وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصنّفہٗ

حضرت مرزا بشیر الدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثّانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد اوّل

مشتمل بر

سورۃ فاتحہ و سورۃ بقرہ رکوع ۱ تا رکوع ۹

نظارت نشر و اشاعت قادیان

نام کتاب : تفسیر کبیر جلد اوّل۔دوم

تصنیف لطیف : حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ

سن اشاعت : فروری رتبلیغ 2004

باہتمام : نظارت نشرو اشاعت قادیان

تعداد : 2000 (دوہزار)

مطبع : پرنٹ ویل امرتسر

ISBN- 81-7912-051-1

نوٹ : تفسیر کبیر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے اس کے چار ایڈیشن ربوہ اور لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ایک عرصہ سے ہندوستان میں تفسیر کبیر کا مطالبہ ہو رہا تھا۔اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ازراہ شفقت مکمل سیٹ کو پانچ جلدوں میں قادیان سے شائع کرنے کی منظوری عنایت فرمائی ہے۔الحمد للہ۔اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اسے ہر لحاظ سے مبارک اور بابرکت کرے اور لوگوں کے ایمانوں کو جلا بخشنے کا باعث ہو۔آمین۔

ناظر نشرو اشاعت قادیان

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کو ایک عظیم نشانِ رحمت۔ مصلح موعود کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "وہ علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔"

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کی تصنیف لطیف تفسیر کبیر اس مذکورہ خدائی بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ یہ تفسیر قدیم و جدید قرآنی علوم کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ظاہر فرمایا ہے۔ حضرت مصلح موعودؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس تفسیر کا بہت سا مضمون میرے غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مطالعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل، اصحاب رضوان اللہ علیہم کی محبت، اسلام کے تابندہ مستقبل کے متعلق بصیرت عطا کرتا ہے۔

حضور کی تحریر فرمودہ تفسیر کی پہلی جلد کتابی شکل میں ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آئی تھی اور اب تک اس کی گیارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ عرصہ دراز سے علوم و معارف کا یہ بیش بہا خزانہ نایاب تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خصوصی توجہ اور ہدایات کی روشنی میں یہ مجموعہ دس جلدوں کے ایک سیٹ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور مطالعہ و تحقیق میں سہولت کے لئے ہر جلد کے آخر میں ایک مبسوط مکمل انڈیکس مضامین، اسماء، جغرافیائی مقامات اور حل لغات کے مکمل انڈیکس تیار کر کے شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ اس تفسیر کی اشاعت کو دین اسلام کی شوکت اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔

خاکسار

سید عبد الحی ناظر اشاعت

کلامُ اللہ

قرآن کریم ایک ہی کتاب ہے جو کلام اللہ کہلا سکتی ہے۔ دوسری کتب خواہ الہامی بھی ہوں کلام اللہ نہیں کیونکہ ان میں انسانی کلام بھی شامل ہے۔ خالص کلام اللہ الف سے لے کر ی تک۔ بِسۡمِ اللّٰہ سے لیکر وَالنَّاس تک صرف قرآن کریم ہے۔

یہ کتاب اس وقت سے کہ نازل ہوئی ہمارے زمانہ تک جوں کی توں ہے نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ۔ نہ کوئی حکم ناقابلِ عمل۔ نہ کوئی آیت منسوخ۔ ہر اک زبر زیر محفوظ۔ ہر ایک حرکت و وقف بعینہٖ۔ پس اس کے سوا اور کوئی کتاب نہیں جسے اس تعیین کے ساتھ اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا جا سکے کہ اس سے کوئی مشتبہ حکم نہ ملے گا۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس قیمتی کتاب کو بھلا دیا ہے وہ اسے چھوڑ کر دوسری کتب کی طرف متوجہ ہیں اور خدا تعالیٰ کی جگہ خود ساختہ لیڈروں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ میں نے اس اُمید کے ساتھ اس کلام اللہ کی تفسیر لکھی ہے کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے یا بدقسمتی سے اس کلام پر غور کرنے کا وقت نہیں پاتے یا جن کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی انہیں کلام اللہ سمجھنے کا موقعہ مل جائے اور اس کی اندرونی خوبیوں سے وہ واقف ہو جائیں۔ پہلی جلد تفسیر کی یہ ہے جس کا دیباچہ میں ان سطور کے ذریعہ سے لکھ رہا ہوں تین جلدیں درمیانی اور آخری حصہ کے متعلق پہلے چھپ چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اس تفسیر کے ذریعہ سے قرآن کریم کے مطالب کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمائے اور مجھے بھی اس تفسیر کے مکمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

تاریخ ۲۲/۵/۴۸

مرزا محمود احمد
رتن باغ لاہور

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ سَبْعُ اٰيَاتٍ

سورۃ فاتحہ۔ یہ سورۃ مکی ہے اور بسم اللہ سمیت اس کی سات آیتیں ہیں ۱؎

۱؎ سورۃ۔ سورۃ کے معنی عربی زبان میں مندرجہ ذیل ہیں۔
(۱) مَنْزِلَةٌ یعنی درجہ (۲) شَرَفٌ یعنی بزرگی بڑائی (۳) عَلَامَةٌ یعنی نشان (۴) اونچی دیوار یا عمارت جو خوبصورت بھی ہو۔ (اقرب) (۵) یہ لفظ سُؤْرَةٌ سے بھی ہو سکتا ہے یعنی اس میں ہمزہ ہے جو ماقبل مضموم کی وجہ سے واؤ سے بدل گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی بقیہ کے ہیں عرب کہتے ہیں ھُوَفِی اَسْاَٰرِ النَّاسِ یعنی وہ قوم کے بقیہ لوگوں میں سے ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی) (۶) ایسی شے جو پوری اور مکمل ہو عرب جوان تندرست اونٹنی کو سورۃ کہتے ہیں (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی) (آئندہ اس تفسیر کا حوالہ دیتے وقت سارے نام کی جگہ صرف قرطبی لکھا جائیگا) سُؤْرَةٌ کی جمع سُوَرٌ ہے یعنی سورتیں۔

لفظ سورۃ اور اس کے معانی

قرآن کریم کے بعض ٹکڑوں کو سُوْرَةٌ کیوں کہتے ہیں اس کے متعلق مختلف علماء نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں بعض کے نزدیک اس لئے کہ ان کے پڑھنے سے انسان کا درجہ بڑھتا ہے بعض کے نزدیک اس لئے کہ اس سے بزرگی حاصل ہوتی ہے بعض کے نزدیک اس لئے کہ سورتیں مضامین کے ختم ہونے کا نشان ہیں بعض کے نزدیک اس لئے کہ وہ ایک بلند اور خوبصورت روحانی عمارت کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں بعض کے نزدیک اس لئے کہ وہ سارے قرآن کا بقیہ یا حصہ ہیں بعض کے نزدیک اس لئے کہ ان کے اندر ایک مکمل اور پورا مضمون آجاتا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ یہ اختلاف صرف ذوقی ہے ورنہ سورۃ کے چھ معنی جو بیان ہوئے ہیں وہ چھ کے چھ ہی اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے معین ٹکڑوں کو سورۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ (۱) قرآن کریم کا حصہ ہیں (۲) اور ان میں سے ہر اک میں ایک مکمل اور پورا مضمون بیان ہوا ہے (۳) وہ بلند اور خوبصورت روحانی تعمیر پر مشتمل ہیں جن میں داخل ہونے والا (۴) اعلیٰ مرتبہ اور (۵) بزرگی پاتا ہے اور (۶) ان پر عمل کرنے والے کو دوسرے لوگوں کے مقابل پر ایک خاص امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔)

قرآن کریم کے بعض ٹکڑوں کو سورۃ کہے جانے کی وجہ

قرآن کریم کے بعض ٹکڑوں کا نام سورۃ رکھا جانا الہامی نام ہے

سُورۃ کا لفظ جو قرآن کریم کے خاص ٹکڑوں کی نسبت استعمال ہوا ہے۔ یہ الہامی نام ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کردہ ہے قرآن کریم میں آتا ہے اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ (بقرہ ع ۳) پس سورۃ کا لفظ خود قرآن کریم نے استعمال فرمایا ہے اور الہامی نام ہے رسول کریم صلعم بھی یہ لفظ استعمال فرماتے تھے صحیح مسلم میں انسؓ سے روایت ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلمؐ نُزِلَتْ عَلَیَّ اٰنِفًا سُوْرَۃٌ فَقَرَأَ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ

قرآن مجید اور احادیث میں لفظ سورۃ کا استعمال

(مسلم کتاب الصلوۃ باب حجۃ من قال البسملۃ اٰیۃ من اَوَّلِ کُلِّ سُوْرَۃٍ سِوٰی بَرَاءَۃ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی مجھ پر ایک سورۃ اُتری ہے اور وہ یہ ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَر الخ بس روایت سے معلوم ہوا کہ رسول کریم صلعم بھی قرآن کریم کے ان حصوں کو جن کو آج مسلمان سورتیں کہتے ہیں سورۃ ہی کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے اور یہ بعد کا رکھا ہوا نام نہیں۔

سُورۃ الفاتحۃ

قرآن کریم کے ابتدا میں رکھی ہوئی اس مختصر سی سورۃ کا نام فاتحۃ الکتاب ہے جو مختصر ہو کر سورۃ الفاتحہ بن گیا ہے اردو دان لوگوں نے آگے اسے فارسی اسلوب پر سورۃ فاتحہ بنا دیا ہے اس کا یہ نام ترمذی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔ عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ (ترمذی ابواب الصلوۃ ماجاء انہ لاصلوۃ الّا بفاتحۃ الکتاب) یعنی جب تک فاتحۃ الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ نماز میں نہ پڑھی جائے نماز نہیں ہوتی۔ یہی روایت اس صحابی سے انہی الفاظ میں مسلم کتاب الصلوۃ باب وجوب قراءۃ الفاتحہ میں بھی مروی ہے۔

سورۃ فاتحہ اور اس کے نام کا ذکر احادیث میں

سورۃ فاتحہ کے نو نام

اس سورۃ کے کئی نام ہیں جن میں سے مشہور نام جو بعض قرآن کریم سے اور بعض رسول کریم صلعم سے ثابت ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **سُورَۃُ الصَّلٰوۃ** حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ (مسلم باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ) یہی روایت جابر ابن عبداللہؓ سے ابن جریر نے بھی نقل کی ہے (مصری جلد اوّل ص ۴۶) میں نے صلوٰۃ (یعنی سورۃ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف کر کے تقسیم کر لیا ہے یعنی آدھی سورۃ میں صفات الٰہیہ کا ذکر ہے اور آدھی میں بندے کے حق میں دُعا ہے۔

(۲) **سُورَۃُ الْحَمْد**۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اُمُّ الْقُرْاٰنِ وَاُمُّ الْکِتَابِ وَالسَّبْعُ الْمَثَانِیْ یعنی سورۃ الحمد للہ کے دوسرے نام امّ القرآن اور امّ الکتاب اور السبع المثانی بھی ہیں۔ (ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب فاتحۃ الکتاب)

(۳ و ۴ و ۵) **امّ القرآن۔ القرآن العظیم اور السبع المثانی** یہ تین نام بھی اس سورۃ کے ہیں مسند امام احمد بن حنبل میں ابوہریرۃؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ھی امّ القرآن وھی السبع المثانی وھی القرآن العظیم۔ سورۃ فاتحہ امّ القرآن بھی ہے اور السبع المثانی بھی ہے اور القرآن العظیم بھی ہے (جلد دوم ص ۴۴۸)

السبع المثانی کا لفظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (الحجر ع ۶) پس یہ نام قرآن کریم کا رکھا ہوا ہے۔

(۶) **اُمُّ الْکِتَاب**۔ اس نام کا ذکر ابوداؤد میں حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت میں موجود ہے اور اوپر نمبر ۲ میں اس کا ذکر آ چکا ہے۔

(۷) **الشِّفَاء**۔ یہ نام حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ دَاءٍ۔ سورۃ فاتحہ ہر بیماری سے شفا دیتی ہے (دارمی) بیہقی فی شعب الایمان میں بھی روایت مروی ہے لیکن من کل داء کی جگہ من کل سمّ کے الفاظ ہیں یعنی ہر زہر کا علاج ہے

(۸) الرُّقْيَة۔ یعنی دم کرنے والی سورۃ۔ یہ نام بھی حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت مذکورہ مسند احمد بن حنبل و بخاری میں درج ہے (بخاری فضائل القرآن باب فاتحۃ الکتاب اور مسند احمد بن حنبل جلد ۳) ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ کسی کو سانپ نے ڈس لیا تھا میں نے اس پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا اور اسے شفا ہو گئی اس پر آپ نے فرمایا۔ مَا یُدْرِیكَ اَنَّهَا رُقْيَةٌ تم کو کس طرح معلوم ہوا کہ یہ دم کرنے والی سورۃ ہے۔ اس صحابی نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ بس میرے دل میں ہی یہ بات آ گئی۔

(۹) **سورۃ الکنز**۔ بیہقی نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَعْطَانِیْ فِیْمَا مَنَّ بِهٖ عَلَیَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقَالَ هِیَ كَنْزٌ مِّنْ كُنُوْزِ عَرْشِیْ (فتح البیان ۱۹؎) یعنی رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے جو احسان فرما کر مجھے انعام دئے ہیں ان میں سے ایک فاتحۃ الکتاب بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ فاتحہ نام میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ پس یہ نو نام قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔ ان کے علاوہ اور نام بھی اس سورۃ کے صحابہ سے مروی ہیں۔ امام سیوطیؒ نے ان کی تعداد پچیس تک لکھی ہے۔ علامہ قرطبی نے بارہ نام لکھے ہیں لیکن باقی ناموں کا ثبوت چونکہ قرآن و حدیث سے مجھے نہیں ملا۔ میں نے انہیں بیان نہیں کیا۔

فاتحہ نام جو اس سورۃ کا بیان ہوا ہے اس کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ یہ نام پیشگوئی کے طور پر پہلی کتب میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ مکاشفات باب ۱۰ آیت ۲ میں لکھا ہے۔

"اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب کھلی ہوئی تھی اور اس نے اپنا داہنا پاؤں سمندر پر اور بایاں خشکی پر دھرا اور بڑی آواز سے جیسے ببر گرجتا ہے پکارا۔ اور جب اس نے پکارا تب بادل نے گرجنے کی اپنی سات آوازیں دیں۔"

اس سورۃ کا نام اور اس کی آیات کی تعداد بطور پیشگوئی مرقوم ہے۔ مترجم نے پیشگوئی کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہونے کے باعث عبرانی لفظ 'فتوحہ' کا ترجمہ کھلی ہوئی کتاب کیا ہے حالانکہ فتوحہ یعنی فاتحہ سورۃ کا نام بتایا گیا تھا اس پیشگوئی میں جو گرج کی سات آوازوں کا ذکر ہے ان سے مراد اس سورۃ کی سات آیات ہیں۔ مسیحی مصنفین بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ مکاشفات کے مذکورہ بالا حوالہ میں مسیح کی آمد ثانی کے متعلق پیشگوئی ہے اور یہ بات بالکل درست ہے۔ پیشگوئی کے الفاظ سے ثابت ہے کہ آنے والے مسیح کے زمانہ تک یہ سورۃ مقفل رہے گی یعنی اس کا تفصیلی مفہوم مسیح موعود کے زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ چنانچہ مکاشفات میں لکھا ہے کہ نبی کو ایک آسمانی آواز نے کہا کہ "بادل کی ان سات رعدوں سے جو بات ہوئی اس پر مُہر کر رکھ اور مت لکھ" (باب ۱۰ درس ۴)

سورتوں کے نام رسول کریمؐ کے رکھے ہوئے ہیں۔

میں نے تفصیلاً سورۃ فاتحہ کے نام اس لئے گنوائے ہیں تا یہ بتاؤں کہ سورتوں کے نام بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ سورۃ فاتحہ کے بعض ناموں سے ثابت ہے آپ نے بھی وہ نام الہاماً اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر رکھے ہیں۔

دوسرے میری غرض ان ناموں کے گنوانے سے یہ ہے کہ ان سے سورۃ فاتحہ کے وسیع مطالب پر روشنی پڑتی ہے یہ نو نام در حقیقت دس مضمون ہیں جو سورۃ فاتحہ بیان کرتی ہے ۱۔ فاتحۃ الکتاب ہے۔ یعنی قرآن کریم میں سب سے پہلے اس کے رکھنے کا حکم ہے دوسرے وہ مطالب قرآنی کے لئے بمنزلہ ایک کلید کے ہے کہ اس کے ذریعہ سے قرآن کریم کے

سورۃ فاتحہ کے متعلق پہلی کتب میں پیشگوئی

سورہ فاتحہ کے مختلف ناموں سے اس کے وسیع مطالب کی طرف اشارہ

مطالب کھلتے ہیں. پھر سورۃ فاتحہ سورۃ الحمد ہے یعنی اس
سورۃ نے انسان اور بندہ کے تعلقات پر اور انسانی پیدائش
پر اس رنگ میں روشنی ڈالی ہے کہ اس سے صاف معلوم ہو
جاتا ہے کہ انسانی پیدائش اعلیٰ ترقیات کے لئے ہے اور یہ کہ
خدا تعالیٰ کا تعلق بندوں سے رحم اور فضل کی بنیادوں پر
قائم ہے. پھر وہ الصلوٰۃ ہے یعنی کامل دعا اس میں سکھائی
گئی ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی اور وہ امّ الکتاب
ہے اس میں وہ تمام علوم جن کے ذریعہ سے دوسروں کو خطاب
کیا جاتا ہے بیان کر دئے گئے ہیں اور یہ بھی کہ وہ کتاب کی ام
یعنی قرآن مجید کے لئے بمنزلہ ماں کے ہے یعنی قرآن کریم کے
نزول کا موجب وہ دعائیں ہیں جو سورہ فاتحہ میں بیان ہوتی ہیں
اور جو درد مند دلوں سے اٹھ کر عرش عظیم سے قرآن کریم کو لائی
ہیں اور وہ امّ القرآن ہے اس میں وہ تمام علوم جو انسان کی
ذات سے تعلق رکھتے ہیں. بیان کر دیئے گئے ہیں اور وہ السبع المثانی
ہے یعنی گو صرف سات آیتیں اس میں ہیں لیکن ہر ضرورت
ان سے پوری ہو جاتی ہے. روحانیت کا کوئی سوال ہو کسی نہ
کسی آیت سے اس پر روشنی پائی جائیگی گویا علمی سوالوں
کے حل کرتے وقت بار بار حوالہ کے طور پر اس کی سات آیتیں
دہرائی جائیں گی اور اس لئے بھی وہ مثانی ہے کہ نماز کی ہر
رکعت میں اسے پڑھا جاتا ہے۔

سورۃ فاتحہ کے فضائل مختلف احادیث میں۔

وہ قرآن عظیم بھی ہے یعنی باوجود ام الکتاب اور
ام القرآن کہلانے کے وہ قرآن کریم کا حصہ بھی ہے اور اس
سے الگ نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے
قرآن عظیم سورۃ فاتحہ کو انہی معنوں سے کہا گیا ہے جس طرح ہم
کسی سے کہتے ہیں قرآن سناؤ اور مراد اس سے ایک
سورۃ یا ایک رکوع ہوتا ہے۔

سورۃ فاتحہ شفا ہے کہ اس میں تمام ان وساوس
کا رد ہے جو انسان کے دل میں دین کے بارہ میں پیدا
ہوتے ہیں اور وہ رقیۃ ہے کہ علاوہ دم کے طور پر
استعمال ہونے کے اس کی تلاوت شیطان اور اس کی
ذریت کے حملوں سے انسان کو بچاتی ہے اور دل میں ایسی
قوت پیدا کرتی ہے کہ شیطان کے حملے بے ضرر ہو جاتے
ہیں اور وہ کنز بھی ہے کہ علوم وفنون کے اس میں
دریا بہتے ہیں. اردو میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کا
ایک محاورہ ہے اس کا صحیح مفہوم شاید سورۃ فاتحہ کے
سوا اور کسی چیز سے ادا نہیں ہو سکتا. بلکہ اس سورۃ کے
بارہ میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سمندر کوزہ میں بند کر دیا گیا
ہے۔

غرض اسماء کے گنانے سے میرا منشاء پڑھنے والے
کے ذہن کو ان وسیع مطالب کی طرف توجہ دلانا تھا جو
رسول کریم صلعم نے مختلف ناموں کے ذریعہ سے اس سورۃ
کے بیان فرمائے ہیں ورنہ حقیقت سے خالی نام کسی سورۃ
کے تو چھوڑ سو بھی ہوں تو ان سے کوئی مقصد پورا نہیں
ہوتا اور رسول کریم صلعم ایسا بے فائدہ فعل ہرگز نہیں
کر سکتے تھے۔ پس سوچنے والوں کے لئے ان ناموں میں
ایک اعلیٰ روشنی اور کامل ہدایت ہے۔

فضائل سورۃ فاتحہ

اس سورۃ کے بہت سے فضائل حدیثوں میں بیان
ہیں. جن میں سے بعض کی طرف تو میں اس کے ناموں میں اشارہ
کر چکا ہوں اور بعض جو زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے
ہیں ان کا ذکر اب کرتا ہوں. نسائی نے ابی بن کعب سے
روایت کی ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فِی التَّوْرَاۃِ وَلَا فِی الْاِنْجِیْلِ مِثْلَ
اُمِّ الْقُرْاٰنِ وَھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَھِیَ مَقْسُوْمَۃٌ
بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ (کتاب الافتتاح
فضل فاتحۃ الکتاب) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا. اللہ تعالیٰ نے نہ توراۃ میں نہ انجیل میں کوئی ایسی سورۃ
اُتاری ہے جیسی کہ ام القرآن (یعنی سورۃ فاتحہ) ہے اور اس
کا ایک نام السبع المثانی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے
بارہ میں مجھے فرمایا ہے کہ وہ میرے اور میرے بندے کے

درمیان بحصّہ مساوی بانٹ دی گئی ہے اور اس کے ذریعہ سے میرے بندے جو دُعا مجھ سے کریں گے وہ ضرور قبول کی جائے گی۔ یہ فضیلت نہایت اہم ہے کیونکہ اس میں ایک عملی گُر بتایا گیا ہے جو انسان کے لئے دین و دُنیا میں مفید ہے یعنی جو دُعا اس کے ذریعہ سے کی جائے وہ قبول کی جاتی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی ایک فضیلت

ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر جو دعا کی جائے وہ ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو ذریعہ دُعا کا اس میں بتایا گیا ہے اس کا اختیار کرنا ضرور دُعا کو قبول کروا دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ذریعہ کیا ہے؟ جیسا کہ اس سورۃ کی عبارت سے ظاہر ہے وہ ذریعہ اوّل بِسْمِ اللّٰهِ دوم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سوم الرَّحْمٰنِ چہارم الرَّحِيْمِ اور پنجم مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور ششم اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور ہفتم اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہے گویا جس طرح سات آیتوں کی یہ سورۃ ہے اسی طرح سات اصول دُعا کی قبولیت کے لئے اس میں بیان کئے گئے ہیں

دُعا کے قبول کروانے کے سات اصولوں کا بیان۔

دُعا قبول کروانے کا پہلا اصل۔

بسم اللہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس مقصد کے لئے دُعا کی جائے وہ نیک ہو یہ نہیں کہ چور چوری کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے تو وہ بھی قبول کر لی جائے گی۔ خدا کا نام لیکر اور اسکی استعانت طلب کر کے جو دُعا کی جائے گی لازماً ایسے ہی کام کے متعلق ہو گی جس میں اللہ کی ذات بندہ کے ساتھ شریک ہو سکتی ہو۔ دیکھو ان مختصر الفاظ میں دُعا کے حلقہ کو کس طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ میں نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے۔ لوگوں کی تباہی اور بربادی کی دُعائیں کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ ہماری دُعا قبول نہیں ہوئی۔ اسی طرح ناجائز مطالب کے لئے دُعائیں کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ دُعا قبول نہیں ہوئی۔ بعض لوگوں نے جھوٹا جامہ زہد و اتقا کا پہن رکھا ہے اور ناجائز امور کے لئے تعویذ دیتے اور دُعائیں کرتے ہیں حالانکہ یہ سب دُعائیں اور تعویذ عاملوں کے منہ پر مارے جاتے ہیں۔

دُعا کے رد کئے جانے کی وجہ

دوسرا اصل

دوسرا اصل اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں بتایا ہے یعنی دُعا ایسی ہو کہ اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے دوسرے بندوں کا بلکہ سب دُنیا کا فائدہ ہو یا کم سے کم ان کا نقصان نہ ہو اور اس کے قبول کرنے سے اللہ تعالیٰ کی حمد ثابت ہوتی ہو اور اس پر کسی قسم کا الزام نہ آتا ہو۔

تیسرا اصل

تیسرے یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو جنبش دی گئی ہو اور اس دُعا کے قبول کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت ظاہر ہوتی ہو۔

چوتھا اصل

چوتھے یہ کہ اس دُعا کا تعلق اللہ تعالےٰ کی صفت رحیمیت سے بھی ہو یعنی وہ نیکی کی ایک ایسی بنیاد ڈالتی ہو جس کا اثر دُنیا پر ایک لمبے عرصہ تک رہے اور جسکی وجہ سے نیک اور شریف لوگ متواتر فوائد حاصل کریں یا کم سے کم ان کے راستہ میں کوئی روک نہ پیدا ہوتی ہو۔

پانچواں اصل

پانچویں یہ کہ دُعا میں اللہ تعالیٰ کی صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا بھی خیال رکھا گیا ہو یعنی دُعا کرتے وقت ان ظاہری ذرائع کو نظر انداز نہ کر دیا گیا ہو جو صحیح نتائج پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تجویز کئے ہیں کیونکہ وہ سامان بھی اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں اور اسکے بنائے ہوئے طریق کو چھوڑ کر اس سے مدد مانگنا ایک غیر معقول بات ہے گویا جہاں تک اسباب ظاہری کا تعلق ہے بشرطیکہ وہ موجود ہوں یا ان کا مہیا کرنا دُعا کرنے والے کے لئے ممکن ہو ان کا استعمال بھی دُعا کے وقت ضروری ہے ہاں اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت اسباب سے بالا ہو کر ظاہر ہوتی ہے ایک اشارہ اس آیت میں یہ بھی کیا گیا ہے کہ دُعا کرنے والا دوسروں سے بخشش کا معاملہ کرتا ہو اور اپنے حقوق کے طلب کرنے میں سختی سے کام نہ لیتا ہو۔

چھٹا اصل

چھٹا اصل یہ بتایا ہے کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق ہو اور اس سے کامل اخلاص حاصل ہو اور وہ شرک اور مشرکانہ خیالات سے کلی طور پر پاک ہو۔

ساتواں اصل

اور ساتویں بات یہ بتائی ہے کہ وہ خدا کا ہی ہو چکا ہو اور اس کا کامل توکل اسے حاصل ہو اور غیر اللہ سے اس کی نظر بالکل ہٹ جائے اور وہ اس مقام پر پہنچ جائے کہ خواہ کچھ ہو جائے اور کوئی بھی تکلیف

ہو۔ مانگوں گا تو خدا تعالیٰ ہی سے مانگوں گا۔

یہ سات امور وہ ہیں کہ جب انسان ان پر قائم ہو جائے تو وہ لعبدی ماسأل کا مصداق ہو جاتا ہے اور حق بات یہ ہے کہ اس قسم کی دُعا کا کامل نمونہ رسول کریم صلعم یا آپؐ کے کامل اتباع نے ہی دکھایا ہے اور انہی کے ذریعہ سے دُعاؤں کی قبولیت کے ایسے نشان دُنیا نے دیکھے ہیں جن سے اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان اور گونگوں کو زبان عطا ہوئی ہے مگر اتباع رسول کا مقام بھی کسی کے لئے بند نہیں جو چاہے اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کر سکتا ہے اور اس مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔

آنحضرتؐ اور آپ کے اتباع کا مذکورہ ذرائع سے قبولیت دعا کا نشان دکھلانا

بخاریؒ نے سعید ابن المعلّی سے ایک روایت کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ آؤ میں تمہیں قرآن کریم کی سب سے بڑی سورۃ سکھاؤں اور پھر سورۃ فاتحہ سکھائی (بخاری کتاب فضائل القرآن باب فاتحۃ الکتاب) آپؐ نے جو اسے اعظم السُّوَر فرمایا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اس کے معانی اور مطالب لمبی لمبی سورتوں سے بھی زیادہ ہیں اور کیوں نہ ہو کہ یہ سارے قرآن کریم کے لئے بطور متن کے ہے۔

سورۃ فاتحہ مطالب کے لحاظ سے اعظم السُّوَر ہے۔

مَیں اس جگہ ایک اپنا مشاہدہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ مَیں چھوٹا ہی تھا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا میں مشرق کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہوں اور سامنے میرے ایک وسیع میدان ہے۔ اس میدان میں اس طرح کی ایک آواز پیدا ہوئی جیسے برتن کو ٹھکورنے سے پیدا ہوتی ہے یہ آواز فضا میں پھیلتی گئی اور یُوں معلوم ہُوا کہ گویا وہ سب فضاء میں پھیل گئی ہے اس کے بعد اس آواز کا درمیانی حصہ متمثل ہونے لگا اور اس میں ایک چوکھٹا ظاہر ہونا شروع ہُوا جیسے تصویروں کے چوکھٹے ہوتے ہیں پھر اس چوکھٹے میں کچھ ہلکے سے رنگ پیدا ہونے لگے آخر وہ رنگ روشن ہو کر ایک تصویر بن گئے اور اس تصویر میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ ایک زندہ وجود بن گئی اور مَیں نے خیال کیا کہ یہ ایک فرشتہ ہے۔ وہ فرشتہ مجھ سے مخاطب ہُوا اور اس نے مجھے کہا کہ کیا مَیں تم کو سورہ فاتحہ کی تفسیر سکھاؤں تو مَیں نے کہا کہ ہاں آپ مجھے ضرور اس کی تفسیر سکھائیں پھر اس فرشتہ نے مجھے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سکھانی شروع کی یہاں تک کہ وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تک پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مجھے کہا کہ اس وقت تک جس قدر تفاسیر لکھی جا چکی ہیں وہ اس آیت تک ہیں۔ اس کے بعد کی آیات کی کوئی تفسیر اب تک نہیں لکھی گئی۔ پھر اس نے مجھ سے پُوچھا۔ کیا میں اس کے بعد کی آیات کی تفسیر بھی تم کو سکھاؤں اور مَیں نے کہا ہاں جس پر فرشتہ نے مجھے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اور اس کے بعد کی آیات کی تفسیر سکھانی شروع کی اور جب وہ ختم کر چکا تو میری آنکھ کھل گئی اور جب میری آنکھ کھلی تو مَیں نے دیکھا کہ اس تفسیر کی ایک دو باتیں مجھے یاد تھیں۔ لیکن معًا بعد مَیں سو گیا اور جب اُٹھا تو تفسیر کا کوئی حصہ بھی یاد نہ تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک مجلس میں اس سورۃ پر کچھ بولنا پڑا اور مَیں نے دیکھا کہ اس کے نئے نئے مطالب میرے ذہن میں نازل ہو رہے ہیں اور مَیں سمجھ گیا کہ فرشتہ کے تفسیر سکھانے کا یہی مطلب تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر آج تک ہمیشہ اس سورۃ کے نئے نئے مطالب مجھے سکھائے جاتے ہیں جن میں سے سینکڑوں میں مختلف کتابوں اور تقریروں میں بیان کر چکا ہوں اور اس کے باوجود وہ خزانہ خالی نہیں ہُوا۔ چنانچہ دُعا کے متعلق جو گُر اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں اور جن کا ذکر مَیں اُوپر کر آیا ہوں وہ بھی انہی تجارب میں سے ہیں۔ کیونکہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھتے وقت میرے دل میں خیال گذرا کہ اس موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ کوئی نئے مطالب اس سورۃ کے کھولے تو فورًا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سات اصول کا انکشاف ہُوا جو دُعا کے متعلق اس سورۃ میں بیان ہیں۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا ہے محض خلاصہ کے طور پر لکھا گیا ہے ورنہ ان اصول میں بہت وسیع مطالب پوشیدہ ہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

سورۃ فاتحہ کا نزول

اس سورۃ کے نزول کے بارہ میں ابن عباسؓ قتادہ اور ابوالعالیہ کا بیان ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے اور ابوہریرہؓ اور مجاہد اور عطاء اور زہری کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے لیکن قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کا ذکر سورۃ الحجر میں جو بالاجماع مکی سورۃ ہے ان الفاظ میں آچکا ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر ع ۶) (قرطبی) بعض ائمہ کا خیال ہے کہ دو دفعہ یہ سورۃ نازل ہوئی ہے ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں۔ پس یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی۔ (قرطبی میں بحوالہ ثعلبی یہ روایت لکھی ہے مگر ثعلبی کی تفسیر میں جو مطبوعہ الجزائر ہے یہ رائے درج نہیں۔ شائد ثعلبی کی کسی اور کتاب سے یہ رائے قرطبی نے درج کی ہو) میرے نزدیک یہی خیال درست ہے۔ اس کا مکی ہونا یقینی ہے اور اس کا مدنی ہونا بھی معتبر رواۃ سے ثابت ہے۔ پس حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے اور جب دوسرے نزول کا رسول کریم صلعم نے کسی مجلس میں ذکر کیا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ یہ سورۃ نازل ہی مدینہ میں ہوئی تھی۔ حالانکہ آپؐ کا مقصد اس سے لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ یہ سورۃ مدینہ میں بھی نازل ہوئی ہے۔ اس کے مکی ہونے کا یہ ثبوت بھی ہے کہ تمام روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ فاتحہ ہمیشہ سے نماز میں پڑھی جاتی رہی ہے اور نماز باجماعت مکہ میں ہی پڑھی جانی شروع ہو گئی تھی بلکہ شروع زمانہ سے ہی شروع ہو گئی تھی۔

سورۃ فاتحہ قرآن کا حصہ ہے

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کا حصہ نہیں ہے اور اس خیال کی دلیل یہ بتاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اپنے نسخہ میں سورۃ فاتحہ کو نہیں لکھا تھا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے سورۃ فاتحہ اور معوذتین یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس تینوں سورتیں قرآن کریم میں نہیں لکھی تھیں

سورۃ فاتحہ کا نزول

اور ان کا یہ خیال تھا کہ سورۃ فاتحہ ہر سورۃ کے ساتھ چونکہ نماز میں پڑھی جاتی ہے اس لئے یہ ہر سورۃ کی تمہید ہے اور غالباً معوذتین کے بارہ میں بھی ان کا یہ خیال تھا کہ بوجہ اس کے کہ ان کا مضمون مختلف نقصانات اور شرور سے بچنے کی دعا پر مشتمل ہے اس لئے وہ گویا باوجود قرآن عظیم کا حصہ ہونے کے متن قرآن سے باہر ہیں اور وہ غالباً انہیں بھی ہر سورۃ سے متعلق سمجھتے تھے۔ سورۃ فاتحہ کے بارہ میں تو ان کے اس خیال کا ذکر احادیث سے ثابت ہے چنانچہ ابوبکر الانباری نے عن الاعمش عن ابراھیم ایک حدیث نقل کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے نسخۂ قرآن میں سورۃ فاتحہ کیوں نہیں لکھی تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ لَوْ كَتَبْتُهَا لَكَتَبْتُهَا مَعَ كُلِّ سُوْرَةٍ۔ یعنی اگر میں سورۃ بقرہ سے پہلے اسے لکھتا تو سب سورتوں کے ساتھ لکھتا یعنی یہ سورۃ ہر سورۃ سے متعلق ہے اس لئے میں نے اسے حذف کر دیا ہے تا یہ غلط فہمی نہ ہو کہ صرف سورۃ بقرہ کے ساتھ اس کا تعلق ہے (قرطبی) معلوم ہوتا ہے یہی استدلال معوذتین کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کیا ہے ورنہ وہ سورۃ جسے رسول کریم صلعم نے صاف طور پر قرآن کریم کی سورتوں میں سے سب سے بڑی قرار دیا ہے (بخاری عن سعید بن المعلّی) اسے کس طرح قرآن کریم سے خارج قرار دے سکتے تھے۔

سورۃ فاتحہ مکہ اور مدینہ میں دو دفعہ نازل ہوئی۔

سورۃ فاتحہ ہر نماز میں اور ہر رکعت میں پڑھنی ضروری ہے سوائے اس کے کہ مقتدی کے نماز میں شامل ہونے سے پہلے امام رکوع میں جا چکا ہو اس صورت میں اسے تکبیر کہہ کر بغیر کچھ پڑھے رکوع میں چلے جانا چاہیئے۔ امام کی قراءت ہی اس کی قراءت سمجھی جائے گی۔ سورۃ فاتحہ کے نماز میں پڑھنے کی تاکید مختلف احادیث میں آئی ہے۔ مسلم میں آتا ہے حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ) یعنی جس نے نماز ادا کی مگر اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز

سورۃ فاتحہ ہر نماز اور ہر رکعت میں پڑھنی ضروری ہے۔

سورۃ فاتحہ کو قرآن کا حصہ نہ سمجھنے کے دلائل کا جواب

ناقص ہے اور بخاری مسلم میں عبادۃ بن الصامت کی روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ (بخاری کتاب الصلوۃ باب وجوب قراءۃ الامام والماموم فی الصلوۃ کلھا نیز مسلم باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ) یعنی جس نے فاتحۃ الکتاب نہ پڑھی اسکی نماز ہی نہیں ہوئی اور صحیح بن خزیمہ اور ابن حبان میں ابوہریرۃؓ سے بھی ایسی ہی روایت آتی ہے (قرطبی) نیز ابوداؤد میں حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُنَادِیَ اَنَّہٗ لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِقِرَاءَۃِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ فَمَا زَادَ (کتاب الصلوۃ باب من ترك القراءۃ فی صلوتہ) یعنی رسول کریم صلعم نے مجھے حکم دیا کہ میں لوگوں میں اعلان کردوں کہ کوئی نماز بغیر اس کے نہیں ہوسکتی کہ سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور حصہ قرآن کریم کا پڑھا جائے۔

سُورۃ فاتحہ کے نماز میں پڑھنے کی تاکید مختلف احادیث میں

صحابہ میں سے حضرت عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ ابوہریرۃؓ ابی بن کعبؓ۔ ابوایوب انصاریؓ۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ عبادۃ بن الصامت۔ ابوسعید خدریؓ۔ عثمان بن ابی العاصؓ خوات بن جبیر اور عبداللہ بن عمرؓ سے بھی متعدد احادیث میں مذکور ہے (قرطبی)

ابن ماجہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت آتی ہے کہ لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃٍ بِالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسُوْرَۃٍ فِیْ فَرِیْضَۃٍ اَوْ غَیْرِھَا یعنی جو شخص ہر رکعت میں الحمد للہ اور کوئی اور سورۃ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی اور یہ حکم فرض نماز اور غیر فرض نماز سب کے متعلق ہے (ابن ماجہ کتاب الصلوۃ باب القراءۃ خلف الامام) اس روایت کو محققین نے ضعیف کہا ہے مگر چونکہ صحابہ کا تعامل یہی ہے اس کے مضمون کی صحت میں کلام نہیں ہوسکتا۔ ابوداؤد کی ایک اور روایت بھی اس کی تائید میں ہے اور وہ عبادۃ بن الصامت سے مروی ہے۔ نافع بن محمود بن الربیع انصاری کہتے ہیں کہ ایک جگہ حضرت عبادۃ امام الصلوۃ تھے ایک دفعہ

وہ دیر سے پہنچے اور ابونعیم نے نماز شروع کرا دی۔ نماز شروع ہو چکی تھی کہ عبادۃ بھی آ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا ہم صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ ابونعیم نے جب سورۃ فاتحہ پڑھنی شروع کی۔ تو میں نے سنا کہ عبادۃ بھی آہستہ آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھتے رہے۔ جب نماز ختم ہوئی۔ تو میں نے ان سے پوچھا کہ جبکہ ابونعیم بالجہر نماز پڑھا رہے تھے آپ بھی ساتھ ساتھ سورۃ فاتحہ پڑھتے جا رہے تھے یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہے کہ ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ رسول کریم صلعم نے ایک دفعہ ہمیں نماز پڑھائی اور سلام پھیر کر جب بیٹھے تو پوچھا کہ جب میں بلند آواز سے نماز میں تلاوت کرتا ہوں تو کیا تم بھی مُنہ میں پڑھتے رہتے ہو بعض نے کہا ہاں بعض نے کہا نہیں اس پر آپ نے فرمایا لَا تَقْرَءُوْا بِشَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَھَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ (ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب من ترك القراءۃ فی صلوتہ) جب میں بلند آواز سے قرآن کریم نماز میں پڑھوں تو سوائے سورۃ فاتحہ کے اور کسی سورۃ کی تلاوت تم ساتھ ساتھ نہ کیا کرو۔ اس بارہ میں اور بہت سی احادیث بھی ہیں۔ مثلاً دارقطنی نے یزید بن شریک سے روایت کی ہے اور اس کے اسناد کو صحیح قرار دیا ہے کہ سَاَلْتُ عُمَرَ عَنِ الْقِرَاءَۃِ خَلْفَ الْاِمَامِ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقْرَاَ قُلْتُ وَاِنْ کُنْتَ اَنْتَ قَالَ وَاِنْ کُنْتُ اَنَا قُلْتُ وَاِنْ جَھَرْتَ قَالَ وَاِنْ جَھَرْتُ۔ یعنی میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھا کروں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ میں نے پوچھا کیا جب آپ نماز پڑھا رہے ہوں تب بھی۔ انہوں نے کہا ہاں خواہ میں نماز پڑھا رہا ہوں۔ میں نے کہا کیا جب بلند آواز سے پڑھا رہے ہوں۔ تب بھی، انہوں نے کہا کہ ہاں تب بھی (دارقطنی جلد اوّل کتاب الصلوۃ باب وجوب قراءۃ ام الکتاب فی الصلوۃ) حضرت مسیح موعودؑ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے بھی پڑھنی چاہیئے خواہ امام جہراً نماز پڑھا رہا ہو سوائے اس کے کہ مقتدی رکوع میں آکر ملے۔ اس صورت میں وہ تکبیر کہہ کر

رکوع میں شامل ہو جائے اور امام کی قراءت اسکی قراءت سمجھی جائے گی۔ یہ ایک استثناء ہے استثناء سے قانون نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح یہ بھی استثناء ہے کہ کسی شخص کو سورۃ فاتحہ نہ آتی ہو۔ مثلاً نو مسلم ہے جس نے ابھی نماز نہیں سیکھی یا بچہ ہو جسے ابھی قرآن نہیں آتا تو اسکی نماز فقط تسبیح و تکبیر سے ہو جائے گی خواہ وہ قرآن کریم کا کوئی حصہ بھی نہ پڑھے سورۃ فاتحہ بھی نہ پڑھے۔

سورۃ فاتحہ کے مضامین کا خلاصہ

سورۃ فاتحہ کے

مضامین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قرآن کریم کے لئے بطور دیباچہ کے ہیں۔ قرآن کریم کے مضامین کو مختصر طور پر اس میں بیان کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو شروع میں ہی قرآنی مطالب پر اجمالاً آگاہی ہو جائے۔ پہلے بسم اللہ سے شروع کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ایک مسلمان (۱) خدا تعالیٰ پر یقین رکھتا ہے (بسم اللہ) (۲) وہ اس امر پر بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ فلسفیوں کے عقیدہ کے مطابق صرف دُنیا کے لئے علّتِ اولیٰ کا کام نہیں دے رہا بلکہ دُنیا کے کام اس کے حکم اور اشارہ سے چل رہے ہیں اس لئے اسکی مدد اور اعانت بندہ کے لئے بہت کچھ کارآمد ہو سکتی ہے (بسم اللہ) (۳) وہ صرف ایک اندرونی طاقت نہیں ہے بلکہ وہ مستقل وجود رکھتا ہے اور اس کا مستقل نام ہے اور مختلف صفات سے وہ متصف ہے (اللہ الرحمٰن الرحیم) (۴) وہ منبع ہے سب ترقیات کا اور تمام سامان جن سے کام لے کر دُنیا ترقی کر سکتی ہے اسی کے قبضہ میں ہیں (الرحمٰن) (۵) اس نے انسان کو اعلیٰ ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے جب وہ اللہ کے پیدا کردہ سامانوں سے صحیح طور پر کام لیتا ہے تو اس کے کام کے اعلیٰ نتائج پیدا ہوتے ہیں جو اسے مزید انعامات کے مستحق بنا دیتے ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں (الرحیم) (۶) اس کے سب کاموں میں جامعیت اور کمال پایا جاتا ہے اور ہر حُسن سے وہ متصف ہے اور سب تعریفوں کا مالک ہے کیونکہ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے سب اسی کا پیدا کردہ ہے (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) (۷) کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی نہیں جسکی ابتدا اور انتہاء یکساں ہو بلکہ اس کے سوا جس قدر اشیاء ہیں ادنیٰ حالت سے شروع ہوئی ہیں اور ترقی کرتے کرتے کمال کو پہنچی ہیں پس اللہ تعالیٰ سب اشیاء کا خالق ہے اور کوئی چیز آپ ہی آپ نہیں (رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) (۸) یہ دنیا ایک متنوع دنیا ہے یعنی اس کی ہزاروں شاخیں ہیں اور ہزاروں قسم کے مزاج ہیں پس کسی چیز کے سمجھنے کے لئے اس کی جنس پر غور کرنا چاہیئے۔ نہ کہ دوسری جنس کی اشیاء پر۔ خدا تعالیٰ کا معاملہ ہر جنس سے اس کی حیثیت کے مطابق ہے۔ پس دنیا میں خدا تعالیٰ کے سلوک میں اگر اختلاف نظر آئے تو اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ وہ اختلاف حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے نہ کہ ظلم کی وجہ سے یا عدم توجہ کی وجہ سے (رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) (۹) جس طرح اللہ تعالیٰ ہر کام لینے والی شے کا خالق نظر آتا ہے وہ ہر سامان کا بھی خالق نظر آتا ہے پس ہر چیز ہر وقت اسکی مدد کی محتاج ہے (اَلرَّحْمٰنِ) (۱۰) پھر جس طرح خدا تعالیٰ اشیاء اور ان سامانوں کا خالق ہے جن سے ان اشیاء نے فائدہ اُٹھانا ہے اسی طرح وہ ان نتائج پر بھی تصرف رکھتا ہے جو سامانوں کے استعمال کرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں مثلاً انسان کو بھی اس نے پیدا کیا ہے اور اس کھانے کو بھی اس نے پیدا کیا ہے جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے اور پھر وہ اچھا یا بُرا خون جو اس کھانے کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے وہ بھی اسی کے حکم اور امر سے ہی ہوگا (اَلرَّحِیْمِ) (۱۱) پھر اس نے جزا سزا کا بھی ایک طریق مقرر کیا ہے یعنی ہر چیز اپنے حالات کے مطابق اپنے کاموں کے اچھے یا بُرے نتائج کا مجموعی نتیجہ ایک دن دیکھ لیتی ہے یعنی کاموں کے نتیجے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک درمیانی کہ ہر کام کا نتیجہ کچھ نہ کچھ نکلتا آتا ہے اور ایک آخری

سُورۃ فاتحہ میں سترہ باتوں کی طرف اشارہ

سُورۃ فاتحہ کے مضامین قرآن کریم کے لئے بطور دیباچہ کے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں) ۵۳

کہ سب کاموں کا مجموعی نتیجہ نکلتا ہے سو اللہ تعالیٰ نے صرف یہی انتظام نہیں کیا کہ ہر کام کا نتیجہ نکلے جس کی طرف رحیم کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے بلکہ اس نے یہ تدبیر بھی اختیار کی ہے کہ سب کاموں کا ایک مجموعی نتیجہ نکلے جس کے سبب سے وہ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ کہلاتا ہے (۱۲) پس ایسی ہی ہستی اس امر کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اسی سے محبت کا تعلق رکھا جائے (اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ) (۱۳) پھر بتایا ہے کہ انسانی ترقی کا انحصار دو امر پر ہے۔ اعمالِ بدن اور اعمالِ قلب پر (اعمالِ قلب سے مُراد فکر خیال عقیدہ ارادہ وغیرہ ہیں) ان دونوں کی اصلاح ضروری ہے اور یہ اصلاح بغیر اللہ تعالیٰ کی تجلّی کے نہیں ہو سکتی (اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ) (۱۴) پھر یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے ملنے کی اور ان کی اصلاح کی خود خواہش رکھتا ہے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ بندہ اس کی طرف جھکے اور اسکی ملاقات کے لئے اسی سے التجا کرے (اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ) (۱۵) پھر یہ بتایا ہے کہ بظاہر خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے بہت سے راستے نظر آتے ہیں لیکن صرف راستہ کا معلوم ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ (الف) وہ راستہ سب سے چھوٹا ہو تا انسان جد و جہد کے دوران میں ہی ہلاک نہ ہو جائے (صِرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ) (ب) وہ راستہ دیکھا بھالا ہو اور اس پر چل کر لوگوں نے خدا کو پایا ہو تا کہ درمیانی خطرات اور ان کے علاج کا بندہ کو پہلے سے علم ہو جائے تا دل مطمئن رہے اور مایوسی پیدا نہ ہو اور اچھے ساتھیوں کی صحبت نصیب رہے پس ایسا راستہ اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا چاہیئے (صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ) (۱۶) ترقیات کے ملنے کی صورت میں دل میں کبر اور خود پسندی کے خیالات پیدا ہو کر انسان کو تباہ کر دیتے ہیں پس ان سے بچتے رہنا چاہیئے اور ترقیات کو ظلم اور فساد کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے بلکہ امن اور خدمت کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس غرض کے لئے دُعائیں کرتے رہنا چاہیئے (غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ) (۱۷) جس طرح انسان ترقیات کو ظلم کا ذریعہ بنا لیتا ہے کبھی وہ ادنیٰ اشیاء کو رحم اور ناجائز محبت کی وجہ سے اونچا درجہ بھی دے دیتا ہے۔ اس سے بھی بچنا چاہیئے اور اس نیکی کے حصول کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے رہنا چاہیئے (وَلَا الضَّآلِّيۡنَ)

حرف باء اور اس کے معنے۔

۵۲ حل لغات۔ (باء) بِسۡمِ اللّٰهِ کی ابتداء میں جو باء آئی ہے وہ حروف ہجاء کا حرف نہیں بلکہ بامعنی حرف ہے عربی زبان میں حروف سے ہجاء کا کام لینے کے علاوہ معنوں کا کام بھی لیا جاتا ہے اور بعض حروف ہجاء کی علامت ہونے کے علاوہ بعض معنے بھی دیتے ہیں۔ ان حروف میں سے بلو بھی ہے۔ یہ حروف ہجاء کا دوسرا حرف بھی ہے اور بامعنی حرفوں میں سے بھی ہے اس کے معنی معیت اور استعانت کے ہیں اور اس کا لفظی ترجمہ 'سے' اور 'ساتھ' ہے مگر چونکہ ان لفظوں سے معنی واضح نہیں ہوتے اس لئے 'لیکر' ترجمہ کیا گیا ہے جو دونوں معنوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق پکڑتے ہوئے اور اس سے مدد مانگتے ہوئے میں یہ کلام پڑھنے لگا ہوں۔

بسم اللہ کے پہلے باء کا متعلق محذوف ہے۔

باء حروف جارہ میں سے ہے یعنی جس اسم پر یہ حرف آتے ہیں اس کے آخری حرف پر زیر یا زیر کی علامت آتی ہے۔ عربی قاعدہ کی رُو سے ان حروف سے پہلے اکثر ایک متعلق محذوف ہوتا ہے جو عبارت کے مفہوم کے مطابق نکال لیا جاتا ہے۔ اس آیت سے پہلے اِقۡرَاۡ یا اِشۡرَعۡ

بعض نے محذوف نکالا ہے یعنی پڑھ یا شروع کر۔ اور اسکی وجہ سورۃ علق کی یہ آیت بیان کی ہے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ پس جو لفظ وہاں بیان ہُوا ہے وہی یا اس کے ہم معنی لفظ یہاں نکالا جائے گا۔ زمخشری نے اِقْرَأْ یا اِشْرَعْ کی جگہ جو امر کے صیغے ہیں أَقْرَأُ یا أَشْرَعُ جو مضارع کے صیغے ہیں محذوف نکالے ہیں یعنی میں پڑھتا ہوں یا شروع کرتا ہوں۔ اور اس کی جگہ بِسْمِ اللّٰہ کے بعد تجویز کی ہے یعنی میں پڑھتا ہوں اللہ کا نام لیکر کی بجائے مَیں اللہ کا نام لیکر پڑھتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں اللہ کے نام پر زور پیدا ہوتا ہے لیکن اگر پڑھتا ہوں پہلے رکھا جائے تو پڑھتا ہوں پر زور آجاتا ہے۔ زمخشری کے یہ معنی لطیف ہیں مَیں نے ترجمہ میں انہی معنوں کو اختیار کیا ہے۔ زمخشری نے سورۃ علق میں جو اِقْرَأْ پہلے آتا ہے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس موقعہ پر اِقْرَأْ پر زور دینا منظور تھا کیونکہ رسول کریم صلعم پڑھنے سے ہچکچاتے تھے (بخاری) لیکن بِسْمِ اللّٰہِ میں پڑھنے پر زور دینا مقصود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر پڑھنے پر زور دینا مقصود ہے۔ اس لئے اس جگہ پڑھنے کا لفظ بعد میں محذوف قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ زمخشری کی یہ تشریح بھی نہایت لطیف ہے۔ اور مَیں نے جو بِسْمِ اللّٰہ کے دُہرانے کے دلائل بیان کئے ہیں۔ ان کے بالکل مطابق آتی ہے۔

(اسم) بسم باء اور اسم سے مرکب ہے اسم کا ہمزہ گِر کر بسم ہوگیا۔ عربی زبان میں بعض ہمزے بولے نہیں جاتے انہیں وصلی ہمزے کہتے ہیں لیکن بسم اللہ میں ہمزہ لکھا بھی نہیں گیا۔ اس کی وجہ علماءِ صرف ونحو کثرت استعمال بتاتے ہیں۔ کسائی اور اخفش کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں سے پہلے جہاں بھی اسم کا لفظ آئے گا اس کا ہمزہ لکھا نہیں جائے گا لیکن فرّاء کا خیال ہے کہ اس جگہ حذف چونکہ نقلاً ثابت ہے۔ ہم بسم اللہ میں یا تو حذف کر دیں گے۔ لیکن دوسرے صفاتِ الٰہیہ سے پہلے چونکہ ایسا کرنا نقلاً ثابت نہیں۔ ہم اس کے ہمزہ کو لکھنے میں ترک نہیں کریں گے (بحر محیط ط۱)

اسم کے معنی اور اس کا اشتقاق۔

اسم کے معنی صفت یا نام کے ہوتے ہیں (قاموس) اور یہ اس م سے نہیں بلکہ و س م یا س م و سے بنا ہے واؤ الف سے بدل گئی ہے جنہوں نے اسے و س م سے بنا ہُوا قرار دیا ہے انہوں نے اس کے معنی نشان اور علامت کے قرار دیئے ہیں کیونکہ وسم کے معنی نشان اور علامت کے ہوتے ہیں مگر جنہوں نے اسے س م و سے بنا ہُوا قرار دیا ہے انہوں نے اس کے معنی اونچا ہونے کے کئے ہیں (اقرب)

اللہ

(اللّٰہ) اللہ اس ذات پاک کا نام ہے جو ازلی ابدی اور الحیّ القیّوم ہے اور مالک اور خالق اور ربّ سب مخلوق کا ہے اور اسم ذاتی ہے نہ کہ اسم صفاتی۔ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں اس خالق وملک کُل کا کوئی ذاتی نام نہیں پایا جاتا۔ صرف عربی میں اللّٰہ ایک ذاتی نام ہے جو صرف ایک ہی ہستی کے لئے بولا جاتا ہے اور بطور نام کے بولا جاتا ہے۔ اللّٰہ کا لفظ بھی اسم جامد ہے مشتق نہیں۔ نہ یہ اور کسی لفظ سے بنا ہے اور نہ اس سے کوئی اور لفظ بنا ہے۔

اللہ اسم ذاتی ہے

بسم اللہ کے محذوف متعلق کے دکھے جانے کی مناسب جگہ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لاہَ یلیہ سے مشتق ہے جس کے معنی تستّر علو اور ارتفاع کے ہیں (اقرب) لیکن یہ درست نہیں بعض لوگ کہتے ہیں اللہ لاہ یَلُوہُ سے نکلا ہے جس کے معنی چمکنے کے ہیں اور لاہ اللّٰہُ الخلقَ کے معنی ہیں۔ اللہ نے مخلوق پیدا کی۔ لیکن لسان العرب میں لکھا ہے کہ یہ معنی غیر معروف ہیں۔ پس یہ قیاس کہ یہ لاہَ یَلُوہُ سے نکلا ہے بالکل غلط ہے۔ بعض لوگ اسے غیر زبان کا لفظ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سریانی کے لفظ لاھا سے نکلا ہے لیکن یہ بھی بالکل غلط ہے بلکہ سُریانی زبان سے تواتفیت کے نتیجہ میں ہے چنانچہ یورپین محققین کی رائے ہے کہ عربی کا لفظ اللہ ابتدائی مادہ سے زیادہ قریب ہے۔

اللہ اسم جامد ہے نہ کہ مشتق

اسم

جرمن عالم NOLDEKE لکھتا ہے کہ عربی کا الٰہ اور عبرانی کے ایل پرانے زمانہ سے پہلو بہ پہلو چلے آتے ہیں اور عبرانی زبان جب عربی سے علیحدہ ہوئی ہے اس سے بھی پہلے سے یہ لفظ سامی زبانوں میں استعمال ہوتا تھا (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۳ زیر عنوان نیمز یعنی اسماء کی بحث)

[۱] الرحمٰن

(الرحمٰن) رحم سے ہے اور فَعْلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن کے الفاظ امتلاء اور غلبہ پر دلالت کرتے ہیں (بحر محیط ص۱۱) پس رحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وسیع رحم کا مالک جو ہر اک پر حاوی ہے اور یہ رحم وہی ہو سکتا ہے جو بلا مبادلہ اور بغیر کسی استحقاق کے ہو کیونکہ ہر شخص حق کے طور پر رحم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

[۲] سورۃ براءۃ کے ابتداء میں بسم اللہ کے نہ رکھے جانے کی وجہ۔

[۳] الرحیم

(اَلرَّحِیْم) بھی رحم سے نکلا ہے اور فعیل کے وزن پر ہے جس کے معنوں میں تکرار اور استحقاق کے مطابق سلوک کا مفہوم پایا جاتا ہے (بحر محیط ص۱۱) پس اس کے معنی ہوئے جو رحم کے حقدار کو اس کے کام کی اچھی جزاء دیتا ہے اور بار بار اس پر رحم نازل کرتا جاتا ہے۔

علم صرف کے زبردست امام ابو علی فارسی کہتے ہیں۔ اَلرَّحْمٰنُ اِسْمٌ عَامٌّ فِیْ جَمِیْعِ اَنْوَاعِ الرَّحْمَۃِ یَخْتَصُّ بِہٖ اللّٰہُ تَعَالٰی وَالرَّحِیْمُ اِنَّمَا هُوَ فِیْ جِهَۃِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ قَالَ تَعَالٰی کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (فتح البیان ص۲۵) یعنی الرحمٰن اسم عام ہے اور ہر قسم کی رحمتوں پر مشتمل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے اور الرحیم مومنوں کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یعنی الرحیم کی رحمت نیکوکاروں سے مخصوص ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت قرآن کریم کی آیت وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ہے (احزاب ع ۶)

[۴] تمام سورتوں سے پہلے بسم اللہ [illegible] لکھی گئی ہے۔

ابن مسعودؓ اور ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرَّحْمٰنُ رَحْمٰنُ الدُّنْیَا۔ وَالرَّحِیْمُ۔ رَحِیْمُ الْاٰخِرَۃِ (محیط ص۱۱) رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ رحمٰن دنیا کی رحمتوں پر نظر رکھتے ہوئے ہے اور الرحیم کا نام آخرت کی رحمتوں پر نظر کرتے ہوئے ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ رحمٰن کے معنے بلا مبادلہ اور بغیر استحقاق رحم کے ہیں کیونکہ اس قسم کا رحم زیادہ تر اس دنیا میں جاری ہے اور رحیم کے معنی نیک کاموں کے اعلیٰ بدلہ کے ہیں کیونکہ آخرت مقام جزا ہے۔

تفسیر۔ قرآن کریم کی سب سورتیں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع ہوتی ہیں۔ سوائے سورۃ بَرَاءۃ کے مگر اس کے بارہ میں زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ وہ الگ سورۃ نہیں بلکہ سورۃ انفال کا تتمہ ہے اور اس لئے اس میں الگ بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ ابو داؤد میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَعْرِفُ فَصْلَ السُّوْرَۃِ حَتّٰی یَنْزِلُ عَلَیْہِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب من جھر ببسم اللّٰہ) یعنی جب ایک سورۃ کے بعد دوسری سورۃ نازل ہوتی تھی تو پہلے بسم اللہ نازل ہوا کرتی تھی اور بسم اللہ کے بغیر رسول کریم صلعم کسی وحی کو دوسری سورۃ قرار نہیں دیا کرتے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں بھی یہ روایت بیان کی ہے (ابن کثیر) اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ہر نئی سورۃ سے پہلے بسم اللہ نازل ہوتی تھی اور پہلی سورۃ کا اختتام ہی تب سمجھا جاتا تھا جب بسم اللہ کے نزول سے دوسری سورۃ کے ابتداء کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ پس جبکہ بَرَاءۃ سے پہلے بسم اللہ نازل نہیں ہوئی یا یوں کہو کہ انفال کے بعد بسم اللہ نازل ہو کر بَرَاءۃ کی آیات نازل نہیں ہوئیں تو یقیناً وہ الگ سورۃ نہیں ہے بلکہ انفال کا حصہ ہی ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تمام سورتوں سے پہلے جو بسم اللہ درج ہے وہ وحی الٰہی ہے اور قرآن کریم کا حصہ ہے زائد نہیں۔

بسم اللہ کے متعلق بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر سورۃ کا حصہ بسم اللہ نہیں بلکہ صرف سورۃ فاتحہ کا حصہ بسم اللہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسی سورۃ کا حصہ بھی بسم اللہ نہیں ہے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اول تو مذکورہ بالا حدیث ہی اس خیال کو رد کرتی ہے دوسرے بہت سی اور احادیث ہیں جن میں بسم اللہ کو رسول کریم صلعم نے سورتوں کا جزو قرار دیا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ کا حصہ ہونے کے متعلق دار قطنی نے مرفوعاً ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَرَأْتُمُ الْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاقْرَؤُا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّھَا اُمُّ الْقُرْاٰنِ وَاُمُّ الْکِتَابِ وَالسَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِحْدٰی اٰیٰتِھَا (دارقطنی جلد اول باب وجوب قراءۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلوٰۃ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم الحمد للہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرو کیونکہ سورۃ فاتحہ ام القرآن ہے اور ام الکتاب ہے اور سبع مثانی ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ میں بھی یہ روایت نقل کی ہے (مرفوع بھی اور موقوف بھی) (فتح البیان جلد اول)

بسم اللہ کا سورۃ فاتحہ کا حصہ ہونے کا ثبوت احادیث سے

اس حدیث میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ دوسری سورتوں کا بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم حصہ ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلعم نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۃ فاتحہ کا حصہ ہے بلکہ اس کے حصہ ہونے کی دلیل دی ہے اور وہ یہ کہ چونکہ یہ ام الکتاب اور ام القرآن ہے اس لئے بسم اللہ اس کے ساتھ ضرور پڑھنی چاہیئے اور یہ دلیل اسی صورت میں ٹھیک ہوتی ہے جب یہ آیت باقی سورتوں کا بھی حصہ ہو اور دلیل بالاولیٰ کے طور پر کہا گیا ہو کہ جب باقی سورتوں کا بسم اللہ الرحمن الرحیم حصہ ہے۔ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ سورۃ فاتحہ جو ام الکتاب اور ام القرآن ہے اس کا حصہ بھی ضرور ہوگی پس اس کی تلاوت سے پہلے اس آیت کو ضرور پڑھا کرو۔

بسم اللہ کے سورتوں کے ایک حصہ ہونے کے متعلق مزید ثبوت احادیث سے۔

اس استدلال کے علاوہ اور دلائل بھی اس بارہ میں ہیں مثلاً مسلم کی روایت ہے عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انزلت علیّ سورۃ آنفا فقرأ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم انا اعطینٰک الکوثر (مسلم باب حجۃ من قال البسملۃ اٰیۃ من اول کل سورۃ) یعنی انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ایک دفعہ فرمایا کہ مجھ پر ابھی ایک سورۃ اتری ہے جو یہ ہے بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم انّا اعطینٰک الکوثر۔ پس آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو سورۃ کوثر کا حصہ قرار دیا ہے بعض اور سورتوں کے متعلق بھی ایسی روایات ہیں۔

اس روایت پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور انسؓ انصاری ہیں جو ہجرت کے وقت آٹھ نو سال کے بچے تھے۔ حدیث کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آپ نے یہ بات سورۃ کے نازل ہوتے ہی فرمائی تھی پھر انسؓ نے اس کو کیونکر سن لیا۔ اگر دوسرے دلائل اس قول کی تائید میں نہ ہوتے تو یہ اعتراض یقیناً اس حدیث کو ضعیف بنا دیتا لیکن دوسرے دلائل کی موجودگی میں اس اعتراض کو زیادہ وقعت حاصل نہیں کیونکہ صحابہ بعض دفعہ دوسرے صحابہ سے سن کر بھی روایات بیان کر دیتے تھے اور یہ امر مسلّم ہے کہ جب کوئی روایت رسول کریم صلعم کی طرف کوئی صحابی منسوب کرے تو وہ بہر حال درست ہے کیونکہ کسی صحابی پر جھوٹ کا الزام ثابت نہیں ہوتا۔ اگر انسؓ نے رسول کریم صلعم کی طرف یہ قول منسوب فرمایا ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے کسی مہاجر صحابی سے یہ روایت سنی ہے اور جب صحابی تک روایت پہنچ گئی تو اس کے سچا ہونے میں شبہ نہ رہا۔

بسم اللہ تمام سورتوں کا حصہ ہے۔

بسم اللہ کے قرآن کے ایک حصہ ہونے کے متعلق احناف کا خیال

احناف کے متعلق جو بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بسم اللہ کو گویا قرآن کریم کا حصہ نہیں سمجھتے یہ غلط ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ آیت مستقل آیت ہے اور سورۃ کا حصہ نہیں۔ امام ابوبکر رازی جو حنفیوں کے آئمہ سے ہیں اپنی کتاب احکام القرآن جزء اول میں لکھتے ہیں۔ وَلَمَّا ثَبَتَ اَنَّھَا لَیْسَتْ مِنْ اَوَائِلِ السُّوَرِ وَاِنْ

كَانَتْ آيَةً فِي مَوْضِعِهَا عَلَى وَجْهِ الْفَصْلِ بَيْنَ السُّوَرَتَيْنِ أُمِرْنَا بِالْابْتِدَاءِ بِهَا تَبَرُّكًا۔ ترجمہ۔ اس وجہ سے کہ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ آیت کسی سورۃ کا حصہ نہیں گو دو سورتوں کا فاصلہ بتانے کے لئے ایک مستقل آیت کے طور پر اتاری گئی ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ نماز شروع کرنے کا حکم بطور تبرک کے دیا گیا ہے۔ پس یہ محض ناواقفوں کا خیال ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو احناف قرآن کا حصہ نہیں قرار دیتے بیشک وہ اسے کسی سورۃ کا حصہ نہیں قرار دیتے لیکن قرآن کریم کا حصہ ضرور قرار دیتے ہیں۔ گو میرے نزدیک ان کا یہ عقیدہ بھی درست نہیں اور حق یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورۃ کا حصہ ہے اور جیسا کہ آگے بیان ہوگا ہر سورۃ کے پہلے اس کے رکھنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

ہرسورۃ سے پہلے بسم اللہ کے رکھے جانے کی پانچ وجوہات۔

بسم اللہ کی فضیلت

بسم اللہ کی فضیلت پر رسول کریم صلعم نے خاص زور دیا ہے آپؐ فرماتے ہیں كُلُّ امْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ (اربعین حافظ عبدالقادر عن ابی ھریرۃ بحوالہ الدرالمنثور) یعنی جس بڑے کام کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلعم نے یہ سنت قائم کی ہے کہ مسلمان اپنے سب کاموں کو بسم اللہ سے شروع کیا کریں۔ چنانچہ ایک حدیث ہے أَغْلِقْ بَابَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَإِنَّ الشَّيْطٰنَ لَا يَفْتَحُ بَابًا مُغْلَقًا وَأَطْفِئْ مِصْبَاحَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَخَمِّرْ إِنَاءَكَ وَلَوْ بِعُوْدٍ تَعْرِضُهُ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَأَوْكِ سِقَاءَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (مسند احمد بن حنبل جلد ثالث صفحہ ۳۱۹) یعنی اپنا دروازہ بند کرتے ہوئے بھی بسم اللہ کہہ لیا کرو اور چراغ بجھاتے ہوئے بھی۔ اور برتن کو ڈھانکتے ہوئے بھی۔ اور پانی کی مشک کا منہ باندھتے ہوئے بھی۔ اسی طرح بیوی کے پاس جاتے ہوئے۔ وضو کرتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے۔ پاخانے میں داخل ہونے سے پہلے۔ لباس پہنتے ہوئے بسم اللہ کا کہنا

ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم

دوسری احادیث سے ثابت ہے قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے ایک خط کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے بھی اپنا خط بسم اللہ سے شروع کیا تھا۔ چنانچہ آتا ہے إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل ع ۲) یعنی یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے حضرت نوحؑ کا ذکر کرکے بھی قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے کشتی میں چڑھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (ھود ع ۴)۔

ہرسورۃ کے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ اس لئے رکھی گئی ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ایک خزانہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ ع ۳) سوائے ان لوگوں کے جن کو خدا تعالیٰ اس امر کے لئے چن لے۔ دوسرے لوگ قرآنی اسرار کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح فرماتا ہے يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرہ ع ۳) قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ بعض کے لئے ہدایت کا موجب اور بعض کے لئے گمراہی کا موجب بنا دیتا ہے گویا لفظ اور عبارت تو سب کے لئے ایک ہے مگر اثر جدا جدا رنگ کا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اچھے اثر کو حاصل کرنے اور برے سے بچنے کے لئے اور اس کے اسرار کو سمجھنے کے لئے کیا ذریعہ اختیار کرنا چاہیئے سو اس کا جواب إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (نحل ع ۱۳) کے حکم سے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورۃ کے پہلے رکھ کر دیا گیا ہے یعنی قرآن کریم پڑھنے سے پہلے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے شیطان کے حملے سے بچنے کے لئے دعا کر لیا کرو۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کا واسطہ دیکر اسکی مدد حاصل کر لیا کرو اس طرح گمراہی سے بچ جاؤ گے اور ہدایت حاصل ہوگی۔

دوسری وجہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ہر سورۃ کے پہلے رکھنے کی یہ ہے کہ بائبل میں لکھا تھا کہ آخری زمانہ میں جو موسیٰ کا ایک مثیل آنے والا ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہوگا

کہ" جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لونگا" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۹) اس پیشگوئی کے مطابق مثیلِ موسیٰ کے لئے مقدر تھا کہ جب وہ خدا تعالیٰ کی باتیں کرے اس سے پہلے کہہ لے کہ میں یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے نام پر کہہ رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں۔ پس ضروری تھا کہ اس پیشگوئی کے مطابق ہر سورۃ سے پہلے بسم اللہ رکھی جاتی۔ تا ایک طرف تو موسیٰ کی پیشگوئی پوری ہو اور دوسری طرف یہود اور نصاریٰ کو تنبیہ ہوتی رہے کہ اگر وہ اس کلام کو نہ سنیں گے تو موسیٰ علیہ السلام کے الہام کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سزا کے مورد بنیں گے۔

تیسری وجہ اس آیت کو ہر سورۃ کے شروع میں رکھنے کی یہ ہے کہ بائبل میں لکھا تھا " وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاوے" (استثناء باب ۱۸ آیت ۲۰) اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا نام لے کر کوئی جھوٹی بات کہے گا اسے اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے گا۔ پس اس حکم کے مطابق قرآن کریم کی ہر سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ رکھی گئی تاکہ یہود و نصاریٰ پر خصوصاً اور باقی دنیا پر عموماً حجت ہو اور اس حکم کی موجودگی میں رسول کریم صلعم کی کامیابی اور ترقی کو دیکھ کر ہر حق کا متلاشی یہ سمجھ لے کہ آپ نے جو کچھ کہا خدا تعالیٰ کی طرف سے کہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جب خدا تعالیٰ کا نام لے کر آپ نے اس کلام کو پیش کیا تھا کیوں آپ ہلاک نہ ہوتے۔ پس بسم اللہ یہود پر خصوصاً حجت ہے ہر سورۃ کے پہلے بسم اللہ رکھ کر گویا ایک سو چودہ دفعہ یہود کو ملزم بنایا گیا ہے اور محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت کی ایک سو چودہ دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ اگر صرف قرآن کریم کے شروع میں یہ آیت ہوتی تو یہ بات حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

چوتھی وجہ اس آیت کو ہر سورۃ کے شروع میں رکھنے کی یہ ہے کہ قرآن کریم کو پڑھنے والا تین حال سے خالی نہیں یا تو وہ تہی دست اور بے سرمایہ ہوگا یا گناہوں کے ارتکاب سے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو بھڑکا چکا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو کھینچنے کا کوئی طبعی ذریعہ اس کے پاس نہ ہوگا یا پھر وہ دین کی راہ میں قربانی کرنے والا ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان تینوں قسم کے لوگوں کی قلبی کیفیت الگ الگ ہوگی پہلی قسم کا انسان حیران دوسری قسم کا مایوس اور تیسری قسم کا مغرور ہو سکتا ہے۔ پہلی قسم کا انسان اس حیرانی میں مبتلا ہوگا کہ میں کہاں سے صداقت تلاش کروں۔ دوسری قسم کا انسان اس غم میں گھلا جا رہا ہوگا کہ میں کس مُنہ سے مانگوں۔ اور تیسری قسم کا اس اثر کے نیچے ہوگا کہ جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا مجھے حاصل ہو گیا۔ دل کی ان تینوں کیفیتوں کے ماتحت انسان نفع حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ پس ہر سورۃ سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم رکھا گیا۔ تا جو تہی دست ہے اسے راستہ بتایا جائے کہ تہی دستوں کی مدد کرنے والا ایک خدا موجود ہے جو بغیر استحقاق کے فضل کرتا ہے اور جو نافرمانی کر کے اپنا حق کھو چکا ہے اسے توجہ دلائی جائے کہ مایوس نہ ہو جس خدا نے یہ سورۃ اُتاری ہے وہ گناہوں کو بخشنے پر بھی آمادہ رہتا ہے اور جو قربانی کی وجہ سے مغرور ہو رہا ہو اسے توجہ دلائی جائے کہ خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے خزانے غیر محدود ہیں پس کسی ایک جگہ پر قدم نہ روک کہ ابھی غیر متناہی ترقیات باقی ہیں۔ ظاہر ہے کہ دل کی اس قسم کی اصلاح کے بعد قرآنی مطالب جس طرح کھل سکتے ہیں اس کے بغیر نہیں کھل سکتے۔ پس ہر سورۃ سے پہلے اس آیت کو رکھ کر قرآنی مطالب کے اظہار کا ایک زبردست ذریعہ مہیا کیا گیا ہے۔

پانچویں وجہ اس آیت کو ہر سورۃ سے پہلے رکھنے کی یہ ہے کہ یہ ہر سورۃ کے لئے کنجی کا کام دیتی ہے تمام دینی اور رُوحانی مسائل رحمٰن اور رحیم دو صفات کے گرد چکر کھاتے ہیں جو کہ غلط فہمی دو طرح دُور ہوتی ہے کبھی تفصیل سے اور کبھی اجمال سے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر سورۃ کے

تسمیہ اللہ سے یہود اور نصاریٰ پر حجت

تسمیہ اللہ میں قرآن مجید کے پڑھنے والوں کی راہنمائی۔

تسمیہ اللہ سے آنحضرتؐ کی صداقت کا ثبوت

شروع میں بسم اللہ رکھ دی تاکہ سورۃ کے مطالب میں جو اشتباہ پیدا ہو اسے پڑھنے والا بسم اللہ سے دُور کرلے یعنی جو مطلب وہ سمجھتا ہے اگر رحمٰن اور رحیم کے مطابق ہو تو اسے درست سمجھے اور اگر اس کے خلاف ہو تو اسے غلط قرار دے۔ اس طرح بسم اللہ کی شارح سورۃ ہو جاتی ہے اور سورۃ کی مفسر بسم اللہ۔ اور دونوں کی مدد سے صحیح مفہوم پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ کا ذکر پہلی کتب میں

بعض معترضین کہتے ہیں کہ بسم اللہ جس پر تم کو اس قدر ناز ہے پہلی کتب میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً زردشتی کتب میں بھی لکھا ہے کہ بنام یزدان بخشائش گر داد بعد کی فارسی میں اس کا اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ بنام خداوند بخشایندہ بخشائش گر (تفسیر ریورنڈ وھیری) یا یہ کہ یہود میں بھی بسم اللہ کا رواج تھا۔ ان سے سیکھ کر عربوں میں رائج ہوا اور پہلے پہل طائف کے امیر نے اس کا رواج دیا (راڈول ترجمہ قرآن) راڈول کا جواب تو یہ ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ عربوں میں اس صورت میں بسم اللہ کا رواج تھا عرب تو الرحمٰن کے کثرت استعمال کو پسند ہی نہ کرتے تھے بہرحال اس کا کوئی تاریخی ثبوت چاہیئے کہ ان میں بسم اللہ اس شکل میں رائج تھی مگر ایسا ثبوت ہرگز موجود نہیں۔ باقی رہا کہ یہود میں بھی اس کا رواج تھا اگر اس سے یہ مراد ہے کہ زمانہ نبوی یا قریب زمانہ میں یہود کی قوم اس عبارت کو استعمال کیا کرتی تھی یا ان کی تاریخ میں اس کا ثبوت ملتا ہے تو یہ بالکل خلاف واقعہ ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ خود قرآن کریم میں آیا لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس آیت کو اپنے خط میں استعمال کیا تو یہ اول درجہ کی بددیانتی ہے کہ قرآن کریم کے حوالہ کو دوسروں کی طرف منسوب کر کے قرآن کریم پر اعتراض کا ذریعہ بنایا جائے۔ جب خود قرآن کریم حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے کہ انہوں نے ملکہ سباء کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ عبارت بھی تھی کہ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (سورۃ نمل ع ۲) تو پھر یہ کہنا کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے اس آیت کا مضمون دُنیا میں رائج نہ تھا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اسلام کا یہ دعویٰ نہیں کہ اس آیت کا مضمون نیا ہے۔ اللہ۔ رحمٰن۔ رحیم یہ سب ہی لفظ پہلے موجود تھے اور استعمال ہوتے تھے۔ اسلام کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس کا وہ استعمال جو قرآن کریم میں ہوا ہے اس سے پہلے موجود نہیں۔ اگر کوئی دشمن اسلام اس کا ثبوت پیش کرے تو بیشک اس کی بات قابل توجہ ہو سکتی ہے مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ قرآن کریم سے پہلے کوئی بھی ایسی کتاب نہیں جس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہو کہ اس کا ہر ہر لفظ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پس کوئی آسمانی کتاب نہیں جس کے ہر ٹکڑے سے پہلے یہ عبارت درج کی جا سکے سوائے قرآن کریم کے۔ باقی رہا تبرک کے طور پر اللہ اور اس کی صفات کا ذکر اپنے خطوں یا مضمونوں سے پہلے کرنا سو یہ عام بات ہے۔ اس کا نہ اسلام کو انکار ہے نہ مسلمانوں کو۔ اس امر میں اگر دوسرے لوگ مسلمانوں کے شریک ہوں تو ہزار دفعہ ہوں۔

بسم اللہ کے متعلق جیسا کہ معترض ... وہ پہلی کتب سے نقل کی گئی ہے۔

بسم اللہ کے پہلی کتب سے نقل کئے جانے کے اعتراضات کا جواب

باقی رہا ریورنڈ وھیری کا اعتراض سو اس کا بھی ایک جواب اوپر آچکا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دونوں عبارتوں کے معنوں میں اس قدر فرق ہے کہ وہی ان کو ہم معنی قرار دے سکتا ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ بخشائش گر اور داد کا مفہوم رحمٰن اور رحیم کے مفہوم کا بیسواں حصہ بھی تو نہیں۔ (جیسا کہ اس سورۃ کے متعلق تفسیری نوٹوں سے معلوم ہو جائے گا) لیکن جس حد تک اس میں خوبی ہے اس کا ہمیں انکار نہیں۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ پہلی سب قوموں میں نبی گذرے ہیں اور آیت وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع ۳) اس پر شاہد ہے پھر اگر کوئی اچھا فقرہ زردشتیوں کی کتب میں موجود ہو۔ تو مسلمانوں کو کیوں بُرا لگنے لگا۔ بُرا تو ریورنڈ وھیری یا ان کے ہم مذہب لوگوں کو لگے گا۔ جو خدا تعالیٰ کے فضل کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور بنو اسرائیل کی قوم سے باہر نبوت اور الہام کا نشان نہیں کہیں نہیں ملتا۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے

زردشت خدا کا پیغامبر ہے اور ہمارے لئے واجب صد احترام۔ اس کے کلام کا منبع قرآن کا منبع ہے پس ان دونوں میں اشتراک یا موافقت کونسا قابلِ تعجب امر ہے۔

پہلے حل لغات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ کے لفظ کے بارہ میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسم مشتق ہے مگر جیسا کہ وہاں پر ثابت کیا جا چکا ہے یہ سب خیال غلط ہیں اور ائمہ نحو ان کو ردّ کرتے ہیں چنانچہ سیبویہ اور خلیل دونوں کا خیال ہے کہ اللہ عَلم ہے اور کسی دوسرے لفظ سے مشتق بھی نہیں ہے (تفسیر کبیر جلد اول ص۱۵۱ المطبعة المصریة اور ص۵۸ طبع قدیم) اس کے دلائل مختلف علماء نے یہ دیئے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے مستعمل نہیں ہے حتیٰ کہ عرب کے مشرک بھی اور کسی معبود کے لئے یہ لفظ نہیں بولتے تھے۔ اگر ال اور اِلٰہ یا ال اور لٰہ سے یہ لفظ بنا ہوتا تو جس طرح یہ لفظ اوروں کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اللہ کا لفظ بھی بولا جاتا مگر عرب ایسا ہرگز نہ کرتے تھے (۲) صفات الٰہیہ ہمیشہ اللہ کے لئے بطور صفت کے استعمال ہوتی ہیں لیکن اللہ کا لفظ اور کسی اسم کے لئے بطور صفت استعمال نہیں کیا جاتا اور یہی اصل علامت عَلم کی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ سورۃ ابراہیم میں ہے اَلْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰہِ (ابراہیم ع۱) اس میں اللہ بطور صفت استعمال ہوا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ اس میں صفت کے طور پر نہیں بلکہ عطف بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس موقعہ پر عَلم کا استعمال جائز ہے جیسے کہتے ہیں ھٰذِہِ الدَّارُ مِنْکَ لِلْعَالِمِ الْفَاضِلِ زَیْدٍ۔ ایسے موقعہ پر عَلم کا استعمال اشتباہ کے دُور کرنے کے لئے ہوتا ہے اور آیت کا یہ مطلب ہے کہ عزیز اور حمید سے مراد ہماری اللہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ھُوَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام ع۱) سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عَلم نہیں بلکہ صفاتی نام ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی نام اپنی صفات کے ساتھ مشہور ہو جاتا ہے تو وہ بھی صفاتی رنگ میں استعمال ہونے لگتا ہے جیسے حاتم رستم کہ ہیں تو خاص اشخاص کے نام لیکن ایک سخاوت اور دوسرا بہادری کے لئے مشہور ہو گیا ہے اور اب حاتم کو سخی کی جگہ اور رستم کو بہادر کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں شخص رستم ہے فلاں حاتم ہے۔ اسی طرح اللہ کا لفظ چونکہ اپنی صفات کے ساتھ ایک کامل ہستی پر دلالت کرنے لگ گیا اس لئے یوں کہنا جائز ہو گیا کہ آسمان میں وہی اللہ ہے یعنی تمام صفات میں کامل ذات جس کا نام اللہ ہے ایک ہی ہے اور دوسرا کوئی اس کے نام میں شریک نہیں اور نہ کام میں۔

لفظ اللہ کے علم ہونے کے متعلق خلیل اور سیبویہ کا خیال۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ فعّال کے وزن پر ہے پس اس پر تنوین آنی چاہیئے لیکن استعمال میں تنوین نہیں آتی پس معلوم ہوا کہ ال اس کے اصلی حروف سے نہیں بلکہ ال تعریف کا ہے پس یہ لفظ مرکب ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر قاعدہ میں استثناء ہوتے ہیں۔ اللہ کے لفظ پر تنوین کا نہ آنا بھی ایک استثناء کی صورت ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ال پر اگر ندا کا حرف آئے تو اس کے بعد ایّھا کا لفظ بڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر النّاس کو بلانا ہو تو کہیں گے یا ایّھا النّاس لیکن یا ایّھا اللّٰہ نہیں کہا جاتا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اللہ کا ال اصلی ہے ال تعریف کا نہیں ہے۔

اللہ کا ال اصلی ہے

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ چونکہ اللہ کے لفظ کا ہمزہ وصل ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصلی ہمزہ نہیں بلکہ زائد ہے اسی طرح جب اللہ پر لام آتا ہے یعنی لِلّٰہ کہتے ہیں تو الف گر جاتا ہے یہ بھی ثبوت ہے کہ یہ اصلی ہمزہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمزہ کا گر جانا زائد ہمزہ کی علامت نہیں اسم اور ابن کے ہمزے زائد نہیں ہیں بلکہ دوسرے حرف کے قائم مقام ہیں اور یہ بھی گر جاتے ہیں۔ چنانچہ بسم اللہ میں اسم کا ہمزہ گر گیا ہے حالانکہ وہ ہمزہ زائد نہیں بلکہ تبدیل شدہ ہے پس معلوم ہوا کہ ہمزہ کا وصلی ہونا یا گر جانا اس کے زائد ہونے کا ثبوت نہیں۔

لفظ اللہ کے استعمال کے متعلق بعض شبہات کا رد۔

غرض اللہ کے لفظ کا استعمال اسلام اور اسلام سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ

ہر (قسم کی) تعریف اللہ (ہی) کا حق ہے (جو)* تمام جہانوں کا رب (ہے) ۳؎

پہلے دونوں ہی زمانہ میں اس کے عَلَم اور غیر مشتق ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جو دلائل اسکی بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کے مشتق ہونے کے دیئے گئے ہیں وہ درست نہیں ہیں بلکہ دوسری مثالوں سے ان کی غلطی ثابت ہے۔

بسم اللہ میں اسم کی زیادتی

ایک اور سوال اس جگہ پیدا ہوتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ اللہ کی مدد مانگتے ہوئے قرآن کریم پڑھتا ہوں اور کہا یہ گیا ہے کہ اللہ کے نام کی مدد سے پڑھتا ہوں۔ نام کا لفظ کیوں زیادہ کیا گیا ہے اس کے مفصلہ ذیل جواب ہیں۔

بسم اللہ میں اسم کی زیادتی۔

(۱) باء استعانت کے علاوہ قسم کے لئے بھی آتی ہے اگر خالی باللہ ہوتا تو شبہ ہو سکتا تھا کہ شائد قسم کھائی گئی ہے پس اس شبہ کے ازالہ کے لئے اسم کا لفظ بڑھایا گیا (۲) اللہ تعالیٰ کی ذات مخفی ہے اور صفات ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے اسم کا لفظ بڑھایا گیا۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ذکر سے مُراد بھی یہی ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ سے اسکی رحمانیت اور رحیمیت کا واسطہ دے کر مدد طلب کرتا ہوں (۳) یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں بھی برکت ہے اور ان کی طرف انسان کو توجہ کرنی چاہیئے (۴) قرآن کریم ایک بند خزانہ ہے اور جب کوئی کسی ایسے مکان میں جس میں داخلہ بلا اجازت ممنوع ہو داخل ہوتا ہے تو اس کے محافظوں کو یا مکین کو مالک کا حُکم یا اجازت دکھاتا ہے یا اس کا ذکر کرتا ہے چنانچہ پولیس جب کسی کے گھر میں داخل ہوتی ہے تو کہتی ہے کہ حکومت کے نام پر ہم داخل ہو رہے یا فلاں مال پر قبضہ کرتے ہیں پس اس جگہ نام کا لفظ بڑھا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو شخص بسم اللہ پڑھ کر قرآن کریم پڑھتا ہے وہ گویا قرآن کریم کی خدمت پر مامور فرشتوں سے کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے خود اس سورۃ کے پڑھنے کا حکم دیا ہے پس میرے لئے اس کے مطالب کے دروازے کھول دو اور وہ اختصاراً اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے کہ اللہ رحمٰن رحیم کے نام پر اس خزانہ کے کھولے جانے کی مَیں درخواست کرتا ہوں ظاہر ہے کہ جو اس طرح خدا تعالیٰ کے اذن سے قرآن کریم کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس کے علوم سے حصہ پائے گا لیکن جو اس کے اذن اور اس کے نام سے توجہ نہیں کرے گا بلکہ شرارت اور بغض سے توجہ کرے گا اس کے لئے اس کے خزانے نہیں کھولے جائینگے۔

پانچویں اور چھٹی حکمت اسکی ان دو پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ اور آیت ۲۰ میں مذکور ہیں اور جن کا ذکر مَیں اس سوال کی بحث میں کر آیا ہوں کہ ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ کیوں دُہرائی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ ان پیشگوئیوں میں لکھا تھا کہ وہ خدا کا نام لیکر کلام الٰہی سنائے گا پس ان پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے ضروری تھا کہ اسم کا لفظ اس جگہ بڑھایا جاتا۔

۳؎ حل لغات۔ اَلْحَمْدُ۔ حمد کے معنی تعریف کے ہیں۔ عربی میں تعریف کے لئے کئی الفاظ آتے ہیں۔ حمد مدح شکر ثنا۔ اللہ تعالیٰ نے حمد کا لفظ چنا ہے جو بلاوجہ نہیں شکر کے معنی احسان کے اقرار اور اس پر قدردانی کے اظہار کے ہوتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو صرف قدردانی کے معنی ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ حمد اس سے زیادہ مکمل لفظ ہے کیونکہ حمد صرف احسان کے اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ ہر حسین شے کے حُسن کے احساس اور اس پر اظہار پسندیدگی اور قدردانی کا نام بھی ہے پس یہ لفظ زیادہ وسیع ہے۔

الحمد

حمد۔ مدح۔ شکر اور ثناء میں فرق۔

دوسرا لفظ ثناء ہے۔ ثناء کے اصل معنے دُہرانے کے ہوتے ہیں اور تعریف کو ثنا اس لئے کہتے ہیں کہ ذکر خیر لوگوں میں پھیل جاتا ہے اور لوگ وقتاً فوقتاً اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں (مفردات) یہ ظاہر ہے کہ ثناء میں ذاتی تجربہ سے زیادہ

* نوٹ۔ آیت اول اور آیت دوم میں صفت کے ترجمہ میں فرق ہے پہلی آیت میں 'جو' اور 'ہے' کو ظاہر کیا گیا ہے لیکن دوسری آیت میں دونوں لفظوں کو خطوط میں رکھا گیا ہے اسکی وجہ ترجمہ کی دقت ہے۔ دوسری آیت میں چونکہ فقرہ مکمل تھا۔ وہاں 'جو' اور 'ہے' کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پہلی آیت میں فقرہ میں ہے کا لفظ ظاہر نہ تھا۔ اس لئے وہاں مقدر کو ظاہر کرنا پڑا۔ آئندہ بھی جہاں جہاں یہ فرق ہوگا ترجمہ میں فرق کیا جائے گا۔

لوگوں میں ذکر خیر کے پھیلنے کی طرف اشارہ ہے اور گو یہ ایک خوبی ہے لیکن بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو ذاتی تعلق ہوتا ہے اس پر یہ لفظ اس قدر روشنی نہیں ڈالتا جس قدر کہ مدح کا لفظ ڈالتا ہے کیونکہ یہ لفظ ذاتی تشکر اور احسان مندی پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

اب رہا مدح سو مدح کا لفظ جھوٹی اور سچی دونو قسم کی تعریف کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن حمد صرف سچی تعریف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے اُحْثُوا فِی وُجُوہِ الْمَدَّاحِیْنَ التُّرَابَ (مسند احمد بن حنبل جلد ۶) جھوٹی تعریف کرنے والوں کے مونہوں پر مٹی ڈالو۔ اسی طرح مدح ان اعمال کے متعلق بھی ہو سکتی ہے جو بغیر اختیار کے ہوں لیکن حمد انہی اعمال کے متعلق ہوتی ہے جو اختیاراً اور ارادہ سے کئے جائیں (مفردات) پس حمد کا لفظ مدح سے بہرحال افضل ہے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق زیادہ مناسب۔ یہ جو میں نے کہا تھا کہ ثنا ایسی تعریف پر دلالت کرتا ہے جو لوگوں میں پھیل جائے اور یہ بھی ایک خوبی ہے۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ حمد کے لفظ سے یہ خوبی تو پیدا نہ ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ الحمد کے الفاظ سے یہ خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے کیونکہ ال استغراق کے معنی دیتا ہے یعنی تمام افراد کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنے ہوئے سب قسم کی تعریف۔ اور ہر شخص کی تعریف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اور اسی کا حق ہے ان معنوں میں ذکر خیر کی کثیر اشاعت آجاتی ہے بلکہ ثنا سے بھی زیادہ اس عبارت سے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اشاعت کا مفہوم نکلتا ہے۔

رَبّ رب کے معنی اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ کے ہیں (مفردات) یعنی کسی چیز کو پیدا کر کے تدریجی طور پر کمال تک پہنچانا۔ خالی تربیت کے معنی بھی یہ دیتا ہے۔ خصوصاً جبکہ انسان کی طرف منسوب ہو مثلاً قرآن کریم میں ماں باپ کی نسبت آتا ہے کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا (بنی اسرائیل ع ۳) یا اللہ میرے ماں باپ پر رحم فرما۔ جس طرح انہوں نے اس وقت میری تربیت کی جبکہ میں چھوٹا تھا۔ رب کے معنی مالک کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح سردار اور مطاع کے بھی (اقرب) جیسے قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کا قول ہے اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ۔ اور مصلح کے بھی معنی ہیں (اقرب) ان معنوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے لیکن بغیر اضافت کے مطلق رب کا لفظ کبھی غیر اللہ کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ربّ الدّار۔ گھر کا مالک یا رَبُّ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کا مالک تو انسان کو کہہ سکتے ہیں مگر جب خالی یہ کہیں کہ ربّ نے یوں کہا ہے یا کیا ہے تو اس کے معنے صرف اللہ تعالیٰ کے ہونگے (مفردات) رب کے معنے مفسّرین نے خالق کے بھی کئے ہیں (بحر محیط)

العالمین۔ عَالَم کی جمع ہے اور مخلوق کی ہر صنف اور قسم عالم کہلاتی ہے (مفردات) اور عَالَمُوْنَ یا عَالَمِیْنَ کے سوا اس کی جمع عَلَالِم یا عَوَالِم بھی آتی ہے اور غیر ذوی العقول کی صفات میں سے وں یا یان سے صرف عالم یا یاسم دو لفظوں کی جمع بنتی ہے اور عالم مخلوق کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے خالق کا پتہ لگتا ہے (اقرب) بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عالم کی جمع عالمون یا عالمین تب بنائی جاتی ہے جبکہ ذوی العقول کا ذکر ہو مثلاً انسان فرشتے وغیرہ۔ مگر یہ قاعدہ لغت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کریم کے محاورہ کے بھی خلاف۔ لغت کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَہٗ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ۔ قَالَ رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَہُمَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (شعراء ع ۲) اس آیت میں عالمین میں انسانوں کے سوا آسمان زمین اور ان کے درمیان کی سب اشیاء اور مغرب اور مشرق اور

حاشیہ: رَبّ کے معنے — العالمین — رَبّ

الحمد للہ کے اظہار کے لئے جملہ فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ رکھنے کی وجہ۔

ان کے درمیان کی سب اشیاء کو عالمین میں شامل بتایا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ حٰمٓ سجدہ میں ہے قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (حٰمٓ سجدہ ع ۲) اس آیت میں بھی زمین اور پہاڑوں وغیرہ کو عالمین میں شامل کیا گیا ہے حضرت مسیح موعودؑ بھی تحریر فرماتے ہیں إِنَّ الْعَالَمِينَ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مَوْجُوْدٍ سِوَى اللّٰهِ.... سَوَاءٌ كَانَ مِنْ عَالَمِ الْأَرْوَاحِ أَوْ مِنْ عَالَمِ الْأَجْسَامِ..... أَوْ كَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْأَجْرَامِ

العالمین کی تشریح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۰ طبع مصر) یعنی عالم سے مراد جاندار اور غیر جاندار سب اشیاء ہیں۔ اسی طرح سورج چاند وغیرہ کی قسم کے اجرام فلکی۔ غرض سب جاندار یا غیر جاندار اس میں شامل ہیں۔

جو صرف ذوی العقول کے لئے اسے قرار دیتے ہیں وہ مَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (قلم ع ۲) کی آیت سے استدلال کرتے ہیں مگر یہ استدلال درست نہیں کیونکہ جب اس کا استعمال غیر ذوی العقول کے لئے قرآن کریم میں موجود ہے تو اس آیت کے متعلق صرف یہ کہا جائے گا کہ عام لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم میں یہی لفظ اس سے بھی خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (بقرہ ع ۶) اے یہود ہم نے تم کو سب جہانوں پر فضیلت دی ہے حالانکہ مراد صرف اپنے زمانہ کے لوگ ہیں نہ کہ ہر زمانہ کے لوگ کیونکہ خیر الامم مسلمانوں کو کہا گیا ہے پس خاص معنوں کا استعمال جبکہ عام معنوں میں یہ لفظ استعمال ہو چکا ہے اس کے معنوں کو محدود نہیں کرتا۔ اور حق یہی ہے کہ عالمین میں ہر قسم کی مخلوق شامل ہے۔ خواہ جاندار ہو یا غیر جاندار۔

تفسیر۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ میں اللہ کی حمد کرتا ہوں نہ یہ کہ ہم کرتے ہیں۔ بلکہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فرمایا ہے۔ اس طرح کئی معانی پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اول مصدر کے استعمال سے معروف اور مجہول دونوں معنی پیدا کر دیئے گئے ہیں یعنی یہ بھی کہ سب حمد جو مخلوق کر سکتی ہے یا کرتی ہے خدا تعالیٰ کو ہی پہنچتی ہے اور وہ سب قسم کی تعریفوں کا مستحق ہے۔ کوئی اچھی بات نہیں جو اس میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی بُری بات نہیں جس سے وہ پاک نہ ہو اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کی صحیح حمد کر سکتا ہے کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ بندے بندے کی تعریف کرتے ہیں لیکن بسا اوقات غلط ہوتی ہے بعض دفعہ جس قدر کسی میں خوبی ہوتی ہے۔ اس کا اظہار نہیں کر سکتے اور بعض دفعہ ایسی تعریف کرتے ہیں۔ جو موصوف میں پائی نہیں جاتی۔ پس اصل حمد وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو بلکہ دوسرے لوگ تو الگ رہے انسان خود اپنی نسبت رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا ہے اور اپنی طاقتوں کا غلط اندازہ لگا لیتا ہے۔ مگر جو بات خدا تعالیٰ بندہ کے متعلق فرماتا ہے نہ اس میں کوئی کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ اگر الحمد کی بجائے احمد یا نحمد کے الفاظ ہوتے تو یہ معنی پیدا نہ ہو سکتے تھے۔

نیز اگر حمد کا صیغہ فعل استعمال کیا جاتا یعنی یہ کہا جاتا کہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید انسان اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ انسان کی حمد محدود ہوتی ہے اور وہ صرف اپنے علم کے مطابق حمد کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ میں اس کے سوا غیر محدود اسباب حمد کے اور بھی پائے جاتے ہیں۔

غرض اَحْمَدُ یا نَحْمَدُ سے جو معنے پیدا ہو سکتے تھے وہ بھی الحمد میں پائے جاتے ہیں اور ان سے زائد بھی۔ اس لئے الحمد للہ کے الفاظ کا اس مختصر سورۃ میں رکھنا جو سب مطالب کی جامع ہے ضروری تھا۔ بیشک قرآن کریم میں حمد مخلوق کی طرف بھی منسوب ہوئی ہے جیسا کہ فرمایا وَنَحْنُ

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (بقرہ ع ۴) لیکن کہیں بھی احمد یا محمد
کے الفاظ مخلوق کی طرف منسوب نہیں ہوئے گو نسبحُ اور
نقدس کے الفاظ یا یُسَبِّحُ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں
اس میں اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خالص حمد کا مکمل
طور پر سمجھنا بندہ کی شان سے بالا ہے حدیثوں میں یہ الفاظ
آئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں الفاظ کے اور
معنے ہوتے ہیں اور بندہ کے کلام میں اور۔ بندہ جب اپنی طرف
سے ایک لفظ بولتا ہے تو اس کے معنے اتنے وسیع نہیں لئے
جاتے جتنے وسیع کہ اس وقت لئے جاتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ
کے کلام اور پھر کلام شریعت میں وہ الفاظ آئیں۔

لِلّٰہ کے الفاظ سے اس شبہ کو بھی دُور کیا ہے کہ حمد تو
انسانوں کی بھی کی جاتی ہے۔ پھر سب تعریف خدا تعالیٰ کی کس طرح
ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ لام ملکیت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے
پس لام کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد حقیقی
ہوتی ہے اور غیر اللہ کی طفیلی۔ کیونکہ انسان میں جو خوبیاں
پائی جاتی ہیں۔ ذاتی نہیں ہوتیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
عطا شدہ ہوتی ہیں۔ پس جو تعریف کسی انسان کی کی جاتی ہے
اس کا بھی اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔

آیت کے مطالب

اس آیت کے بعض مطالب ذیل میں لکھے جاتے ہیں

الحمد للہ کی آیت کے دس مطالب

(۱) اس جہان کا خالق سب نقصوں سے پاک اور
سب خوبیوں کا جامع ہے (۲) وہ تمام مخلوق کی کُنہ اور حقیقت سے واقف ہے
اور اس کے سوا کوئی شخص بھی کسی چیز کی کامل ماہیت سے واقف
نہیں۔ اس دعوٰی کا روشن ثبوت سائنس کی ترقی سے مل چکا
ہے۔ مختلف اشیاء کی تحقیق میں سینکڑوں علماء لگے ہوئے ہیں
لیکن اب تک ادنیٰ سے ادنیٰ شے کی کامل حقیقت سے بھی کوئی
آگاہ نہیں ہو سکا۔ اور ہر چیز کے متعلق تازہ انکشافات ہوتے
چلے جا رہے ہیں (۳) خدا تعالیٰ کامل حمد کا مالک تب ہی ہو
سکتا ہے کہ وہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہو۔ اگر رب العالمین نہ ہو تو وہ
کامل حمد کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جس طرح
اس کا جسمانی نظام سب کے فائدہ میں لگا ہوا ہے۔ اس کا رُوحانی
نظام بھی سب پر حاوی ہو۔ اور کوئی ملک اور کوئی قوم رُوحانی
ترقی کے سامانوں سے محروم نہ ہو پس اگر کوئی الہام کسی خاص
قوم سے مخصوص ہے۔ تو دوسری قوم کے لئے الگ الہام نازل
ہونا چاہیئے۔ اور جب دوسری قوموں کے لئے الگ الہام نازل
نہ ہو۔ تو ایسے وقت میں جو الہام نازل ہو وہ سب دُنیا کی ہدایت
کے لئے ہونا چاہیئے (پس جو مذاہب اس امر کے قائل ہیں کہ
الہام صرف انہی کی قوم کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ یا
یہ کہ نجات صرف انہی کی قوم یا مذہب کا حق ہے غلطی پر ہیں)

(۴) انسانوں کے اندر جس قدر کمالات ہیں وہ سب
خدا تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے جو نیکی بھی وہ کریں۔ اسکی
تعریف کا حقیقی مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے (۵) حمد کو ربوبیت
عالمین کے ساتھ وابستہ کر کے یہ بتایا ہے کہ حقیقی خوشی
انسان کو اسی وقت ہونی چاہیئے۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفت
ربّ العالمین ظاہر ہو۔ جو شخص اپنے فائدہ پر خوش ہوتا ہے
اور دُنیا کے نقصان کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔ وہ اسلام کی تعلیم
کو نہیں سمجھتا۔ حقیقی خوشی یہی ہے کہ سب دُنیا آرام میں ہو۔

(۶) یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے۔ اس
طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے ربوبیت کا
محل ہے یعنی ارتقاء کے قانون کے ماتحت ہے۔ یہ بتایا ہے کہ
دنیا میں کوئی چیز نہیں جسکی ابتداء اور انتہا یکساں ہو۔ بلکہ
اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ اور ادنیٰ حالت
سے ترقی کر کے اعلیٰ کی طرف جاتی ہے۔ جس سے دو امر ثابت
ہوتے ہیں۔ اوّل خدا تعالیٰ کے سوا ہر شے مخلوق ہے کیونکہ جو
چیز ترقی کرتی اور تغیر پکڑتی ہے وہ آپ ہی آپ نہیں ہو
سکتی۔

آیت ہذا میں مسئلہ ارتقاء کے درست ہونے کی طرف اشارہ

دوسرے ارتقاء کا مسئلہ درست ہے۔ ہر شے ادنیٰ حالت
سے اعلیٰ کی طرف گئی ہے خواہ انسان ہوں خواہ حیوان خواہ
نباتات ہوں خواہ جمادات۔ کیونکہ رب العالمین کے معنی یہ
ہیں کہ ہر شے کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف لے جا کر اللہ تعالیٰ
کمال تک پہنچاتا ہے پس ثابت ہوا کہ ارتقاء کا مسئلہ دُنیا کی

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا (ہے) ؎۵

ہر شے میں جاری ہے (۷) نیز یہ بھی معلوم ہؤا کہ ارتقا مختلف وقتوں اور مدارج (STAGES) میں حاصل ہوتا ہے کیونکہ رب کے معنی ہیں۔ اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ چیز کو مختلف وقتوں اور مختلف درجوں میں ترقی دیکر کمال تک پہنچانا (نہ کہ ایک ہی کڑی کو مکمل کرنا)۔

(۸) یہ بھی معلوم ہؤا کہ ارتقاء اللہ تعالیٰ کے وجود کے منافی نہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ارتقا کے ذریعہ سے پیدائش خدا تعالیٰ کے عقیدہ کے خلاف نہیں پڑتی۔ بلکہ اس سے وہ حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے اسی لئے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے ساتھ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے الفاظ استعمال فرمائے۔

انسان لامتناہی ترقیات کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

(۹) اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کو لامتناہی ترقیات کے لئے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہ مختلف انواع و اقسام کی مخلوق کو ادنیٰ حالت سے اٹھا کر اعلیٰ تک پہنچاتا ہے اور یہ مضمون صحیح نہیں ہو سکتا جب تک ہر مقام اور درجے اوپر کوئی اور درجہ تسلیم نہ کیا جائے۔

(۱۰) سب سے آخر میں یہ کہ اس سورۃ کو جو سب سے پہلی سورۃ ہے اور قرآن کریم کے مطالب کا خلاصہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے شروع کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل حمد اب شروع ہوگی۔ کیونکہ اسلام جو رب العالمین کی صفت کا کامل مظہر ہے سب دنیا کی طرف آیا ہے اور جسمانی عالم کی طرح روحانی عالم میں بھی اتحاد پیدا کر دیا گیا ہے پہلے جب مختلف اقوام کی طرف الگ رسول آتے تھے بعض نادان متبع دوسرے انبیاء کی تعلیم کو غلط سمجھ کر انکی تردید کرتے تھے ہندو کہتے ہم یہوواہ کو نہیں جانتے پرمیشور کو جانتے ہیں یہود پرمیشور پر ہنسی اڑاتے لیکن اسلام کے ظہور سے سب دنیا کے لئے ایک ہی دین ہو گیا۔ اور ہندی اور چینی اور مصری اور ایرانی اور مغربی اور مشرقی سب خدا کی تعریف میں لگ گئے اور یہ تسلیم کیا گیا کہ ہر قوم کا خدا الگ نہیں ہے بلکہ سب اقوام کا خدا ایک ہی ہے۔

؎۵ حل لغات۔ رَحْمٰن اور رَحِیْم کے لئے دیکھو لغت ؎۲ سورۃ ہذا۔

تفسیر۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ان الفاظ کے معنی بسم اللہ میں بیان ہو چکے ہیں بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ان دونوں صفات کا ذکر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں ہو چکا ہے پھر ان کو دُہرایا کیوں گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بسم اللہ میں ایک مستقل مضمون بیان ہؤا ہے اور وہ ہر سورۃ کی کنجی ہے۔ اس لئے سورۃ کے مضمون میں اگر اپنے موقعہ پر انہی صفات کو دوبارہ بیان کیا جائے۔ تو یہ امر تکرار نہیں کہلا سکتا۔ چنانچہ یہاں بھی اسی حکمت سے ان صفات کو دُہرایا گیا ہے۔ رب العالمین میں یہ مضمون بتایا گیا تھا۔ کہ خدا تعالیٰ پیدا کر کے آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ اعلیٰ ترقیات تک پہنچاتا ہے۔ آیت زیر تفسیر میں الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ سے طریق ربوبیت بتایا ہے اور وہ یہ کہ (۱) اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے اس نے ہر چیز کے لئے ایسے سامان پیدا کئے ہیں جو انکی ترقی میں ممد ہوتے ہیں اور باریک در باریک سامان پیدا کر کے مخفی در مخفی قوتوں کو قوت ظہور عطا فرمائی ہے۔ اور ترقی کے ذرائع بہم پہنچائے ہیں۔ انسان حیوان نباتات جمادات سب اپنے گرد و پیش سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اور اپنے قیام یا اپنی تکمیل کے سامان حاصل کر رہے ہیں (۲) وہ رحیم ہے پس جب کوئی مخلوق اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کرتی ہے تو اسکی قدردانی کی جاتی ہے اور اس پر خاص فضل کیا جاتا ہے اور مزید ترقی کی اس میں امنگ پیدا کی جاتی ہے۔" (طبع

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

جزاء سزا کے وقت کا مالک (ہے) ۵۵

یہ سلسلہ لا تتناہی طور پر چلا جاتا ہے۔

الرَّحْمٰن۔ ایسی صفت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا استعمال دوسروں پر نہیں ہوتا سوائے اضافت کے جیسا کہ مسیلمہ کذاب اپنے آپ کو رحمٰن یمامہ کہلواتا تھا اس کے معنی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے بلا مبادلہ اور بلا استحقاق رحم کرنے کے ہیں۔ اور اس مفہوم میں کفارہ کا رد پایا جاتا ہے۔ کیونکہ کفارہ کی بُنیاد اس خیال پر ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا استحقاق رحم نہیں کر سکتا۔ مسیحیوں کو اس کا اس قدر احساس ہے کہ عرب کے نصاریٰ بھی جب اپنی تصنیفات یا خطوں پر خدا تعالیٰ کا نام لکھتے ہیں تو بسم اللہ کے بعد اور صفات کا ذکر کر دیتے ہیں۔ رحمٰن کا لفظ استعمال نہیں کرتے سوائے ایسے شخص کے جو اسلامی تمدّن سے متاثر ہو مثلاً یہ لکھ دیں گے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الکریم الرَّحِیْم یا اور کوئی صفت بیان کر دیں گے۔ رحمٰن کا لفظ استعمال نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کا دل مانتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ رحمٰن ہے تو پھر اس کے لئے مسیح کا کفارہ لئے بغیر بندوں کے گناہ بخشنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

رحیم کی صفت میں تناسخ کا رد ہے۔ کیونکہ تناسخ کی بُنیاد محدود عمل کی غیر محدود جزاء نہ مل سکنے کا عقیدہ ہے صفت رحیم بتاتی ہے۔ کہ محدود عمل کی غیر محدود جزاء نہیں ملتی، بلکہ نیک عمل کی خاصیت یہ ہے کہ وہ مکرّر ہوتا ہے پس اس کے بدلہ میں جزاء بھی مکرر ملتی ہے۔ رحیم کا لفظ بار بار رحم کرنے پر دلالت کرتا ہے اور بار بار رحم کے معنے یہ نہیں کہ ایک ہی فعل کا بار بار انعام ملتا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ جو شخص نیکی کی حقیقت کو سمجھتا ہے وہ بار بار نیک اعمال بجا لاتا ہے اور کم سے کم اس کے دل میں بار بار نیک عمل بجا لانے کی خواہش ضرور پائی جاتی ہے پس ہر دفعہ جب نیک عمل کی جزاء بندہ کو ملتی ہے اور نیکی کرنے کی طاقت اور اس کے بار بار بجالانے کی خواہش اور بھی ترقی کر جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس پر پھر رحم کرتا ہے اور اس کی نیکی کی خواہش اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ نیکی کے کاموں میں اور بھی بڑھ جاتا ہے اور اس طرح رحم بار بار نازل ہوتا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا رحم صرف گذشتہ فعل پر انعام کا رنگ ہی نہیں رکھتا بلکہ آیندہ نیکی کے لئے ایک بیج کا کام بھی دیتا ہے۔

لفظ الرحمٰن کا اطلاق

درحقیقت محدود عمل کا خیال ہندوؤں میں محض اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے جنّت کو بیکاری اور بے عملی کا ایک مقام سمجھ لیا ہے اور ان کو سمجھنا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ وہ نجات کے معنی نروان یعنی تمام خواہشات، اور اعمال سے آزاد ہونا سمجھتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک عمل اسی دُنیا میں ختم ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے محدود ہوتا ہے۔ اور چونکہ عمل محدود ہوتا ہے ان کے نزدیک اس کا بدلہ بھی محدود ہونا چاہیئے۔ مگر اسلام بار بار رحم در بار بار عمل کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے اور جنّت کو دار العمل ہی قرار دیتا ہے جب خدا تعالیٰ رب العالمین ہے تو جنّت بھی تو ایک عالم ہے وہاں بھی ترقی ہوگی۔ ورنہ رب العالمین صحیح نہیں ٹھہرتا۔ اور جب انسان وہاں بھی ترقی کرے گا تو لازماً اس کے تقویٰ اور اسکی محبت الٰہی میں بھی ترقی ہوگی اور جب ان چیزوں میں ترقی ہوگی تو اس ترقی کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کا رحم بھی پھر سے نازل ہوگا۔ اور جب یہ رحم اور عمل کا بار بار تبادلہ ہوتا رہے گا تو نجات کا وقت محدود کس طرح ہو سکتا ہے اس دنیا اور اگلے جہاں کے عمل میں صرف یہ فرق ہے کہ اس دنیا میں تنزّل کا خطرہ بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ مگر اگلے جہان میں صرف ترقی ہوگی تنزّل نہ ہوگا۔ ورنہ روحانی عمل اور رُوحانی ترقی وہاں بھی ہوگی۔ پس محدود عمل اور غیر محدود جزاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لفظ رحمٰن اور کفارہ کا رد

رحیم کی صفت میں تناسخ کا رد

۵۵ حل لغات۔ مالك۔ ملك اور مِلك مٰلِكِ

تین ملتے جلتے ہوئے لفظ ہیں۔ مالک جسکو کسی چیز پر جائز قبضہ اور اقتدار حاصل ہو۔ مَلَک فرشتہ۔ اور مَلِک بادشاہ یعنی جسے سیاسی اقتدار حاصل ہو

یَوْم۔ اس کے معنی مطلق وقت کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج ع ۶) خدا تعالیٰ کا بعض دن ہزار سال کا ہوتا ہے ایک شاعر کہتا ہے یوماہ یوم ندیٰ ویوم طعانٍ میرے ممدوح پر دو ہی قسم کے وقت آتے ہیں۔ یا تو وہ سخاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دشمنوں کو قتل کرنے میں۔ اسی طرح عرب کہتے ہیں۔ یوماہُ یومُ نُعمٍ ویوم بُؤسٍ ای الدّھر یعنی زمانہ دو حال سے خالی نہیں یا تو انسان کے لئے نعمتیں لاتا ہے یا تکالیف لاتا ہے (لسان العرب) اسی طرح سیبویہ کا قول ہے کہ عرب کہتے ہیں۔ اَنَا الْیَوْمَ اَفْعَلُ كَذَا لَا يُرِيْدُوْنَ يَوْمًا بِعَيْنِهٖ وَلٰكِنَّهُمْ يُرِيْدُوْنَ الْوَقْتَ الْحَاضِرَ (لسان العرب) یعنی جب کہتے ہیں کہ میں آج کے دن اس اس طرح کروں گا۔ تو اس سے مراد چوبیس گھنٹہ والا دن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے مراد صرف موجودہ وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ جو قرآن کریم میں آتا ہے۔ اس سے بھی مُراد معروف دن نہیں بلکہ زمانہ اور وقت مُراد ہے (لسان العرب) پھر لکھا ہے وَقَدْ يُرَادُ بِالْيَوْمِ الْوَقْتُ مُطْلَقًا وَمِنْهُ الْحَدِيْثُ تِلْكَ اَيَّامُ الْهَرَجِ اَیْ وَقْتُهٗ (لسان العرب) یعنی کبھی یوم سے مطلق وقت مراد ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے کہ یہ دن فتنہ اور لڑائی کے دن ہیں۔ مراد یہ کہ یہ فتنہ اور لڑائی کا زمانہ ہے۔

اَلدِّیْن

الدِّین۔ الجزاء والمکافاۃ۔ بدلہ۔ الطَّاعَةُ اطاعت۔ الحساب۔ محاسبہ۔ القھر والغلبۃ والاستعلاء غلبہ۔ السلطان والمُلك والحكم۔ تصرف حکومت۔ السیرۃ خصلت۔ التدبیر۔ تدبیر۔ اِسْمٌ لِجَمِيْعِ مَا يُعْبَدُ بِهِ اللّٰهُ وہ تمام طریقے جن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے وہ سب دین کہلاتے ہیں یعنی شریعت۔ نیز اس کے معنی ہیں المِلَّةُ مذہب۔ الوَرَعُ نیکی۔ المَعْصِیَةُ نافرمانی۔ الحال۔ کیفیت القضاء فیصلہ۔ العادۃ۔ عادت۔ الشّان خاص حالت (اقرب)

تفسیر۔ آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ جزاء سزا کے وقت کا مالک ہے۔ شریعت کے وقت کا مالک ہے۔ فیصلہ کے وقت کا مالک ہے۔ مذہب کے زمانہ کا مالک ہے۔ نیکی کے زمانہ کا مالک ہے۔ گناہ کے زمانہ کا مالک ہے۔ محاسبہ کے وقت کا مالک ہے۔ اطاعت کے وقت کا مالک ہے۔ غلبہ کے وقت کا مالک ہے خاص اور اہم حالتوں کا مالک ہے۔

عام طور پر تو اس کے معنی قیامت کے دن کا مالک کئے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ لغت سے ظاہر ہے۔ یہ معنی محض تفسیری ہیں لغوی نہیں۔ دین کے ایک معنی جزاء سزا کے ہیں۔ اور جزاء سزا کا کامل مظاہرہ چونکہ قیامت کے دن ہوگا۔ اس لئے مفسرین نے جزاء سزا کے معنوں کی بُنیاد پر اس آیت کے یہ معنی کر دیئے کہ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ حالانکہ لُغت کے رو سے اس آیت کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور سب کے سب قرآنی مطالب کے مطابق اور درست ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ایک معنوں کو تو لے لیا جاوے اور دوسروں کو چھوڑ دیا جائے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ مفسرین اس کے یہ معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزاء سزا کے وقت کا مالک ہے۔ ان معنوں کے رُو سے ایک تو اس آیت کی یہ تشریح ہوگی۔ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک ہے یعنی اس دن جزاء سزا میں کسی اور کا دخل نہ ہوگا بلکہ جزاء سزا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی۔ اس طرح اس دُنیا اور اگلے جہان کے نتائج میں فرق بتایا ہے کہ اس دُنیا میں تو اچھے بُرے افعال کی جزاء سزاء انسانوں کے ذریعہ سے بھی ملتی ہے اور اس میں لوگوں سے غلطی بھی ہو جاتی ہے مگر قیامت کے دن صرف اللہ تعالیٰ ہی جزاء سزاء دے گا۔ اور یہ ناممکن ہوگا کہ کسی پر ظلم ہو اور اسے بے گناہ سزا مل جائے یا جُرم سے زیادہ سزا مل جائے۔ نیز مجرم کے لئے بھی ناممکن ہوگا کہ جھوٹ فریب سے کام لے کر سزا سے محفوظ ہو جائے۔

نیز اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جزاء سزا کے وقت صرف بطور مالک نہیں ...

بلکہ بطور مالک کام کرے گا۔ مَلک یعنی بادشاہ جب فیصلہ
کرتا ہے تو اس کا کام صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انصاف
کیا ہے۔ کیونکہ جن امور کا فیصلہ وہ کرتا ہے وہ مدعی اور
مدعا علیہ کے حقوق کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔ اس لئے
اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ کہ وہ کسی کو معاف کر دے
لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ بادشاہ ہی نہیں بلکہ مالک بھی ہے اس
لئے اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حق میں سے جس قدر چاہے
معاف کر دے۔ اس مضمون سے ایک طرف تو امید کا ایک
اہم پہلو پیدا کر دیا گیا ہے اور مایوسی سے انسان کو بچا لیا
گیا ہے۔ دوسری طرف انسان کو ہوشیار بھی کر دیا گیا ہے
کہ خدا تعالےٰ کے رحم سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا خیال دل
میں نہ لانا۔ کیونکہ مالک ہونے کے لحاظ سے جہاں وہ رحم کر
سکتا ہے۔ وہاں اپنی پیدائش کو گندہ دیکھنا بھی برداشت
نہیں کر سکتا۔ گویا امید اور خوف کے خیالات یکساں پیدا
کر کے انسان کے اندر چستی اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش
کی گئی ہے۔ برخلاف مسیحی نجات کی تعلیم کے کہ ایک طرف انصاف
کا غلط مفہوم پیش کر کے امید کو توڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف کفارہ
کے مسئلہ کو پیش کر کے گناہ پر دلیر کر دیا گیا ہے گویا مسیحی عقیدہ کے
دونوں پہلوؤں نے پاکیزگی کی نہیں بلکہ گناہ کی مدد کی ہے حد سے
زیادہ مایوسی نے بھی گناہ ہی پیدا کیا ہے اور حد سے زیادہ امید نے
بھی گناہ ہی پیدا کیا ہے کچھ لوگ تو پاکیزگی سے مایوس ہو کر نیکی کو چھوڑ
بیٹھیں گے اور کچھ لوگ کفارہ پر توکل کر کے گناہ پر دلیر ہو جائینگے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ
شریعت اور مذہب کے وقت کا مالک ہے۔ اس میں ایک
لطیف مضمون قانونِ قدرت کے بارہ میں بیان کیا گیا ہے
عام طور پر خدا تعالیٰ کا معاملہ دُنیا کے ساتھ عام قانونِ قدرت
کے ماتحت ہوتا ہے لیکن جس زمانہ میں مذہب یا شریعت
کی بُنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالےٰ صفت
مالکیت کا اظہار کرتا ہے یعنی نہ صرف بادشاہت کا ظہور
ہوتا ہے جو عام قانون سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ ان دنوں مالکیت

مالک اور مَلِک میں فرق

کی صفت کا خاص طور پر ظہور ہوتا ہے یعنی خاص تصرف سے
اللہ تعالیٰ کام لیتا ہے اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی
باریکیوں سے واقف نہیں بظاہر قانونِ قدرت کو ٹوٹتے
ہوئے دیکھتے ہیں ایک بیچارہ اور بے کس وجود دُنیا کے
سامنے آکر دعویٰ پیش کرتا ہے سب لوگ اسکی مخالفت کرتے
ہیں لیکن باوجود ظاہری سامانوں کے مخالف ہونے کے وہ شخص
کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے معاملات میں
دُعاؤں اور معجزات کے ذریعہ سے ایسے واقعات ظاہر
ہوتے ہیں کہ دُنیا انہیں دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے درحقیقت
ان واقعات کی حکمت یہی ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کسی
رُوحانی سلسلہ کو چلاتا ہے یا کسی شریعت کی بُنیاد قائم کرتا ہے
تو ان ایام میں اپنی ملوکیت کی نہیں بلکہ مالکیت کی صفت کو
خاص طور پر ظاہر کرتا ہے یعنی عام قانون کی بجائے اپنے
خاص قانون کو جو اس کے محبوبوں سے مخصوص ہے ظاہر کرنا
شروع کر دیتا ہے اور ایسے واقعات ان دنوں میں ظاہر
ہوتے ہیں جو خارق عادت نظر آتے ہیں۔ ہر نبی کے زمانہ
میں خدا تعالیٰ کی سنّت اسی طرح ظاہر ہوتی چلی آئی ہے۔ اور
اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کے زمانہ میں بھی اسی طرح ہوگا۔ خارق عادت واقعات
سے جو بظاہر قانونِ قدرت کے مخالف نظر آئینگے۔ اللہ تعالےٰ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرے گا۔ اور یہ امر
اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ زمانہ قیام شریعت کا ہے۔ اور
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالےٰ کے سچے
رسول ہیں۔

انبیاء کے زمانہ میں صفت مالکیت کا خاص ظہور۔

آیت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ کے پانچ معنے۔

ایک معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کے وقت
کا اور گناہ کے وقت کا مالک ہے اس میں اس طرف اشارہ
کیا گیا ہے کہ دُنیا پر دو دَور آتے ہیں۔ ایک دَور تو وہ ہوتا
ہے جبکہ نیکی اور بدی یکساں طور پر دُنیا میں پائی جاتی ہے
اس وقت اللہ تعالیٰ کا عام قانون دنیا میں جاری رہتا ہے
لیکن ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ دُنیا میں گناہ ہی گناہ پھیل

جاتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ مالک کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اپنے باغ کی اصلاح کرتا ہے اور نبی مبعوث فرماتا ہے اور اس کے ذریعہ سے ایک قوم دُنیا میں ایسی قائم ہو جاتی ہے جو نیکی کے مقام پر اس طرح قائم ہوتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ گویا وہ سب کی سب نیک ہے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اپنی خاص تقدیروں کے ذریعہ اس قوم کی تائید کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ قوم اپنے اس معیار کو کھو دیتی ہے۔ اور اس میں نیکی بدی کی متوازی تحریکیں جاری ہو جاتی ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ اپنی خاص تقدیر کو واپس کر لیتا ہے اور عام قانونِ قدرت کے ماتحت اس سے معاملہ کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ قوم ایک وقت میں جا کر بالکل خراب ہو جاتی ہے تب سنّت اللہ کے تحت پھر اللہ تعالیٰ مالکیت کی صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر نبی مبعوث ہوتا ہے پھر گناہ کا قلع قمع کیا جاتا ہے پھر ایک پاکوں کی جماعت بنائی جاتی ہے اور اس تمام عرصہ میں قدرت خاص یعنی مالکانہ قدرت اور تصرف کا ظہور ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ پھر وہ قوم نیکی کے اعلیٰ معیار سے نیچے گر جاتی ہے اور پھر وہی پہلا سا دَور شروع ہو جاتا ہے۔

ایک معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اطاعت کے وقت کا مالک ہے یعنی وہی قانون خاص جس کا ذکر اوپر ہُوا ہے اور جو اقوام کے متعلق جاری ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ خاص افراد کے لئے بھی جاری کرتا ہے یعنی جب کسی شخص کی زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت میں گذرنے لگتی ہے تو اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ خاص قدرت کا اظہار کرتا ہے اور وہ انسان عام انسانوں کی طرح نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے خاص قدرت کا اظہار کرتا ہے

ایک معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہم حالتوں کے وقت کا مالک ہے۔ اس سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دُنیا میں ہر کام ایک زنجیر سے مشابہت رکھتا ہے یعنی منفرد نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکی بہت سی کڑیاں ہوتی ہیں جب انسان بیمار ہوتا ہے تو اسکی بیماری اس دن کی کسی غلطی کے نتیجہ میں نہیں ہوتی۔ نہ تندرستی اس دن کی ورزش یا غذا کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس انسان کے اعمال دو نتیجے پیدا کرتے ہیں۔ ایک نتیجہ تو عارضی اور وقتی ہوتا ہے۔ اور ایک نتیجہ آخری اور مستقل ہوتا ہے۔ ایک بے احتیاط آدمی آنکھوں کا غلط استعمال کرتا ہے تو اسکی آنکھیں دُکھنے آ جاتی ہیں۔ مگر علاج سے اچھی ہو جاتی ہیں۔ پھر بے احتیاطی کرتا ہے پھر دُکھنے آ جاتی ہیں پھر علاج کرتا ہے پھر اچھی ہو جاتی ہیں۔ آخر ایک دن نظر جاتی ہی رہتی ہے اور علاج بے فائدہ ہو جاتا ہے ایک محنتی طالب علم سبق یاد کرتا ہے دوسرے دن اُستاد اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ اگلے دن پھر سبق یاد کرتا ہے پھر اُستاد خوش ہو جاتا ہے یہ نتیجہ تو ساتھ کے ساتھ نکلتا رہتا ہے مگر اس محنت کا ایک خوشگوار اثر اس کے دماغ پر پڑتا جاتا ہے اور اس کتابی علم کے علاوہ جو سبق یاد کرنے سے حاصل ہو رہا تھا۔ ایک ذہانت ایک علم کی باریکیوں کے سمجھنے کا ملکہ اس کے دماغ میں پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جو ایک دن اسے دُنیا کا مرجع اور ممدوح بنا دیتا ہے یہ آخری نتائج ایسے باریک طور پر پیدا ہوتے ہیں کہ ساتھی اور دوست بھی اسے دیکھ نہیں سکتے اور اسکی وجہ سمجھ نہیں سکتے۔

اس مضمون سے اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ آخری اور مستقل کامیابی اللہ تعالیٰ کے تعلق سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بیشک انسان عام قانون کی فرمانبرداری کر کے عزت اور رتبہ حاصل کر لیتا ہے لیکن ایک آخری نتیجہ جو اعمال کی زنجیر کے مکمل ہونے سے پیدا ہوتا ہے اصل میں وہی قابل قدر شے ہے خصوصاً جو موت کے وقت ایمان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے کہ اسی پر اگلے جہان کی زندگی کا انحصار ہے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے یہ مُراد نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس دُنیا کا مالک نہیں ہے بلکہ اگر اس آیت کے معنی قیامت

کے دن کے مالک کے کئے جائیں تب بھی آیت کا مطلب یہ ہے
کہ اس دن ظاہری طور پر بھی کوئی مالک نہ ہوگا جیسا کہ فرمایا وَمَآ
اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ يَوْمَ لَا
تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (انفطار) یعنی تم
کو کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے۔ یوم الدین دن ہے کہ کوئی
شخص دوسرے کے کسی کام نہ آسکے گا۔ اور صرف خدا تعالیٰ کا
حکم جاری ہوگا پس مالک سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں جو
ظاہر میں بادشاہ اور حاکم اور مالک نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ
اگلے جہان میں ختم ہو جائے گا۔ اور یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ
اس جہان کا مالک نہیں ہے۔

ان چاروں صفات میں اور جس ترتیب سے وہ بیان
ہوئی ہیں سلوک کا ایک اعلیٰ نکتہ بیان کیا گیا ہے جب ہم اس
امر کو دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقام اعلیٰ ہے اور بندہ کا ادنیٰ
تو یہ امر ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ
بندہ کی طرف متوجہ ہوگا تو اوپر سے نیچے کی طرف آئے گا لیکن
جب بندہ اللہ تعالےٰ کی طرف توجہ کرے گا تو نیچے سے اوپر
کی طرف جائے گا۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد ان صفات کو
دیکھ کر جو سورۃ فاتحہ میں بیان ہوئی ہیں ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ
اللہ تعالیٰ بندہ کی طرف (۱) رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲) رحمٰن
(۳) رحیم (۴) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفات سے درجہ
بدرجہ تنزل کرتا ہے یعنی جب وہ اپنے بندہ پر ظاہر ہونے
لگتا ہے۔ تو پہلے رب العالمین کی صفت کا ظہور ہوتا ہے یعنی
ایسے ماحول تیار کرتا ہے جن میں اس کے منظور اور محبوب
بندہ کی صحیح نشو و نما ہو سکے۔ پھر وہ ان سامانوں کو اپنے بندہ
کے ہاتھ میں دیتا ہے جن سے وہ روحانی ترقی کر سکے۔ پھر
بندہ جب ان سامانوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے تو اس کے اعلیٰ
سے اعلیٰ نتائج پیدا کرتا ہے اور انعامات کے ایک لمبے
سلسلہ کے بعد بندہ کی جدوجہد کا آخری نتیجہ نکالتا ہے۔
یعنی اسے دنیا پر غالب کر دیتا ہے اور اپنی مالکیت کی صفت
اس کے لئے ظاہر کر کے اسے دنیا پر غلبہ دے دیتا ہے۔

اس کے برخلاف جب بندہ اللہ تعالےٰ کی طرف
توجہ کرتا ہے تو اُسے پہلے مالک کی صفت کا مظہر ہونا پڑتا
ہے یعنی وہ انصاف اور عدل کو دنیا میں جاری کرتا ہے مگر
اس کے انصاف کے ساتھ رحم کی ملونی ہوتی ہے۔ اور
عفو کا پہلو غالب ہوتا ہے جس کے معنے ایصال شر سے
اجتناب کے ہیں۔ جب بندہ اور ترقی کرتا ہے۔ تو
رحیمیت کی صفت کا مظہر ہو جاتا ہے یعنی جو لوگ
اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ان کے
کاموں کی قدر دانی کرتا ہے بلکہ ان کے حق سے زیادہ
ان پر انعام کرتا ہے یعنے ایصال خیر کی عادت اس میں
پائی جاتی ہے جسے احسان کہتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر
انسان ترقی کرتا ہے۔ اور رحمانیت کی صفت کا ظہور
اس کے ذریعہ سے ہونا شروع ہوتا ہے اور وہ اپنے
پرائے سب سے نیک سلوک کرنا شروع کرتا ہے اور
اس کا دل وسیع ہو جاتا ہے۔ اور وہ رحمانیت کا مظہر
بن جاتا ہے کافر و مومن سب کی محبت اس کے دل میں
پیدا ہو جاتی ہے۔ اور خواہ کسی نے اس سے حسن سلوک
کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے
نیک سلوک کرے۔ اسے اِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى کی حالت
کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح ماں اپنے بچہ کی خدمت اطاعت
کا خیال کئے بغیر یا کسی بدلہ کی امید کے بغیر کرتی ہے
اسی طرح یہ شخص بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہو جاتا ہے
پھر اس مقام سے ترقی کر کے انسان رب العالمین
کا مظہر ہو جاتا ہے یعنی اس کی نظر فرد سے اُٹھ کر نظام
تک جا پہنچتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو دنیا کا نگران
اور داروغہ سمجھ لیتا ہے اور دنیا کی اصلاح کی طرف
بحیثیت مجموعی توجہ کرتا ہے اور سوسائٹی کی حالت کو
بدل ڈالتا ہے۔ یہ صعود اور ہبوط کی راہیں جو ان صفات
میں بیان کی گئی ہیں۔ سلوک کے اعلیٰ گر اپنے اندر رکھتی
ہیں اور سالکوں کے لئے ایک عظیم الشان رحمت ہیں۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ۵۵

اِیَّاكَ

۵۵ حل لغات۔ اِیَّاكَ عام قاعدہ کے رُو سے نَعْبُدُكَ چاہئے تھا مگر معنوں میں اختصاص پیدا کرنے کے لئے ك کو پہلے لایا گیا۔ اور چونکہ ك اکیلا پہلے نہیں آسکتا اس لئے اِیَّا کو جو ضمیر منصوب ہے اس پر بڑھایا گیا۔ پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی ہوئے ہم تجھے عبادت کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔

نَعْبُدُ

اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں ضمیر طلب معنے کی وجہ

نَعْبُدُ ہم عبادت کرتے ہیں۔ اس کا ماضی عَبَدَ ہے اور اس کے مندرجہ ذیل معنی ہیں عَبَدَ اللہَ طَاعَ لَهٗ وَخَضَعَ وَ ذَلَّ وَخَدَمَهٗ وَالْتَزَمَ شَرَائِعَ دِیْنِهٖ وَ وَحَّدَهٗ (اقرب) یعنی عبد کے معنی ہیں اس کی اطاعت کی اور اس کے حکم کے آگے سر جھکایا اور اس کی خدمت کی اور اس کے دین کے احکام پر مستقل طور پر عمل کرنے لگا اور اسکی توحید کا اقرار کیا عبد کے ایک معنی کسی کے نقش قبول کرلینے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں طریق معبد۔ اے مذلل ایسا رستہ جو کثرت آمد و رفت سے اس طرح ہوگیا ہو کہ پاؤں کے نقش قبول کرنے لگ جائے۔

پس عبادت ایک ایسی کامل ہستی کی ہو سکتی ہے جو اپنے کمالات میں منفرد ہو اور اس کا کوئی شریک نہ ہو اور جسکی اطاعت اور فرمانبرداری انسان کے لئے ممکن ہو کیونکہ جسکی فرمانبرداری ممکن ہی نہ ہو اسکی عبادت ایک بیمعنی لفظ ہوگا۔

یہ ظاہر ہے کہ ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی نہیں جس کی حقیقی معنوں میں فرمانبرداری کی جاسکے اور جس کی ذات کو چُن کر انسان اسی کا ہو جائے اس کے سوا جس کی بھی انسان اطاعت کرے ▪ اطاعت محدود ہوگی اور پھر اس کے سوا اور وجود بھی یا اور قانون بھی ایسے ہوں گے جن کی اطاعت پر انسان مجبور ہوگا۔

نَسْتَعِیْنُ

نَسْتَعِیْنُ۔ استعانۃ سے ہے جس کے معنی مدد حاصل کرنے یا طلب کرنے کے ہیں۔ پس اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنے ہوئے ہم مدد طلب کرنے کے لئے تجھے مخصوص کرتے ہیں یعنی اور کسی کو لائق نہیں سمجھتے کہ اس سے مدد طلب کریں

تفسیر۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے کر مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک کی عبارت سے یُوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ بندہ کی نظر سے اوجھل ہے اور ▪ اسکی تعریف کر رہا ہے۔ لیکن اِیَّاكَ نَعْبُدُ سے یک دم خدا تعالےٰ کو مخاطب کرلیا گیا ہے بعض نادانوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ حسنِ کلام کے خلاف ہے۔ حالانکہ یہ حسنِ کلام کے خلاف نہیں۔ بلکہ حسنِ کلام کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ورا ءالورا ء ہے وہ بندہ کو نظر نہیں آتی۔ اسکی صفات کے ذریعہ سے وہ اسے شناخت کرتا ہے۔ اور اس کے ذکر کے ذریعہ سے وہ اس کے قریب ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل کی آنکھیں اسے دیکھ لیتی ہیں۔ ان آیات میں سلوک کے اس نکتہ کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ رحمٰن۔ رحیم۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی صفات پر جب انسان غور کرتا ہے۔ تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت شدید طور پر اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تب وہ روحانی طور پر اللہ تعالےٰ کے دیدار سے مشرف اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر بے اختیار چلا اُٹھتا ہے۔ کہ اے رب میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ پس اس طرح ضمائر کو بدل کر اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم میں بتائی ہوئی صفات پر غور کرنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بندہ کے سامنے آجاتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین فنصفہا لی ونصفہا لعبدی ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد للہ

رب العالمین قال اللہ حمدنی عبدی واذا قال الرحمٰن الرحیم۔ قال اثنی علی عبدی واذا قال مٰلک یوم الدین قال مجدنی عبدی وربما قال فوّض الیّ عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل واذا قال اھدنا الصراط المستقیم الخ الی اخرسوۃ قال ھذا العبدی ولعبدی ما سأل (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ) یعنی حضرت ابوہریرۃ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے سورۃ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ پس اس کا نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے۔ اور میرا بندہ جو کچھ مجھ سے (اس کے ذریعے سے طلب کرتا ہے) وہ میں اسے دُونگا۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ ربّ العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ اور جب بندہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی ہے۔ اور جب بندہ کہتا ہے مٰلک یوم الدین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے اور بعض دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے اپنا معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اور جب بندہ کہتا ہے ایاک نعبد وایاک نستعین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مانگا ہے میں اُسے دُونگا۔ پھر جب بندہ اھدنا الصراط المستقیم سے لے کر آخر تک کی آیات پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ دعا میرے بندے کے لئے ہے اور یہ سب کچھ میرے بندہ کو ملیگا۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور کا استنباط ہوتا ہے اوّل حمد ثنا اور تمجید میں فرق ہے۔ دوم مٰلک یوم الدین کی آیت کامل توکّل پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو آخری نتائج کا مرتب کرنے والا قرار دے کر جب الحمد کہتا ہے تو گویا وہ اس امر پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ درست ہے اور مجھے منظور ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکّل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کیوں نہ اس سے بخشش اور نرمی کا معاملہ کرے۔ سوم یہ کہ اس سورۃ میں جن انعامات کے حصول کے لئے دُعا سکھائی گئی ہے وہ مسلمانوں کو بحیثیت قوم ضرور ملیں گے کیونکہ اس دُعا کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ لعبدی ما سأل میرے بندہ نے جو کچھ مانگا ہے اُسے ضرور ملے گا۔

نعبد کو نستعین سے پہلے رکھنے کی دو وجوہات۔

اس آیت میں نعبد پہلے آیا ہے اور نستعین بعد میں۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی توفیق تو اللہ تعالےٰ کی مدد سے ہی حاصل ہو سکتی ہے پھر نعبد کو پہلے کیوں رکھا۔ نستعین پہلے چاہیئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوتی ہے لیکن اس جگہ اعانت کا ذکر نہیں بلکہ استعانت کا ذکر ہے۔ یعنی مدد مانگنے کا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جب بندہ کے دل میں عبودیت اور عبادت کا خیال پیدا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگنے کا خیال کرے گا۔ جو عبادت کی طرف راغب ہی نہ ہو وہ مدد کیوں طلب کرے گا۔ پس گو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اعانت کے بغیر عبادت کی توفیق نہیں ملتی لیکن استعانت یعنی بندہ کا اللہ تعالےٰ کے دروازہ پر جھکنا عبادت کا خیال آنے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نعبد کو پہلے اور نستعین کو بعد میں رکھا گیا ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ارادہ بندہ کی طرف سے ہوتا ہے اور عمل کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اگر ارادہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو انسان کے اعمال اضطراری اعمال ہو جائیں۔ پس اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ جب بندہ کے دل میں عبادت کا خیال پیدا ہو۔ اسے اللہ تعالیٰ سے تکمیل ارادہ

کے لئے دُعا کرنی چاہیئے اور کہنا چاہیئے کہ اے میرے رب مَیں تیری عبادت کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ مگر اس عہد کی تکمیل تیری امداد کے سوا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تُو میری مدد کر اور مجھے اس امر کی توفیق دے کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کروں۔

عبادت کا حقیقی مفہوم۔

عبادت کامل تذلل کا نام ہے۔ پس عبادت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو بندہ اپنے اندر پیدا کرے۔ عبادت کی ظاہری علامات صرف قلبی کیفیت کو بدلنے کے لئے مقرر ہیں۔ ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبادت دل کی کیفیت اور اس کے ماتحت انسانی اعمال کے صدور کا نام ہے اور خاص اوقات کی تعیین اور قبلہ رُو ہونا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا یا رکوع سجود کرنا یہ اصل عبادت نہیں بلکہ جسم کی ظاہری حالت کا اثر چونکہ دل پر ہوتا ہے اور توجہ بھی قائم ہوتی ہے نماز کے لئے کچھ ظاہری علامات بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔ مگر وہ بمنزلہ برتن کے ہیں جس میں معرفت کا دودھ ڈالا جاتا ہے یا بطور چھلکے کے ہیں جس میں عبادت کا مغز رہتا ہے۔

آیت ہذا میں جمع کا صیغہ استعمال کرنے کی وجہ۔

اس آیت میں اور بعد کی آیات میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی یوں کہا گیا ہے کہ "ہم عبادت کرتے ہیں" اور "ہم مدد مانگتے ہیں" اور "ہمیں سیدھا راستہ دکھا" اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام ایک مدنی مذہب ہے وہ سب کے لئے ترقی چاہتا ہے۔ نہ کہ کسی ایک شخص کے لئے۔ اور یہ بھی کہ ہر مسلمان دوسرے کا نگران مقرر کیا گیا ہے اس کا یہی کام نہیں کہ وہ خود عبادت کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو عبادت کی تحریک کرے اور اس وقت تک تحریک نہ چھوڑے جب تک وہ اس کے ساتھ عبادت کرنے میں شامل نہ ہو جائیں۔ اور آپ ہی اللہ تعالیٰ پر توکل نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی توکل کی تعلیم دے اور اس وقت تک بس نہ کرے جب تک وہ توکل میں اس کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں اور وہ خود ہی ہدایت کا طالب نہ ہو بلکہ دوسروں کو بھی ہدایت طلب کرنے کی نصیحت کرے۔ اور بس نہ کرے جب تک ان کے دل میں بھی ہدایت طلب کرنے کی تڑپ پیدا ہو کر وہ اس کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔ اور خود بھی ہر دُعا میں "مَیں" کی جگہ ہم کا لفظ استعمال نہ کرنے لگیں۔ یہی تبلیغی اور تربیتی روح ہے جس نے اسلام کو چند سالوں میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ اور اگر آج مسلمان ترقی کر سکتے ہیں تو صرف اسی جذبہ کو اپنے دل میں پیدا کر کے جب تک مسلمان نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ اور اِھْدِنَا کے الفاظ نہیں کہتے۔ جب تک ان الفاظ کو سچے طور پر کہنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ اس وقت تک ان کا نہ دین میں ٹھکانا ہوگا نہ دُنیا میں۔

حقیقت یہ ہے کہ عبادت بھی اور استعانت بھی اور طلب ہدایت بھی بحیثیت جماعت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اکیلا آدمی صرف ایک محدود عرصہ کے لئے اور ایک محدود دائرہ میں عبادت کو قائم کر سکتا ہے۔ ہاں جو اپنی اولاد کو بھی اور اپنے ہمسائیوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے وہ عبادت کا دائرہ وسیع کر دیتا ہے اور اس کا زمانہ ممتد کر دیتا ہے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ سچا عبد وہی ہے۔ جو اپنے آقا کی مملوکہ اشیاء کو دشمن کے ہاتھ میں نہ پڑنے دے جو اپنے آقا کے باغ کو لٹتے دیکھتا اور اس کے لئے جدوجہد نہیں کرتا وہ ہرگز سچا بندہ نہیں کہلا سکتا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے جبر و قدر کے متعلق غلط خیالات کا رد

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی آیت میں جبر اور قدر کے متعلق جو غلط خیالات لوگوں میں پھیل رہے ہیں۔ ان کا بھی رد کیا گیا ہے انسانی اعمال کے بارہ میں لوگوں میں دو غلط فہمیاں پیدا ہیں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ جس قدر اعمال انسان سے سرزد ہو رہے ہیں جبر کے ماتحت ہیں یعنی انسان ان کے کرنے پر مجبور ہے۔ یہ خیال مذہبی لوگوں میں بھی ہے اور فلسفیوں میں بھی۔ اور اب علم النفس کے ماہرین کا ایک گروہ بھی ایک رنگ میں اس کا قائل ہو رہا ہے اور ان کا سردار ڈاکٹر فرائیڈ آسٹرین پروفیسر ہے جو لوگ اس عقیدہ پر غلط مذہبی عقیدہ کی وجہ سے قائم ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے جس طرح ایک انجینئر جب عمارت بناتا ہے تو کسی اینٹ کو پاخانہ میں اور کسی کو بالاخانہ میں لگاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مختار ہے

کہ جسے چاہے نیک بنائے اور جسے چاہے بدکار بنائے۔ سو اس نے بعض کو نیک اور بعض کو بدکار بنایا ہے۔ مسیحیوں نے ورثہ کا گناہ تسلیم کرکے جبر کے مسئلہ کو رائج کیا ہے کیونکہ جب انسان ورثہ کے گناہ سے کفارہ کے بغیر آزاد نہیں ہو سکتا تو جس قدر لوگ کفارہ پر ایمان نہیں لاتے گنہگار رہنے پر مجبور ہیں۔ تناسخ کا مسئلہ بھی جبر کی تائید میں ہے کیونکہ جو جون سابق گناہ کی سزا میں ملی ہے لازماً ان حدبندیوں کے نیچے رہے گی جو سابقہ گناہ کی وجہ سے اس پر لگادی گئی ہیں فلسفیوں کے عقیدہ کی بنیاد صرف تجربہ پر تھی کہ باوجود کوشش کے بعض لوگ گناہ سے بچ نہیں سکتے۔ لیکن ڈاکٹر فرائیڈ نے اس مسئلہ کو علمی مسئلہ بنادیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چونکہ انسان کی تعلیم کا زمانہ اس کے ارادہ کے زمانہ سے پہلے شروع ہوتا ہے یعنی بچپن سے۔ اور ارادہ اور اختیار بلوغ کے وقت پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا ارادہ آزاد ہے۔ بلکہ جس چیز کو ہم ارادہ کہتے ہیں درحقیقت وہ وہی میلان ہے جو بچپن کے اثرات کے نتیجہ میں اس کے اندر پیدا ہوگیا ہے۔ انسان اپنے افعال کو بااراوہ اور خیالات کو آزاد سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ صرف بچپن کے تاثرات کے تابع ہیں۔ اور چونکہ وہ اس کے نفس کا جزو بن گئے ہیں۔ وہ ان کو بیرونی اثر خیال نہیں کرتا بلکہ اپنا ارادہ سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر فرائیڈ کے یہ خیالات نئے نہیں اسلام میں انکی سند ملتی ہے جیسے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے مگر اَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ (بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین) اس کے ماں باپ اسے یہودی یا مسیحی بنا دیتے ہیں۔ یعنی ان کی تربیت کے اثر سے وہ بڑا ہونے سے پہلے ان کے غلط خیالات کو قبول کرلیتا ہے اور بے سمجھے بوجھے ان کے راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچہ کی پیدائش پر اس کے کان میں اذان کہنے کا حکم دے کر بچپن کے اثرات کی وسعت اور اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔

اس عقیدہ کا رد کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد ہے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں قرآن کریم نے ان خیالات کے غلط حصہ کی تردید کی ہے کیونکہ جبر کی صورت میں جزاء سزاء ایک بے معنی فعل ہو جاتا ہے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر بتایا ہے کہ انسانی ارادہ اپنی ذات میں آزاد ہے۔ گو ایک حد تک وہ محدود ہو لیکن اس کے اس حد تک آزاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ وہ ہدایت کو دیکھ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کرلے مثلاً گو انسان بُرے اثرات کے تابع ہو لیکن اگر اللہ تعالےٰ کی صفات پر وہ غور کرے تو اِيَّاكَ نَعْبُدُ کی آواز اس کے اندر سے پیدا ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے اور اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر فرائیڈ اور ان کے شاگرد اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ حالات بدلتے رہتے ہیں اور خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں دُنیا کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہتی۔ اگر بچپن کے اثرات ایسے ہی زبردست ہوتے کہ ان سے انسان آزاد نہ ہو سکتا تو چاہیئے تھا۔ کہ آدم سے لے کر اس وقت تک دُنیا ایک ہی راہ پر گامزن رہتی لیکن اس میں بارہا تغیر ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے تغیرات ممکن ہیں۔ جو انسان کے خیالات کی رَو کو اس سمت سے بدل دیں۔ جن پر اس کے بچپن کے تاثرات اسے چلا رہے تھے قرآن کریم نے اس کے نہایت زبردست دلائل دیئے ہیں۔ مگر اس جگہ ان کی تفصیل کا موقعہ نہیں یہاں صرف اجمالی طور پر اس آیت سے جو استدلال ہوتا تھا۔ اسے بیان کردیا گیا ہے۔

دوسرے عقیدہ کا رد کہ انسان اپنے خیالات میں بالکل آزاد ہے

جبر کے عقیدہ کے بالکل مخالف ایک اور خیال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے خیالات میں بالکل آزاد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ اسلام اس خیال کو بھی رد کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ

ہمیں سیدھے راستے پر چلا ۵ے

تم ان اثرات کو جو گرد و پیش سے انسان پر پڑ رہے ہیں بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پس ضروری ہے کہ ایک بالا ہستی جو تمام اثرات سے بالا ہے انسان کی نگران رہے اور ایسے بد اثرات جب خطرناک صورت اختیار کر جائیں۔ تو انسان کی مدد کر کے ان سے اسے بچائے۔ اور اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی دُعا سکھا کر اس طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا خدا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا بلکہ تمہاری مجبوریوں کو دیکھ رہا ہے۔ پس تم اس سے مانگو تو وہ تم کو دیگا۔ کھٹکھٹاؤ تو وہ تمہارے لئے کھولے گا۔

اِھْدِنَا

۵ے حل لغات۔ اِھْدِنَا۔ ھدی سے ہے کہتے ہیں هَدَاهُ اِلَى الطَّرِيْقِ بَيَّنَهٗ لَهٗ اسے رستہ بتایا۔ هَدَى الْعَرُوْسَ اِلٰى بَعْلِهَا زَفَّهَا اِلَيْهِ دُلہن کو اس کے خاوند تک لے گیا۔ هَدَى فُلَانًا: تَقَدَّمَهٗ اس کے آگے آگے چلا کہتے ہیں جَاءَتِ الْخَيْلُ يَهْدِيْهَا فَرَسٌ اَشْقَرُ اَىْ يَتَقَدَّمُهَا۔ گھوڑے آئے جبکہ انکے آگے آگے ایک سُرخ رنگ کا گھوڑا دوڑتا چلا آتا تھا (اقرب) پس ھدی کے تین معنی ہیں راستہ دکھانا۔ راستہ تک پہنچانا اور آگے آگے چل کر منزلِ مقصود تک لئے جانا۔

لفظ ہدایت اور اسکے تین معانی۔

قرآن کریم میں بھی ھدایۃ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک معنی اس کے کام کی طاقتیں پیدا کر کے کام پر لگا دینے کے ہیں مثلاً قرآن کریم میں آتا ہے اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ع ۲) یعنی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسبِ حال کچھ طاقتیں پیدا کیں پھر اسے اس کے مفوضہ کام پر لگا دیا۔ دوسرے معنی ہدایت کے قرآن کریم سے ہدایت کی طرف بُلانے کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً فرمایا وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سجدہ ع ۳) اور ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے

قرآن کریم میں ہدایت کے لفظ کا استعمال مختلف معانی میں

حکم کے مطابق لوگوں کو تورات کی طرف بلاتے تھے۔ تیسرے معنی ہدایت کے قرآن کریم سے چلاتے ہوئے لے آنے کے ہیں جیسے کہ جنتیوں کی نسبت آتا ہے کہ وہ کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (اعراف ع ۵) سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو ہمیں جنت کی طرف چلاتا لایا اور جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا۔ اسی طرح ہدایت کے معنی سیدھے راستہ کے ساتھ موانست پیدا کرنے کے بھی ہوتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (تغابن ع ۲) جو اللہ پر کامل ایمان لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ہدایت سے موانست پیدا کر دیتا ہے اور اچھی باتوں سے اسے رغبت ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں راہ دکھانے کے معنی نہیں ہو سکتے کیونکہ جو ایمان لاتا ہے اسے راہ تو پہلے ہی مل چکا۔ ہدایت کے معنے کامیابی کے بھی قرآن کریم میں آتے ہیں سورۂ نور میں منافقوں کا ذکر فرماتا ہے کہ وہ کہتے تو یہ ہیں کہ انہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو وہ ضرور اس کے لئے نکل کھڑے ہونگے لیکن عمل ان کا کمزور ہے فرماتا ہے قسمیں نہ کھاؤ عملاً اطاعت کرو۔ کیونکہ اللہ تمہارے اعمال سے واقف ہے۔ پھر فرماتا ہے اے رسول ان سے کہدے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر اس حکم کے باوجود تم پھر گئے تو رسول پر اسکی ذمہ واری ہے۔ تم پر تمہاری۔ اور یاد رکھو کہ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (نور ع ۷) اگر تم رسول کی بات اس بارہ میں مان لوگے تو نقصان نہ ہو گا بلکہ تم کامیاب ہو جاؤ گے اور فتح پاؤ گے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے اَلَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورہ محمد ع ۲) جو لوگ اس ہدایت کو جو انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ اپنے نفس میں جذب کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ہدایت عطا کرتا ہے قرآن کریم

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ اس کے بے انتہا مدارج ہیں۔ ہدایت کے ایک درجہ سے اوپر دوسرا درجہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے جاذب ہو جاتے ہیں انہیں ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

صراط۔ راستہ۔ یہ لفظ ص سے بھی لکھا جاتا ہے اور س سے بھی صراط یا سراط ایسے راستہ کو کہتے ہیں جو صاف ہو۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے سَرِطْتُ الطَّعَامَ یعنے کھانا بسہولت نگل لیا۔ اور اچھے اور ہموار راستہ کو سراط یا صراط اس لئے کہتے ہیں کہ گویا اس پر چلنے والا اسے کھاتا جاتا ہے۔ (مفردات)

مستقیم۔ استقامۃ سے ہے۔ مفردات میں ہے۔ اَلْاِسْتِقَامَۃُ یُقَالُ فِی الطَّرِیْقِ الَّذِیْ یَکُوْنُ عَلٰی خَطٍّ مُسْتَوٍ وَبِہٖ شُبِّہَ طَرِیْقُ الْحَقِّ نَحْوُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ یعنی استقامۃ اس راستہ کے لئے بولا جاتا ہے جو سیدھا ہو اور اس وجہ سے جو شخص راستی پر ہو۔ اس کے طریق کو بھی مستقیم کہتے ہیں چنانچہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی آیت میں یہی معنی ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں ایسی اعلیٰ اور مکمل دُعا سکھائی گئی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ دُعا کسی خاص امر کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے متعلق ہے اور دینی اور دنیوی ہر کام کے متعلق اس دُعا سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ہر کام خواہ دینی ہو یا دُنیاوی اس کے پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریق ہوتا ہے اگر اس طریق کو اختیار کیا جائے تو کامیابی ہوگی ورنہ نہ ہوگی پھر بعض دفعہ کئی طریق ایک کام کو کرنے کے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے بعض ناجائز ہوتے ہیں اور بعض جائز۔ جو جائز راستے ہوتے ہیں ان میں سے بعض تو مراد تک جلدی پہنچا دیتے ہیں اور بعض دیر سے پہنچاتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دُعا میں ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے رہیں کہ وہ ہماری اس طریق کی طرف راہنمائی کرے جو اچھا اور نیک ہو اور جس پر چل کر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور جلد سے جلد کامیاب ہوں کیسی سادہ اور کیسی مکمل یہ دُعا ہے اور پھر کیسی وسیع ہے زندگی کا وہ کونسا مقصد ہے جس کے متعلق ہم اس دُعا کو استعمال نہیں کر سکتے اور جو شخص یہ دُعا مانگنے کا عادی ہو وہ کس کس رنگ میں اپنی محنت کو زیادہ سے زیادہ بارآور کرنے کی کوشش نہ کرے گا کیونکہ جس شخص کو ہر وقت یہ یاد کرایا جائے گا کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے اچھے طریق بھی ہیں اور بُرے طریق بھی ہیں اور یہ کہ اسے ہمیشہ اچھے طریق کے تلاش کرنے اور اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور پھر اچھے طریقوں میں سے بھی اس طریق کو اختیار کرنا چاہیئے جو سب سے قریب ہو اس کا دماغ کس طرح اس تعلیم کو اپنے اندر جذب کریگا ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے گا کہ اسے صراط مستقیم دکھایا جائے اس کا دماغ خود بھی اس خیال سے متاثر ہوگا اور اس کی اپنی کوشش بھی اپنے سب کاموں میں ایسے ہی راستہ کی تلاش میں خرچ ہوگی اور جو شخص اپنے کاموں میں ان اصول کو مدنظر رکھے گا کہ (۱) میرے سب کام جائز ذرائع سے ہوں (۲) میں کسی ایک مقام پر پہنچ کر سستی نہ پا جاؤں بلکہ غیر محدود ترقی کی خواہش میرے دل میں رہے (۳) اور میرا وقت ضائع نہ ہو بلکہ ایسے طریق سے کام کروں کہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں ہر کام کو پُورا کرلوں اس کے مقاصد کی بلندی اور اس کے اعمال کی درستی اور اسکی محنت کی باقاعدگی میں کیا شک کیا جا سکتا ہے۔

صراط

مستقیم

اھدنا الصراط المستقیم کی آیت میں جامع دعا۔ انسان کی درستی کے لئے تین زریں اصول۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان اس دُعا کو اخلاص سے مانگتے رہیں اور اس کے مطالب کو ذہن نشین کریں تو دُعا کے رنگ میں تو جو فائدہ ہوگا وہ تو ہوگا ہی اس کا جو اثر طبعی طور پر مسلمانوں کے دماغ پر ہوگا وہ بھی کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔

آیت اھدنا الصراط المستقیم پر طلب ہدایت کے متعلق ایک اعتراض کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبِ ہدایت سے رکو

بعض معترض کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر نماز میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہنے کا حکم دیا گیا تھا اور ان کے رسول بھی یہ دُعا روزانہ مانگتے تھے پھر کیا انہیں صراط مستقیم ملی نہ تھی کیا بار بار دُعا مانگتے تھے۔ کس قدر مضحکہ خیز یہ اعتراض ہے اور کس قدر تعجب ہے کہ پڑھے لکھے مسیحی اور ہندو بے تکلفی سے یہ اعتراض بیان کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ مسلمان اب اس کا کیا جواب دیں گے۔ اوّل تو جیسا کہ اوپر ہدایت کے معنے بیان ہو چکے ہیں ہدایت کے معنے صرف کسی بات کے بتانے کے نہیں ہوتے بلکہ بتلانے اس تک لے جانے اور آگے ہو کر لئے چلے جانے کے ہوتے ہیں پس مختلف قسم کے دُعا کرنے والوں کے لئے اس کے مختلف معنے ہونگے وہ جنہیں ہدایت کا علم بھی حاصل نہیں ہُوا ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے یہ معنے ہونگے کہ ہمیں بتا کہ ہدایت کیا ہے اور کس مذہب یا کس طریق میں ہے اور جن لوگوں کو ہدایت کا علم تو ہو چکا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں ان کے لئے مشکلات ہیں نفس میں کمزوری ہے یا دوست احباب ایسے مخالف ہیں کہ صداقت قبول

ہدایت کے غیر محدود درجات۔

کرنے سے باز رکھ رہے ہیں یا رہبر کامل دُور ہے اور اس تک پہنچنا مشکل ہے یا اس علاقہ میں صحبت صالح میسر نہیں اس شخص کے لحاظ سے اس دُعا کے یہ معنے ہونگے کہ مجھے ہدایت تک پہنچا دے یعنی علمی رنگ میں تو مَیں ہدایت کو سمجھ گیا ہوں مگر عملی طور پر اس کے اختیار کرنے میں جو دقتیں ہیں انہیں بھی دُور کر دے لیکن اگر کوئی ایسا شخص ہے جسے علمی طور پر بھی ہدایت میسر آگئی ہے اور عملی مشکلات بھی دُور ہو گئی ہیں اور وہ ہدایت کے راستوں پر قدم زن ہے تو اس کے لئے اس دُعا کے یہ معنے ہونگے کہ اے خدا تیری ہدایت وسیع ہے اور عرفان کی راہیں غیر محدود ہیں مجھے اپنے فضل سے ہدایت کے راستہ پر آگے بڑھاتا لئے چل میرا قدم کسی جگہ نہ ٹھیرے اور مَیں صداقت کے اسرار سے زیادہ سے زیادہ واقف ہوتا جاؤں اور آگے سے زیادہ مجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق ملتی جائے۔ ان تینوں معنوں کو مدِنظر رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسا ہو سکتا ہے جسے کسی وقت بھی اس دُعا سے استغنا حاصل ہو جائے مسلمانوں کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیشک بہت کامل تھے لیکن اسلام کا خدا غیر محدود طاقتوں والا ہے کوئی کتنی بھی ترقی کر جائے پھر بھی ترقی کی گنجائش اس کے لئے باقی رہتی ہے اور پھر بھی اس کے لئے ضرورت باقی رہتی ہے کہ وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا کرتا رہے۔

دین تو دین دنیا کے متعلق بھی انسان کا علم بڑھتا رہتا ہے اور کوئی علم بھی تو ایسا نہیں جس میں مزید ترقی کی گنجائش نہ ہو پس دُنیا کے کاموں میں بھی انسان محتاج ہے کہ ہمیشہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا کرتا رہے کہ اس کے ذریعہ سے علم کی ترقی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دُعا بجائے محلِ اعتراض ہونے کے علم کے بارہ میں اسلام کا ایسا وسیع نظریہ پیش کرتی ہے جو قرآن کریم کی برتری کی ایک زبردست دلیل ہے قرآن پہلے مذاہب کی موجودگی میں آیا اور انہیں منسوخ کر کے اس نے ایک نئے اور مکمل دین کے قیام کا دعویٰ کیا مگر باوجود اس کے اس نے دوسرے ادیان کی طرح یہ نہیں کہا کہ اس کے زمانہ میں علم ختم ہو گیا بلکہ یہ کہا کہ اس کے ذریعہ سے علم کی زیادتی ہمیشہ ہوتی رہے گی اور اس کے لئے مسلمانوں کو دُعا سکھائی اور ان پر واجب کیا کہ وہ اسے ہر روز تیس پینتیس دفعہ پڑھا کریں اس طرح اس نے علم کی ترقی کے لئے انسانی نظریہ کو کس قدر وسیع کر دیا ہے

کیا قرآن کریم دُنیا میں علم کی زیادتی کی وجہ سے کسی وقت منسوخ ہو جائے گا۔

بعض لوگ اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس سے تو معلوم ہُوا کہ قرآن کریم آخری ہدایت نامہ نہیں کیونکہ اگر علم کی زیادتی ہوتی رہتی ہے تو کیوں تسلیم نہ کیا جائے کہ کسی وقت قرآن کریم بھی منسوخ ہو جائے گا اور اس کی جگہ کوئی اس سے بہتر کتاب لے لیگی اس کا جواب یہ ہے کہ

اوّل تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ قرآن کریم سے بہتر کتاب کوئی لے آئے اور قرآن کریم کو منسوخ قرار دیدے لیکن تیرہ سو سال میں تو ایسی کتاب کوئی آئی نہیں فلسفیوں اور غلط مذاہب کے دلدادوں نے بہت زور لگایا لیکن اب تک ناکام ہی رہے ہیں پس جبکہ ایسی کوئی کتاب اب تک مقابل پر پیش نہیں کی جاتی تو ہم اس پر غور ہی کیوں کریں۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ قرآن روحانی عالم ہے جو جسمانی عالم کا حال ہے وہی اس کا ہے دنیوی امور میں بھی انسانی علم ہر روز ترقی کرتا ہے مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ ہر روز نئی دنیا بنتی ہے بلکہ اسی پرانی دنیا کے اسرار اور غوامض لوگوں پر ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اسی طرح قرآن کریم کے نزول کے بعد جو روحانی عالم ہے کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں رہی مگر علم کی ترقی میں اس نے روک نہیں پیدا کی جس طرح مادی قانون کے مطالعہ سے دنیوی علوم میں ترقی ہو رہی ہے اسی طرح قرآن کریم اپنے اندر وسیع اور انسانی پرواز کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر محدود علم رکھتا ہے جو لوگ اس پر غور کرتے ہیں جس قدر اخلاص ان کی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا میں ہوتا ہے اسی کے مطابق قرآن کریم کے اسرار ان پر کھلتے چلے جاتے ہیں پس باوجود قرآن کریم کے آخری کتاب ہونے کے علم کی ترقی میں کمی نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بھی اس ترقی کی رفتار تیز ہو گئی ہے قرآن کریم کے صریح ارشاد سے ان معنوں کی تصدیق ہوتی ہے فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ع ۲) جو لوگ ہدایت پاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ پھر اور ہدایت دیتا ہے پس ہدایت کسی ایک شے کا نام نہیں بلکہ صداقتوں کی ایک وسیع زنجیر کا نام ہے جس کی ایک کڑی ختم ہوتی ہے تو دوسری سامنے آ جاتی ہے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں جس کے بارہ میں شافی علم قرآن کریم میں نہیں اس حقیقت کی موجودگی میں کسی دوسری شریعت کا پیغام سننا ایسا ہی ہے جیسے چشمہ پر بیٹھا ہوا انسان پانی کی تلاش کے لئے نکل کھڑا ہو۔

مجھے تعجب آتا ہے ان لوگوں پر جو ہر روز اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا مانگتے ہیں اور پھر خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ پہلے مفسر لکھ گئے اس سے بڑھ کر کچھ لکھنا ناجائز ہے ان کے بیان کردہ علوم کے باہر کوئی علم قرآن کریم میں نہیں ہے اگر یہ بات سچ ہے تو وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کیوں مانگتے ہیں ان کے عقیدہ کے مطابق خدا تعالیٰ کے پاس تو ان کے دینے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں انہیں پرانی تفسیریں خرید کر یا دوسروں سے مانگ کر پڑھ لینی چاہئیں اور اس دعا میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

اِهْدِنَا الصراط المستقیم میں دین اور دنیا کے ہر معاملہ کے لئے دعا

(یہ دعا ایسی جامع ہے کہ دین اور دنیا کے ہر معاملہ میں اس سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ہدایت کا طالب خواہ کسی مذہب کا ہو اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں صرف سیدھے اور بے نقص راستہ دکھانے کی التجاء ہے کسی مذہب کا نام نہیں کسی خاص طریقہ کا ذکر نہیں۔ کسی معیّن اصل کی طرف اشارہ نہیں صرف اور صرف صداقت اور غیر مخلوط اور خالص صداقت کی درخواست ہے جسے ہر شخص اپنے عقیدہ اور خیال کو نقصان پہنچائے بغیر دہرا سکتا ہے۔ ایک مسیحی ایک یہودی ایک ہندو ایک زرتشتی ایک بدھ ایک دہریہ بھی ان الفاظ پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ دہریہ خدا تعالیٰ کو نہیں مانتا لیکن وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ مجھے سیدھا راستہ دکھا پس یہ دعا جامع بے ضرر اور عام ہے ہر شخص ہر حالت میں اس کا محتاج ہے اور اس کے مانگنے میں اسے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا میرا تجربہ ہے کہ جن غیر مذاہب کے لوگوں نے میرے کہنے پر یہ دعا مانگی ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اسلام کی سچائی کھول دی ہے اور میں تجربہ کی بناء پر یقین رکھتا ہوں کہ جو کوئی بھی سچے دل سے یہ دعا مانگے گا اس کی ہدایت کے لئے ضرور کوئی سامان خدا تعالیٰ کی طرف سے پیدا کیا جائے گا کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اس

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ

ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا جن پر نہ تو (بعد میں تیرا)

ع ۱ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

غضب نازل ہوا (ہے) اور نہ وہ گمراہ (ہو گئے) ہیں ۵۵

وَلَا الضَّآلِّين

دنیا کا پیدا کرنے والا موجود ہو اور ہدایت کے لئے چلانے والا اس کے دروازہ سے مایوس آئے۔

اَنْعَمْتَ

۵۵ حل لغات۔ اَنْعَمْتَ۔ انعام سے ہے انعام کے معنی فضل کرنے اور زیادہ کے ہیں (اقرب) یہ لفظ ہمیشہ اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ منعم علیہ یعنی جس پر احسان ہوا ہو عقل والی ہستی ہو (مفردات) غیر ذوی العقول کی نسبت مثلاً گھوڑے بیل کی نسبت کبھی نہیں کہیں گے کہ فلاں شخص نے اس گھوڑے یا بیل پر انعام کیا ہاں یہ کہیں گے کہ فلاں انسان پر انعام کیا

اَلْغَضَب

اَلْغَضَبُ۔ ثَوَرَانُ دَمِ الْقَلْبِ اِرَادَةَ الْاِنْتِقَامِ غضب جرم کی سزا دینے کے ارادہ پر دل میں خون کے جوش مارنے کو کہتے ہیں قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِتَّقُوا الْغَضَبَ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ تُوْقَدُ فِيْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَمْ تَرَوْا اِلٰى اِنْتِفَاخِ اَوْدَاجِهٖ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غضب سے بچو کیونکہ وہ ایک چنگاری ہے جو ابن آدم کے دل میں سلگائی جاتی ہے پھر فرمایا کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب کسی کو غضب آتا ہے تو اسکی رگیں پھول جاتی ہیں اور اسکی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں وَاِذَا وُصِفَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ فَالْمُرَادُ الْاِنْتِقَامُ دُوْنَ غَيْرِهٖ اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو تو اس کے معنی صرف مجرم کی سزا دینے کے ہوتے ہیں دوسری باتیں اس وقت مدنظر نہیں ہوتیں (مفردات) پس غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کے یہ معنی ہوئے کہ جن کے افعال کو اللہ تعالیٰ نے برا قرار دیکر ان کے لئے سزا کا فیصلہ کر لیا ہے

وَلَا الضَّآلِّين۔ ضَلَّ کے معنے سیدھے راستے ہٹ جانے کے ہیں اور یہ لفظ ہدایت کے مقابل پر ہے اور ضلال کا لفظ راستی سے خلاف ہر فعل پر بولا جاتا ہے خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ معمولی فعل ہو یا کوئی بڑا جرم ہو (مفردات) ضَلَّ کے معنے کسی کام میں منہمک ہو جانے کے بھی ہیں قرآن کریم میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (کہف ع ۱۲) ان کی تمام کوششیں دنیا کی زندگی میں ہی لگی ہوئی ہیں، اور وہ بالکل دنیا کے کاموں میں ہی منہمک ہیں۔ یہی معنے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ) کی آیت میں ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب ہم نے تجھے اپنی محبت میں منہمک دیکھا اور اپنے عشق میں کھویا ہوا پایا تو اس کے نتیجہ میں ہم نے اپنی ذات تک تیری راہنمائی فرمائی اردو میں بھی کھویا ہوا کھویا رہنا انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں فلاں شخص تو آج کل کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے یعنی کسی خاص خیال میں محو رہتا ہے انگریزی میں بھی یہ محاورہ پایا جاتا ہے۔ میں صرف ان حوالوں سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ایک طبعی محاورہ ہے اور فطرت انسانی سے ایک نہایت قریب مناسبت رکھتا ہے اس وجہ سے بہت سی زبانوں نے اسے اختیار کر لیا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے معنی بالکل اسی محاورہ کے مطابق ہیں یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشق الٰہی میں محو ہو گئے تھے اور ہر وقت کھوئے کھوئے رہنے لگ گئے تھے اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند آئی اور یہ عشق اس کے عشق کو جذب کرنے کا موجب ہو گیا۔ پس جو عاشق اس کے عشق میں کھویا گیا تھا

اسے خود جاکر اپنے دروازہ تک لے آیا۔ مگر یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ضَلَّ کا لفظ عام طور پر بُرے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے پس جب اچھے معنوں میں استعمال ہو تو اس کے لئے کسی قرینہ کی ضرورت ہوگی جیسے اوپر کی آیت میں فعلِ نفی کا قرینہ ہے۔

تفسیر۔ جب سیدھے راستہ کے دکھانے کی دُعا سکھائی تو اس میں اس امر کو بھی شامل کیا کہ وہ راستہ ان لوگوں کا ہو جن پر تُو نے انعام کیا ہے یعنی معمولی راستہ نہ ہو بلکہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ ارواح کا راستہ ہو۔

یہ کیسا شاندار مقصد ہے جو ہر مسلمان کے سامنے اسلام نے پہلی ہی سورۃ میں رکھا ہے اسے نیکیوں میں اور اچھی چیزوں میں صرف نیکی کی خواہش نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ انعام جیتنے والوں کی جماعت میں شامل ہونے کی خواہش رکھنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا چھوٹے درجہ پر صبر نہیں کرسکتا۔ خدا تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں ایسی وسعت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ معمولی ترقی پر خوش نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ کی جستجو کے بعد کونسی چیز ہے جو اسے خوش کرسکے گی جو خداؔ کا طالب ہوا وہ ساری ترقیات کا طالب ہوا۔ اور جس نے خدا تعالیٰ کو سمجھ وہ کسی ترقی کو بھی آخری ترقی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر مومن کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ یہ خواہش صرف اس کے دل سے پیدا نہیں ہوتی اس کا رب بھی اسے یہی تعلیم دیتا ہے کہ دیکھنا چھوٹے درجہ پر راضی نہ ہو جانا مجھ سے نیکی مانگو مگر معمولی نیکی نہیں بلکہ وہ نیکی جو ان لوگوں کو حاصل تھی جنہوں نے نیکیوں کی دوڑ میں انعام حاصل کئے تھے اور کسی ایک دوڑ کے انعام حاصل کرنے والوں کا انعام نہیں بلکہ سب انعام پانیوالوں کے انعام مجھ سے طلب کرو۔

لغت کے متعلق تو میں اوپر بتا آیا ہوں کہ انعام کے کوئی خاص معنے نہیں بلکہ ہر اچھی چیز کو جو خوشنودی کے اظہار کے لئے کسی کو دی جائے وہ انعام ہے خواہ وہ دُنیوی ہو یا دینی۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ انہی وسیع معنوں میں آیا ہے سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ (بنی اسرائیل ۹) یعنی جب ہم انسان پر کوئی انعام کرتے ہیں تو وہ مُنہ پھیر لیتا ہے اور ایک طرف ہو جاتا ہے یعنی بجائے انعام پر شکرگزار ہونے کے ہماری طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ انعام کے معنے دُنیا کے سامان علم۔ ہُنر دُنیاوی عزتیں وغیرہ بھی ہیں کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو ایک احسان کا رنگ بھی رکھتی ہیں اور بہت سے لوگ ان احسانات کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ کو بُھلا دیتے ہیں۔

مُسلمانوں کے لئے ایک شاندار مقصد

مصائب اور مشکلات سے بچا لینے کا نام بھی قرآن کریم میں نعمت آیا ہے۔ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (المائدہ ع ۲) اے مومنو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرو جب ایک قوم (بُری نیت سے) تمہاری طرف ہاتھ بڑھانے کا قصد کر رہی تھی تو ہم نے ان کے ہاتھوں کو تم (تک پہنچنے) سے روکے رکھا اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو، اور مومنوں کو چاہیئے کہ اللہ پر ہی توکل کیا کریں۔ اس آیت میں دشمن کے حملوں سے محفوظ کئے جانے کا نام نعمت رکھا گیا ہے۔

گو جہاں ہر احسان نعمت ہے وہاں اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض احسان خاص طور پر نعمت کہلانے کے مستحق ہیں کیونکہ وہ مختلف قسم کے احسانوں میں سے چوٹی کے احسان ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا

وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (مائدہ ع ۴) یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو جبکہ موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اللہ نے جو تم پر نعمت کی ہے اسے ہر وقت اپنی نگاہوں میں رکھو اور وہ نعمت یہ ہے کہ اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو نسل انسانی کی مختلف اقوام میں سے کسی قوم کو نہ دیا تھا۔ اس آیت میں ان اشیاء کو جو انسان کے لئے نعمت قرار پا سکتی ہیں گنا گیا ہے اور یہود کو بتایا ہے کہ ان سب اقسام میں سے انہیں کثیر حصہ دیا گیا ہے۔

نسبتی ترقی کا انعام

تینوں قسم کے انسانی کمالات۔

انسانی کمالات تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) دنیوی ذاتی (۲) دینی ذاتی (۳) اور دینی دنیوی نسبتی یعنی علاوہ دنیوی اور دینی کمالات کی قسموں کے ایک کمال کی قسم یہ بھی ہے کہ کسی فرد یا قوم کو اپنے رقیبوں پر کیا فضیلت حاصل ہے۔ فضیلت کی اس قسم کی طرف انسان فطرتاً بہت راغب ہوتا ہے یعنی وہ صرف کمال کا طالب نہیں ہوتا بلکہ ایسے کمال کا طالب ہوتا ہے جو اسے اپنے ہمعصروں اور رقیبوں پر فضیلت بخشے۔ مذکورہ بالا آیت میں حضرت موسٰی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف تینوں قسم کے کمالات منسوب فرمائے ہیں (۱) ان پر دنیوی انعامات ہوئے یہاں تک کہ وہ قوم ایک لمبے عرصہ تک بادشاہت کی وارث کی گئی۔

سلطنت کا مقصود

تمام دنیوی کمالات اپنے نشوو نما کے لئے بادشاہت چاہتے ہیں اور جس قوم میں بادشاہت آجائے اسے دنیوی ترقی کے سب اسباب میسر آجاتے ہیں خواہ وہ ان سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے اس لئے کسی قوم میں ایک لمبے عرصہ تک بادشاہت کا وجود قائم کر دینے کے یہ معنے ہیں کہ دنیوی ترقیات کے سب رستے اس کے لئے کھول دئے گئے (۲) جس طرح بادشاہت دنیوی کامیابیوں کا ذریعہ ہے اور اسکی آخری منتہا ہے اسی طرح دینی کامیابیوں کا ذریعہ اور دینی ترقی کی منتہاء نبوت ہے اس بارہ میں حضرت موسٰی اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ وہ ذریعہ اور انتہائی انعام بھی تم کو دیا گیا ہے۔ اور ایک دو نبی نہیں بلکہ ایک لمبا سلسلہ انبیاء کا تم کو عطا ہوا ہے۔

(۳) تیسرا انعام نسبتی ترقی ہے یعنی صرف دنیوی یا دینی انعامات نہ ملیں بلکہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں بھی زیادہ ملیں جس سے ہمعصروں پر عزت اور فوقیت حاصل ہو حضرت موسٰی علیہ السلام وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ فرما کر اپنی قوم کو توجہ دلاتے ہیں کہ دوسری اقوام پر برتری کا انعام بھی اللہ تعالےٰ نے تم کو بخشا ہے تم کو بادشاہت ہی نہیں دی بلکہ شہنشاہیت بھی دی ہے اور نبوت ہی نہیں دی بلکہ ایسے انبیاء عطا کئے جو دوسرے نبیوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دینے والے ہیں اور جن کے ماتحت اور انبیاءؑ ہیں پس تینوں قسم کے انعام تم کو حاصل ہیں دنیوی بھی اور دینی بھی اور دوسری قوموں پر دنیوی اور دینی برتری بھی۔

یہ قول تو موسٰی علیہ السلام کا ہے لیکن عبارت قرآن کریم کی ہے ایک مبصر اس کے الفاظ کے اختصار اور اس کے معانی کی وسعت کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مل کر معنوں میں بہت وسعت پیدا کر دی ہے ان الفاظ نے ایک مسلمان کا مقصود صرف یہ نہیں قرار دیا کہ وہ اپنے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کے لئے سیدھا راستہ مانگے بلکہ یہ اصل قرار دیا ہے کہ وہ مقاصد عالیہ کے بارہ میں بھی اللہ تعالیٰ سے التجا کرے اور درخواست کرے کہ ہدایت کے راستے ہی مجھے نہ دکھا اور صرف منعم علیہ گروہ میں مجھے شامل نہ کر بلکہ ہدایت کے وہ طریقے اور تعلیمیں اور عرفان کی راہیں بھی مجھے سکھا جو منعم علیہ گروہ پر اس سے پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں یہ اعلیٰ امیدیں پیدا کر کے قرآن کریم نے امتِ محمدیہ پر ایک بہت

بڑا احسان فرمایا ہے۔

گو اس واضح تعلیم کی موجودگی میں اس امر کے ثبوت کے لئے کہ مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ذاتی ترقیات کے راستے کھلے ہیں کسی مزید ثبوت کی ضرورت تو نہ تھی مگر چونکہ مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی پیدا ہوگئی ہے ہم قرآن کریم سے دیکھتے کہ اس ہدایت طلبی کے معنے قرآن کریم نے کیا لئے ہیں اور کیا اس دُعا کی قبولیت کا بھی کوئی وعدہ کیا ہے یا نہیں سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (نساء ع ۹) یعنی اگر کمزور مسلمان بجائے نافرمانیوں کے حقیقی اطاعت کا نمونہ دکھائیں اور) جو ان سے کہا جاتا ہے اس پر عمل کریں تو اس کا نتیجہ ان کے حق میں بہت ہی اچھا نکلے۔ اور اس سے ان کے ایمان مضبوط ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے انہیں بہت بڑا اجر ملے اور اللہ تعالیٰ انہیں صراط مستقیم دکھائے اور انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو اللہ اور اس کے اس رسول یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے منعم علیہ لوگوں میں شامل کرتا ہے یعنی نبیوں میں صدیقوں میں شہیدوں میں اور صالحین میں اور یہ لوگ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کے لئے جو انعامات مقدر ہیں ان کا ذکر ہے اور وہی سورۃ فاتحہ والے الفاظ ہیں یعنی صراط مستقیم دکھانا اور صراط مستقیم بھی ان کا جو منعم علیہ گروہ تھا۔ اور منعم علیہ گروہ کی تشریح فرمائی ہے نبی صدیق شہید اور صالح جس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کو سورہ فاتحہ میں جن اعلیٰ مقامات کے طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے دینی لحاظ سے اس سے مراد اعلیٰ روحانی مقامات ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ سب کے سب مسلمانوں کو ملیں گے۔

بعض لوگ اس موقعہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ سورۃ نساء کی آیت میں مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ہے یعنی وہ منعم علیہ گروہ کے ساتھ ہونگے نہ کہ ان میں سے۔ اس اعتراض کی کمزوری تو خود ہی ظاہر ہے اگر مَعَ کا لفظ نبیوں کے ساتھ ہوتا تب تو کہا جا سکتا تھا کہ امت محمدیہ میں نبی نہ ہونگے مگر ایسے لوگ ہونگے جو نبیوں کے ساتھ رہیں گے لیکن قرآن کریم نے مَعَ کا لفظ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کے ساتھ لگایا ہے پس اگر مَعَ کے معنے یہ کئے جائیں کہ جس لفظ پر مَعَ آیا ہے وہ درجہ مسلمانوں کو نہ ملے گا بلکہ اس درجہ کی معیت ملے گی تو پھر اس آیت کے یہ معنی بنیں گے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی منعم علیہ یعنے انعام پانے والا نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ ہوگا کہ ان کے کچھ افراد انعام پانے والوں کے ساتھ رہیں گے اور ان معنوں کو قرآن۔ حدیث اور عقل سلیم رد کرتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ مَعَ کا لفظ درحقیقت اس تشریح کے ساتھ لگتا ہے جو اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کی اس آیت میں کی گئی ہے تو بھی یہ اعتراض بالبداہت غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ تشریح میں چار گروہوں کا ذکر ہے نبیوں صدیقوں شہیدوں اور صالحوں کا۔ اب اگر مَعَ کے معنے صرف معیت کے ہیں نہ کہ گروہ میں شمولیت کے تو پھر اس تشریح کے مطابق اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ مسلمان نبی نہ ہونگے بلکہ نبیوں کے ساتھ رہیں گے۔ صدیق نہ ہوں گے بلکہ صدیقوں کے ساتھ رہیں گے۔ اسی طرح شہید اور صالح نہ ہونگے بلکہ شہیدوں اور صالحوں کے ساتھ رہیں گے اس سے زیادہ غلط معنے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور امت محمدیہ کی ہتک کیا ہو سکتی ہے کہ اس امت میں نبی تو الگ رہے صدیق اور شہید اور صالح بھی نہ ہونگے

نبوت موہبت ہے تو اس کیلئے دُعا کی کیوں ضرورت ہے

بعض لوگوں نے اس جگہ پر اعتراض کیا ہے کہ نبوت تو موہبت ہے اس کے لئے دُعا کے کیا معنی اس کا جواب یہ ہے کہ دُعا انسان نبوت کے لئے نہیں کرتا۔ امت محمدیہ تو دُعا اس امر کے لئے کرتی ہے کہ خدا تعالےٰ اسے اعلےٰ سے اعلےٰ انعام عطا فرمائے یہی اس آیت کا مفہوم ہے آگے یہ اللہ تعالےٰ کی مشیت ہے کہ وہ جس پر جو چاہے انعام کرے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (انعام ع ۱۵) نبوت بیشک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے بعد کوئی نبی کیونکر ہوسکتا ہے

موہبت ہے مگر یہ موہبت ابوجہل پر کیوں نہ ہوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں ہوئی۔ موہبت کو جذب کرنے کے لئے بھی تو ایثار اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے دوسرے یہ کون کہتا ہے کہ مومن کو یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ دُعا کرے کہ یا اللہ مجھے نبوت عطا کر۔ ایسی دُعائیں روحانی امور تو الگ رہے دُنیوی امور کے لئے بھی بعض دفعہ ناپسندیدہ و مکروہ ہونگی۔ کوئی بڑھئی یہ دُعا شروع کر دے کہ یا اللہ مجھے کالج کا پرنسپل بنادے۔ یا کوئی لولا لنگڑا یہ دُعا کرے کہ یا اللہ مجھے فوج کا سپہ سالار بنادے تو یہ دُعائیں لغو اور فضول ہونگی۔ دُعاؤں کی قبولیت حالات اور مصالح آسمانی کے ماتحت ہوتی ہیں۔ پس مومن کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ رُوحانی مقامات کے لئے نام لے کر دُعا کرے۔ نبوت تو الگ رہی اگر کوئی یہ دُعا کرے کہ یا اللہ مجھے صدیق بنادے۔ مجھے قطب بنا دے۔ مجھے شہید بنا دے۔ تو یہ دعا بھی ناپسندیدہ ہوگی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے اِھْدِنَا کہہ کر دُعا سکھائی ہے اِھْدِنِیْ کے الفاظ نہیں رکھے کیونکہ جمع کے الفاظ میں قومی ترقی کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ قوم میں سے جسے جس قرب کے مقام کے لئے چُنا جاسکتا ہے اس کے لئے اسے چن لیتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دُعا حصولِ انعام کے لئے ہے پس جب نبوت بھی موہبت یعنی انعام ہے تو اگر اس دُعا کو قوم

مقام نبوت کے حاصل ہوجانے کے بعد آنحضرت کے اھدنا کی دُعا کرنے سے مُراد۔

اِھْدِنَا …… الخ آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کرنے کی حکمت

کے لئے حصولِ نبوت کی دُعا قرار دیا جائے تو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس دُعا میں ہر قسم کے انعامات کے طلب کرنے کی دُعا سکھائی گئی ہے اور تمام کاموں میں صحیح راہ نمائی کی دُعا سکھائی گئی ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ سب انعامات مسلمانوں کو ملیں گے اور ان میں وہ خود نبوت کو شامل فرماتا ہے پس اس انعام کو الگ رکھنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

اس جگہ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں تو آپ کے بعد نبی کس طرح آسکتا ہے سو اس اعتراض کا جواب بھی سورۂ نساء کی آیت میں موجود ہے کیونکہ اس آیت میں وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ کے الفاظ ہیں یعنی اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والے کو یہ انعام ملیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ جو مطیع ہوگا اس کا کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام سے الگ نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ کوئی شریعت لاسکتا ہے پس جو نبی محمد رسول اللہ کے تابع ہوگا وہ خاتم النبیین کے خلاف نہیں بلکہ اس کے معنوں کو مکمل کرنے والا ہوگا

ایک صاحب جو اس زمانہ کے مفسر ہیں۔ اور اپنے ترجمہ قرآن کریم کو بار بار پیش کرنے کے عادی ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر یہ دُعا نبوت کے حصول کے لئے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام نبوت سے کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت کے ملنے کے بعد سکھائی گئی پس نبوت عطا فرمانے کے بعد اس دُعا کا سکھانا بتاتا ہے کہ حصولِ نبوت کے لئے یہ دُعا نہیں۔ یہ اعتراض انتہاء درجہ کا بودا اور مصنف کے قلت تدبر پر دلالت کرتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں جو دُعا سکھائی گئی ہے وہ تو ایک طبعی دعا ہے ان الفاظ میں دُعا کرنا صرف اس لئے

بابرکت ہے کہ قرآنی الفاظ مبارک ہیں اور غلطی سے پاک ورنہ تمام حق کے متلاشی خواہ کسی مذہب کو ماننے ہوں یا نہ ماننے والے ہوں جب ان کے دل میں صداقت کے پانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ انہی کے ہم معنی الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اور اپنے پیاروں کا راستہ دکھا۔ کیا کوئی معقول انسان بھی یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نبوت سے پہلے یہ خواہش پیدا نہ ہوئی تھی کہ خدا تعالیٰ انہیں سیدھا راستہ دکھائے اور اپنے پیاروں کی راہ پر چلائے۔ اس قسم کا تو خیال بھی انسان کو کافر بنا دیتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی تڑپ ہی تو تھی جس نے خدا تعالیٰ کے فضل کو اپنی طرف جذب کیا اس تڑپ کو ہی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآنی الفاظ نے صرف یہ فرق پیدا کیا ہے کہ اول الفاظ ایسے چُنے ہیں جو کامل ہیں اور ہر نقص سے پاک ہیں۔ دوسرے ان کے ذریعہ سے ان کے دل میں بھی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے دل میں یُوں تڑپ نہ ہوتی۔ تیسرے امید پیدا کر دی گئی ہے کہ ایسی دُعا کرو گے تو قبول ہو گی۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ یہ دُعا کرو۔ ورنہ یہ خیال کرنا کہ اس قسم کا مفہوم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ہتک ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہتک ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تو سیدھا راستہ پانے کی کوئی تڑپ نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے زبردستی آپ کو نبی بنا دیا (نعوذ باللہ من ذٰلک الخرافات)

پھر اگر یہ اعتراض معقول ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے نزول سے پہلے نیک تھے یا نہیں خدا تعالیٰ کی محبت میں سرشار تھے یا نہیں۔ خدا تعالیٰ کا قرب انہیں قرآن کریم کے نزول سے پہلے حاصل تھا یا نہیں۔ اگر ان باتوں کے جواب اثبات میں ہیں تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ پھر ہمیں اس نماز کی کیا ضرورت ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہے اس قسم کے روزہ کی کیا ضرورت ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہے اس قسم کے جہاد کی کیا ضرورت ہے یا اور دوسرے شرعی احکام کی کیا ضرورت ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقویٰ اور محبت الٰہی بغیر ان احکام پر عمل کرنے کے حاصل ہو گیا تھا تو ہمیں بھی ان کے بغیر حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ دین کے معاملات کو جانے دو۔ دنیوی چیزوں میں ہی اگر کوئی کہے کہ پہلی مرغی یا پہلا انڈا کیونکر بنا تھا۔ پہلا دانہ اور پہلا درخت کیونکر بنا تھا اب بھی اسی طرح بن جائیگا ہمیں ان کے پیدا کرنے کے لئے قانون قدرت کے مطابق کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے تو اس شخص کو ہر کوئی نادان کہیگا خدا تعالیٰ کا قانون اس وقت کے لئے جب بیج مٹ جاتا ہے اور ہے اور جب بیج پیدا کر دیا جاتا ہے اور ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کے نزول سے پہلے دنیا سے پاکیزہ تعلیم مٹ چکی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک فطرت میں جذبات محبت پیدا ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بغیر اس کے کہ وہ خاص الفاظ یا خاص انداز میں بیان کئے جاتے ان کو قبول کیا اور نوازا۔ لیکن جب قرآن کریم نازل ہو گیا۔ ہر اک امر کے لئے خاص قواعد بن گئے تو اب ان کے بغیر وہ نعمتیں حاصل نہیں ہو سکتیں جو اس سے پہلے حاصل ہو سکتی تھیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اور شریعت کی بنیاد رکھ دی اور اب اس قانون اور شریعت سے باہر رہنے والا ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا

نبی کے مقام کی تشریح۔

اس سوال پر ایک اور پہلو سے بھی نظر کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ کیا نبی صرف ایک عہدہ کا نام ہے یا نبی کے لئے تقویٰ طہارت اور تقرب الی اللہ کی بھی شرط ہے اگر ان باتوں کا پایا جانا نبی کے لئے شرط ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ غیر نبی۔ نبی سے تقویٰ اور طہارت اور قُرب الی اللہ میں زیادہ ہو۔ اگر تو اس کا جواب یہ مقرر

اوران کے ہمنوا یہ دیں کہ ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک غیر نبی تقویٰ طہارت اور قرب الی اللہ میں نبی سے بڑھ کر ہو تو پھر نزاع لفظی رہ جاتی ہے لیکن اگر اس سوال کا جواب یہ ہو کہ غیر نبی نبی سے ان باتوں میں افضل نہیں ہو سکتا تو جو شخص یہ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ظلی بروزی اور نبوت محمدیہ کی تابع نبوت بھی نہیں ہو سکتی وہ یہ کہتا ہے کہ اس امت میں کوئی شخص قرب الٰہی کے اس مقام کو نہیں پہنچ سکتا جس مقام پر پہلے لوگ پہنچے تھے اور ایسا دعویٰ کرنے والا شخص یقیناً امتِ محمدیہ کو انعام سے محروم قرار دیتا ہے۔

اجرائے نبوت کے متعلق ایک اعتراض کا جواب۔

ایک اعتراض انہی معترض صاحب نے یہ کیا ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ تیرہ سو سال میں ایک مسلمان کی بھی دعا اس بارہ میں قبول نہ ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت تو دعا کی مقدار اور نوعیت پر منحصر ہے یہ معترض صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ صدیقیت کا مقام اس امت میں مل سکتا ہے پس یہی سوال ان کے مسلمات کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس امت میں کتنے لوگوں کو صدیقیت کا مقام ملا ہے اگر گزشتہ تیرہ سو سال میں صرف ابوبکرؓ کو ملا ہے تو یہی اعتراض پھر بھی پڑے گا کہ کیا تیرہ سو سال میں یہ دعا اور کسی کے حق میں قبول ہی نہ ہوئی اور اگر اوروں کو بھی ملا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا وہ اشخاص عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ سے بڑھ کر تھے یا کم۔ اگر کم تھے تو پھر یہ کیونکر ہوا کہ کم درجہ کے لوگ صدیق بن گئے اور بڑے درجہ کے لوگ شہید تک ترقی پا سکے صدیق نہ کہلا سکے۔

غرض جو اعتراض نبوت کے اجراء پر ہوتا ہے وہی اعتراض صدیقیت کا دروازہ کھلا تسلیم کر کے اس پر ہوتا ہے پس یہ اعتراض محض قلت تدبر کی وجہ سے ہے حقیقت پر مبنی نہیں۔

اس آیت کے بارہ میں ایک اور نکتہ بیان کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کے جو نام بتائے ہیں ان میں سے دو نام ام القرآن اور ام الکتاب بھی ہیں (ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ) میرے نزدیک یہ نام قرآن کریم ہی سے مستنبط ہیں اور ان کا ماخذ یہی آیت ہے۔ اس آیت اور پہلی آیت میں بتایا ہے کہ عبادت الٰہی کی آخری منزل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے منعم علیہ گروہ والا صراط مستقیم طلب کرے۔ اب اگر یہ دعا قبول ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ جب انسانی دل سے بحیثیت قوم اللہ تعالیٰ کی طرف پکار بلند ہوگی کہ ہم تباہ ہو رہے ہیں ہمارے لئے ہدایت کا راستہ کھولا جائے اور اس کے ساتھ اس ندا کے اس کمل اور پاکیزہ دل کی التجا اور تڑپ بھی شامل ہو جائے گی جسے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کا مرد میدان بنایا ہے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا رحم جوش مارے گا اور فضل الٰہی الہام اور ہدایت کی صورت میں نازل ہوگا اسی طرح ہر زمانہ میں ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائیگا۔ نوحؑ کے وقت کے مظلوموں کی دعائیں حضرت نوح علیہ السلام کے مطہر قلب کی گریہ وزاری سے مل کر اس کلام کو لائی تھیں جو نوح علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت کی ارواح کی پکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب صافی کی تڑپ کے ساتھ مل کر صحفِ ابراہیم کے نزول کا موجب ہوئی تھی۔ یہی قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں گزرا اور اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہوا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نزول قرآن کریم سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے الگ ہو کر غارِ حرا میں جا کر دعائیں اور عبادت کیا کرتے تھے یہ تو قلب اطہر کی حالت تھی جو اپنے خیالات کو پڑھنے کی طاقت رکھتا ہے اس کے علاوہ دنیا کی مخفی آہیں بھی آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھیں ان سب نے مل کر خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کیا اور قرآن کریم نازل ہوا۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ درحقیقت اسی حالت کا نقشہ ہے جو

نزول کلام سے پہلے دُنیا کی ہوتی ہے خصوصاً اس زمانہ کی پاکیزہ ارواح کی جن کے دل سے صرف آہ ہی نہیں اٹھتی بلکہ ان کے دماغ میں بھی ایک تلاطم بپا ہوتا ہے اور اسی کے نتیجہ میں اس زمانہ کا کلام نازل ہوتا ہے پس چونکہ یہ دُعا سورۂ فاتحہ میں نازل ہوئی ہے اور یہی دُعا ہے جو کلام الٰہی کے نزول کا موجب ہوئی ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ کا نام امّ القرآن اور امّ الکتاب رکھا یعنی سورۂ فاتحہ میں وہ مضمون بیان ہوا ہے جو نزول قرآن کا موجب ہوا اور چونکہ کسی امر کے وجود کا موجب بمنزلہ ماں کے ہوتا ہے اس لئے سورۃ فاتحہ امّ القرآن کہلائی۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم قرار دیا ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن عظیم ہے اور باقی قرآن چھوٹا ہے کیونکہ یہ امر بالبداہت غلط ہے پس اس کی وجہ اور ہے اور میرے نزدیک وہ وجہ امّ القرآن اور امّ الکتاب والے نام ہیں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ کو امّ القرآن اور امّ الکتاب کہا تو آپؐ نے خیال فرمایا کہ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ سورہ قرآن کریم سے الگ ہے اس لئے آپؐ نے اس کا نام قرآن عظیم بھی رکھا تا کہ مسلمانوں پر یہ واضح رہے کہ سورہ فاتحہ قرآن کریم سے باہر نہیں بلکہ اس کا حصہ ہے کسی چیز کا حصہ بھی چونکہ پوری چیز کے نام میں شریک ہوتا ہے اس لئے آپؐ نے سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم فرمایا۔ ہم ہمیشہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ سُننا چاہیں تو کہتے ہیں کہ حافظ صاحب قرآن کریم کی تلاوت فرمائیں یا کہتے ہیں کہ فلاں شخص قرآن کریم پڑھ رہا ہے یا ایک آیت میں جو مضمون ہوتا ہے اس کے بارہ میں کہتے ہیں کہ قرآن یُوں کہتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہمارے نزدیک صرف وہ سورۃ یا آیت قرآن ہے باقی قرآن نہیں بلکہ ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ سورۃ یا وہ آیت جسے ہم پڑھتے ہیں یا جس کا حوالہ دیتے ہیں قرآن کا حصہ ہے۔

سُورۃ فاتحہ کے امّ القرآن اور قرآن عظیم ہونے میں ایک لطیف نکتہ۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ کو امّ القرآن اور امّ الکتاب بھی فرمایا ہے اور قرآن عظیم بھی فرمایا ہے گویا ایک طرف اسے ذریعہ پیدائش قرار دیا دوسری طرف اسے وہ چیز بھی قرار دیا جو اس سے پیدا ہوتی ہے اس میں ایک زبردست روحانی نکتہ نکلتا ہے اور [illegible] یہ ہے کہ رُوحانی دنیا میں پہلی حالت دوسری حالت کی پیدا کرنے والی ہوتی ہے اس لئے پہلی حالت ایک جہت سے ماں کہلاتی ہے اور بعد کی حالت اولاد کہلاتی ہے اسی نسبت سے سورۃ فاتحہ کو امّ القرآن بھی کہا گیا اور بوجہ اس کے کہ وہ خود قرآن بھی ہے اسے قرآن بھی کہا گیا۔ انسانوں کے متعلق بھی ایسے ہی تغیّرات کے مواقع پر اس قسم کے تشبیہی الفاظ استعمال کر لئے جاتے ہیں چنانچہ سورہ تحریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مومنوں کی مثال اِمْرَأَةَ فِرْعَوْنَ اور مَرْيَمَ بنت عِمْرَان سے دی جا سکتی ہے اور جو مومنوں کی مثال مریم بنت عمران سے دی ہے ان کے متعلق آخر میں فرماتا ہے فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ (سورہ تحریم ع۲) ہم نے اس کے اندر اپنا کلام پھونکا اور وہ اپنے رب کے کلام پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لائی اور آخر وہ ایک فرمانبردار مرد کی طرح ہو گئی یعنی جو لوگ مریمی صفت ہوتے ہیں جب ترقی کرتے کرتے کلام الٰہی کے مورد ہو جاتے ہیں تو مسیحی نفس بن جاتے ہیں۔

سُورۃ فاتحہ کے قرآن عظیم ہونے سے مراد

غرض سورہ فاتحہ کا نام امّ القرآن اور امّ الکتاب بھی رکھنا اور اسے قرآن عظیم بھی کہنا اسلامی اصطلاحات پر ایک لطیف روشنی ڈالتا ہے اور ان لوگوں کے لئے اس میں ہدایت ہے جو اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکے کہ اُمّت محمدیہ کے ایک شخص کا نام کس طرح مریم بھی رکھا گیا اور عیسیٰ بھی۔ اگر سورہ فاتحہ کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی اُم بھی فرماتے ہیں اور قرآن بھی۔ تو ایک سچے مسلمان کے لئے اس امر کا سمجھنا کیا مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو مریم بھی فرماتا ہے اور عیسیٰ بھی۔ اسکی وہ حالت جب وہ خدا کے سامنے اس زمانہ میں ایک مسیح کے ظہور کے لئے چلا رہی تھی مریمی حالت تھی اور اسکی وجہ سے وہ مریم کہلایا جس طرح سورۃ فاتحہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا کی وجہ سے جو ایک ہدایت نامہ کے لئے پکار رہی تھی اُم القرآن اور اُم الکتاب کہلائی لیکن جب اس فرد کامل کی دُعا سنی گئی اور خدا تعالیٰ نے اسی کو دنیا کے لئے مسیحی نفس عطا کر کے مبعوث فرما دیا تو وہ عیسیٰ کہلایا جس طرح اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی پکار نے بلند ہو کر جب قرآن کریم کو دُنیا کی طرف کھینچا اور یہ دُعا خود اس کا حصہ بن گئی تو ام القرآن اور ام الکتاب کہلانے کے بعد وہ قرآن عظیم کہلانے لگی۔

اس دُعا کے بارہ میں ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جسے صحابہ نے مدنظر رکھا اور ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا نمونہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جسکی مثال دُنیا کی کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی اور اگر بعد کے مسلمان بھی اسے یاد رکھتے تو یقیناً وہ بھی ایسا اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھاتے کہ دنیا کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے یادگار رہ جاتا۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس زرین ہدایت کو جو اس آیت میں بیان کی گئی تھی بھلا دیا اور اس معیار سے گر گئے جس پر کہ اللہ تعالیٰ انہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اگر آج بھی مسلمان اس ہدایت کو اپنا مطمح نظر بنا لیں تو سب تکلیفیں ان کی فوراً دُور ہو سکتی ہیں اور پھر وہ بے مثال عزت اور رفعت حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی ہدایت اور ترقی کے لئے ایک عظیم الشان مطمح نظر۔

وہ سبق جو اس آیت میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اسی طرح دُنیا کی پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے جو قوم اس مقصد کو پُورا کر دے دُنیا کی پیدائش کا اصل مقصود کہلانے کی وہی قوم مستحق ہوگی آدم علیہ السلام دُنیا میں آئے اور کچھ نیکیاں انہوں نے دُنیا کو بتائیں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ نہایت اعلیٰ تعلیم پر مشتمل تھیں۔ ان نیکیوں پر عمل کر کے اس زمانہ کے لوگوں نے بہت بڑی رُوحانی اور اخلاقی تبدیلی پیدا کی اور انکی ذہنی قوتیں پہلے لوگوں سے بہت آگے نکل گئیں مگر ابھی انسان اس کمال کو نہ پہنچا تھا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا پس اسکی ترقی کے لئے جستجو جاری رہی یہاں تک کہ نوح علیہ السلام پیدا ہوئے اور وہ انسان کو ترقی کی بلندی پر ایک منزل اور اونچا لے گئے مگر انسان نے گو نوح علیہ السلام کے ذریعہ سے رُوحانی اور اخلاقی اور ذہنی طور پر ترقی کی مگر ابھی وہ مقصد حاصل نہ ہوا تھا جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا چنانچہ آپ کے بعد اور نبی آیا اور اس کے بعد اور۔ اور اس کے بعد اور۔ اور یہ سلسلہ چلتا چلا گیا یہانتک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ظاہر ہوئی اور آپ نے تمام راز ہائے سربستہ جو انسان پر اب تک پوشیدہ تھے ظاہر کر دیئے اور دینی اور ذہنی اور اخلاقی ترقی کے لئے جس قدر ضروری امور تھے وہ سب کے سب بیان کر دیئے اور گویا علمی طور پر مذہب کو کمال تک پہنچا دیا۔ اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا اعلان کر دیا مگر جب تک اس اعلیٰ تعلیم کو جامۂ عمل نہ پہنایا جاتا اس کے نزول کی غرض پوری نہ ہو سکتی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری طرح کامیاب نہیں کہلا سکتی تھی پس اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں مسلمانوں کو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دُعا سکھائی اور کہا کہ ہمیشہ اپنے سامنے یہ مقصد رکھو کہ جس مقام محمود کو سامنے رکھ کر اس دُنیا نے شروع سے رُوحانی سفر اختیار کیا ہے

اور جسکی مختلف منزلوں تک مختلف انبیاء انسانوں کو پہنچاتے چلے آئے ہیں اور جسکی آخری منزل تک پہنچانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوا ہے اس تک تم پہنچ جاؤ۔

پس سارے کے سارے منعم علیہ گروہ کی نعمتوں سے ہمیں حصہ دے کے یہ معنی ہیں کہ اے خدا ہم کو آدم کی امت کی نیکیاں دے اور پھر ہماری ذہنی ترقی نوح کی امت کی طرح کر پھر ابراہیم کی امت کے مقام پر پہنچا اور پھر موسیٰ کی امت کے کمالات ہمیں دے اور پھر مسیح کی روحانیت کے اثر سے ہمیں حصہ دے اور اس طرح منزل بمنزل روحانی بلندیوں پر چڑھاتے ہوئے بالآخر مقام محمد پر ہم کو قائم کر دے تاکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو اور وہ مقام محمود پر فائز ہو جائیں غرض صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد انسانی کمال کی وہ آخری منزل ہے جسکی طرف شروع سے انسانی قافلہ بڑھتا آ رہا ہے اور جسکی مختلف منزلوں کی راہنمائی مختلف زمانہ کے انبیاء کے سپرد تھی اور جس کی آخری منزل تک پہنچانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوا تھا اور اس دعا کے ذریعہ سے امت محمدیہ کے افراد درخواست کرتے ہیں کہ الٰہی دین کی تکمیل تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تو نے کر ہی دی ہے اب یہ امر باقی ہے کہ ہم لوگوں کے اعمال بھی اس دین کے مطابق ہو جائیں اور ہم ان تمام مخفی اور اعلیٰ قوتوں کا اظہار کریں جنکی مختلف انبیاء کے ذریعہ سے نشوونما کی جا چکی ہے اور جن کا پیدا کرنا انسانی پیدائش کا آخری اور اعلیٰ مقصد ہے سو اس کام کے لئے ہم کھڑے ہو گئے ہیں اب تو ہماری مدد کر اور ان سب منازل عرفان کو یکجائی طور پر طے کرا دے جنہیں فرداً مختلف انبیاء کے ذریعہ سے مختلف اقوام طے کر چکی ہیں تاکہ انسانی پیدائش کا مقصد امت محمدیہ کے ذریعہ سے پورا ہو جائے۔

صحابہؓ نے اس مقصد کو سامنے رکھا اور زمانہ سابق کی سب اقوام کے اخلاق کو یکجائی طور پر اپنے وجود میں پیدا کر کے ایک بے مثال نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا آج اگر ہماری جماعت اس مقصد کو پھر اپنے سامنے رکھ لے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام محمود پر مبعوث ہونے کا وقت اور بھی قریب ہو جائے گا اور دنیا اپنی پریشان کن بے تابیوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

مغضوب اور ضال قوم سے مراد۔

ہر شخص یا قوم جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے اس کے غضب کو بھڑکا چکی ہو مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں شامل ہے اسی طرح ہر قوم جو غیر اللہ کی محبت میں کھوئی گئی ہو اور اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھی ہو وہ ضال ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں لفظوں کے خاص معنے بھی کئے ہیں امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں عدی بن حاتم سے ایک لمبی روایت نقل کرتے ہیں جس کے آخر میں ہے۔ قَالَ (یعنی رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اِنَّ الْمَغْضُوْبَ عَلَيْهِمْ الْيَهُوْدُ وَاِنَّ الضَّآلِّيْنَ النَّصَارٰى۔ مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اسی طرح ترمذی نے بھی یہی روایت نقل کی ہے اور اس کے بارہ میں کہا ہے کہ حسن غریب ہے ابن مردویہ نے ابوذر غفاریؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ قَالَ الْيَهُوْدُ قُلْتُ الضَّآلِّيْنَ قَالَ النَّصَارٰى (بحوالہ فتح البیان جلد اوّل) یعنی حضرت ابوذر فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا مغضوب علیہم کون ہیں آپ نے فرمایا۔ یہود پھر میں نے کہا کہ ضالین کون ہیں تو آپ نے فرمایا نصاریٰ۔

مغضوب اور ضالین کی تشریح احادیث اور صحابہ کرام سے

بہت سے صحابہؓ سے بھی یہ معنے ثابت ہیں مثلاً ابن عباس اور عبداللہ بن مسعود ابن ابی حاتم تو یہاں تک کہتے ہیں وَلَا اَعْلَمُ بَيْنَ الْمُفَسِّرِيْنَ فِيْ هٰذَا اِخْتِلَافًا۔ یعنی تمام مفسرین ان معنوں پر متفق ہیں

اور اس بارہ میں مجھے ان میں کوئی اختلاف نہیں دکھا (ابن کثیر)

قرآنی آیات سے بھی ان معنوں پر استدلال ہوسکتا ہے کیونکہ یہود کی نسبت قرآن کریم میں بار بار غضب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہی فرماتا ہے فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ (ع ۱۱) یہود خدا کے متواتر غضب کو لے کر اس طرح بن گئے کہ گویا خدا تعالیٰ کا غضب انہی کے لئے ہے۔ اس کے برخلاف نصاریٰ کے لئے ضَلَّ کا لفظ آیا ہے جیسے فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (کہف ع ۱۲) اسی طرح سورہ مائدہ میں مسیحیوں کا ذکر کرکے اور مسیح اور ان کی والدہ کو خدائی کا رتبہ دینے کا بیان کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (مائدہ ع) اے اہل کتاب (یعنی نصاریٰ کیونکہ اس جگہ انہی کا ذکر ہے) اپنے مذہبی خیالات میں غلو سے کام نہ لو اور ایسے لوگوں کے خیالات اور انکی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے سے گمراہ چلے آ رہے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کرچکے ہیں اور سیدھے راستہ سے بھٹک چکے ہیں یعنی عام نصاریٰ کو بتاتا ہے کہ سب نصاریٰ شرک کے عقیدہ کے قائل نہ تھے ان میں سے موحد بھی تھے اور مشرک بھی۔ مشرک گروہ جو مسیح کو خدا قرار دیتا تھا وہ خود بھی گمراہ تھا اور اس نے باقی مسیحیوں میں بھی اپنا عقیدہ پھیلانا شروع کیا اور اکثر حصہ کو اس گمراہی کے عقیدہ پر لے آیا۔ اور جو سیدھا راستہ توحید کا تھا اُسے چھوڑ دیا۔

آیت غیر المغضوب علیہم میں ایک عظیم الشان پیشگوئی۔

یہودیوں کے مغضوب اور عیسائیوں کے ضال ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے

غرض قرآن کریم سے بھی اور اقوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ مغضوب علیہم میں خاص طور پر یہود مراد ہیں اور ضالین سے خاص طور پر نصاریٰ مراد ہیں۔

یہ آیت اَلَّذِيْنَ کا یا اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں جو هم کی ضمیر ہے اس کا بدل ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں منعم علیہ گروہ کے راستہ پر چلا اور منعم علیہ سے ہماری مُراد ایسے منعم علیہ ہیں جو بعد میں تیرے غضب کے مورد نہ ہو گئے ہوں یا جو کسی اور کی محبت میں تجھے چھوڑ نہ بیٹھے ہوں۔ اس مضمون میں مومن کے لئے خشیت کا بہت بڑا سامان مہیا ہے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک انسان اس مقام تک نہ پہنچ جائے جس کے بعد کوئی گمراہی نہیں اسے کبھی مطمئن نہیں ہونا چاہیئے اور اس جد و جہد میں لگا رہنا چاہیئے کہ اس کا قدم زیادہ سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ تقویٰ کی راہوں پر پڑتا رہے تا ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی غفلت سے اپنے مقام سے گر کر تباہ اور برباد ہو جائے۔

اس آیت میں ایک بہت بڑی پیشگوئی ہے۔ جو ہر سوچنے والے کے لئے ترقی ایمان کا موجب ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت یہود اور نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ تھے بلکہ کفار مکہ آپ کے مقابلہ پر تھے۔ یہود اور نصاریٰ کی تعداد مکہ میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی اور نہ ان کا حکومت میں کوئی دخل تھا پھر کیا وجہ ہے کہ اس سورۃ میں یہ نہیں سکھایا گیا کہ دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ تم کو پھر مشرک ہونے سے بچائے بلکہ یہ سکھایا گیا ہے کہ دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ کے طریق پر چلنے سے بچائے مشرکین کا ذکر چھوڑ کر یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ مشرکین مکہ کا مذہب ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائے گا اس لئے اس دُعا کی ضرورت ہی نہیں کہ خدا مسلمانوں کو مشرکین مکہ سا ہونے سے بچائے لیکن یہود اور نصاریٰ کا مذہب قائم رہے گا اس لئے اس بارہ میں دُعا کرنے کی ضرورت رہے گی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ میں شامل ہونے سے بچائے۔

اس آیت میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مسیحی تو اپنے مذہب میں مسلمانوں کو شامل کرتے ہیں اس لئے اس دُعا

کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصاریٰ کے فتنہ سے بچائے۔ لیکن یہود تو بالعموم غیر مذاہب کے افراد کو اپنے اندر شامل نہیں کرتے پھر اس دُعا کی کیا ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں یہود ہونے سے بچائے خدا تعالیٰ کا کلام ایک بے معنی اور بے ضرورت دُعا کے سکھانے کا مجرم نہیں ہو سکتا نہ یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسی غیر ضروری دُعا دن میں تیس چالیس بار پڑھنے کا حکم دیں گے پس مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے کہ یہودی فتنہ کسی اور رنگ میں تو ان کے لئے ظاہر نہیں ہونے والا۔ کیا یہ تو ممکن نہیں کہ آنے والے مسیح کا انکار کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت یہود کے مشابہ ہو جائے گی۔ اور یہ حالت اس وقت ہوگی جبکہ مسیحی فتنہ بھی بڑے زور سے اسلام پر حملہ کر رہا ہوگا۔ پس ایک طرف تو ایک مثیل مسیح کا انکار کر کے انہیں یہود سے مشابہت ہو جائیگی اور خدا تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہو جائینگے دوسری طرف مسیحیت ان پر حملے کر کے ان کے ہزاروں جگر کے ٹکڑے ان سے چھین کرلے جائے گی۔ کیا یہ آیت ایک زبردست پیشگوئی نہیں ہے۔ کیا اس سے فائدہ اُٹھا کر وہ ان دو آگوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سورۃ پر نظر غائر ڈالنے سے ایک اور لطیف خوبی کا پتہ چلتا ہے جو خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کی آیات میں رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ صفات الٰہیہ اور دُعاؤں کا بیان بالکل ایک دوسرے کے مقابل میں ہوا ہے چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (یعنی سب تعریف اللہ کے لئے ہے) کے مقابلہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) ہے جس سے بتایا ہے کہ جونہی انسان معلوم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب خوبیوں کا جامع ہے تو وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں پھر رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے مقابلہ میں اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کو رکھا ہے کیونکہ جب

یہودی فتنہ سے بچائے جانے کی دُعا سکھانے کا مطلب۔

انسان کو یقین ہو جائے کہ ہمارا خدا ہر ایک ذرہ ذرہ کا خالق اور محسن ہے تو وہ کہہ اُٹھتا ہے کہ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی طرح الرَّحْمٰنِ کے مقابلہ میں جس کے معنے بغیر محنت اور مبادلہ کے دینے والا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کو رکھا ہے۔ کیونکہ جب انسان دیکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے کسی عمل کے بغیر اسکی تمام ضروریات کو پورا کیا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ میری سب سے بڑی ضرورت تو حضور تک پہنچنا ہے اس کے پورا کرنے کے سامان بھی پیدا کیجئے پھر الرَّحِيْمِ (یعنی محنت کا عمدہ بدلہ دینے والا) کے مقابلہ میں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ رکھا یعنی یہ کہ ان لوگوں کا رستہ دکھایئے جن پر آپ نے انعام کئے ہیں یعنی سیدھے راستہ پر چلاتے چلاتے مجھے ان انعامات کا وارث کر دیجئے جو پہلے لوگوں کو ملے ہیں۔ کیونکہ رحیمیت چاہتی ہے کہ کسی کام کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے مقابلہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کو رکھا کیونکہ جب انسان کو یقین ہو کہ میرے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ تو فوراً اس کے دل میں ناکامی کا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پس بندہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر غور کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کی دُعا کرتا ہے

سورۂ فاتحہ کی آیات میں پُرلطف ترتیب۔ فطرت انسانی کے بموجب انسانی راہنمائی

اس سورۂ شریفہ کی آیات پر اگر نظر غور ڈالی جائے اور انکی ترتیب کو چشم تعمق سے ملاحظہ کیا جائے تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ اس میں انسان کے لئے بتدریج روحانی منازل طے کرنے اور منزل بہ منزل چل کر آخر قربِ الٰہی کا شرف حاصل کرنے کی ہدایات مندرج ہیں کسی ذات کی فرمانبرداری یا عبادت دو ہی وجہ سے ہوتی ہے یا محبت سے یا خوف سے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں اپنی دونوں قسم کی صفات کی طرف متوجہ کیا ہے بعض لوگ جن کی طبیعت میں احسان کی قدر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے احسان کو دیکھ کر فرمانبرداری کرتے ہیں اور بعض لوگ احسانوں

کی پرواہ بھی نہیں کرتے مگر خوف ان کو فرمانبرداری پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن دانا انسان کا یہ کام ہے کہ پہلے محبت سے کام لے اور اگر اس سے کام نہ چلے تو پھر خوف دلائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس سورۃ میں پہلے اپنی ان صفات کا بیان کیا ہے جن پر غور کرنے سے انسان کا دل محبت الٰہی سے پُر ہو جاتا ہے اس کا نام اللہ ہے یعنی سب خوبیوں کا جامع اور سب نقائص سے منزہ ہے۔ سب اشیاء کا خالق اور ان کا رازق ہے۔ مومن و کافر سب کی ربوبیت کرتا ہے۔ اس نے ہماری زیست کے وہ سامان جن سے ہم واقف بھی نہیں ہمارے لئے پیدا کئے ہیں۔ اور ہم جو نیک عمل کریں ان کا بہتر سے بہتر انعام دیتا ہے جو لوگ کسی چیز کی خوبصورتی یا اس کے احسان کو دیکھ کر فرمانبرداری کرنے کے عادی ہیں وہ ان صفات کو دیکھ کر بے اختیار اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر اُس کے آگے جھک جاتے ہیں لیکن جو لوگ محبت کے اثرات سے ناواقف ہوتے ہیں اور سخت سلوک کے عادی ہوتے ہیں وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت پر جب غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے اور ایک دن اس کے سامنے حاضر ہو کر اس کے سب انعامات کا حساب دینا ہوگا وہ خوف کی وجہ سے بے اختیار ہو کر اس کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ اُٹھتے ہیں۔ غرض کوئی انسان ہو خواہ محبت سے متاثر ہونے والا خواہ خوف سے ماننے والا سورۃ فاتحہ کی ان ابتدائی آیات کو پڑھ کر بے اختیار اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ اُٹھتا ہے لیکن ساتھ ہی جب وہ ایک طرف تو اپنی کمزوری کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف اس شہ خوباں کے حسن و احسان یا اسکی عظمت و جبروت کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو بے اختیار ہو کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے ساتھ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بھی کہہ اُٹھتا ہے یعنی میں تو حضور کا فرمانبردار ہوں۔ اور آپ ہی کی عبادت کرتا ہوں لیکن جو حق عبادت ہے وہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا اس لئے میں آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں کہ آپ اس کام میں میری مدد فرمائیں اور حق عبادت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں جب محبت اس حد تک پہنچ جاتی ہے اور عظمت الٰہی اس حد تک بندہ کو متاثر کر دیتی ہے تو پھر جیسا کہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے وہ بے اختیار اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہہ اٹھتا ہے یعنی مجھے سیدھا راستہ دکھایئے اور سیدھا راستہ ہمیشہ باقی راستوں سے اقرب ہی ہوتا ہے پس یہ کلام محبت کے کمال کو ظاہر کرتا ہے کہ اے اللہ اب میں آپ سے دُور نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے وہ سب سے نزدیک افراط و تفریط سے پاک راستہ دکھائیں جس پر چل کر میں جلد سے جلد آپ تک پہنچ جاؤں لیکن چونکہ دربار شاہی میں باریاب ہونے والے لوگ مختلف مدارج کے ہوتے ہیں بعض عام درباری اور بعض خاص الخاص لوگ اس لئے عین فطرت کے تقاضا کو پورا کرتے ہوئے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دُعا سکھلائی یعنی اے مولیٰ آپ مجھے سیدھا راستہ بھی دکھائیں اور مجھ پر یہ فضل بھی کریں کہ منعم علیہ لوگوں کا راستہ دکھائیں یعنی حضور کے دربار میں میرا داخلہ عام لوگوں میں ہو کر نہ ہو۔ بلکہ آپ کے خاص پیاروں میں مَیں شامل ہو جاؤں اور عاشق ہوتے ہوئے معشوق بھی بن جاؤں اور جس طرح مَیں آپ سے محبت کرتا ہوں جناب بھی مجھ سے محبت کرنے لگ جائیں (کیونکہ منعم علیہ گروہ ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا محبوب گروہ ہے اور جو جماعت انعام ہی انعام کی مستحق ہوتی ہے وہی پیاری جماعت ہوتی ہے) اس طرح بندہ اس مقام محبت کو چاہتا ہے جس میں کوئی پردہ مغائرت نہ رہے اب گویا انسان کمال کو پہنچ جاتا ہے اور عاشق و معشوق ایک ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ ایمان بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ ہے اس لئے جب انسان اس

رُوحانی لذت کو حاصل کر لیتا ہے تو اسکی تمنا ہوتی ہے کہ یہ مقام اس کو ہمیشہ حاصل رہے اور اس پر اس کو ثبات نصیب ہو۔ اس لئے مولیٰ کریم نے انسان کو اپنے حضور یہ عرض کرنا سکھلایا کہ آپ یہ فضل بھی کریں کہ اس ملاقات کے بعد میں آپ سے کسی طرح بھی جُدا نہ ہوں اور چونکہ جُدائی کے دو طریق ہوتے ہیں یا تو یہ کہ معشوق ناراض ہو کر نکال دے اور یا یہ کہ عاشق ہی عشق ترک کر کے علیحدہ ہو جائے اس لئے دونوں صورتوں کو بیان کرنے کے لئے فرمایا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یعنی نہ تو ایسا ہو کہ آپ میری کسی غلطی کی وجہ سے مجھ پر ناراض ہو جائیں وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور نہ ایسا ہو کہ منزل مقصود کو پہنچ کر میرے ہی دل میں آپ کے سوا کسی اور شے کا عشق پیدا ہو جائے اور میں آپ کو چھوڑ کر کسی اور طرف چلا جاؤں۔

یہ ایک ایسی کامل اور جامع دُعا ہے جو خدا تعالیٰ نے محض اپنے رحم سے انسان کو اپنے حضور عرض کرنے کے لئے تعلیم کی ہے کہ جس کے مقابلہ میں کوئی اور مذہب اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا۔ غور کرو کس طرح انسانی فطرت کا اوّل سے آخر تک نقشہ کھینچ دیا ہے اور کس طرح تمام قسم کے متفرق خیالات کے لوگوں کا علاج اس چھوٹی سی سورۃ میں بتا دیا ہے پس جو سمجھنے والے ہیں سمجھیں اور جو سوچنے والے ہیں سوچیں کہ دُنیا کا نجات دہندہ مذہب سوائے اسلام کے اور روحانی بیماریوں کا علاج سوائے قرآن کے کوئی نہیں۔

آمین - صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جب سورۃ فاتحہ کو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر ختم کرتے تو آمین کہتے جس کے معنے اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ لَنَا کے ہیں۔ یعنی اے اللہ ہماری یہ عرض قبول فرما۔ اس ارشاد نبوی کے باتباع صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی عمل ثابت ہے۔

امین

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَتَانِ وَسَبْعٌ وَثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَاَرْبَعُوْنَ رُكُوْعًا

سورۃ بقرہ۔ یہ سورت مدنی ہے اور بسم اللہ سمیت اس کی دو سو ستاسی آیتیں ہیں اور چالیس رکوع ہیں۔

سورۃ بقرہ کے نام کا ذکر مختلف احادیث میں۔

سله سورة البقرہ - اس سورۃ کا نام سُورۃ البقرہ ہے جیساکہ مختلف احادیث سے ثابت ہے اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے گو احادیث سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ نے خود ہی یہ نام رکھا یا اللہ تعالیٰ کے فرمانے کے مطابق رکھا۔ مگر میرا اپنا یقین یہی ہے کہ سورتوں کے نام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے رکھے گئے ہیں۔ اس سورۃ کے نام کے متعلق جو روایات ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

سورۃ بقرہ کے یاد کرنے کی وجہ سے ایک نوجوان کا امیر لشکر تجویز ہونا

ترمذی میں ہے عن ابی ھریرۃ قال قال رسولُ اللہِ صلَّی اللہُ علیہِ وسلَّمَ لکلّ شیءٍ سنامٌ وانَّ سنامَ القراٰنِ سورۃُ البقرۃ وفیھا اٰیۃٌ ھیَ سیّدۃُ اٰیِ القراٰنِ ھی اٰیۃ الکرسی (ترمذی جلد دوم ابواب فضائل القرآن) یعنی ہر چیز کا ایک چوٹی کا حصہ ہوتا ہے اور قرآن کریم کی چوٹی کا حصہ سورۃ البقرہ ہے اور اس میں ایک ایسی آیت ہے جو قرآن کریم کی سب آیات کی سردار ہے اور وہ آیۃ الکرسی ہے۔

سورۃ بقرہ مدنی ہے

یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور مختلف وقتوں میں نازل ہوتی رہی ہے اور بعض کے نزدیک اس کی ایک آیت آخری ایام میں حجۃ الوداع کے موقع پر قربانی کے دن نازل ہوئی تھی اور وہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (بقرہ ع ۳۸) کی آیت ہے اس سورۃ کی رباء کی آیات (یعنی سود کے احکام پر مشتمل آیات) قرآن کریم کی آخری زمانہ میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہیں۔

سورۃ بقرہ کے فضائل

ترمذی نے ابوہریرۃ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھجوائی جو آدمی اس کے لئے چُنے گئے آپ نے اُن سے قرآن کریم سُنا۔ آخر آپ ایک شخص کی طرف متوجہ ہوئے جو ان سب سے چھوٹی عمر کا تھا اور اس سے پوچھا کہ تم کو کتنا حصہ قرآن کریم کا یاد ہے اس نے کہا فلاں فلاں سورۃ کے علاوہ سورۃ بقرہ بھی یاد ہے آپ نے فرمایا کہ کیا سورۃ البقرہ تم کو یاد ہے؟ اس نے کہا ہاں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا۔ بس تو تم اس لشکر کے سردار مقرر کئے جاتے ہو۔ اس پر اس قوم کے سرداروں میں سے ایک شخص نے کہا کہ خدا کی قسم میں سورۃ بقرہ کے یاد کرنے سے صرف اس لئے رُکا رہا ہوں کہ کہیں مجھے بعد میں بھول نہ جائے۔ یہ سُنکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن سیکھو اور اسے پڑھتے رہا کرو کیونکہ جو شخص قرآن سیکھتا ہے اور پھر اسے پڑھتا رہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال اس تھیلی کی سی ہے جس میں مشک بھرا ہُوا ہو اور اسکی خوشبو نکل نکل کر سارے مکان میں پھیل رہی ہو۔ اور جو شخص قرآن سیکھ کر سو جائے اس حالت میں کہ قرآن اس کے اندر ہو اسکی مثال اس تھیلی کی سی ہے کہ جس میں مشک بند پڑا ہو (ترمذی جلد دوم ابواب فضائل القرآن۔ ابن ماجہ نے بھی اس روایت کو جزواً روایت کیا ہے)

ابن مردویہ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت کی جائے اس سے شیطان بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر)

اسی طرح دارمی نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت درج کی ہے کہ جو شخص سورۃ بقرہ کی دس آیتیں رات کے وقت پڑھے صبح تک شیطان اس کے گھر میں داخل نہیں ہوتا۔ یعنی سورۃ بقرہ کے ابتداء کی چار آیتیں آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور سورۃ بقرہ کے آخر کی تین آیتیں جو لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں (یہ آخری رکوع ہے جس میں قر

تین آیتیں ہیں) (ابن کثیر)

بظاہر سورتوں کے ذاتی فضائل کا ذکر ایک تعلیم یافتہ آدمی پر گراں گزرتا ہے کیونکہ کسی سورۃ کا صرف سورۃ کے ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص اثر رکھنا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس امر کو اس نگہ سے دیکھا جائے کہ ہر سورۃ خاص مضمون پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ مضمون ضرور قلب پر کوئی اثر چھوڑتا ہے تو فضائل کا بیان آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سورۃ بقرہ کے یاد کرنے پر ایک نوجوان کو لشکر کا امیر بنا دیا۔ اس میں کئی حکمتیں تھیں۔ اوّل آپؐ نے اس طرح دوسرے لوگوں کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ قرآن یاد کرنے اور یاد رکھنے کی خواہش پیدا کی۔ اسلامی لشکروں کی سرداری مالی لحاظ سے منفعت بخش نہ تھی مگر اپنے روحانی باپ کی خوشنودی کی جو قدر صحابہ کے دل میں تھی اسے صرف محبت کی چاشنی سے واقف لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں دوسرے اس میں یہ بھی حکمت تھی کہ اس زمانہ میں جو سردار لشکر ہوتا تھا وہی عام طور پر امام الصلوٰۃ بھی ہوتا تھا اور اسی سے لوگ مسائل وغیرہ بھی دریافت کرتے تھے۔ اور سورۃ بقرہ میں باقی سب سورتوں سے زیادہ مسائل بیان ہوئے ہیں یہاں تک کہ حضرت ابن العربی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استادوں میں سے ایک اُستاد سے سُنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار حکم ہے اور ایک ہزار مناہی ہے اور ایک ہزار فیصلے اور ایک ہزار خبریں ہیں (قرطبی) یہ صوفیانہ رنگ کی بات ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سورۃ بقرہ میں مضامین کی نوعیت اور احکام اسلام کی وسعت اس قدر ہے کہ دوسری سورتوں میں سے کسی میں بھی اس قدر نہیں ہے۔

یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے اس میں شیطان نہیں آتا اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس سورۃ میں شیطانی وساوس کا ایسا رد موجود ہے کہ اس پر غور کرنے کے بعد شیطان گھر میں نہیں آسکتا اور یہ جو فرمایا کہ صبح تک شیطان نہیں آتا اس سے اس طرف اشارہ کیا کہ تعلیم خواہ کیسی اعلیٰ ہو جب تک بار بار دُہرائی نہ جائے دل پر پُورا اثر نہیں ہوتا اور نیک اثر خواہ کس قدر اعلیٰ ہو کچھ عرصہ کے بعد اگر اسکی تجدید نہ کی جائے زائل ہو جاتا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں اور آیۃ الکرسی اور اس کے ساتھ کی دو آیتیں اور سورہ بقرہ کی آخری تین آیتیں پڑھے اس کے گھر سے بھی شیطان بھاگ جاتا ہے اس سے بھی یہی مراد ہے کہ ان آیتوں میں اسلام کا خلاصہ ہے سورہ بقرہ کی پہلی آیتوں میں پاک عملی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے آیۃ الکرسی میں صفات باری کا نہایت لطیف نقشہ ہے اور سورہ بقرہ کی آخری آیتوں میں دل کو پاک کر دینے والی دُعائیں ہیں اور یہ تین چیزیں یعنی (۱) الٰہی کلام کی تتبع میں نیک اعمال کا بجالانا (۲) صفات الٰہیہ پر غور کرنا (۳) اور ان دونوں باتوں کے ساتھ دعا میں مشغول رہنا اور اپنے آپ کو آستانہ الٰہی پر گرا دینا جب اکٹھی ہو جائیں تو انسان کا دل پاک ہو جاتا ہے اور شیطان بھاگ جاتا ہے۔

سُورتوں کی ترتیب

یہ سورۃ قرآن کریم کی تفصیلی سورتوں میں سے پہلی سورۃ ہے لیکن نزول کے لحاظ سے یہ سورۃ کلام الٰہی کے نزول کے چودھویں سال میں جا کر نازل ہونی شروع ہوئی اور کئی سال تک نازل ہوتی رہی۔ بالآخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے مکمل ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہُوا؟ کیوں نہ قرآن کریم کو اسی ترتیب سے جمع کیا گیا جس ترتیب سے کہ قرآن کریم نازل ہُوا تھا؟ بعض دشمنانِ اسلام اور بعض مسلمانوں تک نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ سورتوں کی لمبائی چھوٹائی کے لحاظ سے

قرآن کریم کو جمع کر دیا گیا ہے اور کسی معنوی ترتیب کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ یہ دعویٰ ایک نہایت لغو اور حقیقت سے دُور دعویٰ ہے کیونکہ (۱) قرآن کریم کی سورتوں کی موجودہ ترتیب خود اس دعویٰ کو باطل کرتی ہے پہلی سورۃ فاتحہ ہے جو نہایت چھوٹی اور سات آیتوں کی سورۃ ہے۔ دوسری بقرہ نہایت لمبی ہے تیسری آل عمران ہے جس کے بیس رکوع ہیں لیکن چوتھی نساء کے چوبیس رکوع ہیں اسی طرح اگلی سورتوں میں بھی کئی جگہ پر فرق ہے پس یہ کہنا کہ لمبائی کے مطابق سورتوں کو آگے پیچھے رکھ دیا گیا ہے درست نہیں۔ (۲) قرآن کا جمع کرنا کسی بندہ کا فعل نہیں بلکہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فعل نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامۃ ع ۱) یعنی قرآن کریم کا جمع کرنا اور اس کا دُنیا میں پھیلانا یہ دونوں کام میں خود کروں گا اور میرے خاص حکم اور نگرانی سے یہ کام ہوں گے پس ایک مسلمان کے نزدیک تو یہ انسانی کام ہو ہی نہیں سکتا اور غیر مسلموں کے لئے وہ جواب ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ سب سورتوں کے مضامین میں ترتیب موجود ہے اگر صرف لمبائی اور اختصار پر انہیں آگے پیچھے رکھا گیا تھا تو پھر سورتوں کے مضامین میں جوڑ اور اتصال کیونکر پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ آگے چل کر تفسیر میں انشاء اللہ ثابت کیا جائے گا اور جس کا علم ہر سورۃ کے شروع اور آخر کے نوٹوں کو پڑھنے سے اس تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں کو ہو جائے گا۔ پس عیاں را چہ بیاں۔

سورتوں کی لمبائی چھوٹائی کے لحاظ سے ان کے جمع نہ کئے جانے کے دو دلائل۔

قرآن کریم کی ترتیب نزول اور ہے اور ترتیب جمع اور ہے

بیشک یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر موجودہ ترتیب خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کیوں نہ اسی ترتیب میں اُتارا جو اس وقت موجود ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلامِ حکیم کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ اس کے اُترنے کی ترتیب اور اس کے جمع کرنے کی ترتیب الگ الگ ہو جب کوئی ایسا نبی دنیا میں آئے جو نئی شریعت لانے والا ہو اور جس نے عقائد اور اعمال کے متعلق ایک مکمل ہدایت نامہ دُنیا کو دینا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے اس کے الہام کا ابتدائی حصہ ترتیب تدوین کے لحاظ سے ابتدائی نہ ہو کیونکہ جن باتوں کی ابتدائی دعویٰ کے وقت جبکہ لوگ اس نئے دین سے بالکل ناواقف ہوں گے سب سے پہلے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی ان باتوں کو اس وقت سب سے پہلے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی جبکہ لوگ اس کے کلام سے ایک حد تک واقف ہو چکے ہونگے۔ پس اسی حکمت کے مطابق قرآن کریم کے نزول کی ترتیب اور ہے اور اس کے جمع کرنے کی ترتیب اور ہے چنانچہ سورتوں کے نزول کا سوال آیتوں کے نزول کی کیفیت سے حل ہو جاتا ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی آیتیں نازل ہوتی تھیں تو آپؐ کاتبوں کو بلوا کر حکم فرما دیتے تھے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ پر رکھو اور فلاں کو فلاں جگہ پر (ابو داؤد۔ ترمذی۔ احمد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن نیز فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹و۲۰-۲۹۶) اگر صرف نزول کی ترتیب کافی ہوتی تو جب کوئی آیت نازل ہوتی اسے اس سے پہلے کی نازل شدہ آیتوں کے ساتھ رکھ دیا جاتا۔

قرآن مجید کی ترتیب نزول اور ترتیب جمع میں فرق کی وجہ۔

سورۃ بقرہ ہی کو دیکھ لو۔ اسکی رباء کی آیات قرآن کریم کے سب سے آخر میں نازل ہونے والے ٹکڑوں میں سے ایک ہیں لیکن وہ سورۃ بقرہ کے آخر میں نہیں رکھی گئیں بلکہ کئی رکوع پہلے رکھی گئی ہیں۔ اسی طرح وَاتَّقُوْا يَوْمًا والی آیت جسکی نسبت احادیث میں آتا ہے کہ حجۃ الوداع میں نازل ہوئی سورۃ کے آخر میں نہیں رکھی گئی۔ پس معلوم ہوا کہ آیتیں جس ترتیب سے نازل ہوتی تھیں اسی ترتیب سے انہیں سورتوں میں نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ مضمون کے لحاظ سے رکھا جاتا تھا۔ بعینہٖ یہی صورت سورتوں کی ترتیب کی ہے وہ بھی مضامین کے لحاظ سے جمع کی گئی ہیں نہ کہ نزول کے وقت کے لحاظ سے۔

سورتوں کی ترتیب مضامین کے لحاظ سے ہے۔

یاد رہے کہ سب سے پہلے جو سورۃ نازل ہوئی یا گیں

کیونکہ جس سورۃ کی بعض آیات نازل ہوئیں وہ سورۃ العلق ہے اسکی جو آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں یہ ہیں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ ان آیات میں تبلیغ کے شروع کرنے کا حکم ہے اور بتایا گیا ہے کہ تبلیغ کا حق انسان پر اس لئے ہے کہ اس کا ایک رب ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں محبت اور تعلق کا مادہ پیدا کیا ہے نیز اس نے انسان کے اندر ترقی کی قوتیں رکھی ہیں اور وہ اپنے بندے پر فضل کرکے اسے بڑھانا چاہتا ہے اور اس غرض سے اس نے انسان کو تحریر و تصنیف کا مادہ عطا کیا ہے تاکہ وہ اپنے علم سے خود ہی فائدہ نہ اُٹھائے بلکہ دوسروں تک بھی اسے پہنچائے اور آیندہ کے لئے بھی ان علوم کو محفوظ کر دے پھر فرماتا ہے کہ علمی ترقی کا مادہ اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی طاقت اس کے اندر رکھ کر اور علم کے محفوظ کرنے کا طریق بتانے کے بعد اس نے علم کی ترقی کے لئے ایسے سامان پیدا کئے ہیں جو ہر زمانہ میں علم کی ترقی کا موجب ہوتے رہیں گے اور انسان نئی سے نئی باتیں معلوم کرتا رہے گا جو اس کے باپ دادوں کو معلوم نہیں تھیں۔ ان آیات میں قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان کا ایک خالق ہے یہ بتایا ہے کہ انسان ہدایت کا محتاج ہے اور اس کے اندر ہدایت پانے اور ترقی کرنے کی قوت پیدا کی گئی ہے جس کے اُبھارنے کے لئے یہ الہام نازل ہوا ہے۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جو نبوت کا دعویٰ کرتے وقت سب سے مقدم ہیں سب سے پہلا مخاطب انسان کا اپنا نفس ہوتا ہے جب تک اس کا اپنا دل جوش اور اخلاص اور کام کی اہمیت اور ضرورت کے احساس سے پُر نہ ہو وہ کبھی ایسے کاموں کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جو اسکی جان اور اس کے آرام کی قربانی کا مطالبہ کرتے ہوں۔ چنانچہ سب سے پہلی قرآنی آیات میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے صرف اسی سورۃ میں نہیں بلکہ دوسری سورتیں جو ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں ان میں بھی یہی مضمون ہے۔ مثلاً سورۃ مُدَّثِّر پہلی سورتوں میں سے ہے اسکی ابتدائی آیات بھی اسی مضمون کی ہیں فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اے ماموریت کا خلعت پہننے والے اُٹھ اور لوگوں کو ہوشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ سورۃ مُزَّمِّل بھی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اسکی ابتداء بھی اسی طرح کی ہے یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا یعنی اے نبوت کی چادر اوڑھنے والے راتوں کو جاگ کر عبادت کیا کر۔ نصف رات یا نصف سے کم یا نصف سے زیادہ عبادت میں گذار۔ اور قرآن کو پڑھتا رہا کر کیونکہ ہم تجھ پر ایک ایسی ذمہ داری نازل کرنے لگے ہیں جس کا اُٹھانا آسان کام نہیں۔

سورہ علق اور سورہ مدثر کو ابتداء میں اتارنے کی حکمت۔

ان ابتدائی سورتوں کے مضامین سے ظاہر ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی صفات۔ انسانی پیدائش کی غرض۔ عبادت کی ضرورت۔ دُنیا میں شرارت اور گناہ کی ترقی وغیرہ کے مضامین بیان کرنے کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ پر آمادہ کرنے اور اس کے لئے آپؐ کے دل میں جوش پیدا کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ گویا ان آیات میں محمد رسول اللہ کو نبوت کے عظیم الشان کام کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بغیر اس تیاری کے نہ تو آپ اس کام کی اہمیت کو سمجھ سکتے تھے جو آپ کے سپرد ہونے والا تھا۔ اور نہ آپ اس کام کو عمدگی سے انجام دے سکتے تھے پس ابتداء میں ایسے ہی کلام کی ضرورت تھی اسی طرح اس مضمون کے بعد خدا تعالیٰ کی صفات۔ ضرورتِ نبوت تقویٰ اور پاکیزگی کے مضامین۔ ضرورت دعا۔ قضا و قدر بعث بعد الموت وغیرہ مضامین کے متعلق تعلیمات کے بیان کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس وقت تک کوئی جماعت قائم نہ ہوئی تھی اور نہ دین مکمل ہوا تھا پس ضروری تھا کہ ابتدائی ضروری امور

سورہ علق و مدثر کے مضمون اور انکی اہمیت۔

کو اختصار کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے تا وہ اصولی باتیں جو اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق کرنے والی تھیں لوگوں کے سامنے آجائیں۔

لیکن جب قرآن مکمل ہو گیا جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی جب ان کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے بہت سے مضامین سے غیر مسلموں کو بھی واقفیت ہو گئی اور مسلمانوں کی نسل ابھی چل چکی جس نے ابتدائی اور اصولی باتیں اپنے ماں باپ سے بچپن میں ہی سیکھ لیں تو اب قرآن کریم کے پڑھنے والے کے لئے ایک اور ترتیب کی ضرورت پیش آئی جو آئندہ زمانہ میں ہمیشہ کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اب اس مضمون کے ابتداء میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ اے محمدؐ رسول اللہ تیری قوم کی حالت خراب ہے اور گو ان میں قابلیت موجود ہے مگر اس قابلیت سے وہ فائدہ نہیں اُٹھا رہے پس تو اُٹھ اور اُن میں تبلیغ کر اور انہیں خدا تعالیٰ کی طرف بُلا۔ اب تو قرآن کریم کے پہلے مخاطب وہ لوگ ہونگے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے زمانہ میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے اب اس مضمون سے قرآن کریم کا شروع ہونا ضروری ہے جس میں مومنوں کو بتایا جائے کہ قرآن کریم کے نزول کی غرض کیا ہے اور مسلمان ہونے کے لحاظ سے ان پر کیا ذمہ واریاں ہیں۔ اسی طرح اس زمانہ میں غیر مسلم بھی قرآن کریم کو فلسفیانہ نگہ سے دیکھنے کی کوشش کرینگے اور یہ پوچھیں گے کہ دوسرے مذاہب کی موجودگی میں اسلام کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مسلمان کونسی ایسی غرض پوری کر رہا ہے جو پہلی اقوام کے لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ پہلی کتب کی تعلیمات اور اسلام کی تعلیم کا تفصیلی مقابلہ کر کے دیکھنا چاہیں گے نیز اس پر بحث کرینگے کہ پہلے انبیاء نے جو خاتم النبیین کے بارہ میں پیشگوئیاں کی ہیں اسلام اور بانیٔ اسلام ان پیشگوئیوں کے مصداق ٹھہرتے ہیں یا نہیں۔ غرض قرآن کریم کی تکمیل کے بعد اسکی طرف توجہ کرنے کا طریقہ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں ہی کے لئے مختلف ہو جاتا ہے اور ایک کامل کتاب تبھی اپنے کمال کو قائم رکھ سکتی ہے جبکہ وہ ان تبدیل شدہ حالات کو مدنظر رکھے اور قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔ نہ تورات نہ انجیل اور نہ اور کسی کتاب میں یہ حکمت مدنظر رکھی گئی ہے کہ ابتداء نزول میں پہلے مخاطبین کو مدنظر رکھ کر اور طرح ترتیب ہو اور مذہب کی اشاعت کے بعد اس وقت کے لوگوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور بعد میں آنے والے لوگوں کا خیال کرتے ہوئے کتاب کے مضامین کی ترتیب بدل دی گئی ہو تا ان تبدیل شدہ حالات کے مطابق وہ مضامین زیادہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوں پس قرآن کریم کی نزول کی ترتیب اور جمع کی ترتیب میں جو فرق ہے یہ قابلِ اعتراض امر نہیں بلکہ قرآن کریم کی فضیلت اور برتری کی ایک علامت ہے۔

سورۂ بقرہ میں فطرت انسانی کے پیدا کردہ طبعی سوالات کا حل۔

سورۂ بقرہ میں جیسا کہ اسکی تفسیر کے پڑھنے سے ثابت ہوگا فطرت انسانی کے پیدا کردہ ان طبعی سوالات کو حل کیا گیا ہے جو فلسفیانہ طور پر ایک مکمل مذہب کے متعلق پیدا ہوتے ہیں اور اس کا مضمون ہی بتاتا ہے کہ یہ سورۃ ابتداء میں نہیں کے لئے ہی نازل کی گئی تھی بلکہ جیسا کہ بتایا جائے گا سورۃ فاتحہ کے مضامین کا اس میں جواب دیا گیا ہے اور اس کے مضامین سے اس کا خاص تعلق ہے جو اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ اس کو سب سے پہلے رکھنا اسکی لمبائی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سورۃ فاتحہ کے مضامین سے اس کے گہرے تعلق کی وجہ سے ہے۔

سورۂ بقرہ اور اسکا معجزانہ فصاحت و بلاغت کا اعتراف ایک شاعر کی زبانی۔

اس سورۃ کے متعلق ایک ادبی لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ لبید بن ربیعہ عامری جاہلیت کے مشہور شعراء میں سے گزرا ہے اس کا ایک قصیدہ سبع معلقہ میں شامل ہے یعنی اس کے کلام کو عرب کے بہترین سات قصائد میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ شاعر آخر عمر میں اسلام لے آیا اور سورۃ بقرہ کی فصیح زبان سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس نے شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اس سے اپنا نیا کلام سنانے کی فرمایش کی اس نے اس کے جواب میں سورۃ بقرہ کی تلاوت

شروع کردی حضرت عمرؓ نے اس پر اسے کہا کہ تمہیں تم سے اپنے شعر سنانے کو کہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مَاکُنْتُ لِاَقُوْلَ بَیْتًا مِّنَ الشِّعْرِ بَعْدَ اِذْ عَلَّمَنِیَ اللّٰہُ الْبَقَرَۃَ وَ اٰلَ عِمْرَانَ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۃ بقرہ اور آل عمران سکھا دی ہیں تو اب کس طرح ممکن ہے کہ اس کے بعد میں ایک شعر بھی کہوں۔ حضرت عمرؓ کو اس کا یہ جواب اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے اس کا وظیفہ جو دو ہزار درہم سالانہ تھا بڑھا کر اڑھائی ہزار کر دیا (اسد الغابہ جلد چہارم حالات لبید بن ربیعہ صفحہ ۲۶۱) بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر جب ہم لبید کے اس مرتبہ کو دیکھتے ہیں جو اسے عرب کے ادبی حلقہ میں اس زمانہ میں حاصل تھا جو عربی علم ادب کے کمال کا زمانہ کہلاتا ہے اور جس زمانہ کے شعراء کے کلام کو آج تک بہترین کلام سمجھا جاتا ہے اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اتنا زبردست شاعر جو خود بادشاہِ سخن کہلاتا تھا سورۃ بقرہ کی زبان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے شعر کو جو اسکی رُوح کی غذا تھی جو اسکی عزت کا ذریعہ تھا جس نے اسے عرب کے حکمران حلقوں میں صدر مقام پر بٹھا رکھا تھا سورۃ بقرہ کی زبان سے مرعوب ہو کر بالکل ترک کر دیا اور جب اس سے اپنا تازہ کلام سُنانے کو کہا گیا تو اس نے حیرت سے جواب دیا کہ کیا سورۃ بقرہ کے بعد بھی کسی اور کلام کی ضرورت رہ جاتی ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ایک معجزانہ کلام کے سوا یہ تاثیر اور کسی کلام سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ سورۃ بقرہ

پیشتر اس کے کہ میں سورۃ بقرہ کی آیات کا مطلب الگ الگ بیان کروں۔ میں سورۃ بقرہ کے مضامین کا خلاصہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ سورۃ بقرہ کو باوجود آخر میں نازل ہونے کے پہلے کیوں رکھا گیا ہے اور اس کے مضامین کی ترتیب بھی مختصر طور پر ذہن میں آجائے گی جس سے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

سورۃ بقرہ کے مطالب کی تفہیم بطور القاء کے

میں سورۃ فاتحہ میں بیان کر چکا ہوں کہ اسکی تفسیر مجھے ایک فرشتہ نے رؤیا میں سکھائی تھی سورۃ بقرہ کی تفسیر مجھے اس طرح تو حاصل نہیں ہوئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک القاء کے طور پر مجھے اس کی تفسیر بھی سکھائی ہے اور جو شخص بھی ذرا غور سے دیکھے گا اسے معلوم ہو گا کہ جو نکتہ اس بارہ میں مجھے بتایا گیا ہے وہ ساری سورۃ بقرہ کو ایک باترتیب مضمون کی صورت میں بدل دیتا ہے اور اس امر کے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یہ تفہیم صرف اور صرف فضل الٰہی سے حاصل ہوئی ہے۔

سورۃ کے مضامین کو سمجھنے کی کنجی

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ستائیس سال کا عرصہ گذرا کہ میں چند دوستوں کو قرآن کریم پڑھا رہا تھا سورۃ بقرہ کا درس تھا جب میں اس آیت پر پہنچا کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (بقرہ ع ۱۵) تو یکدم میرے دل پر القاء ہوا کہ یہ آیت اس سورۃ کے مضامین کی کُنجی ہے اور اس سورۃ کے مضامین اس آیت کے مضامین کے مطابق اور اسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں میں نے جب اس علم سے فائدہ اُٹھا کر سورۃ بقرہ کا مطالعہ کیا تو میری حیرت اور عقیدت کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ سورۃ بقرہ کو میں نے نہ صرف اس آیت کے مضامین کے مطابق پایا بلکہ اس کے مضامین باوجود مختلف قسم کے ہونے کے میرے ذہن میں ایسے مستحضر ہو گئے کہ مجھے یوں معلوم ہوا کہ گویا اس کے مضامین موتیوں کی لڑی کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔

اس آیت کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دُعا کا ذکر ہے جو انہوں نے مکہ میں ایک نبی کے مبعوث ہونے کے لئے کی ہے اور اس دُعا کا مضمون یہ ہے کہ اس شہر اور اس قوم میں ایک

ایسا نبی مبعوث ہو جو (۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور یقین کو درست اور مضبوط کرنے والے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے والے دلائل لوگوں کے سامنے بیان کرے جو دُنیا کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے کے لئے راستہ کے نشان اور شمع ہدایت ثابت ہوں (۲) وہ لوگوں کے سامنے ایک مکمل کتاب پیش کرے (۳) جو شریعت وہ دُنیا کے سامنے پیش کرے اس کے اندر احکام اور مذہب کی اور ان تمام دینی امور کی جن پر مذہب کی ترقی کا مدار ہے حکمت بھی بیان کی گئی ہو (۴) ایسے ذرائع اختیار کرے اور ایسے طریق بتلائے جن سے قوم کی ترقی اور پاکیزگی کے سامان پیدا ہوں۔

ان مضامین کو سامنے رکھ کر جب میں نے سورۂ بقرہ کو دیکھا تو اس کے مضامین کو لفظاً لفظاً ان مضامین کے مطابق پایا بلکہ میں نے دیکھا کہ وہ مضامین بیان بھی اسی ترتیب سے ہوئے ہیں جس ترتیب سے ان کا اس آیت میں ذکر ہے اور ہر حصہ میں اس آیت کے الفاظ کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے یعنی آیات کے مضمون میں آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر کتاب اور حکمت کا مضمون بیان کیا ہے اور کتاب اور حکمت کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر تزکیہ کا مضمون بیان کیا ہے تو اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ مضامین کے لحاظ سے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کا مضمون بیس رکوع تک بیان ہوا ہے اور کتاب اور حکمت کا مضمون اکتیس رکوع تک بیان ہوا ہے۔ اور پھر تزکیہ کا مضمون اکتیسویں رکوع سے شروع ہو کر آخر سورۃ پر یعنی چالیسویں رکوع پر ختم ہوا ہے جو شخص اس امر کو مدنظر رکھ کر سورۂ بقرہ کو پڑھے گا اس کے مطالب کی وسعت اور جامعیت اور ترتیب کی خوبی اور تاثیر کا حیرت انگیز مطالعہ کرے گا۔

سورۂ بقرہ کا خلاصہ اور رکوعات کے مضمون کی ترتیب۔

خلاصہ رکوع اوّل۔ سورۂ بقرہ سورۂ فاتحہ کے بعد شروع ہوتی ہے سورۂ فاتحہ میں طلبِ ہدایت کی دُعا سکھائی گئی تھی۔ سورۂ بقرہ کی پہلی آیات میں اس دُعا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم نے سورۃ فاتحہ میں جس ہدایت کو طلب کیا تھا اور جو گزشتہ زمانہ کے منعم علیہ گروہ کی ہدایت ہے وہ یہی کتاب یعنی قرآن شریف ہے اور اس کے نزول کے ذریعہ سے فطرت کی اس پکار کو اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے جو سابق ہدایتوں کے مٹ جانے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں سے پیدا ہو کر عرشِ الٰہی کو ہلا رہی تھی پھر فرماتا ہے کہ قرآن کریم نے نہ صرف دنیا کے لئے ایک ہدایت نامہ پیش کیا ہے بلکہ ایک ایسا مکمل ہدایت نامہ پیش کیا ہے جو سب مذاہب کی صداقتوں پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اس کے دعویٰ کی بنیاد اس پر نہیں کہ دوسرے مذاہب پر اعتراض کرے اور ان کے متعلق دلوں میں شکوک پیدا کرے اور یہ کتاب انسان کے اخلاق اور اعمال ہی کو درست نہیں کرتی بلکہ ایسے ایسے مقام پر پہنچاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اسے محبت خالص والا تعلق پیدا ہو جائے۔ اس کتاب کو ماننے والوں کے لئے امور اعتقادیہ بھی بیان کئے جائیں گے جن پر ایمان لانا ان کے لئے ضروری ہو گا اور ان کے لئے عبادات کے طریق بھی بیان کئے جائیں گے جن پر عمل پیرا ہونا ان کے لئے ضروری ہو گا ان کے لئے حقوق العباد بھی بیان کئے جائیں گے اور ان پر چلنا بھی ان کے لئے ضروری ہو گا اور ان کے لئے سب صداقتوں اور سب سچے مذاہب کے بانیوں اور سب سچائیوں کا جو گزشتہ یا آئندہ زمانہ سے متعلق ہوں اس کتاب میں ذکر کیا جائے گا اور ان سب پر ایمان لانا ان کے لئے ضروری ہو گا اور یہ ایمان رسمی نہ ہو گا بلکہ اس کے لئے انہیں قربانیاں کرنی پڑیں گی اور لوگ مخالفت کریں گے لیکن وہ اپنی مخالفت میں ناکام رہیں گے۔

خلاصہ رکوع ۲۔ اور کچھ لوگ منافقت سے تعلق پیدا کریں گے حالانکہ ان کے دلوں میں ایمان نہ ہو گا۔ اور کچھ لوگ ایمان تو رکھتے ہوں گے مگر ان کے دل بزدلی سے پُر ہوں گے پس بزدلی کی وجہ سے وہ اس کے دشمنوں سے ساز باز رکھیں گے ان دونو گروہوں کی مخالفت اور منصوبہ بازی بھی اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ (خلاصہ رکوع ۳) پس جو بھی خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتا

ہے اسے اس مذہب میں داخل ہو کر خدائے واحد کی عبادت
میں حصہ لینا چاہیئے اور تقویٰ کا مقام حاصل کرنا چاہیئے تا وہ
قرآن کریم کی مدد سے خدا تعالےٰ تک رسائی پائے کہ پیدائش
عالم کی غرض ہی یہ ہے اور اگر کوئی کہے کہ قرآن کریم کے اس
دعویٰ کو ہم کیونکر تسلیم کریں تو انہیں کہو کہ کسی نہ کسی مذہب
کو تو تم تسلیم کرتے ہو اسے اسکی تعلیم کے مقابل پر رکھ کر دیکھ لو
اگر اس میں اس سے اعلیٰ تعلیم موجود نہ ہو تو اسے رد کر دو ورنہ
تم کو خود اپنے مسلمات کے رو سے ماننا پڑے گا کہ یہ الٰہی کتاب
ہے جس میں پہلی الٰہی کتب سے بہتر تعلیم موجود ہے۔ نیز آسمانی
نشانات کے بارہ میں بھی تم اس کتاب کے ماننے والوں سے
مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہو کہ خدا تعالےٰ کن کے ساتھ ہے لیکن
اگر سوچنے کی کوشش نہ کرو اور بلا وجہ انکار کرتے جاؤ تو اس
میں کیا شبہ ہے کہ تم کو عذاب ملے گا اور اس میں کیا شبہ ہے
کہ جو لوگ اس اعلیٰ تعلیم کو مانیں گے انہیں اعلیٰ انعامات عطا
ہونگے جو متواتر انہیں دیئے جائینگے تا کہ کوئی شخص ان انعامات
کو اتفاقی حادثہ نہ کہہ سکے اور گو ہم نے ان انعامات کی طرف
مختصر الفاظ میں اشارہ کیا ہے مگر اپنے وقت پر ان پیشگوئیوں
کی عظمت ظاہر ہو کر رہے گی۔ اور منکروں کے لئے اعتراض کا
لیکن مومنوں کے لئے زیادتی ایمان کا موجب ہوگی۔ اور منکروں
کا فائدہ نہ اٹھانا ایک طبعی نتیجہ ہے کیونکہ بیمار آنکھ نور کو نہیں
دیکھ سکتی۔ پھر فرماتا ہے کہ آخر قرآن کریم کی صداقت کے سمجھنے
میں مشکل ہی کیا ہے یہ پہلا کلام نہیں۔ اس سے پہلے خدا تعالےٰ
کی طرف سے مردہ قوموں کی طرف ہدایت آتی رہی اور اس کے
ذریعہ سے لوگ زندہ کئے جاتے رہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہ
سلسلہ اب ختم ہو جائے پس اب بھی اسی سنت کے مطابق
خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حق آیا ہے اور آیندہ ایسا ہی ہوتا
رہے گا پھر کیا مشکل ہے کہ جن اصول پر سابق صداقتوں کو پرکھا
گیا تھا انہی پر قرآن کریم کی صداقت کو بھی پرکھ لیا جائے۔ پھر
فرماتا ہے کہ یہ لوگ کیوں نظامِ عالم کو نہیں دیکھتے کہ وہ ایک
ارتقاء پر دلالت کرتا ہے جس میں الٰہی ہاتھ نظر آتا ہے پھر کیوں
یہ اس ارتقاء کی آخری کڑی کو ماننے میں عذر کرتے ہیں حالانکہ
ارتقاء کی آخری کڑی ہی مقصودِ اعلیٰ ہوتی ہے اسے چھوڑ دیا
جائے تو سب نظام ہی نامکمل رہ جاتا ہے۔

خلاصہ رکوع ۴۔ پھر اس نظام کی پہلی کڑی یعنی آدمؑ
یعنی ملہم اول کا ذکر فرماتا ہے کہ آخر آدم کو تم مانتے ہو اسکی سچائی
کا کیا ثبوت تمہارے پاس ہے جس طرح اسکی سچائی کو اس زمانہ
کے لوگوں نے مانا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کی صداقت کو پرکھا
جا سکتا ہے اسکی ذات پر بھی اعتراض ہوئے اور معمولی
لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ملائکہ صفت انسانوں کی طرف
سے اعتراض ہوئے۔ مگر کیا اس سے اسکی سچائی میں فرق آیا
اللہ تعالےٰ نے اسی کی تائید کی اور پھر وہی ملائکہ صفت
رہ سکے جنہوں نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اس کے
آگے تذلل سے گر گئے باقی شیطان بن گئے (خلاصہ رکوع ۵
تا ۱۴) پھر فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر آدم پر کلام نازل
ہوا تھا تو پھر کسی اور کلام کی کیا ضرورت ہے کیونکہ آدم کے
بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے متواتر اور حسبِ ضرورت کلام نازل
ہوتا رہا ہے چنانچہ موجودہ زمانہ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام پر
اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا ان کی قوم میں نبی کے بعد نبی
اصلاح کے لئے آئے اور چونکہ اس قوم نے بغاوت پر بغاوت
کی اللہ تعالیٰ نے مرکزِ الہام بدلنے کا فیصلہ کر لیا اور بنو اسمٰعیل
میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری کلام کا مورد
بنایا اور اب بنی اسرائیل حسد کی وجہ سے آپؐ کی مخالفت
کرتے ہیں لیکن اس مخالفت کا بھی وہی نتیجہ ہوگا جو پہلے
انبیاء کی مخالفت کا نتیجہ ہوا تھا (خلاصہ رکوع ۱۵) پھر
فرمایا بنی اسرائیل کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان پر جو فضل ہوئے
ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کے وعدوں کی وجہ سے ہوئے ہیں
اور ابراہیمؑ سے جو وعدے ہوئے تھے وہ صرف بنو اسحاق
کے بارہ میں نہ تھے بلکہ بنو اسمٰعیل کے حق میں بھی تھے۔ پس
ضروری تھا کہ جب بنو اسحاق ذمہ واری کے ادا کرنے میں
کوتاہی کریں تو بنو اسمٰعیل کے وعدہ کو پورا کیا جائے اور

اسی وعدہ کے پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کو وادی غیر ذی زرع یعنی مکہ میں رکھا تھا آخر بنو اسمٰعیل کی قربانی کا بدلہ ملنے کا وقت آگیا چنانچہ اب ان میں سے نبی مبعوث کیا گیا ہے جس کا یہ کام ہے کہ اللہ کی آیات لوگوں کو سنائے انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انہیں پاکیزہ کرے۔ (خلاصہ رکوع ۱۶) بنو اسرائیل کو اس پر چڑنے کا حق نہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے آباء ابراہیم اسحاق یعقوب علیہم السلام نے انہیں نصیحت کی تھی کہ اصل عزت کامل فرمانبرداری میں ہے پس انہیں فرمانبرداری کرکے خدا تعالیٰ کے انعامات کو حاصل کرنا چاہیئے اور باغی بنکر اس کے عذاب کو نہ بھڑکانا چاہیئے۔

خلاصہ رکوع ۱۷ و ۱۸۔ پھر فرمایا کہ بنی اسرائیل محمد رسول اللہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے گزشتہ نبیوں کا قبلہ ترک کر دیا ہے حالانکہ اول تو قبلہ مقصود بالذات شے نہیں صرف وحدت کے قیام کا ایک ذریعہ ہے دوسرے ابراہیم نے جو دعا بنو اسمٰعیل کے حق میں کی تھی اس میں کعبہ کے قبلہ اور مکہ کے حج کی جگہ مقرر ہونے کی خبر دی گئی تھی۔ پس جب محمد رسول اللہ اس پیشگوئی کو پورا کرنے والے ہیں تو ان کے لئے ضروری تھا کہ کعبہ کے قبلہ ہونے کا اعلان کریں ورنہ انکی قوم ان برکات سے حصہ نہیں لے سکتی جو ابراہیمی دعا کے مطابق اس قبلہ سے وابستہ ہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ کعبہ کی ظاہری و باطنی صفائی کریں ظاہری صفائی اس مقام کو فتح کرکے اور وہاں سے آلاتِ شرک کو دور کرکے اور باطنی صفائی شرک اور کفر کے خیالات کو مٹا کر اور کعبہ کو قبلہ عالم بنا کر (خلاصہ رکوع ۱۹) پھر فرمایا اس کام میں مشکلات ہونگی اور کفار تلوار کے زور سے مسلمانوں کو اس کام سے روکیں گے لیکن انہیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے بلکہ دعا اور کوشش سے اس کام میں لگا رہنا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہی ابدی زندگی پاتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ کوشش ضرور بارآور ہوگی اور مکہ فتح ہوگا اور انہیں اس کی ظاہری باطنی صفائی کا موقع مل جائے گا۔ (خلاصہ رکوع ۲۰) اس رکوع میں خاص طور پر آیات کا لفظ استعمال فرما کر يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ جو باتیں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں وہ یونہی نہیں بلکہ زمین و آسمان کی پیدائش اور رات دن کے اختلاف اور قانون قدرت کے تمام مظاہروں سے انکی تصدیق ہوتی ہے یعنی اول تو قانون قدرت ایک روحانی قانون کے وجود اور اس کے ارتقاء کے ساتھ مکمل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے خود محمد رسول اللہ کی تائید میں تم آسمان و زمین اور رات اور دن اور بادلوں اور ہواؤں اور خشکی اور تری کے سامانوں کو دیکھو گے اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کا پیارا ہے۔ تبھی تو سب کائنات اسکی تائید میں لگی ہوئی ہے ورنہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایک نئی راہ تجویز کرتا ہے وہ تو ذلیل ہوا کرتا ہے اس رکوع میں آیات پڑھ کر سنانے کے مضمون کو ختم کیا گیا ہے۔

خلاصہ رکوع ۲۱۔ اس رکوع سے ابراہیمی پیشگوئی کے دوسرے پہلو کو لیا ہے یعنی شریعت اور اسکی حکمتوں کے بیان کو اور سب سے پہلے حلال اور طیب کھانے کی تعلیم دی ہے کیونکہ انسانی اعمال اس کے ذہنی حالت کے تابع ہیں اور ذہنی حالت غذا سے متأثر ہوتی ہے حلال وہ ہے جسکی شریعت اجازت دے اور طیب وہ جسکی اصول صحت اور رواج ملکی اور ذوق صحیح اجازت دے۔ ممنوع غذاؤں کے بارہ میں چار اصول بتائے کہ وہ غذائیں استعمال نہ کرو جو مردار ہوں یعنی ان میں سڑاندہ شروع ہوگئی ہو یا جو خون کی مانند ہوں یعنی زہروں پر مشتمل ہوں یا جو سؤر کے گوشت کی طرح ہوں کہ وہ بد اخلاق جانور ہے اور اس کے استعمال سے انسان اس کے اخلاق کو قبول کر لیتا ہے یا جو بے غیرتی پیدا کرنے والی ہوں جیسے مشرکانہ رسوم کے کھانے وغیرہ وغیرہ۔ (خلاصہ رکوع ۲۲) اس رکوع میں اسلامی تعلیم کا

صہ بیان کیاہے کہ اللہ۔ یوم آخر۔ کتب سماویہ۔ اور انبیاءؑ
پرایمان لانا ضروری ہے تاکسی سچائی کا انکار نہ ہو اور
بندوں سے حسن سلوک بھی ضروری ہے اور اللہ تعالےٰ
کی عبادت اور قومی چندے بھی ضروری ہیں اور اخلاق
حسنہ صبر اور ایفائے عہد بھی ضروری ہیں اور انصاف کا
قیام اور اپنے رشتہ داروں کی جائز مدد اور قوانین تمدن
کا قیام بھی ضروری ہے جس کے اہم قانونوں میں سے ایک
قانون وراثت بھی ہے (خلاصہ ع ۲۲) اخلاقی قانون کو
پورا کرنے کے لئے ظاہری ریاضت بھی ضروری ہے چنانچہ
اس کے لئے اسلام نے روزے مقرر کئے ہیں اس سے
اخلاق درست ہوتے ہیں اور دُعاؤں کی توفیق ملتی اور
ان میں اثر پیدا ہوتا ہے (خلاصہ رکوع ۲۴ و ۲۵) اس
رکوع میں حج کے قواعد بیان کئے گئے ہیں جو اجتماع اُمّت
کا ذریعہ ہے اور بتایا ہے کہ ایسے پُرامن مقام کے رستہ
میں جو لوگ فساد پیدا کرتے ہیں ان سے جنگ کرنی فساد
نہیں بلکہ امن کا قیام ہے پس مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے
جنگ کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے اور بتایا ہے کہ
ایک مرکز کے بغیر سب عالم ایک رسی میں نہیں بندھ سکتا
پس حج کے حکم کو معمولی حکم نہ سمجھیں۔

خلاصہ رکوع ۲۶۔ اس میں احکام کی حکمتوں کا بیان
کیا گیاہے اور بتایا ہے کہ شریعت کو فضول نہیں سمجھنا
چاہیئے۔ ظاہر باطن کی درستی کا موجب ہوتاہے اور شریعت
کی مخالفت کی اصل وجہ دُنیا کی محبّت ہوتی ہے کہ انسان
اپنے اوقات اور اموال خدا کی راہ میں خرچ کرنا پسند
نہیں کرتا اور بہانے بنا کر اس بوجھ سے بچنا چاہتا ہے
ایسے ہی بہانوں سے دُنیا میں اختلافات بڑھتے ہیں اور انبیاءؑ
کی لائی ہوئی تعلیم کو لوگ کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں حالانکہ روحانیت
بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ پھر صدقہ خیرات کا ذکر کیا
ہے کہ اس کا مصرف کیا ہے اور بتایا ہے کہ سب سے بڑا
مصرف صدقہ کا جہاد فی سبیل اللہ ہے جبکہ لوگ دین میں خلل انداز
کریں اور حرّیت ضمیر کو روکیں۔ (خلاصہ ع ۲۷) ایسے وقت
میں جنگ ضروری ہوتی ہے اور مالی جانی قربانی لازمی حتیٰ کہ
اگر دشمنانِ صداقت حج کے مہینوں میں بھی کہ عام حالتوں
میں ان میں لڑائی منع ہے جنگ کریں تو تم کو بھی ان میں جنگ
کرنا جائز ہو جائے گا۔ جنگ کے ایام میں لوگ جوئے اور
شراب کی طرف رغبت کرتے ہیں تاکہ دل کو بہلائیں اور
جنگ کے لئے روپیہ جمع کریں۔ فرمایا کہ مسلمانوں کی جنگ تو
ایک دینی جنگ ہے ان کے دل کے بہلنے کا سامان تو اللہ تعالےٰ
کی رضا میں موجود ہے انہیں ان بُرے کاموں سے پرہیز
چاہیئے پھر بتایا کہ اموال کی قربانی کی حد کوئی نہیں جو زیادہ
سے زیادہ قربانی جس سے دوسروں کے حقوق کو نقصان
نہ پہنچتا ہو انسان کرسکے کرے۔ پھر فرمایا جنگوں کی وجہ سے
کثرت سے یتامیٰ رہ جائینگے ان کے بارہ میں حکم یاد رکھو کہ
بہتر سے بہتر سلوک ان سے کرنا اور یاد رکھنا کہ مشرک عورتوں
مردوں سے شادی نہ کرنا کہ اس سے نظام میں خلل آتا ہے (خلاصہ
رکوع ۲۸ تا ۳۱) پھر عورتوں کے عام احکام بیان فرمائے
کہ حیض میں ان کے قریب نہ جاؤ اور ان سے حسن سلوک
کرو اور اگر کسی مجبوری سے ان سے قطع تعلق کرنا پڑے تو چار
ماہ سے زیادہ ایسا نہ کرو ہاں بالکل تعلق قائم نہ رکھ سکتے ہو تو
طلاق دے دو۔ پھر طلاق کے احکام بیان کئے اور رضاعت
اور بیواؤں کے بھی۔ اس جگہ کتاب اور حکمت کا مضمون ختم
ہوا (خلاصہ رکوع ۳۲ و ۳۳) رکوع ۳۲ سے تزکیہ کے
اصول بیان کرنے شروع کئے بتایا کہ قومی ترقی بغیر قربانی کے
نہیں ہوتی پس یاد رکھو کہ وہی قوم زندہ ہوسکتی ہے جو اپنے
لئے موت کو قبول کرلے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ احیاء
موتیٰ اسی طرح کرتا ہے کہ ایسے احکام دیتا ہے جو قوم کو بمنزلہ
موت نظر آتے ہیں مگر جب وہ ان پر عمل کرلیتی ہے تو اسے
زندگی مل جاتی ہے۔

خلاصہ رکوع ۳۴۔ بتایا کہ زندگی کا اعتبار نہیں اس
لئے جلد سے جلد نیکی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اللہ تعالےٰ

سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے پھر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارہ میں ایک مختصر مگر جامع بیان دیا جو آیۃ الکرسی کہلاتا ہے اور جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی بہترین آیت قرار دیا ہے۔ پھر فرمایا ایسی اعلیٰ صفات والے خدا سے تعلق کسی جبر کا محتاج نہیں بلکہ اس کا حُسن خود دلوں کو موہ لیتا ہے اور یہی تعلق مفید ہو سکتا ہے پس دین کے بارہ میں جبر سے کام نہ لو کیونکہ مذہب کی غرض تزکیہ ہے اور جبر سے دلوں کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ جن کو اپنے قُرب میں جگہ دیتا ہے ان کے دلوں کی تاریکی کو دلائل و براہین سے دُور کرتا ہے صرف ظاہری اقرار کو وہ پسند نہیں کرتا (خلاصہ رکوع ۳۵) اللہ تعالیٰ کی طرف سے پاکیزگی عطا کرنے کے دو طریق ہیں اول افراد کی پاکیزگی جو براہِ راست بندوں کو عطا کی جاتی ہے جیسے انبیاء کو۔ دوسرے اقوام کی پاکیزگی جو انبیاء کے ذریعہ سے انہیں حاصل ہوتی ہے پھر فرمایا کہ پاکیزگی کی یہ اقسام ابراہیمؑ کی اولاد کو چار زمانوں میں خاص طور پر ملنی مقدر ہیں (خلاصہ رکوع ۳۶) پھر فرمایا کہ قومی پاکیزگی کے حصول کے لئے جدوجہد کی بھی اور تعاون باہمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے ہاں کوئی یہ اعتراض کرے کہ تعاون باہمی تو ہر قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے اس میں خدا تعالیٰ کے ماننے والوں کی کوئی شرط نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے آزاد ہو کر تعاون باہمی کرتے ہیں ان کے اعمال کے نتائج قربانیوں کے مطابق ہوتے ہیں لیکن جو اللہ تعالیٰ کی خاطر ایسا کرتے ہیں انکی قربانیوں کے نتائج انکی کوششوں کے مقابلہ پر بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ (۱) وہ قربانیاں خدا تعالیٰ کے احکام کے قیام کے لئے کرتے ہیں (۲) وہ اپنی قربانیوں کو خدا تعالیٰ کے لئے سمجھتے ہیں اور بندوں پر احسان نہیں جتاتے (خلاصہ رکوع ۳۷) جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے قربانیاں کرتے ہیں ان کے عمل کبھی ضائع نہیں ہو سکتے۔ اور ان کے دل قربانیوں پر مطمئن ہوتے ہیں اور ان کے اعمال میں پاکیزگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پھر بتایا کہ گو حُسن سلوک کسی سے بھی ہو اچھا کام ہے مگر جو لوگ دُنیا کی اصلاح میں مشغول ہوں ان سے حسنِ سلوک زیادہ ثواب کا موجب ہوتا ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ وہی حُسنِ سلوک مفید ہو گا جو جائز طور پر کمائے ہوئے اموال سے ہو (خلاصہ رکوع ۳۸) فرمایا کہ سُود کا کاروبار حسنِ سلوک اور تعاون باہمی کی رُوح کے خلاف ہے اس سے مومن کو بچنا چاہیئے۔ چنانچہ سود کا کاروبار کرنے والی قومیں لڑائی پر دلیر ہوتی ہیں اور امن عامہ کی پرواہ نہیں کرتیں اس بات سے مت ڈرو کہ سود کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی دُنیا میں ایسے سامان پیدا کر دئے جائینگے کہ سود خوار قومیں تباہ ہو جائینگی (خلاصہ رکوع ۳۹) حسنِ سلوک اور تعاون باہمی کا ایک طریق قرض بھی ہے جو اپنے اموال کلی طور پر اپنے حاجتمند بھائی کو نہیں دے سکتا لیکن قرض سے اسکی مدد کر سکتا ہے اسے اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے مگر قرض کا چونکہ کچھ مدت بعد مطالبہ ہوتا ہے اس لئے قرض کو لکھ لینا چاہیئے اور گواہ مقرر کر لینے چاہئیں تا فساد نہ ہو اور اگر لکھنے والا نہ ہو تو شہادت کے طور پر کوئی چیز رہن رکھ دینی چاہیئے (خلاصہ رکوع ۴۰) مگر سب سے بڑا گُر پاکیزگی اور طہارت کا (۱) اللہ تعالیٰ کی صفات کو سامنے رکھنا (۲) کلام الٰہی پر ایمان اور تدبّر (۳) انبیاء اور مسلمانوں اور اشخاص متعلقہ کی دُعا ہے۔

(یہ خلاصہ ہے سورۃ بقرہ کا اور اس میں بلا واسطہ تو یہود و نصارٰی اور قریش پر اس رنگ میں حجت تمام کی گئی ہے کہ ابراہیم کی ایک دُعا کا جو مقبول بارگاہ الٰہی ہو چکی پورا ہونا باقی تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس دُعا کو پُورا کرتا ہے پس اگر ان کے وجود کا انکار کیا جائے تو ابراہیم بھی جھوٹے بنتے ہیں اور ان کے جھوٹا ہونے سے موسویت اور مسیحیت بھی ساتھ ہی جھوٹی ہو جاتی ہیں اور بالواسطہ تمام دنیا پر اسلام کی صداقت ثابت کی گئی ہے کیونکہ انسان کی پیدائش بغیر مقصد کے نہیں ہو سکتی اور اس مقصد کو اگر کوئی کلام پورا کرتا ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہُوا کلام ہے کیونکہ اسی سے معرفت الٰہی صحیح قانون اور فلسفہ شریعت اور پاکیزگی قلب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بیحد کرم کرنے والا۔ بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

الٓمّٓ ○

الٓمّٓ ۲؎

جیسے ضروری امور حاصل ہوتے ہیں۔

اگر کوئی ان نوٹوں کی مدد سے سورۂ بقرہ کو پڑھے گا تو میں سمجھتا ہوں اسے اس سورۃ میں ایک نیا لطف آئے گا اور اس کے مطالب کا ایک وسیع دروازہ اس کے لئے کھل جائے گا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

سُورہ بقرہ کا تعلق سُورۃ فاتحہ سے

سورۃ فاتحہ کا تعلق تو کلام الٰہی کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے سب ہی سورتوں سے ہے لیکن سورۃ بقرہ کو چونکہ اس کے معًا بعد رکھا گیا ہے اس سورۃ کا تعلق سورۃ فاتحہ سے یقیناً سب سے زیادہ ہے چنانچہ اول تعلق تو اس کا اس سے یہ ہے کہ جس طرح سورۃ فاتحہ خلاصہ ہے سارے قرآن کریم کا۔ اسی طرح یہ سورۃ بھی خلاصہ ہے سب قرآن کا کیونکہ اس میں دلائل و براہین بھی بیان کئے گئے ہیں شریعت بھی اور فلسفۂ شریعت بھی اور پاکیزگی اور طہارت کے گر بھی بیان کئے گئے ہیں اور ابراہیمی دُعا میں آخری موعود کی بعثت کا بھی مقصد بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا تعلق سورۃ فاتحہ کا سورۃ بقرہ سے یہ ہے کہ اس میں اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کی دُعا سکھائی گئی تھی اور سورۂ بقرہ کی ابتداء بھی آیت ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ سے ہوئی ہے یعنی یہ سورۃ صراط مستقیم کی طرف لے جانے کے مقصد کو پورا کرتی ہے اور فاتحہ کی دُعا کی قبولیت کا ظاہری نشان ہے۔

۲؎ تفسیر۔ چونکہ یہ حروف الگ الگ بولے جاتے ہیں انہیں حروف مقطعات کہتے ہیں جو ایک سے لے کر پانچ کی تعداد تک بعض سورتوں کے شروع میں بیان کئے گئے ہیں حروف کی اقسام کے لحاظ سے یہ چودہ حرف ہیں اور انکی تفصیل یہ ہے

ا۔ ل۔ م۔ ص۔ ر۔ ک۔ ہ۔ ی۔ ع۔ ط۔ س۔ ح۔ ق ن۔ ان میں سے ص۔ ق اور ن اکیلا اکیلا ایک ایک سورۃ کے پہلے آیا ہے۔ باقی دو دو یا زیادہ مل کر آئے ہیں ان کے معنوں کے بارہ میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے بعض نے تو لکھا ہے کہ یہ حروف خدا تعالیٰ کے اسرار میں سے ہیں اس لئے ان کے معنوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیئے بعض نے لکھا ہے کہ ان سے یہ مراد ہے کہ قرآن کریم بھی حروف ہجا سے بنا ہے مگر پھر بھی معجزانہ کلام ہے اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو کیوں عرب انہی حروف سے ایسا ہی کلام نہ بنا لیتے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ قسمیں ہیں جو سورۃ کے مضمون پر اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں۔ مگر سب مطالب ایسے معمولی ہیں کہ ان کی خاطر حروف مقطعات کا قرآنی سور کے شروع میں رکھنا نظر میں جنچتا نہیں۔ بعض نے ان کو با معانی کلام کا خلاصہ قرار دیا ہے مثلاً الف لام میم کے معنے یہ کئے ہیں کہ اللہ جبریل محمدؐ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعہ سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر یہ کلام نازل کیا ہے۔ یہ معنے الف لام میم کے حروف پر تو چسپاں ہو جاتے ہیں لیکن تمام حروف مقطعات کی اس طرح تشریح نہیں ہو سکتی۔ بعض نے ان حروف کے معنی یہ کئے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہے جن کی تشریح بعد کی سورۃ میں کی گئی ہے اور صفات کے پہلے حروف یا بعض اہم حروف کو مضمون کی طرف اشارہ کرنے کیلئے بیان کر دیا گیا جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا یہی معنی سب سے زیادہ درست اور شانِ قرآن اور شہادت

مقطعات کے معنوں کے بارہ میں مفسرین کا اختلاف

سُورۂ بقرہ کے مضمون کے سورۂ فاتحہ سے تعلق۔

حروف مقطعات اور ان کی تعداد۔

مقطعات کا صحیح مفہوم

قرآن کے مطابق ہیں بعض نے ان حروف سے ان آیات کے مضامین کے اوقات کی طرف اشارہ مراد لیا ہے یعنی حروف مقطعات سے جس قدر عدد نکلتے ہیں اس قدر عرصہ تک کے متعلق ان سورتوں میں واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یا یہ کہ اس زمانہ کے حالات کی طرف ان سورتوں میں خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے یہ معنی بھی جیسا کہ بتایا جائے گا درست معلوم ہوتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی کم سے کم ان کی تصدیق کرتی ہے بعض مغربی مصنفین نے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ ان کاتبوں کے نام ہیں جنہوں نے حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے یہ سورتیں لکھیں (سیل بحوالہ گولیس) چنانچہ انہوں نے الف سے ابوبکر ع سے علی یا عمر س سے سعد ط سے طلحہ اور ھا سے ابوہریرہؓ وغیرہ مراد لئے ہیں یہ معنے اس ناواقفیت کا ایک اور ثبوت ہیں جس کے باوجود ہر مغربی مصنف اسلام کے بارہ میں علمیت کا دعویٰ کرنے پر تیار رہتا ہے لطف یہ ہے کہ ھا سے حضرت ابوہریرہؓ کے نام کی طرف اشارہ مراد لیا گیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف تین سال پہلے اسلام لائے تھے جبکہ سورۂ مریم اور سورۂ طٰہٰ جن میں ھ آتی ہے دونوں ہی مکی ہیں اور ابوہریرہؓ کے اسلام لانے سے دس پندرہ سال پہلے نازل ہو چکی تھیں علاوہ ازیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ یہ حروف بھی الہامی ہیں۔

حروف مقطعات قرآن کریم کی وحی کا حصہ ہیں۔

مقطعات کے معانی سمجھنے میں مغربی محققین کی غلطی۔

نیز یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر یہ سورتیں دوسرے صحابہ سے تیار کروائی گئی تھیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر افراد کو اپنے جھوٹے ہونے کا (نعوذ باللہ من ذالک) گواہ بنالیا آخر جب باقی قرآن آپ نے (نعوذ باللہ من ذالک) خود بنایا تھا تو ان سورتوں کو صحابہ سے بنوانے کی کیا خاص غرض تھی اور کیوں ان کو ایک افتراء کا گواہ بنایا۔ اور اگر بفرض محال ایسا کیا بھی تھا تو ان ناموں کو شروع میں رکھ کر اس افتراء کا ثبوت کیوں بہم پہنچایا ایسا کام تو ایک نیم عقل کا انسان بھی نہیں کرسکتا

اس امر کا ثبوت کہ ان حروف کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی وحی کا حصہ قرار دیا ہے اس حدیث سے ملتا ہے جو بخاری نے اپنی کتاب تاریخ میں نیز ترمذی اور حاکم نے عبداللہ بن مسعود سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَءَ حَرفًا من کتاب اللّٰہِ فَلَہٗ بِہٖ حَسَنَۃٌ وَالْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حرفٌ ولکن الف حرفٌ ولام حرفٌ و میم حرفٌ (ترمذی ابواب فضائل القرآن۔ باب ماجاءَ فی من قَرَأَ حرفًا من القرآن ماله من الاجر) اس روایت کو بزاز اور ابن شیبہ نے بھی عوف بن مالک الاشجعی کی سند پر نقل کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن کریم کا ایک حرف بھی پڑھے وہ جنت کا مستحق ہوگا اور اسکی یہ نیکی دس گنے ثواب کا مستحق اسے بنا دیگی اور میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے بلکہ الٓمّٓ کا الف ایک مستقل حرف ہے اور لام ایک مستقل حرف ہے اور میم ایک مستقل حرف ہے (اس جگہ حرف سے مراد لفظ ہے قواعد نحو کے مدوّن ہونے سے پہلے حرف کا لفظ الفاظ کے لئے بھی عربی میں استعمال کیا جاتا تھا اسلامی زمانہ میں قواعد نحو کے مدوّن ہونے پر حرف کا لفظ حروف ہجا۔ یا ان الفاظ کے لئے مخصوص کر دیا گیا جو دوسرے لفظوں سے ملے بغیر مستقل معنی نہیں دیتے) اس شہادت کی موجودگی میں کون خیال کرسکتا ہے کہ یہ حروف کاتبوں نے اپنے نام کے لئے بطور علامت کے سورتوں کے شروع میں رکھ دیئے تھے پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ تو یہ ہے کہ کاتبوں نے اپنے ناموں کی علامت کے طور پر یہ حروف لکھے تھے لیکن الٓمّٓ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اَمَرَلِی مُحَمَّد مجھے اس کے لکھنے کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا ہے ان معنوں سے تو کسی شخص کا نام بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ پھر یہ علامت

کس بات کی تشریح ہے۔ اس حدیث سے بھی جو جابر بن عبداللہ سے ابھی بیان کی جائے گی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الٓمّٓ کو وحی الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے۔

یعنی ایک معنی ان حروف کے یہ بتلائے تھے کہ انکے عدد کے مطابق سالوں کے واقعات کی طرف انکے بعد کی سورۃ میں اشارہ کیا گیا ہے یہ معنی ایک یہودی عالم نے کئے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نے ان کو دُہرایا آپؐ نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ ایک رنگ میں تصدیق کی۔ اس لئے یہ معنی بھی قابل غور ہیں اور تدبر کرنیوالوں کے لئے اس تفسیر سے کئی نئے مطالب کی راہ کھل جاتی ہے۔ وہ حدیث جس میں اس تشریح کا ذکر آتا ہے یوں ہے

ابن اسحاق نے اور بخاری نے (اپنی تاریخ میں) نیز ابن جریر نے ابن عباس سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے یوں روایت کی ہے

مَرَّ اَبُوْ یَاسِرِ بْنِ اَخْطَبَ فِیْ رِجَالٍ مِنْ یَهُوْدٍ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ یَتْلُوْ فَاتِحَةَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ فَاَتٰی اَخَاهُ حُیَیَّ بْنَ اَخْطَبَ فِیْ رِجَالٍ مِّنَ الْیَهُوْدِ فَقَالَ تَعْلَمُوْنَ وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ مُحَمَّدًا یَتْلُوْ فِیْمَا اُنْزِلَ عَلَیْهِ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ فَقَالَ اَنْتَ سَمِعْتَهٗ فَقَالَ نَعَمْ فَمَشٰی حُیَیٌّ فِیْ اُولٰٓئِكَ النَّفَرِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا یَا مُحَمَّدُ اَلَمْ یُذْكَرْ اَنَّكَ تَتْلُوْ فِیْمَا اُنْزِلَ عَلَیْكَ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ قَالَ بَلٰی قَالُوْا اَجَآءَكَ بِهٰذَا جِبْرِیْلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ قَالُوْا لَقَدْ بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلِكَ الْاَنْبِیَآءَ مَا نعلمه بَیَّنَ لِنَبِیٍّ مِنْهُمْ ما مُدَّۃَ مُلْكِهٖ وَمَا اَجَلُ امته غیرك فَقَالَ حُیَیُّ بْنُ اَخْطب واقبل عَلٰی مَنْ كَانَ معه الالف واحدة واللام ثلاثون والمیم اَرْبَعُوْنَ فَهٰذِهٖ احدی وَسَبْعُوْنَ سَنَةً اَفَتَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ نَبِیٍّ اِنَّمَا مُدَّۃُ مُلْكِهٖ وَاَجَلُ اُمَّتِهٖ احدی وَسَبْعُوْنَ سَنَةً ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ هَلْ مَعَ هٰذَا غَیْرُهٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَمَا ذَاكَ قَالَ الٓمٓصٓ. قَالَ هٰذِهٖ اَثْقَلُ وَاَطْوَلُ الالف واحدة واللام ثلثون والمیم اَرْبَعُوْنَ وَالصَّاد تِسْعُوْنَ فَهٰذِهٖ احدی وَسِتُّوْنَ وَمِاَۃُ سَنَةٍ هَلْ مَعَ هٰذَا یَا مُحَمَّدُ غَیْرُهٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَمَا ذَاكَ قَالَ الٓرٰ قَالَ هٰذِهٖ اَثْقَلُ وَاَطْوَلُ الالف واحدة وَاللَّامُ ثَلٰثُوْنَ والرّاء مِاَتَانِ هٰذِهٖ احدی وَثَلَاثُوْنَ سَنَةً وَمِاَتَانِ فَهَلْ مَعَ هٰذَا غَیْرُهٗ قَالَ نَعَمْ الٓمّٓرٰ قَالَ فَهٰذِهٖ اَثْقَلُ وَاَطْوَلُ الالف واحدة واللام ثَلَاثُوْنَ وَالْمِیْمُ اَرْبَعُوْنَ وَالرَّاءُ مِاَتَانِ فَهٰذِهٖ احدی وَسَبْعُوْنَ سَنَةً وَمِاَتَانِ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ لُبِسَ عَلَیْنَا اَمْرُكَ یَا مُحَمَّدُ حَتّٰی مَا نَدْرِیْ اَقَلِیْلًا اُعْطِیْتَ اَمْ كَثِیْرًا ثُمَّ قَامُوْا فَقَالَ اَبُوْ یَاسِرٍ لِاَخِیْهِ حیی ومن معه من الاحبار مَا یُدْرِیْكُمْ لَعَلَّهٗ قَدْ جُمِعَ هٰذَا لِمُحَمَّدٍ كُلُّهٗ احدی وَسَبْعُوْنَ واحدی وَسِتُّوْنَ ومِاَۃ واحدی وثلاثون ومِاَتَانِ واحدی وَسَبْعُوْنَ وَمِاَتَانِ فَذٰلِكَ سبع مِاَۃ وَاَرْبَعٌ وَثَلَاثُوْنَ سَنَةً فَقَالُوْا لَقَدْ تَشَابَهَ عَلَیْنَا اَمْرُهٗ (بحوالہ فتح البیان مصری ص ٣٣)

> حروف مقطعات کے مطالب ان کے اعداد کے لحاظ سے۔

یعنی ابویاسر بن اخطب (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشہور یہودی علماء سے تھا) کچھ یہود سمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا جبکہ آپؐ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات پڑھ رہے تھے یعنی الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ وہ یہ سُن کر اپنے بھائی حُیَیّ بن اخطب کے پاس جبکہ وہ یہود کی ایک جماعت کے پاس بیٹھا ہوا تھا آیا اور کہا کہ تم کو کچھ معلوم ہے یعنے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا پڑھتے سُنا ہے خدا کی قسم میں نے سُنا ہے کہ وہ اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام میں سے یہ کلام پڑھ رہے تھے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ اس پر حُیَیّ نے کہا کیا فی الواقع تم نے یہ کلام سُنا ہے؟ اس نے

کہا کہ ہاں اسیر حُیَیؔ اپنے ساتھیوں کو لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا آپؐ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاتی کہ آپ اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام میں سے ایک یہ وحی بھی سُناتے ہیں کہ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ آپؐ نے فرمایا یہ درست ہے اس نے کہا کیا یہ کلام جبریل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نازل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں حُیَیؔ نے کہا کہ آپؐ سے پہلے بھی انبیاء آئے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ سوائے آپؐ کے ان میں سے کسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسکی حکومت کی مدت اور اس کی قوم کا عرصہ بیان کیا ہو۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ الف کا ایک لام کے تیس اور میم کے چالیس یعنی کل اکہتر سال ہوئے کیا تم ایسے نبی کے دین کو قبول کروگے جسکی حکومت کا عرصہ اور جسکی امت کا زمانہ کل اکہتر سال ہے پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہؤا اور پُوچھا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا ان کے علاوہ اور حرف بھی آپؐ پر نازل ہوئے ہیں آپؐ نے فرمایا ہاں اس نے پوچھا کیا آپؐ نے فرمایا الٓمّٓصٓ اس نے کہا یہ زیادہ گراں ہے اور لمبا عرصہ ہے الف کا ایک لام کے تیس میم کے چالیس اور ص کے نوّے کل ایک سو اکسٹھ ہوئے پھر پوچھا کیا ان کے سوا اور حروف بھی آپ پر نازل ہوئے ہیں آپؐ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا وہ کیا آپؐ نے فرمایا الٓرٰ اس نے کہا یہ اس سے بھی زیادہ گراں اور لمبا عرصہ ہے الف کا ایک لام کے تیس اور ر کے دوسو کل دوسو اکتیس ہوئے پھر کہنے لگا کیا ان کے سوا اور حروف بھی ہیں آپؐ نے فرمایا ہاں اور وہ الٓمّٓرٰ کے حروف ہیں اسیر وہ بولا کہ یہ تو پہلے سے بھی گراں اور لمبا عرصہ ہے الف کا ایک لام کے تیس میم کے چالیس اور ر کے دوسو ہوئے کل دوسو اکہتر سال کا عرصہ ہؤا پھر کہنے لگا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) آپؐ کا معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا ہے پتہ نہیں لگتا آپؐ کو لمبی عمر عطا ہوئی ہے یا چھوٹی پھر وہ اور اس کے ساتھی اُٹھ کر چلے گئے راستہ میں ابو یاسر نے اپنے بھائی اور دوسرے یہودی علماء سے کہا کیا معلوم کہ یہ سب زمانے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے اکٹھے کر دئے گئے ہوں جنکی میزان سات سو چونتیس سال ہوتی ہے اسیر سب نے کہا کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی ہو گیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے ان حروف سے سالوں کی تعداد مُراد لی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خیال کا اظہار بھی کیا تھا اور آپؐ نے اُنکے خیال کی تردید نہیں فرمائی۔

یہود کا یہ خیال کہ ان حروف سے امت محمّدیہ کا زمانہ بتایا گیا ہے ایک بالبداہت غلط بات ہے کیونکہ امت محمّدیہ کا زمانہ تو تا قیامت ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تردید نہ کرنا بھی کچھ معنے ضرور رکھتا ہے اور اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اور سورتوں کے مضامین کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حروف اپنی عددی قیمت کے لحاظ سے اس زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کے واقعات خاص طور پر اس سورۃ میں بیان کئے گئے ہیں جسکی ابتداء میں وہ حروف آئے ہیں خواہ اس لحاظ سے کہ بعثت نبوی کے بعد اتنے عرصہ کے اختتام پر وہ واقعات ہوئے یا اس لحاظ سے کہ اس عرصہ کے اختتام پر وہ واقعات شروع ہوئے اگر اس خیال کو درست سمجھا جائے تو یہ بات تو واضح ہے کہ سورۂ بقرہ کے واقعات بعثت کے بعد کے اکہتر سال کے واقعات کا مختصر خاکہ ہیں حضرت معاویہؓ سنہ ۶۰ھ میں فوت ہوئے ہیں اس میں تیرہ سال قبل ہجرت کے شامل کئے جائیں تو یہ ۷۳ سنہ ہوتا ہے یزید کی بیعت حضرت معاویہ نے وفات سے ایک دو سال پہلے لی ہے چونکہ اسی وقت سے اصل فتنہ شروع ہؤا ہے اس لئے ابتدائے اسلام اور ترقی اسلام کا زمانہ اکہتر سال ہوتا ہے اور اسی زمانہ کا نقشہ سورۂ بقرہ میں کھینچا گیا ہے۔ دوسری سورۃ مریم ہے اس سے پہلے کٓھٰیٰعٓصٓ کے الفاظ ہیں جنکی مجموعی رقم ۱۹۵ ہوتی ہے سورہ مریم میں مسیحیت کی ترقی کا ذکر ہے اور خصوصاً ذکر

ترقی کا جو اسلامی ترقی کے بعد ہوئی تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا
ہے کہ اس سال سے مسیحیت نے دوبارہ سر نکالا ہے یہی سال
ہے جس میں اسلامی تاریخ میں پہلی دفعہ کوشش کی گئی کہ
جس وقت معتصم باللہ مسیحی رومی حکومت کے خلاف لڑ رہا تھا
اسے معزول کر کے عباس بن مامون کو خلیفہ مقرر کر دیا جائے
اور اس طرح مسیحیوں کے مقابل پر اسلام کو ضعف پہنچایا جائے
اسی زمانہ کے قریب مسیحیوں نے دوبارہ سپین پر حملہ کر کے
اس کے کچھ حصے واپس لے لئے اور اسی زمانہ کے قریب
یہ بدبختی کا واقعہ دیکھنے میں آیا کہ خلافت اندلس نے خلافت
عباسیہ کے خلاف روما کے عیسائی بادشاہ سے خفیہ معاہدہ
کیا اور عباسی حکومت نے شاہ فرانس سے سپین کی اسلامی
حکومت کے خلاف دوستانہ تعلقات قائم کئے اور اس طرح
اسلامی سیاست میں مسیحیوں کو داخل کر کے مسیحیت کی ترقی
اور اسلام کے تنزل کی داغ بیل ڈالی۔ میری رائے میں اگر
دوسری سورتوں پر بھی غور کیا جائے تو زمانہ کے لحاظ سے
کافی روشنی ان مضامین پر پڑے گی۔

اب میں حروف مقطعات کے بارہ میں وہ تحقیق
لکھتا ہوں جس کی بنیاد حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ
کے کئے ہوئے معنوں پر ہے اور وہ تحقیق یہ ہے۔

حروف مقطعات اپنے اندر بہت سے راز رکھتے ہیں
ان میں سے بعض راز بعض ایسے افراد کے ساتھ تعلق
رکھتے ہیں جن کا قرآن کریم سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان کا
ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہیئے لیکن اس کے علاوہ یہ الفاظ
قرآن کریم کے بعض مضامین کے لئے قفل کا بھی کام دیتے
ہیں کوئی پہلے ان کو کھولے تب ان مضامین تک پہنچ سکتا
ہے جس جس حد تک ان کے معنوں کو سمجھا جائے۔ اسی حد
تک قرآن کریم کا مطلب کھلتا جائے گا۔

میری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ جب حروف مقطعات
بدلتے ہیں تو مضمون قرآن جدید ہو جاتا ہے اور جب کسی
سورۃ کے پہلے حروف مقطعات استعمال کئے جاتے ہیں
تو جس قدر سورتیں اس کے بعد ایسی آتی ہیں جن کے پہلے
مقطعات نہیں ہوتے ان میں ایک ہی مضمون ہوتا ہے
اسی طرح جن سورتوں میں وہی حروف مقطعات دُہرائے جاتے
ہیں وہ ساری سورتیں مضمون کے لحاظ سے ایک ہی لڑی میں
پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔

اسلام کے بعض واقعات کا حروف مقطعات میں اشارہ

اس قاعدہ کے مطابق میرے نزدیک سورۂ بقرہ سے لیکر
سورہ توبہ تک ایک ہی مضمون ہے اور یہ سب سورتیں الٓمّٓ
سے تعلق رکھتی ہیں سورۃ بقرہ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے پھر
سورۃ آل عمران بھی الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر سورہ نساء
سورہ مائدہ اور سورہ انعام حروف مقطعات سے خالی ہیں
اور اس طرح گویا پہلی سورتوں کے تابع ہیں جن کی ابتداء
الٓمّٓ سے ہوتی ہے ان کے بعد سورہ اعراف الٓمّٓصٓ
سے شروع ہوتی ہے اس میں بھی وہی الٓمّٓ موجود ہے
ہاں حرف ص کی زیادتی ہوئی ہے اس کے بعد سورۃ انفال
اور براءۃ حروف مقطعات سے خالی ہیں پس سورۃ براءۃ
تک الٓمّٓ کا مضمون چلتا ہے سورۃ اعراف میں جو ص
بڑھایا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حرف تصدیق کی طرف لیجاتا
ہے۔ سورہ اعراف انفال اور توبہ میں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی کامیابی اور اسلام کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے سورۂ
اعراف میں اصولی طور پر اور انفال و توبہ میں تفصیلی طور پر تصدیق
کی بحث ہے اس لئے وہاں ص کو بڑھا دیا گیا ہے۔

مقطعات میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے۔

سورۂ یونس سے الٓمّٓ کی بجائے الٓرٰ شروع ہو
گیا ہے ال تو وہی رہا اور م کو بدل کر ر کر دیا۔ پس یہاں
مضمون بدل گیا۔ اور فرق یہ ہوا کہ بقرہ سے لیکر توبہ تک
تو علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی تھی اور سورۂ یونس سے لیکر
سورۂ کہف تک واقعات کی بحث کی گئی ہے اور واقعات
کے نتائج پر بحث کو منحصر رکھا گیا ہے اس لئے فرمایا کہ الٓرٰ
یعنی اَنَا اللّٰہُ اَرٰی میں اللہ ہوں جو سب کچھ دیکھتا ہوں
اور تمام دُنیا کی تاریخوں پر نظر رکھتے ہوئے اس کلام کو تمہارے
سامنے رکھتا ہوں۔ غرض ان سورتوں میں رویت کی صفت

پر زیادہ بحث کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں علم کی صفت پر زیادہ بحث تھی۔

میں فی الحال اس جگہ اختصاراً اتنی بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حروف مقطعات کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ بے معنی ہیں۔ اور انہیں یونہی رکھ دیا گیا ہے مگر ان لوگوں کی تردید خود حروف مقطعات ہی کر رہے ہیں چنانچہ جب ہم تمام قرآن پر ایک نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں حروف مقطعات استعمال ہوئے ہیں تو ان میں ایک ترتیب نظر آتی ہے۔ سورۂ بقرہ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے پھر سورہ آل عمران الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے پھر سورۂ نساء سورۂ مائدہ سورہ انعام حروف مقطعات سے خالی ہیں پھر سورۂ اعراف الٓمّٓصٓ سے شروع ہوتی ہے اور سورۂ انفال اور براءۃ خالی ہیں ان کے بعد سورۂ یونس سورۂ ہود سورۂ یوسف الٓرٰ سے شروع ہوتی ہیں اور سورہ رعد میں مر بڑھا کر الٓمّٓرٰ کر دیا گیا ہے لیکن جہاں الٓمّٓصٓ میں ص آخر میں رکھا ہے مر کو ر سے پہلے رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی مقصد کے مدنظر رکھے بغیر زیادتی کی جاتی تو چاہیئے تھا کہ میم کو جو زائد کیا گیا تھا ر کے بعد رکھا جاتا میم کو الٓر کے درمیان رکھ دینا بتاتا ہے کہ ان حروف کے کوئی خاص معنے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے الٓمّٓ کی سورتیں ہیں اور اس کے بعد الٓر کی۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مضمون کے لحاظ سے میم کو ر پر تقدم حاصل ہے اور سورۂ رعد جس میں میم اور را اکٹھے کر دئے گئے ہیں اس میں میم کو ر سے پہلے رکھنا اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ سب حروف خاص معنے رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان حروف کو جو معنیً مقدم رکھتے ہیں ہمیشہ مقدم ہی رکھا جاتا ہے۔ سورۂ رعد کے بعد ابراہیم اور حجر میں الٓر استعمال کیا گیا ہے لیکن نحل بنی اسرائیل اور کہف میں مقطعات استعمال نہیں ہوئے اور یہ سورتیں گویا پہلی سورتوں کے مضامین کے تابع ہیں۔ ان کے بعد سورۂ مریم ہے جس میں کٓھٰیٰعٓصٓ کے حروف استعمال

حروف مقطعات بے معنی نہیں۔

حروف مقطعات کے استعمال میں ایک خاص ترتیب۔

کئے گئے ہیں۔ سورۂ مریم کے بعد سورۂ طٰہٰ ہے اور اس میں طٰہٰ کے حروف استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد انبیاء حج مؤمنون نور اور فرقان میں حروف مقطعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ گویا یہ سورتیں طٰہٰ کے تابع ہیں۔ آگے سورۂ شعراء طٰسٓمّٓ سے شروع کی گئی ہے گویا طاء کو قائم رکھا گیا ہے اور ھا کی جگہ س اور میم لائے گئے ہیں اس کے بعد سورہ نمل ہے جو طٰسٓ سے شروع ہوتی ہے اس میں سے میم کو اُڑا دیا گیا ہے اور طاء اور س قائم رکھے گئے ہیں اس کے بعد سورۂ قصص کی ابتدا پھر طٰسٓمّٓ سے کی گئی ہے گویا میم کے مضمون کو پھر شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد سورہ عنکبوت کو پھر الٓمّٓ سے شروع کیا گیا ہے اور دوبارہ علم الٰہی کے مضمون کو نئے پیرایہ اور نئی ضرورت کے ماتحت شروع کیا گیا ہے (اگرچہ میں ترتیب پر اس وقت بحث نہیں کر رہا لیکن اگر کوئی کہے کہ الٓمّٓ دوبارہ کیوں لایا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ سے الٓمّٓ کے مخاطب کفار تھا اور یہاں سے الٓمّٓ کے مخاطب مومن ہیں) سورہ عنکبوت کے بعد سورۂ روم سورۂ لقمان اور سورۂ سجدہ کو بھی الٓمّٓ سے شروع کیا گیا ہے ان کے بعد سورۂ احزاب سبا۔ فاطر بغیر مقطعات کے ہیں اور گویا پہلی سورتوں کے تابع ہیں۔ ان کے بعد سورۂ یٰسٓ ہے جس کو یٰسٓ کے حروف سے شروع کیا گیا ہے اس کے بعد سورۂ صافات بغیر مقطعات کے ہے اس کے بعد سورہ صٓ حرف ص سے شروع کی گئی ہے پھر سورہ زمر حروف مقطعات سے خالی اور پہلی سورۃ کے تابع ہے اس کے بعد سورۂ مومن حٰمٓ سے شروع کی گئی ہے اس کے بعد سورہ حٰمٓ سجدہ کو بھی حٰمٓ سے شروع کیا گیا ہے پھر سورۂ شوریٰ کو بھی حٰمٓ سے شروع کیا گیا ہے لیکن ساتھ حروف عٓسٓقٓ بڑھائے گئے ہیں اس کے بعد سورۂ زخرف ہے اس میں بھی حٰمٓ کے حروف ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ پھر سورۂ دخان۔ جاثیہ اور احقاف بھی حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے بعد سورۂ محمد فتح اور حجرات بغیر مقطعات کے ہیں اور پہلی سورتوں کے تابع ہیں

سورۃ قٓ حرف قٓ سے شروع ہوتی ہے اور قرآن کریم کے آخر تک ایک ہی مضمون چلا جاتا ہے۔

یہ ترتیب بتا رہی ہے کہ یہ حروف یونہی نہیں رکھے گئے۔ پہلے الٓمّٓ آتا ہے پھر الٓمّٓصٓ آتا ہے جس میں صٓ کی زیادتی کی جاتی ہے پھر الٓرٰ آتا ہے اور پھر الٓمّٓرٰ آتا ہے کہ جس میں میم کی زیادتی کی جاتی ہے پھر کٓھٰیٰعٓصٓ آتا ہے جس میں صٓ پر چار اور حروف کی زیادتی ہے پھر طٰہٰ لایا جاتا ہے۔ اور پھر اس میں کچھ تبدیلی کرکے طٰسٓمّٓ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہی قسم کے الفاظ کا متواتر لانا اور بعض کو بعض جگہ بدل دینا بعض جگہ اور رکھ دینا بتاتا ہے کہ خواہ یہ حروف کسی کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں جس نے انہیں رکھا ہے کسی مطلب کے لئے ہی رکھا ہے۔ اگر یونہی رکھے جاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کہیں ان کو بدل دیا جاتا کہیں زائد کر دیا جاتا کہیں کم کر دیا جاتا۔

علاوہ مذکورہ بالا دلائل کے خود مخالفین اسلام کے ہی ایک استدلال سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مقطعات کچھ معنی رکھتے ہیں۔ مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب انکی لمبائی اور چھوٹائی کے سبب سے ہے اب اگر یہ صحیح ہے تو کیا یہ عجیب بات نہیں کہ باوجود اس کے کہ سورتیں اپنی لمبائی اور چھوٹائی کے سبب سے آگے پیچھے رکھی گئی ہیں ایک قسم کے حروف مقطعات اکٹھے آتے ہیں الٓمّٓ کی سورتیں اکٹھی آگئی ہیں الٓرٰ کی اکٹھی طٰہٰ اور اس کے مشترکات کی اکٹھی پھر الٓمّٓ کی اکٹھی حٰمٓ کی اکٹھی۔ اگر سورتیں ان کے حجم کے مطابق رکھی گئی ہیں تو کیا یہ عجیب بات نہیں معلوم ہوتی کہ حروف مقطعات ایک خاص حجم پر دلالت کرتے ہیں اگر صرف یہی تسلیم کیا جائے تب بھی اس کے معنے یہ ہوں گے کہ حروف مقطعات کے کچھ معنی ہیں خواہ یہی معنی ہوں کہ وہ سورۃ کی لمبائی اور چھوٹائی پر دلالت کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ ایک قسم کے حروف مقطعات کی سورتوں کا ایک جگہ پر جمع ہونا بتاتا ہے کہ ان کے معنوں میں اشتراک ہے اور یہ حروف سورتوں کے لئے بطور کنجیوں کے ہیں۔

حروف مقطعات کے معانی کا استنباط قرآن کریم سے

میرے نزدیک حروف مقطعات کے معنوں کیلئے ہمیں قرآن کریم ہی کی طرف دیکھنا چاہیئے پہلی سورتوں میں الٓمّٓ آیا تھا چنانچہ سورہ بقرہ کے پہلے یہی حروف تھے اور ان کے بعد ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا جملہ تھا اس کے بعد آل عمران میں الٓمّٓ آیا جس کے بعد اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ آیا یاد رکھنا چاہیئے کہ حق اور لَا رَیْبَ کے دراصل ایک ہی معنے ہیں پس بقرہ میں بھی الٓمّٓ کے بعد ایسی کتاب کا ذکر تھا جس میں ریب نہ ہو اور اس جگہ بھی پھر اعراف میں الٓمّٓصٓ آیا اور اس کے بعد كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ کی آیت رکھی گئی گویا یہاں بھی لَا رَيْبَ فِيْهِ والی کتاب کا ذکر ہوا ہے کیونکہ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ ایسی ہی کتاب پر دلالت کرتا ہے جو لَا رَيْبَ فِيْهِ کی صفت سے متصف ہو۔ ان ابتدائی سورتوں کے بعد

مقطعات کی حالت کا اعتراف مخالفین اسلام کی طرف سے

وقفہ ہے کہ عنکبوت الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے فرماتا ہے الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ ان آیات میں بھی ایک یقینی کتاب کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ امتحان شک اور ریب کے دور کرنے پر ہی دلالت کرتا ہے پس اس سورۃ میں بھی وہی مضمون ہے جو سورۃ بقرہ وغیرہ میں تھا صرف فرق یہ ہے کہ بقرہ میں انسان بحیثیت مجموعی مخاطب تھے اور یہاں مومنوں سے کہا گیا ہے کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ابھی شک تمہارے دلوں میں باقی ہو اور ہم تم سے معاملہ کا طریق والا شروع کر دیں۔ سورۂ روم میں بھی یہی مضمون ہے گو بہت باریک ہو گیا ہے فرماتا ہے الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ خدا تعالیٰ کا کلام روم کے متعلق نازل ہوا ہے اور وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا

گویا بجائے سب کتاب کی طرف اشارہ کرنے کے ایک خاص حصہ کی طرف اشارہ اور اس کے یقینی ہونے پر زور دیا ہے جیسا کہ ’مِنْ‘ اور ’مص‘ کے حروف سے ظاہر ہے۔

سورۂ روم کے بعد سورہ لقمان الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے اس میں فرماتا ہے الٓمّٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۗ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اس سورۃ میں بھی حَکِیْم کا لفظ استعمال کر کے ایک یقینی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور گویا بقرہ کے ابتدائی مضمون کو دُہرا دیا گیا ہے اور اس کے بعد سورہ سجدہ ہے اس میں آتا ہے الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ یہاں بھی ایک بے ریب کتاب کا ذکر ہے پس ان سب آیات سے ظاہر ہے کہ جہاں الٓمّٓ آتا ہے اس کے بعد ایک خاص مضمون آتا ہے اور ایک یقینی علم کے نزول کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اب اس امر کی موجودگی میں کس طرح سمجھ لیا جائے کہ یہ الفاظ یونہی رکھ دیئے گئے ہیں پس حق یہی ہے کہ الٓمّٓ کے حروف ازالہ شک و یقین پر دلالت کرنے کے لئے آتے ہیں اور وہ چیز جس سے شک دُور ہوتا ہے اور یقین پیدا ہوتا ہے کامل علم ہی ہوتا ہے پس الٓمّٓ کے معنی یہی ہیں اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ میں اللہ ہوں جو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں پس اگر شک کو دُور کرنا اور یقین حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے کلام کی طرف توجہ کرو اور میری کتاب کو پڑھو۔

اب میں الٓرٰ کو لیتا ہوں ان حروف سے جو سورتیں شروع ہوتی ہیں اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ بھی ایک ہی مضمون سے شروع ہوتی ہیں سورۂ یونس میں آتا ہے الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۞ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۞ پھر سورہ ہود میں آتا ہے الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۚ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۞ پھر سورہ یوسف میں آتا ہے الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞ پھر سورۂ رعد میں آتا ہے الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۞ یہاں میم کا بھی اور رَا کا بھی مضمون آ گیا۔ پھر سورۂ ابراہیم میں آتا ہے الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۞ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ۞ پھر سورہ حجر میں آتا ہے الٓرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۞ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۞ ..... وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۞ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۞ ان سب مقامات پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں دو مضامین پر زور دیا گیا ہے ایک پُرانی تاریخ پر جس میں سے خاص طور پر شریروں کو سزا ملنے کے مضمون کو منتخب کر لیا گیا

ہے اور دوسرے پیدائش عالم کے مضمون پر۔ سورۂ یونس میں استفہام انکاری کے استعمال سے بتایا گیا ہے کہ نذیر و بشیر انبیاء ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں۔ سورۂ ہود میں اول تو یہ قاعدہ بتایا ہے کہ کوئی قوم ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتی بلکہ ایک دائرہ کے اندر چکر لگاتی ہے اور پیدائش عالم کا ذکر کرکے جتایا کہ دُنیا کی ترقی قانونِ ارتقاء کے ماتحت ہے اس کے بعد سورۂ یوسف میں صاف الفاظ میں تاریخ عالم کی طرف اشارہ کیا ہے سورۂ رعد میں چونکہ میم زائد تھا اس میں الۗرٰ اور الۗمّۗرٰ دو مضمونوں کو جمع کر دیا اور پہلے تو میم کی مناسبت سے ایک یقینی کلام کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے بعد پیدائش عالم کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے سورۂ ابراہیم میں پھر قانونِ قدرت کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اسے دیکھو اس میں تمہیں ایک بیدار آقا کا ہاتھ نظر آئیگا سورۂ حجر میں پھر پچھلی تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے یہ امر ظاہر ہے کہ واقعات اور قانون کا تعلق دیکھنے سے ہے حقیقت تک وہی پہنچ سکتا ہے جسکی آنکھوں کے سامنے واقعات ہوں یا جسکی آنکھوں کے سامنے کوئی قانون ظاہر ہو رہا ہو پس ان سورتوں کا رویت کے ساتھ تعلق ہے اور الۗرٰ میں یہی دعویٰ کیا گیا ہے کہ مَیں اللہ دیکھتا ہوں نہ تو پُرانی تاریخ میری نظر سے پوشیدہ ہے اور نہ قانونِ قدرت کا اجراء یا پیدائش عالم میری نگاہ سے مخفی ہے پس رویت سے تعلق رکھنے والے اُمور میں میری ہی ہدایت کافی ہو سکتی ہے۔

ایک اور بات بھی حروف مقطعات کے متعلق یاد رکھنی چاہیئے کہ گو حروف مقطعات کے مضامین حروف کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں لیکن ایک امر میں یہ سب حروف مشترک ہیں اور ▓ یہ کہ جو سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں ان کے مضمون کی ابتداء وحی الٰہی کے ذکر سے ہوتی ہے اکثر میں تو صاف الفاظ میں کتاب یا قرآن کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے اور چند ایک میں کسی پرانی کتاب کی طرف اشارہ ہے جیسا سورۂ مریم میں یا کسی خاص کلام کی طرف اشارہ ہے جیسا سورۂ روم میں (یہ نوٹ جلد ۳ میں سورۂ یونس کی تفسیر میں چھپ چکا ہے لیکن چونکہ حالات کی مجبوری سے پہلی جلد بعد میں چھپ رہی ہے اس نوٹ کو سورۂ بقرہ میں درج کرنا پڑا۔ تاکہ شروع سے تفسیر پڑھنے والے پر بھی حروف مقطعات کی حقیقت واضح ہو جائے)

یہ دو معنے جو اوپر کئے گئے ہیں یعنی (۱) حروف مقطعات صفاتِ الٰہیہ پر دلالت کرتے ہیں اور ہر حرف کسی ایسی صفت پر دلالت کرتا ہے جس کا ذکر اس سورۃ میں پایا جاتا ہے (۲) ان حروف سے اشارہ حروف کی عددی قیمت کی طرف ہے اور جس قدر عدد ان حروف سے نکلتے ہیں اس قدر زمانہ کے حالات پر ان سے خاص طور پر روشنی پڑتی ہے دونوں ہی درست ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ایک کو درست اور دوسرے کو غلط کہا جائے اور اس بارہ میں ابتداء اسلام کے بعض آئمہ بھی مجھ سے متفق ہیں چنانچہ ابن ابی حاتم نے ابو جعفر رازی کی روایت سے ابو العالیہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے ایک حصہ کا ترجمہ یہ ہے "ان حروف میں سے ایک حرف بھی ایسا نہیں (یعنی الۗمّۗ اور دوسرے مقطعات میں سے) جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی کُنجی نہ ہو اور ان میں سے کوئی حرف ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے نہ ہو اور اسکی روشنی سے حاصل نہ ہُوا ہو اور ان میں سے ایک حرف بھی ایسا نہیں جو بعض اقوام کی تاریخ اور ان کے زمانہ پر دلالت نہ کرتا ہو" یعنی ان حروف سے یہ تینوں معنے بیک وقت ظاہر ہوتے ہیں ان سے صفاتِ الٰہیہ پر بھی دلالت کی گئی ہے اور مختلف زمانوں کے بارہ میں پیشگوئی بھی کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے معجزانہ کلام کا نمونہ بھی دکھایا گیا ہے اور ابو العالیہ کا یہ خیال نہایت درست اور مطابق حقیقت ہے۔ ابن جریر نے بھی اس روایت کو دوسرے لفظوں میں نقل کیا ہے اور اس کے مضمون کی تصدیق کی ہے۔

حروف مقطعات کی نسبت یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس غیر معمولی طریق کو قرآن کریم نے کیوں استعمال کیا کیوں نہ یہی مضمون سیدھی سادھی عبارت میں بیان کر دیا۔ تا کہ اوّل

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

یہی کامل کتاب ہے — اس (امر) میں کوئی شک نہیں — متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے ۳؎

عربوں پر اور بعد میں دوسرے لوگوں پر اس کا سمجھنا آسان ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غیر معمولی طریق نہیں بلکہ عربوں میں یہ طریق کلام رائج تھا اور ان کے بڑے بڑے شاعر بھی اسے استعمال کرتے تھے اور نثر میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ع قُلْنَا قِفِیْ لَنَا فَقَالَتْ قَاف ہم نے اس سے کہا کہ تو ذرا ہماری خاطر ٹھہر جا تو اس نے جواب میں قاف کہا یعنی وَقَفْتُ لو میں کھڑی ہو گئی ہوں۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر کہتا ہے۔

بِالْخَیْرِ خَیْرَاتٌ وَاِنْ شَرًّا فَا

وَلَا اُرِیْدُ الشَّرَّ اِلَّا اَنْ تَا

یعنی نیکی کے بدلہ میں نیکی کروں گا۔ لیکن اگر تیرا ارادہ بدی کرنے کا ہو تو میں اس کیلئے بھی تیار ہوں اور میں بدی کا ارادہ نہیں رکھتا سوائے اسکے کہ تیرا ارادہ ہو۔ اس شعر میں فَشَرٌّ کی جگہ صرف حرف فا استعمال کیا گیا ہے اور تَشَاءُ

الکتٰب

یعنی تُو چاہے کی جگہ صرف حرف تا استعمال کیا گیا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی ہے کہ مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ کَلِمَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ اٰیِسٌ مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (ابن ماجہ ابواب الدیات) یعنی جو شخص کسی مسلمان کے قتل میں ایک لفظ کا حصہ استعمال کرے (یعنی اُقْتُلْ کی جگہ اُقْ کہہ دے) تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھے گا کہ اسکے ماتھے کے درمیان یہ لکھا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو گیا۔ پس عرب میں نظم و نثر میں جب قرینہ موجود ہو الفاظ کی جگہ حروف استعمال ہوتے تھے اور اس اسلوب کلام کا ایک لطیف نمونہ حروف مقطعات کے ذریعہ سے قرآن کریم نے دکھایا ہے۔ آجکل یورپ نے تو اس اسلوب کو بیحد استعمال کیا ہے ایم اے۔ بی اے۔ بی ٹی۔ ایم ڈی وغیرہ سینکڑوں

ال کی اقسام

ہزاروں حروف الفاظ کے قائم مقام استعمال ہو رہے ہیں۔ اور لوگ ان کے فائدہ کو سمجھتے ہیں۔

۳؎ حل لغات۔ ذٰلِكَ۔ اسم اشارہ ہے اور اشارہ بعید کے لئے آتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں وہ ہے لیکن کبھی ھٰذا کے معنوں میں یعنی قریب کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے چنانچہ زجاج کا قول ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ اَیْ ھٰذَا الْكِتٰبُ یعنی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے معنی ہیں 'یہ کتاب' (تاج العروس) لیکن ذٰلِكَ کو اشارہ بعید کے لئے تصور کرتے ہوئے بھی ذٰلِكَ کے معنی 'یہ' کئے جا سکتے ہیں کیونکہ کبھی قریب کی چیز کے لئے دُور کا اشارہ اس کے فاصلہ کی دوری کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ اس کی شان کی بلندی کے اظہار کے لئے بھی استعمال کر دیا جاتا ہے (فتح البیان)

الْكِتٰبُ۔ ال اور کتاب کا مجموعہ ہے اور معنوں کے علاوہ ال حرف تعریف بھی ہے اس صورت میں یہ کبھی عہد کے لئے ہوتا ہے اور کبھی جنس کے لئے جب عہد کے لئے ہو تو کبھی ذکری ہوتا ہے اور کبھی ذہنی۔ اور کبھی حضوری یعنی جس لفظ پر ال آئے کبھی تو اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ وہی امر ہے جس کا ذکر کر آئے ہیں اور کبھی یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہماری مراد اس چیز سے ہے جو ہم اور تم دونوں اپنے دلوں میں جانتے ہیں اور کبھی یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ جو سامنے چیز پڑی ہے میں اسی کا ذکر کر رہا ہوں۔ اور جب جنسی ہو تو استغراقی ہوتا ہے یعنی اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس جنس کے سب افراد اس لفظ میں شامل ہیں۔ استغراقی آگے کبھی حقیقی ہوتا ہے جیسے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ انسان ضعیف ہی پیدا کئے گئے ہیں اور کبھی مجازی۔ مجازی کی صورت میں ال لا کر یہ بتایا جاتا ہے کہ کامل فرد یہی ہے ورنہ حقیقۃً اس قسم کے اور افراد بھی موجود

ہوتے ہیں اسکی مثال اَنْتَ الرَّجُل ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ بس تُو ہی مرد ہے باقی سب عورتیں ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ مرد کے کمالات کو اگر دیکھا جائے تو اسکی مکمل تعریف تجھ پر ہی صادق آتی ہے باقی مردوں میں کچھ نہ کچھ نقص ہیں استغراق کے علاوہ جنسی ال تعریفِ حقیقت بیان کرنے کے لئے بھی آتا ہے جیسے اَلْاِنْسَانُ اَفْضَلُ مِنَ الْحَیَوَانِ انسان اپنی حقیقت کے لحاظ سے حیوان سے بہتر ہے۔ (اقرب)

کِتَابٌ۔ کتاب۔ کَتَبَ کا مصدر ہے اور اسی لحاظ سے ہر اس چیز کا نام کتاب کہا گیا ہے جس میں مختلف مسائل کو فصل باب کے ساتھ لکھ دیا جائے تورات کو بھی انہی معنوں میں کتاب کہتے ہیں اور ہر لکھی ہوئی تصنیف کو بھی کتاب کہتے ہیں اور کتاب کے معنی فرض کے بھی ہیں اور حکم کے بھی اور قضاء آسمانی کے بھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے کلام کو بھی کتاب کہتے ہیں اور خط کو بھی کتاب کہتے ہیں (اقرب)۔

پس اس لفظ کے اپنے اپنے محل پر مختلف معنی ہونگے کبھی فروض و احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت والی وحی کو کتاب کہیں گے اور کبھی صرف الہام کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قطعی اور یقینی وحی کو کتاب کہیں گے خواہ کتابی صورت میں جمع کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

رَیْبٌ۔ اَلظِّنَّةُ وَالتُّهْمَةُ۔ تخمین سے بلا دلیل کوئی بات کہنا یا محض وہم سے کسی پر الزام لگانا اور اسکی سچائی میں شبہ کرنا۔ الشَّكُّ۔ شک۔ اَلْحَاجَةُ۔ کمی۔ ضرورت اور رَیْبُ الْمَنُوْنِ کے معنے ہیں زمانہ کے مصائب آفات (اقرب)

ریب کا لفظ قرآن کریم میں اور کئی جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً اسی سورۃ میں فرماتا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (بقرہ ع ۳) اس جگہ مراد صداقت میں شبہ کے ہیں۔ اسی طرح سورۃ حج میں ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ (الحج ع ۱) اس جگہ بھی بعث بعد الموت کی صداقت میں شک و شبہ کرنے کے معنے ہیں پھر سورۃ طور میں ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (الطور ع ۲) یعنی کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے متعلق ہم انتظار کر رہے ہیں کہ زمانہ کے مصائب آخر اسے ہلاک کر دینگے۔ اس جگہ ریب مصائب دہر اور ہلاکت کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

لفظ ریب کا استعمال قرآن مجید میں۔

قرآن کریم میں رَیب کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا مثلاً فرماتا ہے مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ (ق ع ۲) نیکی سے بہت روکنے والا۔ حد سے بڑھنے والا شک و شبہ کا شکار دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اسی طرح سورۃ مومن میں آتا ہے كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (المومن ع ۴) یعنی اللہ تعالیٰ اسی طرح گمراہ قرار دیتا ہے یا ہلاک کرتا ہے اسے جو حد سے بڑھنے والا یا اپنے عقیدہ اور خیالات کی بنیاد غیر معقول شبہات و وساوس پر رکھنے والا ہو۔ پس ریب اس شک کو نہیں کہتے جو علم کی زیادتی کا موجب ہوتا ہو اور تحقیق میں ممد ہو بلکہ اس شک کو کہتے ہیں جو تعصب یا بدظنی کی وجہ سے ہو اور سچائی سے محروم کر دے چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (المدثر ع ۱) ہم نے یہ (مذکورہ بالا کام اس لئے کیا ہے کہ تا اہل کتاب اور مومن ریب میں نہ پڑیں گویا مومن ریب میں نہیں پڑتا اور اللہ تعالےٰ مومن کو ریب سے بچاتا ہے حدیث میں آتا ہے دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَالَا یُرِیْبُكَ (ترمذی مطبوعہ مطبع مجتبائی جلد دوم صفحہ ۷۴ ابواب صفۃ القیامۃ) یعنی جو چیز تیرے دل میں قلق اور وسوسہ پیدا کرے اسے چھوڑ دے اور اس چیز کو اختیار کر جس کے بارہ میں وسوسہ نہ ہو۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریب اس شک کو کہتے ہیں جسکی بنیاد وسوسہ اور وہم پر ہو اور اس شک کو نہیں کہتے جو تحقیق

کِتَاب

رَیب

اَلشَّك

تدقیق کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

ھُدًی ھُدًی۔ الرَّشَادُ۔ سیدھے راستہ پر ہونا۔ اَلْبَیَانُ بیان کرنا۔ الدَّلَالَۃُ۔ کسی امر کی طرف رہبری کرنا (اقرب) الھدایۃ الدَّلَالَۃُ بِلُطْفٍ یعنی ہدایت (جو ھُدًی کا ہم معنی دوسرا مصدر ہے) کے معنی محبت اور نرمی سے کسی امر کی طرف رہبری کرنے کے ہیں (مفردات) امام راغب کے نزدیک ہدایت کا لفظ قرآن کریم میں مندرجہ ذیل چار معنوں میں آتا ہے (۱) ہر عقل یا سمجھ یا ضروری جزوی ادراک کی طاقت رکھنے والی شے (جیسے حیوانات وغیرہ کہ ادراک کامل ان کو حاصل نہیں ہوتا صرف جزوی یا سطحی ادراک ایسے ضروری امور کا جو انکی حیات اور محدود عمل سے تعلق رکھتے ہیں ان کو حاصل ہوتا ہے) کو اسکی صلاحیت کے مطابق کام کا طریق بتانا۔ اسکی مثال قرآن کریم میں یہ ہے رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (طٰہٰ ع ۲) یعنی ہر چیز کو پیدا کر کے اسکی عقل یا سمجھ یا اس کے ضروری تقاضوں کے مطابق اسے رہنمائی کی (میرے نزدیک اس جگہ ھَدٰی کے معنے یہ ہیں کہ ہر شے میں مناسب قوتیں پیدا کر کے پھر انہیں کام پر لگا دیا کیونکہ صرف قوتوں کا موجود ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ انہیں ابتدائی حرکت دیکر کام پر لگانا انکی حیات کے شروع کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے بچہ پیدا ہوتا ہے تو گو پیدائش سے پہلے آلاتِ تنفس کامل طور پر موجود ہوتے ہیں مگر باہر نکلنے کے بعد جب تنفس کے آلات کو ہوا لگنے یا پانی کا چھینٹا دینے سے ان میں حرکت پیدا ہوتی ہے بچہ کی عملی زندگی درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جس طرح ایک گھڑی کے اندر سب ہی پُرزے موجود ہوتے ہیں مگر جب تک اسے کُنجی دے کر حرکت نہ دی جائے پُرزے کام کرنا شروع نہیں کرتے غرض حیات کو شروع کرنے سے پہلے ایک ابتدائی دھکے کی ہر شے کو ضرورت ہوتی ہے اور ہدایت سے مُراد وہی حرکت اُولیٰ ہے اور اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو مناسب قوٰی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور پھر حرکت اُولیٰ دیکر اسے مفوضہ کام پر لگا دیا ہے) علامہ راغب کے نزدیک ہدایت کے دوسرے معنے اس ارشاد کے ہیں جو اللہ تعالےٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچاتا ہے اسکی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سجدہ ع ۳) ہم نے بنی اسرائیل میں سے ایسے امام مقرر کئے جو ہمارے الہام سے لوگوں کو ہماری طرف بُلاتے تھے۔ ہدایت کے تیسرے معنے ان کے نزدیک اس توفیق کے ہیں جو ہدایت پانے والوں کو ملتی ہے یعنی ہدایت ملنے کے بعد جو عمل کی توفیق یا فکر کی بلندی پیدا ہوتی ہے یا مزید ہدایت کے حصول کی خواہش پیدا ہوتی ہے وہ بھی ہدایت کہلاتی ہے اسکی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے اَلَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی (محمد ع ۲) جو لوگ ہدایت پاتے ہیں اللہ تعالےٰ انہیں ہدایت میں اور بڑھا دیتا ہے (یعنی عمل کی توفیق اور ہدایت کے سلسلہ میں مزید فکر کرنے اور علوم حاصل کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے) چوتھے معنی ہدایت کے انجام بخیر کے اور جنت کو پالینے کے ہیں اسکی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے سَیَھْدِیْھِمْ وَیُصْلِحُ بَالَھُمْ (محمد ع ۱) اللہ تعالےٰ ان کا انجام بخیر کر کے انہیں جنت تک پہنچا دے گا اور ان کے حالات کو درست کر دے گا اور قرآن کریم میں جہاں یہ آتا ہے یَھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیاء ع ۵) وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت دیتے تھے یا لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ (رعد ع ۱) ہر قوم میں ہادی آیا ہے اس جگہ ہدایت سے مُراد لوگوں کو ہدایت کی دعوت دینے کے ہیں اور ایسی آیات جیسے کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ اور ایسی آیات جن میں یہ ذکر ہے کہ کافروں اور ظالموں کو ہدایت نہیں مِل سکتی۔ اس سے مُراد تیسری اور چوتھی قسم کی ہدایتیں ہیں یعنی ہدایت پا جانے کے بعد توفیق عمل کا ملنا یا نورِ ایمان کا عطا ہونا یا جنت میں داخلہ کی نعمت کا حصول۔ پس ان آیات کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کفار کو مذکورہ بالا انعامات نہیں مل سکتے (اور یہ ظاہر ہے کہ جو دوسری قسم کی ہدایت یعنی دعوت انبیاء کو قبول نہیں کرتا۔ وہ تیسری اور چوتھی

امام راغب کے نزدیک لفظ ہدایت کے معنے

قسم کی ہدایتوں کو جو دوسری قسم کی ہدایتوں کے نتائج ہیں حاصل نہیں کر سکتا) (مذکورہ بالا تمام مضمون سوائے ان عبارتوں کے جو خطوط وحدانی میں ہیں عربی کی مشہور لغت کی کتاب مفردات راغب سے لیا گیا ہے)

المتقین

اَلْمُتَّقِیْن۔ متقی کی جمع ہے جو اِتَّقٰی کا اسم فاعل ہے۔ اتقاء وقی سے باب افتعال کا فعل ہے۔ وَقٰی کے معنے ہیں بچایا حفاظت کی۔ اور اِتَّقٰی کے معنے ہیں بچا۔ اپنی حفاظت کی (اقرب) مگر اس لفظ کا استعمال دینی کتب کے محاورہ میں معصیت اور بُری اشیاء سے بچنے کے ہیں اور خالی ڈر کے معنوں میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ وقایۃ کے معنی ڈھال یا اس ذریعہ کے ہیں جس سے انسان اپنے بچاؤ کا سامان کرتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اتّقاء جب اللہ تعالیٰ کے لئے آئے تو انہی معنوں میں آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنی نجات کے لئے بطور ڈھال بنا لیا۔

لفظ تقویٰ کا استعمال قرآن مجید میں اور اس کے معنے۔

قرآن کریم میں تقویٰ کا یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کے بارہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ کانٹوں والی جگہ پر سے گزرو تو کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا یا اس سے پہلو بچا کر چلا جاتا ہوں یا اس سے پیچھے رہ جاتا ہوں یا آگے نکل جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بس اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مقام پر کھڑا نہ ہو اور ہر طرح اس جگہ سے بچنے کی کوشش کرے ایک شاعر (ابن المعتز) نے ان معنوں کو لطیف اشعار میں نظم کر دیا ہے وہ کہتے ہیں۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صغیرَھا و * کبیرَھا ذَالِکَ التُّقٰی
وَاصنَعْ کَماشٍ فَوْقَ اَرْ * ضِ الشَّوْکِ یَحْذَرُ مَا یَرٰی
لَا تَحْقِرَنَّ صغیرۃً * اِنَّ الجِبَالَ مِنَ الحَصٰی

(ابن کثیر) یعنی گناہوں کو چھوڑ دے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے یہ تقویٰ ہے اور تو اس طریق کو اختیار کر جو کانٹوں والی زمین پر چلنے والا اختیار کرتا ہے یعنی وہ کانٹوں سے خوب بچتا ہے۔ اور تو چھوٹے گناہ کو حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ کنکروں سے ہی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ کے استعمال کے متعلق ایک سوال اور اس کا جواب۔

تفسیر۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ۔ اس کے متعلق اعتراض کیا گیا ہے کہ ذالک تو اشارہ بعید کے لئے ہے پھر اس لفظ کو اس جگہ کیوں استعمال کیا گیا ہے بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اشارہ قریب کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے (زجاج دیکھو حل لغات) بعض نے کہا ہے کہ گو اشارہ بعید کے لئے بھی ہے لیکن جب کسی چیز کا ذکر ختم ہو جائے تو وہ بھی بعید کے حکم میں ہوتی ہے چنانچہ عام طور پر گفتگو میں جس امر کا ذکر ہو چکا ہے اس کے بارہ میں ذٰلِکَ کہہ کر اشارہ کر دیتے ہیں چنانچہ عرب اپنی بات ختم کر کے کہتے ہیں ذٰلِکَ مَالَا شَكَّ فِیْهِ اور ذٰلِکَ سے مُراد وہ بات ہوتی ہے جو اس نے ختم کی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (بقرہ ع ۸) اس جگہ ذٰلِکَ سے مُراد فارض اور بکر ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے پھر فرماتا ہے ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ (یوسف ع ۵) اس جگہ بھی جو بات اوپر کہی ہے اسکی طرف ذٰلِکَ سے اشارہ کیا ہے (کشاف) ان آیتوں کے علاوہ اور آیات بھی قرآن کریم میں ہیں مثلاً ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (سجدہ ع ۱) تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ (انعام ع ۱۰) قرآن کریم میں دوسری جگہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کی جگہ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ بھی آیا ہے۔

غرض اوّل تو ذٰلِکَ عرب کے محاورہ کے مطابق هٰذَا کے معنوں میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ دوم ضروری نہیں کہ جس چیز کے بارہ میں ذٰلِکَ آئے وہ دُور ہو مگر ذہنی طور پر دُور ہو یعنی اس کا ذکر ختم ہو چکا ہو تو اس کے لئے بھی ذٰلِکَ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کے چار معنے۔

اس تشریح کے ماتحت ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کے کئی معنے ہو سکتے ہیں (۱) یہ وہ کتاب ہے (۲) وہ یہ کتاب ہے، (۳) یہی کامل کتاب ہے (۴) وہی کامل کتاب ہے۔

مذکورہ بالا معانی اس صورت میں ہیں کہ ذٰلِکَ مبتدا

ہو اور اَلْکِتَاب خبر لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ ذٰلِکَ کو مبتدا اور الکتاب کو عطف بیان اور لَا رَیْبَ فِیْہِ کو اسکی خبر سمجھا جائے اس صورت میں اس کے معنی یُوں ہونگے (۱) یہ یعنی کامل کتاب اپنے اندر کوئی ریب کی بات نہیں رکھتی (۲) وہ کامل کتاب (یعنے ہدایت انبیاء) اپنے اندر کوئی ریب کی بات نہیں رکھتی۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کی ترکیب

لغوی معنے بیان کرنے کے بعد اب میں تفسیری معنی بیان کرتا ہوں (۱) جن لوگوں نے الٓمّٓ کو سورۃ کا نام قرار دیا ہے انہوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ الٓمّٓ یہ کتاب ہے یعنے الٓمّٓ نام ہے اس سورۃ کا۔ یا یہ معنے کئے ہیں کہ الٓمّٓ ایک کامل کتاب ہے (۲) جنہوں نے ذٰلِکَ کا استعمال قرآن کریم کی عظمت شان کی وجہ سے قرار دیا ہے انہوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ عظیم الشان کلام وہ کتاب ہے جس کی تعریف صحفِ موسٰی اور دوسری کتب میں آچکی ہے (۳) بعض نے اشارۂ بعید لے کر یہ معنی کئے ہیں کہ لوحِ محفوظ میں جو کتاب ہے وہ یہی ہے یعنے قرآن کریم۔ مگر یہ معنے بہت بعید ہیں اور الفاظ قرآنی ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ اس رنگ میں بعض اور معنے بھی مفسرین نے کئے ہیں مگر وہ سب کے سب اسی طرح بعید از قیاس ہیں اور ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک ان تینوں قسم کے معنوں میں سے دوسرے معنے ہی ایسے ہیں جو الفاظ قرآنیہ کے مطابق ہیں۔ کیونکہ مشہور عام بات کی طرف اس طرح اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ پہلے ادیان کے لوگ ایک کتاب کے منتظر تھے۔ انہیں مخاطب کر کے قرآن شریف کے شروع میں کہا جا سکتا تھا کہ جس کتاب کے تم منتظر ہو یہ وہی کتاب ہے۔ مگر میرے نزدیک زیادہ صحیح معنے جو الفاظ قرآنیہ کے بالکل مطابق ہیں۔ دو ہیں۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کے تین تفسیری معنے۔

قرآن مجید کا دعویٰ کمال اور اسکا ثبوت

۱۔ یہی کامل کتاب ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں زَیْدُنِ الْعَادِلُ زید ہی عادل ہے اسی طرح یہ جملہ ہے ذٰلِکَ الْکِتَابُ کتاب کہلانے کی مستحق تو یہی کتاب ہے یعنی اَلْ جنسی استغراقی مجازی ہے ان معنوں کی رو سے کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ نہیں نکالنا پڑتا جس کا ذکر اس جگہ نہیں ہے اور یہ معنے مناسب موقع بھی ہیں۔ ایک الہامی کتاب جو دوسری کتب کی موجودگی میں اپنے آپ کو پیش کرے اسے ابتداء کلام میں ایسا ہی دعویٰ پیش کرنا چاہیئے کیونکہ لوگوں کے دلوں میں طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری کتب کی موجودگی میں یہ نئی کتاب کیوں پیش کی جاتی ہے۔ اس فطرتی سوال کے جواب میں قرآن کریم کے شروع میں ہی یہ الفاظ رکھ دیئے گئے کہ یہی کامل کتاب ہے اور متلاشیانِ حق کو بتلایا گیا کہ بیشک اس کے سوا اور کتب بھی موجود ہیں لیکن کتاب کا موجود ہونا اور شئے ہے اور اس کا انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور شئے ہے۔ اگر کتاب کی غرض یہ ہے کہ انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرے تو پھر صرف یہی کتاب اس غرض کو پورا کرتی ہے اس لئے دوسری کتب کی موجودگی میں بھی اس کی ضرورت ہے۔

الفاظ قرآنیہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کے بالکل مطابق دو معنے۔

الٓمّٓ کے حروف کو جن کے معنے اوپر بتائے جا چکے ہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی یہی معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں کے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ میرا علم جب اور جو تعلیم دُنیا کو دے وہی اس زمانہ کے لحاظ سے کامل اور مکمل تعلیم ہو سکتی ہے۔ نیز میں سب سے زیادہ جاننے والا ہوں ایک دعویٰ ہے جس کا ثبوت بھی چاہیئے اور اس کا سب سے بڑھ کر ثبوت یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی علمی چیز پیش کی جائے جو اپنی نظیر نہ رکھتی ہو پس الٓمّٓ کے معنوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی ذٰلِکَ الْکِتَابُ کے بہترین معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ یہی کامل کتاب ہے۔

جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو یہ دعویٰ قطعی طور پر ثابت ہے۔ بیشک قرآن کریم سے پہلے توریت انجیل وید زند وغیرہ کتب موجود تھیں لیکن ان کی تعلیم اور قرآن کریم کی تعلیم کا مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ قرآن کی جامعیت کسی اور کتاب میں نہیں ملتی انجیل کا سب سے بڑا کمال محبت الٰہی پر زور ہے قرآن کریم میں یہ سب تعلیم موجود ہے بلکہ اس سے بڑھ کر۔ توریت کا فخر جامع شریعت ہونا ہے لیکن شریعت کی جامعیت میں قرآن کریم

کے ترکے وہ بھی ختم کھاتی ہے حالانکہ حجم میں قرآن کریم دونوں کتب سے چھوٹا ہے قرآن کریم کی یہ جامعیت ایسی کامل ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک شریعت کا مفہوم ہی دوسروں سے جداگانہ ہوگیا ہے۔ جب ایک مسلمان شریعت کا لفظ بولتا ہے تو فوراً اس کا ذہن اس طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ اس میں والدین اور اولاد کے تعلقات میاں بیوی کے تعلقات۔ شادی اور اس کے اغراض کے متعلق۔ میاں بیوی کے فرائض کے متعلق۔ میاں بیوی کے انتخاب کے متعلق۔ تربیت اولاد کے متعلق۔ خاندان کے باہمی حقوق کے متعلق۔ وراثت کے متعلق۔ وصیت کے متعلق۔ ہمسایہ اور اہلِ محلّہ کے متعلق تجارت اور زراعت کے متعلق۔ حاکم و محکوم کے تعلقات اور ذمہ واریوں اور حکومت کی نوعیت کے متعلق۔ مزدوروں اور مزدور رکھنے والوں کے متعلق حکومتوں کے باہمی تعلقات کے متعلق۔ اقتصادی مسائل کی بنیادوں کے متعلق۔ انسانوں اور جانوروں کے متعلق۔ اور سب سے آخر میں لیکن سب سے مقدم یہ کہ اللہ اور بندہ اور اس کے رسولوں کے متعلق تفصیلی اور مکمل احکام انکی حکمتوں سمیت بیان کئے گئے ہونگے یہ سب مسائل اور ان کے علاوہ اور بہت سے اپنی حکمتوں سمیت قرآن کریم میں بیان ہیں اور ان کا عشر عشیر بھی اور کسی کتاب میں موجود نہیں۔

ویدوں کو لو۔ تو اوّل عام ہندو ویدوں کو جانتا بھی نہیں اور جو تھوڑے سے جانتے ہیں ان میں سے اکثر انہیں بطور منتر جنتر استعمال کرتے ہیں اور جو اسے سمجھتے ہیں انکے نزدیک بھی اسکی بڑی خوبی دُعائیں اور پیدائش انسانی کی غرض کا بیان کرنا ہے مگر دُعاؤں اور انسانی پیدائش کے فلسفہ پر جو مکمل اور تفصیلی بحث قرآن کریم نے کی ہے اس کے مقابل میں ویدوں کی تعلیم بالکل ماند پڑجاتی ہے قرآن کریم کی دُعائیں انسانی فطرت کی باریکیوں پر مشتمل ہیں وہ لفاظی سے پُر نہیں وہ انسان کی ضروریات کو پہلے ننگا کرکے دکھاتی ہیں پھر انہیں قدوسیت اور پاکیزگی کی چادر اُڑھاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم انسانی پیدائش کی ایسی تفصیلات بیان کرتا ہے جو استعاروں میں چھپ کر انسانی دماغ کو پریشان نہیں کردیتیں بلکہ اسے مشاہدہ اور تجربہ کے میدان میں کھڑا کرکے اس کے ذہن کو صاف کرتیں اور اس کے فکر کو جلا بخشتی ہیں اسلام نے انسان کے انجام کو یعنے مابعد الموت کے مسئلہ کو جس طرح بیان کیا ہے اس کے مقابل پر سب کتب شکست خوردہ ہیں۔ تورات خاموش ہے انجیل بالکل نامکمل سا ذکر کرتی ہے۔ ویدوں میں مابعد الموت کا کوئی ذکر نہیں۔ زرتشت کی کتاب میں کچھ ذکر ہے مگر صرف استعارہ کے طور پر اور مادی الفاظ میں دیا ہوا۔ اس کے مقابل پر قرآن کریم تفصیلاً بتاتا ہے کہ نیک و بد کو کیا جزاء ملے گی اور کس طرح ملے گی اسکی کیا کیفیت ہوگی اور اسکی غرض کیا ہوگی۔ دوسری زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کے حصول کے لئے کس جد و جہد کی ضرورت ہے جزا سزا کے اصول کیا ہیں۔

قرآن مجیدؐ کی دوسری کتب کی تعلیم کے مقابل جامع اور اکمل تعلیم

قرآن مجیدؐ میں فلسفہ اخلاق کا بیان اور دوسری کتب

پھر فلسفہ اخلاق ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے اور دُنیاوی امن وامان کے قیام کا انحصار ہے اس مضمون کو بھی دوسری کتب نے یا چھوا نہیں یا صرف اس کے حواشی کو چھو کر چھوڑ دیا ہے بُدھ کی تعلیم میں بیشک جذبات پر بحث ہے مگر قرآن کریم کی تعلیم کے مقابل پر وہ بھی کچھ نہیں۔ قرآن کریم نہ صرف جذبات پر بحث کرتا ہے بلکہ وہ ان کے پیدا ہونے کی وجوہ اور انکی ضرورت اور پھر ان کے صحیح طور پر اختیار کرنے کے ذرائع پر بھی روشنی ڈالتا ہے وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جذبات کب اور کس صورت میں نیک ہوتے ہیں اور کب اور کس صورت میں بد پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ جذبات کو نیک کس طرح بنایا جاسکتا ہے اور بد ہونے سے کس طرح بچایا جاسکتا ہے اور ایسے اثرات سے کس طرح اپنے نفس کو بچایا جاسکتا ہے جو جذبات کو بدی کی رَو میں بہادیتے ہیں۔

بُدھ کی تعلیم میں تو یہ کہا گیا ہے کہ تم خواہشات کو ترک کرو تو گناہ سے بچ جاؤ گے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کونسی باتیں ہیں جن سے بدی کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ کونسے ذرائع

ہیں جنکی مدد سے ان کو روکا جاسکتا ہے مگر قرآن کریم ہمیں بتلاتا ہے کہ گناہ کا منبع کہاں ہے اور پھر وہ اس منبع کو روکنے کی تدابیر بھی ہمیں بتاتا ہے۔

اور ان سب تفصیلات کے باوجود قرآن کریم سب کتب سے جو الہامی ہونے کی دعویدار ہیں چھوٹا ہے جسکی وجہ سے اس کا پڑھنا سمجھنا اور یاد رکھنا بہت آسان ہے حتیٰ کہ ہزاروں لاکھوں اس کے حافظ دنیا میں موجود ہیں۔ پس قرآن کریم کے شروع ہی میں اس دعویٰ کو پیش کرنا کہ یہی کامل کتاب ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جو ضرورت کے مطابق ہونے کے علاوہ نہایت مناسب موقعہ پر پیش کیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ میں سورۃ فاتحہ میں بیان شدہ ہدایت کی طرف اشارہ۔

۲۔ ان معنوں کے علاوہ ایک اور معنی بھی اس آیت کے ہیں اور وہ بھی سیاق و سباق کے عین مطابق ہیں اور وہ یہ کہ سورۃ بقرہ سے پہلے سورۃ فاتحہ ہے اس سورۃ میں ایک دُعا سکھائی گئی تھی کہ خدایا! مجھے سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام نازل کیا ہے۔ اس دُعا کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس ہدایت کو تم نے سورۃ فاتحہ میں طلب کیا تھا وہ یہی کتاب یعنے قرآن کریم ہے اس طرح ذٰلِكَ اشارہ بعید کے معنے ہی دیتا ہے اور کسی اور تاویل کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ معنی سکھائے تو مَیں بہت خوش ہُوا اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ مجھ سے پہلے ان معنوں کی طرف کم سے کم ایک عالم اسلام سبقت کر چکا ہے اور وہ علامہ ابو حیان کے اُستاد ابن جعفر بن ابراہیم بن الزبیر ہیں جنکی طرف منسوب کر کے علامہ ابو حیان نے یہ معنی اپنی تفسیر میں لکھے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نہایت لطیف معنی ہیں۔ ان معنوں سے سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ کا رکھا جانا یونہی نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے مضامین سورۃ فاتحہ کے جواب میں ہیں اور ذٰلِكَ کے معروف معنی کو بھی نہیں چھوڑنا پڑتا۔

اس آیت کا آخری حصہ یعنے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ان معنوں کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ گویا اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس ہدایت کو تم نے طلب کیا تھا وہ یہی کتاب ہے اور تم نے چونکہ معمولی ہدایت طلب نہیں کی بلکہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ گروہ کی ہدایت طلب کی ہے اس لئے ہم تم کو بتاتے ہیں کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یعنی معمولی ہدایت نہیں دیتی بلکہ کامل متقی کو اَور اوپر لے جاکر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں شامل کر دیتی ہے اور تمام انبیاء کی تعلیموں اور ان کے حاصل کردہ انعامات کی جامع ہے۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ میں قرآن مجید کے متعلق چار دعوے اور ان کا ثبوت۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ ریب کے معنے بتائے جا چکے ہیں۔ کہ تہمت۔ شک۔ کمی۔ نقص اور آفت و مصیبت کے ہیں۔

یہ سب کے سب معنی اس آیت میں چسپاں ہوتے ہیں اور قرآن کریم کے متعلق اس میں چار دعوے کئے گئے ہیں۔

(۱) اس میں کسی ہستی کی حق تلفی نہیں کی گئی اور کسی پر ناواجب الزام نہیں لگایا گیا۔ نہ خدا تعالیٰ پر اس میں تہمت لگائی گئی ہے اور نہ کسی نبی یا رسول پر نہ ملائکہ پر نہ بنی نوع انسان پر نہ انسانی فطرت پر۔ غرض کسی کی اس میں حق تلفی نہیں کی گئی۔ کسی پر اتہام نہیں لگایا گیا۔ یہ اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ اسکی نظیر دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتی اور یہ ایسی زبردست صداقت ہے جسکی مثال اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم کے شروع کرتے ہی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اس کتاب کی دوسری کتب کی موجودگی میں کیا ضرورت تھی اس سوال کا سہل ترین جواب یہ ہو سکتا تھا کہ پہلی کتب کی بعض مضحکہ خیز باتیں پیش کر دی جاتیں اور یہ کہا جاتا کہ ان کتب میں فلاں فلاں عیوب ہیں اس لئے ان سے دُنیا ہدایت نہیں پا سکتی۔ پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اُتارا ہے یہ جواب باوجود اس ادّعا کے کہ قرآن کریم سب نبیوں کی تعلیم کی طرف ہدایت دینے کے لئے نازل ہُوا ہے درست ہوتا کیونکہ قرآن کریم گو اس امر کا مدعی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی آتے رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو شریعت بھی ملی ہے اس امر کو تسلیم نہیں

کرتا کہ ان انبیاء کی تعلیم موجودہ وقت میں بھی محفوظ ہے پس اس کا یہ جواب کہ موجودہ زمانہ میں پہلے نبیوں کی کتب غیر محفوظ ہیں اور خراب ہیں بالکل درست ہوتا اور چاہے یقین قرآن کریم کے لئے نہایت درجہ مُسکت بھی ہوتا مگر ایک عظیم الشان بشارت کی اس رنگ کی ابتداء نفیس طبیعتوں پر گراں ضرور گذرتی۔ کیونکہ گو پہلی کتب کی غلطیوں پر مطلع کرنا قرآن کریم کے ضروری فرائض میں سے ہے مگر ابتداء ہی میں اس مضمون کو چھیڑ دینا نہ تو ایک غیر معمولی شان کی کتاب کے شایاں تھا اور نہ اس سے اس عظمت و شوکت کا اظہار ہو سکتا تھا جو اس مضمون سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہم کسی فرد یا ہستی کو اس کے مقام سے نہیں گراتے بلکہ سب کے مناسب مقام اور درجہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس دعویٰ سے قرآن کریم نے ابتداء ہی میں اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کس قدر مشکلات پیدا کر لی ہیں؟ اعتراض کرنا آسان ہوتا ہے اور اعتراضوں پر ہی مختلف مذاہب کے مدعی اپنی تبلیغ کی بُنیاد رکھتے ہیں لیکن قرآن کریم ابتداء ہی اس طرح کرتا ہے کہ اپنی ضرورت کے ثبوت کے لئے پہلے مذاہب کے نقائص کو پیش نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ میرا الکتاب یعنے کامل کتاب ہونے کا دعویٰ اس امر پر مبنی نہیں کہ دوسری کتب میں نقص ہیں اور مجھ میں نہیں ہیں دوسروں کے مقابل میں نسبتی کمال کو اپنے سچا ہونے کی دلیل نہیں دیتا بلکہ بغیر کسی مذہب پر اتہام لگانے کے اپنے ذاتی کمالات اور اپنے فضائل اور دینی امتیازی تعلیمات سے اپنی ضرورت اور اپنی صداقت کو ثابت کرتا ہوں۔ یہ مقام کیسا شاندار ہے اور پھر ساتھ ہی کیسا مشکل بھی؟ مگر قرآن کریم اسی کو اختیار کرتے ہوئے اپنی صداقت کو کامیاب طور پر ثابت کرتا ہے قرآن کریم اپنی سچائی کی دلیل یہ نہیں دیتا کہ دوسرے مذہب جھوٹے ہیں اس لئے ایک سچے مذہب کی ضرورت تھی جسے وہ پورا کرتا ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطرع ۳) کوئی قوم بھی ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا نبی نہ گذرا ہو اور اسی طرح فرماتا ہے وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد رکوع ۱) اور ہر قوم میں ایک ہادی ہماری طرف سے آچکا ہے اور اسی طرح وہ تمام اقوام کے متعلق اصولی طور پر اس امر کو تسلیم کر لیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کے سمجھانے کے لئے بھی اپنی طرف سے ہدایت نامے بھجواتا رہا ہے اور اصولی طور پر تمام مذاہب کو جو خدا تعالیٰ کی تصدیق کی مُہر رکھتے ہیں جھوٹ اور فریب سے بری قرار دیتا ہے اور انکی سچائی کا اقرار کرتا ہے برخلاف مثلاً یہود نصاریٰ اور آریوں کے مذاہب کے کہ وہ اپنے سوا دوسرے مذاہب کو جھوٹا قرار دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ تورات انجیل اور وید کے سوا باقی سب جگہ ظلمت ہی ظلمت ہے اور ان اقوام کے سوا اللہ تعالیٰ نے باقی سب اقوام کو ہدایت کے سامانوں سے محروم کر دیا تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اسلام کے سوا اور سب ادیان کسی نہ کسی شکل میں دوسرے مذاہب کو جھوٹا یا ادنیٰ ہی قرار دیتے ہیں لیکن اسلام ایسا نہیں کرتا وہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے آسمانی ہدایت کو ضروری قرار دیتا ہے اور اپنے اپنے زمانہ کے لئے سب کو کامل اور انسانی حاجتوں کو پورا کرنے والا تسلیم کرتا ہے اور اس طرح قرآن کریم دوسرے مذاہب سے اتہام سے پاک ہونے میں بالکل ممتاز ہے۔

قرآن مجید میں کسی پر کوئی اتہام نہیں لگایا گیا۔[1]

اگر تفصیلات کو دیکھا جائے تو اس میں بھی قرآن کریم کو اتہام سے پاک ہونے میں دوسرے مذاہب کے مقابل پر ایک امتیاز حاصل ہے سب سے ضروری وجود مذہب کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا ہے وہ تمام مذاہب کا مرکزی نقطہ ہے۔ بظاہر یہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کسی مذہب نے کوئی اتہام لگایا ہوگا لیکن ذرا سے تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ناقابل فہم غلطی بھی انسان کر چکا ہے اور خوب پیٹ بھر کر کر چکا ہے۔ تورات خدا کی نسبت کہتی ہے کہ وہ دُنیا کو پیدا کر کے تھک گیا اور اسے آرام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی حالانکہ جو تھکے وہ خدا نہیں ہو

تورات میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتہام اور اس کا رد قرآن مجید

اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتہام لگانے کے متعلق قرآن مجید کا بائبل سے اصولی اختلاف۔

سکتا۔ بائبل میں لکھا ہے کہ دُنیا کو پیدا کر کے ساتویں دن اللہ تعالیٰ نے آرام کیا (پیدائش باب ۲۔ آیت ۲ و ۳ بعض اردو کے نسخوں میں مترجموں نے آرام کیا کی جگہ اعتراض کے ڈر سے فراغت پائی لکھ دیا ہے لیکن دوسرے نسخوں اور انگریزی کے نسخوں میں آرام کیا کے الفاظ ہی ہیں) اور یہ اللہ تعالیٰ پر اتہام ہے کہ وہ کام کرتے کرتے تھک گیا اور اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن قرآن کریم اللہ تعالیٰ کو اس اتہام سے بری قرار دیتا ہے اور اس کی طرف سے یہ قول نقل فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق ع ۳) یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ اوقات میں پیدا کیا لیکن اس کام سے ہمیں کوئی تھکان محسوس نہیں ہوئی اور نہ آرام کرنے کی حاجت پیدا ہوئی۔ اسی طرح مثلاً بائبل میں اللہ تعالیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ ”تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔“ گویا انسان کو پیدا کرنا ایک غلطی تھی اور اس پر نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو ندامت پیدا ہوئی اور وہ اس پر دلگیر ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ پر ایک اتہام ہے وہ خدا ہی کیا ہوا جو غلطی کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ میرے فعل کا کیا نتیجہ ہوگا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ سُبحان اور قدوس یعنے وہ سب عیبوں سے پاک ہے اور سب بزرگیوں کا مالک ہے اور اسی سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقرہ ع ۴) یعنی میں اللہ آسمان و زمین کے متعلق تمام امور ابتدائے آفرینش سے اور آئندہ کے تمام زمانوں کے متعلق خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کو آسمان اور زمین کے متعلق پورا غیب حاصل تھا اور وہ اس کے حال اور مستقبل سے اچھی طرح واقف تھا اس کی نسبت کب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس نے غلطی سے دنیا کو پیدا کر دیا اور بعد میں پچھتانے لگا پھر ایک اصول کے طور پر قرآن کریم میں یہ بھی بیان

دنیا کا وجود اللہ کے ہر عیب سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

فرمایا گیا ہے یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ (جمعہ ع ۱) یعنے زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اللہ کے ہر عیب سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں کس طرح اصولاً بائبل کے خیال کے خلاف تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کو پیدا کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ جو کام ایک فاعل کی لاعلمی سے کرتا ہے یا جو انجام کے لحاظ سے غلط ہو جاتا ہے وہ کام اپنے فاعل کے نقص پر ایک شہادت ہوتا ہے اور اس کی کم علمی یا بصیرت کے ضُعف پر دلالت کرتا ہے مگر قرآن کریم فرماتا ہے کہ زمین اور آسمان میں جو بھی ہے انسان ہوں یا حیوان ہوں۔ فرشتے ہوں یا ارواح ہوں اسی طرح نباتات ہوں کہ جمادات ہوں باریک سے باریک ذرہ ہو کہ بڑے سے بڑا سماوی کرہ ہو۔ سب کے سب اس بات پر شہادت دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہے اور اس نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی بلکہ آیت کا مضمون اس بات کو بھی پیش کر رہا ہے کہ مومن ہوں یا کافر مخلص ہوں یا منافق سب ہی باوجود اپنے مُنہ کے غلط بیانات اور دماغ کے مخالف خیالات کے اپنے وجود اور اپنے عمل سے اس امر کو ثابت کر رہے ہیں کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے غلطی نہیں کی۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کا وجود خدا تعالیٰ کے ملک قدوس عزیز اور حکیم ہونے پر دلالت کر رہا ہے یعنی نظامِ عالم اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک یعنی بادشاہ ہے اور اس کی طرف سے ایک قانون دنیا کو ملا ہے جس کی پابندی کرنیوالے انعام پاتے ہیں اور خلاف ورزی کرنیوالے سزا پاتے ہیں۔ مَلِک سے اس جگہ قانونِ شریعت مراد ہے یا قانونِ طبعی کا وہ حصہ جس کی خلاف ورزی کا انسان مرتکب ہو سکتا ہے جیسے خلاً زیادہ کھاجانا یا آنکھ ناک کان سے زیادہ یا کم کام لینا۔ غرض اللہ تعالیٰ کا وہ قانون جس کی اطاعت جبراً نہیں

کی جاتی بلکہ اس پر چلنے یا نہ چلنے کی نسبت کو مقدرت حاصل ہوتی ہے اس کا ملوکیت والا قانون ہے کیونکہ بادشاہی قانون بھی ایسے ہی ہوتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے توڑنے کی طاقت ہوتی ہے گو ان کے توڑنے پر وہ سزا پاتے ہیں۔ اس ملوکیت والے قانون پر عمل کرنے والے انعامات پاتے ہیں۔ شرعی قانون پر عمل کرنیوالے رُوحانی انعام اور طبعی قانون پر عمل کرنیوالے طبعی انعام۔ اور یہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ اس نظام عالم کا کوئی بادشاہ ہے چنانچہ انبیاء اور صلحاء کے ساتھ جو معاملہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے وہ ایک قادر خدا کا جو تمام مخلوقات کا بادشاہ ہے ایک قطعی اور یقینی ثبوت ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے القدوس وہ پاک اور تمام عیوب سے مبرّا ہے یعنی اس کی ملوکیت کے معاملہ پر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ اس کا معاملہ دنیوی بادشاہوں اور سلطنتوں کا سا نہیں ہے کہ ان کے حکّام اور بادشاہ اپنی حکومت کے قیام کے لئے ہر قسم کے اعمال کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ اس کی صفتِ ملوکیت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس سے اس کی قدوسیت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اسکی طرف سے جو لوگ اس کے قانون کو جاری کرنے کے لئے مبعوث ہوتے ہیں وہ اعلیٰ اخلاق سے متّصف ہوتے ہیں اور جس قدر کوئی اس کا قرب حاصل کرتا ہے اسی قدر بنی نوع انسان کا ہمدرد ہوتا ہے۔ اسی طرح جو اس کے طبعی قانون پر عمل کرتا ہے اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ فوائد حاصل کرتا ہے اور طبعی نقائص سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ خدا تعالےٰ کے جاری کردہ قانون کے مطابق آنکھوں سے کام لینے والے کی آنکھیں مضبوط ہونگی اس کے قواعد کے مطابق معدہ سے کام لینے والے کا معدہ تمام بیماریوں سے بچا رہے گا۔ غرض اس کا قانون ایسا ہے کہ اس پر عمل انسان کو مشقت اور تکلیف میں نہیں ڈالتا بلکہ اس پر عمل سے انسان قدوسیت کی چادر پہنتا ہے یعنی جس قدر عمل کرتا ہے اسی قدر نقصوں سے پاک ہوتا جاتا ہے۔ شرعی قانون پر عمل کرنے سے روحانی طہارت ملتی ہے اور طبعی قانون پر عمل کرنے سے جسمانی طہارت اور قوت حاصل ہوتی ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ وہ عزیز بھی ہے یعنی اگر مخلوقات پر نگاہ ڈالو تو اس قانون کے علاوہ جو ملوکیت کے قانون کے مشابہ ہے اور جس پر عمل کرنے یا نہ کرنے پر انسان کو مقدرت حاصل ہے اس کا ایک اور بھی قانون ہے جس کی خلاف ورزی کوئی نہیں کر سکتا جسے قانونِ فطرت کہنا چاہیئے۔ یہ قانون بھی دو قسم کا ہوتا ہے روحانی بھی اور جسمانی بھی۔ روحانی قانون تو وہ ہے جسے دین الفطرۃ کہتے ہیں اور جس میں تمام اخلاقی جذبات شامل اور جو ہر مومن و کافر میں پایا جاتا ہے اور جو آخر ہر اس شخص کی ہدایت کا موجب ہوتا ہے جو سچے دل سے دین اور مذہب کو سمجھنا چاہیے اس قانون سے بچنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ مثلاً رحم اور شکر گذاری کے جذبات ہیں کہ ہر شخص میں پائے جاتے ہیں ظالم سے ظالم میں بھی یہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ کوئی انسان ان کے اثر سے بچ نہیں سکتا۔ ایک ڈاکو جو ہزاروں قتل کرکے ندامت محسوس نہیں کرتا اپنے بچے کی بیماری پر چیخیں مار کر رونے لگتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات دیکھا جاتا ہے۔ کہ ڈاکو اور چور بھی ان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاتے جنہوں نے ان سے کبھی حُسن سلوک کیا ہو۔ غرض بطور جذبۂ فطرت کے یہ مادے ہر انسان میں موجود ہیں گو بد استعمالی کی وجہ سے بعض لوگ ان کا استعمال بہت محدود کر دیتے ہیں۔

جسمانی نظام میں یہ قانون ان طبعی خواص پر مشتمل ہے جن کے ماتحت تمام نظام عالم چل رہا ہے ایک دہریہ خدا تعالےٰ کو مُنہ سے گالیاں دے لیتا ہے لیکن اس کے اس قانون کی نافرمانی نہیں کر سکتا جو صفتِ عزیز کے ماتحت ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے اس کی زبان کو چکھنے کے لئے بنایا ہے اس میں یہ طاقت نہیں کہ زبان سے دیکھنے کا کام لے سکے۔ باوجود مذہب میں بغاوت کرنے کے وہ اس کے اس قانون کی بلا چون وچرا پابندی کرتا ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات کا جملہ عیوب سے مبرّا ہونیکا ثبوت اس کی چار صفات سے

اسی طرح جو جو خواص اشیاء اللہ تعالےٰ نے پیدا کئے ہیں
وہ اسی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں کہ جس صورت میں خدا تعالےٰ
نے ان کو پیدا کیا ہے اس قانون کے خلاف وہ نہیں چل سکتے
بیشک خواص اشیاء میں بھی تغیرات ہوتے ہیں مگر وہ تغیرات
بھی دوسرے طبعی قانونوں کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس دُنیا میں ایک قانون صفتِ عزیز کے
ماتحت جاری ہے جس سے خدا تعالیٰ کے غلبہ اور قدرت کا
اظہار ہوتا ہے۔ اس قانون کی ہر کہ ومہ پوری پابندی کرتا
ہے اور پابندی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ملکی قانون کی طرح
اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور یہ قانون ایک عزیز
ہستی پر دلالت کرتا ہے۔

پھر فرمایا ہے کہ شاید کسی کو اعتراض ہو کہ زبردستی
اور جبر سے کام لینا تو اچھا کام نہیں تو اس کا یہ جواب دیا
کہ نہ ہر امر میں قدرت دینا اچھا ہے اور نہ ہر امر میں جبر جائز
ہے۔ قدرت اپنی جگہ اچھی ہے اور جبر اپنی جگہ جائز ہے
اور یہ دونوں امر حکمت کے ماتحت برتے جائیں تبھی نتائج
اچھے نکلتے ہیں اگر قانونِ قدرت نہ بنایا جاتا تو تمام علمی
ترقی انسان کی محدود ہو جاتی۔ کیونکہ کیمیا اور فزکس اور
بایالوجی اور زوالوجی وغیرہ تمام علوم کی بنیاد ہی غیر متبدل
قوانین اور خواص پر ہے۔ اگر آگ کبھی جلاتی اور کبھی پیاس
بجھاتی اور پانی کبھی سرد کرتا اور کبھی آگ لگاتا تو کارخانۂ
عالم ہی درہم برہم ہو جاتا۔ غرض قانونِ قدرت ہو یا قانونِ
فطرت ہو ان کا غیر متبدل ہونا زبردست حکمتوں کے ماتحت
ہے اور بلاوجہ اور بے فائدہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں آسمان و زمین کی پیدائش
کو خدا تعالےٰ کی چار صفات الملک۔ القدوس۔ العزیز۔
اور الحکیم کا ظاہر کرنے والا بتایا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر
ہے کہ جو فعل الٰہی ان چار صفات کا۔ اور خصوصاً حکمتِ الٰہی
کا ظاہر کرنے والا ہو اس پر نادم ہونے یا پچھتانے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معمولی سے معمولی شخص بھی اچھے کام پر
پچھتایا نہیں کرتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے خاص اسی مضمون کو
لیکر بھی وضاحت سے اس کی تردید کی ہے۔ فرماتا ہے۔ وَ
مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ
(الانبیاء ع ۲) یعنی آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان
ہے ہم نے اس کو یونہی بے سوچے ہوئے پیدا نہیں کیا یہ ہمارا
کام کوئی کھیل نہیں بلکہ حکمت اور حق کے ساتھ اس کی پیدائش
ہوئی ہے۔ اس مضمون کی تائید میں فرماتا ہے خَلَقَ اللّٰهُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (العنکبوت ع ۵) یعنے
اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک نہایت پختہ اور اٹل
قانون کے ماتحت بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق سب سے بڑا اتہام شرک کا ہے قرآن
کریم سب کا سب اسی اتہام کے ردّ کے دلائل سے بھرا ہوا ہے۔
خدا تعالیٰ کے شریک کئی قسم کے تجویز کئے گئے ہیں۔ بعض نے
دو خدا تجویز کئے ہیں۔ ایک نور کا اور ایک ظلمت کا خدا۔
بعض نے تین خدا تجویز کئے ہیں۔ باپ۔ بیٹا اور روح القدس
بعض نے خدا تعالیٰ کے لئے بیویاں تجویز کی ہیں۔ بعض نے
یہ تجویز کیا ہے کہ اس نے بعض ہستیوں کو پیدا کر کے اپنی صفات
ان میں بانٹ دی ہیں۔ اور مختلف صفات کے ظہور کے لئے
مختلف دیوتا مقرر کر دیئے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ خدا
تعالےٰ بندوں میں سے بعض کو چنکر اپنے اختیارات کُل یا
بعض ان کو سونپ دیتا ہے۔ بعض تمام بڑے مظاہر قدرت
کو خدا تعالیٰ کی صفات کا بالارادہ ظاہر کرنے والا قرار دیتے
ہیں اور بعض لوگ مضر اشیاء اور خوف دلانے والے جانوروں
کو دیوتا تجویز کرتے ہیں۔ بعض مظاہر حسن کو خدا کا مظہر اور
الوہیت کی صفت سے متصف قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم
نے ان تمام قسم کے شرکوں کو تفصیل سے ردّ کیا ہے۔ اور ان
عقائد کے غلط ہونے کے دلائل دیئے ہیں مگر اس مفصل مضمون
کو حوالوں کے ساتھ بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ اگلے کسی موقعہ
پر ان آیات کے ماتحت ان کا ذکر آجائیگا جن میں توحید یا شرک

کی تفصیلات کا ذکر ہے۔ (انشاء اللہ)

اسی طرح قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو بالتفصیل بیان کیا ہے جس کی مثال اور کسی کتاب میں نہیں ملتی اور اسی طرح ان تمام اتہاموں سے جو مختلف صفات کے ناقص بیان سے یا ناقص طور پر سمجھنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف مختلف مذاہب یا مختلف فلسفے منسوب کرتے چلے آتے ہیں اللہ تعالیٰ کو بری قرار دیا ہے۔ غرض قرآن کریم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کے درجہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جن امور کو اس کی طرف منسوب کرنے سے اس کی کسرِ شان ہوتی ہے ان کو اس کی طرف منسوب کرنے سے قرآن کریم نے اجتناب کیا ہے بلکہ ان کا بادلیل رد کیا ہے۔ اور جن امور سے اس کی وہ شان جو ایک موجود اور کامل الصفات خدا تعالیٰ میں ہونی چاہیئے ظاہر ہوتی ہے ان امور کو اس کی طرف منسوب کیا ہے اور نہایت بسط اور عمدگی سے ان کا ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعد کارخانہ قدرت کے چلانے والی ابتدائی علتوں میں ملائکہ کا وجود ہے۔ ملائکہ کو بھی قرآن کریم نے تمام نقائص اور عیوب سے جو ان کی ذات کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں پاک قرار دیا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم ع۱) یعنے ملائکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کی پوری طرح اطاعت کرتے ہیں اور اس طرح ان تہمتوں کا رد کر دیا ہے جو مثلاً یہود کی طرف سے ملائکہ پر لگائی جاتی ہیں کہ فرشتوں نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال دیا۔ ہندوؤں میں ہے کہ دیوتاؤں نے فلاں فلاں گناہ کیا اور اس تہمت سے فرشتوں کو بچانا ایک ضروری امر تھا کیونکہ فرشتے نیکی کی تحریکوں کا سرچشمہ ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ایک مصفّٰی پانی کے چشمہ کے متعلق شک اور شبہ پیدا ہو جائے تو انسان اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا اور نیکی کا وہ دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

تیسرا ستون انسان کی روحانی اور اخلاقی عمارت کی تکمیل کے لئے کلام الٰہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان یقین اور معرفت حاصل کرتا ہے۔ اس پر بھی مختلف مذاہب اور فلسفوں نے تہمت دھرنے سے دریغ نہیں کیا تھا مثلاً بعض یہ کہتے تھے کہ الہام صرف خیالاتِ صافیہ کا نام ہے حالانکہ محض خیالات کا نام الہام رکھ کر اس یقین اور اعتماد کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جو لفظی الہام کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہر شخص اپنے خیال کا نام الہام رکھ سکتا ہے۔ اس بارہ میں قرآن کریم فرماتا ہے وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (نساء ع۲۳) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے بالمشافہ اور الفاظ میں باتیں کی تھیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی نسبت فرماتا ہے وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ (التوبہ ع۱) یعنی اگر ان مشرکوں میں سے جو تجھ سے برسرِ جنگ ہیں کوئی شخص تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے تاکہ وہ اس کتاب کو سن سکے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے اور ساری کی ساری کلام اللہ سے ہے نیز کسی بندہ کا بنایا ہوا کوئی لفظ بھی اس میں شامل نہیں۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سن لے اور چاہے کہ اپنے لوگوں کے پاس واپس جائے تو چاہیئے کہ حکومت کی حفاظت میں اسے اس علاقہ میں جو اس کی اپنی قوم کا ہے اور اس کے لئے امن کی جگہ ہے تو اسے واپس پہنچا دے۔

۱ قرآن مجید کا اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بیان۔

۲ قرآن مجید میں جملہ کتب سماویہ کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق تعلیم۔

۳ قرآن مجید میں ملائکہ کے وجود کو جملہ نقائص سے پاک قرار دئے جانے کی تعلیم

غرض قرآن کریم نے کتبِ سماویہ کو بھی اس تہمت سے بچایا ہے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ بعض بڑے لوگوں کے خیالات ہیں جو انہوں نے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دئے ہیں۔

چوتھا ستون مذہب کی عمارت کا انبیاء کا وجود ہے ان کے متعلق بھی قرآن کریم نے جو تعلیم دی ہے وہ ہر ایک اتہام سے پاک ہے۔ مثلاً ایک تو اصولی طور پر قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ انبیاء خدا تعالیٰ کے مقرب اور پاک لوگ ہوتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے وَاِذَا جَآءَتْھُمْ اٰیَۃٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰہِ وَعَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا کَانُوْا یَمْکُرُوْنَ (انعام ع۱۵)

۴ قرآن مجید کی انبیاء کے معصوم ہونے کے متعلق تعلیم۔

یعنی جب انبیاء خدا تعالیٰ کا معجزانہ کلام یا اس کے آسمانی نشانات دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو گنہگار لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو بھی براہ راست وہی نعمت ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملی ہے تب ہم ایمان لائیں گے یہ لوگ اپنے اعمال کو نہیں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ ان پہ اپنا پاکیزہ کلام کس طرح نازل کرسکتا ہے جبکہ یہ گنہگار اور مجرم ہیں اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بار کس پر رکھے یعنی اُسی کو یہ خلعت دیتا ہے جو پاکباز اور نیکوکار ہو مجرم نہ ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ گنہگار لوگ انبیاء والے انعامات کے طالب ہیں حالانکہ گنہگاروں کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے بد ارادوں اور منصوبہ بازیوں کی وجہ سے ذلت اور سخت عذاب پہنچیگا۔ اس آیت میں اصولی طور پر انبیاء کی پاکیزہ زندگی اور اُن کے تقدس کی شہادت دی گئی ہے اور اس طرح ان تمام خیالات کی تردید کر دی گئی ہے جو اللہ کے انبیاء پر لگائے جاتے ہیں خواہ اُن کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ مثلاً کرشن جی علیہ السلام کے بارہ میں خود اُنہی کے متبع کہتے ہیں کہ وہ مکھن چُرایا کرتے تھے اور عورتوں کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ چنانچہ "شریمد بھاگوت پُران" اسکندھ ۱۰ نمبر ۸/۲۹ میں لکھا ہے کہ شری کرشن جی کی والدہ انہیں کہتی ہیں کہ:۔

"بیٹا نو لاکھ گائیں میرے یہاں دُودھ دینے والی ہیں جتنا دُودھ مکھن چاہیئے کھایا اور لُٹایا کرو۔ دوسروں کے گھر مکھن کھانے اور چُرانے مت جایا کرو۔"

اسی طرح برہم وَیَ ورت پُوران کرشن جنم کھنڈ ۴ ادھیائے ۷۲ میں تحریر ہے کہ

"دن کے چھپنے پر اکرُور جی اپنے گھر چلے گئے اور کرشن جی بھی کسی کے گھر چلے گئے۔ نند اور بلدیو سمیت کرشن جی گوبند بھگت کے ہاں ٹھہرے۔ بھگت نے سب کا ستکار (عزت) کیا جب سب پلنگوں پر سو گئے اور (سماۃ) کُبجا بھی سو گئی۔ تب کرشن جی بھی کُبجا کے گھر گئے۔ وہاں پر جا کر کُبجا کو پلنگ پر سوئی ہوئی دیکھا۔ کرشن جی نے داسیوں (لونڈیوں) کو نہیں جگایا صرف کُبجا کو جگا لیا۔ اس سے کرشن جی نے کہا اے سُندری نیند کو چھوڑ کر مجھ کو شرنگار دان (داد عیش) دے۔"

اور اس عبارت کے بعد اور بہت کچھ خرافات ہیں جن کی نقل سے شرم و حیا اور حضرت کرشن کا ادب مانع ہے۔ مگر یہ سب من گھڑت باتیں دوسرے لوگوں کی ہیں۔ کرشن جی علیہ السلام ان باتوں سے پاک تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم سے اصولی طور پر سب ربانی مصلحین کی پاکیزگی کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی طرح رامچندر جی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سیتا جی سے آخری عمر میں بلاوجہ ناراض ہو گئے اور قطع تعلق کیا۔

(رامائن انتر کانڈ سرگ ۵۳)

جن انبیاء کا ذکر خاص مصالح کے ماتحت اور فوائد جلیلہ کے لئے قرآن کریم نے نام لے کر کیا ہے اُن کی شان کو قرآن کریم نے خاص طور پر مذکر کیا ہے اور ان پر لگائے ہوئے اتہامات کو خاص طور پر رد کیا ہے۔ مثلاً بائبل کہتی ہے کہ آدم نے گناہ کیا اور دیدہ دانستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ قرآن کریم فرماتا ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ع ۷) یعنی اے محمد رسول اللہ تجھ سے پہلے ہم نے آدم کو بھی بعض امورِ شریعت سے اطلاع دی تھی مگر ایک موقعہ پر وہ ایک حکم کے بارہ میں بھول گیا مگر اس کا ارادہ ہماری نافرمانی کرنے کا نہ تھا۔ یعنی آدم سے جو غلطی ہوئی تھی وہ بھول چوک کی قسم سے تھی جو گناہ نہیں کہلاتی اور دل کی تاریکی پر دلالت نہیں کرتی۔ اسی طرح بائبل میں لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے نعوذ باللہ منہ بعض مواقع پر جھوٹ بولا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے بھی بعض احادیث سے دھوکا کھا کر اسی قسم کا عقیدہ بنا رکھا ہے مگر قرآن کریم فرماتا ہے وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (النجم ع ۳) یعنی ابراہیم نے جو وعدہ اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اُسے کامل طور پر پورا کر دیا۔ یعنی تمام اخلاق حسنہ کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ کیا عدل اور کیا احسان اور کیا عفو اور کیا ستاری اور کیا رأفت اور کیا شفقت علیٰ خلق اللہ اور کیا سچائی اور کیا معاملہ کی صحت۔ ہر ایک حکم جو خدا کی طرف سے اُسے دیا گیا تھا

اُسے اُس نے پورا کیا اور معمولی طور پر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ احکام الٰہی کے پورا کرنے میں دکھایا۔

بعض لوگوں نے کہا تھا کہ موسیٰ نے خدا تعالیٰ کے حکم سے مصریوں سے دھوکا سے اُن کے زیور مانگ لئے (خروج باب ۱۱ آیت ۲) اور پھر ان کو لے کر مصر سے بھاگ گئے۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (طٰہٰ ع ۴) یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہاڑ پر جانے کے بعد اُن کی قوم کے ایک حصہ نے شرک کیا اور حضرت موسیٰ نے آکر اُن پر ناراضگی کا اظہار کیا تو اُن کی قوم نے جواب دیا کہ ہم نے اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کیا بلکہ سامری کے ورغلانے سے کیا ہے۔ اور بات یوں ہوئی ہے کہ مصری قوم کے زیورات جو ہمیں زبردستی دے دئے گئے تھے ہم انہیں اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تھے سامری کے کہنے پر ہم نے وہ زیورات اُسے دیدئے۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے تو الگ رہا بنی اسرائیل نے خود اپنے ارادہ سے بھی مصریوں کو دھوکا دینا نہ چاہا تھا بلکہ مصریوں نے خود ہی عذابوں سے گھبرا کر بنی اسرائیل کو اپنے زیورات دئے تھے تاکہ کسی طرح وہ چلے جائیں اور ان سے مصریوں کا پیچھا چھوٹے اور یہ کہ ان زیورات کو اپنے پاس رکھنے کی بنی اسرائیل کو بالکل کوئی خواہش نہ تھی۔

تورات میں کہا گیا تھا کہ موسیٰ کا ہاتھ معجزہ کی وجہ سے مبروص ہو گیا تھا (خروج باب ۴ آیت ۶) حالانکہ خود تورات ہی مبروص کو ناپاک قرار دیتی ہے (احبار باب ۱۳ آیت ۹، ۱۰) اور یہ ایک گھناؤنی مرض ہے۔ مگر قرآن کریم فرماتا ہے کہ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (طٰہٰ ع ۱) یعنی ہاتھ کے سفید ہونے کا معجزہ کسی بیماری سے مشابہ نہ ہوگا بلکہ معجزانہ رنگ میں ہاتھ میں چمک پیدا ہوگی۔

تورات میں کہا گیا تھا کہ ہارون نے نعوذ باللہ من ذالک بنی اسرائیل کو بچھڑا بنا کر دیا اور شرک کی راہ پر چلایا لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰہٰ ع ۵) یعنی موسیٰ کے پہاڑ سے واپس آنے سے پہلے حضرت ہارونؑ بھی اپنی قوم کو شرک سے روکتے رہے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ اے قوم اس بچھڑے کے ذریعہ سے تمہارا ایمان خراب کیا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے یہ بے حقیقت بچھڑا رب کس طرح ہو سکتا ہے پس تم میری فرمانبرداری کرو اور میرے حکم پر چلو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون شرک کرانے والوں میں سے نہ تھے بلکہ شرک کے روکنے والوں میں سے تھے۔

تورات میں موسیٰ علیہ السلام پر دو الزام اور قرآن مجید میں ان کا رد

حضرت سلیمان پر یہود شرک کا الزام لگاتے ہیں اور گنہگار قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھا ہے "جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا" (۱ سلاطین باب ۱۱ آیت ۴) قرآن کریم اس الزام کو بھی رد کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (البقرہ ع ۱۲) یعنی سلیمان نے کوئی کفر والی بات نہیں کی بلکہ اس کا انکار کرنے والے اور اس پر الزام لگانے والے کافر تھے۔

حضرت مسیح علیہ السلام پر یہودیوں کے لگائے ہوئے الزام کی تردید قرآن مجید میں

حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہود نے الزام لگایا تھا کہ نعوذ باللہ من ذالک اُن کی پیدائش بدکاری کے نتیجہ میں تھی اور یہ کہ وہ نعوذ باللہ من ذالک یوسف کے نطفہ سے بغیر شادی کے پیدا ہوئے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد ۵ صفحہ ۱۰۲ زیر لفظ CELSUS نیز دیکھو جوئش لائف آف کرائسٹ صفحہ ۱۳) اسی طرح بعض یہودی یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ نعوذ باللہ من ذالک ایک رومی سپاہی پینتھرا PENTHERA کے بیٹے تھے جن کا ناجائز تعلق حضرت مریم صدیقہ سے تھا (جوئش انسائیکلو پیڈیا جلد ۷ صفحہ ۱۷۰ کالم اول) اسی طرح یہود کا یہ اعتراض تھا کہ انہیں شیطانی الہام ہوتا تھا اور ان کا تعلق بعل سے تھا جس کے معنے اُن کے محاورہ میں شیطان کے تھے چنانچہ لکھا ہے "اور فقیہہ جو یروشلم سے آئے تھے کہتے تھے کہ اس کے ساتھ بعل زبول کا تعلق ہے اور یہ بھی کہ وہ بدروحوں کے سردار کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے (مرقس باب ۳ آیت ۲۲) قرآن کریم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان سب تہمتوں سے پاک قرار دیا ہے۔ اُن کی پیدائش کے متعلق فرماتا ہے وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا

قرآن مجید میں ہارون علیہ السلام کی ذات پر لگائے گئے الزام کی تردید

مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء ع ۶) یعنی مریم جو حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں انہوں نے اپنے تمام سوراخوں کو گناہ سے محفوظ رکھا تھا اور ان کو جو حمل ہوا تھا وہ ناپاک اور شیطانی روح کا نہ تھا بلکہ ایک پاک روح جو ہماری طرف سے تھی اُن کے اندر داخل ہوتی تھی اور ہم نے اس کو اور اس کے بیٹے عیسیٰ کو دنیا کے لئے ایک نشان بنایا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے شیطان سے تعلق کے ازالہ کیلئے فرماتا ہے۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ ع ۱۱) یعنی ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے نشانات عطا فرمائے تھے اور اس کو روح القدس یعنی پاک الہام لانے والے فرشتہ سے مدد دی تھی یعنی اُن کا الہام خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا اور فرشتے اس پر نازل ہوتے تھے شیطان سے اُن کا تعلق نہ تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے متبعین نے بھی ایک شدید الزام اُن پر لگایا تھا کہ وہ نعوذ باللہ من ذالک صلیب پر مر گئے تھے حالانکہ صلیبی موت تورات کے مطابق لعنتی موت ہوتی ہے چنانچہ عہد نامہ جدید میں لکھا ہے۔ ”مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے“ (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) قرآن کریم اس الزام کو بھی رد فرماتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (مریم ع ۲) یعنی جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ گویا میری پیدائش حرامکاری کے نتیجہ میں تھی وہ بھی غلط کہتے ہیں کیونکہ میری پیدائش پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوئی تھی۔ اور جو لوگ کہینگے کہ میں صلیب پر لٹکایا جا کر لعنتی موت مرا ہوں وہ بھی غلطی کریں گے کیونکہ میری موت بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی اور لعنت کی موت سے میں بچایا جاؤں گا۔ اور جو لوگ یہ کہیں گے کہ میں دوسروں کے گناہ اٹھا کر (نعوذ باللہ من ذالک) تین دن سزا بھگتوں گا وہ بھی غلطی کریں گے کیونکہ میرا بعث بعد الموت بھی خدا تعالیٰ کی سلامتی سے شروع ہوگا۔

حضرت مسیح کا مسیحیوں کی مزعومہ صلیبی موت کے بعد دوزخ میں جانا اور گویا اُن کی موت کا لعنت کے اثر کے نیچے ہونا انجیل نقودیمس کے باب ۲۱ سے ثابت ہے۔ نیز ۱ پطرس ۳ ۱۸-۲۰ میں لکھا ہے ”کیونکہ مسیح نے بھی ایک بار گناہوں کے واسطے دُکھ اٹھایا یعنی راستباز نے ناراستوں کے لئے۔ تاکہ وہ ہم کو خدا کے پاس پہنچائے۔ کہ وہ جسم کے حق میں تو مارا گیا لیکن روح میں زندہ کیا گیا جس میں ہو کے اس نے ان روحوں کے پاس جو قید تھیں جا کے منادی کی جو آگے نافرمانبردار تھیں جس وقت کہ خدا کا صبر نوح کے دنوں میں جب کشتی تیار ہوتی تھی انتظار کرتا رہا“

بائبل کی تفسیر میں جو متھیو پول (MATTHEW POOL) کی تصنیف شدہ ہے قید سے مراد دوزخ لیا گیا ہے (تفسیر بائبل مصنفہ متھیو پول جلد ۳ ص ۹۱۱)

پانچواں ستون مذہب کا خود انسان کا وجود ہے کیونکہ وہ مہبطِ وحی ہے۔ اس ستون کو بھی بعض مذاہب نے گرانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً مسیحی مذہب کہتا ہے کہ انسانی روح آدم علیہ السلام کے گناہ کی وجہ سے گنہگار ہوگئی ہے اور انسان طبعاً میلان گناہ رکھتا ہے۔ رومیوں باب ۵ میں لکھا ہے ”پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا۔ اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا“ (آیت ۱۲)

اور ہندو مذہب بھی ظاہر کرتا ہے کہ گویا انسان تمام کوششوں کے باوجود پاک نہیں ہو سکتا اور بار بار جونوں میں ڈالا جاتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش مصنفہ پنڈت دیانندجی بانی آریہ سماج ب ۹)

قرآن کریم نے ان مذاہب کے برخلاف انسانی فطرت کی برأت کی ہے اور وہ فرماتا ہے۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ع ۱) یعنی ہم نفسِ انسانی کو بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں کہ اسے ہم نے سب عیوب سے پاک پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی اور

حاشیہ: ۱۲ انسانی وجود بعض مذاہب کے نکتہ چینی کا نشانہ اور قرآن مجید میں ان کا رد

حاشیہ: ۱۳ فطرت انسانی سب عیوب سے پاک پیدا کی گئی ہے۔

بدی کے پہچاننے کی طاقت رکھی ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنی روح کو بیرونی طونوں سے پاک رکھتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص اس کی جبلی پاکیزگی کو دنیاوی آلائشوں سے گدلا کر دیتا ہے اور اسے اس کے اعلیٰ مقام سے نیچے گرا دیتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے یعنی انسانی رُوح اصل میں پاکیزگی لے کر آتی ہے اور بعد میں لوگ اُسے گندہ کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آدم یا کسی اور کے گناہ کی وجہ سے وہ ناپاک ہو گئی ہے۔ اسی طرح تناسخ کے چکر کا اس طرح رد کرتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النحل ع۴) یعنی وہ لوگ جن کی جان فرشتے اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں فرشتے اُن سے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے دائمی سلامتی تم کو ملیگی (اسلام کا لفظ جو اسم ہے وہ دائمی سلامتی پر دلالت کرتا ہے) جاؤ اور اپنے اعمال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح فرماتا ہے کہ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (ہود ع۹) یعنی جو لوگ سعید اور نیک ہونگے وہ جنت میں جائیں گے اس میں جنت کے آسمان زمین کے قیام تک اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع رہتے چلے جائیں گے۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کا فیصلہ بھی کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ان کو کبھی جنت سے نہیں نکالے گا اور اُن کو ایسا انعام بخشے گا جو کبھی بند نہ ہوگا۔

اس آیت سے انسانی فطرت کے اس حق کو جو دائمی نجات کے متعلق ہے اور جسے آریہ صاحبان نے تناسخ کے عقیدہ سے باطل کر دیا ہے، قائم کر دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام اہم امور جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے متعلق جو جو تہمتیں مختلف مذاہب کے پیروؤں یا فلاسفروں نے لگائی تھیں اسلام نے ان کو دُور کیا ہے اور ہر ایک تہمت سے خدا تعالیٰ کو، ملائکہ کو، کلام الٰہی کو، انبیاء کو اور فطرتِ انسانی کو بری کیا ہے اور یہ ایسی خوبی ہے جو اور کسی کتاب میں اس کی موجودہ حالت میں نہیں پائی جاتی اور صرف قرآن کریم ہی ہے جو سب تہمتوں سے ان مبارک وجودوں اور اصولوں کو پاک کرتا ہے جو مذہب کے لئے بمنزلہ ستون کے ہیں اور یہ ایسا امر ہے کہ اگر قرآن کریم اس کے سوا اور کوئی کام نہ بھی کرتا تو صرف یہی کام دوسرے ادیان کی موجودگی کے باوجود اسکی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔

قرآن مجید میں شکوک کا رد

ظاہر ہے کہ جس کے دل میں خدا تعالیٰ کی نسبت بدظنی ہوگی اور [illegible] اس کی طاقتوں کے بارہ میں شک میں ہوگا وہ اس سے کامل تعلق پیدا کر کے اس کی بے پایاں رحمت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا۔ اور جو ملائکہ کی نسبت بدظن ہوگا [illegible] ملائکہ سے تعلق جوڑ کر ان کی پاکیزہ تحریکوں سے فائدہ نہ اٹھا سکیگا۔ اور جو انبیاء سے یا اُن میں سے کسی سے بدظن ہوگا وہ ان کے اعلیٰ نمونہ سے فائدہ نہ اُٹھا سکیگا۔ اور جو کلام الٰہی کے متعلق شبہ میں ہوگا وہ اس کی پاک کرنے والی تاثیرات سے محروم رہے گا۔ اور جو انسانی فطرت سے بدظن ہوگا وہ اپنے نفس کو پاک کرنے کی جدوجہد میں اس عزم اور ارادہ سے محروم رہے گا جو پاکیزگی کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ پس لَا رَیْبَ فِیْهِ کے مطابق

قرآن مجید کی نجات کی ضامن بے نظیر تعلیم

تعلیم دے کر قرآن کریم نے انسان کو نیکی کے سرچشموں سے فائدہ اٹھانے، نیک نمونوں کو خضرِ راہ بنانے اور نہ ٹوٹنے والی امید کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے جو اس کی نجات کی ضامن اور اس کی کامیابی کی کفیل ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے رَیْب کے دوسرے معنے شک کے ہیں۔ پس لَا رَیْبَ فِیْهِ کے یہ معنے بھی ہیں کہ قرآن کریم کی صداقت کا ایک مزید ثبوت اور اس کی ضرورت حقہ کا ایک زبردست گواہ یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود قرآن کریم پر اعتراض کرنے میں جلدی کرتے ہیں انہوں نے اس جملہ کے صرف یہی معنے کئے ہیں اور پھر اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کر کے کہ اس میں کوئی شک نہیں گویا خود اپنے مشکوک ہونے کا اعتراف کیا ہے کیونکہ جب دل میں چور نہ ہو

تو انسان کو یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ لوگ مجھ پر جھوٹا ہونے کا الزام لگائیں گے (ویری بحوالہ رومن قرآن) اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس نادان معترض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سورۂ بقرہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی وحی نہیں ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اپنے دل کے خدشہ کی وجہ سے شک کی نفی کی گئی ہے بلکہ یہ سورۃ تو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ قرآن کریم کو نازل ہوتے ہوئے تیرہ سال سے زائد گذر چکے تھے اور اس عرصہ میں کفار ہزاروں شبہات قرآن کریم کے بارہ میں پیش کر چکے تھے۔ پس اس قدر عرصہ تک دشمنوں کے اعتراضات لینے کے بعد بھی اگر قرآن کریم کا حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جو سچا ہو اُسے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ▪ سچا ہے ورنہ اس کی سچائی میں شک پڑ جائیگا یہ دعویٰ بالبداہت باطل ہے اور کبھی کسی عقلمند نے اسے قبول نہیں کیا نہ کبھی کسی صادق نے اس پر عمل کیا ہے اور یہ نکتہ صرف رومن قرآن کے مصنف کے ہی ذہن میں آیا ہے اور ریورنڈ ویری ہی ایک ایسے شخص ہیں جن کو اس خلاف عقل دعویٰ کی تصدیق کی توفیق ملی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ان دونوں پادریوں کو خود اپنی مذہبی کتب پر غور سے مطالعہ کرنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ اگر وہ اپنی مذہبی کتب کا غور سے مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ▪ یہ اعتراض تو قرآن کریم کی صداقت کے خلاف نہیں کر رہے بلکہ خود اپنی کتب کے خلاف کر رہے ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل حوالے جو بہت سے حوالوں میں سے چند ہیں ثابت کرتے ہیں کہ بالکل اس قسم کے محاورات بائبل میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ امثال $\frac{8}{8}$ "میرے منہ کی ساری باتیں صداقت سے ہیں ان میں کچھ ٹیڑھا ترچھا نہیں"۔ یسعیاہ $\frac{45}{19}$ "میں خداوند سچ کہتا ہوں اور راستی کی باتیں فرماتا ہوں"۔ تمطاؤس (۱) $\frac{1}{15}$ "یہ بات سچ اور کمال قبولیت کے لائق ہے"۔ طیطس $\frac{3}{8}$ "یہ بات سچ ہے"۔ مکاشفات $\frac{21}{5}$، $\frac{22}{6}$ "یہ باتیں سچ اور برحق ہیں"۔

بائبل میں لاریب فیہ کے ہم معنی محاورات کا استعمال

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ اپنی سچائی پر زور دینے کے لئے عہد نامہ قدیم اور جدید دونوں نے بالکل قرآن کریم کے مشابہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور اگر اس قسم کے محاوروں کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قائل اپنی سچائی کی نسبت شبہ رکھتا ہے تو یہ شبہ بہت زیادہ مصنفین عہد نامہ قدیم اور جدید کے دل میں پایا جاتا تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ اعتراض نہ بائبل پر پڑتا ہے نہ قرآن کریم پر۔ کیونکہ جب شبہات پیش کئے جائیں تو اپنے دعویٰ کی سچائی پر زور دینے کے لئے ایسے کلمات کا استعمال شک پر نہیں بلکہ یقین پر دلالت کرتا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ الفاظ ابتدائی سورتوں میں استعمال نہیں کئے گئے بلکہ ایک لمبے عرصہ کی مخالفت کے بعد استعمال کئے گئے ہیں۔

اوپر کا جواب امر واقعہ کے لحاظ سے ہے ورنہ میرے نزدیک اس کتاب میں جو عالم الغیب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہو اگر شروع میں بھی ایسے کلمات پائے جائیں تو کسی شک پر دلالت نہیں کرتے۔ کیونکہ گو بندہ نہیں جانتا کہ اس کے دعویٰ کو لوگ کس نگاہ سے دیکھیں گے مگر خدا تعالےٰ تو جانتا ہے کہ اس کے نازل کردہ کلام سے لوگ کس طرح پیش آئیں گے اور وہ اپنے علم کی بناء پر ایسے کلمات شروع میں ہی استعمال کر سکتا ہے اور اس کا ایسا کرنا اس کے متشکک ہونے کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ اس کے عالم الغیب ہونے کا ثبوت ہوگا۔

اوپر کے جوابات اس امر کو تسلیم کر کے دئے گئے ہیں کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ کا فقرہ محض صداقت قرآن کریم کی تاکید کیلئے استعمال ہوا ہے۔ مگر میرے نزدیک رَیب کے معنے اگر صرف شک کے کئے جائیں تو اس صورت میں بھی یہ صرف صداقت کی تاکید کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ اپنے اندر مزید صداقتیں رکھتا ہے جو قرآن کریم کے سچے ہونے کے دلائل پر مشتمل ہیں چنانچہ "اس میں کوئی شک نہیں" کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ یہ کلام ضرور سچا ہے اور دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہیں کہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔

میں حل لغات کے موقعہ پر ثابت کر چکا ہوں کہ ریب اس شک کو نہیں کہتے جو تحقیق کے راستہ میں ممد ہوتا ہے اور

جس پر علمی ترقی کا مدار ہے بلکہ ریب اس شک کو کہتے ہیں جو بلاوجہ
اور بدظنی پر مبنی ہو اور ان معنوں کی رُو سے " اس میں کوئی
ریب نہیں" کے یہ معنے ہوئے کہ قرآن کریم میں کوئی ایسی بات نہیں
جو بدظنی اور صداقت کے انکار پر مشتمل ہو یعنی اس میں جس قدر امور
ہیں وہ تحقیقی ہیں ظنی نہیں۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا یہ
دعویٰ کہ اس میں جس قدر امور ہیں تحقیقی ہیں ظنی نہیں کوئی معمولی
دعویٰ نہیں بلکہ اگر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو اس سے قرآن کریم
کی صداقت پر ایک زبردست شاہد مہیا ہو جاتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے
ہیں کہ قرآن میں جس قدر امور بھی بیان کئے گئے ہیں سب کے لئے
دلائل مہیا کئے گئے ہیں۔ مثلاً بائبل وید اور دیگر کتب خدا تعالیٰ
کے وجود کو پیش کرتی ہیں مگر اس کو ایک دعویٰ کے طور پر پیش
کرتی ہیں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں دیتیں۔ مگر قرآن کریم
اگر خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے تو ایسا مطالبہ کرنے
کی تائید میں دلائل بھی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وجود کو زبردست
شواہد سے ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ ملائکہ پر ایمان لانے کا
حکم دیتا ہے تو ملائکہ کے موجود ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ اگر
وہ قبولیت دعا کا عقیدہ پیش کرتا ہے تو اس کی تائید میں دلیلیں
بھی دیتا ہے۔ اگر انبیاء پر ایمان لانے کو کہتا ہے تو ان کی صداقت
کے ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے۔ اگر بعث بعد الموت منواتا ہے تو اس
عقیدہ کو براہین قویہ سے ثابت بھی کرتا ہے۔ غرض کوئی ایسا عقیدہ
نہیں جسے قرآن کریم پیش کرتا ہو اور اس کی صداقت کے ثبوت
میں اس نے دلائل بھی نہ دئے ہوں۔ چنانچہ ان امور کی تفصیل
قرآن کریم کی مختلف آیات کی تفسیر میں آگے چل کر بیان ہوگی۔ پس
لَا رَیْبَ فِیْہِ کہہ کر قرآن کریم نے اس امر کو پیش کیا ہے کہ گو
قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے یعنی ہر ضروری امر کے متعلق اس میں
بحث کی گئی ہے پھر بھی وہ ظنی اور شکی امور کو پیش نہیں کرتا بلکہ
ہر امر کی دلیل ساتھ دیتا ہے اور تحقیق کے ساتھ ہر مسئلہ کو پیش کرتا
ہے اور یہ امر قرآن کریم کی افضلیت کا ایک زبردست ثبوت ہے
کیونکہ یہ امر تو آسان ہے کہ ایک دو امور جو تحقیقی طور پر ثابت ہو چکے
ہوں ان کو با دلائل بیان کر دیا جائے لیکن یہ امر نہایت مشکل ہے
کہ ہر ضروری امر کے متعلق بحث بھی کی جائے اور پھر ہر بات کا
دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا جائے اور ظن اور گمان کی حد سے
نکال کر یقین اور وثوق کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے
کہ جو کتاب اپنے تمام دعاوی کو اس طرح پیش کرے گی اس کے
سچا ہونے میں کسی منصف مزاج کو شک اور تردد نہ ہو سکیگا۔

لَا رَیْبَ فِیْہِ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ قرآن کریم کے
محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں اور ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کے بعد
یہ الفاظ اس مضمون پر دلالت کرتے ہیں کہ اس کتاب کے بعد کوئی
اور کتاب نازل نہ ہوگی اور یہ دنیا کے لئے آخری ہدایت نامہ
ہے۔ کیونکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ذٰلِکَ الْکِتٰبُ کا ایک
مفہوم یہ ہے کہ یہ کامل کتاب ہے اور تمام انسانی ضروریات کے
پورا کرنے کا سامان اس میں موجود ہے اس قسم کی کتاب کے بعد
دوسری کتاب اسی صورت میں نازل ہو سکتی ہے جب وہ محفوظ نہ
رہے۔ کیونکہ نئے قانون کی دو ہی صورت میں ضرورت ہوتی
ہے یا تو اس وقت جبکہ پہلا قانون ناقص ہو اور کسی وقت جا کر
لوگوں کی ضروریات کے پورا کرنے سے قاصر ہو جائے یا پھر اس
صورت میں کہ پہلا قانون دنیا سے کلی طور پر یا جزوی طور پر مفقود
ہو جائے اور اسے دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت ہو سو ذٰلِکَ
الْکِتٰبُ کے بعد لَا رَیْبَ فِیْہِ فرما کر یہ بتایا کہ یہ کامل کتاب
ہمیشہ زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ رہے گی اور کوئی زمانہ ایسا
نہ آئے گا کہ اس کے بارہ میں یہ شک کیا جا سکے کہ آیا اس کے
الفاظ وہی ہیں جو کسی وقت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل
ہوئے تھے یا ان میں کوئی تغیر تبدل ہو گیا ہے؟ اور چونکہ ایسا
زمانہ اس پر کوئی نہ آئے گا یہ کتاب منسوخ نہ ہوگی اور آئندہ
سب زمانوں میں اسی کے مطابق لوگوں کو رُوحانی زندگی بسر
کرنی پڑے گی۔ یہ مفہوم بھی قرآن کریم کی ایک زبردست خوبی
پر دلالت کرتا ہے اور آج بھی جبکہ قرآن کریم کے نزول پر
تیرہ سو سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے دوست تو الگ رہے
دشمن بھی اس کے محفوظ ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اور
قرآن کریم اندرونی اور بیرونی شواہد بھی ایسے رکھتا ہے جو اس

لاریب فیہ میں قرآن مجید کے منسوخ نہ ہونے کے متعلق پیشگوئی

قرآن مجید کے لفظاً محفوظ رہنے کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت

کے محفوظ ہونے پر گواہ ہیں چنانچہ سر ولیم میور جیسا شخص بھی اس کے بارہ میں گواہی دیتا ہے کہ:-

THERE IS OTHERWISE EVERY SECURITY INTERNAL AND EXTERNAL THAT WE POSSESS THAT TEXT WHICH MOHAMMAD HIMSELF GAVE FORTH AND USED

یعنی "ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت موجود ہے۔ اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی کہ یہ کتاب جو ہمارے پاس ہے۔ وہی ہے جو خود محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور اُسے استعمال کیا کرتے تھے۔"

(لائف آف محمد)

ویدوں کے غیر محفوظ ہونے کا اقرار ہندو علماء کی تحریرات سے۔

قرآن کریم کی یہ فضیلت ایسی ہے جو دوسری کتب کے مقابلہ پر اس کی ضرورت کو روز روشن کی طرح ثابت کر دیتی ہے کیونکہ جس کلام کے محفوظ ہونے میں شک پڑ جائے اس پر عمل کرنے کے لئے انشراح صدر پیدا نہیں ہوتا اور مذہب کیلئے کامل انشراح کا ہونا ضروری ہے۔

ژند اوستا کے غیر محفوظ ہونے کا ثبوت

بے شک قرآن کریم کے وقت میں عہد نامہ قدیم موجود تھا عہد نامہ جدید موجود تھا، وید موجود تھے، ژند اور اس کی شرح اوستا موجود تھی۔ مگر ان میں سے ایک کتاب بھی تو نہ تھی جو اس طرح محفوظ ہو جس طرح کہ وہ نازل ہوئی تھی۔ ژند اوستا کے متعلق تو خود پارسی بھی مقر ہیں کہ اس کے بہت سے حصے ضائع ہو چکے ہیں اور موجودہ ژند ایسی نامکمل صورت میں ہے کہ اس کے غیر محفوظ ہونے میں کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۲ صفحہ ۲۶۷ پر لکھا ہے کہ شاہ یشتاسپ (VISHTASPA) نے جو زرتشت مذہب کا سرپرست تھا۔ اوستا کے دو نسخے سنہری حروف میں لکھوا کر اصطخر اور سمرقند میں رکھوائے ہوئے تھے۔ لیکن ۳۳۰ قبل مسیح سکندر کے حملہ کے دوران میں دونوں نسخے تباہ کر دیئے گئے اور سکندر اعظم کی تاخت و تاراج نے زرتشتی مذہب کی طاقت کو توڑ دیا۔ اور ان پانچ صدیوں میں جو اس کے بعد آئیں سیلیوسڈ SELEUCID اور پارتھین PARTHIAN کا عہد حکومت زرتشتی مذہب کی تاریخ میں تاریکی اور تنگی کا زمانہ ہے جس کے نتیجہ میں اصل مذہبی کتابوں کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ باوجود اس غفلت کے جو اس کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ مذہبی کتب کے معتد بہ حصے متفرق کتابوں میں اور علماء کے حافظہ میں یاد رہے۔

وید بھی غیر محفوظ ہیں اُن کے مختلف نسخے آپس میں اس قدر اختلاف رکھتے ہیں کہ اُن کے متغیر ہونے کی ایک کھلی دلیل ہیں حتیٰ کہ منتروں کے منتر بعض نسخوں میں موجود ہیں اور بعض میں نہیں اور بعض میں عبارت کسی طرح ہے اور بعض میں کسی طرح ہے چنانچہ زمانہ قدیم کے ہندو علماء میں سے ایک عالم نے آج سے کئی صدیاں قبل وید کے محرف ہونے کے متعلق ان الفاظ میں گواہی دی ہے کہ "وید بیاس نے تو دوا پر ینگ میں چاروں ویدوں کا ذکر کیا ہے لیکن رشیوں کی اولاد نے علم کی خامی کی وجہ سے ویدوں کو ایک دوسرے سے مختلف بنا دیا۔ کہیں منتروں کے ساتھ براہمن بھاگ (تفسیری حصہ) شامل کر دیا۔ اور کہیں اعراب اور الفاظ کے فرق سے رگ، یجر اور سام وید کو کئی طرح کا بنا دیا۔ بعض جگہ از راہ تشریح و عام خیالات کے ذریعہ۔ نیز کلپ سوتروں کو ایشوری کلام میں شامل کر کے انہیں مختلف شکلوں میں تبدیل کیا گیا ہے" (کورم پوران پورو آردھ۔ ادھیائے ۲۰ شلوک ۴۴ تا ۴۶)

ویدوں کے غیر محفوظ ہونے کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کی تائید زمانہ حال کے ہندو اور آریہ سماجی پنڈت بھی کرتے ہیں جس سے وید کی موجودہ حالت کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ پنڈت جے دیو شرما اپنے سام وید بھاش (تفسیر) کے صفحہ ۲۹۵ میں لکھتے ہیں کہ "سام وید کے کئی نسخوں میں آرنیک کانڈ (باب) نہیں ہے۔" اسی طرح پنڈت تلسی رام سوامی اپنے سام وید بھاش جلد ۲ صفحہ ۴۸۳ میں لکھتے ہیں کہ "سام وید کا جو نسخہ پنڈت ستیہ برت سام شرمی نے شائع کیا ہے اس میں "مہانامنی شوکت" نہیں ہیں حالانکہ یہ آرنیک کانڈ اور مہانامنی شوکت آریوں کے شائع کردہ نسخہ مطبوعہ اجمیر میں موجود ہیں۔ مگر جو سام وید بنارس میں شائع

ہوا ہے اس میں یہ دونوں باب نہیں پائے جاتے۔ ان دونوں میں ۵۴ منتر ہیں جو بعض نسخوں میں ہیں اور بعض میں نہیں۔ یہی حالت رگوید، یجروید اور اتھروید کی ہے۔ چنانچہ اتھروید کی تحریف کے متعلق پنڈت ویدک منی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "حقیقت میں جتنی بُری حالت اتھروید کی ہوئی ہے اتنی اور کسی وید کی نہیں ہوئی سائن آچاریہ کے بعد بھی کئی سوکت (باب) اس میں شامل کئے گئے ہیں" (وید سَرۡوَسْوَمتْ ۹)

تورات بھی اپنے غیر محفوظ ہونے پر شاہد ہے مثلاً تورات میں جو حضرت موسیٰ کی کتاب ہے لکھا ہے: "سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا" (استثنا باب ۳۴ آیت ۵ و ۶) پھر آیت ۱۰ میں لکھا ہے کہ "اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔"

اب ہر اک شخص سمجھ سکتا ہے کہ موسیٰ پر یہ کلام نازل نہیں ہو سکتا تھا کہ پھر موسیٰ مرگیا اور اب تک اس جیسا شخص کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ضرور ہے کہ یہ فقرہ تورات میں موسیٰ کی وفات کے لمبے عرصہ بعد بڑھایا گیا ہو۔

واضح الحاقی عبارتوں کے علاوہ بائبل میں ایسے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں کسی صورت میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب اس شکل میں موجود ہے جس شکل میں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر چند اختلافات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پیدائش باب ۱ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حشرات الارض اور جنگلی جانور پیدا کئے اور اس کے بعد انسان کو پیدا کیا۔ (آیت ۲۴ و ۲۵ و ۲۶) لیکن پیدائش باب ۲ میں لکھا ہے کہ آدم کی پیدائش کے بعد جانور اور آسمان کے پرندوں کو بنایا گیا۔ آیت ۱۹۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق پیدائش باب ۷ میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کہا کہ سب پاک جانوروں میں سے سات سات نر اور ان کے مادے اپنی کشتی میں رکھ لے اور نوح نے ایسا ہی کیا (آیت ۱ و ۲ و ۵) لیکن اسی باب کی ۸ اور ۹ آیت میں لکھا ہے کہ پاک چارپایوں میں سے دو دو نر اور مادے نوح کی کشتی میں داخل ہوئے جیسے کہ خدا نے فرمایا تھا۔ گویا ایک ہی جگہ پر دو تین آیتوں کے فرق پر اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ دو تین آیتوں پہلے تو کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے سات سات جانور رکھنے کا حکم دیا اور نوح نے سات سات جانور ہی رکھے۔ لیکن دو تین آیتوں بعد یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے دو دو جانور رکھنے کا حکم دیا تھا اور نوح علیہ السلام نے دو دو جانور ہی رکھے۔ اس قسم کے بیسیوں اختلافات تورات میں پائے جاتے ہیں جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس شکل میں موجود نہیں جس شکل میں کہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ورنہ ایسے صریح اختلافات پائے نہ جاتے۔

تورات کے غیر محفوظ ہونے کا ثبوت

اناجیل کی بھی یہی حالت ہے اول تو اس امر کا ہی کوئی ثبوت نہیں کہ کون سی انجیل الہامی ہے اور کون سی نہیں کیونکہ اناجیل کئی ہیں۔ ان میں سے بلا کسی دلیل کے محض قرعہ ڈال کر چار انجیلوں کا انتخاب کر لیا گیا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ یہ زیادہ معتبر ہیں۔ پھر جو چار انجیلیں منتخب کر کے بنیادی کتب قرار دی گئی ہیں ان پر مسیح کا کلام بہت تھوڑا ہے اور خدا تعالیٰ کا کلام تو اس میں کوئی ہے ہی نہیں ان مسیح کی زبانی چند فقرات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ملتے ہیں۔ پس حقیقتاً خدا تعالیٰ کا الہام خواہ اس کے الفاظ میں ہو یا مسیح کے الفاظ میں اناجیل میں بہت کم ہے۔ ہاں تاریخی واقعات پر یہ کتاب مشتمل ہے جو کسی صورت میں الہام نہیں کہلا سکتے۔ بلکہ صرف بعض مورخوں کا نقطۂ نگاہ ہے۔ مگر اسی پر بس نہیں ان اناجیل میں بھی کہ جو عہد نامہ جدید میں شامل کی گئی ہیں (۱) شدید اختلاف ہے اور (۲) اس کے مختلف زمانوں کے ترجموں میں بھی باہم شدید اختلاف ہے۔

انجیل غیر الہامی ہے

بائبل کے بعض معنوی اختلافات

پہلے دعویٰ کی تائید میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ متی باب ۱۰ آیت ۹ و ۱۰ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے حواریوں کو یہ نصیحت کی کہ "نہ سونا، نہ روپا، نہ تانبا اپنے کمربندوں میں رکھو راستے کے لئے نہ جھولی نہ دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی لو" لیکن

[۱] انجیل کے بعض اندرونی اختلافات

مرقس باب ۶ میں حضرت مسیح کی نصیحت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "اور حکم کیا کہ سفر کے لئے سوا لاٹھی کے کچھ نہ لو نہ جھولی، نہ روٹی، نہ اپنے کمر بند میں پیسے۔ مگر جوتیاں پہنو پر دو کرتے مت پہنو" (آیت ۸ و ۹) یہ کیسا صریح اختلاف ہے۔ متی کا بیان ہے کہ مسیح نے کہا نہ جوتی لو نہ لاٹھی لو۔ مرقس کہتا ہے کہ مسیح نے یوں کہا کہ لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو اور جوتی ضرور پہنو۔ اسی طرح متی باب ۲۷ آیت ۴۴ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح کو صلیب کے موقعہ پر ان کے دونوں مصلوب ساتھیوں نے ملامت کی اور طعنے دئے۔ مرقس باب ۱۵ آیت ۳۲ میں بھی اس کی تائید ہے لیکن لوقا باب ۲۳ آیت ۳۹ و ۴۰ میں لکھا ہے کہ ان چوروں میں سے جو اس کے ساتھ صلیب دئے گئے ایک نے اُسے طعنہ دیا لیکن دوسرے نے نہ صرف یہ کہ طعنہ نہیں دیا بلکہ طعنہ دینے والے کو ملامت کی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ان دو صلیب والوں میں سے ایک چور نے مسیح سے کہا "کہ اگر تو مسیح ہے تو آپ کو اور ہم کو بچا۔ دوسرے نے اُسے ملامت کر کے جواب دیا۔ کیا تو بھی خدا سے نہیں ڈرتا جس حال کہ اسی سزا میں گرفتار ہے" پھر آگے لکھا ہے "اور اُس نے یسوع سے کہا اے خداوند جب تو اپنی بادشاہت میں آوے مجھے یاد کیجو" (آیت ۴۲) اس پر یسوع نے اُسے کہا کہ میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ آج تو میرے ساتھ بہشت میں ہوگا" (آیت ۴۳) اسی طرح مرقس باب ۱۵ آیت ۲۵ میں لکھا ہے کہ مسیح کو صلیب تیسرے گھنٹے میں دی گئی۔ لیکن یوحنا باب ۱۹ آیت ۱۴ میں لکھا ہے کہ چھٹی گھڑی تک ابھی مسیح پیلاطوس کی کچہری میں موجود تھا۔ اسی طرح متی باب ۲۷ آیت ۵ میں لکھا ہے کہ یہوداہ اسکریوطی جس نے مسیح علیہ السلام کو پکڑوایا تھا۔ اُس نے پھانسی کے ذریعہ خود کشی کر لی لیکن اعمال باب ۱ آیت ۱۸ میں لکھا ہے کہ وہ اوندھے منہ گر گیا اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس کی ساری انتڑیاں نکل گئیں۔ اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دئے جانے کے دوسرے دن کے متعلق اناجیل میں عجیب و غریب اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوحنا باب ۲۰ آیت ۱ میں لکھا ہے کہ ہفتہ کے پہلے دن (یعنی اتوار کو) مریم میگدلینی قبر پر آئی لیکن متی باب ۲۸ آیت ۱ میں لکھا ہے کہ سبت کے بعد (یعنی اتوار کے دن) پو پھٹنے کے بعد مریم میگدلینی اور دوسری مریم اس کی قبر کو دیکھنے آئیں۔ یعنی قبر پر آنے والی دو عورتیں تھیں۔ مرقس باب ۱۶ آیت ۱ میں اس سے بھی اختلاف کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اتوار کے دن مریم میگدلینی یعقوب کی ماں مریم اور سلومی یعنی تین عورتیں قبر پر آئیں لیکن لوقا باب ۲۴ آیت ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ مریم میگدلینی اور یوحنا اور مریم یعقوب کی ماں اور اَور عورتیں ساتھ تھیں۔ اور یہ سب مل کر قبر پر گئیں۔ گویا ہر ایک انجیل دوسری انجیل کے مخالف بیان دے رہی ہے۔ یوحنا ایک عورت کا جانا بیان کرتا ہے۔ متی دو عورتوں کا جانا بیان کرتا ہے۔ مرقس تین عورتوں کا جانا بیان کرتا ہے اور لوقا تین سے زیادہ عورتوں کا جانا بیان کرتا ہے۔ اب یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کلام خدا تعالیٰ کا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے اختلافات اناجیل میں پائے جاتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ اناجیل شک و شبہ سے خالی نہیں۔

[۲] انجیل میں تحریف کے چند نمونے

دوسرے دعویٰ کی تائید میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ متی باب ۱۷ میں ایک آیت نمبر ۲۱ یوں ہوا کرتی تھی۔ "مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا اور روزہ کے نہیں نکالے جاتے۔" ۱۹۳۰ء کے پہلے کی تمام اناجیل میں یہ آیت پائی جاتی تھی مگر ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کی اناجیل میں سے یہ آیت کی آیت ہی نکال دی گئی۔ متی باب ۱۹ آیت ۱۷ کے الفاظ پہلے اناجیل میں یوں ہوا کرتے تھے "تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے" لیکن ۱۹۳۰ء کی اناجیل میں اس فقرہ کو بدل کر یوں کر دیا گیا ہے "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے" متی باب ۲۳ میں ایک آیت ۱۴ ہوا کرتی تھی جس کے الفاظ یوں تھے "اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ بیواؤں کے گھر نگل جاتے اور مکر سے لمبی نمازیں پڑھتے ہو اس سبب سے تم زیادہ تر سزا پاؤ گے۔" ۱۹۳۰ء کے نسخوں میں سے یہ آیت بالکل نکال دی گئی ہے۔ متی باب ۲۷ میں ایک آیت ۳۵ ہوتی تھی جس کے الفاظ یہ تھے "تا کہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو۔ کہ انہوں نے میرے لباس آپس میں بانٹ لئے اور میرے لباس پر چٹھی ڈالی"۔ مگر یہ آیت ۱۹۳۰ء کے نسخوں میں موجود نہیں۔ یوحنا باب ۵ میں ایک آیت ۴ ہوتی تھی جس کے الفاظ یہ تھے "کیونکہ ایک فرشتہ بعضے وقت اس حوض میں اُتر کے اس پانی کو ہلاتا تھا۔ اور پانی کے ہلنے کے بعد جو کوئی کہ پہلے اس میں اُترتا کسی

نوٹ:۔ بعض آیات جو پہلے ۱۹۳۰ء کے نسخوں سے نکال دی گئی تھیں۔ ۱۹۳۰ء کی مطبوعہ بائبل میں دوبارہ بریکٹوں میں بطور حاشیہ نہ بدلی حروف کے ساتھ لکھ دی گئی ہیں یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ بائبل الہامی کتاب نہیں بلکہ ایک کھیل ہے جب چاہا کسی آیت کو داخل کر دیا۔ جب چاہا خارج کر دیا۔

بیماری میں گرفتار ہو اس سے چنگا ہو جاتا تھا۔" یہ آیت ۱۹۳۰ء اور بعد کی اناجیل میں سے بالکل نکال دی گئی ہے۔ یوحنا باب ۷ آیت ۵۳ سے باب ۸ آیت ۱۱ تک نسخہ مطبوعہ مرزا پور میں موجود ہیں مگر نسخہ بحروف رومن اردو کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ساتویں باب کی ۵۳ آیت سے لیکر آٹھویں باب کی گیارہویں آیت تک کی عبارت اکثر قلمی نسخوں میں نہیں پائی جاتی۔ عیسائی علماء کا اپنا اقرار کہ بعض آیتیں جو اناجیل میں درج تھیں ■ درحقیقت اناجیل کا حصہ نہیں تھیں۔ اور پرانے نسخوں کا آپس میں اختلاف کہ بعض آیتیں بعض میں پائی جاتی ہیں اور بعض میں نہیں۔ یہ امور اس بات کا صاف اور واضح ثبوت ہیں کہ موجودہ اناجیل شک اور شبہ سے پاک نہیں بلکہ اس بات کا قطعی اور یقینی ثبوت ہیں کہ وہ ملاوٹ سے ہرگز محفوظ نہیں۔ اور خود عیسائیوں کے مسلّمات کے رُو سے محرف اور مبدّل ہیں۔ پس ایسی کتب کی موجودگی کے باوجود خواہ وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہوں یقیناً ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس کا ہر ہر لفظ قطعی اور یقینی ہو اور جس کی حفاظت کا دشمن اور دوست کو اقرار ہو۔ اور اس ضرورت کو قرآن کریم نے پورا کیا۔ اور اس آیت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کے متعلق یہ اعتراض کرنا کہ پہلی کتب کی موجودگی میں اس کی کیا ضرورت ہے ایک بے معنے اعتراض تھا کیونکہ محرف مبدّل کتب خود ایک محفوظ کتاب کا مطالبہ کرتی تھیں جس پر لوگ اس یقین سے عمل کر سکیں کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پس قرآن کریم نے اپنی ضرورت کی تائید میں اپنے کامل ہونے کی دلیل کے ساتھ یہ دلیل بھی پیش کی کہ ایمان کے لئے اس کتاب پر کامل یقین ضروری ہے جس پر عمل کرنے کا حکم دیا جائے اور قرآن کریم سے پہلے کی سب کتب اپنی موجودہ شکل میں مجروح اور مشکوک ہو چکی ہیں۔ پس ایک ایسی کتاب کی ضرورت پیدا ہو چکی ہے جس کے لفظ لفظ کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے میں شک نہ کیا جاسکے۔ پس اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تاکہ جو لوگ اس پر عمل کریں اس یقین کے ساتھ عمل کریں کہ یہ تمام کا تمام محفوظ ہے اور ہر ہر لفظ اس کا اسی طرح ہے جس طرح خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کے بعد کوئی شخص قرآن کریم کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا اور جس کے بعد پہلی کتب کا موجود ہونا اس کی ضرورت کو باطل نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ان الفاظ میں یہ پیشگوئی بھی کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی اور کبھی بھی انسانی دستبرد کا شکار نہ ہوگی۔

۳۔ ریب کے ایک معنے ہلاکت اور تباہی کے بھی ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے لَا رَیْبَ فِیْہِ کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ کتاب نہ صرف سب خوبیوں کی جامع ہے بلکہ سب نقائص سے پاک بھی ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ ایک نسخہ کسی خاص مرض کے لئے مفید تو ہوتا ہے لیکن اس فائدہ کے ساتھ بعض اور نقصان بھی پہنچا دیتا ہے پس ان الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو ضرورت بھی انسان کو مذہب کے بارہ میں پیدا ہو قرآن کریم اس کو پورا کرتا ہے اور ساتھ ہی اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے کسی اور جہت سے انسان کی رُوحانیت کو نقصان بھی نہیں پہنچتا۔ چنانچہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ سورۃ طٰہٰ میں فرماتا ہے مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (ع ۱) یعنی اس قرآن کریم میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان دین یا دنیا میں نقصان اٹھائے بلکہ اس کی تعلیم مفید ہونے کے ساتھ بے ضرر بھی ہے۔ اس بارہ میں بھی آئندہ تفسیر میں متعدد مثالیں پیش کی جائیں گی (انشاء اللہ) جن سے معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان کی روحانیت یا اخلاق کو نقصان پہنچتا ہو بلکہ وہ خالص خیر ہی خیر ہے۔ اور یہ امر بھی اسے دوسری کتب پر ایک زبردست فوقیت عطا کرتا ہے۔

[حاشیہ: قرآن مجید میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان دین یا دنیا میں نقصان اٹھائے]

۴۔ چوتھے معنے رَیْب کے حَاجَۃٌ کے بتائے گئے تھے۔ ان معنوں کے رُو سے لَا رَیْبَ فِیْہِ کے معنے یہ ہوں گے کہ اس کتاب میں کوئی دینی امر بیان کرنے سے رہ نہیں گیا بلکہ سب ضروری امور اس میں بیان کر دئے گئے ہیں چنانچہ یہ فضیلت بھی قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اور وہ ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ کوئی انسانی ضرورت ایسی نہیں جس کے متعلق اس میں شافی تعلیم موجود نہیں۔ کوئی اعتقادی اور کوئی عملی اور کوئی اخلاقی اور کوئی اقتصادی اور کوئی مدنی امر نہیں جس کے بارہ میں قرآن کریم

[حاشیہ: قرآن مجید میں کوئی امر بیان کرنے سے رہ نہیں گیا۔]

میں بحث نہ کی گئی ہو اور اس کے متعلق تفصیلی ہدایت نہ دی گئی ہو بلکہ باوجود قلیل الحجم ہونے کے قرآن کریم میں سب ضروری امور پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان حیران ہو جاتا ہے اور اسے قرآن کریم کا ایک زبردست معجزہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس خوبی کی طرف شروع سے اس کے دشمنوں کی نگاہ بھی پڑتی چلی آئی ہے

قرآن مجید کے مکمل ہونے کے متعلق یہودیوں کی شہادت

چنانچہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ قَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَوْ عَلَيْنَا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا لَاتَّخَذْنَاهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا فَقَالَ عُمَرُ اِنِّيْ لَاَعْلَمُ اَيَّ يَوْمٍ اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ اُنْزِلَتْ يَوْمَ عَرَفَةَ فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ (ترمذی جلد دوم کتاب التفسیر زیر آیت الیوم اکملت لکم دینکم) کہ ایک یہودی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملا۔ اور کہنے لگا۔ کہ اگر ہم پر آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اترتی۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی دینی امر بیان کرنے سے رہ نہیں گیا بلکہ سب ضروری امور اس میں بیان کر دئے گئے ہیں اور قرآن مجید کامل کتاب ہے۔ تو ہم اس دن کو جس دن وہ آیت اُتری عید کا دن مقرر کرتے۔ اور خوشی مناتے مگر ہماری شریعت کامل شریعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے خوب یاد ہے کہ کب اور کہاں یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آیت حج کے ایام میں یوم عرفہ میں جمعہ کے روز نازل ہوئی۔ گویا تم تو ایک دن عید مناتے لیکن ہمارے۔ لئے یہ دو عیدیں تھیں ایک جمعہ کا دن اور دوسرا یوم عرفہ۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ پڑھی۔ اور پاس ہی ایک یہودی کھڑا تھا۔ اس نے اُن سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر اترتی تو ہم اس روز عید مناتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ یہ آیت نازل ہی ایسے ایام میں ہوئی جبکہ دو عیدیں جمع تھیں (ترمذی جلد دوم کتاب التفسیر)

خلاصہ کلام یہ کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ میں صرف اس امر کی تاکید نہیں کی گئی کہ یہ کلام سچا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ ریب کے معنوں پر نظر کرتے ہوئے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ (۱) اس میں کسی صداقت کا انکار نہیں ہے بلکہ سب صداقتوں کا اقرار کیا گیا ہے اور مذہب کے سب ضروری امور پر سے تہمتوں اور بدگمانیوں کو دور کیا گیا ہے (۲) اس میں کوئی ظنی اور شکی بات نہیں بلکہ ہر بات دلیل سے بیان کی گئی ہے (۳) یہ کلام محفوظ اور یقینی ہے اور ہمیشہ محفوظ رہیگا (۴) اس میں کوئی ایسا امر نہیں جو انسان کے لئے تکلیف اور تباہی کا موجب ہو (۵) اس میں سب ضروری امور بیان کر دئے گئے ہیں اور کوئی ایسا مذہبی اخلاقی تمدنی اقتصادی سیاسی وغیرہ مسئلہ نہیں جس کے بارہ میں اس میں مکمل تعلیم نہ دی گئی ہو۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے چار معنے

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ ان الفاظ میں یہ بتایا کہ (۱) قرآن کریم میں وصال الٰہی کی تڑپ پیدا کرنے کے سامان موجود ہیں یعنی ہر فطرت صحیحہ کو اس کی تلاوت کے ذریعہ سے وہ ضروری دھکا لگتا ہے جس کے بغیر والہانہ اور عاشقانہ قدم ارواح اپنے معشوقِ حقیقی کی طرف نہیں اٹھا سکتیں۔ صرف فلسفیانہ خیالات کا پیدا ہونا انسان کے لئے کافی نہیں ہوتا کیونکہ فلسفہ صرف خیالات کو درست کرتا ہے ایک ناقابل برداشت جذبہ اس سے پیدا نہیں ہوتا مگر عمل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ فطرۃ انسانی کو ایک ایسا دھکا لگے کہ وہ آپ ہی آپ آگے بڑھتی چلی جائے۔ خدمت اور ایثار پر فلسفی زبردست تقریر کر سکتا ہے ایک جاہل ماں اس کا لاکھواں حصہ بھی بیان نہیں کر سکتی لیکن اپنے بچہ کے لئے جس ایثار اور قربانی کا عملی نمونہ وہ دکھاتی ہے ایک فلسفی بنی نوع انسان کے لئے اس نمونہ کا لاکھواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ پس جب تک کوئی کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ نہ ہو یعنی جن لوگوں کے خیالات و افکار دلیل اور برہان سے پاک ہو چکے ہوں اُن کے اندر عشق اور محبت کی آگ نہ بھڑکا دے اور ایک طرف خدا تعالیٰ کی طرف محبت سے بڑھتے چلے جانے اور دوسری طرف مخلوق کی طرف شفقت سے جھکتے چلے جانے کا بے پناہ جذبہ نہ پیدا کر دے وہ دنیا کی عملی اصلاح میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور قرآن کریم هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ سے اسی مقصد کے پورا کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور بتاتا ہے

کہ اس کتاب کے مطالعہ سے انسانی فطرت کو وہ ابتدائی دھکا لگتا ہے جو اُسے عشق کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

دوسرے معنے ہدایت کے اس ارشاد کے ہوتے ہیں جو نبیوں کے ذریعہ سے انسانوں کو پہنچایا جاتا ہے۔ ان معنوں کے رُو سے اس جملہ کے معنے یہ ہوں گے کہ جو لوگ اس امر کے شائق ہیں کہ ان کو ان کے خالق و مالک کی طرف سے ہدایت ملتی رہے ان کی خواہش کے پورا کرنے کے بھی اس میں سامان موجود ہیں اور خواہ کسی درجہ کا متقی ہو اس کی راہنمائی کے لئے اس کتاب میں پاک اور مصفّٰی الٰہی تعلیم موجود ہے جس سے متقی کے دل کو یہ تسکین حاصل ہوتی ہے کہ وہ صرف اپنی عقل سے کام نہیں لے رہا۔ بلکہ اُسے خدا تعالےٰ کی بتائی ہوئی ہدایت حاصل ہے جس کی مدد سے وہ ہر قدم یقین اور اطمینان سے اٹھا سکتا ہے اور شک و شبہ کی زندگی سے پاک ہو جاتا ہے۔

تیسرے معنے ہدایت کے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے عمل کی مزید توفیق اور فکر کی بلندی کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس جملہ کے یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسی قوت ہے کہ جب اس کے کسی حکم پر انسان عمل کرے تو اسے مزید نیکیوں کی توفیق ملتی ہے اور اس کے خیالات میں جلا پیدا ہوتی ہے اور اس کا فکر اور اس کا حوصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور باریک در باریک تقویٰ کی راہیں اس پر کھولی جاتی ہیں گویا وہ ایک لامتناہی نیکی اور تقویٰ کی نہ ختم ہونے والی راہوں پر چل پڑتا ہے اور اس کی ترقیات کی کوئی انتہا مقرر نہیں کی جا سکتی۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ (محمد ع۲) یعنی جو لوگ ہدایت پا جائیں انہیں اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ سے ہدایت میں اور بھی بڑھاتا ہے اور ان کے مناسب حال تقویٰ انہیں عطا کرتا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے۔ کہ ہدایت اور تقویٰ کسی ایک مقام کا نام نہیں ہیں بلکہ ہدایت کے بھی مختلف مقامات ہیں اور تقویٰ کے بھی مختلف مقامات ہیں۔ قرآن کریم ہدایت یافتوں کو ان کے مقام سے اوپر کے مقام ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور پھر اس مقام کے مناسب حال تقویٰ کا مقام اس شخص کو دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ترقیات کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں وصال الٰہی کی تڑپ پیدا کرنے کے سامان

اسی طرح فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ع۷) یعنی جو لوگ ہماری محبت اور ہمارے وصال کے حصول کے لئے ہمارے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق (اس پر فینا کے الفاظ دلالت کرتے ہیں اور ان سے ایک مراد قرآن کریم ہے) جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم یکے بعد دیگر ان راستوں کا پتہ بتاتے چلے جاتے ہیں جو ہم تک پہنچنے والے ہیں۔ اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف ہدایت کے راستے محدود نہیں بلکہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا راستہ ہے۔

قرآن مجید میں ہر درجہ کے متقیوں کے لئے پاک اور مصفّٰی تعلیم

اسی طرح فرماتا ہے نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (التحریم ع۲) یہ آیت مابعد الموت زندگی کے متعلق ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کو جب آنحضرت صلعم اور مومن جنت کی طرف جائیں گے تو ان کے ایمان و عمل کے نتیجہ میں پیدا شدہ نور ان کے آگے ہوگا اور وہ یہ کہتے جائیں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہماری کمزوریوں کو ڈھانپ دے تو ہر شے پر قادر ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت صرف اسی دنیا میں نہیں بڑھتی بلکہ بعد الموت بھی ہدایت اور عرفان میں انسان ترقی کرے گا اور نئی طاقتیں اُسے ملتی جائیں گی۔ خلاصہ یہ کہ ہدایت کے لفظ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری آیات قرآنیہ اس کی موید ہیں کہ روحانی ترقیات غیر محدود ہیں اور قرآن کریم متقیوں کو ان اعلیٰ ترقیات کی طرف بڑھاتا لئے جاتا ہے۔

قرآن مجید کے ہر حکم پر عمل کرنے سے مزید نیکیوں کی توفیق ملتی ہے

چوتھے معنے ہدایت کے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم سے یہ ثابت ہیں کہ انجام بخیر اور جنت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان معنوں کے رُو سے اس جملہ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسی تعلیم ہے کہ جس کی امداد سے خدا ترس انسان اپنے منزل مقصود یعنی جنت کو حاصل کر لیتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دعویٰ سب مذاہب ہی کرتے ہیں اور بظاہر اس

مضمون میں کوئی جدّت یا افضلیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن جب ہم
قرآن کریم کو دیکھتے ہیں کہ اس میں جنت کے حصول کے کیا معنے
ہیں تو پھر یہ دعویٰ بالکل جدید اور نرالا ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم
میں لکھا ہے کہ جنت کے حصول کے یہ معنے نہیں کہ انسان مرنے
کے بعد جنت میں داخل ہو جائے بلکہ مرنے کے بعد کی جنت کا حصول
اس دنیا میں جنت کے حصول سے وابستہ ہے جسے اس دنیا میں جنت
مل جائے صرف اسی کو بعد الموت جنت ملے گی۔ چنانچہ فرماتا ہے
وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ع۳) یعنی جو
شخص تقویٰ کے سچے مقام پر ہوتا ہے اُسے دو جنتیں ملتی ہیں۔
ایک اس دنیا میں اور ایک اگلے جہان میں۔ اور ایک دوسری جگہ
فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ
اَعْمٰى (بنی اسرائیل ع۸) یعنی جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو یعنی
اُسے دیدار الٰہی نصیب نہ ہو وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا
اور دیدار الٰہی یا دوسرے الفاظ میں جنت سے محروم رہیگا۔

قرآن مجید پر عمل کرنے سے انسان منزل مقصود کو پالیتا ہے

قرآن کریم کی اس تشریح کو مدنظر رکھتے ہوئے جنت کے ملنے
کے معنے صرف یہ نہیں کہ مرنے کے بعد قرآن کریم کا مومن جنت
حاصل کرے گا کیونکہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل
نہیں۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم پر ایمان لانے والا
اور اس کی روشنی سے فائدہ اٹھانے والا شخص اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ
کے دیدار سے مشرف ہو جاتا ہے اور ایمان بالغیب اس کے لئے
ایمان بالمعاینہ ہو جاتا ہے۔ وہ صرف عقیدۃً اس امر کو نہیں
مانتا کہ اسے مرنے کے بعد جنت مل جائے گی بلکہ اسی دنیا میں
اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو اس کے لئے ظاہر کرتا ہے اور اپنے
وجود کو اس کے سامنے لے آتا ہے یہاں تک کہ وہ موت سے پہلے
ہی اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرنے لگتا ہے اور جسمانی موت
صرف اُس کے مشاہدہ کو زیادہ روشن کرنے کا موجب ہوتی ہے
ورنہ مشاہدہ اور دیدار الٰہی اُسے اسی دنیا میں میسر آجاتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم پر عمل کرنے سے جنت مل جانے کا مطلب۔

ظاہر ہے کہ یہ ایسا مقام ہے جس کے بعد کوئی بے چینی
اور شک باقی نہیں رہتا اور ایسا انسان ہر ٹھوکر اور ابتلاء سے
محفوظ ہو جاتا ہے اور گویا اسی دنیا میں خدا تعالیٰ کی گود میں جا
بیٹھتا ہے۔ پس قرآن کا مومنوں کو قرآن کریم کے ذریعہ سے جنت
ملنے کا دعویٰ کرنا محض ایک بے دلیل دعویٰ نہیں بلکہ وہ اسے
ایک ایسی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے جس کا جھوٹ اور سچ ابھی
دنیا میں آزمایا جا سکتا ہے۔ اور اسلام کی تاریخ سے معلوم ہوتا
ہے کہ اسلام میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں
جو اس دعویٰ کے لئے دلیل کے طور پر تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ کا
وصال اور دیدار کامل طور پر اسی دنیا میں حاصل ہو گیا اور اسی دنیا
میں جنت میں داخل ہو گئے۔ یعنی ہر قسم کے شیطانی حملوں سے
محفوظ ہو گئے اور ہر قسم کی روحانی نعمتوں سے متمتع ہوئے اور
اللہ تعالیٰ کے تازہ بتازہ کلام کو انہوں نے سُنا اور اس سے
بالمشافہ انہوں نے باتیں کیں اور اس کے زندہ نشانوں کو انہوں
نے اپنی ذات میں دیکھا اور دوسروں کے وجودوں میں انہیں دکھایا۔

آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ اس آیت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم
متقیوں کے لئے ہدایت ہے تو معلوم ہوا کہ متقی پیدا کرنے کیلئے
اور کسی کلام یا کتاب کی ضرورت ہے۔ سو یاد رہے کہ یہ اعتراض محض
قلّتِ تدبّر سے پیدا ہوا ہے کیونکہ قرآن کریم تقویٰ پیدا کرنے کا
بھی مدعی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ
عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ
التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (فتح ع۳) یعنے
اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اپنی کتاب پر ایمان لانے والوں پر
سکینت اور اطمینان نازل کیا اور اُن سے تقویٰ کی حقیقت کو
وابستہ کر دیا اور مومن بالقرآن ہی حقیقتِ تقویٰ کے مستحق اور
اس کے اہل ہیں۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم
کے ذریعہ سے اور اس پر ایمان لا کر انسان کو کامل تقویٰ میسر آتا
ہے بلکہ ایسا تقویٰ میسر آتا ہے جو دائمی ہوتا ہے۔ بلکہ اس آیت سے
ظاہر ہوتا ہے کہ تقویٰ کے اہل اور اس کے ساتھ حقیقی تعلق رکھنے
والے صرف مومنین قرآن ہیں۔

اس آیت کی موجودگی میں یہ اعتراض کرنا کہ گویا قرآن کریم
صرف متقیوں کو ہدایت دینے کا دعویدار ہے تقویٰ پیدا کرنے کا
دعویٰ نہیں کرتا بالبداہت باطل ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم

تو اس امر کا مدعی ہے کہ حقیقی تقویٰ صرف قرآن کریم پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اس آیت کے علاوہ قرآن کریم کی اور بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف متقیوں کے لئے ہدایت نہیں بلکہ سب بنی نوع انسان کے لئے ہدایت ہے خواہ وہ روحانی زندگی میں اعلیٰ مقام پر ہوں یا ادنیٰ پر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى (آل عمران ع۱۴) یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ضروری امور بیان کرتا ہے اور انہیں ہدایت دیتا ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآنی ہدایت صرف متقیوں کیلئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ قرآن کریم میں ہے هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى (البقرہ ع۲۳) یعنی قرآن کریم سب انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی تمام اقسام بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (الکہف ع۸) یعنی اس قرآن میں تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے خواہ متقی ہوں یا غیر متقی ہر بات اعلیٰ سے اعلیٰ پیرایہ میں بیان کر دی گئی ہے یعنی ہر انسان کی حالت کے مطابق اس میں ایسی تعلیم ہے جو اسے اوپر کے درجہ کی طرف لے جاتی ہے اور اس کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (الروم ع۶) اس آیت کے بھی قریباً وہی معنے ہیں جو اوپر کی آیت کے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں صَرَّفْنَا کہا گیا تھا یہاں ضَرَبْنَا کہا گیا ہے۔ اور صَرَّفْنَا میں اس امر پر زور ہے کہ مختلف پیرایوں سے اس ہدایت کو بیان کیا ہے۔ اور ضَرَبْنَا میں اس امر پر زور ہے کہ فطرت کی صحیح مثالوں اور واضح نمونوں کے مقابل پر رکھ رکھ کر ہدایت کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا (بنی اسرائیل ع۵) یعنی قرآن کریم میں تمام ضروری امور ہدایت مختلف پیرایوں میں بیان کئے گئے ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ اس جگہ بھی متقیوں یا مومنوں کے لئے ہدایت کو مخصوص نہیں کیا گیا بلکہ تمام انسانوں کے لئے اسے پیش کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کی راہیں بھی قرآن کریم نے تمام انسانوں کے لئے بیان کی ہیں چنانچہ فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ع۳) یعنی اے انسانو (نہ کہ مومنو یا مسلمانو) اپنے اس رب کی جس نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا کیا ہے عبادت کرو تاکہ تم متقی بنو۔ اسی طرح فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (طٰہٰ ع۶) یعنی قرآن کریم کو ہم نے عربی زبان میں اتارا ہے اور اس میں تمام عذاب کی خبریں بھی بیان کی گئی ہیں تاکہ جو مومن نہیں وہ بھی متقی ہو جائیں۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم کافروں کو بھی متقی بناتا ہے۔

قرآن کریم سب بنی نوع انسان کے لئے ہدایت ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر اس جگہ یہ کیوں فرمایا کہ قرآن کریم متقیوں کے لئے ہدایت ہے یہ کیوں نہ فرمایا کہ قرآن کریم تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ قرآن کریم کی افضلیت کا ذکر ہے یعنی یہ بیان ہے کہ دوسری کتب کی موجودگی میں اس کتاب کی کیا ضرورت ہے۔ پس اس مضمون کے لحاظ سے ان اعلیٰ مقامات کے حصول کا ذکر ہی مناسب اور درست تھا جن میں قرآن کریم منفرد ہے اور جس میں اس کا مقابلہ کرنے کا دوسرے مذاہب کو دعویٰ تک بھی نہیں۔

اس جواب کے علاوہ اس اعتراض کا ایک اور بھی جواب ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں تقویٰ کی ایک اور بھی تعریف بیان کی گئی ہے اور اس تعریف کے رُو سے تقویٰ کا تعلق انسانی فطرت سے ہے نہ کہ مذہب سے۔ چنانچہ سورہ شمس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ ہر انسان کو اس کی پیدائش کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک امتیازی قابلیت بخشی ہے جس کے ذریعہ سے وہ بُرے اور بھلے میں تمیز کرتا ہے۔ یہ قابلیت مسلمان یا غیر مسلمان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی بلکہ ہر انسان میں پیدا کی گئی ہے۔ پس اس تعریف کے مطابق تقوےٰ کے

معنے فطرت کی حفاظت کے ہیں نہ کہ کسی خاص مذہب یا عقیدہ کے۔
اور یہ ظاہر ہے کہ ہدایت وہی لوگ پا سکتے ہیں جو فطرۃ کو گندے
اثرات سے پاک رکھتے ہیں ورنہ جو لوگ فطرت کو پاک رکھنے کی
کوشش نہیں کرتے اور صداقت کے ماننے سے انکار کرتے ہیں وہ
ہدایت نہیں پا سکتے ان کو ہدایت تبھی مل سکتی ہے جب جبر سے کام
لیا جائے۔ اور قرآن کریم جبر کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ کہ اوپر کی تعریف کے رُو سے اس آیت کے
یہ معنے ہوتے ہیں کہ جو لوگ صداقت کو قبول کرنے کیلئے تیار
ہوں قرآن کریم ان کو ہدایت دیتا ہے اور اعلیٰ مدارج تک
پہنچاتا ہے۔ اور جو لوگ ہدایت کو ماننے کیلئے تیار ہی نہ ہوں
وہ گویا اپنی ہلاکت کا خود ہی فیصلہ کر دیتے ہیں اور انہیں ہدایت
جبر ہی سے دی جا سکتی ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جبر سے
جو ہدایت ملے اس کا فائدہ جبر کرنے والے کو حاصل ہو سکتا ہے
اسے نہیں ہو سکتا جسے ہدایت دیجائے۔ جیسے مثلاً کسی سے زبردستی
مال چھین کر صدقہ کر دیا جائے تو اس صدقہ کا کوئی فائدہ اُسے
نہیں مل سکتا جو صدقہ کا قائل ہی نہیں اور صدقہ دینا ہی
نہیں چاہتا۔

ہر شئے کی تکمیل کے لئے چار علل کی تکمیل اور ان کا بیان قرآن مجید میں

دوسری کتب کی موجودگی میں قرآن مجید کی ضرورت

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں دوسری کتب کی موجودگی
میں قرآن کریم کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ غیر
الہامی کتب کی موجودگی میں تو اس کی یہ ضرورت ہے کہ بغیر آسمانی
ہدایت کے انسان ہدایت پا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آسمانی
ہدایت کی ضرورت تھی جسے قرآن کریم نے پورا کیا ہے اور الہامی کتب
کی موجودگی میں اس کی یہ ضرورت ہے کہ (۱) اس سے پہلے سب
ہدایت نامے نامکمل تھے یہ مکمل ہے (۲) ان میں خرابیاں پیدا ہو
گئی ہیں اور یہ سب خرابیوں سے محفوظ ہے (۳) وہ سب ہدایت نامے
ایک ایک قوم اور مذہب کے لئے تھے اور یہ ہدایت نامہ سب قوموں
کے لئے ہے اور سب قوموں کے بزرگوں کی عزت قائم کرنے اور
سب ضائع شدہ ہدایتوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہے (۴) ان کتب
میں بوجہ اندرونی بیرونی نقائص کے وصال الٰہی پیدا کرنیکی خاصیت
باقی نہ رہی تھی اب اسکے ذریعہ سے پھر انسان کو وصال الٰہی حاصل
کرنے اور کلام الٰہی سے مشرف ہونے کا موقعہ دیا جائے گا۔
وغیرہا وغیرہا۔

اس چھوٹی سی آیت میں اس قدر وسیع مطالب کا بیان
ہونا قرآن کریم کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے جس کی مثال پیش
کرنے سے دوسری کتب قاصر ہیں۔

مذکورہ بالا مضمون بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کے بتائے
ہوئے مطالب کی روشنی اور ہدایت میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن بطور
مثال میں ان بے شمار مطالب سے جو ان کی کتب میں پائے جاتے
ہیں ایک نکتہ براہِ راست بھی ان کی طرف سے اس جگہ بیان کر
دیتا ہوں۔ تا معلوم ہو کہ کس طرح انہوں نے اس آیت کے عمیق
سمندر میں سے روحانیت کے موتی نکالے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ
ہر شے کی تکمیل کے لئے چار علل کی تکمیل ضروری ہوتی ہے یعنی
(۱) اسکے بنانیوالا کامل ہو (۲) وہ جس مادہ سے بنائی جائے وہ اعلیٰ ہو (۳) اسکی
شکل وصورت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو (۴) جو نتیجہ اس سے پیدا ہو وہ بھی اعلیٰ
درجہ کا ہو۔ گویا علت فاعلی علت مادی علت صوری اور علت
غائی۔ ان چار علتوں کے کمال سے کوئی چیز مکمل ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے ابتدائے قرآن میں ہی اسکے حق میں چاروں
علتوں کے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ الٓمّٓ جس کے معنے
ہیں کہ میں اللہ سب سے زیادہ جانتا ہوں علت فاعلی کے
مکمل ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا بنانے والا اعلم میں
کامل ہے اور سب سے افضل ہے۔ پس ایسی علیم ہستی جس کتاب کو
بنائیگی یقیناً وہ ان تمام کتب سے افضل ہوگی جو ادنیٰ علم والی ہستیوں
کی طرف سے تیار کی جائیں گی۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ یعنی یہی
کامل کتاب ہے قرآن کریم کی علت مادی کے مکمل ہونے پر
دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام اعلیٰ اور ضروری مطالب
اس کتاب میں موجود ہیں پس اس کا مادہ بھی دوسری کتب کے
مادہ سے اعلیٰ اور مکمل ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ کہہ کر یہ بتایا کہ
قرآن کریم اپنی بے مثل فصیح زبان اور غیر معمولی حفاظت کی
وجہ سے اپنی ظاہری شکل میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا اور
محفوظ کلام ہے۔ پس اس کی علت صوری بھی تمام دوسری کتب

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ

(ان متقیوں کو) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا

جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۵۴ اور جو اس پر جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے

ے مکمل اور اعلیٰ ہے۔ پھر ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہہ کر بتایا کہ دوسری کتب تو صرف متقی کے درجہ تک پہنچاتی ہیں مگر یہ کتاب متقیوں کو بلند مقامات پر لے جا کر اللہ تعالیٰ سے مکالمہ مخاطبہ کا شرف دلواتی ہے اور اس سے کامل اتحاد پیدا کر دیتی ہے پس اس کی علت غائی بھی دوسری کتب سے افضل اور اکمل ہے۔

یہ خلاصہ ہے بانی سلسلہ احمدیہ کی ایک تحریر کا اور جو صاحب بصیرت اس پر غور کرے گا وہ ان سب مطالب کو جو اوپر بیان ہوئے ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور مطالب بھی اس لطیف تفسیر میں مخفی پائیگا

۵۴ حل لغات ۔ يُؤْمِنُوْنَ ۔ اٰمَنَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اٰمَنَہٗ اِیْمَانًا کے معنے ہیں اٰمَنَہٗ: اس کو امن دیا اور جب اس کا صلہ حرف باء ہو یعنی اٰمَنَ بِہٖ کہیں تو معنے ہونگے صَدَّقَہٗ وَوَثِقَ بِہٖ ۔ اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا اور جب اٰمَنَ کے بعد لام صلہ ہو یعنی اٰمَنَ لَہٗ کہیں تو اس کے معنے ہونگے خَضَعَ وَ انْقَادَ: یعنی فرمانبرداری اختیار کی۔ مطیع ہو گیا اور کہنا مان لیا (اقرب) اَلْاِیْمَانُ: اَلتَّصْدِیْقُ۔ ایمان جو اٰمَنَ کا مصدر ہے اس کے معنے تصدیق کرنے کے ہیں (اقرب) تاج العروس میں ہے۔ اَلْاِیْمَانُ یَتَعَدّٰی بِنَفْسِہٖ کَصَدَّقَ وَبِاللَّامِ بِاعْتِبَارِ مَعْنَی الْاِذْعَانِ وَبِالْبَاءِ بِاعْتِبَارِ مَعْنَی الْاِعْتِرَافِ اِشَارَۃً اِلٰی اَنَّ التَّصْدِیْقَ لَا یُعْتَبَرُ بِدُوْنِ اِعْتِرَافٍ ۔ کہ لفظ ایمان کبھی بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا صلہ لام آتا ہے اور اس میں اذعان یعنی فرمانبرداری کے معنے ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور جب باء کے صلہ کے ساتھ استعمال ہو تو اس وقت اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ ایمان کے معنے تصدیق کے ہیں اور تصدیق کے ساتھ اعتراف بھی ہوتا ہے اس لئے اس کو اعتراف کے معنے میں استعمال کر لیتے ہیں۔ پس یُؤْمِنُوْنَ کے تین معنے ہوں گے (۱) تصدیق کرتے ہیں (۲) اعتراف کرتے ہیں (۳) پختہ یقین اور اعتماد رکھتے ہیں۔

الغیب اَلْغَیْبُ :۔ غَابَ (یَغِیْبُ) کا مصدر ہے کہتے ہیں غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَیْرُھَا: اِذَا اسْتَتَرَتْ عَنِ الْعَیْنِ یعنی غاب کا لفظ سورج اور دیگر اشیاء کے لئے اس وقت بولتے ہیں جبکہ سورج اور دوسری چیزیں آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں وَاسْتُعْمِلَ فِیْ کُلِّ غَائِبٍ عَنِ الْحَاسَّۃِ وَعَمَّا یَغِیْبُ عَنْ عِلْمِ الْاِنْسَانِ بِمَعْنَی الْغَائِبِ۔ جس کا علم حواس ظاہری سے حاصل نہ ہو سکے یا جس کا علم انسان کو نہ ہو اُسے غائب کہتے ہیں۔ وَالْغَیْبُ فِیْ قَوْلِہٖ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ مَا لَا یَقَعُ تَحْتَ الْحَوَاسِّ وَلَا تَقْتَضِیْہِ بَدَایَۃُ الْعُقُوْلِ اور آیت یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو حواس ظاہری سے معلوم نہ کی جا سکے اور سرسری نظر میں انسانی عقلیں اس تک نہ پہنچ سکیں (مفردات) لسان میں ہے وَقَوْلُہٗ تَعَالٰی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ اَیْ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا غَابَ عَنْھُمْ کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں غیب کے یہ معنے ہیں کہ جو باتیں ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اُن پر ایمان لاتے ہیں۔ وَالْغَیْبُ مَا غَابَ عَنِ الْعُیُوْنِ وَاِنْ کَانَ مُحَصَّلًا فِی الْقُلُوْبِ اَوْ غَیْرَ مُحَصَّلٍ اور غیب کا لفظ ہر اس امر پر بولا جاتا ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہو خواہ وہ ایسا امر ہو کہ دماغی طور پر اس کا علم حاصل ہو یا ایسا ہو کہ عقلاً بھی اس کا علم حاصل ہو کُلُّ مَکَانٍ لَا یُدْرٰی مَا فِیْہِ فَھُوَ غَیْبٌ۔ ہر وہ جگہ جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس کے اندر کیا ہے اس کو غیب کہتے ہیں۔ وَکَذٰلِکَ الْمَوْضِعُ الَّذِیْ لَا یُدْرٰی مَا وَرَاءَہٗ۔ اور اسی طرح اس جگہ پر بھی غیب کا لفظ بولتے ہیں جس کے پیچھے کی

یُؤْمِنُوْنَ

اشیاء کا علم نہ ہو۔ نیز کہتے ہیں غَابَ الرَّجُلُ غَیْبًا اَیْ سَافَرَ اَوْبَانَ۔ کہ فلاں شخص نے سفر کیا یا کسی سے جدا ہوگیا۔ پس غیب ہر وہ امر ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہو نہ یہ کہ وہ موہوم اور بے ثبوت ہو۔ پس یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے معنے ہوں گے (۱) ہر وہ چیز (امر) جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور ظاہری حواس اُسے پانے سے قاصر ہیں لیکن وہ موجود ہے اور ایمانیات میں داخل ہے اس کے حق ہونے پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں (۲) اس زندگی کے بعد کے پیش آنے والے حالات پر پختہ یقین رکھتے ہیں (۳) نیز اس کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ وہ غیبوبت کی حالت میں یعنی علیحدگی میں بھی ایمان رکھتے ہیں اور ان میں منافقوں کی طرح دو رنگی نہیں پائی جاتی۔

الصلوٰۃ

یُقِیْمُوْنَ

یُقِیْمُوْنَ:- اَقَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور قَامَ سے جو اس کا مجرد ہے بنا ہے۔ قِیَامٌ (کھڑا ہونا) کا لفظ جُلُوْسٌ (بیٹھ جانے) کا نقیض ہے۔ کہتے ہیں قَامَ الْاَمْرُ۔ اِعْتَدَلَ معاملہ درست ہوگیا۔ قَامَ عَلَى الْاَمْرِ: دَامَ وَثَبَتَ۔ یعنی کسی چیز پر دوام و ثبات اختیار کیا۔ قَامَ الْحَقُّ ظَهَرَ وَثَبَتَ حق ظاہر اور ثابت ہوگیا۔ اور اَقَامَ السُّوْقَ کے معنے ہیں نَفَقَتْ بازار بارونق ہوگیا۔ اور اَقَامَ الصَّلٰوةَ کے معنے ہیں اَدَامَ فِعْلَهَا نماز پر دوام اختیار کیا۔ اَقَامَ لِلصَّلٰوةِ کے معنے ہیں نَادٰى لَهَا نماز کے لئے تکبیر کہی۔ اَقَامَ اللّٰهُ السُّوْقَ: جَعَلَهَا نَافِقَةً اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور بازار کو بارونق بنا دیا (اقرب) مفردات میں ہے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اَیْ یُدِیْمُوْنَ فِعْلَهَا وَیُحَافِظُوْنَ عَلَیْهَا۔ نماز کو اس کی شرائط کے مطابق ادا کرتے ہیں اور اس پر دوام اختیار کرتے ہیں۔ نیز لکھا ہے اِنَّمَا خُصَّ لَفْظُ الْاِقَامَةِ تَنْبِیْهًا اَنَّ الْمَقْصُوْدَ مِنْ فِعْلِهَا تَوْفِیَةُ حُقُوْقِهَا وَشَرَائِطِهَا۔ کہ صلوٰۃ کے ذکر کے ساتھ اقامت کا لفظ اس لئے لایا گیا ہے تاکہ اس طرف توجہ مبذول کرائی جائے کہ نماز کے حقوق اور شرائط کو پوری طرح ادا کیا جائے نہ کہ صرف ظاہری صورت میں اس کو ادا کر دیا جائے۔ لسان میں اَلْقِیَامُ کے معنے اَلْعَزْمُ کے بھی لکھے ہیں یعنی کسی چیز کا پختہ ارادہ کر لینا۔

اَلصَّلٰوةُ:- صَلّٰى سے مشتق ہے اور اس کا وزن فَعْلَةٌ ہے الف واؤ سے منقلب ہے۔ صَلّٰى (یُصَلِّیْ) کے معنے دعا کرنے کے ہیں اور اَلصَّلٰوةُ کے اصطلاحی معنے عِبَادَةٌ فِیْهَا رُکُوْعٌ وَّسُجُوْدٌ کے ہیں یعنی اس مخصوص طریق سے دعا کرنا جس میں رکوع و سجود ہوتے ہیں جس کو ہماری زبان میں نماز کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی کئی معانی ہیں جو بے تعلق نہیں بلکہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں چنانچہ اس کے دوسرے معنے مندرجہ ذیل ہیں اَلرَّحْمَةُ۔ رحمت۔ اَلدِّیْنُ۔ شریعت۔ اَلْاِسْتِغْفَارُ بخشش مانگنا۔ اَلدُّعَاءُ دعا (اقرب) اَلتَّعْظِیْمُ۔ بڑائی کا اظہار۔ اَلْبَرَکَةُ۔ برکت (تاج) وَالصَّلٰوةُ مِنَ اللّٰهِ الرَّحْمَةُ وَمِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ الْاِسْتِغْفَارُ وَمِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الدُّعَاءُ وَمِنَ الطَّیْرِ وَالْهَوَامِّ التَّسْبِیْحُ۔ اور صلوٰۃ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے رحم کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کیلئے استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنے استغفار کے ہوتے ہیں اور جب مومنوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے دعا یا نماز کے ہوتے ہیں اور جب پرندوں اور حشرات کیلئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے تسبیح کرنے کے ہوتے ہیں۔ وَهِیَ لَا تَكُوْنُ اِلَّا فِی الْخَیْرِ بِخِلَافِ الدُّعَاءِ فَاِنَّهٗ یَكُوْنُ فِی الْخَیْرِ وَالشَّرِّ۔ اور لفظ صلوٰۃ صرف نیک دُعا کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن لفظ دُعا، بد دُعا اور نیک دُعا دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ صلوٰۃ کے ایک معنے حُسْنُ الثَّنَاءِ مِنَ اللّٰهِ عَلَى الرَّسُوْلِ کے بھی ہیں یعنی جب صَلّٰى فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو اور مفعول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہو تو اس وقت اس کے معنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم کی بہترین تعریف کے ہوتے ہیں (اقرب) وَیُسَمّٰى مَوْضِعُ الْعِبَادَةِ الصَّلٰوةَ اور عبادت گاہ کو بھی الصَّلٰوة کہہ دیتے ہیں (مفردات) پس یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کے معنے ہونگے (۱) نماز کو باجماعت ادا کرتے ہیں (۲) نماز کو اس کی شرائط کے مطابق اور اس کے اوقات میں صحیح طور پر ادا کرتے ہیں (۳) لوگوں کو نماز کی تعیین کرکے مساجد کو بارونق بناتے ہیں (۴) نماز کی محبت اور خواہش لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں (۵) نماز پر دوام اختیار کرتے ہیں اور اس پر پابندی اختیار

کرتے ہیں (۶) نماز کو قائم رکھتے ہیں یعنے گرنے سے بچاتے رہتے اور اس کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں۔

رَزَقْنَا:۔ رَزَقَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور اَلرِّزْقُ (جو رَزَقَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلْعَطَاءُ۔ عطا کرنا۔ دینا۔ جیسے کہتے ہیں رُزِقْتُ عِلْمًا کہ مجھے علم دیا گیا ہے۔ اور اس کے ایک معنی حصہ کے بھی ہیں جیسے تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (الواقعہ) کہ تم نے اپنے ذمہ یہ کام لگا لیا ہے کہ رسول اور خدا کی باتوں کا انکار کرتے ہو (مفردات) اقرب الموارد میں ہے اَلرِّزْقُ۔ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ ہر وہ چیز جس سے نفع اُٹھایا جائے۔ اور رَزَقَهُ اللّٰهُ (يَرْزُقُ) رِزْقًا کے معنے ہیں اَوْصَلَ اِلَيْهِ رِزْقًا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسی اشیاء عطا فرمائیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ رزق اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو غذا کے طور پر استعمال کی جائے (مفردات)

يُنْفِقُوْنَ:۔ اَنْفَقَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَنْفَقَ مَالَهٗ کے معنے ہیں صَرَفَهٗ وَاَنْفَدَهٗ۔ مال کو خرچ کرتا رہا اور اس کو ختم کر دیا۔ اِنْفَاق کے اصل معنے کسی چیز کو مقبول اور ہاتھوں ہاتھ بک جانے والا بنا دینے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں اَنْفَقَ التَّاجِرُ: نَفَقَتْ تِجَارَتُهٗ کہ تاجر کی تجارت خوب چل پڑی اور سامان تجارت مقبول ہو کر فروخت ہونے لگا۔ اور اَنْفَقَ السِّلْعَةَ کے معنے ہیں رَوَّجَهَا۔ سامان کو ایسا بنا دیا کہ ہاتھوں ہاتھ بک جائے چنانچہ جب کسی سامان تجارت کے گاہک زیادہ ہوں یا کسی عورت کی شادی کے خواہشمند زیادہ تعداد میں ہوں تو نفق کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں نَفَقَتِ الْمَرْأَةُ وَالسِّلْعَةُ اَیْ كَثُرَ طُلَّابُهَا وَخُطَّابُهَا یعنی اس عورت یا مال کے بہت سے خواہش کرنے والے یا طالب پیدا ہو گئے ہیں اور اَلنَّافِقُ اس مال کو کہتے ہیں جو بازار میں جاتے ہی بک جائے (اقرب) پس مادہ کے لحاظ سے اس کے معنے نکلنے اور جاری کرنے اور مسلسل طور پر مال کو خرچ کرنے کے ہیں۔

تفسیر۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے ایمان کے معنے یقین رکھنے اور فرمانبرداری کرنے کے ہوتے ہیں۔ جس کو یقین نہ ہو مومن نہیں کہلا سکتا بلکہ منافق کہلاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ ع۲ آیت ۹ میں فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ دل سے اس امر کو نہیں مانتے۔ اسی طرح قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جن میں یقین ہو اور اطاعت نہ ہو وہ بھی مومن نہیں بلکہ کافر کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النمل ع آیت ۱۵ میں فرمایا وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا۔ یعنی وہ اس کا انکار ظلم اور دشمنی سے کرتے ہیں حالانکہ اُن کے دل اس پر یقین رکھتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے یہ معنے ہرگز نہیں کہ اندھا دھند مان لیتے ہیں۔ یہ معنے نہ زبان عرب کے رُو سے درست ہیں اور نہ قرآن کریم ہی ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ بے دلیل ماننے والوں کو قرآن نے بار بار الزام دیا ہے۔ جیسے کہ سورۃ النجم ع آیت ۲۴ میں فرمایا۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ۔ یعنی یہ تو چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود ہی رکھ دئے ہیں خدا تعالےٰ نے اس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی۔ یہ لوگ صرف اپنے وہموں کی یا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم دشمنان اسلام پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ بے دلیل باتوں کو جن کے لئے نہ آسمانی دلیل ہوتی ہے نہ عقلی، مانتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور وہمی باتوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ پس جبکہ اللہ تعالےٰ وہمی باتوں کے ماننے کو قابل اعتراض قرار دیتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن کریم کی ابتدا ہی میں وہ مسلمانوں کو بے دلیل باتوں کے ماننے کا حکم دے اور اس امر کو تقویٰ کا جزو قرار دے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ایمان دلائل اور براہین پر مبنی ہونا چاہیئے نہ کہ وہم اور گمان پر۔ چنانچہ سورۃ احقاف ع میں فرماتا ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ

رَزَقْنَا

۱ يُنفِقون

۲ یومنون بالغیب کے معنے اندھا دھند مان لینے کے نہیں

شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یعنی مجھے بتاؤ تو سہی کہ خدا کے سوا جن وجودوں کو تم پکارتے ہو کیا ان میں کوئی حقیقت بھی ہے اگر ہے تو مجھے ذرا بتاؤ تو کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے یا یہ تو ثابت کرو کہ آسمانی بادشاہت میں اُن کا کوئی حصہ ہے اور اگر تم سچے ہو تو اس کے لئے یا تو قرآن سے پہلے کی کسی آسمانی کتاب میں سے دلیل پیش کرو یا اپنے باپ دادوں کی بتائی ہوئی کسی علمی بات کو ہی پیش کرو۔ یعنی تمام شرکیہ مسائل نہ تو کسی آسمانی کتاب سے ثابت ہیں نہ کسی علمی دلیل سے ثابت ہو سکتے ہیں پھر ان پر ایمان لانا کس طرح جائز اور ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (روم ع۴) یعنی کیا اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے کی کوئی بھی دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہیا کی ہو اور وہ شرک کی صداقت پر گواہ ہو اگر ایسا نہیں تو پھر بے دلیل بات کو یہ لوگ کس طرح مان رہے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (انعام ع۱۸ آیت ۱۴۹، ۱۵۰) یعنی کفار سے کہدو کہ کیا تمہارے پاس اپنے دعاوی کی کوئی علمی دلیل بھی ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کر سکو تمہارے پاس ہرگز ایسی کوئی دلیل نہیں بلکہ تم تو صرف وہم کی پیروی کرتے ہو اور صرف ڈھکوسلے مارتے ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول ان سے یہ بھی کہو کہ اللہ تعالیٰ تو وہ باتیں اپنے بندوں سے منواتا ہے جن کے دلائل مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں۔ پس جو بات بے ثبوت ہو وہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید سے کسی بات کے بلا دلیل ماننے کا رد

اسی طرح مومنوں کی نسبت قرآن کریم میں فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (فرقان ع۶) یعنی مومنوں کے سامنے جب اُن کے رب کی آیات بیان کی جاتی ہیں تو وہ انہیں اندھا دھند نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھکر اور دلائل کے ساتھ مانتے ہیں۔ نیز فرماتا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ع۱۲) اے ہمارے رسول اپنے منکروں سے کہدو کہ میرا راستہ مذکورہ بالا راستہ ہے میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں اور میں اور میرے متبع کسی بے دلیل بات کو نہیں مانتے بلکہ ہم سوچ سمجھ کر اور دلائل قطعیہ کی بناء پر جو شک وشبہ سے بالا ہوتے ہیں ایمان لاتے ہیں۔

آیت یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے ریورنڈ ویری کا ایک غلط استدلال

قرآن کریم میں غیب کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوا ہے ان سے بھی ثابت ہے کہ اس سے مراد وہمی امور نہیں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حجرات ع۲) اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے غیب کو جانتا ہے اس جگہ غیب کا لفظ حقیقت کے لئے بولا گیا ہے۔ کیونکہ اگر غیب کے معنے محض وہمی اور بے دلیل باتوں کے ہوں تو اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ بے دلیل اور وہمی باتوں کو جانتا ہے اور یہ ترجمہ بالبداہت غلط ہے اسی طرح فرماتا ہے ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (سجدہ) یعنی خدا ہی غیب اور ظاہر کو جانتا ہے اس آیت میں غیب کا لفظ یقینی مگر نظروں سے پوشیدہ امور کے لئے بولا گیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (انعام ع۷) اللہ تعالیٰ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ غیب وہمی باتوں کا نام نہیں بلکہ ان تمام مخفی خزانوں کا نام ہے جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے یہ معنے ہرگز نہیں کہ متقی وہ ہیں جو بغیر دلیل کے قرآن کریم کی باتوں کو مان لیتے ہیں کیونکہ یہ معنے قرآن کریم کی دوسری آیات کے خلاف ہیں۔

ریورنڈ ویری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے نیچے لکھا ہے کہ جب مسلمان اپنی کتاب کے اسرار کو مانتے ہیں تو کیوں پہلی کتابوں کے اسرار کو جیسے کہ تثلیث یا کفارہ ہیں نہیں مانتے۔ مگر جیسا کہ ظاہر ہے یہ اعتراض يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے معنوں کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ قرآن کریم کسی ایسے امر کو ماننے کی تلقین نہیں کرتا جو بے دلیل ہو بلکہ وہ تو ان دوسرے مذاہب پر جو بے دلیل باتیں مانتے ہیں اعتراض کرتا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے متبعین کی نسبت گواہی دیتا ہے کہ وہ ہر امر کو دلیل اور برہان سے مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کفارہ اور تثلیث کا اس لئے انکار نہیں کرتے کہ وہ اسرار میں سے ہیں بلکہ اس لئے کہ

یہ مسائل بے دلیل بلکہ خلاف عقل ہیں اگر ان کی کوئی دلیل ہوتی تو ان کے ماننے سے مسلمانوں کو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے کیا معنے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے غیب کے معنے ان امور کے ہیں جو حواس ظاہری سے معلوم نہ ہو سکیں بلکہ ان کے ثابت کرنے کے لئے عقلی و تجرباتی دلائل کی ضرورت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے امور بے دلیل نہیں کہلا سکتے۔ ہم ہزاروں اشیاء کو جو جسمانی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں مانتے ہیں حالانکہ حواس خمسہ سے ان کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انسانی حافظہ ہے اس کا کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو قوت حافظہ کو دیکھ سکے یا سونگھ سکے یا چکھ سکے یا سُن سکے یا چھو سکے۔ اسی طرح شرم ہے جرأت ہے، محبت ہے، نفرت ہے، خود عقل اور فکر کی قوتیں ہیں ان کو کونسا شخص حواس خمسہ سے معلوم کر سکتا ہے۔ مگر کیا اس وجہ سے کہ ان کا علم حواس خمسہ سے نہیں ہوتا ان کا انکار کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کئی اخلاقی مسائل ہیں جو حواس خمسہ سے معلوم نہیں ہو سکتے لیکن ہم ان پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت کہ عفو بالعموم دلوں سے بُغض کو دُور کرتا ہے حُسن سلوک مختلف انسانوں کو آپس میں رشتہ محبت سے جوڑ دیتا ہے سب دنیا کی تسلیم کردہ ہے مگر اس کو حواس خمسہ سے تو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ماں اپنے بچہ سے حُسن سلوک کرتی ہے لیکن وہ نہیں جانتی کہ اس حُسن سلوک کے نتیجہ میں جو محبت پیدا ہوگی وہ اس کا کوئی مزہ بھی چکھ سکے گی یا نہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ محبت کرتی جاتی ہے۔ ایک استاد شاگردوں کو پڑھاتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کی تعلیم کے نتیجہ میں اس کے طلباء کسی اعلیٰ درجہ کو پہنچیں گے یا نہیں مگر وہ پڑھانے سے باز نہیں رہتا۔ حکومتیں ملک کی حالت سُدھارنے کے لئے ہزاروں جتن کرتی ہیں اور نہیں جانتیں کہ ان کے خوشگوار نتائج کب اور کس شکل میں پیدا ہوں گے مگر وہ آئندہ کی امید پر اور سابقہ تجربہ کی بناء پر اپنی کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔ سپاہی نہیں جانتے کہ جنگ کا کیا نتیجہ نکلیگا لیکن اپنے ملک کی حفاظت میں جانیں دیتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب ایمان بالغیب ہی ہوتا ہے یا کچھ اور؟

ایمان بالغیب سے مراد

خلاصہ یہ کہ ایمان بالغیب سے مراد (۱) ان سب صداقتوں پر ایمان لانا ہے جو حواس خمسہ سے معلوم نہیں کی جا سکتیں بلکہ ان کا ثبوت اور ذرائع سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ اُسے حواس خمسہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے جاننے کے اور دلائل ہیں۔ اور وہ دلائل ایسے یقینی اور قطعی ہیں کہ ظاہری حواس سے معلوم کی ہوئی باتوں سے کم نہیں بلکہ زیادہ یقین کے مقام پر انسان کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا کلام ہے جسے مومن سنتے ہیں اور اس کے بتلائے ہوئے علوم غیبیہ ہیں جنہیں مومن پورا ہوتے دیکھتے ہیں اور اس کی زبردست قدرتیں ہیں جن کا ظہور مومن اپنے نفوس اور باقی دنیا میں دیکھتے ہیں مگر باوجود ان باتوں کے خدا تعالیٰ کی ہستی وراء الوراء ہے وہ حواس خمسہ سے محسوس نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح ملائکہ کا وجود ہے۔ ملائکہ ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتے نہ دوسرے حواس ظاہری سے معلوم کئے جا سکتے ہیں لیکن باوجود اس کے اُن کا وجود وہمی نہیں ہے بلکہ ان کے وجود پر قطعی دلائل ہیں جو قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر بیان کئے گئے ہیں۔ یا مثلاً ایک غیب موت کے بعد کی زندگی ہے قرآن کریم اس پر بے دلیل ایمان لانے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے سچے ہونے پر زبردست دلائل دیتا ہے جو آئندہ مختلف مواقع پر بیان کئے جائیں گے۔

(۲) یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے یہ معنے بھی ہیں کہ متقی صرف ایسے کام نہیں کرتے کہ جن کے نتائج نقد بہ نقد مل جاتے ہیں جیسے کہ تاجر سودا فروخت کرتا ہے اور اس کی قیمت وصول کر لیتا ہے۔ بلکہ ان کی زندگی اخلاقی زندگی ہوتی ہے اور وہ اخلاق کی قوت اور ان کے نیک نتائج پر ایمان رکھتے ہیں اور تاجرانہ ذہنیت کو ترک کر کے ایسی قربانیاں کرتے ہیں کہ جو آخر میں اُن کی قوم کو اور باقی دنیا کو اُبھار دیتی ہیں۔ مثلاً دنیا میں امن کے قیام کے لئے جہاد کا کرنا ایمان بالغیب کا ہی نتیجہ ہے۔ ورنہ کون جانتا ہے کہ وہ زندہ رہیگا اور لڑائی کے اچھے نتیجہ کو دیکھیگا۔ سپاہی جب کسی اچھے مقصد کیلئے

میدان جنگ میں جاتا ہے تو وہ ایمان بالغیب کا ایک مظاہرہ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگیا تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر وہ اس کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے مرگیا تب بھی اس کا نتیجہ حق اور صداقت کے لئے اچھا نکلیگا۔

حق یہ ہے کہ جس قدر شاندار کام ہیں وہ سب ایمان بالغیب کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم، صدقہ، خیرات، غرباء کے اُبھارنے کے لئے کوششیں، ملکی تنظیم سب ایمان بالغیب ہی کی اقسام ہیں۔ اگر انسان آئندہ نکلنے والے اچھے نتائج پر جو ظاہر نگاہ سے پوشیدہ ہوتے ہیں یقین نہ رکھے تو کبھی ایسی قربانیاں نہ کرسکے

ایمان بالغیب کے معنے ادنیٰ درجہ کے متقیوں کے لحاظ سے

پس متقی کی علامت ایمان بالغیب بتا کر قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ مومن ضروری دینی امور پر ایمان رکھنے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی قربانیاں کرتا ہے اور تاجرانہ ذہنیت سے بالا ہو جاتا ہے اور اس امر پر اصرار نہیں کرتا کہ میں وہی کام کروں گا جن کا نقد بہ نقد نتیجہ نکلے۔ بلکہ جب اُسے یقین ہو جائے کہ جو کام اس کے سامنے پیش کیا گیا ہے اچھا اور نیک ہے تو وہ ظاہری حالات سے بے پرواہ ہوکر اس یقین سے اس کام کے کرنے میں لگ جاتا ہے کہ خواہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں نیک کام کا نتیجہ نیک ہی نکلیگا اور اس امر کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ اس نتیجہ کو خود بھی دیکھیگا یا نہیں۔

ایمان بالغیب کے شاندار نتائج

اگر کوئی شخص تعصب سے آزاد ہوکر غور کرے تو ایمان بالغیب کا یہ مفہوم ایسا اہم ہے کہ اس کے ذریعہ سے قرآن کریم نے تمام قومی، ملی اور بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے قربانیوں کی بنیاد رکھ دی ہے۔ یہ ایمان بالغیب ہی تھا کہ جس نے صحابۂ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے وہ قربانیاں کرائیں جنہوں نے عرب کی ہی نہیں بلکہ سب دنیا کی حالت بدل دی۔ اگر وہ تاجرانہ ذہنیت دکھلاتے اور ایمان بالغیب کے ماتحت کام نہ کرتے تو دنیا میں ایسے شاندار نتائج کس طرح پیدا ہو سکتے تھے۔

اوپر جو معنے بیان ہوئے ہیں وہ تو ایمان بالغیب کے کامل اور اعلیٰ معنے ہیں۔ لیکن ایک معنے اس کے اور بھی ہیں جو ادنیٰ درجہ کے متقیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ادنیٰ درجہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان ایمان بالغیب رکھے یعنی دلائل عقلیہ کے ساتھ اسے خدا تعالےٰ اور ملائکہ اور بعث بعد الموت پر یقین ہو گو وہ اس مقام پر نہ پہنچا ہو کہ خدا تعالےٰ اُسے حواس باطنی کے ساتھ نظر آنے لگے۔ یہ مقام تقویٰ کا ادنیٰ ہے یعنی اس تقویٰ کی بنیاد صرف دلائل پر ہوتی ہے مشاہدہ پر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ع) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ واری نہیں رکھتا۔ پس ایک انسان جو ابھی تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچا اور اُسے ان امور غیبیہ پر جو ہیں تو یقینی اور قطعی لیکن ہیں انسانی ادراک سے بالا ابھی ایسا ایمان اور یقین پیدا نہیں ہوا جو مشاہدہ کی حد تک پہنچا ہوا ہو اس سے اللہ تعالےٰ اس امر کا مطالبہ نہیں کرتا کہ جب تک اسے مشاہدہ اور تجربہ والا ایمان نصیب نہ ہوا ہو اُسے متقی اور مومن نہیں سمجھا جائیگا۔ بلکہ اس سے صرف اس قدر مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان دلائل اور براہین پر غور کرکے جو امور غیبیہ کے ثبوت کیلئے اللہ تعالیٰ نے مہیا کئے ہیں ان پر ایمان لے آئے اور یہ امر اس کے متقی ہونے کے لئے ادنیٰ درجہ کے طور پر کافی ہوگا۔ اب دیکھو کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے جو سب مدارج کے انسانوں کی ضرورت کو پورا کردیتی ہے۔ اور ایسی ہی تعلیم خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہونیوالی کہلا سکتی ہے جو سب استعداد کے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو۔ یہ ادنیٰ درجہ تقویٰ کا انسان کی نجات محض کے لئے کافی ہے۔ ہاں جب وہ اس سے ترقی کرتا ہے تو اُسے ایمان بالغیب کا وہ درجہ میسر ہو جاتا ہے جو امور غیبیہ کو مشاہدہ کے رنگ میں اس کے سامنے لے آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی اس فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ احسان یہ ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (مسلم کتاب الایمان) یعنی احسان اس کا نام ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے کہ گویا روحانی نظروں کو وہ تیرے سامنے موجود ہے اور تو اُسے دیکھتا ہے لیکن اگر یہ درجہ تجھے حاصل نہ ہو تو کم سے کم اس درجہ پر فائز ہو کہ تجھے یقین اور وثوق سے عبادت کے وقت یہ معلوم ہو کہ خدا تعالےٰ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث میں ایمان بالغیب کے ان دونوں درجوں کو بیان کر دیا گیا ہے اعلیٰ درجہ

کو بھی اور ادنیٰ درجہ کو بھی۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے ایک معنے غیب کے غائب ہونے کی حالت کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے ایمان بالغیب کے یہ معنے بھی ہیں کہ جب انسان غیب کی حالت میں ہو یعنی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو تب بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو۔ یعنی اس کا ایمان صرف قومی نہ ہو کہ جب اس کے ہم مذہب لوگ اس کے سامنے ہوں تب تو وہ ان عقائد کو تسلیم کرے جو اس کے مذہب نے اس کے سامنے پیش کئے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے لوگوں سے جُدا ہو تو اس کا ایمان کمزور ہو جائے۔ غیب کے یہ معنے قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ (انبیاء ع) وہ مومن جو علیحدگی میں بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ (حدید ع) یعنی ہم نے جنگ کے سامان اس لئے پیدا کئے ہیں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کون خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا دل سے مددگار تھا اور صرف ظاہری دعویٰ نہیں کر رہا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی نسبت آتا ہے اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ (یوسف ع) جس کے یہی معنے ہیں کہ میں نے پس پُشت نظروں سے اوجھل اپنے آقا کی خیانت نہیں کی۔

ان معنوں کے رُو سے ان لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ جو تقریریں سنتے ہیں یا وعظ کی مجالس میں بیٹھتے ہیں تو انہیں خوب جوش آجاتا ہے لیکن جب وہ علیحدگی میں جاتے ہیں تو ان کا ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ درحقیقت معمولی مذہب رکھتے ہیں اور ان کی حالت بھیڑ چال کی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی آراء کی رَو میں بہ جاتے ہیں ان کا اپنا مذہب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ ایسا ایمان بے حقیقت ہے ایمان وہی ہے کہ جو ذاتی ہو اور صرف دوسروں کے جوش کو دیکھ کر بھڑک نہ اٹھتا ہو۔ اور جو شخص ذاتی ایمان نہیں رکھتا اور اپنی قوم اور جماعت اور پُرجوش واعظوں کی صحبت سے الگ ہو کر اسکے دل کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے یا مٹ جاتا ہے وہ متقی نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ اس کا ایمان اپنا ایمان نہیں بلکہ عارضی طور پر وہ دوسرے لوگوں سے مانگا ہوا ایمان ہے ایسے لوگوں کی نسبت قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (بقرۃ ع۲) یعنی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب مومنوں کی مجلس میں آتے ہیں تو ان کی باتوں کو سن کر اور ان کے یقین اور ایمان کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں پر ایمان لاتے ہیں لیکن جب اُن سے الگ ہوتے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کی مجلس میں جاتے ہیں تو پھر اُن کی سی کہنے لگتے ہیں۔ اور ان کے خیالات سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ہی ہم عقیدہ ہیں اور جو مومنوں کی ہاں میں ہاں ہم نے ملائی تھی یہ صرف ایک مذاق تھا۔ ایسے لوگوں کا ایمان درحقیقت کوئی ایمان نہیں بلکہ یہ لوگ بے اصولے ہوتے ہیں۔ پس یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ متقی وہ ہوتا ہے جس کی زبان ہی ایمان کا دعویٰ نہیں کرتی بلکہ اس کا دل بھی صداقت کا مصدق ہوتا ہے اور وہ جب مومنوں کی صحبت سے دُور ہوتا ہے مثلاً غیر ملکوں اور غیر مذاہب کے پیروؤں میں چلا جاتا ہے جہاں اس کے ہم مذہب نہیں ملتے تو بھی اس کا ایمان ڈگمگاتا نہیں یا کمزور نہیں ہوتا کیونکہ وہ دوسروں کی نقل کرنے والا نہیں تھا بلکہ یقین اور وثوق سے ایمان پر قائم تھا۔

[1] غیب بمعنے غائب

[2] یؤمنون بالغیب میں غیر متزلزل ایمان پیدا کرنے کی نصیحت

اس مضمون سے اُن مسلمان طلباء کو جو تعلیم کی خاطر کالجوں میں داخل ہوتے ہیں یا دوسرے ممالک میں جاتے ہیں سبق حاصل کرنا چاہیئے اور اپنے ایمان کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ اگر وہ مومنوں کے ماحول سے جدا ہو کر کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ انہوں نے اپنے مذہب کو سمجھ کر نہیں مانا تھا اور اُن کا ایمان ذاتی نہ تھا بلکہ صرف اپنے ماحول کی ایک صدائے بازگشت تھا۔

خلاصہ یہ کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کہہ کر قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قرآن کریم ان متقیوں کو جو مندرجہ ذیل صفات اپنے اندر رکھتے ہیں اعلیٰ روحانی مقامات تک پہنچاتا ہے (۱) ان متقیوں کو بھی جو دلائل اور براہین سے روحانی دنیا سے تعلق رکھنے والے عقائد پر ان کی صداقت واضح ہو جانے کے بعد پورا ایمان لے آتے

ہیں خواہ ابھی اس مقام پر نہ پہنچے ہوں کہ دلیل سے بڑھکر ذاتی تجربہ نے بھی ان کے ایمان کو مضبوط کر دیا ہو (۲) وہ ان متقیوں کو بھی ہدایت کی اعلیٰ راہوں پر چلاتا ہے جن کا ایمان منافقت سے پاک ہو اور ان کا دل اور زبان اور عمل ایک ہو (۳) وہ ان متقیوں کو بھی ہدایت کی اعلیٰ راہوں پر چلاتا ہے جن کا ایمان قومی نہ ہو بلکہ ذاتی ہو یہ نہ ہو کہ مومنوں کی مجلس میں مومن اور کافروں کی مجلس میں کافر بلکہ خواہ انہیں کیسی ہی مخالف سوسائٹی یا قوم میں رہنا پڑے اُن کا ایمان ڈانواڈول نہ ہو اور اُن کے مومنانہ عمل میں فرق نہ آئے (۴) وہ ان متقیوں کو بھی ہدایت دیتا ہے جو اِن ظاہری حواس سے محسوس نہ ہونے والی صداقتوں پہ کامل یقین اور اعتقاد رکھتے ہیں جن کا وجود دوسرے دلائل اور براہین سے ثابت ہے اور ایسے ایمان کو اپنے تجارب کی بناء پر کمال تک پہنچاتے ہیں (۵) ایسے متقیوں کو بھی ہدایت کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے جو تاجرانہ ذہنیت کو چھوڑ کر اخلاقی اور دینی نتائج پر یقین رکھتے ہیں اور ان قربانیوں کے نیک نتائج پر یقین رکھتے ہیں جو بظاہر حالات مقبول ہوتی نظر نہیں آتیں لیکن قومی ترقی اور ملی کامیابی کے لئے اُن کا وجود ضروری سمجھا جاتا ہے اور اپنے ذاتی فوائد کو قومی فوائد پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے دوسرے معنے اعتدال اور درستی سے نماز ادا کرنے کے

جن متقیوں میں ان میں سے ایک یا زیادہ باتیں پائی جائیں وہ قرآن کریم کی اتباع میں حاصل ہونے والی اعلیٰ ہدایتوں کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور وہ ہدایت انہیں دی جاتی ہے۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے چھ معنے

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ - جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اقامۃ الصلوٰۃ کے معنے (۱) باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کے ہیں کیونکہ قَامَ عَلَى الْاَمْرِ کے معنے کسی چیز پر ہمیشہ قائم رہنے کے ہیں پس يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے یہ معنے ہوئے کہ نماز میں ناغہ نہیں کرتے - ایسی نماز جس میں ناغہ کیا جائے اسلام کے نزدیک نماز ہی نہیں کیونکہ نماز وقتی اعمال سے نہیں بلکہ اُسی وقت مکمل عمل سمجھا جاتا ہے جبکہ توبہ یا بلوغت کے بعد کی پہلی نماز سے لے کر وفات سے پہلے کی آخری نماز تک اس فرض میں ناغہ نہ کیا جائے جو لوگ درمیان میں نمازیں چھوڑتے رہتے ہیں اُن کی سب نمازیں ہی رد ہو جاتی ہیں - پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب وہ بالغ ہو یا جب اُسے اللہ تعالیٰ توفیق دے اُس وقت سے موت تک نماز کا ناغہ نہ کرے کیونکہ نماز خدا تعالیٰ کی زیارت کا قائم مقام ہے اور جو شخص اپنے محبوب کی زیارت سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عشق کے دعویٰ کے خلاف خود ہی ڈگری دیتا ہے (۲) دوسرے معنے إِقَامَة کے اعتدال اور درستی کے ہیں اِن معنوں کے رُو سے يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے یہ معنے ہیں کہ متقی نماز کو اُس کی ظاہری شرائط کے مطابق ادا کرتے ہیں اور اس کے لئے جو قواعد مقرر کئے گئے ہیں ان کو توڑتے نہیں - مثلاً تندرستی میں یا پانی کی موجودگی میں وضوء کر کے نماز پڑھتے ہیں اور وضوء بھی ٹھیک طرح ان شرائط کے مطابق ادا کرتے ہیں جو اس کے لئے شریعت نے مقرر کی ہیں - اسی طرح صحیح اوقات میں نماز ادا کرتے ہیں نماز میں قیام رکوع سجدہ قعدہ کو عمدگی سے ادا کرتے ہیں - مقررہ عبارات اور دعائیں اور تلاوت اپنے اپنے موقع پر اچھی طرح اور عمدگی سے پڑھتے ہیں غرض تمام ظاہری شرائط کا خیال رکھتے اور انہیں اچھی طرح بجالاتے ہیں -

اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گو شریعت کا حکم ہے کہ نماز کو اس کی مقررہ شرائط کے ماتحت ادا کیا جائے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب مجبوری ہو اور شرائط پوری نہ ہوتی ہوں تو نماز کو ترک ہی کر دے نماز بہر حال شرائط سے مقدم ہے - اگر کسی کو صاف کپڑا میسر نہ ہو تو وہ گندے کپڑوں میں ہی نماز پڑھ سکتا ہے خصوصاً وہم کی بناء پر نماز کا ترک تو بالکل غیر معقول ہے - جیسا کہ ہمارے ملک میں کئی عورتیں اس وجہ سے نماز ترک کر دیتی ہیں کہ بچوں کی وجہ سے کپڑے مشتبہ ہیں - اور کئی مسافر نماز ترک کر دیتے ہیں کہ سفر میں طہارت کامل نہیں ہو سکتی - یہ سب شیطانی وساوس ہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ع ۴۰) الٰہی حکم ہے جب تک شرائط کا پورا کرنا اختیار میں ہو اُن کے ترک میں گناہ ہے لیکن جب شرائط پوری کی ہی نہ جا سکتی ہوں تو اُن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے نماز کا ترک گناہ ہے - اور ایسا شخص معذور نہیں بلکہ نماز کا تارک سمجھا جائیگا - پس اس بارہ میں مومنوں کو خاص طور پر

ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے (۳) تیسرے معنے اِقَامَۃ کے کھڑا کرنے کے ہیں ان معنوں کے رُو سے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے معنے یہ ہوئے کہ وہ نماز کو گرنے نہیں دیتے یعنی ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کی نماز درست اور باشرائط ادا ہو اس میں ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو نماز پڑھنے والے مبتدی کو زیادہ اور عارف کو کسی کسی وقت پیش آتی رہتی ہیں یعنی اندرونی یا بیرونی تاثرات نماز سے توجہ ہٹا کر دوسرے خیالات میں پھنسا دیتے ہیں۔ یہ امر انسانی عادت میں داخل ہے کہ اس کا خیال مختلف جہات کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے اور خاص صدموں یا جوش یا محبت کے اثر کے سوا جبکہ ایک حد تک خیالات میں کامل یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے انسانی دماغ ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے اور ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہو کر ابتدائی خیال سے کہیں کا کہیں لے جاتا ہے۔ اسی طرح بیرونی آوازیں یا پاس کے لوگوں کی حرکات یا کھٹکے، بُو یا خوشبو، جگہ کی سختی یا نرمی اور اسی قسم کے اور اُمور انسانی ذہن کو اِدھر سے اُدھر پھیر دیتے ہیں۔ یہی مشکلات نمازی کو پیش آتی ہیں اور اگر اپنے خیالات پر پورا قابو نہ ہو تو اُسے پریشان خیال بنائے رکھتی ہیں اور بعض اوقات وہ نماز کے مضمون کو بھول کر دوسرے خیالات میں پھنس جاتا ہے۔ اس حالت کی نسبت یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ بعض نمازیوں کو یہ مشکل پیش آئے گی مگر انہیں گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر درجہ کے انسان کے لئے ترقی کا رستہ کھول دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی نماز میں ایسی پریشان خیالی سے دوچار ہو تو اُسے مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور اپنی نماز کو بیکار نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں سے اسی قدر قربانی کی امید کرتا ہے جتنی قربانی اُن کے بس کی ہو پس ایسے نمازی جن کے خیالات پراگندہ ہو جاتے ہوں اگر نماز کو سنوار کر اور توجہ سے پڑھنے کی کوشش میں لگے رہیں تو چونکہ وہ اپنی نماز کو جب بھی وہ اپنے مقام سے گرے کھڑا کرنیکی کوشش میں لگے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کی نماز کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ اُسے قبول کرے گا اور اس نماز کو کھڑا کرنے کی کوشش کرنیوالے کو متقیوں میں ہی شامل سمجھیگا۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے تیسرے معنے نماز کو کھڑا رکھنے کے

(۴) لغت کے مذکورہ بالا معنوں کے رُو سے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ متقی دوسرے لوگوں کو نماز کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ کسی کام کو کھڑا کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ اُسے رائج کیا جائے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی جائے۔ پس یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے مالک متقی وہ بھی کہلائیں گے کہ جو خود نماز پڑھنے کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی نماز کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور جو سُست ہیں انہیں تحریک کر کے چُست کرتے ہیں۔ رمضان کے موقع پر جو لوگ تہجد کے لئے لوگوں کو جگاتے ہیں وہ بھی اس تعریف کے ماتحت یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی تعریف میں آتے ہیں۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے چوتھے معنے دوسرے لوگوں کو نماز کی ترغیب دینے کے

(۵) نماز باجماعت سے پہلے امام کے نماز پڑھانے کے قریب وقت میں اذان کے کلمات تھوڑی زیادتی کے ساتھ دُہرائے جاتے ہیں ان کلمات کو اِقَامَۃ کہتے ہیں اور نماز باجماعت بھی ان معنوں کے رُو سے اِقَامَۃ الصَّلٰوۃ کا مفہوم رکھتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں نماز کھڑی ہو گئی ہے۔ اس محاورہ کے مطابق یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہوں گے کہ وہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور دوسروں سے ادا کرواتے ہیں۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے پانچویں معنے نماز باجماعت ادا کرنے کے

نماز باجماعت کی ضرورت کو عام طور پر مسلمان بھول گئے ہیں اور یہ ایک بڑا موجب مسلمانوں کے تفرقہ اور اختلاف کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت میں بہت سی شخصی اور قومی برکتیں رکھی تھیں مگر افسوس کہ مسلمانوں نے انہیں بھلا دیا۔ قرآن کریم نے جہاں بھی نماز کا حکم دیا نماز باجماعت کا حکم دیا ہے خالی نماز پڑھنے کا کہیں بھی حکم نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز باجماعت اہم اصول دین میں سے ہے بلکہ قرآن کریم کی آیات کو دیکھ کر کہ جب بھی نماز کا حکم بیان ہوا ہے نماز باجماعت کے الفاظ میں ہوا ہے تو صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک نماز صرف تبھی ادا ہوتی ہے کہ باجماعت ادا کی جائے سوائے اس کے کہ ناقابل علاج مجبوری ہو۔ پس جو کوئی شخص بیماری یا شہر سے باہر ہونے یا نسیان یا دوسرے مسلمان کے موجود نہ ہونے کے عذر کے

سو نماز باجماعت کو ترک کرتا ہے خواہ وہ گھر پر نماز پڑھ بھی لے تو اس کی نماز نہ ہوگی اور وہ نماز کا تارک سمجھا جائیگا۔

قرآن کریم میں نماز پڑھنے کا جہاں بھی حکم آیا ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ سے آیا ہے کبھی بھی خالی صَلُّوْا کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے یہ امر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اصل حکم یہ ہے کہ فرض نماز کو باجماعت ادا کیا جائے اور بغیر جماعت کے نماز صرف مجبوری کے ماتحت جائز ہے جیسے کوئی کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو اُسے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے پس جس طرح کوئی کھڑا ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت رکھتا ہو لیکن بیٹھ کر پڑھے تو یقیناً وہ گنہگار ہوگا اسی طرح جسے باجماعت نماز کا موقع مل سکے مگر وہ باجماعت نماز ادا نہ کرے تو وہ بھی گنہگار ہوگا۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے لُغوی معنوں کی تصدیق قرآن مجید اور احادیث سے۔

آج کل بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جو باجماعت نمازوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں اور باتوں میں مشغول رہتے ہیں یہاں تک کہ نماز ہو چکتی ہے اور پھر افسوس کرتے ہیں کہ نماز چلی گئی۔ ان کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے کیونکہ وہ معمولی غفلت سے بہت بڑے ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے چھٹے معنے نماز کو ہوشیاری سے ادا کرنے کے

(۶) یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ نماز چستی اور ہوشیاری سے ادا کی جائے کیونکہ سستی اور غفلت کی وجہ سے خیالات میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور نماز کا مغز ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں لاتیں ڈھیلی چھوڑنے یا سہارا لگانے (مسلم جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب کراھۃ الاختصار فی الصلوٰۃ) یا کہنیاں سجدہ کے وقت زمین پر ٹیکنے سے منع فرمایا ہے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی الاعتدال فی السجود) اور اسکے بالمقابل رکوع میں کمر سیدھی رکھنے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی من لا یقیم صُلبہٗ) کھڑا ہوتے وقت یا رکوع میں ٹانگوں کو سیدھا رکھنے سجدہ میں پاؤں گھٹنوں، ہتھیلیوں اور ماتھے پر بوجھ رکھنے (ترمذی کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی السجود علی سبعۃ اعضاء) اور کمر اور پیٹ کو لاتوں سے جدا رکھنے (نسائی کتاب افتتاح الصلوٰۃ باب صفۃ السجود والتجافی فی السجود والاعتدال فی السجود) اور قعدہ کے موقع پر دائیں پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رُخ رکھ کر پاؤں کھڑا رکھنے کا حکم دیا ہے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء کیف الجلوس فی التشھد) کیونکہ یہ سب امور چستی اور ہوشیاری پیدا کرتے ہیں اور نیند اور اونگھ اور غفلت کو دُور کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اسلام نے نماز سے پہلے وضوء کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ سر اور جوارح کے اعصاب کو تری اور سردی پہنچ کر جسم میں چستی اور خیالات میں یکسوئی پیدا ہو۔

اوپر جو معانی یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے لُغوی معنوں سے استنباط کر کے لکھے گئے ہیں قرآن کریم اور احادیث سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً ایک معنے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ کئے گئے تھے کہ باقاعدگی سے نماز ادا کریں اور ناغہ نہ کریں اس کے مفہوم کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج ع ۱) یعنی مومن اپنی نمازوں میں ناغہ نہیں ہونے دیتے بلکہ ہمیشہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے معنے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے اعتدال اور درستی کے ساتھ نماز ادا کرنے کے کئے گئے تھے ان کی تائید اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ کی آیت سے ہوتی ہے (مومنون ع ۱) یعنی مومن اپنی نمازوں میں خشوع اور فرمانبرداری کو مدنظر رکھتے ہیں یعنی ظاہری اور باطنی احکام جو نماز کے بارہ میں دیئے گئے ہیں سب کو پورا کرتے ہیں۔

تیسرے معنے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ کئے گئے تھے کہ وہ نماز کو درست رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان معنوں کی تصدیق اس آیت سے ہوتی ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (مومنون ع ۱) مومن کامل اپنی نماز کی حفاظت کرتے رہتے ہیں یعنی اُسے اعلیٰ اور کامل بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

چوتھے معنے یہ کئے گئے تھے کہ نماز باجماعت کی ترویج میں مومن لگے رہتے ہیں۔ ان معنوں کی تصدیق قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاْمُرْ اَھْلَكَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا (طٰہٰ ع ۸) اے ہمارے مخاطب اپنے اہل کو نماز کی نصیحت کرتے رہا کرو۔ اور اس حکم کو کبھی نہ بھولو بلکہ نماز کی یاددہانی کو ایک ضروری اور لازمی ذمہ واری سمجھ لو۔

اور یہ جو معنے کئے گئے تھے کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے مراد نماز باجماعت کے ہیں سو یہ مندرجہ ذیل آیت سے نکلتے ہیں وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ (نساء ع۱۵) یعنی جب تو مسلمانوں میں موجود ہو اور نماز میں ان کی امامت کرائے تو چاہیئے کہ مومن سب کے سب نماز باجماعت میں شامل نہ ہوں بلکہ بوجہ جنگ کے ان میں سے صرف ایک حصہ نماز باجماعت میں شامل ہو اور دوسرا حصہ بھی اپنے ہتھیار اٹھائے رہے۔ اس آیت میں اَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ کے الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِقَامَةُ الصَّلٰوة سے مراد باجماعت نماز ہوتی ہے۔

ایک معنے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ کئے گئے تھے کہ نماز ہوشیاری اور چستی کی حالت میں ادا کرتے ہیں۔ سو ان معنوں پر یہ آیت دلالت کرتی ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون ع۱) یعنی ان نمازیوں پر خدا کا عذاب نازل ہوگا جو اپنی نمازوں میں غفلت برتتے ہیں یعنی نماز تو پڑھتے ہیں مگر ان کے دلوں میں پوری رغبت اور چستی نہیں ہوتی اسی طرح ظاہری سستی اور غفلت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (توبہ ع۷) یعنی وہ جب بھی نماز پڑھتے ہیں ان پر سستی اور غفلت غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ع۳) یعنی اے مومنو ہر مسجد کے پاس جاتے ہوئے اپنی زینت کے سامان مکمل کر لیا کرو یعنی وضو کر لیا کرو اور ہوشیار ہو جایا کرو۔ اسی طرح فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء ع۷) یعنی اے مومنو جبکہ تمہارے خیالات پراگندہ ہوں نماز کے قریب مت جاؤ بلکہ اسی وقت نماز پڑھو جبکہ تم یہ جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو یعنی دماغی پراگندگی یا سستی کی حالت میں انسان نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کی نماز خراب ہو جاتی ہے ایسی حالت میں نماز پڑھنی چنداں مفید نہیں ہوتی۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ خیالات پراگندہ ہوں تو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے بلکہ یہ مراد ہے کہ خیالات کو پراگندگی سے بچاؤ اور ذہنی بیداری اور چستی پیدا کرو اور جو باتیں کہ پراگندگی کو پیدا کرنے والی ہیں انہیں دور کرو۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ نماز سے کچھ عرصہ پہلے اذان ہونی چاہیئے جسے سنکر مسلمانوں کو اپنے کاروبار ترک کر کے نماز کی تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔ اسی طرح یہ کہ نماز سے پہلے وضو کرنا چاہیئے پھر مسجد میں جا کر یا گھر پر سنتیں پڑھنی چاہئیں پھر مسجد میں امام کے انتظار میں ذکر الٰہی کرنا چاہیئے۔ ان سب کاموں سے ظاہری اور باطنی سستی دور ہوتی ہے کیونکہ خیالات میں پراگندگی اور سستی اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ دھیان کسی اور طرف ہو مگر جو شخص نماز سے پہلے اپنا کاروبار ترک کر دیگا اس کے خیالات جو تجارتی یا دوسرے کاروبار کی وجہ سے یا گھر کے جھگڑوں یا فکروں کی وجہ سے پراگندہ ہو رہے تھے آہستہ آہستہ نماز اور عبادت کی طرف پھر جائیں گے۔ پھر مسجد میں جانے اور سنتیں پڑھنے اور ذکر الٰہی کرنے کی وجہ سے [illegible] دوسری تمام طرفوں سے ہٹکر عبادت اور نماز کی طرف منتقل ہو جائیں گے اور وہ تمام ذرائع مہیا ہو جائینگے جن کی وجہ سے نماز میں خیالات کی یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی پراگندگی کی حالت کو دور کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اس حالت میں کہ پیشاب یا خانہ وغیرہ کی حاجت معلوم ہو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے بلکہ پہلے ان حاجات کو پورا کرکے پھر نماز پڑھے (ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب ایصلی الرجل وھو حاقن) اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِذَا وُضِعَ الْعَشَاءُ وَاُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَابْدَءُوْا بِالْعَشَاءِ (بخاری کتاب الاذان باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلوۃ) یعنی جب شام کا کھانا سامنے آجائے تو عشاء کی نماز سے پہلے کھانا کھا لیا کرو۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کھانا سامنے آجانے کے بعد خیال کھانے کی طرف رہیگا پس پہلے کھانا کھا کر نماز پڑھی جائے تاکہ طبیعت میں یکسوئی پیدا ہو۔ اس حدیث میں جو شام کے کھانے کا خاص طور پر ذکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو دوپہر کا کھانا نماز ظہر سے اس قدر نہیں ٹکراتا جس قدر

کہ شام کا کھانا عشاء کی نماز سے ٹکراتا ہے۔ دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ رات کو سونے سے کافی پہلے کھانا کھا لینا چاہیئے تا نیند پریشان نہ ہو اور بدہضمی کی شکایت پیدا نہ ہو۔ اگر شام کے کھانے کو عشاء کی نماز کے بعد کے لئے اٹھا رکھا جائے تو چونکہ اسلام عشاء کے بعد جلد سونے کی ہدایت دیتا ہے تا تہجد کے لئے اُٹھنے میں آسانی پیدا ہو شام کے کھانے اور سونے کے وقت میں تھوڑا فرق رہ جائیگا اور صحت خراب ہوگی۔

صلوٰۃ کے مختلف معنوں کی تصدیق قرآن مجید سے۔

صَلٰوۃ کے معنے حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ دُعا، رحم، دین، شریعت، استغفار، تعظیم، برکت اور مسلمانوں کی اصطلاحی عبادت کے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ بولا جائے تو اس کے معنے رحم اور برکت کے ہوتے ہیں اور جب بندوں کے لئے استعمال ہو تو دُعا، دین، شریعت، استغفار، تعظیم، علم عبادت یا مسلمانوں کی اصطلاحی عبادت کے ہوتے ہیں چنانچہ دُرُود شریف کے لئے بھی صلوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے اور اس کے معنے دعا اور برکت اور تعظیم کے ہوتے ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ مومن اپنے آقا کے مدارج کی ترقی کے لئے دعا کریں اس کے لئے خدا تعالیٰ سے برکت طلب کریں اور اس کی بڑائی بیان کریں۔ ان معنوں میں قرآن کریم میں یہ لفظ سورۂ احزاب میں استعمال ہوا ہے وہاں لکھا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (احزاب ع) اللہ اپنے رسول پر برکات نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے اس کے لئے دعائیں کرتے اور اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں پس اے مومنو تم بھی اس کے لئے دعائیں کرو اور اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کے تمام احکام کی کامل فرمانبرداری کرو۔ استغفار کے خالص معنوں میں یہ لفظ سورۂ توبہ میں استعمال ہوا ہے وہاں آتا ہے وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (توبہ ع) اے رسول جن سچے مومنوں سے کمزوریاں ہو جائیں تو اُن کیلئے استغفار کر کیونکہ تیرا اُن کے لئے استغفار کرنا ان کی تسلی کا موجب ہوتا ہے۔

دعا کے معنوں میں بھی سورۂ توبہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّھَا قُرْبَۃٌ لَّھُمْ سَیُدْخِلُھُمُ اللّٰہُ فِیْ رَحْمَتِہٖ (التوبہ ع) یعنی چھوٹے دیہات یا جنگلوں میں رہنے والے بعض عرب بھی ایسے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور یوم آخر پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ بھی وہ خرچ کرتے ہیں اُسے اللہ تعالیٰ کے قرب اور رسول کی دعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں اور خوب سن رکھو کہ ان کا یہ عمل خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس نیک نیتی اور رسول کی دعاؤں کی وجہ سے اُن کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

نماز کے معنوں میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس میں اصطلاحی نماز کے علاوہ یہ امور بھی مدنظر ہوتے ہیں کہ نماز دعا ہے اور اس سے دین کا مغز پورا ہوتا ہے اور شریعت کی غرض پوری ہوتی ہے اور اس میں بندہ اپنی کمزوریوں کی معافی کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت کو طلب کرتا ہے چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت ع) یعنی قرآن کریم کی تلاوت کر اور نماز باجماعت ادا کر یقیناً نماز اُن بُری باتوں سے بھی کہ جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان سے بھی کہ جو سوسائٹی پر گراں گذرتی ہیں روکتی ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ نماز کو ایک رسم کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا بلکہ یہ عبادت اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ بدی سے نفرت ہوتا ہے اور اندرونی پاکیزگی اس سے حاصل ہوتی ہے۔

نماز کے بدی سے روکنے کا مطلب

یہ الفاظ استعمال فرما کر کہ نماز بدی سے روکتی ہے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز میں یہ ذاتی خوبی ہے کہ وہ بدی سے روکتی ہے۔ پس جس شخص کو باوجود نماز پڑھنے کے بدی سے نفرت پیدا نہ ہو اُس کی نماز میں ضرور نقص ہے اور یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ متقی صرف رسمی طور پر نماز نہیں ادا کرتے بلکہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کی

نماز کھڑی ہو جائے یعنی وہ اُن کی روحانیت کے لئے بطور سہارے کے بن جائے جس طرح ٹیک اور سہارے جب تک اپنی جگہ پر کھڑے رہیں چھتوں کو کھڑا رکھتے ہیں اسی طرح نماز جب کامل ہو جائے تو متقی کے تقویٰ کو سہارا دیکر اپنی جگہ پر کھڑا رکھتی ہے پس صرف نماز پڑھنے پر تسلی نہیں پانی چاہیئے بلکہ نماز کو کھڑا کرنا چاہیئے تاکہ اس کے سہارے پر انسان کا تقویٰ بھی کھڑا رہے۔

اسلامی نماز۔ چونکہ قرآن کریم میں نماز قائم کرنے کا حکم یہاں پہلی دفعہ بیان ہوا ہے میں اسلامی نماز کی کیفیت کو اس جگہ مختصراً بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ جو غیر مسلم اس تفسیر کو پڑھیں انہیں نماز کے متعلق کچھ واقفیت ہو جائے۔

اسلامی نماز کے ادا کرنے سے پہلے وضو یا تیمم فرض ہے وضو کا حکم اصل ہے اور تیمم کا حکم بطور قائم مقام کے ہے۔ (سورۃ مائدہ رکوع اول آیت ۷) وضو پانی سے کیا جاتا ہے اور اس میں پہلے ہاتھ دھوئے جاتے ہیں اس کے بعد کلی کر کے منہ صاف کیا جاتا ہے اور نتھنوں سے پانی اوپر کی طرف کھینچ کر ناک کو صاف کیا جاتا ہے اس کے بعد منہ دھویا جاتا ہے پھر کہنیوں تک کہنیوں کو شامل کرتے ہوئے دونوں ہاتھ دھوئے جاتے ہیں اس کے بعد ہاتھ گیلے کر کے سر کے بالوں پر ایک ثلث سے دو ثلث تک مسح کیا جاتا ہے اور پھر انگوٹھے کے پاس کی انگلی سے کانوں کے سوراخوں کو گیلا کیا جاتا ہے اور انگوٹھوں کو کانوں کی پشت پر پھرایا جاتا ہے تاکہ کان کی پشت بھی گیلی ہو جائے اس کے بعد دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے جاتے ہیں (بخاری کتاب الوضوء باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً و نسائی کتاب الوضوء باب مسح الاذنین مع الراس) باہوں اور پاؤں کے دھونے میں اس امر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ دائیں طرف پہلے دھوئی جائے اور بائیں طرف بعد میں۔ (نسائی کتاب الوضوء باب بای الرجلین یبدا بالغسل) وضوء کرتے وقت یہ نیت کرنی بھی ضروری ہوتی ہے کہ نماز کے لئے یا طہارت کے لئے وضوء کیا جا رہا ہے (نسائی کتاب الوضوء باب النیۃ فی الوضوء) اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ خیالات کی رَو عبادت کی طرف پھر جائے اور اس وقت سے خیالات دوسرے کاموں کی طرف سے ہٹ جائیں یہ فعل ظاہری صفائی کا بھی موجب ہوتا ہے کیونکہ جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے وہ بالعموم ننگا رہنے کی وجہ سے گرد و غبار کا نشانہ بنتے ہیں۔

ان اعضاء کا دھونا یا گیلا کرنا خیالات کے اجتماع کے لئے بھی مفید اور ضروری ہوتا ہے کیونکہ خیالات کی پراگندگی حواس خمسہ کے مقامات کی تیزی سے ہوتی ہے اور حواس خمسہ کے مقامات آنکھیں کان ناک اور منہ اور جسم ہیں۔ وضوء میں کلی کے ذریعہ سے منہ کو تر کیا جاتا ہے اور اس میں یکسوئی کی قوت پیدا کی جاتی ہے۔ ناک میں پانی ڈالکر اُسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ مُنہ دھوتے ہوئے آنکھوں کو تری پہنچائی جاتی ہے۔ کانوں میں گیلی انگلیاں ڈالکر اور اُن کے پیچھے انگوٹھے کو حرکت دے کر کانوں کی حس کی پراگندگی کو دُور کیا جاتا ہے۔ جسم کی زیادہ حس کو دُور کرنے کے لئے باہیں اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں۔ اور طبی تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ بخار کی تیزی کو دُور کرنے کے لئے صرف باہوں اور پاؤں کا ٹھنڈے پانی سے دھونا یا تر کرنا سارے بدن سے بخار کی گرمی دور کرنے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ سر کی گرمی خیالات کو بہت پراگندہ کر دیتی ہے اس وجہ سے سر کا مسح رکھا گیا ہے جو سر کو ٹھنڈا کر کے سر کی گرمی کو دُور کرتا اور خیالات کے اجتماع میں ممد ہوتا ہے۔

اعصابی ماہرین کے تجربہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے ٹھنڈا کرنے سے بھی خیالات کی رَو کو بدلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسمریزم کے ماہرین کا تجربہ ہے کہ مسمریزم کے عمل کے بعد اگر ہاتھوں اور پاؤں کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کر لیا جائے تو اس دماغی برقی طاقت کے ضائع ہونے سے انسان بچ جاتا ہے جو مسمریزم کے عمل کے بعد دیر تک جاری رہ کر انسان کو کمزور کر دیتی ہے۔ پس ہاتھوں اور پاؤں کے دھونے سے بھی ان خیالات کی رَو کو روکا جا سکتا ہے جو نماز سے پہلے انسان کے دماغ میں جاری ہوتی ہے اور اُسے پھیر کر عبادت اور ذکر الٰہی کی طرف لایا جا سکتا ہے۔

غرض وضوء ایک نہایت پُر حکمت حکم ہے جس کے ایک ایک جزو کی تجربہ اور علم الاعصاب تائید کرتے ہیں۔ وضوء کا حکم

استنشاق:

نماز سے پہلے وضو یا تیمم

وضوء کی ترکیب اور اس کا فلسفہ

قرآن کریم میں موجود ہے (دیکھو سورۃ مائدہ ع۲)

نماز کو شروع کرنے کا طریق

جب پانی میسر نہ ہو یا انسان بیمار ہو یا وضوء سے بیماری کا خطرہ ہو۔ تو اس صورت میں اسلام نے تیمم کا حکم دیا ہے (سورۃ مائدہ آیت ۷ و نساء ۴۴) اور وہ حکم یہ ہے کہ پاک مٹی یا کسی پاکیزہ گرد والی چیز پر ہاتھ مار کر اپنے مُنہ پر اور ہاتھوں اور بازوؤں پر پھیر لے (بخاری کتاب التیمم باب التیمم للوجہ والکفین) یہ حکم بھی انہی حکمتوں سے پُر ہے کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ صاف اور پاک مٹی بھی پانی کا قائم مقام ہو جاتی ہے چنانچہ اسی حکمت کو کسی وقت سمجھ کر ہندو سادھوؤں نے جسم پر بھبوت ملنے کا طریق جاری کیا تھا مگر یہ بات اُن سے نظر انداز ہو گئی کہ یہ طریق ادنیٰ درجہ کا ہے اور پانی کے میسر نہ آنے یا استعمال نہ کر سکنے کی صورت میں ایک قائم مقام کے طور پر ہی استعمال ہو سکتا ہے ورنہ پانی کا استعمال بہر حال افضل اور اعلیٰ ہے۔ تیمم کا حکم بھی قرآن کریم میں مذکور ہے اور سورۃ نساء ع۷ میں اس کا ذکر آتا ہے۔

سینہ پر ہاتھ باندھنا

مرد اور عورت کے شہوانی اجتماع کے بعد کے لئے ایک زائد حکم بھی ہے اور وہ یہ کہ نماز پڑھنے سے پہلے نہا بھی لے۔ اس حکم میں یہ حکمت ہے کہ یہ فعل جیسا کہ تجربہ اس پر شاہد ہے سارے جسم پر اثر کرتا ہے اور جسم کے ہر حصہ کی برقی طاقت میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ پس اس کو ٹھنڈا کر کے سارے جسم کی برقی طاقت اور خیالات کے انتشار کو دُور کرنا عبادت کی تکمیل اور خدا تعالےٰ کے ساتھ حصول اتصال کے لئے ضروری ہے۔ اس کا حکم سورۃ نساء کے رکوع ۷ میں بیان ہے۔ مگر جس طرح بیماری اور پانی کے میسر نہ آنے کی صورت میں وضوء کی جگہ تیمم کو کافی قرار دیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں صورتوں میں بھی غسل کی جگہ تیمم کو کافی قرار دیا گیا ہے۔

قیام اور اس کی دعائیں

وضوء یا تیمم جو بھی صورت ہو اس کے بعد مسلمان کو حکم ہے کہ اگر امن کی حالت ہو اور زمین پر ہو تو قبلہ رُو کھڑا ہو کر (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب التوجہ نحو القبلۃ) دونوں ہاتھ اٹھا کر اور ہاتھوں کو قبلہ رُو کر کے انگوٹھوں کو اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہوئے (جس کے معنے ہیں اللہ سب سے بڑا ہے) کانوں کی لوؤں تک

نماز شروع کرتے ہوئے قبلہ کی طرف منہ کرنا

لے جائے (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب استفتاح الصلوٰۃ ونسائی کتاب الافتتاح الصلوٰۃ باب موضع الابہامین عند الرفع) اور اس نیت کے ساتھ کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے لگا ہے دوسرے سب خیالات کو دور کر کے جلوت الٰہی کے خیال میں محو ہو جائے۔ اس طرح ہاتھ اُٹھانے میں علاوہ توجہ کے قیام کے یہ بھی حکمت ہے کہ یہ حرکت طبعی طور پر باقی سب امور کو ترک کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے پس اس حرکت سے مسلمان یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس وقت دنیا کے سب خیالات اور کاموں سے علیحدہ ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ ہاتھوں کی اسی قسم کی حرکت کی طرف غالب نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے کرتے ہیں سلام
جس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

پس اس حرکت سے مومن گویا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ سب دنیا سے قطع تعلق کر کے اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے بیداری اور چستی بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد مسلمان اپنے سینہ پر ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ (ابن خزیمہ بروایت وائل بن حجر) گویا مؤدب ہو کر اللہ تعالےٰ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ عبارت کہتا ہے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما یقول عند افتتاح الصلوٰۃ ونسائی کتاب الافتتاح باب الذکر بین افتتاح الصلوٰۃ و بین القراءۃ) یعنی اے اللہ تو ہر نقص سے جو تیرے مقام کے خلاف ہے پاک ہے اور ہر خوبی سے جو تیری شان کے لائق ہے متصف ہے اور تیرا نام تمام برکتوں کا جامع ہے اور تیری شان بہت بلند ہے اور تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ اے اللہ میں ہر اُس بد روح سے جو تیری درگاہ سے دور کی گئی ہے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ اس کا اثر مجھ پر نہ ہو اور میں تیری درگاہ سے دور ہونیوالوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔ پھر وہ سورہ فاتحہ پڑھتا ہے (نسائی کتاب الافتتاح باب البداءۃ بفاتحۃ الکتاب

قبل السورۃ و ایجاب قرأۃ فاتحۃ الکتاب) اس کے بعد وہ قرآن کریم کی کوئی سورۃ یا کم سے کم کسی سورۃ کا اتنا حصہ جو تین آیات پر مشتمل ہو پڑھتا ہے اور پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر رکوع میں چلا جاتا ہے (رکوع اُسے کہتے ہیں کہ انسان اس طرح کمر سیدھی کرے کہ اس کا سر اور لاتوں کا اوپر کا حصہ ایک دوسرے کے متوازی ہو جائیں جھک جاتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتا ہے اور لاتیں بالکل سیدھی رکھتا ہے ان میں خم پیدا نہیں ہونے دیتا (نسائی کتاب افتتاح الصلوٰۃ باب الاعتدال فی الرکوع) پھر اس حالت میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کا فقرہ کہتا ہے جس کے معنے ہیں کہ میرا رب جو اپنی شان کی وسعت میں سب سے بڑھکر ہے تمام نقائص سے پاک ہے۔ یہ فقرہ کم سے کم تین بار یا اس سے زیادہ طاق عدد میں وہ دہراتا ہے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ ما جاء فی التسبیح فی الرکوع) پھر سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہہ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس فقرہ کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہر اس شخص کی دعا کو سُنتا ہے جو سچے دل سے اس کی تعریف بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد وُہ پوری طرح کھڑا ہو کر ہاتھ سیدھے چھوڑ کر یہ دعا مانگتا ہے کہ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ (نسائی کتاب الافتتاح ما یقول الماموم اذا رفع راسہ من الرکوع) یعنی اے میرے رب سب تعریف تیرے ہی لئے ہے کثرت سے تعریف اور پاک تعریف جو سب تعریفوں کی جامع ہے۔ اس کے بعد وُہ پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہکر سجدہ میں چلا جاتا ہے۔ سجدہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنی سات ہڈیوں پر زمین پر جھک جاتا ہے یعنی اس کا ماتھا زمین پر پوری طرح لگا ہوا ہو اس کے دونوں ہاتھ قبلہ رُو زمین پر رکھے ہوئے ہوں اور اس کے گھٹنے بھی زمین پر لگے ہوئے ہوں اور اس کے دونوں پاؤں بھی زمین پر لگے ہوئے ہوں اس طرح کہ دونوں پاؤں کی انگلیاں دبا کر قبلہ رُو کی ہوئی ہوں (مسلم جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب فی اعضاء السجود) اس حالت میں مسلمان سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اے میرے رب تو اپنی شان کی بلندی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہے۔ یہ فقرہ وُہ کم سے کم تین دفعہ یا اس سے زیادہ کسی طاق عدد کے مطابق کہتا ہے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التسبیح فی السجود) اس کے بعد وہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس کی بائیں لات تو تہہ ہو کر اس کے نیچے آجائے اور پاؤں لیٹا ہوا ہو۔ اور اس پر سہارا لیکر وہ بیٹھ جائے اور دائیں لات اس طرح ہو کہ ہو تو وہ بھی تہہ کی ہوئی مگر اس کا پاؤں اس طرح کھڑا ہو کہ انگلیاں قبلہ رُخ ہوں۔ اس وقفہ میں وہ یہ دُعا پڑھتا ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ (ابو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب السجود و فضلہ) جس کے یہ معنے ہیں کہ اے میرے رب میرے گناہ معاف کر اور مجھ پر رحم کر اور مجھے سب صداقتوں کی طرف رہنمائی بخش اور مجھے تمام عیبوں سے محفوظ رکھ اور مجھے اپنے پاس سے حلال و طیب رزق عطا فرما۔ بعض احادیث میں وَاجْبُرْنِیْ اور بعض میں وَارْفَعْنِیْ آتا ہے یعنی اے میرے رب میری تمام کمزوریوں کو دُور کر اور تمام نقصانات سے بچا اور میرا قدم ہر گھڑی ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہے) اس کے بعد وہ پھر بآواز بلند اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر پہلے کی طرح سجدہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پہلے سجدہ کی طرح دعا کر کے پھر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے ایک رکعت کہتے ہیں اس کے بعد وہ پہلے کی طرح پھر ایک رکعت ادا کرتا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ والی دعا جس سے اُس نے نماز شروع کی تھی وُہ اسے حذف کر دیتا ہے اور صرف سورۃ فاتحہ سے نماز شروع کرتا ہے۔ اس دوسری رکعت کے ختم کرنے پر وُہ اس طرح بیٹھ جاتا ہے جس طرح کہ پہلے سجدہ اور دوسرے سجدہ کے درمیان بیٹھا تھا اور تشہد پڑھتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب التشہد فی الآخرۃ) یعنی تمام وہ کلمات جو تعظیم کے لئے زبان سے نکل سکتے ہیں اور تمام وہ عبادات

بیٹھنا اور اسکی دعا

دعا بین السجدتین

رکوع سے کھڑے ہونے کی دعا

تشہد

سجدہ، اس کا طریق اور اس کی دُعا

جو جسم انسانی بجا لا سکتا ہے اور تمام وہ مالی قربانیاں جو کسی پاک
ذات کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں خدا تعالیٰ کا ہی حق ہیں اس
کے سوا اور کوئی ہستی ان کی مستحق نہیں اور اے نبی تجھ پر اللہ تعالیٰ
کی طرف سے سلامتی نازل ہو اور اللہ تعالیٰ کا رحم تجھ پر اُترتا
رہے اور اس کی برکتوں سے تو حصہ پاتا رہے اور ہم پر جو اس
نماز میں شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندے جو پہلے
گذر چکے ہیں یا اس وقت موجود ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں
ان سب پر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہو اور یہ کہ
میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور یہ کہ محمد اللہ
کے بندے اور رسول ہیں۔

درُود شریف

اس کے بعد وہ درُود پڑھتا ہے جو مختلف الفاظ میں
آتا ہے مگر مختصر درُود یہ ہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ
عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی
اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ
عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
(بخاری جلد دوم کتاب بدء الخلق باب یزفّون النسلان فی
المشی و مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ
وسلم) اس کے معنے یہ ہیں کہ اے اللہ محمد پر اپنے فضل اور رحمتیں
نازل کر اور اسی طرح تمام ان لوگوں پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
سے تعلق رکھتے ہیں جس طرح تو نے ابراہیم پر اور ابراہیم سے
تعلق رکھنے والوں پر فضل اور رحمت نازل کی تھی اور اے اللہ محمد صلعم
پر بھی برکتیں نازل کر اور ان پر بھی جو آپ سے تعلق رکھتے ہیں۔
جس طرح تو نے ابراہیم پر اور اس سے تعلق رکھنے والوں پر
برکتیں نازل کی تھیں۔ اس کے بعد وہ بعض دعائیں جو رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں پڑھتا ہے مثلاً یہ کہ اَللّٰھُمَّ
اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ
الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ
وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ (ابوداؤد
کتاب الصلوٰۃ باب الاستعاذہ) یعنی اے میرے رب میں تیری
پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ مجھے کوئی گھبرا دینے والی مصیبت
پہنچے یا مجھے غم فکر دبا لیں اور اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا
ہوں اس بات سے کہ میں وہ سامان کھو بیٹھوں جن سے میری زندگی
کے کام چلتے ہیں یا وہ طاقتیں میری جاتی رہیں جن کی مجھے اپنے
مقاصد کے حصول کے لئے ضرورت ہے اور اس سے بھی پناہ چاہتا
ہوں کہ میرے پاس ترقی میں مدد دینے والے سامان تو موجود ہوں یا
ترقی میں مدد دینے والی طاقتیں تو مجھے حاصل ہوں مگر اُن کے
استعمال سے میں گریز کروں اور سُستی اور کاہلی کا شکار ہو جاؤں اور
اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں بُزدلی اور
بخل کی اخلاقی امراض سے۔ اور اے میرے رب
اس بارہ میں بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ مجھے قرض دبا لے اور
میں لوگوں کی نظروں میں قرض نہ ادا کرنے کی وجہ سے ذلیل ہو
جاؤں اور اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ ایسے انسان مجھ پر
مسلّط ہو جائیں جو میرے حقوق کو تلف کریں اور مجھے ان ترقیات
کے حصول سے روک دیں جو ہر انسان کے لئے تو نے اپنے فضل
سے مقدر کر چھوڑی ہیں۔

نماز کو ختم کرنے کا طریق

تشہد کے بعد پڑھنے کیلئے مسنون دعا

یہ اور اسی قسم کی اَور دعائیں ہیں جو رسول کریم صلی اللہ
سے ثابت ہیں ان دعاؤں کو اس موقع پر مسلمان پڑھتا ہے یا جو
اور دعائیں اپنی ضرورت کے مطابق مناسب سمجھتا ہے مانگتا ہے
پھر وہ پہلے دائیں طرف منہ کرکے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ
کہتا ہے اور اس کے بعد بائیں طرف منہ کرکے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ
وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کہتا ہے اور اس کی نماز ختم ہو جاتی ہے۔

یہ اس صورت میں ہے کہ نماز دو رکعت کی ہو اگر دو رکعت
سے زائد کی نماز ہو تو بجائے اِدھر اُدھر منہ پھیر کر السلام علیکم
ورحمۃ اللہ کہنے کے مسلمان اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر پھر کھڑا ہو جاتا ہے
اور تین رکعت کی نماز ہو تو ایک رکعت اور پڑھکر دوبارہ تشہد پڑھ
کر سلام پھیرتا ہے اور اگر چار رکعت کی نماز ہو تو دو رکعت اور
پڑھکر پھر تشہد میں بیٹھ کر اور اوپر کی دعائیں اور کلمات پڑھکر
سلام پھیر دیتا ہے۔ جب دو رکعت سے لمبی نماز ہو تو پہلے تشہد
کے بعد ایک یا دو رکعت جو وہ پڑھتا ہے ان میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتا

ہے قرآن کریم کی زائد آیات نہیں پڑھتا۔

نماز مسلمانوں پر پانچ وقت فرض ہے ایک نماز صبح کی جس کا وقت پو پھٹنے سے لیکر سورج نکلنے کے وقت تک ہوتا ہے یعنی سورج نکلنے سے پہلے یہ نماز ختم ہو جانی چاہیئے اس نماز کی دو رکعت ہوتی ہیں ایک نماز سورج ڈھلنے سے لے کر اندازاً پونے تین گھنٹہ بعد تک پڑھی جاتی ہے گرمیوں میں یہ وقت ہندوستان میں کوئی تین گھنٹہ تک چلا جاتا ہے اس نماز کو ظہر کی نماز کہتے ہیں اور اس کی چار رکعت ہوتی ہیں اس کے بعد تیسری نماز کا وقت شروع ہوتا ہے یہ نماز دھوپ کے زرد ہونے کے وقت تک پڑھی جا سکتی ہے اسے عصر کی نماز کہتے ہیں اور اس کی بھی چار رکعت ہوتی ہیں اس کے بعد سورج ڈوبنے سے لے کر شفق یعنی مغرب کی طرف کی سرخی کے غائب ہونے تک چوتھی نماز کا وقت ہوتا ہے اور اسے مغرب کی نماز کہتے ہیں اسکی رکعتیں تین ہوتی ہیں پہلی دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھتے ہیں اور پھر کھڑے ہو کر ایک رکعت پڑھتے ہیں اور دونوں سجدوں کے بعد تشہد میں بیٹھ کر اور جو دعائیں اوپر بیان ہو چکی ہیں پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں اس کے بعد پانچویں نماز کا وقت شروع ہوتا ہے جسے عشاء کی نماز کہتے ہیں اس کا وقت ہندوستان کے اوقات کے لحاظ سے غروب آفتاب سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد سے شروع ہوتا ہے اور نصف شب تک اور بعض کے نزدیک اس کے بعد تک بھی چلا جاتا ہے اس نماز کی رکعتیں بھی چار ہوتی ہیں جو رکعتیں بیان کی گئی ہیں یہ اس وقت کے لئے ہیں جبکہ انسان وطن میں موجود ہو یا ایسی جگہ پر ہو جہاں اس کی مستقل اقامت ہو۔ جب سفر میں ہو تو اس صورت میں صبح اور مغرب کی نمازوں کے سوا دوسری نمازیں آدھی پڑھی جاتی ہیں یعنی بجائے چار رکعتوں کے دو دو رکعت پڑھی جاتی ہیں بعض لوگوں میں غلطی سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ سفر میں آدھی نماز رہ گئی ہے لیکن اصل بات یہ نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جسے امام مالکؒ نے نقل کیا ہے (موطا امام مالک قصر الصلوٰۃ فی السفر) تا بت ہے کہ جب نماز فرض ہوئی ہے تو ظہر عصر اور عشاء کی دو رکعتیں ہی تھیں مگر بعد میں سفر کی حالت میں دو دو رکعتیں ہی رہنے دی گئیں لیکن حضر یعنی اقامت کے ایام میں دگنی نماز کر دی گئی یعنی دو دو کی جگہ چار چار رکعتوں کا حکم ملا۔

مسلمانوں پر پانچ نمازوں کی فرضیت اور ان کی تفصیل اور ان کے اوقات۔

ان نمازوں میں سے صبح کی نماز باجماعت ہو تو امام سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کا حصہ بلند آواز سے پڑھتا ہے اور مقتدی سورہ فاتحہ ساتھ ساتھ آہستہ پڑھتے ہیں اور باقی قرأت صرف سنتے ہیں باقی حصہ نماز کا امام بھی آہستہ پڑھتا ہے سوائے تکبیروں اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اور آخری سلاموں کے۔ ظہر کی نماز میں تمام رکعتوں میں امام آہستہ پڑھتا ہے اور اس کے پیچھے کے نمازی بھی اپنے طور پر سورہ فاتحہ اور قرآن کریم پڑھتے ہیں۔ عصر کی نماز بھی اسی طرح ہوتی ہے مغرب کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں امام سورہ فاتحہ بلند پڑھتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کے مقتدی آہستہ آہستہ منہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے جاتے ہیں سورہ فاتحہ کے بعد امام قرآن کریم کا کچھ حصہ جب پڑھتا ہے تو مقتدی خاموش اس کے پڑھے ہوئے کو سنتے ہیں خود کچھ نہیں پڑھتے۔ آخری رکعت میں امام بھی دل میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہے اور مقتدی بھی۔ عشاء کی نماز میں بھی پہلی دو رکعتوں میں اسی طرح امام بلند آواز سے سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کا کچھ اور حصہ پڑھتا ہے اور مقتدی سورہ فاتحہ منہ میں دہراتے ہیں اور قرآن کریم کا دوسرا حصہ صرف سنتے ہیں مگر آخری دو رکعتوں میں قیام کی حالت میں امام صرف سورہ فاتحہ پڑھتا ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ منہ میں۔ اور مقتدی بھی اپنے اپنے طور پر آہستہ آہستہ ہی منہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں تمام نمازوں میں باجماعت ہوں تو امام تکبیریں اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اور نماز کے خاتمہ کے بعد کا سلام بہرحال بلند آواز سے کہتا ہے کیونکہ مقتدیوں کو ساتھ چلانا مدنظر ہوتا ہے۔

نمازِ وتر

ان پانچ فرض نمازوں کے علاوہ ایک نماز وتر کہلاتی ہے اس نماز کی بھی مغرب کی طرح تین رکعتیں ہیں مگر فرق یہ ہے کہ مغرب کی نماز میں پہلے تشہد کے بعد جو تیسری رکعت پڑھی جاتی ہے اس میں سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کی زائد تلاوت نہیں کی جاتی لیکن وتر کی نماز میں تیسری رکعت میں بھی سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کی چند آیات یا کوئی چھوٹی سورۃ پڑھی جاتی ہے (ترمذی جلد اول کتاب الصلوٰۃ ابواب الوتر باب ما جاء ما یقرأ فی الوتر)

دوسرا فرق اس میں یہ ہے کہ اس نماز کو مغرب کی نماز کے برخلاف دو حصوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ بھی جائز ہے کہ دو رکعتیں پڑھ کر تشہد کے بعد سلام پھیر دیا جائے اور پھر ایک رکعت الگ پڑھ کر تشہد کے بعد سلام پھیر دیا جائے (نسائی کتاب قیام اللیل وتطوع النہار باب کیف الوتر بثلاث و باب کیف الوتر بواحدۃ وکیف الوتر بثلاث) یہ نماز عشاء کے بعد بھی پڑھی جا سکتی ہے اور تہجد کی نماز کے بعد بھی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

نمازوں کو جمع کرکے پڑھنا۔

سنتیں

ان نمازوں کے علاوہ کچھ سنتیں ہوتی ہیں یعنی ایسی زائد نماز جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالالتزام ادا فرمایا کرتے تھے اور گو آپ ان کو فرض قرار نہ دیتے تھے لیکن ان کی تاکید کرتے رہتے تھے صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں ہیں اور بعد میں بھی چار رکعتیں ہیں۔ چار کی جگہ دو دو بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ عصر کے ساتھ کوئی ایسی سنتیں نہیں ہیں مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور عشاء کے بعد بھی دو یا چار رکعتیں پڑھی جاتی ہیں (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی من صلی فی یوم ولیلۃ ثنتی عشرۃ رکعۃ من السنۃ ماله من الفضل - و باب ما جاء فی الرکعتین بعد الظہر) اور انہی کے بعد مذکورہ بالا وتر پڑھے جاتے ہیں ان سنتوں کے علاوہ ایک نماز تہجد کہلاتی ہے نصف شب کے بعد کسی وقت پو پھٹنے سے پہلے یہ نماز پڑھی جا سکتی ہے مگر جیسا کہ تہجد کے معنوں سے ظاہر ہے یہ نماز سو کر اُٹھنے کے بعد پڑھی جانی چاہیئے گو کسی وقت سونے کا وقت نہ ملے اور نصف شب گذر جائے تو یوں بھی پڑھ سکتا ہے مگر قرآن کریم نے جو اس کا نام رکھا ہے اس سے بھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عشاء کے بعد آدمی سو جائے اور سونے سے اُٹھ کر یہ نماز ادا کرے اس نماز کو روحانی ترقیات سے بہت گہرا تعلق ہے اور قرآن کریم میں اس کی خاص تعریف آئی ہے (دیکھو سورۂ مزمل آیت ۱ تا ۶) ان کے علاوہ بعض اور سنتیں بھی ہیں جو مؤکد تو نہیں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاص تاکید تو نہیں فرمائی مگر آپ جب موقع ملتا انہیں ادا کرتے تھے ان میں سے ایک اشراق کی نماز ہے یعنی جب سورج نیزہ دو نیزے اوپر آ جائے اسی طرح اور بعض

نمازِ تہجد

نوافل ہیں لیکن حکم یہ ہے کہ جب سورج نکل رہا ہو یا ڈوب رہا ہو یا نصف النہار کا وقت ہو تو نماز ناجائز ہے اور جب دھوپ زرد ہو جائے تب بھی ناپسندیدہ ہے۔

نمازوں کو ان کے مقررہ وقت پر پڑھنے کا حکم ہے لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے مثلاً بارش ہو اور بار بار مسلمانوں کا جمع ہونا مشکل ہو یا کوئی ایسا اجتماعی کام ہو جسے درمیان میں نہ چھوڑا جا سکتا ہو یا سفر ہو تو جائز ہے کہ ظہر اور عصر کی نمازوں کو ملا کر پڑھ لیا جائے اس صورت میں بعض کے نزدیک درمیانی سنتیں معاف ہوتی ہیں اور بعض کے نزدیک پہلی اور پچھلی سنتیں بھی معاف ہوتی ہیں اور میرے نزدیک یہی آخری بات درست ہے مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھنا بھی انہی حالات میں اور اسی طرح جائز ہے جس طرح کہ ظہر اور عصر کا۔ مگر جمع ظہر یا عصر مغرب یا عشاء صبح کا ملا کر پڑھنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ کوئی ایسے شدید کام میں ہو کہ اس کا ترک جان کے لئے پُرخطر ہو جیسے جہاد میں کہ اگر لڑائی سے ہٹ کر نماز پڑھے تو دشمن قتل کر دے گا یا مثلاً نہر یا دریا کا بند ٹوٹ جائے اور اس کے بند کرنے میں لوگ مشغول ہوں یا آگ لگ جائے اور اس کے بجھانے میں لوگ مشغول ہوں تو ایسے مواقع پر ان نمازوں کو بھی جمع کیا جا سکتا ہے جن کو امن کی حالت میں جمع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ آفات ملک اور قوم اور شہر کی تباہی کا موجب ہوتی ہیں اس صورت میں بھی ان نمازوں کو جو عام طور پر جمع نہیں ہو سکتیں جمع کرنا جائز ہے کہ کوئی شخص بیہوش ہو جائے اور اس وقت ہوش آئے کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے مثلاً عصر کی نماز کے وقت بیہوش ہو اور عشاء کے وقت ہوش آئے تو عصر اور مغرب جمع کرکے پڑھ لے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے موقعہ پر ظہر، عصر مغرب اور عشاء جمع کیں گو ان مجبوریوں کی وجہ سے جو اوپر بیان ہوئیں ان نمازوں کا جمع کرنا بھی جائز ہے جو عام طور پر جمع نہیں کی جا سکتیں لیکن جو نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی جائے اسے دوسرے موقعہ پر پڑھنا جائز نہیں یعنی وہ نماز کے طور پر قبول نہ ہوگی اس کا علاج صرف توبہ اور استغفار ہے ہاں بھول اور نسیان کے سبب سے یا سوتے رہنے کی وجہ سے جو نماز چھٹ جائے جب بھی یاد آ جائے یا آنکھ

کُھلے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ ممنوع وقت نہ ہو جیسے سورج نکل رہا ہو تو سو کر اُٹھنے والا انتظار کرے اور جب سورج پوری طرح نکل چکے تو اس وقت نماز ادا کرے۔

ان نمازوں کے علاوہ ایک جمعہ کی نماز ہے جو جمعہ کے دن ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے اس دن ظہر کی نماز نہیں پڑھی جاتی جمعہ کی نماز سے پہلے امام خطبہ پڑھتا ہے جس میں حسب موقعہ کسی اسلامی مسئلہ یا مسلمانوں کی کسی ضرورت کے متعلق وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس کے بعد وہ دو رکعت نماز پڑھاتا ہے جس میں برخلاف ظہر کی نماز کے سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کا حصہ بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے وقت مقتدی ساتھ ساتھ سورۂ فاتحہ کے الفاظ مُنہ میں آہستہ طور پر دُہراتے جاتے ہیں اور دوسری قراءت کے وقت صرف کلامِ الٰہی سُنتے ہیں۔

اس کے علاوہ دو اور نمازیں ہوتی ہیں ایک رمضان کے بعد کی عید کی نماز اور ایک حج کے موقعہ کی عید کی نماز۔ رمضان کے بعد کی عید پہلی شوال کو ہوتی ہے اس میں دو رکعت ہوتی ہیں اور سورۂ فاتحہ اور تلاوت بلند آواز سے امام پڑھتا ہے اور حج کے موقعہ کی عید حج کے دوسرے دن دسویں ذی الحجہ کو ہوتی ہے اس میں بھی دو رکعتیں ہوتی ہیں اور امام سورۂ فاتحہ اور مزید حصہ قرآن کریم کا بلند آواز سے پڑھتا ہے۔

یہ دونوں نمازیں دن کے ابتدائی حصہ میں ہوتی ہیں روزوں کے بعد کی عید جسے عید الفطر کہتے ہیں ذرا دیر سے پڑھی جاتی ہے اور حج کے بعد کی جسے عید الاضحیہ کہتے ہیں ذرا سویرے پڑھی جاتی ہے

ان دونوں نمازوں کے ساتھ بھی خطبہ ہوتا ہے مگر جمعہ کے خطبہ کے برخلاف ان عیدوں میں خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے ان دونوں نمازوں سے پہلے اقامۃ نہیں کہی جاتی۔

ان نمازوں کے علاوہ ایک ضروری نماز جنازہ کی نماز ہے یہ فرضِ کفایہ ہے یعنی جب کوئی مسلمان فوت ہو اور کچھ مسلمان اس کا جنازہ پڑھ لیں تو سب کی طرف سے فرض کا ادا ہونا سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر کسی مسلمان کی نماز جنازہ کوئی مسلمان بھی ادا نہ کرے تو سب مسلمان جن کو علم ہو اور وہ شامل نہ ہوئے مجرم سمجھے جاتے ہیں گویا جنازہ کی ادائگی انفرادی ذمہ داری نہیں بلکہ قومی ذمہ واری ہے

نمازِ جمعہ

جنازہ کی نماز میں دوسری نمازوں کے برخلاف رکوع اور سجدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے سب حصے کھڑے کھڑے ادا کئے جاتے ہیں (بخاری جلد اول باب فی الجنائز باب سنۃ الصلوٰۃ علی الجنائز) اور یہ جنازہ کی نماز میت کو سامنے رکھ کر پڑھائی جاتی ہے اور یہی وجہ اس میں رکوع اور سجدہ نہ ہونے کی ہے کیونکہ میت کے سامنے پڑے ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دھوکا لگ سکتا ہے کہ یہ رکوع اور سجدہ اس میت کو کیا جا رہا ہے اور ایسی لاش جو کسی بزرگ کی ہو اس کا جنازہ پڑھتے ہوئے کئی کمزور طبائع خود بھی اس خیال میں مبتلا ہو سکتی ہیں پس نماز جنازہ سے رکوع اور سجدہ کو اُڑا دیا گیا تا شرک کا قلع قمع ہو۔

صلوٰۃ عیدین

اس نماز کے چار حصے ہوتے ہیں امام قبلہ رو کھڑا ہو کر بلند آواز سے سینہ پر ہاتھ باندھ کر تکبیر کہہ کر اس نماز کو شروع کرتا ہے اس نماز سے پہلے اقامۃ نہیں کہی جاتی پہلی تکبیر کے بعد مُنہ میں آہستہ آواز سے امام اور مقتدی اپنے اپنے طور پر سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اس کے بعد امام پھر بلند آواز سے تکبیر کہتا ہے اور بغیر رکوع میں جانے کے اسی طرح کھڑے ہوئے مُنہ میں آہستہ آواز سے درود پڑھتا ہے اور مقتدی بھی اپنے اپنے طور پر ایسا ہی کرتے ہیں اسکے بعد امام پھر تکبیر کہتا ہے اور اسی طرح کھڑے کھڑے میت کی بخشش کے لئے اگر وہ بالغ ہو دُعا کرتا ہے اسی طرح دوسرے مسلمان مردوں عورتوں بڑوں چھوٹوں سب کے لئے عموماً اور میت کے پسماندگان کے لئے خصوصاً دُعا کرتا ہے اور مقتدی بھی یہی کام کرتے ہیں میت نابالغ ہو تو اس کے ماں باپ کے صبر اور نعم البدل کے لئے دُعا کی جاتی ہے اور اس امر کے لئے کہ

نمازِ جنازہ

مرنے والے کو خدا تعالےٰ اس کے رشتہ داروں کے لئے اگلے جہان میں رحمت اور بخشش کا ذریعہ بنا دے بعض مقررہ دعاؤں کے علاوہ اپنے طور پر اپنی زبان میں بھی دُعا کی جا سکتی

قصرِ صلوٰۃ

ہے اور کی جاتی ہے اس کے بعد امام پھر بلند آواز سے تکبیر کہتا اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد سلام پھیر کر نماز کو ختم کر دیتا ہے

نمازِ استسقاء

بعض اور قسم کی نمازیں بھی اسلام میں ہیں مثلاً استسقاء کی نماز جو قلت باراں اور خطرۂ قحط کے وقت میں پڑھی جاتی ہے کسوف و خسوف کے موقعہ کی نماز۔ صلوٰۃ الحاجۃ یعنی کسی بڑی مصیبت کے دُور ہونے کے لئے یا دُور ہونے پر شکریہ کے طور پر یہ نماز پڑھی جاتی ہے مگر یہ نمازیں چونکہ کبھی کبھی ادا ہوتی ہیں میں ان کے بارہ میں اس جگہ کچھ لکھنا نہیں چاہتا فقہ کی کتابوں میں ان کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

صلوٰۃِ حاجت

تمام باجماعت ادا ہونے والی نمازوں کے لئے حکم ہے کہ امام آگے کھڑا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے اتنے اتنے فاصلہ پر صفیں باندھ کر کھڑے ہوں کہ سب آسانی سے سجدہ کر سکیں صفوں کو درست کرنے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر زور دیتے تھے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی اقامۃ الصفوف) قرآن کریم سے بھی اس بارہ میں استدلال ہوتا ہے۔

باجماعت نماز کے لئے صف آرائی۔

نماز میں سجدہ اور قعدہ کے علاوہ باقی سب حصے کھڑے ہو کر ادا کئے جاتے ہیں لیکن بیمار کے لئے بیٹھ کر اور بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھنا جائز ہے۔

نماز کے وقت ادھر اُدھر دیکھنا نظر پھرانا بات کرنا یا نماز سے باہر والے کی بات کی طرف توجہ کرنا اور اسی قسم کے اور کام جو نماز کے فعل میں خلل ڈالیں منع ہوتے ہیں (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الالتفات فی الصلوٰۃ و باب القطع فی الصلوٰۃ و باب تشمیت العاطس فی الصلوٰۃ) بلا وجہ کھانسنا ادھر اُدھر ہلنا بھی ناجائز ہے یہ حکم پہلی تکبیر سے لے کر سلام تک کے وقت کے لئے ہے۔

نماز کے آداب

جب نماز ایسے خوف کے وقت پڑھی جائے کہ نماز پڑھی تو جا سکتی ہو لیکن پورے اطمینان سے نہ پڑھی جا سکتی ہو جیسے مثلاً جنگ کا میدان ہو اور عملاً لڑائی نہ ہو رہی ہو لیکن دشمن حملہ کی تیاری میں ہو یا حملہ کا خوف ہو تو اس صورت میں کئی طرح نماز میں تخفیف جائز ہے ایک مسنون طریق یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ دو رکعتیں اور زیادہ خطرہ ہو تو ایک رکعت ادا کرے دوسرا حصہ دشمن کی طرف مُنہ کر کے کھڑا رہے جب پہلا حصہ ایک یا دو رکعت جیسا بھی موقعہ ہو ختم کرے تو جو حصہ کھڑا تھا وہ امام کے پیچھے آجائے اور پہلا پیچھے ہٹ کر دشمن کی طرف مُنہ کر کے کھڑا رہے اگر دشمن قبلہ کی طرف ہو تو بہر حال سب کا مُنہ ایک ہی طرف ہوگا (مسلم جلد اوّل کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ الخوف) اس نماز کی مختلف صورتیں ہیں جو گیارہ تک پہنچتی ہیں اور خطرہ کی مختلف حالتوں کے مطابق ہیں اس جگہ ان سب کے بیان کا موقعہ نہیں خلاصہ یہ ہے کہ نماز باجماعت کا حکم خطرہ جنگ کی صورت میں مختلف حالات کے ماتحت بدل جائے گا اور موقعہ کے مناسب ان مختلف صورتوں کے مطابق جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں بدلتا رہے گا اس نماز کا ذکر قرآن کریم میں سورہ نساء رکوع ۱۵ میں آتا ہے۔

اس کے علاوہ جب خطرہ شدید ہو اور سواری پر یا پیدل دوڑ کر دشمن کے مقابلہ کے لئے جانا پڑے یا پیچھے ہٹنا پڑے تو سواری پر ہی یا دوڑتے ہوئے بھی نماز جائز ہے اور اسے جلدی جلدی ادا کرنے کی بھی اجازت ہے اس کا ذکر بھی سورۂ نساء کے رکوع ۱۵ میں آتا ہے۔

نماز قبلہ رُخ ہو کر پڑھی جاتی ہے یعنی جہاں بھی کوئی ہو کعبہ کی طرف مُنہ کر کے جو کہ مکہ مکرمہ میں ہے کھڑا ہوتا ہے اس طرح تمام دنیا کے مسلمانوں کی توجہ ایک مرکز کی طرف جمع ہو جاتی ہے یہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنا اس لئے نہیں کہ اسلام نے کعبہ کو کوئی خدائی صفت دی ہے بلکہ جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے اور اسی سورۃ میں آگے آئے گا ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہونے کا حکم باجماعت نماز کے لئے ضروری تھا اگر کوئی خاص جہت مقرر نہ کی جاتی اور صفوں میں کھڑے ہو کر ایک جگہ پہ لوگ نماز نہ پڑھ سکتے کسی کا مُنہ کسی طرف ہوتا اور کسی کا کسی طرف تو نماز جماعتی عبادت کس طرح بنتی؟ پس جب جماعتی عبادت کے لئے کسی نہ کسی طرف مُنہ کرنا ضروری تھا تو اللہ تعالیٰ

نے مسلمانوں کے لئے خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم دے دیا جس کی نسبت اسلام کا دعدہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا یہی ہے (آل عمران آیت ۹۶) یہ گھر حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے کا بنا ہُوا ہے مگر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کسی وقت منہدم ہوگیا تھا جس پر خدا تعالےٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لڑکے اسماعیلؑ کی مدد سے اسے دوبارہ بنایا (بخاری جلد ۲ کتاب بدأ الخلق باب یزفون النسلان فی المشی) حضرت اسمٰعیل ابھی بچہ ہی تھے کہ انہیں اور ان کی والدہ کو اللہ تعالےٰ کے حکم سے اس مقام کی خدمت اور اس میں ذکر الٰہی جاری رکھنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ مکہ میں چھوڑ گئے تھے (بخاری جلد ۲ کتاب بدء الخلق باب یزفون النسلان فی المشی) اور اللہ تعالےٰ نے انہیں خبر دی تھی کہ کسی وقت یہ مقام تمام سچے پرستاروں کا مرکز ہوگا (سورہ بقرہ آیت ۱۲۵ وحج آیت ۲۷) چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے یہ پیشگوئی پوری کی (سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ وسورۃ جمعہ آیت ۲) اس لئے اسی مقام کو مسلمانوں کے ظاہری اجتماع کا مرکز بنایا گیا۔ تا انہیں ہمیشہ وہ فرض یاد رہے جو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے جماعت مسلمین کے قیام کی غرض کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔

اس کا ثبوت کہ کعبہ عبادت کا حصہ دار نہیں صرف اجتماع کا ذریعہ ہے یہ ہے کہ جب چلتی ہوئی کشتی یا کسی دوسری سواری میں نماز ادا کرنی پڑے تو ایک دفعہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز شروع کر لینا کافی ہوتا ہے اس کے بعد سواری کا منہ کدھر بھی ہو جائے نماز میں خلل نہیں پڑتا (ترمذی جلد اوّل ابواب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ الی الراحلۃ و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب التطوع علی الراحلۃ) اور جب کعبہ کی طرف کا علم نہ ہو سکے تو نماز معاف نہیں ہو جاتی بلکہ جدھر مُنہ کر کے بھی نماز پڑھ لی جائے جائز ہے بلکہ ضروری ہے کہ نماز پڑھے خواہ کدھر ہی مُنہ کر کے نماز پڑھے (ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی الرجل یصلی لغیر القبلۃ فی الغیم)

اگر وضو اور تیمم دونوں نہ کر سکے تو اس صورت میں بھی میرے نزدیک نماز ادا کر سکتا ہو تو ادا کرے جیسے مثلاً جہاز غرق ہو جائے اور کوئی شخص لائف بلٹ پہن کر سمندر میں کُود پڑے اور عرصہ تک اسے بچانے والا کوئی نہ آئے تو نہ یہ وضو کر سکے گا نہ تیمم۔ اس سورۃ میں اس کا اشارہ کے ساتھ ہی نماز پڑھ لینا درست ہوگا اور جن فقہاء کے نزدیک اس طرح پانی میں ہونا وضو ہی کا مترادف ہے ان کے خیال کی رو سے تو اس کا وضو ہی ہوگا کیونکہ وضو والے سب اعضاء دُھل چکے ہونگے۔

نماز میں کعبہ کیطرف مُنہ کرنے کی وجہ اور حکمت۔

نماز کی شکل میں حکمت

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں جو قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ مقرر کئے گئے ہیں یہ ایک رسمی سی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ہیئتوں کے اختیار کرنے میں خاص حکمتیں ہیں جو نماز کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں اور نماز کا ان پر مشتمل ہونا اسے ایک رسمی عبادت نہیں بناتا۔ ان ہیئتوں پر اس کا مشتمل ہونا اسے روحانیت کے لئے مکمل بناتا ہے اصل بات یہ ہے کہ انسانی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ جسم کا اثر رُوح پر اور روح کا اثر جسم پر پڑتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جو رونی صورت بنائے اس کی آنکھوں میں کچھ دیر کے بعد آنسو آجاتے ہیں اور دل بھی غمگین ہو جاتا ہے اور جس غمگین آدمی کے پاس بیٹھ کر لوگ ہنسیں اور اسے ہنسائیں تھوڑی دیر کے بعد اس کے دل پر سے غم کا اثر کم ہونے لگتا ہے اور اس کے اُلٹ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل کے غم اور خوشی کا اثر انسان کے چہرہ اور دوسرے اعضاء پر پڑتا ہے حتّٰی کہ بعض دفعہ ایک رات کے صدمہ سے بعض لوگوں کے بال تک سفید ہو گئے ہیں اس طبعی قانون کے مطابق اسلام نے عبادت الٰہی میں چند جسمانی افعال بھی شامل کئے ہیں تاکہ وہ ظاہری ہیئتیں جو ادب کا اظہار کرتی ہیں اس کے باطن میں بھی اسی قسم کا جذبہ پیدا کریں

نماز کی شکل میں حکمت۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں ادب اور احترام کے اظہار کے لئے مختلف اقوام نے مختلف شکلوں کو اختیار کیا ہے بعض قوموں میں ادب کے اظہار کا طریق یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے

سامنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بعض قوموں میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونا ادب کے اظہار کی علامت ہے بعض میں رکوع کی طرح جھک جانا ادب کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور بعض قوموں میں سجدہ کے طور پر گر جانا ادب کے انتہائی اظہار کے لئے علامت مقرر کیا گیا ہے اور بعض قوموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھنا انتہائی ادب کے لئے علامت قرار دیا گیا ہے چنانچہ اسی وجہ سے مختلف اقوام میں عبادت کے وقت ان مختلف صورتوں کو اختیار کیا جاتا ہے ایرانی لوگ اپنے بادشاہ کے سامنے جسے وہ خدا تعالیٰ کا مظہر قرار دیتے تھے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اسی طرح بعض حالات میں وہ ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہوتے تھے مغربی ممالک میں گھٹنوں کے بل گرنے کو انتہائی تذلل کا مقام سمجھا جاتا ہے ہندوستان میں رکوع کی طرح جھکنا ادب کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح اپنے قابلِ تکریم بزرگوں اور بتوں کے آگے سجدہ کیا جاتا ہے اسلام چونکہ سب دنیا کے لئے ہے اس نے اپنی عبادت میں ان سب طریقوں کو جمع کر دیا ہے تاکہ ہر قسم کے لوگوں کے دلوں میں اس طریقِ عبادت سے وہ خشیت پیدا ہو جو عبادت میں پیدا ہونی چاہیئے کیونکہ ایک تو اپنی قومی عادت کے ماتحت وہ اس خاص ہیئت سے زیادہ متأثر ہونگے دوسرے اپنی قلبی کیفیت کے ماتحت وہ ان مختلف ہیئتوں سے موقعہ کے مناسب زیادہ متأثر ہونگے کیونکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے اندر جو مختلف تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کے ماتحت وہ کبھی تو شدتِ محبت اور شدتِ ادب کے وقت جھک جاتا ہے کبھی دو زانو ہو جاتا ہے کبھی سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی سجدہ میں گر جاتا ہے پس اس کے قلب کی جو بھی کیفیت ہوگی اس کے مطابق ہیئت کے وقت اس کے قلب میں جوش پیدا ہو جائے گا اور وہ اپنی عبادت سے پورا فائدہ اٹھا سکے گا۔

علاوہ طبعی کیفیت کے مختلف جسمانی کیفیتوں کے ماتحت بھی ان مختلف حرکات کا اثر انسانی دل پر مختلف پڑتا ہے مثلاً ایک نزلہ کا مریض سجدہ میں تکلیف پاتا ہے اور اس حالت میں اسے پورا جوش نہیں آتا لیکن کھڑے ہونے یا قعدہ کی حالت میں اسے پورا جوش دعا کے لئے پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اس کی صحت کے زیادہ مطابق ہوتی ہے مگر ایک دوسرا آدمی جس کی ٹانگوں میں ضعف محسوس ہو رہا ہو سجدہ میں زیادہ جوش پاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے چونکہ عبادت کو ایک اجتماعی فعل قرار دیا ہے اور چونکہ اس نے سب قوموں کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے اس نے اپنی عبادت میں ان تمام ہیئتوں کو جمع کر دیا ہے جن کے ذریعہ مختلف اقوام کو ادب و محبت کے اظہار کی عادت ہے اور جو مختلف حالتوں میں مختلف انسانوں کے دل میں عقیدت اور ادب کے جذبات کو اُبھار دیتی ہیں اور اس کی نماز ایسی جامع اور کامل ہے کہ اور کسی مذہب کی نماز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسی خصوصیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسلام نے اجتماعی نمازوں کا حکم دیا ہے کیونکہ جب مختلف استعدادوں کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں تو ایک دوسرے کے قلب کی حالت کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے اور کمزور قوی کی قوت ایمان کو اپنے دل پر تاثیر ڈالتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

چونکہ کبھی کبھی انسان کے دل میں خلوت میں عبادت کا جوش بھی پیدا ہوتا ہے اس لئے اسلام نے فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جیسا کہ تہجد کی نماز ہے اور اس طرح انسان کی اس مخصوص ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی نماز ان تمام طریقوں کی جامع ہے جو مختلف اقوام کے دلوں میں اس کیفیت کو پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے چلے آئے ہیں جو عبادت کے لئے ضروری ہے اور اس میں ہر قوم ہر فرد کی قلبی حالت کو درست کرنے اور عبادت کا سچا جذبہ پیدا کرنے کی قوت موجود ہے اور جن ظاہری ہیئتوں کا اختیار کرنا نماز میں لازمی قرار دیا گیا ہے ان سے نماز کی عظمت میں کمی نہیں آتی بلکہ وہ ان کے ذریعہ سے مکمل ہوتی ہے اور دوسری عبادات پر اسے فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

ان ظاہری افعال کے علاوہ اسلامی نماز اللہ تعالیٰ نے

کی تسبیح تحمید اور تعظیم کے ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو سنگدل سے سنگدل انسان کے دل کو بھی نرم کر دیتی ہے اور اس میں ایسی دُعائیں رکھی گئی ہیں جو انسانی فکر کو بہت بلند کر دیتی ہیں اور اس کے مقاصد کو اونچا کر دیتی ہیں اور اس کے جذبات کو نیکی اور تقوےٰ کے لئے اُبھار دیتی ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت کی آگ بھڑکا دیتی ہیں اور روحانی حصہ نماز کا وہی ہیں اور ان کا دوسری اقوام کی عبادات سے اگر مقابلہ کیا جائے تو دونوں میں وہی نسبت معلوم ہوتی ہے جیسے سورج کے مقابلہ پر مٹی کا ایک دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسلام نے عبادت کو تمام ظاہری دلکشیوں سے خالی رکھا ہے نہ اس وقت گانا ہوتا ہے نہ باجا ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر دوسری اقوام کی اجتماعی عبادتوں میں ہوتا ہے بلکہ فقط سنجیدگی سے اللہ کے بندے اس کے حضور میں اپنی عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں اور اس کی محبت کی بھیک مانگتے ہیں اور باوجود اس کے کہ نماز ہفتہ میں ایک وقت ادا نہیں کی جاتی جیسا کہ اکثر مذاہب میں ہے بلکہ دن میں کم سے کم پانچ بار پڑھی جاتی ہے مگر پھر بھی اس بے دینی کے زمانہ میں بھی اس قدر مسلمان پانچ وقت کی نمازیں ادا کرتے ہیں کہ دوسرے تمام مذاہب کے افراد ملا کر ہفتہ میں ایک دفعہ کی عبادت بھی اس تعداد میں ادا نہیں کرتے یہ نماز کی روحانی کشش کا ایک بیّن ثبوت ہے اور مشاہدہ اس پر گواہ ہے۔

دوسری عبادت گاہوں میں باجے بجتے ہیں گانے گائے جاتے ہیں آرام کے لئے کُرسیاں اور صوفے مہیا کئے جاتے ہیں اور صرف ہفتہ میں ایک بار بُلایا جاتا ہے لیکن لوگ ہیں کہ پھر بھی ان سے دور بھاگتے ہیں لیکن يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے مخاطب سخت زمین پر سجدہ کرنے کے لئے پانچ وقت مساجد میں شوق سے جمع ہوتے ہیں اور بغیر کسی ظاہری دلکشی کے اور بغیر کسی مادی آرام کے سامان کے موجود ہونے کے وہ لذت اور سرور محسوس کرتے ہیں کہ دُنیا کی سب نعمتیں اس کے آگے مات ہوتی ہیں اس مشاہدہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلامی عبادت صرف چند ظاہری رسوم کا مجموعہ ہے اور اس میں روحانیت کی نسبت جسمانی ہیئتوں کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے علم النفس اس پر شاہد ہے اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلامی عبادت کی ظاہری شکل صرف ایک برتن کی حیثیت رکھتی ہے ورنہ اس کا مغز تو وہ پُر معارف مضامین ہیں جو اس میں دُہرائے جاتے ہیں اور وہ پُر شوکت دُعائیں اور وہ پُر سوز التجائیں ہیں جو اس میں کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بندوں کو عبادت کے حکم دینے کی وجہ۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت کا حکم دینے سے کیا فائدہ۔ کیا وہ بندوں کی عبادت کا محتاج ہے تعظیم اور تکریم سے تو نادان انسان خوش ہُوا کرتے ہیں خدا تعالیٰ کی ذات کو تو اس سے ارفع ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کا فائدہ یہ نہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھتی ہے بلکہ عبادت کی غرض اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایسا اتصال پیدا کرنا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے نور کو اپنے اندر اخذ کرلے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف فکر انسان کے اندر وہ جذبہ نہیں پیدا کر سکتا جس سے وہ خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنے آپ کو محو کرنے کی کوشش کرے ایسا جذبہ تو محبت کامل سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اور محبت کامل محسن ہستی کے احسانوں کے کامل انکشاف سے پیدا ہوتی ہے اور نماز اس غرض کو پُورا کرتی ہے کیونکہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی شان کو سامنے لانے کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں اگر کہو کہ جو انسان خدا تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا چاہے گا وہ خود ہی اپنے لئے اس کا موقع نکال لے گا اس کے لئے پانچ وقت کی نماز مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلتِ تدبر سے پیدا ہُوا ہے انسانی طبیعت اس قسم کی ہے کہ اگر باقاعدگی سے اسے اس کے مقصد کی طرف توجہ نہ دلائی جائے تو وہ سُستی کرنے لگتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قوی سب کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچانے کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ کمزور بھی قوی کے ساتھ مل کر ان مواقع کو پاتے رہیں جو ان کے دلوں کے اندر صفائی پیدا کریں

اسلامی عبادت دوسری اقوام کی عبادتوں کے مقابل۔

نماز باجماعت میں حکمت

اور قومی ایمان والوں کے دلوں سے نکلنے والی مخفی تاثیرات کو اپنے اندر جذب کر کے صفائی قلب پیدا کر سکیں۔

پانچ وقت نماز ادا کرنے کے حکم کے متعلق ایک اعتراض کا جواب۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز کا کیوں حکم دیا گیا ہے حالانکہ اس زمانہ میں مشاغل اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اتنا وقت نمازوں کے لئے نکالنا مشکل ہے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر نماز کی غرض محبت الٰہی کی آگ بھڑکا کر اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے سہولت بہم پہنچانا ہے تو جس زمانہ میں مشاغل بڑھ جائیں اس زمانہ میں نماز کی ضرورت بڑھ جاتی ہے نہ کہ کم ہو جاتی ہے ظاہر ہے کہ جب مقصد کو بھلا دینے کے سامان کم ہوں گے اس وقت بار بار مقصد کی طرف توجہ دلانے کی اس قدر ضرورت نہ ہوگی جس قدر کہ اس وقت جب مقصد کو بھلا دینے کے سامان زیادہ ہوں پس اگر اس زمانہ میں دنیوی مشاغل بڑھ گئے ہیں تو نماز کی ضرورت بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اگر نماز صرف ایک اظہار عقیدہ کا ذریعہ ہوتا تب یہ اعتراض کچھ وزن بھی رکھتا مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے نماز کی غرض صرف اقرار عبودیت نہیں بلکہ اس کی غرض تو انسانی نفس میں وہ استعداد پیدا کرنا ہے جس کی مدد سے وہ مادی دُنیا سے اُڑ کر روحانی عالم میں پہنچ سکے اور اس کا دماغ جسمانی خواہشات میں ہی اُلجھ کر نہ رہ جائے بلکہ اعلیٰ اخلاق کو حاصل کرے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (العنکبوت ع ۵) یعنی نماز صرف عبودیت کا اقرار نہیں بلکہ قلب انسانی کو جِلا دینے والی شے ہے اور اس کی مدد سے انسان بدیوں اور بدکرداریوں سے بچتا ہے اور اس کا وجود بنی نوع انسان کے لئے مفید بنتا ہے اور وہ ملت و قوم کا ایک فائدہ بخش جزو ہو جاتا ہے پس جو عمل کہ یہ خوبیاں رکھتا ہو مادی اشغال کی کثرت کے زمانہ میں اس کی ضرورت کم نہیں ہوتی بلکہ بہت بڑھ جاتی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں بدامنی اور شورش اور نفسا نفسی اور قوموں کی قوموں پر چڑھائی کا اصل سبب یہی ہے کہ لوگ سچی عبادت میں کوتاہی کرنے لگے ہیں ورنہ اگر صحیح عبادت کا طریق لوگوں میں رائج ہوتا تو اس دُنیا کو پیدا کرنے والے مہربان آقا سے اتصال کی وجہ سے بغض اور نفرت کی جگہ محبت اور ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا۔

مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کی تفسیر۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ رَزَقَ کے معنے دینے کے ہیں نہ کہ کھلانے کے رَزَقَہٗ کے یہ معنے نہیں کہ اسے کھانا کھلایا۔ بلکہ یہ ہیں کہ اسے کچھ دیا خواہ وہ کوئی ہی چیز کیوں نہ ہو عربی زبان میں دینے کے لئے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں رزق بھی اور ھبہ بھی اور عطاء بھی اور مَنّ بھی اور احسان بھی اور انعام بھی اور اِیتاء بھی اور بھی کئی الفاظ ہیں لیکن قرآن کریم میں یہی سات لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں ایتاء تو صرف دینے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہ اَتٰی سے بنا ہے جس کے معنے کسی کے پاس آنے کے ہوتے ہیں اور ایتاء کے معنے کسی کے پاس لانے کے ہوتے ہیں جس سے آگے دینے کے معنے ہو گئے کیونکہ کسی کے پاس کوئی چیز لانے سے مُراد غالب طور پر اسے [illegible] چیز دینا ہوتا ہے۔ غرض یہ لفظ محض دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے خواہ [illegible] چیز بڑی ہو یا چھوٹی اچھی ہو یا بُری اور قرآن کریم میں متعدد بار ان معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ دوسرا لفظ عطاء ہے یہ لفظ اَتٰی سے زیادہ اہم مفہوم بیان کرتا ہے اور معمولی دینے کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ بالعموم ایسی چیز کے دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جسے اس چیز کا حاصل کرنے والا ایک نعمت خیال کرتا ہو اور اسے شوق سے لے اس لفظ کو اسی موقعہ پر استعمال کیا جاتا ہے جبکہ وہ چیز جو دی جائے اس کے لئے جسے دی جائے مفید اور کار آمد ہو چنانچہ عطاء کے معنی خدمت کے بھی ہوتے ہیں اور تعاطی کے معنی ایڑیاں اُٹھا کر اور ہاتھ بلند کر کے کسی چیز کے لینے کے ہوتے ہیں مَنّ احسان اور

انعام زیادہ تر حُسنِ سلوک کے معنوں پر دلالت کرتے ہیں اور لینے والے کی کسی خاص حالت کو ظاہر کرنے کی بجائے دینے والے کے نیک جذبات پر دلالت کرتے ہیں۔ وھب کے معنوں میں اس امر پر زور ہے کہ دینے والے نے جو کچھ دیا ہے اس کے بدلہ میں کسی عوض یا بدلہ کی امید نہیں رکھی۔ رزق کا لفظ جو آیت زیرِ بحث میں استعمال ہُوا ہے اس کے معنے بھی دینے کے ہیں لیکن اس کے معنوں میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو چیز دی گئی ہے اس نے لینے والے کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ گویا عطاءِ دینے کے معنوں کے اس میں پانے والے کی ضرورت کی طرف بھی اور اس کے پورا ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے اور چونکہ انسانی ضرورت بار بار پیدا ہوتی ہے رزق اس عطار کو کہتے ہیں جو بار بار ضرورت کے مطابق نازل ہو چنانچہ مفرداتِ راغب میں لکھا ہے کہ اَلرِّزْقُ یُقَالُ لِلْعَطَاءِ الْجَارِیْ رزق اس عطار کو کہتے ہیں جو بار بار نازل ہوتی رہے وَیُقَالُ لِلنَّصِیْبِ اور حصہ کو بھی کہتے ہیں یہ حصہ کے معنے بھی اسی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کہ رزق درحقیقت قدرِ کفایت کا نام ہے اور حصہ بھی اسی کا نام ہے کہ جس جس قدر کسی کو ضرورت ہو اس کے مطابق اسے چیز مل جائے قرآن کریم میں آتا ہے وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ یعنی ہر جنس کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سامان پیدا کر دیئے ہیں۔

محض اردو دان طبقہ میں یہ غلط خیال رائج ہے کہ رزق کے معنی صرف کھانے پینے کی چیزوں کے ہیں حالانکہ اصل میں رزق کے معنے بقدرِ ضرورت سامان مہیا کر دینے کے ہیں بیشک انہی معنوں سے غذا کے معنے بھی پیدا ہو گئے ہیں کیونکہ وہ بھی انسان کا ضروری حصہ ہیں مگر وہ اصل معنی نہیں ہیں بلکہ بعد میں ضمناً پیدا ہو گئے ہیں پس وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ بھی تم کو ہم نے دیا ہو خواہ علم ہو عزت ہو عقل ہو مال ہو دولت ہو اس میں سے ایک حصہ تم کو خرچ کرنا چاہیئے پس اس جملہ کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ تم کو کھانے پینے کی اشیاء ملی ہیں ان میں سے کچھ غریبوں کو بھی کھلاؤ کیونکہ نہ تو اس جملہ میں غریبوں کا ذکر ہے نہ اس چیز کی تعیین ہے جسے خرچ کرنا ہے اور ہمارا کوئی حق نہیں کہ جن اشیاء کو خدا تعالیٰ نے بغیر حد بندی کے چھوڑ دیا ہے ہم ان کے لئے اپنے پاس سے حد بندی مقرر کریں۔

عربی زبان میں کسی چیز کے دینے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مختلف الفاظ کا استعمال اور ان کا فرق۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں صرف اس قدر فرماتا ہے کہ جو کچھ ہم نے تمہاری ضرورتوں کے مطابق دیا ہے اسے خرچ کرو یہ ضرورت کے مطابق ملنے والی چیز علم بھی ہو سکتا ہے عقل بھی جرأت بھی غیرت بھی وغا بھی ہاتھ پاؤں کی خدمت بھی آنکھ ناک کی خدمت بھی روپیہ پیسہ کی خدمت بھی۔ غرض کوئی چیز جس کی نسبت کہا جا سکے کہ خدا تعالیٰ نے دی ہے اور کسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے دی ہے اس کے خرچ کرنے کا حکم ہے اور اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ روپیہ تو دوسروں کو امداد کے طور پر دیتا ہو لیکن مثلاً کھانا نہ دیتا ہو یا کھانا دیتا ہو کپڑا نہ دیتا ہو یا کپڑا تو دیتا ہو لیکن مکان نہ دیتا ہو یا مکان تو دیتا ہو مگر اپنے ہاتھوں سے خدمت نہ کرتا ہو یا ہاتھوں سے خدمت تو کرتا ہو مگر اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچاتا ہو تو وہ اس آیت پر پوری طرح عامل نہ سمجھا جائے گا اور اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہی اس آیت پر عامل نہیں جو غریبوں کو روپیہ دیتا ہے بلکہ وہ بھی عامل ہے جو لوگوں کو علم پڑھاتا ہے اور وہ بھی عامل ہے جو مثلاً بیواؤں یتیموں کے کام کر دیتا ہے اور وہ سپاہی بھی عامل ہے جو میدانِ جنگ میں ملک کی خاطر جان دینے کی نیت سے جاتا ہے اور وہ موجد بھی عامل ہے جو رات دن کی محنت سے دُنیا کے فائدہ کے لئے کوئی ایجاد کرتا ہے۔

ہر عطا شدہ طاقت کے خرچ کرنے کا حکم۔

رزق کے معنے کھانے پینے کی چیزوں کے نہیں

اس آیت پر غور کرنے والے لوگ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ہر طاقت اور ان کے قبضہ کا ہر سامان ایک حد تک دوسروں کے کام آئے ان فقہائے اسلام کی ایک بڑی صداقت کو پا لیا جنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ عورت کا وہ زیور جو پہنا جائے اور کبھی کبھی دوسری غریب عورتوں کو پہننے کے لئے دے دیا جائے اس پر زکوٰۃ نہیں

یہ ایک نہایت سچی بات ہے کیونکہ زکوٰۃ مال کو پاک کرنے
کے لئے ہے اور جو مال خرچ ہو رہا ہو وہ جاری پانی کی طرح
ہے اور کوئی چیز اسے گندہ نہیں کر سکتی۔ جو مال آج ایک
کو فائدہ دے رہا ہے کل دوسرے کو وہ بہتے چشمے کی طرح
ہے جس کا پانی اس وقت یہاں ہوتا ہے تو دوسرے منٹ
آگے اسی لئے اسلام نے زمینداری تجارت وغیرہ سے منع
نہیں کیا لیکن روپیہ یا سونا چاندی جمع کرنے سے منع کیا ہے
کیونکہ زمینداری تجارت وغیرہ سے زمیندار یا تاجر کے علاوہ
دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کا سرمایہ بھی
ایک طرح خرچ ہو رہا ہوتا ہے مگر جو روپیہ جمع پڑا ہے وہ
چونکہ دوسروں کے کام نہیں آتا اسے گناہ کا موجب قرار
دیا اور یہاں تک فرما دیا کہ اس مال کو گرم کر کے ان کے جمع
کرنے والوں کے ماتھوں پر داغ لگائے جائیں گے (التوبہ آیت ۳۵)

آیت مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں اپنے نفس پر خرچ کرنے کا حکم

دوسری شق خرچ کرنے کے مقام کی ہے اس
آیت میں یہ کوئی ذکر نہیں کہ جو چیز خرچ کی جائے وہ کس پر
خرچ کی جائے اس آیت میں کوئی لفظ غریب یا مسکین
کا نہیں بلکہ محض یہ ہے کہ وہ اس عطیہ کو جو ان کی ضرورتوں
کو پورا کرنے کے لئے دیا گیا ہے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ہذا میں مقام خرچ کی تعیین نہیں۔

اس آیت میں غریبوں کا تو کیا ذکر ہے یہ بھی کوئی
حد بندی نہیں کہ غیروں کو دیتے ہیں نہ یہ کہ اپنے عزیزوں
کو دیتے ہیں اور نہ یہ کہ اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں پس
جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے وہ شخص ہی اس آیت پر
عمل نہیں کرتا جو اپنے مال میں سے کچھ غریبوں کو دیتا ہو بلکہ
اس آیت کے مفہوم کے مطابق وہ باپ جو اپنی اولاد پر خرچ
کرتا ہے اور وہ ماں جو اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور وہ
خاوند جو اپنی بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور وہ اولاد
جو اپنے ماں باپ کا خیال رکھتی ہے سب ہی اس آیت کے
احکام میں سے بعض احکام کو پورا کرتے ہیں کیونکہ اس آیت
کے مفہوم میں ان سب لوگوں پر خرچ کرنا شامل ہے بلکہ اس
آیت کے مفہوم میں وہ خرچ بھی شامل ہے جو ایک شخص خود اپنی

آیت ہذا میں تمام اقسام رہبانیت کا رد۔

ذات پر کرتا ہے۔ وہ شخص جو اپنے نفس کو اس کی ضرورت
کے مطابق کھانا کھلاتا ہے اس آیت کے مفہوم کے ایک
حصہ کو پورا کرنے والا ہے وہ شخص جو اپنے جسم کے لئے ضرورت
کے مطابق کپڑا بناتا ہے اس آیت کے مفہوم کو پورا کرنے
والا ہے۔

ہر وہ شخص جو اپنے نفس کے بارہ میں بخل سے کام لیتا
ہے اور ضرورت اور صحت کے مطابق کھانا نہیں کھاتا وہ
اس حکم کو توڑنے والا ہے خواہ وہ دوسروں پر کس قدر ہی
کیوں نہ خرچ کرے کیونکہ یہ آیت یہ نہیں کہتی کہ غریبوں پر خرچ
کرو بلکہ یہ آیت خرچ کرنے کے مقام کو بلا تعیین چھوڑ کر خود
انسان کے نفس کو بھی اس میں شامل کرتی ہے اور اس کی بیوی
کو بھی اور اس کے بچے کو بھی۔ اور اس کے دوستوں کو بھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس
آیت کے اس مفہوم کی خوب تشریح ہوتی ہے آپ کے پاس
ایک دفعہ ایک شخص کی شکایت کی گئی جو ہر روز روزہ رکھتا
تھا رات بھر عبادت کرتا تھا اور اپنے بیوی بچوں کی طرف
سے غافل تھا اس پر آپ نے فرمایا اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ
حَقًّا وَلِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِضَيْفِكَ عَلَيْكَ حَقًّا
وَاِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ
یعنی تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے تیرے رب کا بھی تجھ پر
حق ہے اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی
اور بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے پس ہر حق والے کو اس کا حق دے
اور کسی کو محروم نہ کر (ترمذی جلد دوم ابواب الزھد)

اس آیت نے ان تمام اقسام رہبانیت کو جن میں
گندہ رہنے بھوکا رہنے اپنے عزیز رشتہ داروں کے حقوق
سے غافل رہنے کا نام نیکی قرار دیا گیا ہے رد کر دیا ہے کیونکہ
اسلام کے نزدیک متقی وہ ہے جو ان سب چیزوں کو خرچ
کرے جو اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور اس کی عطاء
اس کے نفس کے لئے بھی ہو اور اس کے عزیزوں کے لئے
بھی اور اس کے دوستوں کے لئے بھی ہو اور اس کے ہمسائیوں

کے لئے بھی ہو اور غریبوں کے لئے بھی ہو اور امیروں کے لئے بھی ہو اور جان پہچان لوگوں کے لئے بھی ہو اور اجنبیوں کے لئے بھی ہو اور ہم وطنوں کے لئے بھی ہو اور دُور سے آئے ہوئے مسافروں کے لئے بھی ہو اور انسانوں کے لئے بھی ہو اور حیوانوں کے لئے بھی ہو کیونکہ وہ حکم دیتا ہے کہ ہر نعمت سے خرچ کرو اور ہر ضروری مقام پر خرچ کرو۔

اس آیت سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے کا حکم ہے نہ یہ کہ سب ہی خرچ کر دے قرآن کریم کی دوسری آیات اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ اس طرح اپنے مال کو خرچ کرنا کہ اس کے پاس اپنے گزارہ کا سامان ہی ختم ہو جائے ناجائز ہے چنانچہ فرماتا ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ع۳) یعنی نہ تو اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن سے باندھ دے کہ خدا کی مخلوق کا خرچ بالکل روک دے اور نہ ہاتھ ایسا کھول کہ سب مال ضائع ہو جائے اور لوگ تجھ کو ملامت کریں اور تو آیندہ مال کمانے کے سامانوں سے محروم رہ جائے مَحْسُوْر اسے کہتے ہیں جس کی طاقت ضائع ہو جائے اور اس کی کمزوری ظاہر ہو جائے اور اس آیت میں اس شخص سے مراد ہے جو آیندہ کی ترقی کے سامانوں سے محروم ہو جائے۔

اس جگہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ تمام مال کا خرچ تو بُرا کہلا سکتا ہے مگر اس آیت میں تو علم اور فہم وغیرہ کے اخراجات کو بھی شامل کیا گیا ہے ان چیزوں میں سے کچھ خرچ کرنے کے کیا معنے ہیں کیا انسان اپنا سارا علم لوگوں کو نہ سکھائے یا اپنی عقل سے پوری طرح لوگوں کو فائدہ نہ پہنچائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم اور فہم اور عقل خرچ کرنے سے بڑھتے ہیں پس ان میں سے کچھ خرچ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس طرح علم سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچائے یا فہم سے یا عقل سے کہ ان کے بڑھنے کا منبع خراب ہو جائے مثلاً یہ ہلاک ہو جائے یا اس کی صحت ایسی طرح بگڑ جائے کہ اس کا علم یا فہم یا عقل کام دینے سے رُک جائیں مثلاً دماغ خراب ہو جائے۔ غرض علم اور فہم اور عقل کا بھی اسی قدر استعمال ہونا چاہیئے کہ ان کا چشمہ نہ سوکھ جائے کیونکہ جو شخص اپنے علم اور عقل سے لوگوں کو اس طرح فائدہ پہنچاتا ہے یا اپنے آپ کو اس طرح فائدہ پہنچاتا ہے کہ ان کے منبع میں خرابی واقع ہو جاتی ہے [illegible] اس آیت کے حکم کے خلاف عمل کرتا ہے۔

خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم

اگر کہا جائے کہ کیا سارا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے والا گنہ گار ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح علم اور فہم اور عقل کا منبع ہوتا ہے اور [illegible]س کا راس المال ہوتا ہے اسی طرح مال کا بھی ایک منبع ہوتا ہے پس سارا مال خرچ کرنے سے یہی مُراد ہوگی کہ وہ اس منبع تک کو خرچ نہ کر دے مثلاً ایک شخص کا رأس المال اگر اس کی قوتِ بازو اور اس کی عقل یا اس کا فن ہے تو وہ اگر اپنا وہ مال جو روپیہ کی صورت میں اس کے پاس ہے سب کا سب خدا تعالےٰ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے تو وہ گنہ گار نہیں کیونکہ اس کا رأس المال موجود ہے وہ اس سے اور مال کما لے گا لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کا رأس المال اس کی دماغی قوت یا جسمانی قوت نہیں بلکہ اسے اپنی روزی کمانے کے لئے کسی قدر مال کی ضرورت ہے تو اس کے لئے اپنا سارا مال خرچ کر دینا جائز نہ ہوگا

خدا کی راہ میں سارا مال خرچ کرنا۔

حضرت ابو بکرؓ تجارتی کاموں میں بہت ہوشیار تھے وہ اپنی عقل سے پھر مال پیدا کر لینے کا ملکہ رکھتے تھے مکہ سے نکلتے ہوئے ان کا سب مال قریباً ضائع ہو گیا لیکن مدینہ میں آکر انہوں نے پھر اور مال کما لیا ایک دفعہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص چندہ کی تحریک کی تو آپؓ نے اپنے گھر کا سب اثاثہ چندہ میں دے دیا اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ابو بکرؓ اپنے گھر میں کیا چھوڑا ہے تو انہوں نے جواب دیا حضور اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑا ہے (ترمذی جلد دوم ابواب المناقب مناقب ابی بکر الصدیقؓ) ایسے شخص کے لئے اپنا سارا مال دے دینا کوئی گنہ نہیں کیونکہ اس کا رأس المال اس کا دماغ ہے چنانچہ اس کے بعد بغیر اس کے کہ حضرت ابو بکرؓ لوگوں سے سوال کرتے آپ نے

علم اور فہم میں سے کچھ خرچ کرنے کا مطلب۔

پھر اور مال کمالیا اور اپنا گزارہ اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کرتے رہے کسی کے دست نگر نہ ہوئے پس سارے مال کی تعریف ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوگی پیشہ ور کے لحاظ سے اَور تاجر کے لحاظ سے اَور بڑا اور اس تاجر کے لحاظ سے اَور جو تجارت صرف روپیہ کے زور سے نہیں کرتا بلکہ اپنے وسیع تجارتی علم اور تجربہ کے زور سے کرتا ہے اور مزید سرمایہ پیدا کر لینا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے لوگ اسے خود اپنا سرمایہ پیش کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس کو سرمایہ دے کر خود اپنے مال کو بڑھائیں گے۔

لفظ رزق میں مال خرچ کرتے ہوئے نہ گھبرانے کی نصیحت۔

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ انسان کو حلال اشیاء خرچ کرنی چاہئیں یہ نیکی نہیں کہ حرام مال یا حرام اشیاء خرچ کرے بعض لوگ رشوتیں لیکر اور بعض ڈاکے ڈال کر مال جمع کرتے ہیں اور غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ نیکی کرتے ہیں حالانکہ بدی سے بدی پیدا ہو سکتی ہے نیکی نہیں ایسے لوگ بدیوں کی بُنیاد رکھتے ہیں ان کا صرف اس قدر کام تھا کہ جو خدا تعالیٰ نے ان کو دیا تھا اس میں سے خرچ کرتے اگر کوئی شخص دوسرے کے مال سے جس پر اس کا حق نہیں دوسرے کو کچھ دے دیتا ہے وہ اس حکم کا پورا کرنے والا نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اس رزق میں سے خرچ نہیں کرتا جو خدا تعالیٰ نے اسے دیا تھا بلکہ اس میں سے خرچ کرتا ہے جو خدا تعالیٰ نے اسے نہیں دیا تھا اور یہ آیت کہتی ہے کہ جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ہذا میں حلال اشیاء کے خرچ کرنے کا حکم۔

اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مال خرچ کرنے پر گھبرانا عقل کے خلاف ہے کیونکہ یہاں خدا تعالیٰ کی نعمت کا نام رزق رکھا گیا ہے اور رزق اس عطاء کو کہتے ہیں جو جاری ہو اور جو ایک ہی دفعہ ختم نہ ہو جائے پس رزق کا لفظ استعمال کر کے اس جگہ یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق جو خرچ کرے گا اس کا مال بڑھے گا کم نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر بار بار انعام کرے گا۔ علم اور فہم اور عقل اور جسمانی قوتوں کے خرچ کرنے سے ان اشیاء کا بڑھنا تو ظاہر ہی ہے جو شخص اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے اس کا علم ہمیشہ بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا جو لوگ درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں ان کا علم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اسی طرح جو لوگ اپنی عقل اور اپنے فہم سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں ان کی عقل اور ان کا فہم بڑھتا ہے گھٹتا نہیں اسی طرح جسمانی قوتوں کو صحیح طرح خرچ کرنے والے کی قوت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں اسی طرح مال خرچ کرنے والے کا مال بھی بڑھتا ہے مثلاً یہ ظاہر امر ہے کہ جو شخص اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے نفس پر خرچ کرے گا اس کے جسم میں زیادہ قوت پیدا ہوگی اور وہ زیادہ کما سکے گا اسی طرح جو شخص صحیح طور پر اپنی بیوی اور اپنی اولاد پر خرچ کرے گا اس کے ہاں کمانے والوں کی تعداد بڑھے گی جو اپنے ہمسائیوں پر اور دوستوں پر مال خرچ کریگا اس کے معاون اور مددگار بڑھیں گے جو غرباء پر خرچ کریگا اس کی قوم کی مالی حالت ترقی کرے گی اور اس کا ردِّعمل خود اس کے مال کے بڑھنے کی صورت میں ہوگا غرض مال کا صحیح خرچ کبھی مال کو ضائع ہونے نہیں دیتا بلکہ اسے بڑھاتا ہے پس علاوہ اس کے کہ خدا تعالیٰ کا فضل اس شخص پر روحانی طور پر نازل ہوتا ہے خدا تعالیٰ نے طبعی قوانین بھی اسی طرح بنائے ہیں کہ اُن کی مدد سے بھی ایسے حالات میں مال بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا اور صرف کم عقل لوگ اس قسم کے خرچ سے گھبراتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح وہ اپنے مالوں کو نقصان پہنچاتے ہیں محفوظ نہیں کرتے۔

شائد کوئی اعتراض کرے کہ خدا تعالیٰ کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ بندوں کی وساطت سے دوسروں پر خرچ کروائے کیوں نہ اس نے سب انسانوں کو براہِ راست ان کا حصہ دے دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کہ خیال کیا جاتا ہے کہ بعض لوگ خرچ کرنے والے ہیں اور بعض دوسروں کی امداد پر گزارہ کرتے ہیں کیونکہ درحقیقت سب ہی لوگ ایک دوسرے پر خرچ کرنے والے

اللہ تعالیٰ کو بندوں کی وساطت سے دوسروں پر خرچ کروانے میں حکمت۔

ہیں امراء ظاہر میں غرباء پر مال خرچ کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ غرباء بھی امراء پر خرچ کر رہے ہوتے ہیں ایک مالدار جو ایک گاؤں میں رہتا ہے اس کے مال کی حفاظت ان سینکڑوں غرباء کی ہمسائیگی سے ہو رہی ہوتی ہے جو اس کے ساتھ گاؤں میں رہتے ہیں ورنہ ڈاکو اور چور اس کو لوٹ لیں اگر اس کے گھر پر چور اور ڈاکو حملہ نہیں کرتے تو اس کا موجب صرف اس کے ملازم نہیں ہوتے بلکہ اس بستی میں رہنے والے سب لوگ ہوتے ہیں جن کے خوف سے ڈاکو اس کے گھر پر حملہ نہیں کرتے ایک امیر اپنی امارت غرباء کی مدد کے بغیر قائم ہی نہیں رکھ سکتا کیونکہ دولت مزدور کی مدد سے آتی ہے مزدور نہ ہو تو دولت کہاں سے آئے پس امیر ہی غریب کی مدد نہیں کرتا بلکہ غریب بھی امیر کی مدد کرتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے تعاون اور محبت کے قیام اور زیادتی کے لئے دُنیا میں ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر شخص کے مال میں کچھ دوسروں کا حصّہ بھی رکھ دیا ہے تا باہمی ہمدردی اور تعاون سے محبت بڑھے اور تمدن ترقی کرے اگر ہر اک آزاد ہوتا تو مدنیت کبھی ترقی نہ کرتی اور وہ علوم جو انسان کو حیوانوں سے ممتاز کرتے ہیں کبھی پیدا نہ ہوتے پس رزق کا باہم ملا دینا ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے۔

اس جگہ میں مالی خرچ کے متعلق کسی قدر تفصیل سے قرآنی تعلیم کو بیان کر دینا چاہتا ہوں تا کہ قرآن کریم نے جو اس بارہ میں احکام دیئے ہیں اجمالی طور پر ذہن نشین ہو جائیں۔

قرآن کریم میں مالی خرچ کئی قسم کا بیان ہُوا ہے۔ (۱) زکوٰۃ جو فرض ہے (۲) صدقہ جو نفلی ہے اور انسان کے اندرونی تقویٰ کے فیصلہ پر اسے چھوڑ دیا گیا ہے یہ آگے دو قسم کا ہے (الف) ان کے لئے صدقہ جو اپنی ضرورتوں کو پیش کر کے مطالبہ کر لیتے ہیں (باء) ان کے لئے صدقہ جو اپنی ضرورتوں کو پیش نہیں کرتے یہ آگے دو قسم کا ہے (۱) جو اپنی ضرورتوں کو پیش نہیں کرتے (۲) جو اپنی ضرورتوں کو پیش نہیں کر سکتے (۳) وہ خرچ جو انسان قومی ضروریات کے لئے کرتا ہے (۴) شکرانہ (۵) فدیہ (۶) کفارہ (۷) تعاونی خرچ جو مدنی نظام کی ترقی کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے (۸) حق الخدمت (۹) ادا بِاحسان (۱۰) تحفہ یہ دس قسم کے خرچ ہیں جو قرآن کریم سے ثابت ہیں اور جن خرچوں میں سے کسی ایک کا ترک بھی جب موقعہ اس کا مقتضی ہو اس آیت پر عمل کرنے سے انسان کو محروم کر دیتا ہے اور اس کے تقویٰ میں کمزوری پیدا کر دیتا ہے دُنیا میں بہت سے لوگ اس تقسیم کو مدّنظر نہ رکھ کر اعلیٰ ثوابوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

زکوٰۃ اور اس کی حکمت

(۱) زکوٰۃ وہ خرچ ہے جو قرآن کریم میں فرض کیا گیا ہے اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ تمام انسانوں کی دولت دوسرے لوگوں کی مدد سے کمائی جاتی ہے اور اس کمائی میں بہت دفعہ دوسروں کا حق شامل ہوتا ہے جو باوجود انفرادی طور پر دوسروں کا حق ادا کر دینے کے پھر بھی دولتمند کے مال میں باقی رہ جاتا ہے مثلاً ایک مالدار آدمی ایک کان سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ کان کے مزدوروں کو ان کی مزدوری پوری طرح ادا بھی کر دے تو بھی جو کچھ ان کو ادا کرتا ہے وہ ان کی مزدوری ہے مگر قرآنی تعلیم کے مطابق وہ لوگ بھی اس کان میں حصہ دار تھے کیونکہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ دُنیا کے سب خزانے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ کسی خاص شخص کے لئے۔ پس مزدوری ادا کر دینے کے بعد بھی حق ملکیت جو مزدوروں کو حاصل تھا

اسلام میں دس قسم کے مالی خرچ۔

ادا نہیں ہوتا اس کی ادائیگی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ ان مزدوروں کو کچھ زائد رقم بھی دی جائے مگر اس سے بھی وہ حق ادا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس طرح ان چند مزدوروں کو تو ان کا حق ادا ہو جاتا مگر باقی دنیا بھی تو اس میں حصہ دار تھی ان کا حق ادا ہونے سے رہ جاتا۔ پس اسلام نے یہ حکم دیا کہ اس قسم کی کمائی میں سے کچھ حصہ حکومت کو ادا کیا جائے تاکہ وہ اسے تمام لوگوں پر مشترک طور پر خرچ کرے۔

اسی طرح زمیندار جو زمین میں سے اپنی روزی پیدا کرتا ہے گو اپنی محنت کا پھل کھاتا ہے مگر وہ اس زمین سے بھی تو فائدہ اٹھاتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے بنائی گئی تھی پس اس کی آمد میں سے بھی ایک حصہ حکومت کو قرآن کریم دلواتا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے اسے خرچ کیا جائے اسی طرح تجارت کرنے والا بظاہر اپنے مال سے تجارت کرتا ہے لیکن اس کی تجارت کا مدار ملکی امن پر ہے اور اس امن کے قیام میں ملک کے ہر شخص کا حصہ ہے پس اس حصہ کو دلانے کے لئے اس کے مال پر بھی اسلام نے زکوٰۃ مقرر کی ہے تاکہ حکومت کے ذریعہ سے باقی لوگوں کا حق ادا ہو جائے اسی طرح جو شخص مال جمع کرتا ہے اس کے مال جمع کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگ اس مال سے نفع حاصل کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس مال میں ازل سے شریک مقرر کئے گئے تھے پس اس مال پر بھی شریعت نے زکوٰۃ مقرر کی ہے گو جس وقت [illegible] مال کمایا گیا تھا اس پر زکوٰۃ دی گئی تھی لیکن پہلی زکوٰۃ تو اس حق کے بدلہ میں تھی جو اس مال میں دوسروں کو حاصل تھا اور دوسری زکوٰۃ اس وجہ سے ہے کہ اس مال کو بند رکھنے کی وجہ سے وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیئے گئے۔

نفلی صدقہ اور اسکا حکم۔

زکوٰۃ اور اسکا اجمالی حکم

زکوٰۃ کے یہ تمام احکام قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں اور بعض کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے ہوتی ہے وہ سب اپنے اپنے موقع پر تفسیر میں انشاءاللہ بیان ہوں گے اس جگہ زکوٰۃ کے اس اجمالی حکم کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے جس میں اس حکم کی حکمت کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ رکوع ۱۳) یعنی تمام ان مومنوں سے جو اسلامی حکومت تلے رہتے ہیں صدقہ لے اس طرح تو ان کے دلوں کو پاک کرے گا اور ان کے مالوں کو بھی دوسرے لوگوں کے مالوں کی ملونی سے صاف کرے گا اور قومی ترقی کے سامان پیدا کریگا صدقہ سے مُراد اس جگہ زکوٰۃ مفروضہ ہے یہ لفظ صدقہ کا علاوہ ان متداول معنوں کے جن معنوں میں کہ یہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے اور بہت سے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک زکوٰۃ مفروضہ بھی ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بغیر اس قسم کی زکوٰۃ لینے کے لوگوں کے مال پاک نہیں ہوسکتے کیونکہ جب تک لوگوں کا حق ادا نہ ہو مال پاک نہیں ہوسکتا اور نہ مالدار کا تقوٰی مکمل ہوسکتا ہے یہ زکوٰۃ حکومت لیتی ہے اور اسی کی معرفت خرچ ہوسکتی ہے یا حکومت نہ ہو تو اسلامی نظام اس کے وصول کرنے اور خرچ کرنے کا حقدار ہے جیسے کہ خُذْ یعنی لے کے لفظ سے ظاہر ہے (۲) نفلی صدقہ جس کی بناء رحم اور شفقت پر ہے یہ کسی مقدار معین میں فرض نہیں بلکہ ہمسائیوں کی ضرورت اور دینے والے کی مالی حالت اور اس کے دل کے تقوٰی پر اسے چھوڑا گیا ہے صدقہ کا حکم اس شکل میں اس لئے دیا گیا ہے تا ہر شخص اپنے تقوٰی اور اپنی مالی حالت کے مطابق اسے ادا کرے چونکہ اس کی حکمت تعاون باہمی کی رُوح کو پیدا کرنا ہے اس لئے یہ خرچ حکومت کی وساطت سے نہیں رکھا گیا بلکہ ہر فرد کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ خود اس قسم کا خرچ کرے اس کا ارشاد قرآن کریم کی اس آیت میں اجمالاً کیا گیا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ رکوع ۳۸) یعنی جو لوگ اپنے مال رات اور دن خرچ کرتے ہیں اور پوشیدہ بھی خرچ کرتے ہیں اور ظاہر بھی خرچ کرتے ہیں وہ اپنے اجر اپنے رب کے پاس پائیں گے اور انہیں نہ آیندہ کا خوف لاحق ہوگا اور نہ سابق کوتاہیوں پر انہیں کوئی گھبراہٹ لاحق ہوگی اس آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہاں زکوٰۃ کا ذکر نہیں جو فرض ہے اور حکومت کو ادا کی جاتی ہے کیونکہ زکوٰۃ مخفی خرچ نہیں کی جا سکتی پس یہ خرچ نفلی صدقہ کا ہے جو انسان خود کرتا ہے اور حسب موقعہ کبھی مخفی کرتا ہے کبھی

ظاہر مخفی اس لئے تاکہ جس کی امداد کرتا ہے لوگوں میں شرمندہ نہ ہو اور ظاہر اس لئے کہ تا ان لوگوں کو بھی صدقہ کی تحریک ہو جو اس نیکی میں ابھی کمزور ہیں ورنہ اسے اپنی ذات کے لئے کسی شہرت کی تمنا نہیں ہوتی ایسے لوگوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ اپنے اس فعل کا بدلہ خدا سے پائیں گے۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس خرچ کے دو مواقع قرآن کریم سے معلوم ہوتے ہیں (۱) ان افراد پر خرچ کیا جائے جو اپنی ضرورتوں کے لئے مطالبہ کر لیتے ہیں جیسے کہ وہ غرباء جو سوال کر لیتے ہیں اور اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اسلام ان پر بھی حسب موقعہ خرچ کرنے کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ (ذاریات رکوع ۱) مومنوں کے اموال میں سائلوں کا بھی حق ہوتا ہے

یاد رہے کہ قرآنی محاورہ میں سائل سے مراد وہ عادی گداگر نہیں کہ جنہوں نے سوال کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے کیونکہ اسلام سوال کو ناپسند کرتا ہے اور ایسا گداگر اسلامی نظام کی کسی شق میں بھی نہیں آسکتا کیونکہ قرآن کریم توکل علی اللہ پر بڑا زور دیتا ہے اور سوال کرنا توکل کے بالکل برخلاف ہے پھر قرآن کریم انسانی زندگی کو مفید طور پر خرچ کرنے پر زور دیتا ہے اور عادی سوالی اپنی زندگی کو تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال سے سختی سے منع فرمایا ہے اور حضرت عمرؓ تو اس حکم پر عمل کرانے میں اس قدر شدت سے کام لیتے تھے کہ اگر کوئی ایسا سوالی ملتا تو آپ اس کی مانگی ہوئی چیزوں کو پھینک دیتے تھے اور اسے محنت مزدوری کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

سوالی سے مراد وہ لوگ بھی نہیں جو معذور ہوں اور کما نہ سکیں کیونکہ ان کا بوجھ اسلام نے قوم پر تسلیم کیا ہے اور زکوٰۃ بھی ان لوگوں کے اخراجات کی متحمل ہے۔

پس جب ہم اسلام کے دوسرے احکامات کو ملا کر دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک سوالی وہ ہے جو درحقیقت محنت اور مزدوری سے کام تو لیتا ہے لیکن مثلاً اس کا پیشہ ایسا ہے کہ اس سے کافی آمدن نہیں ہو سکتی یا یہ کہ اس کے عیال زیادہ ہیں ایسے اشخاص میں سے اگر کوئی اپنے دوستوں سے سوال کرے تو گو اسلام نے اسے پسند تو نہیں کیا لیکن اسے منع نہیں کیا کیونکہ پوری محنت کے بعد بھی اگر اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو گو اس کا سوال کرنا معیوب ہو مگر اسے حرام یا ممنوع نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آخر بھائی بھائیوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔

صدقات کے خرچ کے مواقع۔

دوسرا مصرف قرآن کریم نے ایسے صدقہ کا محروم لوگوں کا گروہ بتایا ہے چنانچہ اوپر کی آیت پوری اس طرح ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات ع۱) یعنی مومنوں کے مالوں میں سائلوں کا بھی حق ہوتا ہے اور محروم لوگوں کا بھی یعنی جو باوجود غربت کے سوال نہیں کرتے اور اس طرح ان لوگوں کی توجہ میں نہیں آتے جو گہری نگاہ سے اپنے ہمسائیوں کو دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔

ان لوگوں کا ذکر قرآن کریم کی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں آیا ہے لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ رکوع ۳۷) یعنی اے مومنو جو مال تم خرچ کرو اس میں سے ان بے مایہ لوگوں کو بھی دیا کرو جو دین یا ملت کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور اس شغل کی وجہ سے اِدھر اُدھر پھر کر اپنی کمائی میں زیادتی نہیں کر سکتے لیکن باوجود مال کی کمی کے وہ اپنے نفس کو سوال کی ذلت سے بچاتے اور خاموش رہتے ہیں اور اس وجہ سے وہ لوگ جو غور کرنے کے عادی نہیں انہیں خوشحال سمجھ لیتے ہیں حالانکہ تو اگر دیکھے تو ان کو ان کے چہروں سے پہچان لیگا وہ لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے۔

اس آخری فقرہ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ وہ

نرمی سے مانگ لیتے ہیں کیونکہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وہ سوال کرتے ہی نہیں پس چمٹ کر نہیں مانگتے سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنی غربت کو چھپانے کے لئے اصرار کا سایہ بننے سے بھی گریز کرتے ہیں اور اس طرح سوال مجسم ہو کر انسان لوگوں سے جو فائدہ اٹھا سکتا ہے اس سے بھی محروم رہتے ہیں ایسے لوگوں پر خرچ کرنے پر قرآن کریم نے خاص زور دیا ہے۔

نذر اور اس کا حکم

محروم کے دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ وہ سوال کر ہی نہ سکتے ہوں سو ان معنوں کے رو سے اس میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو مثلاً گونگے بہرے ہیں یا پردہ دار عورتیں ہیں یا چھوٹے بچے ہیں یا پھر جانور ہیں کہ زبان ان کو قدرت نے عطا ہی نہیں کی ان سب پر خرچ کرنا بھی صدقہ کی اقسام میں شامل ہے

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ صدقہ ردّ بلا کے لئے مفید ہوتا ہے اور اسلام آفات اور مصائب کے وقت اس قسم کے صدقات کی تحریک متواتر کرتا ہے۔

صدقہ میں وہ تمام اخراجات شامل ہیں جو ردّ بلا کی غرض سے اور مصیبت کے وقت میں یا مصیبتوں کو دور رکھنے کے لئے اور خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں اسی کی ایک قسم کو نذر کہتے ہیں اس میں اور عام صدقہ میں یہ فرق ہے کہ عام صدقہ تو اس خرچ کو کہتے ہیں جو ردّ بلا کی امید میں کیا جاتا ہے اور نذر اس صدقہ کو کہتے ہیں جس کا وعدہ اس صورت میں کیا جائے کہ اگر فلاں مشکل دور ہو جائے یا فلاں کام ہو جائے تو یہ خرچ کروں گا یا فلاں عبادت بجا لاؤں گا۔ اس کا ذکر سورۃ دھر رکوع اول میں ہے جہاں فرماتا ہے وَيُوفُونَ بِالنَّذْرِ مومن نذر کو پورا کرتے ہیں یعنی جب کسی خیرات یا نیک عمل کا عہد کرتے ہیں کہ ردّ بلا یا حصول مقصود کے بعد کریں گے تو اس عہد کو پورا کرتے ہیں صلحاء امت میں سے جو بڑے پایہ کے صلحاء گزرے ہیں ان کا خیال ہے کہ گو نذر کا پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ ▪ ایک عہد ہے جو بندہ خدا تعالیٰ سے کرتا ہے لیکن اس طرح عہد کرنے سے کہ اگر خدا تعالیٰ فلاں مصیبت کو ٹلا دے تو اس اس قدر صدقہ کروں گا یہ بہتر ہے کہ پہلے ہی صدقہ کر کے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لے بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ سے سودا کرنے کی کوشش کرے اور یہ خیال ان کا درست اور صحیح ہے امام بخاری نے امام مالک کے واسطے سے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کی ہے قَالَ مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَّعْصِيَهُ فَلَا يَعْصِهٖ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ایسی نذر مانے جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہو تو اسے پورا کرے اور جو ایسی نذر مانے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو تو وہ نذر کو پورا کر کے نافرمانی نہ کرے۔ (بخاری جزء رابع کتاب النذور باب النذر فی الطاعۃ)

قومی ضروریات کے لئے خرچ کرنے کا حکم

(۳) تیسری قسم خرچ کی جو قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے وہ اخراجات ہیں جو قومی اور ملی ضرورتوں کے مواقع پر اپنے اور نیک افراد کرتے ہیں یہ اخراجات صدقہ نہیں کہلا سکتے کیونکہ ان سے مساکین کی ضرورتیں پوری نہیں کی جاتیں بلکہ غریب ▪ امیر ان سے متمتع ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ساری قوم ان سے فائدہ اٹھاتی ہے جیسے گھر سے خرچ کر کے جہاد کے لئے جانا یا دوسرے کسی سپاہی کے اخراجات مہیا کرنا کہ وہ خرچ اس سپاہی پر نہیں ہوتا بلکہ قوم پر ہوتا ہے کیونکہ کوئی شخص اس لئے سواری طلب نہیں کرتا کہ تا میدانِ جنگ میں جا کر جان دے یا پانچ دس دن کے لئے روٹی نہیں مانگتا کہ اتنے دنوں میں اپنی موت کا سامان کرے پس اگر سپاہی کو ایام جنگ کے لئے کھانا مہیا کر دیا جائے یا اس کے لئے سواری مہیا کر کے دی جائے تو یہ قومی خرچ ہے فرد کی امداد نہیں کیونکہ جنگ اس شخص کا ذاتی کام نہیں بلکہ ملت کے فائدہ کا کام ہے۔

اسلام نے ان اخراجات پر بھی زور دیا ہے اور یہ حکم زکوٰۃ و صدقہ سے الگ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (توبہ ع) کہ اگر ہلکے پھلکے ہو یعنی سواری مہیا ہے یا گھر کا انتظام مکمل ہے تب بھی جہاد کے لئے گھروں سے نکلو اور اگر بوجھل ہو یعنی خود بوجھ اٹھا کر جانا پڑے سواری نہ ہو یا پیچھے گھر کا کوئی انتظام نہ ہو تب بھی جہاد کے لئے گھروں سے باہر نکلو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرو یہ تمہارے لئے اگر تم جانو تو بہتر ہوگا۔

اس آیت میں جو جان و مال کے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ضروری نہیں کہ دوسرے پر خرچ کیا جائے جو شخص صرف اپنے لئے سواری مہیا کرتا ہے تاکہ جہاد میں شامل ہو سکے یا اپنے لئے تلوار خریدتا ہے تا جہاد میں شریک ہو سکے یا اپنے لئے کچھ غلہ خریدتا ہے تا جہاد کے دنوں اسے کھا کر گزارہ کر سکے وہ ہر ایک چیز اپنے لئے خریدتا ہے۔ پس یہ صرف صدقہ نہیں کہلا سکتا کیونکہ اس کا فائدہ وہ خود اٹھاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ خرچ جو اس نے اپنے نفس پر کیا اپنے کسی شوق کو پورا کرنے کے لئے نہیں کیا بلکہ دین و ملت کی خدمت کیلئے کیا اور ایسی حالت میں کیا کہ بجائے لذت کا سامان مہیا کرنے کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا یہ خرچ خدا تعالیٰ کی رضاء کے مطابق خرچ ہے اور ثواب عظیم کا مستحق اس شخص کو بناتا ہے۔

اسی طرح اگر جہاد کی غرض سے یا کسی قومی خدمت کیلئے جو براہ راست اس سے متعلق نہیں۔ کوئی شخص کسی بھائی کی امداد کرتا ہے تو اس کا وہ خرچ بھی صدقہ نہیں۔ کیونکہ اس خرچ سے دوسرے بھائی کی ذاتی ضرورت پوری نہیں کی گئی بلکہ اس کے بدلہ میں اس سے ایک قومی کام لیا گیا ہے۔ سو یہ تیسری قسم کا خرچ ہے جو نہ زکوٰۃ ہے نہ صدقہ۔ مگر ہے نہایت ضروری۔ اور انسان کو بہت بڑے ثواب کا مستحق بناتا ہے۔ آج کل تلوار کا جہاد تو ہے نہیں۔ پس اشاعت اسلام یا تعلیم یا نظام جماعت کی مضبوطی اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کے لئے جو رقوم دی جاتی ہیں وہ اسی مد میں شامل ہیں۔ اور جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ کے حکم کے پہلے نصف کے پورا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ مگر دوسرا نصف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ مال خرچ کرنے کے علاوہ کبھی کبھی اپنے کاموں کا حرج کر کے خود بھی کچھ دن تبلیغ کے لئے دے۔ یا ملی ترقی کی غرض سے تعلیم و تربیت کے کام میں حصہ لے۔

قومی اخراجات پر خرچ کرنے کا حکم

(۴) چوتھی قسم خرچ کی جسے اسلام نے پسند کیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے وہ خرچ ہے جو بطور شکرانہ کیا جاتا ہے۔ اس میں اور صدقہ میں یہ فرق ہے کہ صدقہ تو کسی مصیبت کے دور کرنے یا کسی مقصد کے حصول کے لئے کیا جاتا ہے۔ مگر شکرانہ کا خرچ حصول مقصد کے بعد یا بلا کے دور ہونے پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں ہے كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (انعام ع) یعنی جو پھل یا غلہ خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس میں سے کھاؤ۔ اور جس وقت اس پھل یا غلہ کو کاٹو اس وقت خدا تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو۔ یا یہ کہ اس غلہ یا پھل کو کاٹ کر اپنے قبضہ میں لانے کا حق بھی ادا کرو یعنی کچھ حصہ خدا تعالیٰ کی راہ میں بطور شکر تقسیم کرو۔ بعض لوگوں نے اس کے معنے زکوٰۃ کے کئے ہیں اور بعض نے اس حکم کو زکوٰۃ سے منسوخ قرار دیا ہے۔ مگر حق یہی ہے جیسا کہ اس آیت کے موقعہ پر لکھا جائے گا۔ کہ نہ اس جگہ زکوٰۃ کا حکم ہے اور نہ یہ حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے بلکہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہو اور تمہاری محنت ٹھکانے لگے تو اس شکریہ میں کہ خدا تعالیٰ نے تم کو اس قابل بنایا اللہ تعالیٰ کے غریب بندوں کو بھی اس میں سے کچھ حصہ دو۔ اس حکم پر بھی مسلمانوں میں بہت کم عمل رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ خرچ ایسا طبعی خرچ ہے کہ اسے بھولنا نہیں چاہیئے۔ اور ہر کامیابی پر خدا تعالیٰ کی راہ میں کچھ نہ کچھ بطور شکرانہ خرچ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کامیابی پر الحمد للہ کہنے کا ایک عملی نمونہ ہے۔

شکرانہ کے طور پر خرچ کرنے کا حکم

اشاعت اسلام یا نظام جماعت کی مضبوطی کیلئے خرچ

(۵) خرچ کی پانچویں قسم جو قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے

فدیہ ہے۔ فدیہ کے معنے صدقہ کے بھی ہیں۔ لیکن اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جو کمی کسی نیک عمل میں رہ جائے۔ اُسے خدا تعالےٰ کی راہ میں کچھ مال خرچ کرکے پورا کیا جائے چنانچہ سورۂ بقرہ ع۲۴ میں حج کے احکام میں لکھا ہے کہ ایام احرام میں سر نہیں منڈانا چاہیئے۔ لیکن اگر کسی کے سر میں کوئی بیماری ہو اور سر منڈوانا پڑے تو بطور فدیہ کچھ صدقہ کرے یا روزے رکھے یا قربانی دے۔ پس فدیہ وہ خرچ ہے جو کسی عمل میں کمی رہ جانے کے خیال سے دیا جاتا ہے۔ اور گویا عبادت کی اس کمی کو اس خرچ سے پورا کیا جاتا ہے۔

فدیہ ۔ تاوانی خرچ

(۶) خرچ کی ایک چھٹی قسم قرآن کریم سے ثابت ہے اور اس کا نام کفارہ ہے۔ کفّارہ کا لفظ ردّ بلا کرنے والے فعل کے بھی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور اصطلاح بھی قرآن کریم کی ہے اور اس کے رُو سے کفارہ اس خرچ یا اس عبادت کا نام ہے جو کسی گناہ کا وبال دُور کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں سورۃ مائدہ کے بارھویں اور تیرھویں رکوع میں آتا ہے۔ اس میں اور فدیہ میں یہ فرق ہے کہ فدیہ تو اس صورت میں ادا کیا جاتا ہے جب کوئی فعل اللہ تعالیٰ کی اجازت سے کیا جائے اور اس اجازت سے کوئی حکم جو دوسری صورت میں ضروری تھا ترک کرنا پڑے۔ یا جب کوئی عمل کر تو لیا جائے مگر اس خیال سے کہ اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو کچھ صدقہ کرکے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر کفارہ اس صورت میں دیا جاتا ہے کہ جب کوئی گناہ صادر ہو جائے۔ یا گناہ تو صادر نہ ہو لیکن گناہ کے صدور کے قریب ہو جائے اور اس کی غرض اس گناہ کے وبال سے بچنا اور توبہ کا ایک عملی نشان قائم کرنا ہوتی ہے (اس مضمون کو تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ آیاتِ متعلقہ کے ماتحت بیان کیا جائیگا)

کفارہ ۔ حق الخدمت

اس جگہ ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ قرآن کریم تو کفارہ کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ ایک تائب اپنی توبہ کا عملی ثبوت دلی ندامت اور زبانی اقرار کے علاوہ کچھ مالی یا جسمانی قربانی کے ذریعہ سے دے۔ لیکن مسیحیوں کے نزدیک کفارہ کا یہ مفہوم ہے کہ ایک اعلیٰ وجود نے اپنے آپ کو گنہگار کے پیدا ہونے سے بھی پہلے قربان کر دیا۔ گویا توبہ کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ کیونکہ توبہ تو الگ رہی مسیحیوں کا کفارہ گناہ بلکہ گنہگار کے پیدا ہونے سے بھی پہلے ادا کیا جا چکا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے کفارہ کو توبہ سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔

(۷) ساتویں قسم خرچ کی قرآن کریم سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ مدنی نظام کی ترقی کے لئے کچھ اخراجات انسان پر واجب کئے گئے ہیں۔ جیسے خاوند کا بیوی پر خرچ اور باپ کا اولاد پر خرچ۔ ان اخراجات کو بھی قرآن کریم نے ضروری اور فرض مقرر کیا ہے۔ اور اگر کوئی ان اخراجات سے گریز کرے تو اُسے گنہگار قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر اسلامی حکومت ہو یا اسلامی نظام ہو تو اس کا فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ یہ اخراجات جبراً کرائے۔ اس خرچ کی تفصیلات بھی آئندہ حسب موقع بیان ہوں گی۔

(۸) آٹھویں قسم خرچ کی جو قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے۔ حق الخدمت ہے یعنی اگر کوئی شخص کسی کا کام کرے تو اس کا مناسب اجر اُسے دیا جائے اور اس سے نیک سلوک کیا جائے۔ اس خرچ کی ایک مثال قرآن کریم کا وہ حکم ہے جو اولاد کو دُودھ پلوانے کے متعلق آتا ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم کا حکم ہے کہ اگر اپنے کسی بچہ کو کسی دوسری عورت سے دُودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ دُودھ پلانیوالی عورت کو سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ ع۳۰) یعنی جو حق الخدمت حسب دستور اور ملک کے اقتصادی حالات کے مطابق اور اپنی مالی حالت کے مطابق تم اُسے دینے کا وعدہ کرو اُس کے سپرد کر دو۔ اس حکم میں بتایا گیا ہے کہ حق الخدمت کے لئے ضروری ہے کہ (۱) بلا حجت ادا کر دیا جائے اور اس کے ادا کرنے کا انسان ایسا عہد کرلے کہ گویا ادا کر ہی دیا ہے (۲) اس کے ادا کرنے میں معروف کو نظر رکھا جائے یعنی (الف) ملک کی اقتصادی حالت کے مطابق ادا کیا جائے یعنی اس قدر کم نہ ہو کہ اس وقت کی اقتصادی حالت کے مطابق اس سے دُودھ پلانے والی کا گذارہ نہ ہو سکے (ب) پہلی حد بندی تو کم سے کم تھی اس سے زائد یہ بھی مدنظر رکھو کہ اگر تمہاری مالی حالت عام لوگوں سے اچھی ہو تو ایسا حق الخدمت ادا کرو جو

تمہاری مالی حالت کے بھی مطابق ہو۔ یعنی کم سے کم حق الخدمت تو وہ ہو جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق گزارہ کے لئے کافی ہو لیکن اگر ہو سکے تو اس سے زیادہ دو۔

اس حکم کے ذریعہ سے قرآن کریم نے حق الخدمت کا ایک ایسا زریں اصل بتا دیا ہے کہ اگر اس کے مطابق حق الخدمت مقرر کیا جائے تو مزدور اور مالک کے جھگڑوں کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس مضمون کو تفصیل سے آیت مذکورہ بالا اور اس کے ہم معنے آیات کے ماتحت بیان کیا جائیگا۔

(۹) نویں قسم خرچ کی قرآن کریم سے ادائے احسان کی ثابت ہوتی ہے جیسے مثلاً والدین کی خدمت کا حکم ہے۔ یہ سلوک نہ تو حق الخدمت کہلا سکتا ہے کیونکہ والدین خدمت نہیں کرتے بلکہ ایک طبعی جوش سے بچے کی پرورش کرتے ہیں اور بچہ ان کو اس کام پر مقرر نہیں کرتا نہ کوئی اور انسان انہیں مقرر کرتا ہے اور نہ انہیں کسی بدلہ کی تمنا ہوتی ہے۔ پس والدین کا سلوک بچے سے خدمت نہیں ہے بلکہ احسان ہے۔ اور اگر بڑا ہو کر کوئی بچہ اپنے والدین کی خدمت کرتا ہے تو وہ ان کا حق الخدمت ادا نہیں کرتا بلکہ ان کے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ والدین کی نسبت فرماتا ہے وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ (لقمان ع۲) یعنی ہم نے ہر انسان کو اپنے والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ پھر اسی جگہ آگے چل کر فرماتا ہے اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ یعنی ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ ہمارا بھی شکر کر اور اپنے والدین کا بھی۔ شکر کے لفظ سے یہ بتایا ہے کہ والدین کے ساتھ جو سلوک کر اس خیال سے نہ کر کہ میں ان کے ساتھ کوئی احسان کرتا ہوں بلکہ احسان تو انہوں نے تجھ پر کیا ہے۔ تُو تو جو نیک معاملہ ان سے کریگا اظہار شکر اور اقرار احسان کے طور پر ہوگا۔

قرآن کریم میں بعض جگہ والدین سے سلوک کا نام احسان بھی آیا ہے جیسا کہ مثلاً اسی سورۃ میں یعنی سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (ع۱۰) یعنی والدین سے احسان کا سلوک کر۔ اس سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ والدین سے سلوک بھی احسان کے معروف معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں احسان کا لفظ عام معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک اور معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کسی امر کے بدلہ کے لئے بھی وہی لفظ استعمال کر دیا جاتا ہے۔ جیسے مثلاً ظلم کے بدلہ کا نام ظلم رکھ دیا جاتا ہے اور اس سے مراد ظلم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے معنے ظلم کے بدلے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں اور دوسری آیات میں جہاں والدین کے لئے احسان کا لفظ آیا ہے اس کے معنے احسان کے بدلہ کے ہیں۔ لیکن ان کے سوا دوسرے لوگوں کی نسبت اس لفظ کا استعمال اپنے معروف معنوں میں ہوا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں اور الفاظ بھی اس محاورہ کے مطابق استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں فرمایا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (بقرۃ ع۲۴) یعنی جو تم پر ظلم کرے اس پر اسی قدر ظلم کر سکتے ہو۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ ظلم کا اسی قدر بدلہ ظلم نہیں کہلا سکتا۔ پس بدلہ لینے والے کے لئے جو اعتداء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنے محض بدلہ کے ہیں نہ کہ ظلم کے اسی طرح احسان کرنیوالے کے حق میں جب احسان کرنے کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو اس کے معنے بدلۂ احسان کے ہوتے ہیں نہ کہ احسان کے۔

اسی ادائے احسان کے حکم کے نیچے اپنے اُستادوں اور دوسرے محسنوں یا انکی اولادوں سے حسن سلوک بھی آ جاتا ہے۔ اور اس حکم کے ماتحت سب سے بڑے انسانی محسن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حُسنِ سلوک کا بدلہ بھی آ جاتا ہے۔ جو صحابہ کرام درود اور دعاؤں اور خدمت کے ذریعہ سے ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انکی اولاد کے لئے صدقہ جائز نہیں تو اس میں یہی حکمت تھی کہ اُمّت اسلامیہ کو بتایا جائے کہ اس محسن عظیم کی اولاد سے جو سلوک کیا جائے وہ صدقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو اس محسن کے احسان کا بدلہ اتارنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہوگی۔

مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان اس مسئلہ کو خاص زور سے بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایسے بے نفس

تھے کہ آپؐ نے اپنی اولاد کے لئے صدقہ کو حرام کر دیا۔ اور انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ آپؐ ایسے بے نفس تھے تو مسلمان ایسے نفس کے بندے کیوں ہو گئے ہیں کہ آپؐ کے احسان کا بدلہ اتارنے کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کرتے۔ محسن کسی بدلہ کا خیال نہیں کرتا۔ مگر کیا جس پر احسان کیا جائے اس کی شرافت نفس اس کا تقاضا نہیں کرتی کہ وہ محسن کے احسان کا شکریہ عمل سے ادا کرے۔ میرے نزدیک اس حکم سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ ادب سکھایا تھا کہ اگر حضرت رسالتمآب کی اولاد میں سے کوئی غریب ہو تو وہ اس کے ساتھ حضورؐ کے احسان کی یاد میں سلوک کریں۔ کیونکہ آپکی اولاد کے ساتھ صدقہ کا معاملہ

ہدیہ

کیا ہی نہیں جا سکتا۔ کیا اپنے بھائیوں کو لوگ صدقہ دیا کرتے ہیں پھر کیا اس رُوحانی باپ کی اولاد سے اُن کا سلوک بھائیوں جیسا نہیں ہونا چاہیئے؟ افسوس کہ اس حکمت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان دو حکموں میں سے ایک کو توڑنے لگ گئے ہیں۔ یا تو وہ سادات پر صدقہ اور زکوٰۃ خرچ کرنے لگ گئے ہیں یا اُن کی خدمت سے بالکل محروم ہو گئے ہیں۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میں نے دیر سے اس نکتہ کو سمجھا ہے اور مجھے کئی دفعہ اس امر کی توفیق ملی ہے کہ غرباء سادات کی خدمت کروں۔ نہ اس خیال سے کہ میں اُن پر صدقہ کر رہا ہوں بلکہ اس خیال سے کہ اُن سے حسن سلوک اس احسان عظیم کے اقرار کی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم پر کئے ہیں ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ کاش مسلمان اس نکتہ کو سمجھیں اور سادات کو صدقہ دینے یا انکی مشکلات کو بالکل نظر انداز کرنے کے دو قبیح جرموں سے محفوظ ہو جائیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو شاید اللہ تعالیٰ بھی انکی اولادوں پر رحم فرمائے۔

آیت مما رزقنٰہم ینفقون میں ہر قسم کے اخراجات کا حکم

(۱۰) دسویں قسم جو قرآن کریم سے خرچ کی ثابت ہے وہ ہدیہ ہے یعنی بغیر کسی سابق احسان یا صدقہ کے خیال کے ایک دوسرے کو موقعہ مناسب پر ہدیہ دیا جائے تاکہ آپس میں محبت بڑھے۔ اس کا بہترین موقعہ تو وہ ضیافت ہے جو ایک شخص دوسرے کی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دو نبیوں کے ذکروں میں آتا ہے۔ ضیافت صرف ایک صورت ہدیہ کی ہے ورنہ اور مناسب مواقع بھی اس حکم کے عمل کے نکل سکتے ہیں۔ افسوس مسلمانوں نے اس حکم کو بھی بھلا دیا ہے۔ اور مسافروں کی مہمان نوازی شاذ و نادر کے طور پر رہ گئی ہے بلکہ شہروں کے باشندے تو اس سے قریباً محروم ہی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس قدر تاکید کی ہے کہ ضیافت کو ایک حق قرار دے دیا اور فرمایا کہ اگر کسی بستی کے باشندے ضیافت میں کوتاہی کریں تو اُن سے جبراً بھی ضیافت کا حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس حق کی تمام تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس حق کی تشریح میں فرماتے ہیں تَهَادَوْا تَحَابُّوا (ابن عساکر عن ابی ہریرہ بحوالہ جامع الصغیر) یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے محبت میں ترقی ہوتی ہے۔ اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھے جبریل علیہ السلام نے ہمسایوں سے نیک سلوک کی اس قدر تاکید کی کہ میں نے سمجھا کہ اُسے وارث مقرر کر دیا جائے گا (ترمذی جلد دوم ابواب البرّ والصِّلَة باب ما جاء فی حق الجوار)

یہ خرچ صدقہ کی اقسام سے نہیں ہے بلکہ اخوت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور تمدن کی ترقی کے لئے نہایت ضروری احکام میں سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں صرف صدقہ کا ذکر نہیں بلکہ اُوپر کے بیان کردہ سب قسم کے اخراجات اس میں شامل ہیں۔ اور غریب امیر بڑے چھوٹے سب کے بارہ میں اس میں نہایت لطیف احکام بیان ہوئے ہیں۔ اور تقویٰ کے قیام کے لئے یہ ایک ضروری امر ہے۔

آیت کے مضامین پر مجموعی نظر

آیت کے مضامین پر مجموعی نظر

اِس آیت میں تین احکام بیان ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ان صداقتوں پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے جو انسانی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ اور بتایا ہے کہ صرف محسوسات پر ایمان رکھنا کوئی خوبی نہیں۔ کیونکہ انکو تو ہر جاہل سے جاہل اور بیوقوف سے بیوقوف

بھی مانتا ہے حقیق کا مقام اس سے بالا ہے اور وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ان صداقتوں پر بھی ایمان لائے جو نظاہر نظر سے پوشیدہ ہوتی ہیں اور یہی روحانیت کے کمال کی علامت ہے ورنہ دریا کو دریا سمجھنا اور پہاڑ کو پہاڑ جاننا کوئی خوبی نہیں ہے دریا کو دریا ماننے والا عالم اور کامل نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ وہ شخص عالم سمجھا جاتا ہے جو اس دریا کے پیچھے بھی نظر کرتا ہے۔ اور یہ تحقیق کرتا ہے کہ دریا کہاں سے آیا ہے، کس طرح بنا ہے، کن طبعی تغیرات کے نتیجہ میں اس کو پانی حاصل ہوا ہے۔ اور اس پر بھی غور کرتا ہے کہ دریا سے اس وقت کیا کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور یہ کہ وہ کدھر کو جاتا ہے اور کہاں گرتا ہے۔ غرض ایک دریا کو دیکھنے والے جاہل اور عالم میں یہی فرق ہے کہ جاہل صرف حاضر کو جانتا ہے اور عالم اس کے غائب حصہ کو بھی جانتا ہے۔ اور اسی کے جاننے سے وہ اس سے علمی اور عملی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہی حال روحانیات کے متعلق ایک عالم باعمل یا دوسرے لفظوں میں ایک متقی کا ہوتا ہے۔ وہ بھی اس دنیا کے بارہ میں صرف اس پر قناعت نہیں کرتا جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے بلکہ اس کے مبدا اور منتہیٰ کی تحقیق بھی کرتا ہے اور اس کے مخفی خزانوں کو بھی تلاش کرتا ہے اور اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سوائے اس قسم کی تحقیق کے نہ علم کامل ہو سکتا ہے نہ عمل۔ پس ایمان بالغیب انسانی تکمیل کا ایک ایسا ضروری جزو ہے کہ اسے نظر انداز کر دینا صرف ایک جاہل کا کام ہو سکتا ہے۔

اس اہم اور ضروری امر پر زور دینے کے بعد اس کے لازمی نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اول یہ کہ جب انسان اس عالم کے مبدا پر غور کرتا ہے اور اس کے پیدا کرنے والے وجود کو دلائل سے معلوم کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ شدید تعلق پیدا کرنے کی طرف بھی توجہ کرتا ہے اور اسی کا نام دوسرے لفظوں میں عبادت یا اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ پھر جب اس کا روحانی تعلق اس مبداءِ کُل سے ہو جاتا ہے تو لازماً اسے اس کے متعلقین اور متوسلین کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے اور ان کی بہتری کے لئے کوشش کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ مبداءِ کُل سے تعلق پیدا ہو جانے کے بعد اس کی مخلوق کی محبت بھی اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے جس طرح کہ ماں باپ سے تعلق کے نتیجہ میں بھائیوں کی محبت پر بھی انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ پس عبادت اور اقامتِ صلوٰۃ کے بعد متقی کا دوسرا کام وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ بتایا۔

ایمان بالغیب کے بعد اقامۃ الصلوٰۃ اور اس کے بعد مما رزقنٰھم ینفقون رکھنے میں حکمت

اوپر کی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں ایمان بالغیب کے بعد اِقَامَةَ الصَّلٰوةِ اور اس کے بعد مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا رکھنا ایک اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ ایک پُر حکمت ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے۔

اقامۃ الصلوٰۃ کے حکم کو مما رزقنٰھم ینفقون سے پہلے رکھنے کا مطلب

اس جگہ ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ اِقَامَةَ الصَّلٰوةِ کو اس جگہ پہلے رکھا گیا ہے اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کو بعد میں رکھا گیا ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ روحانی عالم میں خدا تعالیٰ سے تعلق مخلوق سے تعلق پر مقدم ہے اور یہی طبعی اور درست ترتیب ہے۔ کیونکہ غیر اللہ تو سے کامل تعلق کے مخلوق سے کامل محبت ہو ہی نہیں سکتی۔

روحانی عالم میں خالق سے تعلق مخلوق سے تعلق پر مقدم ہے

اس معاملہ میں اسلام اور فلسفیوں کے خیالات میں اختلاف ہے فلسفی کہتے ہیں اور بعض مذہب سے ناکمل تعلق رکھنے والے بھی انکی تائید کرتے ہیں کہ جب مخلوق سے تعلق ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے خود بخود ہی تعلق ہو جاتا ہے۔ اور اُن کے نزدیک جو شخص مخلوق سے تعلق کو درست کرے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی آپ ہی آپ درست ہو جاتا ہے۔ پس اصل چیز جس کی طرف توجہ چاہیئے وُہ مخلوق سے تعلق ہے۔ مگر ایک ادنیٰ تأمّل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بات بالبداہت باطل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوق سے نیک سلوک خدا تعالیٰ کی عبادت کا حصہ ہے لیکن یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ امر اللہ تعالیٰ سے تعلق کا موجب ہو سکتا ہے۔ بلکہ حق یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق مخلوق سے محبت کا موجب ہوتا ہے اور جو لوگ اس کے اُلٹ خیال کرتے ہیں وہ اس امر کو نہیں دیکھتے کہ مشاہدہ کس امر کی تائید کرتا ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتے کہ جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کو پا کر مخلوق سے محبت کی ہے وہ کس پایہ کے تھے اور جو لوگ مخلوق سے محبت کر کے خدا تعالیٰ کو

مخلوق سے تعلق پیدا کر کے خالق تک پہنچنے کا خیال رکھنے والوں کے شبہات کا رد

پانے کے مدعی ہیں وہ اگر کہیں پائے جاتے ہیں تو کس پایہ کے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو پا کر مخلوق سے محبت کرنے والوں میں سے حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ حضرت کرشنؑ حضرت رامچندر اور حضرت زردشت ہیں اور میرے نزدیک حضرت بُدھ اور حضرت کنفیوشس علیہم السلام بھی اور سب کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم۔ ان سب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے جس رنگ میں اور جس شان کی بنی نوع انسان اور

خدا تعالیٰ کو پا کر پھر مخلوق کی محبت کرنے والے بکثرت ملتے ہیں

باقی مخلوق کی خدمت کی ہے اس کی مثال دوسرے لوگوں میں کہاں پائی جاتی ہے؟ کوئی ایک شخص بھی جس نے مخلوق سے محبت کرکے خدا تعالیٰ کو پایا ہو ان کے مقابل پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کے مقابل پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اور حق یہ ہے کہ تاریخ ایسے وجود کو پیش ہی نہیں کرتی جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس نے پہلے مخلوق سے محبت کی اور پھر خدا تعالیٰ کو پایا۔ لیکن ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی دنیا میں گزرے ہیں کہ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو پایا اور اس کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی مخلوق کی محبت کو حاصل کیا۔ پس جبکہ مشاہدہ اس امر پر شاہد ہے کہ خدا تعالیٰ کو پا کر مخلوق کی محبت کرنے والے تو ہزاروں لاکھوں وجود دنیا میں گزرے ہیں لیکن مخلوق کی محبت کرکے خدا تعالیٰ کو پانے والے کسی ایک وجود کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ تو ایسی بے دلیل بات کے پیش کرنے کا فائدہ کیا۔

دوسرا پہلو اس سوال کا عقلی پہلو ہے۔ اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تب بھی یہ دعویٰ کہ پہلے مخلوق کی محبت ہو تو اس سے خدا تعالیٰ آپ ہی مل جاتا ہے درست ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ عقلی طور پر مخلوق کی محبت سے خدا تعالیٰ کے وجود کا مل جانا ناممکن

مخلوق کو خالق پر مقدم کرنے کے متعلق عقلی دلیل

اور غیر معقول نظر آتا ہے۔ کیونکہ مخلوق کی محبت کی وجہ یا تو حُبِّ وطنی ہو سکتی ہے یا طبیعت کی نرمی۔ اور ظاہر ہے کہ حُبِّ وطن کی وجہ سے جو بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے وہ وطنی تقاضا کے ماتحت ان دوسرے انسانوں سے جو اس کے وطنی نہیں ہیں دشمنی بھی کر سکتا ہے۔ اور اسے خدا تعالیٰ تک پہنچانے والا کوئی بھی موجب موجود نہیں بلکہ اس سے دُور لے جانے والے موجبات پیدا ہوتے رہیں گے اور وُہ بجائے خالق کی طرف جانے کے سیاسیات میں اُلجھ کر رہ جائیگا۔ اور اگر اس کا موجب طبعی نرمی ہو تب بھی ایسے شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف پھیرنے والا موجب کوئی موجود نہیں۔ کیونکہ ایسا شخص کسی عقلی سبب سے مخلوق سے حسن سلوک نہیں کرتا بلکہ محض طبعی نرمی کی وجہ سے ایسا کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی عقل اُسے کسی دوسرے رستہ کی طرف راہنمائی ہی نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے۔

بعض لوگ اس موقعہ پر کہا کرتے ہیں کہ حُبِّ وطن نہیں بلکہ محبتِ انسانیت انسان کو بنی نوع سے حُسنِ سلوک کی طرف راغب کرتی ہے اور ایسا انسان یقیناً سیاسیات سے بالا رہتا ہے لیکن یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے۔ کیونکہ ہر فعل کا کوئی طبعی محرک ہوتا ہے اور اُسی کے مطابق اس کے خیالات کی رَو دوسری اطراف کی طرف پھرتی ہے۔ پس اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ انسانیت کی محبت کی وجہ سے بنی نوع انسان سے حسنِ سلوک کرنے والے شخص کے لئے محرک کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے افعال کا محرک خدا تعالیٰ کی محبت نہیں تو پھر اس کے لئے محرک یہی خیال ہو سکتا ہے کہ چونکہ باقی انسان بھی میری طرح کے انسان ہیں اس لئے بوجہ ہم جنس ہونے کے مجھے اُن سے محبت کرنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دوسرے انسانوں سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ اسی کی طرح کے انسان ہیں وُہ درحقیقت اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اس کی اپنی ذات کی محبت اُسے کسی اپنے سے بالا وجود کی طرف توجہ نہیں دلا سکتی۔ اور اس کا خاتمہ بھی اسی حالت میں ہوگا جس حالت پر کہ اس کی ابتداء ہوئی ہے اور وُہ محض حُبِّ انسانیت کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف راہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔

اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ جو شخص مخلوق سے محبت کرے اُسے خدا تعالیٰ اس کے نیک فعل کی وجہ سے اپنی طرف کھینچ لے۔ مگر یہ حالت غیر طبعی ہے کیونکہ یہ صورت اسی شخص کے حق میں پوری ہو سکتی ہے جو خدا تعالیٰ کا علم رکھتے ہوئے مخلوق سے کامل محبت کرے۔ کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کو عقلی طور پر معلوم کر لیتا ہے اور پھر اس کی طرف سے مُنہ موڑ کر مخلوق کی خدمت پر

اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ

اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا ہے ایمان لاتے ہیں اور وہ آئندہ ہونیوالی (موعود باتوں)

کفایت کرتا ہے وہ تو ایک زبردست سچائی کا منکر ہے اور ہدایت پانے کا مستحق نہیں۔ ہاں صرف وہ شخص اس حالت میں ہدایت پانے کا مستحق ہو سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کا علم حاصل نہیں ہوا لیکن اس نے اپنے فطری قویٰ کو صحیح طور پر استعمال کیا اور گو صانع کا وجود اس کی نگہ سے پوشیدہ رہا مگر اس نے اس قدر حصے سے جو اسے نظر آتا تھا (یعنی مخلوق) اپنے تعلق کو مضبوط کر لیا۔ ایسا شخص بے شک باوجود مخلوق سے پہلے تعلق پیدا کرنے کے صانع کی طرف ہدایت پانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ جس قدر حصہ پر عمل کرنا اس کے لئے اس کے علم کے مطابق ممکن تھا اس نے اس پر عمل کر لیا اور اس قسم کی استثنائی حالتوں میں مخلوق کو پا کر خالق کو پا لینے کے ہم بھی منکر نہیں نہ قرآن کریم اس کے خلاف ہے۔ بلکہ قرآن کریم سے صاف ظاہر ہے کہ جو ان سامانوں سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اُسے میسّر ہیں خدا تعالیٰ اُسے ان دوسرے سامانوں کی طرف ہدایت کرتا ہے جو اُسے میسر نہ تھے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت بھی اسے ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ مجھے ایمان تو اب نصیب ہوا ہے مگر ایمان سے پہلے بھی میں بنی نوع انسان سے نیک سلوک کیا کرتا تھا کیا میرے ان اعمال کا بھی مجھے کوئی صلہ ملیگا یا مجھے اب اپنی گزری ہوئی عمر کے اعمال کی تلافی کرنی چاہیئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَسْلَمْتَ عَلٰى مَآ اَسْلَفْتَ (مسلم کتاب الایمان باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم بعدہٗ) یعنی تمہارے وہ عمل ضائع نہیں ہوئے بلکہ تم کو جو اسلام کی صداقت کے قبول کرنے کی توفیق ملی ہے یہ اُنہی اعمال کی وجہ سے ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اعمال جو خدا تعالیٰ کا علم ہونے سے پہلے تم نے کئے گو خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے نہیں کئے مگر چونکہ اس میں تمہارا قصور نہ تھا خدا تعالیٰ نے ان کو بھی قبول کر لیا اور مخلوق سے نیکی نے تم کو خدا تعالیٰ کے عرفان اور اس پر ایمان کی طرف راہنمائی کی۔ لیکن اس جگہ سوال یہ نہیں کہ عدمِ علم کی صورت میں بطور استثناء انسان سے کیا سلوک کیا جا سکتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو خدا تعالیٰ کے وجود کا علم ہو جائے تو پھر وہ اس سے تعلق پیدا کر کے اپنے نفس کی اصلاح میں جلدی کرے یا وہ اس سے مُنہ موڑ کر مخلوق کی خدمت میں لگ جائے اور اقرار کرے کہ میں تو اس ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو پاؤں گا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقلمند اس امر کی تائید کرے گا۔ کہ خدا تعالیٰ کا علم ہو جانے کے بعد بھی انسان کو اس سے مُنہ موڑ لینا چاہیئے اور مخلوق کی خدمت میں لگ جانا چاہیئے کہ یہی طبعی راستہ خدا تعالیٰ کو پانے کا ہے بلکہ ہر عقلمند یہ کہیگا کہ اس صورت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مُنہ موڑ لینا ہدایت پانے کا موجب نہ ہوگا بلکہ ہدایت سے دُور جانے کا موجب ہوگا۔

خدا تعالیٰ کو پا کر مخلوق کی محبت کا پیدا ہونا ایک طبعی راستہ ہے

خلاصہ یہ کہ مخلوق کی خدمت کر کے خدا تعالیٰ کو پانا ایک استثنائی صورت ہے۔ اور عدمِ علم کی صورت میں ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کو پا کر مخلوق کی محبت کا پیدا ہونا ایک طبعی راستہ ہے کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کو پا کر اس کی عبادت میں لگ جائیگا وہ لازماً اس کی مخلوق سے بھی محبت کریگا کیونکہ خدا تعالیٰ کو پا لینے کے معنے یہ ہیں کہ اس کی صفات کا کامل علم اُسے ہو جائے اور جو شخص خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت عالمین اور صفت رحمانیت اور صفت رحیمیت اور صفت مالکیت یوم الدین کو معلوم کرے گا [illegible] طبعاً اس کے بندوں سے اسی رنگ میں سلوک کرے گا جس رنگ میں کہ اس کا رب ان بندوں سے سلوک کرتا ہے ورنہ وہ اس کے نقش کو اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتا۔ پس خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے اس کے بندوں سے حُسنِ سلوک کرنا ایک لازمی امر ہے اور خدا تعالیٰ کے تعلق کا ایک نشان ہے اور اسی طبعی امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم نے اِقَامَۃ الصَّلٰوۃ کو مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ سے پہلے رکھا ہے۔

هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ

پر (بھی) یقین رکھتے ہیں ۝۵ یہ لوگ اس ہدایت پر (قائم) ہیں جو اُن کے رب کی طرف سے ہے

یؤمنون

۵ حل لغات۔ یُؤْمِنُوْنَ: کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴۔

اُنْزِلَ:۔ اَنْزَلَ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اَنْزَلَ اللّٰہُ الْکَلَامَ کے معنے ہیں اَوْحَیٰ بِہٖ۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کلام کو بذریعہ وحی نازل فرمایا (اقرب) پس وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ کے معنے ہوں گے اور وہ لوگ جو اس کلام پر جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے ایمان لاتے ہیں۔

الاخرۃ

اَلْاٰخِرَۃُ:۔ اَلْاٰخِرُ کا مؤنث ہے اَلْاَوَّلُ کے مقابل پر بولا جاتا ہے اور صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے (اقرب) یہاں پر اس کا موصوف محذوف [illegible] ہے معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ آنے والی، آئندہ ہونے والی۔

یوقنون

یُوْقِنُوْنَ:۔ اَیْقَنَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَیْقَنَ الْاَمْرَ وَاَیْقَنَ بِہٖ کے معنے ہیں عَلِمَہٗ وَتَحَقَّقَہٗ۔ یعنی کسی بات کو معلوم کیا اور اس کی پوری تحقیق کرتے ہوئے اپنے شک و شبہ کو دور کر لیا۔ اور اَلْاِیْقَانُ (جو اَیْقَنَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اِزَاحَۃُ الشَّكِّ وَتَحْقِیْقُ الْاَمْرِ۔ اپنے شک کو دور کر لینا اور کسی معاملہ کی پوری تحقیق کر کے حقیقت پر قائم ہو جانا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں متقیوں کی تین اور صفات بیان کی گئی ہیں اور اس آیت کی پہلی اور گزشتہ آیت کو ملا کر چوتھی

متقیوں کی چوتھی صفات کا ذکر

علامت متقی کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان فرمائی ہے کہ جو کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے متقی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس صفت کے بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ انسان کے لئے صرف نیک نیتی کافی نہیں ہوتی بلکہ صحیح طریق عمل کا اختیار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ صرف نیک نیتی اسی حالت میں کام آتی ہے جبکہ صحیح طریق عمل کا معلوم کرنا اس کے لئے ناممکن ہو لیکن جب صحیح طریق عمل کا معلوم کرنا ممکن ہو تو نیک نیتی کا عذر

نہ صرف یہ کہ غیر مقبول ہوتا ہے بلکہ غیر معقول بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص کی نیت نیک بھی ہو اور وہ پھر بھی صحیح طریق عمل کو نظر انداز کر دے اور اس کے معلوم کرنے سے اعراض کرے۔ نیک نیت تو وہی ہوتا ہے جو اپنی نیت کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ لیکن جو شخص باوجود استطاعت کے صحیح طریق عمل کو چھوڑ دیتا ہے یا اُسے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ تو اپنے عمل سے اپنے دعویٰ کو باطل کرتا ہے اور اپنی بد نیتی پر آپ شاہد ہوتا ہے۔

چونکہ روحانی عالم میں صحیح طریق عمل وہی ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بتایا جائے اس لئے وہی شخص نیک نیت کہلائیگا کہ جو اس طریق کو معلوم کرنے اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ اور چونکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہی صحیح طریق عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ پر ظاہر کیا ہے۔ اس لئے وہی شخص روحانی مقاصد کو پا سکتا ہے جو آپؐ پر نازل ہونے والے کلام پر ایمان لائے۔ پس چوتھی صفت متقی کی یہ بیان کی گئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام پر ایمان لاتا ہو۔ کیونکہ جو شخص اس کلام پر ایمان نہیں لاتا جو اس کے زمانہ کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہو وہ ہدایت کی جزئیات سے نہ باخبر ہو سکتا ہے اور نہ اُن پر عمل کر سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو کسی مقصد کے حصول کی تمام جزئیات سے واقف نہیں [illegible] اس مقصد کو پا بھی نہیں سکتا۔ جو شخص کسی زبان کا عالم بننا چاہے اسے اس زبان کے الفاظ اور الفاظ کی صحیح بندش کے طریق اور اس میں خیالات کے اظہار کے مناسب طریق کو بھی سیکھنا ہوگا ورنہ اس زبان کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تقویٰ کی تکمیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ تقویٰ کی جزئیات سے بھی انسان واقف ہو۔ جو ان سے واقف نہ ہوگا اس کے خیالات اور عمل بسا اوقات تقویٰ کے خلاف ہوں گے اور بجائے تقویٰ

میں ترقی کرنے کے وُہ آہستہ آہستہ اس اجمالی تقویٰ کو بھی کھو بیٹھیگا جو اُسے نیک نیتی کی وجہ سے حاصل تھا کیونکہ خالی نیت انسان کو صحیح اعمال پر قادر نہیں کرسکتی۔ کوئی شخص کتنا ہی مضبوط ارادہ رکھتا ہو کہ وہ صحیح زبان بولیگا لیکن اگر اُسے اس زبان کے الفاظ کا علم نہیں، اس کی بندشوں کا علم نہیں تو محض ارادہ سے وُہ صحیح زبان نہیں بول سکتا۔ پس اس جُملہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اجمالی تقویٰ کے حاصل ہونے کے بعد متقی اس کی تفصیلات کو معلوم کرکے اس کے مطابق عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور چونکہ اس زمانہ میں تقویٰ کی تفصیلات وہی ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ سے ظاہر کی گئی ہیں اس لئے تقویٰ کے تفصیلی حصہ کو حاصل کرنے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

بعض لوگ اس آیت اور ایسی ہی بعض دوسری آیات سے یہ دھوکا کھاتے ہیں کہ قرآن کریم پر ایمان لانے کا حکم ہے نہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کو تسلیم کرنے کی نہ ضرورت ہے، نہ جائز ہے بلکہ شرک ہے۔ یہ فرقہ چند سال سے ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اور اصل میں خوارج کی ایک شاخ ہے کیونکہ خوارج میں بھی اصل جذبہ یہی کارفرما تھا کہ اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ وَاَلْاَمْرُ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ یعنی حکم صرف خدا تعالےٰ کا ہے اس کے بعد جن امور میں کسی فیصلہ کی ضرورت ہو اس کا فیصلہ مسلمان اپنے مشورہ اور اتفاق سے کریں گے۔

ان لوگوں کو یہ دھوکا قرآن کریم کے مضامین پر غور نہ کرنے سے لگا ہے۔ ان کے اس وہم کی بنیاد اس پر ہے کہ چونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ متعدد آیات میں بیان ہوا ہے کہ وہ مکمل کتاب ہے اس لئے اور کسی شخص کی ہدایت یا تشریح کی کیا ضرورت ہے اس بنیاد میں غلو کرکے جہاں جہاں رسول پر ایمان لانے یا اس کی اطاعت کرنے کا حکم قرآن کریم میں آتا ہے اس کے معنے وہ قرآن کریم کے لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہاں رسول سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ لوگ اس امر پر غور نہیں کرتے کہ قرآن کریم میں کتب سماویہ کے نزول کا ذکر دو طرح آتا ہے ایک تو رسول کی طرف نسبت دے کر دوسرے اس کتاب کے ساتھ وابستہ گروہ سے نسبت دے کر۔ مثلاً قرآن کریم کی نسبت یہ الفاظ بھی ہیں کہ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ اور یہ بھی ہیں کہ وَھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام ع۱۴) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے تم پر ایک کامل اور مفصل کتاب اُتاری ہے۔ غور کے قابل بات ہے کہ آخر یہ فرق قرآن کریم نے کیوں کیا ہے کسی جگہ تو فرماتا ہے کہ یہ کتاب تم پر نازل ہوئی ہے اور کسی جگہ فرماتا ہے کہ یہ کتاب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اگر دوسرے لوگوں کی طرف کتاب نازل ہونے کی نسبت اس غرض سے کی گئی ہے کہ وہ کتاب اُن کے لئے نازل کی گئی ہے تو پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی صرف یہی کہا جاتا کہ جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ لیکن قرآن کریم نہ ایک جگہ بلکہ متواتر اس نسبتِ نزول کا ذکر کرتا ہے اور اس شخص کو پیش کرتا ہے جس پر وہ کلام نازل ہوا ہے اور یہ طریق بیان اس کا آنحضرت علیہ السلام کی نسبت ہی نہیں بلکہ تمام سابق انبیاء کی نسبت بھی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بھی وُہ یہ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ (بقرہ ع۱۱) یعنی ہم نے موسیٰ کو ضرور کتاب دی تھی اور پھر ساتھ یہ بھی فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ (آل عمران ع۲۰) یعنی اہل کتاب میں سے وُہ بھی ہیں جو اللہ تعالےٰ پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس پر بھی جو اے مسلمانو تم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو ان اہل کتاب پر نازل ہوا ہے۔ اِن دو قسم کی نسبتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں قوم پر نزول کتاب کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس امر پر زور دینا مطلوب ہے کہ اس قوم اور اس کتاب کے حالات بالکل متناسب ہیں اور اس قوم کے لئے اس کتاب پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں اور جہاں رسول پر کتاب نازل ہونے کا ذکر ہے وہاں اس مناسبت

بعض لوگوں کا آیت یومنون بما انزل الیک سے آنحضرت کی ذات کو چھوڑ کر قرآن مجید پر ایمان لانے کا غلط استدلال اور اس کا رد

کی طرف اشارہ ہے جو اس رسول کی فطرۃ کو اس کتاب سے حاصل ہے اور صرف کتاب کا ذکر ہی مطلوب نہیں۔ بلکہ یہ بتانا بھی مطلوب ہے کہ اس کتاب کی عملی تفسیر اور مجسم نمونہ اس کے وجود میں موجود ہے جس پر وُہ کتاب نازل ہوئی ہے اگر یہ نہ ہوتا تو کسی جگہ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ اور کسی جگہ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یا اٰتَيْنَا مُوْسٰى کہہ کر دو مختلف نسبتوں کی طرف اشارہ نہ کیا جاتا بلکہ صرف یہ کہہ دیا جاتا کہ قرآن کریم پر ایمان لاؤ یا تورات پر ایمان لاؤ جب کسی کتاب کا نام رکھ دیا جائے تو اس کا ذکر لمبے چوڑے جملوں سے عبث اور فضول ہو جاتا ہے اور اگر کسی کلام حکیم میں کتاب کے نام کو چھوڑ کر اور الفاظ میں اس کتاب کا ذکر کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس طریق بیان میں کوئی زائد فائدہ مدنظر رکھا گیا ہے اور وُہ فائدہ آیت زیر بحث میں یہی مدنظر ہے کہ کتاب کو منزل الیہ وجود کی طرف نسبت دے کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کتاب ہادی ہے بلکہ وہ وجود بھی ہادی ہے جس پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے چنانچہ اس اشارہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دوسری جگہ واضح الفاظ میں بھی بیان فرما دیا ہے۔ فرماتا ہے وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام ع۱۵) یعنی جب کفار کو نبیوں کے الہام کے ذریعہ سے کوئی نشان دکھایا جاتا ہے تو وُہ کہتے ہیں کہ جب تک اسی طرح ہم پر کلام نازل نہ ہو جس طرح ان مدعیان نبوت پر نازل ہوا ہے ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے کہ اس کا کلام کس پر نازل ہو اور کس پر نازل نہ ہو۔ پس جس کو وُہ اس کلام کے نزول کے مناسب حال سمجھتا ہے اسی کے ذریعہ سے کلام بھجواتا ہے۔ یہ آیت واضح طور پر اس امر کو ثابت کر رہی ہے کہ کلام الٰہی محض ایک ہرکارہ کے ذریعہ سے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وُہ ایک ایسے شخص کے ذریعہ سے بھجوایا جاتا ہے جو اس کا صحیح مفہوم لوگوں کو بتا سکے اور اس کا مطلب سمجھا سکے۔ اگر صرف الفاظ پہنچانے مطلوب ہوتے تو ہر نبی کی قوم میں اچھے اچھے ادیب موجود تھے ان کے ذریعہ سے وُہ کلام پہنچایا جا سکتا تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر بالعموم اُمّیوں اور ظاہر بینوں کی نگاہ میں کم علم لوگوں کی معرفت اس کلام کو بھجوانے کے تو یہی معنے ہیں کہ اس کلام کا مطلب بیان کرنے کی کلام لانے والے سے امید کی جاتی ہے اور دوسروں کی نسبت اس کلام کی باریکیوں کو سمجھنے کا اُسے زیادہ اہل سمجھا جاتا ہے اور نہ صرف الفاظِ کتاب اُسے دیئے جاتے ہیں بلکہ فہم کلام بھی اُسے عطا کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی فطرت اس کلام کے مفہوم کے مطابق اور مناسب ہوتی ہے اور جب یہ حقیقت ہو تو پھر یہ کہنا کہ جب کلام موجود ہے تو کلام لانے والے میں اور ہم میں کیا فرق ہے ہم کلام پر ایمان لائیں گے اور اس کا مطلب خود سمجھیں گے کس قدر عقل کے خلاف ہے اور بالکل اسی قسم کا قول ہے جیسے کفار نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے بات ہی کرنی تھی تو ہم سے کیوں نہ کر دی درمیان میں ایک واسطہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی کیا ہم اس کی بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ نہ خدا تعالیٰ نے ان کفار کے اعتراض کو درست سمجھا نہ یہ مومن کہلانے والے اپنے دعویٰ میں سچے ہیں۔ اور سچ یہی ہے کہ کلام الٰہی پر ایمان لانے میں کلام الٰہی لانیوالے پر ایمان لانا اور اس کی تشریح کو قبول اور تسلیم کرنا بھی شامل ہے کیونکہ کلام الٰہی لفظی کلام ہوتا ہے اور کلام الٰہی لانے والا اس کا جسمانی نمونہ۔ اور اُسے اسی لئے منتخب کیا جاتا ہے تا وہ اپنے عمل سے اس کا نمونہ پیش کرے اور اپنے کلام سے اسکی تفسیر بیان کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسی تشریح کو قبول کیا جائے جو اُس تک یقینی طور پر پہنچی ہو نہ یہ کہ ہر رطب و یابس جو کسی جھوٹے راوی نے اپنے سے پہلے چند معروف لوگوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔

چونکہ اس آیت سے بھی اس مضمون کا تعلق ہے اس جگہ اختصاراً اسے بیان کر دیا گیا ہے مفصل بحث اس کی ان آیات کے ماتحت آئے گی جو زیادہ وضاحت سے اس مضمون کی طرف اشارہ کرتی ہیں یا جن آیات سے مذکورہ بالا فاسد عقیدہ کے لوگ

استدلال کرتے ہیں۔

اس جگہ ایک اور مضمون بھی وضاحت طلب ہے اور وُہ کلام کے اتارنے کا محاورہ ہے عام طور پر جب اسلامی تعلیم سے ناواقف لوگ کلام الٰہی کے اترنے کا محاورہ قرآن کریم میں پڑھتے ہیں تو خیال کر لیتے ہیں کہ شائد یہ کلام خدا تعالیٰ نے لکھکر فرشتوں کو دیا اور وُہ اسے آسمان پر سے زمین پر لائے اور رسول کے ہاتھ میں دے دیا۔ بلکہ غیر مذہب والوں کو کیا کہنا ہے خود مسلمانوں میں سے ایک بڑا طبقہ تعلیم اسلام سے ناواقفی کی وجہ سے اب یہی سمجھنے لگ گیا ہے کہ شائد کوئی چیز آسمان پر سے زمین پر مادی طور پر اترتی ہے اور رسول کو ملتی ہے۔ لیکن یہ عقیدہ کئی غلطیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے (۱) ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ آسمان سے کیا مراد ہے (۲) انہوں نے غور نہیں کیا کہ فرشتے کیا ہیں اور ان کے اعمال کس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ (۳) انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کس ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں (۴) انہوں نے غور نہیں کیا کہ نزول کے کیا معنے ہیں۔ ان چار امور پر غور نہ کرنے کے سبب سے ان کو مذکورہ بالا غلط عقیدہ میں مبتلا ہونا پڑا ہے۔

اوّل سوال یہ ہے کہ کیا نزول کے یہ معنے ہیں کہ کلام الٰہی آسمان سے مادی طور پر نازل ہوتا ہے جیسا کہ عوام مسلمانوں میں اور اُن سے سُن سُنا کر دوسرے مذاہب کے لوگوں میں پھیلا ہُوا ہے۔ چنانچہ سیل مترجم قرآن انگریزی نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ کے باب۳ میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قرآن کریم ایک جلد میں جبرئیل فرشتہ کو دیا اور وُہ اسے نچلے آسمان پر لے آئے اور یہاں سے آہستہ آہستہ انہوں نے قرآن کریم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اُتارا۔ (تفسیر ریورنڈ ویری جلد اول صفحہ ۱۰۸) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسی روایات کی بناء پر جو مسلمانوں میں بدقسمتی سے مشہور ہو گئی ہیں لیکن اُن کے معنوں پر انہوں نے غور نہیں کیا اور نہ ان کی صحت کی تصدیق کی مسیحیوں نے اس قسم کی تاریخ کی بنیاد رکھی ہے اور اس وجہ سے ہم ان پر یہ الزام تو نہیں لگا سکتے کہ انہوں نے یہ روایات خود بنالی ہیں۔ لیکن جس رنگ میں اُنہوں نے ان روایات کو استعمال کیا ہے وہ ضرور قابل اعتراض ہے نیز وہ اس اعتراض کے نیچے ضرور ہیں کہ جن امور پر وہ اعتراض کرتے ہیں اسی قسم کے اُمور خود ان کی کتب میں موجود ہیں۔ جو تاویل وہ اپنی کتب میں کر لیتے ہیں دیانت اور تقویٰ کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی روایات یا ان قرآن کریم کی آیات کے متعلق جن میں انہیں کوئی ایسا مضمون نظر آتا وُہ ویسی ہی تاویل کر لیتے مذہب تو خشیت اللہ اور تقویٰ پیدا کرنے کیلئے ہوتا ہے نہ کہ ہار جیت کا اکھاڑہ بنانے کے لئے۔

کلام کے آسمان سے اترنے کے محاورہ کا مطلب

موسیٰ کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ جب سدوم اور عمارہ میں گناہ بڑھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تباہی کی خبر دی تو وُہ حضرت ابراہیم سے یوں گویا ہُوا "میں اب اُتر کے دیکھوں گا کہ انہوں نے سراسر اس چلّانے کے مطابق جو مجھ تک پہنچا، کیا ہے یا نہیں" (باب ۱۸ آیت ۲۱) اس آیت سے نہ صرف بظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کامل نہیں اور وُہ دوسروں سے خبریں سُن کر ان کی تصدیق بعد میں کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وُہ اس تصدیق کے لئے آپ آسمان سے اترنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اب اگر ان مسیحی مصنفین میں حقیقی دینی رُوح ہوتی اور وُہ مذہب کو ایک جیت ہار کا اکھاڑہ نہ سمجھتے تو اس آیت کی موجودگی میں انہیں قرآن کریم کے اس مضمون پر کیونکر اعتراض ہو سکتا تھا کہ کلام الٰہی آسمان سے اُترتا ہے۔

کلام اللہ کے آسمان سے اترنے کے محاورہ کا استعمال تورات میں

لطافت کے معنوں کے طور پر کسی کلام کے آسمان سے اترنے کے معنی

اس مضمون کے مطابق جو قرآن کریم میں بیان ہُوا ہے عہدنامہ قدیم کی کتاب اسموئیل میں بھی ذکر آتا ہے وہاں لکھا ہے "اور خداوند کی روح اس دن سے ہمیشہ داؤد پر اُترتی رہی" (باب ۱۶ آیت ۱۳) خدا کی روح کے معنے اس کے کلام اور اس کی ہدایت کے ہی ہیں۔ پس اس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام داؤد پر اُترتا رہا۔ اب جو چیز ہمیشہ داؤد پر اترتی رہی اور اس کا ذکر بائبل میں موجود ہے کس طرح تسلیم کیا جائے کہ مسیحی مصنفین اس کے مفہوم کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

نئے عہد نامہ میں بھی اسی قسم کا محاورہ استعمال ہوا ہے۔ اس میں آتا ہے "اور یوحنا نے یہ کہہ کے گواہی دی کہ میں نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اُترتے دیکھا اور وہ اس پر ٹھہری اور میں اُسے نہ جانتا تھا پر جس نے مجھے بھیجا کہ پانی سے بپتسمہ دوں اس نے مجھے کہا کہ جس پر تو روح کو اترتے اور ٹھہرتے دیکھے وہی ہے جو روح قدس سے بپتسمہ دیتا ہے سو میں نے دیکھا اور گواہی دی کہ یہی خدا کا بیٹا ہے (یوحنا باب ۱ آیت ۳۲ تا ۳۴) ان آیات سے ظاہر ہے کہ روح القدس جسے قرآنی اصطلاح میں کلام لانے والا فرشتہ یا جبرئیل کہتے ہیں کبوتر کی شکل میں حضرت مسیحؑ پر اترا جیسا کہ عہد نامہ جدید کے متعدد حوالہ جات سے ثابت ہے یہ روح قدس ہی ہے جو خدا کا کلام پہنچاتی ہے پس اس کبوتر نے اتر کر مسیحؑ پر خدا تعالیٰ کی مرضی ہی کھولی ہوگی چنانچہ متی باب ۳ آیت ۱۶ سے اس کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کیونکہ وہاں لکھا ہے کہ "اس نے (یعنی مسیح علیہ السلام) نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اُترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا" غرض خدا کی روح سے خدا تعالیٰ کا کلام ہی مراد ہے

کلام الٰہی کے آسمان سے اترنے کا ذکر انجیل میں

پس جبکہ عہد نامہ قدیم اور جدید دونوں خدا تعالیٰ اور اس کے کلام کے اترنے پر شاہد ہیں تو اس قسم کی روایات اگر مسلمانوں میں پائی جائیں تو مسیحیوں کو ان کے سمجھنے میں کیوں دقت پیش آئے۔

کلام الٰہی کے آسمان پر سے اترنے کا غلط مطلب سمجھنے کے چار وجوہات

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں سماء کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی اس کے معنے بادلوں کے ہوتے ہیں کبھی بلندی کے اور کبھی بلندیٔ مقام کے۔ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی اس کے بلند مقام کے ہوتے ہیں نہ یہ کہ وہ کسی خاص مقام پر انسانوں کی طرح بیٹھا ہے جس ہستی کی نسبت قرآن کریم خود فرماتا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (قٓ ع۲) وہ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے اس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ ایک جسمانی آسمان پر بیٹھا ہے اور وہاں سے لکھ لکھ کر اپنا کلام بھجوا رہا ہے کس طرح درست ہو سکتا ہے

عام مسلمانوں کو بھی یہ ٹھوکر لگی ہے اور انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر جو قرآن کریم میں مذکور ہیں غور کئے بغیر ذوالوجوہ روایات اور متشابہ آیات سے دھوکا کھایا ہے۔

دوسری وجہ جس سے لوگوں نے دھوکا کھایا ہے وہ فرشتوں کے متعلق اور ان کے اعمال کے ظہور کے متعلق اُن کا ناقص علم ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے مادی اجسام نہیں ہیں بلکہ تمام کائنات عالم کے لئے علّت ثانیہ کا مقام رکھتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان پہلے واسطہ کی حیثیت ان کو حاصل ہے اور نظام عالم کا خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کے اشارہ کے مطابق چلانا ان کا کام ہے۔ کوئی فرشتہ کلام الٰہی کو بندہ تک پہنچانیکا ذمہ دار ہے، کوئی پیدائش کا کارخانہ چلا رہا ہے، کسی کے ذمہ موت کا کام ہے اور وہ گویا بمنزلہ تاروں کے ہے جن کے ذریعہ سے دنیا کے کارخانہ کو خدا تعالیٰ حرکت دیتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اُن کی زبان سے فرماتا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (صافات ع۵) ہم میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے یعنی ہر ایک اپنے مقام پر رہتے ہوئے اسی طرح اپنا کام کر رہا ہے جس طرح کہ سورج اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اپنے گرد کے سیاروں تک روشنی پہنچاتا ہے اور انہیں اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جگہ کو چھوڑیں پس جب فرشتوں کا اُترنا ایک استعارہ ہے تو اس کلام کا اُترنا بھی جو اُن کے ذریعہ سے واقع ہوتا ہے ایک استعارہ ہے۔

تیسری وجہ غلطی لگنے کی یہ ہے کہ لوگوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ جاہل لوگ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح انسان کو ضرورت ہوتی ہے کہ اپنا کلام پہنچانے کے لئے وہ مادی وسائل کو اختیار کرتا ہے مثلاً کسی پیغامبر کو سواری دیکر اپنے مخاطب کی طرف بھجواتا ہے اسی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی اس امر کا محتاج ہے کہ اپنا پیغام لکھکر کسی پیغامبر کو دے اور وہ اس کے اس بندے تک چل کر آئے جس تک پیغام بھجوایا گیا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے کاموں کے متعلق صاف فرماتا ہے کہ وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (بقرہ ع۱۴) یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو اُسے

اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ انسانوں کی طرح حرکت کرے اور اس کام کے کرنے کے لئے چل کر جائے بلکہ وہ صرف یہ ارادہ کر لیتا ہے کہ ایسا ہو جائے پھر اسی طرح ہو جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے کلام بھیجنے کے صرف یہ معنے ہیں کہ وہ اس کا ارادہ کر لیتا ہے اور اس ارادہ الٰہی سے آپ ہی آپ کلام الٰہی کے نزول کا ذمہ وار فرشتہ واقف ہو جاتا ہے پھر وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے کائنات کی متعلقہ زنجیروں کو کھینچتا ہے اور خود بخود ایک لطیف اور پُر معارف کلام اللہ تعالیٰ کے اس بندہ کے کانوں یا دل یا آنکھوں پر نازل ہو جاتا ہے جس تک خدا تعالیٰ کا منشاء پہنچانا مطلوب ہوتا ہے ورنہ یہ ہرگز مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ کے ہونٹ ہیں اور زبان ہے اور حلق اور تالو ہے کہ وہ ان کو حرکت دے کر کوئی آواز پیدا کرتا ہے یا انسانوں کی طرح کے ہاتھ ہیں کہ وہ ان سے لکھ کر فرشتوں کو دیتا ہے اور وہ اسے رسول تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس آیت کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کا چوتھا موجب یہ ہے کہ لوگوں نے نزول کے معنے غلط سمجھے ہیں۔ بے شک نزول کے عام معنے جسمانی طور پر اُترنے کے ہیں لیکن لفظ اور معانی میں بھی مستعمل ہے اور قرآن کریم میں کئی اور جگہ دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً (آل عمران ع ۱۶) کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر غم کے بعد امن کے سامان اُتارے اور اس سے مراد امن کے سامان پیدا کرنا ہے کیونکہ نہ غم آسمان سے اترتا ہے نہ امن بلکہ دونوں زمینی تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ (زمر ع ۱) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آٹھ قسم کے چوپائے اتارے ہیں۔ حالانکہ چوپائے آسمان سے اُترا نہیں کرتے بلکہ زمین میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا (اعراف ع ۳) اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے لباس اتارا ہے جو تمہارے ننگ کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لئے موجبِ زینت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی (بقرہ ع ۶) ہم نے تمہارے لئے ترنجبین اور بٹیرے اتارے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (الحدید ع ۳) ہم نے لوہا اتارا ہے جس میں بہت بڑے جنگ کے سامان مخفی ہیں۔ اب ان تمام اشیاء میں سے ایک بھی نہیں جو آسمان سے اترتی ہو بلکہ سب ہی چیزیں زمین میں پیدا کی جاتی ہیں۔

خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا (طلاق ع ۲) ہم نے تیرا ایک بڑے شرف کی بات یعنی اپنا رسول اتارا ہے۔

اوپر کی تمام آیات سے ثابت ہے کہ نزول کا لفظ پیدا کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور اس جگہ بولا جاتا ہے جبکہ اس چیز کی پیدائش کا ذکر کیا جائے جسے بطور احسان یا انعام کے پیش کیا جائے۔ چنانچہ جانوروں کی پیدائش کا ذکر بھی بطور احسان کیا گیا ہے لوہے کی پیدائش کا بھی اور من و سلوٰی کی پیدائش کا بھی اور لباس کی پیدائش کا بھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا بھی۔ پس ان معنوں کے رو سے کلام الٰہی کے اترنے کے اصل معنے صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بطور ایک خاص نعمت کے ہوتا ہے اور اس کی ناقدری اور ناشکری کرنا انسان کو خدا تعالیٰ کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔ ورنہ یہ مراد نہیں کہ وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا آسمان سے اترتا ہے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک خاص اذن ہے جو تمام ملاوٹوں اور وسوسوں سے پاک ہونے کی حالت میں اس کے مقربوں کے کانوں یا آنکھوں یا قلوب پر منکشف کیا جاتا ہے اور جسے الفاظ اور صوت دی جاتی ہے۔ صرف ایک خیال کا نام نہیں ہے جیسے کہ برہمو سماج یا بابی وغیرہ خیال کرتے ہیں۔

لفظ نزول کا استعمال قرآن مجید میں اور اس کا صحیح مفہوم

کلام الٰہی کے صحیح مفہوم ادا کرنے کیلئے لفظ نزول کے استعمال میں حکمت

اس جملہ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ متقی کی تعریف صرف یہ ہے کہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لائے کیونکہ قرآن کریم سے پہلے زمانہ کے لوگوں میں بھی قرآن کریم متقیوں کا وجود تسلیم کرتا ہے مثلاً فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ (انبیاء ع ۴)

یعنی ہم نے موسٰی اور ہارون کو فرقان دیا تھا اور وہ تعلیم دی تھی جو متقیوں کے لئے روشنی اور شرف کا موجب تھی۔ پس جب حضرت موسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں بھی متقی تھے جبکہ نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے تھے اور نہ قرآن کریم اترا تھا تو معلوم ہُوا کہ متقی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانا دائمی شرط نہیں بلکہ ایک موقّت شرط ہے جس کا وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شروع ہوتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیئے کیونکہ خدا تعالےٰ کے تازہ احکام کو جو نہ مانے وہ متقی کیونکر ہوسکتا ہے۔ غرض موسٰی علیہ السلام کے زمانہ کے متقیوں کے لئے یہ شرط تھی کہ موسٰی کی وحی پر ایمان لاتے ہوں حضرت عیسٰی کے زمانہ میں متقیوں کی یہ علامت تھی کہ عیسٰی علیہ السلام کی وحی پر ایمان لاتے ہوں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد یہ علامت قرار پائی کہ آپ کی وحی پر ایمان لانیوالے ہوں۔

ہر زمانہ کے متقیوں کیلئے ان کے مناسب حال حکم

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ پہلی آیت کو شامل کرکے پانچویں اور اس آیت میں بیان کردہ دوسری علامت متقیوں کی یہ بتائی کہ وہ ان وحیوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہوچکی ہیں۔ اللہ اکبر! یہ قرآن کریم کا کیسا شاندار معجزہ ہے کہ ایک اُمّی جو اپنی زبان میں بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا اور پھر عرب قوم کا فرد جو تعصبِ قومی میں ساری دنیا سے بڑھی ہوئی تھی قرآن کریم سے حکم پاکر اعلان کرتا ہے کہ اسی کلام پر ایمان لانے سے نجات نہ حاصل ہوگی جو مجھ پر نازل ہُوا ہے بلکہ خدا تعالےٰ کی ہدایت کے مستحق بننا چاہتے ہو تو جو وحیاں مجھ سے پہلے نازل ہوچکی ہیں اُن پر بھی ایمان لاؤ۔ اسی کی تشریح دوسری جگہ یُوں فرماتا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع۳) کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں خدا تعالےٰ کا مامور نہ آیا ہو اور فرماتا ہے وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ع۱) ہر قوم میں خدا تعالےٰ کی طرف سے ہادی گزرا ہے گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجمع البحرین ہی نہیں مجمع البحار ہیں جو آپؐ پر ایمان لائے اس کے لئے ضروری ہے کہ ابتدائی عراقی نبیوں آدم۔ نوح اور ابراہیم علیہم السلام پر بھی ایمان لائے اور جو آپؐ پر ایمان لائے وُہ یہودی نبیوں موسٰی، داوٗد، ادریس، الیاس، ذکریا اور یحیٰ پر بھی ایمان لائے اور جو آپؐ پر ایمان لائے وہ مسیحیت کے بانی عیسٰی علیہ السلام پر بھی ایمان لاتے اور جو آپؐ پر ایمان لائے ہندوستان کے نبیوں کرشن اور رامچندر پر بھی ایمان لائے اور جو آپؐ پر ایمان لائے ایرانی نبی زردشت پر بھی ایمان لائے۔ اس سے زیادہ رواداری اور اس سے زیادہ صداقت طلبی کا کیا ثبوت ہے۔ کوئی قومی تعصب نہیں، کوئی نسلی امتیاز نہیں صرف اور صرف صداقت اور راستی کی طلب ہے جہاں بھی ملے اس کا اقرار، جہاں بھی پوشیدہ ہو اس کا اظہار۔ آہ! دنیا کی یہ کس قدر قدرناشناسی ہے کہ اسی کتاب سے سب سے زیادہ بُغض اور کینہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کاش دنیا میں انصاف کا مادہ ہوتا کاش لوگ قرآن کریم کے پہلے ہی رکوع کے مطالب پر غور کرکے اس کی نسبت اپنا فیصلہ صادر کرتے۔

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کی تشریح

قرآن مجید کے بائبل کی تصدیق کرنے کا مطلب

مسیحی مصنف جن کی نظرِ حُسن کی جگہ قُبح پر پڑنے کی عادی ہوچکی ہے اس آیت کی مذکورہ بالا خوبی پر نظر ڈالنے اور اس کی عظمت اور خوبی تسلیم کرنے کی بجائے اُلٹا یہ ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے بائبل کی تصدیق کی ہے اور چونکہ بائبل کے مضامین قرآن کریم کے خلاف ہیں اس لئے قرآن کریم جھوٹا ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ کیسے شاندار مضمون کے موقعہ پر کیسی بھونڈی بات سوجھی ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن بائبل کے کس حصہ کی تصدیق کرتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کی کہ جس میں شریعت کو روحانیت کے لئے ضروری قرار دیا ہے یا اناجیل کے ان قصّوں کی کہ جن میں یہ لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام روزے رکھا کرتے تھے (متی باب ۴ آیت ۱ و ۲) اور لکھا ہے کہ خاص قسم کے جن بغیر روزہ کے نہیں نکلتے (مرقس باب ۹ آیت ۲۹) یا حواریوں کے اقوال کی جن میں یہ لکھا ہے کہ شریعت ایک لعنت ہے۔ ان دو متضاد اقوال میں سے وہ کس کی تصدیق کرتا ہے؟ کاش وہ سمجھتے کہ ایک مصلح کو پہلے ادیان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں اُسے تو صرف منبع کے بارہ میں اپنے خیال کا اظہار کر دینا کافی ہے

قرآن کریم کی پہلے نازل شدہ کتب پر ایمان لانے کی بے نظیر تعلیم

کیا دنیا میں صلح کے قائم کرنے اور سچائی جہاں بھی ملے اس کا اقرار کرنے کے لئے یہ اصل کم قیمتی ہے کہ اس امر کا اقرار کیا جائے کہ خدائے قوم سب اہل زمین کا خدا ہے اور اس کا کلام ہر قوم پر نازل ہوتا رہا ہے اور ایک مومن صادق کو اجمالاً اس پر ایمان رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے کسی قوم کو بھی اپنی ہدایت سے محروم نہیں رکھا۔ اگر تفصیلی معتقدات مختلف اقوام کے تسلیم کرنے صلح کے لئے ضروری ہوں تو یہ اتحاد تو خود مسیحیوں میں بھی پیدا نہیں جیسیوں فرقے ہیں جو ایک دوسرے کے عقیدے کو غلط کہتے ہیں رومن کیتھولکس کے نزدیک اناجیل کچھ کہتی ہیں اور پراٹسٹنٹ کے نزدیک کچھ۔ اور اگر تصدیق کے وہی معنے ہیں جو قرآن کریم کے سر مسیحی مصنف مڑھنا چاہتے ہیں تو مسلمان کون سے عقائد کی تصدیق کرے پراٹسٹنٹ عقیدہ کی یا رومن کیتھولک عقیدہ کی یا یونی ٹیرین عقیدہ کی یا گریک چرچ کی یا شامی گرجا کی ؟

مسیحی مصنفوں کا استدلال اس سے باطل ہوتا ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں پہلے کلاموں پر ایمان کو بعد میں رکھا گیا ہے اگر تفصیلی ایمان مراد ہوتا تو پہلے پہلی وحی کا ذکر ہوتا بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا۔ پہلی وحی کا بعد میں ذکر کرنا بتاتا ہے کہ اس پر ایمان قرآن کریم کے توسط سے ہے یعنی اس کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق۔

(۲) وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ میں کسی قوم یا مذہب کا مخصوص ذکر نہیں بلکہ ہر قوم و ملت کے الہام کی تصدیق کی ہے اگر مسیحی اس سے بائبل کی تصدیق نکالیں تو ہندو اپنے ویدوں کی تفصیلی تصدیق نکالنے میں حق بجانب ہوں گے اور زردشتی اپنی الہامی کتب کی۔ ان سب کتب میں مسیحی اتحاد کیونکر پیدا کریں گے آخر بائبل کو دوسری کتب پر فضیلت کیوں ؟

(۳) قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن ع) ہم نے تجھ سے پہلے جو رسول بھیجے تھے ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے تیرے الہام میں کیا ہے اور بعض کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کئی انبیاء کا ذکر تک نہیں اُن کے کلام پر مسلمان کس طرح ایمان لائیں ؟ پس ظاہر ہے کہ اس جگہ اجمالی ایمان مراد ہے نہ کہ تفصیلی۔

(۴) قرآن کریم میں آتا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ع) قرآن کریم میں تمام سابق صحیح اور غیر منسوخ تعلیمیں جمع کر دی گئی ہیں پھر فرماتا ہے وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ ع) اور ہم نے تجھ پر ایسی کتاب اتاری ہے جو تمام سچائیوں پر مشتمل ہے اور کتاب الٰہی میں سے جو کچھ بھی اس کے وقت میں موجود ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے مضامین کی حفاظت کرتی ہے۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ تفصیلی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ سب پہلی غیر منسوخ اور زمانہ حال کے لئے قابل عمل تعلیمات قرآن کریم میں شامل کر دی گئی ہیں۔ پس جب سب پہلی قابل عمل تعلیمات قرآن کریم کے دعویٰ کے مطابق اس میں شامل ہو چکی ہیں تو پہلی کتب کی تصدیق سے مراد صرف اجمالی تصدیق ہے نہ کہ کچھ اور یہ تصدیق ویسی ہی ہے جیسے کہ مسیحی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ نبی تھے لیکن ان کی تعلیم پر تو عمل نہیں کرتے بلکہ وہ تو اُسے لعنت کہتے ہیں۔ قرآن کریم بھی اسی اجمالی رنگ میں اُن کی بھی اور اُن کے علاوہ دوسری اقوام کے انبیاء کی بھی تصدیق کرتا ہے مگر وہ ان کی شریعتوں کو لعنت قرار نہیں دیتا بلکہ وہ ان سب راستبازوں کو اپنے اپنے وقت کے لئے رحمت الٰہی قرار دیتا ہے۔

وما انزل من قبلک کے الفاظ سے مسیحیوں کا قرآن مجید کو بائبل کا مصدق قرار دیکر غلط مطلب نکالنا

مسیحی مصنفوں کی سمجھ میں قرآن کریم کا یہ بے نظیر نکتہ اس لئے نہیں آتا کہ وہ نبی مان کر بھی ایک شخص کو مجرم اور گنہگار قرار دینے میں دریغ نہیں کرتے پس ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ قرآن کریم کی اس تعلیم سے کہ ہر قوم کے نبیوں اور ان کے الہام کے سچا ہونے کا اقرار کرو دنیا کو یا اس کے امن کو کیا فائدہ پہنچیگا۔ کیونکہ وہ تو جن کو نبی سمجھتے ہیں ان پر بھی خلاف اخلاق الزام لگانے سے باز نہیں رہتے اور صرف مسیح علیہ السلام کو پاک قرار

دیتے ہیں لیکن قرآن کریم کا مسلک اور ہے وہ سب نبیوں کو پاک اور راستباز قرار دیتا ہے اس لئے جب وہ ہر قوم کے نبیوں کے الہام کو اجمالی طور پر سچا ماننے کا حکم دیتا ہے تو وہ اپنے عقیدہ کے رُو سے دنیا میں امن کے قیام کا راستہ کھول دیتا ہے کیونکہ جب ایک مسلمان یہ تسلیم کرے گا کہ خدا تعالےٰ نے کرشن اور رامچندر اور زردشت پر اپنا کلام نازل کیا تھا تو وہ قرآنی عقیدہ کے رُو سے اُن کی زندگیوں کو پاک سمجھیگا۔ اور اُن پر لگائے گئے سب الزاموں کو خواہ ماننے والوں کیطرف سے ہوں خواہ مخالفوں کی طرف سے غلط اور بے بنیاد قرار دیگا اور ان کا احترام کرے گا اور اس طرح دنیا میں امن قائم ہوگا۔

اس اجمالی ایمان کا ایک اور بھی فائدہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کے دل میں خدا تعالےٰ کی حقیقی محبت قائم کی گئی ہے کیونکہ تعصب کی وجہ سے خواہ کوئی قوم کتنا ہی یقین کرے کہ صرف ہماری ہی کتاب خدا تعالےٰ کی طرف سے آئی ہے لیکن ان خشیت اللہ کے اوقات میں جو ہر انسان پر آتے ہی رہتے ہیں اس کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو رب العالمین کس طرح ہوگیا جبکہ اس نے کسی ایک قوم کو اپنے الہام کے لئے چُن لیا اور باقی سب اقوام کو چھوڑ دیا ہے۔ اس قرآنی عقیدہ کی بناء پر ایک مسلمان کا عقیدہ ربوبیت عالمین کے متعلق اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا تعالےٰ واقعہ میں کسی ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ سب دنیا کا خدا ہے۔

الاٰخرۃ سے مراد آنحضرت کے بعد نازل ہونیوالی وحی

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ اَلْاٰخِرَۃ کے معنے بعد میں آنیوالی چیز کے ہوتے ہیں اسی وجہ سے بعد الموت زندگی کو حیاتِ آخرت اور قیامت کے دن کو یوم الآخرۃ کہتے ہیں اور اسی وجہ سے انجام کو بھی آخرت کہتے ہیں کیونکہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔

وبالآخرۃ ھم یوقنون کی تشریح

الآخرۃ کے معنے

قرآن کریم میں انجام کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ) یعنی تُو جو کام بھی شروع کرتا ہے اس کا انجام ابتداء کی نسبت اچھا ہوتا ہے اور یہ ہر کام میں تیری کامیابی اس امر کی شہادت ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رضا تیرے ساتھ ہے پس لفظی معنے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کے یہ ہیں کہ بعد میں آنیوالی شئے پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ بعد میں آنے والی کیا شئے ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو اس امر کو دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں آخرۃ کا لفظ زیادہ ترکن معنوں میں استعمال ہوا ہے تو اس کے معنے قیامت یا مابعد الموت زندگی کے ہوتے ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ ع) ایسے شخص کا حصہ بعد الموت زندگی میں کوئی نہ ہوگا۔ یا فرماتا ہے بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (نمل ع ۵) بعد الموت زندگی کے بارہ میں ان کا علم بعد مشاہدہ کے کامل ہو گیا۔ اسی طرح اور متعدد مقامات پر ان معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ پس اگر قرآن کریم میں اس لفظ کے استعمال کی کثرت کو دیکھا جائے تو اس جملہ کے یہ معنے ہوں گے کہ یوم آخرۃ پر ایمان لاتے ہیں (گو بالعموم ایسے موقعہ پر خالی آخرۃ کی جگہ یوم الآخرۃ کے الفاظ آتے ہیں) لیکن اگر اس آیت کے مضمون اور اُس کے مطالب کو دیکھا جائے تو چونکہ اس جگہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانے کا ذکر ہے پھر آپ سے پہلے جو وحی نازل ہوتی رہی اس پر ایمان لانے کا ذکر ہے اس کے بعد آخرۃ پر یقین رکھنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخرۃ سے مراد اس جگہ بعد میں آنیوالی وحی ہے اور اس آیت میں تینوں وحیوں پر ایمان لانا متقی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس وحی پر بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہو چکی تھی اور اس پر بھی جو آپ کے بعد نازل ہوگی۔ سیاق آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔

بعض مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا نزول کس طرح ہو سکتا ہے لیکن یہ وہم ان کا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ صاف طور پر مسلمانوں کی نسبت فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ (حٰم سجدہ ع ۴) یعنی جو مسلمان یہ اعلان کرے کہ اللہ ہمارا رب ہے تمام مصائب کو برداشت کریں گے اور استقامت دکھائیں گے خدا تعالےٰ کے فرشتے ان پر یہ کہتے ہوئے نازل ہوں گے کہ نہ آیندہ کا خوف کرو اور نہ سابق پر غم کرو اور اس جنت کی بشارت سُنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ٥ (نساء ع ۹) یعنی جو لوگ اللہ اور اس رسول (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کریں گے وہ اس گروہ میں شامل ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے یعنی نبیوں صدیقوں شہداء اور صالحین کے گروہ میں اور یہ گروہ ساتھیوں کے لحاظ سے سب سے بہتر گروہ ہے پس جبکہ اس اُمت سے یہ وعدہ ہے کہ وہ نبیوں اور صدیقوں اور شہداء والے انعام پائے گی تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اس امت میں وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو حالانکہ اصل انعام جو نبیوں اور صدیقوں اور شہداء کو ملتا ہے وہ تو خدا تعالیٰ کی وحی ہی ہے؟

اس آیت میں اس پیشگوئی کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورہ جمعہ میں کی گئی ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (ع ۱) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے اُمیوں میں انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور اُنہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے گو پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور اسی طرح وہ ان کے سوا ایک اور قوم کو سکھائے گا جو اب تک انہیں نہیں ملے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو احادیث میں آتا ہے کہ صحابہ نے پُوچھا وہ کون لوگ ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے جو ہم سے نہیں ملے اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا لَوْكَانَ الدِّيْنُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَذَهَبَ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ اَوْ اَبْنَاءِ فَارِسَ حَتّٰى يَتَنَاوَلَهُ (مسند احمد بن حنبل جلد دوم ص ۲۹۷) کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چڑھ جائے تو فارس سے ایک شخص یا فرمایا ابناء فارس میں سے ایک شخص آسمان پر جاکر دین کو واپس لے آئے گا۔ اس روایت سے اور بعض اور روایات سے کہ جن میں رَجُلٌ کی جگہ رِجَالٌ کا لفظ ہے۔ (بخاری جلد سوم کتاب التفسیر) معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں ایمان دُنیا سے اُٹھ جائے گا اور ایک شخص بنو فارس سے جس کے ساتھ اور بھی بعض ابناء فارس بطور مددگار ہوں گے ایمان کو واپس لائے گا اور اس کی معرفت اللہ تعالےٰ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی کام کرنے کا موقع دے گا کہ جو صحابہؓ کے زمانہ میں آپ نے کیا یعنی وہ آپ کا بروز ہونے کی حیثیت سے خدا تعالےٰ کی وحی سے اصلاح امت کرے گا۔

بالآخرة هم يوقنون میں حضرت مسیح موعود کی بعثت کی پیشگوئی

غرض اس آیت کے سباق کو مدّنظر رکھتے ہوئے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح متقی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان رکھتا ہے اور آپ سے پہلی وحی پر ایمان رکھتا ہے اسی طرح [illegible] بعد میں آنے والی وحی پر بھی یقین رکھتا ہے۔

آنحضرت اور آپ سے پہلے انبیاء کی وحیوں کے متعلق ایمان [illegible] لے کے الفاظ اور آخری وحی کے متعلق یقین رکھنے کے الفاظ استعمال کرنے کی وجہ

شاید کسی کو یہ شبہ گزرے کہ پہلی دونوں وحیوں کی نسبت تو ایمان کا لفظ استعمال ہُوا ہے لیکن آخرۃ کی نسبت یقین کا لفظ استعمال ہُوا ہے پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس جگہ وحی کی بجائے کسی اور چیز کا ذکر ہے ورنہ اس کے لئے بھی ایمان کا لفظ استعمال ہوتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایمان کا لفظ عام طور پر اس شے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کا وجود معرض وجود میں آچکا ہو۔ جس کا وجود معرضِ وجود میں نہ آیا ہو بلکہ آئندہ آنے والا ہو اس کی نسبت یقین کا لفظ ہی زیادہ مناسب ہوتا

ہے۔ اگر کہا جائے کہ حیٰوۃ بعد الموت کے متعلق بھی تو ایمان
کا لفظ آتا ہے حالانکہ وہ بعد میں آنے والی شے ہے۔ تو
اس کا جواب یہ ہے کہ حیٰوۃ بعد الموت بیشک ایک زندہ
شخص کے لئے تو بعد میں آنے والی شے ہے مگر اس کا وجود
اس وقت بھی موجود ہے اور جو لوگ مر چکے ہیں وہ معاً ایک قسم
کی زندگی پا رہے ہیں پس یہ خدائی فعل پہلے بھی ظاہر ہوتا رہا
ہے اب بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا پس
حیٰوۃ بعد الموت درحقیقت ایک ایسی چیز ہے جو ہر وقت ہو
رہی ہے اس لئے اس کی نسبت ایمان کا لفظ ہی زیادہ
مناسب ہے مگر جو وحی آئندہ نازل ہونے والی ہو اس کی
نسبت یقین کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔

اگر پہلی وحیوں کی نسبت سے وحی کا ذکر نہ کیا جائے
بلکہ صرف یہ کہا جائے کہ مومن اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ وحی
خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے تو اس موقعہ پر چونکہ
مخصوص طور پر آئندہ وحی کا ذکر نہ ہوگا اس کے لئے ایمان
کا لفظ زیادہ مناسب ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ وحی الٰہی ہر شخص پر نہیں اُترتی
بلکہ بعض ترقی یافتہ اور مقرب وجودوں پر اُترتی ہے اور قومی
لحاظ سے متقیوں کا فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اس امر پر یقین
رکھیں کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ان کو بھلائے گا نہیں بلکہ ان میں
سے کامل وجودوں پر وحی نازل ہوتی رہے گی اور اس طرح ہر
مسلمان کے دل میں یہ خواہش پیدا کی گئی ہے کہ وہ اپنے
آپ کو ایسا اعلیٰ درجہ کا متقی بنائے کہ اس پر خدا تعالیٰ کی
وحی نازل ہو اور اس طرح اعلیٰ امید پیدا کر کے اور اعلیٰ مقصد
کو سامنے لا کر مسلمانوں کا مطمح نظر اونچا کر دیا گیا ہے۔

افسوس کہ مسلمانوں نے اس عظیم الشان احسان کو نہ
سمجھا اور خود اپنے مستقبل کو تاریک بنا لیا آج کیوں مسلمان
اسلام سے دُور جا رہے ہیں اور کیوں گزشتہ صدی میں ان
میں حسن بصریؒ، سید عبد القادر جیلانیؒ، جنید بغدادیؒ، معین الدین
چشتیؒ، شہاب الدین سہروردیؒ، محی الدین ابن عربیؒ، سید احمد سرہندیؒ
اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ علیہم جیسے لوگ پیدا نہیں ہوئے؟
اسی وجہ سے کہ اعلیٰ روحانی مقامات کے حصول کے لئے جس
امید اور یقین کی ضرورت ہے وہ ان میں نہیں رہی خدا تعالیٰ
نے اس ولولہ اور جوش کے پیدا کرنے کے لئے ان سے اعلیٰ
روحانی انعامات کا وعدہ کیا تھا اور اس پر یقین رکھنے کے
لئے قرآن کریم کے شروع میں ہی انہیں حکم دیا تھا۔ لیکن انہوں
نے اس کی قدر نہ کی اور ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور کوششیں
سست ہو گئیں آج مسلمان تعلیم حاصل کرتے ہیں کیونکہ انہیں
یقین ہے کہ ایم اے بی اے ہو کر انہیں نوکریاں مل جائینگی۔ تجارت
کرتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ اس سے مال ملے گا۔ زراعت
کرتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ اس سے غلہ اور پھل حاصل
ہوگا لیکن نماز اور روزہ اور حج میں وہ جوش نہیں جو اُمید سے
پُردل کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان امور کا بجا لانا صرف
فرض کی ادائیگی ہے اس کے رُوحانی نتائج کوئی پیدا نہ ہونگے

کس قدر حسرت کا مقام ہے کہ مسلمانوں میں سے جس نے
اس دروازہ کو کھلا بتایا مسلمانوں نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا
دیا انہوں نے کہا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرنے
والا ہے کیونکہ وہ آپ کے بعد وحی کا دروازہ کھلا بتاتا ہے اور
یہ نہ سمجھا کہ وحی کیا ہے؟ وحی کے معنے ہیں خدا تعالیٰ کے تازہ
کلام کا سُننا اور جو شخص خدا تعالیٰ کے تازہ کلام کو سُنے گا ظاہر
ہے کہ اس کا دل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترقی
کرے گا اور آپ پر اس کا ایمان بڑھے گا نہ یہ کہ اس کے برعکس
ہوگا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے
وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دُور چلا جائے نعوذ باللہ
من ذالک۔

خلاصہ کلام یہ کہ آخرۃ پر یقین کی تعلیم مسلمانوں کے حوصلے
بڑھانے اور روحانی میدان میں ان کی کوششوں کو تیز کرنے کے
لئے تھی اور جو مسلمان بھی آخرۃ پر یقین رکھے گا وہ اس کے حصول
کے لئے اسی طرح کوشش کرے گا جس طرح صحابہ کرام نے کی اور
سید عبد القادر جیلانیؒ اور محی الدین ابن عربی وغیرہم نے کی۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ؎ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وحی مذکر ہے اور آخرۃ مؤنث کا صیغہ ہے پھر اس سے وحی کی طرف کس طرح اشارہ ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ وحی کا لفظ نہیں مَآ اُنْزِلَ کے الفاظ ہیں اور ان کی تعبیر کسی ہم معنے لفظ سے کی جا سکتی ہے قرآن کریم میں مَآ اُنْزِلَ کے لفظ کی تعبیر وحی سے بھی کی گئی ہے اور رِسَالَۃٌ کے لفظ سے بھی۔ چنانچہ سورۂ احزاب میں ہے اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (ع ۵) یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی وحی لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے غرض رسالت کا لفظ بھی وحی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ مؤنث ہے پس آخرت کے معنے اَلرِّسَالَۃُ الْاٰخِرَۃُ کے ہیں اور رسالۃ کے لفظ کی رعایت سے اٰخرۃ کا لفظ مؤنث آیا ہے یاد رہے کہ لغت میں بھی وحی کے معنے رسالت کے آتے ہیں (تاج العروس)۔

اس جگہ یہ امر بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اوپر کی دونو آیتوں کی ابتدا يُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ سے ہوئی ہے اور بعد میں دو اور دو دونوں آیتوں میں بیان ہوئے ہیں اس سے استدلال ہوتا ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے تابع اقامۃ الصلوٰۃ اور انفاق مارزق اللہ ہیں اور يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلٰى مُحَمَّدٍ کے تبع بِمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِهٖ پر ایمان اور اٰخرۃ پر یقین ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں قرآن کریم ہی کے ذریعہ سے اس سے پہلے کی وحیوں پر ایمان اور آخرۃ پر یقین پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ پہلے انبیاء کے حالات ایسے مشتبہ کر دیئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں ہی ان کی قدر اور صداقت معلوم ہو سکتی ہے اور آئندہ وحی کے نزول کے متعلق بھی قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہی یقین ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے سوا جس قدر ادیان ہیں سب نے وحی کا دروازہ بند کر رکھا ہے اور کوئی مذہب اس امر کا مدعی نہیں کہ اسے مانکر خدا تعالےٰ کی وحی اب بھی بندہ پر نازل ہو سکتی ہے۔

۵۶ حل لغات۔ عَلٰى۔ علیٰ حرف جر ہے اور اس کے نو معنے ہیں جن میں سے ایک معنے استعلاء کے ہیں یعنی غالب ہونے یا اوپر آجانے کے (مغنی) — عَلٰى

هُدًى۔ کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ حل لغات ۵ و سورۂ بقرہ حل لغات ۳ — هُدًى

رَبِّهِمْ۔ رَبّ کے معنوں کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ حل لغات ۳ — رَبِّهِمْ

اَلْمُفْلِحُوْنَ۔ اَفْلَحَ سے اسم فاعل مُفْلِحٌ آتا ہے اور مُفْلِحُوْنَ اس سے جمع کا صیغہ ہے اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں فَازَ وَظَفِرَ بِمَا طَلَبَ یعنی اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا اور مقصود کو پا لیا۔ اَفْلَحَ زَيْدٌ نَجَعَ فِي سَعْيِهٖ وَاَصَابَ فِي عَمَلِهٖ۔ زید نے اپنی کوشش کے پھل کو پا لیا اور اس کی محنت بار آور ہوئی (اقرب) اَلْفَلَاحُ اَلظَّفَرُ وَاِدْرَاكُ بُغْيَةٍ۔ فلاح کے معنے کسی کام میں کامیاب اور مقصود کو پا لینے کے ہیں (مفردات) تاج العروس میں ہے يُقَالُ لِكُلِّ مَنْ اَصَابَ خَيْرًا۔ مُفْلِحٌ ہر اس شخص کو جو کسی دنیوی یا دینی بھلائی کو حاصل کرے مفلح کہتے ہیں اور فلاح ایسی کامیابی کو کہتے ہیں جس پر دوسرے رشک کریں۔ ائمہ عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے بڑھ کر دینی اور دنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا لفظ اور کوئی نہیں۔ پس مُفْلِحُوْنَ کے معنے ہونگے اپنے مطالب میں کامیاب ہونے اور اپنے مقصود کو حاصل کر لینے والے۔ — اَلْمُفْلِحُوْنَ

تفسیر۔ اس آیت میں اس قسم کے متقی کا انجام بتایا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے پہلے تو یہ بتایا تھا کہ قرآن کریم اس قسم کے متقی کو ہدایت کے اعلیٰ مقامات تک پہنچاتا ہے اس

اولٰئک ھم المفلحون میں متقی کے انجام کا ذکر

آیت میں اس ہدایت کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ اوپر کے بیان کردہ شرائط کے ماتحت جو متقی ہوں وہ اپنے رب کی ہدایت پر ہوتے ہیں۔

تفصیل اس مضمون کی یہ ہے کہ ایک تو اس آیت میں مِنْ رَّبِّهِمْ کے الفاظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ رب ہے اور رب اسے کہتے ہیں جو بتدریج ترقی کی طرف لے جائے اس لئے جو شخص خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے اس کا قدم بتدریج آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے

اولٰئک ھم المفلحون کی تشریح اور اس کے متعلق ایک اعتراض کا جواب

دوسرے رب کو ھُمْ کی طرف مضاف کر کے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ ان کا رب ہے اس لئے اصل منشاء اس کا یہ ہے کہ لوگ ہدایت پائیں نہ یہ کہ گمراہ ہوں پس جو شخص ہدایت کی طرف توجہ کرے اسے ضرور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے سامان میسر ہوتے ہیں۔ تیسرے عَلٰی ھُدًی کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ گویا ایسے متقیوں کے لئے ہدایت ایک سواری کی طرح ہو جاتی ہے جس کی پیٹھ پر وہ سوار ہوتے ہیں اور یہ سواری ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اور جب کسی کی طرف سے سواری آئے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص کو ملاقات کے لئے بلایا گیا ہے۔ پس اس عبارت سے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ہدایت انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانا شروع کرتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل جاتے ہیں

علٰی ھُدًی کے الفاظ میں متقیوں کے لئے ہدایت کے ایک سواری کی طرح ہو جانے کی طرف اشارہ

ہدایت کے لئے سواری کا محاورہ کوئی ذوقی لطیفہ نہیں بلکہ عربی میں اس قسم کا محاورہ عام مستعمل ہے چنانچہ عرب لوگ کہتے ہیں جَعَلَ الْغَوَایَۃَ مَرْکَبًا فلاں شخص نے تو گمراہی کو اپنی سواری بنا لیا ہے یعنی وہ جس طرف رُخ کرتا ہے گمراہی کی راہ سے کرتا ہے اسی طرح کہتے اِمْتَطَی الْجَھْلَ فلاں شخص جہالت پر سوار ہو گیا ہے اسی محاورہ کے مقابل پر قرآن کہتا ہے کہ اوپر کی صفات والے متقیوں کی سواری ہدایت ہو جاتی ہے یعنی وہ ہر کام خدا تعالیٰ کی ہدایت کے ماتحت کرتے ہیں جہالت اور گمراہی سے ان کے افعال پاک ہو جاتے ہیں اور ایسا شخص جو ہر وقت ہدایت پر رہے وہی ہو سکتا ہے جسے

ہدایت کیلئے سواری کا محاورہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اور الہام سے ہدایت ملتی رہے ورنہ جو شخص محض عقل سے کام لیتا ہے وہ بسا اوقات غلطی میں پڑ جاتا ہے عَلٰی ھُدًی فرما کر اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف جانے کا عمل ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت سواری کی طرح ان کے سفر کو ہلکا کر دیتی ہے۔

عَلٰی ھُدًی میں جو ھُدًی پر تنوین ہے یہ تعظیم کے لئے ہے یعنی یہ ہدایت بہت بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔

وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ مُفْلِحُوْن کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ اپنی مُراد کو پا لینے کے ہوتے ہیں پس اس جملہ کے یہ معنے ہوئے کہ یہ لوگ اپنی مراد کو پا لیتے ہیں اور مومن کی مراد اپنے رب کا قرب اور اس سے وصال ہوتا ہے پس اس جملہ میں پہلے جملہ کے مضمون کا انجام بتایا ہے کہ ایسے متقی ہدایت کی سواری پر چڑھ کر آخر خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنی مراد کو پا لیتے ہیں۔

بعض لوگ اس جگہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کئی خدا تعالیٰ کے مقرب اس زندگی میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور بعض مارے جاتے ہیں تو پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگ ضرور کامیاب ہوتے اس کا جواب یہ ہے کہ مُفْلِح کے معنے اپنی مراد پا لینے کے ہیں نہ کہ دنیوی ترقیات یا جسمانی راحت کے۔ اس میں شک نہیں کہ بالعموم خدا تعالیٰ کے مقربوں کو دنیوی کامیابی بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک ضمنی شے ہے مقصود نہیں ہے خدا رسیدہ لوگوں کی مُراد تو خدا تعالیٰ کا قُرب اور اس کی بھیجی ہوئی سچائی کی اشاعت ہے۔ سو اس میں کبھی کوئی خدا رسیدہ ناکام نہیں ہُوا۔ مسیح علیہ السلام کو یہود نے پھانسی پر تو لٹکا دیا مگر کیا وہ مسیح کے مشن کو ناکام کر سکے؟ اپنے مقصد میں تو مسیح علیہ السلام ہی کامیاب ہوئے۔ حضرت امام حسین یزید کے مقابلہ پر شہید ہوئے مگر کیا یزید کا نام بھی اب کوئی لیتا ہے۔ جس مقصد کے لئے امام حسین کھڑے ہوئے آخر وہی کامیاب ہُوا اور دُنیا

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

— درآنحالیکہ تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا اُن کے لئے برابر ہے ے

لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى

ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ثہ اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے

نے اسلامی نظام کی اسی تشریح کو قبول کیا جس کے لئے حضرت امام حسین رضہ کھڑے ہوئے تھے یزید کے مقصد کی تو آج ایک مسلمان بھی تائید نہیں کرتا۔ بس مُفْلِح کے لفظ سے مراد کو پالینے کا وعدہ ہے نہ یہ کہ وہ اپنے دشمن کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوسکتے عاجل طور پر وہ ہلاک بھی ہوجائیں تب بھی فتح آخر انہی کے مقصد کو حاصل ہوتی ہے اگر حضرت امام حسین رضہ کربلا کے میدان میں جان نہ دیتے تو مسلمانوں کو شاید اسلامی نظام کی اہمیت کا اس قدر احساس نہ ہوتا جس قدر کہ اُنکی شہادت کی وجہ سے ہوا۔ اس شہادت نے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیم کے احیاء کے لئے گویا ایک آگ لگا دی اور اسلام کے علماء نے اس تعلیم کو ہمیشہ کیلئے روشن کر دیا۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں جو دعا بندہ سے منگوائی گئی تھی وہ قرآن کریم کی مدد سے پوری ہوجاتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے تقویٰ کے طریق پر چل کر انسان خدا تعالےٰ کو حقیقتاً پالیتا ہے صرف دعا تک ہی اس کی کوشش ختم نہیں ہوجاتی۔

ثہ **حل لغات۔** كَفَرُوْا:۔ كَفَرَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور كَفَرَ الرَّجُلُ (يَكْفُرُ كُفْرًا) کے معنے ہیں ضِدُّ اٰمَنَ۔ کسی چیز کا انکار کیا۔ كَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰهِ وَبِنِعْمَتِهٖ: جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا۔ اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا اور ناشکری کی (اقرب) اَلْكُفْرُ فِي اللُّغَةِ سَتْرُ الشَّيْءِ۔ کفر کے لغوی معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ وَكُفْرُ النِّعْمَةِ وَكُفْرَانُهَا سَتْرُهَا بِتَرْكِ اَدَاءِ الشُّكْرِ۔ اور کفران نعمت کے معنے ہیں نعمت کا شکر ادا نہ کیا۔ وَلَمَّا كَانَ الْكُفْرُ اَنْ يَّقْتَضِيَ جُحُوْدَ النِّعْمَةِ صَارَ يُسْتَعْمَلُ فِي الْجُحُوْدِ۔ اور کفران نعمت میں نعمت کا شکریہ ادا نہ کرنا ایک طرح پر اس نعمت کا انکار تھا اس لئے کفر کا لفظ صرف انکار کے معنے میں مستعمل ہونے لگا وَالْكَافِرُ عَلَى الْاِطْلَاقِ مُتَعَارَفٌ فِيْمَنْ يَّجْحَدُ الْوَاحْدَانِيَّةَ اَوِ النُّبُوَّةَ اَوِ الشَّرِيْعَةَ اَوْ ثَلَاثَتَهَا اور کافر کا لفظ جب اکیلا استعمال ہو تو اس کے معروف معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت یا آنحضرتؐ کی نبوۃ اور شریعت یا ان تینوں کا منکر ہو (مفردات) پس كَفَرُوْا کے معنے ہونگے جنہوں نے انکار کیا۔ کفر کیا۔ حق پوشی کی۔ یا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یا آنحضرت صلعم کی نبوت کا یا شریعت کا یا ان تینوں کا انکار کیا

ءَاَنْذَرْتَهُمْ۔ اَ۔ ہمزہ ہے جو استفہام کے معنے بھی دیتا ہے یعنی سوال کے۔ اور کبھی ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ فعل پر آکر اُسے مصدر کے معنے دیدیتا ہے اس وقت اس کے معنوں میں استفہام کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

اَنْذَرْتَهُمْ:۔ اَنْذَرْتَ۔ اَنْذَرَ سے مفرد مخاطب کا صیغہ ہے اور اس کا مصدر اِنْذَارٌ ہے۔ کہتے ہیں اَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ: اَعْلَمَهٗ وَحَذَّرَهٗ مِنْ عَوَاقِبِهٖ قَبْلَ حُلُوْلِهٖ یعنی کسی امر کی حقیقت سے اُسے آگاہ کیا۔ اور اس امر کے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے اُسے ہوشیار کر دیا۔ نیز کہتے ہیں۔ اَنْذَرَهٗ: خَوَّفَهٗ فِيْ اِبْلَاغِهٖ يُقَالُ اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَيْرَ الْعَدُوِّ اِلَيْهِمْ فَنَذِرُوْا یعنی اَنْذَرَهٗ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کیا۔ چنانچہ جب کہتے ہیں اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ سَيْرَ الْعَدُوِّ تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ میں نے قوم کو دشمن کی پیش قدمی سے خوب ہوشیار کیا

۲ علیٰ ھدًی الخ میں اھدنا الصراط المستقیم میں بیان شدہ ہدایت کی طرف اشارہ

۲ ءَ انذرتہم

۱ کفروا

ے نوٹ:۔ اس جگہ جملہ معترضہ کا ترجمہ حال کا کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ ترجمہ کی دقت ہے۔ کیونکہ جملہ معترضہ جو حال یا صفت کے مشابہ معنے دیتا ہے۔ اس کا صحیح پورا مفہوم اردو میں ادا کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اس کے قریب ترین مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "درآنحالیکہ" کے الفاظ لکھے گئے ہیں ؛

اس کا فعل لازم یا مطاوع نَذِرَ ہے جس کے معنے ہیں وُہ ہوشیار ہو گیا (اقرب)

یومنون

یُؤْمِنُوْنَ: کے لئے دیکھو حل لغات ۱۲۵

تفسیر۔ پہلی آیات میں ان لوگوں کا حال بتایا تھا۔ جو قرآن کریم پر عمل کریں گے۔ اور بتایا تھا کہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے فضلوں کو جذب کریں گے اور ادنیٰ ہدایت سے اعلیٰ ہدایت کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ ان کا تعلق ہدایت سے اٹل ہو جائے گا اور وُہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص روشنی حاصل کر کے اپنے روحانی سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کریں گے

سواء علیہم الخ کی تشریح

قرآن مجید کی بات کو سنکر غور نہ کرنے والے کا انجام

اس کے بعد اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جو قرآن کریم کی تعلیم سُنکر اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے بلکہ اس کے انکار پر باوجود ہر قسم کے دلائل مہیا ہونے کے مُصِر ہوتے ہیں۔ ان کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو باوجود دلائل کے مہیا ہو جانے کے صداقت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں انہیں ایمان نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ایمان اُسی کو نصیب ہو سکتا ہے کہ جو دلائل و براہین سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے (دیکھو یونس ع آیت ۳۳۔ الاعراف ع آیت ۱۰۲۔ النحل ع آیت ۳۷۔ یٰس ع آیت ۸ تا ۱۱۔ ان آیات میں بھی اسی آیت کے مضمون کی تشریح ہے)

آیت لا یومنون کا [illegible] نہیں کہ کفار میں سے آئندہ کوئی ایمان نہ لائیگا

اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ کفار میں سے آئندہ کوئی ایمان نہ لائیگا کیونکہ واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ اس آیت کے بعد کثرت سے کفار ایمان لائے بلکہ اس آیت کے بعد سورۃ نصر نازل ہوئی جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نصرت اور فتح آئے گی اور تُو دیکھیگا کہ لوگ دین الٰہی میں فوج در فوج داخل ہوں گے۔ پس جبکہ سورۃ بقرہ کی اس آیت کے نزول کے کئی سال بعد قرآن کریم میں فوج در فوج لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کی خبر دی گئی ہے تو اس آیت سے یہ معنے کسی طرح درست نہیں ہو سکتے کہ اس میں کفار کے مسلمان نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

یہ شبہ کہ شاید اس آیت میں اس امر کا ذکر ہے کہ آئندہ کوئی کافر ایمان نہ لائے گا اس آیت کے معنوں پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت سے کھینچ تان کر بھی یہ معنے نہیں نکالے جا سکتے کہ کافر ایمان نہیں لاتے۔ اس آیت میں تو یہ ذکر ہے کہ جن کفار کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہو وُہ ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ ہر کافر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہو اور نہ ہر کافر ہدایت سے محروم ہوتا ہے۔

کافر منکر کا نام ہے اور جب ایسے لوگوں کے سامنے صداقت آئے گی جو اس سے واقف نہیں اور اس کے دلائل ابھی ان کے ذہن نشین نہیں ہوئے تو وہ اس وقت تک اس کا انکار کرنے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ہر شخص وہ نہ ہوگا جو باوجود صداقت کے روشن ہو جانے کے اس کا منکر ہوگا اور نہ ہر شخص ایسا ہوگا جس کی دماغی قابلیت کے لحاظ سے پہلے ہی دن اس پر صداقت روشن ہو سکیگی۔ پس ہر ایسا شخص اس آیت کے مصداقوں میں سے نہ ہوگا۔ اس کا مصداق وہی ہوگا جو باوجود صداقت کھل جانے کے اس کا انکار کرے گا یا اس کوشش میں لگا رہے گا کہ مجھ پر صداقت کھلے ہی نہ۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں صفات والا شخص جبتک اپنی اس حالت کو نہ بدلے ایمان نہیں لا سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کفار ہدایت نہیں پائیں گے بلکہ یہ ذکر ہے کہ یہ قرآن کافروں کو ہدایت دے گا سوائے اُن کے جو صداقت کے کھل جانے کے باوجود اس کا انکار کریں یا صداقت کے کھلنے کے راستوں کو اپنے اوپر بند کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

یہ شبہ جو اوپر بیان ہُوا اس بات سے پیدا ہُوا ہے کہ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ کو ماضی کے معنی میں سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اس کے معنے ماضی کے ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر ان الفاظ کے معنے ماضی کے کئے جائیں تو ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے لئے برابر ہے کیا تو نے انہیں ڈرایا یا نہ ڈرایا۔ ایک ادنیٰ تامل سے یہ امر سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ فقرہ

بے معنے ہے۔ اس صورت میں تو استفہام کی کوئی ضرورت نہ تھی یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اُن کے لئے یہ امر یکساں رہا ہے کہ تو نے انہیں ڈرایا یا انہیں نہ ڈرایا۔ استفہام کا طریق اختیار کرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کسی واقعہ کا ذکر مراد نہیں بلکہ بعض کفار کی حالت کا اظہار مراد ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ معنے قرآن کریم کی دوسری آیات کے بھی خلاف ہیں۔

ان غلط معنوں کے کرنے والوں کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ عربی زبان میں ایسے موقعہ پر ہمزہ استفہام کے لئے نہیں بلکہ مصدر کے مشابہ معنے دینے کے لئے آتا ہے اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ کے معنے یہ ہیں کہ تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر رہا ہے۔ پس یہ جملہ معترضہ اُن کی کیفیت کو یا پہلے مضمون سے جو غلطی لگتی ہو اُسے دُور کرنے کے لئے آتا ہے اور حال اور صفت کے معنوں کے مشابہ معنے دیتا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ کافر جن کا حال یہ ہے یا جن کی یہ صفت ہے کہ تیرا اُن کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اُن کے لئے برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ یعنی جو کافر دلائل پر کان ہی نہیں دھرتے وہ ہدایت نہیں پا سکیں گے۔ چنانچہ امام سیبویہ جو نحو کے سب سے بڑے عالم ہیں لکھتے ہیں کہ اس مقام پر استفہام یعنی سوال کے معنے بالکل نظر انداز کر دئے جاتے ہیں (کشاف زیر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ) اقرب الموارد جو لغت کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے وَتَخْرُجُ الْهَمْزَةُ عَنْ حَقِيْقَةِ الْاِسْتِفْهَامِ فَتَرِدُ لِثَمَانِيَةِ مَعَانٍ یعنی کبھی ہمزہ استفہام کے معنوں سے بالکل خالی ہوتا ہے اور اس صورت میں اس کے آٹھ معنے عربی زبان میں ہوتے ہیں۔ پھر لکھا ہے اَلْاَوَّلُ التَّسْوِيَةُ نَحْوَ مَا اُبَالِيْ اَقُمْتَ اَمْ قَعَدْتَ وَ ضَابِطَتُهَا اَنَّهَا تَدْخُلُ عَلٰى جُمْلَةٍ يَصِحُّ اِسْتِبْدَالُهَا بِالْمَصْدَرِ وَهِيَ تَقَعُ بَعْدَ سَوَاءٍ وَمَا اُبَالِيْ وَلَيْتَ شِعْرِيْ وَمَا شَاكَلَهُنَّ۔ یعنی پہلے معنے اس کے برابر ہونے کے ہوتے ہیں جیسے کہ یہ فقرہ کہ مجھے تیرے کھڑے رہنے یا بیٹھ جانے کی پرواہ نہیں۔ اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ ایسے جملہ پر داخل ہوتا ہے جس کی جگہ مصدر کا رکھنا جائز ہوتا ہے اور اس موقعہ پر یہ سواء کے لفظ کے بعد استعمال ہوتا ہے یا مَا اُبَالِیْ یا لَیْتَ شِعْرِیْ یا ان کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے بعد استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی یہ سواء کے بعد استعمال ہوا ہے۔ پس اس کے معنے مصدر کے معنوں سے صحیح طور پر ادا ہوتے ہیں اور سوال کے معنے اس میں ہرگز جائز نہیں بلکہ صرف یہ معنے ہیں کہ سَوَاءٌ اِنْذَارُكَ لَهُمْ وَعَدَمُ اِنْذَارُكَ لَهُمْ یعنی جن کافروں کے لئے تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔

آیت سواءٌ علیہم الخ میں ءَ انذرتہم کے معنے امر کے نہیں

جو معنے میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان کے رُو سے لَا يُؤْمِنُوْنَ اِنَّ کی خبر ہے یعنی ایسے کافر ایمان نہیں لائیں گے۔ لیکن بعض مفسرین نے سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ کو پہلی خبر اور لَا يُؤْمِنُوْنَ کو دوسری خبر بتایا ہے مگر میرے نزدیک گو نحواً یہ درست ہے لیکن معناً درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں معنے یہ ہوتے ہیں کہ کافروں پر تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے اور وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ معنے سورۃ نصر کے مضمون کے خلاف ہیں جس میں یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ کفار کثرت کے ساتھ ایمان لائیں گے۔

ءَ انذرتہم میں ہمزہ استفہام اور اس کا مطلب

مذکورہ بالا تشریح کے مطابق اس آیت کے معنے مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کسی ایک طریق پر کئے جا سکتے ہیں (۱) کافر دراں حالیکہ تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا ان کے لئے برابر ہے ایمان نہیں لائیں گے یعنی جب تک یہ اپنے اس عناد کو دُور نہ کریں وہ ہدایت نہیں پا سکتے (۲) وہ کافر جن کے لئے تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے ایمان نہیں لائیں گے یعنی ایسے لوگ جو انذار کا محل نہیں ہیں انہیں خدا تعالےٰ کا خوف دلانے کا فائدہ نہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی کافر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو کوئی نہ کوئی مذہب رکھتے ہیں خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں، حشر و نشر کو مانتے ہیں اُن کے سامنے جب صداقت پیش کی جائے اور خشیت اللہ کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کے دلوں میں ایک قسم کا تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ غور کی طرف مائل ہو جاتے ہیں

سواءٌ علیہم الخ کا ترجمہ تین طرح پہ

سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۚ وَّلَهُمْ

کانوں پر مہر کر دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے اور ان کے لئے

ع ۱

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ

ایک بڑا عذاب (مقدر) ہے ۵ؔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں

اور اگر صداقت کھل جائے تو اُسے مان بھی لیتے ہیں لیکن ایسے کافر جو نہ خدا کو مانیں اور نہ حشر و نشر کو انہیں خشیت اللہ کی طرف توجہ دلانے کا فائدہ نہیں۔ وُہ تو خدا تعالیٰ کے نام پر بھی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اُن کے لئے تو پہلے خدا پر ایمان اور حشر و نشر پر ایمان لانے کے دلائل بیان کرنے چاہئیں تب جا کر وُہ نبی کی لائی ہوئی صداقت کی طرف توجہ کریںگے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بعد ہی خشیت پیدا ہوتی ہے اور تبھی خشیت اللہ کی طرف توجہ دلانا ایمان کا موجب ہو سکتا ہے [illegible] تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ وُہ کافر جن کیلئے تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے یعنی وہ سننا ہی نہیں چاہتے تو انہیں وعظ کرے یا نہ کرے اُن کے لئے یکساں ہے کیونکہ انہوں نے تو اُسے سُننا ہی نہیں ایسے لوگ بھی ایمان نہیں لا سکتے اور ایمان نہیں لائیں گے۔

ختم

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہوا کہ ایک طبقہ انسانوں کا ایسا ہے جو ایمان سے محروم ہے لیکن یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ کسی حالت کا نتیجہ بتلانے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وُہ حالت بھی نہیں بدل سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شخص کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہو وُہ ایمان نہیں لا سکتا لیکن اس حالت کا ہمیشہ رہنا تو ضروری نہیں بڑے بڑے ضدی شخص کبھی اپنی ضد کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس وقت اُن کے لئے ہدایت کا رستہ کھل جاتا ہے۔ خود حضرت عمرؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے خلیفہ ہوئے اُن کے متعلق تاریخوں میں آتا ہے کہ قرآن کا خود سننا تو الگ رہا [illegible] دوسروں کو بھی سننے

آیت سواء علیہم الخ سے ایک غلط استدلال اور اس کا جواب

نہ دیتے تھے لیکن ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ وہ قرآن کریم سننے پر اپنے بہنوئی کو مارنے لگے اور بہن درمیان میں آگئی اور اُسے چوٹ آگئی چونکہ شریف آدمی تھے عورت کو زخمی دیکھ کر [illegible] ندامت پیدا ہوئی اور اس ندامت کی وجہ سے کہا کہ اچھا مجھے دکھاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد قرآن کریم کا کچھ حصہ پڑھا اور فوراً ایمان لے آئے (سیرت ابن ہشام) پس یہ حالت ایمان سے بے شک محروم کر دیتی ہے مگر یہ حالت بدل بھی جاتی ہے اور اس وقت انسان کے لئے ایمان نصیب ہونے کا رستہ کھل جاتا ہے ؛

۵ؔ حل لغات۔ خَتَمَ :- خَتَمَ خَتْمًا وَخِتَامًا کے معنے ہیں طَبَعَهٗ وَوَضَعَ عَلَيْهِ الْخَاتَمَ مُہر لگائی۔ خَتَمَ الصَّکَّ وَغَيْرَهٗ : وَضَعَ عَلَيْهِ نَقْشَ خَاتَمِهٖ حَتّٰى لَا يَجْرِيَ عَلَيْهِ التَّزْوِيْرُ۔ کسی تحریر پر مہر لگا دی تاکہ جعل ہونے کا امکان باقی نہ رہے (اقرب) کلیات ابی البقاء میں ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ : جَعَلَهٗ حَيْثُ لَا يَفْهَمُ شَيْئًا وَّلَا يَخْرُجُ عَنْهُ شَيْئًا یعنی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ جب بولا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کے دل کو ایسا بنا دیا کہ وُہ کوئی بات نہیں سمجھ سکتا اور نہ اپنی بات سمجھا سکتا ہے۔ مفردات میں ہے اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ عَلٰى وَجْهَيْنِ مَصْدَرُ خَتَمْتُ وَطَبَعْتُ وَهُوَ تَاْثِيْرُ الشَّيْءِ كَنَقْشِ الْخَاتَمِ وَالطَّابَعِ۔ کہ لفظ ختم اور طبع دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) مصدری معنوں میں یعنی کسی چیز پر کسی چیز کا مہر کی طرح کا نقش کر دینا۔ وَالثَّانِي الْاَثَرُ الْحَاصِلُ عَنِ النَّقْشِ۔ (۲) اس نقش سے جو اثر حاصل ہوتا ہے یعنی جو مہر لگتی ہے اس کو۔

بھی ختم کا لفظ اطلاق پاتا ہے وَيُتَجَوَّزُ بِذَالِكَ تَارَةً فِي الْاِسْتِيْثَاقِ مِنَ الشَّيْءِ وَالْمَنْعِ مِنْهُ اِعْتِبَارًا بِمَا يَحْصُلُ مِنَ الْمَنْعِ بِالْخَتْمِ عَلَى الْكُتُبِ وَالْاَبْوَابِ اور کبھی کبھی کسی امر سے رُکنے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ معنے اس بات پر اعتبار کرتے ہوئے کئے گئے ہیں کہ جب کتابوں کو یا ابواب کو لکھنے کے بعد ان پر مہر کر دیتے ہیں تو گویا اب اُن کی تصنیف کو ختم کر دیا اور اس کے لکھنے سے رُک گئے (گویا کسی چیز کو ختم کرنے کے معنے مجازی ہیں) وَقَوْلُهٗ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِشَارَةٌ اِلٰى مَا اَجْرَى اللّٰهُ بِهِ الْعَادَةَ اَنَّ الْاِنْسَانَ اِذَا تَنَاهٰى فِيْ اِعْتِقَادٍ بَاطِلٍ اَوِارْتِكَابِ مَحْظُوْرٍ وَلَا يَكُوْنُ مِنْهُ تَلَفُّتٌ بِوَجْهٍ اِلَى الْحَقِّ يُوْرِثُهٗ ذَالِكَ هَيْئَةً تُمَرِّنُهٗ عَلَى اسْتِحْسَانِ الْمَعَاصِيْ وَكَاَنَّمَا يُخْتَمُ بِذَالِكَ عَلٰى قَلْبِهٖ - اور آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ میں ختم کا لفظ بولنے سے اللہ تعالےٰ کے اس قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقاد باطل یا ممنوع باتوں کے ارتکاب میں حد سے بڑھ جاتا ہے اور حق کی طرف کسی طرح بھی توجہ نہیں کرتا تو اس کا یہ طرزِ عمل اس کے اندر ایک ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے جو گناہوں کے ارتکاب کو عمدہ سمجھتی ہے گویا اس کے دل پر اب مہر لگ گئی کہ نہ اس پر حق کا اثر ہوتا ہے اور نہ اس کا دل حق کی طرف رجوع کرتا ہے (مفردات) نیز لکھا ہے اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ وَاحِدٌ فِي اللُّغَةِ وَهُوَ التَّغْطِيَةُ عَلَى الشَّيْءِ وَالْاِسْتِيْثَاقُ مِنْ اَنْ لَا يَدْخُلَهٗ شَيْءٌ - کہ لفظ ختم اور طبع لُغت میں دونوں ہم معنے ہیں - اور اُن کے معنے یہ ہیں کہ کسی چیز پر پردہ ڈال دینا - اور اس کے اور دوسری اشیاء کے درمیان روک بنا دینا - اس طور پر کہ کوئی چیز اس تک پہنچ جائے (تاج)

قُلُوْب: قلب کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْفُؤَادُ - دل - وَقَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْعَقْلِ اور کبھی قلب کا لفظ عقل پر بھی بولا جاتا ہے (اقرب) وَيُعَبَّرُ بِالْقَلْبِ عَلَى الْمَعَانِي الَّتِيْ تَخْتَصُّ بِهٖ مِنَ الرُّوْحِ وَالْعِلْمِ وَالشَّجَاعَةِ - اور لفظ قلب کے ذریعہ ان کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے جو روح - علم اور شجاعت وغیرہ اقسام کی اس کے ساتھ مخصوص ہیں - وَجَائِزٌ فِي الْعَرَبِيَّةِ اَنْ تَقُوْلَ مَا لَكَ قَلْبٌ وَمَا قَلْبُكَ مَعَكَ تَقُوْلُ مَا عَقْلُكَ مَعَكَ - اور عربی زبان میں یہ جائز ہے کہ مَا لَكَ قَلْبٌ اور مَا قَلْبُكَ مَعَكَ بول کر قلب سے مراد عقل لی جائے یعنی تجھے عقل نہیں - نیز کہتے ہیں اَيْنَ ذَهَبَ قَلْبُكَ - اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تیری عقل کہاں گئی - اور مَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ کے تحت میں لکھا ہے اَيْ تَفَهُّمٌ وَتَدَبُّرٌ یعنی قلب کے معنے سوچنے اور تدبر کے ہیں (لسان) پس خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے معنے ہوں گے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے یعنی ایسا بنا دیا ہے کہ نہ اُن کے دل کوئی بات سمجھتے ہیں نہ انکی عقول میں سوچنے اور تدبر کا مادہ باقی رہا ہے -

السّمع — اَلسَّمْعُ :- یہ سَمِعَ (يَسْمَعُ) کا مصدر ہے اور سَمِعَ الصَّوْتَ يَسْمَعُ سَمْعًا کے معنے ہیں اَدْرَكَهٗ بِحَاسَّةِ الْاُذُنِ - آواز کو کان کی حس کے ساتھ معلوم کیا نیز اَلسَّمْعُ کے معنے ہیں حِسُّ الْاُذُنِ - شنوائی - وَالْاُذُنُ - کان - وَمَا وَقَعَ فِيْهَا مِنْ شَيْءٍ تَسْمَعُهٗ اور جو آواز کان میں پڑے اس پر بھی سمع کا لفظ بولتے ہیں - اَلذِّكْرُ الْمَسْمُوْعُ سُنی ہوئی بات - لفظ سمع واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہ دراصل مصدر ہے جو قلت اور کثرت کا احتمال رکھتا ہے اس کی جمع اَسْمَاعٌ آتی ہے (اقرب) مفردات میں ہے اَلسَّمْعُ قُوَّةٌ فِي الْاُذُنِ بِهٖ يُدْرَكُ الْاَصْوَاتُ یعنی سمع کان کی ایک قوت (شنوائی) کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان آواز کو معلوم کرتا ہے وَفِعْلُهٗ يُقَالُ لَهُ السَّمْعُ اَيْضًا - اور سُننے کے فعل کا نام بھی سمع رکھا جاتا ہے وَيُعَبَّرُ تَارَةً بِالسَّمْعِ عَنِ الْاُذُنِ اور کبھی لفظ سمع بول کر کان مراد ہوتا ہے وَتَارَةً عَنْ فِعْلِهٖ كَالسَّمَاعِ اور کبھی لفظ سمع سے اس کا

قلوبٌ

فعل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ کہ ان کو سننے کے فعل سے روک دیا گیا ہے وَتَارَۃً عَنِ الْفَھْمِ اور کبھی لفظ سمع سے مراد بات کا سمجھنا ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں لَمْ تَسْمَعْ مَاقُلْتُ۔ کہ جو میں نے کہا تو نے نہیں سمجھا وَتَارَۃً عَنِ الطَّاعَۃِ۔ اور کبھی اس سے مراد اطاعت ہوتی ہے

الابصار

اَلْاَبْصَارُ:۔ اَلْبَصَرُ کی جمع ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ حَاسَّۃُ الرُّؤْیَۃِ۔ دیکھنے کی حس۔ اَلْعَیْنُ آنکھ۔ اَلْعِلْمُ۔ علم (اقرب)

غشاوۃ

غِشَاوَۃٌ:۔ اَلْغِشَاوَۃُ کے معنے ہیں اَلْغِطَاءُ: پردہ (اقرب) تاج میں ہے اَلْغِشَاوَۃُ مَا یُغْشٰی بِہِ الشَّیْءُ۔ کہ ہر اس چیز کو جس کے ساتھ کوئی چیز ڈھانپی جائے غِشَاوَۃ کہتے ہیں۔

کفار کے اپنے اعضاء کو استعمال نہ کرنے کا طبعی نتیجہ

العذاب

اَلْعَذَابُ:۔ اَلْعَذَابُ کُلُّ مَا شَقَّ عَلَی الْاِنْسَانِ وَمَنَعَہٗ عَنْ مُّرَادِہٖ۔ عذاب کے معنے ہیں کہ وہ چیز جو انسان پر شاق گذرے اور حصول مراد سے اُسے روک دے۔ وَفِی الْکُلِّیَاتِ کُلُّ عَذَابٍ فِی الْقُرْاٰنِ فَھُوَ التَّعْذِیْبُ اِلَّا وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَائِفَۃٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ عذاب سے مراد قرآن مجید میں عذاب دینا ہوتا ہے سوائے وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا کی آیت کے۔ وہاں ظاہری سزا مراد ہے (اقرب) اَلْعَذَابُ ھُوَ الْاِیْجَاعُ الشَّدِیْدُ۔ عذاب کے معنے ہیں سخت تکلیف دینا۔ فَالتَّعْذِیْبُ فِی الْاَصْلِ ھُوَ حَمْلُ الْاِنْسَانِ اَنْ یَّعْذِبَ اَیْ یَجُوْعَ وَیَسْھَرَ۔ اگر مادہ کے لحاظ سے اُسے دیکھا جائے تو اس کے معنے ہیں کہ کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر آمادہ کرنا۔ کیونکہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ اس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ وَقِیْلَ اَصْلُہٗ مِنَ الْعَذْبِ۔ عَذَّبْتُہٗ اَیْ اَزَلْتُ عَذْبَ حَیٰوتِہٖ۔ بعض نے کہا ہے کہ عذاب عَذْبٌ سے نکلا ہے جس کے معنے میٹھے پانی کے ہیں۔ تَعْذِیب کے معنے اور عَذَّبَ کے معنے ہیں کہ اُسے زندگی کی حلاوت سے محروم کر دیا (مفردات) پس عَذَاب کے معنے ہوئے (۱) تکلیف (۲) ایسی چیز جو زندگی کی حلاوت سے محروم کر دے (۳) مقصود حیات سے محروم کر دے۔

تفسیر۔ اس آیت میں ان کفار کا انجام بتایا ہے کہ جن میں مذکورہ بالا آیات والی صفت پائی جاتی ہے نہ کہ ہر کافر کا۔

یہ طبعی قاعدہ ہے کہ جو عضو انسان استعمال نہیں کرتا وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ بعض ہندو سادھو اپنا ہاتھ کھڑا رکھ کر سکھا دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر آنکھ سے کام نہ لیا جائے تو بالآخر اس کی بینائی جاتی رہتی ہے۔ اگر کانوں سے کام نہ لیا جائے تو شنوائی مفقود ہو جاتی ہے اور اگر زبان کو بند رکھا جائے تو گویائی جاتی رہتی ہے۔ یہی حال باطنی حسّوں کا ہے ان سے بھی اگر کام نہ لیا جائے تو وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد معطل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ یہ کفار قلوب کی نظر سے کام نہیں لیتے رہے اس لئے ان کے قلوب کی بینائی جاتی رہی ہے اور وہ مردہ دل ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ باوجود کان رکھنے کے وہ ہماری باتیں نہیں سنتے رہے اور باوجود آنکھیں رکھنے کے نشانات اور واقعات نہیں دیکھتے رہے اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دین کی طرف سے انکی یہ حسیں بیکار ہو گئی ہیں۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے کام لیتے اور حق کی باتیں سنتے اور ان کو سمجھتے تو اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ چنانچہ دوزخیوں کی نسبت آتا ہے کہ وہ عذاب میں مبتلا ہو کر کہیں گے کہ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (الملک ع ۱) اگر ہم ان کی باتیں سنتے یا خود سمجھنے کی کوشش کرتے تو آج دوزخ والوں میں شامل نہ ہوتے۔

آیت ختم اللہ الخ میں تین لطیف باتوں کی طرف اشارہ

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین لطیف باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ اگر غور کرو تو ضلالت کا فردہی تو ہیں جو دل، کان اور آنکھوں سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ہدایت کے یہی تین بڑے ذریعے ہیں اور ہر ایک بات پر غور انہی تین طریق سے ہو سکتا ہے۔ اوّل۔ ہے سب سے پہلا ہدایت کا ذریعہ یہی ہے جو شخص سوچنے کا عادی ہوتا ہے وہ بیسیوں صداقتوں کو پالیتا ہے دوم کان ہیں اگر کسی میں زیادہ عقل اور سمجھ نہیں ہوتی کہ غور کر کے خود فیصلہ کرلے وہ کسی سے سُن کر بات مان لیتا ہے۔ تیسرے آنکھیں

ہیں۔ اگر کانوں سے سنکر ہدایت نہ پائے تو کم سے کم آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ جو باتیں مجھ سے کہی جاتی ہیں اُن کا نتیجہ دنیا میں کیا پیدا ہو رہا ہے۔ اگر نتیجہ اچھا نکل رہا ہو تو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ گو کانوں سے سنکر وہ باتیں بھلی معلوم نہیں ہوتیں مگر مشاہدہ نے ان کی تصدیق کر دی ہے لیکن جو بدبخت ان تینوں باتوں سے عاری ہو۔ وہ کبھی کوئی بات نہیں مان سکتا وہ ہمیشہ دُکھ اٹھاتا ہے۔ پس وہ انسان جو دنیا کی اشیاء پر غور کر کے خود صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا وہ اگر انبیاء کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں سُنے تو اُسے ہدایت مل سکتی ہے۔ اگر ان کو سُن کر اس کا دل فیصلہ نہ کر سکے تو وہ خدا تعالےٰ کی قدرت کے جلوے اور نظارے دیکھ کر مان سکتا ہے کہ وُہ کس کی تائید میں ہیں اور اگر وہ نہ خود سوچے اور نہ علم کی باتوں کو سنے اور نہ خدا تعالیٰ کے نشانات کو دیکھے تو اُس کا انجام اس کے سوا کیا ہوگا کہ وُہ دکھوں میں پڑ جائے۔

اللہ تعالےٰ نے اس جگہ ان لوگوں کو ان تینوں باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور فرمایا ہے ہم نے انہیں ایسے دل دئے تھے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتے تھے۔ اگر یہ قوت فکریہ سے کام لیتے تو اسلامی صداقتوں کا چشمہ ان کے دلوں سے ہی پھوٹ پڑتا اور یہ اسلام کی دعوت کو سُنتے ہی اسے مان لیتے۔ اگر دلوں سے انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ تو ان دلائل کو سنتے جو اسلام نے پیش کئے ہیں۔ اس طرح بھی انکو ہدایت مل سکتی تھی۔ اگر کانوں سے سُن کر اسلام کی صداقت کا فیصلہ نہ کر سکے تھے تو یہ خدا تعالےٰ کے فعل کو ہی دیکھتے کہ خدا تعالےٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا معاملہ کر رہا ہے۔ مگر انہوں نے یہ بھی نہ کیا پس جب سب دروازے انہوں نے اپنے لئے خود بند کر لئے تو اب انہیں ہدایت نصیب ہو تو کیسے ہو۔ ان تینوں طاقتوں کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے اب تو ان کی وہ قوتیں ہی ضائع ہو گئی ہیں۔

ٹ مخالفین اسلام کا آیت ختم اللہ الخ سے غلط استدلال اور اس کا جواب

اس آیت کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ مخالفین اسلام نے اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ خدا تعالےٰ جبراً کفار کے دلوں پر اور کانوں پر مُہر لگا دیتا ہے اور انکی آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے یہ تو ظلم ہے اور قرآن کریم خدا تعالےٰ سے ظلم کی نفی فرماتا ہے جیسے کہ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (نساء ع) یعنی اللہ تعالےٰ اپنے بندوں پر ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (یونس ع) یعنی اللہ تعالےٰ کی شان تو ایسی ہے کہ وُہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔ ہاں لوگ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے ہیں۔

ٹ اللہ تعالیٰ جبراً کفار کے دلوں پر مہر کرتا ہے مہر نہیں لگاتا

دوسرے اگر ان معنوں کو تسلیم کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ خود بعض بندوں کے لئے کفر کو پسند کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں ہے وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ (زمر ع) کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے لئے کفر کو ناپسند کرتا ہے۔ اور فرمایا وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ (حجرات ع) یعنے کفر اور خودسری اور نافرمانی سے اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو نفرت دلا دی ہے۔

تیسرے ان معنوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ جبر سے بعض لوگوں سے کفر کرواتا ہے لیکن قرآن کریم اس مضمون کو بھی رد کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (کہف ع) یعنی جو چاہے اللہ کی طرف سے نازل شدہ کلام پر ایمان لے آئے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے۔ بلکہ قرآن کریم نے جبر کی نفی کرتے ہوئے بیسیوں جگہ بتایا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جبر ہوتا تو ایمان پر ہوتا نہ کہ کفر پر۔ جیسے کہ فرمایا فَلَوْ شَآءَ لَھَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ (انعام ع)

کہ اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو تم سب کو دین حق کی طرف ہدایت کرتا۔ قرآن کریم سے تو وضاحت سے یہ امر ثابت ہے کہ ایمان لانا اور کفر اختیار کرنا بندوں کا فعل ہے اور یہی وجہ ہے کہ کوئی مومن ہے تو کوئی کافر۔ جیسے کہ فرمایا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ (بقرہ ع [۳۳]) یعنی لوگوں میں سے بعض تو ایسے تھے جو ایمان لے آئے اور بعض ایسے تھے جنہوں نے انکار کر دیا۔ اور فرمایا مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ (روم ع) جو کفر کرتا ہے۔ تو اُسی پر اس کے کفر کا وبال پڑے گا۔

دلوں پر مہر اور تکمیل کا پردہ پڑ جانا انسانی اعمال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ یہ مُہر اور پردہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ جیسے فرمایا طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء ع [۲۲]) کہ اللہ نے اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں پر مُہر کر دی ہے۔ پھر فرمایا اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (المنافقون ع) یعنی یہ لوگ پہلے مسلمانوں کو دکھانے کو ایمان لائے پھر منکروں میں مل کر اسلام سے پھر گئے۔ یہاں تک کہ اُن کے دلوں پر مُہر کر دی گئی۔ پھر فرمایا كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ (یونس ع) یعنی ہم حد سے بڑھنے والوں کے دلوں پر اسی طرح مُہر لگایا کرتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (مومن ع) کہ اللہ تعالےٰ مغرور اور سرکش لوگوں کے دلوں پر ایسے ہی مہر لگایا کرتا ہے۔ پھر فرمایا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (تطفیف ع) یعنی اصل بات یہ ہے کہ اُن کے دلوں پر اُن ہی کے اعمال بد کے زنگ بیٹھ گئے ہیں۔

ختم اللہ میں مہر لگانے کی نسبت کا اللہ تعالیٰ کی طرف ہونے کا مطلب

اگر کہا جائے کہ پھر کیا وجہ کہ اس آیت میں مہر لگانے کی نسبت خدا تعالےٰ کی طرف کی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان کے اعمال کا یہ نتیجہ اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے اِن آیات میں خَتَم اور طَبَع کی نسبت جناب الٰہی کی طرف کی گئی ہے۔ ورنہ ایک دوسری آیت میں اس مہر کو خود کفار کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ع [۳]) یعنی کیا کفار قرآن کریم کے مضمون پر غور نہیں کرتے یا یہ بات ہے کہ ان کے دلوں پر اُنہی کے دلوں سے پیدا شدہ قفل لگے ہوتے ہیں۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ نہ ماننے کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا تو غور نہ کرنا یا غور نہ کرنے کی عادت یا لمبے عناد اور تعصب کی وجہ سے دلوں میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا جو سمجھنے کی طاقت کو ضائع کر دیتا ہے۔ اور استعارۃً اس کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ دلوں میں قفل پیدا ہو کر دلوں کی کھڑکیوں میں لگ گئے ہیں۔ پس اللہ تعالےٰ کا مہر لگانا انہی معنوں میں ہے کہ دوسری قسم کے لوگوں نے چونکہ خود اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر دیتے تھے اور اپنے دلوں کو اور کانوں کو اور آنکھوں کو معطل کر دیا تھا۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے ان کے فعل کا مناسب نتیجہ پیدا کر دیا ہے۔ اس مفہوم کے مطابق قرآن کریم میں ایک اور مثال بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے کے متعلق ایک جگہ فرماتا ہے کہ ہم نے آدم کو کہا کہ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (بقرہ ع [۴]) یعنی اللہ تعالےٰ نے آدم سے کہا کہ تم سب نکل جاؤ۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ جنت سے آدمؑ کو اللہ تعالےٰ نے نکالا۔ مگر دوسری جگہ فرماتا ہے يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ (اعراف ع [۲]) یعنی اے بنی آدم شیطان تم کو دُکھ میں مبتلا نہ کر دے جس طرح اس نے تمہارے ابتدائی ماں باپ کو جنت سے نکال دیا تھا۔ اس بارہ میں ایک دفعہ نکالنے کو اپنی طرف منسوب کرنا اور ایک دفعہ شیطان کی طرف اسی حکمت سے ہے۔ شیطان کی طرف نکالنے کو اس لئے منسوب کیا کہ اس کے فعل کے سبب سے وہ جنت سے نکلنے کے مستحق ہوئے اور خدا تعالےٰ کی طرف اس لئے کہ اس فعل کا آخری اور لازمی نتیجہ خدا تعالےٰ

نے نکالا۔ جیسے اسی طرح مہر لگانے والی بات بھی ہے۔ مہر لگتی ہے عناد اور ضد سے یعنی جان بوجھ کر صداقت کے انکار سے۔ لیکن آخری نتیجہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے جس طرح ہر دوسرے فعل کا نتیجہ وہی نکالتا ہے۔ یہ معنے جو میں نے کئے ہیں ان کی تصدیق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا کَانَ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءَ فِیْ قَلْبِہٖ فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی یُغْلَقَ قَلْبُہٗ فَذَالِکَ الرَّانُ الَّذِیْ قَالَ اللّٰہُ جَلَّ ثَنَاءُہٗ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (ابن جریر) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مومن گناہ کرے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے پھر اگر توبہ کرے اور گناہ ترک کر دے اور استغفار کرے تو اس کے دل کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہ میں بڑھتا جائے تو یہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے حتٰی کہ اس کے دل پر غلاف چڑھ جاتے ہیں۔ اور یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ خبردار بات یہ ہے کہ خود ان کے اعمال نے اُن کے دلوں پر زنگ لگا دیا ہے۔ اس کی ابن جریر یہ تشریح بیان کرتے ہیں کہ فَاَخْبَرَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ الذُّنُوْبَ اِذَا تَتَابَعَتْ عَلَی الْقُلُوْبِ اَغْلَقَتْھَا وَاِذَا اَغْلَقَتْھَا اَتَاھَا حِیْنَئِذٍ الْخَتْمُ مِنْ قِبَلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَلَا یَکُوْنُ لِلْاِیْمَانِ اِلَیْھَا مَسْلَکٌ وَلَا لِلْکُفْرِ مِنْھَا مَخْلَصٌ فَذَالِکَ ھُوَ الطَّبْعُ وَالْخَتْمُ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ خبر دی ہے کہ گناہ جب متواتر صادر ہوں تو وہ دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور جب وہ دلوں پر پردہ ڈال دیں تو اس کے بعد اللہ تعالےٰ کی طرف سے مہر آ جاتی ہے۔ پس اس صورت میں دل میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا نہ اس میں سے کفر باہر نکل سکتا ہے۔ اور اسی کا نام قرآن کریم میں طبع اور ختم آتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک حدیث مسلم میں حذیفہ رضؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔

۲ مہر اور پردہ کوئی جسمانی چیز نہیں

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ مہر اور پردہ کوئی جسمانی چیز نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ کفار کی زبانی بیان فرماتا ہے قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ (حٰم سجدہ ع) کہ کفار آنحضرت کو یوں کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہمارے دل اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے جس کی وجہ سے تمہاری بات سنائی نہیں دیتی اور تمہارے اور ہمارے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے تم ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پردہ اور ختم وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ ہیں۔ اور ان کی تشریح وہی ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں کی گئی ہے۔ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا (اعراف ع۲۲) یعنی اُن کے دل تو ہیں لیکن وہ اُن سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور اُن کی آنکھیں بھی ہیں مگر وہ اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور اُن کے کان بھی ہیں مگر وہ اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اسی مضمون کی تشریح ایک اور آیت میں بھی ہے جو یہ ہے اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج ع) یعنی کیا یہ لوگ ملک میں چلتے پھرتے نہیں۔ کہ اُن کے دل ایسے ہوتے کہ اُن کے ذریعہ وہ انجام کو سمجھتے اور ان کے کان ایسے ہوتے کہ ان کے ذریعے سے نصیحت کی باتوں کو سنتے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اصل نابینائی آنکھوں کی نہیں بلکہ اصل نابینائی ان کے دلوں کی ہے جو سینوں میں ہیں۔

۱ دلوں پر مہر لگنے کی تشریح احادیث میں

اوپر جو شبہ بیان ہوا ہے اور جس کا جواب دیا گیا ہے وہ درحقیقت اس سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ غور نہیں کیا گیا کہ یہ آیت پہلی آیت کا تتمہ ہے اور اس میں ان کفار

کا ذکر ہے جو صداقت کو سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے اور نہ خدا تعالےٰ کے فعل کو دیکھنے کیلئے تیار ہوتے ہیں پس ان لوگوں کی مُہر تو ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس سے خدا تعالےٰ پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ میں جس بڑے عذاب کی خبر دی گئی ہے اس سے صرف بعد الموت کی جہنم کی سزا ہی مراد نہیں بلکہ سب سے زیادہ اس میں خدا تعالےٰ کی دُوری کا ذکر ہے۔ عذاب کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں۔ کہ روکنے کے بھی ہوتے ہیں۔ پس عذاب سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ مومن تو خدا تعالےٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر سوار ہو کر اس تک پہنچ جائیں گے مگر یہ لوگ خدا تعالےٰ کے دیدار سے روک دیئے جائینگے اور اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ دل۔ کان اور آنکھوں کے استعمال کو ترک کر دیتے ہیں وہ دنیا کے ہر کام میں بھی ذلت اور دُکھ پاتے ہیں اور عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ میں عذاب سے مراد

اس آیت کے متعلق یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں دل کے بعد کان کا ذکر ہے اور اس کے بعد آنکھ کا۔ اور قرآن کریم میں جہاں بھی اس قسم کا ذکر آیا ہے کان کو آنکھ پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی ایک حکمت تو پہلے بیان ہو چکی ہے دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان پہلے کام کرنے لگتے ہیں اور آنکھیں بعد میں۔ چنانچہ بعض جانوروں میں تو آنکھیں کئی دن تک بند رہتی ہیں اور شروع میں کان ہی سے وہ کام لیتے ہیں۔

آیت ہذا میں کان کو آنکھ پر مقدم کرنیکی وجہ

اس آیت کے بارہ میں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل اور آنکھوں کو تو جمع بیان کیا اور کانوں کے لئے مفرد کا لفظ رکھا ہے اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دلوں اور آنکھوں کا فعل ہر شخص کا جداگانہ ہوتا ہے۔ دلوں کی طاقتوں کا اس قدر فرق ہوتا ہے کہ کوئی تحت الثریٰ میں ہوتا ہے اور کوئی افلاک پر۔ اسی طرح آنکھوں کے فعل سے اسجگہ معجزات اور نشانوں کو دیکھنا مراد ہے اس کا اندازہ بھی ہر شخص الگ الگ لگاتا ہے۔ اور اسطرح گو یا مختلف آنکھوں سے انکو دیکھا جاتا ہے مگر سنی جلنیوالی شئے ایک معین چیز ہے یعنی قرآن کریم۔ وہ معین الفاظ میں سب کے سامنے پڑھا جاتا تھا۔ پس سوچنے میں گو سب مختلف تھے اور معجزات کا نظارہ کرنے میں بھی مختلف تھے مگر سننے میں مختلف نہ تھے کیونکہ ایک ہی کلام سنتے تھے پس سننے کیلئے مفرد کا لفظ استعمال کیا کہ گو یا سب ایک ہی کان سے سنتے تھے۔

آیت ہذا میں آنکھوں کے لئے جمع اور کانوں کیلئے مفرد لفظ رکھنے کی وجہ

ایک سوال اس آیت کے بارہ میں یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ دلوں اور کان کیلئے تو مُہر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ سخت ہے لیکن آنکھوں کیلئے پردہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہٹ بھی سکتا ہے لیکن سورۃ نحل ع۱۴ میں فرماتا ہے طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی اللہ تعالےٰ نے انکے دلوں انکے کان اور انکی آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پہلے انسان اپنے دل میں غور کرتا ہے پھر بات سن کر ہدایت پاتا ہے اور جب یہ بھی نہ ہو تو معجزات کو دیکھتا ہے۔ معجزات کلام کے بعد آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں اس لئے آنکھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیر میں مہر لگائی جاتی ہے کیونکہ اس رستہ کے ذریعہ حجت دیر سے قائم ہوتی ہے پہلے پردے پڑتے ہیں پھر مہر لگتی ہے پس سورہ بقرہ میں اس حالت کا ذکر ہے کہ جب ابھی مہر کا وقت نہ آیا تھا اور سورۃ نحل میں اس حالت کا ذکر ہے جبکہ معجزات کو دیکھکر بھی ایک لمبے عرصہ تک انسان ایمان نہ لائے۔

اس جگہ یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قلوب اور کانوں پر مہر لگانے کو تو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن آنکھوں کے پردوں کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفار یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں سمجھ نہیں دی کہ ہم اس کی باریک حکمتوں کو سمجھ سکیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں سننے کا موقعہ نہیں ملا۔ گو حق یہ ہے کہ انہوں نے خود ہی نہیں سنا لیکن وہ اس بات کا کیا جواب دینگے کہ خدا تعالیٰ کی تائیدات اور نصرتیں انکے دائیں اور بائیں اور سامنے ظاہر ہو رہی ہیں انہیں انہوں نے کیوں نہیں دیکھا پس اس طرح اس مضمون کو واضح کر دیا ہے کہ ختم کا خدا تعالیٰ کی طرف

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

کہ ہم اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ہرگز ایمان نہیں رکھتے ۵۹

منسوب کیا جانا صرف نتیجہ فعل کے طور پر ہے ورنہ یہ دونوں نتائج بھی خود کفار کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جس طرح ان کا نشانات کو نہ دیکھنا ان کا اپنا فعل ہے۔

۵۹ حل لغات۔ اٰمَنَّا۔ اٰمَنَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور مُؤْمِنُوْنَ وَمُؤْمِنِیْنَ، مُؤْمِنٌ کی جمع ہے جو اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ قبل ازیں حل لغات ۵ سورۃ ہذا میں ایمان کے تین معنے لکھے جا چکے ہیں (۱) اعتراف (۲) تصدیق یعنی سچائی کا اقرار کرنا (۳) کسی چیز کے اوپر پختہ ہو جانا۔ امام راغب ایمان کی تشریح کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ:۔ "اَلْاِیْمَانُ یُسْتَعْمَلُ تَارَۃً اِسْمًا لِلشَّرِیْعَۃِ الَّتِیْ جَاءَ بِھَا مُحَمَّدٌ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَیُوْصَفُ بِہٖ کُلُّ مَنْ دَخَلَ فِیْ شَرِیْعَتِہٖ مُقِرًّا بِاللّٰہِ وَبِنُبُوَّتِہٖ" یعنی ایمان کبھی اس شریعت کے لئے بطور نام استعمال کیا جاتا ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور ایسے شخص کو جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کا اقرار کرتے ہوئے شریعت محمدیہ میں داخل ہو ایمان کے ساتھ موصوف کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں (یعنی لفظ مومن بولنے سے فوراً ذہن میں اس شخص کا تصور آتا ہے جو آنحضرتؐ پر ایمان رکھنے والا ہو) "وَتَارَۃً یُسْتَعْمَلُ عَلٰی سَبِیْلِ الْمَدْحِ وَیُرَادُ بِہٖ اِذْعَانُ النَّفْسِ لِلْحَقِّ عَلٰی سَبِیْلِ التَّصْدِیْقِ وَذٰلِکَ بِاجْتِمَاعِ ثَلٰثَۃِ اَشْیَاءَ تَحْقِیْقٌ بِالْقَلْبِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِحَسْبِ ذٰلِکَ بِالْجَوَارِحِ" نیز کبھی لفظ ایمان بطور مدح استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تصدیق کے ساتھ ساتھ نفس نے حق کی پوری اطاعت بھی کر لی ہے اور حق کے پوری طرح تابع ہو جانیکا اظہار تین چیزوں کے جمع ہونے سے ہوتا ہے (۱) دل سے صداقت کو حق قرار دینا (۲) زبان سے اس کا اقرار کرنا (۳) اعضاء سے اسکے مطابق عمل کر کے پوری طرح صداقت کے تابع ہو جانیکا اظہار کرنا۔ گویا امام راغب نے اسی شخص کو حقیقی مومن قرار دیا ہے جس کے اندر تینوں مذکورہ بالا باتیں پائی جائیں۔ اگر کسی میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے تو وہ مومن کہلانیکا حقدار نہیں) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ تصریح فرما دی ہے کہ محض زبان سے اقرار یا صرف دل سے یقین کر لینا اور زبان سے اقرار نہ کرنا کوئی معنے نہیں رکھتا جبتک کہ یہ اکٹھے نہ ہوں چنانچہ فرمایا "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (حجرات) یعنی اعراب نے مومن ہونیکا دعویٰ کیا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ کیونکہ انہوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ وہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن انکے قلوب میں ایمان داخل نہیں ہوا اور چونکہ ایسے لوگ مومن نہیں ہوتے اس لئے انکے ایمان لانیکا دعویٰ غلط ہے۔ ایک اور جگہ آل فرعون کی نسبت فرمایا "جَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ" (نمل) کہ انہوں نے ظاہر میں اور عمل سے اللہ تعالیٰ کے نشانات کا انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دل ان نشانوں کے سچے ہونیکا اقرار کر چکے تھے۔ الغرض ایمان صرف منہ سے کسی بات کے اقرار کر لینے یا دل سے کسی کے سچا ہونیکا یقین کر لینے کا نام نہیں بلکہ جبتک (۱) دل سے صداقت کو حق قرار نہ دیا جائے (۲) اور پھر زبان سے اسکا اقرار کرتے ہوئے (۳) اعضاء سے اسکے مطابق عمل کا اظہار نہ کیا جائے اسوقت تک مومن کہلانا درست نہیں:

تفسیر۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک اس گروہ کا ذکر کیا جو ایمان پر مستقل طور پر قائم ہے اور اس کے ایمان سے جو فوائد وابستہ ہیں ان سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا ہے پھر اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے اس گروہ کا ذکر کیا جو کفر و عصیان سے مستقل طور پر وابستہ ہے اور اس کے بد نتائج کا مستحق ہو چکا ہے۔ انہی کے ذکر میں ضمناً ان کفار کا بھی ذکر آ گیا جو عقیدۃً کافر ہیں لیکن انکے دلوں میں تعصب نہیں وہ صداقت کے سمجھ آ جانے پر اسے قبول کرنے کیلئے بھی تیار ہیں اور اس کے سمجھنے کیلئے بھی کوشش کرتے ہیں کیونکہ جب یہ فرمایا کہ وہ کافر ایمان نہیں لائینگے جنھوں نے نشانات سنا کر چھوڑا ہے اور جو اس حد تک متعصب ہیں کہ سچائی کو قبول نہ کرنیکا فیصلہ کر چکے ہیں تو اس سے ضمناً یہ نتیجہ بھی نکل آیا کہ جو کافر سنتے ہیں اور سچائی کو اگر سمجھ میں آ جائے ماننے پر آمادہ ہیں وہ جیسے جیسے انکشاف تام ان پر ہوتا جائے گا ایمان لاتے چلے جائیں گے۔

اب اس آیت سے قرآن کریم سے تعلق رکھنے والے ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جو منافقوں کا گروہ کہلاتا ہے۔ مومنوں کی

منافقین کا ذکر اور انکی دو اقسام

جماعت کو مدنظر رکھتے ہوئے منافق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو صرف ظاہر میں مومنوں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں لیکن دل میں منکر ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شمولیت محض دنیوی فوائد یا قومی جتھابندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور ایک وہ منافق جو عقلی لحاظ سے تو ایمان کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اُن کے اندر ایسی مضبوطی نہیں ہوتی کہ اس کے لئے پوری طرح قربانیاں کر سکیں پس ایسے لوگ اپنی عملی کمزوری کی وجہ سے نہ کہ عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے عمل میں سستی دکھاتے ہیں اور کبھی کفار کا زیادہ دباؤ پڑے تو ان کی ہاں میں ہاں بھی ملا دیتے ہیں اور اُن سے تعلق و محبت بھی جتا دیتے ہیں اور دل میں خیال کرتے ہیں کہ جب صداقت کو اللہ تعالےٰ نے غلبہ دینا ہی ہے تو کیا حرج ہے کہ مداہنت کرکے ہم اپنے آپ کو نقصان سے بچا لیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اگر سب لوگ ہی اس طریق کو اختیار کر لیں تو صداقت کی تائید کون کرے۔ اور یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ صداقت کو تو بے شک اللہ تعالےٰ نے فتح دینی ہی ہے لیکن انہیں اپنے انجام کا بھی تو خیال کرنا چاہیئے اگر صداقت کامیاب ہوگئی مگر وہ صداقت کے منکروں میں شامل ہوگئے تو ان کو اس سے کیا فائدہ۔

آیت ہذا میں اعتقادی منافقوں کا ذکر

آیت زیر تفسیر میں اس تیسرے گروہ کے پہلے حصہ کا یعنی جو دل سے قرآن کریم کے منکر تھے لیکن ظاہر میں مسلمانوں میں شامل تھے ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ظاہر میں تو وہ مسلمانوں میں شامل ہیں لیکن اُن کے دل میں اسلام کی صداقتوں پر پورا یقین نہیں ہے وُہ مُنہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخر کو مانتے ہیں لیکن اُن کے دلوں میں اللہ اور یوم آخر پر کوئی ایمان نہیں۔

یہاں اللہ کے ذکر میں صرف اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے کے ذکر کی وجہ

اس آیت میں صرف اللہ اور یوم آخر پر ایمان کا ذکر ہے کلام الٰہی یا انبیاء وغیرہما کا ذکر نہیں۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ ایمانیات کے سلسلہ کی پہلی کڑی خدا تعالےٰ پر ایمان لانا ہے اور آخری کڑی یوم آخر پر ایمان لانا۔ پس اختصار کے لئے صرف پہلی اور آخری کڑی کا ذکر کر دیا گیا اور درمیانی امور کو چھوڑ دیا گیا کیونکہ ابتداء اور انتہاء کے ذکر سے درمیانی اُمور خود ہی سمجھ آجاتے ہیں۔ پس گو کفار کا قول اختصاراً یہی نقل کیا ہے کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں لیکن مراد یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ سے لے کر یوم آخر تک سب امور ایمانیہ کو مانتے ہیں جیسے کہ ہماری زبان میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ الف سے یاء تک سب بات سمجھ لی ہے۔

قرآن کریم میں یہ طریق کلام عام طور پر مستعمل ہے کیونکہ وہ سب علوم کی جامع کتاب ہے اس نے روحانی مسائل بھی اور جسمانی مسائل بھی اور الٰہیات بھی اور فلکیات بھی اور مادی صنعتوں کے مسائل بھی بیان کرنے تھے۔ اُس نے اقتصادی امور، اجتماعی امور، مدنی احکام، اخلاقی احکام، عبادات کے ساتھ تعلق رکھنے والے احکام، بندوں سے تعلق رکھنے والے احکام، حاکموں سے متعلق احکام، رعایا سے متعلق احکام، مالداروں سے متعلق احکام، غریبوں سے متعلق احکام، کارخانہ داروں سے متعلق احکام، مزدوروں سے متعلق احکام، خاندان سے متعلق احکام اور میاں بیوی سے متعلق احکام، جنگ، صلح، قضاء، اکل و شرب کے متعلق احکام غرض سینکڑوں اور سینکڑوں اقسام کے احکام بھی اس نے بیان کرنے تھے، اُن کے علل و اسباب بھی بیان کرنے تھے، اور خدا تعالےٰ کے تازہ و تازہ نشانات بھی بیان کرنے تھے، سابق انبیاء کے کام اور خدا تعالےٰ کے ان سے معاملات بھی اس نے بیان کرنے تھے اور آئندہ زمانوں کے متعلق اخبار غیبیہ بھی بتانی تھیں تا ہر زمانہ کے مسلمانوں کے ایمانوں میں زیادتی ہو اور غیر مومنوں کے لئے موجبات ہدایت پیدا ہوں۔ ایسی کتاب اس چھوٹے سے حجم میں آ ہی کس طرح سکتی تھی اگر اس میں لطیف اختصار سے کام نہ لیا جاتا۔ عہدنامہ جدید میں ایک دو مضامین کے سوا اور ہے کیا؟ مگر اس کا حجم قرآن کریم سے بڑا ہے اسی طرح عہدنامہ قدیم بھی قرآن کریم سے بڑا ہے اسی طرح وید بھی قرآن کریم سے بڑے ہیں۔ مگر وہ مضامین جن پر قرآن کریم نے بحث کی ہے کوئی انکی صداقت کا قائل ہو نہ ہو اُسے یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے مطالب کی فہرست دوسری کتب میں مذکورشدہ مطالب سے بہت ہی زیادہ

ہے اور باوجود اس کے اس کا اختصار ایسا نہیں کہ وہ چیستان بن کر رہ جائے۔ قرآن کریم کے ایک رکوع کے برابر بھی جنتی کے پہیلیوں کے مضامین نہیں لیکن اس نے ایک ضخیم جلد شعروں کی لکھی ہے مگر وُہ ہے چیستان ہی۔ لیکن قرآن کریم نے سینکڑوں مسائل پر اختصار سے گفتگو کر دی ہے مگر پھر بھی پہیلیوں کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ ہر شخص اپنی لیاقت کے مطابق اس کے مضامین کو سمجھتا ہے اور ایک عالم اور سادہ زبان میں بیان کرنے والی کتاب اسے پاتا ہے کسی جگہ بھی کوئی ایسی عبارت اُسے نظر نہیں آتی کہ جو پہیلیوں کی طرح کی ہو۔

اس قسم کا اختصار ظاہر ہے کہ ایسے ہی لطیف اصولوں کی اتباع سے پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک طبعی تقسیم کا ذکر کرنا ہو تو ابتدائی اور آخری کڑی کو بیان کر دیا۔ کسی واقعہ سے کوئی فائدہ حاصل کرنا ہے تو اس کے زائد حصوں کو چھوڑ کر صرف اس حصہ کو لے لیا جس سے استنباط کرنا ہے۔ الفاظ وہ استعمال کئے جو نہایت وسیع معنے رکھتے ہوں۔ جملوں کی بندش ایسی رکھی کہ ہر لفظ کے ہر معنی دوسرے الفاظ سے مل کر ایک الگ اور مستقل مضمون بیان کرتے ہوں۔ آیات میں ترتیب ایسی رکھی کہ آیت علیحدہ کر لی جائے تو اور مضمون ظاہر کرے اور دوسری آیات سے مل کر اور مطالب پر روشنی ڈالے۔ پھر مختلف آیات کا مجموعہ دوسرے مجموعوں سے الگ کر کے الگ مطالب پر روشنی ڈالے اور دوسرے مجموعوں سے ملا کر ایک نئے معنے بھی دینے لگے۔ ان اصول کو قرآن کریم نے اس لئے استعمال کیا تا کہ تھوڑے سے الفاظ میں غیر محدود مضامین بیان ہو جائیں۔

مجھے اس تفصیل کی اس لئے ضرورت پیش آئی ہے کہ بعض نادان ایسی آیات سے یہ مضمون نکالتے ہیں کہ گویا صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا کافی ہوتا ہے کیونکہ اس جگہ ایمان کے ثبوت کے لئے انہی دو باتوں کا ذکر ہے۔ اور یہ لوگ ان زبردست اصولوں کو بھول جاتے ہیں جو جامعیت اور اختصار کی خاطر قرآن کریم نے استعمال فرمائے ہیں اور جو تمام قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ اس کے مطالب پر غور کرنے والے لوگوں پر یہ امر کما حقہٗ منکشف ہے۔ شاید کوئی کہے کہ تمہارا یہ استدلال خود ساختہ ہے کس طرح معلوم ہو کہ قرآن کریم نے واقعہ میں زنجیر کی اول اور آخری کڑی بیان کر کے ساری زنجیر کی طرف اشارہ کیا ہے کیوں نہ سمجھا جائے کہ درحقیقت انہی دو باتوں کا بیان مقصود ہے کیونکہ یہی ایمان کی بنیاد ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ وُہ ان اصولوں کی تشریح بھی خود ہی دوسری جگہ پر کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں جو اختصار کیا گیا ہے اس کی وضاحت بھی دوسری جگہ مل جاتی ہے سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۗ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (ع۱۱) یعنی یہ کتاب اس شان کی ہے کہ اسے خدا تعالیٰ نے اتارا ہے پھر اس کے اندر تمام ان کلاموں کی ضروری تعلیمات جمع ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے نازل ہوئے تھے اور ان کتب سماویہ میں بھی اس کے بارہ میں خبریں تھیں جن کو اس کی آمد نے پورا کیا ہے۔ یہ کتاب دنیا کو ہدایت دینے کے لئے نازل ہوئی ہے اور اس کے گرد کی دنیا کو ہوشیار کرنے کیلئے بھی اور وہ لوگ جو یوم آخرۃ پر ایمان لاتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ضرور ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں میں بھی بہت باقاعدہ ہیں۔ اب دیکھو اس آیت میں کس طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ایمان بالآخرۃ ایمان بالقرآن کا مستلزم ہے اور جو قرآن کریم پر ایمان لائیگا لازماً اُسے محمد رسول اللہ پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ کیونکہ آپ ہی کے ذریعے سے قرآن کریم دنیا کو ملا ہے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہُوا کہ ملائکہ پر ایمان بھی یوم آخر میں شامل ہے کیونکہ جو قرآن کریم کو مانیگا وہ ملائکہ کا انکار کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس میں بار بار ملائکہ کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ اس آیت میں تو یہ امر بھی زائد کر دیا گیا ہے کہ یوم آخر پر ایمان میں اعمال صالحہ بھی شامل ہیں۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ جو یوم آخرۃ پر ایمان لاتے ہیں نہ صرف یہ کہ وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں بلکہ وہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

غرض مذکورہ بالا آیت اس امر پر شاہد ہے کہ میرا یہ استدلال کہ اللہ اور یوم آخر کے ذکر پر اقتصار اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کے

سوا کسی اور امر پر ایمان لانا مومن ہونے کے لئے ضروری نہیں بلکہ اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں امور ایمانیات کی ابتدائی اور آخری کڑیاں ہیں پس ساری زنجیر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ان کو منتخب کر لیا گیا ہے۔

ایک اور معنے بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اس جگہ منافقوں کا قول بیان کیا گیا ہے نہ کہ اللہ تعالےٰ کا۔ پس ہو سکتا ہے کہ منافق یہ الفاظ جان بوجھ کر کہتے ہوں اور انکی غرض مومنوں کو دھوکا دینا ہو۔ وہ مومنوں کے سامنے یہ الفاظ کہکر ان پر تو یہ اثر ڈالنا چاہتے ہوں کہ ہم تمام اسلامی عقیدوں کو تسلیم کرتے ہیں لیکن دل میں یہ خیال رکھتے ہوں کہ ہم اللہ تعالےٰ کو بھی مانتے ہیں اور یوم آخر کو بھی مانتے ہیں لیکن قرآن کریم اور اس کے لانے والے کو نہیں مانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار عرب میں سے بہت سے ایسے لوگ تھے جو قیامت کے منکر تھے مگر سب کے سب کفار اس خیال کے نہ تھے ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے کہ جو بعد الموت زندگی کے قائل تھے۔ چنانچہ انکی روایات اور اشعار سے ایسے مطالب کی طرف اشارہ ملتا ہے خصوصاً مدینہ کے پاس کے لوگوں کے خیالات میں نسبتاً زیادہ اصلاح تھی۔ کیونکہ یہود اور نصاریٰ کے ساتھ مل جل کر رہنے کی وجہ سے اُن میں اہل کتاب کے کئی عقیدے سرایت کر گئے تھے۔ اور یہ منافقین جن کا ذکر ہے مدینہ ہی کے رہنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں اس دھوکے کی طرف اشارہ کیا گیا ہو جو منافق اپنے کلام سے مومنوں کو دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگلی آیات میں ان کے دھوکا دینے اور استہزاء کرنے کا ذکر بھی ہے۔

اس آیت کو وَمِنَ النَّاسِ سے شروع کرنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ منافقوں کو ان کی انسانیت کی طرف توجہ دلائی جائے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی ناسؔ کا لفظ استعمال ہوا ہے بشر کی اچھی قوتوں اور استعدادوں کی طرف اشارہ کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے۔ ورنہ یا تو قرآن کریم کفار کا لفظ استعمال کر کے یا صرف ضمیر کے استعمال سے یا ملکوں یا قوموں کا نام بیان کر کے مخالفین صداقت کا ذکر کرتا ہے پس اس جگہ وَمِنَ النَّاسِ کہکر ایک لطیف طنز سے انہیں نیکی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اور حیوان میں بھی فرق ہے کہ حیوان ایک مقررہ راستہ پر چلتا جاتا ہے اور انسان سمجھ کر کام کرتا ہے سو انسانیت کے جامہ کی تم کو اس قدر تو عزت ہونی چاہیئے تھی کہ جس امر کو سچا سمجھتے تھے اس پر کاربند ہوتے اور اگر تمہاری قوم مسلمان ہو بھی گئی تھی لیکن تم خود اسلام کو بُرا سمجھتے تھے تو بھیڑوں کی طرح ان کے پیچھے نہ چلتے بلکہ جو تمہارا عقیدہ خلاف اسلام تھا اس پر قائم رہتے۔

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کہہ کر اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کے اندر کوئی شائبہ بھی ایمان کا نہیں مَا سے نفی کر کے پھر بعد میں باء کا استعمال عربی میں زور پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اور اردو میں اس کا صحیح ترجمہ "ہرگز" کی زیادتی سے ہو سکتا ہے یعنی اس جملہ کا یہ ترجمہ نہیں کہ وہ مومن نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ ہرگز مومن نہیں۔ اگر صرف عدم ایمان کا اظہار کرنا ہوتا تو اس مضمون کو دوسری ترکیب سے بیان کیا جاتا۔ مثلاً کہا جاتا کہ وَهُمْ مُنَافِقُوْنَ۔

اس قسم کے منافقوں کا جو دل سے تو کافر ہوں لیکن منہ سے مومن بنتے ہوں قرآن کریم میں متعدد بار ذکر آیا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ (مائدہ ع ۹) یعنی جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں حالانکہ وہ جب تمہارے پاس آئے تھے تب بھی کافر تھے اور جب تمہارے پاس سے اُٹھ کر گئے تب بھی کافر تھے اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ تعالےٰ اسے خوب جانتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (مائدہ ع ۶) یعنی یہ منافق لوگ مُنہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آتے ہیں لیکن ان کے دل مومن نہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ

وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں ؎ مگر (واقع میں) اپنے سوا کسی کو

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ

دھوکا نہیں دیتے ؎ اور وہ سمجھتے نہیں ؎۱۰ ان کے دلوں میں

فِيْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران ع۱۷) وہ اپنے مونہوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور آیت زیر تفسیر میں ان لوگوں کے خیالات کی زبردست تردید ہوتی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کا حکم دیا ہے اس غلطی میں بعض مسلمان بھی پھنسے ہوئے ہیں اور دشمنانِ اسلام نے تو اس غلط عقیدہ کو اسلام کی طرف منسوب کر کے اس پر اعتراض کرنا ایک مشغلہ بنا رکھا ہے حالانکہ اگر یہ دھوکا خوردہ مسلمان اور وہ دشمنانِ اسلام اسی آیت پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اسلام جبر کے سراسر خلاف ہے کیونکہ جبر منافقت پیدا کرتا ہے اور جبراً کسی کو مسلمان بنانے کے یہی معنے ہیں کہ گو تیرا دل اور دماغ اسلام پر تسلی نہیں پاتا لیکن تو ظاہر میں کہہ دے کہ میں مسلمان ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ جو مذہب ایسی مذہبی تبدیلی کو جائز بلکہ پسند کرے گا وہ لازماً منافق کو اپنی جماعت کا جزو سمجھیگا اور اُسے کبھی خارج نہیں کر سکتا۔ کیونکہ منافقت کے نقص کو جانتے ہوئے اُس نے جبراً ایک ایسے شخص کو اپنے مذہب میں داخل کیا ہوگا جو اس کا قائل نہ تھا لیکن قرآن کریم تو جیسا کہ اوپر کی آیات میں بتایا گیا ہے سختی سے ایسے لوگوں کو ملامت کرتا ہے اور انکی نسبت اعلان کرتا ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ جو مذہب منافقوں کو اپنے اندر شامل کرنے کے لئے تیار نہیں اور صرف دل کی تسلی کے بعد درست عقیدہ رکھنے والے کو اپنا جزو قرار دیتا ہے وہ زبردستی اور تلوار سے کسی شخص کو نہ اپنے اندر شامل کر سکتا ہے نہ اُسے جائز قرار دے سکتا ہے چنانچہ قرآن واضح الفاظ میں فرماتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ع۲) یعنی مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائیں اور اُن کے دل میں بعد میں بھی کوئی شبہ پیدا نہ ہوا ہو اور وہ اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے ہر قسم کی قربانیاں بھی کریں اور یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ پس اسلام کے نزدیک مومن ہونے کے لئے دلی یقین شرط لازم ہے۔ اور جو مذہب دلی یقین کو شرط ایمان قرار دے وہ کسی صورت میں زبردستی اور جبراً تبدیلیٔ مذہب کی اجازت نہیں دے سکتا۔

؎ مذہب اسلام پر جبر سے مسلمان کرنے کے الزام کا رد

؎ يُخَادِعُوْنَ

؎۱۰ حل لغات۔ يُخٰدِعُوْنَ :۔ خَادَعَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ خَادَعَ خَدَعَ سے رباعی مزید فیہ ہے اور خَدَعَ کے اصل لغوی معنے فساد کے ہیں چنانچہ تاج العروس میں ہے خَدَعَ الشَّيْءُ خَدْعًا : فَسَدَ کہ جب خَدَعَ الشَّيْءُ کہیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس چیز میں فساد پیدا ہو گیا۔ اقرب میں اس لفظ کی تشریح میں لکھا ہے "خَدَعَهٗ : خَتَلَهٗ وَاَرَادَ بِهِ الْمَكْرُوْهَ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُهٗ" کہ خَدَعَ کے معنے ہیں اُسے دھوکا دیا اور ایسے ایسے طریقوں سے تکلیف پہنچانی چاہی جن سے وہ بے خبر تھا۔ وَفِي الْكُلِّيَّاتِ يُقَالُ خَادَعَ اِذَا لَمْ يَبْلُغْ مُرَادَهٗ وَخَدَعَ اِذَا بَلَغَ مُرَادَهٗ۔ اور کلیات (ابی البقاء) میں ہے کہ جب دھوکا دینے والا کامیاب ہو جائے تو خَدَعَ کا لفظ (مجرد) استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنی کوشش میں ناکام رہے تو خَادَعَ کا لفظ بولتے ہیں۔ خَادَعَهٗ کے ایک معنے تَرَكَهٗ یعنی چھوڑ دینے کے ہیں۔ اور خَادَعَ الْعَيْنَ کے معنے ہیں شَكَّكَهَا فِيْمَا تَرٰى۔ آنکھ پوری طرح دیکھ نہ سکی اور کسی چیز کی اصلیت میں شک پڑ گیا۔

وَخَلَادَعَہٗ اَکَاسَدَہٗ؛ خَادَعَ کے معنی گھاٹا دینے کے بھی ہیں نیز مفردات میں ہے اَلْخِدَاعُ اِنْزَالُ الْغَیْرِ عَمَّا هُوَ بِصَدَدِہٖ بِاَمْرٍ یُبْدِیْہِ عَلٰی خِلَافِ مَا یُخْفِیْہِ کسی کو اس کے اصل مقصود سے جس کے وُہ درپے ہو ایسے طریق سے ہٹا دینا کہ دل میں کچھ اور ہو اور ظاہر میں کچھ اور خداع کہلاتا ہے۔ لسان العرب میں ہے اَلْخَدْعُ اِظْهَارُ خِلَافِ مَا تُخْفِیْہِ جس بات کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اس کے خلاف بات کا اظہار کرنا خدع کہلاتا ہے وَجَازَ یُفَاعِلُ لِغَیْرِ اثْنَیْنِ لِاَنَّ ہٰذَا الْمِثَالَ یَقَعُ کَثِیْرًا فِی اللُّغَۃِ لِلْوَاحِدِ نَحْوُ عَاقَبْتُ اللِّصَّ اور خَادَعَ باب مفاعلہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ دونوں فریق نے بالمقابل ویسا ہی کام کیا لیکن بعض اوقات اس طرح بھی استعمال ہوتا ہے کہ اس سے صرف ایک شخص کے فعل پر دلالت ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں عَاقَبْتُ اللِّصَّ کہ میں نے چور کو سزا دی حالانکہ سزا صرف حاکم چور کو دیتا ہے۔ چور حاکم کو سزا نہیں دیتا۔ وَالْعَرَبُ تَقُوْلُ خَادَعْتُ فُلَانًا اِذَا کُنْتَ تَرُوْمُ خَدْعَہٗ اور خَادَعَ عرب ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جبکہ کوئی کسی کو دھوکا دینے کا قصد کرے۔ خواہ دوسرا شخص دھوکے میں آئے نہیں تاج العروس میں ہے کہ خدع کے ایک معنے روک لینے یا روک دینے کے بھی ہیں چنانچہ جب کہتے ہیں کَانَ فُلَانٌ کَرِیْمًا ثُمَّ خَدَعَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَمْسَكَ وَمَنَعَ کہ فلاں شخص بہت عطا کیا کرتا تھا پھر اس نے اپنے مال کو روک لیا اور اپنے نفس کو اس طرح خرچ کرنے سے باز رکھا۔ پھر ایک اور معنے کرتے ہوئے لکھا ہے سُوْقٌ خَادِعَۃٌ؛ اَیْ مُخْتَلِفَۃٌ مُتَلَوِّنَۃٌ تَقُوْمُ تَارَۃً وَتَکْسُدُ اُخْرٰی کہ جب کہیں بازار خادع ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کبھی بھاؤ بڑھ جاتا ہے کبھی گھٹ جاتا ہے۔ نیز اقرب میں ہے کہ جب کہیں خَادَعَ الْعَہْدَ تو اس کے معنے ترک کے ہوتے ہیں کہ اس نے عہد کو چھوڑ دیا۔ پس یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ کے معنے یہ ہوں گے (۱) کہ وُہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ دھوکا نہیں کھاتا۔ (۲) جو اُن کے دلوں میں بات ہے اس کے خلاف اظہار کر کے شک میں ڈالنا چاہتے ہیں (۳) وُہ خدا کے دین کے معاملہ میں فساد کرتے ہیں (۴) وُہ اللہ کو روکتے ہیں یعنی دین کی اشاعت میں روکیں ڈالتے ہیں۔[۵]

یَشْعُرُوْنَ:۔ شَعَرَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور شَعَرَ کے معنے ہیں عَلِمَ بِہٖ اس کو جانا۔ شَعَرَ لِکَذَا: فَطَنَ لَہٗ۔ اس کو خوب سمجھ لیا۔ عَقَلَہٗ۔ اس کو جان لیا۔ وَاَحَسَّ بِہٖ۔ اس کو محسوس کیا (اقرب) تاج العروس میں ہے اَلشِّعْرُ هُوَ الْعِلْمُ بِدَقَائِقِ الْاُمُوْرِ وَقِیْلَ هُوَ الْاِدْرَاكُ بِالْحَوَاسِّ کہ شعر علم کی وہ قسم ہے جس کے ذریعہ سے امور کی باریکیاں معلوم ہو سکیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حواس کے ذریعہ کسی امر کو معلوم کر لینا شِعْرٌ کہلاتا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ لَا یَشْعُرُوْنَ کی جگہ لَا یَعْقِلُوْنَ استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اکثر اوقات ایک چیز معقول تو ہوتی ہے لیکن محسوس نہیں ہوتی۔ شعور اور علم میں یہ فرق ہے کہ شعور ایک حس باطنی کے متعلق ہے جو بلا سامان ظاہری بھی اپنا کام کرتی ہے لیکن علم بیرونی چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ممکن ہے علم کا اثر قلب پر نہ ہو لیکن شعور کا بالضرور ہوتا ہے پس وَمَا یَشْعُرُوْنَ کے معنے ہونگے۔ وُہ سمجھتے نہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایمان وُہی کارآمد ہوتا ہے جو نیک نیتی اور اخلاص اور صداقت پر مبنی ہو جس ایمان میں اخلاص نہیں وُہ کسی کام کا نہیں کیونکہ وُہ تو دھوکا ہے اور خدا تعالیٰ جو عالم الغیب ہے وہ دھوکا کب کھا سکتا ہے۔

اس آیت پر بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں جن کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ وُہ اعتراض یہ ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کو کوئی دھوکا کب دے سکتا ہے (۲) اگر دھوکا دینے کے قصد کے معنے کئے جائیں تو اللہ تعالیٰ کو مان کر کوئی شخص اسے دھوکا دینے کا قصد ہی کب کر سکتا ہے (۳) اس جگہ یُخَادِعُوْنَ کے الفاظ ہیں اور خَادَعَ باب مفاعلہ سے ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اس فعل میں دونوں فریق شریک ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ منافق خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو دھوکا دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف دھوکے کی نسبت کرنا اس کی ہتک ہے۔ ان اعتراضات کا جواب علی الترتیب یہ ہے:۔

[۵] (۵) اللہ تعالیٰ سے مضطرب الا معاملہ کرتے ہیں۔ کبھی ٹھیک ہو جاتے ہیں کبھی بگڑ جاتے ہیں۔

(۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص دھوکا کب دے سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ (الف) اس جگہ خَادَعَ کا لفظ ہے خَدَعَ کا نہیں۔ اور خَادَعَ کے معنے عربی زبان میں دھوکا دینے کے نہیں بلکہ دھوکا دینے کا قصد کرنے کے ہیں خواہ دُوسرا دھوکا کھائے یا نہ کھائے۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے پس یہ اعتراض اس آیت پر نہیں پڑ سکتا کہ خدا تعالیٰ کو کوئی دھوکا کیونکر دے سکتا ہے (ب) اگر دھوکا دینے کے معنے بھی کئے جائیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ جو دھوکے کے مشابہ ہوتا ہے یعنی اس میں صداقت اور اخلاص نہیں ہوتا اور یہ امر مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بعض لوگ اپنے ایمان میں مخلص نہیں ہوتے۔ پس جب مشاہدہ اس امر کی تائید کرتا ہے تو اس پر اعتراض کیسا۔ آخر ایک منافق خواہ بظاہر مومن ہو اور کفار سے ملا جُلا ہے۔ یا بظاہر کافر ہو اور مسلمانوں سے ملا جُلا ہے وہ ایسا فعل کیوں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکی غرض یہی ہوتی ہے کہ بندوں کو دھوکا دے کر فائدہ اٹھائے مگر چونکہ ایمان کا معاملہ خدا تعالیٰ سے ہے اس لئے اس کے اس فعل کے معنے بہرصورت یہ ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ سے اخلاص کا معاملہ نہیں کر رہا اور جس طرح اخلاص کا تعلق اس سے رکھنا چاہیئے اس قسم کا تعلق نہیں رکھتا پس اس کی نیت خواہ بندوں کو دھوکا دینے کی ہو اگر اس کے عمل کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اور جب کسی انسان کا دل خراب ہو جائے تو اس سے اس قسم کے متضاد افعال کا صدور غیر ممکن نہیں ہوتا۔ باقی خدا تعالیٰ پر اس سے کوئی اعتراض نہیں آتا کیونکہ جیسا کہ اس فعل کے معنوں سے ثابت ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ خدا تعالیٰ بھی دھوکا کھا جاتا ہے بلکہ جیسا کہ اس آیت کے آخری حصہ میں وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ فرمایا ہے وہ خدا تعالیٰ کو دھوکا نہیں دیتے بلکہ اپنی جانوں کو دھوکا دیتے ہیں یعنی اس قسم کے نامناسب افعال سے سمجھتے تو یہ ہیں کہ ہم دُکھوں سے محفوظ ہو گئے ہیں حالانکہ وہ اس طرح خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو سہیڑ لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا مورد بن جاتے ہیں۔

خادع کا یہ استعمال عرب شعراء کے کلام میں بھی آتا ہے۔ جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے ؎ وَخَادَعْتُ الْمَنِيَّةَ عَنْكَ سِرًّا یعنی میں نے چھپکر تیری موت کو دھوکا دیا جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں نے موت کے اثر کو دُور کر دیا۔ اسی طرح اس جگہ خدا تعالیٰ کے احکام اور ذمہ واریوں کو ٹلانے کے لئے یہ لفظ استعمال ہُوا ہے اور منافقوں کے اس قسم کے فعل کو مجازاً خداع کہا گیا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر دھوکے کے قصد کے معنے کئے جائیں تو بھی درست نہیں کیونکہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کو دھوکا دینے کا قصد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ یہ اعتراض بھی درست نہیں کیونکہ اول تو ایک گروہ دنیا کا ایسا ہے بلکہ تمام فلسفی ہی اس گروہ میں شامل ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کے قائل نہیں بلکہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے جزئیات کا علم نہیں۔ قرآن کریم کے زمانہ نزول کے وقت بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ (حٰم سجدۃ ع ۳) یعنی تم وہ لوگ ہو کہ تم کو یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اکثر اعمال کو نہیں جانتا (یعنی اُسے کلیات کا علم ہے جزئیات کا علم نہیں) اور یہی تمہارا وہم جو تم نے اپنے رب کے متعلق غلط طور پر اپنے دلوں میں بٹھا لیا ہے تمہاری ہلاکت کا موجب ہو گیا ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے تمہیں اپنے اعمال کی اصلاح کا خیال نہیں رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ تم زیاں کار ہو گئے ہو۔ اسی طرح فرماتا ہے أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (ہود ع ۱) یعنی سُنو وہ یقیناً اپنے سینوں کو اس لئے موڑتے رہتے ہیں کہ اس سے چھپے رہیں۔ سنو جس وقت وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں تو اس وقت بھی جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں

اُسے سو جاننا ہوتا ہے وُہ یقیناً سینوں کی باتوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کے لوگ اگر ایسے افعال کریں کہ جن میں اللہ تعالیٰ سے اخلاص کی رُوح نہ پائی جائے تو یہ کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی نسبت جزئیات کے علم کے قائل نہیں اور دراصل اس عقیدہ کی بنی شرط نہیں بالعموم جو لوگ کمزور ایمان کے ہوتے ہیں وُہ خدا تعالیٰ کی صفات کا کامل علم نہ رکھنے کی وجہ سے ہی کمزور ہوتے ہیں اور جب صفاتِ الٰہیہ کا علم کامل نہ ہو تو ایسے متضاد اعتقادات اور اعمال کا صدور اُن سے ناممکن نہیں ہوتا چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ قیامت کو جب مشرک خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے تو اُن میں سے بعض اس سے یہ کہیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (انعام ع۳) یعنی ہمیں اللہ اپنے رب کی قسم کہ ہم مشرک نہ تھے۔ عربی کی مثل ہے کہ اَلْغَرِيْقُ يَتَشَبَّثُ بِالْحَشِيْشِ یعنی جو شخص غرق ہو رہا ہو وہ تنکے کے سہارے کو بھی نہیں چھوڑتا پس وہ کمزور ایمان والے جو مصائب اور مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے قسم قسم کے بہانوں سے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے۔ اس وقت انسانوں کے عذاب سے اپنے آپ کو بچاؤ جب خدا تعالیٰ سے معاملہ ہوگا تو ہم اس کی بخشش کے طالب ہوں گے اسی قسم کے غلط خیالات ہیں جن کی وجہ سے کسی شاعر نے کہہ دیا کہ ؎

مستحقِ شفاعت گناہ گار انند

خدا تعالیٰ کی بخشش آخر گنہگاروں کے ذریعہ سے ہی ظاہر ہوگی پس اگر ہم گناہ کرتے ہیں تو کیا ہوا ہم ہی لوگ تو اللہ تعالیٰ کی بخشش کو ظاہر کرنے والے ہوں گے۔ اس قسم کے خیالات اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے قصد کو ظاہر نہیں کرتے تو اور کیا ظاہر کرتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے اخلاص کا معاملہ اس کی صفات کے کامل علم سے ہوتا ہے جو لوگ اس علم سے محروم ہوتے ہیں وُہ اس قسم کے بیسیوں بہانے بنا کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں حالانکہ یہ تسلی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ کبوتر بلی کے حملہ کے وقت آنکھیں بند کر کے سمجھ لیتا ہے کہ وہ بلی کے حملہ سے محفوظ ہو گیا ہے۔

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ یہاں مُخَادَعَہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو دونوں فریق کے فعل میں شارکت پر دلالت کرتا ہے اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا بھی ان کو دھوکا دیتا ہے اور یہ امر خدا تعالیٰ کی شان سے بعید ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ (الف) باب مفاعلہ ہمیشہ دونوں کے فعل میں شریک ہونے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ کبھی صرف ایک شخص کے فعل پر دلالت کرتا ہے چنانچہ حل اللغات میں بتایا جا چکا ہے کہ عَاقَبْتُ اللِّصَّ کا محاورہ عربی میں ہے جس کے معنے یہ نہیں کہ میں نے یعنی قاضی نے چور کو سزا دی اور چور نے مجھ کو سزا دی بلکہ صرف یہ معنے ہوتے ہیں کہ میں نے چور کو سزا دی پس يُخٰدِعُوْنَ کے معنوں میں خدا تعالیٰ کی شارکت ثابت نہیں بلکہ صرف اس قدر مفہوم ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں (ب) دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کبھی جرم کا لفظ جزا کے اظہار کے لئے دہرا دیا جاتا ہے پس اس جملہ کی تشریح یوں ہوگی کہ اَلْمُنٰفِقُوْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَاللّٰهُ يُخٰدِعُهُمْ اور اللہ تعالیٰ کے متعلق جو يُخٰدِعُهُمْ کا لفظ آئے گا اس کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ وُہ ان کو دھوکا دیتا ہے بلکہ یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دھوکے کی سزا دیتا ہے یہ محاورہ جیسا کہ نوٹ ۳ سورۃ ہذا میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ آتا ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ ع۴) یعنی بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے چونکہ بدی کا بدلہ بدی نہیں ہوتا اس لئے اس کے یہ معنے ہیں کہ بدی کا بدلہ اسی قدر جزا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (بقرہ ع۲۴) اس پر اسی قدر زیادتی کرو جس قدر کہ اُس نے تم پر زیادتی کی تھی ظاہر ہے کہ زیادتی اور ظلم کا اسی قدر بدلہ ظلم نہیں کہلا سکتا۔ پس یہاں بھی فَاعْتَدُوْا کے معنے اسی قدر سزا کے ہیں۔

عربی زبان میں بھی یہ محاورہ کثرت سے استعمال ہوتا ہے چنانچہ اقرب الموارد میں جو عربی لغت کی کتاب ہے لکھا ہے کہ عربی کا محاورہ ہے حَسَدَنِي اللّٰهُ إِنْ كُنْتُ أَحْسُدُكَ یعنی

اگر میں تجھ سے حسد رکھتا ہوں تو اللہ تعالےٰ مجھ سے حسد کرے اور اس کے معنے یہ لکھے ہیں عَاقَبَنِیْ عَلَی الْحَسَدِ یعنی اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اللہ مجھ سے حسد کرے (کیونکہ اللہ تو حسد کر ہی نہیں سکتا) بلکہ یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالےٰ مجھے میرے حسد کرنے کی سزا دے پھر آگے لکھا ہے وَھُوَ مِنْ بَابِ الْمُشَاکَلَۃِ اور یہ استعمال مشاکلہ کی قسم سے ہے یعنی اس جگہ جرم کے لفظ کو سزا کے معنوں کے اظہار کے لئے استعمال کر لیا گیا ہے اور جرم کی مانند لفظ کو دُہرا دیا گیا ہے۔ عرب شعراء نے بھی اس محاورہ کو استعمال کیا ہے عمرو بن کلثوم کہتا ہے ؎

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا ✦ فَنَجْھَلَ فَوْقَ جَھْلِ الْجَاھِلِیْنَا

سنو ہم سے کوئی شخص جہالت کا معاملہ نہ کرے ورنہ ہم جاہلوں سے زیادہ جہالت کا معاملہ کریں گے۔ مطلب یہ کہ ہم طاقتور ہیں جو ہم پر حملہ کرے گا یہ اس کی حماقت ہوگی ہم اس کی حماقت کی اُسے سزا دیں گے کیونکہ کمزور کا طاقتور پر حملہ جہالت کہلا سکتا ہے طاقتور کا جواب حماقت نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح ابو الغول الطہوی کہتا ہے ؎

فَنَکَّبَ عَنْھُمْ دَرْءَ الْاَعَادِیْ ۔ وَدَاوَوْا بِالْجُنُوْنِ مِنَ الْجُنُوْنِ

یعنی انہوں نے اپنی قوم سے دشمن کے حملہ کو دُور کیا اور جنون کا علاج جنون سے کیا۔ اس جگہ بھی حملہ آور کے جنون سے مراد اس کا کمزور ہو کر طاقتور پر حملہ کرنا ہے پس طاقتور کا جواب جنون نہیں کہلا سکتا اس کے معنے محض جزاء کے ہیں۔

غرض اگر باب مفاعلہ کے اصلی معنوں کو قائم رکھا جائے تب بھی اس آیت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت خَدَعَ کے لفظ کے معنے بسبب اس کے کہ یہ لفظ ایک جُرم کے جواب میں استعمال ہوا ہے صرف یہ ہوں گے کہ وہ ان کے دھوکے کی سزا دیگا۔ سورۂ نساء میں جو یہ الفاظ ہیں کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ (نساء ع ۲۱) اس کے بھی یہی معنے ہیں کہ منافق خدا تعالےٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر وہ ان کے اس بدعمل کی ان کو سزا دیگا۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اللہ کو چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ اقرب میں لکھا ہے خَادَعَ الْحَمْدَ: تَرَکَہٗ یعنی جب خَادَعَ الْحَمْدَ کا محاورہ بولیں تو اس کے معنے ہوں گے اس نے حمد کو چھوڑ دیا۔

غرض اس آیت سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اللہ تعالےٰ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہے یہ تعلیم تو قرآن کریم کی صریح آیات کے خلاف ہے اور محض عناد سے ایسا خیال اس آیت کے متعلق کر لیا گیا ہے ورنہ قرآن کریم کے رو سے تو اللہ تعالیٰ ہر پوشیدہ سے پوشیدہ بات کو جانتا ہے۔ اور اس تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اللہ تعالےٰ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے ایک ظلم عظیم ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق ع ۲) کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے دلی خیالات تک سے واقف ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔ اور فرماتا ہے اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (انفال ع ۶) کہ اللہ تعالیٰ سینوں تک کی باتوں سے واقف ہے۔ اور فرماتا ہے عَالِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (سباء ع ۱) کہ اللہ تعالےٰ عالم الغیب ہے اور ذرہ بھر آسمانوں اور زمین کی چیزوں میں سے اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور ذرہ سے چھوٹی اور ذرہ سے بڑی جتنی چیزیں بھی ہیں سب اس کو معلوم ہیں۔ اور فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (مجادلہ ع ۲) کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا کو سب معلوم ہے کبھی تین شخصوں کا مشورہ نہیں ہوتا مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ کہیں پانچ کا مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ مگر وہ جہاں ہوں خدا ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ پھر جو جو کام یہ کرتے ہیں

یخادعون اللہ کا مطلب اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کا قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔

قیامت کے دن ایک ایک کرکے ان کو بتائیگا بیشک خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ پھر فرماتا ہے یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (مومن ع۲) وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور جو باتیں سینوں میں پوشیدہ ہیں انکو بھی۔ قرآن کی ایسی تعلیم کی موجودگی میں کسی کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کا خدا دھوکا میں آجاتا ہے یا اس پر کسی شخص کا داؤ فریب چل جاتا ہے ایک صریح ظلم ہے۔

خلاصہ یہ کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ کے معنے اس جگہ یہ ہیں کہ (۱) وہ خدا تعالےٰ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جو دھوکے کے مشابہ ہے (۲) وُہ خدا تعالےٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ دھوکا میں نہیں آسکتا (۳) وُہ خدا تعالےٰ سے دھوکے کا معاملہ کرتے ہیں اس لئے خدا تعالےٰ اُن کے غیر مخلصانہ افعال کی سزا دے گا۔ (۴) وُہ خدا تعالےٰ کو چھوڑ رہے ہیں۔

(۵) حل لغات میں ایک اور محاورہ بھی لکھا گیا ہے۔ کہ عرب کہتے ہیں سُوْقٌ خَادِعَةٌ بازار دھوکا دے رہا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ منڈی کے بھاؤ ایک رنگ میں نہیں چل رہے بلکہ کبھی یکدم بڑھ جاتے ہیں کبھی یکدم گھٹ جاتے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ منافقوں کا معاملہ خدا تعالےٰ سے اخلاص کا نہیں ہے کبھی وہ مومنوں کے رُعب میں آکر اچھے کام کرنے لگ جاتے ہیں اور کبھی کفار کے اثر کے نیچے دین کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

(۶) ایک معنے خِدَاع کے فساد کے بھی حل لغات میں لکھے جا چکے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وُہ خدا تعالےٰ سے فساد کا معاملہ کرتے ہیں یعنی ان کے کاموں میں اخلاص نہیں ہے۔

(۷) ایک معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرنے سے مراد یہ ہو کہ وُہ خدا تعالےٰ کے رسول اور مومنوں سے دھوکے کا معاملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کا محاورہ قرآن کریم میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح ع۱) یعنی جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وُہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں بیعت کے وقت خدا تعالےٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں رسول کی بیعت کو خدا تعالےٰ کی بیعت قرار دیا ہے اسی طرح ایک دوسری جگہ فرماتا ہے فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (انعام ع۴) کیونکہ وہ تیری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ تعالیٰ کے نشانات کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان دونوں آیات میں رسول کے ساتھ ہونے والے ایک فعل کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں رسول سے ہونیوالے ایک فعل کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں بھی اسی طرح کلام کو استعمال کیا گیا ہے اور وُہ یہ ہے عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ قَالَ یَارَبِّ كَیْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَهٗ لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَهٗ یَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ یَارَبِّ كَیْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَیْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ یَارَبِّ كَیْفَ اَسْقِیْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَیْتَهٗ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ (مسلم جزء رابع کتاب البر والصلة والآداب باب فضل عیادة المریض) یعنی حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالےٰ قیامت کے دن فرمائیگا اے آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا اور تونے میری عیادت نہیں کی۔ وُہ کہیگا اے میرے رب میں تیری عیادت کس طرح کر سکتا ہوں حالانکہ تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالےٰ فرمائیگا کیا تجھے یہ علم نہیں ہوا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے مگر تُو نے

اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اگر تو میرے اس بندے کی عیادت کو جاتا تو تُو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائیگا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ کہیگا اے میرے رب میں تجھے کس طرح کھانا کھلا سکتا ہوں حالانکہ تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائیگا کیا تجھے یہ علم نہیں ہوا تھا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے اُسے کھانا نہیں دیا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تُو اُسے کھانا کھلا دیتا تو تُو اُسے میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہیگا اے میرے رب میں تجھے پانی کس طرح پلا سکتا ہوں حالانکہ تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائیگا تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا مگر تو نے اُسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تُو اُسے پانی پلا دیتا تو تُو اُسے میرے پاس پاتا یعنی تیرا یہ پانی مجھے پہنچتا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے معاملہ کو اپنے ساتھ معاملہ قرار دیتا ہے۔ پس جس طرح بندوں کو کھانا نہ کھلانا خدا تعالیٰ کو کھانا نہ کھلانا اور بندوں کی عیادت نہ کرنے کے معنے خدا تعالیٰ کی عیادت نہ کرنا اور بندوں کو پانی نہ پلانا خدا تعالیٰ کو پانی نہ پلانا ہو سکتے ہیں اسی طرح اس کے بندوں کو دھوکا دینا خدا کو دھوکا دینا کہلا سکتا ہے۔ اس طریق کلام کو انجیل میں بھی استعمال کیا گیا ہے چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ مسیح کی آمد ثانی کے موقع پر سب قومیں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی اور وُہ مومنوں سے کہیگا کہ خدا تعالیٰ کی میراث حاصل کرو کیونکہ "میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری عیادت کی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ اس وقت راستباز اُسے جواب میں کہینگے اے خداوند! کب ہم نے تجھے بھوکا دیکھا اور کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھا اور پانی پلایا۔ کب ہم نے تجھے پردیسی دیکھا اور اپنے گھر میں اُتارا۔ یا ننگا دیکھا اور کپڑا پہنایا۔ ہم کب تجھے بیمار یا قیدی دیکھ کر تجھ پاس آئے۔ تب بادشاہ اُن سے جواب میں کہیگا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے اِن سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ یہ کیا تو میرے ساتھ کیا۔" (متی باب ۲۵ آیت ۳۵ تا ۴۰)

گو انجیل کے ناقلوں نے خدا تعالیٰ کی جگہ مسیح کو رکھ کر اس لطیف پیرایہ کو بھونڈا بنا دیا ہے مگر اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی کے مقرب یا پیارے سے سلوک کرنا خود اسی سے سلوک کہلا سکتا ہے اور اسی لطیف استعارہ کو یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ میں استعمال کیا گیا ہے۔

وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ کا مطلب۔

وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ میں اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ منافقوں کے غیر مخلصانہ افعال خود اُن کے لئے وبال بن جائیں گے۔ کیونکہ جو شخص دھوکے سے کام لیتا ہے آخر اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں ذلیل ہوتا ہے پس جبکہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں دوسروں کو دھوکا دے رہا ہوں وہ درحقیقت اپنے نفس کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے اور خود اپنی تباہی کے سامان کر رہا ہوتا ہے۔

وَمَا یَشْعُرُوْنَ کی تشریح

وَمَا یَشْعُرُوْنَ اور وہ سمجھتے نہیں۔ شعور کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے باریک امور کے جاننے کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کے مشابہ الفاظ علم، عرفان، عقل اور فکر کے استعمال ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ الفاظ مشابہ ہیں لیکن ان سب الفاظ کے معانی ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ جیسا کہ عربی زبان کے ماہروں نے لکھا ہے دراصل عربی زبان میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو دوسرے لفظ کا کلی طور پر ہم معنی ہو بلکہ ہر لفظ مختلف اور زائد معنے دیتا ہے۔ چنانچہ علم اس قسم کے جاننے کیلئے آتا ہے جو باہر سے پیدا ہو یعنی سُن کر یا دیکھ کر یا چھو کر یا چکھ کر پیدا ہو مثلاً کسی شخص کو ایک میٹھی چیز کا چکھ کر جس ذائقہ کا پتہ چلتا ہے وُہ علم کہلا سکتا ہے شعور یا عرفان نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح عرفان اس علم کو کہتے ہیں جو دوبارہ حاصل ہو کیونکہ عرفان پہچاننے کو کہتے ہیں اور پہچانتا انسان اُس شئے کو ہے جس کا علم اُسے پہلے حاصل ہو چکا ہو۔ ایک شخص کو پہچاننے کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے اُسے پہلے دیکھا ہوا تھا دوبارہ دیکھ کر ہمارا وہ سابق علم تازہ ہو گیا اور ہم نے اس علم کے متعلق غلطی نہیں کی۔ روحانی علوم کو بھی لئے

عرفان کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے کلام کے ذریعہ سے یا فطرت صحیحہ کے ذریعہ سے جو روحانی امور ہمیں معلوم تھے ہم نے ان کا جب مشاہدہ کیا تو پہچان لیا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا علم کلام الٰہی یا فطرت صحیحہ کے ذریعہ سے ہم کو حاصل ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے عارف اُسے کہتے ہیں کہ اس نے خدا تعالےٰ کی صفات کا جن کا علم اُسے کتاب الٰہیہ کے ذریعہ سے حاصل ہو چکا تھا مشاہدہ کر لیا اور سمجھ لیا کہ یہ وہی صفات ہیں جن کو اس نے کلام الٰہی میں پڑھا تھا۔ عقل اس قوت کو کہتے ہیں کہ جو انسان کو علم، فکر اور شعور کے مطابق کام کرنے کی توفیق بخشتی ہے اور عاقل وہ ہے جو علم صحیح، فکر صحیح اور شعور صحیح کے مطابق کام کرے اور اپنے نفس کو ان کے خلاف چلنے سے روکے۔ فکر اس قوت کا نام ہے جو بیرونی علم سے نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آیت یخادعون اللہ الخ میں صرف ظاہری طور پر مسلمانوں سے ملنے والے لوگوں کا ذکر۔

اور مفکر اُسے کہتے ہیں کہ جو اس بسیط علم کو جو اُسے حاصل ہو چکا جوڑ کر اور ملا کر ایک نیا نتیجہ پیدا کرے۔ جو محض بسیط علم سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور شعور اس حس کو کہتے ہیں جو اندر سے پیدا ہوتی ہے اور فطرت صحیحہ کو معلوم کرنے کا نام ہے۔ پس شعور کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جب انسان اپنی اندرونی طاقتوں کو محسوس کرنے لگتا ہے اور ان جبلی طاقتوں کو محسوس کر کے اپنے لئے نیک راہ تجویز کرنے لگتا ہے کہ جو خدا تعالےٰ نے اس کے اندر پیدا کی تھیں۔ چنانچہ بالوں کو اَشْعَارٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اندر سے باہر کی طرف اگتے ہیں۔ اسی طرح شِعَارٌ اس لباس کو کہتے ہیں کہ جو دوسرے کپڑوں کے نیچے ہو اور جسم سے لگا ہُوا ہو۔ شِعَار درخت کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے باہر نکلتا ہے۔ اور شِعَارٌ اس اشارہ کو بھی کہتے ہیں کہ جو فوجیں باہم مقرر کر لیتی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے سپاہیوں کو اپنا مطلب سمجھا سکیں۔ اور اسے یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتا ہے اور باہمی راز کو ظاہر کرتا ہے اسے انگریزی میں (Watch [illegible] یا Pass word) کہتے ہیں شِعر کو بھی شعر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اندرونی جذبات کو بیان کرتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے ارادے کو ظاہر کرنیوالے امور کو بھی شَعَائِر کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کے منشاء کا پتہ چلتا ہے اور اس کی صفات کا ظہور ان کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مَشَاعِر باطنی حواس کو کہتے ہیں پس شعور وہ مخفی حِس ہے جو انسان کو اس کے اندرونی قویٰ کا علم دیتی ہے اور اس کا تعلق بیرونی علم سے نہیں۔ پس وَمَا یَشْعُرُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ دھوکا دینا ایک ایسا فعل ہے جس کے خلاف فطرت صحیحہ گواہی دیتی ہے مگر یہ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے مذہب کو تو کیا سمجھنا ہے خود اپنے نفس کو بھی نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ منافقت ان افعال قبیحہ میں سے ہے کہ جن کو فطرت صحیحہ بھی رد کرتی ہے اور کسی دوسرے شخص کے بتانے کی بھی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس آیت میں ان مسلمان کہلانے والے لوگوں کا ذکر ہے جو دل سے مسلمان نہ تھے اور صرف ظاہری طور پر مسلمانوں سے مل گئے تھے۔ یہ لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے جب مدینہ کے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا تو یہ لوگ بھی دیکھا دیکھی اسلام پر پورا غور کئے بغیر مسلمان ہو گئے مگر جب اسلام میں داخل ہونے کی شرائط پر غور کیا اُس میں داخل ہو کر جو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں انہیں دیکھا تو اسلام میں ترقی نہ کر سکے بلکہ آہستہ آہستہ اس سے دُور ہو گئے لیکن اپنی قوم کی وجہ سے ظاہراً اسلام کو ترک بھی نہ کر سکے۔ اس گروہ کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (توبہ ع ۸) یعنی جب منافق لوگ شرارتیں کرتے ہیں اور انہیں اس پر گرفت ہوتی ہے تو وہ عذر کرنے اور بہانے بنانے لگ جاتے ہیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے عذر نہ کرو کیونکہ عذر بے فائدہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ تم

پہلے تو سچا ایمان لے آئے تھے بعد میں پھر کفر میں چلے گئے اگر ہم تم میں سے بعض کو اپنی خاص مصلحت کے ماتحت معاف کرتے رہیں گے تو بعض کو حسب موقعہ سزا بھی دیتے رہیں گے کیونکہ وہ مجرم ہیں۔ منافق مرد بھی اور منافق عورتیں بھی آپس میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا شغل یہ ہے کہ جن امور سے اسلام روکتا ہے وہ ان کے کرنے کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں اور جن باتوں کی اسلام تحریک کرتا ہے وہ ان کے نہ کرنے کی ایک دوسرے کو ہدایت کرتے رہتے ہیں اور اسلام کی مدد سے ہاتھ کھینچے رکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے پس خدا تعالیٰ نے ان کو چھوڑ دیا ہے یقیناً منافق ہی اطاعت سے باہر نکلنے والے ہیں (ورنہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو آپ نہیں چھوڑتا)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ پہلے تو اسلام میں داخل ہو گئے تھے پھر بعد میں اُن کے دلوں سے اسلام نکل گیا۔ اس گروہ میں کچھ مرد بھی شامل تھے اور کچھ عورتیں بھی۔ یہ لوگ اسلام پر اعتراض کرتے رہتے تھے لیکن کھلی کھلی مخالفت کی جرأت بھی نہ رکھتے تھے پوشیدہ مخالفت کرتے تھے۔ جب اسلام کی مدد کا وقت آتا پیچھے ہٹ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اُن کے دل میں نہ تھی دنیا کی محبت میں مبتلا تھے اس لئے خدا تعالیٰ کی نصرت بھی جاتی رہی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب مدینہ والوں کو اسلام کی خبر ہوئی اور ایک حج کے موقعہ پر کچھ اہل مدینہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کی صداقت کے قائل ہو گئے تو انہوں نے واپس جا کر اپنی قوم سے ذکر کیا کہ جس رسول کی آمد کا مدینہ میں رہنے والے یہودی ذکر کیا کرتے تھے وہ مکہ میں پیدا ہو گیا ہے اس پر اُن کے دلوں میں رسول کریمؐ کی طرف رغبت پیدا ہو گئی اور انہوں نے دوسرے حج پر ایک وفد بنا کر آپ کی طرف بھجوایا۔ اس وفد نے جب آپ سے تبادلہ خیالات کیا تو آپ پر ایمان لے آیا اور آپ کی بیعت کر لی۔ چونکہ اس وقت مکہ میں آپؐ کی شدید مخالفت تھی یہ ملاقات ایک وادی میں مکہ والوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوئی اور وہیں بیعت بھی ہوئی۔ اس لئے اسے بیعتِ عقبہ کہتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مدینہ کے مومنوں کی تنظیم کے لئے افسر مقرر کیا اور اسلام کی اشاعت کی تاکید کی اور ان کی امداد کے لئے اپنے ایک نوجوان صحابی مصعب ابن عمیر کو بھجوایا تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو دین سکھائیں (سیرت ابن ہشام جلد اول)

آنحضرت صلعم پر اہل مدینہ کا ایمان لانا

یہ لوگ جاتے ہوئے آنحضرت صلعم کو یہ دعوت بھی دے گئے کہ اگر مکہ چھوڑنا پڑے تو آپ مدینہ تشریف لے چلیں جب یہ لوگ واپس گئے تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدینے کے لوگوں میں اسلام پھیل گیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ اور صحابہ کو مدینہ بھجوا دیا جن میں حضرت عمرؓ بھی تھے (سیرت ابن ہشام جلد دوم) اس کے بعد ہجرت کا حکم ملنے پر آپ خود وہاں تشریف لے گئے اور آپؐ کے جاتے ہی بہت تھوڑے عرصہ میں وہ سب اہلِ مدینہ جو مشرک تھے مسلمان ہو گئے۔

مدینہ میں اسلام کے پھیلنے سے پہلے مدینہ کی حالت۔

اسلام کے مدینہ میں پھیلنے سے پہلے مدینہ کی یہ حالت تھی کہ اس میں دو عرب قبیلے بستے تھے جن کا نام اَوس اور خزرج تھا اور تین یہودی قبیلے بستے تھے جن کا نام بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع تھا۔ یہودی گو مالدار تھے اور علوم دنیوی سے آراستہ لیکن تھے اقلیت میں۔ اور ارد گرد کی عرب آبادی کو ملا کر اور بھی کمزور ہو جاتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے مدینہ میں دنیوی سیاست کا جال پھیلا رکھا تھا اور "اختلاف پیدا کرا اور حکومت کر" کی سیاسی چال پر عمل پیرا تھے۔ آئے دن اَوس اور خزرج میں لڑائیاں کرواتے رہتے تھے اور مدینہ کے امن کو خراب کرتے رہتے تھے۔ اسلام کے مدینہ میں آنے کے قریب زمانہ میں مدینہ کے لوگوں کو اس حالت کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا۔ آخر بعض لوگوں نے یہ تجویز کی کہ اس فتنہ کے سدِ باب کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مدینہ میں ایک منتظم حکومت قائم کی جائے اور اپنے میں سے کسی شخص کو بادشاہ تجویز کر لیا جائے۔ یہ خیال زور پکڑ گیا اور مدینہ کے مشرک لوگ ایک بادشاہ کے انتخاب پر متفق ہو گئے آخر ایک

مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

ایک بیماری تھی پھر اللہ نے ان کی بیماری کو (اور بھی) بڑھا دیا - اور انہیں ان کے جھوٹ

اَلِيْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

بولنے کے سبب سے (ایک) دردناک عذاب پہنچ رہا ہے - ۱۱ اور جب اُن سے کہا جائے

شخص عبداللہ ابن اُبَی ابن سلول پر جو خزرج قبیلہ کا ایک رئیس تھا سب کا اتفاق ہوا - عام رواج کے مطابق اس کے لئے ایک تاج بنوانے کا بھی فیصلہ ہوا مگر ابھی تاج بنوانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ان تک اسلام کی آواز پہنچ گئی اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی مشکلات کا علاج اسلام ہے نہ کہ بادشاہت - اور وہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے آخرکار مسلمان ہو گئے - قوم کا شدید اخلاص اسلام کی طرف دیکھکر عبداللہ بن اُبَی بن سلول اور اس کے ساتھی بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس وقت یہ خیال نہیں آیا کہ اسلام کی حکومت کے قیام سے ان کی حکومت بالکل جاتی رہیگی - لیکن اسلامی نظام قائم ہوا تو ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ کسی خاص دنیوی وقار کی تمنا ایک خواب پریشان ہو چکی ہے - چنانچہ اس احساس کے بعد جو خفیف سا لگاؤ بھی اسلام سے تھا جاتا رہا اور اسلام کی مخالفت دل میں پیدا ہو گئی - مگر ادھر قوم کی بڑی اکثریت اسلام کی شیدا ہو چکی تھی اس وجہ سے ظاہر میں یہ لوگ اسلام سے باہر بھی نہ نکل سکتے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہر میں تو یہ لوگ مسلمان بنے رہے مگر اندر ہی اندر ریشہ دوانیاں شروع کیں - ابتدا میں تو سابق عادت کے مطابق یہود سے مخفی دوستی گانٹھ کر اسلام کو نقصان پہنچانے کی تجویزوں میں مشغول ہوئے اور کفارِ مکہ سے تعلق پیدا نہ کیا کیونکہ قومی تعصبات کی وجہ سے وہاں سے تعلق پیدا کرنے کو پسند نہ کرتے تھے حتیٰ کہ اُحد کی جنگ کے موقعہ پر یہ منافقین کفارِ مکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام سے ناراض ہو کر راستہ میں سے واپس لوٹ آئے (سیرت ابن ہشام جلد دوم) اس کے بعد یہود کی انگیخت کی وجہ

سے اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متأثر ہو کر انہوں نے اپنے پُرانے قومی تعصب کو بھی بُھلا دیا اور کفارِ مکہ سے بھی سازباز شروع کر دی مگر پھر بھی ظاہری تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے ان کے سردار مختلف جنگوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاتے رہتے تھے گو ہمیشہ مسلمانوں کو باہم لڑوانے کے منصوبے کرتے رہتے تھے -

قرآن کریم کے متعدد مقامات پر ان منافقوں کا ذکر آتا ہے - ان کی آخری شرارت [illegible] تھی جو انہوں نے فتح مکہ کے بعد کفارِ مکہ کی طاقت سے مایوس ہو کر قیصر کی حکومت سے سازباز کر کے کرنی چاہی اسی کے نتیجہ میں غزوۂ تبوک کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جانا پڑا - آخر اس میں بھی ان کو مایوسی ہوئی اور شاید اسی صدمہ سے عبداللہ بن اُبَی بن سلول تبوک کے واقعہ کے دو ماہ بعد مر گیا اور اس پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا اور کچھ لوگ تو سچے دل سے مسلمانوں میں شامل ہو گئے اور باقی گمنامی میں ہلاک ہو گئے -

۱۱ حل لغات - قُلُوْبِهِمْ :- قلوب قلب کی جمع ہے اس کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵ - ۵

مَرَضٌ :- اَلْمَرَضُ كُلُّ مَا خَرَجَ بِالْاِنْسَانِ عَنْ حَدِّ الصِّحَّةِ مِنْ عِلَّةٍ وَّنِفَاقٍ وَّشَكٍّ وَّظُلْمَةٍ وَّ نُقْصَانٍ وَّتَقْصِيْرٍ فِيْ اَمْرٍ - یعنی ہر وہ امر جو انسان کو حدِ صحت سے نکال دے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق یا شک یا فساد یا ظلمت یا کسی چیز میں کمی اور کوتاہی ہو - وہ مرض کہلاتا ہے (اقرب) مفردات میں مرض کے معنے کیئے گئے ہیں کہ ہر وہ چیز جو انسان کو صحت کی حد سے باہر نکال دے - اور اس کی دو اقسام ہیں -

۱ مدینہ کے بعض لوگوں کے منافقت اختیار کرنے کی وجہ -

۲ منافقین کا مقصد اور ان کا انجام

۳ قلوبهم

۴ مرض

اوّل جسمانی مرض۔ دوسرے جُملہ بُری عادات جیسے جہالت۔ بُزدلی بخل۔ نفاق وغیرہ اور نفاق اور کفر اور ایسی ہی اور بُری باتوں کو مرض کے ساتھ اس واسطے تشبیہہ دی جاتی ہے (۱) کہ جس طرح ظاہری مرض بدن کو پوری طرح سے کام کرنے سے روک دیتا ہے اسی طرح کفر اور نفاق اور دیگر رذائل فضائل کو پانے سے روک دیتے ہیں (۲) یا اس لئے کہ جو ایسی باتوں کا شکار ہو اُسے اخروی زندگی حاصل نہیں ہو سکتی (۳) یا جس طرح مریض آدمی کا بدن مضر اشیاء کی طرف مائل ہوتا ہے اسی طرح ایسی باتوں میں پھنسے ہوئے انسان کا میلان اعتقادات ردّیہ کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ سب اشیاء مرض کی صورت میں شمار کی جاتی ہیں۔ تو گویا اس شخص کو جو ان باتوں میں گرفتار ہو مریض قرار دیا گیا۔ (مفردات)

عَذَابٌ:۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵

اَلِیْمٌ:۔ کے معنے ہیں اَلْمُوْجِعُ: دکھ دینے والا (اقرب) عَذَابٌ اَلِیْمٌ اَیْ مُؤْلِمٌ یعنی تکلیف دِہ عذاب (مفردات)

یَکْذِبُوْنَ:۔ کَذَبَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور کَذَبَ کے معنے ہیں اَخْبَرَ عَنِ الشَّیْءِ بِخِلَافِ مَا هُوَ مَعَ الْعِلْمِ بِهٖ ضِدُّ صَدَقَ۔ کسی چیز کے متعلق اپنے علم کے خلاف خبر دینا کذب کہلاتا ہے اور یہ لفظ صدق کے مقابل پر بولا جاتا ہے۔ وَسَوَاءٌ فِیْهِ الْعَمَدُ وَالْخَطَاءُ خواہ جان بوجھ کر جھوٹ بولا گیا ہو یا نادانستہ غلط بات بیان کر دی ہو۔ دونوں کے لئے کذب کا لفظ بولیں گے (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ کا ترجمہ اُن کے جھوٹ بولنے کے سبب سے کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مَا مصدریہ ہے اور اپنے بعد کے فعل کے معنی کو مصدری معنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان کا فطرت صحیحہ کے مطابق کام نہ کرنا بتاتا ہے کہ ان کے دل مریض ہیں کیونکہ اگر دل میں مرض نہ ہوتا تو کم سے کم یہ ان باتوں کو تو محسوس کرتے جو فطرت صحیحہ سے پیدا ہوتی ہیں جس طرح صفراء کی زیادتی سے زبان کا مزہ خراب ہو جاتا ہے اور میٹھا بھی کڑوا معلوم دیتا ہے اسی طرح جن کے دل مریض ہوں وہ اپنی فطرت کی آواز کو صحیح طور پر نہیں سُن سکتے۔

اس آیت میں بیماری سے مراد نفاق کی بیماری ہے جیسے رکوع کے شروع میں روحانی طور پر تندرست لوگوں کا ذکر تھا پھر کفر کے بیماروں کا ذکر ہوا اب اس آیت میں نفاق کی بیماری کا ذکر کیا گیا ہے۔

منافق کی علامات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی بیماری کی مندرجہ ذیل علامات بتائی ہیں اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (بخاری کتاب المظالم وکتاب الشہادات) یعنی جب منافق بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھائیں تو وہ خیانت کرتا ہے اور جب معاہدہ کرے تو اُسے توڑ دیتا ہے اور جب جھگڑا ہو تو گالیوں پر اُتر آتا ہے۔

یہ علامات منافقت کا لازمہ ہیں کیونکہ منافق چونکہ اپنے نفاق کو چھپانا چاہتا ہے اس کا ذریعہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ اگر اس پر کوئی الزام لگے اور اس کے عیب کو ظاہر کرے تو وہ جھوٹ بولے اور اس سے لڑ پڑے اور گالیوں پر اُتر آئے تاکہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف پھر جائے۔ اسی طرح اُسے جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت رہتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے اندرونہ کو چھپا نہیں سکتا۔ وعدہ خلافی اور عہد کو توڑنا بھی اس کے خواص میں ہونا لازمی ہے کیونکہ منافق وہی ہوتا ہے جو ایک قوم سے بظاہر تعلق رکھ کر در اصل اس سے بگاڑ رکھے۔ امانت میں خیانت بھی اس کا ضروری خاصہ ہوتا ہے کیونکہ اپنے قومی راز غیروں کو بتائے بغیر وہ ان میں مقبول نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں بیماری کا بڑھانا اللہ تعالےٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ اسی کے احکام اور قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے اور لوگوں کے اعمال پر نیک و بد نتائج بھی وہی مرتب فرماتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کو کسی کی بیماری کے بڑھانے کے لئے نازل نہیں فرمایا بلکہ لوگوں کی بیماری کے دور کرنے کیلئے بھیجا ہے چنانچہ فرماتا ہے یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○

(کہ) زمین میں فساد نہ کرو - تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ۱۲؎

مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یونس ع ۶)
یعنی اے لوگو تمہارے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو دل پر اثر کرنیوالی نصائح پر مشتمل ہے اور سینہ کی سب بیماریوں کیلئے شفاء ہے
یہ مرض جس کا اس آیت میں ذکر ہے قوت فیصلہ کا نہ ہونا بزدلی اور نفاق ہے جیساکہ اللہ تعالےٰ دوسری جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (توبہ ع) یعنی اللہ تعالےٰ نے ان کی وعدہ خلافی اور جھوٹ کا یہ انجام دکھایا کہ اُن کے دلوں میں نفاق پیدا ہوگیا۔
(۲) اللہ تعالےٰ کے مرض بڑھا دینے سے ایک یہ مراد ہے کہ اللہ تعالےٰ جوں جوں مسلمانوں کو ترقی دیتا اور اُن کی طاقت بڑھاتا گیا منافقوں کو اپنے دلی عقیدے کے خلاف ان کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کی وجہ سے اور زیادہ نفاق سے کام لینا پڑا۔ حالانکہ در اصل اسلام کی شوکت اُن کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ (آل عمران ع ۱۲)
اگر تمہیں کوئی آرام پہنچتا ہے تو ان (منافقوں) کو تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے شریعت اسلامی آہستہ آہستہ نازل ہوئی پس جوں جوں احکام اور مسائل بڑھتے گئے منافقوں کا نفاق بھی بڑھتا چلا جاتا تھا اور ان کی جان اور گھبراہٹ اور بزدلی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ (سورہ محمد ع ۳) یعنی جب کوئی محکم آیات نازل ہوتی ہیں اور ان میں لڑائی کا ذکر ہوتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کہ کسی پر موت کی غشی طاری ہو۔
پہلی آیات میں کفار کی نسبت فرمایا تھا وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ اس آیت میں منافقوں کی نسبت فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ کافر کو خواہ کس قدر عذاب ملتا ہو وہ مقابلہ کر کے اپنے دل کا بخار نکال لیتا ہے اور اس طرح بدلہ لینے سے جو انسان کو تسلی ہوتی ہے وہ اُسے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر منافق بدبخت چونکہ اپنے اندرونہ کو چھپاتا ہے اندر ہی اندر گُڑھ گُڑھ کر مرتا ہے۔ اس لئے منافق کی اس حالت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے الفاظ استعمال کئے گئے کہ اُسے دُکھ کے ساتھ جلن کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے۔

۱۲؎ حل لغات

لَا تُفْسِدُوْا :- نہی جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَلْفَسَادُ کے معنے ہیں خُرُوْجُ الشَّيْءِ عَنِ الْاِعْتِدَالِ قَلِيْلًا كَانَ الْخُرُوْجُ مِنْهُ اَوْ كَثِيْرًا وَيُضَادُّهُ الصَّلَاحُ کسی چیز کا حدِ اعتدال سے نکل جانا فساد کہلاتا ہے خواہ وہ خروج کم ہو یا زیادہ۔ اور اس کے بالمقابل ”صلاح“ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (مفردات)

اَلْاَرْضُ :- اَلْاَرْضُ کے مصدری معنے اَلنَّفْضَةُ وَالرِّعْدَةُ کے ہیں یعنی کانپنا (تاج) اقرب میں ہے۔ اَلْاَرْضُ، کرۂ زمین۔ كُلُّ مَا سَفَلَ۔ ہر نیچے کی چیز۔

مُصْلِحُوْنَ :- اَصْلَحَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اَصْلَحَ بَيْنَ الْقَوْمِ کے معنے ہیں۔ وَفَّقَ۔ قوم کے درمیان صلح کرائی اور اَصْلَحَهٗ کے معنے ہیں اَقَامَهٗ بَعْدَ فَسَادِهٖ کسی چیز کے خراب ہو جانے کے بعد اسے اس کی اصل حالت پر لے آیا (اقرب) پس مُصْلِحُوْنَ کے معنے ہوئے اصلاح کرنے والے۔

تفسیر۔ ارض کے معنے عربی زبان اور محاورہ کے مطابق ساری زمین کے ہیں اور اس حصہ زمین کو بھی کہتے ہیں

[margin: لَا تُفْسِدُوْا — الْاَرْض — مُصْلِحُوْنَ]

جو کسی چیز کے نیچے آئے جیسے کہتے ہیں اَرْضُ النَّعْلِ جوتی کے کے نیچے آنے والا حصہ زمین۔ اور ہر نیچے کی چیز یا دبے ہوئے وجود کو بھی کہتے ہیں چنانچہ عربی کا محاورہ ہے اِنْ ضُرِبَ فَاَرْضٌ (اقرب) یعنی اگر اُسے مارا جائے تو وہ ارض ہو جاتا ہے یعنی بالکل دب جاتا ہے۔ محاورۂ زبان میں ارض کے معنے ملک یا زمین کے ٹکڑہ کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اَرْضُ شَامٍ اَرْضُ مِصْرَ یعنی شام کا ملک مصر کا ملک۔ ہمارے ملک میں بھی زمیندار کی زمین کو اراضی کہتے ہیں۔ اس آیت میں ارض سے مراد ملک یا علاقہ کے ہیں کیونکہ جن منافقوں کا ذکر ہے ان کے اعمال ساری دنیا پر حاوی نہ تھے بلکہ ملک عرب یا اس کی سرحدوں تک محدود تھے۔

منافقوں کا فساد کئی رنگ میں ظاہر ہوتا تھا (۱) وہ مہاجرین اور انصار میں فساد ڈلوانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور قومی سوال کو اپنے بداغراض کو پورا کرنے کے لئے آڑ بناتے رہتے تھے چنانچہ غزوہ بنی المصطلق کے موقعہ پر جب ایک معمولی سی بات پر مہاجرین اور انصار میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تو عبد اللہ بن ابی بن سلول نے جو اس وقت ساتھ تھا اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شور مچا دیا کہ یہ مہاجر باہر سے آکر ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہیں تم لوگوں نے ان کو سر پر چڑھا رکھا ہے اگر ان کی مدد نہ کرو تو وہ خود ہی تتر بتر ہو جائیں گے (سیرت ابن ہشام جلد سوم) چنانچہ اس قول کا ذکر قرآن کریم میں یوں ہے هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (منافقون ع۱) یہ منافق ہی ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ لوگ جو محمد رسول اللہ کے ساتھ جمع ہیں ان پر اپنے روپے نہ خرچ کیا کرو تاکہ یہ تتر بتر ہو جائیں۔ اور جب عبد اللہ بن ابی بن سلول نے دیکھا کہ انصار جوش میں آگئے ہیں تو جڑ پر تبر چلانا چاہا۔ یعنی خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک کی اور کہہ دیا لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (منافقون ع۱) یعنی ہمیں مدینے پہنچ لینے دو وہاں مدینہ کا سب سے بڑا آدمی (یعنی خود عبد اللہ بن ابی) اس کے سب سے ذلیل آدمی کو (یعنی نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ نفسی وروحی کو) وہاں سے نکال دیگا۔

لا تفسدوا فی الارض میں الارض کے معنے۔

کبھی یہ لوگ قومی گنہگاروں کی پیٹھ ٹھونکتے تھے کہ تا وہ جوش میں آکر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں کبھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعمال پر معترض ہوتے تاکہ لوگوں میں بددلی پھیلائیں جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ (توبہ ع۷) یعنی ان منافقوں میں سے وہ بھی ہیں جو تیری صدقات کی تقسیم پر معترض ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ جن کو صدقہ میں سے مال نہ ملا ہو ان میں بددلی پیدا ہو۔ اسی طرح آپ کے متعلق اعتراض کرتے کہ هُوَ اُذُنٌ (توبہ ع۸) یہ تو کان ہی کان ہے یعنی اس نے تو چاروں طرف جاسوس چھوڑ رکھے ہوئے ہیں کوئی آدمی آزادی سے اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا کبھی مشکلات کے وقت مسلمانوں میں بددلی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ (توبہ ع۷) یعنی اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مخلصین صحابہ کو کوئی نقصان جنگ میں پہنچتا تو کہتے کہ دیکھا یہ ہمارے مشورہ پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے ہم نے پہلے ہی صورتِ حالات کو بھانپ لیا تھا اور اس جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے کبھی کفار کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلاتے جیسا کہ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (حشر ع۲) یعنی کیا تجھے ان منافقوں کا حال معلوم ہے کہ یہ اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں کو جا کر اُکساتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم کو مدینہ سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہی مدینہ چھوڑ جائیں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات نہ سنیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم

منافقین کے آنحضرت کے اعمال پر اعتراضات

منافقین کا کفار عرب کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا۔

اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝

سنو یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں ۱۳؎

تمہارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑیں گے لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب اہل کتاب کو جلاوطن کیا گیا تو وہ لوگ ساتھ نہ نکلے۔ اور جب ان سے لڑائی ہوئی تو انہوں نے انکا ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ ان کی اصل غرض تو مسلمانوں کے خلاف فساد پھیلانا تھی۔

اسی طرح ایک فساد کا طریق یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ڈرانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ (نساء ع ۱۱) جب کوئی امن یا خوف کی بات انکو معلوم ہو جائے تو اسے خوب پھیلاتے ہیں تاکہ مسلمانوں میں فساد پیدا ہو جائے۔ خوف کی بات تو اس لئے کہ مسلمان ڈریں اور امن کی بات اس موقعہ پر کہ جب دیکھیں کہ بعض مسلمان اس صلح پر خوش نہیں تو ایسے موقعہ پر وہ مسلمانوں کو جوش دلانے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ اس طرح صلح کر کے ہم کو ذلیل کیا جا رہا ہے۔

غرض منافق طرح طرح سے ملک میں فساد پیدا کرتے تھے اور اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ ملک میں فساد پیدا کرنے سے کیا فائدہ ایسا نہ کرو۔ تو وہ یہ جواب دیتے کہ ہم تو صرف اصلاح کی خاطر یہ سب کام کرتے ہیں۔ یہ بھی منافقوں کی ایک علامت ہے کہ اپنے گندے اعمال کو چھپانے کے لئے وہ ہمیشہ اپنے اعمال کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ بنا لیتے ہیں کہ جس سے ان کے اعمال بظاہر نیک نظر آئیں کسی موقعہ پر غریبوں کی امداد کا بہانہ کسی موقعہ پر مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کا بہانہ کسی موقعہ پر دشمن کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کا بہانہ۔ غرض اپنی بدنیتی کو نیک نیتی کے پردہ میں چھپانے کی کوشش ہمیشہ انکی طرف سے ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر وہ یہ نہ کریں تو اپنے نفاق کو چھپائیں کس طرح۔ ہر قوم اور ہر ملک کے منافق اسی طرح کرتے ہیں۔ اور جن قوموں کی تباہی کے دن آجاتے ہیں وہ انکے دھوکے میں آکر سچے خیر خواہوں کو چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو انکے دھوکے سے بچایا اور انکی شرارتیں انہی کے سروں پر الٹ پڑیں۔

منظم جماعتوں میں منافقوں کا گروہ ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تنظیم نہ ہو تو منافقت کرنے کی ضرورت کم ہی ہوتی ہے لیکن جب ایک جماعت منظم ہو۔ تو اسے چھوڑنا کمزور دل لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اس لئے وہ ایک طرف تو اپنی جماعت سے بھی تعلق بنائے رکھتے ہیں اور دوسری طرف خفیہ خفیہ اس کے مخالفوں سے بھی سازباز شروع کر دیتے ہیں۔ جماعت احمدیہ چونکہ ایک منظم جماعت ہے اسے اس خطرہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے۔ منافقوں کا وجود اس میں پایا جانا اسکی کمزوری کی علامت نہیں بلکہ اسکی تنظیم کا ثبوت ہے۔ ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ منافقوں کی چالوں کو جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں سمجھے اور انہیں مدنظر رکھ کر منافقوں کو پہچانے اور ان سے وہی معاملہ کرے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ہے اور ان کے ہتھکنڈوں میں نہ آئے کہ وہ شیطان کی طرح خیر خواہ بن کر ہی حملے کیا کرتے ہیں۔

۱۳؎ **حل لغات**۔ اَلَآ کے معنے چوکس اور ہوشیار کرنے کے ہوتے ہیں نہ کہ دھمکی دینے کے پس خبرداری بجائے "سنو" کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو ہوشیار کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

وَلٰکِنْ۔ عربی میں واؤ اور لٰکِنْ دو لفظ عطف کے ہیں اور ایک دوسرے کی تاکید کرتا ہے۔ اردو میں اسکی جگہ "ہاں مگر" یا "مگر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یَشْعُرُوْنَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۰؎

تفسیر۔ منافقوں کے اس قول سے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اس طرف اشارہ تھا کہ ہم تو اصلاح کرنیوالے ہیں مگر وہ لوگ جن کو سچا مسلمان کہا جاتا ہے فساد کرتے ہیں کیونکہ

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا

اور جب انہیں کہا جائے کہ (اسی طرح) ایمان لاؤ جس طرح (دوسرے) لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ

کیا ہم (اسطرح) ایمان لائیں جسطرح بیوقوف (لوگ) ایمان لائے ہیں سنو! یقیناً یہی (لوگ)

السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ

بیوقوف ہیں مگر اس حقیقت کو جانتے نہیں ۱۴ اور جب (کبھی) [illegible] ان لوگوں سے ملیں

اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے۔ اور جب کوئی شخص کہے کہ میں ہی ایسا ہوں تو اسکا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ میرے سوا دوسرے لوگ ایسے نہیں ہیں۔ پس انکے جواب میں قرآن کریم میں ایسا ہی فقرہ استعمال فرمایا کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یعنی سننے والے سُن چھوڑیں کہ منافق ہی تو فساد کرنے والے ہیں اور الزام دوسروں کو دیتے ہیں۔

پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ منافق قسم قسم کے فساد کرتے تھے مگر اپنے مفسدانہ اعمال کی کوئی نہ کوئی نیک توجیہہ پیش کر دیا کرتے تھے لیکن نیک توجیہہ بُرے کام کو اچھا نہیں بنا دیتی۔ اگر کوئی شخص کسی جماعت کے نظام یا عقیدہ سے خوش نہ ہو تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ اس سے جدا ہو جائے نہ کہ اسمیں رہ کر اس میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس آیت کے آخر میں منافقوں کے اندر شعور کی کمی بتائی ہے کیونکہ نفاق دل سے تعلق رکھتا ہے اور قوتِ شعور ہی سے اس کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اگر منافق ظاہری توجیہوں کی بجائے اپنے دلوں کو پڑھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے اعمال اصلاح کے خیال سے نہیں بلکہ بزدلی اور جماعت سے اختلاف رکھنے کے باعث ہیں اور اس طرح انکو اپنی بیماری کا علم ہو جائے مگر وہ اپنے دل کے خیالات کو بھی صحیح طور پر پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اسطرح دوسروں کو دھوکہ دینے کی بجائے اپنے آپکو دھوکہ دیتے ہیں۔

۱۴ حل لغات

اٰمِنُوْا: اٰمَنَ سے جمع مذکر امر کا صیغہ ہے۔ اور اٰمَنَ کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ ہذا ۵۔

اَلسُّفَهَآءُ: سَفِيْهٌ کی جمع ہے جو سَفِهَ سے صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے۔ اور سَفِهَ عَلَيْنَا کے معنے ہیں جہل وہ جہالت سے پیش آیا۔ سَفِهَتِ الطَّعْنَةُ: اَسْرَعَ مِنْهَا الدَّمُ وَخَفَّ۔ خون نیزہ کے زخم سے تیزی سے نکل کر ہلکے طور پر بہا۔ سَفِهَ نَصِيْبَهٗ: نَسِيَهٗ اپنے حصہ کو بھول گیا۔ اَلسَّفَهُ کے معنے ہیں خِفَّةُ الْحِلْمِ اَوْ نَقِيْضُهٗ بیوقوفی۔ کم عقلی۔ برداشت کا کم ہونا۔ اَوِ الْجَهْلُ۔ جہالت۔ وَاَصْلُهُ الْخِفَّةُ وَالْحَرَكَةُ وَالْاِضْطِرَابُ اس کے اصل معنے ہلکاپن۔ حرکت اور اضطراب کے ہیں۔ اور اَلسَّفِيْهُ کے معنے ہیں ذُو السَّفَهِ ایسا شخص جس میں عقل۔ صبر اور برداشت کم ہوں۔ (اقرب) مفردات میں ہے اَلسَّفَهُ: اَلْخِفَّةُ فِي الْبَدَنِ وَمِنْهُ قِيْلَ زِمَامٌ سَفِيْهٌ كَثِيْرُ الْاِضْطِرَابِ وَثَوْبٌ سَفِيْهٌ: رَدِيُّ النَّسْجِ۔ اَلسَّفَهُ کے معنے ہیں۔ بدن میں ہلکا پن کا پایا جانا۔ اس واسطے اونٹ کی ایسی مہار کو جو ہلکا ہونے کی وجہ سے بہت حرکت کرے زِمَامٌ سَفِيْهٌ کہتے ہیں۔ اور ایسا کپڑا جو ناقص طور پر بُنا ہوا ہو اور وہ بہت کم قیمت کہا جائے اسے ثَوْبٌ سَفِيْهٌ کہتے ہیں۔ وَاسْتُعْمِلَ فِيْ خِفَّةِ النَّفْسِ وَ

نُقْصَانِ الْعَقْلِ وَفِي الْاُمُوْرِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالْاُخْرَوِيَّةِ اور دینی یا دنیوی امور میں سمجھ اور عقل نہ ہونے کیوجہ سے جو نفس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے (مفردات) لسان العرب میں ہے کہ جب سَافَهْتُ الشَّرَابَ کا فقرہ بولیں تو معنے یہ ہوں گے اِذَا اَسْرَفْتُ فِيْهِ کہ میں نے شراب کے خرچ کرنے میں اسراف سے کام لیا۔ پس سَفِيْهٌ کے معنے ہوں گے (۱) خفیف العقل (۲) جاہل (۳) جس کی رائے میں اضطراب ہو۔ استقامت نہ ہو (۴) ایسا شخص جو دینی و دنیوی عقل عمدہ نہ رکھتا ہو (۵) جسکی رائے کی کچھ قیمت نہ ہو (۶) جو شخص اپنی قیمتی اشیاء کو بے سوچے خرچ کر دے۔

لَا يَعْلَمُوْنَ منافقوں کا السُّفَهَاء کا لفظ کہکر مومنوں پر بیدریغ مال خرچ کرنیکا الزام

لَا يَعْلَمُوْنَ : عَلِمَ سے مضارع منفی جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور عَلِمَهٗ (يَعْلَمُهٗ) کے معنے ہیں تَيَقَّنَهٗ وَعَرَفَهٗ کسی چیز کا یقین کر لیا اور اس کو جان لیا۔ جب سمجھنے کے معنوں میں استعمال ہو تو اس وقت اسکے دو مفعول آئیں گے اور اگر معرفت کے معنوں میں استعمال ہو تو ایک۔ عَلِمَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَتْقَنَهٗ کسی کام کو مضبوط کیا۔ عَلِمَ الشَّيْءَ وَ بِالشَّيْءِ: شَعَرَبِهٖ وَاَحَاطَهٗ وَاَدْرَكَهٗ کسی چیز کی پوری واقفیت حاصل کر لی۔ اسکی حقیقت کا احاطہ کر لیا۔ اس کا پورا علم حاصل کر لیا۔ اور اَلْعِلْمُ کے معنے ہیں اِدْرَاكُ الشَّيْءِ بِحَقِيْقَتِهٖ کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کر لینا (اقرب) پس لَا يَعْلَمُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ وہ حقیقت کو نہیں جانتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ کہنے والے مسلمان ہیں۔

تفسیر۔ گو اس آیت میں صیغہ مجہول کا استعمال کیا گیا ہے مگر گذشتہ آیات کو دیکھتے ہوئے کہنے والے مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان ان منافقوں سے کہتے ہیں کہ جس طرح دوسرے شریف آدمی ایمان لائے ہیں اور اپنے عہد کے پکے ہیں تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ۔ یہ کیا کہ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر۔ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ تو منافق اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جن لوگوں کیطرح ایمان لانے کا تم ہم کو مشورہ دیتے ہو وہ تو کم عقل ہیں اور اپنی جانوں اور مالوں کو بے دریغ لٹا رہے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بھی انکی طرح بے عقل ہو جائیں۔ ایک مٹھی بھر آدمی ہیں اور ساری دنیا سے مقابلہ شروع کر رکھا ہے۔ انکو چاہیئے تھا کہ سمجھ سے کام لیتے اور سب سے تعلقات بنا کر رکھتے جس طرح ہم سب سے تعلق بنا کر رکھتے ہیں۔

حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ سَفِيْهٌ جس کی جمع سُفَهَاءُ ہے سَفَهَ سے نکلا ہے اور اس کے معنے قلت عقل کے بھی ہوتے ہیں۔ اور بے دریغ اپنے اموال کو لٹانے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ آتا ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ (نساء ع) اپنے مال ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ دو جو انکو خرچ کرنا نہ جانتے ہوں اور انکو ضائع کر دیں۔ منافقوں کا مسلمانوں کو سُفَهَاء کہنا انہی معنوں میں ہے۔ انکا خیال تھا کہ یہ لوگ نہ اپنی جانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنے مالوں کی اور یونہی بے سوچے سمجھے اپنی جانیں ضائع کر رہے ہیں اور مال لٹا رہے ہیں۔ لیکن ہم ہوشیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ساتھ بھی بنا کر رکھتے ہیں اور کفار سے بھی اس طرح ہم دونوں طرف کے خطروں سے محفوظ ہیں۔

منافقوں کا یہ اعتراض قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر بھی وضاحت سے بیان ہوا ہے چنانچہ آتا ہے کہ منافق اپنے ہموطنوں سے کہتے تھے لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (المنافقون ع) یہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر خواہ مخواہ اپنے مال نہ خرچ کرو تا کہ یہ پراگندہ ہو جائیں اور تم اس وبال سے محفوظ ہو جاؤ۔ اسی طرح آتا ہے اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ (توبہ ع) یعنی منافق لوگ ان پر بھی ہنسی اڑاتے ہیں جو صاحب توفیق ہو کر بڑھ بڑھ کر چندے دیتے ہیں اور ان پر بھی جو صاحب توفیق

نہیں۔ اور جو کچھ تھوڑا سا مال ان کے پاس ہوتا ہے۔ حاضر کر دیتے ہیں۔ گویا انکو دونوں پر اعتراض تھا۔ صاحبِ استطاعت تھے انہیں کہتے تھے کہ دیکھو کیسے ریاکار ہیں اپنے مال شہرت کی خاطر لٹاتے ہیں۔ جو غریب تھے ان پر ہنستے تھے کہ کیسے بیوقوف ہیں کھانے کو ملتا نہیں اور چندے دئے جاتے ہیں۔ جانوں کے اسراف کے بارہ میں بھی ان کا اعتراض تھا۔ چنانچہ جنگ کا ذکر اور دشمنوں کے غلبہ اور کثرت کا ذکر کرکے فرماتا ہے کہ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ (انفال ۶) یعنی منافق اور جن کے دلوں میں مرض ہے کہتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو تو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے یعنی دین میں جو وعدے ترقی کے مذکور ہیں ان سے دھوکہ کھا کر اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کرتے اور جانیں قربان کرتے چلے جاتے ہیں اور انجام کو نہیں دیکھتے۔

غرض سُفَهَاۗءُ سے مراد منافقوں کی یہ ہے کہ مسلمان اپنی جانوں اور مالوں کو بے سوچے سمجھے برباد کر رہے ہیں اور ہم اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے مالوں کو بچا رہے ہیں۔ یہ اعتراض ہمیشہ بڑھنے والی قوموں پر ہوتا ہے۔ جب بھی خدا تعالیٰ کسی قوم کو بڑھانا چاہتا ہے ایسے ہی حالات میں بڑھاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ جو قوم کمزور اور بے سامان ہوتی ہے وہ اسے بے دریغ قربانی کا حکم دیتا ہے جو منافقوں اور دشمنوں کی نظر میں ایک لغو فعل نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ قربانی کی قیمت نہیں جانتے۔ ہاں جب کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی اولاد کہتی ہے کہ یہ کامیابی غیر معمولی نہیں اس کا سبب یہ تھا کہ مومن قربانی کرتے تھے اور ان کے مخالف غافل تھے گویا پہلے ان کے آباء اور رنگ کا اعتراض کرتے ہیں اور اولاد بالکل الٹ قسم کے اعتراض شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسلام کی ابتداء میں تو یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمان تو بے وقوف ہیں۔ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور ایسے طور پر خرچ کر رہے ہیں کہ نتیجہ کچھ نہ نکلے گا یونہی اپنے مذہب کے جھوٹے وعدوں کے دھوکے میں آگئے ہیں مگر جب اسلام کو غلبہ مل گیا تو اب ان کی اولاد یا ان کے اظلال یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی ترقی کوئی معجزانہ ترقی نہ تھی۔ عربوں اور ایرانیوں اور رومیوں کے اخلاق تباہ ہو گئے تھے اور ان میں قوم کی خاطر قربانی کرنے کا جذبہ نہ رہا تھا اس لئے مسلمان غالب آگئے۔ سچ ہے جب انسان سچائی کو چھوڑتا ہے تو کسی ایک مقام پر کھڑا نہیں ہو سکتا اسے بار بار اپنی جگہ بدلنی پڑتی ہے۔ بھلا کوئی سوچے کہ اگر مسلمانوں کے اندر ایسی ہی کوئی غیر معمولی طاقت موجود تھی اور ان کے مقابل ایسے ہی کمزور تھے تو اندرونی منافق اور بیرونی دشمن ان کی قربانیوں کو اسراف اور ان کے ارادوں کو جنون کیوں قرار دے رہے تھے۔

منافقوں کا السفہاء کے الفاظ معزول کے متعلق استہزاء کرکے ان کی بیدریغ قربانیوں پر طنز کرنا [1]

باقی رہا یہ کہ بعض اسباب انکی تائید میں پیدا ہو گئے تو یہ معجزانہ غلبہ کے خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی خبر دیتا ہے تو اس کی تائید میں سامان بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر وہ سامان مومنوں کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ آخر عربوں، ایرانیوں اور رومیوں کو سچی قربانیوں سے مسلمانوں نے تو محروم نہ کیا تھا۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ دونوں فریق کی طاقت کی باہمی نسبت کیا تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں رومیوں اور ایرانیوں سے سچی قربانی کی روح چھین لی۔ مگر جس حد تک انہوں نے طاقت خرچ کی مسلمانوں میں تو اس کے مقابلہ کی بھی ظاہر حالات میں طاقت نہ تھی پھر وہ کیونکر غالب آئے۔

منافقوں کی اس حالت کا کہ وہ کفار کے مقابلہ کو نادانی سمجھتے تھے ایک اور آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے

اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ

جو ایمان لائے ہیں۔ تو کہدیتے ہیں کہ ہم تو (اس رسول کو) مانتے ہیں۔ اور جب اپنے شیطانوں سے علیحدگی میں ملیں

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○

تو کہدیتے ہیں کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف (ان سے) ہنسی کر رہے ہیں ۱۵ ؎

فرماتا ہے۔ تَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ (مائدہ ع) یعنی ان منافقوں کا حال جن کے دلوں میں بیماری ہے تم دیکھتے ہو کس طرح مخالفین اسلام میں بھاگ کر گھستے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انجام کیسا بُرا ہوگا۔ پس قریب ہے کہ اللہ تعالےٰ فتح کے سامان پیدا کردے یا اور کوئی ایسا امر ظاہر کردے کہ یہ منافق ان خدشات کی وجہ سے جو انکے دلوں میں پیدا ہورہے ہیں شرمندہ ہو جائیں۔

اصل بات یہ ہے کہ فتح تو بہادروں اور قربانی کرنے والوں کا حق ہوتا ہے۔ اور مومن دنیا میں سب سے بہادر ہوتا ہے کیونکہ اس کی نظر آسمان کی طرف ہوتی ہے نہ کہ زمین پر۔ جو قوم بھی کچی قربانی سے ڈرتی ہے تباہ ہوتی ہے۔ جو اپنے مالوں کو سنبھال کر رکھتے ہیں وہی انہیں ضائع کرتے ہیں جو انہیں صحیح طور پر خرچ کرتے ہیں انکے مال ہزاروں گنے بڑھ کر واپس آتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اصل میں یہی لوگ اپنے اموال اور جانوں کا نقصان کر رہے ہیں۔ کیونکہ نہ کفار نے فتح پانی ہے کہ ان کے ساتھ تعلق انکے لئے مفید ثابت ہو اور نہ مسلمانوں نے ہارنا ہے کہ ان سے بگاڑ انہیں فائدہ پہنچا سکے لیکن چونکہ یہ آیندہ کی بات ہے یہ جانتے نہیں۔ اور خدا تعالےٰ پر ایمان نہیں کہ اسکی پیشگوئیوں کے ذریعہ سے اس حقیقت کو سمجھ سکیں۔ حالانکہ اگر جانتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ یہ اس طریق عمل سے اپنے مالوں اور جانوں کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔ ایک دوسری آیت میں اسکی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔ فرماتا ہے وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○ (توبہ ع) یعنی منافق لوگ اپنے مالوں اور اپنی اولادوں پر ناز کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے مال بھی محفوظ ہیں اور جانیں بھی۔ کیونکہ وہ اپنی اولادوں کو جہاد پر جانے نہیں دیتے۔ لیکن مسلمان ان کے اس فخر سے دھوکہ نہ کھائیں۔ کیونکہ گو بظاہر وہ مالدار ہیں۔ اور بظاہر انکی اولادیں گھروں میں آرام سے بسر کر رہی ہیں لیکن خدا تعالےٰ انہیں ان کے مالوں اور انکی اولادوں کے ذریعہ سے اسی دنیا میں عذاب دے گا اور دنیا میں ذلیل ہو جانے کے بعد ایک دن کفر کی حالت میں یہ اس دنیا سے چل بسیں گے۔

یہ آیت منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی بن سلول پر خوب صادق آئی۔ وہ اپنی سب کوششوں کو نامراد ہوتے دیکھ کر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی دیکھ کر آپ کی زندگی میں ہی وفات پا گیا اور اس کا بیٹا نہایت مخلص ثابت ہوا جو اس کے لئے مزید ذلت اور دکھ کا موجب تھا۔

خَلَوْا

۱۵ ؎ حل لغات

خَلَوْا: خَلٰى سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور خَلَا بِالشَّيْءِ کے

معنے ہیں اِنْفَرَدَ بِہٖ وَلَمْ یَخْلِطْ بِہٖ غَیْرَہٗ۔ کسی چیز کو الگ رکھا اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو نہ ملایا خَلَا بِفُلَانٍ وَمَعَہٗ وَاِلَیْہِ: سَاَلَہٗ اَنْ یَجْتَمِعَ بِہٖ فِیْ خِلْوَۃٍ فَفَعَلَ کسی سے علٰحدہ ملنے کی خواہش کی اور دوسرے نے یہ بات مان لی۔ وَقِیْلَ اِنَّ اِلٰی ھٰھُنَا بِمَعْنٰی مَعَ کَمَا فِیْ قَوْلِہٖ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ میں اِلٰی کے معنے مَعَ کے ہیں۔ یعنی جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ علٰحدہ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ آیت مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ میں اِلٰی کے معنے مَعَ کے ہیں اور خَلَاکَ ذَمٌّ کے معنے ہیں تجھ سے مذمت دور رہو جائے۔ (اقرب)

شَیٰطِیْنِہِمْ: شَیْطَانٌ کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ دو مختلف مادوں سے بن سکتا ہے (۱) شَطَنَ۔ (۲) شَاطَ۔ اگر اسے شَطَنَ کے مادہ سے بنا ہُوا قرار دیا جائے تو یہ فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ اور شَطَنَ عَنْہُ کے معنے ہیں اَبْعَدَ دور ہو گیا۔ شَطَنَ الدَّارُ کے معنے ہیں گھر دور ہو گیا (اقرب) اور اَلشَّطَنُ کے معنے ہیں اَلْحَبْلُ الطَّوِیْلُ لمبا رسہ۔ اور شَطَنَ صَاحِبَہٗ کے معنے ہیں خَالَفَہٗ عَنْ نِیَّتِہٖ وَوَجْھِہٖ۔ اپنے ساتھی کی مخالفت کی۔ اسکو اس نے ارادہ اور مقصد سے پھرا دیا (اقرب) پس اس مادہ کے لحاظ سے اس کے معنے ہونگے کہ وہ ہستی جو حق سے خود بھی دور ہے اور دوسروں کو بھی دور کرنے والی ہے۔ اور وہ ہستی جسے ہر وقت شرارتیں ہی سوجھتی ہیں اور اس نے حق کی مخالفت کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اور اگر شَاطَ اس کا مادہ مانا جائے تو اس کے معنے ہوں گے کہ وہ ہستی جو حسد اور تعصب کیوجہ سے جل جائے یا ہلاک ہو جائے۔ کیونکہ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں اِحْتَرَقَ کوئی چیز جل گئی اور اِسْتَشَاطَ غَضَبًا کے معنے ہیں اِذَا احْتَدَّ فِیْ غَضَبِہٖ وَالْتَھَبَ کہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اور شَاطَ فُلَانٌ کے معنے ہیں ھَلَکَ ہلاک ہو گیا۔ شَیْطَان اس سے فَعْلَان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اگر تو فَیْعَال کے وزن پر ہو تو یہ منصرف ہوگا ورنہ غیر منصرف۔ ان معنوں کے علاوہ شیطان کے معنے لغت میں مندرجہ ذیل لکھے ہیں:۔

رُوْحٌ شِرِّیْرٌ۔ بدروح۔ کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ ہر سرکش اور حد سے بڑھنے والا۔ اَلْحَیَّۃُ سانپ (سانپ کو اس لئے شیطان کہتے ہیں کہ یہ بھی لوگوں کو ہلاک کرتا ہے مگر شیطان اسی سانپ کو کہتے ہیں جو چھوٹا ہو)۔ جو ہلاک ہونے والا ہو اسکو بھی شیطان کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اکیلا سفر کرنے والا یا دو سفر کرنے والے شیطان ہیں۔ ہاں تین اشخاص جا سکتے ہیں یعنی چونکہ اس وقت ڈاکے پڑتے تھے اور ہلاک ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لئے فرمایا کہ دو شخصوں کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاں تین ہوں تو سلامت آجانے کی امید ہو سکتی ہے۔ قاموس میں لکھا ہے:۔ وَالشَّیْطَانُ مَعْرُوْفٌ وَکُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ مِنْ اِنْسٍ اَوْ جِنٍّ اَوْ دَآبَّۃٍ۔ یعنی ایک شیطان تو مشہور ہے ہی نیز ہر ایک حد سے بڑھنے والے سرکش کو بھی شیطان کہتے ہیں خواہ انسان ہو یا جن یا چارپایہ۔

شَیٰطِیْنِہِمْ

مُسْتَھْزِءُوْنَ

مُسْتَھْزِءُوْنَ: اِسْتَھْزَأَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتَھْزَأَ کے وہی معنے ہیں جو مجرد ھَزَأَ کے ہیں۔ کہتے ہیں ھَزَءَ بِہٖ وَمِنْہُ اَیْ سَخِرَ مِنْہُ اس سے ہنسی ٹھٹھا کیا (اقرب) اور اَھْزَاَہُ الْبَرْدُ کے معنے ہیں قَتَلَہٗ سردی نے اسے ہلاک کر دیا (لسان) پس مُسْتَھْزِئٌ کے معنے ہوں گے ہنسی کرنے والا اور مُسْتَھْزِءُوْنَ کے معنے ہونگے ہنسی کرنے والے۔

تفسیر۔ شَیْطٰن کے معنے اوپر حل لغات میں

اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ وَیَمُدُّہُمْ فِیْ طُغْیَانِہِمْ

اللہ انہیں (انکی) ہنسی کی سزا دے گا اور انہیں انکی سرکشیوں میں

لکھے جا چکے ہیں۔ ہر شخص جو حق سے دور ہو یا بغض و کینہ سے جل رہا ہو یا سرکش اور باغی ہو شیطان کہلاتا ہے پس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ شیطان کا لفظ قرآن کریم میں یقینی طور پر انسانوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

¹ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ میں شیاطین سے مراد کفار اور منافقین کے سردار ہیں

اس آیت میں شیاطین سے مراد کفار اور منافقین کے سردار ہیں جو کبر اور نخوت کے باعث خدا تعالیٰ کے دین سے دور اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے سے نفور رہتے تھے اور دوسرے زیر اثر لوگوں کو بھی صراط مستقیم کیطرف نہیں آنے دیتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کہیں گے۔ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا۔ (احزاب ع ۸) کہ اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اور بڑوں کے کہنے پر چلے جنہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو منافقوں کو اکسانے والے تھے اور مسلمانوں کی ترقیوں کو دیکھ کر جلتے اور حق سے دور تھے مسلمانوں سے جھگڑتے رہتے اور ان کاموں میں مشغول تھے جو انکی ہلاکت کا باعث تھے۔ شیطان سے یہاں ابلیس مراد لینا صحیح نہیں اور نہ اس لفظ کے استعمال سے یہود اور

² شیاطین کے معنے یہودیوں کے سرداروں کے

مسیحیوں کے رؤساء کو گالی دی گئی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضؓ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں اَلرَّاکِبُ شَیْطَانٌ وَّالرَّاکِبَانِ شَیْطَانَانِ وَالثَّلٰثَۃُ رَکْبٌ یعنی سفر کی مصیبتوں کی صورت میں اکیلا سفر کرنیوالا اپنے آپکو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے۔ دو کا بھی یہی حال ہے تین ہوں تو مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔ مسیحی معترضین مرقس باب ۸ آیت ۳۳ ملاحظہ کریں۔ پر اس نے پھر کے اور اپنے شاگردوں پر نگاہ کر کے پطرس پر جھنجھلایا اور

³ مخالفین اسلام کے لئے شیاطین کے لفظ کے استعمال پر مخالفین کا ایک اعتراض اور اسکا جواب۔

کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو"۔ اسی طرح متی باب ۲۳ آیت ۳۳ ملاحظہ ہو جہاں مسیح نے اپنے مخالف فقیہوں اور فریسیوں کو کہا ہے "اے سانپو اور اے سانپ کے بچو تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے"۔ نیز متی باب ۳ آیت ۷ بھی ملاحظہ ہو جہاں لکھا ہے "پر جب اس نے دیکھا کہ بہت سے فریسی اور صدوقی بپتسمہ پانیکو اس پاس آئے ہیں تو انہیں کہا کہ اے سانپوں کے بچو تمہیں آنیوالے غضب سے بھاگنا کس نے سکھلایا"۔ انجیل میں ان حوالوں کی موجودگی کے باوجود مسیحیوں کا شیطان کے لفظ پر اعتراض کرنا جو گالی کے طور پر نہیں بلکہ محض ایک حقیقت کے اظہار کیلئے عربی محاورہ کے مطابق استعمال ہوا ہے سخت تعجب انگیز ہے۔

شیطان کے جو معنے میں نے کئے ہیں وہ صحابہ رضؓ اور اکابر علماء سے بھی ثابت ہیں۔ ابن جریر حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ مِنَ الْیَہُوْدِ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَہُمْ بِالتَّکْذِیْبِ یعنی شیاطین سے منافقوں کے دوست یہودی مراد ہیں جو انہیں تکذیب اسلام کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی طرح ابن جریر قتادہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ کے معنے ہیں اِخْوَانُہُمْ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ یعنی انکے مشرک بھائی۔ اسی طرح ابن جریر مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں۔ اَصْحَابُہُمْ مِنَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُشْرِکِیْنَ یعنی ان کے منافق اور مشرک دوست۔ اسی طرح ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شیاطین سے مراد رُءُوْسُہُمْ فِی الْکُفْرِ یعنی انکے کافر سردار مراد ہیں۔

مُسْتَہْزِءُوْنَ بصیغہ اسم فاعل جو دوام اور ہمیشگی کا فائدہ دیتا ہے۔ منافق یہ ظاہر کرنا چاہتے

يَعْمَهُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ

بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیگا۔ ۱۷ؐ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو

بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا

اختیار کر لیا پس ان کا سودا نفع مند نہیں ہوا اور نہ انہوں نے

کتے کہ ہم مسلمانوں سے جب بھی ملتے ہیں استہزاء کے طور پر ہی ملتے ہیں۔

۱۶ؐ حل لغات۔ يَمُدُّهُمْ : مَدَّ مَدًّا

سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور مَدَّهٗ فِيْ غَيِّهٖ کے معنے ہیں اَمْهَلَهٗ وَطَوَّلَ لَهٗ اسکو کسی بات میں مہلت دی اور اسکی میعاد کو لمبا کیا۔ (اقرب) تاج میں ہے مَدَّهٗ فِي الْغَيِّ وَالضَّلَالِ: اَمْلٰى لَهٗ وَتَرَكَهٗ اسکو گمراہی میں پڑا رہنے دیا اور اسمیں چھوڑ دیا۔ پس يَمُدُّهُمْ کے معنے ہونگے وہ انہیں چھوڑ دے گا۔ انکو رہنے دے گا۔

طُغْيَانِهِمْ : طُغْيَان مصدر ہے طَغِيَ يَطْغٰى یا طَغٰى يَطْغِيْ کی۔ اور اس کے علاوہ طَغْيٌ اور طُغْيَانًا کی صورت پر بھی اس کی مصدر آتی ہے۔ طَغٰى کے معنے ہیں جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ اندازہ اور حد سے بڑھ گیا۔ طَغَى الْكَافِرُ: غَلَا فِي الْكُفْرِ کفر میں زیادہ بڑھ گیا۔ طَغٰى فُلَانٌ: اَسْرَفَ فِي الْمَعَاصِيْ وَالظُّلْمِ گناہ اور ظلم میں حد سے بڑھ گیا۔ طَغَى الْمَاءُ: اِرْتَفَعَ پانی اونچا ہوگیا۔ طغیانی اور سیلاب آگیا۔ (اقرب)

يَعْمَهُوْنَ : عَمَهَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں عَمَهَ الرَّجُلُ جسکے معنے ہیں تَرَدَّدَ فِي الضَّلَالِ وَتَحَيَّرَ فِيْ مُنَازَعَةٍ اَوْ طَرِيْقٍ وہ شخص گمراہی کی حالت میں حیران پھرتا رہا یا جھگڑے یا راستہ میں حیران رہ گیا کہ اصل حقیقت یا اصل راستہ کونسا ہے۔ اور یہ بھی محاورہ ہے کہ جب کسیکو کوئی دلیل نہ سوجھے یا بات نہ آئے تو اسحالت کو بھی عَمَهٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ لکھا ہے اَلْعَمَهُ اَنْ لَّا يَعْرِفَ الْحُجَّةَ یعنی عَمَهَ کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو دلیل نظر نہ آئے۔ اس کا اسم فاعل عَامِهٌ ہے۔ اور اسکی جمع عُمَّهٌ اور صیغہ مبالغہ عَمِهٌ ہے۔ جس کی جمع عَمِهُوْنَ آتی ہے۔ عَمِيَ کا لفظ جو قرآن کریم میں آتا ہے اور جس سے اَعْمٰى کا لفظ بنا ہے اس کے معنے بھی اندھے پن کے ہیں مگر زمخشری کا قول ہے کہ وہ عَمَهٌ سے عام ہے۔ اَعْمٰى اس شخص کو کہتے ہیں جو آنکھ یا عقل کا اندھا ہو مگر عَامِهٌ صرف اسکو کہتے ہیں جو عقل کا اندھا ہو۔ آنکھ کے اندھے کو عَامِهٌ نہیں کہتے۔ (اقرب) پس معنے یہ ہوئے کہ اپنی ظالمانہ زیادتیوں میں سرگردان پھرتے ہیں اور پھرتے رہیں گے۔ اور انکی عقلیں ماری ہوئی ہیں اور ماری رہینگی۔

یَمُدُّ ۱ — طُغْیَانِہِمْ — اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ استہزاء منسوب کرنے کا مطلب ۲ — یَعْمَہُوْنَ

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ ان سے استہزاء کرے گا کے یہ معنے نہیں جیسا کہ بعض مفسرین قرآن کریم نے سمجھا ہے کہ نعوذ باللہ مسلمانوں کا خدا استہزاء کرتا ہے۔ بلکہ اسجگہ جزائے جرم کے لئے جرم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو عربی زبان کا عام قاعدہ ہے اور قرآن کریم میں مستعمل ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انکے استہزاء کی انہیں سزا دے گا۔ (اسکی تفصیل کے لئے دیکھو نوٹ نمبر ۴ اور ۱۰)۔

قرآن کریم کی تعلیم اس بارہ میں صاف ہے، کہ اللہ تعالیٰ استہزاء سے کام نہیں لیتا۔ چنانچہ اسی سورۃ میں (ع ۸ ،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا ہے کہ جب
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے شرک کی عادت
کو چھڑانے کے لئے ایک خاص گائے قربان کرنے کے لئے
کہا تو انہوں نے جواب دیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا
آپ ہم سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام
کا یہ جواب نقل کیا گیا ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں
اس سے کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں یعنی استہزاء کرنا
تو جاہلوں کا کام ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا
ہوں کہ جاہل نہ بنوں میں کس طرح استہزاء کر سکتا ہوں
پس جس پاک ہستی کی مدد سے بندے استہزاء سے بچتے
ہیں اسکی طرف استہزاء کی نسبت قرآنی تعلیم کے مطابق
کسطرح جائز ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں استہزاء جھوٹ کو کہتے ہیں یعنی کہا
کچھ جائے اور دل میں کچھ اور مراد ہو۔ اور اس سے
مخاطب کی تذلیل مراد ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نسبت قرآن
کریم میں آتا ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔
(نساء ع ۱۰) یعنی اللہ تعالیٰ سے سچا اور کون ہو سکتا
ہے۔ اسی طرح ہنسی مذاق کرنیوالا شخص لغو گو ہوتا ہے
اور اللہ تعالیٰ کا نام قرآن کریم حکیم رکھتا ہے یعنی
جسکی ہر بات میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے پس اللہ تعالیٰ
کی نسبت استہزاء کا لفظ محض ان معنوں میں استعمال
ہوا ہے کہ وہ منافقوں کو انکے استہزاء کی سزا دیگا۔

يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ کا مطلب

ان معنوں کے علاوہ یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے
کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت جو لفظ استعمال ہو وہ ان معانی سے
جدا ہو جاتا ہے جو بندہ کی نسبت استعمال ہونیکی صورت
میں اسمیں پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت بولنے
کا لفظ بولا جائے تو یہ معنی نہیں کہ اسکی زبان ہے اور ہونٹ
ہیں جن کو اسنے ہلایا۔ بلکہ صرف یہ معنے ہیں کہ بولنے کا
جو نتیجہ ہوتا ہے یعنی الفاظ کا پیدا ہونا وہ اسنے اپنی قدرت
پیدا کر دیا۔ اللہ کی نسبت آتا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ
شَيْءٌ (شوریٰ ع ۲) پس اس تاویل کے رو سے اللہ تعالیٰ
کے استہزاء کرنے کے یہ معنے ہونگے کہ استہزاء کا نتیجہ
اس نے انکے حق میں پیدا کر دیا یعنی انہیں ذلیل کر دیا
اور لوگوں کی نظروں میں قابل مضحکہ بنا دیا۔

یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مومنوں کے
سامنے منافقوں نے یہ کہا کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں
اور کفار کے سامنے یہ کہ ہم ہنسی کرنے والے ہیں یہ انکی
فطرت کی شہادت ہے کہ مومن کیسے ہیں اور کافر
کیسے ہیں۔ مومنوں کی نسبت وہ جانتے تھے کہ کافروں سے
ہنسی کرنے کا عذر بھی قبول نہ کرینگے اور اسے بھی بُرا
منائیں گے۔ اس لئے انکے سامنے اصلاح کا عذر پیش
کیا۔ مگر کافروں کی نسبت سمجھتے تھے کہ انمیں تقویٰ نہیں
ہمارے استہزاء کے عذر پر بُرا نہ منائیں گے بلکہ بوجہ
عداوت خود بھی اسے پسند کریں گے اور خوب خوش
ہونگے کہ ہمارے ساتھیوں نے مسلمانوں کو بیوقوف
بنایا۔ منافقوں کی یہ بے ساختہ شہادت مسلمانوں کے
اعلیٰ اخلاق اور کفار کی تقویٰ سے دُوری کی عجیب مؤثر
شہادت ہے۔

وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ: يَمُدُّ
مَدٌّ سے نکلا ہے جس کے معنے مہلت دینے کے ہیں (تاج العروس
جلد ثانی و قاموس جلد اول) صاحب تفسیر روح المعانی
زجاج اور ابن کیسان نے بھی یہی معنے کئے ہیں۔ حضرت
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے۔ سورۃ انعام
ع ۱۳ میں فرمایا نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ
جس سے مہلت دینے کے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔ پس
اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ باوجود انکی شرارتوں کے
خدا تعالیٰ انکو مہلت دیتا ہے کہ وہ سنبھل جائیں مگر وہ
طغیان میں بڑھتے جاتے ہیں۔

یہ معنے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کفار کو طغیان میں زیادہ

مُهْتَدِيْنَ ○ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ

ہدایت پائی ١ﮯ انکی حالت اس شخص کیحالت کی طرح ہے جس نے آگ

نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

جلائی پھر جب اس (آگ) نے اس کے اردگرد (کے علاقہ) کو روشن کردیا تو اللہ تعالٰے ان کی

کرتا ہے۔ اس بات کو سورۃ فاطر ع۴ میں خوب حل کردیا ہے کہ مہلت گمراہ کرنے کے لئے نہیں دیجاتی بلکہ اسلئے کہ جو چاہیں اس عرصہ میں توبہ کرلیں۔ جیسا کہ فرمایا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ یعنی کیا ہم نے تم کو اسقدر عمر نہ دی تھی کہ جس میں نصیحت پکڑنے والا نصیحت پکڑ لیتا ہے۔ اور تمہارے پاس ڈرانے والے بھی آئے مگر تم نے نہ ڈھیل سے فائدہ اٹھایا نہ نذیر سے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مہلت جو کفار کو ملتی ہے وہ گمراہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت پانے کے لئے ملتی ہے۔

یعمھون کی تشریح

يَعْمَهُوْنَ ۔ عَمَهٌ سے نکلا ہے جو رستہ میں علامات اور نشانات نہ ہونیکو کہتے ہیں۔ اور اس کے تین معنے مستعمل ہیں۔ (۱) مُتَحَیِّرٌ، حیران ہونا۔ (۲) رشد سے اندھا ہونا۔ (۳) سر نیچے کرلینا اور جو آگے سے آرہا ہو اُسے نہ دیکھنا۔ یہاں یہ مراد ہے کہ منافقین جن شرارتوں میں پڑے ہوئے ہیں بلا سوچے سمجھے انہی میں بڑھتے جاتے ہیں۔

اشتروا

١ﮯ حل لغات۔ اِشْتَرَوْا : اِشْتَرٰى سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِشْتَرَاہُ کے معنے ہیں مَلَكَهٗ بِالْبَيْعِ کسی چیز کا خرید کے ذریعہ سے مالک ہوگیا۔ بَاعَهٗ نیز اس کے معنے ہیں اسکو بیچا۔ یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اور متضاد معنے دیتا ہے خریدنے کے بھی اور بیچنے کے بھی۔ وَكُلُّ مَنْ تَرَكَ شَيْئًا وَتَمَسَّكَ بِغَيْرِهٖ فَقَدِ اشْتَرَاهُ۔ ہر وہ شخص جو ایک چیز کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کو اسکی بجائے اختیار کرلے اسپر اِشْتَرٰى کا لفظ بولیں گے۔ گویا اسنے ایک چیز دے کر دوسری لے لی۔ (اقرب) عام طور پر شَرَا کسی چیز کو خریدنے اور لفظ بَيْع کسی چیز کے بیچنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن جب سامان کو سامان کے بدلہ میں تبادلہ کیا جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرلیا کرتے ہیں۔ لیکن لفظ شَرَا اور اِشْتَرٰى کا استعمال اس طرح بھی جائز ہے کہ جو شخص ایک چیز کو ترک کردے اور دوسری کو اختیار کرے تو اسکی نسبت کہیں گے کہ شَرَاهُ یا اِشْتَرَاهُ (مفردات)۔

الضللة

اَلضَّلٰلَةُ : ضَلَّ يَضِلُّ کے معنے ہیں ضِدُّ اِهْتَدٰى یعنی ہدایت کے خلاف حالت پر ہوگیا اور دین اور حق نہ پایا۔ ضَلَّ عَنْهُ يَضِلُّ : لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ اس طرف راہ نہ پائی۔ ضَلَّ يَضَلُّ (ضاد کی زبر سے) فُلَانٌ اَلطَّرِيْقَ وَعَنِ الطَّرِيْقِ : لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ راستہ نہ پایا۔ جب دار یا منزل یا ہر اپنی جگہ پر قائم رہنے والی چیز کا اس کے بعد ذکر ہو تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں۔ ضَلَّ الرَّجُلُ فِي الدِّيْنِ ضَلَالًا وَضَلَالَةً : ضِدُّ اِهْتَدٰى۔ اس شخص نے دین کے معاملہ میں درست راہ نہ پائی۔ ضَلَّ فُلَانٌ اِلْفَرَسَ فلاں شخص نے اپنا گھوڑا گم کردیا۔ ضَلَّ عَنِّيْ كَذَا : ضَاعَ مجھ سے فلاں چیز ضائع ہوگئی۔ ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ ۔

خَفِيَ وَغَابَ پانی دودھ میں مل گیا اور غائب ہو گیا۔
ضَلَّ فُلَانٌ فُلَانًا: نَسِيَهٗ اس شخص کو بھول گیا۔
ضَلَّ النَّاسِيْ: غَابَ عَنْهُ حِفْظُ الشَّيْءِ. بھول گیا اس کے ذہن سے بات نکل گئی۔ ضَلَّ سَعْيُهٗ: عَمِلَ عَمَلًا لَمْ يَعُدْ عَلَيْهِ نَفْعُهٗ ایسا کام کیا کہ جس کا اسے کوئی نفع نہ ہوا۔ (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ حل لغات ۵ ۔

اَلْهُدٰی کے لئے دیکھو سورہ بقرہ حل لغات ۳ و سورۃ فاتحہ حل لغات ۶

رَبِحَتْ

رَبِحَتْ تِجَارَتُهٗ کے معنے ہیں رَبِحَ فِيْهَا کہ تاجر نے اپنی تجارت میں نفع اٹھایا (اقرب)

مُهْتَدِيْنَ

مُهْتَدِيْنَ: اِهْتَدٰی سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور اِهْتَدٰی کے وہی معنے ہیں جو هَدٰی کے ہیں۔ هَدٰی کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۶ ۔

اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ کے معنے

تفسیر۔ (۱) اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہدایت دیکر گمراہی کو خرید لیا ہے۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ ان لوگوں کے سامنے ہدایت اور ضلالت دونوں پیش کی گئی تھیں انہوں نے ضلالت اختیار کر لی اور ہدایت ترک کر دی۔

پہلے معنوں کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو فطرت صحیحہ عطا کی ہے۔ اور اسے بہترین قویٰ دئے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (روم ع) اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اسنے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین) کہ ہم نے انسان کو بہترین طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسے اعلیٰ سے اعلیٰ قویٰ دئے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی یا اپنے والدین کی خرابیوں اور بداعمالیوں کیوجہ سے فطرت صحیحہ اور پاک قویٰ سے محروم ہو جاتا ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ (مسلم جلد ۲ کتاب القدر) کہ بچہ تو فطرۃ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے والدین اس کے بچپن سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے دین پر کر لیتے ہیں اور اسے یہودی یا مجوسی یا عیسائی بنا لیتے ہیں گویا وہ اسکی فطرتی ہدایت کو قربان کر دیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں اسے گمراہی خرید دیتے ہیں۔ یا پھر وہ بڑا ہو کر خود اپنی اچھی طاقتوں کو بُرے طریق پر استعمال کر کے خراب کر لیتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اسے جرأت عطا کی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اس سے کسی کی مدد کرے وہ ظلم کرنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح اور اچھے جوہر جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کئے ہیں بُرے استعمال کیوجہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ پس اس جگہ ہدایت سے وہ فطرتی نیک طاقتیں مراد ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کیطرف سے ملتی ہیں۔ اور اِشْتَرٰی کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ان پاک قویٰ کو جو انکی ترقی کے لئے انکو دئے گئے تھے بُرے مواقع پر استعمال کر کے ان سے گمراہی اور ضلالت خرید لیتے ہیں اور دینی اور دنیوی دونوں فائدوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

دوسرے معنوں کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایکطرف تو خدا تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی کے امتیاز کی مقدرت اور اختیار دیا ہے۔ دوسری طرف نبیوں کے ذریعہ اس کے پاس نیکی کی تعلیم اور ہدایت بھیجدیتا ہے مگر ساتھ ہی شیطان اپنی بُری تعلیم اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے وہ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو چھوڑ دیتے ہیں اور شیطان یا اس کے چیلوں کی پیش کی ہوئی

بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝ ﴿۱۸﴾

روشنی کو لے گیا اور اس نے انہیں (قسما قسم کے) اندھیروں میں (اس حال میں) چھوڑ دیا (کہ) وہ (کوئی راہ نجات) نہیں دیکھتے۔

گمراہی کی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں اور اس طرح ہدایت کو رد کر کے ضلالت کو اختیار کرنے والے ہو جاتے ہیں۔

(ب) فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔ چونکہ کفار نے ایک چیز چھوڑ دی اور دوسری اس کے بدلہ میں لے لی اس لئے اس کا نام تجارت رکھا گیا ہے۔ فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنے خیال میں ایک مفید تجارت کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نیک فطرت کو ترک کر کے بُری باتوں کو اختیار کر لیا ہے۔ یا خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم کو چھوڑ کر شیطانی باتوں کو اختیار کر لیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ بہت فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن انہیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا بلکہ وہ نقصان اٹھائیں گے اور یہ سودا انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔

(ج) وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ یہ نتیجہ پہلے نتیجہ کے علاوہ ہے۔ اسمیں بتایا ہے کہ انکو صرف یہی نقصان نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں ذلیل ہوں گے اور نقصان اٹھائیں گے۔ بلکہ اسکا نتیجہ یہ بھی نکلیگا کہ وہ ہدایت سے محروم رہیں گے اور انکی عاقبت بھی خراب ہوگی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فعل کے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک نتیجہ تو اس فعل کے ساتھ ہی نکلتا ہے اور دوسرا اس کے بعد پیدا ہوتا ہے مثلاً ایک انسان چوری کرتا ہے تو اسکا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ وہ ذلیل ہو جاتا ہے اور پکڑا جاتا ہے اور قید ہوتا ہے یا اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا اور کوئی سزا پاتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہدایت کے قبول کرنے کی قابلیت اسمیں سے جاتی رہتی ہے اور وہ ہدایت سے دور ہو جاتا ہے اسی طرح ہر نیکی کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی نکلنا شروع ہو جاتا ہے مثلاً اس نیکی کی وجہ سے اس کے اپنے دل میں خوشی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں میں اسکی عزت قائم ہو جاتی ہے اور وہ اسے اچھا خیال کرنے لگجاتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر ہدایت قبول کرنے کی قابلیت بڑھتی جاتی ہے اور وہ ہدایت میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ میں اسی بات کیطرف اشارہ کیا ہے کہ دوسرا نقصان انہیں یہ پہنچا کہ وہ ہدایت سے دور ہی دور ہوتے چلے گئے ہیں۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ کی تشریح

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ کی تشریح

۱۸ حل لغات۔ مَثَلُهُمْ: اَلْمَثَلُ کے معنے ہیں اَلشِّبْهُ وَالنَّظِيْرُ۔ مشابہ اور نظیر۔ اَلصِّفَةُ حالت۔ بیان۔ اَلْحُجَّةُ۔ دلیل۔ ثبوت۔ يُقَالُ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا اَيْ حُجَّةً۔ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا کہکر مثل سے مراد دلیل لیتے ہیں۔ اَلْحَدِيْثُ بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ ضرب المثل۔ اَلْعِبْرَةُ۔ عبرت۔ اَلْاٰيَةُ نشان (اقرب) مفردات میں ہے اَلْمَثَلُ عِبَارَةٌ عَنْ قَوْلٍ فِيْ شَيْءٍ يُشْبِهُ قَوْلًا فِيْ شَيْءٍ اٰخَرَ بَيْنَهُمَا مُشَابَهَةٌ لِيُبَيِّنَ اَحَدُهُمَا الْاٰخَرَ وَيُصَوِّرَهٗ یعنی کسی چیز کے متعلق کسی دوسری چیز سے جو اس سے مشابہ ہو ملتا جلتا بیان کرنا تاکہ انہیں سے ایک کا ذکر دوسرے کی حقیقت کو واضح کردے مثل کہلاتا ہے۔

مَثَلُهُمْ

اِسْتَوْقَدَ: اِسْتَوْقَدَ النَّارَ اِسْتِيْقَادًا کے معنے ہیں اَشْعَلَهَا آگ کو روشن کیا (اقرب)۔

اِسْتَوْقَدَ

اَضَآءَتْ: اَضَآءَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے جو ضَآءَ سے باب افعال ہے۔ اَضَآءَ لازم اور متعدی ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یوں بھی کہتے ہیں اَضَآءَتِ النَّارُ اَيْ اِسْتَنَارَتْ

اَضَآءَتْ

کہ آگ روشن ہوگئی (لازم) اور یوں بھی کہتے ہیں کہ اَضَاءَهَا یعنی آگ کو کسی نے روشن کیا (متعدی) (مفردات)۔ اس آیت میں اَضَاءَ متعدی استعمال ہوا ہے۔ اور فَلَمَّآ اَضَآءَتْ کے معنے ہیں کہ جب اس آگ نے روشن کردیا۔

حَوْلَهٗ

حَوْلَهٗ : کہتے ہیں قَعَدَ حَوْلَهٗ اَیْ فِی الْجِهَاتِ الْمُحِيْطَةِ بِهٖ اس کے ارد گرد بیٹھا۔ (اقرب)۔

ذَهَبَ بِهٖ ۔ لَا يُبْصِرُوْنَ

ذَهَبَ بِهٖ : اَزَالَهٗ اسکو دور کیا۔ (اقرب)۔

ظُلُمٰت

ظُلُمٰتٌ : اَلظُّلُمَاتُ۔ اَلظُّلْمَةُ کی جمع ہے اور اَلظُّلْمَةُ کے معنے ہیں ذَهَابُ النُّوْرِ روشنی کا نہ ہونا یعنی اندھیرا۔ وَقِيْلَ هِيَ عَدَمُ الضَّوْءِ عَمَّا مِنْ شَأْنِهٖ اَنْ يَكُوْنَ مُضِيْئًا اور بعض نے یہ معنے کئے ہیں کہ جس چیز کے لئے روشنی ضروری تھی اس سے اگر روشنی علیحدہ ہوجائے تو اسے ظلمت کا لفظ کہتے ہیں وَيُكَنّٰى بِالظُّلْمَةِ عَنِ الضَّلَالَةِ كَمَا يُكَنّٰى بِالنُّوْرِ عَنِ الْهُدٰى جس طرح نور کا لفظ بول کر ہدایت مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی ظلمت کا لفظ بول کر اس سے ضلالت مراد لیتے ہیں۔ (اقرب) وَيُعَبَّرُ بِهَا عَنِ الْجَهْلِ وَالشِّرْكِ وَالْفِسْقِ اور جہل اور شرک اور فسق کو بھی ظلمت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (مفردات)

اندھیروں کا لفظ اس امر کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ صرف ظاہری تاریکی ہی نہیں بلکہ وہ جگہ بھی پرخطر ہے اور ظاہری اندھیرے کے ساتھ اور کئی قسم کے خطرات بھی لاحق ہو گئے ہیں۔ اردو میں چونکہ اندھیرے کا لفظ اس موقعہ پر جمع کے صیغہ میں استعمال نہیں ہوتا۔ اور اگر استعمال بھی کرلیں تو وہ معنے نہیں دیتا جو عربی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے "قسما قسم" کے الفاظ خطوط میں بڑھا دئے گئے ہیں تا اصل مفہوم پڑھنے والے پر ظاہر ہوجائے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن جب بھی استعمال ہوا ہے اخلاقی یا روحانی امر کی تمثیل بیان کرنے کے لئے ہوا ہے۔ کیونکہ گناہ اور بداخلاقیاں اکیلی نہیں رہتیں بلکہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو اور ایک مصیبت دوسری مصیبت کو کھینچتی ہے۔

لَا يُبْصِرُوْنَ : لَا يُبْصِرُوْنَ اَبْصَرَ سے مضارع منفی جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَبْصَرَهٗ کے معنے ہیں رَاٰهُ اس کو دیکھا۔ وَاَخْبَرَهٗ بِمَا وَقَعَتْ عَيْنُهٗ عَلَيْهِ اور جس پر اسکی نگاہ پڑی اس کے متعلق خبر دی۔ اَبْصَرَ فُلَانًا: جَعَلَهٗ بَصِيْرًا کسی کو دیکھنے والا بنایا۔ اَبْصَرَ الطَّرِيْقُ۔ اِسْتَبَانَ وَوَضَحَ راستہ واضح ہوگیا (اقرب)۔

آیت اَوْ كَصَيِّبٍ میں اعتقادی منافقوں کا ذکر

تفسیر۔ اس آیت میں اعتقادی منافقوں کی جو دل سے کافر تھے مگر بظاہر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے۔ ایک مثال دی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مثال سے ملتے ہوئے بعض الفاظ بیان فرمائے ہیں جن سے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ وہ اس آیت کی تشریح میں ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ وہ حدیث جسے اس آیت کی تشریح کہا گیا ہے یوں ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ اُمَّتِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَتِ الدَّوَآبُّ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيْهِ (فِيْهَا)، فَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِكُمْ وَاَنْتُمْ تَقَعُوْنَ فِيْهِ (مسلم جلد چہارم۔ کتاب الفضائل باب شفقته علی امته)۔ یعنی حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری حالت اور میری امت کی حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے

آگ جلائی۔ جب آگ جل اٹھی تو کیڑے مکوڑے آگ میں گرنے لگے۔ پس میں تو تمہاری کمروں کو پکڑتا ہوں کہ آگ میں نہ گر جاؤ اور تم اسمیں بے تحاشا گر رہے ہو۔

اس حدیث میں بے شک ایک تمثیل بھی بیان کی گئی ہے۔ نیز اس میں آگ جلانے والے ایک شخص کا بھی ذکر ہے۔ مگر ساتھ ہی اس میں یہ لفظ بھی ہیں کہ یہ میری اور میری امت کی مثال ہے۔ لیکن جن کفار کا آیت زیر تفسیر میں ذکر ہے وہ تو اعتقادی کافر ہیں۔ یعنی دل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ من ذالک جھوٹا سمجھتے ہیں اور انکی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ - وہ ہرگز مومن نہیں۔ ایسے لوگوں کو امت رسول اللہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ پس اس حدیث میں اس آیت سے ملتے جلتے ہوئے الفاظ بے شک ہیں لیکن اسمیں ان منافقوں کا ذکر نہیں بلکہ امت کے بعض گنہ گاروں کا ذکر ہے جو عقیدۃً تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں لیکن پورا تقویٰ نصیب نہ ہونے کیوجہ سے اعمال میں کمزور ہوتے ہیں۔

منافقوں کے آگ جلانے سے مراد۔

میرے نزدیک اس آیت میں منافقوں کیحالت بیان کی گئی ہے کہ پہلے تو انہوں نے خود آگ جلائی مگر جب اس آگ کا نور پھیل گیا تو بینائی سے محروم ہو گئے اور اس سے فائدہ نہ حاصل کر سکے۔ آگ جلانے سے یہاں مراد اسلام کو مدینہ میں بلوانا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں آنے کی دعوت دی گئی تو اس میں سب ہی اہل مدینہ شامل تھے اور یہ منافق بھی سب کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے مگر جب اسلام کی روشنی پھیل گئی تو ان کے دلوں کے بغضوں اور کینوں نے انہیں حسد پر مجبور کر دیا اور آخر بینائی بھی کھو بیٹھے۔ یہ ایک روحانی حقیقت ہے کہ جب انسان راستہ کو قبول کر کے پیچھے ہٹتا ہے تو جو نیکی کا مقام اسے پہلے حاصل تھا اسے بھی کھو بیٹھتا ہے۔

آگ سے مراد الہی تعلیم اور نشانات۔

آگ سے الہی تعلیم اور آسمانی نشانات کا مراد لینا قرآن کریم کی دوسری آیات سے ثابت ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں قرآن کریم میں آتا ہے کہ جب وہ مدین سے واپس آ رہے تھے تو انہوں نے الہی تجلی کو آگ کی شکل میں دیکھا چنانچہ فرماتا ہے اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا (قصص ع۴) انہوں نے طور کی جانب ایک آگ دیکھی پھر آگے ذکر ہے کہ جب وہ اس آگ کے پاس گئے تو انہیں آواز آئی کہ يٰمُوْسٰى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اے موسیٰ میں یقیناً اللہ سب جہانوں کا رب ہوں۔ پس آگ کا لفظ تجلی الہی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں بھی یہی مراد ہو سکتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلے تو ان لوگوں نے آگ جلائی یعنی اللہ تعالیٰ کی تجلی کو یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں بلوایا مگر بعد میں حسد کرنے لگ گئے۔ اور آپکے ساتھ وابستگی کے فوائد سے محروم رہ گئے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی الہی کلام کے نزول کو نار سے تشبیہ دی گئی ہے اور وہ یہ ہے :- يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (نور ع۵) یعنی فطرۃ صحیحہ کا تیل ایسی اعلیٰ طاقت رکھتا ہے کہ الہام کی آگ سے روشن ہونے کے بغیر بھی جلنے کے قریب ہوتا ہے۔ یعنی گو جلتا تو الہام کی آگ سے ہی ہے مگر استعداد کے لحاظ سے وہ بھڑکنے کے قریب ہوتا ہے۔

غرض قرآنی محاورہ کے مطابق آگ کا لفظ الہی جلوہ یا الہی کلام پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اور اس

محاورہ کے مطابق اس آیت کا یہی مفہوم ہے کہ منافقوں نے خدا کے کلام کی آگ کو اپنے گھروں میں روشن کیا مگر بعد میں اس کے فوائد سے محروم ہو گئے۔

آگ کے لفظ کا الٰہی جلوہ یا کلام الٰہی کے لئے استعمال کرنا کوئی معیوب امر نہیں۔ کیونکہ آگ بے شک جلانے والی چیز ہے۔ لیکن محبت کے لئے بھی آگ کا لفظ مستعمل ہے کیونکہ وہ ایک نہ بٹنے والی خواہش کو پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح جو چیز گندے خیالات اور گناہ کی خواہش کو مٹا دے اور بھسم کر دے۔ اسے آگ سے تشبیہ دینا بالکل درست اور ایک لطیف تشبیہ ہوگی۔ اور جلوہ الٰہی اور کلام الٰہی کا یہی کام ہے پس انکی اس تاثیر کو مد نظر رکھتے ہوئے انکو آگ سے بھی تشبیہ دیجا سکتی ہے۔ جس طرح بعض تاثیرات کے لحاظ سے انہیں پانی سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اور قرآن کریم نے دی ہے۔

آگ سے مراد جنگ۔

آگ عربی کے محاورہ میں جنگ کو بھی کہتے ہیں اس محاورہ کے رو سے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ منافقوں نے کفار سے منصوبے کر کے جنگ کی آگ بھڑکائی۔ اور خیال کیا کہ اس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو نقصان پہنچا سکیں گے۔ لیکن نتیجہ الٹا نکلا۔ ان جنگوں سے اسلام کو اور بھی تقویت پہنچی اور اسلام کی شان اور بھی بڑھ گئی۔ اور یہ بجائے فائدہ اٹھانے کے اپنی بینائی کھو بیٹھے یعنی حیران رہ گئے کہ اب کیا کریں کہ نتیجہ تو ہماری توقع کے خلاف نکلا۔

آگ کا لفظ ان معنوں میں عرب میں عام طور پر مستعمل ہے۔ کہتے ہیں۔ خَمَدَتْ نَارُهُ اسکی آگ بجھ گئی یعنی لڑائی میں اس کا جتھا شکست کھا گیا۔ عربوں میں آگ کا جنگ سے اسقدر تعلق سمجھا جاتا تھا کہ اگر لڑائی کے میدان میں کسی لشکر کی آگ بجھ جاتی تو وہ اسے اپنی شکست کا شگون سمجھتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر ابوسفیان اس لئے میدان سے بھاگ کھڑا ہوا تھا کہ اسکی آگ بجھ گئی تھی۔ قرآن کریم نے بھی اس محاورہ کو استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (مائدہ ع) یعنی جب بھی لڑائی کی آگ جلاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے۔ یعنی انکی شکست اور ذلت کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ پس اس محاورہ کی روشنی میں اس آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ منافقوں نے لڑائی کی آگ تو اس لئے جلائی تھی کہ اسلام تباہ ہو۔ اُلٹے خود تباہ ہو گئے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کی تشریح

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جنگوں کی وجہ سے اسلام کا نورانی جُبّہ جو منافقوں نے پہن رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اتار لیا یعنی کفار کو فتح تو ملی نہیں الٹا ان کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ جب وہ مسلمانوں کی امداد سے دستکش ہو گئے۔ اور لڑائیوں میں شامل نہ ہوئے تو ان کے اسلام کے دعوے کی قلعی کھل گئی۔ اور جو مسلمان غلطی سے ان پر حسن ظنی رکھتے تھے ان پر کھل گیا کہ یہ لوگ منافق ہیں اور اسلام سے انکو کوئی لگاؤ نہیں۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اسلام کی ترقی نے منافقوں کی حقیقت کو آشکار کر دیا۔ کیونکہ جوں جوں دین کامل ہوتا جاتا ہے اور نور الٰہی ترقی کرتا جاتا ہے۔ شریعت کے احکام بڑھتے جاتے ہیں اور منافقوں کے لئے اس پر عمل کرنا زیادہ سے زیادہ دوبھر ہوتا جاتا ہے۔ اور انکی منافقت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اور نور کا لباس ان سے چھن جاتا ہے۔

تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ سے

یہ بتایا ہے کہ جنگ کی آگ تو انہوں نے اس لیے جلائی تھی کہ اسکی بھڑکتی آگ سے فائدہ اٹھائیں گے اور پھر اپنی شوکت قائم کریں گے مگر ہوا یہ کہ نفاق کے کھل جانیکے سبب سے اور بھی اندھیرے میں جا پڑے یعنی حیران رہ گئے کہ اب کیا کریں یا یہ کہ نفاق کی مرض اور بھی ترقی کر گئی۔

آگ کے معنے اگر اسلام کے کئے جائیں تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ چونکہ انہوں نے خود اسلام کو بلوایا اور پھر اس سے اعراض کیا اللہ تعالیٰ نے انکو اس نور سے بھی محروم کر دیا جو فطرت صحیحہ کے ذریعہ سے ہر انسان کو ملتا ہے اور انکو اسی حالت میں چھوڑ دیا کہ نہ خدا تعالیٰ کے الہام کا نور انکے پاس رہا اور نہ فطرۃ صحیحہ کی ہدایت انکے ساتھ رہی۔

بعض لوگ اس آیت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آگ جلانیوالے ایک شخص کا ذکر ہے لیکن بعد میں ضمیر جمع کی آئی ہے اسکا کیا مطلب؟ اسکا جواب یہ ہے اس آیت میں آگ جلانیوالے کے لئے اَلَّذِیْ کا لفظ آیا ہے اور اَلَّذِیْ عربی میں مفرد تثنیہ اور جمع تینوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ جائز ہے کہ کبھی تو اسکی طرف لفظ کی رعایت سے مفرد کی ضمیر پھیری جائے اور کبھی مراد کے لحاظ سے اگر وہ جمع ہو جمع کی ضمیر پھیری جائے چنانچہ ہمع الہوامع میں جو امام سیوطی کی علم نحو میں نہایت[1] اعلیٰ کتاب ہے لکھا ہے کہ اخفش کہتا ہے اَلَّذِیْ کَمَنْ یَکُوْنُ لِلْوَاحِدِ وَالْمُثَنّٰی وَالْجَمْعِ بِلَفْظٍ وَّاحِدٍ۔ اَلَّذِیْ بھی مَنْ کیطرح ہے اس سے واحد مثنیٰ اور جمع تینوں کیطرف اشارہ کرنا جائز ہوتا ہے۔ پھر اخفش کی روایت سے ایک مصرعہ لکھا ہے اُولٰٓئِکَ اَشْیَاخِیَ الَّذِیْ تَعْرِفُوْنَھُمْ یعنی یہ میرے شیوخ ہیں جنکو تم جانتے ہو۔ اس مصرعہ میں اشیاخی کے لئے جو جمع ہے اَلَّذِیْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی دوسرے مقامات پر اسی طرح اَلَّذِیْ جمع کے لئے استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ (زمر ع) یعنی اَلَّذِیْ کے بعد پہلے مفرد ضمیر استعمال کی اور جَآءَ اور صَدَّقَ کے الفاظ رکھے مگر بعد میں اُولٰٓئِکَ کہکر جمع کے لفظ سے اشارہ کیا۔ اسیطرح ایک اور جگہ آتا ہے وَخُضْتُمْ کَالَّذِیْ خَاضُوْا (توبہ ع) اور تم باتوں میں پڑ گئے جس طرح پہلے لوگ باتوں میں پڑ گئے تھے۔ یہاں اَلَّذِیْ کہکر خَاضُوْا کہا ہے جس میں جمع کی ضمیر ہے۔

ترکھم فی ظلمٰت لا یبصرون کا مطلب

غرض اس آیت میں پہلے تو اَلَّذِیْ کے لفظ کی رعایت سے اِسْتَوْقَدَ کا لفظ لایا گیا جس میں واحد کی ضمیر ہے اور پھر ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ کہہ کر بتا دیا گیا کہ گو لفظ مفرد کا استعمال ہوا ہے مگر مراد اس سے ایک جماعت ہے۔

نیز اسکا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے اِسْتَوْقَدَ میں انکے لیڈر کیطرف اشارہ کیا جس نے آگ جلائی تھی اور پھر ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ میں اسطرف اشارہ کر دیا کہ وہ شخص اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک جماعت بھی ہے۔ اور یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ فساد شروع منافقوں کے لیڈر نے کیا تھا مگر اسکے نتیجہ میں تباہی سب منافقوں پر آئی۔

آیت ہذا میں آگ جلانیوالے کے لئے مفرد کی ضمیر اور پہلی کے بعد جمع کی ضمیر رکھنے کی وجہ

ایک اعتراض اس آیت پر یہ کیا جاتا ہے کہ پہلے تو فرمایا مَثَلُھُمْ پھر فرمایا کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا یعنی پہلے تو ایک جماعت کیحالت بیان کرنیکا ذکر کیا اور بعد میں ایک شخص کو پیش کیا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اول تو جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ اسجگہ ایک شخص کا ذکر نہیں بلکہ اَلَّذِیْ کی وجہ سے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد جمع ہی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک جماعت کیحالت بھی ایک شخص کی حالت کے مشابہ ہو سکتی ہے۔ اسمیں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ جماعت کو ایک سے مشابہت دینا محاورہ کے خلاف نہیں۔ قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ آتا ہے مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ ع) یعنی وہ لوگ جن پر تورات حکماً لادی گئی۔ پھر انہوں نے اس کو نہ اٹھایا یعنی اس پر کاربند نہ ہوئے انکی مثال گدھے کی مثال ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۙ اَوْ كَصَيِّبٍ

وہ بہرے ہیں۔ گونگے ہیں۔ اندھے ہیں پس وہ لوٹیں گے نہیں ۱۵ یا (ان کا حال) اس بارش کی طرح ہے

صُمٌّ

۱۵ حل لغات ۔ صُمٌّ :۔ اَصَمٌّ کی جمع ہے اور کہتے ہیں صَمَّ الرَّجُلُ صَمًّا وَصَمَمًا۔ اِنْسَدَّتْ اُذُنُهٗ وَثَقُلَتْ سَمْعُهٗ۔ اس کے کان بند ہو گئے اور بوجھل ہو گئے یعنی شنوائی جاتی رہی فَھُوَ اَصَمُّ اور ایسے شخص کو اَصَمّ یعنے بہرہ کہتے ہیں اَلْاَصَمُّ اَیْضًا الرَّجُلُ لَا یُطْمَعُ فِیْهِ وَلَا یُرَدُّ عَنْ ھَوَاهُ اور ایسے شخص کو بھی اَصَمّ کہتے ہیں جس کے راہ راست پر آنے کی امید نہ کی جا سکے اور نہ اس سے کسی بھلائی کی امید کی جا سکے اور اسکو بھی اَصَمّ کہتے ہیں جو اپنی شرارت سے باز نہ آئے اور اس کو ہوا پرستی وگمراہی سے روکا نہ جا سکے (اقرب)

عُمْيٌ

لَا يَرْجِعُوْنَ

بُكْمٌ

بُكْمٌ :۔ اَبْكَمُ کی جمع ہے جو بَكِمَ سے صفت مشبہ ہے۔ اَلْبَكَمُ کے معنے ہیں اَلْخَرَسُ مَعَ عَیٍّ وَبَلَهٍ ایسا گونگا پن جس میں زبان کی رکاوٹ اور سادہ لوحی پائی جائے وَقِیْلَ ھُوَ الْخَرَسُ مَا کَانَ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے مطلق گونگا پن کے ہیں خواہ کیسا ہی ہو۔ وَقَالَ ثَعْلَبُ اَلْبَكَمُ اَنْ یُوْلَدَ الْاِنْسَانُ لَا یَنْطِقُ وَلَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ۔ ثعلب جو لغت کے مشہور امام ہیں کہتے ہیں کہ اَبْكَمُ ایسے شخص پر بولا جائے گا جس کی پیدائش ایسی ہو کہ نہ وہ بول سکے اور نہ سُن سکے اور نہ دیکھ سکے۔ نیز اَبْكَم کے معنی ہیں۔ اَخْرَسُ بَیِّنُ الْخَرَسِ۔ ایسا گونگا جس کا گونگا پن ظاہر ہو قَالَ الْاَزْھَرِیُّ بَیْنَ الْاَخْرَسِ وَالْاَبْكَمِ فَرْقٌ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ۔ ازہری کہتے ہیں کہ اَخْرَسُ اور اَبْكَم میں کلام عرب میں فرق ہے فَالْاَخْرَسُ الَّذِیْ خُلِقَ وَلَا نُطْقَ لَهٗ کَالْبَھِیْمَةِ الْعَجْمَاءِ وَالْاَبْكَمُ الَّذِیْ بِلِسَانِهٖ نُطْقٌ وَھُوَ لَا یَعْقِلُ الْجَوَابَ وَلَا یُحْسِنُ وَجْهَ الْکَلَامِ۔ اخرس ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ جو ایسی خلقت میں پیدا ہو کہ اس میں قوت ناطقہ نہ ہو اور وہ حیوان کی طرح ہو اور ابکم ایسے شخص کو کہیں گے جس کی زبان میں نطق تو ہو لیکن وہ جواب نہ دے سکتا ہو اور نہ اچھی طرح کلام کر سکتا ہو۔ (لسان)

عُمْيٌ :۔ اَعْمٰی کی جمع ہے اس کا فعل عَمِیَ ہے کہتے ہیں عَمِیَ :۔ ذَھَبَ بَصَرُهٗ کُلُّهٗ مِنْ عَیْنَیْهِ کِلْتَیْهِمَا یعنی بکلی آنکھوں سے اندھا ہو گیا۔ نیز عَمِیَ فُلَانٌ کے معنے ہیں۔ ذَھَبَ بَصَرُ قَلْبِهٖ وَجَھِلَ دل کا اندھا اور بصیرت سے کورا ہو گیا۔ غَوٰی :۔ بدراہ ہو گیا (اقرب)

لَا يَرْجِعُوْنَ :۔ رَجَعَ سے مضارع منفی جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور رَجَعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اِنْصَرَفَ واپس لوٹا (اقرب) پس لَا يَرْجِعُوْنَ کے معنے ہونگے وہ لوٹیں گے نہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے یہ منافق بہرے۔ گونگے اور اندھے ہیں۔ اس لئے اپنی شرارتوں سے باز نہیں آ سکتے بہرے اس لئے کہ قرآن کریم سُنا مگر پھر بھی اس سے فائدہ نہ اُٹھایا گونگے اس لئے کہ اگر دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے تو ان کے بارہ میں سوال کر لیتے اور اس طرح دل صاف کر لیتے۔ مگر جھوٹی عزت کے خیال سے کہ پہلے تو قوم کو پڑھانے والے سمجھے جاتے تھے اب دوسروں سے کس طرح پڑھیں۔ پوچھنے سے بھی گریز کیا۔ اور گونگوں کی طرح ہو گئے۔ اندھے اس لئے کہ سچے مومنوں کے اندر جو نیک تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ آخر اوس اور خزرج ہی میں سے بیسیوں وہ لوگ تھے جو ہر قسم کے اخلاقی عیوب سے پاک ہو گئے تھے۔ ان کے دل خدا تعالیٰ کی محبت سے پُر تھے اُن کی آنکھیں خدا تعالیٰ کے ذکر سے بہتی تھیں ان کی زبان خدا تعالیٰ کی تقدیس کے گیت گاتی تھی وہ دُنیا میں رہتے ہوئے دُنیا سے جُدا تھے اور آخر ان کی پہلی حالت سے

مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ

جو گھٹا ٹوپ بادل سے (برس رہی) ہو (ایسی بارش) جس کے ساتھ (قسما قسم کے) اندھیرے اور گرج اور بجلی ہوتی ہے

اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ

یہ اپنی انگلیوں کو کڑک کی وجہ سے موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں

الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ

حالانکہ اللہ تمام کافروں کو گھیرنے والا ہے ۵۲۰ قریب ہے

بھی یہ منافق واقف تھے اور ایمان کے بعد کی حالت سے بھی آگاہ تھے پھر اگر قرآن کریم سمجھ میں نہ آتا تھا اور اسکے متعلق اپنے شبہات کا ازالہ کرولنے سے شرماتے تھے تو اس عظیم الشان تبدیلی ہی کو دیکھتے جو خود انکے گھروں میں ظاہر ہو رہی تھی عبداللہ بن ابی ابن سلول کا لڑکا مخلص مسلمان تھا کیا عبداللہ کو نظر نہ آتا کہ اس جیسے کذاب کے لڑکے کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صادق اور راستباز کس طرح بنا دیا اور اس جیسے بزدل کے لڑکے کو آپؐ نے بہادر اور جری کس طرح بنا دیا۔ اس جیسے دُنیا کے پرستار کے لڑکے کو خدائے ذوالجلال کے عرش کے آگے سجدہ میں کس طرح گروا دیا۔ اسی طرح دوسرے منافقوں کے گھروں اور ہمسائیوں کے گھروں میں یہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں مگر دل کی آنکھیں اندھی تھیں اس لئے نظر کچھ نہ آتا تھا سجھائی کچھ نہ دیتا تھا۔

۵۲۰ حل لغات

اَوْ:- حرف عطف ہے۔ اور مندرجہ ذیل بارہ معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اَلشَّكُّ (۲) اَلْاِبْهَامُ (۳) اَلتَّخْيِيْرُ (۴) اَلْجَمْعُ الْمُطْلَقُ (۵) اَلتَّقْسِيْمُ (۶) اَلْاِضْرَابُ (۷) اَلْاِبَاحَةُ (۸) بمعنے اِلَّا (۹) بمعنے اِلٰى (۱۰) اَلتَّقْرِيْبُ (۱۱) اَلتَّرْتِيْبُ (۱۲) اَلتَّبْعِيْضُ (مغنی)

آیت ہذا میں ان میں سے دو معنے چسپاں ہو سکتے ہیں جن کی تشریح ذیل میں درج ہے۔

(۱) اَلْجَمْعُ الْمُطْلَقُ یعنی کبھی دو امور کے درمیان لفظ اَوْ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی "اور" کے ہوتے ہیں چنانچہ ؎

وَقَدْ زَعَمَتْ لَيْلٰى بِاَنِّيْ فَاجِرٌ
لِنَفْسِيْ تُقَاهَا اَوْ عَلَيْهَا فُجُوْرُهَا

میں اَوْ معنے یا نہیں بلکہ بمعنے "اور" ہے یعنی میرے نفس کا تقویٰ مجھے ہی فائدہ دے گا اور اس کی برائی بھی مجھ پر ہی وبال ثابت ہو گی۔

(۲) اَلتَّقْسِيْمُ: کسی چیز کی مختلف اقسام بتانے کے لئے بھی اَوْ آتا ہے۔ چنانچہ نحو کا یہ جملہ کہ اَلْكَلِمَةُ اِسْمٌ اَوْ فِعْلٌ اَوْ حَرْفٌ اس کی مثال ہے اس میں اَوْ تقسیم کے لئے استعمال ہوا ہے اور معنی یہ ہیں کہ کلمہ کی تین قسمیں ہیں یا وہ اسم ہو گا یا فعل ہو گا یا حرف ہو گا۔ (مغنی)

كَصَيِّبٍ:- اَلصَّيِّبُ کے معنے ہیں اَلسَّحَابُ ذُوْالصَّوْبِ۔ ایسا بادل جو کڑک اور بارش والا ہو (اقرب) اَلصَّوْبُ: نُزُوْلُ الْمَطَرِ اِذَا كَانَ بِقَدَرِ مَا يَنْفَعُ یعنے صوب بارش کے ایسے طور پر اور ایسے انداز پر برسنے کو کہتے ہیں جبکہ وہ موجب نفع ہو۔ وَالصَّيِّبُ:- اَلسَّحَابُ الْمُخْتَصُّ بِالصَّوْبِ۔ اور صَيِّب اس بادل کو کہتے ہیں جس میں صوب کی صفت پائی جائے یعنی خوب برسے (مفردات)

اَلسَّمَآءُ:- آسمان كُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ۔ ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز سَقْفُ كُلِّ شَيْءٍ وَبَيْتٍ چھت

كَصَيِّبٍ ... سَمَاء

دَوَاقُ الْبَیْتِ گھر کے سامنے کا چھجہ۔ ظَہْرُ الْفَرَسِ گھوڑے کی پیٹھ۔ اَلسَّحَابُ بادل۔ اَلْمَطَرُ بارش اَلْمَطَرُ الْجَیِّدَۃُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ اَلْعُشْبُ سبزہ وگیاہ (اقرب)

الصَّوَاعِق

ظُلُمَات

ظُلُمَاتٌ :۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۸ نیز تاج العروس جلد ثامن میں ہے کہ اَلْعَرَبُ تَقُوْلُ لِلْیَوْمِ الَّذِیْ تَلْقٰی فِیْہِ الشِّدَّۃَ یَوْمٌ مُظْلِمٌ :۔ اہل عرب شدت اور تکلیف کے دن کو ظلمت والا دن کہتے ہیں۔

رَعْد

رَعْدٌ :۔ رَعَدَ کا مصدر ہے اور رَعَدَ السَّحَابُ کے معنی ہیں صَاتَ وَضَجَّ لِلْاِمْطَارِ بادل برسنے کے لئے گرجا اَلرَّعْدُ کے معنے ہیں۔ صَوْتُ السَّحَابِ۔ بادل کی آواز یعنی کڑک (اقرب) لغوی معنے رَعْدٌ کے بادلوں کے گرجنے اور گرجنے کی آواز کے ہیں۔ آیت ہذا میں زبردست احکام۔ تباہی کی خبروں۔ وعید کی پیشگوئیوں اور احکام جنگ کو رعد یعنی کڑک سے تشبیہ دی گئی ہے۔

حَذَر

اَلْبَرْق

اَلْمَوت

البرق :۔ وَمِیْضُ السَّحَابِ :۔ بادل کی چمک (اقرب) لغوی طور پر برق چمکتی بجلی کو کہتے ہیں۔ آیت ہذا میں اس سے مراد لڑائی کے نظارے ہیں یا کھلی کھلی علمی باتیں، صداقت کے نشانات یا مال غنیمت و اسلامی فتوحات۔

یَجْعَلُوْن

یَجْعَلُوْنَ :۔ جَعَلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ جَعَلَہٗ (یَجْعَلُ) جَعْلاً کے معنے ہیں صَنَعَہٗ اس کو پیدا کیا۔ چنانچہ انہی معنوں میں جَعَلَ اللّٰہُ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ استعمال ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اندھیروں اور روشنی کو پیدا کیا۔ جَعَلَ الشَّیْءَ کے ایک معنی وَضَعَہٗ کے ہیں یعنی اس کو کسی جگہ رکھا۔ نیز جَعَلَ کبھی ظَنَّ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں جَعَلَ الْبَصْرَۃَ بَغْدَادًا اَیْ ظَنَّہَا اِیَّاہَا کہ فلاں شخص نے بصرہ کو بغداد خیال کر لیا۔ بعض اوقات جَعَلَ کے معنے شَرَعَ کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے جَعَلَ یَنْشُدُ مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے شعر خوانی شروع کر دی (اقرب) اس آیت میں جَعَلَ وَضَعَ کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے یَجْعَلُوْنَ کے معنے یہ کئے گئے ہیں کہ ڈال لیتے ہیں۔

الصَّوَاعِقُ :۔ الصَّاعِقَۃُ کی جمع ہے اور الصَّاعِقَۃُ کے معنے ہیں اَلْمَوْتُ موت۔ کُلُّ عَذَابٍ مُّھْلِکٍ۔ ہر مہلک عذاب۔ صَیْحَۃُ الْعَذَابِ۔ عذاب کی آواز۔ نَارٌ تَسْقُطُ مِنَ السَّمَاءِ فِیْ رَعْدٍ شَدِیْدٍ لَا تَمُرُّ عَلٰی شَیْءٍ اِلَّا اَحْرَقَتْہُ وہ آگ جو بادل سے کڑک کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور جس چیز پر گرے اسے جلا دیتی ہے (یعنی گرنے والی بجلی) (اقرب) الصَّاعِقَۃُ :۔ ھِیَ الصَّوْتُ الشَّدِیْدُ مِنَ الْجَوِّ ثُمَّ یَکُوْنُ مِنْہُ نَارٌ فَقَطْ اَوْ عَذَابٌ اَوْ مَوْتٌ وَھِیَ فِیْ ذَاتِھَا شَیْءٌ وَّاحِدٌ وَّھٰذِہِ الْاَشْیَاءُ تَاْثِیْرَاتٌ مِّنْھَا۔ صَاعِقَہ اس ہولناک گرج اور آواز کو کہتے ہیں جو فضا سے پیدا ہوتی ہے پھر اس سے کبھی تو آگ واقع ہوتی ہے یا عذاب یا موت نازل ہوتی ہے۔

حَذَر :۔ اَلتَّحَرُّزُ وَمُجَانَبَۃُ الشَّیْءِ خَوْفًا مِّنْہُ کسی چیز سے بچنا اور خوف کے ڈر سے علیحدہ رہنا۔ (اقرب)

اَلْمَوْت :۔ زَوَالُ الْحَیَاۃِ عَمَّنِ اتَّصَفَ بِھَا۔ اس چیز سے زندگی کا علیحدہ ہو جانا جو زندگی کے ساتھ متصف ہو (اقرب) مفردات میں ہے اَلْمَوْتُ زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْحَیَوَانِیَّۃِ وَاِبَانَۃُ الرُّوْحِ عَنِ الْجِسْمِ۔ قوت حیوانیہ اور روح کا جسم سے علیحدہ ہو جانا موت کہلاتا ہے اَنْوَاعُ الْمَوْتِ بِحَسْبِ الْحَیٰوۃِ۔ موت کئی قسم کی ہوتی ہے جس قسم کی زندگی ہوگی اسی کے مطابق موت ہوگی (۱) فَالْاَوَّلُ مَا ھُوَ بِاِزَاءِ الْقُوَّۃِ النَّامِیَۃِ الْمَوْجُوْدَۃِ فِی الْاِنْسَانِ وَالْحَیَوَانَاتِ وَالنَّبَاتِ۔ انسان۔ حیوانات اور نباتات میں نشوونما کا رک جانا موت کہلاتا ہے جیسے یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا (روم) میں اشارہ فرمایا ہے (۲) اَلثَّانِیْ زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْحَاسَّۃِ احساس کا زوال بھی موت کہلاتا ہے جیسے حضرت مریم علیہا السلام کا قول یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا (مریم ع) ہے کہ اے کاش میں اس سے پہلے کی بے حس ہو چکی ہوتی (۳) زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْعَاقِلَۃِ زوالِ عقل یعنی جہالت بھی موت

کہلاتی ہے جیسے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ (انعام) (۴) اَلرَّابِعُ اَلْحُزْنُ الْمُکَدِّرَۃُ لِلْحَیٰوۃِ۔ ایسے غم جو زندگی کو دوبھر کر دیں جیسے فرمایا یَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّمَا ھُوَ بِمَیِّتٍ (ابراہیم) (۵) اَلْخَامِسُ۔ اَلْمَنَامُ نیند۔ لسان میں ہے وَقَدْ یُسْتَعَادُ الْمَوْتُ لِلْاَحْوَالِ الشَّاقَّۃِ کَالْفَقْرِ وَالذُّلِّ وَالسُّؤَالِ وَالْھَرَمِ وَالْمَعْصِیَۃِ۔ کبھی موت کا لفظ استعارۃً تکلیف دہ حالتوں پر بھی جیسے فقر۔ ذلت۔ سوال۔ بڑھاپا اور معصیت پر بولا جاتا ہے۔

وَاللّٰہُ۔ واؤ اس جگہ حالیہ ہے یعنی جب کفار خدا کی گرفت تلے آ گئے ہیں اور تباہ ہونے والے ہیں پھر اُن سے ڈرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ چونکہ واؤ حالیہ ہے اس لئے ترجمہ "حالانکہ" کیا گیا ہے۔

مُحِیْطٌ۔ اَحَاطَ سے اسم فاعل ہے۔ اَحَاطَ بِالْاَمْرِ کے معنے ہیں۔ اَحْدَقَہٗ مِنْ جَوَانِبِہٖ۔ اس کو تمام طرفوں سے گھیر لیا۔ (اقرب) پس محیط کے معنے ہونگے گھیرنے والا۔

تفسیر۔ اس آیت میں دوسری قسم کے منافقوں کا ذکر ہے جو دل سے کافر نہ تھے۔ مگر کمزوری ایمان کی وجہ سے قربانیوں کے مطالبہ یا دشمن کے حملہ کے وقت گھبرا جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی سزا کی نسبت بندوں کی سزا سے زیادہ خائف تھے اس لئے ایسے اوقات میں کفار کو خوش کرنے کے لئے ان سے مخفی تعلق رکھتے اور ایسی باتیں کرتے جس سے وہ ان کو اپنا خیر خواہ سمجھیں یا بعض خبریں مسلمانوں کی ان کو دیتے اور دل میں یہ سمجھ لیتے کہ اسلام سچا مذہب ہے ہماری اس کمزوری سے اسلام کو حقیقی نقصان تو پہنچ نہیں سکتا پھر کیا حرج ہے اگر ہم اس طرح اپنے آپ کو تکلیف سے بچا لیں۔ اسلام جیسے قربانی والے مذہب میں ایسے لوگوں کی بھی گنجائش نہیں اس لئے ابتداءِ قرآن میں ہی ایسے لوگوں کو بھی کھول کر بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو منافق ہی سمجھتا ہے اور منافقوں والا سلوک ان سے کرے گا۔ اسلام تو سب کچھ خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے قربان کر دینے کا نام ہے جو اس رنگ میں مخلصانہ تعلق نہیں پیدا کر سکتا اسے ان انعامات کی امید نہیں رکھنی چاہیئے جو اسلام کے ساتھ وابستہ ہیں۔

آیت اَوْکَصَیِّبٍ میں عملی منافقوں کا ذکر

اس امر کا ثبوت کہ اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں کمزور ایمان والوں کا ذکر ہے جو کمزوری ایمان کی وجہ سے قومی کاموں میں جرأت سے حصہ نہیں لے سکتے اور وقت پر کمزوری دکھا جاتے ہیں یہ ہے کہ پہلی آیات میں تو منافقوں کے آگ جلانے کا ذکر ہے مگر ان آیات میں منافقوں کے آگ جلانے کا ذکر نہیں بلکہ آسمانی سامانوں کے ظہور کا ذکر ہے۔ پہلی مثال میں یہ ذکر ہے کہ روشنی کے وقت منافقوں کا نور جاتا رہا اور اس میں یہ ذکر ہے کہ روشنی ہو تو یہ لوگ سنبھل جاتے ہیں اور چلنے لگ جاتے ہیں۔ پھر پہلی مثال میں تو یہ ذکر ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں لیکن اس مثال میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی نسبت یہ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ چاہتا تو انہیں بہرے اور اندھے کر دیتا مگر اب تک وہ ایسے ہوئے نہیں۔ ہاں ان کی یہ حالت قائم رہی تو بہرے اور اندھے ہو جائیں گے اسی طرح پہلی مثال میں بتایا تھا کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور دوسری مثال والوں کی نسبت یہ بتایا ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے بلکہ ڈر کے مارے مصیبت کے وقت ان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

بعض مدعیوں کا آیت ہٰذا میں اَوْ کے لفظ سے ایک غلط استدلال اور اس کا رد۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے جو اَوْ کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں پر یا پہلی مثال چسپاں ہوتی ہے یا دوسری۔ اس عبارت سے شک ظاہر ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کو شک نہیں ہو سکتا پس یہ کلام انسان کا ہے۔ یہ اعتراض معترضین کے قلتِ تدبر پر دلالت کرتا ہے کیونکہ شک پر تو یہ آیت اس صورت میں دلالت کرتی۔ اگر اس کا یہ مطلب ہوتا کہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ منافقوں کی حالت وہ ہے جو پہلے بیان ہوئی یا یہ ہے جو ہم اب بیان کرتے ہیں۔ مگر اس آیت میں تو کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے یہ مطلب نکلتا ہو اَوْ کا لفظ بیشک استعمال ہوا ہے جس کے معنے 'یا' اور 'اور' دونوں کے ہوتے ہیں

اور ان دونوں معنوں میں سے کوئی بھی اس جگہ لئے جائیں ان سے شک کا اظہار نہیں ہوتا۔ اگر اس کے معنے "اور" کے کئے جائیں تو بھی اس کے یہ معنے ہونگے کہ منافقوں کے گروہ پر وہ مثال بھی صادق آتی ہے اور یہ بھی یعنی ان کے دو گروہ ہیں ایک پر پہلی مثال صادق آتی ہے اور دوسرے پر دوسری اور اگر اَوْ کے معنے یا کے کئے جائیں تو بھی اس کے یہ معنی ہونگے کہ منافقوں کی یا تو وہ حالت ہے جو اوپر بیان ہوئی اور یا پھر یہ حالت ہے جو ہم اب بیان کر رہے ہیں یعنی ان میں سے ایک گروہ کی وہ حالت ہے اور ایک کی یہ۔

اَوْ بمعنے مطلق جمع کے لحاظ سے آیت ہذا کی تشریح۔

حل لغات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اَوْ کا لفظ علاوہ شک یا ابہام کے معنوں کے تقسیم کے معنے بھی دیتا ہے یعنی اس سے شئے مذکور کی قسمیں بیان کرنی مطلوب ہوتی ہیں جیسے مثلاً یہ کہیں کہ اَلْكَلِمَةُ اِسْمٌ اَوْ فِعْلٌ اَوْحَرْفٌ تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کلمہ اسم ہوتا ہے یا فعل یا حرف بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ کلمہ کئی قسم کا ہوتا ہے یا اسم ہوتا ہے یا فعل یا حرف۔ پس اگر اَوْ کے معنے یا کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ منافقوں کی دو قسمیں ہیں یا تو وہ کافر جو ظاہر میں مسلمان بن گئے ہیں یا وہ مسلمان جو عقیدۃً تو مسلمان ہیں لیکن ایمان کی کمزوری کی وجہ سے کفار سے تعلق رکھنے اور ان کے ڈر سے اسلام کے لئے قربانیاں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

آیت ہذا میں اَوْ تقسیم یا مطلق جمع کے لئے ہے۔

اَوْ بمعنے تقسیم کے لحاظ سے آیت ہذا کی تشریح۔

حماسہ میں جعفر بن علبہ حارثی کا شعر لکھا ہے ؎

فَقَالُوْا لَنَا ثِنْتَانِ لَا بُدَّ مِنْهُمَا
صُدُوْرُ رِمَاحٍ اُشْرِعَتْ اَوْ سَلَاسِلُ

جس کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس دو چیزیں تمہارے لئے ہیں ان دونوں میں سے ایک کے لینے کے سوا تمہیں کوئی چارہ نہیں یا اُٹھائے ہوئے نیزوں کے سرے پڑیں گے یا زنجیریں۔ مطلب یہ کہ تم میں سے بعض کو ہم مار دیں گے اور بعض کو قید کر لینگے۔ اس میں شک کا کوئی شائبہ نہیں ہے بلکہ صرف مخالف کی تقسیم بتائی ہے کہ ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے یعنی مقتولوں اور قیدیوں میں۔

اسی طرح اَوْ کے ایک معنی لغت میں جمع مطلق کے بھی آتے ہیں یعنی یہ لفظ صرف جمع کے معنے دیتا ہے اور یا کے معنی نہیں دیتا چنانچہ لغت میں اس کی مثال یہ مصرعہ لکھا ہے ؎

لِنَفْسِیْ تُقَاهَا اَوْ عَلَیْهَا فُجُوْرُهَا

اس کے یہ معنے نہیں کہ یا میرے نفس کو تقویٰ ملے گا۔ یا فجور۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ میرے نفس کو اس کے تقویٰ کا بھی بدلہ ملے گا۔ اور اس کے گناہ کا بھی بدلہ ملے گا۔

پس اس آیت میں شک کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ منافق اوپر کی صفات والے بھی ہیں اور ان دوسری صفات والے بھی جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

قَوْمٌ اِذَا سَمِعُوا الصَّرَاخَ رَاَيْتَهُمْ
مَا بَيْنَ مُلْجِمِ مُهْرِهٖ اَوْ سَافِعِ (لسان)

یعنی وہ ایسی قوم ہے کہ جب کسی فریادی کی آواز سنتے ہیں تو فوراً ان میں سے کچھ تو گھوڑوں کے منہ میں لگام دے رہے ہوتے ہیں اور کچھ گھوڑوں کی پیشانی کے بال پکڑ کر ان کو کھینچ رہے ہوتے ہیں یعنی سب کے سب فوراً فریادی کی فریاد کو پہنچنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں غرض ان آیات میں منافقوں کے دو گروہوں کا ذکر ہے نہ کہ کسی شک کا اظہار ہے۔

ان معترضین نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہاں ایک فرد کا ذکر نہیں بلکہ ایک گروہ کا ذکر ہے جس کے مختلف افراد مختلف حالتوں کے ہیں ایسے موقعہ پر اَوْ شک کو ظاہر نہیں کرتا شک اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایک شخص کی ایک ہی حالت کے متعلق دو باتیں بتائی جائیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ زید کھڑا ہے یا بیٹھا ہے لیکن جب قوم کی نسبت کہا جائے کہ وہ کھڑی ہے یا بیٹھی تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ اس میں سے کچھ کھڑے ہیں اور کچھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک فرد کی نسبت بھی اگر دو مختلف حالتوں کا ذکر ہو تب بھی اَوْ شک کے معنی نہیں دیتا مثلاً ہم بزدل انسان کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ جب خطرہ

پیدا ہو وہ یا بھاگ جاتا ہے یا چھپ جاتا ہے اس کے معنی یہ نہ ہونگے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے بلکہ یہ معنی ہونگے کہ کبھی اس کے قلب کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بھاگ جاتا ہے اور کبھی ایسی کہ وہ چھپ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں شک کا اظہار نہیں بلکہ یہ بتایا ہے کہ منافقوں کے ایک گروہ کی حالت یہ ہے کہ جیسے بادل سے بارش نازل ہونے کے وقت جبکہ اس کے ساتھ تاریکی اور گرج اور بجلی ہو تو وہ خوب ڈرتے ہیں اور اگر کبھی بجلی گر پڑے تو پھر تو موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں دے کر کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ بارش تو خدا تعالےٰ کی رحمت کی علامت ہے اور اس کے ساتھ اندھیروں اور گرج اور بجلی کا چمکنا لازمی امر ہے کبھی کبھی اس کے ساتھ بجلی کا گرنا بھی ایک سنت ہے ان باتوں سے گھبرا کر بارش کے فوائد سے محروم ہو جانا بیوقوفی ہے۔ مثلاً ایک زمیندار اگر بارش کے وقت بجائے اس کے کہ اپنے کھیت کی مینڈھوں کو ٹھیک کرے اور پانی جمع کرنے کی کوشش کرے کانوں میں انگلیاں ڈال کر گھر بیٹھ جائے تو اسے کوئی شخص عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح اسلام کا ظہور آسمانی بارش کی طرح ہے اس کے ساتھ بھی اندھیروں اور گرج اور بجلی کا وجود ضروری ہے مومن اس کو سمجھتے ہیں اور اس حالت سے ڈرنے کی بجائے قربانیاں کرکے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر عملی منافق اس حالت سے ڈر کر اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور ان فوائد سے بھی محروم رہ جاتے ہیں جو اسلام کی ظاہری ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں اور اللہ تعالےٰ کی ناراضگی بھی حاصل کرتے ہیں پھر فرماتا ہے وَاللّٰہُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ۔ آخر یہ ڈرتے کن سے ہیں؟ کیا کافروں کی ایذا سے؟ کافروں کی تباہی کا تو اللہ تعالےٰ فیصلہ کر چکا ہے جن کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جن کی تباہی کے لئے یہ سامان پیدا ہوا ہے ان سے ڈرنے کا کیا مطلب؟

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدائی سلسلے جب بھی دنیا پر ظاہر ہوتے ہیں بارش برسانے والے بادلوں کی طرح ان کے ساتھ بھی تاریکیاں ہوتی ہیں گرج ہوتی ہے اور بجلیاں ہوتی ہیں یعنی شروع شروع میں تکالیف کا وجود ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے مثلاً تاریکیاں ہوتی ہیں کہ بڑے رشتہ داروں اور بڑے دوستوں سے قطع تعلق کا حکم ہوتا ہے کبھی ہجرت کا حکم ملتا ہے مالی قربانیوں کا مطالبہ ہوتا ہے جانی قربانیوں کا مطالبہ ہوتا ہے پھر ان کے ساتھ گرج بھی ہوتی ہے یعنی سب دُنیا سے مقابلہ کا اعلان ہوتا ہے اور بظاہر یُوں معلوم ہوتا ہے کہ سب دُنیا کو دشمنی کی دعوت دے کر اپنے مدِمقابل کھڑا کر لیا گیا ہے پھر ان کے ساتھ بجلی بھی ہوتی ہے یعنے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔

آیت ہذا میں بارش و بجلی اور گرج سے مراد۔

پھر یہ بجلیاں کبھی صواعق بن جاتی ہیں یعنی دشمن مومنوں کو برباد کرنے کے لئے حملے کرتے ہیں یا مومن جوابی طور پر ان پر حملے کرتے ہیں اور بعض دفعہ ان حملوں کے نتیجے میں بعض مومن موت کا شکار بھی ہو جاتے ہیں جو کمزور دل کے لوگ ہوتے ہیں وہ تو سب مشکلات سے ہی گھبراتے ہیں مگر اس آخری حصہ کے ڈر سے تو ان کی رُوح تھرّانے لگتی ہے۔

منافقین کے کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے مُراد۔

اس آیت میں ان لوگوں کا بھی جواب دیا گیا ہے جو انبیاء کی بعثت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے آنے سے تو فساد پیدا ہو گیا ہے اور بتایا ہے کہ دیکھو بارش کیسی رحمت الٰہی ہے مگر اس کے نازل ہونے کے وقت بھی پہلے سورج چھپ جاتا ہے اور تاریکی چھا جاتی ہے اور گرج اور بجلی نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کا وجود ہے ان کی آمد پر جو شور و شر اُٹھتا ہے وہ نحوست کی علامت نہیں بلکہ آنے والی برکات کا اعلان ہوتا ہے اور انسانوں سے خدا تعالےٰ کے سلوک کا بدل جانا اسی نہج سے ہوتا ہے جس طرح بادل کے آنے پر سورج چھپ جاتا ہے اور روحانی بارش کے بعد الٰہی سورج پھر پہلے سے بھی زیادہ شان کے ساتھ چمکنے لگتا ہے۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے صاعقہ کے معنی گرنے والی بجلی کے ہیں اور اس کے معنے موت اور عذاب کے بھی ہیں اور یہی وہ امور ہیں کہ جن سے کمزور دل لوگ زیادہ

الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۚ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ

کہ بجلی انکی بینائیوں کو اچک کرلے جاوے جب بھی وہ ان پر چمکتی ہے تو وہ اس (کی روشنی)

مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَآءَ

میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کر دیتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا

اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تو یقیناً ان کی شنوائی اور ان کی بینائی کو ضائع کر دیتا ۔ اللہ

گھبراتے ہیں مگر فرماتا ہے کہ صاعقہ کی وجہ سے کان میں انگلی ڈالنے سے کیا ہوتا ہے اوّل تو صاعقہ کے گرنے کے بعد آواز پیدا ہوتی ہے جو بجلی گر چکی اس سے بچنے کے لئے کان میں انگلی دینے سے کیا فائدہ۔ دوسرے جب خدا تعالےٰ کی طرف سے اعلان جنگ ہو گیا تو پھر ان منافقوں کے ڈرنے سے اس میں تبدیلی تو ہو نہیں سکتی بہر حال کافر حملہ کریں گے تب بھی انہیں کچھ نہ کچھ ضرر پہنچے گا اور مومن حملہ کریں گے تب بھی کچھ نہ کچھ نقصان انہیں پہنچے گا۔ ان کے کانوں میں انگلیاں ڈال لینے سے وہ اعلان جنگ تو نہ ٹل جائے گا جو خدا تعالےٰ کی طرف سے ہوا ہے کفر و ایمان کی نبرد آزمائی ان بزدلوں کے اظہارِ بزدلی سے رک تھوڑے ہی جائے گی۔

جیسا کہ اوپر کی تشریح سے ظاہر ہے صواعق ظلمات رعد اور برق کے علاوہ ایک تیسری شئے ہے ضروری نہیں کہ جب بجلی چمکے اس سے صاعقہ بھی گرے۔ صاعقہ کبھی گرتی ہے کبھی نہیں۔ اسی طرح کفر و ایمان کے ٹکراؤ میں ہمیشہ جنگ کی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی کبھی بجلی صرف روشنی کا کام دے جاتی ہے اس میں سے صاعقہ نہیں گرتی اور کبھی اس کے ساتھ صاعقہ بھی گرتی ہے جب بجلی کی چمک کے ساتھ صاعقہ نہ ہو تو منافق نہیں گھبراتے کیونکہ خالی بجلی کا چمکنا اسلام کی شوکت کے اظہار کے لئے ہے ہاں جب اس کے ساتھ صاعقہ بھی ہو تب وہ بہت گھبراتے ہیں چنانچہ اگلی آیت میں اس فرق کو ظاہر کیا ہے۔

اس آیت کی ترکیب کچھ مشکل ہے نحویوں کو اس میں اختلاف ہے کہ مِنَ الصَّوَاعِقِ کا کیا مقام ہے اور حَذَرَ الْمَوْتِ کا کیا اکثر مفسر حَذَرَ الْمَوْتِ کو مفعول لہٗ قرار دیتے ہیں لیکن اس پر بعض مفسرین نے اعتراض کیا ہے کہ مِنَ الصَّوَاعِقِ کا پھر کیا مقام ہے اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مِنْ اس جگہ سببیہ ہے اس پر معترض اعتراض کرتے ہیں کہ اگر مِنْ سببیہ ہے تو وہ بھی فِی معنی مفعول لہٗ ہوا۔ اس صورت میں دونوں مفعولوں میں عطف چاہیئے تھا۔ اس کا جواب پہلا گروہ یہ دیتا ہے کہ فی معنی مفعول لہٗ ہونا اور بات ہے اور مفعول لہٗ ہونا اور بات۔ اس لئے عطف کی ضرورت نہ تھی (محیط)
بعض نے حَذَرَ الْمَوْتِ کو مفعول مطلق قرار دے کر اس مشکل کو حل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حَذَرَ الْمَوْتِ سے پہلے يَحْذَرُوْنَ کا فعل محذوف ہے اس کے مفعول موت کو وہاں سے اٹھا کر حَذَرَ مصدر کو اس کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے اور معنے یہ ہیں کہ صواعق کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح موت سے ڈرنا چاہیئے (املاء ابی البقاء) مِنَ الصَّوَاعِقِ يَجْعَلُوْنَ کا متعلق ہے۔

(کشاف)

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ

ہر (اس) امر پر (جس کا ارادہ کرے) یقیناً پوری طرح قادر ہے ۲۱ اے لوگو اپنے رب کی جس نے تمہیں (بھی) اور انہیں (بھی)

۲۱ حل لغات:۔ اَلْبَرْقُ:۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۲۰

یَخْطَفُ:۔ خَطِفَ سے مضارع ہے اور خَطِفَ کے معنے ہیں اِخْتَلَبَهٗ بِسُرْعَةٍ جلدی سے اُچک لیا۔ خَطِفَ الْبَرْقُ الْبَصَرَ کے معنے ہیں ذَهَبَ بِهٖ بجلی اپنی چمک کے ذریعہ سے بینائی کو لے گئی (اقرب)

اَضَآءَ:۔ کے لئے دیکھو حل لغات ۱۸

اَظْلَمَ:۔ اَظْلَمَ عَلَيْهِ اللَّيْلُ کے معنے ہیں رات نے ان پر اندھیرا کر دیا۔ (اقرب)

ذَهَبَ:۔ ذَهَبَ چلا گیا۔ ذَهَبَ بِهٖ لے گیا۔ نیز ذَهَبَ بِهٖ کے معنے اَزَالَهٗ کے بھی ہیں یعنی ضائع کر دے دُور کر دے (اقرب) قرآن کریم میں یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے مثلاً ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ (ہود ع آیت ۷۱) ابراہیم کا خوف دُور ہو گیا۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ (فاطر ع آیت ۹) تیرا نفس ان کے پیچھے ہلاک نہ ہو۔ اَذْهَبَهٗ بھی ذَهَبَ بِهٖ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن کریم میں ہے اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ (ابراہیم ع ۳) اگر اللہ تعالےٰ چاہے تو تمہیں ہلاک کر کے اور مخلوق پیدا کر دے۔ اس آیت میں ذَهَبَ بِهٖ ضائع کرنے اور تباہ کرنے کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے

شَيْءٌ:۔ شَاءَ کا مصدر ہے عربی میں مصدر کبھی بمعنی اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور شَيْءٌ کا لفظ انہی معنوں میں ہے اور اسکے معنی ہیں چاہی ہوئی بات نیز اس کے معنے ہیں مَا يَصِحُّ اَنْ يُّعْلَمَ وَ يُخْبَرَ عَنْهُ۔ وہ امر یا بات جس کے متعلق خبر دی جا سکے (اقرب) شَيْءٌ کا ترجمہ امر۔ بات وغیرہ کیا جاتا ہے۔ مگر شَيْءٌ کے مکمل معنے ہیں وہ چیز جسے کوئی فاعل چاہے یا جس کا وہ ارادہ کرے۔ ان معنوں کو واضح کرنے کے لئے خطوط میں بعض الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں جب تک ان معنوں کو مدنظر نہ رکھا جائے ناواقفوں کو دھوکا لگ جاتا ہے حتیٰ کہ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کیا خدا چوری پر قادر ہے مرنے پر قادر ہے حالانکہ خدا تعالےٰ چوری اور مرنے کو پسند نہیں کرتا اور نہیں چاہتا کیونکہ یہ امور اس کی ذات کے لئے نقص ہیں خوبیاں نہیں۔

قَدِيْرٌ:۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قَدَرَ عَلَيْهِ (يَقْدِرُ) قَدْرًا وَ قُدْرَةً کے معنے ہیں قَوِيَ عَلَيْهِ کسی چیز کے کرنے پر طاقت پائی اور اَلْقُدْرَةُ کے معنے ہیں۔ اَلْقُوَّةُ عَلَى الشَّيْءِ وَالتَّمَكُّنُ مِنْهُ کسی چیز کے کرنے پر طاقت حاصل کرنا یا کسی پر قابو پا لینا قدرت کہلاتا ہے (اقرب) مفردات میں ہے کہ جب قُدْرَةٌ کا لفظ انسان کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس کو کسی چیز کے کرنے کی طاقت حاصل ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس سے مراد ہر قسم کی کمزوری و عاجزی کی نفی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے قدرت مطلقہ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پوری قدرت حاصل نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ایسی ذات ہے جسے پوری پوری قدرت ہر بات پر حاصل ہے۔ قَدِيْرٌ کے معنی کے ماتحت لکھا ہے هُوَ الْفَاعِلُ لِمَا يَشَآءُ عَلٰى قَدْرِ مَا تَقْتَضِي الْحِكْمَةُ لَا زَائِدًا عَلَيْهِ وَلَا نَاقِصًا عَنْهُ یعنی اپنی چاہی ہوئی بات کو اندازے پر جس کا حکمت تقاضا کرتی ہے بغیر کمی یا بیشی کے کرنے والا قدیر کہلاتا ہے قَدِيْرٌ مبالغہ کا صیغہ ہے اور کثرت و عظمت پر دلالت کرتا ہے عام طور پر بڑا قادر اور بہت قادر سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے لیکن اردو میں جب اس کا مفعول بھی بیان کیا گیا ہو تو بڑا یا بہت کے الفاظ استعمال نہیں ہو سکتے بلکہ یہ مفہوم پورا پورا یا پوری طرح کی قسم کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

اَلْبَرْق یَخْطَف اَضَاءَ قَدِیْر اَظْلَم ذَهَب شَيْء

تفسیر: اس میں بتایا گیا ہے کہ قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائیوں کو اُچک لے جائے یعنی بار بار صاعقہ کی حالت پیدا ہو تو ان کے ایمان بالکل ضائع ہو جائیں لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سامان پیدا کیا گیا ہے کہ کبھی تو بجلی صرف روشنی کا کام دیتی ہے یعنی صرف شوکتِ اسلام کے ظہور کے سامان پیدا ہوتے ہیں اس موقع پر یہ مسلمانوں کے ساتھ آشامل ہوتے ہیں مگر کبھی اس کے ساتھ صاعقہ بھی نازل ہوتی ہے اور اس وقت ان کی نگہ میں دُنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اور یہ وہیں دبک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

آیت یکاد البرق یخطف کی تشریح

اس آیت سے ظاہر ہے کہ بجلی کی دو کیفیتوں کا الگ الگ اثر ان منافقوں پر ہوتا ہے جب صرف روشنی ہو تب اور اثر ہوتا ہے اور جب اس کے ساتھ موت اور ہلاکت ہو تو اور اثر ہوتا ہے۔ الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ روشنی اور تاریکی دونوں بجلی کا فعل ہیں کیونکہ جس طرح اَضَاءَ کی ضمیر برق کی طرف راجع ہے اسی طرح اَظْلَمَ کی ضمیر بھی برق کی طرف راجع ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ روشنی تو بجلی سے ظاہر ہوتی ہے مگر بجلی سے اندھیرا نہیں ہُوا کرتا پس اس جگہ اندھیرے سے مُراد ظاہری اندھیرا نہیں بلکہ اس کے گرنے کے اثر کے نتیجہ میں جو تباہی اور ہلاکت پیدا ہوتی ہے وہ مراد ہے اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں فرمایا ہے کہ قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائیوں کو اچک کر لے جائے مگر ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ جب بجلی ان کے لئے دُنیا کو روشن کر دیتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں یعنی اس وقت یہ اپنے آپ کو مطمئن پاتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگ جاتے ہیں پس جبکہ روشنی کے وقت وہ اچھے ہو جاتے ہیں اور نقصان کی بجائے فائدہ اٹھاتے ہیں تو بجلی کے ان کی بینائیوں کو اچک لے جانے کا کونسا موقع ہُوا۔ اگر کہا جائے کہ اس کا موقع وہ ہے جب وہ نہیں چمکتی اور اندھیرا ہو جاتا ہے تو یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ جب بجلی نہ چمکے تو وہ بینائیوں کو ضائع نہیں کر سکتی پس معلوم ہُوا کہ اس جگہ اندھیرے سے مُراد معنوی اندھیرا ہے یعنی تکالیف اور مصائب کی شدّت اور بجلی کے ساتھ مصائب اور شدائد کی نسبت اس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ گر کر ہلاک کرتی ہے پس مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب بجلی صرف یہ اثر ظاہر کرے کہ روشنی کرے گرے نہیں تب تو یہ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ چل پڑتے ہیں مگر جب بجلی ظلمات پیدا کر دے یعنی صاعقہ کی صورت اختیار کر کے موت اور ہلاکت کا دروازہ کھول دے تب یہ لوگ ڈر کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

آیت وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ کی تشریح

کُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِیْهِ الخ کا مطلب

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ یعنی اگر اللہ چاہے تو ان کے نفاق کی وجہ سے انکی شنوائی کو بھی زائل کر دے اور بینائیوں کو بھی۔ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ ذَهَبَ بِهٖ کے معنے دُور کر دینے اور ضائع کر دینے کے بھی ہوتے ہیں، اور یہی معنے اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ چاہے تو انکی شنوائی کو بھی برباد کر دے اور بینائیوں کو بھی۔ یعنی اب تک تو ان کو یہ توفیق حاصل ہے کہ یہ قرآن سُن کر اس پر ایمان لے آتے ہیں لیکن اگر یہ حالت رہی تو بالکل ممکن ہے کہ ان کا یہ ایمان بھی جاتا رہے اور قرآن کریم کو سن کر ان کے دل میں کوئی ایمان نہ پیدا ہو اسی طرح اگر یہ حالت لمبی چلی تو خطرہ ہے کہ ان کی بینائیاں بھی جاتی رہیں یعنی بوجہ بار بار صاعقہ کے نزول کے اور آفات اور مصائب کے آنے کے یہ مسلمانوں کا بالکل ساتھ چھوڑ دیں اور اب تو یہ حالت ہے کہ روشنی کے وقت مسلمانوں کے ساتھ مل جاتے ہیں پھر یہ حالت ہو جائے کہ روحانی بینائی کے ضائع ہو جانے کے سبب سے ایسے مواقع پر بھی ان کو مسلمانوں کا ساتھ دینے کی توفیق نہ ملے اور یہ کلی طور پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ آیت مشکل آیات میں سے ہے اور جن لوگوں نے

اس کی تفسیر کی ہے مجملاً کی ہے الگ الگ حصوں کا کلی تطابق نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مَیں نے اس کی اس طرح وضاحت کر دی ہے کہ اس کے ہر حصہ کا الگ الگ بھی اور دوسرے حصوں کے ساتھ مل کر بھی مضمون واضح ہو جاتا ہے اور کوئی اغلاق نظر نہیں آتا۔

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ عملی منافق کا وجود قرآن کریم سے ثابت نہیں اور یہ کہ دوسری مثال بھی اعتقادی منافقوں کے متعلق ہے چنانچہ مجھے یاد ہے کہ جب ہم حضرت مولوی نورالدین صاحب خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم پڑھا کرتے تھے تو حافظ روشن علی صاحب مرحوم جو ہماری جماعت کے بڑے پایہ کے عالم تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کریم کے مضامین کے اخذ کرنے کا خاص ملکہ دیا تھا (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی برکات نازل فرمائے اور انکی رُوح کو اپنے قرب میں جگہ دے) اکثر حضرت خلیفۃ المسیح سے بحث کیا کرتے تھے کہ عملی منافق کا وجود عقلاً محال ہے منافق اسی کو کہتے ہیں کہ جس کا عقیدہ خراب ہو مگر علاوہ اس کے کہ ان آیات کا مفہوم بتاتا ہے کہ ان میں عملی منافقوں کا ذکر ہے مجھے اس بارہ میں ایک حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی مل گئی ہے جس میں عملی منافقوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْقُلُوْبُ اَرْبَعَۃٌ قَلْبٌ اَجْرَدُ فِیْہِ مِثْلُ السِّرَاجِ یَزْھَرُ وَ قَلْبٌ اَغْلَفُ مَرْبُوْطٌ عَلٰی اَغْلَافِہٖ وَ قَلْبٌ مَنْکُوْسٌ وَ قَلْبٌ مُصْفَحٌ فَاَمَّا الْقَلْبُ الْاَجْرَدُ فَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ سِرَاجُہٗ فِیْہِ نُوْرُہٗ وَ اَمَّا الْقَلْبُ الْاَغْلَفُ فَقَلْبُ الْکَافِرِ وَ اَمَّا الْقَلْبُ الْمَنْکُوْسُ فَقَلْبُ الْمُنَافِقِ عَرَفَ ثُمَّ اَنْکَرَ وَ اَمَّا الْقَلْبُ الْمُصْفَحُ فَقَلْبٌ فِیْہِ اِیْمَانٌ وَ نِفَاقٌ فَمَثَلُ الْاِیْمَانِ فِیْہِ کَمَثَلِ الْبَقْلَۃِ یَمُدُّھَا الْمَاءُ الطَّیِّبُ وَ مَثَلُ النِّفَاقِ فِیْہِ کَمَثَلِ الْقَرْحَۃِ یَمُدُّھَا الْقَیْحُ وَ الدَّمُ فَاَیُّ الْمَدَّتَیْنِ غَلَبَتْ عَلَی الْاُخْرٰی غَلَبَتْ عَلَیْہِ (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۷) یعنی انسانی دل چار قسم کے ہوتے ہیں ایک صیقل شفاف تلوار کی طرح سُتا ہُوا خدمت دین کے لئے تیار اور دوسرا وہ دل ہوتا ہے کہ اس پر غلاف چڑھا ہُوا ہوتا ہے اور غلاف بھی وہ جو خوب بندھا ہُوا ہو اور تیسرا وہ دل جو اوندھا رکھا ہُوا ہو اور چوتھا وہ دل جو ٹیڑھا رکھا ہُوا ہو یا پتھروں کے نیچے دبا ہُوا ہو۔ وہ جو پہلا دل ہے یعنی صاف وہ تو مومن کا دل ہے اس کا دیا وہ نور ہے جو اس کے دل میں پیدا ہے۔ اور وہ دل جو غلافوں میں بند ہے کافر کا دل ہے (کہ صداقت اس کے اندر نہیں جاتی اور کفر باہر نہیں نکلتا) اور اوندھا رکھا ہُوا دل منافق کا دل ہے جو پہلے صداقت کو مان لیتا ہے پھر اس کا ایمان ضائع ہو جاتا ہے اور وہ دل جو ٹیڑھا رکھا ہُوا ہے یا پتھروں میں دبا ہُوا ہے وہ اس شخص کا دل ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں پائے جاتے ہیں اس کے ایمان کی حالت تو اچھی سبزی کے مشابہ ہے جسے پاک پانی مل رہا ہو اور اس کے نفاق کی حالت ایک زخم کی سی ہے جسے پیپ اور خون خراب کر رہا ہو پھر ان دونوں سے جو حالت غالب آ جائے وہ اسی گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

کیا عملی منافقین کا وجود محال ہے؟

اس حدیث سے ثابت ہے کہ ایک منافق وہ ہوتا ہے جو ایمان کے لحاظ سے تو مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے مگر عملی لحاظ سے اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں اگر اس کی ایمانی حالت غالب آ جائے تو وہ مومن ہو جاتا ہے اور نفاق کی حالت غالب آ جائے تو پورا منافق ہو جاتا ہے یعنی ایمان ضائع ہو جاتا ہے یہ مضمون آیات مذکورہ بالا کی تشریح ہے کیونکہ ان آیات میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ ایسے شخص کی روحانی شنوائی اور بینائی باطل نہیں ہوئی لیکن اگر یہ حالت دیر پا رہی تو ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

عملی منافقین کا ذکر حدیث میں

ان آیات نے مومن کو بہت ہوشیار کیا ہے ان میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کوئی ہدایت آتی ہے اس کے ساتھ شروع میں بہت سی مشکلات اور مصیبتیں

الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

جو تم سے پہلے گذرے ہیں پیدا کیا ہے۔ عبادت کرو ؎تاکہ تم (ہر قسم کی آفات سے) بچو ؎۵۲۲

لپٹی ہوئی ہوتی ہیں دین کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں ہوتا بلکہ خاردار جنگلوں میں سے گزر کر انسان گوہر مراد کو پاتا ہے پس اگر ایمان چاہو تو ان مصائب کو برداشت کرنا پڑے گا اور وہ قربانیاں ضرور دینی پڑینگی جو اس مُراد کے حصول کے لئے مقرر کی گئی ہیں جو شخص ایمان لینا چاہے لیکن قربانیاں پیش نہ کرنا چاہے بیوقوف ہے اور نفاق کی راہ سے خدا تعالیٰ کو پانا چاہتا ہے وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اگر صداقت کے متلاشی اس گُر کو سمجھ لیں تو انکی کامیابی یقینی ہے ورنہ وہ خیالی پلاؤ پکانے والے ثابت ہونگے اور خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے کی بجائے اس کے غضب کو اپنے پر وارد کریں گے۔ العیاذ باللہ۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس میں یہ بتایا کہ کمزور ایمان والوں کا ڈر اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہ ہونے اور اس کی صفات کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے آخر وہ قربانیوں سے کیوں ڈرتے ہیں؟ اسی وجہ سے نہ کہ ایسا نہ ہو کہ کفار کے ہاتھوں ہم دُکھ اُٹھائیں حالانکہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات پر پورا یقین ہو تو وہ کبھی اس شبہ میں مبتلا نہ ہوں۔ اگر ان کو یہ یقین ہو کہ خدا تعالیٰ ہر امر جس کا فیصلہ کرے اس پر قادر ہے تو کفار کی طرف سے کسی خطرہ سے وہ کیوں ڈریں ان کو جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جس امر کا ارادہ کرلے اس پر پورا قادر ہوتا ہے اور اس کے ارادہ کو پورا ہونے سے کوئی شخص روک نہیں سکتا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اسلام کو ترقی دے اور غلبہ عطا کرے تو اس کے اس ارادہ کو کفار خواہ بظاہر کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اور ان کے پاس کتنے ہی سامان کیوں نہ ہوں کس طرح پورا ہونے سے روک سکتے ہیں پس چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر غور کریں اور ان پر اپنے ایمان کو مضبوط کریں پھر ان کا ڈر آپ ہی آپ دور ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کمزوریاں اور گناہ صفات الٰہیہ کے نہ سمجھنے اور ان پر کامل ایمان نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں پس جس شخص کے دل میں ماسوی اللہ کا ڈر پیدا ہو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس ڈر کی نسبت کے مطابق اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق ایمان میں کمی ہے ورنہ وہ ڈر پیدا ہی نہ ہو سکتا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ مرنے پر بھی قادر ہے یا کیا خدا تعالیٰ جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے یہ اعتراض بالکل بے سوچے سمجھے کیا گیا ہے کیونکہ قدیر کا لفظ تو قدرت اور طاقت کے کمال پر دلالت کرتا ہے پھر کیا مرنا اور جھوٹ بولنا قدرت اور طاقت کی علامتیں ہیں کہ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ خدا تعالیٰ مرنے پر اور جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے یہ تو ایسا ہی اعتراض ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص بڑا بہادر ہے تو دوسرا اعتراض کرے کہ کیا وہ ایسا بہادر ہے کہ چور سے ڈر کر بھاگ بھی سکتا ہے ایسے معترض کو کونسا شخص عقلمندوں میں شمار کریگا دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے معترضین کو خاموش کرنے کے لئے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور شَیْءٌ کے معنی چاہی ہوئی چیز کے ہوتے ہیں پس اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر اس چیز پر قادر ہے جس کا ارادہ کرلے ان الفاظ سے وہ اعتراض کلی طور پر باطل ہو جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ موت اور جھوٹ کا ارادہ نہیں کرتا کیونکہ یہ قدرت نہیں بلکہ ضعف کی علامت ہے۔

۵۲۲ حل لغات:۔ اُعْبُدُوْا:۔ امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے۔ اَلْعِبَادَۃُ کے معنے ہیں غَایَۃُ التَّذَلُّلِ۔ کامل تذلل (مفردات) مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ؎۶

رَبَّکُمْ:۔ رَبّ کے معنی کے لئے دیکھو حل لغات فاتحہ ع۵

خَلَقَکُمْ:۔ خَلَقَ (یَخْلُقُ) اَلْاَدِیْمَ کے معنے ہیں قَدَّرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّقْطَعَہٗ۔ کھال کو کاٹنے سے پہلے اُسے جانچا کہ زیادہ سے زیادہ مفید کٹائی کس طرح ہو سکتی ہے اور جب خَلَقَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہوں گے۔ اَوْجَدَہٗ وَ اَبْدَعَہٗ عَلٰی غَیْرِ مِثَالٍ سَبَقَ یعنی کسی چیز کو پیدا کیا عدم سے وجود بخشا۔ نیست سے ہست کیا۔ اختراع کیا۔ (اقرب) پس خَلَقَ کے دو معنی ہوئے (۱) اندازہ کرنا (۲) کسی چیز کا اختراع کرنا۔

لَعَلَّکُمْ:۔ لَعَلَّ حروف مشبّہ بالفعل میں سے ہے اس کے ساتھ یاء متکلم بھی لگائی جاتی ہے جیسے لَعَلِّیْ اور کبھی لَعَلَّ اور یاء متکلم کے درمیان نون زائد کیا جاتا ہے جسے نونِ وقایہ کہتے ہیں جیسے لَعَلَّنِیْ۔ نون کے بغیر استعمال زیادہ ہے یہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے جیسے لَعَلَّ زَیْدًا قَائِمٌ۔ لیکن فرّاز اور بعض دیگر نحویوں کے نزدیک اسم اور خبر دونوں کو نصب دیتا ہے جیسے لَعَلَّ زَیْدًا قَائِمًا

لَعَلَّ کے کئی معنے ہیں (۱) پسندیدہ شئے کی توقع اور ناپسندیدہ شئے سے خوف ان معنوں میں یہ ایسے امر کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا حصول ممکن ہو گو مشکل ہو۔ قرآن کریم میں جو فرعون کا قول نقل ہے۔ لَعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (مومن ع۴ آیت ۳۷) اس کے متعلق مفسرین کہتے ہیں یہ اس کی جہالت پر دلالت کرتا ہے وہ اپنی نادانی سے یہی سمجھتا ہوگا کہ میں اونچے مکان پر سے خدا تک پہنچنے کا راستہ پالوں گا مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ یا تو وہ یہ کہتا ہے کہ علم ہیئت کے ذریعہ سے موسیٰؑ کے مستقبل کو معلوم کرکے اس کا مقابلہ کروں گا اور یہ عقیدہ گو باطل ہے مگر کثرت سے رائج ہے۔ یا پھر اس کا قول بطور تمسخر ہے۔ چونکہ موسیٰؑ بار بار خدا کو آسمان پر بتاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ خدا اور فرشتے مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ اس پر وہ تمسخر سے کہتا ہے کہ لاؤ ایک مکان بناؤ شاید اس طرح ہم موسیٰ کے خدا کو پہنچ جائیں اور ہم بھی اس سے باتیں کرکے دیکھیں۔ مطلب یہ کہ ایک طرف خدا کو آسمان پر ماننا اور دوسری طرف اس سے باتیں کرنے کا دعویٰ یہ خلاف عقل ہے الٰہی علوم سے ناواقف انسانوں کے لئے اس مسئلہ کو نہ سمجھ سکنا قابلِ تعجب نہیں (۲) اس کے معنے محض تعلیل کے بھی ہوتے ہیں جیسے قُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی یہی معنے ترجمہ میں استعمال کئے گئے ہیں (۳) کوفیوں کے نزدیک کبھی اس کے معنوں میں استفہام کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ یعنی لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ کے سوا (شعراء۔ ۱۳۰) جہاں کہیں بھی لَعَلَّ استعمال ہوا ہے توقع کے معنوں میں نہیں بلکہ تعلیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی "تاکہ" یا "تا" کے معنوں میں (۴) کلام ملوک کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی بادشاہ کے لئے کوئی اور یا بادشاہ اپنی نسبت خود امید اور توقع کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن مراد اس سے یقینی بات یا حکم کے ہوتے ہیں۔

تَتَّقُوْنَ:۔ اِتَّقٰی سے مضارع مخاطب کا صیغہ ہے اس کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ع۱ آیت ۳

تفسیر۔ قرآن کریم کی ابتداء اس دعویٰ سے کی گئی ہے کہ بہترین نسخہ وہی ہو سکتا ہے جو علم کامل رکھنے والی ہستی کی طرف سے تجویز ہوا اور وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور اس نے دنیا کی روحانی تکمیل کے لئے قرآن کریم کا نسخہ تجویز کیا ہے جو (۱) تمام کمالات کا جامع ہے (۲) تمام قسم کے ریبوں سے یعنے عیوب سے پاک ہے (۳) کمال کے کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا بلکہ جس مقام کا بھی کوئی متقی ہو اسے اس کے اوپر کے درجہ تک پہنچاتا ہے اور غیر متناہی ترقیات کے راستے کھولتا ہے۔ اس کے بعد متقیوں کے لئے جو قرآن کریم کے زمانہ کے لوگوں کے لئے شرائط مقرر کی گئی تھیں وہ بتائیں اور پھر بتایا کہ اس کلام کا انکار کرنے والوں کا کیا حال ہوگا اس کے بعد ان لوگوں کا حال بتایا کہ جو قرآن کریم کو ظاہر میں مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے یا دل سے مانتے

رَبَّکُمْ
خَلَقَکُمْ
لَعَلَّکُمْ
تَتَّقُوْنَ
لَعَلَّ کے معانی۔
یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا الخ کی تشریح۔

تو ہیں لیکن اس کے بتائے ہوئے طریق پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں اور ان کی نسبت بیان کیا کہ یہ دونوں قسم کے لوگ قرآن کریم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ قرآن کریم کوئی نیا جھنڈا بنانے کے لئے نہیں آیا کہ صرف نام اختیار کرنے پر خوش ہو جائے وہ تو دنیا کی زندگی میں تغیر پیدا کرنے کے لئے آیا ہے پس جب تک اس کو مانکر اس پر عمل کرنے کی کوشش نہ کی جائے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور نہ ایسے لوگوں کو قرآن کریم کے ماننے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے رکوع میں بنی نوع انسان کے لئے کمالات کو حاصل کرنے کے طریق کا بیان

اس اجمالی نقشہ کے بعد تیسرے رکوع میں بنی نوع انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ چونکہ قرآن کریم متقیوں کو اعلیٰ مقامات پر پہنچاتا ہے اس لئے تم کو متقی بننا چاہیئے تاکہ تم اس کے ساتھ جو فوائد وابستہ ہیں ان سے متمتع ہو سکو اور اس کا طریق یہ بتایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو اس سے تم متقی بن جاؤ گے۔

عبادت کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ کامل تذلل اور اتباع کے ہیں جب تک پوری اتباع نہ ہو اور انسان اپنے نفس کو الٰہی تاثرات کے قبول کرنے کے قابل نہ بنائے اس کی عبادت عبادت نہیں کہلا سکتی۔ جو شخص صرف ظاہری شکل عبادت کی پوری کرتا ہے وہ عابد نہیں کہلا سکتا کیونکہ اس نے تذلل اور اتباع کا نقشہ نہیں پیش کیا۔

اس آیت میں عبادت کے بارہ میں ایک لطیف اور مکمل تعلیم دی گئی ہے اور عبادت کی تکمیل کے لئے جن امور کی ضرورت ہے وہ سب بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ عبادت میں فائدہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کامل عبادت کامل تعلق کو چاہتی ہے اور کامل تعلق کامل احسان سے پیدا ہوتا ہے اور کامل احسان وہ ہوتا ہے جو اس انسان پر بھی ہو جو عبادت کرتا ہے اور اس کے بزرگوں پر بھی ہو کیونکہ دنیا میں لوگ مخلصانہ تعلق دو ہی وجہ سے رکھتے ہیں یا تو اس لئے کہ ان پر احسان کیا جائے یا اس لئے کہ ان کے بزرگوں پر احسان کیا گیا ہو چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں قربانیاں اس لئے پیش کی گئی ہیں کہ قربانی کرنے والوں کے ماں باپ پر کسی شخص کا احسان تھا گو خود ان سے کوئی خاص سلوک نہ تھا۔ ہزاروں جانیں ظالم بادشاہوں اور امراء کی خدمت میں اس لئے قربان کی جاتی رہی ہیں کہ ان ظالم بادشاہوں کے آباء نے ان قربانی کرنے والوں کے آباء سے حسن سلوک کیا تھا پس اولاد نے احسان کے بدلے کے طور پر باوجود خود مظلوم ہونے کے اپنی جانیں قربان کر دیں تا اس احسان کے ناقدروان نہ قرار دیئے جائیں لیکن اگر دونوں قسم کے احسان جمع ہو جائیں تو پھر تو محبت کا جذبہ نہایت شدت سے اُبھر آتا ہے چنانچہ اس فطرتی جذبہ کو اپیل کرنے کے لئے اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو اس ہستی کی عبادت کرو جو تمہاری بھی خالق ہے اور تمہارے آباء کی بھی۔ جب عارضی تعلقات کی بناء پر تم اخلاص کا معاملہ کرتے ہو تو کیوں اس ہستی سے اخلاص کا تعلق پیدا نہیں کرتے جو تمہاری بھی محسن ہے اور تمہارے آباء کی بھی محسن رہی ہے۔

اس آیت میں عبادت کی تحریک بھی نہایت عجیب اسلوب سے کی گئی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ضرورت خوب واضح ہو جاتی ہے اس جگہ عبادت کی تحریک ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ اے لوگو اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو بھی اور تمہارے بڑوں کو بھی پیدا کیا ہے اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو کسی وجود کو پیدا کرنے والا ہو وہی اس کی صحیح طاقتوں کو سمجھتا ہے۔ ایک مکان بنانے والا انجنیئر جانتا ہے کہ اس کی تعمیر کردہ عمارت کس حد تک بوجھ برداشت کر سکتی ہے اسی طرح حقیقی اصلاح خدا تعالیٰ ہی کر سکتا ہے جس نے انسان کو اور اس کے آباء کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کی قوتوں کی حد بندی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ کسی اور ہستی کی عبادت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے آپ کو ایسے ناواقف کے سپرد کر کے تباہ کروایا جائے

جو انسان کی قابلیتوں اور اس کی حد بندیوں کو نہیں جانتا
پس اصل عبادت جو صرف ظاہری رسوم کا نام نہیں بلکہ
روحانی راستہ پر چلنے کا نام ہے خدا تعالیٰ کی ہی مناسب
ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ انسان کی قوتیں کیا ہیں اور انہیں
کن ذرائع سے بڑھایا اور مکمل کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد عبادت کی وجہ بھی بتا دی کہ عبادت کی
غرض صرف اقرارِ عبودیت نہیں اگر صرف اقرار عبودیت کسی
عبادت کا مقصد ہوتا تب بھی خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے
کسی کی عبادت کرنا گو ظلم ہوتا مگر اس قدر مضر نہ ہوتا مگر
عبادت تو حصولِ تقویٰ کے لئے کی جاتی ہے یعنی تکمیلِ
روحانیت کے لئے اور تکمیل روحانیت وہ ہستیاں کس طرح
کر سکتی ہیں جو انسان کی خالق نہیں اور اس کی مخفی طاقتوں
اور حد بندیوں سے واقف نہیں۔ وہ تو اسے مکمل کرنے کی
بجائے توڑ کر رکھ دیں گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی انسان نے اپنی باگ ڈور
غیر اللہ کے سپرد کی ہے نقصان اُٹھایا ہے کسی راہنما نے
کھلی آزادی دیکر رُوحانی تکمیل کی راہوں سے بالکل دُور
پھینک دیا اور کسی راہنما نے انسانی قوتوں کو نظر انداز
کرتے ہوئے ایسا بوجھ لاد دیا کہ انسان اس بوجھ تلے دبکر
رہ گیا کسی نے رہبانیت کے اختیار اور طیبات سے اجتناب
کرنے کی تعلیم دی تو کسی نے مضر اور مفید میں فرق نہ کرتے
ہوئے شریعت کو لعنت قرار دے کر انسان کو تباہی کے
گڑھے میں گرا دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ایسی تعلیم
دی کہ جس کی مدد سے نہ تو وہ اپنی ذمہ واریوں کو بھلا دے
اور نہ ایسے بوجھوں تلے دب جائے جو اس کی فطرت کو
کچل کر رکھ دیں۔ غرض لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہہ کر اس طرف
توجہ دلائی کہ عبادت کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انسان فطرتِ
صحیحہ کی راہنمائی میں ترقی کر سکے اور ظاہر ہے کہ فطرت کے
مطابق صحیح راہنمائی وہی کر سکتا ہے جو فطرت انسانی کی تمام
جزئیات سے واقف ہے اور وہ خالق ہی کی ہستی ہو سکتی ہے
نہ کہ کسی اور کی۔

لعلکم تتقون میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت کا حکم کسی ایسی غرض کے لئے نہیں جس میں خدا تعالیٰ کو فائدہ ہو

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے
کہ عبادت کا حکم کسی ایسی غرض کے لئے نہیں جس میں خدا تعالیٰ
کا فائدہ ہو بلکہ عبادت کا حکم خود انسان کے فائدہ کے لئے دیا
گیا ہے اور اس کی غرض صرف یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں کو
صحیح طور پر پورا کر کے انسان کو مکمل بنایا جائے۔ اس مضمون
سے ان لوگوں کے شبہات کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو شریعت
کو لعنت قرار دے کر اسے ترک کر چکے ہیں۔ انہوں نے شریعت
کو لعنت اسی لئے قرار دیا کہ اس کے احکام کو لغو اور بلا حکمت کے
سمجھا اور خیال کیا کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ صرف بندوں پر
حکومت جتانا چاہتا ہے مگر قرآن کریم میں لکھا ہے کہ ہمارے
بنائے ہوئے احکام لغو اور بلا حکمت نہیں بلکہ انسان کو صحیح
راستہ پر چلانے کے لئے ہیں اور اسے افراط و تفریط کی راہوں
سے ہٹا کر ان اعمال کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہیں جن سے اسکی
مخفی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور اس قسم کی تعلیم کو لعنت قرار دینے
والا عقلمند نہیں کہلا سکتا۔ ایک اندھے کو راستہ کے گڑھے سے
ہوشیار کرنے والا کیا لعنت کی تعلیم دیتا ہے؟ کیا کوئی اس
اندھے کو کہہ سکتا ہے کہ میاں اس طرح ہوشیار کرنے والے
تم کو لعنت کا طوق پہناتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر جو مریض کو صحیح
پرہیز بتاتا ہے لعنت کا کام نہیں کرتا بلکہ رحمت کا کام کرتا ہے
پس شریعت کو لعنت قرار دینے والوں کے دعویٰ کی بنیاد صرف
اس پر ہے کہ وہ شریعت کے احکام کو بے حکمت سمجھتے ہیں ممکن
ہے ان کے دین کی یہی حالت ہو مگر قرآنی تعلیم کی یہ حالت نہیں
وہ تو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی غرض تمہیں نفع پہنچانا اور
تباہی کے راستوں سے بچانا ہے۔

تتقون کے معنے وضع لغت کے لحاظ سے

اِتَّقٰی کا لفظ اِوْتَقٰی سے بنا ہے اور وضع لغت کے لحاظ
سے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنی ڈھال بنا لیا۔ اپنے بچاؤ کا
ذریعہ بنا لیا۔ پس تَتَّقُوْنَ کے معنے یہ ہوئے کہ تا تم خدا تعالےٰ
کو اپنی ڈھال بنا لو یعنی خدا تعالیٰ کی مدد سے تباہیوں سے بچ
جاؤ اور وہ تمہارا ذمہ وار ہو جائے جس طرح دنیوی راہنما

انسان کو جنگل یا نادیدہ راستوں سے صحیح اور بے تکلیف نکال کر لے جاتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ تم کو زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں سے صحیح سلامت بچا کر لے جائے۔

ایک اور لطیف بات بھی اس آیت کے متعلق یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اس میں اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور رب کے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس ہستی کے ہوتے ہیں جو پیدا کر کے بتدریج ترقی کی طرف لے جائے۔ اس صفت کے انتخاب سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ہر انسان کی پیدائش میں اس کی آئندہ ترقی کے لئے ایک بنیاد رکھی گئی ہے تاکہ وہ اس پر چل کر کمال تک پہنچے۔ پس جب تک عبادت ربّ کی نہ ہو جو اسے ان مخفی طاقتوں کے مطابق کمال تک پہنچائے مفید نہیں ہو سکتی بیشک انسانوں میں مابہ الاشتراک بھی ہے اور سب انسان اپنے اندر مشابہ طاقتیں بھی رکھتے ہیں لیکن باوجود اس کے ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے باپ کا مزاج اور۔ بیٹے کا اَور۔ بھائی کا اَور۔ کوئی ایک تعلیم سب کے لئے یکساں مفید نہیں ہو سکتی اصول تعلیم ایک ہونگے لیکن جزئیات الگ الگ ہونگی پس ایسے راہنما کی ضرورت ہے جسے ان جزئیات کا علم ہو اور ان کے مطابق ترقی دے کر بلند مراتب تک لے جا سکے پس یہ کام رب ہی کر سکتا ہے جو پیدائش سے جوانی تک ایک خاص طرز پر اس فرد کو بڑھاتا لایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زید یا بکر کے مزاج کی افتاد کس طرح پڑ چکی ہے اور اس کے مزاج کا اس کے باپ یا بھائیوں کے مزاج سے کیا اختلاف ہے پس خالی شریعت پر عمل کافی نہیں بلکہ اپنے رب سے اخلاص اور محبت کا تعلق بھی ضروری ہے تاکہ وہ خاص راہنمائی کے ذریعہ اسے شریعت کی ان جزئیات کی طرف راہنمائی کرے جو اس کی ذات کے لئے زیادہ مفید ہیں بیشک شریعت کہتی ہے نماز پڑھو زکوٰۃ دو مگر وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ اقل ترین نماز اقل ترین صدقہ کے بعد کونسا عمل ایک شخص کی روحانی ترقی کے لئے زیادہ ضروری ہے یہ ہدایت تو ہر شخص کو الگ الگ ہی مل سکتی ہے اور رب کی طرف سے ہی مل سکتی ہے۔

غرض ہدایت عامہ یعنی شریعت کے مل جانے کے بعد بھی انسان محفوظ نہیں ہوتا کیونکہ اسے اعلیٰ ترقیات کے لئے ہدایت خاصہ کی ضرورت ہے جو بطور القاء کے رب کی طرف سے ہی یعنی اس ہستی کی طرف سے ہی جس نے اسے پیدا کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے کا ذمہ لیا ہے آ سکتی ہے پس اس ہستی سے محبت اور عبادت کا تعلق بہر حال ضروری ہے تا ہدایت خاص سے بھی انسان فائدہ اٹھا سکے۔

تَتَّقُوْنَ میں جہاں ایسے امور سے بچنے کے معنی نکلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کو بگاڑ دیتے ہیں وہاں اس سے ان امور سے بچنے کا بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ جو بندوں کے باہمی تعلقات سے تعلق رکھتے ہیں عبادت الٰہی ایسے امور میں غلطی کرنے سے بھی انسان کو بچاتی ہے جو شخص خدا تعالیٰ کو اپنا رب سمجھنے لگے ضرور ہے کہ وہ اس کے بندوں سے بھی اچھا تعلق پیدا کرے گا اور پھر یہ بھی لازم ہے کہ وہ بندوں پر ظلم نہیں کرے گا کیونکہ جو شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ بنا لے گا اس کی نظر اپنی سب ضرورتوں کے لئے خدا تعالیٰ پر ہی پڑے گی خصوصاً جبکہ وہ اس کے رب ہونے پر ایمان رکھتا ہوگا۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو اپنی سب ضرورتوں کا کفیل سمجھے گا وہ بندوں کے اموال پر نظر نہیں رکھ سکتا اور نہ اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے ان کے مالوں میں خیانت کر سکتا ہے نہ ان پر ظلم کر سکتا ہے پس تَتَّقُوْنَ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اگر تم رب کی عبادت اخلاص اور یقین کے ساتھ کرو گے تو آپس کے ظلموں سے بھی بچ جاؤ گے اور دُنیا میں بھی امن قائم ہوگا صحابہ کرام اپنے رب کے بندے بن گئے تھے۔ دیکھو ان کی حکومت میں دُنیا کو کس قدر امن ملا حتیٰ کہ دشمن تک ان کے نیک سلوک کے معترف ہوئے اور آج تک ابوبکرؓ اور عمرؓ کی حکومت کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کی حکومت بھی ایسی ہی تھی مگر چونکہ ان کے بارہ میں اختلاف ہوا ہے میں نے ان کا

تَتَّقُوْنَ میں اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑ دینے والے امور سے بچنے کے علاوہ بندوں کے تعلقات کو خراب کر دینے والے امور سے بچنے کی طرف اشارہ

ذکر نہیں کیا۔ سچ بات یہی ہے کہ دنیا میں امن رب کا بندہ بن جانے کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اگر یورپ خدا کا بندہ بن جاتا تو آج یہ جُوعُ الارض کی بیماری اسے لاحق نہ ہوتی۔

بعض لوگ خلق کے لفظ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم بھی اس امر کا قائل ہے کہ اس دُنیا کی پیدائش ایک ایسے مادہ سے ہوئی ہے کہ جو پہلے سے موجود تھا پس قرآن کریم بھی مادہ کے انادی یا ازلی ہونے کا قائل ہے۔ یہ استنباط ایک وسوسہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ گو خلق کے معنی ایک موجود شے کے اندازہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے معنے جیسا کہ حل لغات میں لکھا جا چکا ہے کسی چیز کو بغیر اصل اور نمونہ پیدا کرنے کے بھی ہوتے ہیں پس ایک خاص موقعہ کے استعمال سے یہ استدلال کرنا کہ سب جگہ وہی معنے ہیں درست نہیں قرآن کریم میں خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام ع ۱۳) بھی تو آتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خلق کا لفظ ہی قرآن کریم میں استعمال نہیں ہُوا بلکہ بَدِیع اور فاطر کا لفظ بھی استعمال ہُوا ہے اور بدیع کے معنے ہیں جو شروع کرے اور فاطر کے معنے ہیں جو کسی پہلے سے موجود وجود کے بغیر نیا وجود پیدا کرے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم میں فَطَرَنِيْ (ہود ع ۵) اور فَطَرَنَا (طٰہٰ ع ۳) کے الفاظ آتے ہیں مگر اس سے ابتدائے پیدائش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ کہ ترتیب کی پیدائش کی طرف۔

یہ آیت اس لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ ترتیب مستقل کے لحاظ سے اس میں قرآن کریم کا سب سے پہلا حکم بیان ہُوا ہے اس سے پہلے یہ کہا گیا تھا کہ متقی ایسا ایسا کرتے ہیں مگر حکم کے طور پر بنی نوع انسان کو نہ کہا گیا تھا کہ تم ایسا کرو حکم سب سے پہلے اسی آیت میں دیا گیا ہے اور سب سے پہلا حکم توحید کا دیا گیا ہے اور ایسے لطیف اور مکمل طور پر دیا گیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی مثلاً اوّل تو عبادت کرو کا حکم النّاس کو دیا گیا ہے یعنی سب دُنیا کو مخاطب کیا گیا ہے نہ کہ صرف عربوں کو جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلام شروع سے ہی سب دُنیا کو دینِ توحید پر جمع کرنے کا مدعی ہے اور قومی عبادتوں کو مٹا کر ایک جامع حلقہ جس میں سب انسان آجائیں بنانا چاہتا ہے پھر عبادت کس کی کرو۔ اس کے لئے اللہ کا لفظ نہیں استعمال کیا بلکہ رب کا لفظ چنا ہے جس سے بہت سے معبودانِ باطلہ کا رد ہو گیا کیونکہ دُنیا میں بہت لوگ شرک پتھروں سے کرتے ہیں رب کے لفظ سے ایسے تمام وجودوں کو عبادت کی حد سے نکال دیا۔ پھر لوگ دریاؤں پہاڑوں ستاروں کی پرستش کرتے ہیں اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ کہہ کر ان کو خارج کر دیا۔ پھر کچھ لوگ اپنے بزرگوں کی پوجا کرتے وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہہ کر ان کو بھی عبادت سے خارج کر دیا۔ غرض ایسی جامع عبارت بیان کی ہے کہ چند لفظوں میں خالص توحید کی تعلیم دے دی ہے۔ اسی طرح تعلق کی مضبوطی کے لئے فطرت کے عین مطابق طریق استعمال کیا۔ دُنیا میں تعلق کے دو ہی طریق ہیں یا محبت یا خوف مختلف اقوام میں عبادت الٰہی دو اسباب کی وجہ سے کی جاتی ہے جیسا کہ کمپیریٹو ریلیجنز (Comparative Religions) والوں نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے اس آیت میں دونوں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے پہلا محبت کے لئے اور لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ خوف کے مضمون کو سامنے لانے کے لئے محبت آگے دو طرح پیدا ہوتی ہے یا حُسن سے یا احسان سے اس مختصر آیت میں ان دونوں باتوں کو خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ وہ حسین ہے کیونکہ رب ہے کیسا اعلیٰ درجہ کا صناع ہے کہ ایک چیز کو نہایت ادنیٰ حالت میں پیدا کرتا ہے پھر درجہ بدرجہ ترقی دیکر کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر احسان کو کس لطیف طور پر پیش کیا کہ وہ تمہارا بھی محسن ہے اور تمہارے ماں باپ کا بھی۔ پھر جہاں

قرآن مجید کے حکم یا ایّھا النّاس اعبُدوا سے دنیا کو امن مل سکتا ہے

خَلَقَکُمْ آیت خلقکم الخ میں خلق کے لفظ سے مادہ کے انادی اور ازلی ہونے کا استدلال اور اس کا جواب۔

قرآن مجید کی ترتیب مستقل کے لحاظ سے آیت یٰٓاَیُّھَا النَّاس میں پہلا حکم۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ

جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو

آیت ہذا میں محبت کے دو درجات کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارہ

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ میں خوف کی طرف اشارہ کیا مستقبل کے احسان کی طرف بھی توجہ دلائی اس قدر چھوٹی سی آیت میں اس قدر وسیع مطالب کا بیان کرنا کیسا معجزانہ کلام ہے فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔

(لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ میں لَعَلَّ کے لئے دیکھو حل لغات)

عجیب بات ہے کہ حضرت مسیح ناصری سے سوال کیا گیا کہ سب سے بڑا حکم شریعت میں کونسا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری سمجھ سے پیار کر۔ پہلا اور بڑا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند ہے کہ تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا آپ کو" (متی باب ۲۲ آیت ۳۷ تا ۳۹) لیکن انجیل کو پڑھ کر دیکھو تو اس میں پہلے اور باتیں بیان کی گئی ہیں اس حکم کا نام ونشان نہیں بلکہ جو سب سے بڑا اور پہلا حکم تھا مسیح ناصری نے بیان ہی نہیں کیا جب تک لوگوں نے سوال نہیں کیا حالانکہ اہمیت کے لحاظ سے پہلے اس حکم کو بیان کرنا چاہیئے تھا جو سب سے بڑا ہے پُرانے عہد نامہ کو دیکھو تو اس میں بھی اس حکم کو کہیں بعد میں جاکر بیان کیا گیا ہے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں لکھی گئی ہیں یہی حال دوسری کتب کا ہے کوئی ایک مذہبی کتاب نہیں جس میں اس حکم کو جو نہ صرف مسیح علیہ السلام کے قول کے مطابق بلکہ عقل کے مطابق بھی سب سے بڑا اور سب سے پہلا ہے پہلے جگہ نہیں دی گئی۔

یہ فضیلت صرف قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلا حکم جو قرآن کریم میں بیان کیا ہے یہی ہے کہ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کیا یہ قرآن کریم کی فضیلت نہیں کہ اس نے پہلے حکم کو پہلی جگہ دی ہے جبکہ دوسری تمام کتب نے اس پہلے حکم کو پیچھے ڈال دیا ہے اگر حکم کے لفظ پر زور نہ دیا جائے تو اس سے بھی پہلے جہاں متقیوں کے عمل کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے وہاں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ فرمایا ہے جس کے معنے یہی ہیں کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کی عبادت کرو اور اس کے بعد اس حکم کو جسے مسیح علیہ السلام نے دوسرے درجہ پر رکھا ہے بیان کیا ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ اس بارہ میں بھی قرآن کریم کی تعلیم فائق ہے کیونکہ مسیح نے تو صرف دل کی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآن کریم نے جامع الفاظ رکھے ہیں اور مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کہہ کر فرمایا ہے کہ اپنی دلی محبت بھی اپنے ہمسائیوں کو دے اور اپنا علم بھی اور اپنا مال بھی اور اپنی جان بھی۔ غرض ان دونوں احکام کو اسلام نے ان کے مناسب حال جگہ دی ہے اور مسیح کے الفاظ سے زیادہ شاندار الفاظ میں۔ اگر کوئی کہے کہ مسیح نے تو سارے دل اور اور ساری جان اور ساری سمجھ کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو زیادہ شاندار ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے وہی مضمون ایک لفظ میں ادا کر دیا ہے جو مسیح نے ایک فقرہ میں بیان کیا ہے کیونکہ قرآن کریم کہتا اُعْبُدُوْا عبادت کرو اور عبادت کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بیان کیا گیا ہے غَایَۃُ التَّذَلُّلِ کے ہیں یعنی اپنی سب طاقتوں کو انتہائی درجہ پر خرچ کرنا۔ پس عبادت میں سارا دل بھی اور ساری جان بھی اور ساری سمجھ بھی اور اس کے سوا ساری قوت بھی اور سارے اسباب بھی شامل ہیں اور اس ایک لفظ سے قرآن کریم نے وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ جو حضرت مسیح ناصری بیان کرنا چاہتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

(ذات باری کے متعلق ایک نوٹ اگلی آیت کے بعد دیکھو)

بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ
چھت کے طور پر بنایا ہے اور بادلوں سے پانی اُتارا ہے پھر اس (پانی) کے ذریعہ سے

الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا
میووں کی قسم کا رزق تمہارے لئے نکالا ہے پس تم سمجھتے بوجھتے ہوئے اللہ

وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا
کے ہمسر نہ بناؤ ۲۳ؐ اور اگر اس (کلام) کے سبب سے جو ہم نے

۲۳ؐ حل لغات:۔ اَلْاَرْضُ:۔ کُرۂ زمین كُلُّ مَا سَفَلَ۔ ہر نیچے کی چیز (اقرب)

فِرَاشًا:۔ فَرَشَ الشَّیْءَ (یَفْرُشُ) فَرْشًا وَ فِرَاشًا کے معنے ہیں۔ بَسَطَهٗ کسی چیز کو پھیلایا۔ کہتے ہیں فَرَشَ فُلَانٌ بِسَاطًا۔ بَسَطَهٗ لَهٗ۔ اس کے لئے غالیچہ بچھایا۔ اور اَلْفِرَاشُ کے معنے ہیں مَا يُفْرَشُ وَيُنَامُ عَلَيْهِ جو بچھایا جائے اور اس پر سویا جائے (اقرب) اَلْفَرْشُ کے معنے ہیں۔ بَسْطُ الثِّيَابِ کپڑوں کا پھیلانا وَيُقَالُ لِلْمَفْرُوْشِ فَرْشٌ وَفِرَاشٌ اور بچھائی ہوئی چیز کے لئے فِرَاشٌ اور فَرْشٌ کا لفظ بولتے ہیں قَالَ هُوَالَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا اَىْ ذَلَّلَهَا وَلَمْ يَجْعَلْهَا نَاتِئَةً لَا يُمْكِنُ الْاِسْتِقْرَارُ عَلَيْهَا اور آیت هُوَالَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا میں زمین کو فراش بنانے کے یہ معنی ہیں۔ کہ اس کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ہموار اور درست ہے اور اس طور پر اٹھا ہوا نہیں بنایا کہ اس پر آرام حاصل نہ ہو سکے (مفردات) وَالْفَرْشُ مَا يُفْرَشُ مِنَ الْاَنْعَامِ اَىْ يُرْكَبُ اور فرش ایسے چارپایوں کو بھی کہتے ہیں۔ جن پر سواری کی جاتی ہے (مفردات)

بِنَآءً:۔ اَلْبِنَاءُ بَنٰى (يَبْنِىْ) کا مصدر ہے اور اس کی جمع اَبْنِيَةٌ آتی ہے کہتے ہیں۔ بَنَاهُ يَبْنِيْهِ (بَنْيًا وَبِنَاءً) نَقِيْضُ هَدَمَهٗ یعنی کسی مکان کو بنایا اور جب بَنَى الْاَرْضَ کہیں تو معنے ہونگے بَنٰى فِيْهَا دَارًا اَوْ نَحْوَهَا کسی رقبہ زمین میں کوئی مکان بنایا (اقرب) اَلْبِنَاءُ اِسْمٌ لِمَا يُبْنٰى بِنَاءً لفظ بناء ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو بنائی جاوے (مفردات)

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ:۔ اَلسَّمَآءُ کے معنی یہاں بادل کے ہیں۔ یعنی بادلوں سے پانی اُتارا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲۰

اَخْرَجَ:۔ نکالا۔ پیدا کیا (مفردات)

اَلثَّمَرَاتُ:۔ اَلثَّمَرَةُ کی جمع ہے اور اَلثَّمَرَةُ کے معنے ہیں حَمْلُ الشَّجَرِ یعنی درخت کا پھل (اقرب) مفردات میں ہے اَلثَّمَرُ اِسْمٌ لِكُلِّ مَا يُتَطَعَّمُ مِنْ اَحْمَالِ الشَّجَرِ کہ درختوں کے ان پھلوں کو جن کو کھانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ثَمَرٌ کہتے ہیں۔

رِزْقًا:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۴

اَنْدَادًا:۔ نِدٌّ کی جمع ہے اور اَلنِّدُّ کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ۔ مثل۔ ہمرتبہ وَلَا يَكُوْنُ اِلَّا مُخَالِفًا لفظ نِدٌّ کا استعمال صرف اس نظیر اور مشابہ کے لئے ہوتا ہے جو مخالف ہو اور مَا لَهٗ نِدٌّ کے معنے ہیں مَا لَهٗ نَظِيْرٌ کہ اس کا کوئی مثل اور ہمرتبہ نہیں (اقرب) نِدُّ الشَّیْءِ

مُشَارِكُهٗ فِی الْجَوْهَرِ وَمِثْلُهٗ مُشَارِكُهٗ فِیْ أَیِّ شَیْءٍ كَانَ کسی چیز کا ندّ وہ ہوتا ہے جو اس کے جوہر میں شریک ہو اور مثل اس پر بولتے ہیں جو اپنے مثل کی کسی بات میں شریک ہو یعنی ندّ خاص ہے اور مثل عام ہے۔ اور ان دونوں میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ نیز نِدُّ الشَّیْءِ کے معنے ہیں مَا یَسُدُّ مَسَدَّہٗ جو کسی چیز کے قائم مقام ہو سکے قَالَ ابْنُ الْاَثِیْرِ هُوَ مِثْلُ الشَّیْءِ الَّذِیْ یُضَادُّهٗ فِیْ اُمُوْرِهٖ وَیُنَادُّهٗ اَیْ یُخَالِفُهٗ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ ندّ کسی چیز کے اس مثیل پر بولیں گے جو اس کے جملہ امور کے مخالف ہو (تاج العروس)

زمین کو فراش بنانے سے مراد

تفسیر۔ اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا ہے پہلی آیت میں تو یہ بتایا تھا کہ عبادت صرف رَبّ کی اور اس رب کی جس نے تم کو پیدا کیا ہو اور تمہارے آباء کو بھی پیدا کیا ہو صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ وہی تمہاری قوتوں کی صحیح راہنمائی کر سکتا ہے اب اس آیت میں بتاتا ہے کہ آسمان و زمین بھی خدا تعالیٰ نے بنائے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی اعمال کا وجود ان اشیاء سے پیدا ہوتا ہے جو اس کے گرد و پیش ہیں آخر انسانی عمل کس چیز کا نام ہے؟ اس کی تجارت اسکی زراعت اسکی صنعت و حرفت اسکی سیر و سیاحت یہی اعمال ہیں جو انسان بجا لاتا ہے اور یہ سب امور زمین و آسمان اور ان کی تاثیرات سے پیدا ہوتے ہیں پس وہی ہستی انسان کے اعمال کو صحیح راستہ پر چلا سکتی ہے جو زمین و آسمان اور ان کی تاثیرات کو پیدا کرنے والی ہے دوسری کوئی ہستی اس بارہ میں کامل ہدایت نہیں دے سکتی کیونکہ وہ بوجہ ان اشیاء کی خالق نہ ہونے کے ان کی تاثیرات اور قوتوں کی پوری طرح واقف نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ ان اشیاء کو انسان کی مدد پر لگا سکتی ہے کیونکہ اسے ان پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ پس فرمایا کہ اس خدا کی عبادت کرو جس نے زمین کو تمہارے لئے فراش کے طور پر بنایا ہے یعنی ایسا بنایا ہے کہ اس سے تم فائدہ اُٹھا سکتے ہو اور اس میں آرام کر سکتے ہو جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے فراش سے مراد اس طرح پھیلانے کے ہیں کہ اس پر آرام کیا جا سکے پس زمین کو فراش کی طرح بنانے کے یہ معنے ہیں کہ اس میں انسان کے آرام کے سامان پیدا کئے گئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ زمین پر ہر قسم کا تصرف انسان کے آرام کا موجب نہیں ہوتا بلکہ زمین انسان کی ہلاکت کا موجب بھی ہو جاتی ہے پس زمین کی طاقتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے بھی کسی قاعدہ اور دستور کی ضرورت ہے اور وہی قاعدہ اور دستور سب سے زیادہ مناسب ہو سکتا ہے جو زمین کے پیدا کرنے والے کی طرف سے مقرر کیا جائے

آیت ہٰذا میں پہلی آیت کے مضمون کی تکمیل

آسمان کو چھت بنانے سے مراد

اسی طرح آسمان کو بطور چھت کے بنایا گیا ہے یعنی حفاظت کا ذریعہ سورج اور چاند اور ستاروں کی روشنیاں کس طرح ہزاروں فائدے انسان کو پہنچا رہی ہیں مگر ان کی مخالف تاثیرات بھی ہیں جو انسان کے اخلاق و عادات پر اثر ڈالتی ہیں ہزاروں بیماریاں اور حادثات اجرام فلکی کے دوروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسدان تسلیم کریں یا نہ کریں دُنیا پر بعض ایسے حوادث آتے ہیں جو زمینی تغیرات کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ مثلاً مَیں نے دیکھا ہے کہ بعض ایام میں عورتیں کثرت سے اسقاط کی مرض میں مبتلا ہوتی ہیں بعض ایام میں لڑکیوں کی پیدائش کی کثرت ہوتی ہے اور بعض میں لڑکوں کی بعض ایام میں تکلیف دہ زچگی کی شکایات بڑھ جاتی ہیں بعض ایام میں دیکھا گیا ہے کہ ہڈی ٹوٹنے کے حادثات کثرت سے ہوتے ہیں بعض ایام میں ریلیں کثرت سے ٹکراتی ہیں ان تغیرات کو محض حادثہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ آخر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے کہ کیوں بعض ایام میں گر کر سر کو چوٹ آنے کے حادثات زیادہ ہوتے ہیں اور بعض ایام میں گر کر ٹانگوں کو زیادہ ضربیں آتی ہیں۔ میں نے اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب سے اس کا ذکر کیا اور انہوں نے اس کا خیال رکھا تو بعد میں کئی دفعہ اسکی رپورٹ کی کہ آج فلاں حادثہ کے مریض کثرت سے آ رہے ہیں حالانکہ وہ تکلیفیں بیماریوں کا

نتیجہ نہیں کہ انہیں دبا دیا جائے بلکہ حادثات تھے جو ایک ہی صورت میں ظاہر ہوئے اور لطیفہ یہ کہ چوٹوں کے مریض آنے شروع ہوئے تو کبھی پے در پے سر کی چوٹوں کے مریض آئے اور کبھی پے در پے لاتوں کی چوٹوں کے مریض آئے اس تجربہ کے بعد انہوں نے تسلیم کیا کہ واقعہ میں یہ امر ایک حیرت انگیز قانون قدرت کے مخفی اسباب پر دلالت کرتا ہے۔

غرض علاوہ اس کے کہ بارشوں خشک سالی کھیتوں کے پکنے یا موسمی تغیرات کا تعلق اجرام فلکی سے ہے حوادث اور بعض غیر متعدی بیماریوں کا تعلق بھی اجرام فلکی سے ہے چنانچہ میں نے یہ تجربہ کیا ہے کہ جس علاقہ میں پورا چاند گرہن ہو اس علاقہ میں اور اس موسم میں زچگی کی تکالیف بہت زیادہ نمایاں طور پر پیدا ہو جاتی ہیں میں نے کئی دفعہ دوستوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے اور بعد میں اسی طرح مشاہدہ کیا ہے پس ان امور سے ایک عام اندازہ اس امر کا کیا جا سکتا ہے کہ زمین و آسمان مل کر سارے عالم پر مختلف اثرات ڈالتے ہیں اور اسی قسم کے بعض مشاہدات سے بعض لوگ اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سورج، چاند، ستارے بھی خدائی میں شریک ہیں اور ان کے خوش کرنے کے لئے کئی قسم کی عبادات بجا لاتے ہیں مگر یہ سب وہم ہیں جو انسان کو انسانیت سے گرا کر حیوانیت کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں اصل حقیقت تو ان تاثیرات میں صرف اس قدر ہے کہ انسان اس تمام کائنات کو ایک طبعی مؤثر اپنے اعمال اور قویٰ پر سمجھے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور اسکی اعانت کا طالب ہو۔ تاکہ اپنے علم سے کام لینے کے بعد جن باتوں کا اسے علم نہیں ان میں خدا تعالیٰ کی مدد اسکی راہنمائی کرے اور اسکی غیبی حفاظت کے سامان کرے ورنہ اس قسم کے امور کو دیکھ کر اجرام فلکی کی عبادت کرنی تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی طاعون کے کیڑوں یا ہیضہ کے کیڑوں کی عبادت شروع کر دے۔ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک کے بعض جاہل ان چیزوں کی عبادت کر بھی رہے ہیں چنانچہ چیچک کی دیوی کی عبادت تو ہمارے ملک میں مشہور ہے اسی وہم کی بناء پر ہمارے ملک میں چیچک کا نام نہیں لیتے بلکہ اسے ماتا یعنے ماں کہتے ہیں تاکہ وہ مزعومہ دیوی خوش ہو کر ماتا کہنے والے ماں باپ کی اولاد کو چھوڑ دے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

آیت ہذا میں مضرتوں سے محفوظ رکھنے والے خدا سے تعلق پیدا کرنے کی ترغیب۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام کے سامان پیدا کئے ہیں لیکن یہ سب سامان ظاہر نہیں ان میں سے ظاہر بھی ہیں اور مخفی بھی پس انسان کو اس دُنیا کے پیدا کرنے والے رب سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے تاکہ وہ ان سے صحیح فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور ان کی مخفی مضرتوں سے محفوظ رکھے کیونکہ انسان ساری تدبیریں کر لینے کے بعد بھی ارضی و سماوی تغیرات کے ضرروں سے کامل طور پر نہیں بچ سکتا خدا تعالیٰ ہی پوری طرح اسکی حفاظت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو دیکھو لوگ ان کے تباہ کرنے کے لئے کیسے جتن کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کی سب تدبیروں کو باطل کر دیتا ہے۔

زمین و آسمان کا مل کر سارے عالم پر مختلف اثرات ڈالنا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے دشمنوں نے طرح طرح کے حملے کئے۔ آپؐ کو زہر دینے کی کوشش کی گئی مگر آپؐ کے ایک ساتھی تو شہید ہو گئے لیکن آپؐ جن کو زہر دینے کی اصل کوشش تھی محفوظ رہے۔ آپؐ پر خفیہ کمینوں میں بیٹھ کر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر دشمن ناکام رہا۔ علیحدگی میں آپؐ پر حملہ کرنے کی تدبیر کی گئی مگر اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی دشمن کو نامراد رکھا گھر بلا کر اوپر سے پتھر پھینکنے کا منصوبہ یہود نے کیا مگر اللہ تعالیٰ نے الہام سے خبردار کر دیا اور دشمن کو شرارت کا اقرار کرنا پڑا۔ غارِ ثور میں دشمن سر پر پہنچ کر جس طرح لوٹا آج تک دُنیا اس پر حیران ہے۔

خدا تعالیٰ کا انبیاء کو خلق عادت طور پر ضرروں سے محفوظ رکھنا

یہ سب کچھ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے خدا کے فضلوں سے ہُوا۔ آپؐ نے اس سے تعلق جوڑا تو اس نے آپؐ سے جوڑا۔ اور سارے عالم کو آپؐ کی خدمت میں لگا دیا حضرت مسیح ناصری کو جب ان کے دشمنوں نے اپنی طرف سے صلیب پر لٹکا کر مار ہی دیا تھا خدا تعالیٰ نے کس طرح ایک

تاریک آندھی بھیج کر حاکم اور یہود دونوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کو وقت سے پہلے صلیب پر سے اُتار لیں اور اس طرح حضرت مسیح اس ذلّت کی موت سے محفوظ ہو گئے جو دشمنوں نے ان کے لئے تجویز کی تھی۔ اس زمانہ میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے ذریعہ سے ایسے بیسیوں واقعات ظاہر ہوئے آپؑ کو خدا تعالیٰ نے بتایا کہ طاعون سے آپ کا گھر محفوظ رہیگا سو باوجود اسکے کہ سالہا سال تک قادیان میں طاعون پھیلتی رہی اور آپؑ کے گھر کے دائیں بائیں بھی اس سے کئی موتیں ہوئیں مگر آپؑ کے گھر میں کوئی حادثہ نہ ہوا۔ آپ کی جوانی کا ایک واقعہ ہے جس کے بعض ہندو صاحبان بھی گواہ ہیں چنانچہ مسٹر جسٹس کنور سین جو جموں کی ریاست کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں ۔ ان کے والد لالہ بھیم سین بھی اس کے گواہ تھے اور انہوں نے اپنے صاحبزادے کے سامنے اس کے متعلق شہادت بھی دی ہوئی ہے جن سے اب بھی پُوچھا جا سکتا ہے وہ واقعہ یُوں ہے کہ آپؑ سیالکوٹ میں ایک مکان پر تھے کہ ایک معمولی سی آواز چھت میں پیدا ہوئی آپؑ نے سب ساتھیوں کو جگایا جن میں لالہ بھیم سین صاحب وکیل بھی تھے اور کہا کہ فوراً نیچے اُترو مگر انہوں نے ہنسی اُڑائی اور کہا کہ آپؑ کو وہم ہو گیا ہے مگر پھر تھوڑی دیر بعد آپ نے سب کو اُٹھا کر دوستانہ جبر سے اُترنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان سب سے کہا کہ پہلے تم اُترو کیونکہ یہ چھت تب تک قائم ہے جب تک میں اس پر ہوں اس لئے میں سب سے آخر میں اُتروں گا جب سب دوست سیڑھیاں اُتر چکے تو پھر آپ اُترے اور جونہی آپؑ سیڑھی پر آئے چھت یکدم زمین پر آ رہی۔ یہ سب امور جو دنیا کی پیدائش سے اس وقت تک ظاہر ہوتے چلے آئے ہیں اور ظاہر ہوتے رہیں گے اس امر کا ثبوت ہیں کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک وجود ہے اور اس سے تعلق پیدا کرنے سے ہی انسان کامل طور پر ہلاکت سے بچ سکتا ہے۔ اور یہی اس آیت کا مطلب ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کو خدا تعالیٰ نے ہی تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس ان سے کامل فائدہ تم اسی سے تعلق پیدا کر کے حاصل کر سکتے ہو اور نقصانات سے بھی تم اسی سے تعلق پیدا کر کے محفوظ ہو سکتے ہو۔

خدا تعالیٰ کے خارق عادت طور پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو محفوظ رکھنے کے متعلق بعض واقعات کا ذکر۔

یاد رہے کہ اس فائدہ سے ظالمانہ فائدہ مُراد نہیں جو ظالم بادشاہ اور جابر رؤسا اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ فائدہ اُٹھاتا نہیں بلکہ لعنت مول لیتا ہے۔ پس خدا رسیدہ لوگوں کی زندگی کے مقابلہ پر ظالم بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کے حالات رکھ کر مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے عزت نہیں بلکہ ذلّت حاصل کی تھی۔

سَمَآء سے مراد

یاد رہے کہ اس آیت میں سَمَآء سے مُراد بلندی ہے نہ کہ کوئی ٹھوس دائرہ جیسا کہ عوام الناس کا خیال ہے اور اس بلندی سے مراد وہ تمام فضاء ہے جس میں ستارے اور سیّارے پائے جاتے ہیں اور چھت بنانے سے یہ مُراد ہے کہ بلندی کو حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے حفاظت کے لئے چھت کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ چھت بھی بہت سی تکالیف سے حفاظت کا ذریعہ ہوتی ہے اور یہ ایک محاورہ ہے۔

'بلندی کو حفاظت کا ذریعہ بنایا' سے یہ مطلب ہے کہ انسان کی زندگی کے قیام کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے وہ بلندی سے تعلق رکھتی ہیں پانی بھی بلندی سے برستا ہے ہَوا بھی اوپر ہے۔ اسی طرح سورج چاند وغیرہ ہیں اور انہی اشیاء سے وہ سب چیزیں تیار ہوتی ہیں جن سے انسان زندہ رہتا ہے روحانیات میں بھی انسان اوپر کا محتاج ہے

سَمَآء کے معنے بادل

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً سے مراد یہ ہے کہ بادلوں سے پانی اُتارا ہے۔ اس جگہ سَمَآء سے مراد فضاء کی بلندی نہیں بلکہ بادل ہے اور بادل کے معنے استعارۃً نہیں کئے گئے بلکہ لغت سے ثابت ہیں اور قرآن شریف میں دوسری جگہوں پر بھی اس معنے میں یہ لفظ استعمال ہُوا ہے چنانچہ فرماتا ہے وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا (سورۃ انعام عٔ) کہ ہم نے ان پر بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔ اسی طرح پھر فرماتا ہے

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (سورۂ نوح ع ۱ و ہود ع ۵) کہ اللہ تعالیٰ تم پر موسلا دھار برسنے والا بادل بھیجے گا۔ آیت زیرِ تفسیر میں سَمَاء بمعنے بادل استعمال ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں دو دفعہ سَمَاء کا لفظ استعمال ہوا ہے اگر دوسری جگہ پر فضاء ہی کے معنے ہوتے تو صرف ضمیر لانی کافی تھی دوبارہ سَمَاء کے لفظ کو لانا بتاتا ہے کہ دوسری جگہ پر اس کے دوسرے معنے ہیں۔

اس امر کو بیان کر دینے کے بعد کہ زمین و آسمان اور ان کے پیدا کردہ تغیرات جیسے بادل وغیرہ کا آنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں فرماتا ہے کہ جب دُنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہے تو تم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی نِدّ نہیں ہے یعنی ایسا کوئی وجود نہیں ہے جو خدا تعالیٰ کا ذات اور صفات میں شریک ہو اور اس کے برابر ہو (نِدّ کے لئے دیکھو حل لغات) اور جب تمام نظامِ عالم ایک قانون کے ماتحت نظر آتا ہے اور کوئی بات بھی اس پر دلالت نہیں کرتی کہ اس کا کوئی حصہ کسی نے پیدا کیا ہے اور کوئی کسی اور نے تو پھر خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کے معنے ہی کیا ہوئے۔ پس تم کو چاہیئے کہ ایک خدا کی پرستش کرو اور اس کے فضلوں سے فائدہ اُٹھاؤ اور اس کے سوا دوسروں کی عبادت کر کے اپنے مستقبل اور حاضر کو خراب نہ کرو۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ نظامِ عالم میں یکسوئی ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے کوئی عقلمند شخص بھی ناواقف نہیں ہو سکتا اور سب کو اس کا علم اور اقرار ہے کہ کل کائنات ایک قانون کے مطابق چل رہی ہے پس اس امر کو جانتے بوجھتے ہوئے شرک میں مبتلا نہ ہو بلکہ اس علم سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے توحید پر قائم ہو جاؤ ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جرم کامل اسی صورت میں ہوتا ہے کہ علم کے ماتحت ہو۔ اس سے اسلام کی کیسی برتری ثابت ہوتی ہے کہ وہ صرف عمل پر ہی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ اس امر کا بھی لحاظ کرتا ہے کہ وہ عمل کن حالات میں کیا گیا ہے اور کس قسم کے علم کے نتیجہ میں صادر ہوا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مادی دُنیا کی تکمیل بھی زمینی اور آسمانی قوتوں کے ملنے سے ہوتی ہے زمین پر پانی کو لوگ خراب کر دیتے ہیں تو آسمان سے نیا پانی آ کر مصفّٰی پانی مہیا کر دیتا ہے۔ ہوا جیسی مصفّٰی چیز کو جب انسان سانس سے گندہ کر دیتا ہے تو وہ اوپر جا کر پھر پاک ہو جاتی ہے آنکھ مفید ہے مگر آسمان یعنی سورج کی روشنی کے بغیر وہ کس کام کی۔ غرض اگر زمین انسان کے لئے بچھونا ہے تو آسمان چھت کا کام دیتا ہے اسی طرح روحانی دُنیا کا حال ہے انسان کے اندر بیشک عقل موجود ہے مگر عقل کا وجود آنکھ کی طرح ہے جب تک روحانی سورج کی روشنی یعنی الہام اس کے ساتھ نہ ملے وہ صحیح طور پر کام نہیں کر سکتی فطرتی تقاضے بیشک نہایت پاک ہیں لیکن دنیوی لالچوں سے مل کر وہ گندے ہو جاتے ہیں اور الہام کے آسمانی پانی کے ذریعہ سے ہی پاک ہوتے ہیں پس اللہ تعالیٰ سے تعلق کے بغیر انسان کامیاب زندگی کسی صورت میں بسر نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مادی زندگی کو زمین اور آسمان دو حصّوں کے ساتھ متعلق کر کے رُوحانی عالم کی طرف راہنمائی کی ہے اور بتایا ہے کہ رُوحانی امور میں بھی صرف زمینی سامانوں پر کفایت نہ کر لینا اور اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ہی اپنے لئے کافی نہ سمجھ لینا کہ جس طرح مادی دنیا آسمانی امداد کی محتاج ہے روحانی دنیا بھی آسمانی امداد کی ہر وقت محتاج ہے جس طرح مادی دُنیا میں زمین کے اوپر آسمان ہے اسی طرح روحانی دُنیا میں انسانی دل اور دماغ زمین ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیوض و ہدایات آسمان ہیں یہ دونوں مل کر ہی روحانی دنیا کو کامل کرتے ہیں ان کے ملے بغیر وہ دُنیا نامکمل اور بے فائدہ ہو جاتی ہے۔

بارش کے ذکر سے الہام الٰہی کے نزول کی طرف اشارہ۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ نِدّ تجویز کرنے کا لطیف رَدّ۔

حقہ آیت وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں اسلام کی برتری کی طرف اشارہ

وَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا میں اسی مضمون کی مزید تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ زمین میں قوتِ نمو موجود ہے مگر کیا آسمانی پانی کے بغیر وہ پھل پیدا کر سکتی

ہے پھر تم کس طرح خیال کرتے ہو کہ تمہارے دماغ خواہ کیسے ہی زرخیز کیوں نہ ہوں اور کیسی ہی نمو کی قابلیت کیوں نہ رکھتے ہوں وہ خدا تعالیٰ کی مدد کے بغیر اچھے پھل دینے لگیں گے جس طرح بارش بند ہو جائے تو زمین کے پانی بھی خراب ہو جاتے ہیں اور زمین اچھے پھل دینے سے قاصر ہو جاتی ہے اسی طرح الہامِ الٰہی نہ آئے جو خدا تعالیٰ کی عبادت کا نتیجہ ہے تو انسانی دماغ بھی پاکیزہ خیالات پیدا کرنے سے جو روحانی ثمرہ ہوتے ہیں قاصر رہ جاتے ہیں پس یہ دعوے نہ کرو کہ ہم اپنی عقلوں سے اپنے لئے ہدایت نامے تجویز کر سکتے ہیں۔ اور کریں گے۔

وَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ کے الفاظ سے الہامِ الٰہی کے نزول کی طرف لطیف اشارہ۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تم کو ادنیٰ حالت سے ترقی دیکر اعلیٰ تک پہنچایا اور تم اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کو اس کے مقام سے نیچے گراتے ہو اور اس کے انداد تجویز کرتے ہو جن کو انداد بناتے ہو وہ نہایت معمولی ہستیاں ہیں پس تم دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہو کہ اللہ بھی ایسا ہی ہے ہم نے تو تم کو مخلوقات میں لاشریک بنا دیا زمین و آسمان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا مگر تم نے ہم کو جو فی الحقیقت لاشریک تھے باشریک بنا دیا۔ کیسے جاہل اور راندے اور قابلِ افسوس ہیں وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے ان احسانات کے ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو نہیں بنایا بلکہ انسان نے خدا کو بنایا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا وجود کوئی نہیں انسان نے اپنی عقل سے ایک ایسا وجود گھڑ لیا ہے یہ لوگ فلسفی کہلاتے ہیں حالانکہ ان سے زیادہ جاہل اس دنیا کے پردہ پر کوئی نہیں مل سکتا۔

آیت ہٰذا اور اس سے پہلی آیت کے مضمون کے متعلق فلسفیوں کا ایک سوال۔

کیا خدا تعالیٰ کی نسبت عقیدہ روحوں جنوں پریوں کے خیال سے ترقی پاکر بنا ہے؟

توحید کی وہ تعلیم جو اس آیت میں دی گئی ہے ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر کیسا عمل تھا۔ اسکی ایک مثال لکھتا ہوں ایک دفعہ ایک صحابی نے آپؐ کے سامنے کہا کہ مَاشَآءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ یعنی فلاں معاملہ میں اسی طرح ہوگا جس طرح خدا تعالیٰ چاہے گا یا آپؐ چاہیں گے آپؐ نے فرمایا اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا کیا تو مجھے خدا کا ند بناتا ہے یوں کہو کہ مَاشَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ یعنی وہی ہوگا جو خدائے واحد چاہے گا (ابن کثیر جلد اوّل ۹۹)۔

آیت ہٰذا میں بیان شدہ توحید پر آنحضرتؐ کا عمل۔

اس آیت اور پہلی آیت کے تعلق سے ایک سوال کے متعلق جو اس زمانہ میں یورپین مصنفین نے اُٹھایا ہے کچھ تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ سوال مسٹر ہربرٹ اسپنسر مشہور فلسفی اور مسٹر فریزر نے نمایاں طور پر پیش کیا اور ان کے بعد ڈاکٹر رابرٹسن سمتھ مسٹر لارنس گوم مسٹر گرانٹ ایلن وغیرہم نے اسے پھیلایا۔ ان لوگوں کے دو گروہ ہیں ایک گروہ نے یہ اصل پیش کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نسبت عقیدہ روحوں جنوں اور پریوں کے خیال سے ترقی پاکر بنا ہے اور دوسرے گروہ نے یہ اصل پیش کیا ہے کہ ابتدائی انسان نے درندوں اور زہریلے کیڑوں سے متأثر ہو کر انکی پُوجا شروع کی اور آہستہ آہستہ خدا کا خیال پیدا ہُوا۔ دونو فریق کا خیال ہے کہ ابتدا میں کئی خداؤں کا خیال پیدا ہُوا اور رفتہ رفتہ اسکی جگہ ایک خدا نے لے لی۔ اِن لوگوں کے دعویٰ کی بُنیاد اس پر ہے کہ ابتدائے آفرینش میں انسان کی تاریخ کئی خداؤں کے اعتقاد پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک وحدانیت سے پہلے کا ہے اور چونکہ شرک وحدانیت سے پہلے کا ہے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ ایک خدا کا خیال شرک کی ترقی پذیر صورت ہے۔

ان میں سے بعض نے مذاہب کے پیرووں سے ڈر کر اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ہمارے عقیدہ کی زد مذہب پر نہیں پڑتی کیونکہ ایک معقولیت پسند خدا سے یہ بعید نہیں کہ جس طرح اس نے دُنیا پر قوانین نیچر کو بتدریج ظاہر کیا اسی طرح اس نے اپنی نسبت عقیدہ کو بھی دنیا پر بتدریج ظاہر کیا۔

میں اس امر کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ان لوگوں نے اس خیال کو پورے غور کے بعد پیش کیا ہو بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یا تو یہ خیال انہوں نے مذہبی دُنیا کی مخالفت کے ڈر سے پیش کیا ہے یا پھر انہوں نے اس سوال پر غور

کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور مذہبی لوگوں کی دلجوئی کے لئے بغیر کافی غور کرنے کے یہ بات پیش کر دی ہے۔

میرے اس خیال کی بنیاد اس پر ہے کہ تمام اہم مذاہب مذہب کی بنیاد الہام پر رکھتے ہیں اور اگر مذہب کی بنیاد الہام پر رکھی جائے تو یہ فلسفہ کہ خدا تعالیٰ نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ظاہر کیا اور پہلے اپنے سوا دوسرے وجودوں کی طرف دنیا کی راہنمائی کی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتا۔ کیونکہ یہ عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مردہ ارواح کی طرف لوگوں کی راہنمائی کی یا پتھروں دریاؤں سانپوں شیروں کی طرف دُنیا کی راہنمائی کی اور بعد میں اپنے آپ کو ظاہر کیا کیونکہ ایک خدا کے وجود کی طرف راہنمائی اگر شروع زمانہ سے بھی کی جاتی تو اس میں عقلاً کوئی امر مستبعد نہیں۔ علاوہ ازیں مختلف مذاہب جو اس وقت دُنیا میں پائے جاتے ہیں وہ ابتدائے آفرینش سے الہام کے قائل پائے جاتے ہیں اور اس امر کا کوئی بھی قائل نہیں کہ الہام بعد کے کسی زمانہ سے شروع ہوُا ہے ہندو مذہب بھی اسی کا قائل ہے کہ ابتدار آفرینش سے الہام ہونا شروع ہوُا اور یہودی مذہب بھی اسی کا قائل ہے اور مسیحیت چونکہ یہودی مذہب کی آخری کڑی ہے وہ بھی اسی امر کی قائل ہے اور زرتشتی مذہب بھی اسی امر کا قائل ہے اور اسلام بھی اسی کا قائل ہے پس اگر یہ خیال درست ہے تو ماننا پڑے گا کہ وید اور تورات اور انجیل اور ژند اوستا اور قرآن کریم سب کی بنیاد جھوٹ پر ہے۔

بائبل صاف طور پر اس امر کی مدعی ہے کہ جب انسان دنیا پر نمودار ہوُا اسے الہام ہوُا اور اسے خدا واحد کا پتہ دیا گیا اور انجیل اس کے بیان کو صحیح تسلیم کرتی ہے پس اگر دُنیا میں ابتداءً خدا تعالیٰ کا علم نہ تھا تو بائبل کا یہ دعویٰ یقیناً جھوٹا ہے کہ خدا نے آدم سے کہا کہ "پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو اور اس کو محکوم کرو اور سمندر کی مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں پر اور سب چرندوں پر جو زمین پر چلتے ہیں سرداری کرو" (پیدائش باب ۱ آیت ۲۸) اس آیت سے ثابت ہے کہ آدم کے زمانہ سے جو پہلا انسان تھا۔ اس کو یہ بتادیا گیا تھا کہ آسمان وزمین میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے انسان کا محکوم اور اس کے فائدہ کے لئے ہے۔ اس تعلیم کے بعد آدم کے دل میں یہ خیال کس طرح پیدا ہو سکتا تھا کہ پہلے ستاروں اور سورج اور چاند کو خدا سمجھے یا زمین کے جانوروں کو خدا سمجھے یا آدم سے پہلے کونسے آباء تھے جن کو وہ خدا سمجھ سکتا تھا پس یقیناً یا تو بائبل کو جھوٹا کہنا ہوگا یا اس خیال کو کہ خدا کا خیال آہستہ آہستہ پیدا ہوُا غلط کہنا پڑے گا۔

اسلام نے بھی اسی عقیدہ کو پیش کیا ہے جیسا کہ اگلے رکوع میں آدم کے ذکر میں آئے گا کہ انسان کے نمودار ہوتے ہی خدا تعالیٰ نے پہلے انسان کو اپنے کلام سے مشرف کیا اور اپنے وجود کی اسے خبر دی۔

ان تعلیمات کی موجودگی میں مذہب کے دعویٰ اور ان خیالات کا اجتماع کسی صورت میں نہیں ہو سکتا اور یقیناً دونوں میں سے ایک کو باطل کہنا پڑے گا پس میں ان دونوں اصول کے درمیان موازنہ کر کے بتاتا ہوں کہ کونسا درست اور کونسا غلط۔

اس خیال کی جو خدا تعالیٰ کے متعلق فلاسفروں نے پیش کیا ہے بنیاد ان دو باتوں پر ہے۔ اوّل وحی الٰہی کے وجود سے انکار دوم مسئلہ ارتقاء کا غلط مفہوم۔

وحی الٰہی کا انکار محض اس لئے پیدا ہوُا ہے کہ ان فلاسفروں کو اس کا تجربہ نہیں اور وہ مسیحی ممالک میں پیدا ہوئے ہیں جن میں ایک لمبا عرصہ سے الہام کا وجود ناپید ہے۔ چونکہ اُنہوں نے نہ خود الہام پایا اور نہ الہام پانے والوں کو دیکھا وہ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ وحی کا وجود ہی کوئی نہیں۔ اور جب وحی الٰہی کے منکر ہوئے تو خدا تعالیٰ کے خیال کے لئے کوئی عقلی وجہ تلاش کرنے لگے اور چونکہ

اس عقیدہ کا رد کہ خدا تعالیٰ نے اپنے وجود کو بتدریج ظاہر کیا۔

انسانی پیدائش کے بعد اسپر الہام کا نزول بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بتدریج اپنا وجود ظاہر نہیں کیا۔

ارتقار کے مسئلہ کی طرف انکی توجہ اِن دنوں ہو رہی تھی اسے بھی اِسی مسئلہ کے ماتحت حل کرنا چاہا اور اس غلط عقیدہ میں مبتلا ہو گئے۔

جیسا کہ میں نوٹ ۵ سورۃ ہذا (زیر آیت وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ) میں بتا آیا ہوں قرآن کریم نہ صرف وحی الٰہی کا قائل ہے بلکہ اس کے وجود کو ہر زمانہ میں تسلیم کرتا ہے اور اگر اِس کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو تو اِس فلسفہ کی جڑ آپ ہی آپ اُکھڑ جاتی ہے۔ قرآن کریم اپنی نسبت دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا ہر ہر لفظ لفظی وحی کی قسم سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل کی اور وہ اس امر کا بھی مدعی ہے کہ اس سے پہلے ابتدائے آفرینش سے اللہ تعالےٰ اپنے خاص بندوں اور ان کے اتباع پر وحی نازل کرتا چلا آیا ہے اور اپنے وجود کو ان پر ظاہر کرتا چلا آیا ہے اور وہ اس امر کا بھی مدعی ہے کہ قرآن کریم کے ماننے والوں پر بھی وحی نازل ہوتی رہے گی۔ چنانچہ اِس زمانہ میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود مہدی مسعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ بھی وحی الٰہی پانے کے مدعی تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ قرآن کریم کی برکت سے اور اس کی خدمت کے لئے ان پر بھی وحی نازل ہوتی ہے اور ہزارہا الہام انہیں ہوئے جو کتاب تذکرہ کی صورت میں یکجائی طور پر ان کی جماعت نے شائع کر دیئے ہوئے ہیں ان میں ہزاروں پیشگوئیاں اور معجزات پر مشتمل کلام ہے جو پورا ہو چکا ہے اور پورا ہو رہا ہے۔ اس تازہ مشاہدہ کے بعد ہم کس طرح ان فلسفیوں کی باتوں کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ بلکہ ان نشانات کو دیکھنے کے بعد ہماری نگہ میں تو یہ لوگ اِس روایتی لال بجھکڑ کے مثیل ہیں کہ جو ہر سادہ سے سادہ بات کا کوئی غیر معقول سبب نکالنے کا عادی تھا۔

آپ کے بعد آپ کی برکت سے ہم لوگوں نے بھی وحی الٰہی کا مزہ چکھا ہے اور راقم حروف بھی سینکڑوں بار اس کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکا ہے اس مشاہدہ کے بعد مجھ پر ان فلسفیوں کی باتوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے سوائے اسکے کہ میں انکی حالت کو قابلِ رحم سمجھ کر ان کی روحانی دنیا سے ناواقفی پر حیرت کروں۔ اگر یہ لوگ ہماری طرف رجوع کریں تو ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ وہ رُوحانی دُنیا کے بادشاہ جو گذشتہ زمانوں میں گذرے ہیں ان کی صداقت مشاہدات اور قوی دلائل سے ہم اب بھی بفضلہ تعالیٰ ثابت کرنے کو تیار ہیں۔

غرض جب وحی الٰہی ایک مجرب اور مشاہدہ سے ثابت شدہ امر ہے تو ان عقلی وجوہ کی جو محض ظنیات اور قیاسات پر مبنی ہیں کوئی وقعت بھی باقی نہیں رہتی۔

ان لوگوں کے خیال کی دوسری بُنیاد مسئلہ ارتقاء کے غلط مفہوم پر ہے ان کا یہ خیال کہ دنیا کی ابتداء میں محض آباء یا طبعی مظاہروں یا جانوروں وغیرہ کی پرستش ہوتی تھی بالکل باطل ہے اور تاریخ اور عقل سے غلط ثابت ہوتا ہے اصل بات یہ ہے کہ ارتقاء کا تعلق جہاں تک عقل انسانی سے ہے صرف اس حد تک محدود ہے کہ باریک مسائل آہستہ آہستہ دنیا پر کھولے گئے ہیں اور انسانی عقل کی نشوونما کے مطابق انہیں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس قدر ارتقاء کا یہودی مذہب بھی قائل ہے اور مسیحیت بھی اور اسلام بھی لیکن یہ کہ خدا تعالےٰ کے وجود کا بسیط علم بھی انسان کو ابتداء میں نہیں دیا گیا بالکل غیر معقول ہے۔ بھلا وہ کونسی روک تھی جو ابتدائی انسان کو ایک پیدا کرنے والے کے وجود کو ماننے میں مانع تھی؟ کوئی بھی عقلی وجہ اس کی معلوم نہیں ہوتی۔ پھر ایسے غیر معقول عقیدہ کو کوئی کس طرح تسلیم کر سکتا ہے۔

اِن فلسفیوں کا یہ خیال کہ چونکہ غیر مہذب اقوام میں خدا تعالےٰ کے متعلق جو علم بھی ہے مشرکانہ عقیدوں کے ذریعہ سے ہے اس لئے یہی عقیدہ خدا تعالیٰ کے وجود کی بنیاد ہے اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے کہ غیر مہذب ہونا ابتدائی ہونے کی علامت نہیں۔ اگر وہ تاریخ کو دیکھتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ مختلف اقوام پر تہذیب کے مختلف دَور آئے ہیں اور کسی وقت ایک قوم مہذب اور علوم سے آراستہ تھی تو دوسرے

وقت میں وہی قوم غیر مہذب اور علوم سے تہی ہوگئی۔ کیا انہوں نے یونان اور ایران اور عراق اور مصر کی تاریخوں کو نہیں پڑھا۔ کیا ہندوستان اور چین کی تاریخ ان سے پوشیدہ ہے کیا قدیم آثار سے جن کو خود انہی کے بھائی بندوں نے دریافت کیا ہے انہیں یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ گذشتہ زمانوں میں ان ملکوں میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب پائی جاتی تھی لیکن اب وہ مفقود ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ ممالک علوم کے گہوارے تھے مگر بعد میں جہالت کا مرکز ہوگئے۔ کیا موجودہ یونان باوجود یورپ کا حصہ ہونے کے انہی علوم کا سرچشمہ ہے جو ارسطو اور افلاطون کے وقت میں وہاں سے پھوٹ رہا تھا۔ کیا ہندوستان میں اب ان ترقیات کے زندہ آثار موجود ہیں جو سابق زمانوں میں یہاں پائے جاتے تھے۔ مصر نے اپنے وقت میں کس قدر ترقی کی اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ اس کی ممیوں (مصالحوں سے محفوظ کردہ لاشوں) میں نظر آتا ہے جس کے نسخے کو اب تک بھی یورپ معلوم نہیں کرسکا۔ لیکن اب ان علوم کا نشان کہاں ہے۔ پس جب تہذیب اور تمدن کے دوروں کے بعد جہالت اور کم علمی کے دور آتے رہے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ توحید کے بعد شرک کے دور آتے رہے ہوں اور کس بناء پر ان شرک کے دوروں کو توحید کے دوروں پر مقدم سمجھا جائے اور اگر شرک کے دور کا توحید کے دور پر تقدم ثابت نہ ہو تو ان فلسفیوں کے خیال کی بنیاد کس بناء پر ہے؟ اس امکان کے پیدا ہونے کی صورت میں تو وہ خود بخود باطل ہوجاتا ہے۔

میں اس سوال پر روشنی ڈالنے کے لئے موجودہ مذاہب ہی کی مثال پیش کرتا ہوں ہندو قوم کے ایک بزرگ جو دو ہزار سال پہلے گذر چکے ہیں ان کا کلام اب تک موجود ہے یعنی وہ حضرت کرشنؑ ہیں ان کی کتاب گیتا ایک معروف کتاب ہے اس کتاب کی تعلیم کو آج سے پانچ سو سال پہلے کے ہندوؤں کے عقائد سے مقابلہ کرکے دیکھو کوئی لگاؤ بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ آج سے پانچ چھ سو سال پہلے جب مسلمان اس ملک میں آئے ہیں گھر گھر میں بت خانہ تھا توہم پرستی تھی مذہب کا حقیقی وجود کہیں بھی پایا نہ جاتا تھا مگر کیا گیتا میں بھی ان بتوں کا کہیں ذکر ہے جنکی حکومت آج سے چند سو سال پہلے ہندوستان میں تھی کیا گیتا میں بھی ان توہمات کی کوئی سند ہے جو اس وقت ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اگر یہ درست ہے کہ شرک کا دور پہلے تھا اور اس سے آہستہ آہستہ توحید کا خیال پیدا ہوا تو چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے توہمات کا راج ہوتا بتوں کا زور ہوتا اور بعد میں توحید آتی لیکن یہاں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ پہلے توحید کا دور تھا اور کرشن جی جیسا موحد انسان ہندوستان کا رہنما تھا مگر بعد میں شرک اور توہم پرستی نے جگہ لے لی۔ اگر کہو کہ بعد میں لوگ بگڑ کر مشرک ہوگئے تو میں کہتا ہوں کہ یہی خیال ان دوسرے شرک کے دوروں کی نسبت کیوں درست نہیں جو ان لوگوں کو دھوکا دینے کا موجب ہوئے ہیں۔ اصل اصول تو یہ تھا کہ ارتقاء چاہتا ہے کہ پہلے ادنیٰ حالت ہو بعد میں اچھی ہو جائے مگر جب یہ بات غلط ثابت ہوگئی تو اس عقیدہ کی بنیاد گر گئی۔

ہندو مذہب کی کتب سے اس بات کا ثبوت کہ توحید کا دور شرک کے دور سے پہلے تھا

دوسری مثال یہودی مذہب کی ہے تورات کو پڑھ کر دیکھ لو اس سے صاف ثابت ہے کہ توحید کے دوروں کے بعد یہود پر شرک کے دور آتے رہے بلکہ دور کیوں جائیں تورات میں جس توحید کا ذکر ہے اس کے خلاف یہود میں موجودہ زمانہ میں بھی مشرکانہ خیالات پیدا ہوگئے ہیں۔ پھر مسیحیت کو لو اس عقیدہ کے پیش کرنے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح نے ایک سادہ خدا کی تعلیم دی تھی مگر وہ عقیدہ بگڑ کر اب کیا شکل اختیار کرچکا ہے کیا یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ توحید کا دور پہلے تھا یا اس امر کا کہ شرک کا دور پہلے تھا۔

تورات سے اس بات کا ثبوت کہ توحید کا دور شرک کے دور سے پہلے تھا۔

سب سے آخر میں اسلام ظاہر ہوا اسی کی تاریخ دیکھ لو وہ مذہب جو ابتداء سے انتہاء تک ایک خالص توحید کا پیش کرنیوالا مذہب تھا جس میں امرواح پرستی کا بھی نام نہ تھا جس کے نبی نے اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ

اسلامی کتب سے اس بات کا ثبوت کہ توحید کا دور شرک کے دور سے پہلے تھا۔

اس کا کوئی صحابی اسے یہ کہے کہ جو تم چاہو وہ ہوگا جیسا کہ اس (نوٹ ۲۳ سورۃ ہذا زیر آیت لَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا دیکھو) سے پہلے بتایا جا چکا ہے جس کے نبی نے مرتے وقت اپنی قوم کو ان الفاظ سے ہوشیار کیا کہ خدا لعنت کرے یہود اور نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ کی جگہ بنا لیا (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیعۃ) اس کی امت بگڑی تو ان کا کیا حال ہوا۔ قبروں پر سجدے انہوں نے کئے۔ اولیاء کو خدا کی صفات انہوں نے دیں۔ مُردوں سے مرادیں انہوں نے مانگیں غرض وہ کونسی مشرکانہ بات تھی جو انہوں نے نہ کی کیا ان کی حالت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا جائز ہوگا کہ اسلام کی ابتداء شرک سے ہوئی اور بعد میں ایک خدا کا خیال پیدا ہوا کیونکہ ارتقاء کے مسئلہ کے ماتحت بسیط عقیدہ اپنی تمام شاخوں میں کامل ہو جانے والے عقیدہ سے پہلے ہونا چاہیئے۔

اگر ان سب تاریخی حوالوں کا جواب یہ ہو کہ ان اقوام میں توحید پہلے تھی اور شرک بعد میں آیا تو ایسے زبردست تاریخی شواہد کے باوجود اس ڈھکوسلے کے پیش کرنے کے کیا معنے جو ان نام نہاد فلسفیوں نے پیش کیا ہے؟ کیا یہ شواہد اس امر کا ثبوت نہیں کہ جس طرح ان اقوام میں توحید کے بعد شرک آیا ان سے پہلی اقوام میں بھی توحید کے بعد شرک آیا۔

اصل بات یہ ہے کہ انسانی ترقی دوروں کی صورت میں ہوتی ہے اور ترقی کے بعد زوال اور زوال کے بعد ترقی کا دور آتا ہے پس انسانی خیالات کے متعلق کسی دور سے یہ قیاس کرنا کہ صرف زوال کا دور پہلے تھا جس سے پہلے کوئی اور ترقی کا دور نہ تھا ایک ایسا بودا قیاس ہے جو کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

دوسرا جواب اس خیال کے غلط ہونے کے بارہ میں یہ ہے کہ اگر ارتقاء سے خدا تعالیٰ کا خیال پیدا ہوا ہے تو چاہیئے تھا کہ سورج چاند ستاروں کی پرستش پہلے شروع ہوتی لیکن مشرکانہ قبائل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سانپ کی پرستش اور دوسرے حیوانات کی پرستش پہلے کی ہے اور چاند سورج کی پرستش نسبتاً مہذب اقوام میں پائی جاتی ہے حالانکہ اگر انسان نے ابتداء میں اپنے گرد و پیش کے حالات سے مرعوب ہو کر خدا کا خیال اخذ کیا تھا تو چاند سورج ستاروں کی پرستش پہلے چاہیئے تھی کیونکہ وہ ہر جگہ میں نظر آتے ہیں اور ہر روز نظر آتے ہیں اور دنیا پر ایک خاص اثر ہر روز پیدا کرتے ہیں جو علم ہیئت سے ناواقف انسان کے دل کو خاص طور پر مرعوب کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف شیر چیتے سانپ کبھی کبھی نظر آتے ہیں اور ان کا اثر اس قدر وسیع نہیں۔ علاوہ ازیں اگر انسان ارتقاء کے قواعد کے ماتحت ترقی کر کے بنا ہے تو انہی شیر چیتوں سانپوں سے اس کا واسطہ ہزارہا سال سے پڑ رہا تھا مگر اس نے ان کو کوئی خاص عظمت نہ دی تھی پھر کیا وجہ کہ یکدم اس نے ان کو خدائی کا مرتبہ دے دیا حالانکہ ان کے وجود میں ستاروں سورج اور چاند کی طرح کوئی پُراسرار کیفیت نہ تھی جو خدا بنانے کے خیال کے لئے ضروری ہے۔ غرض ان حیوانات اور کیڑوں کی پرستش کا خیال پہلے پیدا ہونا جو انسانی ارتقاء کی ترقی کے مسئلہ کے مطابق تو اس کے ہم صحبت بھی رہے تھے اور بندر کی شکل میں یا لنگور کی شکل میں انسان ان سے لڑتا بھڑتا بھی رہا تھا اور بعض کو مارتا بھی رہا تھا اور ستاروں کا خیال بعد میں پیدا ہونا ان فلسفیوں کے خیالات کی ایک کھلی تغلیط ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ انسان سانپ بچھو اور سورج چاند کو ہزاروں سال اپنے ارتقائی دور میں خدا نہ سمجھا اس کے بعد انہی اشیاء کو جن کو وہ پہلے معمولی وجود سمجھتا تھا خدا سمجھنے لگا تو اس کی وجہ خوف یا ہراس نہیں ہو سکتی خوف و ہراس تو پہلے دن سے ہی اثر کرتے ہیں مگر ہزاروں سال کے معاملہ کے بعد اس خیال کا پیدا ہونا بتاتا ہے کہ اس کا سبب کچھ اور ہے اور وہ سبب درحقیقت اتفاقی حادثات سے تعلق

رکھتاہے جو انسان کے توہم اور اس کے ادھورے علم سے ملکر اسے صداقت سے پھرا کر غلط تعلیم کی طرف لے جاتا ہے افسوس کہ ان فلسفیوں نے علم النفس کو مطالعہ کرکے شرک کے مسئلہ پر غور نہ کیا ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ شرک کا مقام طبعًا توحید کے بعد ہی ہے پہلے نہیں۔ بھلا کونسا عقلمند مان سکتاہے کہ انسان روزانہ سب جانوروں کو مرتے ہوئے دیکھ کر ایک دن اپنے مرنے پر خدا کے خیال کو ایجاد کر بیٹھا حالانکہ وہ پہلے بھی مرتا تھا اور اگر وہ ارتقائیوں کے خیال کے مطابق بندر کی قسم کے کسی جانور سے بناہے تو اس وقت بھی تو وہ مرتا تھا اور اس کے گردوپیش کے سب جانور ہی مرتے تھے موت تو اگر کوئی خیال پیدا کر سکتی تھی تو صرف یہ کہ دُنیا کی ہر چیز ایک عرصہ کے بعد اپنی قوت کھو کر بیکار ہو جاتی ہے نہ یہ کہ مرنے کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے۔ اگر ایسی زندگی کا خیال پیدا ہو سکتا ہے تو خوابوں سے ہو سکتاہے اور جب دماغی خوابوں پر غلط خیالات کی بنیاد تسلیم کر لی جائے تو سچی خوابوں پر صحیح عقائد کی بُنیاد تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا اور یہ سب جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اور ثبوت بھی اس کے رد میں مَیں پیش کرتا ہوں جو خود ان فلسفیوں کی تحقیقاتوں سے ہی ملتاہے اور وہ ثبوت یہ ہے کہ تہذیب کے ادنیٰ ترین مقام پر جو قبائل اس وقت دُنیا میں پائے جاتے ہیں اور مشرکانہ خیالات میں شدت سے مبتلا ہیں ان میں بھی ایک خدا کا خیال پایا جاتاہے اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ توحید کا دَور پہلا تھا کیونکہ ان کے حالات سے ثابت ہے کہ وہ باوجود ایک بڑے خدا کو ماننے کے اس کی پوجا نہیں کرتے۔ پوجا وہ اپنے قومی دیوتاؤں کی ہی کرتے ہیں آسٹریلیا مکیکو افریقہ کے قبائل کی تحقیق جو کمپیریٹو ریلیجنز (Comparative Religions) والوں نے کی ہے اس میں تسلیم کیا ہے کہ ان اقوام میں ایک بڑے خدا کا خیال موجود ہے جو ان کے نزدیک نظر نہیں آتا اور آسمانوں پر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عقلی طور پر ایسے انسان اس خیال کی طرف زیادہ راغب ہونگے جو پہلے پیدا ہوا یا بعد میں پیدا ہونے والے خیال کی طرف زیادہ راغب ہونگے ظاہر ہے کہ انسان پر وہی خیال زیادہ غالب ہوتا ہے جو آخر میں پیدا ہُوا ہو۔ اب اگر ایک خدا کا خیال بعد میں پیدا ہوا تھا تو چاہیئے تھا کہ ان وحشی قبائل میں جو قدیم زمانہ کی یادگار ہیں اس غیر مرئی خدا کی پرستش زیادہ کی جاتی اور ان خداؤں کی پرستش کم کی جاتی جو پہلے خیالات کا نتیجہ تھے کیونکہ ترقی یافتہ خیال غالب ہُوا کرتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ اس کے برخلاف ہے مکیکو آسٹریلیا اور افریقہ کے ان وحشی قبائل میں جن میں ایک غیر مرئی اور سب سے بڑے خدا کا خیال پایا جاتا ہے اسکی عبادت بالکل مفقود ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے اور چھوٹے خداؤں اور قومی دیوتاؤں کی پرستش وہ لوگ خوب کرتے ہیں جس سے صاف ثابت ہے کہ مشرکانہ خیالات توحید کے خیالات کے بعد پیدا ہوئے اسی لئے ان کی زندگی پر وہی غالب نظر آتے ہیں۔

اس امر کے ثبوت میں کہ غیر مہذب قدیم وحشی قبائل میں ایک غیر مرئی خالق کُل خدا کا یقین پایا جاتا ہے میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کرتا ہوں مکیکو کے قدیم باشندے قدیم ترین اقوام کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں کمپیریٹو ریلیجنز کے محققین نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ ان میں بھی یہ خیال موجود ہے کہ ایک خدا ایوونا ویلونا ہے جو سب کا خالق ہے اور سب پر محیط ہے اور سب باپوں کا باپ ہے۔ ابتدا میں جب کچھ نہ تھا ویلونا نے خیال کیا اور اس کے خیال کرنے کے بعد اس خیال سے نمو کی طاقت پیدا ہوئی اور وہ طاقت بڑھتے بڑھتے وسیع فضا کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور اس سے خدا کی روشنی جلوہ گر ہوئی اور وہ فضا سکڑنے لگی جس سے یہ چاند اور سورج اور ستارے بنے۔ اس خیال کو موجودہ مذاہب کے خیالات سے ملا کر دیکھو تو عجیب مشابہت معلوم ہوتی ہے بلکہ پیدائش عالم کے متعلق جو خیالات ہیں وہ تو موجودہ علم ہیئت کی تحقیق سے اور

ٹمبولائی ٹمبوری سے ملتے جلتے ہیں۔

اس امریکن قدیم قبیلہ کے علاوہ افریقہ میں بعض نہایت وحشی قدیم غیر مہذب قبائل پائے جاتے ہیں یہ لوگ ایسے ابتدائی ہیں کہ ان کے دماغوں کی بناوٹ جانوروں سے بہت ملتی ہے اور بعض تو جوانی کا یاد کیا ہُوا بڑھاپے میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ ان قبائل میں بھی ایک سب کے خالق خدا کا خیال پایا جاتا ہے جسے اُنکی زبان میں نیٹنکمو کہتے ہیں۔

پرانے اور غیر مہذب قبائل میں ایک خالق کل اور غیر مرئی خدا کے وجود کا عقیدہ۔

بابل کا زمانہ کیسا قدیم ہے ان میں بھی ایک خدا کا پتہ چلتا ہے چنانچہ بابل کے آثار قدیمہ میں سے ایک کتبہ ملا ہے جس پر لکھا ہے "اے دائمی بادشاہ تمام مخلوق کے مالک تو میرا خالق ہے اے بادشاہ تیرے رحم کے مطابق اے آقا جو تو سب پر رحم کرنے والا ہے تیری وسیع بادشاہت رحم کرنے والی رحم والی ہو۔ اپنی اُلوہیت کی عبادت کی محبت میرے دل میں گاڑ دے اور جو کچھ تجھے اچھا معلوم دیتا ہے وہ مجھے دے کیونکہ تو ہی ہے جس نے میری زندگی کو اس رنگ میں ڈھالا ہے" یہ کیسا اعلیٰ اور موجودہ مذاہب سے ملتا جلتا خیال ہے حالانکہ اس زمانہ کے بعد بابل مرکز شرک بن گیا تھا۔

اسی طرح کینیڈا کے قدیم باشندوں میں بھی ایک خدا کے عقیدہ کا پتہ چلتا ہے۔

پھر آسٹریلیا کا علاقہ جو چند صدیوں سے ہی دریافت ہوا ہے اور جہاں کے لوگ باقی دنیا سے بالکل منقطع ہو رہے تھے اور اس قدر وحشی اور خونخوار تھے کہ ان کا قریباً خاتمہ ہی کر دیا گیا ہے ان کے ایک قبیلہ کا نام آرنٹا ہے وہ ایک ایسے خدا کا قائل ہے جسے آلٹجیرا کہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ وہ حلیم ہے اس لئے سزا نہیں دیتا پس اسکی عبادت کی ضرورت نہیں۔

افریقہ کا ایک وحشی قبیلہ جسے زولو کہتے ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ ایک غیر مرئی خدا ہے جو سب دنیا کا باپ ہے۔ اس کا نام ان کے نزدیک اُنکولنکولو ہے۔

اسی طرح آسٹریلیا کے بعض اور قدیم باشندے نُورینڈیرے کو شریعت دینے والا خدا سمجھتے ہیں۔ مُومبو ایک پُرانا وحشی قبیلہ ہے نوریلی کے نام سے ایک زبردست خدا کی پرستش کرتا ہے۔ افریقہ کا مشہور بنٹو قبیلہ نزامبی نام خدا کو تمام دنیا کا پیدا کرنے والا اور بنی نوع انسان کا باپ قرار دیتا ہے۔

ان مثالوں سے یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ پُرانے اور غیر مہذب قبائل میں مشرکانہ خیالات کے علاوہ اور قبائلی خداؤں کے علاوہ ایک خالق کل اور غیر مرئی غیر مادی خدا کا وجود بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور پھر یہ بھی ثابت ہے کہ وہ اس غیر مادی سب پر حاکم خدا کی پرستش یا تو کرتے ہی نہیں یا سب سے کم کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے کسی وقت ان میں توحید کا خیال رائج تھا اس کے بعد مشرکانہ خیالات پیدا ہو گئے اور جھوٹے خداؤں نے ان کے دل میں سچے خدا کی جگہ لے لی اور توحید کے بعد شرک کا دَور دورہ ہُوا۔

خلاصہ یہ کہ اگر الہام کا وجود تسلیم کیا جائے اور بوجہ ہر زمانہ میں اس کا ثبوت ملنے کے اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے کہ سورج کا انکار کر دیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ توحید کا خیال ابتدا سے تھا اور شرک کا خیال قومی زوال کا نتیجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ تاریخی زمانہ کی اقوام میں توحید کا خیال شرک کے خیالات سے پہلے کا ہے جس سے ماننا پڑتا ہے کہ جن اقوام کی تاریخ معلوم نہیں ان میں بھی توحید شرک سے پہلے تھی۔ تیسرے یہ کہ قدیم اقوام کے جو نمونے اس وقت دنیا میں ملتے ہیں ان میں بھی ایک بڑے اور غیر مرئی خدا کا وجود پایا جاتا ہے مگر اسکی عبادت ان میں مفقود ہے جس سے معلوم ہُوا کہ توحید کا خیال پہلا ہے اور شرک کے خیالات بعد کے ہیں تبھی پہلا خیال بعد کے خیالات سے دب گیا۔

ان فلسفیوں کو اس غلط خیال کی طرف ایک اور چیز نے بھی راہنمائی کی ہے۔ مَیں اس کا بھی ازالہ کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بائبل اور دوسری کتب میں انہوں نے جب یہ پڑھا کہ ہمارے قبیلہ کا خدا ایسا ہے اور ویسا ہے تو یہ نتیجہ نکالا کہ گویا ایک خدا کا وجود ان میں پایا جاتا ہے مگر یہ خیال قبائلی خدا کے خیال سے ترقی پاکر بنا ہے حالانکہ یہ غلطی محض اس لئے لگی ہے کہ اسلام سے پہلے تمام مذاہب ایک ایک قوم کی طرف آتے تھے اور چونکہ وہ قبائلی مذاہب ہوتے تھے اپنی بول چال میں وہ لازماً ہمارے خدا اور ان کے خدا کے الفاظ بولتے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مذاہب الہامی نہ تھے بلکہ یہ محاورات محض اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ مختلف اقوام کے مذاہب بھی مختلف تھے جاہل لوگ جو مذہب کی اس حقیقت سے ناواقف تھے یہ خیال کرتے تھے کہ جس خدا نے ہمیں مذہب عطا کیا ہے وہ اَور ہے اور دوسروں کا خدا اور ہے حالانکہ خدا ایک ہی تھا صرف مختلف اقوام کے لحاظ سے اس نے ہر قوم کی ضرورت کے لحاظ سے مختلف تعلیم دی تھی اور یہ محاورات خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ تھے بلکہ قومی اختلافات سے دھوکہ کھا کر لوگوں نے ایسا سمجھ لیا تھا۔ یہوؔاہ وہی تھا جو ہندوستان میں برہما یا پرم ایشور کہلاتا تھا اور جو ایران میں یزدان کہلاتا تھا مختلف ناموں کی وجہ سے اور مختلف تعلیمات کی وجہ سے ان مذاہب کے جاہل پیروؤں نے ان کو الگ الگ خدا سمجھ لیا مگر مذاہب کے بعض ناواقف ماننے والوں کی غلطی سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ ایک خدا کا وجود ان میں نہ تھا۔ اسلام نے اس غلطی پر سے پردہ اُٹھا دیا اور صاف کہہ دیا کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع ۳) یعنی ہر قوم میں خدا تعالیٰ کے نبی گذر چکے ہیں ہندوستان میں بھی اور ایران میں بھی اور کنعان میں بھی اور عرب میں بھی۔ اور ان ممالک کے مذاہب کے پاس جو کتب ہیں وہ سب خدائے واحد کی نازل کردہ تھیں۔ اس حقیقت کو نہ سمجھ کر ایک غلط عقیدہ کی بنا پر ایک تاریخی نتیجہ نکال لینا ایک صریح ظلم ہے قوم کے ناواقفوں یا مذہبی تعصب رکھنے والوں کی رائے پر حقائق کی بُنیاد نہیں رکھی جاتی بلکہ اصل صداقت سے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ اگر اس طرح بعض جاہلوں کی غلطیوں پر بُنیاد رکھ کر صداقتیں معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو دنیا میں اندھیر پڑ جائے اور علم کی جگہ جہالت لے لے۔

شرک کو توحید سے پہلے سمجھنے والے فلسفیوں کا غلط خیال اور اس کا ازالہ

مجھے تعجب آتا ہے ان لوگوں پر جو موسیٰ کے بعد ایک ترقی پذیر یہوؔاہ کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ موسیٰ سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کا وجود گذر چکا ہے انکی نسل سے ایک قوم عرب کی مکہ میں بستی تھی وہ عقیدتاً یہود کے خلاف تھی اور خطرناک مشرک تھی کعبہ جیسے مقام میں جو توحید کا مرکز تھا اس نے بُتوں کی ایک فوج رکھ چھوڑی تھی بیرونی تہذیب کے اثر سے وہ بالکل غیر متاثر تھی ان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی وہ قوم جانی دشمن تھی ببانگ بلند یہ دعویٰ کیا کہ ان کے دادا ابراہیم موحّد تھے مشرک نہ تھے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (بقرہ ع ۱۶) ابراہیم مشرک نہ تھے بلکہ خالص موحّد تھے مگر ان مشرکوں میں سے ایک بھی نہ بولا کہ ابراہیم تو مشرک تھے۔ باوجود شرک میں مبتلا ہونے کے وہ اس امر کو تسلیم کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام مشرک نہ تھے اور ایک بُت کی نسبت بھی ان کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اسکی پُوجا کیا کرتے تھے ایسی مشرک قوم کا ابراہیم کی نسبت تسلیم کرنا کہ وہ مشرک نہ تھے اور قرآن کریم کے بار بار اعلان کی کہ ابراہیم مشرک نہ تھے تردید نہ کرنا جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے بتلاتا ہے کہ عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ابراہیم مشرک نہ تھے بلکہ موحّد تھے اور ان کی قدیم روایات اسی امر کی تصدیق کرتی تھیں اور ایسی قدیم روایات خصوصاً ایسی قوم کی جو بیرونی دُنیا کے خیالات سے متاثر نہ ہوئی تھی ایک زبردست ثبوت ہے اس امر کا کہ موسیٰ

نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا

اپنے بندے پر اُتارا ہے تم کسی (قسم کے) شک میں (مبتلا) ہو تو اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔ اور اگر

شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

تم سچے ہو تو اپنے غیر اللہ مددگاروں کو (بھی اپنی مدد کے لئے) بُلا لو ۵۲۴

کے ظہور سے پہلے ایک خدا کا وجود دنیا میں مانا جاتا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کے آباء میں مانا جاتا تھا۔ پھر اس حقیقت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ ایک خدا کا وجود یہود میں جو حضرت ابراہیم کے صدیوں بعد ہوئے اور ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے پایا نہ جاتا تھا اور ایک یہوا نامی دیوتا کے ڈر سے جسکی نسبت ان کا خیال تھا کہ وہ بڑا غیور ہے انہوں نے دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر اسکی عبادت شروع کردی اور اس طرح ایک خدا کا خیال پیدا ہوا کیسا بودا استدلال ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک خدا کا عقیدہ جسے ان آیات میں پیش کیا گیا ہے کسی مشرکانہ عقیدہ کی ارتقائی کڑی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس پر وہ دلائل و براہین جو اوپر بیان کئے گئے ہیں شاہد ہیں اور تاریخ اور تمام غیر مہذب اقوام کے حالات اس پر گواہ ہیں کہ توحید کا عقیدہ ہی اصل اور پُرانا عقیدہ ہے اور شرک صرف قوموں کے زوال کی حالت میں پیدا ہوا ہے اور ابتدائی انسانی عقیدہ نہیں ہے۔

میں ان فلسفیوں کی محنت کے نتائج کا بالکل منکر نہیں۔ ان کی ان تحقیقاتوں کو اس حد تک مان سکتا ہوں کہ انہوں نے شرک کے اسباب کو ایک حد تک دریافت کیا ہے اور جن اقوام میں شرک پھیلا ہے ان کے خیالات میں تنزل جس جس وجہ سے ہوا اسکی انہوں نے ایک حد تک تحقیق کی ہے مگر اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شرک ایک خدا کے خیال کا موجب تھا بالکل درست نہیں اور ویسی ہی غیر معقول چھلانگ ہے جیسے کہ انسانی نسل کے ارتقاء کی نسبت انہوں نے لگائی ہے اور دوسرے حیوانات اور انسان کی بناوٹ کی مناسبتوں اور ان کے باہمی اختلافات اور ان کے اور انسان کی بناوٹ کے اختلافات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان حیوانات کی زنجیر کی آخری کڑی ہے جس طرح پیدائش کے ارتقاء کی ایک غائب کڑی کو نظر انداز کر کے انہوں نے غلط نتیجہ نکال لیا ہے اسی طرح اس بارہ میں بھی ایک غلط نتیجہ نکال لیا ہے اگر وہ اپنی تحقیق کا نام شرک کے اسباب کی دریافت رکھتے تو یہ ایک حد تک معقول ہوتا اور ان کے خیالات سے ہمیں جس حد تک کہ ان کا نتیجہ درست اور معقول ہوتا۔ اتفاق ہوتا۔

۵۲۴ **حل لغات**:۔ رَيْبٌ۔ رَیْب کے لئے دیکھو سورہ بقرہ حل لغات ۵۳

نَزَّلْنَا۔ نَزَّلَ (جو نَزَلَ سے باب تفعیل ہے) سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور نَزَّلَهٗ کے معنے ہیں صَيَّرَهٗ نَازِلًا اس کو اُترنے والا کر دیا۔ یعنی اس حالت میں کر دیا کہ وہ اُترے۔ اور نَزَّلَ الْقَوْمَ کے معنے ہیں اَنْزَلَهُمُ الْمَنَازِلَ لوگوں کو انکی جگہوں پر اُتارا۔ نَزَّلَ الشَّیْءَ رَتَّبَهٗ کسی چیز کو مرتب کیا۔ نَزَّلَ الْعِيْرَ: قَدَّرَ لَهَا الْمَنَازِلَ قافلہ کے امام نے قافلہ کے لوگوں کے لئے جگہیں مقرر کر دیں۔ تَنْزِيْلٌ اصل میں آہستہ آہستہ اُتارنے کو کہتے ہیں چنانچہ لکھا ہے اَلتَّنْزِيْلُ يَكُوْنُ تَدْرِيْجًا مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ وَالْاِنْزَالُ اَعَمُّ مِنْهُ کہ تنزیل میں تدریجاً اور یکے بعد دیگرے اُترنا ہوتا ہے لیکن لفظ انزال تنزیل سے عام ہے۔ اس میں یہ شرط نہیں (اقرب) مفردات میں ان دونوں میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے۔ وَالْفَرْقُ بَيْنَ الْاِنْزَالِ

وَالتَّنْزِيْلِ اَنَّ التَّنْزِيْلَ يَخْتَصُّ بِالْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُشِيْرُ اِلَيْهِ اِنْزَالُهٗ مُفَرَّقًا وَ مَرَّةً بَعْدَ اُخْرٰى وَالْاِنْزَالُ عَامٌّ کہ انزال اور تنزیل میں یہ فرق ہے کہ تنزیل کا لفظ آہستہ آہستہ اُتارنے اور یکے بعد دیگرے اتارنے کے معنوں سے مخصوص ہے لیکن لفظ انزال (اُتارنا) عام ہے یعنی خواہ اکٹھا اُتارے یا یکے بعد دیگرے۔ (مفردات)

عَبْدِنَا ۔ عَبَدَ لَهٗ کے معنے ہیں تَاَلَّهَ لَهٗ تمامتر کوشش کے ساتھ پرستش میں لگ گیا۔ اور عَبَدَ اللّٰهَ کے معنی ہیں طَاعَ لَهٗ وَخَضَعَ وَ ذَلَّ وَخَدَمَهٗ وَالْتَزَمَ شَرَائِعَ دِيْنِهٖ وَوَحَّدَهٗ یعنی اللہ کا فرمانبردار بن گیا اور اپنے آپ کو اسی ایک کا بنا کر اس کے احکام کا پابند ہو گیا (اقرب) اَلْعُبُوْدِيَّةُ اِظْهَارُ التَّذَلُّلِ وَالْعِبَادَةُ اَبْلَغُ مِنْهَا لِاَنَّهَا غَايَةُ التَّذَلُّلِ. عبودیت کے معنی عاجزی کے اظہار کے ہیں اور لفظ عبادت اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی عاجزی کرنے کے ہیں۔ وَلَا يَسْتَحِقُّهَا اِلَّا مَنْ لَهٗ غَايَةُ الْاِفْضَالِ وَهُوَ اللّٰهُ تَعَالٰى. اور انتہائی عاجزی اسی کے سامنے کی جا سکتی ہے جس کے انعام و اکرام بہت زیادہ ہوں اور ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ وَالْعِبَادَةُ ضَرْبَانِ عِبَادَةٌ بِالتَّسْخِيْرِ وَعِبَادَةٌ بِالْاِخْتِيَارِ اور عبادت کی دو اقسام ہیں (۱) کسی چیز کا اپنے طبعی اعمال کے ذریعہ سے اظہار فرمانبرداری کرنا (۲) اختیاری عبادت اور یہ انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔ وَالْعَبْدُ يُقَالُ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَضْرُبٍ اور عبد کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) عَبْدٌ بِحُكْمِ الشَّرْعِ شریعت کی رو سے غلام جس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہو ان معنوں کے اعتبار سے لفظ عبد کی جمع عبید ہوگی (۲) عَبْدٌ بِالْاِيْجَادِ وَذٰلِكَ لَيْسَ اِلَّا لِلّٰهِ پیدا کئے جانے کے باعث عبد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے عبد کی اضافت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوگی کیونکہ خالق صرف وہی ذات ہے (۳) عَبْدٌ بِالْعِبَادَةِ وَالْخِدْمَةِ عبادت اور خدمت کے باعث عبد کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لحاظ سے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے (۱) جو محض اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کرنے والے ہیں یعنی عابدان معنوں کے لحاظ سے اس کی جمع عِبَاد آتی ہے (ب) جو دُنیا کے غلام اور دُنیادار ہوں (مفردات) مصنف تاج العروس کہتے ہیں قَالَ بَعْضُ اَئِمَّةِ الْاِشْتِقَاقِ اَصْلُ الْعُبُوْدِيَّةِ الذُّلُّ وَالْخُضُوْعُ یعنی علم اشتقاق کے بعض آئمہ نے کہا ہے کہ عبودیت کے اصل معنے عاجزی اور خضوع کے ہیں۔ وَقَالَ اٰخَرُوْنَ

اَلْعَبْدُ

اَلْعُبُوْدَةُ اَلرِّضَا بِمَا يَفْعَلُ الرَّبُّ وَالْعِبَادَةُ فِعْلُ مَا يَرْضٰى بِهِ الرَّبُّ وَالْاَوَّلُ اَقْوٰى اور بعض آئمہ نے کہا ہے کہ عبودیت اللہ تعالیٰ کی تمنا کے ساتھ راضی رہنے کو کہتے ہیں اور عبادت وہ فعل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ راضی رہتا ہے لیکن بقول مصنف تاج العروس پہلے معنے زیادہ صحیح ہیں نیز اَلْعَابِدُ کے معنے ہیں اَلْمُوَحِّدُ توحید پرست اور التَّعْبِيْدَةُ کے معنی ہیں اَلْعُبُوْدِيَّةُ عاجزی کرنا۔ کہتے ہیں مَا عَبَدَكَ عَنِّيْ اَيْ مَا حَبَسَكَ کس چیز نے تجھ کو مجھ سے روکا اور جب عَبَدَ بِهٖ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے لَزِمَهٗ وَلَمْ يُفَارِقْهُ اس کے ساتھ اس طرح چمٹ گیا کہ اس سے جدا نہ ہوا۔ قَالَ ابْنُ الْاَنْبَارِيِّ

اَلْعِبَادَةُ

فُلَانٌ عَابِدٌ وَهُوَ الْخَاضِعُ لِرَبِّهِ الْمُسْتَسْلِمُ الْمُنْقَادُ لِاَمْرِهٖ ابن انباری کہتے کہ عابد کے معنے ہیں وہ شخص جو اپنے رب کے سامنے عاجزی کرنے والا ہو اور اس کے حکموں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو وَالْمُتَعَبِّدُ اَلْمُنْفَرِدُ بِالْعِبَادَةِ اور وہ شخص جو عبادت میں ہی لگا رہے اسے متعبد کہتے ہیں (تاج العروس) الغرض عبد کے معنی کے اندر انتہائی عاجزی، تذلل، خضوع، توحید پرستی، خدمت گذاری، کسی کے ساتھ چمٹ جانا اور مفارقت اختیار نہ کرنا اور دُنیا سے اپنے آپ کو روک کر اللہ کا ہی ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

سُوْرَةٌ

سُوْرَةٌ :۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات فاتحہ

شُهَدَآء

شُهَدَآءِ :- شَهِيْدٌ کی جمع ہے اور یہ شَهِدَ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ شَهَادَةٌ اور شُهُوْدٌ (جو شَهِدَ کے مصدر ہیں) کے معنی ہیں اَلْحُضُوْرُ مَعَ الْمُشَاهَدَةِ اِمَّا بِالْبَصَرِ اَوْ بِالْبَصِيْرَةِ کسی واقعہ کے وقت حاضر ہوکر اس کا مشاہدہ کرنا خواہ وہ مشاہدہ ظاہری آنکھ سے ہو یا بصیرت سے وَقَدْ يُقَالُ لِلْحُضُوْرِ مُفْرَدًا اور کبھی صرف حاضر ہونے پر شَهَادَة اور شُهُوْد کا لفظ بولا جاتا ہے وَالشَّهَادَةُ قَوْلٌ صَادِرٌ عَنْ عِلْمٍ حَصَلَ بِمُشَاهَدَةِ بَصِيْرَةٍ اَوْ بَصَرٍ اور کسی واقعہ کے متعلق اس بیان کو جو ایسے علم کے ساتھ دیا جائے جو آنکھ کے ساتھ مشاہدہ کرنے یا بصیرت کے ذریعہ حاصل ہوا ہو شہادت کہتے ہیں۔ وَقَدْ يُعَبَّرُ بِالشَّهَادَةِ عَنِ الْحُكْمِ وَالْاِقْرَارِ اور کبھی شہادت کے لفظ سے مُراد کسی بات کا اقرار ہوتا ہے وَقَوْلُهُمَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا اَیْ مَا اَخْبَرْنَا ... شَهِدْنَا ... الخ میں شہادت سے مراد خبر ہے کہ ہمیں جس چیز کا علم تھا اسی کی خبر دی نیز شَهَادَة کے معنے یقینی خبر کے کئے گئے ہیں وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے۔ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ مَعْنَاهُ اَعْوَانَكُمْ کہ ابن عباسؓ نے شُهَدَآء کے معنے مددگاروں کے کئے ہیں وَقَالَ مُجَاهِدٌ اَلَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ لَكُمْ اور مجاہد کے نزدیک شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو گواہی دیں وَقَالَ بَعْضُهُمُ الَّذِيْنَ يُعْتَدُّ بِحُضُوْرِهِمْ کہ شہداء ان لوگوں کو کہیں گے جن کی گواہی کی کوئی وقعت سمجھی جائے (مفردات) اَلشَّهِيْدُ :- اَلشَّاهِدُ گواہ۔ اَلْاَمِيْنُ فِیْ شَهَادَتِهٖ۔ سچی گواہی دینے والا۔ اَلَّذِیْ لَا يَغِيْبُ عَنْ عِلْمِهٖ شَیْءٌ۔ جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو۔ (اقرب) پس وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ کے یہ معنے ہونگے (۱) کہ تم اپنے معاونین اور دوستوں کو بلا لو (۲) تم اپنے گواہوں کو بلا لو (۳) اپنے معبودوں کو بلا لو۔

دُوْنَ دُوْن کے ایک معنی غَیْر کے ہیں یعنی سوا (اقرب) پس دُوْنِ اللّٰهِ کے معنے ہونگے غَيْرُ اللّٰهِ یعنی اللہ کے سوا۔

تفسیر۔ اس آیت سے پہلی دو آیات میں قرآن کریم کا سب سے پہلا حکم حکم کی شکل میں نازل ہُوا تھا۔ اس سے پہلے بیشک قرآنی خوبیاں اور متقیوں کے فرائض اور سورۃ فاتحہ میں مومنوں کی دعاؤں۔ ارادوں اور کاموں کا ذکر ہُوا تھا مگر انسان کو خدا کی طرف سے مخاطب کر کے کوئی حکم نہ سورۃ فاتحہ میں بیان ہُوا تھا اور نہ سورۂ بقرۃ کی ان آیات میں جو اس سے پہلے گذر چکی ہیں اور یہ ایک طبعی امر ہے کہ انسان خطاب پر ہی اعتراض کی طرف مائل ہوتا ہے کیونکہ جب تک اسے مخاطب نہ کیا جائے وہ سمجھتا ہے کہ اس کلام سے مجھے کیا تعلق ہے لیکن جب اس کو مخاطب کیا جائے تو فوراً اس کی توجہ یا ماننے کی طرف یا غور کی طرف یا مقابلہ کی طرف مائل ہو جاتی ہے پس پہلے حکم کے بعد جو اس کا لازمی نتیجہ نکلا یعنے وہ ردّ عمل جو قرآن کریم کے حکم کو سُن کر کفار کے دل میں پیدا ہُوا اس کا ذکر آیت زیر تفسیر میں کیا گیا ہے اور وہ ردّ عمل یہ تھا کہ یہ کلام تو ہم کو کوئی ایسا اچھا معلوم نہیں ہوتا اس نے تو ہمارے امن کو برباد کر دیا ہے اور ہمارے دلوں کو اس یقین سے بھی محروم کر دیا ہے جو اس سے پہلے ہم کو حاصل تھا اور شکوک و شبہات کا دروازہ کھول دیا ہے یہ استدلال جو میں نے کیا ہے اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ رَيْب کے معنے جب شک کے ہوں تو شک کی طرح اس کا صلہ بھی فِیْ آنا چاہیئے مثلاً کہیں گے فِيْهِ رَيْبٌ یہ امر شک پیدا کرنے والا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ہے اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا (کہف ع ۳) موعود ساعت کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا (جاثیہ ع ۴) ساعت مقررہ کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ پر مِنْ اس کے بعد استعمال کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ (حج ع ۱) مگر اس کے معنے بھی یہ کئے جا سکتے ہیں کہ اگر بعث کے مسئلہ کے سبب سے تم شکوک میں پڑ گئے ہو۔ یہ نہیں کہ

بعث کے مسئلہ میں تم کو شک ہے کیونکہ کفار کو تو بعث کے بارہ میں شک نہ تھا بلکہ وہ قطعی طور پر اس کا انکار کرتے تھے۔

ریب اور شک میں یہ فرق ہے کہ شک انسان کرتا ہے لیکن ریب انسان نہیں کرتا بلکہ ریب کو ہمیشہ اس چیز کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس سے شک پیدا ہوا ہو مثلاً یہ تو کہیں گے کہ اَشُكُّ فِیْ ذَالِكَ میں اس معاملہ میں شک کرتا ہوں مگر یہ نہیں کہیں گے کہ اُرْتَابُ فِیْهِ بلکہ یُوں کہیں گے رَابَنِیْ یَا اَرَابَنِیْ هٰذَا الْاَمْرُ اس بات نے مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔ غرض کفار نے صرف قرآن کریم کے دعویٰ کے بارہ میں شک کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ اظہار کیا ہے کہ (۱) قرآن کریم نے ہمارے شکوک کیا دُور کرنے تھے اس کے مضامین کی وجہ سے تو ہمارے دلوں میں بعض اور صداقتوں کے بارہ میں بھی جنکو ہم پہلے مانتے تھے شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں اور اس کتاب نے بجائے شک دور کرنے کے ہمارے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے ہیں (۲) ہم پہلے تو محمد رسول اللہ کے دعویٰ کو قابلِ غور سمجھتے تھے اور اس پر غور کرنے پر تیار تھے لیکن جُوں جُوں قرآن نازل ہُوا ہمارے دلوں میں اس کے مضامین کی وجہ سے اس کے دعویٰ کے بارہ میں شکوک کا سلسلہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ گویا وہ قرآن پر دو اعتراض کرتے ہیں ایک یہ کہ اس کے مضامین اس غرض کو پورا نہیں کرتے جس کے لئے یہ نازل ہُوا ہے۔ دوم یہ کہ اگر اسے مانا جائے تو کئی صداقتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور بجائے صداقت کی طرف لے جانے کے یہ اور کئی صداقتوں سے دُور کر دیتا ہے۔

علامہ ابوالبقاء مِمَّا نَزَّلْنَا کی ترکیب دو طرح کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ریب کی صفت ہے یعنی تم ایسے ریب میں پڑ گئے ہو جو ہمارے بندے پر اُتارے گئے کلام سے پیدا ہُوا ہے اور اسکی یُوں تشریح کرتے ہیں کہ فِیْ رَیْبٍ كَائِنٍ مِنَ الَّذِیْ نَزَّلْنَا اور دوسرا مقام اس کا یہ بتاتے ہیں کہ مِمَّا نَزَّلْنَا ریب کا متعلق ہے اور معنے یہ ہیں کہ فِیْ رَیْبٍ مِنْ اَجْلِ مَا نَزَّلْنَا یعنے ایسے شک میں ہو جو ہمارے اُتارے ہوئے کلام کے سبب سے پیدا ہُوا ہے علامہ ابو حیان اپنی تفسیر بحر محیط میں اس آیت کے ماتحت لکھتے ہیں۔ وَمِنْ یَحْتَمِلُ اِبْتِدَاءَ الْغَایَةِ وَالسَّبَبِیَّةِ مِنْ کے معنے اس جگہ یہ ہیں کہ مَا نَزَّلْنَا سے شک پیدا ہُوا ہے یا یہ کہ مَا نَزَّلْنَا شک کا باعث ہُوا ہے۔

ریب اور شک میں فرق

خلاصہ اوپر کے حوالوں کا یہ ہے کہ مِمَّا کے الفاظ نے اس امر پر دلالت کی ہے کہ جس شک کا ذکر اوپر ہُوا ہے وہ قرآن کریم پر اعتراض کرنے والوں کے نزدیک قرآن کریم سے پیدا ہُوا تھا اور ان کا یہ اعتراض اس جگہ بیان کیا گیا ہے کہ ہمیں تو قرآن کریم نے قلق اور اضطراب میں ڈال دیا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے الفاظ شک پر دلالت نہیں کرتے۔

اس آیت میں جو اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہ شک پر دلالت نہیں کرتے بلکہ کفار کے اعتراض کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ ہمیں تو اس قرآن نے شکوک میں ڈال دیا ہے ان کے اس دعویٰ کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا کہ اگر تم کو قرآن کی وجہ سے شک ہُوا ہے تو ایسا ایسا کرو یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ قرآن کی وجہ سے شک پڑ گیا ہے غلط ہے۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے کہ اِنْ كُنْتَ عَبْدِیْ فَاَطِعْنِیْ اگر تو میرا غلام ہے تو میری اطاعت بھی کر۔ یہ ایسے موقعہ پر بولا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص جھوٹا دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں تو آپ کا غلام ہوں۔ اس کے جواب میں وہ شخص جس کی غلامی کا دعویٰ قائل کرتا ہے کہتا ہے کہ اِنْ كُنْتَ عَبْدِیْ فَاَطِعْنِیْ یعنی تو اپنے اس قول میں کہ تو میرا غلام ہے جھوٹا ہے اگر سچا ہے تو پھر میری اطاعت بھی کر لیکن جبکہ تو اطاعت نہیں کرتا تو معلوم ہُوا کہ صرف مُنہ سے غلامی کا دعویٰ کرتا ہے اسی مفہوم میں یہاں اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور مُراد یہ ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ تم کو قرآن کریم نے شک میں ڈال

مِمَّا نَزَّلْنَا کی ترکیب۔

کفار کے اس دعویٰ کا ابطال کہ قرآن کریم نے انہیں شکوک میں ڈال دیا ہے۔

دیا ہے جھوٹا ہے اگر سچا ہے تو پھر اس کا ثبوت اس طرح تم دے سکتے ہو کہ ایسی ہی ایک سورۃ بنا کر پیش کرو لیکن اگر تم ایسی سورۃ کے لانے کی کوشش بھی نہ کرو تو معلوم ہوا کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم نے تم کو شکوک میں ڈال دیا ہے باطل ہے اور صرف دفع الوقتی کے طور پر ہے ورنہ جو کلام اس قدر گندہ اور خراب ہو کہ اس سے دلوں میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں اسکی مثل تو ایک بچہ بھی لا سکتا ہے کجا یہ کہ تمام کفار اور ان کے انصار مل کر بھی اسکی مثل نہ لا سکیں بلکہ اسکی کوشش تک کی جرأت نہ کر سکے ہوں پس ان کے عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

اعتراض کرنا سہل ترین کام ہے جو کوئی شخص اپنے مدمقابل کے خلاف کر سکتا ہے۔ صداقت کے منکر ہمیشہ اعتراضوں تک ہی اپنے حملہ کو محدود رکھتے ہیں کبھی کوئی ٹھوس کام مقابل پر نہیں کرتے جس سے ان کے جوہر بھی ظاہر ہوں اور ان کے اعتراض کی حقیقت بھی ظاہر ہو۔ یہی حال قرآن کریم کے منکروں کا تھا۔ وہ قرآن کریم پر اعتراض تو کرتے تھے لیکن اس کے مقابل پر کوئی تعلیم ایسی پیش نہ کرتے تھے جو اس سے برتر تو الگ رہی اس کے برابر بھی ہو۔ آج تک قرآن کریم کے مخالفوں کا یہی حال رہا ہے مسیحی مصنف قرآن کریم پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں لیکن آج تک اس مطالبہ کو پورا کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ کہ اسکی مثل لائیں وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے انجیل کا فلاں مسئلہ چرا لیا ہے۔ توراۃ سے فلاں بات اڑا لی ہے زردشتی کتب سے فلاں تعلیم اخذ کر لی ہے لیکن یہ جرأت نہیں کہ انجیل توراۃ اور زردشتی کتب میں سے مضامین لے کر خود کوئی کتاب ایسی بنا دیں جو قرآن کریم جیسی جامع ہو شہد پر انسان اعتراض تو آسانی سے کر سکتا ہے کہ مکھیوں نے پھولوں سے خوشبو اُڑا لی پھلوں میں سے مٹھاس چُرا لی۔ مگر بات تو تب ہے کہ ویسا شہد بنا کر دکھا دے اچھی چیزوں کو مختلف جگہوں سے اُڑا کر کوئی نئی اور اعلیٰ چیز بنا دینا بھی تو ایک کمال ہے اگر یہ آسان بات ہے تو معترض ویسا ہی کام کر کے کیوں نہیں دکھا

مخالفین کے اس اعتراض کا جواب کہ قرآن مجید میں دوسری کتب کی تعلیمات موجود ہیں۔

دیتے۔ مگر یہ جواب بطور تنزل ہے۔ ورنہ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں وہ سب صداقتیں بھی موجود ہیں جو پہلی کتب میں پائی جاتی ہیں چنانچہ فرماتا ہے فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ (البینۃ) اس میں سب قائم رہنے والی صداقتیں جو زمانہ کے لحاظ سے منسوخ کرنے کے قابل نہ تھیں موجود ہیں اور اس کے علاوہ فرماتا ہے وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ع۱۸) یعنی یہ رسول تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔ یعنی اسکی تعلیم صرف انہی اچھی تعلیمات پر مشتمل نہیں جو پہلی کتب میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس سے زائد اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو پہلے دُنیا کو معلوم نہ تھیں۔ اسی طرح فرماتا ہے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ع۳۱) یعنی جب تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو ان صفات سے یاد کرو جو خدا تعالیٰ نے اس قرآن کریم کے ذریعہ سے تم کو سکھائی ہیں اور جن کا علم اس سے پہلے تم کو حاصل نہ تھا اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں صفات الٰہیہ کا ایسا زائد علم دیا گیا ہے جو اس سے پہلے دنیا کو حاصل نہ تھا۔ اسی طرح فرماتا ہے کہ قرآن کریم میں بعض متشابہات ہیں یعنی ایسے امور ہیں جو پہلی کتب سے ملتے جلتے ہیں۔ اور بعض محکمات ہیں یعنی ایسے امور ہیں کہ جو دوسری کتب کے علاوہ ہیں اور فرماتا ہے هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وہی اس کتاب کی ماں ہیں یعنی وہی اس کے نزول کا سبب ہیں (آل عمران ع۱) اسی طرح فرماتا ہے یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (رعد ع۶) یعنی کفار اعتراض کرتے ہیں کہ یہ شخص پہلی کتب کے خلاف تعلیم لایا ہے اور یہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے تو ان سے کہدے کہ ہر قوم کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس تعلیم کے بعض حصوں کو جو اسے دی گئی تھی مٹا دیتا ہے اور بعض حصے رہنے دیتا ہے اور اس کے پاس وہ احکام محفوظ ہیں جو اس کے زمانہ کے لئے ضروری ہیں اور جو نئے نبی کو دیئے جاتے ہیں پس ان کا اعتراض فضول ہے۔ پہلی کتب کے مفید حصوں کو بھی ہم نے لیا اور ان کے علاوہ وہ نئی تعلیم جو پہلے زمانہ کے

مناسبِ حال نہ تھی اور اسی زمانہ کے مناسب حال تھی وہ بھی تجھ کو عطا کردی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم پہلی کتب کی مفید تعلیم اخذ کرنے کا تو خود اقرار کرتا ہے مگر وہ اس کے علاوہ اور اس سے زائد نئی تعلیمات کے پیش کرنے کا بھی دعویٰ دار ہے پس صرف چند متشابہ باتوں کو پیش کرکے اعتراض کرنا خلاف دیانت ہے جیسے دعویٰ ہو کہ قرآن کریم صرف چوری کے مضامین پر مشتمل ہے وہ پہلی کتب سے مضامین اخذ کرکے قرآن کریم کی مثل پیش کردے اور پھر دیکھے کہ کیا اس کی محنت ان مضامین کا ہزارواں حصہ بھی پیش کرتی ہے جو قرآن کریم نے پیش کئے ہیں۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ شروع سورۃ میں کہا گیا تھا کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ اس میں کوئی بات ریب والی نہیں جب تمام بنی نوع انسان کو ایک خدا کی پرستش کی طرف بلایا گیا اور مخالفین قرآن کی رگِ حمیت بھڑکی تو انہوں نے یہ اعتراض کردیا کہ تم ہمیں کیا دعوت دیتے ہو تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں کوئی ریب والی بات نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے شروع میں ہی وہ تعلیم دے دی ہے کہ جو شکوک و شبہات کا دروازہ کھول دیتی ہے یعنی ایک خدا کی تعلیم دیتی ہے حالانکہ توحید کا مسئلہ (ان کے خیال کے مطابق) بالکل باطل ہے۔ اس قسم کی تعلیم کو سن کر تو ہم کو مذہب پر ہی شکوک و شبہات شروع ہوجاتے ہیں کہ کوئی یقینی سے یقینی بات بھی اعتراض سے محفوظ نہیں پھر مذہب کا کیا فائدہ ہوا اور اس سے کیا تسلی حاصل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ (۱) فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲) وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تم دو کام کرو اول تو اس قسم کی کوئی سورۃ بنا لاؤ یعنی جو مضامین اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں بیان ہوئے ہیں اس قسم کے مطالب پر مشتمل کوئی کلام پیش کردو اور دوسرے یہ کہ اپنے شہداء کو پکارو۔

اوپر کی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس جگہ جس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سورۃ بقرہ کی پہلی آیات میں جو مضمون گذرا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے کوئی سورۃ ایسی لے آؤ جو اس معیار کو پہنچتی ہو جو ان مضامین میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ باقی قرآن کریم کی مثل لوگ لاسکتے ہیں بلکہ یہ حجت ملزمہ ہے کہ قرآن کریم میں جو اور اصول بیان ہوئے ہیں ان کی مثال تو تم نے کیا لانی ہے ان چند آیات میں بیان کردہ مضمون کے مطابق ہی کوئی سورۃ لے آؤ کیونکہ وہی تمہارے اعتراض کا موجب ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں پہلی کتب کی تعلیمات کے علاوہ اور زبردست محکم تعلیمات۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس اعتراض سے پہلے قرآن کریم میں کیا مضامین گذرے ہیں تو ہمیں پہلی آیت میں ہی جس میں لَا رَيْبَ فِيْهِ کہا گیا ہے اور جس کی بناء پر کفار نے اپنے ریب کا ذکر کیا ہے یہ مضامین نظر آتے ہیں (۱) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (الف) یہ موعود کتاب ہے یعنے پہلے انبیاء نے ایک کامل کتاب کی خبر دی تھی یہ وہی ہے اور اس کے ذریعہ سے ان انبیاء کی پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں (باء) یہ ایک کامل کتاب ہے اس میں تمام ضروری امور جو روحانی تکمیل کے لئے ضروری ہیں بیان ہیں (ج) یہ کتاب اس دعا کو پورا کرنے والی ہے جو سورۃ فاتحہ میں سکھائی گئی ہے یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہمیں سیدھا راستہ دکھا وہ راستہ جو منعم علیہ گروہ یعنے انبیاء صدیقوں شہداء اور صالحین کو دکھایا گیا تھا (تفصیل کے لئے دیکھو نوٹ سورۃ فاتحہ زیر آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ)

آیت ان کنتم فی ریب کا تعلق پہلی آیات سے۔

(۲) لَا رَيْبَ فِيْهِ یعنے (الف) اس میں کوئی بات ایسی بیان نہیں کی گئی جو فی الحقیقت قلق و اضطراب پیدا کرنے والی ہو بلکہ یہ ہر امر کے لئے دلائل و براہین مہیا کرتی ہے اور ہر گناہ اور نیکی کے اسباب بتا کر بدی کا دروازہ بند کرتی اور نیکی کے لئے راستہ کھولتی ہے (باء) اس میں کوئی بات ایسی بیان نہیں کی گئی جس سے خدا تعالیٰ پر یا کسی راستباز انسان پر یا کسی سچی تعلیم پر کوئی تہمت لگائی گئی ہو (ج) اس سے

کفار کو ان کے اعتراض کا جواب فاتوا بسورۃ کے الفاظ سے دینے کا مطلب۔

کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی جس کا بیان کرنا روحانی تکمیل کے لئے ضروری ہو (د) اس میں کوئی تعلیم ایسی نہیں دی گئی کہ جو انسان کو مشقت یا ہلاکت میں ڈالتی ہو۔ اس کے بعد کی آیات میں مندرجہ ذیل امور بیان ہوئے ہیں۔

(۳) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یہ صرف انسان سے ہی اعمالِ حسنہ کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ وعدہ کرتی ہے کہ جو لوگ اس کی تعلیم پر چلیں گے انہیں خدا تعالیٰ اپنے وصال کے مقام پر پہنچائے گا اور اپنے قُرب میں جگہ دے گا اور اپنے منشاء سے انہیں مطلع فرمائے گا

(۴) اس کا ضد سے انکار کرنے والے خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہونگے۔

(۵) جو لوگ اس سے اخلاص کا معاملہ نہ کریں گے خواہ عقیدہ کے لحاظ سے یا اخلاص عمل کے لحاظ سے وہ بھی آسمانی سزاؤں میں مبتلا ہونگے۔

(۶) یہ ذاتِ باری کے متعلق سچی اور مدلّل تعلیم پیش کرتی ہے۔

یہ وہ امور ہیں جو اس آیت سے پہلے گذر چکے ہیں اور مِثْل کا مطالبہ وہی سورۃ پورا کر سکتی ہے جو ان تمام امور پر مشتمل ہو مگر ظاہر ہے کہ ان امور میں مِثْل کا مطالبہ پورا کرنا انسانی طاقت سے بالا ہے ایسی مِثْل تو وہی کتاب پیش کر سکتی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو۔

چونکہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں ایک ایسا دعویٰ قرآن کریم کی نسبت کیا گیا تھا کہ جو انسان کے بس کا ہی نہیں بلکہ اسے صرف خدا تعالیٰ ہی پورا کر سکتا ہے اس لئے آخر میں یہ بھی فرما دیا وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ تم اپنے معبودوں کو بھی بلا لو کہ وہ تم کو الہام کریں کیونکہ ایک دعویٰ اس کتاب کا یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے آسمانی الہام کا دروازہ کھُلے گا۔

قرآن کریم میں مِثْل لانے کا پانچ جگہ مطالبہ۔

یہ وہ مطالبہ ہے جو اس آیت میں کیا گیا ہے اس میں زبان کی خوبی بھی شامل ہے کیونکہ اگر زبان اعلیٰ نہ ہو تو مطلب واضح نہیں ہوتا اور شک پیدا ہوتا ہے پس جب یہ فرمایا اس میں کوئی امر ایسا نہیں جو قلق و اضطراب پیدا کرے تو اس میں یہ دعویٰ بھی آگیا کہ اسکی زبان بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کا کلام فصیح و بلیغ ہے۔ لیکن اس آیت کے یہ معنے کرنے کہ اس میں صرف اس امر کا مطالبہ ہے کہ قرآن کریم جیسی فصیح و بلیغ عبارت پیش کرو درست نہیں اور سمندر میں سے ایک قطرہ لے کر پیش کرنے والی بات ہے قرآن کریم کا مطالبہ وسیع ہے اور صرف زبان پر مشتمل نہیں اور نہ زبان کا یہاں کوئی ذکر ہے زبان کا ذکر تو لَا رَيْبَ فِيْهِ سے ہی نکل سکتا ہے مگر اس میں بھی اور مطالب کا ذکر ہے اور یہ درست نہیں کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ کے ایک معنی کو لے لیا جائے اور باقی معانی کو چھوڑ دیا جائے اور نہ یہ درست ہے کہ صرف لَا رَيْبَ فِيْهِ کے حصہ کو لے لیا جائے اور باقی مطالب جنکی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ان کو چھوڑ دیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں کفار کے اس اعتراض کا کہ ہمیں تو قرآن کریم کے مضامین سے اور بھی شبہات ذہن پر پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں اور یا یہ کہ قرآنی مضامین کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اور بھی شبہات پیدا ہو گئے ہیں ایسا مُنہ توڑ جواب دیا ہے کہ نہ اس سے کوئی اس سے پہلے عہدہ برا ہو سکا ہے اور نہ آیندہ کوئی ہو سکتا ہے۔ باقی رہے اعتراض تو وہ لوگ پہلے بھی کرتے چلے آئے ہیں اور پھر بھی کرتے چلے جائیں گے جب تک انسانوں میں تقویٰ سے خالی لوگ موجود ہیں اس وقت تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ ہاں تعصب سے خالی ہو کر کوئی شخص اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کرے تو اسے اپنے عجز کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا چنانچہ قرآن کریم اگلی آیت میں خود ہی فرماتا ہے کہ تم لوگ اسکی مثل نہ قریب زمانہ میں نہ آیندہ کسی زمانہ میں لا سکو گے۔

قرآن کریم میں یہ مِثْل کا مطالبہ پانچ جگہ ہوا ہے۔ اور میرے نزدیک پانچوں جگہ میں اس کا مفہوم جدا جدا ہے ایک تو اسی آیت میں جسکی تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے۔ دوم سورہ یونس ع ۴ میں۔ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ

فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ سوم:۔ سورۃ ہود ع ۲ میں جہاں فرماتا ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىہُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۰ چہارم سورہ بنی اسرائیل ع ۱۰ میں۔ وہاں آتا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۰ پنجم سورۃ طور ع ۲ میں وہاں آیا ہے۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَہٗ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖٓ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۰

ان پانچ جگہوں میں سے سورہ بقرہ اور سورہ یونس میں تو ایک ہی قسم کا مطالبہ ہے۔ باقی تین جگہ میں علیحدہ علیحدہ مطالبے گئے گئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں سارے قرآن کریم کی مثال کا مطالبہ کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر سارے جن وانس بھی اکٹھے ہو جائیں تو قرآن کریم کی مثال نہیں لا سکیں گے سورۃ ہود میں فرمایا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو دس سورتیں اپنے پاس سے بنا کر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے شائع کرو۔ سورہ بقرہ اور سورہ یونس میں ایک سورۃ کا مطالبہ ہے اور سورہ طور میں ایک سورۃ کی بھی شرط نہیں ہے خواہ وہ ایک بات ہی بنا کر لے آئیں اب بظاہر یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ کہیں سارے قرآن کا مطالبہ ہے کہیں دس سورتوں کا مطالبہ ہے اور کہیں ایک سورۃ کا اور کہیں ایک ہی بات پر اکتفا کی گئی ہے اور طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیوں ہے بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے ایسا ہوا ہے۔

پہلے سارے قرآن کی مثال کا مطالبہ کیا۔ جب وہ نہ لا سکے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیا۔ جب وہ بھی نہ لا سکے تو پھر فرمایا کہ ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ جب وہ بھی نہ لا سکے تو پھر فرمایا کچھ ہی لے آؤ۔ خواہ ایک بات ہی ہو۔ میرے نزدیک اس میں کچھ اشتباہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ان سورتوں میں سے کہ جن میں اس مضمون کا ذکر آیا ہے نزول کے لحاظ سے سب سے پہلے سورہ طور ہے اور اس میں قرآن کریم کی بجائے بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖ ہے۔ یعنی اس جیسا کوئی کلام لے آؤ اور شرط ایک سورۃ کی بھی نہیں رکھی گئی۔ خواہ وہ کلام ایک سورۃ سے بھی کم ہو پس عقلاً یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ طور میں تو بغیر مقدار مقرر کرنے کے مثل کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ اور اس کے بعد سورۃ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مطالبہ کیا گیا ہو اور بعد میں اس مطالبہ کو گرا کر دس سورتوں میں اور پھر دس سورتوں سے گرا کر ایک سورۃ میں محصور کر دیا گیا ہو۔

آیات کی تحدی و مطالبہ کی نظیر۔

دوسرے یہ کہ یہ کوئی واقعہ تو ہے نہیں کہ ہم اس سے عبرت پکڑیں بلکہ ایک چیلنج ہے جو ہم نے دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے اب ہم دُنیا کے سامنے کیا پیش کریں آیا یہ کہ سارا قرآن لاؤ یا یہ کہ دس سورتیں لاؤ یا ایک سورۃ یا ایک بات لاؤ اگر ایک آیت کا مطالبہ کافی ہے تو ایک سورۃ کا مطالبہ کیوں کریں۔ اور اگر ایک سورۃ کا لانا کافی ہو سکتا ہے تو دس سورتوں کا مطالبہ کیوں کریں۔ اور اگر دس سورتوں کا لے آنا کافی ہے تو سارے قرآن کی مثل لانے کے لئے کیوں کہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اس میں ترتیب نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو ان میں سے بعض سورتیں ایسے قریب قریب کے زمانہ کی نازل شدہ ہیں کہ انکی صحیح ترتیب کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ دوسرے قرآن کریم کی تنزیل اس طرح نہیں ہوئی کہ ایک وقت میں ایک ہی سورۃ نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قریب قریب نازل ہونے والی سورتیں بعض دفعہ ایک ہی وقت میں تین تین چار چار نازل ہوتی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک کو پہلی کہنا اور دوسری کو بعد کی کہنا اس لحاظ سے تو گو درست ہو کہ ایک کی آخری آیت پہلے اور دوسری

تحدی کے مطالبات میں مقدار مطلوبہ کے اختلاف کی وجہ۔

تحدی والی سورتوں کے زمانہ نزول کا مختلف ہونا ثابت نہیں۔

کی آخری آیت پیچھے نازل ہوئی ہو لیکن ایک کی سب آیتوں کے متعلق کہنا کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہیں اور دوسری کی سب آیتوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ پیچھے نازل ہوئی ہیں درست نہیں ہوسکتا پس میرے نزدیک ان آیتوں میں ایسے مطالبات ہیں جو ترتیب نزول کے حل کرنے کے محتاج نہیں ہیں اور سب کے سب ایک ہی وقت میں آج بھی اس طرح پیش کئے جا سکتے ہیں جس طرح کہ زمانہ نزول میں پیش کئے جا سکتے تھے۔

تحدّی مثل کے ساتھ اکثر جگہ مال و دولت اور طاقت کا ذکر۔

پیشتر اس کے کہ میں ان مختلف تحدیوں کی تشریح کروں جو ان آیات میں مذکور ہیں۔ میں اس عجیب بات کی طرف توجہ پھرانی چاہتا ہوں کہ یہ چیلنج جس جس جگہ کے لئے ہیں اُن کے ساتھ ہی مال و دولت اور طاقت و قدرت کا بھی ذکر آیا ہے سوائے سورہ بقرہ کے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی نیا چیلنج نہیں ہے بلکہ سورۃ یونس کے چیلنج کو سورۃ بقرہ کے مضامین کی ضرورت کے لحاظ سے دہرایا گیا ہے (سورۃ یونس مکّی ہے اور سورۃ بقرہ مدنی ہے) اس لئے اس میں اس ذکر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے اس کے سوا باقی سب سورتوں کو دیکھ لو۔ سب میں مال و دولت یا طاقت و قدرت کا ذکر ہے سورۃ یونس میں اس مطالبے سے چند آیات پہلے آیا ہے قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ٥ گویا دعویٰ کیا ہے کہ سب خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں خواہ وہ رزق کے ہوں یا قوائے طبعیہ کے یا قوائے علیہ کے ہوں یا مختلف قوتوں کو ایک نظام میں لانے کے متعلق ہوں۔ اور پھر اس کے بعد فرمایا قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۔ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ٥ اس میں بھی طاقت و قوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ طور میں تحدّی کے بعد

اُن تحدیوں میں مطالبۂ خزائن کے جواب میں قرآن کریم کو بطور خزانہ پیش کیا گیا ہے۔

فرماتا ہے۔ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ٥ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ٥ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ٥ یہاں پر بھی دولت اور حکومت اور طاقت و قدرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ ہود کی آیت سے پہلے بھی لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ آیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں تحدّی کے بعد آیا ہے وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ٥ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ اس جگہ بھی مال و دولت اور طاقت و قوت کا ہی ذکر ہے۔ غرض چاروں جگہ پر ایک ہی قسم کا مطالبہ بیان ہوا ہے یا مطالبہ کا ذکر نہیں لیکن مطالبہ کا جواب دیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ خزانوں کے سوال اور مطالبہ مثل میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ اور وہ یہی تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو خزانہ قرار دیا ہے اور مخالفین کے خزانہ کے مطالبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کا اصل خزانہ قرآن کریم ہے اور لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ کا بھی یہی جواب دیا ہے کہ ملائکہ ظاہری مقابلوں کے لئے نہیں اُترتے بلکہ کلام الٰہی لے کر اُترا کرتے ہیں اور وہ اس پر نازل ہو چکا ہے پس یہ کہنا کہ اس پر ملک نہیں اُترا یا یہ کہ اُترنا چاہیئے بے معنی قول ہے اور ایسی چیز کا مطالبہ ہے جو پہلے سے حاصل ہے۔ پھر چونکہ ملائکہ کا اُترنا یا روحانی خزانہ کا حصول بظاہر ایک دعویٰ معلوم ہوتا ہے جس کا ثبوت نہیں اس کے لئے خود قرآن کریم کے بے مثل ہونے کو پیش کیا ہے کہ یہ اپنی صداقت کی آپ دلیل ہے اور اس کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اسے لاثانی خزانہ اور منجانب اللہ کلام ثابت کرتے ہیں اور یہ جو فرق کیا ہے کہ جس جگہ زیادہ کلام کا مطالبہ ہے اس جگہ کفار کی طرف سے خزانوں یا مَلک کا مطالبہ ہے اور جس جگہ تھوڑے سے کلام کی مثل

کا مطالبہ ہے اس جگہ خدا تعالےٰ کی طرف سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا یہ کفار خزانوں کے مالک اور قانونِ قدرت کے متولی ہیں سو اسکی وجہ یہ ہے کہ جن مقامات پر پورے قرآن یا دس سورتوں کا مطالبہ ہے اس جگہ سوال ایسا ہے جو کفار کے ذہن میں آ سکتا تھا اور ہوتا تھا۔ پس ان کے سوال کو پیش کر کے اس کا جواب دے دیا گیا ہے لیکن بعض پہلو قرآن کریم کے بے مثل ہونے کے ایسے رہ جاتے ہیں جن کے متعلق سوال کرنے کا بھی کفار کو خیال نہیں آسکتا تھا اگر ان کا بیان کرنا بھی کفار کے سوالات پر منحصر رکھا جاتا تو وہ پہلو پوشیدہ ہی رہتے۔ اس لئے ان پہلوؤں کو قرآن کریم نے خود سوال پیدا کر کے بتا دیا اور اس طرح قرآن کریم کی تکمیل کے سب پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥

اب میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک مطالبہ کو الگ الگ لے کر بتاتا ہوں کہ کس طرح ان آیات میں قرآن کریم کی مختلف خوبیوں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور ہر جگہ کے مناسب حال زیادہ یا کم کلام کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سب سے بڑا مطالبہ سارے قرآن کی مثل لانے کا ہے اور یہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اس مطالبہ میں یہ شرط نہیں رکھی گئی۔ کہ جس کلام کو منکر پیش کریں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب کریں بلکہ جائز ہے کہ ان کا پیش کردہ کلام مفتریات میں سے نہ ہو اور ان کا صرف یہ دعویٰ ہو کہ گو ہم نے یہ کلام خود بنایا ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہے لیکن یہ کلام قرآن کریم کی مثل یا اس سے بڑھ کر ہے۔ چونکہ مثل کی حدبندی بھی ضروری تھی کہ وہ کلام کس امر میں مثل ہو۔ اس لئے اسکی تشریح بھی خود کر دی اور فرمایا کہ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۔ اس کلام میں ہر پہلو سے لوگوں کے فائدہ کے لئے ہر اک ضروری دینی امر پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ اس کے انکار پر مصر ہیں۔ یہی چیز ہے جس میں مثل کا مطالبہ کیا گیا ہے اگر فی الواقع وہ اس کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو ان چار خوبیوں والا کلام پیش کریں جو اپنی خوبیوں میں قرآن کریم کے برابر ہو (۱) اس میں ہر ضروری دینی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہو یعنی اعتقادات۔ فلسفۂ اعتقادات۔ صفات باری اور فلسفۂ ظہور صفات باری۔ علم کلام۔ عبادات۔ فلسفۂ عبادات۔ علم اخلاق۔ فلسفۂ اخلاق۔ معاملات۔ فلسفۂ معاملات۔ مدنیت۔ اقتصادیات۔ سیاسیات کا جو حصہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا فلسفہ معاد اور اس کے متعلق تمام امور وغیرہ وغیرہ سب امور ضروریہ پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہو (۲) وہ بحث جو ان امور کے متعلق کی گئی ہو سیر کن ہو نہ صرف وسعت کے رُو سے احاطہ ہو یعنی سب علوم کے متعلق کچھ نہ کچھ بحث ہو بلکہ حق کی گہرائی کا بھی احاطہ ہو اور ہر مسئلہ کے ہر پہلو کو پیش کر کے اس میں ہدایت دی گئی ہو (۳) وہ تمام تعلیم باوجود اپنی وسعت اور باریکی کے مضرت رساں نہ ہو بلکہ اس میں نفع ہی نفع ہو (۴) اس میں کسی ایک قوم یا طبقہ کے فائدہ کو مدِنظر نہ رکھا گیا ہو بلکہ تمام بنی نوع انسان کی فطرت کو مدنظر رکھا گیا ہو اور ہر قسم کی طبیعت اور ہر قسم کے حالات اور ہر درجہ اور ہر فہم کے انسان کے متعلق اس میں ہدایت موجود ہو۔

قرآن کریم کی چار صفات

تمام تحدیوں پر تفصیلی نظر۔

چونکہ قرآن کریم ابھی مکمل نہیں ہُوا تھا اس لئے یہ نہیں فرمایا کہ تم ابھی اس کی مثل لے آؤ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ نہ لا سکو گے یعنی نہ اسکی موجودہ حالت میں اور نہ اس وقت جب یہ مکمل طور پر نازل ہو جائے گا حق یہی ہے کہ قرآن کریم نے ایسے رنگ میں روحانی امور پر بحث کی ہے کہ اوپر کے چاروں امور کے مقابلہ میں اس قدر کلام میں بھی کوئی شخص اسکی کوئی مثل نہیں لا سکتا تھا جو اس وقت تک نازل ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کے لحاظ سے قرآن کہلاتا تھا۔

بجائے مطالبہ کی صورت کے پیشگوئی کی صورت میں تحدی۔

سورۃ بنی اسرائیل والی تحدی

اس آیت کے مطالب میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا اور وہ یہ کہ اس میں علم الارواح کے ماہرین کو بھی جنہیں انگریزی میں سپرچولسٹ کہتے ہیں مخاطب کیا گیا ہے اور جن سے مراد وہی ارواح ہیں جن سے تعلق پیدا کر کے روحانیت کی باریکیاں معلوم کرنے کے علم الارواح کے علمبردار مدعی ہیں۔

پیرنچو کرم کا ابطال

اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کی مثل نہ تو انسان خود لا سکتے ہیں اور نہ پوشیدہ ارواح کی مدد سے لاسکتے ہیں جنکی مدد کا ان کو دعویٰ ہے اس جگہ جنّ سے مراد وہ جنّات نہیں کہ جو عوام الناس میں مشہور ہیں کیونکہ انکی مدد سے کلام لانے کا مطالبہ ایک مہمل بات ہو جاتی ہے

مطالبہ میں دس کا عدد اختیار کرنے کی وجہ

نیز اس آیت سے پہلے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ بھی مذکور ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس جگہ ارواح کا ہی ذکر ہے نہ کہ جنّات کا (تفصیل کے لئے دیکھو اس آیت کی تفسیر بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں)

دوسری آیت جس میں کفار کا یہ اعتراض بیان کیا ہے کہ اس کے پاس خزانہ اور ملک نہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر یہ درست ہے تو تم دس سورتیں مفتریات کی اس کے مقابلہ

دس سورتوں کا مطالبہ

میں لے آؤ۔ پس اس جگہ سورتوں کو بطور خزانہ کے پیش کیا اور مفتریات کا مطالبہ کرکے بتایا ہے کہ اگر اس کا دعویٰ وحی یا ملائکہ کا جھوٹا ہے اور اس کے ساتھ ملائکہ نہیں آئے تو تم بھی زیادہ نہیں تو دس سورتیں ایسی پیش کرو جن کے متعلق دعویٰ ہو کہ ملائکہ نے باذن الٰہی ہم پر اُتاری ہیں پھر دیکھو کہ تمہارا کیا انجام ہوتا ہے اور اگر تم میں یہ جرأت نہیں کہ تم ایسا جھوٹا دعویٰ کرسکو تو محمد رسول اللہ کی نسبت کس طرح خیال کرسکتے ہو کہ اس قدر افترا کر رہا ہے۔ اور اگر افترا کر رہا ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی گرفت سے محفوظ کیوں ہے غرض اس جگہ عقلی مقابلہ کے ساتھ آسمانی مقابلہ کو بھی شامل کیا گیا ہے اور یہ جو اس جگہ فرمایا کہ دس سورتیں ایسی لاؤ اسکی یہ وجہ ہے کہ اس جگہ قرآن کریم کے ہر رنگ میں مکمل ہونے کا دعویٰ نہ تھا بلکہ کلام بعض القرآن کے متعلق تھا یعنی مخالف معترض تھا کہ اس کے بعض حصے قابل اعتراض ہیں جیسا کہ آیت فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

دس سورتوں کا مطالبہ کفار کی فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ والی طعن کے جواب میں۔

سے ظاہر ہے اور اسی طرح کفار کے اس سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے پاس خزانہ اور ملک نہیں۔ پس اس جگہ سارے قرآن کے مقابلہ کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ تم قرآن میں جو بھی کمزور سے کمزور حصہ سمجھتے ہو اس کے مقابلہ میں دس سورتیں بناکر پیش کردو تا تمہارے دعویٰ کی آزمائش ہو جائے۔

دس کا عدد اس واسطے استعمال کیا کہ یہ عدد کامل ہے اور چونکہ معترض کے دعویٰ کو ردّ کرنا تھا اس وجہ سے اس کو دس سورتیں بنانے کو کہا کہ تم کو ایک مثال نہیں دس مثالیں بنانے کی اجازت دیتے ہیں پس یہاں دس کا لفظ اس لئے نہیں رکھا گیا کہ وہ ایک سورۃ تیار کرسکتے تھے بلکہ اس لئے کہ ان کے اس اعتراض کو دُور کرنے کا بہترین ذریعہ یہی تھا کہ انہیں کئی مواقع اعتراض کے دیئے جاتے۔ اور سب اس لئے نہیں کہا کہ اس وقت جن معترضوں کا ذکر تھا وہ صرف بعض حصوں کو قابلِ اعتراض قرار دیتے تھے سب کو نہیں۔ غرض سورۃ بنی اسرائیل میں چونکہ تکمیل کا دعویٰ تھا اس میں قرآن شریف کی مثل کا مطالبہ کیا گیا۔ اور سورۃ ہود میں چونکہ کفار کے اس اعتراض کا جواب تھا کہ بعض حصے غیر معقول ہیں اس لئے فرمایا کہ دس ایسے حصے جو تمہارے نزدیک سب سے کمزور اور قابلِ اعتراض ہوں تم انہی کے مقابل میں کوئی کلام بناکر پیش کردو تاکہ کفار یہ نہ کہیں کہ ہمیں صرف ایک اعتراض کا حق دیا تھا اور اس کا مقابلہ کرنے میں ہم سے غلطی ہوگئی۔

تیسرا مقام جس میں قرآن کریم کی بے مثلی کا دعویٰ ہے سورۃ یونس ہے اس میں ایک سورۃ کا مطالبہ کیا ہے جو پہلے دونوں مطالبوں سے کم ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ اپنے ایک دعویٰ کے ثبوت کے لئے تھا نہ کہ کفار کے اعتراض کی تردید میں۔ اس جگہ اس آیت سے پہلے دعویٰ کیا گیا تھا کہ سب تصرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اس کے ثبوت میں قرآن کریم کو پیش کرکے اس کے متعلق پانچ دعوے کئے تھے وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی اوّل اس میں ایسی تعلیم ہے جسے انسان بنا ہی نہیں سکتا۔ دوم پہلی کتب کی اس میں تصدیق ہے۔ سوم اس میں پہلی کتب کے نامکمل احکام کو مکمل کیا گیا ہے۔ چہارم یہ کلام بالکل محفوظ

اور انسانی دست برد سے پاک ہے۔ پنجم اسکی تعلیم تمام قسم کے انسانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ سچ نہیں تو پھر تم بھی ایک سورۃ ایسی بنا کر پیش کردو جس میں وہ پانچ باتیں جو بیان کی گئی ہیں ایسے مکمل طور پر بیان ہوں جیسی کہ اس سورۃ یعنی سورۃ یونس میں بیان کی گئی ہیں لیکن اگر ایک سورۃ کے مقابلہ میں بھی تم کوئی کلام پیش نہ کرسکو تو پھر سمجھ لو کہ سارے کلام میں کس قدر کمالات مخفی ہونگے اور ان کا بنانا انسانی طاقت سے کس قدر بالا ہوگا۔ غرضیکہ اس جگہ مِثْلِہٖ سے مراد ان پانچ کمالات کی مثل والا کلام ہے جو سورۃ یونس میں بیان کئے گئے ہیں۔

اب رہی آخری آیت یعنی فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (سورۂ طور ع ۲) کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی ایسی ہی بات پیش کرکے دکھاؤ۔ میرے نزدیک اس آیت میں سب سے چھوٹا مطالبہ ہے اور وہ صرف ایک مثال کا ہے خواہ وہ ایک سورۃ سے بھی چھوٹی ہو اور یہ مطالبہ بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ہے نہ کہ کفار کے دعویٰ کے رد میں اور وہ دعویٰ وہی ہے جو اس سورۃ کے شروع میں کیا گیا ہے یعنی وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ۔ یعنی یہ کتاب جس کا وعدہ کوہ طور پر دیا گیا تھا اور جو لکھی جائے گی اور ہمیشہ پڑھی جائے گی اور دنیا میں پھیلائی جائے گی اور اسلام جس کے متبعین کی تعداد بہت بڑھ جائے گی اور نہ صرف عوام بلکہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ روحانی و جسمانی فضائل والے اس میں داخل ہونگے اور یہ روحانیت کا چشمہ جو مختلف ملکوں کو سیراب کرے گا ان دونوں امور کو ہم بطور قیامت کی دلیل کے پیش کرتے ہیں۔ اس ذکر کے بعد فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس کلام کو بناوٹی کہتے ہیں اگر ایسا ہے تو جو جو اور جس جس قسم کی پیشگوئیاں اوپر پیش کی گئی ہیں انکی مانند یہ بھی ایک پیشگوئی پیش کردیں اور مفتریات کی بھی ہم شرط نہیں لگاتے انہیں اجازت ہے کہ چاہیں تو پچھلی الہامی کتب سے ہی کوئی ایسی مثال نکال کر پیش کردیں۔ مگر یاد رکھیں کہ یہ اسکی نظیر کہیں سے نہیں لا سکتے۔ اس مطالبہ میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بھی کوئی شرط نہیں اور نہ یہ شرط ہے کہ اپنے پاس سے کوئی پیشگوئی کریں بلکہ اجازت دی ہے کہ خواہ خود بنالیں یا پچھلی کتب سے جو خواہ الہامی ہو خواہ غیر الہامی نکال کر پیش کردیں۔ اور پھر مطالبہ بھی نہایت چھوٹا رکھا ہے کہ ایسی ایک ہی پیشگوئی پیش کردیں حالانکہ قرآن کریم میں اور بھی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں اور پھر دشمن کے عاجز رہنے کی وجہ بھی بتادی ہے کہ ایسی پیشگوئی کے بیان کرنے کے لئے تو زمین اور آسمان کے خالق اور خزانوں کے مالک اور نگران اور روحانی ترقی کے مالک اور غیب کے مالک کی ضرورت ہے اور یہ باتیں ان میں موجود نہیں پس یہ کیونکر اس کی مثل بنا سکتے ہیں۔

سورۃ طور میں بیان شدہ تحدی کا مطلب

دوسرے حصہ کو یعنی پہلی کتب سے مثال نہ لا سکنے کے دعویٰ کو رد کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ وہ کتب سچی تھیں صرف درجہ کا سوال تھا یہ مطالبہ بھی باقی مطالبوں کی طرح اب تک قائم ہے۔

اب کیا کوئی انسان خواہ کسی مذہب کا ہو سورۃ طور کی اس آیت کی مثل لانے کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ اگر ہے تو آگے آکر اُسے پیش کرے۔

پانچواں مطالبہ سورۃ بقرہ کا ہے جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔

اوپر کی تشریحات سے یہ امر ثابت ہے کہ درحقیقت یہ پانچوں مطالبے الگ الگ ہیں اور سب ایک ہی وقت میں قائم ہیں کوئی مطالبہ کسی دوسرے مطالبہ کو منسوخ نہیں کرتا۔ اور سب غلطی اس امر سے لگی ہے کہ خیال کرلیا گیا ہے کہ جہاں جہاں مثل طلب کی گئی ہے وہاں صرف فصیح عربی کی مثل طلب کی گئی ہے اور سب آیتوں میں ایک ہی مطالبہ ہے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے ان پانچ سورتوں میں ایک ہی مطالبہ نہیں بلکہ مختلف مطالبے ہیں اور ہر مطالبہ کے مناسب حال پورے

قرآن یا بعض قرآن کی مثل طلب کی گئی ہے۔

اوپر کی تشریح سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ مثل کا مطالبہ انہی سورتوں تک محدود ہے جن میں اس دعویٰ کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ گو ایک جگہ سارے قرآن کی مثل لانے کا ایک جگہ دس سورتوں کی مثل لانے کا اور ایک جگہ اس دعویٰ کی مثل لانے کا مطالبہ ہے جو سورہ طٰہٰ کے شروع میں بیان کیا گیا ہے اور سورہ یونس کا مطالبہ بھی اسی مضمون کے متعلق ہے جو سورہ یونس میں بیان ہوا ہے مگر سورہ بقرہ کا مطالبہ عام ہے کیونکہ سورہ بقرہ کے شروع میں جو مضمون ہے وہ ساری سورتوں میں مشترک ہے۔ قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ گذشتہ انبیاء کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی ہے۔ (دیکھو سورہ فاتحہ میں بسم اللہ کا نوٹ ۵) اسی طرح سب کی سب سورتیں ریب والی تعلیم سے پاک ہیں اور سب ہی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہیں پس اس سورۃ میں جو مطالبہ ہے وہ باقی ساری سورتوں کے متعلق بھی ہے اور کسی ایک سورۃ کی مثل بھی اگر کوئی ان شرائط کے مطابق لے آئے جو سورہ بقرہ کے شروع میں بیان ہوئی ہیں اور جو سب سورتوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ قرآنی دعوے کو غلط ثابت کرنے والا ہوگا مگر ایسی مثل لانی ناممکن ہے اور جو شخص ایسی کوشش بھی کرے گا مُنہ کی کھائے گا۔ ایک جاہل شخص نے جو عربی بھی صحیح طور پر نہ لکھ سکتا تھا چند سال ہوئے تمسخر کے رنگ میں قرآن کریم کی مثل پیش کی تھی آج اس کا نام و نشان بھی کہیں باقی نہیں اور قرآن کریم کے پیش کردہ امور میں سے صرف ایک امر کو لے لیا جائے یعنی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کو تو اس کا دعویٰ مثل کا جھوٹا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا تو ماننے والا دُنیا میں کوئی بھی نہیں پھر وہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کیونکر ہوئی۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ کتاب کے الہامی ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ جو الہام کا جھوٹا دعویٰ کرے تباہ کر دیا جاتا ہے کسی زمانہ میں مسیلمہ کذاب نے بھی جھوٹے الہام کا دعوے کیا تھا مگر چند ہی سال میں ہلاک ہوا اور اسکی تباہی نے اور قرآن کریم کے قائم رہنے نے بتا دیا کہ اس کا پیش کردہ کلام قرآن کریم کی مثل نہ تھا۔ امام رازیؒ نے ایک مضحکہ خیز کلام اس کا نقل کیا ہے جو اس نے سورۃ الکوثر کے مقابل پر پیش کیا تھا جو یہ ہے اِنَّآ اَعْطَيْنَاكَ الْجَمَاهِرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَهَاجِرْ اِنَّ مُبْغِضَكَ رَجُلٌ كَافِرٌ۔ اس کلام کو مثل قرار دینا کسی مجنون کا کام ہے یہ تو اس سے بھی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص غالب اور میر کی غزلوں کو لے کر اس میں بعض الفاظ بدل کر غالب اور میر کے مدِّمقابل ہونے کا دعویٰ کرے قرآن کریم کی ہی سورۃ میں سے بعض الفاظ بدل کر ایک کلام پیش کرنا اور وہ بھی معنے اور مطلب سے عاری حالانکہ سورہ کوثر زبردست پیشگوئیوں پر مشتمل ہے جن میں سے بہت سی غیر معمولی حالات میں پوری ہو چکی اور بعض پوری ہونے والی ہیں ایک مجنون ہی کا کام ہو سکتا ہے اور بعض مسیحی مصنفوں کا اس پوچ عبارت کو قرآن کریم کی سورۃ کے مدِّمقابل پیش کرنا یقیناً ان کے تقویٰ کو اچھی شکل میں پیش نہیں کرتا۔ مگر میں پھر کہتا ہوں قرآن کا دعویٰ ہر سورۃ کے بارہ میں ہے کہ اس پر قیامت تک عمل کیا جائے گا مگر مسیلمہ کا کلام کہاں ہے اور اُسے کون مانتا ہے؟۔

حقیقت آیت مِمَّا نَزَّلْنَا سے بعض مفسرین کا نَزَّلْنَا کے لفظ سے ایک غلط استنباط۔

مِمَّا نَزَّلْنَا ... الخ اس آیت کے متعلق ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض مفسرین نے کفار کے شبہ کی وجہ نَزَّلْنَا کے لفظ کو قرار دیا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ چونکہ نَزَّلَ باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل میں ایک خاصیت آہستہ آہستہ یا بار بار فعل کے صدور کی پائی جاتی ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ اے کفار اگر تم کو قرآن کے آہستہ آہستہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے نازل ہونے پر اعتراض ہے اور تمہارے نزدیک سارا قرآن اکٹھا اُترتا تو اور بات تھی مگر وہ چونکہ آہستہ آہستہ پیش کیا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ پیش کرنے میں اس کے مصنف کو آسانی رہتی ہے کہ جوں جوں واقعات پیش آتے جائیں وہ ان کے مطابق کلام بناتا جاتا ہے

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ

اور اگر تم نے (ایسا) نہ کیا اور تم ہرگز (ایسا) نہ کر سکو گے تو اس آگ سے

اس لئے وہ معجزانہ کلام نہیں ہو سکتا تو ہم تم کو کہتے ہیں کہ تم ایک ٹکڑا ہی قرآن جیسا بنا دو اگر تم ایک ٹکڑا ہی بنا سکے تو تمہارا اعتراض درست ہوگا ورنہ نہیں۔ معنیً تو یہ استنباط لطیف معلوم ہوتا ہے لیکن عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے یہ امر درست نہیں ثابت ہوتا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ باب تفعیل میں تکرار اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے لیکن ہر جگہ نہیں بلکہ ایسے الفاظ میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے جن کے مجرد کا صیغہ متعدی ہو مثلاً ضَرَبَ کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں کسی کو مارا یہ متعدی ہے اس کو اگر ضَرَّبَ بنا دیا جائے تو اس میں تکرار اور شدت کے معنے پیدا ہو جائیں گے اور ضَرَبَ کے معنے اگر مجرد مارنے کے ہوں گے تو ضَرَّبَ کے معنے بار بار اور خوب مارنے کے ہوں گے یا ذَبَحَ کا لفظ ہے اس کے معنے کسی کو ذبح کرنے یا ہلاک کرنے کے ہوتے ہیں اگر ذَبَّحَ کہیں گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اسے بار بار ذبح کیا یعنی ایک ہی وار میں ذبح نہیں کر دیا بلکہ بار بار چھری پھیر کر آہستہ آہستہ ذبح کیا مگر نَزَّلَ جو نَزَلَ کا مجرد ہے اس کے معنے اُتارنے کے نہیں ہوتے بلکہ اُترنے کے ہوتے ہیں یعنی وہ لازم ہے متعدی نہیں اس صورت میں نَزَّلَ کی زاء کا دوبارہ لانا صرف اسے متعدی بنائے گا بار بار یا آہستہ آہستہ اُتارنے کے معنے نہ دے گا۔ کیونکہ عربی زبان کا اصل قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی حرف زیادہ کیا جائے تو وہ کچھ نہ کچھ زیادتی معنوں میں کرتا ہے اور اس جگہ لازم کو متعدی بنا کر زیادتی حرف نے اپنی غرض کو پورا کر دیا ہے۔ اس امر کا مزید ثبوت کہ خالی نَزَّلَ کے لفظ سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ کفار کا یہ اعتراض کہ قرآن کریم کیوں ایک ہی دفعہ نہیں اُتارا گیا جس آیت

میں بیان کیا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (فرقان ع ۳) یعنی کفار کہتے ہیں کہ کیوں اس پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اُتار دیا گیا اور اس آیت میں بھی نُزِّلَ زاء کی تضعیف سے استعمال ہوا ہے پس کم سے کم اس آیت میں نَزَّلَ (بِتَشْدِیْدِ الزَّاءِ) سارے قرآن کے اکٹھا نازل ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے پس جب اکٹھا اُتارنے کے لئے بھی تنزیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ اس جگہ قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارنے پر اعتراض ہے درست ثابت نہ ہوتا کیونکہ کفار کے منہ سے اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو بیان کرتے وقت اَنْزَلَ کا لفظ بیان نہیں کیا بلکہ نَزَّلَ کا لفظ بیان فرمایا ہے پس اس آیت سے یہ استدلال درست نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ نَزَّلَ تشدید کے ساتھ کہیں بھی آہستہ آہستہ اُترنے کے معنوں پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ بعض جگہ پر اس لفظ کے بعد مصدر بھی لایا گیا ہے جیسے نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا کہا گیا ہے (بنی اسرائیل ع ۱۲) جس سے یہ غرض پوری ہو گئی ہے اور مصدر کی زیادتی نے وہ معنے پیدا کر دیئے ہیں مگر بہرحال آیت زیر تفسیر میں بار بار اور آہستہ اُترنے پر اعتراض نہیں بلکہ توحید کے مضمون پر اعتراض ہے جو اس آیت سے پہلے بیان ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ توحید کی تعلیم نے دلوں میں قسم قسم کے شک پیدا کر دیئے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تفسیر
نَزَّلْنَا کا صحیح ترجمہ

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں بچو۔ وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۲۵

۲۵ حل لغات:۔ فَاتَّقُوْا۔ باب افتعال سے امر جمع کا صیغہ ہے اور اِتَّقٰی یَتَّقِیْ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۳

وَقُوْدُهَا۔ اَلْوَقُوْدُ۔ مَاتُوْقَدُ بِهِ النَّارُ مِنَ الْحَطَبِ۔ ایندھن جس سے آگ جلائی جاتی ہے (اقرب)

اَلْحِجَارَةُ:۔ اَلْحَجَرُ کی جمع ہے اور اَلْحَجَرُ کے معنی ہیں اَلْجَوْهَرُ الصَّلْبُ پتھر (مفردات) اسکی جمع اَحْجَارٌ بھی آتی ہے اور حَجَرَانِ سونے اور چاندی کو کہتے ہیں (اقرب)

اُعِدَّتْ:۔ اَعَدَّ سے ماضی مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور اَعَدَّهٗ لِاَمْرِ كَذَا کے معنی ہیں هَيَّأَهٗ وَاَحْضَرَهٗ اس کو اس کے لئے تیار کیا اور حاضر کیا (اقرب) پس اُعِدَّتْ کے معنی ہونگے وہ تیار کی گئی ہے اور حاضر رکھی گئی ہے۔

اَلْكٰفِرِيْنَ:۔ الکافِرُ کی جمع ہے۔ اور یہ کَفَرَ کا اسم فاعل ہے مزید تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرہ ۷

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ اگر تم اس دعوٰی کا مقابلہ نہ کرسکو اور قرآن کریم کی کسی سورۃ کی مثل نہ لاسکو اور وہ امور جو بیان کئے گئے ہیں اپنے کلام میں بتا نہ سکو اور تم ایسا کبھی نہ کرسکو گے تو سمجھ لو کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کا ہے اور تم انسان کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا مقابلہ کر رہے ہو اور اس صورت میں تم کو اس سزا کے بھگتنے کے لئے بھی تیار ہو جانا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی صداقتوں کا مقابلہ کرنے والوں کو ملتی ہے۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا کے معنے یہ بھی ہیں کہ تم ایسا ہرگز نہ کر سکو گے اور یہ بھی کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ دوسرے معنوں کے رُو سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گو کفار خدا تعالیٰ کے ساتھ بعض ہستیوں کو شریک قرار دیتے تھے مگر اپنے دلوں میں جانتے تھے کہ ان میں الہام نازل کرنے کی طاقت نہیں اور وہ کبھی وحی نازل نہیں کرتے پس وہ کس مُنہ سے اپنے شہداء کو بلاتے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی جب مشرکوں کو توجہ دلائی کہ اپنے معبودوں سے پوچھو کہ وہ فلاں امر کے بارہ میں کیا کہتے ہیں تو انہوں نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (انبیاء ع ۵) یعنی تم جانتے ہو کہ وہ بولتے نہیں۔ اسی طرف قرآن کریم بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہم تو اس کلام کو خدا تعالیٰ کے کلام کے طور پر پیش کرتے ہیں تم کو بھی یہ کہنا ہوگا کہ ہمارے بتوں نے یا خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے خود ساختہ معبودوں نے اس سورۃ کے مضامین ہمیں بتائے ہیں جو قرآن کریم کے مقابل پر ہم پیش کرتے ہیں مگر تم شرک کے دعوے تو بہت کرتے ہو مگر اس مقابلہ کے لئے تم کبھی تیار نہیں ہوگے کیونکہ تم جانتے ہو کہ تمہارے معبود تمہارے ذہنوں میں ہی ہیں ان کا خارجی وجود کوئی نہیں اور وہ زندہ خدا کی طرح بول نہیں سکتے۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کا مطلب

جس سزا سے ڈرایا گیا ہے اس کے متعلق بتایا کہ وہ سزا آگ ہے جس کا ایندھن ناس اور حجارہ ہیں۔ نار کے معنی اگر دوزخ کے کئے جائیں تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ جس دوزخ میں کافر جائیں گے اس کا ایندھن کچھ انسان اور پتھر ہیں یعنی مشرک اور ان کے بُت جن کو وہ پُوجتے ہیں چنانچہ ایک دوسری جگہ آتا ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء ع ۷) تم اور تمہارے بُت جہنم میں جاؤ گے یہ بھی مُراد ہے کہ وہ آگ پتھروں کی ہوگی جو زیادہ سخت ہوتی ہے جیسے پتھر کے کوئلہ یا چونے کے پتھر کی آگ نہایت سخت ہوتی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایندھن کا لفظ استعارہ کے طور پر ہو اور معنے یہ ہوں کہ اس آگ کے بھڑکانے کا موجب

انسانوں اور پتھروں کا تعلق ہوگا یعنی بُت پرستی۔

ناس اور حجارہ کی تشریح بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے یہ کی ہے کہ ان الفاظ سے دوزخیوں کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں ایک وہ جو کسی قدر محبت الٰہی اپنے دل میں رکھتے ہیں اور ناس کے لفظ سے جو محبت پر دلالت کرتا ہے بالکل خارج نہیں ہو گئے مگر ایک گروہ دوزخ میں وہ جائے گا جو حجارہ کے مشابہ ہوگا یعنی ان کے دل محبت الٰہی سے بالکل سرد ہونگے اور وہ پتھروں کی مانند ہونگے کہ کوئی رأفت اور شفقت انکے دلوں میں باقی نہ رہی ہوگی۔ یہ معنے نہایت لطیف ہیں اور قرآن کریم سے ان کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ قرآن کریم میں کفار کو پتھروں سے مشابہت دی گئی ہے چنانچہ یہود کی نسبت فرماتا ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ ع ۹) یعنی اللہ تعالیٰ کے نشانات دیکھنے کے بعد بھی تمہارے دل پتھروں کی طرح ہو گئے بلکہ بعض کے دل تو پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے پس اس تشبیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ دوزخ کی آگ میں عام کفار بھی ڈالے جائیں گے اور وہ لوگ بھی جو شقاوت کی وجہ سے پتھروں کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ اس صورت میں تو حجارہ کو پہلے بیان کرنا چاہیئے تھا اور ناس کو بعد میں۔ کیونکہ وہ لوگ جو پتھروں کی طرح ہو گئے ہیں دوزخ کے زیادہ مستحق ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں فرمایا یہ گیا ہے کہ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔ یعنی تم کو آگ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور ظاہر ہے کہ اس حکم سے فائدہ اٹھانے کی زیادہ قابلیت انہی لوگوں میں ہو سکتی ہے کہ جو کسی قدر انسانیت کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہوں پس موقعہ کے لحاظ سے ناس کا لفظ حجارہ سے پہلے ہی رکھنا مناسب تھا۔

قرآن کریم نے شرارت کے لحاظ سے بھی کفار کے دو نام رکھے ہیں جن اور ناس اور سزا کے لحاظ سے بھی دو نام رکھے ہیں حجارہ اور ناس۔ سورۃ الناس میں فرماتا ہے اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یعنے وسوسے ڈالنے والے وجود سے میں پناہ مانگتا ہوں جو کبھی جن ہوتا ہے اور کبھی انسان۔ اس محاورہ کا استعمال سورۃ حٰم سجدہ میں بھی ہُوا ہے وہاں فرماتا ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے کے وقت عام دوزخی کہیں گے کہ رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (ع ۴) یعنی اے ہمارے رب جن لوگوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا خواہ جن تھے خواہ انس ان کو ہمارے حوالے کر کہ انہیں ہم پاؤں تلے روندیں۔ اس آیت میں بھی گمراہ کرنے والے انسانوں کو دو گروہ قرار دیا ہے ایک کو جن کہا ہے اور ایک کو انس (جن کی پوری تشریح کے لئے دیکھو حجر ع ۲) غرض گمراہ کرنے کے لحاظ سے کفار کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں جن اور انس۔ اور سزا کے لحاظ سے بھی دو قسمیں بتائی ہیں ناس اور حجارہ۔ اس فرق کی یہ وجہ ہے کہ شرارت کو مدنظر رکھتے ہوئے تو اخفا کے پہلو پر زور دینا ضروری ہوتا ہے کیونکہ شریر لوگ ہمیشہ باریک راہوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی شرارتوں کو ظاہر کر دیں تو لوگ ان کے فریب میں نہ آویں پس ان کی اس کوشش کے مدنظر ان کا نام جن رکھا لیکن سزا کا جب ذکر ہو تو ان کی سزا کی سختی کی وجہ بتانے کے لئے ان کے دلوں کی سختی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا ہے تا سزا کے ذکر کے ساتھ اسکی سختی کی معقولیت بھی ثابت ہو پس ایسے موقعہ پر انہی انسانوں کو جو شرارت اور فساد کے لحاظ سے جن کہلاتے تھے دوزخ کی سزا کے لحاظ سے پتھر کے نام سے یاد کیا۔

خصوصیات وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ میں ناس اور حجارہ کی تشریح بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے قلم سے اور اسکی تائید قرآن مجید سے۔

گو اس آیت میں آگ اور خصوصاً پتھروں کی آگ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن مابعد الموت سزا اور جزاء کے بارہ میں جو کچھ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ تمثیلی زبان میں ہے جیسا کہ آگے چل کر مختلف آیات کے ماتحت بتایا جائے گا صرف عذاب اور ثواب کو انسانی ذہن کے قریب لانے

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ

اور تو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں خوشخبری دے کہ ان کے لئے (ایسے)

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا

باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب بھی ان (باغوں) کے پھل میں

مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا

سے کچھ رزق انہیں دیا جائے گا وہ کہیں گے یہ تو وہی (رزق) ہے جو ہمیں اس سے

مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ

پہلے بھی دیا گیا تھا اور ان کے پاس لایا جائے گا وہ (رزق) ملتا جلتا اور ان کے لئے ان (باغوں)

مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ

میں پاک جوڑے ہونگے اور وہ ان (باغوں) کے اندر (ہمیشہ) بسیں گے ۲۶؎ اللہ ہرگز نہیں رکتا

کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کو انسان اس دنیا میں سمجھتا ہے تا وہ بعدالموت عذاب یا ثواب کی کیفیتوں کو ایک حد تک سمجھ سکے۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ کا مطلب

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عذاب الٰہی صرف انکار کی صورت میں آتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نجات کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس آیت سے بعض مسلمانوں کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر مومن و کافر دوزخ کا مزہ تھوڑا بہت ضرور چکھے گا کیونکہ اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ دوزخ صرف کفار کے لئے تیار کی گئی ہے مگر یہ بھی اس کے معنی نہیں کہ کوئی مومن کہلانے والا دوزخ میں نہ جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو جو اسلام کی تعلیم پر پوری طرح عمل نہیں کرتے اور اپنی اصلاح کی بھی کوشش نہیں کرتے بمنزلہ کفار کے قرار دیا ہے پس ایسے لوگ جو عقیدۃً مسلمان ہوں لیکن عملاً کفار کا سا رنگ رکھتے ہوں اس آیت کے مضمون کی وجہ سے عذاب سے محفوظ نہیں سمجھے جا سکتے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے رو سے سزا دائمی اور ابدی نہیں ہوتی نہ اسکی غرض انتقام اور بے حکمت تکلیف دینا ہے بلکہ اسلام کی تعلیم کے رُو سے سزا وقتی ہوتی ہے اور اسکی غرض یہ ہے کہ وہ پاکیزگی پیدا کی جائے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قُرب کے قابل بنا دے اور اسکی حیثیت ایک شفاخانہ کی ہے جو بیماری کے علاج کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ اسکی تفصیل آیندہ متعلقہ آیات کے ماتحت آئے گی (مثال کے لئے دیکھو سورہ ہود نوٹ ۱۵۰؎)

بَشِّرْ

۲۶؎ **حل لغات**:۔ بَشِّرْ:۔ اَلْبَشَرَةُ ظَاهِرُ الْجِلْدِ جلد کے اوپر کے حصہ کو بَشَرَۃٌ کہتے ہیں اور بَشَّرْتُهٗ کے معنے ہیں اَخْبَرْتُهٗ بِسَارٍّ بَسَطَ بَشَرَةَ وَجْهِهٖ وَذَالِكَ اَنَّ النَّفْسَ اِذَا سُرَّتْ اِنْتَشَرَ الدَّمُ فِيْهَا اِنْتِشَارَ الْمَاءِ فِي الشَّجَرِ میں نے اسے خوشخبری

سُنائی جس سے اس کے چہرہ پر اثر ہوا اور چہرہ خوشی سے
پھیل گیا۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جب نفسِ انسانی خوش ہو تو
خون اس میں ایسے ہی پھیل جاتا ہے جس طرح درخت میں
پانی۔ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ فَاسْتِعَارَةٌ
دَالِكَ تَنْبِيْهٌ اَنَّ اَسَرَّ مَا يَسْمَعُوْنَهُ الْخَبَرُ
بِمَا يَنَالُهُمْ مِنَ الْعَذَابِ اور کفار کو عذاب کی خبر دیتے
ہوئے بشارت کا لفظ استعمال کرنے میں اس بات کی طرف
اشارہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوش کرنے والی بات جو وہ
سُنیں گے وہ اس عذاب کی خبر ہوگی جو انہیں پہنچے گا (مفردات)
تاج میں ہے اَلْبِشَارَةُ الْمُطْلَقَةُ لَا تَكُوْنُ اِلَّا بِالْخَيْرِ
بشارت کا لفظ جب بغیر کسی قید کے بولا جائے تو اس سے
مُراد اچھی خبر ہوتی ہے۔ وَ اِنَّمَا تَكُوْنُ بِالشَّرِّ اِذَا
كَانَتْ مُقَيَّدَةً كَقَوْلِهٖ تعالىٰ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
اَلِيْمٍ اور وہ بُری چیز کے لئے اس وقت بولا جاتا ہے
جبکہ ساتھ کی بُری بات کا ذکر ہو جیسے کہ آیت مذکورہ میں
عَذَابٍ اَلِيْمٍ کے ساتھ اسے مقید کیا گیا ہے وَ التَّبْشِيْرُ
يَكُوْنُ بِالْخَيْرِ وَالشَّرِّ كَقَوْلِهٖ تَعَالىٰ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
اَلِيْمٍ لیکن تبشیر کا لفظ خیر اور شر دونوں معنوں کے ادا کرنے
کے لئے بولا جاتا ہے وَقَدْ يَكُوْنُ هٰذَا عَلٰى قَوْلِهِمْ تَحِيَّتُكَ
الضَّرْبُ وَعِتَابُكَ السَّيْفُ اور تبشیر کا یہ استعمال ایسا
ہی ہے جیسا کہ کسی شخص کو جو سخت غصیلا ہو کہتے ہیں کہ تیرا
تحفہ مار ہے اور تیری ناراضگی تلوار یعنی معمولی غصہ میں تو
تلوار نکال لیتا ہے اور کسی پر خوش ہو تو مار کا تحفہ دیتا ہے
اسی طرح یہ کہہ دیا گیا کہ انہیں عذاب کی بشارت ملیگی وَ التَّبْشِيْرُ
فِيْ عُرْفِ اللُّغَةِ مُخْتَصَّةٌ بِالْخَبَرِ الَّذِيْ يُفِيْدُ
السُّرُوْرَ اِلَّا اَنَّهٗ بِحَسَبِ اَصْلِ اللُّغَةِ عِبَارَةٌ عَنِ
الْخَبَرِ الَّذِيْ يُؤَثِّرُ فِي الْبَشَرَةِ تَغَيُّرًا وَهٰذَا
يَكُوْنُ لِلْحُزْنِ اَيْضًا فَوَجَبَ اَنْ يَكُوْنَ لَفْظُ
التَّبْشِيْرِ حَقِيْقَةً فِي الْقِسْمَيْنِ اور لفظ تبشیر عام
لغت میں خوشی کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن
اصل لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے معنی ایسی
خبر دینے کے ہیں جس سے چہرہ پر اثر ہو اور یہ دونوں طرح
ہوسکتا ہے خوشی سے بھی اور غم و اندوہ سے بھی۔ اس لئے
درحقیقت یہ لفظ دونوں معنے اپنے اندر رکھتا ہے (تاج)

اَلصّالحات

الصّالحات :۔ الصَّالِحَةُ کی جمع ہے جو صَلَحَ
سے نکلا ہے اور صَلَحَ الشَّيْءُ کے معنے ہیں ضِدُّ فَسَدَ
کوئی چیز فساد سے پاک ہوگئی نیز کہتے ہیں هٰذَا يَصْلُحُ لَكَ
اَىْ مِنْ بَابَتِكَ یعنی یہ تیرے مناسب حال ہے اور
صَالِحَةٌ کے معنے ہیں وَافِقَةٌ اس سے موافقت کی
الصَّالِحُ کے معنے ہیں ضِدُّ الْفَاسِدِ فساد سے پاک
وَالصَّلَاحِيَّةُ حَالَةٌ يَكُوْنُ بِهَا الشَّيْءُ صَالِحًا
وہ حالت جس سے کوئی چیز مناسب و موزون ہو جائے (اقرب)
پس صالحات کے معنے ہونگے وہ اعمال جو فساد سے پاک
اور با مصلحت اور مناسب حال ہوں۔

جَنّٰتٌ

جَنّٰتٌ :۔ جَنَّةٌ کی جمع ہے اور اَلْجَنَّةُ جَنَّ
میں سے ہے وَاَصْلُ الْجَنِّ سَتْرُ الشَّيْءِ یعنی جنّ
کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ يُقَالُ جَنَّهُ
اللَّيْلُ چنانچہ جَنَّهُ اللَّيْلُ کا محاورہ بھی معنے ادا کرنے
کے لئے مستعمل ہے کہ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔
وَالْجَنَّةُ كُلُّ بُسْتَانٍ ذِيْ شَجَرٍ يَسْتُرُ بِاَشْجَارِهِ
الْاَرْضَ اور جنّت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کثرت
سے درخت ہوں اور وہ درختوں کے سایہ سے زمین کو
ڈھانپ لے۔ وَقَدْ تُسَمَّى الْاَشْجَارُ السَّاتِرَةُ جَنَّةً
اور ڈھانپنے اور چھپانے والے یعنے گھنے درختوں کو بھی
جنّت کہتے ہیں وَسُمِّيَتِ الْجَنَّةُ اِمَّا تَشْبِيْهًا بِالْجَنَّةِ
فِي الْاَرْضِ وَاِنْ كَانَ بَيْنَهُمَا بَوْنٌ وَاِمَّا لِسَتْرِهٖ
نِعَمَهَا عَنَّا الْمُشَارَ اِلَيْهَا بِقَوْلِهٖ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ
مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ اور جنت کو اس لئے
جنّت کے نام سے پکارا گیا ہے کہ یا تو وہ دُنیاوی باغات
کے مشابہ ہے اگرچہ ان میں اور اس میں بہت فرق ہے

یا اس وجہ سے ہے کہ اسکی نعمتیں ہم سے پوشیدہ ہیں جیساکہ اللہ تعالیٰ نے آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ میں فرمایا ہے کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں (مفردات)

اَلْاَنْهٰرُ: اَلنَّهْرُ کی جمع ہے اور النَّهْرُ کے معنے ہیں مَجْرَی الْمَآءِ الْفَائِضِ بہنے والے پانی کے چلنے کی جگہ۔ وَجَعَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی ذٰلِكَ مَثَلًا لِّمَا يُدِرُّ مِنْ نِعَمِهٖ وَفَضْلِهٖ فِی الْجَنَّةِ عَلَی النَّاسِ قَالَ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے بطور مثال کے اپنے اس فیض اور فضل کو جو اس کے بندوں پر جنت میں بکثرت نازل ہوگا بیان کیا ہے۔ جیسے کہ فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ کہ متقی باغات اور نہروں میں ہونگے وَالنَّهْرُ السَّعَةُ تَشْبِيْهًا بِنَهْرِ الْمَآءِ نَهَر کے معنی وسعت کے ہیں۔ نہر کا پانی چونکہ وسیع ہوتا ہے اس لئے اس کو اس پر قیاس کر لیا چنانچہ کہتے ہیں نَهَّرَ نَهْرًا اَنْهَرَ کَثِیْرُ الْمَآءِ بہت پانی والا دریا (مفردات)

مُطَهَّرَةٌ

اَزْوَاجٌ

اَزْوَاجٌ: زَوْجٌ کی جمع ہے اور زَوْج کے معنے ہیں کُلُّ وَاحِدٍ مَعَهٗ اٰخَرُ مِنْ جِنْسِهٖ ہر ایک وہ چیز جس کے ساتھ اسکی جنس میں سے ایک اور وجود بھی ہو (اقرب) عام لوگ زوج کے معنے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ زوج کے معنے جوڑے کے ہیں حالانکہ عرب لوگ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے زوج کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ تثنیہ کا صیغہ بولتے ہیں مثلاً وہ کبوتروں کے جوڑے کے لئے (مذکر و مؤنث کے لئے) زَوْجُ حَمَامٍ نہیں کہیں گے بلکہ زَوْجَانِ مِنْ حَمَامٍ کہیں گے اسی طرح دو موزوں کے لئے زَوْجَانِ مِنْ خِفَافٍ کہیں گے چنانچہ قرآن مجید میں سورہ ہود کی آیت قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ بھی اس استعمال کو واضح کرتی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ زوج کے معنے نر و مادہ کے نہیں بلکہ یا نر یا مادہ کے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے اس آیت میں اِثْنَيْنِ کا لفظ لگا کر واضح کر دیا گیا ہے

خَالِدُوْنَ

کہ مراد دو ہم جنس جانور ہیں نہ کہ دو جوڑے (یعنی چار جانور مراد نہیں) حضرت نوحؑ کو حکم تھا کہ ضروری جانوروں میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ اپنے ساتھ رکھ لیں پس آیت وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ میں اَزْوَاجٌ سے مراد ہم جنس ساتھی کے ہیں یعنی ایسے وجود جن کے ساتھ مل کر تمام ترقیاں اور تمام آرام مکمل ہونگے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے ذات باری کے ہر چیز ایک جوڑے کی محتاج ہے اس قاعدہ کے مطابق جنتی بھی جوڑوں کے محتاج ہونگے خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ جوڑے کس قسم کے ہونگے یہ تفصیل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ انسان اس کو تفصیلاً اسی وقت معلوم کرے گا جب وہ جنت میں جائے گا۔

مُطَهَّرَةٌ: طَهَّرَ سے اسم مفعول مؤنث کا صیغہ ہے اور طَهُرَ (مجرد) کے معنی ہیں ضِدُّ نَجِسَ پاک ہو گیا اور طَهَّرَهٗ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ طَاهِرًا اسے پاک کیا (اقرب) مفردات میں ہے اَلطَّهَارَةُ ضَرْبَانِ طَهَارَةُ جِسْمٍ وَّ طَهَارَةُ نَفْسٍ پاکیزگی دو قسم کی ہوتی ہے (۱) جسمانی (۲) باطنی۔ پس اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کے معنے ہوں گے پاک ساتھی۔

خَالِدُوْنَ: خَلَدَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور اَلْخُلْدُ کے معنے عربی زبان میں یہ ہوتے ہیں کہ اَلْبَقَاءُ باقی رہنا۔ اَلدَّوَامُ چلتے ہی چلے جانا۔ اور خَلَدَ (يَخْلُدُ) خُلُوْدًا کے معنے ہیں دَامَ وَبَقِیَ دائم رہا اور باقی رہا کہتے ہیں خَلَدَ الرَّجُلُ خَلْدًا وَّخُلُوْدًا اَیْ اَبْطَاَ عَنْهُ الشَّيْبُ وَقَدْ اَسَنَّ کہ اس آدمی کی عمر زیادہ ہو گئی۔ اور بڑھاپا نہ آیا۔ خَلَدَ بِالْمَكَانِ وَاِلَی الْمَكَانِ کے معنے ہیں اَقَامَ بِهٖ کسی جگہ میں ٹھہر گیا بس گیا اور جب خَلَدَ اِلَی الْاَرْضِ کہیں تو یہ معنے ہونگے کہ لَصِقَ بِهَا وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهَا کہ وہ زمین پر چمٹ گیا اور اس پر مطمئن ہو گیا (اقرب) کلیات ابی البقاء میں ہے کُلُّ مَا يَتَبَاطَاُ عَنْهُ التَّغَيُّرُ وَالْفَسَادُ تَصِفُهُ الْعَرَبُ بِالْخُلُوْدِ كَقَوْلِهِمْ لِلْاَيَّامِ

خَوَالِدُ وَذٰلِكَ لِطُوْلِ مَكْثِهَا لَا لِلدَّوَامِ کہ ہر وہ چیز جس سے تغیّر اور فساد دُور رہے اس پر عرب خُلُوْدٌ کا لفظ بولتے ہیں جیسے اَیَّام کے لئے خَوَالِد کا لفظ بولتے ہیں اور یہ انکی لمبائی کے لئے کہا جاتا ہے نہ اس لئے کہ وہ ہمیشہ رہتے ہیں اور مفردات میں ہے کہ اَلْخُلُوْدُ هُوَ تَبَرِّى الشَّيْءِ مِنْ اِعْتِرَاضِ الْفَسَادِ وَبَقَاءُهُ عَلَى الْحَالَةِ الَّتِيْ هُوَ عَلَيْهَا کسی چیز کا خراب ہونے سے محفوظ اور اپنی اصلی حالت پر رہنا خُلُود کہلاتا ہے وَاَصْلُ الْمُخَلَّدِ الَّذِىْ يَبْقٰى مُدَّةً طَوِيْلَةً اور مُخَلَّد کے اصلی معنے اس چیز کے ہیں جو ایک لمبے عرصہ تک رہے ثُمَّ اسْتُعِيْرَ لِلْمُبْقِيْ دَائِمًا پھر ہمیشہ رہنے والی چیز کے لئے یہ لفظ استعارۃً استعمال ہونے لگا۔ وَالْخُلُوْدُ فِي الْجَنَّةِ بَقَاءُ الْاَشْيَاءِ عَلَى الْحَالَةِ الَّتِيْ عَلَيْهَا مِنْ غَيْرِ اِعْتِرَاضِ الْفَسَادِ اور جنت میں خُلُود سے مُراد یہ ہے کہ اشیاء بغیر خراب ہونے کے اپنی حالت پر رہیں گی۔

تفسیر۔ اس آیت میں مومنوں کے انعامات کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انہیں جنّات میں جگہ ملے گی جن کے ساتھ نہریں متعلق ہونگی۔ مومنوں کے انعامات کا مسئلہ مخالفین اسلام کے لئے قابلِ اعتراض بنتا چلا آیا ہے اس پر ذیل کے اعتراض کئے جاتے ہیں (۱) اس قسم کے انعام کا وعدہ انتہائی درجہ کی لالچ ہے اور کامل ایمان کے منافی ہے کیونکہ جس ایمان کا باعث لالچ ہو وہ ایمان نہیں کہلا سکتا (۲) ایمان کے نتیجہ میں مادی انعامات قرآن نے تجویز کئے ہیں جو قابلِ اعتراض ہے (۳) اگر مرنے کے بعد مادی انعامات ملنے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مرنے کے بعد پھر یہی جسم زندہ کیا جائے گا جو عقل کے خلاف ہے کیونکہ یہ جسم تو فنا ہو جاتا ہے اور ایک ہی جسم کے اجزاء کئی کئی انسانوں میں استعمال ہو جاتے ہیں پھر وہ جسم کس کس کو ملے گا (۴) اِس آیت میں اور متعدد آیات میں بتایا گیا ہے کہ مومنوں کو جنت میں بیویاں ملینگی اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جنسی تعلقات بھی ہونگے جو قابلِ اعتراض ہے اور جنسی تعلقات کی خواہش کا اُخروی زندگی کے متعلق پیدا کرنا اور بھی قابلِ اعتراض ہے نیز جنسی تعلقات تو نسل چلانے کے لئے ہوتے ہیں پھر کیا وہاں بھی نسل چلے گی (۵) جنّات کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عیش و طرب کا مقام ہوگا نہ کہ رُوحانی اور یہ انعام قابلِ قدر نہیں۔

خلاصہ ان اعتراضات کا یہ ہے کہ اسلام نے محض نفسانی خواہشات کو انگیخت کر کے اُخروی زندگی کو بہت ادنیٰ درجہ دے دیا ہے اور اس طرح اس زندگی کا پاک مفہوم خراب کر دیا ہے۔

مخالفین اسلام کے مومنوں کے انعامات پر اعتراضات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بعض امور کا ذکر

ان اعتراضات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جنت کے اُس نقشہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔

آیت وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ میں مومنوں کے لئے انعامات کے طور پر جنّات کا وعدہ اور مخالفین اسلام کے اس پر پانچ اعتراض

اوّل۔ تو یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ اگلے جہان کے انعامات کا سمجھنا انسانی عقل سے بالا ہے پس اس دنیا کی زندگی سے اُخروی زندگی کا قیاس کرنا درست نہیں قرآن کریم فرماتا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سجدہ ع ۲) یعنی کوئی انسان بھی اِس کو نہیں سمجھ سکتا کہ ان کے لئے اگلے جہان میں کیا کیا نعمتیں مخفی رکھی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے بارہ میں جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے وہ تمثیلی زبان میں ہے اور اس سے وہ مفہوم نکالنا درست نہیں جو اس دنیا میں اسی قسم کے الفاظ سے نکالا جاتا ہے اس مضمون کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ

مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری جلد دوم کتاب بدء الخلق باب صفة الجنة ومسلم جلد ہم کتاب الجنة وصفة نعیمہا واہلہا) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے آخرت کی زندگی میں وہ کچھ تیار کر چھوڑا ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سُنا ہے اور نہ کسی انسان کے فکر نے اسکی حقیقت کو سمجھا ہے۔ اس تشریح سے بھی ظاہر ہے کہ جنت کی نعماء کی حقیقت اس دنیا کی حقیقت سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اگر وہاں بھی اسی قسم کے مادی باغ اور مادی نہریں اور مادی پھل اور مادی بیویاں ہوتی ہیں تو یہ چیزیں تو ایسی ہیں جنہیں آنکھوں نے دیکھا بھی ہے اور کانوں نے سُنا بھی ہے اور فکرِ انسانی ان کی حقیقت کو سمجھتا بھی ہے۔

اگلے جہان کے انعامات کو سمجھنا انسانی عقل سے بالا ہے

اصولی طور پر ان انعامات کے متعلق سورہ رعد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ (رع ۵) یعنی متقیوں کو جن جنات کا وعدہ دیا گیا ہے اُنکی کیفیت یہ ہے کہ نہریں ان کے تابع ہو کر بہتی ہونگی اور ان کے پھل بھی دائمی ہونگے اور ان کے سائے بھی دائمی ہونگے یہ مومنوں کا آخری مقام ہوگا اور کافروں کا آخری مقام آگ ہوگا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ باغات جو اُخروی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اس دُنیا کے باغوں سے مختلف ہیں کیونکہ ان کے پھل بھی دائمی ہیں اور ان کے سائے بھی دائمی ہیں یعنی ان میں زوال نہیں لیکن مادی اشیاء میں زوال کا پیدا ہونا لازمی ہے کیونکہ مادی اشیاء میں تحلیل کا سلسلہ چلتا ہے اور جن چیزوں میں تحلیل کا سلسلہ چلے انہیں غذا کی ضرورت بھی ہوتی ہے اس کے برخلاف جن میں تحلیل کا سلسلہ نہ ہو ان کو غذا کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس وہ جنات ایسی ہیں کہ نہ غذا کی محتاج ہیں اور نہ ان پر فنا آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنات ہرگز مادی نہیں

جنت کا نقشہ از روئے قرآن مجید

قرآن مجید میں جنت میں خمار نہ پیدا کرنے والی شراب کا ذکر۔

قرآن مجید میں بیان شدہ جنات مادی نہیں۔

ہو سکتیں۔

جنات کی تفصیل ایک اور جگہ قرآن کریم میں یُوں بیان ہوئی ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (محمد ع ۲) یعنی جس جنت کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے اسکی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نہریں بہتی ہیں ایسے پانی کی جس کے لئے سڑنا ناممکن ہوگا۔ اور ایسے دودھ کی نہریں بہتی ہیں جن کا مزہ کبھی بگڑا نہیں اور ایسی شرابوں کی نہریں رواں ہیں جو پینے والوں کے لئے لذت کا موجب ہوتی ہیں اور ایسی شہد کی نہریں جاری ہیں جو بالکل مصفّٰے ہے موم وغیرہ کوئی شئے اس میں نہیں۔ اور انہیں وہاں تمام اقسام کے پھل ملیں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت بھی ملے گی۔ اس آیت میں جو امور بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ یہ جنتیں مادی نہیں کیونکہ جو پانی کبھی سڑے نہیں جو دودھ کبھی بگڑے نہیں جو شراب خمار پیدا نہ کرے جس شہد میں موم نہ ہو وہ ان مادی اقسام کی اشیاء میں سے تو ہو نہیں سکتا۔

جنت کی شراب کے متعلق جو یہ آیا ہے کہ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ اور اس سے میں نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ خمار پیدا کرنے والی نہ ہوگی اس کا ثبوت قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے ملتا ہے جس میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم سے ملتا جلتا مضمون بیان ہوا ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ بَیْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ لَا فِیْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا یُنْزَفُوْنَ (الصافات ع ۲) یعنی مومنوں کے پاس چھلکتے ہوئے پیالے بار بار لائے جائیں گے وہ سفید ہونگے اور پینے والوں کے لئے موجب لذت ہونگے نہ تو ان سے کا

ہوگا اور نہ مومن ان کو پی کر مدہوش ہونگے۔ اس آیت میں بھی لَذَّةٍ لِلشَّارِبِيْنَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور بعد میں لذت کی تشریح کر دی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نہ تو نشہ ہوگا اور نہ نشہ اُترنے کے بعد کا خمار۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیوی شراب حقیقی لذت کا موجب نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت غفلت پیدا کرکے غم غلط کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے مگر جنت کی شراب نہ نشہ کرے گی اور نہ بعد کا خمار اس سے پیدا ہوگا۔ اسی طرح اس شراب کے بارہ میں ایک دوسری جگہ آتا ہے وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (دھر ع ۱) اللہ تعالیٰ انہیں وہ کچھ پینے کو دے گا جو پاک اور پاک کر دینے والا ہوگا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (تطفیف) مومنوں کو جنت میں خوشبودار شراب پینے کو دی جائے گی جس پر مہریں لگی ہوئی ہونگی اور اس کا آخری حصہ مشک کا ہوگا اور چاہیئے کہ جس نے خواہش کرنی ہو ایسی چیز کی خواہش کرے اور اسکی ملاوٹ کثرت اور بلندی سے ہوگی۔ وہ کثرت اور بلندی ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پانی پیا کرتے ہیں اسی طرح لکھا ہے يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (طور ع) یعنی مومن جنت میں ایسے شراب سے بھرے ہوئے پیالے ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کرلیں گے جن میں نہ تو کوئی لغو بات ہوگی اور نہ اس کو پی کر ایک دوسرے کو گالیاں دینگے اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ایک ایسی شراب ملے گی جو نہ نشہ لائے گی نہ خمار پیدا کریگی - کثرت اور بلندی والے ایک چشمہ کا پانی ملا کر وہ مومنوں کو دی جائے گی اس میں مشک کی سی خوشبو ہوگی وہ پاک ہوگی اور جو اسے پیئے گا اسے پاک کر دیگی اور وہ ایسی شراب ہوگی کہ اس کے پینے والے نہ تو لغو باتیں کریں گے اور نہ ایک دوسرے کو گالیاں دینگے

یہ تو جنت کی شراب کا حال بیان ہوا ہے لیکن دُنیا میں جو شراب بنتی ہے وہ نشہ لاتی ہے اور اس کو پینے والے لغو باتیں کیا کرتے ہیں اور بعض دفعہ گالیاں دینے لگتے ہیں اسکی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (مائدہ ع ۱۲) یعنے اے مومنو! شراب اور جوا اور جو بتوں کے لئے عبادت گاہیں بنائی جاتی ہیں اور لاٹریاں سب گندی باتیں ہیں پس تم ان سے بچو تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکو شیطان تم میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے صرف عداوت اور بغض پیدا کرنا چاہتا ہے نیز اللہ تعالےٰ کے ذکر سے اور نماز سے روکنا چاہتا ہے پھر کیا تم ایسے اعلیٰ درجہ کے کاموں سے رُک جاؤ گے۔

اس مادی دُنیا کی شراب اور جنت کی شراب میں فرق۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ شراب ایک گندی چیز ہے اس کا پینا شیطانی فعل ہے یعنے دین کے خلاف ہے اس سے عداوت اور بُغض پیدا ہوتا ہے اور اس کے پینے سے ذکر الٰہی اور نماز میں روک پیدا ہوتی ہے۔ اب ان باتوں کو جنت کی شراب کی خصوصیات سے ملا کر دیکھو تو دونوں میں اندھیرے اور نور کا فرق نظر آتا ہے۔ اگر دُنیا کی شراب کو گندہ کہا گیا ہے تو جنت کی شراب کو پاک اور پاک کرنے والی قرار دیا گیا ہے اگر دُنیا کی شراب کو بُغض اور عداوت پیدا کرنے والی بتایا گیا ہے تو اُخروی شراب کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ لغو باتیں کرنے اور گالی گلوچ سے بچانے والی ہوگی اگر دنیا کی شراب کو عمل شیطان کہا گیا ہے تو اُخروی شراب کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ وہ کثرت اور بلندی پیدا کرنے کا موجب ہوگی۔ اگر دنیوی شراب نشہ اور خمار پیدا کرنے والی ہوتی ہے تو اُخروی شراب کی نسبت کہا گیا ہے کہ نہ اس سے

نشہ پیدا ہوگا اور نہ خمار۔ اگر دُنیا کی شراب کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ اس سے بچو تو اُخروی شراب کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی خواہش کرنی ہو تو وہ اس شراب کے حصول کی خواہش کرے۔ ان اختلافات سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ جنّت کی وہ چیز جس کا نام شراب رکھا گیا ہے نہ صرف یہ کہ دنیوی شراب سے مختلف ہے بلکہ وہ مادی چیز بھی نہیں کیونکہ مادی چیز خواہ کیسی اعلیٰ بھی ہو وہ نہ تو دل کو پاک کر سکتی ہے اور نہ اس سے کثرت اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ کثرت اور بلندی تو کسی روحانی چیز سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

جنّت کے ثمار کے دنیوی نام اختیار کرنے کی وجہ۔

جنّت کے ثمار سے مراد بعض روحانی نعمتیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جنّت کی نعمتوں کے نام گو دنیا کی چیزوں جیسے رکھے گئے ہیں لیکن ان سے مُراد بعض رُوحانی نعمتیں ہیں نہ کہ کوئی جسمانی اشیاء۔ کجا یہ کہ وہی اشیاء جو اس دُنیا میں پائی جاتی ہیں۔

صحابہؓ کے کلام سے بھی اس مفہوم کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ لَیْسَ فِی الدُّنْیَا مِمَّا فِی الْجَنَّةِ شَیْءٌ اِلَّا الْاَسْمَاءَ (ابن جریر جلد اوّل) یعنی جو کچھ جنّت میں ہے اس دنیا میں صرف ان کے نام معلوم ہیں انکی حقیقت معلوم نہیں۔

اُخروی زندگی میں باغات، نہروں، پانی، دودھ، شراب اور شہد سے مراد۔

غرض اُخروی زندگی میں باغات اور نہروں اور پانی اور دودھ اور شراب اور شہد سے مُراد صرف یہ ہے کہ وہ بعض چیزیں ہونگی جو اس قسم کی رُوحانی تاثیرات پیدا کرینگی جو یہ دُنیا کی اشیاء مادی جسم پر پیدا کرتی ہیں سوائے شراب کے کہ اسکے سب خواص مُراد نہیں بلکہ بعض خاص خواص مراد ہیں اور چونکہ اس کا نام استعمال کرنے سے دھوکہ لگ سکتا تھا قرآن کریم نے اُخروی شراب اور دنیوی شراب کا فرق بالتفصیل بیان کر دیا۔

وہ دھوکہ جو شراب کے نام سے لگ سکتا تھا یہ تھا کہ کیا وہ شراب بھی عقل پر پردہ ڈالنے والی ہوگی اور جسمانی نشہ کی سی کیفیت پیدا کرے گی سو اس کا جواب یہ دیا کہ ان باتوں میں اس کو دنیوی شراب سے مشابہت نہ ہوگی بلکہ اسکی مشابہت اور لحاظ سے ہے اور وہ مشابہت یہ ہے کہ جس طرح شراب انسان کے دماغ پر اثر ڈال کر یکسوئی پیدا کر دیتی ہے وہ شراب بھی یکسوئی پیدا کر دیگی اور اسے پی کر قلوب کلی طور پر خدا تعالےٰ کی محبت میں مست اور مدہوش ہو جائینگے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جب جنّت کی ثمار بالکل اور قسم کی ہیں اور روحانی ہیں تو پھر دنیوی نام کیوں اختیار کیے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب سب قسم کے لوگوں کے لئے ہوتا ہے مخالفوں کے لئے بھی اور ادنیٰ لوگوں کے لئے بھی اور اعلیٰ قسم کے لوگوں کے لئے بھی۔ ان امور کے متعلق جن کا سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو ضروری ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ میں کلام کیا جائے کہ ان میں مخالفوں کا بھی جواب آجائے اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی تسلی کا بھی وہ موجب ہو اور اعلیٰ درجہ کے لوگ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس حکمت کو مدّنظر رکھ کر قرآن کریم نے اُخروی نعماء کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو سب قسم کے لوگوں کے لئے ان کی عقل اور درجہ کے بموجب تشفی کا موجب ہوں چونکہ کفّار کہا کرتے تھے کہ دیکھو محمد رسول اللہ (صلعم) تو ہم سے سب قسم کی نعمتیں چھڑوانا چاہتے ہیں اور ان کی جماعت بھی تمام نعمتوں سے محروم ہے اللہ تعالیٰ نے اُخروی نعمتوں کو ان کے ذہن کے قریب کرنے کے لئے وہ اشیاء جن کو وہ نعمت سمجھتے تھے انہی کے نام لے کر بتایا کہ مومنوں کو یہ سب کچھ حاصل ہوگا۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے کوئی مالدار کسی عالم سے کہے کہ میرے پاس مال ہے تو وہ عالم اپنے کتبخانہ کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ میرے پاس تم سے بھی بڑھ کر خزانہ ہے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ ان کتب میں روپیہ بھرا ہوا ہے بلکہ صرف یہ کہ جس چیز کو تم خزانہ کہتے ہو اس سے زیادہ فائدہ والی چیز میرے پاس موجود ہے پس جب قرآن کریم نے یہ کہا کہ مومنوں کو وہ جنّتیں ملینگی جن میں سایہ دار درخت اور نہریں اور نہ خراب ہونے والا دودھ اور نہ

سڑنے والا پانی اور موم اور آلائش سے پاک شہد اور نشہ نہ دینے والی بلکہ دل کو پاک کرنے والی شراب ہوگی تو اس سے ان کے اعتراض کا جواب اس رنگ میں دیا کہ جن چیزوں کو تم نعمت سمجھتے ہو وہ حقیقی مومنوں کو ملنے والے انعامات سے ادنیٰ ہیں جن نہروں کو تم نعمت سمجھتے ہو ان کا پانی تو سڑ جاتا ہے مومنوں کو وہ نہریں ملینگی جن کا پانی سڑنے والا نہ ہوگا اور جن باغوں کو تم نعمت خیال کرتے ہو وہ اصل نعمت نہیں اصل نعمت تو وہ باغ ہیں جو کبھی برباد نہ ہونگے اور مومنوں کو ملینگے۔ جس شراب کو تم نعمت سمجھتے ہو اس کی مومنوں کو ضرورت نہیں وہ شراب تو گندی اور عقل پر پردہ ڈالنے والی شئے ہے مومنوں کو تو خدا وہ شراب دے گا جو عقل کو تیز کرنے والی اور پاکیزگی بڑھانے والی ہوگی۔ اور جس شہد پر تم کو ناز ہے اس میں تو آلائش ہوتی ہے خدا تعالیٰ مومنوں کو وہ شہد دے گا جو ہر آلائش سے پاک ہوگا اور جن ساقیوں پر تم کو ناز ہے وہ نعمت نہیں کیونکہ وہ گندے ہیں مومنوں کو اللہ تعالیٰ وہ ساقی دے گا جو پاک ہونگے جن پھلوں پر تم کو ناز ہے وہ تو ختم ہو جاتے ہیں مومنوں کو تو وہ پھل ملیں گے جو کبھی ختم نہ ہونگے اور ہر وقت اور خواہش کے مطابق ملیں گے یہ مضمون ایسا واضح ہے کہ ہر شخص جو تعصب سے خالی ہو کر غور کرے اس کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے اور اس کے لطیف اشارہ کو پا سکتا ہے مگر جو متعصب ہو یا جاہل۔ اس کا علاج تو کوئی ہے ہی نہیں۔

مسیحی کتب میں مذکورہ انعامات کا ذکر اور ان کے مسلمانوں پر اعتراضات کے جواب۔

مسیحی معترضین کو ہی سب سے زیادہ اس کلام پر اعتراض ہے مگر وہ تو اپنی کتب میں نہیں دیکھتے کہ وہاں لکھا ہوا ہے ”بلکہ مال اپنے لئے آسمان پر جمع کرو“ (متی باب ۶ آیت ۲۰) اسی طرح لکھا ہے ”تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا“ (متی باب ۱۹ آیت ۲۱) اگر آسمان پر خزانہ جمع کرنا اور مرنے کے بعد آسمان پر خزانہ کا ملنا انسان کے لئے ممکن ہے تو جنتوں اور نہروں اور پانی اور دودھ اور شہد اور بے نشہ پاک کرنے والی شراب کا ملنا کیوں عقل کے خلاف ہے۔ اسی طرح لکھا ہے کہ مسیح ”خدا کے تخت کے داہنے جا بیٹھا“ (عبرانیوں باب ۱۲ آیت ۲) اگر خدا کو تخت پر بیٹھنے کی ضرورت ہے اور مسیح کو بھی آسمان پر جا کر تخت کی ضرورت پیش آئی تو مومنوں کو جنتوں کی کیوں ضرورت نہیں اور اس پر کیا تعجب ہے۔ اگر ان کا جواب ہو کہ انجیل میں مذکور خزانہ سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی شخص خدا تعالیٰ کے لئے اپنے خزانہ کو چھوڑے گا اسے خدا تعالیٰ روحانی خزانہ عطا کرے گا۔ اور خدا تعالیٰ کے تخت سے مراد لکڑی یا سونے چاندی کا تخت نہیں بلکہ اس سے مراد اس کے جلال کا تخت ہے تو یہی توجیہہ انہوں نے قرآنی پانی اور دودھ اور شراب کی کیوں نہ کر لی اور کیوں نہ سمجھا کہ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ جب مومن خدا تعالیٰ کی خاطر پانیوں سے محروم کئے گئے ان کے اموال چھین کر انہیں دودھ اور شہد سے محروم کر دیا گیا انہوں نے خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے روزے رکھے اور خود اپنے لئے دودھ اور شہد اور پانی کو حرام کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں انہیں روحانی دودھ اور روحانی شہد اور روحانی پانی دیگا اور چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اپنے اوپر شراب کا استعمال حرام کر لیا تو اللہ تعالیٰ انہیں محبت کی شراب پلائے گا اور چونکہ وہ خدا کے لئے اپنے گھروں سے نکالے گئے یا انہوں نے خدا تعالیٰ کے لئے اپنے گھروں کو غریبوں کے ٹھہرنے کی جگہ اور مہمانوں کی آسائش کا مقام بنا دیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں اپنی رحمت کے باغوں میں جگہ دی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں جن باغوں اور نہروں اور پھلوں اور جس دودھ اور شہد اور شراب کا ذکر آتا ہے وہ اس دنیا کے باغوں اور نہروں اور پھلوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہاں کا دودھ اور شہد اور شراب اس دنیا کے

دودھ اور شہد اور شراب سے بالکل مختلف ہے اور قرآن کریم نے ان امور کی خود ایسی تشریح فرما دی ہے کہ اس کے بعد اس امر میں شک کرنا محض تعصب کا اظہار ہے اور یہ محاورات چونکہ پہلی کتب میں بھی موجود ہیں اس لئے ان آیات میں کوئی ایسی بات نہیں جس کا سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو۔

اُخروی زندگی میں رُوح کے لئے جسم

میں اس جگہ یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ اُخروی زندگی ایک ایسی روحانی زندگی ہوگی جو کلی طور پر جسم سے پاک ہوگی اور جہاں صرف دل کے احساسات پر ہی سب انعامات ختم ہو جائیں گے بلکہ قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح اپنی ہر حالت میں ایک جسم کی محتاج ہے اور اُخروی زندگی میں بھی اسے ایک جسم ملے گا جو اس مادی دنیا سے بالکل مختلف ہوگا۔ اور اس زندگی کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں عالمِ خواب کا سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ انسان اگلے جہان کی زندگی کا کچھ اندازہ کر سکے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ اُخروی زندگی اور عالمِ خواب کا ایک گہرا جوڑ ہے چنانچہ فرماتا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

اُخروی زندگی کو سمجھانے کے لئے عالمِ خواب کا سلسلہ

(زمر ع ۵) یعنے کفار اُخروی زندگی اور اس کے عذابوں کے منکر ہیں حالانکہ اگر غور کریں تو انہیں اس کا ثبوت اپنی زندگیوں میں مل سکتا ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر رُوح کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جو مرتی نہیں اسے نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے پھر جس پر تو موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اسے اپنے پاس رہنے دیتا ہے اور دوسری رُوح کو یعنے سونے والے کی رُوح کو ایک وقتِ مقررہ تک کے لئے واپس کر دیتا ہے۔ اس مشاہدہ میں فکر کرنے والے لوگوں کے لئے بہت سے نشانات ہیں اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ موت اور نیند آپس میں مشابہ ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ موت میں کلی طور پر رُوح کو مادی جسم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور نیند کے وقت اس کے تعلق کو عارضی طور پر مادی جسم سے قطع کر دیا جاتا ہے اس عارضی قطع تعلق کے وقت روح انسانی کئی نظارے دیکھتی ہے اور اپنے لئے ایک نیا جسم اور نیا ماحول پاتی ہے اس سے اُخروی زندگی کے متعلق بہت کچھ قیاس کر سکتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ نیند کی حالت میں جو انسان کو نظارے نظر آتے ہیں انہیں محض روحانی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کبھی کوئی شخص خواب میں خالی رُوح نہیں دیکھتا بلکہ اس کے ساتھ ایک جسم بھی دیکھتا ہے اور بسا اوقات وہ اپنے آپ کو باغوں میں پاتا ہے اور نہروں میں دیکھتا ہے اور پھل کھاتا ہے اور دودھ پیتا ہے یہ بھی محض روحانی نہیں ہوتے بلکہ ظاہری شکل میں باغوں اور نہروں اور دودھ اور شہد وغیرہ سے مشابہ ہوتے ہیں مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ خواب کا دودھ ظاہری دودھ ہے یا خواب کا پانی ظاہری پانی ہے بلکہ اس کا مفہوم روحانی عالم میں کچھ اور ہوتا ہے مثلاً جب کوئی شخص اپنے آپ کو ایک ایسے باغ میں دیکھتا ہے جس میں نہر چل رہی ہو اور اس کی یہ خواب اس کے کسی خیال کا نتیجہ نہ ہو بلکہ سچی ہو اور اللہ تعالیٰ نے دکھائی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا ایمان خدا تعالیٰ کے فضل کا جاذب ہو رہا ہے اور اس کا عمل خدا تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے اور اس کے ایمان اور اس کے عمل نے اللہ تعالیٰ کے فضل کو جس رنگ میں جذب کیا ہوتا ہے اسے وہ باغ اور نہر کی صورت میں دیکھ کر روحانی لذت محسوس کرتا ہے یا مثلاً کوئی دیکھے کہ وہ آم کھا رہا ہے اور اس کی رؤیا سچی ہو تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں اُسے نیک اولاد یا نیک دل دینے کا فیصلہ کیا ہے یا مثلاً کوئی دیکھے کہ وہ انگور

کھارہا ہے تو اسکی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں خشیت اللہ بڑھے گی اور محبت الٰہی ترقی کرے گی اور اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہوگا۔ اور اگر کوئی دیکھے کہ وہ کیلا کھارہا ہے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اللہ تعالیٰ اسے حلال اور طیب اور بے مشقت رزق دینے کا فیصلہ فرما چکا ہے۔ پس جبکہ انسان بظاہر کیلا یا انگور یا آم کھارہا ہوتا ہے درحقیقت اسکی رُوح میں ان انعامات کے قبول کرنے کی قابلیت پیدا کی جارہی ہوتی ہے جو ان پھلوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ رُوحانی انعامات سے یہ مُراد نہیں کہ اُخروی زندگی میں محض ایک اندرونی احساس خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا ہوگا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کی سب نعمتیں جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے اُخروی نعماء کی تمثیل ہیں اور بجائے یہ کہنے کے کہ اُخروی زندگی میں اس دنیا کی نعمتوں کی مثل ملے گی یُوں کہنا چاہیئے کہ اخروی نعمتیں تو اصل ہیں اور یہاں کا پانی اور یہاں کا دودھ اور یہاں کا شہد اور یہاں کے پھل سب اُخروی زندگی کی تمثیل ہیں اور ان نعمتوں کا نقشہ کھینچنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور چونکہ یہ دُنیا مادی ہے انہیں مادی شکل دے دی گئی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے ان نعماء سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جب تمثیل ایسی لذیذ ہے تو اصل شئی کہیں لذیذ ہوگی کیونکہ رُوح اپنے احساس کے لحاظ سے جسم سے بہت زیادہ شدت رکھتی ہے۔

اس تشریح کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان اعتراضات کا جواب الگ الگ دینے کی ضرورت نہیں جو اوپر درج ہو چکے ہیں ان سب اعتراضوں کا سوائے ایک کے اس تشریح میں جواب آگیا ہے اور وہ ایک اعتراض وہ ہے جو بیویوں کے متعلق ہے سو اس کا جواب آگے چل کر اس ٹکڑے کی تفسیر کے نیچے دیا جائے گا۔

اب میں آیت زیر تفسیر کی تفسیر بیان کرتا ہوں اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں انہیں جنتیں ملینگی اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے۔ صَلَحَ کے معنے مناسب حال کے ہوتے ہیں پس اعمال صالحہ کے معنے مناسب حال اعمال کے ہیں قرآن کریم اور دوسری کتب میں یہ فرق ہے کہ دوسری کتب میں نیک اعمال کرنے کا حکم ہے اور نیک اعمال کا مطلب خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندوں سے حُسنِ سلوک مثلاً صدقہ و خیرات عفو احسان وغیرہ اعمال کو سمجھا جاتا ہے مگر قرآن کریم اس کی جگہ عمل صالح کے بجالانے کا حکم دیتا ہے جو نیک عمل سے زیادہ وسیع مفہوم پر مشتمل ہے قرآن کریم کے نزدیک ایک عمل کی ظاہری اچھی شکل انسان کو پاک کرنے کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کا مناسب حال ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً قرآن کریم کے نزدیک خدا تعالےٰ کی عبادت کی ظاہری شکل کا بجالانا کافی نہیں جب تک کہ وہ ریا اور نمائش سے بھی پاک نہ ہو۔ نماز نیک عمل ہے لیکن اگر اس کے ساتھ ریا شامل ہو تو گو بظاہر وہ خدا تعالیٰ کی عبادت ہے مگر خدا تعالےٰ کے ہاں مقبول نہیں کیونکہ وہ عمل صالح نہیں اسی طرح مثلاً کوئی شخص ڈوب رہا ہو اور ایک شخص جو تیرنا جانتا ہو اور اسے اس ڈوبنے والے کا علم ہو جائے وہ اگر اس وقت نماز شروع کردے تو نماز گو نیک عمل ہے مگر اس وقت عمل صالح نہ ہوگا کیونکہ اس وقت کے مناسب حال عمل اس ڈوبنے والے کو بچانا ہے نہ کہ نماز پڑھنا۔ یا مثلاً ایک شخص فطرۃً رحم کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہو اور وہ کسی شخص کو دیکھے کہ دوسرے آدمی پر ظلم کررہا ہے تو اگر وہ اس ظالم کے متعلق عفو ظاہر کرنا چاہے تو گو عفو نیک عمل ہے مگر اس وقت وہ عمل صالح نہیں ہوگا بلکہ عمل صالح یہ ہوگا کہ وہ اس ظالم کا مقابلہ کرے اور مظلوم کی حمایت کرے یا مثلاً ایک شخص جج کی کرسی پر بیٹھا ہو اور ملک نے اسے مجرموں کی سزا کے لئے مقرر کیا ہو تو اگر وہ ایک چور کو یا ڈاکو کو اپنے طبعی رحم کی وجہ سے چھوڑ دے تو گو عفو نیک عمل ہے مگر چونکہ اس وقت وہ عمل صالح نہ ہوگا خد

ظالم خواب میں دیکھے جو تفاروں کی تعبیر

اعمال صالح کرنے کا مطلب۔

کے حضور میں مقبول نہ ہوگا کیونکہ جج کی کرسی پر بیٹھنے والے کے مناسب حال عمل یہ ہے کہ جو فرض اس کے ذمہ لگایا گیا ہے اُسے پُورا کرے گو جس حد تک قانون اسے اجازت دیتا ہو وہ رحم سے بھی کام لے سکتا ہے۔ یا مثلاً کسی شخص کے پاس کسی نے اپنا روپیہ امانت رکھوایا ہُوا ہو اور امین شخص اس روپیہ کو غرباء میں تقسیم کر دے تو گو غرباء کی امداد نیک عمل ہے مگر اس کا یہ فعل عمل صالح نہیں ہوگا کیونکہ امین کی حیثیت سے اس کے لئے مناسب حال عمل یہی تھا کہ وہ اس روپیہ کو محفوظ رکھتا اور اگر کسی مستحق کا اسے علم ہوتا تو مال کے مالک کو اس سے حُسن سلوک کرنے کی طرف توجہ دلاتا۔ اسی طرح مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے کسی شخص کو دربان کے طور پر مقرر کرے اور اُس دربان کو علم ہو کہ کوئی ایسی مصیبت دُنیا پر نازل ہو رہی ہے کہ جس کی وجہ سے مخلوقِ خدا کا تباہ ہونا ممکن ہے تو گو اس وقت وہ ایک امانت پر مقرر ہے مگر اس کا فرض ہوگا کہ وہ اس وسیع تباہی کے دور کرنے میں لگ جائے کیونکہ اس وقت عمل صالح یہی ہے کہ وہ تھوڑے نقصان کی پرواہ نہ کرے اور بڑے نقصان کو دُور کرے۔ غرض عمل صالح نیک عمل سے زیادہ وسیع معنے رکھتا ہے اور عمل صالح اس نیک عمل کو کہتے ہیں کہ جو نہ صرف ظاہری طور پر اچھا ہو بلکہ باطنی طور پر بھی اچھا ہو اور صرف اپنی ذات میں اچھا نہ ہو بلکہ موقعہ کے لحاظ سے بھی اچھا ہو اور عمل صالح کرنے والا وہ شخص ہے کہ جو اندھا دھند لفظوں کی اتباع نہیں کرتا بلکہ اپنی عقل خداداد سے کام لے کر یہ بھی دیکھتا ہے کہ موقعہ کے لحاظ سے وہ عمل کس صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے یا وہ اس پر کفایت نہیں کرتا کہ وہ کوئی نیک عمل بجا لا رہا ہے بلکہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ہر قسم کے نیک اعمال جو اس کی اور دوسروں کی روحانی یا مادی بہتری کے لئے ضروری ہیں بجا لا رہا ہے۔ قرآن کریم میں اس فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (سورہ شوریٰ ع ۴) یعنے

نیک اعمال اور اعمال صالحہ میں فرق

جس شخص پر ظلم ہو وہ اس کا بدلہ اس قدر لے سکتا ہے جس قدر اس پر ظلم ہُوا ہو لیکن جو شخص معاف کرے مگر ساتھ اس کے اصلاح کا پہلو مدنظر رکھے تو اس کا اجر اللہ پر ہوگا اس آیت میں عفو جو ایک نیک عمل ہے اسکی تعریف کی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی ہے کہ عفو اسی صورت میں خدا تعالیٰ کے حضور پسندیدہ ہوگا جبکہ اس کے نتیجہ میں اصلاح بھی پیدا ہو ورنہ نہیں۔ اسکی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو کوئی ڈاکو ملے جو پاس کے گاؤں میں لُوٹنے جا رہا ہو وہ ڈاکو اس کی طاقت کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے جانتے جاتے اس پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہے مگر اس سے مغلوب ہو جائے تو گو اس کا اس ڈاکو کو معاف کر دینا بظاہر نیک عمل ہوگا لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ اس ڈاکو کا دل صاف نہیں اور وہ اس سے چھُٹ کر گاؤں کے کسی اور غریب اور کمزور آدمی پر حملہ کر کے اس کے مال یا اسکی جان کو نقصان پہنچائے گا تو چونکہ اس ڈاکو کو معاف کرنا اصلاح کا نہیں بلکہ فساد کا موجب ہوگا اگر وہ شخص اس ڈاکو کو معاف کر دے تو باوجود عفو سے کام لینے کے عمل صالح کا بجا لانے والا نہ سمجھا جائے گا۔

احادیث رسول کریم سے بھی اس فرق کا پتہ چلتا ہے احادیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ سب سے اچھا عمل کونسا ہے آپ نے فرمایا اِیْمَانٌ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ جِهَادٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا گیا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھا عمل کونسا ہے تو آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد تو آپؐ نے فرمایا اللہ کے رستہ میں جہاد کرنا (بخاری جلد اوّل کتاب الحج) ایک دوسرے موقعہ پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے آپ سے پُوچھا یا رسول اللہ سب سے اچھا عمل کونسا ہے تو آپؐ نے فرمایا اَلصَّلٰوةُ عَلٰى مِیْقَاتِهَا یعنے اپنے

وقتوں پر نمازوں کا اُدا کرنا۔ وہ کہتے ہیں مَیں نے پھر پُوچھا یارسول اللہ اس کے بعد کونسا عمل ہے تو آپؐ نے فرمایا ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ اس کے بعد والدین سے نیکی کرنا۔ فرماتے ہیں مَیں نے پوچھا یارسول اللہ اسکے بعد پھر کونسا عمل اچھا ہے تو آپؐ نے فرمایا اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پھر اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا اچھا عمل ہے (بخاری جلد دوم کتاب الجہاد) جو لوگ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں۔ انہیں اس میں اختلاف نظر آیا ہے اور انہوں نے بحث شروع کر دی ہے کہ اس اختلاف کو کس طرح دُور کیا جائے اور یہ کہ اصل میں کونسا اچھا عمل ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے غور نہیں کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک اعمال کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ اعمال صالحہ کا مقابلہ کیا ہے جس شخص کو آپؐ نے یہ فرمایا کہ ایمان کے بعد جہاد سب سے اچھا عمل ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جہاد کے موقعہ پر سُستی دکھاتا تھا اور اس نیک عمل کے بجالانے کے متعلق اس کے دل میں قبض تھا پس وہ اپنے تقوٰی کے مکان کو ادھورا رکھ رہا تھا اسے آپؐ نے یہ بتایا کہ جہاد سب سے اچھا عمل ہے اور مُراد یہ تھی کہ تمہارے مناسب حال عمل جہاد ہے کیونکہ تم باقی نیک اعمال بجالاتے ہو مگر جہاد میں سستی کرتے ہو۔ اور جس وقت یہ فرمایا کہ سب سے اچھا عمل وقت پر نماز ادا کرنا ہے اور پھر ماں باپ کی خدمت اور پھر جہاد۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے بعض ایسے لوگ مجلس میں بیٹھے تھے جو وقت پر نماز ادا کرنے میں سست تھے اور ماں باپ سے اچھا سلوک نہ کرتے تھے۔ پس ان کے مناسب حال یہی حکم تھا کہ وہ نماز وقت پر ادا کریں اور ماں باپ کی خدمت کریں تا ان کی نیکیوں میں یہ رخنہ باقی نہ رہ جائے۔

اس آیت میں ایمان اور عمل صالح بجالانے والے کو جنتوں کی بشارت دی گئی ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ ایمان ایک باغ کی حیثیت رکھتا ہے اور عمل اسے سرسبز کرتا ہے اور اس کو پانی دے کر بڑھاتا ہے جو شخص ایمان لانے کے بعد عمل نہیں کرتا اس کے ایمان کا درخت سوکھ جاتا ہے چنانچہ عملی منافقوں کی مثال میں اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اگر وہ ایمان کے بعد اعمال کی طرف توجہ نہ کرینگے تو ان کا ایمان بھی ضائع ہو جائے گا (دیکھو نوٹ نمبر سورہ ہذا) قرآن کریم میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر ع ۲) یعنے جب انسان ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے لیکن اسے خدا تعالےٰ تک اُٹھا کر لے جانے والا عمل صالح ہوتا ہے یعنے ایمان کی تکمیل عمل صالح سے ہوتی ہے اگر عمل صالح نہ ہو تو ایمان درمیان میں ہی رہ جائے اور اپنا پھل پوری طرح نہ دے ایک دوسری آیت میں کلمہ طیبہ یعنے پاک تعلیم کو جس کا نتیجہ ایمان ہوتا ہے شجرہ طیبہ سے مثال دی ہے فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم ع ۴) یعنے کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے پاک کلمہ کو پاک درخت سے تمثیل دی ہے پاک درخت سے مشابہت دینے کے معنے یہ بھی ہیں کہ جس طرح درخت پانی کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح کلمہ طیبہ کا اختیار کر لینا ہی کافی نہیں۔ اسے عمل کے پانی سے سیراب کرنا بھی ضروری ہے تبھی اسکی سرسبزی اور شادابی قائم رہے گی۔ عمل صالح کرنے والے مومنوں کو ایسے باغات کی بشارت دی ہے کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ چونکہ انہوں نے اپنے ایمان کی کھیتی کو عمل کے پانی سے سینچا تھا اللہ تعالیٰ بھی انہیں ایسے باغوں میں رکھے گا جن کے اندر نہریں بہتی ہونگی اور یہ نہروں کا بہنا انہیں یاد کراتا رہیگا کہ ان کا ایمان اور عمل ضائع نہیں ہوا بلکہ اس سے ہمیشہ کی راحت پیدا ہوئی۔ باغوں کے سائے ان کی توجہ کو ایمان کی طرف کھینچیں گے جو اللہ تعالیٰ کے فضل کو کھینچتا ہے

اعمال صالحہ اور نیک اعمال میں فرق کی طرف اشارہ احادیث میں

ایمان کی حیثیت ایک باغ کی اور عمل باغ کو ترو تازہ رکھنے کا ایک ذریعہ۔

اور اس کے اندر بہنے والی نہریں انہیں ان کے اعمال صالحہ کی یاد دلائینگی جنہوں نے ایمان کے درخت کو سُوکھنے سے بچایا۔

جنّات میں نہروں کے باغوں کے نیچے بہنے کا مطلب

یہ جو فرمایا ہے کہ ان باغوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جنت میں ہر شخص کا دائرہ عمل دوسروں کے اثر اور دخل اندازی سے آزاد ہوگا اور نیچے بہنے سے مُراد یہی ہے کہ ہر باغ کی نہر اس سے متعلق ہوگی اور اس کے انتظام کا حصہ ہوگی اس دُنیا کی طرح نہ ہوگا کہ ایک نہر کئی باغوں اور کھیتوں کو پانی دیتی ہے اور بسا اوقات لوگوں میں اس کے پانی کی تقسیم پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا کے دو معنے۔

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا اس میں رِزْقًا مفعول مطلق بھی ہو سکتا ہے اور مفعول بہٖ بھی مفعول مطلق کی صورت میں رِزْقًا کے معنے ہونگے اچھی طرح دینا۔ اور آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ’جب کبھی پھلوں کی قسم سے کوئی چیز انہیں بطریق احسن دی جائے گی‘۔ ان معنوں کے لحاظ سے آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ مومنوں کو ان کے ایمان کا پھل ہی نہیں ملے گا بلکہ ان کا ایسا اعزاز کیا جائے گا کہ وہ پھل کامل طور پر انہیں ملے گا اور خدا تعالیٰ کی عطا اسی طرح ہوگی کہ جو عطا کرنے کا حق ہے رِزْقًا کو اگر مفعول بہٖ مانا جائے تو اس کے معنے مَرْزُوْقٌ کے کئے جائیں گے یعنے کھانے کی چیز یا دی جانے والی چیز اور اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ جب کبھی کوئی کھانے کی چیز انہیں دی جائیگی جو پھلوں کی قسم سے ہوگی تو وہ اگلا بیان کردہ فقرہ دُہرائیں گے۔ اس صورت میں زور عبارت کا مِنْ ثَمَرَةٍ پر ہوگا اور اس طرف اشارہ سمجھا جائے گا کہ جو کچھ انہیں ملے گا وہ ان کے ایمان اور اعمال کا نتیجہ ہوگا۔

قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کی تشریح پہلے مفسرین کے نزدیک۔

قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ۔ وہ کہینگے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے مفسرین لکھتے ہیں کہ یا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ ہمیں جو پھل دیتا تھا وہی پھل ہمیں وہ یہاں بھی دے رہا ہے یا اس کے یہ معنے ہیں کہ بار بار پھل ملینگے اور وہ ہر دوسری بار کہیں گے کہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے بھی مل چکی ہے گویا جنت کی نعمتوں کی تکرار کی طرف اشارہ کریں گے لیکن میرے نزدیک یہ دونوں معنی درست نہیں کیونکہ اگر اس کے یہ معنی کئے جائیں کہ دُنیا میں بھی ہم کو پھل ملے تھے اور اب بھی ملے ہیں تو اس کے معنے تو یہ ہونگے کہ دُنیا کے پھل اور آخرت کے پھل ایک قسم کے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (سجدہ ع ۲) کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ جنت میں اسے کیا ملنے والا ہے پھر جنت کے پھلوں کو دنیا کے مادی پھلوں جیسا قرار دینے کے معنے کیا ہوئے اور اگر یہ معنے کئے جائیں کہ ایسے پھل ہمیں جنت میں پہلے بھی مل چکے ہیں تو اوّل تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن کریم فرماتا ہے جب بھی انہیں پھل ملیں گے وہ یہ فقرہ کہیں گے لیکن ظاہر ہے کہ پہلی دفعہ پھل ملنے پر وہ یہ فقرہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں پہلے یہ پھل مل چکے ہیں۔ دوسرا اعتراض اس پر یہ پڑتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کا کفران ہے شکریہ نہیں کیونکہ احسان کی قدر دانی کے موقعہ پر تو انسان یہ کہتا ہے کہ آج جیسی لطیف چیز ملی ہے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی کسی میزبان کو یہ کہنا کہ ایسا کھانا آپ مجھے پہلے بھی کھلا چکے ہیں اسکی ہجو ہے نہ کہ تعریف۔ اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ اب بس کرو اور کھلاؤ گے کب تک یہی چیز دوبار ملتی رہیں گے

میرے نزدیک اس کے دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ چونکہ باغ ایمان کی تمثیلی شکل ہونگے اور پھل ایمان کی لذت کا تمثل ہوگا مومنوں کو جب بھی جنتی پھل ملیں گے وہ کہیں گے کہ یہ وہی ایمان کی حلاوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو دُنیا میں عطا فرمائی تھی اور ہمارا وہ ایمان ضائع نہیں ہوا بلکہ بار آور ہوا بلکہ ہمارا پھل

لا رہا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ فقرہ شکریہ اور امتنان کے جذبات سے بھرا ہوا ہے اور مومن اور خدا تعالیٰ دونوں کے شایانِ شان ہے۔ ہر دفعہ پھل ملنے پر وہ ایمان کی نعمت کو یاد کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے اس فضل کو بھی یاد کریں گے کہ اس نے انہیں ایمان بخشا تھا اور ساتھ ہی وہ اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کریں گے جو ہمیشہ کے لئے ایمان کے نتیجہ کے طور پر رُوحانی پھل کی شکل میں انہیں آخرت میں ملے گی۔

دوسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ رُزِقْنَا کے معنی وعدہ کے کئے جائیں اور آیت کے معنے یہ ہوں کہ جب کبھی بھی انہیں جنّتی پھل ملینگے وہ کہینگے کہ یہی وہ پھل ہیں جن کا ہم سے دُنیا میں وعدہ کیا گیا تھا اور وعدہ کے لئے ماضی کے لفظ کا استعمال قرآن کریم سے ثابت ہے چنانچہ اُجرت پر دودھ پلانے والی عورتوں کے ذکر میں فرماتا ہے اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ ع ۳۰) جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کو دے دو جو حسب قاعدہ دے چکے ہو مگر مُراد یہ ہے کہ جس کے دینے کا ان سے پختہ وعدہ کر چکے ہو اس محاورہ کے مطابق رُزِقْنَا کے معنے اس آیت میں یہ کئے جائینگے کہ جس کے دینے کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا اور آیت کے یہ معنے ہونگے کہ جس بات کا وعدہ ہم سے دُنیا میں کیا گیا تھا وہ آج اس نعمت کے ذریعہ سے پورا کیا جا رہا ہے۔ اور جب بھی جنّتی پھل ملیں گے وہ بے اختیار کہہ اُٹھیں گے کہ لو اس وعدے کے مطابق آج بھی ہم کو یہ پھل ملے ہیں ان معنوں کو بعض سابق مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کا مطلب پہلے مفسرین کے نزدیک۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ یعنی وُہ پھل انہیں متشابہ صورت میں دیئے جائینگے کے معنے مفسرین نے یہ کئے ہیں کہ دُنیا کے پھلوں سے ملتے ہوئے پھل دیئے جائینگے۔ یا یہ کہ جو پھل آخرت میں ملینگے انکی شکل تو آپس میں ملتی جلتی ہوگی مگر مزہ میں فرق ہوگا پہلے معنوں کی کمزوری مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں دوسرے معنی بالبداہت باطل ہیں کیونکہ پھل ہی دیئے جائیں گے تو انہیں ایک شکل میں دینے کا کیا فائدہ۔ پھر مزہ کے مختلف ہونے کا ثبوت کہاں سے ملا۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کے چار معنے۔

میرے نزدیک اس کے صحیح معنے یہ ہیں (۱) جنّتی پھل اپنی لذّت کے لحاظ سے ان عبادات کی لذتوں کے مشابہ ہونگے کہ جو مومن اس دُنیا میں کرتے رہے ہیں یعنی مومن ان پھلوں کو کھا کر محسوس کرے گا کہ یہ وہی نماز ہے جو مَیں نے پڑھی تھی یہ وہی روزہ ہے جو مَیں نے رکھا تھا یہ وہی حج ہے جو مَیں نے کیا تھا یہ وہی صدقہ ہے جو مَیں نے دیا تھا یہ وہی عفو ہے جس سے مَیں نے اپنے دشمن سے معاملہ کیا تھا۔ غرض تمام نیک اعمال ایک ایک کر کے ان کے لئے جنت میں متمثل ہونگے اور ان کے دل خدا تعالیٰ کے شکر سے بھرتے جائینگے کہ میری فلاں نماز بھی اس نے نہیں بھلائی۔ میرا فلاں صدقہ بھی اس نے نہیں بُھلایا۔ غرض ہر ہر پھل میں خدا تعالیٰ کی قدردانی کو محسوس کرینگے اور انہیں وہ لذّت یاد آجائیگی کہ جو اُس دُنیا میں اس نیک عمل کے بجا لاتے وقت ان کو حاصل ہوئی تھی۔

اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا سے مراد مومنوں کے اعمال کے مشابہ لذت رکھنے والے پھل۔

ان معنوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے مومنوں کو اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیئے جو اعمال صالحہ کے بجا لانے وقت ان پر عائد ہوتی ہے اگر ہماری نماز جنت میں پھل کی شکل میں آنے والی ہے ہمارا صدقہ پھل کی شکل میں سامنے آنے والا ہے تو ہمیں اپنی نماز اور اپنے صدقہ کو درست کرنا چاہیئے کیونکہ جیسی ہماری نماز اور جیسا ہمارا روزہ ہوگا اسی قسم کے مزہ کا وہ پھل ہوگا جو ہمیں جنت میں ملے گا اگر ہم اپنے اعمال کو پوری دلجمعی اور شوق سے بجا نہیں لاتے تو ہم اپنی روحانی غذا کو جو ہمیں جنت میں ملنے والی ہے دوسروں سے کم لذیذ بناتے ہیں اور اگر ہم اپنے صدقہ اور اپنے عفو اور رفقِ خلق کو اور عبادت کو ٹھیک کرتے ہیں تو گویا اپنی روحانی غذا کو لذیذ بناتے ہیں۔ کیونکہ اس غذا کی لذّت ہماری اس لذّت کے مشابہ ہوگی جو اس وقت ہم نیک اعمال میں

محسوس کرتے ہیں۔

مُتَشَابِهًا اُتُوْا بِهٖ سے مراد متشابہ خاصیتوں کا رزق

دوسرے معنے اس جملہ کے یہ ہیں کہ جو رزق جنتیوں کو ملے گا وہ متشابہ خاصیتوں کا ہوگا یعنی اس دُنیا میں تو جو غذا انسان کھاتا ہے وہ بسا اوقات ایک دوسرے کے اثر کو باطل کرنے والی ہوتی ہے ایک چیز معدہ کے لئے مقوی اور دوسری مضعف۔ ایک چیز دل کے لئے اچھی دوسری بُری۔ ایک دماغ کو طاقت دینے والی دوسری کمزور کرنے والی ہوتی ہے۔ اس طرح بہت سی غذا آپس میں ٹکرا کر اپنے اثر کو کمزور کر لیتی ہے اور بہت تھوڑی غذا حقیقتاً ہمارے جسم کے کام آتی ہے۔ اسی طرح اِس دُنیا میں رُوحانی اعمال کا حال ہوتا ہے کوئی نیک عمل ظاہر ہوتا ہے تو کوئی بد۔ اور بدیاں نیکیوں کے اثرات کو کم کرتی رہتی ہیں مگر اُخروی زندگی کے متعلق فرماتا ہے کہ وہاں جو روحانی غذا ملے گی وہ متشابہ ہوگی یعنی تاثیر کے لحاظ سے ہر چیز دوسری کی ممد ہوگی اور یہ نہ ہوگا کہ کوئی غذا رُوحانیت کی طرف لیجائے تو کوئی اس سے دُور کرے بلکہ ساری کی ساری غذا ایک دوسری کی ممد ہوگی اور رُوحانی ترقی کا موجب ہوگی اور انسانی رُوح ہر قسم کی روحانی بیماریوں سے محفوظ ہو جائیگی اور روحانی بیماریاں اسی مادی دُنیا میں رہ جائینگی۔

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ کا مطلب اور ازواج سے مراد پاک ساتھی یا بیویاں۔

اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا سے مُراد اندرونی قویٰ کے مشابہ غذا۔

ایک معنی اس کے یہ بھی ہیں کہ جنت کی غذا ہر شخص کے اندرونی قویٰ کے مطابق ہوگی جیسی اسکی طاقت ویسی غذا یعنی جس جس انسان کو روحانی ترقی کے لئے جس جس قسم کی روحانی غذا کی ضرورت ہوگی وہی غذا اس کے لئے مہیا کی جائے گی تا کہ اسکی رُوحانی طاقتیں بڑھتی چلی جائیں اور کوئی روک پیدا نہ ہو۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا سے مراد جنات کے پھلوں کا اس دُنیا کے پھلوں سے ہم شکل ہونا۔

ایک معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گو جنت کے پھل دُنیا کے پھلوں کے ہم شکل ہونگے مگر یہ مشابہت صرف شکل کی ہوگی ورنہ اپنی لذت اور تاثیر اور حقیقت کے لحاظ سے وہ اِن سے مختلف ہونگے کیونکہ یہ مادی جسم والے پھل ہیں اور وہ روحانی جسم والے پھل ہونگے۔

وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ۔ انہیں وہاں پاک ساتھی یا پاک بیویاں یا پاک خاوند ملیں گے۔ پاک ساتھی کے معنوں کی صورت میں تو کسی کے لئے اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ اِس صورت میں اِس کے یہ معنی ہونگے کہ جنت میں جس طرح غذا ایک دوسرے کی ممد ہوگی اس طرح اِس کے سب مکین ایک دوسرے کی رُوحانی ترقی میں مدد کرنے والے ہونگے گویا اندرونی اور بیرونی ہر طرح کا امن اور تعاون حاصل ہوگا۔

اور اگر خاوند یا بیوی کے معنی کئے جائیں کیونکہ ازواج مرد اور عورت دونوں کے لئے بولا جاتا ہے عورت کا زوج اس کا خاوند ہے اور مرد کا زوج اسکی بیوی تو اس صورت میں اس کے ایک معنی یہ ہونگے کہ ہر جنتی کے پاس اس کا وہ جوڑا رکھا جائے گا جو نیک ہوگا۔ اس صورت میں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا بلکہ یہ تو تحریک ہے کہ مرد کو اپنی نیکی کے ساتھ اپنی بیوی کی نیکی کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور عورت کو اپنی نیکی کے ساتھ اپنے خاوند کی نیکی کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ اگر وہ دنیوی زندگی کی طرح اگلے جہان میں بھی اکٹھا رہنا چاہتے ہیں تو چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو بھی نیک بنانے کی کوشش کرے تا ایسا نہ ہو کہ میاں جنت میں ہو اور بیوی دوزخ میں ہو یا بیوی جنت میں اور میاں دوزخ میں ہو۔ ان معنوں کے رُو سے یہ روحانی پاکیزگی کی ایک اعلیٰ تعلیم ہے جس پر اعتراض کرنے کی بجائے اسکی خوبی کی داد دینی چاہیئے۔

باقی رہا یہ کہ اِس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہر شخص کو ایک پاک جوڑا دیا جائے گا تو ان معنوں کے رو سے بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہی معنی ہوں کہ ہر مرد کو ایک پاک بیوی دی جائے گی اور ہر عورت کو ایک پاک مرد دیا جائے گا تو اس پر کیا اعتراض ہے اعتراض تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کسی ناپاک فعل کی طرف اشارہ کیا جائے جب قرآن شریف پاک کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ جنت میں وہی کچھ ہوگا جو جنت کے لحاظ سے پاک ہے

پھر اس پر اعتراض کیا۔

سر ولیم میور نے اس آیت کے مضمون پر ایک نہایت ناپاک اعتراض کیا ہے اور ریورنڈ وہیری نے حیثیات اسکی تصدیق کی ہے وہ اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں جنّت میں عورتوں کا ذکر کثرت سے اور زیادہ جوش سے کیا گیا ہے لیکن مدنی سورتوں میں صرف دو دفعہ اور نہایت مختصر الفاظ میں جو یہ ہیں کہ مومنوں کو جنّت میں پاک بیویاں ملینگی ذکر کیا گیا ہے اس سے (نعوذ باللہ من ذالک) یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ مکہ میں آپؐ کی صرف ایک بیوی تھی اور وہ بھی عمر میں بڑی اس لئے محمد صاحب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو عورتوں کا خیال زیادہ آتا تھا مگر مدینہ میں چونکہ یہ خواہش پوری ہوگئی اور کئی جوان بیویاں مل گئیں یہ خیال کم ہوگیا۔

سر ولیم نے جو اعتراض کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآنی آئینہ میں اپنا منہ دیکھا ہے اور ریورنڈ وہیری نے پادریوں کے روایتی تعصب کو قائم کیا ہے مجھے تعجب آتا ہے کہ یہ لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہوئے اور تہذیب کا دعویٰ کرتے ہوئے کروڑوں انسانوں کے پیشواؤں پر قیاسی باتوں کی بنا پر کس طرح حملہ کر دیتے ہیں حالانکہ خود ان لوگوں کے اخلاق اس قدر گرے ہوئے اور ذلیل ہوتے ہیں کہ انسانیت کو ان سے شرم آتی ہے انکی یہ جرأت محض اس وجہ سے ہے کہ اس وقت عیسائیوں کو حکومت حاصل ہے اور ان کو یہ شرم بھی نہیں آتی کہ جب مسلمان دُنیا پر حاکم تھے اور مسیحیوں کا اس سے بھی بدتر حال تھا کہ جو اس وقت مسلمانوں کا مسیحیوں کے مقابل پر ہے اس وقت بھی مسلمانوں نے یسوع ناصری کے بارہ میں سخت الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے مسلمانوں نے ہزار سال تک مسیحی ممالک پر حکومت کرکے اُن کے سردار کی جس عزت کا اظہار کیا کاش مسیحی لوگ دو تین سو سال کی حکومت پر ایسے مغرور نہ ہو جاتے کہ اس نبیوں کے سردار پر اس طرح درندوں کی طرح حملے کرتے اور مسلمانوں کے اس احسان کا کچھ تو خیال کرتے کہ انہوں نے یسوع کے خلاف کبھی جارحانہ قدم نہیں اُٹھایا ورنہ حق یہ ہے کہ مسلمان یسوع کی نسبت اس سے بہت زیادہ کہہ سکتے ہیں جو مسیحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہتے ہیں۔

سر ولیم میور کا آیت وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ پر ایک اعتراض

سر ولیم نے اپنی طرف سے ایک گندہ اعتراض تو کر دیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ مکی اور مدنی سورتوں میں اس قسم کا فرق صرف عورتوں کے بارہ میں ہی نہیں ہے بلکہ اور امور میں بھی ہے مثلاً یہ کہ مکی سورتوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ جنّت میں شراب ہوگی مگر کسی مدنی سورۃ میں یہ ذکر نہیں مکی سورتوں میں یہ ذکر ہے کہ جنّت میں شہد ہوگا مگر کسی مدنی سورۃ میں یہ ذکر نہیں مکی سورتوں میں یہ ذکر ہے کہ جنّت میں دودھ کی نہریں ہونگی مگر کسی مدنی سورۃ میں یہ ذکر نہیں۔ (جیسا کہ اوپر گذری ہوئی آیات سے ثابت ہے) اب اگر سر ولیم کا خود ساختہ نفسیاتی نکتہ صحیح ہے کہ چونکہ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ) کی ایک ہی بیوی تھی اور وہ بڑی عمر کی اس لئے آپؐ کو جنّت کے نقشے میں عورتیں نمایاں نظر آتی تھیں تو کیا شراب کے ذکر میں بھی سر ولیم کا یہ نکتہ چسپاں ہو سکے گا کہ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں شراب نہ ملتی تھی اس لئے جنّت میں بھی انہیں شراب نظر آتی تھی اور مدینہ میں چونکہ شراب ملنے لگی اس لئے مدنی زندگی میں قرآنی جنّت میں سے شراب کا ذکر حذف ہو گیا یا کیا اسی قاعدہ کی رُو سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکے گا کہ مکہ میں آپؐ کو دودھ نہ ملتا تھا اس لئے جنّت میں دودھ میسر ہونے کا آپؐ خیال کیا کرتے تھے مگر مدینہ میں چونکہ دودھ ملنے لگا یہ خیال کمزور پڑ گیا یا کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ مکہ میں چونکہ آپؐ کو شہد نہ ملتا تھا اس لئے آپؐ اس کے شوق کی وجہ سے جنّت میں شہد کی کثرت کا خیال کرتے تھے مگر مدینہ میں چونکہ شہد ملنے لگا آپؐ نے اس کے ذکر کو چھوڑ دیا۔ کیا کوئی انسان بھی جس کے دماغ میں عقل ہو اس قسم کی خرافات کو تسلیم کر سکتا ہے اگر وہ نفسیاتی نکتہ صحیح ہے تو پھر ان دوسری

سر ولیم میور کے اعتراض کا جواب۔

باتوں پر بھی اسے چسپاں کر کے دکھائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مکی زندگی کے اکثر حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے زیادہ فراخی حاصل تھی جس قدر کہ مدنی زندگی میں حاصل تھی کیونکہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بہت مالدار تھیں اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے انہوں نے اپنا سب مال آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا چنانچہ آپ کی جو اولاد مکہ میں جوان ہوئی اور بیاہی گئی اسکی نسبت ثابت ہے کہ اسے قیمتی زیورات جہیز میں دئے گئے مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو مدینہ میں بیاہی گئیں انہیں ایک چھلا تک نہیں ملا۔ غرض دنیوی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت مکہ میں اچھی تھی لیکن چونکہ آپ نے حضرت خدیجہؓ کی دولت کو آہستہ آہستہ نیک کاموں میں خرچ کر دیا اس لئے مدینہ منورہ کے ایام میں آپ کی وہ آسودگی کی حالت نہ رہی تھی پس اگر یہ فرق کسی نفسیاتی اثر کے ماتحت ہوتا تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا جیسا کہ سر ولیم نے سمجھا ہے۔

اگر سر ولیم کا طریق استدلال ٹھیک ہو تو پھر مسیحیت کے مخالفوں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ کہیں کہ یسوع کو چونکہ بوجہ غربت اور یہود کی مخالفت کے اِدھر اُدھر بھاگے پھرنا پڑتا تھا اس لئے وہ اپنے دل کی تکلیف کا ازالہ ان خیالات کے ذریعہ کرتا رہتا تھا کہ وہ یہودیوں کا بادشاہ ہونے والا ہے اسی طرح سر ولیم کے مقرر کردہ اصل کے ماتحت یسوع کی نسبت یہ اعتراض بھی درست تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ چونکہ انکو شادی کی توفیق نہ ملی اس لئے انکے ذہنی جذبات انہیں ایک دوبارہ آمد کے خیال میں مبتلا رکھتے تھے جبکہ وہ دُولہا کی شکل میں آئیں گے اور ایک نہیں دو نہیں اکٹھی پانچ کنواریوں کو لیکر مکان میں گھس جائیں گے چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ یسوع نے کہا ” اس وقت آسمان کی بادشاہت دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنے مشعلیں لے کر دولہا کے استقبال کے واسطے نکلیں۔ ان میں پانچ ہوشیار اور پانچ نادان تھیں جو نادان تھیں انہوں نے اپنے مشعلیں لئے مگر تیل ساتھ نہ لیا پر ہوشیاروں نے اپنے مشعلوں کے ساتھ برتنوں میں تیل لیا۔ جب دولہا نے دیر کی سب اونگھنے لگیں اور سو گئیں آدھی رات کو دھوم مچی کہ دیکھو دُولہا آتا ہے اس کے استقبال کے واسطے نکلو تب ان سب کنواریوں نے اُٹھ کر اپنی مشعلیں درست کیں اور نادانوں نے ہوشیاروں سے کہا اپنے تیل میں سے ہمیں بھی دو کہ ہماری مشعلیں بجھی جاتی ہیں پر ہوشیاروں نے جواب میں کہا ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور تمہارے واسطے کفایت نہ کرے بہتر ہے کہ بیچنے والوں کے پاس جاؤ اور اپنے واسطے مول لو۔ جب وے خریدنے گئیں دُولہا آ پہنچا اور وے جو تیار تھیں اس کے ساتھ شادی کے گھر میں گئیں اور دروازہ بند ہوا پیچھے وے دوسری کنواریاں بھی آئیں اور کہنے لگیں اے خداوند اے خداوند ہمارے لئے دروازہ کھول تب اس نے جواب میں کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہیں نہیں پہچانتا “ (متی باب ۲۵۔ آیت ا تا ۱۲) اب دیکھو اگر سر ولیم میور اور پادری وہیری جیسے شخص اسی تمثیل سے یہ نتیجہ نکالیں کہ شادی نہ ہونے کی وجہ سے یسوع کو کنواریوں کا ہی خیال رہتا تھا تو کیا یہ درست ہوگا کیا مسیحی دُنیا ایسے اعتراض کرنے والے کو منصف قرار دیگی اگر نہیں تو میں کہتا ہوں کیوں انہوں نے اس قسم کے لوگوں کا مقابلہ نہ کیا جنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایسے لغو اور بیہودہ اعتراض کئے اور کیوں مسیحیت کی اس تعلیم کو یاد نہ رکھا کہ ” تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا آپ کو “ (متی باب ۲۲ آیت ۳۹)۔

اگر سر ولیم اور پادری وہیری غور کرتے تو انہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ فرق جو مکی اور مدنی سورتوں کے بیان میں ہے اسکی نہایت معقول وجہ موجود ہے اور وہ یہ کہ مکہ میں مسلمانوں پر کفار کا یہ طعنہ ہوتا تھا کہ یہ ذلیل اور غریب ہیں ان کے پاس وہ نعمتیں نہیں ہیں جو ہمیں حاصل ہیں اس لئے انہیں کے الفاظ میں جنت کی حقیقت کو بیان کیا گیا۔ اور

بتایا گیا کہ جن چیزوں پر تم کو فخر ہے ان سے بہتر مسلمانوں کو ملینگی لیکن مدینہ میں جب مسلمانوں کے قدم اللہ تعالیٰ نے جما دیئے تو کفار کے اس اعتراض کی گنجائش نہ رہی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس رنگ کے جواب کو ترک کر دیا۔ اب آیندہ زمانوں کے لئے قرآن شریف میں دونوں طرح کی تشریح جنت کی موجود ہے جن کا اعتراض مسلمانوں پر مکی زندگی کے دشمنوں کا سا ہو ان کے لئے مکی زندگی کی آیات میں جواب موجود ہے اور جن کا اعتراض مدنی زندگی کے دشمنوں کا سا ہو ان کے لئے مدنی زمانہ کی آیات موجود ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مکی زمانہ میں اعتقادات کی تشریح پر زور دینا ضروری تھا کیونکہ ابتداء میں اعتقادات کی درستی اور تلقین ہی ضروری ہوتی ہے اس لئے ان سورتوں میں اعتقادی مسائل کی تشریح زیادہ تفصیل سے موجود ہے اور جنت بھی اعتقادات میں سے ہے پس جنت کے متعلق زیادہ تفصیل مکی سورتوں میں ہے مدنی سورتوں میں چونکہ اسلامی تمدن کا قیام زیادہ مقدم تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے حسب حال تعلیم مدنی سورتوں میں دی ہے اور وہ مدنی احکام کی زیادہ تفصیل بیان کرتی ہیں اور ان میں ان مسائل کی طرف (جب بھی ان کا ذکر آئے) صرف اشارہ ہوتا ہے جو مکی سورتوں میں بیان ہو چکے تھے اور کلام حکیم میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

سرولیم نے اعتراض کا ایک اور پہلو بھی اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بات نہیں جو اوپر بیان ہوئی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں آئے تو یہود و نصاریٰ کے اثر سے انہوں نے جنت کے بارہ میں اپنے کلام کو بدل دیا کسی نے سچ کہا ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ مسیحی مصنف کفار مکہ کے اسی اعتراض کو بڑی وقعت دیتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کو کوئی اور شخص سکھاتا ہے اور اس پر زور دیتے ہیں کہ بعض مسیحی لوگ جو غلام تھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسیحی کتب کی باتیں بتاتے تھے اور کبھی وہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے ایک مسیحی راہب سے اپنی جوانی میں مسیحی مذہب کی تعلیم حاصل کی تھی اور اسے قرآن میں نقل کر دیا۔ سرولیم میور نے اپنی کتاب میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے صہیب رضی اللہ عنہ سے جو ایک رومی غلام تھے اور مکہ میں رہتے تھے عیسائیت کے بارہ میں علم حاصل کیا تھا (لائف آف محمد ص ۱۲۷) اگر یہ بات درست ہے تو مدینہ میں آنے سے پہلے ہی آپ کو مسیحی تعلیم کا علم تھا اور مدینہ میں آکر جنت کے بارہ میں مسیحی تعلیم سے متاثر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر واقعہ میں مسیحی اور یہودی غلام آپ کو پرانے اور نئے عہد نامہ کی باتیں بتایا کرتے تھے تو یہ علم آپ کو مکہ میں ہی حاصل ہو جانا چاہیئے تھا۔

بات یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی لٹریچر میں جنت کا کوئی ذکر ہی نہیں اسرائیلی لوگوں کو اس دنیا کی زندگی سے ایسی اُلفت رہی ہے اور اُنکی شاخ مسیحیت بھی اسی مرض میں مبتلا رہی ہے کہ اُخروی زندگی کے بارہ میں اُنکی کتب میں کوئی معین تعلیم موجود نہیں وہ سب ان وعدوں کو جو انبیاء نے اُخروی زندگی کے بارہ میں کئے ہیں اسی دُنیا پر چسپاں کرتے چلے آئے ہیں۔ پس ان سے کسی کا متاثر ہونا امر محال ہے ان کی کتب میں نہ ان مسائل پر بحث ہے اور نہ کوئی ان سے کچھ اخذ کر سکتا ہے وہ تو اِسی دُنیا کی طرف راغب رہے ہیں جیسا کہ قرآن کریم ان کے حق میں فرماتا ہے کہ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (سورہ کہف ع ۱۲) یعنی ان کی تمام کوششیں اسی دُنیا میں غائب ہو کر رہ جاتی ہیں پس اگر کوئی ان سے اس بارہ میں حاصل کرنا بھی چاہے تو کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہاں قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے ان مسائل پر سیر کن بحث کی ہے جو اپنے اپنے موقعہ پر بیان ہوگی۔

میں آخر میں اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس آیت کے بارہ میں جو مضامین میں نے بیان کئے ہیں وہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی کی روشنی

أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا

کسی بات کے بیان کرنے سے (خواہ وہ) مچھر کے برابر ہو یا اس سے (بھی) بڑھ کر ہو پھر جو لوگ (تو)

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ

ایمان رکھتے ہیں وہ تو جان لیتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے بالکل حق (بات) ہے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ

اور جو لوگ کافر ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ (آخر) اللہ کا اس (بات) کے بیان کرنے سے منشا کیا ہے (اصل بات یہ ہے کہ)

بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وقف لازم

وہ بہت (سے لوگوں) کو اس کے ذریعہ سے گمراہ قرار دیتا ہے اور بہت (سے لوگوں) کو اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ

اور وہ اس کے ذریعہ سے ان نافرمانوں کے سوا (کسی کو) گمراہ نہیں قرار دیتا ۳۵ جو اللہ کے عہد کو

میں بیان کئے گئے ہیں۔ عالم اُخروی کے متعلق اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے کوئی شخص جو اس مسئلہ کے متعلق کچھ بیان کرے اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

وَهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ کی تشریح

وَهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ۔ وہ جنت میں بستے چلے جائیں گے فنا کبھی ان پر نہ آئے گی۔ یہ پہلی دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ فنا اسی صورت میں ہوتی ہے کہ جب انسان کی غذا اس پر متضاد اثر ڈالے آخر ایک دن اسکی متضاد غذا کا اثر موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا موت اس طرح آتی ہے کہ کوئی اسے مار دے۔ جب وہاں کی ہر غذا دوسرے کی مؤید ہوگی اور انسان کی اندرونی طاقتوں کے بھی مطابق ہوگی اور جب سب ساتھی نیک اور پاک ہونگے اور کوئی کسی کو نقصان پہنچانے والا نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ موت کے دروازے بند ہو جائیں گے اور ابدی زندگی کا مقام انسان پائے گا

۳۵ حل لغات۔ يَسْتَحْيٖ۔ اِسْتَحْیَاءٌ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَحْيَا حَيِيَ سے باب استفعال ہے حَيِيَ مِنْهُ حَيَاءً کے معنے ہیں اِحْتَشَمَ اس سے رُکا (اقرب) اَلْحَيَاءُ (جو حَيِيَ کا مصدر ہے) کے معنی ہیں اِنْقِبَاضُ النَّفْسِ مِنْ شَيْءٍ وَتَرْكُهُ حَذَرًا مِنَ اللَّوْمِ فِيْهِ یعنی طبیعت کا کسی امر سے رُکنا اور کسی امر کو لوگوں کی ملامت کے خوف سے چھوڑ دینا حَيَاء کہلاتا ہے اور اِسْتَحْيَاهُ وَاِسْتَحْيَا مِنْهُ کے معنی ہیں۔ اِنْقَبَضَ عَنْهُ وَامْتَنَعَ مِنْهُ کسی چیز سے رُکا اِسْتَحْيَا کے ایک معنی تَخَجَّلَ کے بھی ہیں یعنی شرم کھا کے حیرانگی اور اضطراب میں پڑ گیا (اقرب) اس آیت میں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہیں رُکتا۔

اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا۔ ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ کے معنی ہیں اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا اس کو ہاتھ سے مارا۔ ضَرَبَهٗ بِالسَّوْطِ کے معنے ہیں جَلَدَهٗ اس کو کوڑے سے مارا۔ اور اَلْمَثَلُ کے معنی ہیں اَلشِّبْهُ وَالنَّظِيْرُ شبہ۔ الصِّفَۃ

اَلْحُجَّةُ. دلیل۔ یُقَالُ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا اَیْ حُجَّةً۔ اَقَامَ لَهٗ مَثَلًا کے معنی یہ ہیں کہ اس پر حجت قائم کی۔ اَلْحَدِیْثُ عام بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ ضرب المثل۔ اَلْعِبْرَةُ عبرت اَلْاٰیَةُ۔ نشان (اقرب) اور ضَرَبَ لَهٗ مَثَلًا کے معنے ہیں وَصَفَهٗ وَقَالَهٗ وَ بَیَّنَهٗ۔ بیان کیا۔ اور اچھی طرح سے واضح کیا (اقرب) پس اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا کے معنی ہونگے کہ اللہ نہیں رُکتا کسی بات کے بیان کرنے سے۔

فَوْقَهَا۔ فَوْقَ عربی زبان میں دونوں معنی رکھتا ہے اگر بڑائی کا مقابلہ ہو تو اس کے معنے زیادہ بڑے کے ہوسکتے ہیں اور اگر چھوٹے ہونے کا ذکر ہو تو زیادہ چھوٹا ہونے کے معنے دے سکتا ہے اس آیت میں دونوں معنی کئے جاسکتے ہیں یہ بھی کہ مچھر سے بڑی بات۔ یا یہ کہ اس سے بھی چھوٹی بات۔ کہتے ہیں فُلَانٌ اَسْفَلُ النَّاسِ وَ اَنْذَلُهُمْ کا جواب اگر هُوَ فَوْقَ ذَالِكَ دیا جائے تو اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ وہ اس قدر کمینہ نہیں بلکہ یہ کہ وہ اس سے بھی زیادہ کمینہ ہے (کشاف)

اٰمَنُوْا۔ اٰمَنَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اٰمَنَ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ؏

اَلْحَقُّ۔ ضِدُّ الْبَاطِلِ جھوٹ کے خلاف چیز یعنی سچ اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ ہو کر رہنے والی بات۔ اَلْعَدْلُ انصاف۔ اَلْمِلْكُ ملکیت۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ یعنی ثابت رہنے والی چیز اَلْیَقِیْنُ بَعْدَ الشَّكِّ شک کے بعد یقین کا آنا (اقرب)

کَفَرُوْا۔ کَفَرَ سے جمع مذکر کا صیغہ ہے اور کفر کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ؏

یُضِلُّ۔ اَضَلَّ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے جو ضَلَّ (مجرد) سے بنا ہے۔ ضَلَّ کے معنی حل لغات سورہ فاتحہ ؏ میں بتائے جاچکے ہیں۔ اور اَضَلَّهٗ کے معنے ہیں۔ دَفَنَهٗ وَ غَیَّبَهٗ اس کو دفن کردیا اور غائب کردیا۔ اَضَاعَهٗ اس کو ضائع کردیا۔ اَهْلَكَهٗ اس کو ہلاک کردیا۔ اَضَلَّ اللّٰهُ فُلَانًا کے ایک معنے یہ بھی ہیں صَیَّرَهٗ اِلَی الضَّلَالِ اللہ نے اسے گمراہی کی طرف پھیر دیا۔ اور جب اَضَلَّ فُلَانٌ الْفَرَسَ وَالْبَعِیْرَ کہیں تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ شَرَدَا وَذَهَبَا عَنْهُ وَلَمْ یَدْرِ اَیْنَ اَخَذَ اکہ فلاں شخص کا اونٹ اور گھوڑا غائب ہوگئے اور علم نہ ہوا کہ وہ کدھر چلے گئے ہیں (اقرب) کلیات ابی البقاء اور مفردات راغب میں ہے کہ اِضْلَال کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی دو طرح ہوتے ہیں (۱) کہ انسان گمراہ تو خود ہوتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اس کے گمراہ ہونے کا فیصلہ کردیتا ہے۔ اور آخرت میں اسے اس کے نتیجہ میں دوزخ کی طرف لے جاتا ہے (۲) فطرتِ انسانی میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ جب وہ کسی بُری بات کو یا اچھی بات کو باربار کرتا ہے تو وہ اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے اور اس سے رکنا اس کے لئے مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ اس بات کا کرنا اسکی عادت میں داخل ہوجاتا ہے چونکہ فطرت کو اللہ تعالیٰ ہی نے اس قسم کا بنایا ہے اس لئے اضلال یا ہدایتِ انسانی کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے (کلیات ابی البقاء ومفردات راغب) اس آیت میں یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا کے معنے یَحْکُمُ اللّٰهُ بِالضَّلَالِ عَلَیْهِمْ کے کئے گئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کے گمراہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے یا یہ کہ اس کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ قرار دیتا ہے۔

یَهْدِیْ۔ هَدٰی سے مضارع ہے اور هُدٰی کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ حل لغات ؏ وبقرہ ؏

اَلْفَاسِقِیْنَ۔ فَسَقَ سے اسم فاعل فَاسِقٌ آتا ہے اور فَاسِقُوْنَ۔ فَاسِقِیْنَ۔ فَسَقَةٌ۔ فُسَّاقٌ فَاسِقٌ کی جمع ہیں۔ فَسَقَ کے معنے ہیں (۱) تَرَكَ اَمْرَاللّٰهِ اللہ کے حکم کو رد کردیا۔ (۲) عَصٰی وَجَارَ عَنْ قَصْدِ السَّبِیْلِ نافرمانی کی اور سیدھے راستہ سے ہٹ گیا۔

فَوْقَهَا
اٰمَنُوْا
اَلْحَقُّ
یَهْدِیْ
کَفَرُوْا
اَلْفَاسِقِیْنَ
یُضِلُّ

چنانچہ کہتے ہیں فَسَقَتِ الرِّکَابُ عَنْ قَصْدِ السَّبِیْلِ کہ قافلہ چلتے چلتے ٹھیک راستہ سے اِدھر اُدھر ہوگیا۔(۳) خَرَجَ عَنْ طَرِیْقِ الْحَقِّ حق کے راستہ سے نکل گیا وَقِیْلَ فَجَرَ اور بعض لغت کے ائمہ نے اس کے معنی بدکار ہوگیا کے کئے ہیں۔ نیز کہتے ہیں۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَۃُ عَنْ قِشْرِھَا اَیْ خَرَجَتْ۔ کہ کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل آئی۔ اور جب فَسَقَ فُلَانٌ مَالَہٗ کہیں تو معنے یہ ہوں گے کہ اَھْلَکَہٗ وَ اَنْفَقَہٗ اس نے مال کو ضائع کر دیا۔ اور خرچ کر دیا (اقرب) لسان میں ہے اَلْفُسُوْقُ:۔ اَلْخُرُوْجُ عَنِ الدِّیْنِ یعنی فُسُوق دین سے خروج کرنے کا نام ہے اور اَلْفِسْقُ کے معنی ہیں۔ اَلْعِصْیَانُ وَالتَّرْکُ لِاَمْرِاللّٰہِ وَ الْخُرُوْجُ عَنْ طَرِیْقِ الْحَقِّ یعنی نافرمانی اور خدا تعالیٰ کے حکم کو ترک کرنے اور سچے راستے سے خروج کا نام فسق ہے اَلْمَیْلُ اِلَی الْمَعْصِیَۃِ گناہ کی طرف میلان کو بھی فسق کہتے ہیں نیز لکھا ہے وَتُسَمَّی الْفَاْرَۃُ فُوَیْسِقَۃً لِخُرُوْجِھَا عَلَی النَّاسِ وَ اِفْسَادِھَا یعنے چوہے کو فُوَیْسِقَہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دکھ دیتا ہے اور کام خراب کرتا ہے (لسان) امام راغب فاسق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اَکْثَرُ مَا یُقَالُ الْفَاسِقُ لِمَنِ الْتَزَمَ حُکْمَ الشَّرْعِ وَ اَقَرَّبِہٖ ثُمَّ اَخَلَّ بِجَمِیْعِ اَحْکَامِہٖ اَوْبِبَعْضِہٖ کہ فاسق کا لفظ اکثر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے تو شریعت کے احکام کی پابندی کرے اور ان احکام کو درست سمجھنے کا اقرار کرے لیکن بعد ازاں تمام احکام شریعت کو یا بعض احکام کو ترک کر دے۔ وَاِذَا قِیْلَ لِلْکَافِرِ الْاَصْلِیِّ فَاسِقٌ فَلِاَنَّہٗ اَخَلَّ بِحُکْمِ مَا اَلْزَمَہُ الْعَقْلُ وَاقْتَضَتْہُ الْفِطْرَۃُ اور جب شریعت کے احکام کے منکر کے لئے فاسق کا لفظ استعمال کریں تو یہ مفہوم مدِنظر ہوگا کہ اس نے ان احکام کو چھوڑ دیا اور ان کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جن کو عقل لینے کا فتویٰ دیتی تھی۔ اور جن کو تسلیم کرنے کا فطرت تقاضا کرتی تھی (مفردات) پس فَاسِقٌ کے معنی ہوئے (۱) نافرمان (۲) خدا تعالیٰ کے حکم کو ترک اور رد کرنے والا (۳) حق کو قبول کر کے پھر اسے ترک کر دینے والا۔

اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا کے معنے۔

تفسیر۔ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی مثال بیان کرے بلکہ یہ معنے ہیں کہ کوئی بات بیان کرے۔ مَثَلٌ کے معنے حقیقت بیان وغیرہ کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَ سَکَنْتُمْ فِیْ مَسٰکِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ وَ تَبَیَّنَ لَکُمْ کَیْفَ فَعَلْنَا بِھِمْ وَضَرَبْنَا لَکُمُ الْاَمْثَالَ (ابراہیم ع۷) یعنی تم ان لوگوں کے گھروں میں رہتے ہو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے ان سے کیا معاملہ کیا اور ہم ان کے احوال تم سے بیان کر چکے ہیں۔ آیت زیرِ تفسیر میں بھی ضرب المثل کا کوئی موقعہ نہیں اور معنے صاف ہیں کہ ضرب مثل سے مُراد صرف حال یا کیفیت یا حقیقت بیان کرنے کے ہیں۔ فرماتا ہے ہم اس بات سے نہیں رکتے کہ ہم کوئی بات بیان کریں خواہ وہ مچھر کے برابر ہو یعنی بہت چھوٹی ہو یا مچھر سے بھی چھوٹی ہو اس جگہ فَمَا فَوْقَھَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور فوق کے عام معنے اوپر کے ہوتے ہیں مگر عربی میں فوق کا لفظ نسبتی طور پر استعمال ہوتا ہے بڑی کے لئے بھی فوق کا لفظ استعمال کر دیتے ہیں اور چھوٹی کے لئے بھی۔ اور اس موقعہ پر اس کے معنے پہلی بیان کردہ حقیقت میں زیادتی پر دلالت کرنے کے ہوتے ہیں اگر کسی کی شرافت کا ذکر ہو اور کوئی کہے ھُوَ فَوْقَہٗ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اسکی شرافت اس سے بھی زیادہ ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ اور اگر دنائت کا ذکر ہو اور کوئی ھُوَ فَوْقَہٗ کہے تو اس کے معنے ہونگے اسکی کمینگی اس سے بھی زیادہ ہے جو تم بتلاتے ہو یہاں چونکہ چھوٹی چیز کی مثال دی گئی ہے پس فَمَا فَوْقَھَا کے معنی ہیں کہ مچھر سے بھی چھوٹی بات بیان کرنے سے اللہ نہیں رُکتا۔

عربی میں لفظ فوق کا استعمال۔

اس آیت میں مَا نکرہ پر دلالت کرنے کے لئے آیا ہے اور مَثَلاً مَّا کے معنی ہیں کوئی بات۔ اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی بات بیان کرنے سے نہیں رُکتا۔ رہا یہ کہ بَعُوْضَۃً کا مقامِ ترکیب کیا ہے؟ سو اس بارہ میں مفسّرین نے اختلاف کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس پر نصب اس لئے آئی ہے کہ یہ مَا کی صفت ہے جو بدل ہے مَثَلاً کا جو آگے مفعول ہے یَضْرِبُ کا بعض نے کہا ہے کہ یہ مَثَلاً کا عطف بیان ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ بدل ہے مَثَلاً کا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ یَضْرِبُ بمعنی یَجْعَلُ کا مفعول ثانی ہے بعض نے یہی توجیہ کی ہے مگر اسے مفعول اوّل مؤخر قرار دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ بَعُوْضَۃً کو نصب اسقاطِ جار کی وجہ سے آئی ہے اور آیت یُوں ہے اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَیْنَ بَعُوْضَۃٍ اِلٰی مَا فَوْقَھَا یعنی اللہ تعالیٰ اس سے نہیں رُکتا کہ مچھر سے لے کر اس سے بہت چھوٹی چیز تک کسی بات کو بیان کرے اس آخری امر کو فرّاء اور کسائی جیسے آئمہ نحو نے ترجیح دی ہے (ابن کثیر جلد اوّل) اور یہی توجیہ سب سے درست ہے عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی لفظ مجرور ہو یعنی اس پر لفظاً یا معنیً زیر آئی ہو اور پھر زیر دینے والے لفظ کو وہاں سے حذف کر دیا جائے تو اس زیر والے لفظ کی زیر نصب سے بدل جاتی ہے یعنی لفظاً یا مقاماً اس پر زبر آجاتی ہے اس جگہ چونکہ بَعُوْضَۃً کی طرف بَیْنَ کا لفظ مضاف تھا جسے اس لئے حذف کر دیا گیا کہ فَمَا فَوْقَھَا اس پر دلالت کر رہا تھا اس لئے بَعُوْضَۃٍ کی جر نصب سے بدل گئی اور بَعُوْضَۃٍ کی جگہ بَعُوْضَۃً ہوگیا۔ اس توجیہ کے مطابق جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے آیت کے معنے یہ ہوئے کہ خواہ ایک مچھر کے برابر بات ہو یا اس سے بھی چھوٹی ہو اگر اس کے بیان کرنے میں کوئی فائدہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بیان کر دیتا ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کہیں گے کہ ایسی بات بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ میرے نزدیک یہی توجیہ سب سے درست ہے مگر میرے نزدیک محذوف بجائے بَیْنَ کے لفظ کے مِثْلُ کا لفظ نکالنا زیادہ مناسب ہے یعنی مچھر کے برابر یا اس سے بھی چھوٹا۔

اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوْضَۃً میں نحوی لحاظ سے بعوضۃ کا مقام۔

عربی زبان میں مچھر کو چھوٹی بات کی تمثیل کے لئے لاتے ہیں چنانچہ حدیث میں آتا ہے لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَا سَقٰی کَافِرًا مِنْھَا شَرْبَۃَ مَاءٍ (ترمذی جلد دوم ابواب الزہد باب ما جاء فی ہوان الدنیا علی اللہ) یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دُنیا کی قیمت مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی بھی پینے نہ دیتا۔ اس حدیث سے اِس آیت کے لفظوں اور معنوں دونوں پر روشنی پڑتی ہے معنوں پر تو اس طرح کہ اس دُنیا اور آخرت کی زندگی میں کوئی حقیقی مشابہت نہیں کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ اس دُنیا کی نعمتوں کی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں اور لفظی مشابہت اس سے ثابت ہے کہ حدیث میں چھوٹا پن بیان کرنے کے لئے مچھر کے پر کی مثال دی ہے اور اس حدیث کے معنوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم مچھر سے بھی چھوٹے کے معنے مچھر کے پر کے کرسکتے ہیں اور آیت کے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ ایک مچھر کے برابر بلکہ اس کے پَر کے برابر بھی کوئی بات بیان کرنی پڑے تو اللہ تعالیٰ اس سے نہیں رُکتا۔

عربی زبان میں مچھر کو چھوٹی بات کی تمثیل کے لئے لاتے ہیں۔

لفظوں اور عبارت کی تشریح کرنے کے بعد اب میں آیت کے مطالب کی تفسیر کو لیتا ہوں پہلی آیت میں جنّت اور اس دُنیا کی نعمتوں کی مشابہت بیان کی گئی تھی تا کفار کا یہ اعتراض دُور ہو کہ ہمارے پاس تو فلاں فلاں نعمتیں ہیں اور مسلمانوں کے پاس نہیں؛ اور تا مسلمانوں میں سے کمزور لوگوں کے ذہن میں بھی جنّت کا ایک تمثیلی نقشہ آجائے لیکن دوسری طرف قرآن کریم میں صاف طور پر دوسرے مقامات میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ اس دنیا کی زندگی اور اُخروی زندگی میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ وہ اعلیٰ روحانی زندگی ہے اور یہ مادہ سے گھری ہوئی زندگی اور کفار اس حقیقت سے واقف تھے۔ پس اس بظاہر نظر آنے والے تضاد کو دُور کرنا بھی ضروری تھا

آیت اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا کے مطلب کی تفسیر۔

تا مخالفوں کا اعتراض نہ ہو کہ آخر ایسی دو مغائر باتوں کی مشابہت ظاہر کرنے سے مطلب کیا۔ اگر محض ایک ادنےٰ مشابہت کا اظہار مُراد ہے تو اللہ تعالیٰ جیسی اعلیٰ ہستی کو ایسی معمولی سی مشابہت کے بیان کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی سو اس سوال اور اس کے جواب کو اللہ تعالیٰ اس آیت زیرِ تفسیر میں بیان فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ بعض لوگ اعتراض کرینگے کہ جنّت و دوزخ کا جو یہ تمثیلی حال قرآن کریم نے بیان کیا ہے اس سے غرض کیا ہے اگر یہ جنّت اور دوزخ کا صحیح نقشہ نہیں تو اس کے بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان باتوں کے بیان کرنے سے نہیں رُک سکتا جو خواہ تمثیل کے رنگ میں ہوں مگر ہیں مفید اور ان تمثیلوں کے بیان کرنے سے بھی انسانی علم میں ترقی ہوتی ہے اور مومن کچھ نہ کچھ اندازہ اس بیان سے اپنے ذہنوں میں لگا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ امر جس کا ذکر کیا گیا ہے ضرور اسی طرح ہو کر رہے گا جس طرح خدا تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے پس اگر اسکی پُوری حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تو کوئی حرج نہیں اس کا ایک اندازہ تو ہوگیا جس سے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی۔

تمثیل کی شکل دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے مقابلہ کے لئے بیان کی گئی ہے

يَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ يَعْلَمُوْنَ اس جگہ جاننے کے معنوں میں نہیں بلکہ یقین رکھنے کے معنوں میں ہے کیونکہ اس کے دو مفعول آئے ہیں (اور جب عَلِمَ کے دو مفعول ہوں تو اس کے معنے یقین کرنے کے ہوتے ہیں نہ کہ جاننے کے) اور مُراد یہ ہے کہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ وہ حق ہے۔ حق کے معنے صداقت کے ہیں ایسی صداقت جو بالکل پکّی اور بغیر شبہ کے ہو۔ یہ مصدر ہے اور مصدر کبھی اسم فاعل اور کبھی اسم مفعول کے معنے بھی دیتا ہے (رضی شرح کافیہ جلد ۲ بحث مصدر) پس اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مومن خوب سمجھتے ہیں کہ یہ بات ہو کر رہنے والی ہے اور یہ بھی کہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف

يَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ کی تشریح۔

سے ثابت شدہ ہے پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ گو نہایت باریک تشبیہات سے جنّت کا ذکر کیا گیا ہے جو درحقیقت اس کا حقیقی نقشہ نہیں بلکہ بطور استعارہ کے استعمال ہوئی ہیں جیسے کسی استقلال والے شخص کو کہہ دیتے ہیں کہ ▮▮ تو پہاڑ ہے اب پہاڑ سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ وہ اُونچا اور ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ پہاڑ کو جو مقام جسمانی دُنیا میں حاصل ہے وہ مقام اس شخص کو اخلاق کی دنیا میں حاصل ہے اور وہ اخلاقی طور پر بلند حوصلہ اور اپنے ارادہ سے نہ ٹلنے والا ہے لیکن پھر بھی چونکہ ان استعاروں کے علاوہ قرآن کریم میں جنّت کی نعماء کی امتیازی خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں اس لئے مومن ان استعاروں کو سُن کر فوراً ان دوسرے مضامین کو یاد کر کے کہتے ہیں کہ جو کچھ فرمایا سچ فرمایا اور یہ صداقت معمولی نہیں بلکہ وہ ہے جو ہمارے رب کی طرف سے آئی ہے یعنی یہ استعارے اور تشبیہات بالکل اس مضمون کے مطابق ہیں جو دوسری جگہوں پر جنّت کی رُوحانی کیفیات کے متعلق بیان ہوا ہے گویا مومن ان استعاروں کی صحت اور انکی مطابقت کی داد دیتے ہیں اور ان کے دل اس لذّت سے مسرور ہو جاتے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں کفّار جو قرآن کریم کے دوسرے مضامین کو جو اس بارہ میں بیان ہوئے ہیں (جیسا کہ وہ مضامین جو میں جنّت کی نعمتوں کے بارہ میں آیات قرآنیہ میں سے ہی پہلے بیان کر آیا ہوں) یا تو جانتے نہیں یا جاننا چاہتے نہیں ان استعاروں اور تشبیہوں کو سُن کر کہتے ہیں کہ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا آخر اس قسم کی بات بیان کرنے سے خدا تعالیٰ کا منشا کیا ہے یہ توجیسی بیان ہوئی جیسی نہ ہوئی یہ تعصب اور جہالت کا نتیجہ ہوتا ہے ورنہ اس دُنیا میں استعاروں اور تشبیہات سے بہت بڑا کام لیا جاتا ہے استعارہ اور تشبیہ ہر زبان کا ایک جزو اہم ہیں اور اعلےٰ ادیب اس سے کام لیتے ہیں۔ ایک بہادر کو بہادر کہنے سے

اگر کام لیا جا سکتا تو اسے تشبیہ کے نام سے کیوں موسوم کرتے ایک سخی کو اگر سخی کہنے سے وہی فائدہ حاصل ہو سکتا جو حاتم کہنے سے حاصل ہو سکتا ہے تو اسے حاتم کیوں کہتے؟

اصل بات یہ ہے کہ غیر مرئی اور لطیف وجودوں کو تشبیہات کے ذریعہ سے ہی ذہن کے قریب کیا جا سکتا ہے آواز کے آثار چڑھاؤ سمٹنے اور پھیلنے کو بیان کرنے کے لئے انسان کے پاس کوئی معیار نہیں جب ایک شخص دوسرے کے سامنے آواز کی خوبی بیان کرتا ہے تو کس طرح اسے میٹھی کے لفظ سے ظاہر کرتا ہے حالانکہ میٹھا تو زبان کے ذائقہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن پھر بھی آواز کی خوبی کو بیان کرنے کے لئے خوب اچھی وغیرہ الفاظ سے انسان کو تسلی نہیں ہوتی اور آخر وہ میٹھی آواز کہہ کر اپنے مطلب کو بیان کرتا ہے خوشبو کا ذکر بھی مشکل ہوتا ہے اور خوشبو کے مختلف اثرات کو بیان کرنے والے کسی خوشبو کو پھیلنے والی کسی کو گول اور کسی کو چپٹی کہہ کر اسکی کیفیت ذہن نشین کراتے ہیں حالانکہ خوشبو کا گول یا چپٹا ہونا عقل کے خلاف ہے یہ محض استعارات ہیں اور انکے بغیر صرف یہ کہکر کہ اچھی خوشبو ہے عمدہ ہے ہم کبھی اپنے مطلب کو واضح نہیں کر سکتے مگر جب ہم استعارہ استعمال کرتے ہیں تو مضمون کو نہایت قریب کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ غرض استعارہ اور تشبیہہ ضروری امور میں سے ہیں اور صرف مبالغہ کا کام نہیں دیتے بلکہ حقیقت کو قریب کرنے کا کام دیتے ہیں اور کفار کا یہ اعتراض کہ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا محض جہالت اور تعصب کا اظہار تھا۔

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا میں مَثَلًا پر نصب اس لئے ہے کہ وہ بطور تمیز کے واقع ہوا ہے اور تمیز کا اصول یہ ہے کہ اسے اسم کی طرف مضاف کر کے معنے صحیح ہو سکیں چنانچہ اس آیت کے معنے یوں ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا اس بات کے بیان کرنے سے کیا منشاء ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا میں اس قسم کے ناقص ذکر کی غرض کو بیان فرمایا اور بتایا کہ ایسے ذکر سے فائدہ کیوں نہیں مومن چونکہ رُوحانی آدمی ہیں انہوں نے رُوحانی لذتیں حاصل کی ہوئی ہیں اس لئے جب وہ یہ استعارے قرآن میں پڑھتے ہیں تو اُن کے قلوب کچھ نہ کچھ اندازہ ان نعمتوں کا لگا لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے ان دونوں نعمتوں کو الگ الگ چکھا ہُوا ہوتا ہے۔ نماز کی لذت روزہ کی لذت صدقہ و خیرات کی لذت بھی انہوں نے چکھی ہوئی ہوتی ہے اور پھلوں کی لذت بھی چکھی ہوئی ہوتی ہے پس اس لطیف ذوق کی وجہ سے جو صاحب کمال لوگوں میں ہوتا ہے وہ ان روحانی پھلوں اور ان جسمانی پھلوں کی مشابہت کو سمجھتے ہیں اور جب قرآن کریم میں استعارہ اور تشبیہ کے طور پر ان جسمانی نعمتوں کے الفاظ کا استعمال دیکھتے ہیں تو ان کے دل اس مناسبت کو جو ان دونوں میں ہے اپنے ذوق صحیح کی وجہ سے محسوس کر لیتے ہیں اور یہ امر ان کے ایمان کی زیادتی کا موجب ہوتا ہے لیکن کافر جن کی رُوحانی حِس مری ہوئی ہے اور وہ عبادات کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔ اور ان کے نتیجہ میں خدا تعالےٰ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہوں نے کبھی چکھا ہی نہیں اس لئے انکی مثال اس اندھے کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے رنگوں کا ذکر کیا جائے تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ اور اس کے قلب کی کوئی تار خوبصورت نظاروں کے ذکر سے پھڑکتی نہیں۔ اور وہ بجائے فائدہ اُٹھانے کے اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور اپنے اندر کی گمراہی کو ظاہر کر دیتے ہیں جیسے طرح مثلاً کسی کی آنکھ بظاہر سلامت ہو مگر اُسے نظر کچھ نہ آتا ہو اور کسی مجلس میں لوگ کسی نظارے کی طرف اشارہ کریں اور وہ بول اُٹھے کہ ایسی کوئی چیز موجود نہیں تو اس کے اندھے پن کا راز افشاء ہو جائیگا اسی طرح فرماتا ہے کہ ایسے بیان سے ایک فائدہ مومنوں کے بارہ میں ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اندرونی ذوقوں کا پتہ چل جاتا ہے اور ایک فائدہ کافروں کے بارہ میں حاصل ہوتا

یَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ میں جنت کے متعلق پُر استعارہ کلام پر ہونے کے فائدے کا ذکر

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا میں مَثَلًا کا اعراب

عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ

اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو جسے

اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِؕ اُولٰٓئِكَ

ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں وہی لوگ

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ

نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ۵۲۵ تم کس طرح اللہ (کی باتوں) کا انکار کرتے ہو

ہے۔ کہ انکی اندرونی گمراہی کا پتہ چل جاتا ہے۔

اضلال کے معنے گمراہی کے متعلق فیصلہ صادر کرنیکے۔

حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا میں گو نسبت گمراہ کرنے کی خدا تعالیٰ کی طرف ہے مگر ایک تو اس کے معنی ہلاک کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے اضلال کے معنی گمراہی کا نتیجہ نکالنے کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہ آئمہ کتب لغات نے بیان کیا ہے اور جیسا کہ خود آیت کا اگلا ٹکڑا بتا رہا ہے کیونکہ اس ٹکڑے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ یعنی خدا تعالیٰ اس قسم کے استعارہ اور تشبیہ والے بیانات سے صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور فاسق چونکہ پہلے سے ہی گمراہ ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی یہی ہوئے کہ جو گمراہ ہوں انکی گمراہی کو ظاہر کر دیتا ہے اور انکی گمراہی کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرما دیتا ہے۔

یَنْقُضُوْنَ

۵۲۵ حل لغات۔ يَنْقُضُوْنَ:۔ نَقَضَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور نَقَضَ الْعَهْدَ وَالْاَمْرَ کے معنی ہیں ضِدُّ اَبْرَمَهٗ ۔ وَاَفْسَدَهٗ بَعْدَ اِحْكَامِهٖ کہ کسی عہد کو پختہ کرنے کے بعد پھر توڑ دیا (اقرب) پس يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ کے معنے ہیں وہ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔

عَهْد

عَهْد:۔ اَلتَّوَفَادُ۔ وفا اَلضَّمَانُ ضمانت۔ اَلْمَوَدَّةُ دوستی۔ الذِّمَّةُ ذمہ داری عہد۔ اَلْوَصِيَّةُ۔ وصیت اَلْمَوْثِقُ۔ عہد نیز کہتے ہیں عَهِدَ فُلَانٌ الشَّيْءَ اور معنے یہ ہوتے ہیں حَفِظَهٗ وَرَاعَاهُ حَالًا بَعْدَ حَالٍ اس کی حفاظت کی اور ہر گھڑی اس کی نگہداشت میں لگا رہا قِيْلَ هٰذَا اَصْلُهٗ ثُمَّ اسْتُعْمِلَ فِى الْمَوْثِقِ الَّذِىْ يَلْزِمُ مُرَاعَاتُهٗ بعض نے کہا ہے کہ یہ تو عہد کے لغوی معنے ہیں لیکن پھر ایسے اقرار کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا جسکی نگہداشت اور حفاظت ضروری ہو (اقرب)

یُفْسِدُوْنَ

يُفْسِدُوْنَ:۔ فَسَدَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۱۲؎

الخاسرون

الخَاسِرُوْنَ:۔ خَسِرَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور خَسِرَ التَّاجِرُ فِىْ بَيْعِهٖ (يَخْسَرُ) کے معنے ہیں وُضِعَ فِىْ تِجَارَتِهٖ۔ تاجر کو تجارت میں گھاٹا ہوا ضِدُّ رَبِحَ خَسِرَ کا لفظ نفع کے مخالف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ خَسِرَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ضَلَّ وَهَلَكَ گمراہ ہو گیا اور ہلاک ہو گیا (اقرب) عربی زبان میں یہ لفظ ہمیشہ لازم ہی استعمال ہوتا ہے میں نے بڑی تحقیق کی ہے مگر مجھے نہیں ملا کہ یہ لفظ عرب کے استعمال میں کہیں بھی متعدی استعمال ہوا ہو مگر عجیب بات ہے کہ تمام کے تمام مفسرین خَسِرُوْا کے معنے اَهْلَكُوْا کرتے ہیں لیکن تاج العروس والا کہتا ہے وَلَا يُسْتَعْمَلُ هٰذَا الْبَابُ اِلَّا لَازِمًا كَمَا صَرَّحَ بِهٖ اَئِمَّةُ التَّصْرِيْفِ کہ سارے اہل تصریف

اس کو لازم ہی قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں کیونکہ قرآن کریم میں متعدی استعمال ہوا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ لازم ہی ہے اور افسوس یہ ہے کہ ہماری لُغتیں مذہبی اثر کے نیچے ہیں اور تفسیروں کے ماتحت لغت کو بھی کر دیا ہے جس سے اسلام کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ نقصان پہنچا ہے اور کئی معارف قرآنیہ اس تصرف کی وجہ سے لوگوں کی نظر سے مخفی ہوگئے ہیں کاش کوئی شخص ہمت کر کے ایسی لُغت تیار کرے جو تفسیروں کے اثر سے بالکل آزاد ہو۔ تا کہ لوگ اس ناجائز دباؤ سے بالکل آزاد ہو جائیں اور قرآن مجید کے سمجھنے میں لوگوں کو سہولت حاصل ہو جائے۔

خَسِرَ کے لفظ کے متعلق ہی اگر تفسیروں کا رُعب ماننے کی بجائے عربی کے قواعد پر نظر کی جائے تو اسے خلاف محاورہ متعدی بنانے کی ضرورت نہ تھی ہم اس کے معنے اس طرح کر سکتے ہیں کہ جس طرح سَفِهَ نَفْسَهٗ کے کرتے ہیں یعنی حرفِ جار محذوف تصوّر کرتے ہیں اور جملہ کو یوں تصوّر کرتے ہیں کہ سَفِهَ فِیْ نَفْسِهٖ یا تمیز خیال کرتے ہیں جو شاذ و نادر کے طور پر معرفہ بھی آجاتی ہے اسی طرح ہم خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کے بھی یہ معنے کر سکتے ہیں کہ اپنے نفسوں کے بارہ میں گھاٹا میں پڑ گئے اور یہ معنے دوسرے معنوں سے زیادہ زور دار بھی ہو جاتے ہیں اور یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کا سب فریب خود اپنے ہی نفسوں کے خلاف پڑا ہے تمیز کی صورت میں بھی زور قائم رہتا ہے اور معنے اوپر والے ہی رہتے ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ فاسق جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے کن صفات کے مالک ہوتے ہیں اور وہ صفات یہ بیان فرمائی ہیں (۱) اللہ تعالیٰ سے جو عہد انہوں نے باندھا ہوا ہے اسے توڑنے والے ہوتے ہیں (۲) جن تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط کرنے کا حکم دیا ہے ان کو کاٹنے والے ہوتے ہیں (۳) اور زمین میں فساد کرنے والے ہوتے ہیں۔

فاسقوں کے عہد توڑنے سے مراد

امر اوّل یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے سے مراد اوّل تو توحید کا ترک ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (اعراف ع۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر رُوح کے اندر ایک ایسا مادہ رکھا ہے کہ گویا وہ زبانِ حال سے اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے پھر فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی گویا اپنی صفات کے مخفی ظہور کے ذریعہ سے ان سے کہتا ہے کہ کیا تم اس پر گواہ ہو اور وہ بزبانِ حال کہتی ہیں کہ ہاں ہم گواہ ہیں یہ انسانی فطرت کی ایک لطیف شہادت قرآن کریم نے بیان کی ہے لیکن کچھ لوگ اس فطرتی شہادت کو جو ہر انسان کے نفس میں پائی جاتی ہے بُھلا کر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس طرح گویا اس عہد کو توڑ دیتے ہیں جو ہر فطرت نے ہوش آتے ہی توحید پر قیام کے متعلق کیا تھا۔

دوسری مُراد عہد سے وہ عہد ہے جو ہر نبی اپنے سے بعد میں آنے والے نبی پر ایمان لانے کے متعلق لیتا ہے۔ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ (آل عمران ع۹) یعنی ہم نے ہر نبی سے اس کے وقت میں عہد لیا ہے کہ جو کلام اور جو مامور بعد میں میری طرف سے آئے اسے بھی ماننا ہوگا۔ پس فاسق وہ ہوتے ہیں جو اس عہد کو بھول جاتے ہیں اور وقت کے مامور کا انکار کر دیتے ہیں۔

فاسقوں کی تین صفات

اور یہ جو فرمایا کہ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور سچائیوں کی محبت ان کے دلوں سے سرد ہو جاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے

أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ

حالانکہ تم بے جان تھے پھر اس نے تمہیں جاندار بنایا پھر (ایک دن آئے گا کہ) وہ تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا

پھر تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا ۵۲۹ وہ (خدا) وہی (تو) ہے جس نے ان

ساتھ تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ دُنیا کی محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں۔ اور انکی تمام توجہ دُنیا کی طرف پھر جاتی ہے۔

ثُمَّ

پھر فرماتا ہے کہ دُنیا کی محبت بھی انکی صادق نہیں ہوتی۔ کیونکہ محبوب چیز کی تو عقلمند حفاظت کرتا ہے مگر وہ دنیا کو بھی خراب کر دیتے ہیں اور اس کے امن کو بد امنی سے اور اسکی خوبصورتی کو بدصورتی سے بدل دیتے ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیئے کیونکہ دنیا کو خوبصورت تو اس کا خالق ہی بنا سکتا ہے جو خالق سے مُنہ موڑ لیں وہ دُنیا کی مشین کو سمجھ ہی کس طرح سکتے ہیں۔ اور جو کسی مشین کو سمجھتا نہیں وہ اسے خراب ہی کرے گا درست کس طرح کر سکتا ہے

يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ کا مطلب۔

چنانچہ فرماتا ہے أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ یہ لوگ ہی گھاٹا پانے والے ہیں سمجھتے تو یہ ہیں کہ مومن دنیوی نعمتوں سے محروم ہو کر گویا زندگی کا لُطف کھو بیٹھے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خود سرچشمہ حیات سے قطع تعلق کر کے ازلی زندگی سے محروم ہو گئے ہیں۔

۵۲۹ حل لغات:۔ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ:۔

تَكْفُرُونَ كَفَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور كَفَرَ بِاللّٰهِ کے معنی ہیں خدا کی ہستی کا انکار اس کی صفات یا احکام کا انکار کیا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۷ھ

کفر باللہ دو طرح ہوتا ہے۔

أَمْوَاتًا:۔ مَيِّتٌ اور مَيْتٌ کی جمع ہے اور مَيِّتٌ اور مَيْتٌ کے معنے ہیں۔ اَلَّذِي فَارَقَ الْحَيٰوةَ جو زندگی سے علیحدہ ہو جاوے (اقرب) موت کے

أَمْوَاتًا

مختلف معانی ہیں جیسی زندگی ہوگی اسی کے مقابل اس چیز کے نہ ہونے کو موت کہیں گے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲ھ

ثُمَّ:۔ حرفِ عطف ہے جو ترتیب اور تراخی کے لئے آتا ہے یعنی یہ ظاہر کرتا ہے کہ معطوف اپنے معطوف علیہ کے بعد ترتیباً اور کچھ دیر کے بعد واقع ہوا ہے اُردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "پھر" "تب" "بعد ازاں" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، و بعض اوقات ثُمَّ کے آخر میں تا بھی لے آتے ہیں جیسے کہ اس شعر میں اسے لایا گیا ہے ع

وَلَقَدْ أَمُرُّ عَلَى اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي

فَمَضَيْتُ ثُمَّتَ قُلْتُ لَا يَعْنِينِي (اقرب)

یعنی میں جب کبھی گالیاں دینے والے ایک کمینے شخص کے پاس سے گزرتا ہوں۔ تو خاموشی سے گزر جاتا ہوں اور اپنے نفس میں کہتا ہوں کہ وہ مجھے مخاطب نہیں کرتا۔

تفسیر۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ۔ کفر باللہ دو طرح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کرے۔ یا اس کے احکام یا بعض صفات کا انکار کرے۔ اس جگہ دوسرے معنے مُراد ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات کا انکار مُراد نہیں بلکہ کُفر سے مُراد کلام الٰہی کا انکار ہے جس کا ذکر اوپر إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا میں ہو چکا ہے۔

اصل ذکر آیات میں کلام الٰہی کا ہی تھا آگے اس کے انکار کے ذکر میں کافروں کی سزا اور مومنوں کی جزا کا

ذکر ضمناً ہوا تھا پس اس آیت میں پھر اصلی مضمون کی طرف رجوع کر کے عقلی طور پر کلام الٰہی کے ثبوت میں دلیل بیان فرمائی اور بتایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی صفت تکلم کا انکار کس طرح سکتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تم کو زندہ کیا۔ یہ دلیل اس لئے دی کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوحانی زندگی بغیر وحی کے ناممکن ہے کیونکہ رُوح کی زندگی کے معنے یہ ہیں کہ وہ ابدی زندگی پانے کے قابل ہو جائے اور ابدی زندگی کا معاملہ اسرارِ قدرت میں سے ہے اسے انسان عقلاً معلوم نہیں کر سکتا اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے کہ خدا تعالیٰ جو اگلی زندگی کی حقیقت سے واقف ہے اپنے الہام سے اس کے مطابق قابلیت پیدا کرنے کا گُر بتائے پس روحانی زندگی صرف وحی اور الہام سے مل سکتی ہے مجرد عقل اس کے ذرائع کو معلوم نہیں کر سکتی پس اس آیت میں بتاتا ہے کہ سوچو تو سہی کہ جس خدا نے جسم کے لئے زندگی کا سامان پیدا کیا ہے کس طرح ہو سکتا ہے کہ اُخروی زندگی کا جو دنیوی زندگی سے کہیں اہم ہے سامان پیدا نہ کرے گا۔

اَمْوَاتٌ جمع مَیِّتٌ کی ہے۔ اور میت اسے کہتے ہیں جس پر موت وارد ہو۔ اور موت حیات کے مقابل کا لفظ ہے جو معنی حیات کے ہوں اس کے اُلٹ معنے موت کے ہوتے ہیں۔ حیات کے معنی لغت میں (۱) نمو کے ظاہر ہونیکے ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (روم ع ۲) یعنی اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے خشک اور ویران ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے یعنی اس میں سبزہ چارہ اُگاتا ہے (۲) دوسرے معنی حیات کے حِس کا درست ہونا ہے اور موت کے معنے حِس کے زائل ہونے کے ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے یَا لَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا (مریم ع ۲) حضرت مریمؑ نے دردِ زہ کے وقت میں فرمایا کاش میں اس سے پہلے بیہوش ہو جاتی۔ اس جگہ موت سے مراد حقیقی موت نہیں بلکہ درد کی وجہ سے انہوں نے بیہوشی کی خواہش کی ہے (۳) تیسرے معنی حیات کے علم اور عرفان کے ہوتے ہیں۔ اور موت کے معنی جہالت کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ (انعام ع ۱۵) یعنی کیا وہ شخص جو جاہل ہو اور پھر ہم نے اسے علم رُوحانی بخشا ہو اس جیسا ہو سکتا ہے جو اس کے برخلاف ہے اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (روم ع ۵) تو مردوں کو نہیں سُنا سکتا۔ مُراد یہ ہے کہ تو جاہلوں سے بات نہیں منوا سکتا۔ (۴) زندگی سے مُراد خوشیاں ہوتی ہیں اور موت کے معنے تکلیفوں اور دُکھوں کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں ہے یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ (ابراہیم ع ۳) یعنی دوزخی کو چاروں طرف سے موت آئے گی مگر وہ مرا ہُوا نہ ہوگا۔ یعنی غم اور پریشانی لاحق ہوگی۔ مگر موت نہ آئے گی (۵) پانچویں معنی حیات کے جاگتے اور ہوشیار رہنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل موت کے معنی نیند کے ہیں (۶) چھٹے معنے حیات کے جاندار کا سانس لینا۔ یا سانس کی حالت کا پایا جانا ہے اور موت کے معنے اس کے سانس کا بند ہو جانا یا سانس کے بغیر ہونا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ میں عقلی طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت تکلم کی دلیل۔

اس آیت میں پہلے اموات کے معنے تو بے جان ہونے کے ہیں نہ کہ وہ معنے جو اُردو میں مُردہ ہونے کے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ مُراد نہیں کہ زندہ تھے اور مر گئے بلکہ یہ معنی ہیں کہ بے جان تھے پھر ہم نے تم کو زندہ کیا اور جاندار بنایا۔

اموات کی تشریح اور موت کے چھ معانی

پھر فرماتا ہے کہ جاندار بنانے کے بعد پھر تمہاری روح قبض کرے گا اور مار دے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا اور اس کے بعد تم اسکی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی قرآن کریم کے نزدیک انسان پر چار حالتیں آتی ہیں۔ اوّل بے جان ہونا۔ پھر جاندار بننا۔ پھر مرنا۔ اور پھر زندہ ہونا۔ اور آخری حالت جو چاروں کا نتیجہ ہے خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

آیت ہذا میں اموات سے مُراد بے جان ہونے کے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس خدا نے تم کو بے جان سے جاندار بنایا۔ اور پھر جان دینے کے بعد موت

فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ

تمام چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے (فائدہ کے) لئے پیدا کیا ہے پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہُوا تو انہیں

دیتا ہے۔ اسکی نسبت یہ خیال کرنا کہ اس موت کے بعد دوسری زندگی نہ دے گا خلاف عقل ہے۔ اور اگر دوسری زندگی ملنی ہے۔ تو پھر کوئی ہدایت بھی اس کی طرف سے ضرور آنی چاہیئے تاکہ وہ انسان کو دوسری زندگی کے لئے تیار کرے۔

کیا سادہ اور لطیف استدلال ہے کہ ایک بیجان کو جاندار بنانے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی اگر کوئی خاص مقصد اس کے سپرد نہ تھا پھر فرض کرو کہ کوئی مقصد نہ تھا تو ایک صاحب فہم و فراست وجود کو پیدا کرکے مارا کیوں۔ اگر اسی دُنیا کی خوشی اور چین انسان کے لئے مقدر تھا تو پھر اس قدر لمبے عمل کے بعد بے جان سے جاندار بناکر اسے موت کا مزہ کیوں چکھایا جب تک کہ اس موت کے بعد ایک اَور اعلیٰ حیات دینی مدّ نظر نہ تھی۔

آیت وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا الخ میں سوخیال کا رد کہ مرنے کے بعد عذاب قبر کوئی نہیں۔

اس آیت میں اُن لوگوں کا بھی ردّ ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد عذاب قبر کوئی نہیں بلکہ جنّت دوزخ سے ہی جب واسطہ پڑے گا پڑے گا۔ کیونکہ اس میں پانچ زمانوں کا ذکر ہے۔ ایک بے جان ہونے کا زمانہ دوسرا دنیوی زندگی کا زمانہ۔ تیسرا جسمانی موت کا زمانہ۔ چوتھا پھر ایک نئی زندگی کا زمانہ۔ اور اس کے بعد وہ زمانہ جب انسان خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوگا۔ یعنی حشر موت کے بعد حیات اور حیات کے بعد ثُمَّ کا لفظ رکھ کر اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ فرمانا بتاتا ہے کہ موت کے جلد بعد ایک قسم کی حیات تو مل جاتی ہے مگر حشر بعد میں ہوتا ہے یہ حیات جو حشر سے پہلے ملتی ہے لازم ہے کہ اس میں کوئی نیک یا بدسلوک انسان سے ہو ورنہ اس حیات کے معنی ہی کوئی نہیں۔ اور اگر نیک و بدسلوک ہوتا ہے تو معلوم ہُوا کہ حشر سے پہلے بھی ایک نامکمل ثواب اور نامکمل عذاب ہے اور اسی کو سزا و جزاء قبر کہتے ہیں۔ جو احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ثابت ہے قرآن کریم کی ایک اور آیت واضح طور پر اس عذاب کا ذکر کرتی ہے۔ فرماتا ہے اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن رکوع ۵) یعنی فرعون کی قوم کو صبح اور شام دوزخ کے سامنے کیا جاتا ہے۔ اور جب قیامت کا دن آئے گا تو کہا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو اس آیت سے ظاہر ہے کہ دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے آل فرعون کو عذاب ملتا رہے گا اور قرآن کریم کے نزول کے وقت میں بھی مل رہا تھا۔

آیت وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا الخ میں اسلام کی دو ترقیوں کی طرف اشارہ۔

اِس آیت میں جس طرح جسمانی موت کے بعد ایک حیات کے وعدہ کا ذکر ہے دُنیا کی قومی موت اور زندگی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور مُراد یہ ہو سکتی ہے کہ دُنیا مُردہ تھی خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ سے اسے زندہ کیا ہے پھر ایک دفعہ وہ مرے گی اور پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا گویا اسلام کی دو ترقیوں کی خبر اس میں دی گئی ہے ایک شروع زمانہ میں اور ایک آخر زمانہ میں یعنی اس جگہ سورۂ جمعہ کی آیت وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ والی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِن معنوں کے رُو سے ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ سے یہ مراد ہوگی کہ پھر قیامت آجائے گی اور اس طرف اشارہ نکلے گا کہ دین اسلام آخری دین ہے اور اس کے بعد قیامت تک کوئی اور دین یا مذہب نہیں۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۟ وَاِذْ قَالَ

ع ۳ / ۳

مکمل بنا دیا یعنی ساتوں آسمانوں کو اور وہ ہر ایک بات (کی حقیقت) کو خوب جانتا ہے ۵۳ اور (اے انسان تو اس وقت

۵۳ حل لغات: خَلَقَ:۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲۲

اِسْتَوٰی:۔ کے معنی ہیں (۱) برابر ہو گیا (۲) معتدل ہو گیا (۳) اس میں کوئی کمی یا نقص باقی نہ رہا (۴) کھانے کے لئے آئے تو معنے ہیں پک گیا (۵) لکڑی یا اور دھات وغیرہ کے لئے آئے تو معنے ہوں گے اس میں کجی نہ رہی (۶) انسان کے لئے ہو تو اس کے معنے ہونگے جوان ہو گیا یا کمال کو پہنچ گیا (۷) اِسْتَوَی الْمَلِكُ عَلٰی سَرِيْرِ الْمُلْكِ کے معنے ہیں بادشاہ تخت حکومت پر قابض ہو گیا (۸) اِسْتَوٰی عَلَی الشَّيْءِ کے معنی ہیں اس پر غالب آگیا (اقرب) ایک شاعر کہتا ہے ع

فَلَمَّا عَلَوْنَا وَاسْتَوَيْنَا عَلَيْهِمْ (محیط)

یعنی جب ہم ان پر بھاری ہو گئے اور غالب آگئے (۹) اِسْتَوٰی کے معنے عَلَا اور اِرْتَفَعَ کے بھی ہیں یعنی اونچا ہوا (۱۰) جب اس کا صلہ اِلٰی آئے تو اس کے معنی کامل توجہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

السَّمَاءُ:۔ اسم جنس ہے ایک کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور زیادہ کے لئے بھی چونکہ آگے اسکی طرف جمع کی ضمیر پھیری گئی ہے معلوم ہوا یہاں جمع مراد ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲۰ پس ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ کے معنے ہوئے پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔

سَوّٰهُنَّ:۔ سَوَّی الشَّيْءَ تَسْوِيَةً کے معنے ہیں جَعَلَهٗ سَوِيًّا کسی چیز کو درست کیا۔ صَنَعَهٗ مُسْتَوِيًا کسی چیز کو ایسا بنایا کہ اسکی سب ضرورتوں کا لحاظ کر لیا گیا تھا۔ جب سَوَّاهُ بِهٖ، یا سَوّٰی بَيْنَهُمَا کہیں تو معنے ہونگے عَدَلَ کہ دو چیزوں کو برابر کر دیا (اقرب) اس آیت میں

خَلَقَ

سَوّٰهُنَّ کے معنے ہونگے کہ ان کو ایسا بنایا کہ ان کی سب ضرورتوں کا لحاظ کر لیا گیا تھا۔

اِسْتَوٰی

سَبْعَ

سَبْعَ:۔ کے معنے کبھی سات کے ہوتے ہیں اور کبھی زیادہ کے سَبْع سے مراد ضروری نہیں کہ سات ہی ہو کیونکہ عربی زبان میں سات اور ستر کے الفاظ مجرد کثرت کیلئے بھی استعمال ہوتے ہیں (لسان)

سَبْع سے مراد ضروری نہیں کہ سات ہی ہوں

شَيْءٌ

شَيْءٌ:۔ کا ترجمہ اس جگہ بجائے چیز کے بات کیا گیا ہے کیونکہ اردو میں چیز کا لفظ اس موقعہ پر پورا مفہوم ادا نہیں کرتا لیکن بات کا لفظ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے بات کے معنی اس جگہ قول کے نہیں بلکہ امر اور حقیقت کے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ کی تشریح۔

تفسیر۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے اس رنگ میں صرف قرآن کریم ہی نے پیش کیا ہے اول تو اس سے شرک کا رد ہوتا ہے کیونکہ جب ہر چیز انسان کے لئے ہے تو پھر اس کا خدا ہونا بے معنی ہے کیونکہ خادم آقا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے ہے اس میں سائنس کی ترقی کا راستہ کھول دیا کیونکہ سائنس کا دارو مدار تحقیق پر ہے اور تحقیق اسی وقت شروع ہو سکتی ہے جب یہ یقین ہو کہ جس چیز کے بارہ میں تحقیق کی جائے گی اس میں سے کوئی فائدہ مند علم پیدا ہو گا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ دنیا جہان کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے ہے تو اول یہ ثابت ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز نہیں جس میں فائدہ نہ ہو کسی ردی سے ردی شے کو بھی بیکار نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ اگر کوئی ایک چیز بھی دنیا کی بے کار ثابت ہو تو یہ آیت غلط ہو جاتی ہے کس جہالت کے زمانہ میں قرآن کریم نے یہ زبردست علمی بات بیان

السَّمَاءُ

سَوّٰهُنَّ

دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے ہے

فرمائی۔اس زمانہ میں تو سوائے دنیا کی محدود سے چند چیزوں کے باقی سب چیزوں کو بے کار محض خیال کیا جاتا تھا لیکن قرآن کریم نے فرمایا یہ غلط ہے کوئی چیز بے کار محض نہیں بلکہ ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے ہے آج ہزاروں لاکھوں اشیاء کے فوائد معلوم ہو چکے ہیں اور باقیوں کے آئندہ معلوم ہوتے چلے جائیں گے اور جو کوئی کہے کہ دنیا کی ایک شے بھی ایسی ہے کہ بے کار ہے اور اس میں انسان کے فائدہ کا کوئی سامان نہیں ہے وہ جاہل ہے اور قرآن کریم اسکی بات کو رد کرتا ہے۔

آیت خَلَقَ لَكُمْ الخ میں قرآن کریم کا جہالت کے زمانہ میں ایک علمی بیان

دوسرا امر اس سے یہ نکلتا ہے کہ جن چیزوں میں فوائد نکلیں اگر وہ مرکب ہوں تو جن اجزا سے وہ بنتی ہیں آگے وہ اجزا بھی پھر انسان کے لئے مفید ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ جمیعًا کا لفظ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ خواہ مفردات ہوں خواہ مرکبات خواہ ذرات ہوں خواہ مجموعۂ ذرات۔ سب کی سب اشیاء انسان کے لئے مفید ہیں پس اگر سائنس کسی مرکب وجود کو پھاڑ کر اس کے اجزاء دریافت کرے تو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ان مفردات میں پھر آگے اور فوائد مخفی نکلیں گے اور صرف فوائد مخفی نہ ہونگے بلکہ ایسے فوائد مخفی ملیں گے جو انسان کے لئے مفید ہوں گے۔

دنیا میں جو کچھ ہے سب بنی نوع انسان کی مشترک وراثت ہے۔

تیسرے یہ بتایا گیا ہے کہ جو چیزیں بظاہر انسانی زندگی یا اس کے جسم کے لئے مضر نظر آتی ہیں ان میں بھی انسان کے فائدہ کے اسباب موجود ہیں خواہ کوئی کس قدر ہی خطرناک زہر کیوں نہ ہو۔اس کا بھی کوئی نہ کوئی مفید استعمال ضرور ہے جس میں انسان کے لئے فائدہ کا پہلو ہے۔اس نکتہ کو سمجھ کر لوگوں نے سنکھیا، کچلہ، سانپ کے زہروں وغیرہ سے فوائد طبیہ حاصل کئے ہیں مگر افسوس کہ اس کتاب کے کمال کا اعتراف نہیں کیا۔جس نے ان ایجادات سے بہت پہلے اس زبردست سچائی کی طرف اشارہ کیا تھا

آیت ہذا میں مذاہب کی جنگ کا فیصلہ۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ تمہارے فائدہ کے لئے ہے پس اسکو فساد اور جھگڑے کا ذریعہ بنانا درست نہیں۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہے سب بنی نوع انسان کی مشترک وراثت ہے پس اس کا استعمال اس رنگ میں نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک فرد یا ایک قوم کی مخصوص ملکیت ہو جائے اس نکتہ کو نظرانداز کرکے اس وقت یورپ تباہی کی طرف جا رہا ہے اگر قرآن کریم کی اس تعلیم پر عمل کیا جاتا تو یہ حسد اور بغض جو مختلف ممالک اور مختلف اقوام اور مختلف گروہوں اور مختلف افراد میں پیدا ہو رہا ہے کبھی نہ ہوتا۔اسلام نے صدقہ اور زکوٰۃ کا حکم بھی اسی اصل پر مبنی رکھا ہے کہ اصل میں زمین کی سب اشیاء سب انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور انسان مجموعی طور پر ان کا مالک ہے پس گو انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جائے مگر یہ ایسے رنگ میں نہیں ہونا چاہئے کہ دوسرے حقدار اس سے فائدہ اُٹھانے سے کلی طور پر محروم ہو جائیں۔

اس آیت میں مذاہب کی جنگ کا بھی عجیب طرح فیصلہ کیا گیا ہے۔مثلاً ہندوؤں کا خیال تھا کہ یہ دُنیا گندی ہے اور اس سے بچنے میں ہی نجات ہے۔ چنانچہ تناسخ کے مسئلہ کی بُنیاد اسی پر ہے۔اس خیال کی وجہ سے ہندوؤں میں مکتی کا لفظ اس حالت کے لئے بولا جاتا ہے جب انسان دُنیا سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں کامیاب ہو جائے اور مکتی کے معنے محض دُکھوں سے نجات کے ہیں مسیحیوں میں بھی نجات کی امید کی گئی ہے اور نجات کے معنی بھی تکلیف اور ضرر سے بچ جانے کے ہیں گویا انہوں نے بھی دُنیا کو گندہ قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے مسیح علیہ السلام نے ایک مالدار سے فرمایا ہے کہ پہلے اپنے مال کو لٹا آ پھر آکر میرا مرید بنیو (متی باب ۱۹ آیت ۲۱، ۲۲) بُدھوں میں بھی کامیاب ہونے والے شخص کے لئے نروان

کا لفظ رکھا گیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ تمام خواہشات سے بچ گیا گویا ان کے نزدیک بھی محض خواہش بُری شئے ہے ان کے نزدیک اچھی اور بُری دو قسم کی خواہشات ہو ہی نہیں سکتیں۔ زردشتیوں نے بھی بعض اشیاء کو مضر اور بعض کو مفید قرار دیا ہے اور اس فرق کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑ گئے ہیں کہ دُنیا کے دو خدا ہیں ایک خالقِ خیر ہے اور ایک خالقِ شر ہے لیکن ان تمام تعلیموں سے ظاہر ہے کہ ان اقوام نے دُنیا کی پیدائش کو ایک آزمائش خیال کیا ہے۔ بڑے اور رائج الوقت مذاہب میں سے صرف یہودیت اور اسلام ہی ہیں جنہوں نے اس دُنیا کو ایک سزا نہیں قرار دیا۔ مگر اِن دونوں میں آگے یہ فرق ہے کہ یہودیت نے صرف اسی دُنیا کو اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ پس اسلام ہی اس بات میں منفرد ہے کہ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دُنیا میں انسان کا آنا اس لئے نہیں کہ وہ دُنیا سے بچے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کو نیک استعمال کے ذریعہ سے عاقبت کی درستی کا ذریعہ بنائے۔

مگر یہ عجیب نظارہ اس وقت نظر آتا ہے کہ وہ دُنیا جسے مختلف مذاہب نے ایک گندی اور پھینکنے والی شے قرار دے رکھا تھا آج وہ اسے دانتوں سے مضبوط پکڑے بیٹھے ہیں اور صرف مسلمانوں کو اس سے دور رکھا ہوا ہے اگر یہ دنیا ایسی ہی گندی تھی تو آج ان مذاہب کے پیرووں نے اسے اپنا مقصد اور مدعا کیوں بنا رکھا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ بعض نے اس آیت سے یہ نکالا ہے کہ اس میں آسمانوں کی پیدائش کا ذکر ہے اور ثُمَّ اس جگہ حقیقت کے لئے نہیں آیا بلکہ صرف اور کے معنوں میں آیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف بیان کیا گیا ہے کہ آسمانوں کی پیدائش کے بعد زمین کو پیدا کیا گیا ہے مگر اس تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں آسمانوں کی پیدائش کا ذکر نہیں۔ اور نہ زمین کی پیدائش کا ذکر ہے کیونکہ خَلَقَ الْاَرْضَ نہیں کہا گیا بلکہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ کہا گیا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے بنایا گیا ہے اور یہ فقرہ زمین کی پیدائش کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں تو صرف اس حقیقت کا ذکر ہے کہ زمین کی ہر چیز تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے پس نہ تو یہاں زمین کی پیدائش کا ذکر ہے اور نہ آسمان کی پیدائش کا۔ بلکہ صرف یہ بیان ہے کہ ہم نے تمہارے نفع کے لئے دُنیا کی ہر چیز کو پیدا کر کے بلندی کی طرف توجہ کی اور سات بلندیوں میں اسے مکمل بنایا۔ پس اس سے تو صرف اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کو انسان کے فائدہ کے لئے بنا کر اللہ تعالیٰ نے اس سے فائدہ اُٹھانے والے کے لئے سات مدارج ترقیات کے تیار کئے۔ یعنی جو لوگ ان سامانوں کو درست طور پر استعمال کریں گے ان کو اعلیٰ درجہ کی رُوحانی ترقیات ملینگی۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے سات سے مُراد ضروری نہیں کہ سات ہی کا عدد ہو بلکہ اس سے مُراد کثرت بھی ہو سکتی ہے اور آیت کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ زمین میں تمہارے عمل کے لئے بے انتہا سامان پیدا کر کے ہم بلندی کی طرف متوجہ ہوئے یعنی اس کے بعد تمہاری رُوحانی ترقیات کے سامان ہم نے مقرر کئے اور بے عیب سامان ترقی کے کثرت سے تیار کئے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ میں آسمان کی پیدائش کا ذکر نہیں

وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ زمین میں ہر چیز تمہارے فائدہ کے لئے بنا کر ضروری تھا کہ اس امر کا انتظام کیا جاتا کہ جو لوگ اس مقصد کو پورا کریں یعنی زمینی سامانوں سے خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام لیں اور اس طرح کام لیں کہ ان سے دُنیا کو فائدہ ہو نقصان نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے بھی مستحق ہوں پس فرمایا کہ ایسے لوگوں کے انعامات کے لئے ہم نے بے انتہا رُوحانی مدارج تجویز کئے ہیں تاکہ جو لوگ زمین میں نیکی اور امن پھیلائیں انہیں بلند کر کے آسمانِ روحانیت پر جگہ دی جا سکے پس بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ اس امر پر

وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کا مطلب۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ کی تشریح

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ

(یاد کر) جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا (کہ) میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ

(اس پر) انہوں نے کہا (کہ) کیا تو اس میں (ایک ایسا شخص) پیدا کرے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون

دلالت کرتا ہے کہ ہمارا پہلا فعل جس امر کا مقتضی تھا ہم اس سے غافل نہ تھے پس چونکہ زمین کی ہر شے کو انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کر کے ضروری تھا کہ اس کے صحیح استعمال کرنے والے کو اعلیٰ مقامات دیئے جائیں ہم نے ان اعلیٰ مقامات کو بھی نہیں بھلایا اور ہر شخص جو زمین میں اچھا کام لے اس کے لئے آسمان پر اس کے درجہ کے مطابق جگہ بنائی گویا جنت کے مفہوم کو دوسرے لفظوں میں اس آیت میں واضح کیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کے فعل سے کسی طرح ٹکرا نہیں سکتا

اس آیت میں ایک اور زبردست ثبوت اسلام کی حقانیت کا نکلتا ہے کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام جو خدا تعالیٰ کا کلام ہے سائنس سے جو خدا تعالیٰ کے فعل کی تشریح ہے کسی صورت میں ٹکرا نہیں سکتا کیونکہ سائنس کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ وہ خواص اشیاء معلوم کرے اور خواص اشیاء کے معلوم ہونے پر اسلام کی صداقت ثابت ہوگی اور اس آیت کی تصدیق ہوگی نہ کہ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ پس سائنس کی ترقی پر جبکہ دوسرے مذاہب کو فکر ہوتی ہے کہ ان کے مذہب کی تردید نہ ہو جائے اسلام کو خوشی ہوتی ہے کہ اس کی صداقت کا ایک اور ثبوت مہیا ہو گیا۔

فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ میں روحانی مدارج کے تعدد اور کثرت کی طرف اشارہ۔

فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ میں روحانی مدارج کے تعدد اور کثرت کی طرف اشارہ کر کے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح جسمانی عالم میں ارتقاء ہے اسی طرح روحانی عالم میں بھی ارتقاء ہے اور اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور آخری حصہ وہ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا حدیث اسراء جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم کو پہلے آسمان پر دیکھا اور اپنی نسبت یہ دیکھا کہ آپ آسمان کی آخری منزل تک گئے اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ روحانی عالم کے ارتقاء کی پہلی کڑی آدم تھے اور آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ گویا جس روحانی دنیا کی ابتداء آدم کی صورت میں ظاہر ہوئی اس کی انتہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

اس آیت میں اس مضمون کو ختم کیا گیا ہے جو الہام کے بارہ میں تردد کے متعلق تھا اور بتایا ہے کہ دنیا کو جس طرح خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ الہام ہو کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے الہام دیکر انسان کو ترقی نہ دینی تھی تو اس کے عمل میں بے انتہا تنوع پیدا کرنے کے لئے زمین میں بے انتہا ایسی اشیاء کیوں پیدا کرتا جو سب کی سب انسان کے لئے مفید ہوں اس قدر پُر حکمت عالم پیدا کرنا اور انسانی اعمال کو ایسی وسعت دینا بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون کو ایک دوسری آیت میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جو میرے بیان کردہ معنوں کی پوری تصدیق کرتی ہے فرماتا ہے وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ہود ع ۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں تدریجاً پیدا کیا ہے اور اس کا تخت حکومت روحانی پانی یعنی الہام پر قائم ہے تاکہ وہ دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرنے

الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ

بہائے گا۔ اور ہم (تو وہ ہیں جو) تیری حمد کے ساتھ (ساتھ تیری) تسبیح بھی کرتے ہیں اور تجھ میں سب بڑائیوں کے پائے

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ

جانے کا اقرار کرتے ہیں (اس پر اللہ نے) فرمایا۔ میں یقیناً وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۵۳۱ اور

والا ہے یعنی زمین اور آسمان کو پیدا کر کے خدا تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ سے انسان پر حکومت شروع کی تاکہ جو باکمال انسان ہیں انہیں اپنے ہنر دکھانے کا موقعہ ملے اور وہ ادنیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف ترقی کریں۔

۵۳۱ حل لغات۔ قَالَ :۔ قَالَ ماضی کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کا مصدر قَوْلٌ ہے۔ مفردات راغب میں لکھا ہے کہ اَلْقَوْلُ یُسْتَعْمَلُ عَلٰی اَوْجُهٍ لفظ قَول کئی معانی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَظْهَرُهَا اَنْ یَّكُوْنَ لِلْمُرَكَّبِ مِنَ الْحُرُوْفِ الْمُبْرَزِ بِالنُّطْقِ مُفْرَدًا كَانَ اَوْ جُمْلَةً (۱) زیادہ تر حروف سے مرکب مفہوم پر بولا جاتا ہے خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ۔ اَلثَّانِیْ یُقَالُ لِلْمُتَصَوَّرِ فِی النَّفْسِ قَبْلَ الْاِبْرَازِ بِاللَّفْظِ قَوْلٌ (۲) نفس میں کسی سوچی ہوئی بات پر جو ابھی بول کر ظاہر نہ کی گئی ہو اس پر بھی قول کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں فِیْ نَفْسِیْ قَوْلٌ لَمْ اُظْهِرْهُ کہ میرے نفس میں ایک خیال ہے جس کو میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اَلثَّالِثُ لِلْاِعْتِقَادِ (۳) کسی کے کوئی عقیدہ رکھنے کے مفہوم کو ظاہر کرنے پر بھی قول کا لفظ بولتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ یَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ کہ فلاں شخص امام ابو حنیفہؒ کا عقیدہ رکھتا ہے اَلرَّابِعُ یُقَالُ لِلدَّلَالَةِ عَلَی الشَّیْءِ (۴) اگر کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اس وقت بھی قَوْل کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ اِمْتَلَاَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ میں قَالَ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی جب حوض پانی سے بھر گیا تو اس نے کہا بس بس! اب زیادہ پانی نہ ڈالو (اس کا مطلب یہ نہیں کہ حوض زبان سے بولا۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حوض کی حالت بزبانِ حال یہ کہہ رہی تھی کہ وہ بھر گیا ہے اور اس میں مزید پانی کی گنجائش نہیں چنانچہ اس قسم کی مثالیں لغت کی کتب میں بکثرت ملتی ہیں۔ کہ کسی واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے قَالَ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار بھی اس امر کی مثالیں ہیں۔ ع

قَالَتْ لَهُ الْعَیْنَانِ سَمْعًا وَطَاعَةً

وَحَدَّرَتَا كَالدُّرِّ لَمَّا یُثَقَّبِ (لسان)

یعنی اسے دونوں آنکھوں نے کہا کہ تمہارا کہنا سر آنکھوں پر اور پھر وہ ایسے موتیوں کی طرح بہہ پڑیں جن میں ابھی چھید نہ ڈالا گیا ہو۔ ع

قَالَتْ لَهُ الطَّیْرُ تَقَدَّمْ رَاشِدًا

اِنَّكَ لَا تَرْجِعُ اِلَّا حَامِدًا (لسان)

یعنی پرندے نے اسے کہا کہ سیدھا راستہ اختیار کر کے آگے بڑھ اور تو واپس نہیں لوٹے گا مگر تعریف کرتا ہوا۔ ان اشعار میں قَوْل کے لفظ کی اضافت ایسی اشیاء کی طرف کی گئی ہے جو غیر ناطق ہیں یعنی پہلے شعر میں قول کا لفظ آنکھوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آنکھوں نے بزبانِ حال کہا اور دوسرے میں پرندے کی طرف۔ اور مطلب یہ ہے کہ پرندہ بزبانِ حال کہہ رہا تھا۔ تو گویا ان ہر دو اشعار میں قَالَ کے لفظ کو ایک واقعہ پر دلالت کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اَلْخَامِسُ یُقَالُ لِلْعِنَایَةِ الصَّادِقَةِ بِالشَّیْءِ (۵) اگر کسی چیز کی طرف خاص توجہ ہو تو اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بھی قَالَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اَلسَّادِسُ فِیْ

قَالَ

الانْعَامِ (۶) قَوْلٌ کا لفظ الہام کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالٰے قرآن مجید میں فرماتا ہے قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ کہ ہم نے ذوالقرنین کو الہام کرتے ہوئے کہا کہ اے ذوالقرنین! (مفردات) پس قَالَ کے معنے صرف یہ نہیں کہ انسان کسی کو مخاطب کرتے ہوئے مُنہ سے کوئی بات کہے بلکہ لفظ قَوْل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ہر مقام پر اس کے مناسب حال معنی ہوں گے۔

رَبُّكَ

رَبُّكَ۔ ترب کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۳

اَلْمَلٰٓئِكَة

اَلْمَلٰٓئِكَةُ۔ مَلَائِكَہ مَلَكٌ کی جمع ہے جو بعض کے نزدیک اَلَكَ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں۔ خبر پہنچادی پس مَلَائِكَہ کے معنے ہوئے خبر پہنچانے والے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ اَلَاكَہ سے بنا ہے اس کے معنے بھی خبر پہنچانے کے ہوتے ہیں مَلْاَكٌ کے معنے پیغام کے ہیں بعض کے نزدیک یہ لفظ مِلْكٌ سے بنا ہے جس کے معنی قبضہ اور اقتدار کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ مفردات میں لکھا ہے کہ مِلْك سے دو لفظ بنے ہیں مَلَك بھی اور مَلِكٌ بھی۔ فرشتوں میں سے جو نظامِ عالم کے نگران ہیں ان کو مَلَكٌ (لام کی زبر سے) کہتے ہیں۔ اور انسانوں میں سے جو نظام کے نگران ہوں۔ ان کو مَلِكٌ (لام کی زیر سے) کہتے ہیں یعنی بادشاہ۔ اسی طرح مفردات میں لکھا ہے مَلَائِكَة اور مَلَكٌ کا اصل مَاْلَكٌ ہے۔ بعض کے نزدیک مَلْاَكٌ سے مقلوب ہے جو اَلَكَ سے بنا ہے (لسان العرب نے اس کے اُلٹ لکھا ہے کہ مَلْاَكٌ مَاْلَكٌ سے مقلوب ہے اور یہی قواعد کے مطابق درست ہے گو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جب اَلَكَ اور اَلَاكَ دونوں کے معنے خبر دینے کے ہیں تو پھر مقلوب ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ دونوں مادوں میں سے ہی مَلَكٌ کا لفظ بن سکتا ہے اور جائز ہے)

مَاْلَكٌ اور مَاْلُوْكٌ کے معنی پیغام کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں اَلِكْنِيْ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اَبْلِغْهُ رِسَالَتِيْ کہ اسے میرا پیغام پہنچادو۔ (مفردات)

صاحب مفردات نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ اَلِكْنِيْ کے معنے ہیں مجھے رسول بنادے لیکن تقلیب کے طور پر استعمال اُلٹ معنوں میں ہونے لگ گیا ہے اور مطلب یہ لیا جانے لگا ہے کہ مجھ سے خبر لے کر دوسرے کو پہنچادے۔ یہ محاورہ ایسا ہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ پرنالہ چلتا ہے۔ حالانکہ پرنالہ کھڑا ہوتا ہے پانی چلتا ہے۔ پس اصل معنے مجھے پیغامبر بنادے کے ہیں محاورہ میں اُلٹ گئے۔ اس امر کی لسان العرب والے نے وضاحت کردی ہے۔ نیز صاحب مفردات سے ایک اور سہو ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اَلِكْنِيْ کو اَلَكَ کے مادہ کے نیچے درج کیا ہے۔ حالانکہ اَلَكَ کا صیغہ امر تو اَلِكْنِيْ ہوتا ہے اَلِكْنِيْ کا لفظ اَلَكَ سے نہیں بلکہ اَلْاَكَ سے بنا ہے جو مجوز العین ہے اس کا ماضی اَلْاَكَ ہوا۔ اور اس سے امر اَلِكْنِيْ ہوگیا۔

بعض کے نزدیک مَلَكٌ لَأَكَ سے بنا ہے کہتے ہیں اَلَاكَهُ اِلٰى فُلَانٍ اِلَاكَةً اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اَبْلَغَهُ عَنْهُ اس کی طرف سے کسی کو پیغام دیا۔ اس صورت میں مَلَكٌ اصل میں مَلْاَكٌ تھا۔ ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف ہوگیا اور باقی مَلَكٌ رہ گیا (اقرب)

تاج میں ہے لَاكَ الشَّيْءَ۔ اَدَارَهٗ فِيْ فِيْهِ کہ لَاكَ کے معنے کسی چیز کو مُنہ میں پھیرنے کے ہیں چنانچہ گھوڑا جب مُنہ میں لگام پھیرتا ہے۔ تو کہتے ہیں لَاكَ الْفَرَسُ (تاج) گویا پیغامبر بھی پیغام کے الفاظ کو مُنہ میں دُہراتا ہے اور پھیرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی پیغامبر ہستیوں کو ملائک کہا گیا۔

پس ملائکہ ان ہستیوں کو کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانوں کی طرف لاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادے کا اجرا اس دُنیا میں کرتی ہیں یا یہ کہ طاقتور ہستیاں۔

اَلْاَرْض

اَلْاَرْضُ۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲۳

خَلِيْفَة

خَلِيْفَةٌ۔ مَنْ يَخْلُفُ غَيْرَهٗ وَيَقُوْمُ مَقَامَهٗ جو کسی کا قائم مقام اور جانشین ہو (۲) السُّلْطَانُ الْاَعْظَمُ حاکم اعلیٰ۔ شاہنشاہ (۳) وَفِي الشَّرْعِ الْاِمَامُ الَّذِيْ لَيْسَ

فَوْقَهٗ اِمَامٌ۔ اور شرعی لحاظ سے خلیفہ کے یہ معنی ہونگے کہ وہ پیشرو اور حاکم جس کے اوپر اور کوئی حاکم نہ ہو۔ اور اَلْخِلَافَۃُ کے معنے ہیں اَلْاِمَارَۃُ حکومت۔ اَلنِّیَابَۃُ عَنِ الْغَیْرِ اِمَّا لِغَیْبَۃِ الْمَنُوْبِ عَنْہُ اَوْلِمَوْتِہٖ اَوْ لِعَجْزِہٖ اَوْ لِتَشْرِیْفِ الْمُسْتَخْلَفِ یعنی دوسرے کی نیابت کرنا خلافت کہلاتا ہے خواہ وہ نیابت جسکی نیابت کی گئی ہو اسکی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت یا کام سے عجز کی وجہ سے ہو۔ اور بعض اوقات یہ نیابت صرف عزت افزائی کے لئے ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو زمین پر خلیفہ بناتا ہے تو یہ صرف ان کے اعزاز کی خاطر ہوتا ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔ اور شرعی معنے خلافت کے امامت کے ہیں (اقرب)

يَسْفِكُ: سَفَكَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَفَكَ الدَّمَ کے معنے ہیں صَبَّہٗ خون کو بہایا (اقرب) پس یَسْفِكُ کے معنی ہوں گے وہ بہائے گا۔

اَلدِّمَاءَ:۔ اَلدَّمُ کی جمع ہے۔ اور اَلدَّمُ کے معنے ہیں خون۔ (اقرب)

نُسَبِّحُ:۔ سَبَّحَ سے مضارع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور سَبَّحَ اللّٰہَ کے معنی ہیں نَزَّھَہٗ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام عیوب ونقائص سے پاک سمجھا اور مبرا قرار دیا (بعض اوقات سَبَّحَ کا صلہ لام آتا ہے چنانچہ سَبَّحَہٗ کی بجائے سَبَّحَ لَہٗ کہہ دیتے ہیں لیکن معنی دونوں کے ایک ہی ہوتے ہیں) بعض اوقات سَبَّحَ کے معنے صَلّٰی کے ہوتے ہیں یعنی اس نے نماز ادا کی۔ نیز بعض اوقات سَبَّحَ کا لفظ بولتے ہیں اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے سُبْحَانَ اللّٰہِ کہا (اقرب) لسان میں ہے اَلتَّسْبِیْحُ اَلتَّنْزِیْہُ یعنی تسبیح کے معنی ہیں پاک قرار دینا اور پاک سمجھنا۔ اور جب سُبْحَانَ اللّٰہِ کہیں تو اس کے معنی ہونگے تَنْزِیْھًا لِلّٰہِ مِنَ الصَّاحِبَۃِ وَالْوَلَدِ یعنی اللہ تعالیٰ کو بیوی اور لڑکے سے پاک قرار دینا وَقِیْلَ تَنْزِیْہُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَنْ کُلِّ مَالَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یُّوْصَفَ بِہٖ اور بعض ائمہ لغت نے یہ کہا ہے کہ جب سُبْحَانَ اللّٰہِ کا فقرہ کہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام اُن باتوں سے مبرا قرار دینا جو اس کے شایان و مناسب حال نہیں پھر لکھا ہے وَجِمَاعُ مَعْنَاہُ بُعْدُہٗ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی عَنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ مِثْلٌ اَوْ شَرِیْكٌ اَوْ نِدٌّ۔ اور سُبْحَانَ اللّٰہِ کے جامع معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی مثل یا شریک یا ذات یا صفات میں اس کا کوئی حصہ دار ہو (لسان) مصنف تاج العروس لکھتے ہیں کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کے لئے سُبْحَانَكَ کے الفاظ استعمال کریں تو اس کے معنے ہونگے اُنَزِّھُكَ یَا رَبِّ مِنْ کُلِّ سُوْءٍ وَاُبَرِّئُكَ کہ اے میرے رب میں تجھے ہر نقص سے پاک سمجھتا ہوں اور ہر عیب سے مبرا قرار دیتا ہوں۔ پھر لکھا ہے کہ سُبْحَانَ ہے تو مصدر لیکن فعل کے قائمقام ہو کر استعمال ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے اسے استعمال کریں تو اس کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے کامل پاکیزگی کا اقرار پایا جائے گا چنانچہ لکھا ہے دَلَّ عَلَی التَّنْزِیْہِ الْبَلِیْغِ مِنْ جَمِیْعِ الْقَبَائِحِ الَّتِیْ یُضِیْفُھَا اِلَیْہِ الْمُشْرِکُوْنَ کہ یہ لفظ اس وقت ایسی کامل پاکیزگی پر دلالت کرے گا جو ان تمام عیوب سے اللہ کی ذات کو پاک قرار دیتی ہو جو اسکی طرف مشرک لوگ اسکی ذات کو کماحقہ نہ سمجھ کر منسوب کر دیتے ہیں نیز لکھا ہے فِی الْعَجَائِبِ لِلْکِرْمَانِیْ اَنَّ سُبْحَانَ مَصْدَرُ سَبَّحَ اِذَا رَفَعَ صَوْتَہٗ بِالدُّعَاءِ وَالذِّکْرِ کہ کرمانی اپنی کتاب عجائب میں لکھتے ہیں کہ سُبْحَانَ سَبَّحَ کا مصدر ہے اور یہ اس وقت بولیں گے جبکہ کوئی شخص اپنی آواز دُعا اور ذکر کے ساتھ بلند کرے وَالتَّسْبِیْحُ قَدْ یُطْلَقُ وَیُرَادُ بِہٖ الصَّلٰوۃُ وَالذِّکْرُ وَالتَّحْمِیْدُ وَالتَّمْجِیْدُ کبھی لفظ تسبیح سے مُراد نماز۔ ذکر الٰہی خدا تعالیٰ کی تحمید اور اسکی بزرگی کا اقرار و اظہار کرنا ہوتا ہے۔ (وَسُمِّیَتِ الصَّلٰوۃُ تَسْبِیْحًا

يَسْفِكُ

اَلدِّمَاءَ

نُسَبِّحُ

لِاَنَّ التَّسْبِيْحَ تَعْظِيْمُ اللّٰهِ وَتَنْزِيْهُهٗ مِنْ كُلِّ سُوْءٍ نماز کو تسبیح کے نام سے اس لئے موسوم کرتے ہیں کہ تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار اور اس کو جملہ عیوب ونقائص سے مبرا قرار دینا ہوتا ہے اور نماز میں بھی یہی امور مدِّ نظر ہوتے ہیں (تاج) امام راغب لکھتے ہیں اَلتَّسْبِيْحُ تَنْزِيْهُ اللّٰهِ تَعَالٰى کہ تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو جملہ نقائص سے پاک سمجھنے اور پاک قرار دینے کے ہیں۔ وَاَصْلُهُ اَلْمَرُّ السَّرِيْعُ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى اور تسبیح کے اصل معنے وضع لغت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جلدی جلدی تیزی سے گزرنے کے ہیں کیونکہ اس کا اصل مادہ اَلسَّبْحُ ہے جس کے معنے تیزی سے ہَوا میں یا پانی میں گزرنے کے ہیں وَجُعِلَ ذٰلِكَ فِيْ فِعْلِ الْخَيْرِ كَمَا جُعِلَ الْاِبْعَادُ فِي الشَّرِّ فَقِيْلَ اَبْعَدَهُ اللّٰهُ یعنی تسبیح کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کمال کا ذکر مقصود ہو اور اس کے برخلاف ابعاد کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی حقیقی کمزوری اور خرابی سے حفاظت کا ذکر کرنا ہو۔ وَجُعِلَ التَّسْبِيْحُ عَامًّا فِي الْعِبَادَاتِ قَوْلًا كَانَ اَوْ فِعْلًا اَوْ نِيَّةً۔ نیز لفظ تسبیح کے اندر ہر قسم کی عبادات آجاتی ہیں۔ خواہ وہ عبادات قولاً ہوں خواہ فعلاً یا نیتہً (مفردات)

آیت اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ الخ کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات

بِحَمْدِكَ ۔ نُقَدِّسُ

بِحَمْدِكَ:۔ حمد کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ
نُقَدِّسُ:۔ قَدَّسَ سے مضارع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور قَدَّسَ الرَّجُلُ اللّٰهَ کے معنی ہیں نَزَّهَهٗ وَوَصَفَهٗ بِكَوْنِهٖ قُدُّوْسًا اللہ تعالیٰ کو تمام عیوب سے پاک اور جامع جمیع صفات حسنہ قرار دیا (اقرب) مفردات میں ہے اَلتَّقْدِيْسُ۔ اَلتَّطْهِيْرُ کہ تقدیس کے معنے ہیں پاک کرنا۔ اور آیت نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ میں نُقَدِّسُ لَكَ کے معنے ہیں نُطَهِّرُ الْاَشْيَاءَ اِرْتِسَامًا لَكَ کہ جن کو تو پاک کرنے کا حکم دیتا ہے ہم انہیں تیرے حکم کے مطابق پاک کرتے ہیں۔ وَقِيْلَ نُقَدِّسُكَ اَيْ نَصِفُكَ بِالتَّقْدِيْسِ اور بعض نے کہا ہے کہ نُقَدِّسُكَ کے یہ معنے ہیں کہ ہم تجھے تقدیس کے ساتھ موصوف کرتے ہیں یعنی یہ کہ تُو خود پاک ہے اور تو دوسروں کو پاک کرتا ہے (مفردات) لسان میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سُبُّوْحٌ اور قُدُّوْسٌ ہیں۔ ان میں یہ فرق ہے کہ سُبُّوْحٌ کے معنے ہیں اَلَّذِيْ يُنَزَّهُ عَنْ كُلِّ سُوْءٍ کہ وہ ذات جو تمام نقائص سے پاک ہے۔ اور اَلْقُدُّوْسُ کے معنے ہیں اَلْمُبَارَكُ جس میں سب قسم کی خوبیاں جمع ہیں بابرکت۔ اَلطَّاهِرُ خود پاک اور دوسروں کو پاک کرنے والا (لسان) تسبیح اور تقدیس میں یہ فرق ہے کہ تسبیح میں تنزیہ ہوتی ہے اور تقدیس میں اس کے علاوہ تعظیم بھی ہوتی ہے۔

تفسیر پیشتر اسکے کہ اس آیت کے مضمون پر کچھ لکھا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات کا اظہار کر دیا جائے۔ نیز اس بارہ میں جو کچھ سابق کتب میں بیان ہُوا ہے اس کا بھی ذکر کر دیا جائے مفسرین نے اس آیت کے متعلق اختلاف کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً سے مُراد آدم ہے اور مراد یہ ہے کہ انسانوں سے پہلے اس دُنیا پر ملائکہ رہتے تھے پس خدا تعالیٰ نے ان سے کہا کہ مَیں تم کو آسمان پر بُلا لوں گا اور تمہاری جگہ ایک اور وجود پیدا کروں گا یعنی آدم (ابن کثیر) اس صورت میں خلیفہ بمعنی اسم فاعل لیا جائیگا ان معنوں کے قائلین میں سے بعض نے یہ توجیہہ کی ہے کہ آدم کو اس لئے خلیفہ نہیں کہا گیا کہ ان سے پہلے فرشتے بستے تھے اور انہوں نے انکی جگہ لے لی بلکہ اس لئے کہ ان سے پہلے دنیا پر جن بستے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ہموار زمین سے پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا اور آدم کو انکی جگہ رکھا (ابن کثیر بحوالہ ابن جریر عن ابن عباس) بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ سے مراد ایسا وجود ہے جس کے نائب آیندہ پیدا ہوتے رہیں۔ پس اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً سے مُراد آدم ان معنوں میں ہیں کہ انکی نسل اس دنیا پر پھیلنے والی تھی (فتح البیان) اس صورت میں خلیفہ بمعنے اسم مفعول ہو گا جیسے کہ ذَبِيْحَةٌ بمعنے مَذْبُوْحٌ آتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مُراد نسلِ انسانی ہے

نہ آدم چنانچہ اسکی تائید میں بعض نے اس آیت کی یہ قرأت بھی نقل کی ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْقَۃً یعنی میں زمین میں ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں (عن زید ابن علی۔ قرطبی جلد اوّل) اور بعض نے اس خیال کی بنیاد قرآن کریم کی اس آیت پر رکھی ہے۔ ھُوَالَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (فاطر ع ۵) خدا ہی ہے جس نے تم کو دنیا میں ایک دوسرے کے بعد اسکی جگہ لینے والا بنایا ہے قتادہ نے بھی یہی مراد لی ہے کہ اس جگہ خلیفہ سے مُراد نسل انسانی ہے وہ کہتے ہیں فَکَانَ فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ اَنَّہٗ تَکُوْنُ فِیْ تِلْکَ الْخَلِیْفَۃِ اَنْبِیَآءُ وَرُسُلٌ وَقَوْمٌ صَالِحُوْنَ وَسَاکِنُوا الْجَنَّۃِ (ابن کثیر) یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس خلیفہ کے وجود میں نبی بھی ہونگے اور رسول بھی اور صلحاء کی جماعت بھی اور جنت کے بسنے والے بھی۔ اس فقرے سے ظاہر ہے کہ قتادہ کے نزدیک خلیفہ سے آدم کے وجود کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا بلکہ انکی نسل کے کاملین کی طرف یہ قائلین اپنے دعویٰ کی تائید میں اس بات سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ فرشتوں نے جو یہ کہا ہے کہ کیا تو اسے پیدا کرے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا یہ بتاتا ہے کہ خلیفہ سے مراد آدم نہیں بلکہ بنی نوع انسان ہیں کیونکہ آدم نے نہ خون بہانا تھا اور نہ فساد کرنا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض نے کہا ہے کہ خلیفہ سے مُراد آدم ہیں کیونکہ خلیفہ اسے کہتے ہیں کہ جو کسی کی نیابت میں احکام و اوامر کو جاری کرے پس چونکہ آدم خدا تعالےٰ کے نبی ہونے والے تھے اور اسکے احکام کو دُنیا میں جاری کرنے والے تھے ان کا نام خلیفہ رکھا گیا۔

میرے نزدیک بھی خلیفہ کا لفظ اسی لئے استعمال ہوا ہے کہ آدم خدا تعالےٰ کے احکام و مناہی کو دُنیا میں جاری کرنے والے تھے اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب دُنیا میں خدا تعالیٰ کا ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ یہ کہنا کہ آدم سے پہلے فرشتے دنیا پر رہتے تھے ایک بے ثبوت قول ہے اور یہ کہ جن پہلے رہتے تھے جو بشر کے سوا کوئی اور مخلوق تھی ویسا ہی بے ثبوت قول ہے اور اسکی وجہ سے آدم یا اسکی نسل کو خلیفہ کہنا بھی بے معنی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اسکی مخلوق کب سے چلی آرہی ہے اگر خلیفہ کے لفظ سے بعد میں آنے والی کسی دوسری جنس کی مخلوق مراد لی جائے تو ہر مخلوق ہی خلیفہ کہلانی چاہیئے کیونکہ وہ اپنے سے پہلے کسی اور مخلوق کی قائم مقام ہو گی کیونکہ خدا تعالیٰ کی صفت خلق کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ صرف چند ہزار سال یا چند لاکھ سے جاری ہوئی ہے اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔

میرے نزدیک یہ بھی درست نہیں کہ خلیفہ سے مُراد اس جگہ آدم کی ذریت ہے کیونکہ قرآن کریم میں جہاں قوموں کی نسبت خلیفہ کا لفظ آیا ہے جمع کی شکل میں آیا ہے چنانچہ سورۂ انعام میں ہے وَھُوَالَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (ع ٢٠) اور سورۂ فاطر میں ہے ھُوَالَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (ع ۵) اور سورۂ یونس میں ہے ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (ع ٢) اور پھر سورہ یونس میں ہے وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰٓئِفَ (ع ٨) اسی طرح سورہ اعراف میں دو جگہ ہے وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ (اعراف ع ٩ و ١٠) پھر سورۂ نمل میں ہے وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (ع ۵) ان حوالوں سے ثابت ہے کہ قرآن کریم نے جب کسی قوم کے خلیفہ ہونے کا ذکر کیا ہے جمع کے لفظ سے کیا ہے اس لئے کہ قوم بہت سے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر فرد اپنی قسم کے فرد کا خلیفہ ہوتا ہے۔ پس جب تک کوئی خاص غرض نہ ہو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے لئے مفرد لفظ کا استعمال ہو اس کے برخلاف قرآن کریم میں جہاں ایک شخص کے خلیفہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں لفظ خلیفہ مفرد استعمال کیا ہے مثلاً حضرت داؤد کی نسبت آتا ہے اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ (ص ع ٢) پس ان حوالجات سے یہی استنباط ہوتا ہے کہ آیت زیر تفسیر میں بھی خلیفہ سے مراد حضرت آدم ہیں نہ کہ بنی نوع انسان۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر خلیفہ سے اس جگہ مراد حضرت آدم

آیت اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں خلیفہ سے مُراد۔

خلیفہ سے مراد بنی نوع انسان نہیں بلکہ آدم ہیں

ہیں تو پھر فرشتوں نے یہ کیوں کہا کہ وہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ سو اس کا جواب آیت کے اس ٹکڑہ کے ماتحت دیا جائے گا۔

آیت اِنِّی جَاعِلٌ کا تعلق پہلی آیات سے

اب میں آیت کی تفسیر بیان کرتا ہوں اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں قرآن کریم کی نسبت یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جو دُنیا کی ہدایت کے لئے آیا ہے اس دعویٰ پر چونکہ کفار کو اعتراض تھا جیسا کہ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا کی آیت میں بتایا گیا تھا اس کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ حضرت آدم کو پیش کرتا ہے تا یہ بتائے کہ الہام الٰہی کا نزول کوئی نئی شئے نہیں بلکہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ سب سے پہلا انسان آدم تھا اور اسکی پیدائش کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کا الہام نازل ہوا پس الہام اور وحی پر شبہ کرنا کوئی معقول بات نہیں اگر اللہ نے ابتدار آفرینش میں الہام اور وحی نازل کی تو اب کیوں نہ کرے غرض وحی کے ابتداءِ آفرینش سے متواتر نازل ہونے کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ وہ دلیل ہے جو سب مذاہب کے ماننے والوں پر حجت ہے کیونکہ تمام مذاہب کیا ہندو کیا زردشتی اور کیا یہود و نصاریٰ ابتدار آفرینش میں وحی کے نزول کے مصدّق ہیں پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے ذکر کے بعد آدم اور اسکی وحی کو پیش کیا۔ تا بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ شروع سے ہی اسے ہدایت دیتا چلا آیا ہے۔

حضرت آدم کی بعثت پر فرشتوں کے مکالمہ کا مطلب

آیت زیر تفسیر کو اِذْ کے لفظ سے شروع کیا گیا ہے جو ماضی پر دلالت کرتا ہے اس سے پہلے ایک فعل محذوف ہے جو اُذْكُرُوْا ہے یعنی یاد کرو جس کا استدلال اِذْ کے لفظ سے ہوتا ہے [illegible] مطلب یہ ہے کہ اے لوگو آ[illegible]م کے واقعہ کو یاد کرو کہ اسکی پیدائش کے وقت خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے اس اس طرح کلام کیا تھا فرشتوں کے اس مکالمہ سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبی کی بعثت سے پہلے اس کی ضرورت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔ کیونکہ نبی کا وجود خدا تعالیٰ کے غیبوں میں سے ایک غیب ہوتا ہے اسکی ضرورت کلّی طور پر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ ظاہر ہو کر اپنا کام پورا کر لیتا ہے تب ان تغیرات کی وجہ سے جو اس کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں لوگوں کو ماننا پڑتا ہے کہ اگر وہ ظاہر نہ ہوتا تو دُنیا ایک عظیم الشان اور مفید انقلاب سے محروم رہ جاتی پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عظیم الشان انقلابات پیدا کرنے والے ہیں ان کا اندازہ اسی وقت ہو سکے گا جبکہ وہ اپنی خدا داد قابلیتوں کو ظاہر کر چکیں گے اس سے پہلے ان انقلابات کا تصور بھی لوگوں کے لئے مشکل ہے جس بات کو خدا تعالیٰ کے مقرب فرشتے بھی نہ سمجھ سکیں جاہل انسانوں نے اسے کیا سمجھنا ہے پس چاہیئے کہ انتظار کرو اور اس کے کام کے نتیجہ کو دیکھو اور انکار میں جلدی نہ کرو۔ اس مضمون کو دوسری جگہ پر قرآن کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (النحل ع۱) یعنی خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ تغیرات کا زمانہ نزدیک آ پہنچا ہے پس اسے جلد دیکھنے کی خواہش نہ کرو کہ وہ اپنے وقت میں ظاہر ہوگا اور دُنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہے اور لوگوں کے شرک سے بہت بلند ہے۔

خدا تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ ملائکہ کو اپنا کلام دیکر اپنے پسندیدہ بندوں پر نازل کیا کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ لوگوں کو ہوشیار کر دو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں پس میرا تقویٰ اختیار کریں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء خدا تعالیٰ کی توحید کے قیام کے لئے اور اسکی طرف لوگوں کو لانے کے لئے آتے ہیں مگر اس وقت کے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس مقصد میں جو بظاہر بالکل خلاف عقل نظر آتا ہے کامیاب ہونگے مگر آخر وہ کامیاب ہو جاتے

ہیں اور دُنیا حیران رہ جاتی ہے اور پھر ایک دفعہ دُنیا پر خدا تعالیٰ کی بادشاہت قائم ہو جاتی ہے اور توحید کا دور دورہ ہو جاتا ہے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت کا دعویٰ کیا کون کہہ سکتا تھا کہ آپؐ عرب سے ہی نہیں بلکہ سب دُنیا سے شرک کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کر پھینک دیں گے دعویٰ کی ابتداء میں یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آ سکتی تھی مگر جب آپؐ نے یہ کام ختم کر لیا تو ہر ایک کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ انقلاب پیدا ہو گیا۔

غرض آدم کے واقعہ کے ذکر میں فرشتوں کے مکالمہ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بد اور ادنیٰ لوگ تو الگ رہے نیک اور ملائکہ صفت لوگ بھی نبی کے نزول کے وقت اس انقلاب عظیم کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے جو اس کے ذریعہ سے ہونے والا ہے پس شرافت یہ ہے کہ انسان اگر مان نہیں سکتا تو کم سے کم قبل از وقت مخالفت تو نہ کرے اور اس دن کا انتظار کرے جب وہ اپنا کام کر چکے اگر وہ سچا ہے تو خود ہی اس کے کام سے اسکی سچائی ظاہر ہو جائے گی اور اگر جھوٹا ہے تو اس کا کام اس کے جھوٹا ہونے کا شاہد ہو گا۔

آدم کے واقعہ میں فرشتوں کے مکالمہ کو ذکر کرنے سے نبی کے وقت کے لوگوں کو ایک نصیحت

ایک دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں فرعون کی قوم کے ایک فرد کی زبانی اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے وَاِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ (مومن ع ۴) یعنی اگر موسیٰ جھوٹے ہیں تو تم کو جوش دکھانے کی کیا وجہ ہے خود ہی ان کا جھوٹ ان کو تباہ کر دے گا اور اگر سچے ہیں تو اس مخالفت کی وجہ سے تم کو خدا تعالیٰ کا عذاب پکڑ لے گا۔

حضرت آدم کے ذکر کے ساتھ ملائکہ کا ذکر کرنے کی ایک خاص وجہ

ایک دوسری غرض اس جگہ ملائکہ کا ذکر کرنے کی یہ ہے کہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے اور سب مذاہب اس کے کسی نہ کسی رنگ میں مصدق ہیں کہ اس دُنیا کا کارخانہ ملائکہ کے توسط سے چلایا جاتا ہے مختلف ملائکہ دنیا کے مختلف کاموں پر مقرر ہیں کوئی موت کا فرشتہ ہے کوئی سیاروں کی گردش وغیرہ کا نگران ہے اور کسی کے سپرد نظامِ عالم میں بارش کا انتظام ہے اسکی تفصیل آگے آئے گی اس جگہ پر اسی قدر ذکر کافی ہے پس فرشتوں کو آدم کے خلیفہ بنانے کی خبر دینے سے اور انہیں اسکی پیدائش پر سجدہ کرنے سے یہ مُراد ہے کہ جب کوئی نبی دُنیا میں ظاہر ہوتا ہے ملائکہ کو جو نظام عالم کے مدبّر ہیں اسکی مدد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اس لئے باوجود سب دُنیا کی مخالفت کے نبی جیتتا ہے کیونکہ سب نظام عالم بوجہ اسکے کہ نظام کے مدبّروں کو اس کی تائید کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں ہوتا ہے چنانچہ انبیاء کی زندگی میں اسکی ناقابل انکار مثالیں پائی جاتی ہیں طوفان کے وقت حضرت نوحؑ کا محفوظ رہنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دشمنوں کا آگ میں ڈالنے کی کوشش کرنا لیکن باوجود کوشش کے آگ کا نہ جلنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمندر میں سے گذرنے کے وقت انکی قوم کا بچ جانا لیکن فرعون کی فوج کے سمندر میں داخل ہوتے ہی طوفان کا آجانا اور پانی کا زمین پر چڑھ جانا۔ اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب پر لٹکائے جانے کے وقت آندھی کا آنا اور یہود کے عقیدہ کے مطابق کہ سبت کے دن کوئی شخص صلیب پر نہ لٹکا رہے ان کا چند گھنٹوں میں صلیب پر سے اُتار لیا جانا اور صلیبی موت سے محفوظ رہنا۔ رامچندر جی کا باوجود اکیلے ہونے اور دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہونے کے راون پر فتح پانا کرشن جی کا زبردست دشمنوں کے مقابلہ پر جبکہ ان کے ساتھی بھی چھوڑ رہے تھے فتح پانا۔ زردشت کا زبردست مخالفتوں کے باوجود کامیاب ہونا اور ان سب سے آخر لیکن شان کے لحاظ سے سب سے شاندار طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تنِ تنہا سارے عرب کا مقابلہ کرنا اور غیر معمولی سامانوں سے فتح پانا یہ سب ایسے واقعات ہیں کہ کوئی اندھا ہی ان کے غیر معمولی ہونے سے انکار کر سکتا ہے اور یہ سب واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ جب کوئی نبی دُنیا میں مبعوث ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نظام عالم کو اسکی تائید میں لگا دیتا ہے اور چونکہ نظام عالم ملائکہ کے ماتحت ہے اللہ تعالیٰ نبی کے مبعوث کرنے سے پہلے انہیں اپنے ارادہ سے مطلع کر دیتا

ہے اور اسی کی طرف وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے الفاظ میں اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ آدم کی بعثت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اسکی بعثت کے بارہ میں اطلاع دے دی تھی اور وہ اسکی تائید میں لگ گئے تھے جسکی وجہ سے ان کے دشمن باوجود عارضی طور پر ان کے مقابلہ میں کامیاب ہوجانے کے آخر ناکام رہے۔ اور آدم علیہ السلام اس مقصد میں کامیاب ہوگئے جس کے پورا کرنے کے لئے انہیں مبعوث کیا گیا تھا اور ساتھ ہی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس وقت بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں ملائکہ کو لگا دیا گیا ہے جو دُنیا میں ایسے تغیرات پیدا کرینگے جنکی وجہ سے باوجود شدید مخالفت کے اور دشمنوں کے قوی ہونے کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر کامیاب ہو کر رہیں گے۔

آدم کی بعثت پر ملائکہ کو اسکی مدد کا حکم۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم کو اسی دُنیا میں پیدا کیا گیا تھا اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اسی جنت میں رکھا گیا تھا جو مرنے کے بعد انسان کو ملنے والی ہے وہ غلطی پر ہیں تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ میں اس زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہیں جنت میں رکھا گیا تھا اس مشکل کو بعض لوگوں نے بزعم خود اس طرح حل کیا ہے کہ پہلے اسی دُنیا میں پیدا کیا پھر انکو جنت میں لےجایا گیا لیکن یہ آیت اس توجیہ کی بھی اجازت نہیں دیتی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً میں اسی دُنیا میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں خلیفہ کے مقرر کرنیکی کوئی غرض ہوگی پھر اسے جنت میں لیجانے سے وہ غرض کس طرح پوری ہوسکتی تھی یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص مقصد کے لئے آدمؑ کو اس دنیا میں خلیفہ مقرر کرے اور پھر اسے جنت میں لیجائے جہاں وہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا آدمؑ کو جنت میں لیجانے کے بعد اس مقصد کو دنیا میں کون پورا کرتا جس کے لئے آدم کو خلیفہ مقرر کیا گیا تھا؟ قرآن کریم کی دوسری آیات بھی اس خیال کو رد کرتی ہیں مثلاً فرماتا ہے لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ (طور ع) یعنی جنت میں نہ کوئی لغویات ہوں گی اور نہ ایک دوسرے کے خلاف گناہ کا الزام لگایا جائیگا یعنی سب غلطیوں سے پاک ہونگے لیکن جس جنت میں آدم علیہ السلام رکھے گئے تھے اس میں تو شیطان بھی داخل ہوا اور اس نے آدم علیہ السلام سے ایک ایسا کام کروایا جو منشائے الٰہی کے خلاف تھا پھر جنت کی نسبت تو آتا ہے کہ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ (حجر ع) کہ اس جنت میں لوگوں کو نہ کسی قسم کی تکان ہوگی اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائینگے مگر آدمؑ تو اس جنت میں سے جس میں وہ رکھے گئے تھے نکالے گئے اسی طرح اس جنت کے متعلق جو مرنے کے بعد ملنے والی ہے فرماتا ہے کہ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰم سجدہ ع ۴) جو تم طلب کروگے تمہیں ملے گا۔ مگر آدم جس جنت میں رکھے گئے اس میں تو انکی خواہش کے پورا کرنے پر یعنی شجرہ کے پاس جانے پر انہیں جنت میں سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد ملنے والی جنت کے بارہ میں تو آتا ہے کہ اس میں داخل ہونے والے لوگ کہیں گے نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ (زمر ع) اس جنت میں ہم جہاں چاہیں جاسکتے ہیں لیکن آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رکھا گیا اس کے بارہ میں آتا ہے کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (بقرہ ع ۴) اس فلاں درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ غرض قرآن کریم میں مرنے کے بعد ملنے والی جنت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس نقشہ سے بالکل مخالف ہے جو اس جنت کا بتایا گیا ہے جس میں آدم علیہ السلام کو رکھا گیا تھا پس آدم کی جنت اسی دُنیا کا کوئی مقام تھا کیونکہ آدم علیہ السلام اسی دُنیا کے لوگوں کے لئے خلیفہ مقرر کئے گئے تھے اور تاموت اسی میں ان کا رہنا ضروری تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت اسی دنیا کی جنت تھی۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ (۱) خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا۔ کیا اللہ تعالیٰ ملائکہ کے مشورہ کا محتاج ہے (۲) فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کیا کہ انسان تو فساد کریگا پھر اسے پیدا کرنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا ملائکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرسکتے ہیں (۳) ملائکہ کی بات درست نکلی کہ آدم کی نسل نے دنیا میں فساد کیا اور خدا تعالیٰ کا فعل

قابلِ اعتراض ٹھہرا۔

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قَالَ کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے ضروری نہیں کہ اس کے معنے یہ ہوں کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں اور انسانوں کی کوئی مجلس بُلائی تھی اور فرشتوں سے کوئی بات کی تھی اور انہوں نے اس کے بارہ میں کوئی جواب دیا تھا بلکہ جیسا کہ حلِ لغات میں بتایا جا چکا ہے۔ قَالَ کے معنی صرف زبان سے بولنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ علاوہ بولنے کے دل میں خیال آنے کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ مفردات راغب میں لکھا ہے۔ یُقَالُ لِلْمُتَصَوَّرِ فِی النَّفْسِ قَبْلَ الْاِبْرَازِ بِاللَّفْظِ قَوْلٌ یعنی دل میں کسی خیال کا آنا بھی خواہ اسے الفاظ میں ادا نہ کیا جائے قول کہلاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں فِیْ نَفْسِیْ قَوْلٌ لَمْ اُبْرِزْہُ۔ میرے دل میں ایک بات ہے جو میں نے بتائی نہیں۔ قرآن کریم میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے فرماتا ہے۔ وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوْلُ (مجادلہ ع۲) یعنی منافق اپنے دلوں میں خیال کرتے ہیں کہ اگر محمد رسول اللہ سچے ہیں تو پھر ہماری باتوں کی وجہ سے جو ہم ان کے بارہ میں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب میں کیوں مبتلا نہیں کرتا۔ اسی طرح اس کے معنی عقائد کے بھی ہیں چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ یَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ یعنی فلاں شخص حضرت ابو حنیفہ کے عقیدہ کے مطابق عقیدہ رکھتا ہے۔ نیز قول عملی دلالت کے معنے بھی دیتا ہے یعنی ایسی چیز کی نسبت بھی جو بول ہی نہیں سکتی قول کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ وہ اپنی حالت سے کسی امر کا اظہار کرے چنانچہ عرب کا محاورہ ہے اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ حوض بھر گیا اور اس نے کہا کہ بس بس اب زیادہ پانی نہ ڈالو قرآن کریم میں یہ بھی محاورہ استعمال ہوا ہے چنانچہ زمین و آسمان کی نسبت آتا ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (حٰمٓ سجدہ ع۲) یعنی پھر اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف جبکہ وہ ابھی دخانی حالت میں تھا متوجہ ہوا اور اسے کہا اور زمین کی طرف بھی کہ وہ بھی اسی حالت میں تھی متوجہ ہوا اور کہا کہ چاہو تو مرضی سے اور چاہو تو مجبوری سے میرے احکام کی فرمانبرداری کرو اس پر ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی مرضی سے تیری فرمانبرداری کریں گے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ کا قول بھی تسخیر کے معنوں میں ہے یعنی خدا تعالیٰ نے انہیں ایسا بنایا کہ ان کے بعض حصے اپنی مرضی سے فرمانبردار ہیں اور بعض جیسے انسانوں کا ایک حصہ کہ جبر سے فرمانبرداری کرتے ہیں اور آسمان و زمین کا جواب جو بیان کیا ہے وہ بھی اس کی حالت کا بیان ہے نہ یہ کہ واقعہ میں وہ زبان سے بولے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی حالت سے یہ بتایا کہ وہ خوشی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے یعنی وہ کلّی طور پر خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے فرمانبردار ہیں۔ دوسرے حصہ میں جو صرف طَآئِعِیْنَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو حصہ ناخوشی سے خدائی قانون کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ خوشی سے فرمانبرداری کرنے والے حصہ کے مقابل پر تھوڑا ہے اور یا یہ کہ دوسرے کا ذکر محذوف ہے۔ اور یہ عربی کا عام قاعدہ ہے جو قرآن کریم میں بھی متعدد جگہ پر استعمال ہوا ہے کہ بات کا ایک حصہ محذوف کر دیا جاتا ہے اور جملہ کی بناوٹ کی دلالت کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَجَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ (نحل ع۱۱) ہم نے تمہارے لئے ایسی قمیصیں یا لباس بنائے ہیں جو تم کو گرمی سے بچاتے ہیں اس جگہ سردی سے بچانے کے ذکر کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ گرمی کے لباس کے ذکر میں خود ہی آ گیا ہے۔ زبانِ حال سے کسی حقیقت کے اظہار کے لئے قول کی طرح اور الفاظ بھی عربی میں استعمال ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً قرآن کریم میں آتا ہے فَوَجَدَا فِیْھَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَہٗ (کہف ع۱۰) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کا

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ پر تین اعتراض اور ان کے جوابات

لفظ قَالَ کا استعمال

ارادہ کر رہی تھی۔ اسپر حضرت موسیٰ کے ساتھی نے اسکی مرمت
کر دی۔ اس جگہ دیوار کی نسبت آتا ہے کہ وہ گرنے کا ارادہ کر
رہی تھی اور مراد یہ ہے کہ اسکی حالت بتاتی تھی کہ وہ گرنے والی
ہے۔ امام ابو منصور الثعالبی اپنی کتاب فقہ اللغۃ میں لکھتے ہیں
مِنْ سُنَنِ الْعَرَبِ اَنْ تُعَبِّرَ عَنِ الْجَمَادِ بِفِعْلِ
الْاِنْسَانِ کَمَا قَالَ الرَّاجِزُ اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ فَقَالَ
قَطْنِیْ یعنی عربی کا محاورہ ہے کہ کبھی بے جانوں کی نسبت انسانوں
جیسے افعال کو منسوب کر دیتے ہیں جیسے راجز نے کہا ہے کہ
اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ فَقَالَ قَطْنِیْ (فقہ اللغۃ صفحہ ۲۳۲) خلاصہ
یہ کہ قول کا لفظ اور اسی قسم کے اور الفاظ جو انسانوں کے
لئے آتے ہیں کبھی حالت کے بتانے کے لئے عربی میں غیر ذی
رُوح اشیاء کی نسبت بھی بول دئے جاتے ہیں اور مراد صرف
یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے زبانِ حال سے یُوں ظاہر کیا۔

اس تمہید سے میرا یہ منشاء ہے کہ اس آیت میں اور بعد
کی آیات میں جو سوال و جواب کا ذکر ہُوا ہے ضروری نہیں
کہ اسی طرح سوال و جواب ہُوا ہو بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے
ہیں کہ ہر اک چیز نے اپنی اپنی حالت کے مطابق خدا تعالیٰ کے
حکم کا جو جواب دیا وہ الفاظ میں اس طرح ادا ہو سکتا ہے
جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں فرشتوں نے اپنے عمل سے
جواب دیا۔ ابلیس نے اپنی حالت کو پیش کیا اور دوسری اشیاء
نے اپنی حالتوں سے اس کا جواب دیا نہ کہ الفاظ میں اور بول کر
اس طرح کہا۔ اردو زبان کا بھی محاورہ ہے کہ انتڑیاں قُلْ
هُوَ اللّٰهُ پڑھ رہی ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ بھوک کی
شدت کی وجہ سے پیٹ اپنے عجز کا اظہار کر رہا ہے اور اپنی
حالت سے ظاہر کر رہا ہے کہ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی
کام آتا ہے۔

فرشتوں کا مکالمہ زبانِ حال کا مکالمہ ہے

اس تمہید کے بعد میں بتاتا ہوں کہ جو
کچھ اس آیت میں بیان ہُوا ہے یا تو وہ اوپر
کی تمہید کے مطابق زبانِ حال کا ایک مکالمہ ہے
لیکن اگر اسے زبانِ حال کا مکالمہ نہ کہا جائے
اور میرا ذاتی رُجحان اس طرف ہے کہ اس آیت میں جو کچھ ملائکہ
کے متعلق کہا گیا ہے وہ بذریعہ الہام گزرا ہے صرف زبانِ
حال کا محاورہ نہیں تو پھر جو کچھ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا وُہ
بطور فیصلہ سُنانے کے تھا مشورہ نہ تھا۔ اور الفاظ قرآنیہ اس
امر پر دلالت کر رہے ہیں۔ آیت کا کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے
معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کچھ پوچھا ہے بلکہ الفاظ
بالوضاحت بتا رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ کہا
کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں پھر نہ معلوم
معترضین نے مشورہ کا مفہوم کہاں سے نکال لیا۔ ہاں یہ
بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سوال کرنے کی
اجازت دی ہے کیونکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے فرشتوں کو اس
امر کے بتانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں آدم
کی تائید میں لگ جائیں اور جس کے سپرد کوئی کام کیا جاوے
اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اُسے اچھی طرح سمجھ بھی لے
پس انہوں نے سمجھنے کے لئے یہ سوال کیا ہے کہ الٰہی کیا آپ
کوئی ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو فساد کریگی اور خون
بہائے گی اور یہ سوال ان کا خلیفہ کے لفظ سے استدلال
کر کے ہے جس کے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایسے وجود
کے ہیں جو نظام قائم کرے اور نیکوں کو انعام اور بدوں
کو سزا دے اور ظاہر ہے کہ ہر سوال اعتراض کے طور پر
نہیں ہوتا بلکہ بعض سوال زیادتی علم کے لئے ہوتے ہیں ہر
روز اس دُنیا میں افسر ماتحتوں کو جب حکم دیتے ہیں تو وہ
سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا یہ فعل اعتراض نہیں
کہلاتا۔

تعجب ہے کہ فرشتے تو ادب کے طور پر فوراً سوال کے
ساتھ ہی کہہ دیتے ہیں کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ
وَنُقَدِّسُ لَكَ لیکن متعصب معترض پھر بھی انکے سوال
کو اعتراض قرار دیتا ہے جو شخص بات کے ساتھ ہی کہہ دے
کہ ہم تجھے سب نقصوں سے پاک اور سب خوبیوں کا جامع
سمجھتے ہیں اس کے سوال کو اعتراض کس طرح کہا جا سکتا ہے

اس فقرہ سے تو انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ ہمارا سوال زیادتیٔ علم کے لئے ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کی نیت سے۔

ہاں ایک اور پہلو بھی اس آیت کا ہے جس کے رُو سے اُسے اعتراض بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح آدم خدا تعالیٰ کا نائب تھا اسی طرح بعض اور وجود بشروں میں سے ایسے تھے جو ملائکہ کے نائب تھے اور ظلّی طور پر ملائکہ کہلا سکتے تھے اگر ایسے وجود نہ ہوتے اور صرف آدم کا دماغ ہی ترقّی یافتہ ہوتا تو شریعت کا نزول عبث رہتا ایسے وجودوں کے دِلوں میں یہ بات بطور اعتراض کے پیدا ہو سکتی تھی کہ جب وہ خدا تعالیٰ کی عبادت اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق کر رہے ہیں تو پھر کسی شریعت لانے والے انسان کی کیا ضرورت ہے پس ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں ایسے لوگوں کے دلی خیالات کا بھی جواب دیا گیا ہو اور اِس صورت میں اسے اعتراض قرار دینے میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اس وقت کے ظاہری تقویٰ شعار لوگوں کے دِلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے پھر جو تقویٰ کے اصلی مقام پر ہوتے ہیں وہ تو اپنی غلطی کو سمجھ جاتے ہیں اور وقت کے امام کو مان لیتے ہیں لیکن جن کا تقویٰ کامل نہیں ہوتا وہ ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور آخر ملائکہ کی صف سے نکل کر ابلیسوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں یہ نظارہ بھی ہر نبی کے زمانہ میں نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایک شخص زید نامی کا ہمیں پتہ ملتا ہے جو اپنے آپکو ابراہیمی دین پر کہتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں شرک کے خلاف لیکچر دیتا پھرتا تھا ایک دفعہ اس شخص کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا موقعہ ملا تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ میں مشرکوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تو کبھی شرک نہیں کیا۔ جب آپ نے دعویٰ کیا تو اس شخص کو ایمان لانے کی توفیق نہ ملی کیونکہ اس نے کہا کہ اگر خدا تعالیٰ نے نبی بنانا ہوتا تو مجھے بناتا جس نے اس قدر شرک کے خلاف جہاد کیا ہے (بخاری جلد دوم مناقب الانصار و سیرت ابن ہشام جلد اوّل) یہ شخص بعثت نبوی سے پہلے گویا عربوں میں ایک فرشتہ کا رنگ رکھتا تھا مگر اس کے دل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے گریز کیا اور آپ کی بعثت کو لغو قرار دیا اور ایمان سے محروم رہ گیا ایسے وجود ہر نبی کے زمانہ میں ہوتے ہیں اور باوجود ملائکہ کے اظلال ہونے کے نبی کی بعثت پر اعتراض کر کے ابلیس بن جاتے ہیں۔

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا الخ کے الفاظ سے فرشتوں کا اعتراض کرنا زیادتیٔ علم کے لئے تھا

باقی رہا تیسرا سوال کہ جو فرشتوں نے کہا وہ پورا ہُوا اور خدا تعالیٰ کا مقصد پورا نہ ہُوا۔ یہ بھی ناسمجھی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے کب کہا کہ انسانوں میں فساد اور سفکِ دِماء نہیں ہوگا یہ مضمون تو خلیفہ کے لفظ سے ہی ظاہر تھا۔ اللہ تعالیٰ تو صرف یہ فرماتا ہے کہ باوجود اسکے کہ آدم کے خلیفہ ہونے کے معنے ہی یہ ہیں کہ اب انسانی افعال شریعت کے تابع ہو گئے اور اس کے افعال آئندہ فساد اور سفکِ دم کہلائیں گے پھر بھی انسان کی پیدائش ایک ایسی غرض کو پورا کریگی جو کوئی دوسری مخلوق پورا نہیں کر سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی اس بات کو رَدّ نہیں کرتا کہ انسان سے فساد و خون کا ظہور ہوگا بلکہ صرف یہ فرماتا ہے کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ یعنی آدم کے ذریعہ سے ایک نئے نظام میں جو غرض پوشیدہ ہے وہ باوجود فساد اور سفکِ دم کے ایسی اہم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظِ آیت کو معترض غور سے دیکھیں تو یہاں یہ نہیں کہا کہ جو تم جاننے کا دعویٰ کرتے ہو غلط ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ جو تم نہیں جانتے اسے میں جانتا ہوں پس فرشتوں کے قول کو رَدّ نہیں کیا بلکہ اس سے زائد امور کی طرف اشارہ کیا ہے جو فرشتوں کے شبہ کے درست ہونے کے باوجود انسان کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ کی بات ہی پوری ہوئی۔ اور فرشتوں نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب انہیں مل گیا۔

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا الخ کے الفاظ کو اعتراض قرار دیتے ہوئے آیت کا مطلب۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کے متعلق سوال یہ ہے کہ یہ آدم کی نسبت ہے یا ان انسانوں کی نسبت جن سے اس کا واسطہ پڑنا تھا یا اسکی آیندہ نسل کی نسبت۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فقرہ سب ہی کی نسبت ہے آدم کی نسبت اس طرح کہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں اور ان کے ذریعہ سے انسان کو شریعت کا تابع کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص نظام کا افسر مقرر کیا جائے اسے نظام کی حرمت کے قیام کے لئے کبھی لوگوں کو قید بھی کرنا پڑتا ہے اور کبھی قاتلوں کو قتل بھی کرنا پڑتا ہے اور کبھی جبراً ٹیکس بھی وصول کرنے پڑتے ہیں اور یہ بظاہر فساد نظر آتا ہے کیونکہ بعض لوگ جو نظام کے فوائد کو نہیں سمجھتے وہ حیران ہوتے ہیں کہ دوسروں کا مال جبراً لینا کس طرح جائز ہے اور آزاد کو قید کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے اور کسی شخص کو قتل کر دینا کیونکر حلال ہو سکتا ہے حالانکہ حکومت کے لئے ان سب امور پر عمل کرنا ضروری ہے۔ حکومت ٹیکس لینے اور مجرموں کو قید اور قاتلوں کو قتل کرنے کے بغیر امن قائم ہی نہیں کر سکتی اور نظام کی خوبیاں جو فردی آزادی سے بدرجہا زیادہ فوائد انسانوں کو پہنچاتی ہیں ظاہر نہیں ہو سکتیں پس پہلی دفعہ نظام کے قیام کے اعلان پر فرشتوں نے اس بات کو عجیب دیکھا کہ اب ایک شخص مقرر کیا جائے گا جسے قید کرنے اور قتل کرنے اور لوگوں سے طوعاً یا کرہاً ان کے اموال کا ایک حصہ لینے کا حق ہوگا اور انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے علم کی زیادتی کے لئے سوال کیا کہ یہ نظام کس رنگ میں زیادہ بہتر اور زیادہ مفید ہوگا؟ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا کہ یہ امر ابھی تم نہیں سمجھ سکتے یہ نظام جس وقت مکمل ہوگا اس کے نتیجہ میں ایسے اعلیٰ درجہ کے انسان پیدا ہونگے کہ اس سے پہلے موجود نہ تھے اور بنی نوع بشر کو وہ فائدہ پہنچے گا جو اب تک انہیں نہیں پہنچا تھا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا الخ کے فقرہ میں بیان کردہ امر آدم اور انکی نسل ہر دو کی نسبت ہے

اور اس سے مراد آدم کے مخاطبین بھی ہو سکتے ہیں اور آیندہ نسل بھی کیونکہ شریعت ہی انسان کو گنہ گار قرار دیتی ہے شیر انسانوں اور دوسرے جانوروں کو کھاتا ہے سانپ جانوروں اور انسانوں کو ڈستا ہے لیکن نہ شیر کو اور نہ سانپ کو مفسد قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ عقل سے عاری ہیں اور شریعت کے تابع نہیں۔ مگر آدم علیہ السلام کو خلیفہ مقرر کرنے کے یہ معنے تھے کہ بشر اب ایسی عقل کو حاصل کر چکا تھا کہ شریعت کے تابع ہو اس لئے خدا تعالیٰ نے اسے آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے حکم دیا کہ آیندہ کسی دوسرے انسان کو مت مارو اور اگر تمہارے کسی شخص کو کوئی مارے تو اُسے بھی خود قتل نہ کرو بلکہ حکومت سے اپنے نقصان کی تلافی چاہو پس اس حکم کے بعد کوئی بشر اگر کسی دوسرے بشر کو قتل کرے تو وہ مفسد اور قاتل کہلائے گا اس سے پہلے اس کا فعل اسے مفسد اور قاتل نہیں بناتا تھا کیونکہ وہ کسی شریعت کے تابع نہ تھا پس آدم کے خلیفہ قرار دینے پر فرشتوں نے صحیح استدلال کیا کہ بشر جو اس سے پہلے کسی شریعت کے تابع نہ ہونے کے سبب سے اپنے افعال کے جواب دہ نہ تھے آیندہ جواب دہ قرار دئے جائیں گے اور اگر وہ اپنے طبعی تقاضوں کو قانون کے مطابق پورا نہ کریں گے تو مفسد اور قاتل قرار دئے جائیں گے اور وہ پوچھتے ہیں کہ کیا آیندہ بشر بھی اسی طرح خدا تعالیٰ کے منشا پر چلنے کے لئے مجبور کئے جائیں گے جس طرح ملائکہ مجبور ہیں اور انکی طبعی حیوانیت آیندہ قانونِ شریعت کے تابع کر دی جائیگی یہ استدلال ملائکہ کا بالکل درست تھا اور واقعہ میں ایسا ہی ہونے والا تھا وہ بشر جو آدم کی بعثت سے پہلے عام حیوانوں کی سی ایک حیثیت رکھتا تھا آدم کے ذریعہ سے شریعت سُنکر اور اس پر عمل کر کے اب ملائکہ کے درجہ کو پہنچنے والا تھا اور اسکی مخالفت کر کے سزا کا مستحق بننے والا تھا اور مفسد اور قاتل کہلانے والا تھا۔

یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ انجیل نے بھی اس نکتہ کو پیش کیا ہے لیکن ادھورا پیش کرنے کی وجہ سے مسیحیوں کو اس سے سخت ٹھوکر لگی ہے پولوس کے خط رومیوں میں لکھا ہے۔

"کیونکہ شریعت کے ظاہر ہونے تک گناہ دنیا میں تھا پر جہاں شریعت نہیں گناہ گنا نہیں جاتا" (باب ۵ آیت ۱۳)

اسی طرح لکھا ہے "شریعت قہر کا سبب ہے اس لئے کہ جہاں شریعت نہیں وہاں نافرمانی بھی نہیں" (رومیوں باب ۴ آیت ۱۵) یہ وہی خیال ہے جسے فرشتوں نے پیش کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے تقوٰے کے ماتحت اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ ایسے وجود کا پیدا کرنا ترقّی کے راستہ میں ضرور روک ہو گا بلکہ سوال اور زیادتی علم کی خواہش کی حد تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے لیکن مسیحیت نے اس سے نتیجہ بھی تو دہی نکال لیا اور سمجھ لیا کہ شریعت صرف بطور سزا کے تھی اور مسیح کے ذریعہ سے اسے دُور کر دیا گیا حالانکہ گناہ تو ایک زہر ہے وہ زہر اس لئے نہیں بنتا کہ خدا تعالیٰ نے اسے گناہ قرار دیا ہے بلکہ چونکہ وہ زہر ہے اس لئے خدا تعالیٰ اسے گناہ قرار دیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زہر کا علم دینا زہر کے ضرر کو بڑھاتا نہیں بلکہ اس سے بچنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے بچنے کی ایک راہ کھول دیتا ہے جب تک بچہ میں سمجھ نہیں ہوتی اس کی حرکات کسی گرفت کے ماتحت نہیں ہوتیں اس لئے نہیں کہ وہ بُری نہیں ہوتیں بلکہ اس لئے کہ وہ بُرائی کو ابھی سمجھتا نہیں لیکن جب وہ سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے ہمارا فرض ہوتا ہے کہ اسے کرنے کے قابل اور نہ کرنے کے قابل امور کا علم دیں اور اس کا فرض ہوتا ہے کہ اس علم کے مطابق عمل کرے۔ ہمارا اسے ان امور سے خبردار کرنا ظلم نہیں کہلاتا بلکہ احسان کہلاتا ہے اور حُسن تربیت سمجھا جاتا ہے اسی طرح بشر جب سمجھنے کے قابل ہُوا خدا تعالیٰ نے اسے ان کاموں کا علم دیا جو اس کے کرنے کے تھے اور ان کاموں کا بھی اسے علم دیا جو اس کے کرنے کے قابل نہ تھے یہ اس پر قہر نہ تھا بلکہ احسان اور رحم تھا اس میں شک نہیں کہ اس علم اور اس قابلیت کے بعد ہی وہ مفسد اور قاتل کہلانے کا مستحق ہُوا لیکن جب وہ بُرے کاموں سے بچنے کا اہل ہو گیا تو اسے اس کا علم نہ دینا یقیناً اس پر ظلم ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ ملائکہ کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا شریعت کے نزول کے بعد بشر کی حالت بدل جائیگی پہلے وہ جن افعال کو کرنے کے سبب سے مجرم قرار نہیں دیا جاتا تھا اب انہی افعال کے کرنے کی وجہ سے مجرم قرار دیا جائے گا۔ اور یہ خیال ان کا درست تھا اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کو بعض کاموں کی وجہ سے زبردستی مجرم قرار دینے والا تھا بلکہ اس لئے کہ بشر کا دماغ اب کامل ہو چکا تھا اور وہ بُرے کام اس کے دل پر بُرے اثرات ڈالنے کا موجب ہو سکتے تھے پس خدا تعالیٰ نے آدم کو خلیفہ بنا کر اپنا الہام نازل کرنے کا ارادہ کیا تا بشر اپنے اندر پیدا ہونے والی نئی تبدیلی سے آگاہ ہو جائے اور اپنے مقام کو سمجھنے لگے اور اس اعلیٰ مقام کے حصول کے لئے کوشش کرنے لگے جس کے حاصل کرنے کا اب وہ اہل ہو چکا تھا۔

ملائکہ کے سوال کا خلاصہ

اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ آدم کو خلیفہ بنانے کے موقعہ پر جو کچھ خدا تعالیٰ نے فرمایا وہ بھی درست تھا اور جو فرشتوں نے کہا وہ بھی درست تھا صرف نقطۂ نگہ کا فرق تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر ان صلحاء پر تھی جو آدم کی نسل میں ظاہر ہونے والے تھے اور اس نظام کی خوبیوں پر تھی جو آدم اور اس کے اظلال کے ذریعہ سے دُنیا میں قائم ہونے والا تھا لیکن فرشتوں کی نظر ان بدکاروں پر تھی جو انسانی دماغ کی تکمیل کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا مورد عتاب بننے والے تھے خدا تعالیٰ آدم کی پیدائش میں محمدی جلوہ کو دیکھ رہا تھا اور فرشتے بوجہلی صفات کے ظہور کو دیکھ کر لرزاں و ترساں تھے اور گو یہ درست ہے کہ جو کچھ فرشتوں نے خلافت کے قیام سے سمجھا تھا درست تھا مگر ان کا یہ خوف کہ ایسا نظام دُنیا کے لئے لعنت کا موجب نہ ہو غلط تھا کیونکہ کسی نظام کی خوبی کا اس کے اچھے ثمرات سے اندازہ کیا جاتا ہے نہ کہ اس میں کمزوری دکھانے والوں کے ذریعہ سے اگر کسی اچھے کام کو اس کے درمیانی خطرات کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے تو کوئی ترقی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر بڑا کام اپنے ساتھ خطرات رکھتا ہے ملک کی حفاظت کی خاطر جو جنگ کی جاتی ہے اس میں ہزاروں لاکھوں آدمی مارے جاتے اور زخمی ہوتے ہیں

آدم کو خلیفہ بنانے کے وقت دو مختلف نظریئے۔

طالب علم علم کے سیکھنے میں جانیں ضائع کر دیتے ہیں مگر ان نقصانوں کی وجہ سے نہ ملک کی حفاظت ترک کی جاتی ہے اور نہ علم کا سیکھنا پس گو خلافت کے قیام سے انسانوں کا ایک حصہ مورد سزا بننے والا تھا اور مفسد اور قاتل قرار پانے والا تھا مگر ایک دوسرا حصہ خدا تعالیٰ کا محبوب بننے والا تھا اور فرشتوں سے بھی اُوپر جانے والا تھا وہ کامیاب ہونے والا حصہ ہی انسانی نظام کا موجب تھا اور اس حصہ پر نظر کر کے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انسانی نظام ناکام رہا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس اعلیٰ حصہ کا ایک ایک فرد اس قابل تھا کہ اسکی خاطر اس سارے نظام کو تیار کیا جاتا۔ اسی حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بعض اپنے کامل بندوں سے فرمایا ہے کہ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا (ابن عساکر) اگر تو نہ ہوتا تو ہم دُنیا جہان کے نظام کو ہی پیدا نہ کرتے۔ یہ حدیث قدسی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وارد ہوئی ہے بعض اور کامل وجودوں کو بھی اسی قسم کے الہام ہوئے ہیں پس یہ کامل لوگ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ارادہ ہی حکمت کے مطابق تھا اور فرشتوں کا خدشہ اس کے مقابل پر کوئی وزن نہ رکھتا تھا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اس جملہ میں فرشتوں نے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے ارادہ پر کوئی اعتراض کرتے ہیں اور بتایا ہے کہ ہم تیری تسبیح اور حمد اور تقدیس کرنے والے ہیں ہم یہ سوال صرف حقیقت حال کو سمجھنے کے لئے کرتے ہیں اعتراض کے طور پر نہیں کرتے۔

دوسری الہامی کتب کے خلاف قرآن مجید میں تسبیح کے ساتھ تحمید اور تقدیس کا ذکر کرنے کی وجہ۔

اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ خلیفہ کا وجود خدا تعالیٰ کا ظل ہوتا ہے وہ اس فقرہ سے اس شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تو اپنی طرف سے تیری تسبیح اور تحمید اور تقدیس کرتے ہیں کیا ہماری تسبیح اور تحمید اور تقدیس میں کوئی نقص ہے کہ ایک اور وجود کو پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے جو تیرا ظل ہو اگر یہ معنے لئے جائیں تب بھی فرشتوں کا قول اعتراض نہیں بنتا بلکہ خشیت اللہ کا ایک لطیف اظہار ہے جو مقربین الٰہی کی شان کے عین مطابق ہے۔

اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سوال جو ہم نے کیا ہے زیادتی علم کے لئے ہے ورنہ اجمالی طور پر ہم تیرے ارادے کی تصدیق کرتے ہیں اور چونکہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور ہر خوبی کا مالک ہے ہم یقین رکھتے ہیں کہ جو ارادہ تو نے کیا ہے اس میں ضرور کوئی بڑی حکمت ہوگی مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں بھی وہ بات آجائے تاکہ ہم اپنے فرض منصبی کو اچھی طرح ادا کر سکیں۔

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ اس میں فرشتوں کے سوال کا اجمالی جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت کے نزول کے بعد بشر اس سے پست حالت میں جانے کے قابل بھی ہو جائے گا جو اسے اب حاصل ہے کیونکہ وہ گنہگار اور خدا تعالیٰ کا مغضوب بھی بن سکے گا لیکن باوجود اس کے شریعت کا نزول اپنے اندر ایسے فوائد رکھتا ہے جن کو ابھی تم نہیں سمجھ سکتے اور جو اپنے وقت پر ظاہر ہونگے تو انکی حقیقت تم پر کھل جائے گی۔

یہ اجمالی جواب ہے جو ملائکہ جیسے مقرب وجودوں کے لئے کافی ہے کیونکہ ان کو خدا تعالیٰ کی شان کا علم تھا جب خدا تعالیٰ نے کہا کہ اس میں عظیم الشان فوائد ہیں جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے تو انہیں یقین ہو گیا کہ ضرور ایسا ہی ہوگا لیکن چونکہ یہ بات خدا تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعہ سے آیندہ انسانوں پر بھی ظاہر کرنے والا تھا اس لئے اس نے ان کو تفصیلی جواب بھی دیا جو اگلی آیات میں مذکور ہے۔

اس جگہ ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کی صفت تسبیح کے ساتھ تحمید اور تقدیس کا بھی ذکر کرتا ہے جو امر اسے دوسری کتب سے ممتاز کرتا ہے تسبیح میں صرف تنزیہ آتی ہے یعنی اس کے نقصوں سے پاک ہونے کا ذکر آتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس قدر بیان صفات الٰہیہ کا اعلیٰ درجہ کے متفکر انسان کے لئے کافی نہیں کامل دماغ کے لئے صفات تنزیہیہ کے ساتھ صفات حقیقیہ مثبتہ کا اظہار بھی ضروری ہے ہم اگر کسی شئے کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسی بھی نہیں

اور ویسی بھی نہیں تو بے شک اسے انسانی دماغ کے قریب تو کر دیتے ہیں لیکن اسکی حقیقت کو پوری طرح واضح نہیں کرتے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کہیں کہ وہ مادہ نہیں اسے بھوک نہیں لگتی پیاس نہیں لگتی وہ مرتا نہیں وہ سوتا نہیں وہ طبعی خواہشات کا شکار نہیں تو اس سے یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ سُننے والے کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ دوسری مادی اشیاء سے کسی قدر مختلف ہے لیکن اسکی شان کا کما حقہ اظہار نہیں ہوتا اور یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہے کیا۔

ابتدائی مذاہب میں چونکہ اس وقت انسانی دماغ کا نشوونما اچھی طرح نہ ہوا تھا تسبیح پر زیادہ زور تھا اور حمد اور تقدیس کا پہلو بہت کمزور تھا مثلاً ہندو مذہب ہی کو لے لو اس میں اللہ تعالیٰ کے وجود کو نفی کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ وہ نظر نہیں آتا وہ کسی جگہ میں سماتا نہیں اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں اسے خواہش کوئی نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ بدھ مذہب کے موجودہ لٹریچر میں خدا تعالیٰ کی تعلیم کسی معیّن صورت میں تو پائی نہیں جاتی مگر انسان کامل جو خدا تعالیٰ کی مادی تصویر ہے اس کا نقشہ اسی طرح کھینچا گیا ہے کہ اس کے دل میں کوئی خواہش نہیں ہوتی سب خواہشات سے وہ آزاد ہوتا ہے حالانکہ خواہشات سے آزاد ہونا صرف تنزیہی صفت ہے اس میں کسی کمال کا اظہار نہیں۔ یہودی مذہب میں ایک حد تک صفاتِ الٰہیہ کے مثبت پہلو کا بھی ذکر ہے مگر اس قدر نہیں جس قدر کہ قرآن کریم میں ہے ان صفات حمد اور تقدیس کو جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور جس رنگ میں بیان ہوئی ہیں اگر بائبل کے بالمقابل رکھا جائے تو بائبل کا بیان بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے غرض قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس نے تسبیح کے ساتھ تحمید پر زور دیا ہے اور خدا تعالیٰ کو نفی کے ساتھ روشناس نہیں کرایا بلکہ اسکی صفات حمد اور تقدیس پر خاص زور دیا ہے۔

نفی کی صفات پر قرآن کریم میں بہت ہی کم زور ہے مثلاً آتا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ ع ۲) اس جیسی اور کوئی شے نہیں یا آتا ہے لَا يَمُوْتُ (فرقان ع ۵) وہ مرتا نہیں یا فرمایا ہے لَمْ يَلِدْ (اخلاص) اس نے کسی کو جنا نہیں یا فرمایا کہ لَمْ يُوْلَدْ (اخلاص) وہ کسی کے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ یا فرمایا وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (انعام ع ۲) وہ دوسروں کو کھلاتا ہے پر اُسے کوئی نہیں کھلاتا۔ یا فرمایا لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (بقرہ ع ۳۴) اُسے اونگھ یا نیند نہیں آتی۔ ان صفات کو بھی اگر دیکھا جائے تو سوائے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کی آیت کے باقی سب خدا تعالیٰ کی شان کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ مشرکانہ عقائد کے رد کے لئے بیان ہوئی ہیں چونکہ مسیحی لوگ اور اسی قسم کے اور مشرک لوگ بعض انسانوں کو خدا تعالیٰ کی صفات سے متصف بتاتے تھے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ معبودانِ باطلہ تو کھانا بھی کھاتے تھے اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور آگے انہوں نے بیویاں کیں اور ان کے ہاں اولادیں پیدا ہوئیں اور وہ سوتے بھی تھے تھک کر اونگھتے بھی تھے مگر اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے۔ پس ان صفات کا ذکر اس قدر اللہ تعالیٰ کے وجود کے سمجھانے کے لئے نہیں جس قدر کہ معبودانِ باطلہ کی اُلوہیت کو باطل کرنے کے لئے ہے۔

قرآن مجید سے پہلی کتب میں صرف تسبیح پر زور دینے کی وجہ

اب رہا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کا عقیدہ سو یہ بھی خالص سلبی نہیں یعنی اس میں یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہ جو دوسروں جیسا نہ ہو خدا ہوتا ہے بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانی فہم کے قریب کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی جو ایجابی صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ اپنی حقیقت میں وہ انسانی صفات سے ملتی ہیں بلکہ ان کا استعمال صرف خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھانے کے لئے ہے ورنہ وہ حقیقت میں انسانی صفات سے بالکل مختلف ہیں مثلاً یہ جو آتا ہے کہ خدا تعالیٰ بولتا ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی بھی زبان ہے تالو ہے حلق ہے ہونٹ ہیں اور دانت ہیں جنکی مدد سے وہ آواز نکالتا ہے بلکہ جب بولنے کا لفظ بولا جائے تو اس سے صرف یہ مُراد ہوتی ہے کہ وہ اپنے عندیہ کو دوسری

خدا تعالیٰ کے متعلق قرآن مجید میں نفی کی صفات کا ذکر اور ان کا مطلب۔

مخلوق پر الفاظ پیدا کر کے یا دل میں خیال پیدا کر کے ظاہر کر دیتا ہے یہی حال اس کے سُننے اور دیکھنے کا ہے ان الفاظ کے استعمال سے بھی یہ مراد نہیں کہ اس کے کان ہیں یا آنکھیں ہیں، بلکہ محض یہ مراد ہے کہ وہ مخلوق کی خواہشات اور پکار کو معلوم کرتا اور ان کے حالات کو معلوم کرتا ہے پس لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کا جملہ بھی اس قدر صفات سلبیہ پر دلالت نہیں کرتا جس قدر کہ صفات حقیقیہ کی تاکید اور تشریح کرتا ہے۔

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ میں اس طرف اشارہ کہ کامل عرفان والے صفات حقیقیہ مثبتہ سے اللہ کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ملائکہ کا یہ فقرہ بیان کر کے کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کامل عرفان والے وجود صفات سلبیہ سے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھتے بلکہ اسکی صفات حقیقیہ مثبتہ سے اس کا عرفان حاصل کرتے ہیں اور نیز اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم جو صفات حقیقیہ پر زور دیتا ہے ایسے ملکوتی وجود پیدا کرے گا جو تسبیح کے ساتھ حمد اور تقدیس پر بھی زور دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے وجود کو اسکی ان صفات کے ذریعہ سے بندوں کے قریب کرینگے جو اسکی قدرتوں کے ظہور سے تعلق رکھتی ہیں اور صرف نفی پر بحث کر کے اسے ایک وراء الوراء اور بندوں سے بے تعلق ہستی ثابت نہیں کریں گے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق صفات ایجابیہ پر غور اور ان سے فائدہ اُٹھانے کے بغیر نہیں ہو سکتا جو صرف تسبیح کرتا ہے وہ صرف اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ایک بالا ہستی ہے مگر جو اسکی تحمید کرتا ہے وہ اسے ایک زندہ اور فعّال خدا ثابت کرتا ہے اور اسکی صفات سے خود فائدہ اُٹھاتا اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے

قرآن مجید میں سَبِّحْ کے ساتھ لفظ حمد کا استعمال۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم میں سَبِّحْ امر کا صیغہ سترہ دفعہ استعمال ہوا ہے اور اس میں سے آٹھ جگہ اس کے ساتھ بِحَمْدِ رَبِّكَ یا بِحَمْدِهٖ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں یعنی حجر ع۶ نصر ع۱ طٰہٰ ع۸ مومن ع۶ ق ع۳ طور ع۲ سجدہ ع۲ میں۔ باقی نو جگہیں رہ جاتی ہیں جہاں یہ امر بغیر حمد کے لفظ کے استعمال ہوا ہے ان میں سے ایک تو طٰہٰ ع۸ میں ہے مگر یہ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے بعد استعمال ہوا ہے اور ساری آیت یوں ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى یعنی تسبیح کر اپنے رب کی اسکی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے دونوں سروں پر بھی تسبیح کر اور دن کی دونوں طرفوں میں بھی تسبیح کر تا کہ تو خدا تعالیٰ کے انعام پا کر اس سے راضی ہو جائے۔ اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ دوسرا سَبِّحْ جو خالی آیا ہے پہلے مضمون کی تکرار ہے اور اس میں بِحَمْدِكَ کا حکم شامل ہے خالی تسبیح مراد نہیں۔

دوسری اور تیسری آیات جن میں خالی تسبیح کا لفظ استعمال ہوا ہے سورہ قٓ اور سورہ طور کی ہیں۔ ان میں بھی پہلی آیت کی طرح یہ لفظ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے بعد اور اس کے تابع کے طور پر استعمال ہوا ہے اور بِحَمْدِكَ کا مفہوم اس میں شامل ہے۔

چوتھی آیت جس میں سَبِّحْ کا لفظ بغیر حمد کے استعمال ہوا ہے سورہ دھر کی آیت ہے جو یوں ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (ع ۲) یعنی اپنے رب کا نام صبح شام لیا کر اور رات کے وقت بھی اس کے حضور میں سجدہ کیا کر اور دیر تک رات کو اسکی تسبیح کیا کر۔ اس آیت میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ رب کا نام لے کر تسبیح کر اور سجدہ میں تسبیح کرنے کا ذکر ہے جس میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہا جاتا ہے پس یہ بھی خالی تسبیح نہیں بلکہ تسبیح اور تحمید ملی ہوئی ہے۔ کیونکہ ربّ تنزیہی صفت نہیں بلکہ ایجابی صفت ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ میرا اعلیٰ رب ہر نقص سے پاک ہے تو ہم نفی سے اس کی تعریف نہیں کرتے بلکہ اس کے اعلیٰ ہونے اور رب ہونے سے اسکی تعریف کرتے ہیں جو خالی تسبیح نہیں بلکہ تسبیح اور تحمید کا

مرکب ہے۔

پانچویں چھٹی اور ساتویں آیات واقعہ اور حاقہ کی ہیں دو دفعہ سورہ واقعہ (ع۳ و ع۳) میں آتا ہے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ اور ایک دفعہ حاقہ (ع۲) میں آتا ہے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ان تینوں آیات میں بھی گو حمد کا لفظ نہیں مگر یہ مضمون ہے کہ اپنے رب عظیم کا نام لے کر تسبیح کر یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ کہو جو رکوع میں مسلمان کہا کرتے ہیں اور یہ مضمون بھی حمد پر مشتمل ہے نہ کہ خالی تسبیح پر۔

آٹھویں آیت آل عمران ع۴ کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا سے کہا کہ اپنے رب کا ذکر کثرت سے کر اور صبح شام اُس کی تسبیح کر۔ اس میں بھی رب کے لفظ کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم ہے جو خالی تسبیح نہیں بلکہ حمد اس کے ساتھ شامل ہے۔ نویں آیت سورہ مریم کی ہے اس میں آتا ہے فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (ع۱) یعنی حضرت زکریا مقام عبادت سے باہر آئے اور اپنے دوستوں سے اشارہ سے کہا کہ صبح شام تسبیح کرو اس آیت میں بیشک حمد شامل نہیں مگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں حضرت زکریا کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ کے حکم میں تحمید شامل تھی اسکے دوبارہ ذکر میں یہاں بھی تخفیف کیلئے حمد کے ذکر کو چھوڑ دیا گیا ہو بہرحال مسلمانوں کو قرآن کریم میں پندرہ جگہ مخاطب کیا گیا ہے اور سب جگہ تسبیح کے ساتھ حمد الٰہی کو شامل کرنے کا حکم دیا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خالی صفات سلبیہ پر زور نہ دیا کرو کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صفات سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ نہیں ملتا بلکہ اس کے ساتھ حمد کو شامل کیا کرو تا کہ ایصال خیر کی صفات سے تم کو فائدہ پہنچے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ (بخاری جلد ۴ کتاب الایمان والنذور) دو کلمے ایسے ہیں کہ بولنے کے لحاظ سے تو بہت ہلکے پھلکے ہیں مگر نتیجہ کے لحاظ سے بہت بھاری ہیں اور رحمٰن کو بہت ہی پیارے ہیں اور وہ یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ اس حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات ایجابیہ کا ذکر کرتا ہے وہ ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر کے ان کے مقابل کی الٰہی صفات کو اپنے پر وارد کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے انعامات کا مستحق ہو جاتا ہے۔

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کے فقرہ کے بیان کرنے سے امت محمدیہ کیلئے ایک عظیم الشان سبق۔

خلاصہ یہ کہ ملائکہ کا یہ فقرہ اس جگہ دُہرا کر اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کو ایک عظیم الشان سبق دیا ہے کہ صفات سلبیہ پر اکتفا نہ کرو بلکہ صفات ایجابیہ کو ساتھ یاد کیا کرو تا کہ ان سے فائدہ اُٹھا سکو اور تا تمہارا وجود ملائکہ کے اس سوال کا جواب ہو کہ ہم تو تسبیح اور تحمید کرتے ہیں پھر انسانی نظام کے چلانے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ تم بھی تسبیح اور تحمید کرنے والے وجود بنکر بنی نوع انسان کی پیدائش کی ضرورت کا عملی ثبوت بنجاؤ گے اور خدا تعالیٰ کی حکمت کی شہادت ہو جاؤ گے۔

قرآن کریم کی دوسری آیات کی روشنی میں اس آیت کے بعض مطالب کا بیان

قرآن کریم کی دوسری آیات کی روشنی میں آیت ہذا کے مضامین کی تشریح۔

اب میں قرآن کریم کی دوسری آیات کی روشنی میں اس آیت کے بعض مضامین کو بیان کرتا ہوں۔ اوّل میں آدم علیہ السلام کے ذکر کو لیتا ہوں۔ آدم علیہ السلام انسانی نظام کی پہلی کڑی ہیں اور قرآن کریم کے بیان کے مطابق الہام الٰہی کا سلسلہ انسانوں میں ان سے چلا ہے۔ میں سب سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آدم علیہ السلام کے ذکر سے ہرگز یہ مُراد نہیں کہ بشر کی پیدائش آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے چلی ہے یا یہ کہ خدا تعالیٰ نے یکدم ایک

بشر یعنی آدم کو پیدا کر دیا اور پھر اسکی پسلی سے اسکے لئے بیوی بنادی اور ان سے آگے انسانی نسل چلی اس خیال کی تصدیق قرآن کریم سے ہرگز نہیں ہوتی بلکہ یہ بیان بائبل اور دوسری کتب کا ہے اور اسے غلطی سے اسلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

بائبل میں آدم کی پیدائش کا واقعہ

بائبل میں آدم کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں کہ وہ سمندر کی مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں اور مویشیوں پر اور تمام زمین پر اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں سرداری کریں اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا نر و ناری ان کو پیدا کیا۔ اور خدا نے انہیں برکت دی اور خدا نے انہیں کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو.....

اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا .... اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں کہ آدم اکیلا رہے میں اسکے لئے ایک ساتھی اسکی مانند بناؤں گا....... اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سوگیا اور اس نے اسکی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ایک ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس سبب سے وہ ناری کہلائیگی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی (پیدائش باب ۱ و ۲)

ہندوؤں کی کتب میں پیدائش انسانی کی حقیقت کا بیان

ہندوؤں نے پیدائش انسانی کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے۔ رگوید میں لکھا ہے "کون یقیناً جانتا ہے اور کون بیان کر سکتا ہے کہ یہ کائنات کہاں سے آ پیدا ہوئی اور کس طرح اس کی تخلیق ہوئی کیونکہ دیوتا اس کے بعد کے ہیں پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کہاں سے نمودار ہوئی۔

یہ خلقت کہاں سے آ موجود ہوئی اے پیارے آکاش میں جو اس کا منتظم ہے وہ بھی اس کو جانتا ہے یا وہ بھی نہیں جانتا" (رگوید منڈل نمبر۱ سوکت ۱۲۹) اس عدم علم کے اظہار کے بعد رگوید نے خود ہی پیدائش عالم اور پیدائش انسانی کی یوں تشریح کی ہے " اس یگیہ سے کہ جس میں سب نے ہون کیا دہی اور گھی پیدا ہوا اور ان حیوانوں کو پیدا کیا جو ہوا کے سہارے ہیں اور جنگل اور آبادی میں رہنے والے ہیں۔

اس یگیہ سے کہ جس میں سب نے ہون کیا رچا (رگوید) سام وید چھند (بحر) اور یجروید پیدا ہوئے جب وراٹ پرش کو تقسیم کیا گیا تو کتنی طرح سے اس کا خیال کیا گیا کون اس کا منہ قرار دیا گیا کس سے بازو کس سے رانیں اور کس سے پاؤں۔

اس کا منہ کیا ہے بازو کون ہیں رانیں کیا ہیں اور پاؤں کون؟

براہمن اس کے منہ سے پیدا ہوا کھشتری اس کے بازو سے اور شودر اس کے پاؤں سے من سے چاند پیدا ہوا۔ آنکھ سے سورج پیدا ہوا منہ سے اندرا اور اگنی اور پران سے ہوا پیدا ہوئی (رگوید منڈل نمبر۱ سوکت نمبر۹۰) ہندوؤں کی ایک معتبر کتاب ہے جس کا نام برہدارنیک اپنشد ہے اور سناتنیوں اور آریوں دونوں میں عزت کی نگہ سے دیکھی جاتی ہے اس میں ویدوں کے بیان کی تشریح اس طرح کی گئی ہے " اس کو (یعنی ایشور کو) تنہائی میں آنند نہ ہوا (یعنی خدا تعالیٰ نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا آرام سے نہیں رہ سکتا) اس لئے دنیا میں اکیلے کسی کو آنند نہیں آتا (تب) اس نے دوسرے ساتھی کو چاہا (پھر) وہ اتنا موٹا ہوا کہ جتنے دو مرد عورت مل کر ہوتے ہیں اس کے بعد اس نے (آتما یا ایشور نے) اپنے موٹے جسم کے دو حصے کئے ایک حصہ سے تو مرد اور دوسرے سے عورت بنی (پھر) اس سے (دوسرے) انسان پیدا ہوئے" اس کے آگے مخلوق بننے کی تفصیل اس طرح لکھی ہے "عورت نے دیکھا کہ اس نے (یعنی ایشور نے) مجھ کو اپنے جسم سے بنا کر مجھ سے رمن (یعنی مواصلت) کیا ہے اس لئے وہ دکھ کے مارے کہیں چھپ گئی اور گائے بن گئی تب پرش نے بھی سانڈ

بنکر اس گائے سے صحبت کی تب اس سے گائے کی نسل پیدا ہوئی۔

اسی طرح وہ شرم کے مارے سرے حیوانات کی شکل اختیار کرتی چلی گئی اور پرمیشور بھی اسی جانور کے نر کی شکل میں اس سے صحبت کرتا رہا اور تمام حیوانات چرند پرند کی پیدائش ظہور میں آئی۔ (برہدارنیک اُپنشد ادھیائے ۱ براہمن ۴ کھنڈ ۱ تا ۴)

منوسمرتی میں جانوروں کے بننے کا ذکر تو نہیں لیکن اس طریق پیدائش کو تسلیم کیا گیا ہے (منوسمرتی ادھیائے ۱ شلوک ۳۲)
پرشنو اُپنشد میں لکھا ہے "پرجاپتی (ایشور) کو مخلوق کی خواہش ہوئی تو اس نے تپ کیا (ریاضت کی) اور تپ کرنے کے بعد ایک جوڑا پیدا کیا رَیی اور پران (مادہ اور زندگی) اس لئے کہ یہ دونوں مل کر میرے لئے مختلف قسم کی مخلوق پیدا کریں گے (پرشنو اُپنشد پرشن ۱ منتر ۴)

ایتریہ اُپنشد میں لکھا ہے آغاز میں بیشک اکیلا صرف آتما (ایشور) ہی تھا اور کچھ بھی آنکھ جھپکتا ہوا نہ تھا اس نے سوچا میں لوکوں (کرہ ہائے عالم) کو رچوں اس نے لوگوں (آسمان زمین) کو بنایا۔ . . . . . تب اس نے دیکھا یہ ہیں لوگ تب اس نے سوچا لوک پالوں (ان کروں میں رہنے والوں) کو بناؤں تب اس نے پانیوں میں سے ہی نکال کر پُرش کو بنایا اس نے اسے تپایا جب وہ تپ گیا تو اس (پُرش) کا منہ کھلا جیسے انڈا پھٹتا ہے منہ سے کلام ظاہر ہوئی کلام سے آگ پھر دونوں نتھنے کھلے نتھنوں سے سانس کھلا۔ سانس سے ہوا (نکلی) دونوں آنکھیں کھلیں آنکھوں سے بصارت (پیدا ہوئی) بصارت سے سورج (بنا) کان کھلے کانوں سے قوت سامعت (پیدا ہوئی) قوتِ سامعت سے اطراف بدن سے کھال ظاہر ہوئی اس سے روئیں پیدا ہوئے ان روؤں سے ادویات بوٹیاں پیدا ہوئیں دل کھلا دل سے من (قوتِ فکریہ پیدا ہوئی) من سے چاند پیدا ہوا۔ ناف کھلی ناف سے اَپان وایو (قوتِ ہاضمہ پیدا ہوئی) اس سے موت۔ عضو مخصوص کھلا اس سے بیج نکلا بیج سے پانی پیدا ہوا (ایتریہ اُپنشد ادھیائے ۱ کھنڈ ۱)۔

بشنو پُران میں لکھا ہے "برہما والے دلوں میں مہیط شنکر سے تحریک پاکر مَیں نے اپنے آپ کو دو حصوں میں تقسیم کیا اے مُنی مَیں دو رُوپوں والا ہوگیا پس آدھے سے عورت اور آدھے سے مرد ہوگیا۔ اس مرد نے عورت میں تمام صفتوں سے متصف جوڑے کو پیدا کیا اس میں پُرش تو پَرَ ڈیکاری (یعنی خواہ خلائق) سُوَیمبُو منو پیدا ہوا اور وہ عورت تپسیا اور ریاضت کرنے والی شت رُوپا نام کی پیدا ہوئی پھر وہ سُندری منو سے بیاہی گئی اور منو اور شت رُوپا کے اختلاط سے انسانی نسل چلی" (بشنو پُران اُردو ترجمہ سرتی کھنڈ ۱ ادھیائے ۱۶)

ان بیانات کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مذہب کے نزدیک شروع میں ایک جوڑا پیدا کیا گیا تھا جو بعض کے نزدیک ایشور کے دو ٹکڑے ہو کر بنا اور بعض کے نزدیک برہما کے دو ٹکڑے ہونے سے بنا اور پھر آگے اس سے انسانی نسل چلی۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ حوالے استعاروں سے پُر ہیں اور ان میں انسانی پیدائش کے متعلق بعض امور کو استعارہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے اور ممکن ہے بعض بعد کے مصنفین نے ابتدائی الہام کو صحیح نہ سمجھ کر اس میں بعض باتیں اپنی عقل سے بھی داخل کر دی ہوں۔ مگر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویدوں اور اُپنشدوں کے بیانات میں ایک مطابقت ضرور پائی جاتی ہے میں ان کے بیانات پر معترضانہ نظر نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ تفسیر قرآنی اس کا مقام نہیں مَیں اس جگہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مختلف معتبر ہندو کتب میں یہ امر متفق طور پر پایا جاتا ہے کہ بشر کی نسل ایک جوڑے سے چلی جسے خدا تعالیٰ کے وجود سے یا دیوتاؤں کے وجود سے ہستی میں لایا گیا۔

قدیم مذاہب میں بھی جو تاریخی زمانہ سے پہلے کے ہیں جیسے بابلی مذہب ہے ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دیوتاؤں سے پیدا ہوا ہے مثلاً بابلی مذہب

بابلیوں کے نزدیک ابتدائے نسل انسانی

کی تحقیق سے یہ امر معلوم ہوا ہے کہ بابل کے باشندوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انسان دیوتاؤں سے بنا ہے بابل کے قدیم آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ بابلیوں کے نزدیک ابتداء میں صرف دو خدا تھے ایک اَپسُو دوسرا تِیامَت۔ اَپسُو میٹھے پانیوں کا دیوتا تھا اور تِیامَت شور یلے پانیوں کی دیوی تھی ان شوریلے پانیوں کے ملنے سے آسمان و زمین کے دیوتا پیدا ہوئے جنہوں نے اَپسُو اور تِیامَت سے بغاوت کی اور ایک منظم دُنیا کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا اس جنگ میں ای آ اور آسمان کا خدا آنو شکست کھا کر بھاگ گئے مگر ای آ کا لڑکا مردوک تِیامَت کے خاوند کنگو سے لڑنے گیا جو تِیامَت کے لشکروں کا سردار تھا اور اس کے بعد خود تِیامَت سے لڑا آخر اس نے سب ظلمت کے دیوتاؤں کو شکست دی اور ان کو ستاروں سے باندھ دیا تِیامَت کے جسم کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھے سے آسمان بنائے اور دوسرے نصف سے اَپسُو کو قید رکھنے کی جگہ تیار کی اور کنگو جو تِیامَت کا خاوند تھا اس کے خون سے ای آ نے انسان بنایا۔

نسل انسانی کی ابتداء کے متعلق مختلف نظریوں کے مقابل ایک نیا قرآنی نظریہ

زمانۂ حال کے فلاسفروں کے نزدیک انسانی پیدائش

زمانۂ حال کے فلاسفر سائنسدانوں میں سے ڈارون نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ایک لمبے عرصہ کے تغیر کے بعد زندگی کے ذرہ نے ترقی شروع کی۔ اور مختلف حیوانوں کی شکلوں میں ترقی کرتے ہوئے ایک جانور سے جو موجودہ بندر کے مشابہ تھا انسان بنا۔ اس فلسفہ کے ماتحت انسانی پیدائش ذرّہ حیات کی ترقی کی آخری کڑی ہے اور فوری طور پر کوئی انسان پیدا نہیں ہوا۔

موجودہ زمانہ کے بعض جرمن اور فرانسیسی فلاسفروں کا نسل انسانی کی ابتداء کے متعلق نظریہ۔

موجودہ فلاسفروں میں سے بعض جرمن اور فرانسیسی فلاسفروں کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود ہی ترقی پاتے ہوئے انسان بنا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ ازلی قانون مختلف تغیرات کے بعد انسان کی شکل کو پا گیا ہے۔ اور انسان اسکے ارتقاء کی آخری معلوم کڑی ہے گویا ان لوگوں نے ہندو اور بابلی عقائد کو سائنس کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن کریم نے ان سب سے مختلف اور نیا راستہ دُنیا کی پیدائش کے راز کو کھولنے کا اختیار کیا ہے قرآنی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں ارتقاء کا قانون ضرور رائج ہے روحانی دُنیا میں بھی اور مادی دُنیا میں بھی۔ مادی دُنیا بھی ایک لمبے ارتقاء کے بعد کمال کو پہنچی ہے اور روحانی دنیا بھی ایک لمبے ارتقاء کے بعد کمال کو پہنچی ہے مگر قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق یہ اصل ماننے کے قابل نہیں کہ انسان مختلف حیوانوں کی ارتقائی حالت کی آخری کڑی ہے قرآن کریم کے نزدیک انسانی ارتقاء اپنی ذات میں مستقل اور جُداگانہ ہے اور حیوانی ترقی کا اتفاقی مظاہرہ نہیں ہے اس بارہ میں قرآن کریم کی تعلیم سورہ نوح سے ظاہر ہے اس میں اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ قول نقل فرماتا ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (نوح ع ۱) یعنی اے لوگو تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ یقین نہیں رکھتے کہ اس کے سب کام حکمتوں کے مطابق ہوتے ہیں حالانکہ اس نے تم کو متعدد دوروں میں سے گذار کر پیدا کیا ہے کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ کس طرح اس نے سات آسمان اس طرح بنائے ہیں کہ ان کے اندر کامل مطابقت پائی جاتی ہے اور ان آسمانوں میں چاند بھی پیدا کیا ہے جو نور والا ہے اور سورج کو بنایا ہے جو روشنی بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے اس طرح اُگایا ہے جو اُگانے کا حق ہے پھر وہ تم کو اسی زمین میں واپس لے جاتا ہے اور ایک دن تم کو اسی میں سے اچھی طرح سے نکالے گا۔

ان آیات سے یہ امور ظاہر ہیں (۱) انسانی پیدائش کئی دوروں میں ہوئی ہے کیونکہ فرماتا ہے خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا اور طَوْرٌ کے معنی عربی زبان میں اندازہ اور ہیئت اور حال کے ہوتے ہیں (اقرب)

پس اطوار کے معنے ہوئے کئی حدوں میں سے گذار کر کئی ہیئتوں اور احوال میں بدلتے ہوئے پیدا کیا ہے اندازہ اور

حد کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر اندازہ اور حد میں تم دوسرے اندازہ اور حد سے ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے اور ایک حد میں جب تھے تو دوسری حد کی طاقتوں سے محروم تھے اور ہیئت اور حالت کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مختلف دوروں میں تمہاری شکل مختلف تھی اور مختلف حالتوں کے ماتحت تم ترقی کر رہے تھے (۲) دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک دَور انسانی پیدائش پر وہ آیا ہے جو آسمان و زمین کی پیدائش سے بھی پہلے تھا کیونکہ اس آیت میں انسانی پیدائش کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے بیان کیا ہے اور ایک حصہ آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حصہ انسانی پیدائش کا اس وقت سے شروع ہے جبکہ ابھی آسمان و زمین بھی اپنی موجودہ شکل میں ظاہر نہ ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ آسمان و زمین کا مادہ ابھی دخانی حالت میں تھا اور سمٹ کر جرم کی شکل میں نہ بنا تھا اس وقت بھی وہ ذرہ حیات کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا جو بعد میں انسان بنا (۳) تیسری بات ان آیات سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ دخانی مادہ جس سے کائنات بنی سمٹ کر جرم کی شکل میں آگیا اور آسمان و زمین کے اجرام تیار ہو گئے تو انسان پر ایک نیا دَور آیا اور وہ زمین سے باہر نمودار ہوا اور جس طرح نباتات کی حالت ہوتی ہے کہ چل پھر نہیں سکتے اور غذا ہر جگہ سے لیتے ہیں وہ بھی کمزور تھا اور ابھی حرکت کرنے کے قابل نہ ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے ایک حرکت کرنے والے مستقل وجود کی شکل اختیار کرنی شروع کی (۴) چوتھی بات جو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا جسم پھر مٹی میں مل جاتا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اسکی ابتدا مٹی کے اجزاء سے ہی کی گئی تھی ورنہ وہ سڑ کر مٹی نہ بن سکتا پس اس کا مٹی میں مل جانا اور اس کے اجزاء کا مٹی کے اجزاء میں شامل ہو جانا اسکی اصلیت پر ایک دلیل ہے پھر فرماتا ہے

انسانی پیدائش کئی دوروں میں ہوئی۔

کہ اس مٹی میں مل جانے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان کے تمام اجزاء پھر بے جان ہو جاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی مقدر کر رکھا ہے کہ اسکی وہ ترقی یافتہ حالت جو مٹی سے بننے کے بعد اس نے حاصل کی تھی ایک مستقل حیثیت قائم رکھتی ہے اور اس حیثیت کو اللہ تعالیٰ کسی وقت پھر نمایاں کرے گا اور انسان پھر ایک اور زندگی حاصل کرے گا جس میں اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے انسان کا وجود

خلاصہ یہ کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ انسان کی پیدائش قرآن کریم کے رو سے فوری اور ایک وقت میں نہیں ہوئی بلکہ جس وقت سے کہ کائنات کی پیدائش کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کیا اسی وقت سے اس نے انسان کی پیدائش کی بنیاد رکھی اور مختلف اوقات میں ترقی دیتے دیتے زمین سے نکال کر اسے بڑھایا اور انسانی شکل اسے دی اور شعور اور عقل اسے بخشی

اس حالت سے بھی پہلے کی ایک حالت قرآن کریم نے بیان کی ہے جو یہ ہے کہ انسان یا اسکے ابتدائی ذرات کا بھی کوئی وجود نہ تھا چنانچہ فرماتا ہے اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا (مریم ع۵) یعنی کیا انسان اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ ہم نے اسکی حیاتی شکل پہلے جو وجود اسے دیا تھا وہ اس حالت میں بنا تھا کہ اس سے پہلے اس کا کوئی اور کسی رنگ میں بھی وجود نہ تھا یعنی وہ ذرہ حیات بھی موجود نہ تھا جس نے ترقی کرتے کرتے آخر انسانی شکل اختیار کی۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک اللہ تعالیٰ صرف مادہ کا جوڑنے والا ہی نہیں بلکہ مادہ کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ کوئی مادہ موجود نہ تھا پھر اللہ تعالیٰ نے مادہ پیدا کیا جو سورہ نوح کے بتلائے ہوئے طریق کے مطابق ترقی کرتے کرتے انسان بنا۔

وہ ادوار جو سورۂ نوح میں بیان کئے گئے ہیں انکی مزید تشریح قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے (۱) فرماتا ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (فاطر ع۲) اللہ تعالیٰ

نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے یعنی ایک وقت انسان پر ایسا آیا ہے کہ اس کا ذرہ حیات خشک مٹی میں ملا ہوا تھا (۲) اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (سجدہ ع۱) وہ خدا ہی ہے جس نے ہر چیز جو اس نے بنائی ہے اس میں اسکی ضرورت کے مطابق نہایت اچھی طاقتیں رکھی ہیں اور انسانی پیدائش کی ابتدار پانی ملی ہوئی مٹی سے کی ہے یعنی خشک مٹی جس میں ذرۂ حیات تھا اس میں اس نے پانی ملایا اور ذرہ حیات کے نشوونما کے سامان پیدا کئے قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ ذرہ حیات کے نشوونما کا زمانہ وہ ہے جب مٹی میں پانی ملا چنانچہ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (انبیاء ع ۳) ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی ہے پھر کیا وہ اسپر ایمان نہیں لاتے اس آیت سے ظاہر ہے کہ حیات یعنی زندگی اور اس کے نشوونما کا تعلق پانی سے ہے پس جب تراب کے بعد طین سے انسانی پیدائش کا ذکر کیا تو اس طرف اشارہ کیا کہ ذرہ حیات کی نشوونما کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ پانی مٹی سے ملا اور اس میں نشوونما کی طاقت پیدا ہوئی اس امر کا ثبوت کہ طین سے مُراد اس جگہ نطفہ نہیں یہ ہے کہ سورۂ سجدہ کی اوپر بیان کی ہوئی آیت کے بعد فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (سجدہ ع۱) یعنی پہلا دَور انسانی پیدائش کا طین سے نشوونما پانے کا تھا پھر جب وہ ترقی کر گیا تو آیندہ اسکی نسل ایک ذلیل سمجھے جانے والے پانی یعنے نطفہ سے بننے لگی۔ اس آیت نے بتا دیا کہ طین سے انسان کا بننا ایک اور دَور سے متعلق ہے اور نطفہ سے انسان کا بننا ایک اور دَور سے متعلق ہے طینی دَور بشر کی پیدائش سے پہلا دور ہے مگر جب طین سے بشر کی پیدائش ہو گئی تو بشر کی ترقی کا دوسرا دور یہ شروع ہُوا کہ نسل انسانی نطفہ سے پیدا ہونی شروع ہوئی اور پیدائش مفردہ کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

انسانی پیدائش کے مذکورہ ادوار کی بابت قرآن کریم کی دیگر آیات سے

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ انسان قرآن کریم کے نزدیک دوسرے حیوانوں سے ترقی کر کے نہیں بنا بلکہ بذاتِ خود شروع سے انسان کی شکل اختیار کرنے کے لئے بنایا گیا تھا کیونکہ فرماتا ہے کہ انسان بننے کے بعد اسکی نسل کی پیدائش نطفہ سے شروع ہو گئی گویا جب سے اسکی نسل نطفہ سے پیدا ہونے لگی وہ بشر بن چکا تھا حالانکہ اگر ڈارون تھیوری کے مطابق انسان کی پیدائش کو تسلیم کیا جائے تو وہ انسان بننے سے پہلے حیوانوں کی صورت میں نطفہ کے ذریعہ سے نسل پیدا کر رہا تھا۔

(۳) اس حیوانی حالت میں بشر کے آنے سے پہلے کی حالت کا نقشہ قرآن کریم کی ایک اور آیت میں اس طرح کھینچا گیا ہے هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا (دھر ع۱) یعنی انسان پر ایک ایسا دَور ضرور آچکا ہے کہ وہ شئے مذکور نہ تھا یعنی انسان تو تھا مگر اس کے اندر دماغی قوت ابھی پیدا نہ ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے حال سے باخبر نہ تھا اور ایک دوسرے کا ذکر نہ کرتا تھا۔ ایک دوسرے کا ذکر کرنا اور اسے پہچاننا دماغ سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس دور میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتا نہ تھا۔ اور ایک دوسرے کا ذکر نہ کرتا تھا پس اس دور میں اس کے دماغ کی نشوونما نہ ہوئی تھی یعنی اب تک وہ حیوان نہ بنا تھا ہاں اس کے اندر ایک دن ترقی کرنے اور کامل بننے کی قوت موجود تھی پھر فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ (دھر ع۱) پھر ہم نے انسان کو حیوانی حالت میں بدل دیا اور اسکی پیدائش نطفہ امشاج سے ہونی شروع ہوئی اَمْشَاج مَشَج سے نکلا ہے جس کے معنے مختلط کے ہیں یعنی مرکب۔ ملا ہوا (اقرب) پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ انسانی نطفہ مرکب القویٰ ہے اور اس میں بہت سی قوتوں کو جمع کیا گیا ہے یہ ایک امتیاز ہے جو انسانی نطفہ اور دوسرے حیوانوں کے نطفوں میں پایا جاتا ہے دوسرے حیوانوں کے نطفے امشاج نہیں یعنی ان کے اندر مختلف طاقتوں کا مجموعہ نہیں۔ اور انہیں مختلف راہوں کے اختیار کرنے کی طاقت نہیں جبکہ انسان کے نطفہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس سے

پیدا ہونے والا وجود مختلف القویٰ ہوتا ہے اور ہر انسان اپنے اندر جُدا امزاج اور مختلف راستوں پر چلنے کی طاقت رکھتا ہے تمام باقی حیوانوں کی نسل نطفۂ امشاج سے پیدا نہ ہونے کے سبب سے اپنے باپ دادوں کے راستہ پر چلتی ہے اور آج کا بندر وہی طاقتیں رکھتا ہے جو ہزاروں سال پہلے کا بندر رکھتا تھا اور آج کا شیر وہی دماغی حالت رکھتا ہے جو ہزاروں سال پہلے کا شیر رکھتا تھا مگر انسان کی اولاد بوجہ نطفہ امشاج سے پیدا ہونے کے اپنے آباء سے مختلف ہونے کی طاقت رکھتی ہے اور بالفعل اس کا اظہار کرتی رہتی ہے اور علوم و فنون میں ترقی کرتی جاتی ہے گویا نطفۂ امشاج کے الفاظ سے انسان کے حیوان ناطق ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان جس وقت سے حیوانی جامہ میں ظاہر ہوا ہے اس کا نطفہ اسی وقت سے دوسرے حیوانوں سے مختلف تھا اور اس میں غیر محدود ترقی کا مادہ رکھا گیا تھا۔

یہ آیت بھی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسانی پیدائش شروع سے ہی دوسرے حیوانوں سے مختلف تھی کیونکہ جب سے وہ نطفہ سے پیدا ہونے لگا ہے اس کا بیج نطفۂ امشاج سے بننا شروع ہوا ہے جبکہ دوسرے حیوانوں کا تناسل نطفۂ غیر امشاج سے ہوتا چلا آیا ہے۔

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ گو انسان کی پیدائش شروع سے ہی نطفۂ امشاج سے ہوئی ہے مگر ابتدا میں وہ بالقوۃ تو نطفۂ امشاج کی خصوصیات رکھتا تھا مگر بالفعل اس سے نطفۂ امشاج کی قوتیں ظاہر ہونی شروع نہ ہوئی تھیں بلکہ آہستہ آہستہ ترقی کرنے کے بعد ظہور میں آنے لگیں چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (دہر ع ۱) یعنی نطفۂ امشاج سے پیدا کرنے کے بعد ایک زمانہ وہ آیا کہ انسان بالقوۃ سے بالفعل بھی انسان بن گیا اور سمیع و بصیر ہو گیا۔

سمیع و بصیر سے مراد صرف سننے والا اور دیکھنے والا نہیں ہے بلکہ سمیع بہت سننے والے اور بصیر دیکھنے پر قادر کو کہتے ہیں یہ الفاظ حیوانوں کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتے ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سمیع اور بصیر ہیں بلکہ وہ صرف سننے والے اور دیکھنے والے ہیں سننے اور دیکھنے کے قویٰ ان میں کامل طور پر نہیں پائے جاتے سمیع و بصیر وہی ہستی کہلا سکتی ہے جس کی سننے اور دیکھنے کی قوت کمال کو پہنچی ہوئی ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی سمیع و بصیر کے الفاظ آتے ہیں مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی جا سکتی ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (نساء ع ۸) اللہ تعالیٰ یقیناً سمیع اور بصیر تھا اور سمیع و بصیر ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ غرض سمیع و بصیر اس ہستی کی نسبت بولا جاتا ہے جو سننے اور دیکھنے میں کمال رکھتی ہو اور قرآن کریم کے محاورہ میں انسان کو اسی لئے سمیع و بصیر کہا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی آواز کو سنتا اور اس کی قدرتوں کو دیکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ان لوگوں کو جو الٰہی کلام کے سننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کی قدرتوں کے دیکھنے سے اعراض کرتے ہیں اندھے اور بہرے قرار دیا گیا ہے فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (ہود ع ۲) یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ایمان کے مطابق اعمال بھی کئے اور اپنے رب کی طرف عجز کے ساتھ جھکے اور اس کے سلوک سے مطمئن ہو گئے وہی لوگ جنت کے مستحق ہیں وہ اس میں بستے چلے جائیں گے۔ ان دونوں فریق (یعنی خدا تعالیٰ کا کلام سن کر اس پر ایمان لانے والوں اور اس کی قدرتوں کو دیکھنے والوں اور منکروں) کی حالت اندھوں اور بہروں اور دیکھنے والوں اور سننے والوں کی حالت کی طرح ہے کیا یہ دونوں حالتیں برابر ہو سکتی ہیں پھر کیا یہ لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم حقیقی سمیع و بصیر انہی کو قرار دیتا ہے جو خدا تعالیٰ

انسان کے نطفہ امشاج سے پیدا ہونے اور اس کے سمیع و بصیر ہونے کا مطلب

کی بات سُننے اور اسکی قدرتوں کے دیکھنے کے عادی ہیں۔

قرآن کریم میں بیان شدہ واقعہ آدم سے اس بات کا ثبوت کہ نسل انسانی کی ابتدا آدم سے نہیں ہوئی

پس اوپر کی آیت میں انسان کے سمیع و بصیر بنانے سے یہی مُراد ہے کہ ایک وقت انسان پر ایسا آیا کہ نطفۂ امشاج سے جو خاصیتیں اس کے اندر بالقوہ رکھی گئی تھیں وہ بالفعل بھی ظاہر ہو گئیں اور یہی وہ تغیر تھا جس کے اوّل مظہر اور اپنے زمانہ کے کامل مظہر آدم علیہ السلام تھے ورنہ یہ نہیں کہ ان سے پہلے کوئی بشر نہ تھا ان سے پہلے بھی بشر تھے کیونکہ وہ نطفۂ امشاج سے پیدا ہوتے تھے مگر آدم علیہ السلام کے ظہور سے پہلے وہ ابھی سمیع و بصیر نہ ہوئے تھے یعنی ان کی قوتیں ابھی اس حد تک ترقی پذیر نہ ہوئی تھیں کہ وہ خدا تعالےٰ کے کلام کو سُننے کے اہل ہو جاتے اور اسکی قدرتوں کو دیکھنے کے لائق ہو جاتے پس اس زمانہ میں ان پر الہام نازل نہ ہوتا تھا اور خدا تعالیٰ اپنی قدرتوں کو جو شریعت سے تعلق رکھتی ہیں ان کے لئے ظاہر نہ کرتا تھا لیکن جب انسان ترقی کرتے کرتے سمیع و بصیر کے مقام پر پہنچ گیا اور اس کا پہلا کامل وجود آدم علیہ السلام کی شکل میں ظاہر ہُوا تو اللہ تعالےٰ نے اسے اپنے کلام کے لئے چن لیا اور اپنے الہام سے اسے مشرف کیا اور رُوحانی دَور کی ابتدا ہو گئی اور انسان گویا اس جنت کا مستحق ہو گیا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا اس سے پہلے بشر گو بالقوہ انسانیت کی طاقتیں رکھتا تھا مگر بالفعل ان قوتوں کو ظاہر کرنے کے قابل نہ تھا اور اسکی دماغی حالت دوسرے حیوانوں سے زیادہ ممتاز نہ تھی اور اس وجہ سے اسے شریعت کا پابند نہ کیا گیا تھا۔

اوپر کی آیات سے یہ امر ظاہر ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بشر کی پیدائش یکدم نہیں ہوئی اور آدم علیہ السلام سے اسکی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ آدم علیہ السلام بشر کی اس حالت کے پہلے ظہور تھے جب سے وہ حقیقی طور پر انسان کہلانے کا مستحق ہُوا اور شریعت کا حامل ہونے کے قابل ہُوا اور اس وجہ سے گو آدم علیہ السلام رُوحانی لحاظ سے ابو البشر ہیں کیونکہ روحانی دُنیا کی ابتدا ان سے ہوئی اور وہ پہلے ملہم انسان تھے مگر جسمانی لحاظ سے ضروری نہیں کہ وہ سب موجودہ انسانوں کے باپ ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ حصّہ انسانوں کا ان دوسرے بشروں کی اولاد ہو جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت میں موجود تھے اور جو ان پر ان کے زمانہ میں ایمان لائے یا ان کے زمانہ میں تو ایمان نہ لائے مگر بعد میں آہستہ آہستہ ایمان لاتے رہے۔

اب میں بتاتا ہوں کہ قرآن کریم میں جو آدم کا واقعہ بیان ہُوا ہے اس میں کہیں بھی اس امر کا اظہار نہیں کیا گیا کہ آدم علیہ السلام سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی ہے یا یہ کہ ان کے زمانہ میں اور کوئی بشر نہ تھا قرآن کریم میں آدم علیہ السلام کا نام لے کر ان کے واقعہ کو مندرجہ ذیل مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو اسی آیت میں جسکی تفسیر مَیں اس وقت لکھ رہا ہوں اس آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس میں انسانی پیدائش کا کوئی ذکر نہیں صرف یہ فرماتا ہے کہ یاد کرو جب تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اور یہ فقرہ اپنی بناوٹ سے ہی ظاہر کرتا ہے کہ آدم اور ان کے کچھ ہم جنس پہلے ہی موجود تھے ان کے بنانے کا اس وقت سوال نہ تھا بلکہ سوال صرف بشر میں سے ایک خلیفہ بنانے کا تھا اور ظاہر ہے کہ خلیفہ بنانے سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس سے پہلے کوئی انسان نہ تھا بلکہ صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت خلیفۃ اللہ نہ تھا قرآن کریم میں حضرت داوٗد کو بھی خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے اور حضرت داوٗد کسی لحاظ سے بھی پہلے انسان نہ تھے ان کی نسبت آتا ہے یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص ع ۲) یعنے اے داوٗد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس سچائی کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کر اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کر کیونکہ اگر تو ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بھٹک جائے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ خلیفہ بنانے سے صرف یہ مراد ہے کہ وہ بنی نوع انسان میں

انصاف کی حکومت قائم کرے اور انسانی عقل کو اللہ تعالےٰ کے الہام کی ہدایت کے تابع کرے۔ پس جب اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کا اعلان کیا تو اس سے بھی صرف اسی قدر مراد تھی یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آدم کو اس وقت پیدا کیا گیا تھا بلکہ انکی بلوغت روحانی کے زمانہ میں انہیں الہام کا مرکز بنانے کا اعلان تھا اس کے بعد کی آیت بھی اسی امر پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو خلیفہ بنانے کی خبر دے کر آدم پر الہام نازل کیا اور اسے تمام اسماء سکھائے اسماء کیا تھے اسکی نسبت تو میں اگلی آیت میں روشنی ڈالوں گا اس وقت اس امر کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ اس وقت آدم پہلے سے موجود تھے کیونکہ خلیفہ بنانے کا ذکر کرنے کے بعد یہ نہیں کہا گیا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا بلکہ یہ کہا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم پر الہام نازل کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت سے پہلے آدم پیدا ہو چکے تھے۔

دوسری آیت جس میں آدم کا ذکر کیا گیا ہے یہ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اعراف ع ۲) یعنی ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو اعلیٰ سے اعلیٰ قویٰ بخشے پھر اعلیٰ قویٰ بخشکر فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ میں نے صورت دینے کے معنی اس جگہ اعلیٰ قویٰ بخشنے کے کئے ہیں اور یہ لغت کے مطابق ہیں مفردات راغب میں لکھا ہے صورت دو قسم کی ہوتی ہے اَحَدُهُمَا مَحْسُوْسٌ يُدْرِكُهُ الْخَاصَّةُ وَالْعَامَّةُ بَلْ يُدْرِكُهُ الْاِنْسَانُ وَكَثِيْرٌ مِّنَ الْحَيَوَانِ كَصُوْرَةِ الْاِنْسَانِ وَالْفَرَسِ وَالْحِمَارِ بِالْمُعَايَنَةِ یعنی ایک صورت تو وہ ہوتی ہے جو حواس ظاہری سے معلوم ہوتی ہے اسے خاص و عام سب معلوم کر لیتے ہیں بلکہ انسانوں کے سوا بہت سے جانور بھی اسے دیکھتے ہیں جیسے انسان یا گھوڑے یا گدھے کی شکل وَالثَّانِيْ مَعْقُوْلٌ يُدْرِكُهُ الْخَاصَّةُ دُوْنَ الْعَامَّةِ كَالصُّوْرَةِ الَّتِي اخْتَصَّ الْاِنْسَانُ بِهَا مِنَ الْعَقْلِ وَالرَّوِيَّةِ وَالْمَعَانِي الَّتِي خُصَّ بِهَا شَيْءٌ بِشَيْءٍ اور دوسری صورت وہ ہے جو صرف عقل کے ذریعہ سے دیکھی جا سکتی ہے اسے صرف خاص ہستیاں دیکھ سکتی ہیں جانور تو الگ رہے عام انسان بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے جیسے کہ وہ صورت جس سے انسان کو ممتاز کیا گیا ہے یعنی اسکی عقل اور قوت فکریہ اسی طرح وہ ممتاز کرنے والی طاقتیں جو مختلف اشیاء کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ عربی زبان میں صورت کا لفظ ظاہری شکل کے لئے بھی اور باطنی شکل یعنی اندرونی طاقتوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور انہی دوسرے معنوں کے مطابق میں نے ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ کے معنی یہ کئے ہیں کہ تم کو اعلیٰ سے اعلیٰ قویٰ بخشے۔

اس کے بعد جو فرمایا کہ پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ محض پیدائش انسان کے معاً بعد ہی ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم نہ دیا گیا تھا بلکہ انسان کے پیدا ہونے کے بعد جب درجہ بدرجہ ترقی کر کے انسان نے اپنی روحانی قوتوں کو کامل کیا تھا۔ اس وقت آدم کے سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔

ایک اور امر بھی اس آیت سے ظاہر ہے کہ آدم کے سجدہ یا دوسرے لفظوں میں مطاع یا خلیفہ بننے سے پہلے متعدد انسان موجود تھے کیونکہ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ آدم کو پیدا کرنے اور اُسے صورت رُوحانیہ دینے کے بعد ہم نے ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا بلکہ جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے تم کو پیدا کیا اور تم کو صورت روحانیہ بخشی اس کے بعد آدم کے سجدہ کا حکم ملائکہ کو دیا۔ "تم کو پیدا کیا" اور "تم کو صورت رُوحانیہ بخشی" کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ آدم پہلا بشر نہ تھا بلکہ اس کے زمانہ میں متعدد بشر موجود تھے جو صورتِ روحانیہ پا چکے تھے ان میں آدم چونکہ کامل وجود تھا اسے خلافت کے لئے چُنا گیا اور اسکی فرمانبرداری کا فرشتوں کو حکم دیا گیا۔

تیسری جگہ جہاں آدم کا ذکر کیا گیا ہے سورۂ طٰہٰ کی یہ آیت ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ع ۷) یعنی ہم نے اس سے پہلے آدم

کو بھی خاص احکام دیئے تھے پھر وہ ایک موقعہ پر بھول گیا مگر ہم نے اسکی اس بھول میں ارادہ کا ظہور نہیں پایا۔ بلکہ یہ فعل اس سے نادانستہ ہُوا۔ اس آیت میں بھی یہ ذکر نہیں کہ آدم کو سب بشروں سے پہلے پیدا کیا گیا تھا بلکہ محض یہ ذکر ہے کہ آدم کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تھی۔ ان آیات کے علاوہ سورۃ آل عمران میں آدم کا ذکر ہے (ع۶) جس میں صرف انکی بزرگی کا اظہار کیا گیا ہے اور پھر دوسری دفعہ اسی سورۃ میں آدم کا ذکر ہے (ع۶) جس میں یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیح کو آدم سے ایک مشابہت ہے مگر ان آیات میں سے کسی میں بھی یہ ذکر نہیں کہ آدم کو اللہ تعالےٰ نے پہلا بشر بنا کر پیدا کیا۔

بعض لوگوں کا قرآن کریم کی بعض آیتوں سے آدم علیہ السلام سے پہلے بشر ہونے کا استدلال اور اس کا رد۔

فرشتوں کے سجدہ کا ذکر بغیر آدم کا نام لئے بعض اور مقامات پر ہے اور بعض لوگ ان آیتوں سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام پہلے بشر تھے لیکن ان سے بھی یہ مضمون ثابت نہیں ہوتا یہ ذکر مندرجہ ذیل آیات میں ہے فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ○ (حجر ع۳) اور ہم نے انسان کو ایک آواز دینے والی مٹی سے پیدا کیا جو ایک پانی ملے ہوئے گارے سے بنی تھی اور جنوں کو اس سے پہلے پیدا کیا۔ ایک ایسی آگ سے جو گرم ہوا کی شکل کی تھی۔ اور اس وقت کو بھی یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں آواز دینے والی مٹی سے جو پانی ملے ہوئے گارے سے تیار ہوئی ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں پھر جب میں اس کی قوتوں کو مکمل کرلوں اور اس میں اپنی رُوح ڈال دوں تو اس کے سامنے فرمانبرداری کا طریق اختیار کرتے ہوئے جُھک جاؤ۔ اسی طرح سورہ ص میں ہے إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ (ع۵) یعنی یاد کر جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میں ایک بشر گیلی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں پھر جب میں اسکی قوتوں کو مکمل کردوں اور اس میں اپنی رُوح ڈالدوں تو اسکے آگے فرمانبرداری کے طریق سے جُھک جاؤ۔ ان دو آیتوں سے شبہ پڑ سکتا ہے کہ چونکہ بشر کی پیدائش کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا ہے اور دوسری طرف آدم کے اندر نفخ رُوح کرنے کے بعد اسکی فرمانبرداری کا حکم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ بشر سے مراد آدم ہے اور آدم ہی پہلا بشر ہے لیکن یاد رہے کہ اس جگہ آدم کا ذکر نہیں محض ایک بشر کی پیدائش کا ذکر ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ان آیات کے یہ معنی نہ کئے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے بشر کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بتا دیا تھا کہ ایک دن بشر میرے الہام پانے کا مستحق ہوگا پھر آدم کے زمانہ میں اس کے خلیفہ بنانے کا وقت جب قریب آگیا۔ تو دوبارہ انہیں اپنے اس ارادہ کی خبر دی اور بتایا کہ جس امر کی میں نے تم کو خبر دی تھی اب اس کا وقت آگیا ہے اور سَوَّيْتُهُ میں جس وقت کی طرف اشارہ تھا اسی وقت کی طرف جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کے الفاظ سے دوبارہ اشارہ کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ اب بشر کا تسویہ ہو گیا ہے اور وہ الہام پانے کے قابل ہو گیا ہے اس لئے اب تم اس امر کے لئے تیار ہو جاؤ کہ اسپر الہام نازل ہوں اور اسکی تائید کرنے لگ جاؤ۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے ان معنوں کی تصدیق بھی ہوتی ہے چنانچہ سورہ سجدہ میں آتا ہے اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِيْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (ع۱) یعنی خدا ہی ہے جس نے ہر اس چیز کو کہ اس نے پیدا کیا ہے اس کے مطابق حال طاقتیں بخشی ہیں اور انسان کی پیدائش کو اس نے گیلی مٹی سے شروع کیا ہے پھر اس نے اسکی نسل کو ایک بظاہر حقیر نظر آنے والے پانی کے خلاصہ سے (یعنی نطفہ سے) بنانا شروع کیا پھر اس نے اُسے مکمل قوتوں والا بنایا اور اس میں اپنی رُوح داخل کی اور تم کو اس نے کان و

آنکھیں اور دل عطا کئے مگر باوجود اسکے تم شکر نہیں کرتے اس آیت میں پیدائش کی ترتیب یوں بیان کی گئی ہے (۱) انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا گیا (۲) اس کے بعد اُسکی نسل نطفہ سے چلی (۳) اس کے بعد انسانی قویٰ ایک وقت میں جاکر مکمل ہوئے (۴) اس کے بعد اس پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہُوا۔ اس ترتیب سے صاف ظاہر ہے کہ کلام الٰہی نطفہ سے چلنے والی مخلوق پر نازل ہُوا نہ کہ اس ابتدائی انسان پر جو گیلی مٹی سے بنا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے گیلی مٹی سے انسان بنا۔ پھر اسکی نسل نطفہ سے جاری ہوئی۔ اس کے بعد اس کے قویٰ مکمل ہوئے اور اس کے بعد کلام الٰہی نازل ہُوا پس آدم جس پر کلام نازل ہُوا تھا نطفہ سے پیدا ہونے والے انسانوں میں سے تھا نہ کہ ان انسانوں میں سے جو نطفہ کی پیدائش سے پہلی ابتدائی کڑی کے طور پر مٹی سے ترقی دے کر بنائے گئے تھے کیونکہ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ کلامِ الٰہی نطفہ سے پیدا ہونے والے انسانوں میں سے کسی ایک پر نازل ہُوا تھا اور نطفہ سے پیدا ہونے والا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کے ماں باپ موجود ہوں اور جس کے ماں باپ موجود ہوں وہ پہلا انسان نہیں کہلا سکتا پس اس آیت کی روشنی میں پہلی نقل کردہ دونوں آیتوں کا یہی مطلب لینا پڑے گا کہ جس ابتدائی بشر کا ان میں ذکر کیا گیا ہے وہ آدم نہ تھا بلکہ اس کے آباء میں سے کوئی تھا اور فرشتوں کو جو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا وہ اس ابتدائی بشر کے متعلق نہ تھا بلکہ اس کامل انسان کے متعلق تھا جس نے انسانی نسل کے دماغی ترقی کر جانے کے بعد سب سے پہلے کلام الٰہی سے مشرف ہونا تھا۔

ان آیات کے علاوہ اور آیات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم پہلے انسان نہ تھے بلکہ اُن کے زمانہ میں اور لوگ بھی موجود تھے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ان آیات میں جو آیت زیر تفسیر کے بعد میں فرمایا گیا ہے وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اے آدم تو اور تیرے ساتھی یا یہ تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اگر زوج کے معنے ساتھی کے سلئے جائیں جو لغت کے لحاظ سے درست ہیں تو بھی اس کے یہ معنی بنتے ہیں کہ اس وقت آدم کے اور ہم جنس بھی موجود تھے اور اگر اس کے معنی بیوی کے لئے جائیں تو بھی اس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت عورت اور مرد پیدا ہو چکے تھے کیونکہ اس جگہ کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کے لئے کوئی بیوی پیدا کی تھی بلکہ ایک امر واقعہ کے طور پر اس کا ذکر ہے کہ تُو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پہلے سے موجود تھی اور عورت کو اس وقت پیدا نہیں کیا گیا تھا اگر اس وقت عورت کا وجود نہ تھا اور نئے سرے سے عورت بنائی گئی تھی تو چاہیئے تھا کہ اس کا بھی ذکر کیا جاتا مگر قرآن کریم تو عورت کے وجود کو ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر لیتا ہے اور آدم علیہ السلام کو اسی طرح اپنی بیوی سمیت جنت میں رہنے کا حکم دیتا ہے جس طرح کہ موجودہ زمانہ میں کسی مرد اور اسکی بیوی کے متعلق کوئی حکم دیا جا سکتا ہے سورۂ اعراف ع۲ میں بھی یہ حکم اس رنگ میں بیان ہُوا ہے اور وہاں بھی بیوی کے پیدا کرنے کا کوئی ذکر نہیں سورۂ طٰہٰ میں بھی بیوی کا ذکر ہے اور ان الفاظ میں ہُوا ہے فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ (ع۷) اے آدم شیطان تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے یہاں بھی بیوی کا اس طرح ذکر ہے گویا کہ اس کا وجود عام قاعدہ کے مطابق تھا نہ کہ کسی معجزانہ رنگ میں اور اس کے خاص طور پر پیدا کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔

اسی طرح آیت زیر تفسیر کے بعد لکھا ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ اور ہم نے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے اور تم سب کے لئے اسی دُنیا میں ایک وقت تک رہنا اور فائدہ اُٹھانا ہوگا اس آیت میں جن لوگوں کو وہاں سے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ایک جماعت ہے پس معلوم ہُوا کہ آدم اور اسکی بیوی کے سوا اور اشخاص بھی اس وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اگر کہا جائے کہ جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ شیطان بھی وہاں تھا تو بھی وہ استنباط باطل نہیں ہوتا جو اس آیت سے میں نے کیا ہے کیونکہ اگر شیطان کو اس حکم میں شامل کیا جائے تو ماننا پڑیگا

کہ شیطان بھی آدم کی جنس میں سے تھا کیونکہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم کے ساتھ نکلنے والے سب کے سب اکٹھے اس زمین پر رہیں گے اور ایک دوسرے سے معاملات رکھیں گے پس اگر شیطان اس حکم میں شامل ہے تو وہ بھی جنس آدم سے قرار پاتا ہے اور اس طرح بھی آدم پہلا انسان قرار نہیں پا سکتا اور اگر شیطان کو اس حکم سے باہر رکھا جائے تو پھر آدم اور اسکی بیوی کے سوا اور انسانی وجودوں کو ماننا پڑے گا کیونکہ اس آیت میں دو سے زیادہ اشخاص کو نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اور انسانوں کی ایک جماعت کے پائے جانے کا ثبوت ملتا ہے (میرا یہی خیال ہے کہ اس حکم میں شیطان بھی شامل ہے اور یہ کہ شیطان جس نے آدم کو دھوکا دیا اس وقت کے ان بشروں میں سے ایک بشر تھا جو آدم پر ایمان نہ لاتے تھے اور ان کی شریعت کے جوئے کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے)

اس کے بعد پھر اگلی آیت میں فرمایا ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ اس وقت بہت سے اور افراد بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے کیونکہ اس آیت میں پھر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس آیت سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے سوا ایک جماعت تھی کیونکہ فرماتا ہے کہ اے جماعت اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو یاد رکھو کہ جو میری ہدایت پر چلیں گے ان کو کوئی خوف یا حزن پیش نہ آئے گا ظاہر ہے کہ اس حکم کے مخاطب حضرت آدم علیہ السلام نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ تو خود وقت کے نبی تھے پس اس کے مخاطب ان کے ساتھی تھے جو قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ایک جماعت کی حیثیت رکھتے تھے یہی الفاظ سورۂ اعراف میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

شاید اس جگہ کوئی کہے کہ سورۂ طٰہٰ ع ۷ میں قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا کے الفاظ آئے ہیں یعنی تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف آدم اور انکی بیوی کو وہاں سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا اور ان کے ساتھ اس وقت کوئی اور آدمی نہ تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک سورۂ طٰہٰ میں اِهْبِطَا کے الفاظ آئے ہیں مگر ان کے آگے جَمِيْعًا کا لفظ بھی رکھا ہوا ہے اس لفظ کو ساتھ ملا کر ترجمہ کیا جائے تو ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں سب کے سب چلے جاؤ ساری آیت یوں ہے قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰہٰ ع ۷) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں سب کے سب چلے جاؤ پس جب تم سب کی طرف میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ نہ گمراہ ہونگے نہ دکھ میں پڑینگے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ تم دونوں سے مراد آدم اور انکی بیوی نہیں بلکہ آدم اور شیطان کی جماعتیں مراد ہیں کیونکہ اگر آدم اور انکی بیوی دونوں مراد ہوتے تو اس کے بعد "تم سب" کے الفاظ استعمال نہ ہوتے "تم سب" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ دونوں سے مراد دو فرد نہیں بلکہ دو جماعتیں ہیں پس یہ آیت میرے استدلال کے خلاف نہیں بلکہ اسکی تائید کرتی ہے پھر ہدایت کے ذکر میں بھی جمع کا لفظ استعمال کر کے اس امر کی اور وضاحت کر دی گئی ہے سورۂ حجر میں بھی آتا ہے کہ جب شیطان نے آدم کے خلافت پر مبعوث ہونے پر فرمانبرداری سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق زجر کی تو اس نے کہا کہ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (الحجر ع ۳) یعنی اے میرے رب چونکہ تُو نے مجھے آدم کی وجہ سے ہلاک کیا ہے میں ان سب کو زمین میں بُری باتیں خوبصورت کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو ہلاک کروں گا سوائے ان کے جو ان میں سے تیرے مخلص بندے ہونگے اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ شیطان اس وقت اپنے خلاف ایک جماعت کو پاتا تھا۔ بیشک کہا جا سکتا ہے کہ اس سے شیطان کی مُراد آدم کی اولاد سے ہے لیکن آدم کی اولاد تو دوسرے نمبر پر آئے گی پہلا افراد اس کا تو آدم اور اس کے ساتھیوں کے

متعلق ہی ہوسکتا ہے پس جب وہ ایک جماعت کا ذکر کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک جماعت موجود تھی۔

شاید اس جگہ کسی کو یہ اعتراض پیدا ہو کہ اوپر کی تشریح سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی بشر کی نسل میں سے تھا حالانکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (اعراف ع ۲) یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا کہ باوجود اسکے کہ مَیں نے تجھے حکم دیا تھا تجھے کس امر نے اس بات سے روکا کہ تو آدم کی فرمانبرداری کرے تو اس نے جواب دیا کہ مَیں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو پانی ملی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے اسی طرح ابلیس کی نسبت آتا ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (کہف ع ۷) یعنی ابلیس جنوں میں سے تھا تبھی اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور جنوں کی نسبت آتا ہے کہ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (رحمٰن ع ۱) اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آگ کے تیز شعلہ سے پیدا کیا ہے پس جبکہ انسان اور جن کی پیدائش میں فرق ہے ایک طین سے پیدا ہوا ہے اور دوسرا آگ سے تو اِن دونوں کو ایک جنس کیونکر سمجھا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان میں فرق کیا گیا ہے جہاں کہیں آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں ابلیس کا ذکر ہے اور جہاں کہیں آدمؑ کو ورغلانے کی کوشش کا ذکر ہے وہاں شیطان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً انہیں آیات زیر تفسیر میں جہاں سجدہ کا ذکر ہے وہاں تو ابلیس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور جب آدمؑ کو ورغلانے کا ذکر کیا ہے تو فرمایا فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا یعنی پھر شیطان نے انکو اِس حالت سے پھسلا دیا اسی طرح سورۂ اعراف کے رکوع ۲ میں اِس واقعہ کا ذکر ہے وہاں بھی جہاں سجدہ کے حکم کا ذکر ہے ابلیس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن جہاں ورغلانے کا ذکر ہے وہاں فرماتا ہے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ پھر انہیں شیطان نے شک میں ڈال دیا تیسری سورۃ جہاں اس واقعہ کا ذکر ہے سورہ طٰهٰ ہے وہاں بھی جہاں کہ سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں ابلیس کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جہاں آدم کو شک میں ڈالنے کا ذکر ہے وہاں فرماتا ہے فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ شیطان نے آدمؑ کے دِل میں شک پیدا کر دیا (طٰهٰ ع ۷)

کیا شیطان بشر کی نسل سے تھا۔

ہر آیت میں دونو مواقع پر الگ الگ الفاظ کا استعمال کرنا حکمت سے خالی نہیں قرآن کریم جو لفظ لفظ میں حکمت کو مدِنظر رکھتا ہے ممکن ہی نہیں کہ اس فرق میں کہ ہر جگہ سجدہ کے ذکر میں ابلیس کا لفظ استعمال کرتا ہے اور آدم کو ورغلانے کے ذکر میں شیطان کا لفظ استعمال کرتا ہے کوئی حکمت مدنظر نہ رکھتا ہو پس ضرور ہے کہ سجدہ سے انکار کرنے والا کوئی اور وجود ہو اور ورغلانے والا کوئی اور وجود ہو۔ اسی وجہ سے ایک کا نام ابلیس بتایا گیا اور دوسرے کا شیطان۔ پس اگر کوئی اس شبہ پر زور دے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نار سے پیدا کرنے کا ذکر تو ابلیس کے متعلق ہے نہ کہ شیطان کے متعلق (میرے نزدیک جو اس فرق کی وجہ ہے آگے چلکر متعلقہ آیات کے ضمن میں بیان کیجائیگی)

دوسرا جواب اور یہی اصلی جواب ہے یہ ہے کہ نار سے پیدا کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ابلیس یا جن اس مادی آگ سے پیدا کئے گئے تھے بلکہ یہ ایک عربی کا محاورہ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اسکی طبیعت ناری تھی اور وہ اطاعت کی برداشت نہیں کرسکتا تھا چنانچہ یہ محاورہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی استعمال ہوا ہے فرماتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ (انبیاء ع ۳) یعنی انسان کو عجلت سے پیدا کیا گیا ہے میں تم کو اپنی آیات دکھاؤں گا پس جلدی نہ کرو اب یہ ظاہر ہے کہ اس آیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عجلت اور جلدی کوئی مادہ ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ انسانی طبیعت جلد باز واقع ہوئی ہے وہ ہر کام کا نتیجہ جلدی دیکھنا چاہتا ہے اسی طرح قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (روم ع ۶) اللہ ہی ہے جس نے تم کو ضعف سے

ابلیس کے آگ سے پیدا کئے جانے کا مطلب۔

پیدا کیا ہے اس آیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ضعف کوئی مادہ ہے جس سے انسان کو پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس سے مُراد صرف یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں کمزوری ہے وہ خود اپنے لئے ہدایت کا راستہ تیار نہیں کرسکتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آنے کا محتاج ہے ان محاوروں کے رو سے جنوں کے اور ابلیس کے نار سے پیدا کرنے کے یہ معنے ہیں کہ انکی طبیعت ناری تھی یعنی جب تک انسان میں تمدن کی حکومت قبول کرنے کا ملکہ پیدا نہ ہُوا تھا وہ ناری مزاج کا تھا اور اس کے لئے دوسرے کی اطاعت قبول کرنا آسان نہ تھا مگر جب وہ ترقی کرتے کرتے طینی جوہر کو جو اس کا اصل تھا پا گیا تو اس میں اطاعت کے قبول کرنے کا مادہ پیدا ہو گیا اور ابلیس کے مقال کا صرف یہ مطلب ہے کہ آدم تو غلام ذہنیت رکھتا ہے کہ دوسرے کی اطاعت کرسکتا ہے مگر میں ناری مزاج ہوں اور دوسرے کی اطاعت نہیں کرسکتا پس میں اس سے اچھا ہوں اور یہ دعویٰ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا طبعی دعویٰ تھا وہ اپنی خیالی حریت کو اطاعت سے بہتر خیال کرتے تھے اور ایک نظام کے ماتحت چلنے کو عیب خیال کرتے تھے آج بھی جو لوگ ابلیس کے اظلال ہیں اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ کسی دوسرے انسان کی اطاعت کرنا گویا اپنے نفسوں کو ذلیل کرنا ہے انارکسٹ رجحانات کے لوگ اسی قسم میں شامل ہیں۔

قرآن کریم میں اِس ناری طبیعت کا محاورہ ایک اور جگہ بھی استعمال ہُوا ہے فرماتا ہے کہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (سورہ لہب) یعنی شعلہ کے باپ کے دونوں ہاتھ برباد ہو گئے اور وہ تو دبھی برباد ہو گیا اس آیت میں ابولہب یعنی شعلوں کا باپ کسی کا نام نہیں بلکہ ایک مخالفِ اسلام کی صفت بتائی ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسکے ہاں آگ پیدا ہوتی تھی بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ اسکی طبیعت ناری تھی اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغض اور حسد سے جلتا رہتا تھا اور آپ کی مخالفت میں آگ بنا رہتا تھا۔

اس شبہ کا جواب کہ اگر آدم اور ان کی بیوی ایک ہی جوڑا تھے تو انکی اولاد کی شادی کس سے ہوئی تھی

اوپر کی آیات میں جو یہ ذکر آیا ہے کہ صلصال سے پیدا ہونے والے انسانوں سے پہلے دُنیا میں جنّ بستے تھے اس کی تشریح متعلقہ آیات کے ماتحت آئے گی (کسی قدر اس کا ذکر سورہ حجر کے نوٹ ۲۵ میں بھی آیا ہے جسکی تفسیر پہلے شائع ہو چکی ہے اس میں دیکھنا چاہیئے)

جو کچھ قرآن کریم کی آیات زیر تفسیر اور دوسری آیات کی روشنی میں اوپر لکھا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق (۱) انسان کی پیدائش یکدم نہیں ہوئی بلکہ باریک در باریک ذرّات کی صورت سے ترقی کرکے اور مختلف احوال میں سے گذر کر انسانی شکل اختیار کی ہے (۲) انسان شروع سے ہی بطور انسان پیدا کیا گیا ہے اور وہ فلاسفروں کے خیال کے مطابق جانوروں کے ارتقاء کا اتفاقی نتیجہ نہیں ہے (۳) سب سے پہلا الہام الٰہی پانے والا وجود وہ تھا جو نطفہ سے پیدا ہونے والا تھا یعنی سب سے پہلے حیوانی شکل اختیار کرنے والا وجود ملہم من اللہ نہ تھا بلکہ اسکی نسل میں سے ایک کامل وجود اس مقام کا مستحق ہُوا جس کا نام قرآن کریم کے رو سے آدم تھا (۴) اس سے پہلے آدم کے زمانے میں اس کے علاوہ اسکے اور ہمجنس بھی تھے اور انہی کے نظام اور ہدایت کے لئے آدم خلیفہ بنایا گیا تھا یہ لوگ اس کے ساتھ اس جنت ارضی میں رہتے تھے جس میں آدم علیہ السلام رکھے گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی وہ اس جنت ارضی سے نکالے بھی گئے۔

اگر اوپر کے مطالب کو درست سمجھا جائے (اور میں سمجھتا ہوں کہ مَیں قرآن کریم کی مختلف آیات سے اس امر پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں کہ وہ مطالب درست ہیں) تو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ شبہ کہ آدم اور اسکی بیوی اگر ایک ہی جوڑا تھے تو پھر ان کی اولاد کی شادی کس سے ہوئی تھی اگر بھائی بہنوں کی آپس میں شادی ہوئی تھی تو یہ قابل اعتراض اور گھنونا امر ہے بے بنیاد شبہ ہے کیونکہ اوپر کی تشریح کے مطابق شریعت آدم سے شروع ہوئی اور اس وقت تک بہت سے دوسرے انسان پیدا ہو چکے تھے باقی رہا ان سے پہلے کا زمانہ سو اس وقت تک انسانی دماغ بالقوۃ انسانی دماغ نہ بنا تھا اور شریعت کو سمجھنے یا اس پر عمل کرنے کے قابل ہی نہ تھا پس اسکے کسی فعل کو قابل اعتراض نہیں کہا جاسکتا نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ

آدم علیہ السلام سے پہلے کے بشر ایک ہی جوڑے سے ترقی پاکر بنے ہوں جس طرح یہ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی جوڑے سے ترقی پاکر بنے ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے بلکہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ وہ کئی جوڑوں سے ترقی پاکر بنے ہوں۔

اس بارہ میں مَیں بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کے اس مکالمہ کے ذکر کے بغیر نہیں رہ سکتا جو ان میں اور ایک آسٹریلین سٹرانومسٹ کے درمیان ہوا یہ آسٹریلین پروفیسر ١٩٠٨ء میں ہندوستان کی سیر کو آیا تھا اور اس نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں لیکچر بھی دیئے تھے جن دنوں وہ لاہور میں تھا وہ بانی سلسلہ احمدیہ سے بھی ملا تھا اور اس نے ان سے اس مضمون کے بارے میں سوال کیا تھا اس کا سوال اور آپ کا جواب اس بارہ میں مَیں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

سوال۔ بائبل میں لکھا ہے کہ آدم یا یُوں کہیئے کہ پہلا انسان جیحون سیحون میں پیدا ہوا تھا اور اس کا وہی ملک تھا تو پھر کیا یہ لوگ جو دُنیا کے مختلف حصّوں امریکہ۔ آسٹریلیا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں یہ اس آدم کی اولاد سے ہیں۔

جواب۔ فرمایا ”ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں ہم توریت کی پیروی کرتے ہیں کہ چھ سات ہزار سال سے ہی جب سے یہ آدم پیدا ہوا تھا اس دنیا کا آغاز ہوا ہے اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور خدا گویا معطّل تھا اور نہ ہی ہم اس بات کے مدّعی ہیں کہ یہ تمام نسل انسانی جو اس وقت دُنیا کے مختلف حصّوں میں موجود ہے یہ اسی آخری آدم کی نسل ہے ہم تو اس آدم سے پہلے بھی نسل انسانی کے قائل ہیں جیسا کہ قرآن شریف کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے خدا نے یہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً خلیفہ کہتے ہیں جانشین کو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی پس امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس آخری آدم کی اولاد میں سے ہیں یا کسی دوسرے آدم کی اولاد میں سے ہیں“ (الحکم ۲۰ مئی ۱۹۰۸ء)

اس بارہ میں امتِ اسلامیہ کے گزشتہ اہم ترین صاحبِ کشف

ابتدائے نسل انسانی کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک انگریز سے مکالمہ

لوگوں میں سے ایک حضرت محی الدین صاحب ابن عربی اپنے ایک عجیب کشف کا ذکر اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں اس وقت کچھ اور لوگ بھی طواف کر رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔

لَقَدْ طُفْنَا کَمَا طُفْتُمْ سِنِیْنًا
بِھٰذَا الْبَیْتِ طُرًّا اَجْمَعِیْنَا

یعنی ہم سب نے بھی اسی طرح اس گھر کا سالوں طواف کیا ہے جس طرح تم نے اس گھر کا طواف کیا ہے۔ اسپر وہ کہتے ہیں میں نے ان لوگوں میں سے ایک شخص سے بات کی اس نے جواب میں کہا کہ کیا تم مجھ کو نہیں پہچانتے میں تمہارے پہلے دادوں میں سے ایک ہوں فرماتے ہیں میں نے اس سے پُوچھا آپ کو کتنا عرصہ گزرا ہے اس نے جواب دیا چالیس ہزار سال سے زیادہ گزرے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسپر مَیں نے کہا کہ اتنا عرصہ تو آدم پر نہیں گزرا اس کے جواب میں اس شخص نے جواب دیا کہ تم کون سے آدم کے متعلق سوال کرتے ہو جو سب سے زیادہ تم سے قریب ہے یا کسی اور کے متعلق۔ اس جواب کو سُن کر وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسپر مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ وہ جدِ اکبر جس نے مجھے اپنی طرف منسوب کیا ہے ان میں سے ایک ہونگے۔ (فتوحات مکیہ جلد ثالث الفصل الخامس فی المنازلات الباب التسعون وثلث مائتہ)

انسانی وجود کی ابتداء پر روشنی ڈالنے والا حضرت محی الدین ابن عربی کا ایک کشف۔

اس کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیم آدم جسکی طرف اس زمانہ کے لوگ منسوب ہوتے ہیں پہلا آدم نہیں بلکہ آخری آدم ہے اور یہ بھی کہ آدم کا لفظ کبھی بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے یعنی جدِ اکبر کے معنوں میں اور ضروری نہیں کہ اس سے مراد وہی آدم اوّل ہو جو الہام کے لحاظ سے سب سے اوّل تھا اس کشف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بشر کی نسل بہت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے اور یہ جو سات ہزار سال کا دور اس دُنیا کی پیدائش کے متعلق احادیث میں مذکور ہے اس سے مراد صرف آخری آدم کا دور ہے

ذکر دَورِ بشر بحیثیت مجموعی۔

غرض اوپر کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ مجھ سے پہلے ایسے صاحبِ کشف لوگوں نے جنکی رائے ہی قرآن کریم کی تفسیر کے بارے میں ماننے کے قابل ہے اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ نسلِ انسانی ایک آدم سے نہیں چلی بلکہ متعدد آدم پہلے گزر چکے ہیں اور یہ کہ آدم مذکور جس کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے ان آدموں میں سے ایک فرد ہے نہ کہ صرف ایک ہی فرد۔

انسانوں کو نفسِ واحد سے پیدا کئے جانے کا مطلب۔

اس موقعہ پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے کہ آدم مذکور سے پہلے بھی بشر کی نسل موجود تھی اور انکی نطفہ سے پیدائش ہو رہی تھی تو پھر قرآن کریم میں یہ کیوں فرماتا ہے کہ تم کو ایک جوڑے سے پیدا کیا گیا ہے اور احادیث میں یہ کیوں آتا ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس امر کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں آتا ہے سورۂ نساء رکوع سورۂ اعراف رکوع ۲۴۔ اور سورۂ زمر رکوع ان میں سے سورۂ نساء میں تو یہ لفظ ہیں خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اس نفس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور سورۂ اعراف میں یہ الفاظ ہیں جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اس نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور سورۂ زمر میں یہ الفاظ ہیں ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ ان تینوں حوالوں میں آدم کا کہیں ذکر نہیں صرف یہ ذکر ہے کہ تم کو ہم نے ایک نفس سے پیدا کیا ہے پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا ان تینوں آیات میں سے جو ہم معنی ہیں زیادہ صراحت سورہ اعراف کی آیات میں ہے وہاں فرماتا ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (اعراف ع ۲۴) یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا ہے تاکہ اسکی طرف مائل ہو کر تسکین حاصل کرے پھر جب اس نفس واحدہ نے اپنی بیوی سے مباشرت کی تو وہ ایک ہلکا سا حمل لیکر جدا ہوئی پھر جب وہ حمل نمایاں ہُوا تو اس نفس واحدہ اور اسکی بیوی نے اللہ اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو ہم کو تندرست بچہ عطا کرے تو ہم ضرور شکرگزار ہونگے پھر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں تندرست بچہ عطا فرمایا تو انہوں نے اس کے متعلق شرک کرنا شروع کر دیا یعنی یہ کہنے لگے کہ یہ بچہ تو ہمیں فلاں بُت یا دیوی کی بدولت ملا ہے اور اللہ تعالیٰ تو ان کے شرک سے بہت بلند ہے۔ اس آیت پر غور کرو کہ یہ کسی صورت میں بھی آدم اور انکی بیوی پر چسپاں نہیں ہوتی کیونکہ آدم علیہ السلام تو خدا تعالیٰ کے نبی تھے اور اس نفسِ واحد کی نسبت اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ اولاد ہونے پر مشرک ہو گیا تھا اور اسکی بیوی بھی مشرک ہو گئی تھی۔

پس حق یہ ہے کہ نفس واحدہ سے اس جگہ پہلا بشر مراد نہیں اور نہ آدم علیہ السلام بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ ایک ایک انسان سے بڑی بڑی اقوام پیدا ہو جاتی ہیں اور اولاد اپنے ماں باپ کے اثر کو قبول کر کے وہ کافر ہوں تو کافر مشرک ہوں تو مشرک اور مُوحد ہوں تو مُوحد ہو جاتی ہے پس شادی کرتے ہوئے انسان کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور اپنی اولاد کی تربیت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے تا یہ نہ ہو کہ ماں باپ کی غلطیاں اولاد میں پیدا ہو کر ہزاروں لاکھوں انسان گند میں مبتلا ہو جائیں۔

یہ جو فرمایا وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی قسم سے اس کا جوڑا بنایا یعنی بیوی اور میاں ایک ہی جنس میں سے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے خیالات سے متأثر ہوتے ہیں نہ یہ کہ بیوی میاں کی پسلی سے پیدا کی جاتی ہے کیونکہ اگر یہ معنے کئے جائیں تو ماننا پڑے گا کہ جس قدر مشرک لوگ ہوتے ہیں انکی بیویاں انکی پسلیوں سے پیدا کی جاتی ہیں کیونکہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پہلا بشر مُراد نہیں اور جب پہلا بشر یہاں مُراد نہیں تو ماننا پڑے گا کہ ہر

مرکی بیوی اس کی پسلی سے پیدا کی جاتی ہے جو بالبداہت باطل ہے (اس مضمون کو پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت کے نیچے انشاء اللہ بیان کیا جائے گا)۔

اب رہا یہ سوال کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اس سے تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آدم اکیلے پیدا کئے گئے تھے اور ان سے پہلے کوئی بشر نہ تھا پھر جب آدم کی پسلی سے عورت پیدا ہوئی تو اس سے انسانی نسل چلی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حدیث جس سے بعض لوگ دھوکا کھاتے ہیں ان الفاظ میں ہے اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ (مسلم جلد دوم کتاب الرضاع باب الوصیۃ بالنساء) یعنی عورتوں کے متعلق نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری نصیحت کو قبول کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اس حدیث کی پوری تشریح تو میں سورۂ نساء کی آیت کے ماتحت ہی لکھوں گا اس جگہ کے مناسب حال صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس حدیث میں آدم کی بیوی کا ذکر نہیں بلکہ عورت کا ذکر ہے اور ہر عورت کے پسلی سے پیدا ہونے کا بیان ہے اور ہر عورت کی پیدائش جس طرح ہوتی ہے اسے ہم سب لوگ جانتے ہیں پس مشاہدہ کے خلاف اس حدیث کے یہ معنے ہرگز نہیں کئے جا سکتے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے معنی وہی ہیں جو آئمہ لغات نے کئے ہیں حدیث کی مستند لغت کی کتاب مجمع البحار میں شیخ محمد طاہر صاحب لکھتے ہیں۔ فَاِنَّھُنَّ خُلِقْنَ مِنَ الضِّلَعِ اسْتِعَارَةٌ لِلْمُعْوَجِ اَیْ خُلِقْنَ خَلْقًا فِیْهِ الْاِعْوِجَاجُ (مجمع البحار جلد اوّل زیر لفظ ضلع) یعنی یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں یہ کلام استعارہ کی قسم سے ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کے اخلاق میں ناز کا پہلو غالب ہوتا ہے یعنی خاوند سے اختلاف کرنے کو ان کا دل طبعاً چاہتا ہے اور یہ امر تجربہ سے ثابت ہے کہ عورت اپنے خاوند سے اختلاف کر کے اس سے اپنی بات منواتی ہے اور اس پر اثر ڈالکر اس پر حکومت کرتی ہے اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ عورت پر جبری حکومت نہ کیا کرو بلکہ محبت سے اسے منوایا کرو اور اس کے احساسات کا خیال رکھا کرو کیونکہ چونکہ وہ بہت سی باتوں میں مرد کے تابع ہوتی ہے۔ طبعاً مرد کے ہر حکم کو پرکھنا چاہتی ہے اور اس سے اختلاف ظاہر کرتی ہے تا حقیقت کو معلوم کرے پس مرد کو بھی چاہیئے کہ عورت سے جو بات منوائے دلیل اور محبت سے منوائے۔ اگر جبر اور زور سے منوائے گا تو عورت کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کا پیار کا تعلق مرد سے نہیں رہے گا۔

عورت کے پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب۔

خلاصہ یہ کہ اوپر کی آیات اور حدیث سے بھی ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم پہلے بشر تھے اور یہ کہ ان کے جسم سے ان کی بیوی پیدا کی گئی۔ بلکہ آیات اور حدیث دونوں میں تمام بنی نوع انسان کا ذکر بطور قاعدہ کلیہ کے ہے نہ کہ خاص طور پر آدم اور ان کی بیوی کا۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو وہ اعتراض بھی دُور ہو گیا جو بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ جب سب انسان آدم کی اولاد سے ہیں تو کیا آدم کی نسل میں بہن بھائی کی شادی ہوا کرتی تھی کیونکہ یہ اعتراض صرف آدم کی نسل پر پڑ سکتا تھا جو پہلا کامل العقل اور حامل الشریعت انسان تھا لیکن جب اس کے زمانہ میں اور انسانوں کا وجود ثابت ہو گیا تو یہ اعتراض بھی باقی نہ رہا۔ باقی رہے اس سے پہلے کے انسان تو ان پر یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ وہ اوّل تو کامل العقل اور حاملِ شریعت ہی نہ تھے۔ دوسرے ان کی نسبت بھی یہ ثابت نہیں کہ وہ ایک ہی بشر سے پیدا ہوئے تھے بلکہ ممکن ہے کہ وہ بھی ایک ہی وقت میں کئی مرد اور کئی عورتیں پیدا کئے گئے ہوں

انسان صفاتِ الٰہیہ کا ظلّی حامل

انسان صفاتِ الٰہیہ کا ظلّی حامل

اسی آیت سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان صفاتِ الٰہیہ کا ظلّی طور پر حامل ہے کیونکہ اس آیت میں آدم کو خلیفہ بنانے کا ارشاد ہے اور خلیفہ کے ایک معنے دوسرے کی صفت کو جاری رکھنے کے ہوتے ہیں جیسے بادشاہ کا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو بادشاہ کے اختیارات کو چلاتا ہے پس خلیفۃ اللہ وہ ہوا جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو جاری رکھے اور چونکہ آدم انسانیت کا پہلا کامل مظہر تھا اور دوسرے

انسانوں کو اپنے نقش قدم پر چلانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سب انسان ہی خلیفۃ اللہ ہونے کی قدرت رکھتے ہیں اور اس کی صفات کو اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ اس مقدرت کو ظاہر کریں یا نہ کریں۔

آدم کا تمدن

آدم کا تمدن چونکہ اس آیت میں سب سے پہلے خلیفۃ اللہ کا ذکر ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ آدم کے تمدن کا بھی ذکر کر دیا جائے جس کے قیام کے لئے آدم کو مبعوث کیا گیا تھا اور جو اس کی خلافت کا اصل مقصد تھا۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم نے اپنی خلافت کو جس تمدن کے قیام سے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل اصول پر مبنی تھا۔

آدم کی جماعت کے چھ فرائض

۱۔ آدم کی جماعت کا فرض مقرر کیا گیا تھا۔ کہ وہ شادی کریں جیسا کہ یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (بقرہ ع۴) کے حکم سے معلوم ہوتا ہے۔ آدم سے پہلے چونکہ شریعت نازل نہ ہوئی تھی۔ شادی کا خاص دستور بشر میں نہ تھا۔ آدم کے ذریعہ سے شادی کا حکم جاری ہوا۔ بائبل نے اس واقعہ کو مسخ کر کے بیان کیا ہے مگر اس کا یہ بیان کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آدم کیلئے ایک بیوی تیار کرے (پیدائش باب ۲) اس تحقیق کی روشنی میں کہ آدم سے پہلے بشر موجود تھے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گو آدم سے پہلے بشر تھے مگر کوئی باقاعدہ نکاح کا طریق رائج نہ تھا اور بیوی بنانے کا اصل مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق احکام بتائے گئے۔

۲۔ جماعت آدم کو کچھ امور کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور کچھ امور سے اجتناب کا بھی حکم دیا گیا تھا جیسا کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (بقرہ ع۴) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

۳۔ وہ تعاون سے اپنی جماعت کے کھانے پینے کا انتظام کریں۔

۴۔ پانی کا انتظام کریں۔

۵۔ لباس پہنیں۔ اور ننگے نہ رہیں۔

۶۔ مکان بنائیں اور اکٹھے رہیں۔

تین سے چھ تک کے امور اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰہٰ ع۷) یعنی اے آدم جس مقام پر ہم تم کو رکھنے لگے ہیں۔ اس میں تمہارا فرض ہوگا۔ کہ بھوکے نہ رہو۔ اور ننگے نہ رہو اور پیاسے نہ رہو۔ اور دھوپ کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ بعض لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ یہ آدم کی جنت کی تفصیل ہے لیکن یہ جنت کی تفصیل نہیں ہو سکتی۔ بھوکے پیاسے تو درندے بھی نہیں رہتے اور نہ وہ دھوپ میں تپتے ہیں۔ یہ امور تو اسی دنیا میں جانوروں تک کو میسر ہیں پس یہ جنت کی تفصیل نہیں۔ آدم کے تمدن کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور پہلی انسانی سوسائٹی کو بتایا گیا ہے کہ ایک جگہ رہنے سہنے کے نتیجہ میں بعض دفعہ ایک حصہ آبادی کا اپنی خوراک مہیا نہیں کر سکتا یا لباس مہیا نہیں کر سکتا پس جہاں تم کو تمدن کی برکات سے حصہ دیا جاتا ہے وہاں اس کی خرابیوں کے دور کرنے کا خیال رکھنا بھی تمہارا فرض ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا اور غریبوں کی مدد کرنا تمہارے ذمہ لگایا جاتا ہے اگر کوئی بوڑھا ہو جائے یا غریب ہو جائے یا اور کسی طرح معذور ہو جائے تو یہ سب کا فرض ہوگا کہ اس کے لئے روٹی اور لباس اور پانی اور رہائش کا انتظام کریں یہ اصول تمدن ایسے اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ دنیا کبھی ان سے آزاد نہیں ہوئی لیکن افسوس کہ کبھی بھی دنیا نے اس طرف پوری طرح توجہ نہ کی سوائے اسلام کے جس کے اصولوں میں حکومت کے فرائض میں یہ امور داخل ہیں مگر افسوس کہ انھوں نے بھی بعد زمانہ خلافت ان اصول پر عمل نہیں کیا اور اس کا نتیجہ آج دنیا کو فسادوں اور جھگڑوں اور قتل و خونریزی کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔

خلیفہ جیسا کہ پہلے حل لغات اور نوٹوں میں بتایا جا چکا ہے لفظ خلیفہ کے مندرجہ ذیل معانی ہیں (۱) جو کسی پہلی قوم یا فرد کا قائم مقام ہو (۲) جو کسی بالا افسر کا اسکی زندگی ہی میں دوسرے مقام پر اس کے احکام کے نافذ کرنے کے لئے مقرر ہو (۳) جس کے بعد کوئی اس کا قائم مقام ہو خواہ (ا) اس کے اختیارات یا کام کو چلانے والا (ب) خواہ اس کی نسل لیکن

اس آیت میں جو لفظ خلیفہ کا آیا ہے اس کے معنوں کو قرآن کریم کے محاورہ کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے سو جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو اس میں یہ لفظ مندرجہ ذیل تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) نبی اور مامور کے معنوں میں۔ جیسا کہ اس آیت میں استعمال ہُوا ہے کیونکہ گو آدم اس معنے میں بھی خلیفہ تھا کہ ایک پہلی نسل کے تباہ ہونے پر اس نے اور اس کی نسل نے جگہ لی اور اس معنے میں بھی خلیفہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسکے ذریعہ سے ایک بڑی نسل چلائی لیکن وہ سب سے بڑی اہمیت جو اسے حاصل تھی وہ نبوت اور ماموریت ہی کی تھی جسکی طرف اس آیت میں سب سے پہلا اشارہ ہے۔

نبی یا مامور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہوتے ہیں یعنی صفات الٰہیہ کو اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق دُنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی ظل بنکر ظاہر ہوتے ہیں۔ انہی معنوں میں حضرت داؤد کو بھی خلیفہ کہا گیا ہے (ص عٓ) (۲) دوسرے ہر قوم جو پہلی قوم کی تباہی پر اس کی جگہ لیتی ہے ان معنوں میں بھی خلیفہ کا لفظ قرآن کریم میں متعدد بار استعمال ہُوا ہے مثلاً حضرت ہود کی زبان سے فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف ع ۹) یاد کرو جبکہ خدا تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا یعنی قوم نوح کی تباہی کے بعد ان کی جگہ تم کو دنیا میں حکومت اور غلبہ حاصل ہو گیا اسی طرح حضرت صالح کی زبانی فرماتا ہے وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (اعراف عٓ) یاد کرو جب تم کو خدا تعالیٰ نے عاد اولیٰ کی تباہی کے بعد ان کا جانشین بنایا اور حکومت تمہارے ہاتھ میں آگئی (۳) نبی کے وہ جانشین بھی خلیفہ کہلاتے ہیں جو اس کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں یعنی اسکی شریعت پر قوم کو چلانے والے ہوں اور ان میں اتحاد قائم رکھنے والے ہوں خواہ نبی ہوں یا غیر نبی جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام موعود راتوں کے لئے طور پر گئے تو اپنے بعد انتظام کی غرض سے انہوں نے حضرت ہارون سے کہا کہ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ (اعراف ع ۱۷) یعنی میرے بعد میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ان کی اصلاح کو مدّ نظر رکھنا اور مفسد لوگوں کی بات نہ ماننا

حضرت ہارون خود نبی تھے اور اس وقت سے پہلے نبی ہو چکے تھے پس یہ خلافت جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے انہیں دی تھی وہ خلافت نبوت نہ ہو سکتی تھی اس کے معنے صرف یہ تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں انکی قوم کا انتظام کریں اور قوم کو اتحاد پر قائم رکھیں اور فساد سے بچائیں جہاں تک اس خلافت کا تعلق ہے یہ خلافتِ نبوت نہ تھی بلکہ خلافتِ انتظامی تھی مگر جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں اس قسم کی شخصی خلافت علاوہ خلافتِ انتظامی کے خلافتِ نبوت بھی ہوتی ہے یعنی ایک سابق نبی کی امت کی درستی اور اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ ایک اور نبی کو مبعوث فرماتا ہے جو پہلے نبی کی شریعت کو ہی جاری کرتا ہے کوئی نئی شریعت جاری نہیں کرتا پس جہاں تک کہ شریعت کا تعلق ہوتا ہے وہ پہلے نبی کے کام کو قائم رکھنے والا ہوتا ہے اور اس لحاظ سے پہلے نبی کا خلیفہ ہوتا ہے لیکن عہدہ کے لحاظ سے وہ پہلے نبی کا مقرر کردہ نہیں ہوتا نہ اسکی امت کا مقرر کردہ بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے مقرر کیا جاتا ہے اس قسم کے خلفاء بنی اسرائیل میں بہت سے گذرے ہیں بلکہ جس قدر انبیاء بھی حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے بعد بنی اسرائیل میں آئے ہیں سب اسی قسم کے خلفاء تھے یعنی وہ نبی تو تھے مگر کسی جدید شریعت کے ساتھ نہ آئے تھے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شریعت کو ہی دنیا میں جاری کرنے کے لئے آئے تھے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ ع ۷) یعنی ہم نے تورات اُتاری تھی جس میں ہدایت اور نور تھے۔ تورات کے ذریعہ سے بہت سے نبی جو (موسیٰؑ کے) فرمانبردار تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا یہود کے درمیان فیصلے کرتے تھے اور یہ انبیاء اور ربانی اور احبار تورات پر بطور نگران مقرر تھے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے بعد کچھ انبیاء ایسے آئے تھے جن کا کام

لفظ خلیفہ کے معنے قرآن کریم کے محاورہ کی روشنی میں۔

لفظ خلیفہ کے معنے نبی اور مامور کے۔

موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا قیام تھا، ور وہ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے (۲) ان انبیاء کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی جن کو ربانی اور احبار کہنا چاہیئے اس کام پر مقرر تھے اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور مجدّدین کا ایک لمبا سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلفاء کے طور پر ظاہر ہوتا رہا جن کا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کام کی تکمیل تھا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت مسیح ناصری علیہ السلام تھے جن کو تدبر فی القرآن نہ کرنے کے سبب کئی مسلمان خصوصاً آخری زمانہ کے مسلمان باشریعت نبی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اسی طرح اسی زمانہ کے مسیحی ان کی نسبت یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ وہ ایک نیا قانون لے کر آئے تھے اور اسی وجہ سے وہ ان کی کتاب کو نیا عہد نامہ کہتے ہیں حالانکہ قرآن کریم ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کا قائم کرنیوالا ایک خلیفہ قرار دیتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے چند آیات بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ (مائدہ ع) یعنی ہم نے مذکورہ بالا نبیوں کے بعد جو تورات کی تعلیم کو جاری کرنے کیلئے آئے تھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو انکے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے اور توریت کی پیشگوئیوں کو پورا کرنیوالے تھے خود مسیح ناصری فرماتے ہیں۔

امتِ محمدیہ میں تین قسم کی خلافتوں کا وعدہ۔

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا ہوں۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان و زمین ٹل نہ جائیں۔ ایک نقطہ یا شوشہ توریت کا ہرگز نہیں مٹیگا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔" (متی باب ۵ آیت ۱۷و۱۸)

غرض یوشع سے لے کر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے معاً بعد ان کے خلیفہ ہوئے حضرت مسیح ناصری تک کے سب انبیاء اور مجدّدین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اور ان کی شریعت کو جاری کرنے والے تھے۔

امتِ محمدیہ میں ان تینوں قسم کی خلافتوں کا وعدہ بھی قرآن کریم سے ثابت ہے جن سے افسوس کہ بعض مسلمان غافل رہے اور ان سے صحیح فائدہ نہ اٹھا سکے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (نور ع ۷) یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنوں اور مناسب حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کرتا ہے کہ ضرور انکو بھی زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ضرور ان کے لئے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کرے گا اور ان کے خوف کے بعد امن کی حالت پیدا کردے گا وہ میری عبادت کرینگے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائینگے اور جو لوگ اس کے بعد بھی کفر کرینگے وہ نافرمان قرار دیئے جائیں گے۔

اس آیت میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ انکو پہلی اُمتوں کی طرح کی خلافت حاصل ہوگی اور پہلی امتوں کی خلافت جیسا کہ قرآن کریم سے اوپر ثابت کیا جا چکا ہے تین قسم کی تھی (۱) ایسے انبیاء ان میں پیدا ہوئے جو ان کی شریعت کی خدمت کرنے والے تھے (۲) ایسے وجود ان میں کھڑے کئے گئے جو نبی تو نہ تھے لیکن خدا تعالےٰ کی خاص حکمت نے ان کو ان امتوں کی خدمت کے لئے چن لیا تھا اور وہ اُمت کو صحیح راستہ پر رکھنے کے کام پر خدا تعالےٰ کی حکمت کے ماتحت لگائے گئے تھے (۳) ان امتوں کو خدا تعالےٰ نے پہلی قوموں کا قائم مقام بنایا اور پہلوں سے شوکت چھین کر ان کو دی۔ یہ تین قسم کی خلافتیں ہیں جن کا مسلمانوں سے وعدہ تھا اور تینوں کے حصول سے ہی اسلام کی شوکت پوری طرح ظاہر ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی مسلمانوں کو اس وعدہ کے مطابق پہلی قوموں کی جگہ پر متمکن کر دیا اور ان کے دشمنوں کو ہلاک اور برباد کر دیا اور اگر مسلمان ایمان اور عمل صالح پر قائم رہتے تو ہمیشہ

کے لئے ان کی شوکت قائم رہتی لیکن افسوس کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد دین کی طرف سے ہٹ کر دنیا میں مشغول ہو گئے اور انھوں نے غلطی سے سمجھا کہ دوسری اقوام کی طرح وہ دنیا میں مشغول ہو کر بھی ترقی کر سکتے ہیں حالانکہ قرآن کریم صاف فرما چکا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی دوسری اقوام کی طرح نہ ہوگی بلکہ وہ جب ترقی کرینگے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ سے ترقی کرینگے صدیوں کے تجربہ نے اس صداقت کو ثابت کر دیا ہے۔ کاش وہ اب بھی اپنی ترقی کے گر کو سمجھ کر ایمان اور عمل صالح کی طرف توجہ کریں۔ دوسری قسم کی خلافت انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی جبکہ اول حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ یکے بعد دیگرے نعمتِ خلافت سے متمتع ہوئے اور انکی اس نعمت سے تمام مسلمانوں نے حصہ پایا۔ اگر بعد کے مسلمان اس نعمت کی قدر کرتے تو وہ صحابہ کی ترقی کی راہ پر گامزن رہتے اور آج اسلام کہیں کا کہیں پہنچا ہوا ہوتا لیکن افسوس انھوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہ کی اور بادشاہت کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس شان کو کھو بیٹھے جو خلافت کے ذریعہ ان کو حاصل ہوئی تھی۔ تیسری قسم کی خلافت جو تابع انبیاء کے ذریعہ سے حاصل ہوتی تھی اس کی طرف سے مسلمان ایسے غافل ہوئے کہ آخری زمانہ میں اس قسم کی نبوت کا سرے ہی سے انکار کر دیا اور باب نبوت کو خواہ غیر تشریعی ہی کیوں نہ ہو بند کر کے اس عظیم الشان فضل سے منکر ہو گئے جو اس زمانہ میں صرف اسلام سے ہی مخصوص تھا اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نبی ہونے کا ایک زبردست ثبوت تھا کیونکہ تابع کی نبوت متبوع کی نبوت اور شان کو بڑھاتی اور روشن کرتی ہے نہ کہ کم کرتی ہے۔

جماعتِ احمدیہ کا ایمان ہے کہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے ذریعہ سے اس پُرفتن زمانہ کی اصلاح اور اسلام کو دوبارہ اس کے مقام پر کھڑا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پھر اس تابع نبوت کا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان کے مناسب حال امتی نبوت ہے دروازہ کھولا ہے اور آپ کے ذریعہ سے اس نے پھر آپ کے ماننے والوں میں خلافت کو بھی زندہ کر دیا ہے جس سے پھر ایک دفعہ ساری دنیا میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ایک ہاتھ پر جمع ہو کر خدمتِ اسلام کر رہا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کے لئے رات دن جد و جہد کر رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب پھر دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور کفر بھاگ جائے گا۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسلمانوں کی شوکت کے مٹ جانے کی ایک وجہ۔

جماعتِ احمدیہ کے ذریعہ سے خلافت کا احیاء۔

ملائکہ

اس آیت میں ملائکہ کا بھی ذکر آتا ہے پس ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے متعلق قرآنی تعلیم کو اجمالی طور پر بیان کر دیا جائے تا آئندہ جہاں جہاں ملائکہ کا ذکر آئے ان کے بارہ میں قرآنی نقطۂ نگاہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہاں تفصیلات متعلقہ آیات کے نیچے اپنی اپنی جگہ بیان ہونگی۔

جدید فلسفہ سے متأثر نوجوانوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا غلط اندازہ لگا کر ملائکہ کی نسبت یہ خیال پیدا کر لیا ہے کہ ملائکہ کا وجود چونکہ الوہیت کے منافی ہے اس لئے ملائکہ کا کوئی وجود نہیں ہے اور جو لوگ مذہب کے اثر سے ابھی تک پوری طرح آزاد نہیں ہوئے انھوں نے فرشتوں کے لفظ کی توجیہہ کر کے اپنے نفس کو تسلی دے لی ہے وہ کہتے ہیں کہ ملائکہ سے مُراد وہ نیک جذبات ہیں جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں۔

ملائکہ کے وجود کو الوہیت کے منافی قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے نوجوان اللہ تعالیٰ کا نقشہ یہ کھینچتے ہیں کہ وہ ایک وراء الوریٰ ہستی ہے اور اوّل تو اس کا اس دنیا کے کاروبار سے کوئی تعلق ہی نہیں اس لئے اسے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں اور اگر اس کا کوئی تعلق ہے تو یہ یقین کرنا کہ وہ فرشتوں سے کام لیتا ہے اس کی قدرتِ کاملہ کے خلاف ہے اور اس کی صفات میں نقص پر دلالت کرتا ہے پس دونوں صورتوں میں فرشتوں کا وجود محال ہے

اوّل الذکر عقیدہ کہ خدا تعالیٰ تو ہے مگر اس کا دنیا کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں صرف ایک خوشکن پردہ ہے جو دہریت کے خیالات پر ڈالا گیا ہے درحقیقت اس عقیدہ اور

دہریت میں کوئی فرق نہیں اگر خدا ہے بھی اور اس کا دُنیا سے کوئی تعلق بھی نہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ ہے کیوں؟ خدا تعالیٰ کا وجود دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو وہ کوئی دخل دُنیا کے نظام میں رکھتا ہے یا بے تعلق محض ہے اگر بے تعلق محض ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو وہ ہمیشہ سے بے تعلق محض ہے یا دنیا کو پیدا کر کے بے تعلق ہو گیا۔ اگر ہمیشہ سے بے تعلق محض ہے تو پھر اس کے وجود کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بھی ثبوت نہیں پھر اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے نہ کوئی معنی ہیں نہ اس کی کوئی ضرورت ہے سوائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے ماننے والوں سے ایک منافقانہ ارتباط ظاہر کر کے ان کی خوشنودی اور ہمدردی حاصل کی جائے جو ایک نہایت ہی ذلیل مقصد ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ دنیا کو پیدا کر کے بے تعلق ہو گیا تو پھر اس کا بارِ ثبوت ان لوگوں پر ہے جو خدا تعالیٰ کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں کیونکہ ایک فعّال ہستی کو بے کار اور بے تعلق قرار دینے کا کوئی ثبوت ہونا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کو ہمیشہ فعّال اور زندہ ماننے والے تو صرف اس کے اس فعل کے تسلسل کے قائل ہیں جس کو یہ دوسرے عقیدہ والے بھی مانتے ہیں لیکن اسے اب غیر فاعل اور عاجز قرار دینے والے اس کی فعالیت کو ایک وقت تک جاری قرار دے کر پھر بعد میں باطل اور ساکن قرار دیتے ہیں پس بارِ ثبوت ان کے ذمہ ہے کہ وہ بتائیں کہ کس دلیل سے معلوم ہوا کہ پہلے تو وہ کوئی کام کرتا تھا لیکن بعد میں وہ اس کام سے علیٰحدہ ہو گیا اور اب بالکل بیکار اور دُنیا سے بے تعلق بیٹھا ہے اور نظامِ عالم آپ ہی آپ چل رہا ہے۔

بہرحال دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی تسلیم کی جائے فرشتوں کا وجود محلِ اعتراض نہیں ٹھیرتا کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کسی وقت کوئی کام کرتا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس وقت کوئی واسطہ وہ استعمال کرتا تھا یا نہیں یعنی کیا ابتدائے آفرینش میں دنیا کے وجود میں آنے کا ذریعہ کوئی طبعی قواعد تھے یا جادو کے وہمی کرشموں کی طرح ہر تغییر بغیر کسی قانون یا ذریعہ کے ہو جاتا تھا اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس عالم کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اس کے اندر کا ہر تغیّر کسی قاعدہ کے ماتحت معلوم ہوتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو وجود میں لانے کے لئے بعض وسائط بھی پیدا کئے تھے اور بعض قانون جاری کئے تھے جن کے ماتحت یہ عالم پیدا ہُوا اور اس نے موجودہ صورت اختیار کی اگر یہ تسلیم کیا جائے اور اس کے تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ فرشتوں کے وجود پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیونکہ جس طرح ایک وسیلہ اور واسطہ کا اختیار کرنا خدا تعالیٰ کی قدرت کے منافی نہیں اسی طرح دوسرے وسیلے یا واسطے کا استعمال کرنا بھی اسکی قدرت کے منافی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کو اپنے حکموں کے لئے واسطہ بنانا اسکی قدرت کے منافی نہیں۔

اسی طرح اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ خدا تعالیٰ اب بھی نظامِ عالم کے چلانے میں کوئی دخل رکھتا ہے تب بھی فرشتوں کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر خدا تعالیٰ بچّہ پیدا کرنے کے لئے انسانی نطفہ سے کام لیتا ہے۔ حیوان کی پیاس بجھانے کے لئے پانی سے کام لیتا ہے۔ دُنیا کو روشن کرنے کے لئے سورج سے کام لیتا ہے اور اس کی قدرت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ تو نظامِ عالم کے جاری رکھنے کے لئے اگر اس نے فرشتوں کو بھی واسطہ بنایا ہو تو اس کی قدرت پر کیوں حرف آنے لگا۔

اصل بات جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور قانونِ قدرت اسکی تصدیق کرتا ہے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے کارخانۂ عالم کو ایک وسیع قانون کے ماتحت چلایا ہے قرآن کریم فرماتا ہے رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا (النازعات ع ۲) یعنی آسمان کو دیکھو کہ ہم نے اسکی بلندی کو خوب بلند بنایا ہے اور پھر اسے تمام ضروری قوتیں اور کمالات دئیے ہیں اور اس کی قوتوں کو دو طرح کا بنایا ہے ایک مخفی جو رات کی طرح پوشیدہ ہیں اور ایک ظاہر کہ دوپہر کی طرح روشن ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نظامِ آسمانی ایک کامل قانون پر مبنی ہے جس میں سے کچھ مخفی

ہے اور غور اور فکر اور تدبر سے اس کا علم ہوتا ہے اور کچھ ظاہر و روشن ہے کہ ظاہری آنکھ بھی اس کا مطالعہ کر سکتی ہے یہ دونوں قسم کے قانون۔ قانونِ قدرت کا مطالعہ کرنے والوں پر روشن ہیں۔ سورج اور چاند کو ہی لے لو کچھ اثرات ان کے ایسے واضح ہیں کہ جاہل اور اَن پڑھ لوگ بھی ان سے واقف ہیں اور کچھ قانون ان کے ایسے مخفی ہیں کہ ہزاروں سالوں کے مشاہدہ کے بعد ان کا ایک نہایت خفیف حصہ علم ہیئت کے ماہر اور سائنسدان دریافت کر سکے ہیں اور مزید تحقیقاتیں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وسیع سلسلہ علّت و معلول اور سبب اور مسبّب کی اول کڑی ملائکہ ہیں اور جس طرح آخری کڑیوں کو دیکھ کر کوئی شخص خدا تعالیٰ کے قادر ہونے پر اعتراض نہیں کر سکتا اسی طرح پہلی کڑی کی وجہ سے بھی اسکی قدرت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

غرض یہ اور بات ہے کہ کوئی انسان خدا تعالیٰ کا ہی انکار کرے۔ اس صورت میں تو اسے پہلے ہستی باری تعالےٰ کے دلائل معلوم کرنے چاہئیں لیکن خدا تعالیٰ کو مانکر اور یہ مانکر کہ خدا تعالےٰ اس دُنیا میں قانون اور وسائط سے کام لے رہا ہے اور سب کارخانہ اس دُنیا کا مختلف وسیلوں اور اسباب اور علتوں کے ماتحت چلایا جا رہا ہے یہ کہنا کہ فرشتوں کا وجود خدا تعالیٰ کی قدرت کے خلاف ہے ایک نہایت ہی کمزور وہم ہے۔ اگر اور ہزاروں وسیلوں اور اسباب اور علتوں اور قانونوں سے کام لینے سے خدا تعالیٰ کی قدرت میں فرق نہیں آتا تو فرشتوں کے پیدا کرنے سے کیوں خدا تعالیٰ کی قدرت میں فرق آجائے گا۔ اگر آنکھ کو دیکھنے کے قابل بنانے کے لئے خدا تعالیٰ نے روشنی پیدا کی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کے قادر ہونے میں فرق نہیں آیا اور کانوں کو شنوائی پر قادر کرنے کے لئے اس نے ہوا پیدا کی ہے اور اس سے اسکی قدرت پر کوئی حرف نہیں آیا تو اسی طرح فرشتوں کو کارخانہ عالم کے چلانے میں ایک علت اولیٰ بنانے میں اسکی قدرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عالم کا سلسلہ جس طرف بھی اسے لے جایا جائے آہستہ آہستہ باریک در باریک علل یا نتائج میں غائب ہو جاتا ہے صرف اسکی درمیانی کڑیاں ظاہر اور روشن ہوتی ہیں انسان ہی کو لے لو اس کی پیدائش کے پہلے کے علل اور اسباب بھی مخفی ہیں اور اس کی موت کے بعد کے نتائج بھی مخفی ہیں۔ ان دونوں مخفی اور باریک حالات کا فرشتوں سے جو مخلوق کی زنجیر کی باریک ترین کڑیاں ہیں گہرا تعلق ہے گویا وہ خدا تعالیٰ اور دوسری مخلوق کے درمیان ایک واسطہ کے طور پر ہیں چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (نجم ع ۳) اور بات یہ ہے کہ ہر چیز کی انتہا تیرے رب کی طرف جاتی ہے اور اس انتہاء کا ذریعہ خدا تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ مخلوق کا آخری واسطہ خدا تعالیٰ سے ملنے کے لئے ملائک ہیں جب چیز پیدا ہوتی ہے تو اسکی پہلی کڑی ملائکہ ہوتے ہیں اور جب ختم ہوتی ہے یا اپنی منزل ختم کرتی ہے تو اس کی آخری کڑی بھی ملائکہ ہوتے ہیں اور اس طرح باریک در باریک اسباب سے شروع ہو کر مخلوق ظاہری شکل اختیار کرتی ہے اور پھر باریک در باریک شکلوں میں بدلتے ہوئے فرشتوں کے ذریعہ سے اپنی منزل مقصود کو پہنچ جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ تمام نظامِ عالم کی ابتدائی کڑیاں ہیں اور خدا تعالیٰ کے حکم کو چلانے والے ہیں قرآن کریم فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مومن ع ۱) یعنی فرشتے جو عرش کو اٹھا رہے ہیں اور وہ بھی جو عرش کے گرد ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور مومنوں کے قصوروں کے لئے معافی کی دُعاؤں میں لگے رہتے ہیں۔ عرش کے معنے سورہ یونس نوٹ ۴۸ میں بیان کئے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس سے مُراد صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کے ہیں پس عرش کو اٹھانے کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالےٰ کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ کارخانہ عالم صفات الٰہیہ کے ماتحت چلتا ہے اس کا مطلب یہ نکلا کہ تمام کارخانۂ عالم کے چلانے کی [illegible] پہلی کڑیاں ہیں اور خدا تعالیٰ کی صفات کو عالمِ مادی میں جاری کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی مختلف آیات میں فرشتوں کے کام بھی بیان کئے گئے ہیں مثلاً وحی الٰہی کا نزول۔ قانونِ قدرت کا اجرا موت وحیات کے قانون کو چلانا۔ نیک تحریکوں کا دلوں میں پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ جن کو ان کی متعلقہ آیات کے ماتحت بیان کیا جائیگا اس آیت زیرِ تفسیر میں جو ملائکہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ چند آیات چھوڑ کر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (بقرہ آیت ۳۴) یعنی یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو پس سب نے فرمانبرداری کی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا ایک کام یہ بھی ہے کہ چونکہ وہ تمام اسباب مادیہ کی علتِ اولیٰ ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی مامور کو مبعوث فرماتا ہے تو ساتھ ہی انہیں بھی حکم ملتا ہے کہ وہ تمام کائنات کو اس کی تائید میں لگا دیں اور اس طرح کل دنیا ہی مامور کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور وہ باوجود شدید مخالفت کے آخر غالب آجاتا ہے اور اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کے لئے اسے بھیجا جاتا ہے۔ حدیث نبوی میں بھی یہ امر بیان ہوا ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا نَادٰی جِبْرِيْلَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ فَيُحِبُّهٗ جِبْرِيْلُ فَيُنَادِيْ جِبْرِيْلُ فِيْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْاَرْضِ (بخاری جلد رابع کتاب الادب باب المقۃ من اللہ) یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے کہ میں خدا فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں* اس پر جبریل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے پھر جبریل دوسرے آسمانی فرشتوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے پس تم بھی اس سے محبت کرو اس پر سب آسمانی وجود اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اس کے بعد دنیا کے لوگوں میں بھی اسکی قبولیت کی روح پیدا کر دی جاتی ہے۔ اس حدیث میں اوپر کی آیت کا مضمون ہی دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ دنیوی تغیرات جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتے ہیں ان کی علتِ اولیٰ ملائکہ ہیں اور ان کا ایک کام اللہ تعالیٰ کے مامورین کی قبولیت کا پھیلانا ہے۔

فرشتوں کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دینے سے مراد آدم کی قبولیت کا دنیا میں پھیلانا۔

چونکہ وہ دنیوی تغیرات کے سربراہ ہوتے ہیں ان کی تائید سے کل کارخانہ عالم مامورین کی تائید میں لگ جاتا ہے اور آسمانی تائیدات کو دیکھ کر سفلی وجود آخر ہدایت پا جاتے ہیں اور ماموروں کو قبول کر لیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ملائکہ روحانی وجود ہیں اور مادی عالم کی پہلی کڑیاں اور اس کے مدبر ہیں اور ان کا وجود درباریوں کے طور پر نہیں ہے بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کارخانۂ عالم کو چلانے کے لئے مختلف اسباب پیدا کئے ہیں اسی طرح انہیں کائناتِ عالم کے تغیرات کے لئے پہلی علتیں اور ابتدائی اسباب بنایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسکے بنائے ہوئے قواعد کے ماتحت دُنیا میں تغیرات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کی تدبیر سے یہ کارخانۂ عالم صحیح طور پر مقررہ قوانین کے مطابق چلتا جاتا ہے بیشک بوجہ ان کے نظر نہ آنے کے تدبر سے کام نہ لینے والے لوگ ان کے وجود کا انکار کرتے ہیں لیکن یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض جاہل قانونِ قدرت کے باریک اسباب کو نہ جاننے کی وجہ سے ان کا انکار کر دیتے ہیں چنانچہ اب تک دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بیماریوں کے جراثیم کا انکار کرتے ہیں اور انہیں دیوی دیوتاؤں کے غصہ اور ناراضگی کی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ جو لوگ روحانیت سے ادنیٰ تعلق بھی رکھتے ہیں انہیں ملائکہ کو دیکھنے کا بھی موقعہ ملتا ہے جیسا کہ انجیل میں حضرت مسیح پر جبریل کے اُترنے کا ذکر آتا ہے اور قرآن کریم میں اور احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل امین کے اُترنے کا ذکر آتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بانی سلسلہ احمدیہ نے ملائکہ سے تعلق کا دعویٰ کیا ہے۔ راقم سطور بھی اس امر میں خدا تعالیٰ کے فضل سے کسی قدر مشاہدہ رکھتا ہے اور اسے ذاتی مشاہدہ کے بعد ہمیشہ ان لوگوں پر حیران ہوتا ہے جو ملائکہ کو صرف انسان کی مخفی طاقتیں قرار دیتے ہیں ذاتی مشاہدات کے بعد ایسے لوگوں کے خیالات کو محض وہم اور عدم علم میں

ملائکہ انسان کی مخفی طاقتوں کا نام نہیں۔

آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

(اُسنے) آدم کو سب نام سکھائے پھر (جن چیزوں کے وہ نام تھے) ان کو ملائکہ کے سامنے (پیش)

فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ

کرکے فرمایا (کہ) اگر تم درست بات کہہ رہے ہو تو تم مجھے ان کے نام بتاؤ

صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

۳۲ انہوں نے کہا تو بے عیب ہے جو (کچھ)

قرار دیا جاسکتا ہے۔

ملائکہ کے کاموں ان کی پیدائش کی غرض ان سے تعلق رکھنے کے ذرائع اور فوائد اور ایسے ہی بہت سے امور کے متعلق میری کتاب مَلَائِکَۃُ اللہ دیکھنی چاہیئے۔ اس طویل مضمون کو یکجائی طور پر تفسیر میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مختلف آیتوں کے ماتحت متعلقہ امور کو بیان کیا جائے گا۔

خلاصہ اس آیت کا یہ ہے کہ اس میں پہلی آیات کے اس دعویٰ کی دلیل دی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ ضرورت کے موقعہ پر اپنے مامور بھجواتا ہے اور شروع زمانہ سے ایسا کرتا چلا آیا ہے جب وہ ایسا مامور بھجواتا ہے تو فرشتوں کو اسکی آمد کی اطلاع دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے حلقۂ نظام میں اسکی تائید کی رَو چلائیں۔ اور یہ بھی کہ ہمیشہ سے یہ سنت اللہ چلی آئی ہے کہ جب [illegible] مامور آتا ہے بدکار تو الگ رہے نیکوکار اور فرشتہ خصلت لوگ بھی بوجہ نبوت کے زمانہ سے بُعد کے اور اسکی خصوصیات سے ناواقفیت کے نبوت کی ضرورت کو نہیں سمجھتے اور اس نئے نظام کی حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ وقت کے نبی کے ذریعہ سے قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بعثت کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ بہرحال اس نظام کو قائم کرتا ہے اور دُنیا کی غیر معمولی بہتری کے سامان پیدا کردیتا ہے اور اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کریم کے نزول کے وقت میں بھی ایسا ہی ہونا لازمی تھا اگر اس وقت کے کفار ان کی بعثت کی عدم ضرورت کے قائل ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں جب نبوت کی ابتداء ہوئی تھی تو ملائکہ تک اسکی ضرورت کو نہیں سمجھ سکتے تھے مگر آخر واقعات نے ان سے اس کی عظمت کا اقرار کرواکر چھوڑا۔

۳۲ حل لغات۔ آدَمَ : ابوالبشر صلوٰت اللہ علیہ کا نام ہے بعض لوگوں نے اسے عجمی قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مشتق ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے اس صورت میں اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم بھی ہے اور [illegible] وزنِ فعل پر بھی ہے اگر مشتق مانا جائے اور یہی درست ہے۔ تو پھر آدم کا نام اس لئے آدم رکھا گیا کہ وہ لوگوں کو ایک تمدّن پر جمع کرنے والے تھے چنانچہ کہتے ہیں اَدَمَ بَیْنَہُمْ (یَادِمُ) اَدْمًا: اَلَّفَ وَوَفَّقَ لوگوں کو جمع کیا۔ یا پھر اس وجہ سے ان کو آدم کہا گیا کہ وہ مختلف عناصر سے بنے تھے۔ اور ان میں مختلف قویٰ جمع کردیئے گئے تھے کیونکہ اَدَمَ الْخُبْزَ کے معنی ہیں خَلَطَہٗ بِالْاِدَامِ کہ روٹی کو سالن کے ساتھ ملا دیا۔ یا اس لئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے نمونہ تھے۔ چنانچہ جب اَدَمَ اَھْلَہٗ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَارَ لَھُمْ اُسْوَۃً کہ وہ اپنے خاندان کے لئے نمونہ بن گیا۔ یا اس وجہ سے کہ وہ سطح زمین پر رہتے تھے کیونکہ

آدَم

نوٹ: آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ

سطح زمین کو اَدِیْمُ الْاَرْضِ کہتے ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ایک وسیلہ تھے۔ کیونکہ اَلْاُدْمَۃُ کے معنے اَلْوَسِیْلَۃُ کے بھی ہیں (اقرب)

اَلْاَسْمَآءَ

اَلْاَسْمَآءَ :۔ اِسْمٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْاِسْمُ کے معنے ہیں اَللَّفْظُ الْمَوْضُوْعُ عَلَی الْجَوْھَرِ وَالْعَرَضِ لِتَمْیِیْزِہٖ کہ جو لفظ کسی چیز کی حقیقت کے بیان کے لئے اور اسکی صفات کے بیان کے لئے لاتے ہیں اسے اسم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے نیز کہتے ہیں اِسْمُ الشَّیْءِ عَلَامَتُہٗ کہ کسی چیز کو پہچاننے کے لئے جو اس کے بالمقابل لفظ رکھا جاتا ہے اسے اس کا اسم کہتے ہیں (اقرب) کلیات ابی البقاء میں ہے اَلْاِسْمُ :۔ ذَاتُ الشَّیْءِ وَالْاِسْمُ اَیْضًا اَلصِّفَۃُ کہ اسم اس کو بھی کہیں گے کہ جو کسی چیز کی حقیقت اور ذات کو بیان کرے۔ اور اس کو بھی کہیں گے جو اس چیز کی صفات کو بیان کرے (کلیات)

عَرَضَھُمْ

عَرَضَھُمْ :۔ عَرَضَ الشَّیْءَ لَہٗ کے معنے ہیں اَظْھَرَہٗ لَہٗ اس کے سامنے کسی چیز کو پیش کیا۔ اور جب عَرَضَ الْمَتَاعَ لِلْبَیْعِ کہیں تو معنے یہ ہونگے کہ اَظْھَرَہٗ لِذَوِی الرَّغْبَۃِ لِیَشْتَرُوْہُ کہ سامان خریداروں کے سامنے پیش کیا۔ اور عَرَضَ الشَّیْءَ عَلَیْہِ کے معنے ہیں اَرَاہُ اِیَّاہُ :۔ اسے کوئی چیز دکھائی۔ (اقرب)

آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں اسماء سے مراد

اَنْۢبِئُوْنِیْ

اَنْۢبِئُوْنِیْ :۔ اَنْۢبِئُوْنِیْ امر جمع کا صیغہ ہے۔ اور اَنْبَاہُ الْخَبَرَ کے معنی ہیں خَبَّرَہٗ اس کو خبر دی (اقرب) پس اَنْۢبِئُوْنِیْ کے معنے ہونگے مجھے خبر دو۔

صٰدِقِیْنَ

صٰدِقِیْنَ :۔ صَدَقَ (یَصْدُقُ) صَدْقًا وَصِدْقًا سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور صَدَقَ فِی الْحَدِیْثِ کے معنے ہیں اس نے سچی سچی بات کہی (اقرب) صَدَقَہُ الْحَدِیْثَ اَنْبَاہُ بِالصِّدْقِ اسے اس نے جو بات کہی درست تھی (اقرب) تاج العروس میں ہے صَدَقَنِیْ فُلَانٌ: قَالَ لِیَ الصِّدْقَ یعنی اس نے جو بات کہی درست تھی (تاج) بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا۔ اور آپ کے جواب پر اس نے کہا صَدَقْتَ یعنے آپ نے درست کہا۔ یہ نہیں کہ آپؐ نے سچ بولا۔ پس اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کے معنے ہونگے اگر تم درست بات کہہ رہے ہو۔

تفسیر۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کیا نام سکھائے اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ اشیاءُ کے نام سکھائے مثلاً پیالہ کا نام پیالہ۔ ہنڈیا کا نام ہنڈیا سکھایا یعنی زبان سکھائی (دُرِّ منثور) بعض نے اسپر یہ زیادتی کی ہے کہ تمام زبانیں سکھائیں (فتح البیان) یہ معنے بالکل خلافِ عقل و نقل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آدم کو اسکی اولاد کے نام بتائے (دُرِّ منثور)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ظاہر الفاظ میں نہیں فرمایا کہ کیا نام سکھائے اس وجہ سے اختلاف ہوا ہے لیکن اگر ہم قرآن کریم کو غور سے دیکھیں تو آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اَسْمَاء سے کیا مراد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانوں کے متمدن ہونے کی صورت میں ان کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے ضرور آدم کو زبان کا علم سکھایا ہوگا لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے ایک خاص اسماء بھی ہیں جن کا سیکھنا انسان کے دین اور اخلاق کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور جن کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سکھا سکتا۔ پس اسی جگہ جن اسماء کے سکھانے کا ذکر ہے ان سے وہ اسماء ضرور مراد ہیں اور ان اسماء کا قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر ہے وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (اعراف ع ۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ تمام نیک ناموں یعنی صفات کا مالک ہے پس اللہ کو ان ناموں سے یاد کیا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں یعنی صفات میں غلط راستہ کو اختیار کرتے ہیں اور شک اور جھگڑے سے کام لیتے ہیں وہ اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے اس آیت سے ظاہر ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء یعنی صفات کا صحیح علم حاصل کئے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کا

عرفان حاصل نہیں کرسکتا اور اس کے فضلوں کا وارث نہیں ہوسکتا (۲) ان اسماء یعنی صفات کا صحیح علم اسی کے سکھانے سے آسکتا ہے جو لوگ اپنے خیال اور عقل سے کام لیتے ہیں وہ ضرور غلطی کرتے ہیں اور اسماء الٰہیہ کا صحیح علم حاصل نہیں کرسکتے۔ پس آدم چونکہ مذہب کے قیام اور اتصال خالق سے مخلوق کے وصال کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے ضروری تھا کہ انہیں اسماء الٰہیہ سکھائے جاتے تا ان کی امت ان ناموں کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو شناخت کرتی اور اس سے تعلق پیدا کرتی اور اگر وہ نام نہ سکھائے جاتے تو اس کے ملحد اور بے دین ہونے کا خطرہ تھا۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ اسماء الٰہیہ کا آدم کو سکھانا ضروری تھا تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جن اسماء کے سکھانے کا اس آیت میں ذکر ہے ان میں اسماء الٰہیہ ضرور شامل تھے بلکہ مذہب کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی نام اصل میں مقصود تھے اور ان کے سوا جو نام بھی ہوں وہ ان کے تابع ہونگے۔ سابق مفسرین میں سے مظہری نے اسماء کے معنی اسماء الٰہیہ کے ہی کئے ہیں (فتح البیان) مصنف فتح البیان نے اسے بے دلیل قرار دیا ہے مگر جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ معنی سب معنوں سے زیادہ بادلیل ہیں۔

ان معنوں کی تعیین اس امر سے بھی ہو جاتی ہے کہ اگلی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اسماء آدم کو سکھائے گئے تھے فرشتے ان سے پوری طرح واقف نہ تھے اور وہ اسماء جن سے فرشتے فرداً فرداً کلی طور پر واقف نہیں صفات الٰہیہ ہی ہیں کیونکہ ان کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (نحل ع ۶) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں کرتے اور کر نہیں سکتے۔ اور جب فرشتے وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں کہا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بخشش اور خدا تعالیٰ کی ستاری اور خدا تعالیٰ کی قہاری کی صفات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان ہی ہے جسے خدا تعالیٰ نے علم دیکر مقدرت دی ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرے اور خطا اور نسیان کا اسے محل بنایا ہے وہ خدا تعالیٰ کے علم کے بعد کبھی نافرمانی کرتا ہے اور کبھی توبہ اور کبھی نسیان کا مرتکب ہوتا ہے اور کبھی پھر صحیح راستہ کی طرف واپس آتا ہے اور اسی طرح خدا تعالیٰ کی بخشش اور اس کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی نافرمانی پر اصرار کرکے خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے

انسان کو سکھانے سے مراد صفات الٰہیہ کا علم۔

پس صفاتِ الٰہیہ کا کامل علم انسان کو ہی حاصل ہوتا ہے ملائکہ کو نہیں۔ وہ صرف اس صفت کو ہی جانتے ہیں جو ان سے متعلق ہے اسی لئے اس آیت میں كُلَّهَا کا لفظ رکھ کر اس پر زور دیا ہے کہ گو ملائکہ اپنے ساتھ تعلق رکھنے والی ایک صفت یا ایک سے زیادہ صفات سے تو واقف ہوتے ہیں مگر انسان تمام صفات الٰہیہ سے واقف ہوتا ہے وہ رحیم ہے یہ بھی رحیم بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ غفار ہے یہ بھی غفار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ قہار ہے یہ بھی قہار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ جبار ہے یہ بھی جبار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ شکور ہے یہ بھی شکور بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرشتے ان سب صفات کے حامل نہیں ہوسکتے۔ مثلاً موت کے فرشتے ہیں ان کا کام صرف جان نکالنا ہے وہ کسی پر رحم نہیں کرسکتے رزق پر مامور فرشتے کسی کی جان نہیں نکال سکتے۔ کلام الٰہی لانے والے فرشتے کوئی اور کام نہیں کرسکتے۔ مگر ایک کامل انسان اپنے اپنے موقعہ پر جِلاتا بھی ہے مارتا بھی ہے بخشتا بھی ہے اور سزا بھی دیتا ہے پس انسان تمام صفات الٰہیہ کا حامل ہے مگر فرشتے صرف ایک ایک یا چند صفات کے حامل ہیں اس لئے انسان کو صفات الٰہیہ کا جو کامل علم دیا گیا ہے وہ فرشتوں کو نہیں دیا گیا اور اس کی بنیاد آدم کے ذریعہ سے اور ان کے وقت سے رکھی گئی ہے ان سے پہلے کا انسان چونکہ کامل نہ تھا وہ یہ علم نہ رکھتا تھا اور تمام صفاتِ الٰہیہ سے واقف نہ کیا گیا تھا۔

آیت وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا میں كُلَّهَا کی قید کا مطلب

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے زبان کا مفہوم بھی اس آیت کے مفہوم میں بطور تنزل شامل ہے کیونکہ تمدن کے قیام کے لئے کسی زبان کا ہونا ضروری تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زبان کے اصول سکھائے جن کے مطابق انہوں نے زبان کا علم جاری کیا اور اسی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان عربی زبان تھی کیونکہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ آدم کو اسماء مسمّیات کے ذریعہ سے سکھائے گئے تھے۔ یعنی جس زبان کا انہیں علم دیا گیا تھا اُس کی بناء مسمّیات اور اسماء کے اتحاد پر تھی یعنی ہر چیز کا نام اس کی خصوصیت کی بناء پر رکھا گیا تھا نہ کہ بے تعلق اور بے ربط۔ اور یہ خصوصیت صرف عربی زبان میں ہے کہ اس کے تمام اسماء مسمّیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں یہ بات نہیں ہے ان زبانوں میں نام سے صرف شناخت کا فائدہ حاصل کیا گیا ہے اگر ان ناموں کو بدل دیا جائے تو بھی کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا مثلاً اردو میں غلّے سے بنائی ہوئی غذا کو روٹی کہتے ہیں انگریزی میں بریڈ اور فارسی میں نان۔ اگر ان ناموں کی جگہ مثلاً جوئی یا جریڈ یا پان۔ اس چیز کے نام رکھ دئے جائیں تو کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا مگر عربی زبان میں اس چیز کا نام خُبْزٌ ہے جو بامعنی ہے۔ عربی زبان میں خ ب ز جمع ہوں تو ان کے معنوں میں عمل اور پھولنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بَزَخَ کے معنی ہیں سینہ کو باہر نکالا اور خَزَبَ کے معنی ہیں بغیر بیماری اور نقص کے موٹا ہو گیا اور خَبَزَ کے معنے ہیں جلدی جلدی ہاتھ مار کے عمل کیا پس خُبْزٌ کے معنے ہوئے وہ چیز جسے جلدی جلدی ہاتھوں سے تیار کیا جائے اور وہ موٹی ہو جائے اور پھول جائے اور یہ روٹی کا عین نقشہ ہے۔ روٹی کو جلدی جلدی ہاتھ مار کر تیار کیا جاتا ہے اور آگ میں رکھنے کے بعد وہ پھول جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روٹی کے لئے اگر عربی زبان میں خُبْزٌ کی جگہ کوئی اور لفظ رکھا جائے تو اس سے روٹی کی حقیقت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ روٹی کا مفہوم خ ب ز کے حروف کے ملانے سے ہی پیدا ہوتا ہے اسی طرح اللہ کے نام ربّ کو لے لو۔ ربّ کے معنے تربیت کرنے اور ادنیٰ سے اعلیٰ حالت تک پہنچانے کے ہیں اس لفظ کی جگہ کوئی اور لفظ رکھو تو یہ غرض کبھی پوری نہ ہوگی۔ پھر عربی میں آسمان کو سَماء کہتے ہیں س م و جس سے یہ لفظ بنا ہے بلندی اور ارتفاع پر دلالت کرتا ہے مگر آسمان فارسی کا لفظ یا سکائی انگریزی کا لفظ اس حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا پس عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں سب نام نام والے کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اگر ان ناموں کو بدل دو تو وہ اس حقیقت کو ظاہر نہیں کریںگے بلکہ صرف ایک علامت رہ جائیںگے لیکن دوسری زبانوں میں اس حقیقت کا نام و نشان نہیں پایا جاتا اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ۔ پس زبان سکھانے کے معنوں سے یہ مراد لی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک ایسی زبان سکھائی جو بے معنے اور بے ربط نہ تھی بلکہ اس کی بُنیاد فلسفہ پر تھی اور اس کے تمام لفظ بامعنی تھے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان سکھائی جو بعد میں دوسری زبانوں کی ماں بنی (اس لطیف نکتہ کے لئے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی کتاب مِنَنُ الرَّحْمٰن دیکھو جس میں نہایت لطیف پیرایہ میں عربی زبان کے اُمّ الالسنہ ہونے کا مسئلہ بتایا گیا ہے)

آیت عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ سے مراد خدا تعالیٰ کا آدم کو زبان کے اصول سکھانا۔

آدم علیہ السلام کو عربی زبان کے اصول سکھائے گئے

عربی زبان اُمّ الالسنہ ہے۔

میری مراد اوپر کی تحریر سے یہ ہرگز نہیں کہ عربی زبان اپنی موجودہ شکل میں آدم علیہ السّلام کو سکھائی گئی یا یہ کہ آدم علیہ السّلام کے بعد اس نے ترقی نہیں کی بلکہ میری مراد صرف یہ ہے کہ اس آیت کے مفہوم کے مطابق عربی زبان کے بعض اصول پر اس وقت بُنیاد رکھی گئی تھی باقی رہا یہ کہ وہ بعد میں تبدیل بھی ہوئی یا اس میں اور الفاظ کی ترقی ہوئی اس کا نہ اس مسئلہ سے تعلق ہے نہ اس سے عربی زبان کی اس افضلیت یا خصوصیت میں کوئی فرق آتا ہے اصول وہی ہیں ہاں ان اصول کی اتباع میں زبان آگے ترقی کرتی چلی گئی ہے اور آئندہ بھی ترقی کر سکتی ہے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کی ایک اور تفسیر بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عَلَّمَ کے معنے خارجی ذرائع سے سکھانے کے علاوہ طبعی طور پر سکھانے کے بھی ہوں یعنے یہ مطلب بھی ہو کہ آدم کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف علوم کے سیکھنے کا مادہ رکھا یہ ظاہر ہے کہ ہر جنس کے افراد کو اپنی جنس سے تعلق رکھنے والے علوم کو بھی ایک دوسرے سے کم و بیش سیکھتے ہیں لیکن جو علوم ان کے دائرہ سے باہر ہوں انہیں وہ بالکل نہیں سیکھ سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر جنس کے لئے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوتوں کے دائرے مقرر کئے ہیں انسان کے علم حاصل کرنے کا دائرہ اور ہے طوطے کا اور مینا کا اور گھوڑے کا اور۔ اور کتے کا اور۔ مینا طوطا بھی سکھانے سے چند لفظ سیکھ لیتے ہیں لیکن پوری طرح بات سمجھ کر ہر قسم کے موضوع پر بات نہیں کر سکتے لیکن انسان ایسا کر سکتا ہے گھوڑے اور کتے بھی بعض کرتب سیکھ لیتے ہیں لیکن انسان کی طرح ان کا یہ سیکھنا وسیع نہیں ہوتا۔ پس ایک معنی اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وسیع علوم سیکھنے کی قابلیت پیدا کی اس صورت میں عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ کے یہ معنے ہونگے کہ اس نے مختلف اشیاء کے خواص سمجھنے کی قابلیت انسان میں پیدا کی چنانچہ آدم کے وقت سے اس وقت تک انسان مختلف علوم میں ایجادیں کر رہا ہے اور ہر روز اس کا علم پہلے سے بڑھ رہا ہے اس صورت میں اسماء کے معنی خواص اور صفات کے ہی ہونگے مگر صفات الٰہیہ کی بجائے صفات طبعیہ کے معنے کئے جائیں گے منطقی اصطلاح کی روشنی میں ان معنوں کی تشریح یہ ہوگی کہ آدم کو ہم نے حیوانِ ناطق بنایا یعنے مختلف اشیاء پر غور کرنے اور اس کی کنہ کو پہنچنے اور دوسروں کو سکھانے کی قابلیت اس میں رکھی جیسا کہ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا تعلق ان اسماء کے سکھانے سے ہے جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ پہلی آیت میں صرف اس امر کا اظہار تھا کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے ایک خلیفہ بنانے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بعض اسماء سکھائے اس کے بعد کی دو آیتوں میں انہی اسماء کے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے بعد فرماتا ہے کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدم کی خلافت ان اسماء کے سکھانے کے بعد شروع ہوئی اور اسی وقت سے ملائکہ کو اس کی تائید اور نصرت کا حکم ملا پس پہلی آیت آدم کی خلافت کی خبر نہیں دیتی تھی بلکہ صرف خلافت کی خبر دیتی تھی اس کے بعد جب آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے گئے تو یہ گویا اس شخص کی تعیین کا اظہار تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خلافت کے لئے چنا تھا۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں عَلَّمَ کے معنے فطرۃً ذریعہ سے سکھانے کے

یہ جو فرمایا گیا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا آدم کو اللہ تعالیٰ نے سب نام سکھائے اس سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ تمام صفاتِ الٰہیہ کا مکمل علم آدم کو دیا گیا یا زبان کا مکمل علم آدم کو دیا گیا کیونکہ کُلّ کا لفظ عربی زبان کے محاورہ کے مطابق ضروری نہیں کہ تمام افراد جنس پر مشتمل ہو بلکہ بسا اوقات یہ لفظ ضرورت کے مطابق اشیاء پر بولا جاتا ہے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر کُلّ کا لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام ع ۵) یعنی جب تجھ سے پہلی قوموں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے پہلے تو ہر قسم کی ترقیات کے دروازے ان پر کھول دیئے (اور پھر ان پر عذاب نازل کیا) جیسا کہ ظاہر ہے اس آیت میں کُلّ کے لفظ کے یہ معنی نہیں کہ ہر نعمت دنیا کی ان کو ملی بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ اس زمانہ کی اور ان کے ملک کی بڑی بڑی نعمتوں سے انہیں حصہ ملا۔ اسی طرح اہل مکہ کی نسبت آتا ہے اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (قصص ع ۶) یعنی کیا اہل مکہ کو ہم نے ایک عزت والے اور محفوظ مقام میں جگہ نہیں دی کہ ہماری طرف سے انعام کے طور پر اس کی

عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ کے یہ معنے کہ اللہ تعالےٰ نے مختلف اشیاء کے خواص سمجھنے کی قابلیت انسان میں پیدا کی۔

طرف ہر قسم کے میوے لائے جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی کُلّ سے تمام دنیا کے میوے مراد نہیں بلکہ بہت سے میوے جو اہلِ مکہ کی صحت کی درستی اور ان کی لذت کا سامان پیدا کرنے کے لئے ضروری تھے مُراد ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی آیات میں کُلّ کا لفظ بہت سے یا حسب ضرورت کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔

عربی زبان کے علاوہ باقی سب زبانوں میں بھی کُلّ یا اس کے ہم معنی الفاظ علاوہ اپنے اصلی معنوں کے کثرت یا حسب ضرورت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور سیاق وسباق یا محل استعمال سے ان کے اصلی معنوں اور ان مجازی معنوں میں فرق کیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو کل اسماء سکھانے کا مطلب۔

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے آیت زیر تفسیر میں بھی كُلَّهَا سے مُراد نہ تمام صفات الٰہیہ مُراد ہیں اور نہ انسان سے تعلق رکھنے والی سب صفات یا ان کا کامل علم مراد ہے کیونکہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ علم دین جو صفات الٰہیہ سے تعلق رکھتا ہے دنیا پر آہستہ آہستہ کھولا گیا ہے اور اسکی پوری تکمیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ ع ۱) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر کمال تک پہنچا دی پس آدم علیہ السلام پر تمام صفات الٰہیہ کا پورا انکشاف نہ ہُوا تھا بلکہ وہ انکشاف آہستہ آہستہ کامل ہوتا ہوا رسول کریم صلعم کے ذریعہ سے اپنی انتہاء کو پہنچا اور آدم کو سب اسماء سکھانے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ان کے زمانہ کے ساتھ جن صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کا تعلق تھا اور جس حد تک تعلق تھا اسی حد تک انہیں ظاہر کیا گیا اسی طرح جو صفاتِ الٰہیہ کہ انسانوں سے متعلق نہیں ان کا انکشاف بھی کُلّ کے لفظ میں شامل نہیں۔ ہاں کُلّ کے لفظ سے انسانوں سے تعلق رکھنے والی کل صفات بھی مراد لی جا سکتی ہیں مگر اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہونگے کہ کل صفات

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ سے مراد

کے سمجھنے کی قابلیت آدم اور اس کی ذریت میں رکھی یعنی یہ تعلیم بالقوہ اور بالاجمال تھی بالفعل اور بالتفصیل نہ تھی۔ بالفعل اور تفصیلاً یہ تعلیم مکمل صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری ہوئی۔ اسی طرح زبان کے اسماء سکھانے سے یہ مراد نہیں کہ کل اسماء اور زبان کے مادے آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے بلکہ اصول مراد ہیں جو بعد میں ترقی کرتے کرتے کامل عربی زبان کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

یہ جو فرمایا کہ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا اس سے مراد اسماء نہیں ہو سکتے کیونکہ اسماء کا لفظ عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق مؤنث ہے چنانچہ اس سے پہلے اسماء کی طرف كُلَّهَا کے لفظ میں ھا کی ضمیر آ چکی ہے جو مؤنث ہے لیکن عَرَضَهُمْ میں جمع مذکر کی ضمیر آئی ہے پس معلوم ہُوا کہ ملائکہ کے سامنے اسماء نہیں پیش کئے گئے بلکہ جن کے نام تھے ان کے وجود پیش کئے گئے۔

اسی طرح عَرَضَهُمْ میں جو هُمْ کی ضمیر استعمال ہوئی ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن کو پیش کیا گیا ہے وہ چیزیں نہ تھیں یعنی پیالے یا لوٹے یا ہنڈیاں پیش نہیں ہوئیں کیونکہ اگر ان چیزوں کا ذکر ہوتا تو بھی عَرَضَهَا آنا چاہیئے تھا کیونکہ بے جان چیزوں کی طرف بھی بلکہ جاندار اور غیر ذوی العقول کی طرف بھی عربی زبان میں هُمْ کی ضمیر نہیں پھیری جاتی هُمْ کی ضمیر صرف ذوی العقول کی طرف پھیری جاتی ہے پس عَرَضَهُمْ کے الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود ملائکہ کے سامنے لائے گئے وہ ذوی العقول تھے۔

عَرَضَهُمْ کے معنوں میں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ وجود عملاً پیش کئے گئے ہوں کیونکہ عَرَضَهُمْ کے ایک معنی دکھانے کے بھی ہیں پس اگر هُمْ کی ضمیر آدم کی آئندہ نسل یا اس کے کامل ظہوروں کی طرف پھرائی جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ مسمّیات ملائکہ کو دکھائے یعنی کشف کے ذریعہ سے آئندہ ہونے والے مظاہر کا نقشہ ملائکہ کو دکھا دیا۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ کیا تھے سو سیاق وسباق پر

غور کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ملائکہ کو خلیفہ بنانے پر اس لئے تعجب تھا کہ اس کے سبب سے خونریزی ہوگی اور فساد ہوگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ان صفاتِ الٰہیہ کے جو آدم اور اس کی نسل پر ظاہر ہونے والی تھیں کامل مظاہر دکھائے اور پوچھا کہ اگر تمہاری بات درست ہے تو پھر ان کے نام بتاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات رحم کی یا غضب کی جس طرح ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والی تھیں ان کا نقشہ ان وجودوں کے ذریعہ سے دکھایا اور ملائکہ سے پوچھا کہ کیا تم ان کی تفصیل بتا سکتے ہو۔

دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آدم کو تعلیم اسماء کے بعد اور خلافت سونپنے کے بعد جو اعوان و انصار ملے اور جن کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی مختلف صفات کا ظہور ہوا ان افراد کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ اگر تمہارا خیال درست ہے تو ان کے نام بتاؤ یعنی ان کی صفات کاملہ کی تفصیل بیان کرو مطلب یہ کہ یہ افراد تو صلح و آشتی کا نمونہ ہیں اور اللہ کی صفات کو ظاہر کرنے والے ہیں اور آدم کے پیدا کردہ لوگ تو یہ ہیں ان سے سفک دم اور فساد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور ان کے بالمقابل جو لوگ آدم کے دشمن ہیں یا اس کی تعلیم پر ظاہر میں ایمان لائے ہیں مگر سچے متبع نہیں اگر ان سے سفک دم یا فساد پیدا ہو تو ان کے اعمال کا آدم کس طرح ذمہ وار ہو سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آج تک کوئی نبی بھی دُنیا میں نہیں آیا جس کی بعثت کے ساتھ ساتھ سفک دم اور فساد بھی نہ ہُوا ہو مگر وہ سفک دم اور فساد اس کے یا اس کے اتباع کے اعمال کی وجہ سے یا ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ان کے منشاء کے خلاف اور ان کے مخالفوں کی شرارتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس جو فساد بظاہر نیا پیدا شدہ نظر آتا ہے وہ دیرینہ فساد کا اظہار اور اس کی آخری سرکشی کا شعلہ ہوتا ہے نبی فساد پیدا نہیں کرتا بلکہ شریروں کے اندرونی خبث کے اظہار کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اندرونی خبث

باہر نہ آئے اس کا علاج اور قلع قمع بھی ناممکن ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ "یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا۔ صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹی کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کروں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے" (متی باب ۱۰ آیت ۳۴ تا ۳۶) ان فقرات میں حضرت مسیح نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ گو میں تو صلح کی تعلیم دیتا ہوں لیکن میرے مخالف اس صلح کے پیام کو جنگ کے اعلان میں بدل دینگے اور مجھ پر ایمان لانے کی وجہ سے بھائی بھائی کا اور باپ بیٹے کا دشمن ہوگا اور اپنے اندرونی خبث کو شرارت اور فتنہ کی صورت میں ظاہر کرے گا اور اس طرح باوجود میری صلح کی تعلیم کے جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں گے اور بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ میں جو صلح کا پیغامبر ہوں جنگ اور فساد کا بانی ہوں۔

اسی سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نسبت فرماتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (ع ۲۶) تم پر جنگ فرض کی گئی ہے باوجود اس کے کہ وہ تم کو سخت ناپسند ہے یعنی مسلمان دل سے صلح جُو تھے مگر دشمن نے بار بار حملہ کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی اب ساری مخالف دُنیا مسلمانوں کو ملامت کرتی ہے کہ انہوں نے فساد کیا اور سفک دما کیا اور یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جنگ پر مسلمانوں کو کفار نے مجبور کیا پس سفک دم کا الزام تو کفار پر ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ وہ جو تلوار چلانے پر کسی کو مجبور کرتا ہے اگر مد مقابل کو مار لیتا ہے تب بھی وہی قاتل ہوتا ہے اور اگر خود مارا جاتا ہے تب بھی وہی قاتل ہوتا ہے کیونکہ اس نے دوسرے کو تلوار چلانے پر مجبور کیا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آیندہ پیدا ہونے والے کاملین کو خواہ تقویٰ کے کامل ہوں یا کُفر کے کامل ہوں بطور کشف ملائکہ پر ظاہر کیا اور ان سے

پُوچھا کہ کیا تم ان صفات کو بتا سکتے ہو جو ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ آدم کے ذریعہ سے جو لوگ کامل ہونے والے تھے اور اس کی صفاتِ الٰہیہ کی تعلیم سے جو بہرہ ور ہونے والے تھے ان وجودوں کو ان کے سامنے کرکے پُوچھا کہ کیا تم ان کی صفات اور ان کے خواص کو ظاہر کر سکتے ہو (اور یہ مراد نہیں کہ محض نام جیسے زید بکر وغیرہ پوچھے) اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آدم جن لوگوں کو پیدا کرے گا وہ سفک دم کرنے والے یا فساد کرنے والے نہ ہونگے بلکہ ان نیک طبع اور شریف لوگوں سے ان کے دشمن جھگڑا کرکے لڑائی کی طرح ڈالیں گے پس سفکِ دم کے وہ دشمن مجرم ہونگے نہ کہ آدم یا اس کے اتباع خواہ وہ کافر منہ سے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے کتنے ہی نعرے لگاتے رہیں۔

آیت اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ میں صَدَق کے معنے درست بات کہنے کے ہیں۔

اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اگر تم سچ بول رہے ہو۔ فرشتوں کی نسبت اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق گناہ کا امکان ثابت نہیں پس اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے تو ان کی صفات بتاؤ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اگر تمہاری بات درست ہے تو ان کی صفات بتاؤ یہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ صَدَقَ کے معنے صرف سچ بولنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنے درست بات کہنے کے بھی ہوتے ہیں اور یہی معنی اس آیت میں ہیں۔

آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں جدید طریقۂ تعلیم کنڈر گارٹن کی طرف اشارہ

اوپر جو معنے اس آیت کے کئے گئے ہیں ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو اپنے بعد آنے والے انبیاء اور اپنی جماعت کے افراد کی قابلیتوں کا بھی ایک حد تک علم دیا جاتا ہے کیونکہ آدم کے بعد آنے والے انبیاء کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہ سلوک نظر آتا ہے کہ اپنے بعد آنیوالے ایک یا ایک سے زیادہ نبیوں کی خبر دیتے رہے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو جامع جمیع کمالات تھے ان کی تو ہر ایک نبی نے ہی خبر دی ہے اسی طرح انبیاء کی زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اتباع میں سے جو خاص وجود ہوتے ہیں ان پر ان کے حالات بھی اجمالی طور پر منکشف کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نبی نے اپنے انصار چننے میں غلطی نہیں کی یعنی ان کے انصار کی اکثریت کبھی غلطی پر جمع نہیں ہوئی کاش شیعہ لوگ اس حقیقت کو دیکھتے اور خلفاء کی مخالفت سے باز آتے۔

لطیفہ:۔ آجکل کے تعلیم کے طریقوں میں سے جدید ترین طریقہ کنڈرگارٹن کہلاتا ہے جو جرمنی کی ایجاد ہے اس کے لفظی معنے تو بچوں کے باغ کے ہیں مگر محاورہ میں اس کے معنے بچوں کا سکول کے لئے جاتے ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس طریقِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ کتابوں سے علم پڑھانے کی بجائے چیزیں دکھا کر ان کے نام سکھائے جائیں اس طرح بات اچھی طرح یاد رہتی ہے اور بچہ حافظہ پر بوجھ پڑے بغیر سبق یاد کر لیتا ہے اس طریقِ تعلیم میں یا تو عملاً باغ میں بچہ کو پھرا کر مختلف اشیاء کے نام یاد کرائے جاتے ہیں اور یا تصویروں اور مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے نمونوں کو دکھا کر مختلف اشیاء کا علم دیا جاتا ہے یورپ کو اور خاصکر جرمنی کو اس طریقِ تعلیم پر بڑا ناز ہے مگر دیکھو کہ قرآن کریم کی اس مختصر آیت میں اسی کنڈرگارٹن کے طریق کو کس لطیف طور پر پیش کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کو زبانی اس طرح نہیں سکھائی کہ الفاظ یاد کرا تا بلکہ اشیاء کو پیش کرکے اور ان کے امثال دکھا کر ان کے نام بتائے اور جب فرشتوں کے سبق کا وقت آیا تو انہیں بھی صرف الفاظ میں جواب نہیں دیا گیا بلکہ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فرشتوں کے سامنے بھی اصل اشیاء کو یا ان کے کشفی وجود کو پیش کرکے پھر آدم سے کہا کہ ان کے نام بتاؤ کیونکہ علم سکھانے کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ اصل چیز یا اس کے نمونہ یا تصویر کو پیش کرکے اس کا نام اور کام بتایا جائے اس طرح سبق خوب یاد رہتا ہے پس پہلا سبق جو کنڈرگارٹن کے اصول پر دیا گیا وہ نہ تھا جو جرمنی میں دیا گیا بلکہ جنت یا باغِ آدم پہلا کنڈرگارٹن کا سکول تھا جس میں خدا تعالیٰ کی وحی نے پہلے آدم کو اور پھر آدم کے ذریعہ

عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ

تُو نے ہمیں سکھایا ہے اس کے سوا ہمیں کسی قسم کا علم نہیں ہے یقیناً تو ہی کامل علم والا (اور ہر قول اور فعل میں) حکمت کو مدنظر رکھنے والا ہے (اس پر اللہ نے) فرمایا اے آدم

سے فرشتوں کو اسماء کا سبق مسمیات دکھا کر دیا۔ اس کا نقش گہرا ہو اور پوری کیفیت ذہن میں سما جائے۔

اللہ تعالیٰ کے تعلیم دینے کی ایک تازہ مثال اس زمانہ میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ جنہوں نے کسی باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم نہ پائی تھی انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے عربی زبان میں کتب لکھنی شروع کیں تو ایک دفعہ انہیں ایک رات میں چالیس ہزار عربی الفاظ سکھائے گئے چنانچہ اس کے بعد انہوں نے دعویٰ سے عربی کتب لکھیں اور دنیا کو چیلنج دیا کہ اس قسم کی فصیح عبارت اور لطیف مضامین پر مشتمل کتب الگ الگ یا مل کر لکھ کر پیش کریں لیکن باوجود اس کے کہ ان کتب کو عربی بلاد میں بھی کثرت سے پھیلایا گیا آج تک کوئی ان کی مثل نہیں لکھ سکا اور یہ معجزہ قرآنی معجزہ کی تائید میں اور اس کے افاضۂ کمال کے ثبوت میں تھا۔

اس جگہ ایک سوال کا جواب دیا جانا ضروری ہے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ملائکہ سیکھ نہ سکتے تھے تو پھر انہیں نام بتانے سے کیا فائدہ تھا اور اگر وہ سیکھ گئے تو آدم و ملائکہ کی قابلیت کے تفاوت کا مسئلہ غلط ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ آدم کا علم تفصیلی ہے اور ملائکہ کا اجمالی۔ اجمالی طور پر کسی شے کا علم ان افراد کو بھی ہو جاتا ہے جو اس کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے ملائکہ کو صرف یہ بات بتانی منصود تھی کہ آدم اپنی قابلیت سے صفاتِ الٰہیہ کا علم جس رنگ میں حاصل کر سکتا ہے ملائکہ نہیں کر سکتے اور اس قدر بات کاملین کا وجود پیش کرنے سے ان کی سمجھ میں آ سکتی تھی ورنہ یہ مراد نہیں کہ کاملین کا وجود دیکھنے کے بعد فرشتے تمام صفات الٰہیہ کا تفصیلی علم سیکھ گئے۔

٣٣ حل لغات۔ سُبْحَانَكَ

سُبْحَانَكَ۔ سُبْحَانَ مصدر ہے اور اس کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ اَیْ اُبَرِّیُٔ اللّٰہَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَۃً کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام عیوب سے پاک سمجھتا ہوں (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۳۱؁

اَلْحَكِيْمُ

اَلْحَکِیْمُ: اَلْعَالِمُ، عالم صَاحِبُ الْحِکْمَۃِ، حکمت والا۔ اَلْمُتْقِنُ لِلْاُمُوْرِ، تمام کاموں کو اچھی طرح کرنے والا جس کے کاموں کو کوئی بگاڑ نہ سکے (اقرب) حِکْمَۃٌ کے معنے ہیں عدل۔ علم۔ حلم۔ یعنی دانائی۔ مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَہَالَۃِ یعنی ہر وہ بات جو جہالت سے روکے۔ کُلُّ کَلَامٍ مُوَافِقٍ لِلْحَقِّ۔ ہر وہ کلام جو سچائی کے موافق ہو۔ بعض کے نزدیک اس کے معنے وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَوْضِعِہٖ کے ہیں یعنی ہر امر کو اس کے مناسب حال طور پر استعمال کرنا۔ نیز اس کے ایک معنی ہیں صَوَابُ الْاَمْرِ وَسَدَادُہٗ بات کی حقیقت اور اس کا مغز۔ (اقرب) حَکَمَ جو حَکِیْم کا مادہ ہے اس کے معنے ہیں مَنَعَ مَنْعًا لِلْاِصْلَاحِ۔ اصلاح کی خاطر کسی کو کسی کام سے روکنا۔ اور اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَکَمَۃٌ کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

اس سوال کا جواب کہ اگر ملائکہ سیکھ نہ سکتے تھے تو ان کو نام بتانے سے کیا فائدہ؟

اَبَنِیْ حَنِیْفَۃَ اَحْکِمُوْا سُفَہَاءَکُمْ کہ

اے بنی حنیفہ اپنے بیوقوفوں کو سمجھاؤ اور بری باتوں سے روکو (مفردات)

تفسیر۔ ملائکہ نے ان وجودوں کے دکھلائے جانے پر کہا کہ اے اللہ تو پاک ہے ہمیں تو اسی قدر علم ہے جس قدر تو نے ہمیں دیا ہے تُو بہت جاننے والا اور حکمت والا خدا ہے یعنی آدم کی خلافت کا مسئلہ ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے خونریزی اور فساد ہوگا مگر اب اس اظہار سے کہ گو اس کے خلیفہ ہونے پر خونریزی اور فساد ہوگا مگر

سُبْحَانَكَ

اس کی ذمہ واری آدم پر نہ ہوگی بلکہ جس مقام پر آدم کو کھڑا کیا

گیا ہے اس کا یہ بھی ایک لازمہ ہے جس کا باعث بیرونی دشمن یا اندرونی کمزور وجود ہوتے ہیں نہ کہ خلیفہ اور اس کے ساتھی۔ مگر ہم اب سمجھ گئے ہیں کہ اس حالت کا پیدا کرنا حکمت سے خالی نہیں اور یہ فعل تیرے حکیم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا تو وہ سیکھ گیا فرشتوں کو نہ سکھایا وہ نہ سیکھے پھر اس میں فرشتوں کا کیا قصور؟

بعض لوگ غلطی سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا تو وہ سیکھ گیا فرشتوں کو نہ سکھایا وہ نہ سیکھے پھر اس میں فرشتوں کا کیا قصور۔ اور ان کی بات کو غلط کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ یہ اعتراض صرف اس وجہ سے پیدا ہُوا ہے کہ پہلی آیت جس میں خلافت کا سلسلہ شروع کرنے کا اعلان ہے اس کے یہ معنی سمجھے گئے ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا (۲) فرشتوں نے جواب میں کہا کہ ہم جو تیری تسبیح کرنے والے موجود ہیں ہماری موجودگی میں کسی اور خلیفہ کی کیا ضرورت ہے کیا ہم کافی نہیں۔

لیکن یہ دونوں نتیجے جو اخذ کئے گئے ہیں غلط ہیں۔

(۱) اس آیت میں کسی مشورہ کا ذکر نہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ان الفاظ میں مشورہ کرنے کا کوئی اشارہ تک نہیں اگر مشورہ ہوتا تو یُوں کہنا چاہیئے تھا کہ اے فرشتو! بتاؤ کہ میں زمین میں کوئی خلیفہ بناؤں یا نہ بناؤں مگر اس قسم کا کوئی جملہ نہ اس جگہ ہے نہ قرآن کریم میں کسی اور جگہ ہے پس جب مشورہ لیا ہی نہیں گیا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے جن کو علم تھا ہی نہیں مشورہ کیوں لیا اور اگر مشورہ لیا تھا تو ان کے مشورہ پر اعتراض کیسا؟ (۲) فرشتوں نے جو کچھ کہا ہے جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے اس میں ہرگز یہ کوئی ذکر نہیں کہ ہماری موجودگی میں کسی اور خلیفہ کی کیا ضرورت ہے اور وہ ایسا کہہ بھی کب سکتے تھے جبکہ زمین پر خلیفہ بنانے کا ذکر تھا نہ کہ آسمان پر۔ فرشتوں نے جو کچھ کہا اس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس نئے نظام کی جو دُنیا پر قائم کیا جانے والا ہے جبکہ اس کے ساتھ خونریزی اور فساد کا امکان بھی موجود ہے کیا ضرورت ہے پس ان کا سوال حقیقت کو سمجھنے کے لئے تھا نہ کہ خدا تعالیٰ پر اعتراض کے طور پر یا اپنے آپ کو خلافت کا مستحق ثابت کرنے کے لئے۔ اب انکے اس سوال کا صحیح جواب دو ہی طرح ہو سکتا تھا (۱) یا تو انہیں یہ بتایا جاتا کہ خلیفہ کے قیام کے بعد کوئی خونریزی یا فساد نہ ہوگا (۲) یا یہ بتایا جاتا کہ خونریزی اور فساد تو بیشک ہوگا لیکن اس کے باوجود یہ نظام ضروری ہے اور اس کے فوائد اسکے نقصانوں سے زائد ہیں چونکہ خلافت انسانیہ کے نظام کے متعلق یہی دوسرا جواب صحیح اور درست تھا اللہ تعالیٰ نے یہی جواب کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا ہے اس نے یہ نہیں کہا کہ خلافت انسانیہ کے ساتھ خونریزی اور فساد نہیں ہوگا بلکہ یہ بتایا ہے کہ گو اس نظام کی وجہ سے کچھ لوگ خونریزی اور فساد کے مجرم ہونگے لیکن اس کے نتیجہ میں ایسے وجودوں کا بھی ظہور ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات کے حامل ہوں گے اور خدا تعالیٰ کے مظہر ہونگے اور ایسے وجودوں کو پیدا کرنا ناقص وجودوں کی موجودگی کے باوجود جو انسانوں میں سے ظاہر ہونگے صفات الٰہیہ کے ظہور کے لئے ضروری ہے اور نظام عالم کے لئے مفید۔ یہ جواب بھی دو طرح دیا جا سکتا تھا (۱) فلسفیانہ رنگ میں دلائل کے ساتھ (۲) عملی رنگ میں پہلے خلیفہ کی قوتوں کا اظہار کرکے اور اسکی نسل کے کاملین کو کشفی رنگ میں فرشتوں کو دکھا کر۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا طریق زیادہ اعلیٰ اور زیادہ مؤثر ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو اختیار کیا اور آدم کو صفات الٰہیہ کی تعلیم دی اور اس نے ان پر عمل کرکے بتا دیا کہ صفات الٰہیہ کا کامل ظہور بغیر ایسے وجود کے جس میں خیر اور شر دونوں قسم کی طاقتیں موجود ہوں اور اسے دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کی مقدرت دی جائے اور پھر وہ محبت الٰہی کے جذبہ سے متاثر ہو کر خیر کی طاقتوں کو اپنے اندر نشو و نما دے کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرے ممکن نہیں پس چونکہ صفات الٰہیہ کے کامل ظہور کے لئے ایسے وجود کا ہونا جسے خیر و شر کی تعلیم دے کر اپنے لئے

خود راستہ تجویز کرنے کی مقدرت دے دی جائے ضرور ہے ایسے ناقص افراد کے پیدا ہونے کے خطرہ کو بھی جو شر کی طاقتوں کو اختیار کر کے خونریزی اور فساد کریں برداشت کر لیا جائے گا۔ اگر یہ مقدرت نہ دی جائے اور اس وجود کو خیر پر مجبور کیا جائے تو وہ صفات الٰہیہ کا مظہر نہیں کہلا سکتا۔ صرف ایک بے جان اور بے مقدرت آلۂ کار کہلا سکتا ہے۔

جواب کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ اعتراض کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا اور فرشتوں کو نہ سکھایا تو پھر اس کا یہ پوچھنا کس طرح درست تھا کہ مجھے ان مسمّیات کی صفات اور خواص سے اطلاع دو۔ درست نہیں۔ کیونکہ یہاں تو سوال ہی یہ تھا کہ ایسے وجودوں کی کیا ضرورت ہے جو گناہ بھی کر سکیں گے اور شریعت کے مجرم ہو سکیں گے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ بیشک وہ گناہ کے مرتکب بھی ہو سکیں گے مگر اس مقدرت کے باوجود ان میں سے کاملین کا نیکی کو اختیار کرنا اور صفات الٰہیہ کو اپنے وجود سے ظاہر کرنا اور پھر ایک نظام کے ماتحت دوسروں کو نیکی کی راہ پر چلانا ہی تو ان کے مقرب بارگاہ ہونے کا ذریعہ ہو گا اور یہی تو ان کے اعلیٰ کمالات کا ثبوت ہو گا اور جس طرح ان کامل وجودوں کو دکھا کر جو فرشتوں کے دائرۂ عمل سے اوپر نکل چکے ہوں اور صفاتِ الٰہیہ کو مجموعی طور پر بہتر رنگ میں ظاہر کرنے والے ہوں۔ فرشتوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جا سکتا تھا اور کوئی ذریعہ انہیں حقیقتِ انسانیہ سے آگاہ کرنے کا ممکن نہ تھا پس یہ آیات قابلِ اعتراض نہیں بلکہ ان میں ایک اعلیٰ حقیقت ایک ایسے مکمل پیرایہ میں ظاہر کی گئی ہے کہ اس سے بہتر ذریعہ اور ممکن ہی نہیں۔

فرشتوں کا جواب ظاہر کرتا ہے کہ باوجود معترضین کے اعتراض کے جو وہ فرشتوں کی طرف سے کرتے ہیں فرشتوں کی اس جواب سے پوری تسلی ہو گئی اور انہوں نے اقرار کیا کہ ان کا علم محدود ہے اور انسان کا ان کے مقابل پر غیر محدود اور انہوں نے تسلیم کیا کہ اللہ تعالیٰ اَلْعَلِیْمُ اور اَلْحَکِیْمُ ہے یعنے اس کا علم کامل ہے اور اس کا کوئی فعل بلا حکمت نہیں ہوتا۔

آیت ہذا میں فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی صفات العلیم اور الحکیم بیان کرنے کا مطلب۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے یہ تو نتیجہ نہ نکلا کہ انسان بھی کوئی ذاتی خوبی رکھتا ہے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کے رو سے اور یہی حقیقت بھی ہے حقیقی طور پر ذاتی خوبی تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی وجود میں ہے ہی نہیں۔ اور فرشتوں نے اپنے پہلے اظہار خیال میں ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ انہوں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ پس یہ سوال تو زیر بحث ہی نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ کو علم کامل حاصل ہے یا نہیں سوال یہ تھا کہ آیا انسانی پیدائش کی کوئی غرض ہے یا نہیں اور اسی کا جواب آدمؑ کو صفاتِ الٰہیہ کا علم دیکر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کو سیکھنے کی قابلیت جس قدر ایسے وجود میں پائی جا سکتی ہے جو خیر و شر دونوں کی مقدرت رکھتا ہو وہ قابلیت ان وجودوں میں نہیں ہو سکتی جو صرف خیر کا ہی مادہ رکھتے ہوں اور شر کو اختیار کرنے کی مقدرت ان میں نہ ہو فرشتوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور عَلِیْمٌ کے ساتھ حَکِیْمٌ کا لفظ لگا کر اقرار کیا کہ خدا تعالیٰ کی صفت علیم کا کامل مظہر وہ نہیں ہو سکتے بلکہ انسان ہی ہو سکتا ہے اس لئے اس کی پیدائش خدا تعالیٰ کی صفت حکیم کے ماتحت ہے یعنی بڑی بھاری حکمت اپنے اندر رکھتی ہے۔

آدم کے واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کی غرض

جیسا کہ اوپر کی تشریحات سے ثابت ہے کہ آدم کے واقعہ کی اس تفصیل کے بیان کرنے سے پیدائش عالم کی غرض اور حکمت بتانا مقصود ہے اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہر زمانہ میں الہام الٰہی کا نزول اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے اور جو لوگ نبیوں کی بعثت پر معترض ہوتے ہیں وہ گویا دوسرے الفاظ میں اس امر پر معترض ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی پیدائش کی غرض کو کیوں پورا کرنے لگا ہے اور یہ اعتراض

أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ

ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتا پھر جب اس (یعنی آدم) نے ان کو ان کے نام بتائے (تو)

قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّىٓ أَعْلَمُ غَيْبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ

فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں یقیناً آسمانوں

وَٱلْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۝

اور زمین کی چھپی باتیں جانتا ہوں اور میں (اسے بھی) جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور (اسے بھی) جو تم چھپاتے تھے ۳۴؎

ان کا ایسا ہوا ہے کہ اس کی بناء پر نبوت کے سلسلہ کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جو ملائکہ نے کہا کہ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تُو نے ہمیں سکھایا اس کا یہ مفہوم نہیں کہ جو تُو نے ہمیں سکھایا ہے اسی قدر ہمیں علم ہے کیونکہ یہ تو ایک ظاہر حقیقت ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارا علم اس طرح بڑھتا نہیں جس طرح کہ انسان کا بڑھتا ہے اور لے اس کے بڑھانے کی مقدرت حاصل ہے اور دوسرے یہ کہ ہمارے اندر وہی طاقتیں ہیں جو تُو نے ہمارے اندر رکھی ہیں اور ان طاقتوں کے ساتھ ہم انسان کے متنوع اور جامع علوم کو نہیں پہنچ سکتے یعنی ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ انسان کی پیدائش میں حکمت ہے اور اس کے سپرد ایک ایسا کام ہے جو ہم بھی نہیں کر سکتے اس لئے اگر بعض انسان خونریزی کرنے والے ہوں یا خونریزی کا موجب بننے والے ہوں یا شریروں کی شرارتوں کو روکنے کے لئے جائز خونریزی پر مجبور ہوں تب بھی انسان کی پیدائش ضروری اور حکیمانہ فعل ہے۔

غَيْبَ — ۳۴؎ حل لغات:- غَيْبٌ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۴؎

ٱلسَّمَٰوَٰتِ — اَلسَّمٰوٰتُ:- کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۳۰؎

ٱلْأَرْضِ — الْأَرْضُ:- کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۱۲؎

تُبْدُونَ — تُبْدُوْنَ:- اَبْدٰی (یُبْدِیْ) سے مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَدَا (یَبْدُوْا) سے جو اس کا مجرد ہے بنا ہے بَدَا الْاَمْرُ کے معنے ہیں ظَهَرَ کوئی امر واضح اور ظاہر ہو گیا اور اَبْدَی الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَظْهَرَهٗ کسی امر کو ظاہر کیا (اقرب) پس تُبْدُوْنَ کے معنے ہونگے تم ظاہر کرتے ہو۔

تَكْتُمُونَ — تَکْتُمُوْنَ:- کَتَمَ (یَکْتُمُ کَتْمًا وَکِتْمَانًا) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے کَتَمَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں اَخْفَاهُ اس کو پوشیدہ رکھا۔ بعض اوقات کَتَمَ کے دو مفعول آجاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کَتَمَ زَیْدًا الْحَدِیْثَ کہ اس نے زید سے بات کو مخفی رکھا۔ اس میں زَیْدًا اور اَلْحَدِیْثَ دونوں کَتَمَ کے مفعول ہیں (اقرب) نیز اہل عرب کہتے ہیں کَتَمَ الْفَرَسُ الرَّبْوَ اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ضَاقَ مَنْخِرُهٗ عَنْ نَفْسِهٖ کہ گھوڑا جب دوڑتے ہوئے ہانپ گیا اور لمبے سانس لینے [illegible] تو نتھنوں کے تنگ ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح سانس نہ لے سکا (اقرب) گویا جب کسی چیز کی وضع ایسی ہو کہ وہ کسی بات کے ظاہر کرنے سے قاصر ہو تو اس وقت بھی اس کے متعلق کَتَمَ کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں مفردات راغب میں امام راغب لکھتے ہیں کہ لَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا کے معنی حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ نے یہ کئے ہیں کہ ان کا اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا

سکتا اس طور پر ہوگا کہ اُن کے جوارح تمام باتوں کو ظاہر کردینگے (مفردات) گویا آپ ہی آپ جو بات ظاہر ہو جائے خلاف کَتَمَ ہے۔ پس جو بات آپ ہی رُکی ہوئی ہو اسپر کَتَمَ بولیں گے۔ پس تَكْتُمُوْنَ کے دو معنے ہوئے (۱) جو تم چھپاتے ہو (۲) جو تم سے ظاہر نہیں ہو سکتا ہے جو چیز باہر آنی تھی وہ بسبب ناقابلیت کے نہیں آسکتی یعنی تمہاری خلقت ایسی ہے کہ تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

تفسیر گو فرشتوں نے اجمالی طور پر انسانی پیدائش کی غرض کو سمجھ لیا تھا مگر دلیل کو مکمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدم کو حکم دیا کہ وہ ان کاملین کے خواص اور خصائص کو جو اس کی امت میں ہونے والے تھے یا اس کی نسل میں ہونے والے تھے بیان کرے تاکہ وہ حقیقت جو علمی طور پر ظاہر تھی عملی طور پر بھی ظاہر ہو جائے۔

اس سے یہ مُراد نہیں کہ فرشتوں یا آدم میں واقعی کوئی ایسا مکالمہ ہُوا بلکہ عربی محاورہ کے مطابق ایک حقیقت جو ظاہر کی جائے اُسے مکالمہ کا رنگ دے دیا جاتا ہے عربی زبان کا شاعر راجز کہتا ہے اِمْتَلَاءَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ حوض بھر گیا اور اس نے کہا کہ بس بس مَیں بھر گیا ہوں اس سے یہ مراد نہیں کہ حوض بھر گیا تو چیخ اُٹھا کہ بس کر دبلکہ مراد یہ ہے کہ حوض نے بزبان حال ایسا کہا (فقہ اللغۃ للثعالبی جلد دوم ص۲۳) اسی طرح ایک اور عرب شاعر کہتا ہے ؎

قَالَتْ لَهُ الْعَيْنَانِ سَمْعًا وَطَاعَةً (لسان)

آنکھوں نے اس سے کہا کہ ہم نے آپ کی بات سُنی اور ہم فرمانبرداری کرینگی۔ دوسری زبانوں میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے اُردو کے مشہور شاعر جلال الدین لکھنوی جن سے بچپن میں مَیں نے بھی اصلاح لی تھی کہتے ہیں ؎

حکم دل کا ہے لگی آکے بجھاؤ میری
عرض کرتے ہیں یہ آنسو کہ جناب آنکھوں سے

اس شعر کا بھی یہی مطلب ہے کہ دل کے درد کا نتیجہ آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا ہے پس کبھی قول کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مُراد صرف یہ ہوتی ہے کہ زبانِ حال سے یہ امر ظاہر ہُوا اسی طرح اس جگہ یہ ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ایسا کہا ہو بلکہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت آدم علیہ السلام نے ان صفاتِ الٰہیہ کا اظہار کرنا شروع کیا جو ان کی نسل سے ظاہر ہونے والی تھیں اور اس طرح عملی طور پر ملائکہ پر انسان کی رُوحانی ترقیات کی حقیقت کُھل گئی اور آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے کے بھی یہ معنی نہیں کہ بالمشافہ بٹھا کر درس دیا گیا تھا بلکہ الہام جلی یا خفی یا دونوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے یا دونوں سے انہیں صفاتِ الٰہیہ اور لغت اور خواص اشیاء کا علم بخشا گیا فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ یعنی جب آدم علیہ السلام نے ان کمالات کو ظاہر کرنا شروع کیا جو ان کی اُمت سے عام طور پر اور انکی نسل کے کاملین سے خاص طور پر ظاہر ہونے والے تھے تو ملائکہ کو معلوم ہو گیا کہ جس رنگ میں صفات الٰہیہ کو انسان ظاہر کرنے والا ہے اور کوئی وجود ظاہر نہیں کر سکتا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اس میں پہلی آیت کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے کہ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور اسی مضمون کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ زمین کی ضرورتوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے اور آسمانی فضل کی بارشیں جس طرح زمین پر نازل ہونا چاہتی ہیں اور اس کی صفات کا جو تقاضا ہے اسے بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

فرشتوں کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا مطلب۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ فرشتوں کے دلوں میں کوئی ایسا اعتراض تھا جسے وہ چھپاتے تھے اور مُنہ سے کچھ اور کہتے تھے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے فرشتے گناہ سے پاک ہیں وہ اس قسم کا فعل کر ہی نہیں سکتے اس جملہ کا صرف یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان قوتوں کا بھی علم ہے جو فرشتوں سے ظاہر ہوتی ہیں اور ان کا بھی جو انکے ذریعہ سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ حلِ لغات میں

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ اسپر انہوں نے تو فرمانبرداری کی مگر

اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ابلیس (نے نہ کی۔ ابلیس) نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا ۳۵

کَتَمَ کے معنوں میں بتایا جاچکا ہے کہ کَتَمَ کے معنے کبھی روک بننے اور معذور ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور یہی معنے اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کس حد تک تم صفاتِ الٰہیہ کو ظاہر کرنے پر قادر ہو اور کس حد تک ان کے اظہار سے قاصر ہو اس لئے میری صفات کا طرنے چاہا کہ وہ ایک ایسا وجود بھی کھڑا کرے جو خدا تعالیٰ کی تمام صفات کو ظاہر کرسکنے کی مقدرت رکھتا ہو۔

قُلْنَا

۳۵ حل لغات :۔

قُلْنَا۔ قَالَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور قَالَ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۳۱۔

اُسْجُدُوْا

اُسْجُدُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَلسُّجُوْدُ جو (سَجَدَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں التَّذَلُّلُ عاجزی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا۔ وَقَوْلُهٗ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ قِيْلَ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ لَهٗ وَالْقِيَامِ بِمَصَالِحِهٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِهٖ یعنی آیت اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ الخ میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کی فرمانبرداری کریں اور اس کے ماتحت چلیں (یعنی اصلاح کا وہ کام جو آدم دنیا میں کرینگے اس میں اسکی مدد کریں اور اس کی قبولیت لوگوں میں پھیلائیں) اور اسکی مدد کریں اور اس کی اولاد کے لئے ممد اور معاون بنیں اَوِ اسْجُدُوْا لِاَجْلِ خَلْقِ اٰدَمَ نیز اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ آدم کی پیدائش کی وجہ سے اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤ۔ وَقَوْلُهٗ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اَیْ مُتَذَلِّلِيْنَ مُنْقَادِيْنَ اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے جاؤ (مفردات) سَجَدَ (يَسْجُدُ) سُجُوْدًا کے معنی ہیں خَضَعَ وَانْحَنٰى اس نے عاجزی کی اور عجز کا اظہار جھکنے سے کیا سَجَدَ الْبَعِيْرُ۔ خَفَضَ رَأْسَهٗ اونٹ نے اپنا سر نیچا کیا۔ سَجَدَتِ السَّفِيْنَةُ الرِّيَاحَ اَطَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا کشتی نے ہوا کی پیروی کی۔ اور جدھر کو ہوا اسے لے گئی اُدھر چل پڑی۔ اہل عرب کہتے ہیں فُلَانٌ سَاجِدُ الْمَنْخِرِ اور مراد یہ ہوتی ہے ذَلِيْلٌ خَاضِعٌ کہ فلاں شخص مطیع ہے اور عاجزی کرنے والا ہے (اقرب) پس اُسْجُدُوْا کے معنے ہونگے اطاعت و فرمانبرداری کرو۔

اِلَّا

اِلَّا۔ حرف استثناء ہے اور اپنے مابعد اسم کو اکثر نصب دیتا ہے۔ استثناء دو قسم ہوتا ہے (۱) متصل جیسے جَاءَنِی الْقَوْمُ اِلَّا زَيْدًا یعنی زید کے سوا باقی سب لوگ میرے پاس آئے (۲) منقطع جیسے مَا جَاءَنِی الْقَوْمُ اِلَّا حِمَارًا یعنی لوگ تو میرے پاس نہیں آئے مگر گدھا آیا۔

اِبْلِيْس

اِبْلِيْسُ :۔ اِبْلِيْسُ اَبْلَسَ سے بنا ہے اور اَبْلَسَ کے معنے ہیں قَلَّ خَيْرُهٗ اس سے کسی بھلائی کی توقع کم ہوگئی یعنی بے خیر ہو گیا۔ اِنْكَسَرَ وَحَزِنَ شکستہ خاطر ہو گیا۔ غمگین ہو گیا اور جب اَبْلَسَ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کہیں تو اس کے یہ معنے ہونگے يَئِسَ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا (ان معنوں میں لازم معنے کے علاوہ متعدی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں اَبْلَسَهٗ غَيْرُهٗ اس کو کسی نے ناامید اور مایوس کر دیا) اور اَبْلَسَ

فِیْ اَمْرِہٖ کے معنے ہیں تَحَیَّرَ وہ اپنے معاملہ کے بارہ میں حیرانگی میں پڑ گیا۔ اَبْلَسَ فُلَانٌ کے ایک معنے سَکَتَ غَمًّا کے بھی ہیں یعنی غم و اندوہ کی وجہ سے خاموش ہو گیا (اقرب) پس اِبْلِیْس کے معنے ہونگے (۱) ایسی ہستی جو خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گئی (۲) ایسی ہستی جس سے بھلائی کی امید کم ہو (۳) ایسی ہستی جو اپنے معاملہ میں حیران رہ گئی ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہئے (۴) ایسی ہستی جو غم و اندوہ سے بھری رہے۔

اَبٰی:۔ اَبَاہُ اِبَاءً وَاِبَاءَۃً کے معنے ہیں لَمْ یَرْضَہٗ اس کو پسند نہ کیا (اقرب) امام راغب اپنی کتاب مفردات راغب میں لکھتے ہیں کہ اَلْاِبَاءُ کے معنی ہیں شِدَّۃُ الْاِمْتِنَاعِ کسی امر سے سختی سے رُکنا (ہر امتناع کو اِبَاء نہیں کہیں گے) (مفردات) مصنف تاج العروس لکھتے ہیں اَبَاہُ کَرِھَہٗ کہ اَبٰی کے معنے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں نیز لکھا ہے کہ اَلْاِبَاءُ:۔ ھُوَ الْاِمْتِنَاعُ عَنِ الشَّیْءِ وَالْکَرَاھِیَۃُ لَہٗ بِبُغْضِہٖ وَعَدَمِ مُلَایَمَتِہٖ کسی چیز کو رَدّی اور اپنے مناسب حال نہ سمجھ کر اس سے انکار کر دینا اور اس سے نفرت کرنا اِبَاءٌ کہلاتا ہے (تاج)

اِسْتَکْبَرَ:۔ اِسْتَکْبَرَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں رَاٰہُ کَبِیْرًا وَعَظُمَ عِنْدَہٗ کسی چیز کو بڑا سمجھا نیز اِسْتَکْبَرَ کے معنے ہیں کَانَ ذَا کِبْرِیَاءٍ بڑا بنا۔ مغرور ہُوا (اقرب) مفردات میں لکھا ہے۔ اَلْکِبْرُ:۔ اَلْحَالَۃُ الَّتِیْ یَتَخَصَّصُ بِھَا الْاِنْسَانُ مِنْ اِعْجَابِہٖ بِنَفْسِہٖ وَذٰلِکَ اَنْ یَّرَی الْاِنْسَانُ نَفْسَہٗ اَکْبَرَ مِنْ غَیْرِہٖ کہ کِبْر اس حالت کو کہتے ہیں کہ جب انسان خود پسند بن کر کسی بات کو اپنے ساتھ مخصوص سمجھ لیتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز اور بڑا خیال کرنے لگ جاتا ہے وَالْاِسْتِکْبَارُ یُقَالُ عَلٰی وَجْھَیْنِ اور اِسْتِکْبَار (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) دو طور پر ہوتا ہے (۱) اَنْ یَّتَحَرَّی الْاِنْسَانُ وَیَطْلُبَ اَنْ یَّصِیْرَ کَبِیْرًا کہ انسان بڑا بننے کی خواہش اور کوشش کرتا ہے (اور یہ اگر مناسب محل و مقام پر کوشش کی جائے تو قابلِ تعریف بات ہوتی ہے) (۲) اَنْ یَّتَشَبَّعَ فَیُظْھِرَ مِنْ نَّفْسِہٖ مَا لَیْسَ لَہٗ کہ کوئی شخص بعض ایسی باتوں کے ساتھ اپنے نفس کو متصف کرے جو اس میں پائی نہیں جاتیں اور مقصد یہ ہو کہ وہ کسی طرح دوسروں پر فوقیت لے جائے (مفردات)

كَانَ:۔ کَانَ افعال ناقصہ میں سے ہے یہ مبتدا اور خبر پر داخل ہو کر مبتدا کو رفع، اور خبر کو نصب دیتا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ایک فعل گزشتہ زمانے میں سرزد ہو کر ختم ہو گیا۔ بعض اوقات اس کے معنے صرف کسی بات کے حدوث اور وقوع کے ہوتے ہیں اس وقت اس کی خبر نہیں آتی۔ چنانچہ کہہ دیتے ہیں کَانَ الْاَمْرُ کہ فلاں کام ہو چکا۔ علاوہ ازیں یہ کئی اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی صَارَ کے ہیں یعنی ہو گیا (اقرب) چنانچہ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ میں کَانَ کے معنی صَارَ کے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ اور یہ بھی کہ کافروں میں سے تھا۔

اَلْکٰفِرِیْنَ:۔ کفر سے اسم فاعل کَافِرٌ آتا ہے اور کَافِرُوْنَ اور کَافِرِیْنَ اس کی جمع ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ع۱

تفسیر: پیشتر اس کے کہ اس آیت کی مجموعی تفسیر بتائی جائے یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ اس آیت میں سجدہ کرنے سے کیا مُراد ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ (سورہ حٰم سجدہ ع ۵) یعنی نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ صرف اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے پس اس حکم کے ہوتے ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں بعض لوگ اسپر کہدیا کرتے ہیں کہ شاید آدم کے وقت میں سجدہ غیر اللہ کے لئے جائز ہوگا بعد میں منع ہُوا لیکن یہ خیال

كَانَ

اَبٰی

اَلْکٰفِرِیْنَ

اِسْتَکْبَرَ

آیت وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا میں سجدہ کرنے سے مُراد۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا امتناع۔

درست نہیں کیونکہ توحید پر قائم رہنے کا حکم ایک دائمی حکم ہے وقتی حکم نہیں کہ مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہو۔ علاوہ ازیں فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ (اعراف ع۲۴) وہ ہستیاں جو اللہ تعالیٰ کے قرب میں رہتی ہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بُرا نہیں سمجھتیں اور اس سے جی نہیں چُراتیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی رہتی ہیں اور صرف اس کے سامنے سجدہ کرتی ہیں

آدم کو سجدہ کرنے کے حکم سے مراد خلافتِ آدم کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ملائکہ کا ہمیشہ سے یہ طریق ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور کسی کے آگے سجدہ نہیں کرتے۔ پس جب ملائکہ اور ملائکہ کے نقشِ قدم پر چلنے والے وجودوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کبھی بھی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے تو یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیکر ملائکہ سے غیر اللہ کو سجدہ کروایا اور انہوں نے سجدہ کیا۔

فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا مطلب۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور یہ بھی کہ ملائکہ نے کبھی بھی کسی غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا تو اب یہ سوال رہ گیا کہ اس آیت میں سجدہ کے حکم سے کیا مُراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) عربی زبان میں گو کبھی لام سَجَدَ کے بعد اس کے معنوں کو تقویت دینے کے لئے بھی آتا ہے اور اس وقت اس کے معنے اس چیز کو سجدہ کرنے کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ (حٰمٓ سجدہ ع۵) یعنی اللہ کو سجدہ کرو لیکن کبھی لام عام صلہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت اس کے اپنے مستقل معنے ہوتے ہیں اور وہ معنے علّت اور سبب کے ہیں چنانچہ عرب کا مشہور شاعر امرء القیس کہتا ہے ؎

وَیَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارٰی مَطِیَّتِیْ (سبعہ معلقات)

اور یاد کرو اس دن کو جبکہ مَیں نے کنواری عورتوں کی خاطر اپنی سواری کی اونٹنی ذبح کر دی تھی اس جگہ لام تعدیہ کی تقویت کے لئے نہیں آیا بلکہ مستقل معنے دیتا ہے اور وہ سبب اور علّت کے معنے ہیں اور مُراد یہ ہے کہ میرے اونٹنی ذبح کرنے کا سبب کنواری لڑکیوں کی دلبستگی کا حصول تھا اسی طرح اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے معنے یہ نہیں کہ آدم کو سجدہ کرو بلکہ یہ معنی ہیں کہ آدم کے خلیفہ بننے کے سبب سے خدا تعالیٰ کو سجدہ کرو کہ اس نے ایک ایسے اچھے نظام کو قائم کیا۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے دلائل اور مشاہدات سے فرشتوں پر ثابت کر دیا کہ آدم کی خلافت اللہ تعالیٰ کے پُرحکمت افعال میں سے ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نیا اور کامل ظہور وابستہ ہے تو اس نے ملائکہ کو کہا کہ اس خوشی میں اب تم میرے حضور سجداتِ شکر بجا لاؤ یہ حکم ویسا ہی ہے جیسے خدا پرست لوگوں کو جب کوئی خدا تعالیٰ کی قدرت نظر آتی ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ خلافتِ آدم کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ آدم کی وجہ سے یعنی اس کے مقامِ خلافت پر فائز ہونے کی وجہ سے سجدہ کرو۔ سجدہ کِسے کرو اس کے اظہار کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سجدہ سوا خدا تعالیٰ کے کسی کو جائز ہی نہیں۔

ان معنوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مومن کو یہ سبق مِلتا ہے کہ جب کوئی فضل خدا تعالیٰ کا نازل ہو اسے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جانا چاہیئے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے مزید فضل نازل ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ انعامات کے حصول پر بجائے خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنی ترقیوں کو اپنے ہُنر اور اپنے کمال کی طرف منسوب کرنے لگ جاتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے سجدہ کرنے کے یہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں کہ آدم کی فرمانبرداری اور اطاعت کرو جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے سجدہ کے معنے علاوہ جسمانی سجدہ کے فرمانبرداری اور اطاعت کے بھی ہیں چنانچہ راغب لکھتے ہیں اَلسُّجُوْدُ: اَلتَّذَلُّلُ سجدہ کے معنے فرمانبرداری اور عاجزی کے بھی ہیں حل لغات میں راغب کا یہ قول لکھا جا چکا ہے کہ بعض آئمہ نے اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ

لَہٗ ذَا الْقِیَامِ بِمَصَالِحِہٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِہٖ یعنی ملائکہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ آدم کی فرمانبرداری کریں اور اس کی مصلحتوں اور اس کے ارادوں اور اس کی اولاد کے ارادوں اور خواہشوں کے پورا کرنے میں لگ جائیں۔

ان معنوں کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلعتِ خلافت بخشا تو ملائکہ کو حکم دیا کہ اب یہ دُنیا پر ہماری مرضی ظاہر کرنے والا ہے تم کو بھی چاہیئے کہ جو کام یہ کرے اس کی امداد کرو اور اس کی تائید میں اس نظام کو لگا دو جو تمہارے ماتحت ہے اور جس کی تم ابتدائی کڑیاں ہو چنانچہ فرماتا ہے فَسَجَدُوْا اس پر وہ سب کے سب آدم کی تائید میں لگ گئے اور اس کے ارادوں کو پورا کرنے کی کوششوں میں منہمک ہو گئے۔

اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ یعنی ملائکہ نے تو حکمِ الٰہی کے ماتحت سجدہ کر دیا۔ مگر ابلیس نے نہ کیا۔ ابلیس کون تھا اس کا تفصیلی جواب آگے آئے گا مگر یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ بہرحال وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ (کہف ع ۷) وہ جنوں میں سے تھا پس اپنی جبلّت کے مطابق اس نے فرمانبرداری سے انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو اِلَّا کا لفظ کیوں یہاں استعمال ہوا ہے کیونکہ اِلَّا کے معنے سوائے کے ہیں۔ اور سوائے کے لفظ سے تو انہی اشیاء کا استثناء کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے کی مذکورہ چیزوں میں سے ہوں مثلاً جب یہ کہیں کہ سب دوست آگئے سوائے زید کے تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ زید ہمارے دوستوں میں سے ہے پس اس آیت میں بھی سوائے ابلیس کے الفاظ کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ ابلیس بھی فرشتوں میں سے تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اِلَّا کے معنے سوائے کے ہیں اور بالعموم اِلَّا کے بعد جس وجود کا ذکر ہو وہ اِلَّا کے پہلے کے بیان کردہ گروہ کی جنس میں تو شریک ہوتا ہے مگر اس خاص فعل میں جس کا پہلے ذکر ہوا ہو اس سے مختلف ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہے کہ 'سوائے' سے پہلے جن دوستوں کا ذکر ہے ان میں تو زید شامل ہے لیکن آنے کے فعل میں ان کا شریک نہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اِلَّا کے بعد مذکور وجود اِلَّا سے پہلے کے مذکورہ گروہ سے الگ ہوتا ہے اور جب ایسا ہو تو عربی میں اس اِلَّا کو منقطع کہتے ہیں یعنی اس کے بعد جس وجود کا ذکر ہے وہ نہ صرف یہ کہ پہلے بیان کردہ فعل میں ان کا شریک نہیں بلکہ اس فعل کے مرتکب لوگوں کا بھی جزو نہیں اس کی مثال میں علماء نحو کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ جَاءَ الْقَوْمُ اِلَّا حِمَارَھُمْ یعنی قوم تو آگئی مگر ان کا گدھا نہیں آیا اس استعمال کے موقعہ پر اُردو زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے سوائے کا لفظ استعمال نہ کیا جائے گا بلکہ 'مگر' کا لفظ استعمال کیا جائے گا کیونکہ اُردو زبان میں سوائے کا لفظ وہی معنے دیتا ہے جن میں اِلَّا کے بعد کا مذکور اس سے پہلے کے مذکور کا حصہ ہو اور وہ دوسرے معنے اِلَّا کے جو اوپر بیان ہوئے ہیں سوائے کے لفظ سے ادا نہیں ہوتے ان دوسرے معنوں کے ادا کرنے کے لئے 'مگر' کا لفظ زیادہ مناسب اور ٹھیک ہوتا ہے۔

فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کے حکم سے مراد آدم کی فرمانبرداری کا حکم۔

حقیقتِ ابلیس میں اِلَّا استثناء منقطع کے لئے ہے

خلاصہ یہ کہ اس جگہ اِلَّا منقطع ہے اور اس کے معنے 'سوائے' کے نہیں بلکہ 'مگر' کے ہیں۔ ان معنوں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تو پھر ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے اور ان کے فرمانبرداری کرنے کے ذکر میں ابلیس کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جب اسے حکم ہی نہ دیا گیا تھا تو پھر اس نے سجدہ کرنا ہی کیوں تھا مگر یہ اعتراض ملائکہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے پہلی آیات میں بتایا جا چکا ہے کہ ملائکہ اس نظامِ عالم کے مدبّر ہیں چنانچہ قرآن کریم میں انہیں مختلف امور کی پہلی کڑی اور سببِ اولیٰ بتایا گیا ہے اور سورۃ نازعات میں ان کی نسبت آتا ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا ہم شہادت کے طور پر ان ارواح کو پیش کرتے ہیں جو کارخانۂ عالم کو چلاتی ہیں پس جب ملائکہ کارخانہ عالم کو چلانے والے اور پہلی علّت ہیں تو جو انہیں دیا جائیگا [illegible] ان کے لئے ہی نہ ہوگا بلکہ ان افراد کے لئے بھی ہوگا جو ان کے تابع ہیں چنانچہ اس حدیث میں جو پہلے بیان ہو

چکی ہے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ جب کسی شخص کی قبولیت دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے تو جبریل سے کہتا ہے اور جبریل دوسرے ملائکہ سے۔ اور پھر ملائکہ سے یہ بات عالم سفلی میں اُتر آتی ہے اور اس شخص کی قبولیت انسانوں میں پھیل جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارخانۂ عالم ایک زنجیر کی طرح ہے اور اس کی پہلی کڑی ملائکہ ہیں اور جو زنجیر کی پہلی کڑی کو ہلائے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کے ہلنے سے بعد کی کڑیاں بھی حرکت کریں اسی طرح جب اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کوئی حکم دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عالم دُنیاوی میں اس قسم کی تحریک شروع ہو جائے جب ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تو اس کا بھی یہی مطلب تھا ملائکہ تو پہلے مخاطب تھے لیکن حکم سب دُنیا کے لئے تھا پس جس نے اس حکم کا انکار کیا نافرمان ٹھہرا۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالےٰ اس کی نسبت فرماتا ہے کہ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (اعراف ع ۲) جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس امر نے روکا اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کے حکم میں سب کے لئے حکم شامل تھا اور ابلیس بھی اس کا ویسا ہی پابند تھا جیسا کہ اور مخلوق۔ پس ابلیس کی نافرمانی کا ذکر یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ ملائکہ میں سے تھا بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے ملائکہ کی تحریک کا انکار کیا اور خدا تعالیٰ کے حکم کو جسے فرشتوں نے آگے چلایا قبول نہ کیا اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اس جملہ میں ملائکہ کی تحریک کے انکار کے چار اسباب بیان فرمائے ہیں (۱) اوّل اِباء۔ اِباء کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں ایسی چیز کے ردّ کرنے کے ہیں جسے انسان ناقص اور اپنے مناسب حال نہ سمجھتے ہوئے ردّ کر دے۔ پس اَبٰى کے معنے ہوئے کہ ابلیس نے اس تحریک کو اپنے مناسب حال نہ سمجھا اور ناقص خیال کیا اور اس وجہ سے اسے نفرت کرتے ہوئے ٹھکرا دیا۔ سچائیوں کے انکار کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہوتا ہے لوگ سچائی کو اس نظر سے نہیں دیکھتے کہ ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا بلکہ اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان کے قریب کے مصالح پر ان کا کیا اثر پڑیگا اور جب ان کے قریب کے مصالح پر بُرا اثر پڑتا ہے تو وہ اپنے انجام کو اور دنیا کے فوائد کو بھلا دیتے ہیں اور سچائی کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں (۲) دوسری وجہ اِسْتَكْبَرَ کے ان معنوں سے بتائی ہے جو تکبّر کرنے کے ہیں۔ ابلیس نے اس وجہ سے آدم کی فرمانبرداری سے انکار کیا۔ کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا اور آدم کی اطاعت میں اپنی بڑائی کے کھوئے جانے کا خطرہ محسوس کرتا تھا قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ ابلیس نے آدم کی فرمانبرداری سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (اعراف ع ۲ و ص ع ۵) میں اِس سے بہتر ہوں کیونکہ تُو نے اسے تو پانی ملی ہوئی مٹی سے بنایا ہے اور مجھے آگ سے بنایا ہے یعنی یہ تو گیلی مٹی کی طرح غلامانہ فطرت رکھتا ہے جس سانچے میں چاہو اسے ڈھال لو۔ مگر میں تو آگ ہوں کسی کی بات مان نہیں سکتا۔ آزاد مزاج رکھتا ہوں۔ ایسے غلام مزاج والے کی فرمانبرداری کس طرح کر سکتا ہوں۔

صداقت کے انکار کی یہ دوسری وجہ بھی عام ہے صداقت کے ساتھ جو انکسار اور فروتنی انسان کی طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہے اسے صداقت کے دشمن حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مُلک و ملت کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو قوم کا دشمن اور مُلک کا غدار خیال کرتے ہیں اور اپنی شورش پسند اور شریر طبیعت پر فخر کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس جارحانہ عادت سے وہ ملک اور قوم کو اعلیٰ مقام پر لے جائیں گے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ حقیقی ترقی استقلال اور قربانی اور پابندی نظام سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ شورش اور فساد سے کہ جو عارضی طور پر جاذبِ توجہ ہوتا ہے مستقل فوائد کا موجب نہیں ہو سکتا۔

استکبار کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے اصل روک یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی

ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے میں ابلیس کا ذکر

ملائکہ کی تحریک کے انکار کے چار سبب

سرداری کھوئے جانے سے ڈرتے ہیں۔ قوم کا فائدہ اور دُنیا کا نفع ان کے سامنے نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری وجہ استکبار کے ان معنوں سے بتائی ہے جو بڑا سمجھنے کے ہیں جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے استکبار کے ایک معنی تکبر اور خود پسندی ہیں اور دوسرے کسی چیز کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا (فرقان ع۲) یعنی جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعاوی کو سُن کر کہا کہ اگر فرشتے اُترتے ہیں تو ہم پر کیوں نہیں اُترتے اور اگر خدا تعالیٰ کو کوئی دیکھ سکتا ہے تو ہمیں خدا تعالیٰ کیوں نظر نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنے دلوں میں ان دونوں باتوں کو بہت بڑا اور ناممکن سمجھتے ہیں اور شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔

یہ تیسری وجہ بھی صداقتوں کے انکار میں بہت بڑا دخل رکھتی ہے مُنہ سے تو مخالف یہ کہتے ہیں کہ انبیاء جھوٹ بول رہے اور قوم کے دشمن ہیں لیکن اپنے دلوں میں یہ خیال کرتے ہیں کہ قوم کو جس مقام تک پہنچانے کے وہ مدعی ہیں اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا گویا بظاہر مخالفت کی وجہ تو قوم سے غداری بیان کرتے ہیں اور بہ باطن ان کے دعووں کو ناقابل حصول سمجھتے ہیں اور اس مایوسی کی وجہ سے ان قربانیوں کے لئے جو ان کے ساتھ مل کر کرنی پڑتی ہیں اپنے نفوس میں جرأت نہیں پاتے۔

(۴) چوتھی وجہ جو ابلیس کے انکار کا سبب ہوئی یہ بیان فرمائی ہے کہ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ابلیس پہلے سے منکروں میں شامل تھا یعنی صداقتوں کے انکار کی اسے عادت تھی یہ وجہ بھی اکثر لوگوں کو صداقت کے قبول کرنے میں روک بنتی ہے وہ اچھے اخلاق نہ رکھنے کی وجہ سے اچھی باتوں کا انکار کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور کمزوری اور بزدلی اور اچھی باتوں کے ترک کرنے کی عادت کی وجہ سے جب صداقت ان پر کھل بھی جاتی ہے اسے قبول کرنے کی جرأت نہیں کرتے ایسے ہزاروں لوگ ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں کہ صداقت تو ان پر کھل جاتی ہے لیکن جس طرح عنکبوت اپنے گرد خود ایک جالا تن کر اس میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ بھی سچائیوں کے انکار کا ایک ایسا جالا اپنے گرد تن چکے ہوتے ہیں کہ باوجود صداقت کا علم ہو جانے کے اسے قبول کرنے کی جرأت اور توفیق نہیں پاتے۔ ابلیس میں یہ چاروں عیب جمع تھے وہ آدم کی تعلیم کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا تھا وہ آدم سے اپنے آپ کو دنیوی وجاہت میں بڑا سمجھتا تھا اور اس کی اطاعت اس پر گراں گزرتی تھی وہ آدم کے مطمح نظر کو ناقابلِ حصول سمجھتا تھا اور اس کے دعاوی کو ایک ہوائی قلعہ خیال کرتا تھا وہ اس کے بیان کردہ عقائد کا ایک حد تک قائل تھا لیکن جھوٹ سے ملوث زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کا قبول کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ اس کا دل اپنے سابق اعمال کے جال میں پھنس رہا تھا آج بھی صداقتوں کے منکروں کی یہی حالت ہے کاش لوگ ان چاروں عیبوں سے پاک ہو کر صداقتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت بھی خدا تعالیٰ نے دُنیا کے لئے ترقی کا ایک وسیع دروازہ کھولا ہے اور اسلام کے غلبہ کے سامان پیدا ہو سکتے ہیں مگر تھوڑے ہیں جو اس موت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جس کے بعد انہیں بھی اور اسلام کو بھی نئی زندگی ملے گی وہ وقتی قربانیوں پر جان دیتے ہیں اور دائمی قربانی کے دینے سے کتراتے ہیں کاش ان کے دل کُھل جائیں کاش ان کے دلوں کے زنگ دُھل جائیں۔

اِبْلِيْس۔ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ ابلیس بَلَسَ اور اَبْلَسَ سے بنا ہے اَبْلَسَ کے معنی ہیں (۱) نیکی کا مادہ کم ہو گیا (۲) ہمت ٹوٹ گئی اور غمگین ہو گیا

(۳) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا (۴) حیران رہ گیا اور اسے کوئی راہ کام کی نظر نہ آئی۔ ان معنوں کے رُو سے ابلیس کے معنی ہوئے وہ ہستی جس میں نیکی کا مادہ کم ہو گیا اور بدی کی طاقتیں زیادہ ہو گئیں جس کی ہمت ٹوٹ گئی اور ناکامی کے غم نے اسے دبا لیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا جس نے اپنے مقاصد کے پانے کے لئے کوئی راستہ کھلا نہ پایا اور حیران رہ گیا ان معنوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ یا تو یہ نام صفاتی طور پر کسی ایسی رُوح کو دیا گیا ہے جو اس قسم کی کیفیات اپنے اندر رکھتی ہے اور یا پھر یہ صفاتی نام کسی ایسے انسان کا ہے جس کا نام خواہ کچھ ہو مگر اس کی دلی کیفیت کے لحاظ سے وہ اس قسم کے نام پانے کا مستحق تھا اور قرآن کریم نے اسے یہ نام دیا ہے۔

ابلیس کے معنے۔

ابلیس کا نام صفاتی نام ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کا نام قرآن کریم میں گیارہ جگہوں میں آتا ہے (۱) یہی مقام جس کی تفسیر لکھی جا رہی ہے (۲) اعراف (۳ و ۴) حجر دو دفعہ (۵) بنی اسرائیل (۶) کہف (۷) طٰہٰ (۸) شعراء (۹) سباء (۱۰ و ۱۱) ص۔ ان گیارہ مقامات میں سے سوائے شعراء اور سباء کے باقی سب جگہ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے ذکر میں ابلیس کا ذکر آتا ہے باقی دو جگہوں میں آدم کے سجدہ کا ذکر نہیں۔ سورۃ شعراء میں یہ ذکر ہے کہ ابلیس کے سب تابع جہنم میں جائیں گے اور سورۂ سباء میں یہ ذکر ہے کہ سباء کی قوم نے ابلیس کے گمان کو پورا کر دیا یعنی ابلیس نے انہیں اپنا شکار سمجھا اور وہ اس کا شکار بن گئے۔

قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان کے الفاظ کے استعمال میں ایک خاص امتیاز

بہرحال جہاں آدم کا ذکر ہے وہاں سجدہ نہ کرنے کے موقعہ پر ہر جگہ ابلیس کا لفظ استعمال ہوا اس کے مقابل پر آدم کو ورغلانے کی کوشش کا جہاں ذکر ہے وہاں ہر جگہ ہی شیطان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کسی ایک جگہ بھی ابلیس کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اس فرق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ابلیس اور شیطان کے الفاظ کے استعمال میں ایک خاص امتیاز سے کام لیا ہے اور یہ امتیاز بتاتا ہے کہ یہ سجدہ نہ کرنے والا ابلیس اور آدم کو دُکھ میں ڈالنے کی کوشش کرنے والا شیطان دو الگ وجود ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرما دیا تھا کہ ابلیس کی بات کو نہ ماننا یہ تمہارا دشمن ہے تو اس کے بعد آدم کا ابلیس کے دھوکے میں آنا سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں آتا ہے فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (ع) یعنی ہم نے ابلیس کے سجدہ سے انکار کے بعد آدم سے کہہ دیا تھا کہ یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا دشمن ہے پس ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنّت سے نکال دے اور تو تکلیف میں پڑ جائے اس واضح ارشاد کے بعد آدم علیہ السلام ابلیس کے دھوکے میں نہ آسکتے تھے سوائے اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ ہوتے مگر قرآن کریم اس کا انکار فرماتا ہے اور فرماتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ع ۶) یعنی آدم علیہ السلام سے جو غلطی ہوئی وہ بھول سے ہوئی اور ہم نے اس میں اس غلطی کے ارتکاب کے متعلق کوئی ارادہ نہیں پایا۔

ان دونوں امور کی تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ابلیس اور تھا اور وہ شیطان جس نے آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا اور تھا۔ چونکہ آدمؑ کو ابلیس سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اس کے ظل اور نمائندہ کو ابلیس کا نمائندہ سمجھنے میں غلطی کر گئے اور اسے دوسرا وجود سمجھ کر اس کے بارہ میں انہوں نے پوری ہوشیاری سے کام نہ لیا اور اس طرح غلطی کے مرتکب ہو گئے ان معنوں کا مؤید وہ امتیاز ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ قرآن کریم نے جہاں بھی سجدہ نہ کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں ابلیس کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی وجود سے آدم کو ہوشیار کیا گیا ہے اور جہاں دھوکا دینے والے کا ذکر کیا ہے ■ ہاں اسے شیطان کے نام سے یاد کیا ہے۔

حقیقت جیسا کہ ا■پر کے حوالہ جات سے ثابت

ہوتا ہے یہ ہے کہ ابلیس تو اس وجود کا نام رکھا گیا ہے جو فرشتوں کے متقابل پر بدی کا محرک ہے اور شیطان ایک عام نام ہے۔ اس ابلیس کو بھی شیطان کہہ سکتے ہیں اور ان تمام لوگوں کو بھی جو ابلیس کے نائب کے طور پر اور اسکے ورغلائے ہوئے اس کے نیک پردہ پر بدیوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور نبیوں اور ان کی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں کسی انسان کو ابلیس کے نام سے یاد نہیں کیا گیا جہاں بھی ابلیس کا ذکر ہے فرشتوں کے مقابلہ کرنے والے وجود کے متعلق یہ لفظ استعمال ہُوا ہے یا بدی کی محرک رُوح کے لئے استعمال ہُوا ہے جیسا کہ سورۂ شعراء اور سورۂ سباء کے مذکورہ بالا حوالوں میں گزر چکا ہے۔ اس کے برخلاف شیطان کا لفظ مختلف ارواحِ خبیثہ کے متعلق بھی استعمال ہُوا ہے اور انسانوں کے متعلق بھی استعمال ہُوا ہے ارواحِ خبیثہ کے متعلق یہ لفظ بہت دفعہ استعمال ہُوا ہے اور انسانوں کے متعلق اس کا استعمال بھی بہت ہے مگر نسبتاً کم ہے اور مندرجہ ذیل مثالوں سے ثابت ہے (۱) سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ (ع۲) جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ الگ جمع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اس آیت کے الفاظ سے یہ امر واضح ہے کہ یہاں شیاطین سے مُراد آئمہ کُفر ہیں اور صحابہ نے بھی اس آیت میں شیاطین کے یہی معنی کئے ہیں (دیکھو نوٹ ۱۵ سورہ بقرہ) اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ لوگ مومنوں سے کہتے ہیں کہ کفار بڑی تعداد میں ان پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں پھر فرماتا ہے اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَہٗ فَلَا تَخَافُوْہُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران ع۱۸) یعنی یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تم کو ڈراتا ہے پس تم کفار سے مت ڈرو بلکہ اگر مومن ہو تو مجھ سے ڈرو۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں شیطان سے مُراد کفار کے ایجنٹ ہیں جو مسلمانوں کو کفار سے مرعوب کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے چنانچہ سابق مفسرین نے بھی اس جگہ شیطان سے مُراد نعیم بن سعود یا ابو سفیان یا عام کفار مُراد لئے ہیں جو مسلمانوں کو کفار کی طاقت سے ڈراتے تھے (فتح البیان ابن کثیر) اسی طرح قرآن کریم میں ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ (انعام ع۱۴) یعنی اسی طرح ہم نے ہر نبی کا دشمن انسانوں میں سے شیطانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو بنایا ہے آپس میں ایک دوسرے کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

شیطان اور ابلیس ہر دو کے الگ الگ وجود۔

غرض شیطان کا لفظ قرآن کریم میں ارواحِ خبیثہ کے متعلق بھی استعمال ہُوا ہے جو دلوں میں وساوس ڈالتے ہیں اور انسانوں کے متعلق بھی استعمال ہُوا ہے لیکن ابلیس کا لفظ صرف اسی ہستی کی نسبت استعمال کیا گیا ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا پس ابلیس سے مُراد تو وہ رُوحِ خبیثہ ہے جو فرشتوں کے مدِ مقابل ہے اور دلوں میں وساوس ڈالتی ہے اور شیطان اسے بھی کہتے ہیں اور اس کے ان اظلال کو بھی جو انسانوں میں سے اس جیسے کام کرتے ہیں۔

ابلیس کو ابلیس اور شیطان یعنی دو ناموں سے یاد کئے جانے کی وجہ۔

اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو دو ناموں سے یاد کیا ہے (۱) ابلیس اور (۲) شیطان حل لغات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ابلیس کے معنے مایوس اور حیران کے ہیں اور شیطان کے معنے حق سے دُور ہونے والے یا حق سے دُور کرنے والے کے اور جلنے والے کے ہیں۔ پہلا نام اس وجود کا ابلیس رکھا گیا ہے اور دوسرا نام شیطان۔ اس سے یہ نفسیاتی نکتہ نکلتا ہے کہ گمراہی اور ضلالت کا تغیر جب بھی انسان میں پیدا ہوتا ہے اس کے دو مدارج ہوتے ہیں پہلے مایوسی اور حیرانی یا دوسرے لفظوں میں جہالت پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد حق سے دوری اور دوسروں کو گمراہ کرنے اور حسد کی حالت جو آگ میں جلنے کے مشابہ مرض ہے پیدا ہوتی ہے پس گناہ سے بچنے کے لئے انسان کو مایوسی اور جہالت کا مقابلہ کرنا چاہیئے اگر مایوسی اور جہالت کو دنیا سے دُور کر دیا جائے تو گمراہی اور

دوسروں کو گمراہ کرنے اور حسد کا فساد بھی خود بہ خود دُور ہو جائے کیونکہ یہ دوسری حالت پہلی حالت کا نتیجہ ہے۔

ملائکہ اور ابلیس

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کیوں پیدا کیا۔ کیا وہ اپنے بندوں کو خود گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کی مقدرت بخشی تو ساتھ ہی ملائکہ اور ابلیس اور ان کے اظلال کا وجود بھی پیدا کیا کہ ایک گروہ تو نیکی کی تحریک دلوں میں پیدا کرتا ہے اور دوسرا بدی کی تحریک پیدا کرتا ہے پھر جو شخص ملائکہ اور ان کے اظلال کی تحریک کو قبول کرتا ہے انعام کا مستحق ہوتا ہے اور جو ابلیس اور اس کی ذریت کی تحریک کو قبول کرتا ہے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ انسان کے کامل ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اس کے سامنے دونوں قسم کی تحریکات پیش ہوں تا وہ اپنے فیصلہ سے ایک تحریک کو قبول کرے اور اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اگر بدی کی تحریکات اس کے راستہ میں نہ آئیں تو وہ اعلےٰ انعامات کا مستحق نہیں بن سکتا۔

کیا ابلیس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

ہاں ایک بات قرآن کریم نے واضح فرما دی ہے اور وہ یہ کہ ابلیس یا شیطان کسی کو بھی انسان پر تصرف حاصل نہیں لوگ اپنی مرضی سے ان کی اتباع کریں تو کریں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (الحجر ع ۳) یعنی اے ابلیس میرے بندوں پر تجھے دلیل اور برہان کے ذریعہ سے غلبہ حاصل نہ ہوگا ہاں مگر جو سرکش لوگ تیرے متبع ہو جائیں گے انہیں تیری باتیں وزنی معلوم ہونگی اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں بھی ابلیس کے متعلق فرمایا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (بنی اسرائیل ع ۷) اے ابلیس تجھے میرے بندوں پر دلائل اور براہین کے ذریعہ غلبہ حاصل نہ ہوگا اور تیرا رب ان کا کارساز ہوگا۔

لوگوں کا اپنی مرضی سے ابلیس کی پیروی کرنا۔

یعنے سُلْطٰنٌ کے معنے دلیل اور برہان کے ذریعہ غلبہ کے کئے ہیں یہ معنی قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْہِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ (کہف ع ۲) یعنی یہ ہماری قوم ہے جس نے خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود اختیار کر لئے ہیں اگر یہ سچے ہیں تو کیوں ان کے بارہ میں کوئی کُھلی دلیل پیش نہیں کرتے۔ اسی طرح یہ لفظ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی واضح دلیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے پس ابلیس کو خدا تعالیٰ کے بندوں کے خلاف کوئی سلطان حاصل نہ ہونے کے یہی معنے ہیں کہ ابلیس کا پلہ دلیل کی وجہ سے کبھی بھاری نہ ہوگا بلکہ وہ جھوٹ اور خوف اور لالچ اور حرص کے ذریعہ سے لوگوں کو ورغلائے گا جیسا کہ فرماتا ہے وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْھُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْہِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْھُمْ ؕ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (بنی اسرائیل ع ۷) یعنی اے ابلیس ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے اپنی آواز سے خوف دلا کر یا دھوکا دیکر اپنی طرف بلا اور اپنے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا اور ان کے مالوں اور اولادوں میں حصہ دار بن اور ان سے جھوٹے وعدے کر اور شیطان جو وعدے بھی کرتا ہے فریب دینے کے لئے ہی کرتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس کے ورغلانے کا طریق یہ نہیں کہ وہ کوئی معقول دلیل دیتا ہے بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ دلوں میں خوف پیدا کرتا ہے اور جھوٹے وعدے دیتا ہے پھر جو لوگ اس خوف اور جھوٹ کی وجہ سے اس کا ساتھ دیتے ہیں ان کی مدد سے ان سے کم درجہ کے خراب لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کے رو سے ابلیس کی تحریکات کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ خوف اور جھوٹے وعدوں پر مبنی ہوتی ہیں اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کر کے انسان کو گمراہ کیا ہے کیونکہ گمراہی کا الزام اللہ تعالیٰ پر تب لگ سکتا تھا اگر ابلیس کی تائید میں بھی اس نے

کوئی علمی دلیل پیدا کی جاتی۔ دلیلیں سب ملائکہ کی تائید میں ہوتی ہیں پس جو لوگ ابلیس کی اتباع کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اپنے عمل کے خود ذمہ وار ہوتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے رو سے محرّک خیر یعنی نیکی کی تحریک کا پلہ بھاری ہوتا ہے چنانچہ اس کی پہلی دلیل تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملائکہ کے تابع قرار دیا ہے جو امر کہ اِلَّآ اِبْلِیْسَ کے الفاظ سے ظاہر ہے سجدہ کا حکم ملائکہ کو دیا گیا تھا لیکن اس کی نافرمانی پر ابلیس کو بھی تنبیہ کی گئی ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ملائکہ کے تابع رکھی گئی ہے پس جو حکم ملائکہ کو دیا گیا اس میں ابلیس شامل تھا پس اِلَّآ اِبْلِیْسَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اصل تحریک ملکی ہے اس سے انحراف کا نام ابلیس تحریک ہوتا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ملائکہ کو ابلیس پر غلبہ حاصل ہے۔ دوسری دلیل اس امر کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے بار بار فطرتِ انسانی کے نیک ہونے کا اظہار فرمایا ہے ہاں بعد میں انسان خود اسے خراب کر دیتا یا اس کے والدین یا مربی اسے خراب کر دیتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ع) یعنی ہم انسانی جان اور اس کی درستی اور تکمیل کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کے مکمل بنانے کے بعد جن باتوں سے اس کے اندر خرابی پیدا ہو سکتی ہے اور جن امور سے اس میں نیکی پیدا ہو سکتی ہے ہم نے ان سے اسے خبردار کیا پس جو شخص اپنے نفس کو بیرونی اثرات سے پاک رکھتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے نفس کو مٹی میں ملا دیتا ہے ناکام ہو جاتا ہے ان آیات سے ظاہر ہے کہ نفسِ انسانی کو پاک بنایا گیا ہے اور برے بھلے کی پرکھ کا مادہ اس میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد انسان کا کام صرف اس قدر ہے کہ فطرت کے مطابق چلے اگر وہ ایسا کرے اور بیرونی اثرات کو جو فطرت کے خلاف ہوں قبول نہ کرے تو وہ نیکی میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے لیکن جو ایسا نہ کرے اور فطرت کے خلاف اثرات کو قبول کر کے اپنے پاک نفس کو گندگی سے ملوث کر دے وہ ہلاک ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے ملائکہ کی تحریکوں کو قبول کرنے کے قابل بنایا گیا ہے پیدائش کے وقت اس میں ابلیس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں وہ خود ابلیس کو دعوت دے کر ہلاک ہو جاتا ہے احادیث نبی کریمؐ میں بھی اس مضمون کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (بخاری کتاب الجنائز باب ماقیل فی اولاد المشرکین) یعنی ہر بچہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مادہ کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی بچہ کی فطرت میں خرابی پیدا نہیں کی۔ یہ خرابی بعد میں پیدا ہوتی ہے گویا اصل تعلق بچہ کا ملائکہ سے ہوتا ہے۔ ابلیس سے اس کا تعلق خارجی اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔

اس عقیدہ کی تردید کہ ابلیس سفلی زندگی کا مظہر ہے جس میں سے گذر کر انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے

بعض حال کے مفسرین نے اس آیت میں ابلیس کی ضرورت یہ بتائی ہے کہ وہ سفلی زندگی کا مظہر ہے جس میں سے گذر کر انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے مگر یہ تشریح درست نہیں کیونکہ اگر سفلی زندگی سے مراد جسمانی خواہشات کا پورا کرنا ہے جیسے کھانا پینا پہننا یا شہوات بحدِ اعتدال پورا کرنا تو اسے ابلیس سے تعلق رکھنے والی زندگی نہیں کہا جا سکتا ان تقاضوں کو اللہ تعالیٰ کے انبیاء بھی پورا کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (مومنون ع ۴) اے رسولو پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو یعنی طیبات کا استعمال نیک کاموں کی توفیق دیتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ (مسند احمد بن حنبل جلد ۶) اسلام میں رہبانیت نہیں یعنی

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا

اور ہم نے (آدم سے کہا کہ) آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں

مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا

درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۳۶ اور (اس کے بعد یوں ہوا کہ)

اسلام طیب اشیاء کے استعمال سے خواہ کھانے پینے کے متعلق ہوں یا پہننے اوڑھنے کے متعلق ہوں یا رہنے سہنے کے متعلق [illegible]ں منع نہیں کرتا بلکہ ضرورت کے مطابق ان اشیاء کے استعمال نہ کرنے کو گنہ قرار دیتا ہے پس جہاں تک طیبات کو حدِ اعتدال کے اندر استعمال کرنے کا سوال ہے اسلام اسے دین کا حصہ قرار دیتا ہے اور ان کے ترک کو گنہ گردانتا ہے اب اگر اس فعل کو ابلیس کے متعلق قرار دیا جائے اور سفلی زندگی کہا جائے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ گویا خدا تعالیٰ تمام انبیاء اور مومنوں کو ابلیس اور شیطان سے تعلق پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ سفلی زندگی سے مُراد حدِ اعتدال سے زیادہ ان اشیاء کا استعمال ہے تو اس صورت میں بھی مذکورہ بالا خیال غلط قرار پاتا ہے کیونکہ اس صورت میں سفلی زندگی کو اعلیٰ زندگی کے حصول کے لئے ضروری قرار دینے کے یہ معنے ہونگے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے انسان کو کھانے پینے اور پہننے میں اسراف کرنا چاہیئے اس کے بعد اسے اعلےٰ زندگی مل سکتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ سب انبیاء اور کامل مومن خدا تعالےٰ کو پانے سے پہلے اسراف کرتے اور حدِ اعتدال سے بڑھتے ہیں اور یہ بھی بالبداہت باطل ہے پس ابلیس کی یہ تشریح کہ [illegible] سفلی زندگی کا مظہر ہے اور اس میں سے ہو کر خدا تعالےٰ تک پہنچا جا سکتا ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اُسْكُنْ — زَوْجُكَ — اَلْجَنَّةَ — رَغَدًا — حَيْثُ

۳۶ حل لغات :- اُسْكُنْ :- واحد امر مخاطب کا صیغہ ہے اور سَكَنَ (يَسْكُنُ) سُكُوْنًا کے معنے ہیں قَرَّ کسی جگہ قرار پکڑا۔ ٹھہر گیا۔ سَكَنَ فُلَانٌ دَارَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَوْطَنَهَا وَ اَقَامَ بِهَا وہ اپنے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ رہ پڑا اور بس گیا (اقرب) پس اُسْكُنْ کے معنے ہونگے۔ رہو۔

زَوْجُكَ :- زَوْجٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۲۶

اَلْجَنَّةُ :- اَلْجَنَّةُ کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۲۶

رَغَدًا :- رَغَدَ عَيْشُهٗ رَغَدًا کے معنے ہیں طَابَ وَاتَّسَعَ اس کے لئے زندگی کے سامان وسیع طور پر اور بافراغت مہیا ہوگئے (اقرب) تاج العروس میں ہے اَلرَّغَدُ :- اَلْكَثِيْرُ الْوَاسِعُ الَّذِىْ لَا يُعْيِيْكَ مِنْ مَالٍ اَوْ مَاۤءٍ اَوْ عَيْشٍ اَوْ كَلَاٍ ضروریات زندگی کا سہولت اور کثرت کے ساتھ مل جانا رغد کہلاتا ہے (تاج)

حَيْثُ :- ظرف مکان ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ کوئی کام کس جگہ واقع ہوا ہے جمہور علماء کے نزدیک اس کے بعد جملہ کا آنا ضروری ہے بعض اوقات اس کے ساتھ ما لگتا ہے یعنی حَيْثُ کی بجائے حَيْثُمَا کہہ دیتے ہیں اس وقت اس کے معنی

میں شرط کا مفہوم آجاتا ہے اس لئے یہ اپنے بعد دو جملوں کو جزم دیتا ہے جیسے کہ ایک شاعر کا شعر ہے ؎

حَيْثُمَا تَسْتَقِمْ يُقَدِّرْ لَكَ
اللّٰهُ نَجَاحًا فِي غَابِرِ الْاَزْمَانِ

کبھی یہ کسی فعل کے وقوع کا زمانہ بتلانے کے لئے آتا ہے چنانچہ اوپر کا شعر بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (اقرب) پس حَيْثُ شِئْتُمَا کے معنی ہونگے جہاں سے چاہو (۲) جب چاہو۔

اَلظّٰلِمِيْنَ: ظَلَمَ سے اسم فاعل ظَالِمٌ آتا ہے اور اَلظّٰلِمُوْنَ اور اَلظَّالِمِيْنَ اس کی جمع ہیں ظَلَمَ فُلَانٌ ظُلْمًا وَظَلْمًا کے معنے ہیں وَضَعَ الشَّيْءَ فِي غَيْرِ مَوْضِعِهٖ کسی چیز کا بے محل اور بے موقع استعمال کیا نیز ظَلَمَ فُلَانًا کے معنے ہیں فَعَلَ لَهُ الظُّلْمَ اس پر ظلم کیا۔ ظَلَمَ فُلَانٌ حَقَّهٗ ـ نَقَصَهٗ اِيَّاهُ اس کو اس کا حق پورا نہ دیا (اقرب) نیز حد سے بڑھ جانے اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنے کو بھی ظلم کہتے ہیں (اقرب) مفردات میں ہے کہ ظلم کی تین قسمیں ہیں (۱) ظُلْمٌ بَيْنَ الْاِنْسَانِ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ظلم۔ یعنی جو حقوق اللہ تعالےٰ کے بندے کے ذمہ ہیں وہ اس کو دینے کی بجائے دوسروں کو دیئے جائیں وَ اَعْظَمُهُ الْكُفْرُ وَالشِّرْكُ وَالنِّفَاقُ اور ان معنوں کے لحاظ سے سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا جائے اس کے ساتھ شریک قرار دیا جائے اور نفاق سے کام لیا جائے حالانکہ مناسب تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو مانا جائے اور اسکی توحید کا اقرار کیا جائے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے (۲) ظُلْمٌ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا (۳) ظُلْمٌ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ نَفْسِهٖ انسان کا اپنے نفس پر ظلم کرنا چنانچہ آیت مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ میں یہی ظلم مراد ہے (مفردات) پس ظالم کے معنے ہونگے (۱) بے محل و بے موقعہ کام کرنے والا۔ (۲) کسی کے حق کو کم دینے والا۔ (۳) حد سے بڑھ جانے اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنے والا۔ (۴) شرک کرنے والا۔ (۵) ظلم کرنے والا۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم اور اسکی بیوی یا آدم اور اس کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہنے کا حکم دیا جس کی تشریح دوسری جگہ یہ کی گئی ہے کہ وہ اس میں نہ بھوکا رہے گا نہ پیاسا اور نہ ننگا رہے گا اور نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائے گا اور یہ بھی حکم دیا کہ اس میں جہاں سے چاہیں بافراغت کھائیں۔

اَلظَّالِمِيْن

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت۔

جنت سے مراد بعض نے کہا ہے کہ وہی جنت ہے جس میں انسان بعد الموت جائے گا اور بعض مفسرین نے اسے اسی زمین کا کوئی ٹکڑا قرار دیا ہے۔ بائبل میں ہے "اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا (پیدائش باب ۲ آیت ۸) اس کے بعد آیت ۱۴ میں یہ ذکر ہے کہ اس باغ کو دجلہ اور فرات سیراب کرتے ہیں گویا بائبل کا یہ بیان استعارہ اور حقیقت اور صحیح اور غلط سے مخلوط ہے لیکن دجلہ اور فرات کے پاس کے علاقہ کی اس سے تعیین ہو جاتی ہے چونکہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے واقعات بھی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مولد بھی اُور ہے جو عراق میں ہے اور جدید تحقیق سے بھی اُور اور اس کے گرد کا علاقہ کھودنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ملک نہایت قدیم تمدن کا گہوارہ رہا ہے پس ان حالات سے قرین قیاس یہی ہے کہ آدم کا مولد عراق کا علاقہ ہی تھا اور جس جنت کا ان کے متعلق ذکر آتا ہے وہ بھی اسی علاقہ کا کوئی مقام تھا جسے مقام کے آرام دہ ہونے اور اس اچھے نظام کی وجہ سے جو آدم نے قائم کیا جنت کہا گیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت کی تعیین۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے آثار قدیمہ کی تازہ کھدائیوں سے یہ علاقہ ایک نہایت قدیم تمدن کا گہوارہ ثابت ہوتا ہے چنانچہ اُور جو بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت ملک عراق کے کسی علاقہ میں ہونے کا ثبوت۔

کا وطن تھا اور جو دجلہ اور فرات کے ملنے کی جگہ کے قریب واقع ہے اس کی کھدائی جنگِ عظیم کے بعد اوّل اوّل مسٹر ہال نے اور ان کے بعد مسٹر وُڈلے نے کی ہے ان دونوں کی کھدائیوں کے نتیجہ میں اس شہر کے دبے ہوئے جو آثار ملے ہیں ان کا زمانہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کے زمانہ سے ۳۵۰۰ سال پہلے معلوم ہوتا ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ) بلکہ بعد کی تحقیق سے یہ آثار اس سے بھی بہت پہلے کے تمدن کے معلوم ہوتے ہیں (ایضاً) پس جبکہ ہم ایک طرف مغربی عرب میں کعبہ جیسے قدیم معبد کو دیکھتے ہیں دوسری طرف مشرق طرف اُور کی قدیم ترین تہذیب کے آثار ہمیں ملتے ہیں اور معلومہ تاریخ کے زبردست تغیرات کا اس علاقہ کو مرکز پاتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ آدم کا مولد یا بشر کی تمدنی ترقی کا مبداء یہی علاقہ تھا۔

یہ خیال کہ آدم کو اس جنت میں رکھا گیا تھا جس میں نیک انسان بعد الموت جائیں گے بالبداہت باطل ہے اوّل تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً یعنی زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں اور یہ امر خلافِ عقل ہے کہ آدم علیہ السلام کو انتظام تو دُنیا کا سپرد کیا گیا اور رکھا انھیں آسمان پر گیا۔ دوسرے اس جنت کی نسبت جو بعد الموت

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت بعد الموت ملنے والی جنت نہ ہونے کے دلائل۔

ملنے والی ہے خود حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ سورہ حجر میں فرماتا ہے لَا یَمَسُّھُمْ فِیْھَا نَصَبٌ وَّمَا ھُمْ مِّنْھَا بِمُخْرَجِیْنَ (ع ۴) یعنی جنت اُخروی میں نہ تو انسانوں کو کسی قسم کی تکان ہوگی اور نہ وہ اس سے نکالے جائینگے لیکن آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رکھا گیا وہ اس سے نکالے گئے پس معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی جنت ارضی تھی آسمانی نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ آدم علیہ السلام کی جنت میں شیطان کا داخل ہونا ثابت ہے بلکہ اس کی ذریت کا بھی۔ پس بفرضِ محال آدم کا جنت سماوی میں رکھنا اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ خلافِ عقل ہے کہ آدم کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کو بھی جنت میں رکھ دیا گیا۔ اس آیت سے اس امر کا بھی استدلال ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام پہلے کسی اور جگہ رہتے تھے پھر جب ان پر الہام الٰہی نازل ہوا تو اپنی بیوی یا ساتھیوں سمیت اس مقام میں جا بسے جسے جنت کہا گیا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ اے آدم تُو اور تیرا زوج جنت میں ہی بسو پس معلوم ہوا کہ وہ پہلے کسی دوسری جگہ رہتے تھے۔

رَغَدًا کی تشریح جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی سہولت کے ساتھ اور کثرت کے ساتھ مل جائیں۔ اس میں تمدن کی خوبی بتائی گئی ہے تمدن ہی ہے جو انسان کے لئے بافراغت سامانِ زندگی مہیا کرتا ہے۔ غیر تمدن کے کھانے پینے کی اشیاء کا نہ تو خزانہ رکھا جا سکتا ہے اور نہ کثرت سے ان اشیاء کی پیداوار کی جا سکتی ہے۔ حیوانی زندگی میں ضروری اشیاء کے پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کا ذخیرہ رکھا جا سکتا ہے اور کمی کے وقت انسان تکلیف اُٹھاتا ہے پس ان الفاظ میں تمدن کی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم مل کر رہو گے تو ضروریات زندگی کو کثرت سے پیدا کر سکو گے اور ضرورت کے موقعہ کے لئے ان کا ذخیرہ رکھ سکو گے اور یہی وہ ارضی جنت ہے جس کی بنیاد تمدن کے ذریعہ سے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے رکھی گئی۔ جو قومیں اس تمدن کی نگہداشت کرتی ہیں ان کے تمام افراد آرام سے رہتے ہیں۔ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں اس تعلیم کے مطابق عمل کیا اور مسلمانوں کا بچہ بچہ بھوک اور پیاس اور تنگی کی زندگی سے محفوظ ہو گیا۔

بظاہر یہ ایک دُنیاوی حکم معلوم ہوتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ طریق زندگی انسان کو گناہ سے بچانے والا ہے لُوٹ کھسوٹ اور دھوکے فریب کا بڑا باعث غربت اور بے سر و سامانی ہوتے ہیں جو قوم اپنے تمام افراد کے کھانے پینے اور پہننے کا سامان مہیا کر دیتی ہے وہ اس کو گناہ میں پڑنے سے بچا لیتی ہے اور اس بڑے سبب کو جو ظلم اور گناہ کی طرف کھینچتا ہے دُور کر دیتی ہے پس گو بظاہر یہ کام دُنیاوی اور سیاسی نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً خالص دینی انتظام ہے اور گناہ کو جڑ سے اکھیڑنے میں ممد ہے اس وقت دُنیا میں جو جھگڑے اور فساد پھیلا ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے

کہ بعض افراد تو مالا مال ہیں اور دوسرے بھوکے مر رہے ہیں اگر سب دنیا میں ایسا نظام قائم ہو جائے کہ ہر شخص کو اسکی ضروریات زندگی سہولت سے مل جائیں تو لڑائی جھگڑے کی جڑ کٹ جائے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا جہاں چاہو کے الفاظ سے یہ بتایا ہے کہ انسانی تمدن کے کمال کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ انسان کو سفر اور اقامت کی سہولت حاصل ہو۔ اور اس پر سے غیر ضروری پابندیاں اُٹھا دی جائیں۔ موجودہ زمانہ کے فسادات کی ایک بڑی وجہ اس حکم کی طرف سے عدم اعتنا بھی ہے مختلف اقوام ایک دوسرے کے خلاف پابندیاں لگاتی ہیں کہ فلاں قوم ہمارے ملک میں نہ آئے یا ہمارے ملک میں نہ رہے اور اس طرح خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سب دنیا کو سب انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اس قسم کی روکیں پیدا کر کے دوسروں کو خدائی نعمتوں سے محروم کرنا بڑا گناہ ہے اس وقت بعض بڑے بڑے بر اعظموں میں صرف چند لاکھ آدمی رہ رہے ہیں اور دوسروں کو ان ممالک میں آکر بسنے سے روکا جاتا ہے۔ ہندوستان میں چالیس کروڑ کے قریب آبادی ہے اور آسٹریلیا جو اس سے دُگنے کے قریب ہے اس میں کل ستر لاکھ آبادی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو اس میں جا کر بسنے سے روکا جاتا ہے اسی طرح جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کامل شہری کے حقوق حاصل نہیں بلکہ اس ملک کے قدیم باشندوں کو بھی یہ حقوق حاصل نہیں چنانچہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی لیڈر گاندھی جی کی تمام طاقت کی بُنیاد انہی زخمی جذبات پر ہے جو جنوبی افریقہ کی رہائش کے ایام میں ان کے دل میں پیدا ہوئے۔

اس قسم کے امتیاز سے دلوں میں بغض اور کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی اس قسم کی پابندیوں سے منع فرمایا ہے۔ اور تمام بنی نوع انسان کو دنیا سے یکساں فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی ہے کاش لوگ اس تعلیم پر عمل کرتے اور بغض اور فساد کا قلع قمع ہو کر یہ دُنیا جو اس وقت بعض لوگوں کے لئے جہنم بن رہی ہے سب کے لئے جنت بن جاتی۔

حَيْثُ شِئْتُمَا میں انسانی تمدن کے کمال کے ایک ضروری جزو کی طرف اشارہ

شائد اس جگہ کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اسلام نے بھی تو حجاز میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کا داخلہ منع کیا ہے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیشک اسلام نے حجاز میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کا داخلہ منع کیا ہے لیکن اس کا اثر دُنیا کے اقتصادی معاملات پر نہیں پڑتا حجاز ایک وادی غیر ذی زرع ہے جہاں نہ کچھ پیدا ہوتا ہے نہ اُگتا ہے پس اس علاقہ کے ساتھ دُنیا کے کھانے پینے کا تعلق نہیں جس علاقہ میں نہ فصل ہوتی ہو نہ میٹھا پانی ملتا ہو۔ اقتصادی ضرورتوں کے لئے لوگوں نے وہاں جا کر کرنا کیا ہے وہاں تو وہی لوگ جا کر بسنے کی خواہش کرینگے جن کو اس جگہ سے مذہبی لگاؤ ہو اور وہ لوگ خواہ کسی قوم کے ہوں اس جگہ جا سکتے ہیں شائد اللہ تعالےٰ نے اپنی اول اور آخر مسجد کے لئے اس وادی غیر ذی زرع کو چنا ہی اس لئے تھا تاکہ اس کے مذہبی نظام کے قیام کے لئے دوسرے مذاہب کو اس سے روکا جائے تو کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ اس طرح ہمیں دنیوی فوائد اور ثمرات سے محروم کر دیا گیا ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ کعبہ کو کسی سرسبز جگہ بنایا جاتا مگر ایسا ہوتا تو دوسرے مذاہب کے لوگ دنیوی فوائد سے محروم رہ جاتے یا پھر اسے دین کے لئے محفوظ قلعہ نہ بنایا جا سکتا۔

اسلام کسی قوم کو کسی جگہ جا کر بسنے سے نہیں روکتا۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اور اس شجرہ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔

یہ شجرہ جس کے پاس جانے سے آدم کو روکا گیا تھا کیا تھا؟ یہ سوال بڑا ہی محل اختلاف بنا رہا ہے بعض نے اسے عورت کہا ہے بعض نے گندم کا دانہ اور بعض نے انگور لیکن یہ سب معانی خلاف قرآن ہیں۔ عورت اس سے مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام کو بیوی سمیت اس میں رہنے کا حکم دیا

شجرہ ممنوعہ کے متعلق پہلے مفسرین کا خیال اور اس کا رد۔

گیا ہے گندم بھی اس سے مراد نہیں ہو سکتی اور نہ انگور کہ یہ دونوں اشیاء حلال ہیں اور اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ کُلَا مِنْهَا رَغَدًا اس علاقہ میں سے اپنی غذا بافراط حاصل کرو۔

بائبل کا شجرہ ممنوعہ کو شجرہ علم قرار دینا اور اس کا بطلان۔

بائبل میں اسے شجرۂ علم قرار دیا گیا ہے لکھا ہے "اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس سے کھائے گا ضرور مرے گا" (پیدائش باب ۲ آیت ۱۶ و ۱۷) بائبل کا یہ بیان بالبداہت باطل ہے کیونکہ نیک و بد کی پہچان ہی تو انسان کو دوسرے حیوانوں سے افضل بناتی ہے ورنہ بیل گھوڑے گدھے اور انسان میں فرق ہی کیا ہے اور جبکہ خود بائبل کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر اور اپنی مانند بنایا (پیدائش باب ۱ آیت ۲۶) تو اس کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس میں نیک و بد کی پہچان رکھی اور علم اور عرفان کا مادہ رکھا ورنہ خدا کی صورت اور اس کی مانند کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں اور جب آدم کو خدا کی صورت اور اس کی مانند بنایا گیا تھا تو وہ تو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی نیک و بد کو پہچاننے والا تھا اس غرض کے لئے اسے کسی درخت کا پھل کھانے کی کیا ضرورت تھی اپنی مانند پیدا کر کے اسے نیک و بد کی پہچان کا درخت کھانے سے روکنے کے تو یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے خود اپنا کام باطل کیا اور بچوں کا سا کھیل کھیلا جو پہلے ایک گھروندا بناتے ہیں اور پھر اسے توڑ دیتے ہیں۔

آیت وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس درخت سے مراد نہ تو گندم اور انگور ہے اور نہ نیک و بد کی شناخت ہے تو پھر اس درخت سے کیا مراد ہے جس کے پاس جانے سے آدم علیہ السلام کو روکا گیا؟ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے آدم علیہ السلام پر ان کا ننگ ظاہر ہو گیا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ درخت کا لفظ استعارتاً استعمال ہوا ہے کیونکہ دُنیا کے پردہ پر کوئی ایسا درخت نہیں جس کا پھل کھانے سے انسان پر اس کا ننگ ظاہر ہوتا ہو۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ نہ

شجرہ کا لفظ استعارۃً استعمال ہونے کے چار ثبوت۔

اسلامی شریعت میں اور نہ کسی قدیم شریعت میں کوئی درخت ایسا ملتا ہے جس کے پھل کا استعمال شرعاً ممنوع ہو تو یہ امر اس امر کے لئے مزید شہادت ہے کہ شجرہ سے مراد اس جگہ درخت نہیں بلکہ استعارۃً کسی اور چیز کا نام درخت رکھا گیا ہے تیسرے قرآن کریم فرماتا ہے کہ اس درخت کے قریب جانے سے آدم اور اس کی بیوی یا اس کے ساتھی ظالم ہو جائیں گے یہ امر بھی ظاہر کرتا ہے کہ درخت کا لفظ اس جگہ استعارۃً استعمال ہوا ہے کیونکہ اگر کوئی ممنوع درخت ہوتا تو اس کے پھل کے استعمال سے وہ گنہ گار تو ہو سکتے تھے ظالم نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ظلم کا لفظ یا تو شرک کے معنوں میں قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے یا پھر دوسروں کے حقوق کے تلف کرنے کے معنوں میں۔ چوتھے ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایک خاص درخت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر کے آدم کو منع فرمایا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ دوسری طرف فرماتا ہے کہ شیطان کے بہکانے پر انہوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ اب اگر یہ ممنوع چیز ظاہری درخت ہوتا تو یہ قصور آدم کا دیدہ دانستہ ہو سکتا تھا۔ ایک معین درخت جس سے منع کیا گیا تھا اس کا پھل کھانا کسی صورت میں غلطی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن تیسری طرف ہم قرآن کریم میں یہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں فَنَسِيَ (طٰہٰ ع ۶) آدم نے اس پھل کو بھول کر کھایا تھا جان بوجھ کر نہیں کھایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت سے مُراد کوئی ظاہری درخت نہ تھا بلکہ کوئی اور چیز تھی جس کے بارہ میں غلطی لگنے کا امکان ہو سکتا ہے اور یہ چیز معنوی درخت ہی ہو سکتی ہے مثلاً ظلم کا درخت کہ اگر اس کے قریب جانے سے منع کیا جائے تو یہ کوئی ایسا معیّن حکم نہ ہو گا جس میں غلطی نہ لگ سکے یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص کو ظلم سے منع کیا جائے اور وہ اس سے بچنا بھی چاہے لیکن اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو ہو تو ظلم لیکن وہ شخص اسے ظلم نہ سمجھے۔

غرض ان سب امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز سے آدم علیہ السلام کو روکا گیا تھا اسے استعارۃً شجر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے ورنہ وہ تھی کچھ اَور۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں شجرہ کا لفظ کسی اور

معنوں بھی استعمال ہُوا ہے یا نہیں یا یہ کہ استعارۃً کسی اور چیز کو بھی شجرہ کہا گیا ہے یا نہیں۔

شجرہ کا لفظ قرآن کریم میں استعارۃً اچھی اور بُری باتوں کی نسبت استعمال ہُوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم ع ۴) یعنی کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح پاک بات کی کیفیت پاک درخت کی مثال سے بیان فرمائی ہے پھر فرماتا ہے وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ (ابراہیم ع ۴) بُری بات کی کیفیت بُرے درخت کی طرح ہوتی ہے ان معنوں کے رُو سے اس درخت کے پاس نہ جاؤ کے یہ معنے ہونگے کہ جس طرح اوپر بعض اچھی باتوں کا ذکر تھا ان کے مد مقابل کاموں سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو منع فرمایا اور چونکہ اس اچھے نظام کو جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دیا تھا جنّت یعنی باغ سے مشابہت دی تھی اس نظام کے خلاف جو امور تھے انہیں بھی درخت کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور فرمایا کہ جہاں اس جنّت میں تم کو رہنے کا حکم ہے وہاں اس کے خلاف امور سے بچنے کی بھی تاکید ہے تا وہ جنّت ضائع نہ ہو جائے ان معنوں کے رو سے آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ بعض باریک امور میں آدم علیہ السلام کو غلطی بھی لگ سکتی تھی اور کوئی دوسرا آدمی انہیں دھوکا بھی دے سکتا تھا۔

گو شجرہ سے مراد تمام وہ بدیاں ہو سکتی ہیں جن سے آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا۔ مگر اس آیت کے مضمون کے لحاظ سے خصوصیت سے یہ امر اس شجرۂ ممنوعہ میں داخل ہوگا کہ ابلیس اور اسکی ذریّت سے بچ کر رہیں کیونکہ اس نے آدم اور انکی اولاد کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰهٰ ع ۷) یعنی ہم نے کہا کہ اے آدم یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی یا ساتھیوں کا دشمن ہے پس اس سے بچتے رہیو ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو جنّت سے نکال دے تو تم تکلیف میں پڑو اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کہ ابلیس سے بچتے رہو اس شجرہ کی ایک ضروری شاخ تھی جس کے قریب نہ جانے کا آدم کو حکم دیا گیا تھا۔

قرآن کریم میں شجرہ کے لفظ کا استعمال بُری اور اچھی باتوں کیلئے

جب ہم دیکھتے ہیں کہ سلسلہ نسب کو بھی شجرہ کہتے ہیں تو اس موقعہ پر شجرہ کے لفظ کا استعمال نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابلیس سے بچنے کا حکم جب دیا گیا تو اسکی ذریت یعنی اس کے اتباع اس حکم میں شامل تھے۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آدم اور اللہ تعالےٰ کی گفتگو عام انسانی بول چال کی طرح نہیں تھی وہ لازماً اسی طرح ہوئی ہوگی جس طرح سب انبیاء کے ساتھ خدا تعالیٰ کی گفتگو ہوتی ہے یعنی الہام اور وحی کے ذریعہ سے اور الہام اور وحی میں استعارۃ اور مجاز اور تمثیل کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام جمیل و حسین ہوتا ہے اور استعارہ مجاز اور تمثیل کلام کو حسین بنا دیتے ہیں۔

اچھے نظام کو جنّت اور اسکے مقابل کے نظام کو شجرہ ممنوعہ قرار دیا جانا۔

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک ایسے مقام میں رہنے کا حکم دیا جو نہایت آرام دہ تھا اور بمنزلہ جنّت کے تھا اور ایسی شریعت عطا کی جو اس دنیا کو جنّت بنا دینے والی تھی اور ایسی بیوی اور ساتھی بخشے جو مطیع اور فرمانبردار تھے اور ہر قسم کے آرام کا موجب ہو کر اس زندگی کو جنّت میں تبدیل کر دینے والے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آدم علیہ السلام سے کہا کہ اب تو اور تیرے ساتھی اس جنّت میں رہو اور اسی استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے نظام کی خرابیوں اور بُرے ساتھیوں کو ایک درخت قرار دیکر فرمایا۔ کہ ایک طرف تو اس جنّت میں رہنے کا ہم تم کو حکم دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کے مخالف صفات والے درخت سے بچنے کا حکم دیتے ہیں۔

شجرہ ممنوعہ سے مراد ابلیس اور اسکی ذریت۔

غرض شجرہ کا لفظ جنّت کے لفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا گیا۔

اچھے نظام اور عمدہ ساتھیوں کو جنّت کہہ کر جو بہت سے درختوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور بُری باتوں اور بُرے ساتھیوں کو شجرہ کہہ کر جس کے معنے ایک درخت کے ہیں

الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَ

شیطان نے اس (درخت) کے ذریعہ سے اُن (دونوں) کو (انکے مقام سے) ہٹا دیا اور (اس طرح) اس نے انہیں اس (حالت) سے جس میں وہ تھے نکال دیا

قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی

اور (اس کے نتیجہ میں) ہم نے (انہیں) کہا (کہ یہاں سے) نکل جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) تمہارے لئے ایک

الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ

(مقرر) وقت تک اسی زمین میں جائے رہائش اور سامانِ معیشت (مقدّر) ہے ۵۳۷ اس کے بعد آدم نے

مندرجہ ذیل امور کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے (۱) آدم کو جو تعلیم دی گئی ہے اس میں اشیاء کی حلت اصل ہوگی اور حرمت کے احکام محض ضرورتاً دیئے جائینگے اور اس طرح حلال اشیاء حرام اشیاء کے مقابلہ پر بہت زیادہ ہونگی (۲) آدم کی جماعت غالب آجائیگی اور تعداد میں بڑھ جائیگی اور اس کے دشمن قلیل ہونگے حتیٰ کہ اگر آدم کے نظام اور اسکی جماعت کو ایک باغ کا نام دیا جاسکے گا تو اس کے دشمنوں اور ان کے نظام کو ایک درخت کہا جاسکے گا جس کا سایہ محدود ہوتا ہے اور پھیلاؤ تنگ۔

الشَّیْطٰنُ

عَنْهَا

اپنے نظام اور اپنے ساتھیوں کو جنت یعنی درختوں کا مجموعہ اور باغیوں کو ایک درخت سے تعبیر کرنے میں لطیف اشارہ ہے۔

اَزَلَّهُمَا

اِهْبِطُوْا

۵۳۶ حل لغات:۔ اَزَلَّهُمَا۔ اَزَلَّهٗ کے معنے ہیں اَزْلَقَهٗ اس کو اس کے مقام سے ہٹا دیا حَمَلَهٗ عَلَی الزَّلَّةِ اس کو لغزش پر آمادہ کیا (اقرب) مفردات میں ہے اَلزَّلَّةُ فِی الْاَصْلِ اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ قَصْدٍ کہ اصل وضع لغت کے لحاظ سے زَلَّةٌ کے معنے ہیں پاؤں کا بغیر قصد کے پھسل جانا وَقِیْلَ لِلذَّنْبِ مِنْ غَیْرِ قَصْدٍ زَلَّةٌ تَشْبِیْهًا بِزَلَّةِ الرِّجْلِ بغیر ارادہ کے کسی غلطی اور قصور کے ہو جانے کو بھی زَلَّة سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ جس طرح بغیر ارادہ کے پاؤں پھسل جاتا ہے اسی طرح بعض اوقات بعض غلطیاں بھی بغیر ارادہ کے وقوع ہو جاتی ہیں گویا پاؤں کا بغیر ارادہ کے پھسلنا اور غلطی کا بغیر ارادہ کے وقوع پذیر ہونا دونوں آپس میں مشابہ ہیں (مفردات) لسان میں ہے اَزَلَّهٗ اَیْ حَمَلَهٗ عَلَی الزَّلَلِ اس کو قصور اور خطا کرنے پر آمادہ کیا (لسان)

اَلشَّیْطٰنُ:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵۱ھ

عَنْهَا:۔ عَنْ حرف جار ہے اور یہ دس معانی ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک تعلیل کے ہیں (مغنی) یہی معنی ادا کرنے کے لئے آیت فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا میں عَنْ استعمال ہوا ہے یعنی حَمَلَهُمَا عَلَی الزَّلَّةِ بِسَبَبِهَا اَیْ بِسَبَبِ الشَّجَرَةِ یعنی اس درخت کے ذریعہ سے ان دونوں کو ان کے مقام سے ہٹا دیا۔

اِهْبِطُوْا:۔ اِهْبِطُوْا امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور هَبَطَهٗ (یَهْبُطُ هَبْطًا) مِنَ الْجَبَلِ کے معنے ہیں اَنْزَلَهٗ اس کو پہاڑ سے اُتارا۔ هَبَطَ بَلَدًا كَذَا۔ دَخَلَهٗ کسی شہر میں داخل ہوا (یہ متعدی بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ هَبَطَهٗ بَلَدًا كَذَا کے معنے ہونگے اَدْخَلَهٗ اس کو فلاں شہر میں داخل کیا) هَبَطَ السُّوْقَ:۔ اَتَاهَا بازار میں آیا۔ هَبَطَ فُلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ (یَهْبُطُ وَیَهْبِطُ هُبُوْطًا) نَزَلَ پہاڑ سے اُترا۔ هَبَطَ الْوَادِیَ: نَزَلَهٗ وادی میں اُترا۔ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ آخَرَ: اِنْتَقَلَ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (اقرب) پس اِهْبِطُوْا کے معنے ہونگے اپنے جائے قیام کو چھوڑ کر کسی

اور جگہ قیام پذیر ہو جاؤ (۲) نکل جاؤ۔

اَلْاَرْض :۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۲ع

مُسْتَقَرٌّ :۔ اَلْمُسْتَقَرُّ اِسْتَقَرَّ سے ظرف ہے اور اِسْتَقَرَّ بِالْمَكَانِ کے معنے ہیں ثَبَتَ وَسَكَنَ کسی جگہ میں ٹھہرا۔ رہائش اختیار کی اور اَلْمُسْتَقَرُّ کے معنے ہیں مَوْضِعُ الْاِسْتِقْرَارِ۔ قرارگاہ۔ جائے رہائش (اقرب)

مَتَاعٌ :۔ كُلُّ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ مِنَ الْحَوَائِجِ كَالطَّعَامِ وَالْبَزِّ وَ اَثَاثِ الْبَيْتِ وَالْاَدَوَاتِ وَالسِّلَعِ وہ تمام اشیاء جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جاتا ہے مَتَاعٌ کہلاتی ہیں۔ جیسے خوراک۔ پوشاک گھر کا سامان۔ فروخت کی چیزیں وغیرہ وَقِيلَ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ مِنْ عُرُوضِ الدُّنْيَا قَلِيلِهَا وَكَثِيرِهَا مَا سِوَى الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ۔ اور بعض کے نزدیک دنیا کا سامان جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے وہ متاع ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت سوائے سونے اور چاندی کے۔ وَعُرْفًا كُلُّ مَا يَلْبَسُهُ النَّاسُ وَيَبْسُطُهُ اور عرف عام میں متاع ان کپڑوں کو کہتے ہیں جو انسان پہنتا ہے یا فرش وغیرہ جو بچھائے جاتے ہیں وَفِي الْكُلِّيَاتِ اَلْمَتَاعُ وَالْمُتْعَةُ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ اِنْتِفَاعًا قَلِيلًا غَيْرَ بَاقٍ بَلْ يَنْقَضِي عَنْ قَرِيبٍ کلیات ابی البقاء میں ہے کہ متاع اور متعہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے قلیل فائدہ حاصل کیا جاتا ہو اور جس کا فائدہ مستقل نہ ہو بلکہ جلدی ختم ہو جائے۔ وَاَصْلُ الْمَتَاعِ مَا يُتَبَلَّغُ بِهٖ مِنَ الزَّادِ۔ متاع اصل میں وہ زاد ہے جس کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچا جائے وَيَاْتِي الْمَتَاعُ اِسْمًا بِمَعْنَى التَّمَتُّعِ اور یہ لفظ اسم مصدر کے طور پر تمتع کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی سامان دینا (اقرب)

حِيْنٍ :۔ اَلْحِيْنُ کے معنے ہیں وَقْتٌ مُبْهَمٌ يَصْلُحُ لِجَمِيعِ الْاَزْمَانِ طَالَ اَوْ قَصُرَ مطلق وقت خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ وَقِيلَ اَوِ الدَّهْرُ بعض محققین لغت نے اس کے معنے "ایک لمبے زمانہ" کے کئے ہیں۔ نیز اس کے ایک معنی اَلْمُدَّةُ کے ہیں یعنی کچھ وقت (اقرب)

۱ اَلْاَرْض مُسْتَقَرٌّ

تفسیر۔ عَنْهَا میں ھا کی ضمیر جنت کی طرف بھی جا سکتی ہے اور شجرہ کی طرف بھی۔ جنت کی طرف ضمیر پھیرنے کی صورت میں اس کے یہ معنی ہونگے کہ شیطان نے آدم کو جنت سے الگ کر دیا یا یہ کہ شیطان کے دھوکے کی وجہ سے جنت کی حالت میں فرق آگیا اور وہ ایک وقت کے لئے تکلیف کا مقام بن گئی۔ شجرہ کی طرف ضمیر پھرنے کی صورت میں عَنْ کے معنے سبب کے ہونگے اور مطلب یہ ہوگا کہ اس درخت کو ذریعہ بنا کر آدم کو اس کے مقام سے پھسلا دیا لیکن جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے اَزَلَّ کے لفظ میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ جس شخص سے وہ فعل ہوا اس کا اس میں ارادہ نہ تھا پس معنے یہ ہونگے کہ اس درخت کے ذریعہ سے شیطان نے آدم کا قدم پھسلا دیا لیکن آدم کا اس میں ارادہ شامل نہ تھا سب کچھ دھوکے اور فریب سے ہوا۔

۲ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا کی ضمیر جنت۔ شجرہ دونوں کی طرف جا سکتی ہے

۳ مَتَاعٌ

عَنْ کے معنے سببیت کے عربی زبان میں عام ہیں لغت میں لکھا ہے اَلرَّابِعُ التَّعْلِيلُ نَحْوُ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لِاَبِيهِ اِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ (اقرب) یعنی چوتھے معنے عَنْ کے تعلیل کے ہوتے ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لِاَبِيهِ اِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ (توبہ ع ۱۴) جس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیم نے جو استغفار اپنے باپ کے لئے کیا تھا وہ صرف ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عَنْهَا کے معنے یہ ہونگے کہ شجرۃ کو سبب اور ذریعہ بنا کر شیطان نے حضرت آدم کے قدم کو بغیر اس کے کہ ان کا اپنا ارادہ ہوتا پھسلا دیا۔

عَنْهَا کی ضمیر شجرہ کیطرف پھیرنے سے عَنْ کے معنے سببیت کے ہوتے ہیں

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ۔ اور اس طرح جس حالت میں وہ تھے اس سے انہیں نکال دیا یا یہ کہ جس جنت میں وہ تھے وہاں سے انہیں نکال دیا۔ مگر پہلے معنے زیادہ

حِيْنٍ

درست ہیں کیونکہ جنت میں سے نکلنے کا حکم اس کے بعد دیا گیا ہے ہاں اگر یہ مطلب لیا جائے کہ جنت میں سے نکالے جانے کا مستحق بنا دیا تو دوسرے معنے بھی درست ہو سکتے ہیں۔

قُلْنَا اھْبِطُوْا کی تشریح۔

وَقُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا۔ اور ہم نے کہا کہ جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے یعنی اس دشمنی کو یہیں ختم نہ سمجھنا یہ دشمنی آیندہ جاری رہے گی اور ہر نبی کے وقت میں پھر شیطان اسی طرح حملہ کرنے کی کوشش کیا کرے گا۔

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ کی تشریح۔

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ یعنی اسی زمین میں تم کو رہنا اور فائدہ اٹھانا ہے پس ہوشیاری سے کام کرنا شیطان کی ذریت سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نہیں اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا پس ہر وقت چوکس رہنے کی کوشش کرو۔ دوسرے یہ زندگی آیندہ زندگی کے لئے سامان جمع کرنے کا ذریعہ ہے اس سے غافل نہ رہو اور دوسری زندگی کے لئے سامان جمع کرتے رہو۔

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ میں مومنوں کو اپنی اولاد کو شیطان سے بچاتے رہنے کا حکم

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مومن و کافر نیک اور بد کو ایک ہی جگہ رہنا پڑتا ہے اس لئے مومنوں اور نیکوں کو اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو شیطان کے حملہ سے بچانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے یہ حکم ایسا ضروری ہے کہ اسے نظر انداز کرنے کی وجہ ہی سے ہمیشہ نیکی کا زمانہ مٹ جایا کرتا ہے جب بھی مومن اور نیک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شیطانی حملہ سے محفوظ ہو گئے ہیں تنزّل کا دور شروع ہو جاتا ہے اور شیطان غالب آنے لگ جاتا ہے کاش کوئی قوم ایسی پیدا ہو جو اس حکم کو مدّنظر رکھے اور شیطان کا سر پوری طرح کچلا جائے۔ لوگ خود نیک بھی ہو جائیں تو اولاد کی محبت یا ان پر حد سے زیادہ اعتماد کر کے اسے خرابی میں پڑنے کا موقع بہم پہنچا دیتے ہیں اور پھر قوم نیکی کی چوٹی سے نیچے گر جاتی ہے۔

اس سوال کا جواب کہ آدم علیہ السلام کو شجرہ کے ذریعہ سے شیطان نے کس طرح دھوکا دیا۔

آیت وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ سے مسلمانوں کے ایک غلط عقیدہ کا قلع قمع

اس آیت سے ایک اور زبردست استدلال ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ایک غلط عقیدہ کا قلع قمع کرتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کے لئے اسی دنیا میں رہنے کا فیصلہ فرمایا ہے اور شیطانی حملہ سے بچنے کے لئے کسی اور جگہ جانے کو ناممکن بتایا ہے لیکن باوجود اس کے بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر شیطان کی ذریت نے حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ ان سے بچانے کے لئے انہیں آسمان پر لے گیا۔ یہ عقیدہ اس آیت کے صریح خلاف ہے اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ باوجود شیطان کے حملہ کے آدم اور انکی اولاد کو اسی دنیا میں رہنا ہوگا پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ آسمان پر لے جاتا اگر کوئی حقدار تھا کہ اسے آسمان پر لے جایا جاتا تو وہ آدم علیہ السلام تھے جو سب سے پہلے نبی تھے یا پھر سیّد ولد آدم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے مگر حضرت آدم کی نسبت تو مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں شیطان کے حملہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ جانا پڑا اگر اللہ تعالیٰ نے ان دو کی نسبت اس آیت کا بیان کردہ قانون نہیں بدلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کیونکر بدل دیا اور خود اپنے فیصلہ کو کیوں غلط کر دیا۔

آدم علیہ السلام کو اس شجرہ کے ذریعہ شیطان نے کس طرح دھوکا دیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو ابلیس سے بھی اور اس درخت سے بھی ہوشیار کر دیا تھا تو پھر وہ شیطان کے دھوکے میں کس طرح آئے کچھ جواب تو اس کا میں اوپر دے آیا ہوں کچھ اس جگہ بیان کرتا ہوں۔

مَیں بیان کر چکا ہوں کہ جہاں تک ابلیس سے دھوکا کھانے کا سوال ہے اس دھوکے کی وجہ یہ ہے کہ گو آدم علیہ السلام کو ابلیس سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا منشاء اس سے یہ تھا کہ ابلیس اور اس کے اتباع سے بچو کیونکہ ابلیس تو ایک بدی کی محرک رُوح ہے وہ براہ راست تو آ کر آدم کو دھوکا دے نہ سکتی تھی اس کے اتباع ہی بُری تحریکوں کا موجب ہو سکتے تھے مگر یہ اتباع چونکہ انسان ہوتے ہیں بسا اوقات ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کبھی وہ ظاہر میں مومن بنکر ساتھ آملتے ہیں اور اس طرح دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں

اور انسان کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا یہ اب بھی ابلیس کے اتباع میں یا مومن ہو کر خیر خواہ ہو گئے جس شیطان کا اس جگہ ذکر ہے اس نے بھی اس ترکیب کو استعمال کیا تھا چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (اعراف ع ۲) یعنی اس شیطان نے آدم اور اس کے ساتھی کے سامنے قسمیں کھا کر کہا کہ میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں گویا مخالفت کا رنگ چھوڑ کر وہ ساتھ آ شامل ہوا اور اپنے اخلاص کا انہیں یقین دلایا اس صورت میں آدم علیہ السلام کو دھوکا لگنا بالکل ممکن تھا کیونکہ انہوں نے یہ اجتہاد کیا کہ گو یہ شخص پہلے ابلیس کا ظل تھا اور اس وقت اس سے بچنا ضروری تھا مگر اب تو یہ مخالفت کا راستہ ترک کر کے ہمارے ساتھ آ ملا ہے اور قسمیں کھاتا ہے کہ میں تمہارا مخلص خادم ہوں اب اس سے تعلق رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ اجتہاد گو غلط تھا مگر باوجود ابلیس سے بچنے کے حکم کے اس اجتہاد کی وجہ سے دھوکا کھا جانا بالکل ممکن تھا اور یہ دھوکا خلافِ عقل نہیں ایسے ہی لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (منافقون ع ۱) یعنے جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تو واقعہ میں اس کا رسول ہے مگر اللہ انکی گواہی کے مقابل پر یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں ان لوگوں نے اپنی قسموں کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنا رکھا ہے۔ اور اس طرح یہ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں ان کے یہ عمل بہت ہی بُرے ہیں۔ یہ اعمال ان سے اس وجہ سے سرزد ہوتے ہیں کہ یہ لوگ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پس ان کے دلوں پر مہریں کردی گئیں اور اب یہ کچھ نہیں سمجھتے اور جب تُو ان پر نگہ کرے تو ان کے جسم تجھے پسند آتے ہیں اور اگر یہ بات کریں تو انکی باتوں کو معقول سمجھ کر سنتا ہے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے بڑی بڑی لکڑیاں ٹیک لگا کر کھڑی کی ہوں یعنی مجالس میں بڑی شان سے اور رُعب سے بیٹھتے ہیں جو عذاب بھی آئے یہ اسے اپنے ہی خلاف سمجھتے ہیں یہ لوگ اصل دشمن ہیں ان سے بچ کر رہ۔ اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کدھر لوٹے جا رہے ہیں۔

ان آیات میں منافقوں کی حالت کا وہی نقشہ کھینچا گیا ہے جو اوپر کی آیت میں شیطان کا کھینچا گیا ہے یہ بھی قسمیں کھاتے تھے جس طرح شیطان نے قسمیں کھائی تھیں یہ بھی اپنے اخلاص کا دعویٰ کرتے تھے جس طرح شیطان نے کیا تھا اور انکی باتیں بھی بظاہر ایسی ہوتی تھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دھوکا کھا جاتے کہ بڑے اچھے مشورے دے رہے ہیں اسی طرح شیطان کی بات پر آدم نے یقین کر لیا صرف فرق یہ ہے کہ سید ولدِ آدم چونکہ آخری نبی تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان شیطانوں کے حملے سے اپنے الہام سے بروقت خبردار کر دیا اور وہ اسلام کو عارضی نقصان بھی نہ پہنچا سکے مگر آدم کا شیطان یا اپنے وقت کا عبداللہ بن ابی بن سلول عارضی طور پر آدم کو جنّت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

شیطان کا یہ کہنا کہ میں آپ کا مخلص ہوں اسی لئے تھا کہ آدم علیہ السلام کو یقین دلائے کہ ابلیس اور اس کی ذریت سے بچنے کا حکم بیشک آپ کو ملا تھا مگر میں تو اب آپ کا مخلص ہوں اس لئے اب میں ابلیس کی ذریت سے نہیں رہا بلکہ آپ کی ذریت سے ہو گیا ہوں اسکی ان چکنی چپڑی باتوں سے

آدم علیہ السلام کو دھوکا لگ گیا اور انہوں نے سمجھا کہ یہ تو کہتا ہے جب یہ ہمارا مخلص ہو گیا ہے تو اب اس سے بچنے کی کیا ضرورت ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خبردار کر دیا کہ منہ سے یہ منافق کس قدر ہی اخلاص کے دعوے کریں مگر هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ اصل دشمن یہی ہیں پس تُو ان سے بچ۔

اس سوال کا جواب کہ حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے دھوکے میں کیونکر آ گئے۔

اب سوال کا یہ دوسرا پہلو حل کرنے کے قابل رہ جاتا ہے کہ شیطان چونکہ ابلیس کے علاوہ اور وجود تھا اس لئے اس نے اپنے مومن اور مخلص ہونے کا دھوکا دیکر حضرت آدمؑ کو غافل کر دیا مگر وہ بات جو اس نے کی ہوگی وہ تو خدا تعالےٰ کے حکم کے خلاف ہی ہوگی پھر اس بات کے ماننے کے لئے آدم علیہ السلام کس طرح تیار ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح آدمی ایک غلط جبہ پہن کر دوسرے کو دھوکا دے دیتا ہے اسی طرح وہ باریک امور میں غلط امور کو غلط رنگ دیکر اچھا بنا کر بھی دکھا دیتا ہے۔ دیکھو اسی سورۃ کے شروع میں اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (بقرہ عٓ) یعنے جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ کفار سے میل جول رکھ کر فساد پیدا نہ کرو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ واہ ہم پر فساد کا الزام لگاتے ہو حالانکہ ہم ہی اصلاح کی سچی کوشش کرنے والے ہیں ہمارا کفار سے ملنا تو اس غرض سے ہے کہ ان کے جوشوں کو دبائیں اور مسلمانوں کی طرف ان کو مائل کریں۔ اس جواب میں انہوں نے اپنے بُرے فعل کی اچھی توجیہ کر دی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو بھی رغبت دلائی ہے کہ تم بھی اسی طرح کرو تا کہ فساد جاتا رہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی یہی طریق اختیار کیا تھا چنانچہ فرماتا ہے شیطان نے آدم علیہ السلام کو شجرۂ ممنوعہ کے قریب لے جانے کے لئے کہا کہ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ (اعراف عٓ) یعنے شیطان نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو شجرۂ ممنوعہ سے بچنے کی حکمت پر غور کرنا چاہیئے صرف حکم کے ظاہری الفاظ کو نہیں دیکھنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ اس شجرہ سے بچ کر آپ فرشتے ہو جائیں اور ہمیشہ کی زندگی پائیں پس جب یہ حکم آپ کو نیک بنانے اور دائمی زندگی دینے کے لئے تھا تو اب اگر اس شجرہ کے قریب جانے سے وہی غرض پوری ہوتی ہو تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی رُوح کو مقدم رکھتے ہوئے اب آپ کو اس کے قریب جانے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے اور اس کے قریب جانے کو ہی منشائے الٰہی کو پُورا کرنے والا سمجھنا چاہیئے چنانچہ دوسری جگہ اسکی تشریح یُوں آتی ہے فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَىٰ (طٰهٰ ع ۷) یعنی شیطان نے آدم علیہ السلام کو یہ دھوکا دیا کہ اے آدم کیا میں تم کو وہ درخت بتاؤں جو دائمی زندگی بخشنے والا ہے اور ایسی بادشاہت بخشے گا جو کبھی تباہ نہ ہوگی (یعنے فرشتوں جیسی زندگی جو کبھی تنزل کی طرف نہیں جاتے) سورۂ اعراف کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس امر کو آدم علیہ السلام کے سامنے رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت سے اس لئے روکا تھا کہ تا اس سے رُک کر آپ فرشتے ہو جائیں اور دائمی زندگی پائیں اور طٰہٰ کی آیت بتاتی ہے کہ اس درخت کے قریب لے جانے کے لئے اس نے کہا کہ اس کے قریب جا کر آپ دائمی زندگی پائینگے ان دونوں آیتوں کو ملا کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا فریب یہی تھا کہ اس نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی بات کی تصدیق کر کے آدم علیہ السلام کے سامنے اپنے ایمان کا ثبوت دیا دوسری طرف اجتہاد کی آڑ لے کر یہ بتایا کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی غرض اور اس کا منشاء اس درخت سے دُور رہ کر نہیں بلکہ اس کے قریب جا کر پُورا ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے اور اس کے حکم کی رُوح کو مقدم رکھتے ہوئے اب آپ کو اس درخت کے قریب جانا چاہیئے آدم علیہ السلام اس کے اس دھوکے میں آ گئے اور اسکی بات کو مان لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنت دُکھ کا مقام بن گئی۔ ظاہر ہے کہ

اس قسم کا دھوکا بعض باریک مسائل کے متعلق خواص کو بھی لگ سکتا ہے۔ اور آدم علیہ السلام تو پہلے نبی تھے ان سے پہلے اسی قسم کی مثالیں عبرت کے لئے موجود نہ تھیں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ لوگوں کی عبرت کے لئے ان سے اس غلطی کے صدور کو رَوا رکھا ہو۔

ہمارے زمانہ میں بھی عام مسلمان باوجود پہلی قوموں میں عبرت کی مثالوں کے موجود ہونے کے اس قسم کے اجتہادوں سے دھوکا کھا رہے ہیں مثلاً تاجروں کو بعض علماء یہ دھوکا دیتے ہیں کہ سود جو اسلام نے منع کیا تھا وہ وہ سود نہ تھا جو اَب بنکوں کو دینا پڑتا ہے موجودہ سود سے بچنا تو قوم کو تباہ کرتا ہے اور اس سود کا لینا قوم کو تباہ کرتا تھا اس لئے اب بنکوں کا سود لینا منع نہیں بلکہ قومی زندگی کے لئے ضروری ہے اور کئی مسلمان جو دل سے اسلام کے احکام پر عمل کرنے کے خواہشمند ہیں اس دھوکے میں آکر سود لے رہے ہیں اسی طرح بعض لوگوں نے عورتوں کو دھوکا دیا ہے کہ عرب کا ملک جاہل تھا اور پردہ نہ کرنے کی وجہ سے اس وقت کی عورتیں گمراہ ہو سکتی تھیں لیکن اب تعلیم کا زمانہ ہے اب پردہ چھوڑنے میں حرج نہیں بلکہ مسلمان عورتوں کے باہر آنے میں اسلام کی مضبوطی ہے اور کئی عورتیں جو دل سے اسلام سے محبت رکھتی ہیں اس دھوکے میں آکر پردہ چھوڑ رہی ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہ کیا امر تھا جس کے بارہ میں شیطان نے دھوکا دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت سے اس امر کو پوشیدہ رکھا ہے پس اجمالاً اس امر پر یقین رکھنا کافی ہے کہ ممنوع باتوں میں سے کسی ایک کو جس کے بارہ میں دھوکا لگ سکتا تھا شیطان نے پیش کیا اور اس کی نسبت یہ دھوکا دیا کہ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے اب اس کا ترک دین کے لئے مضر ہے جس طرح کہ پہلے اس کا اختیار کرنا دین کے لئے مضر تھا ممکن ہے کہ اس وقت کے دشمنوں سے تعلقات پیدا کرنے کے متعلق ہی تحریک کی ہو جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے منافق کہا کرتے تھے۔ ہماری جماعت کو بھی اس بارہ میں ایک حصہ سے اس قسم کا تلخ تجربہ ہُوا ہے اور حال کے زمانہ کی یہ دو مثالیں ہمیں اس طرف رہبری کرتی ہیں کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شیطان نے کوئی ایسی ہی چال چلی تھی۔

شائد کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب اس امر کو جس کے بارہ میں شیطان نے آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا تھا ظاہر نہیں کیا گیا تو (۱) اس سے ہم فائدہ کیا اُٹھا سکتے ہیں (۲) دشمنانِ قرآن پر یہ مبہم بیان حجت کیونکر ہو سکتا ہے۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ سے جس امر سے ہوشیار کرنا ہمیں مقصود ہے وہ صرف یہ ہے کہ کبھی دشمن نیکی کے جبہ میں آکر اور بُری بات کو نیک توجیہہ کے پردہ میں چُھپا کر گمراہ کرنا چاہتا ہے مسلمانوں کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے یہ غرض اس مضمون سے روز روشن کی طرح واضح ہے باقی رہا یہ کہ آدم علیہ السلام کو کسی خاص امر میں شیطان نے دھوکا دیا تھا اس کا بیان کرنا ضروری نہیں کیونکہ ہر زمانہ میں شیطان نیا رنگ اختیار کرتا ہے اگر اس خاص امر کو بیان کر بھی دیا جاتا تو مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکتا تھا جس قدر واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مومنوں کو منافقوں کی چالبازیوں سے ہوشیار کرنے کے لئے کافی واضح اور بیّن ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ منکرین قرآن کے فائدہ اُٹھانے کا یہاں سوال ہی نہیں قرآن کریم کی تعلیم دو حصوں پر مشتمل ہے (۱) وہ حصہ جو مومن و کافر سب کے لئے مشترک ہے (۲) وہ حصہ جو صرف مومنوں کے لئے نصیحت اور فائدہ کا موجب ہے جن حصص میں عقلی دلائل اور معجزات عامّہ اور مختلف مذاہب کی کتب کے نقلی دلائل بیان ہوئے ہیں وہ تو مومن و کافر یا مومنوں اور خاص خاص مذاہب کے کافروں کے لئے حجت ہیں اور جن حصوں میں خالص روحانی امور بیان ہوئے ہیں وہ صرف مومنوں کے لئے مفید ہیں اور کافروں کے لئے اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جب پہلے ان کے عقائد کی اصلاح ہو جائے اور یہ حصہ صرف مومنوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کفار کو اگر اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو کوئی اعتراض کی بات

اس سوال کا جواب کہ وہ امر کیا تھا جس کے بارہ میں شیطان نے دھوکہ دیا۔

مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

اپنے رب سے کچھ (دعائیہ) کلمات سیکھے (اور ان کے مطابق دعا کی) تو وہ (یعنی اللہ) اس کی طرف (پھر فضل کے ساتھ) متوجہ ہوا یقیناً وہی بار بار

الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

کی مصیبت کے وقت) بہت ہی توجہ کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۳۸؎ ہم نے کہا (جاؤ) اس میں سے سب کے سب نکل جاؤ (اور یاد رکھو کہ)

نہیں جس طرح ایک دہریہ کی وجہ سے جو خدا تعالیٰ کو نہیں مانتا نبوت کے دلائل بیان کرنے سے رُکا نہیں جا سکتا اسی طرح جو لوگ کسی خاص نبی کو نہیں مانتے ان کی وجہ سے اس نبی کے اتباع کے فائدہ کی باتوں کے بیان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

لفظ اِھْبِطُوْا سے بعض لوگوں کا غلط استدلال اور اس کا صحیح مطلب۔

اِھْبِطُوْا کے لفظ سے دھوکا کھا کر بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آدم علیہ السلام آسمان پر تھے پھر انہیں زمین پر پھینکا گیا مگر جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے اس لفظ کے معنے چلے جانے کے بھی ہوتے ہیں اور اس امر کو دیکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین میں خلیفہ بنایا تھا اس جگہ اس کے یہی معنے ہیں قرآن کریم میں ان معنوں میں یہ لفظ دوسری جگہ پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً بنی اسرائیل کی نسبت فرماتا ہے اِھْبِطُوْا مِصْرًا (بقرہ ع۷) شہر کی طرف چلے جاؤ یا شہر میں داخل ہو جاؤ۔

۳۸؎ حل لغات :- تَلَقّٰی، لَقِیَ سے باب تفعّل کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَلَقَّاهُ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ اس کو آگے سے جا کر ملا۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ يَتَلَقّٰى فُلَانًا اَیْ يَسْتَقْبِلُهٗ فلاں شخص فلاں کو آگے سے جا کر ملتا ہے اور تَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ کے معنے ہیں اَخَذَهَا عَنْهُ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلمات لئے وَقِيْلَ تَعَلَّمَهَا بعض نے اس کا پورا مفہوم یوں ادا کیا ہے کہ انہوں نے سیکھے (لسان) اقرب میں لکھا ہے کہ تَلَقَّى الشَّیْءَ کے معنے ہیں لَقِيَهٗ کسی کو آگے جا کر ملا (کسی چیز کو آگے جا کر لیا) اور جب تَلَقَّى الشَّیْءَ مِنْهُ کہیں تو اس کے معنے ہونگے تَلَقَّنَهٗ

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ سے مراد۔

کسی کے منہ سے کوئی بات بالمشافہ سن کر اخذ کی اور اس کو ضبط کر لیا (اقرب) پس تَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کے معنے ہوں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ دعائیہ کلمات بذریعہ الہام سیکھے۔

كَلِمٰتٌ :- كَلِمَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں اَللَّفْظَةُ منہ سے بولا ہوا مفرد لفظ وَكُلُّ مَا يَنْطِقُ بِهِ الْاِنْسَانُ مُفْرَدًا كَانَ اَوْ مُرَكَّبًا نیز ہر اس بات پر بھی جو انسان بولے خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب كَلِمَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ كَلِمَةٌ کے ایک معنے اَلْخُطْبَةُ وَالْقَصِيْدَةُ کے بھی ہیں یعنی خطبہ اور قصیدہ (اقرب)

تَابَ :- تَابَ اِلَيْهِ وَعَلَيْهِ کے معنے ہیں رَجَعَ عَلَيْهِ بِفَضْلِهٖ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا (اقرب)

تَوَّابٌ :- تَوَّابٌ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں فضل کے ساتھ بہت متوجہ ہونے والا۔

اَلرَّحِيْمُ :- اس کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ۲؎

تفسیر۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت آدم کو شیطان نے دھوکا دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی غلطی سے آگاہ کیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف ع۲) یعنی اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اور اگر تو ہماری غلطی کو معاف نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ یہی دعا ہوگی

مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۵۳۹ اور جو (لوگ) کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے

نے سیکھی تھی۔

اس آیت میں ایک اور لطیف بات بتائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کی جاذب زیادہ تر وہی دُعائیں ہوتی ہیں جو وہ خود سکھلاتا ہے بہت سے انسان اپنی طرف سے دُعائیں بناتے ہیں لیکن وہ ایسی ناقص اور لغو ہوتی ہیں کہ بعض اوقات وہ دُعاؤں کی بجائے بددُعاؤں کا مفہوم ادا کرتی ہیں اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے الفاظ میں دُعا مانگے ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا مضبوط تعلق پیدا کرے کہ جب کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہو تو آدم اور دوسرے بزرگوں کی طرح اللہ تعالیٰ خود ہی اسے دُعا سکھلا دے جس کے مانگنے سے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو حاصل کر سکے۔

۵۳۹ حل لغات:۔ اِمَّا ۔ اِنْ اور مَا سے مرکب ہے (مغنی) اِنْ حرف شرط ہے۔ اور مَا تاکید کے لئے زائد لایا گیا ہے۔

هُدًی:۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۵ و سورہ ہذا ۳۔

خَوْفٌ:۔ خَوْفٌ کے معنے ہیں اِنْفِعَالٌ فِی النَّفْسِ یَحْدُثُ لِتَوَقُّعِ مَا یَرِدُ مِنَ الْمَكْرُوْهِ اَوْ یَفُوْتُ مِنَ الْمَحْبُوْبِ کسی آئندہ وقت میں کسی ناپسندیدہ امر کے وقوع پذیر ہونے یا کسی پسندیدہ چیز کے ہاتھ سے چلے جانے کے خیال سے جو طبیعت پر گھبراہٹ طاری ہوتی ہے اسے خوف کے نام سے موسوم کرتے ہیں (اقرب)

یَحْزَنُوْنَ:۔ حَزِنَ (یَحْزَنُ) حَزَنًا سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حَزِنَ لَهٗ وَعَلَیْهِ کے معنے ہیں ضِدُّ سُرَّ غمگین ہوا (اقرب) اَلْحُزْنُ کے معنے ہیں اَلْغَمُّ غم و اندوہ خِلَافُ السُّرُوْرِ خوشی کے متضاد معنے دیتا ہے یعنی غمگینی۔ نیز لکھا ہے کہ اَلْحُزْنُ اَلْغَمُّ الْحَاصِلُ لِوُقُوْعِ مَكْرُوْهٍ اَوْ فَوَاتِ مَحْبُوْبٍ فِی الْمَاضِیْ زمانہ ماضی میں کسی ناپسندیدہ امر کے وقوع پذیر ہونے یا کسی پسندیدہ چیز کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے جو طبیعت میں افسوس پیدا ہوتا ہے اُسے حزن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں (تاج) مفردات راغب میں ہے اَلْحُزْنُ خُشُوْنَةٌ فِی النَّفْسِ لِمَا یَحْصُلُ فِیْهِ مِنَ الْغَمِّ دل کی بیقراری جو غم کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے وَیُضَادُّهُ الْفَرَحُ اور اس کے بالمقابل فرح کا لفظ بولا جاتا ہے (مفردات) خوف اور حُزن میں یہ فرق ہے کہ خوف آئندہ زمانے کے متعلق ہوتا ہے اور حُزن کسی گذشتہ واقعہ کی بنا پر ہوتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اِهْبِطُوْا جمع کا لفظ ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس جنت میں صرف آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی نہ تھے بلکہ آدم کے اتباع بھی تھے۔

اس آیت میں وعدہ کیا گیا ہے کہ آدم کی اولاد میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی طرف بلاتے رہیں گے اور ایسے لوگ جو ہدایت کو مانیں گے وہ اسی دنیا میں جنت میں آ جائیں گے یعنی ان کے دلوں میں ایسی ایمانی قوت پیدا ہو جائیگی کہ ہر حالت میں ان کے دل مطمئن رہیں گے اور خوف یعنی آئندہ نقصانات کا ڈر اور حُزن یعنی

قتاب علیه میں طرف اشارہ کہ خدا تعالیٰ کے رحم کی جاذب زیادہ تر وہی الہامی دعائیں ہوتی ہیں

اِمَّا

هُدًی

خَوْفٌ

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کہ آدم کی اولاد میں ہادی پیدا ہوتے رہیں گے۔

یَحْزَنُوْنَ

ع ۴ بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ دوزخ (میں پڑنے) والے ہیں اور وہ اس میں بستے رہیں گے ۳۹؎

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ کی تشریح۔

پچھلے نقصانات پر افسوس ان کو غمگین نہ کریگا بلکہ ان کا دل جنت کا قائم مقام ہو جائے گا اور مابعد الموت الٰہی انعامات کے وارث ہوں گے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بعد وحی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ اسی وقت سے اللہ تعالےٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ آیندہ بھی وحی الٰہی آتی رہے گی اور اس کے ماننے والوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل نازل ہوتے رہینگے۔

كَذَّبُوا

۳۹؎ حل لغات۔ كَذَّبُوا:۔ كَذَّبَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور كَذَّبَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ كَاذِبًا وَنَسَبَهٗ اِلَى الْكِذْبِ اُسے جھٹلایا۔ اور اس کی نسبت جھوٹ کی طرف کی۔ وَقِيلَ قَالَ لَهٗ كَذَبْتَ اور بعض نے کہا ہے کہ كَذَّبَ کے معنے ہیں کسی کو یہ کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اور جب كَذَّبَ بِالْاَمْرِ تَكْذِيبًا وَكِذَّابًا کا فقرہ بولیں تو معنے یہ ہونگے اَنْكَرَهٗ وَجَحَدَهٗ کہ کسی معاملہ کا انکار کیا (اقرب) پس كَذَّبُوا کے معنے ہونگے انہوں نے جھٹلایا۔

اٰيٰتٌ — واقعہ آدم میں ہر ایک مسلمان کے لئے نصیحت۔

اٰيٰتٌ:۔ اٰيَةٌ کی جمع ہے اور اٰيَةٌ کے معنے علامت۔ نشان اور دلیل کے ہوتے ہیں نیز قرآن کریم کے ہر ایسے ٹکڑے کو جسے کسی لفظی نشان کے ساتھ دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہو اٰيَةٌ کہتے ہیں۔ (تاج)

خٰلِدُونَ

خٰلِدُونَ:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۲۶؎

تفسیر۔ یعنی جو لوگ ہدایت کو چھوڑ کر ان نشانوں کا انکار کرینگے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی شناخت کے لئے اس وقت پیدا کئے ہونگے وہ ایک آگ میں پڑ جائینگے۔ اور دلی اطمینان اور قلبی راحت ان کو حاصل نہ ہوگی خواہ بظاہر ہزاروں نعمتوں میں گھرے ہوئے ہوں اور مابعد الموت سزاؤں کے وارث ہوں گے۔

وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ۔ خلود کے معنے ہیں ایک لمبا عرصہ رہنا۔ دیکھو کلیات ابی البقاء وَفِي الْاَصْلِ الثَّبَاتُ الْمَدِيدُ دَامَ اَمْ لَمْ يَدُمْ یعنی خلود کے اصل معنے ایک لمبا عرصہ تک رہنے کے ہیں خواہ ہمیشہ رہیں یا نہ رہیں یہ معنے نہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اسلام دائمی عذاب کا قائل نہیں۔ بلکہ دوزخ کو ایک شفاخانہ کی طرح قرار دیتا ہے جس میں لوگ صرف اصلاح کے لئے داخل کئے جائینگے اسلام کا خدا غیظ اور کینہ کے طور پر انتقام نہیں لیتا بلکہ وہ سزا کی یہ وجہ بیان فرماتا ہے کہ انسان کی اصلاح ہو جائے جب یہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو عذاب ٹل جاتا ہے اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس میں کوئی بھی دوزخی نہ رہے گا اور نسیم اس کے دروازے ہلائیگی۔ (تفسیر معالم التنزیل سورۃ ہود زیر آیت اَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا)

گو یہ واقعہ کسی پچھلے زمانہ میں انسانی نسل کے کسی خاص جد کے ساتھ بھی گزرا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان فرمانے میں ایک ایسا رنگ اختیار کیا ہے جس سے ہر ایک مسلمان نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی باتوں کا ذکر بطور قصہ کے نہیں کیا بلکہ ایسے الفاظ میں ان کو ظاہر کیا ہے کہ جنہیں ہر انسان اپنے پر چسپاں کر سکے مثلاً یہ کہ اسماء کی نسبت نہیں بتایا کہ وہ کیا تھے نہ شجرہ کی نسبت بیان کیا کہ وہ کونسا تھا پھر جہاں آدم کو بہکانے والے کا ذکر ہے وہاں ابلیس کی جگہ شیطان کا لفظ رکھ کر بتا دیا ہے کہ ابلیس کے اضلال چار [illegible]ں طرف موجود ہیں تا یہ واقعہ لوگوں کے لئے نصیحت اور فائدہ کا موجب ہو اور ایسا نہ ہو کہ [illegible] ایک قصے کے طور پر اسے پڑھیں۔ ہر ایک انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ آدم ہے ملائکہ کو جو دنیا کے روحانی نظم ونسق کو قائم

رکھنے کے لئے ایک واسطہ کے طور پر پیدا کئے گئے ہیں انہیں اس کی مدد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے ملائکہ جن اشیاء کے نگران ہیں وہ سب انسان کی مدد کرتی اور اس کی زندگی کو بہ آرام بنانے میں کار آمد ہوتی ہیں۔ لیکن بعض شریر لوگ دوسرے بھائیوں کا سُکھ نہیں دیکھ سکتے وہ شیطان بنکر ان کو اس رُوحانی جنت سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ہر ایک انسان کو اس کی پیدائش سے ملا ہے اور بہت کچھ دُکھ دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو آدم کی طرح اپنے رب کے حضور جھکتا ہے اور اس سے اپنی مصیبت کے دُور کرنے کی التجا کرتا ہے آخر کامیاب ہو جاتا ہے اور ہر خوف و حزن کی حد سے باہر نکل جاتا ہے لیکن جو لوگ آدم کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے بلکہ ابتلاؤں میں ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور شیطان سے صلح کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو رد کر دیتے ہیں وہ دُکھ میں پڑ جاتے اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک سورج جو چڑھتا ہے اس واقعہ کو بار بار دُہرا رہا ہے۔ لیکن نادان انسان جو خود ہزاروں خطرناک بدیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ آدم پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان کا کہنا کیوں مانا۔ حالانکہ آدم بھول کر ایک غلطی کا مرتکب ہوا تھا اور یہ معترض اپنے دل میں شیطان کو لئے بیٹھا ہوتا ہے اور آدم پر اعتراض کرتے ہوئے نہیں شرماتا۔ بعض مفسرین نے اصل حقیقت سے قطع نظر کر کے اس جگہ عجیب عجیب قصے بیان کئے ہیں جن کی صحت کا ثبوت نہ قرآن مجید سے ملتا ہے نہ احادیث صحیحہ سے پس انکی طرف توجہ نہیں ہونی چاہیئے اور نہ غیر مذاہب کی طرف سے انکی بناء پر کوئی اعتراض قرآن مجید پر آ سکتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے علاوہ انسان کو اس کے ذاتی حالات کی طرف توجہ دلانے کے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی طرف بھی لطیف طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ (۱) الہام الٰہی ہی انسانی برتری کا ذریعہ ہے۔ بشر کو دوسرے حیوانات پر فضیلت الہام الٰہی کے ذریعہ سے ہی ملی پس جو اقوام الہام الٰہی سے محروم ہیں یا اس کی قدر نہیں کرتیں ▪وہ حیوانیت کو انسانیت پر ترجیح دینے کی مجرم ہیں۔ اور تمدنی ترقی کے راستہ میں روک ثابت ہو رہی ہیں اور ہونگی۔ وہی لوگ تمدنی ترقی کا موجب ہوتے ہیں جو آسمانی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہنے والے ایک جدید اور مفید تمدن کی بنیاد رکھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت کے مطابق اس جدید رُوحانی سلسلہ کے تبع ایک جدید اور عظیم الشان تمدن کے بانی ہوئے موجودہ مغربی تمدن گو بہت شاندار نظر آتا ہے مگر وہ بہت ▪حد تک اسلامی تمدن کا خوشہ چین ہے اور جس حد تک وہ اس کے خلاف چلا ہے امن کا موجب نہیں ہوا۔ بلکہ فساد اور خونریزی کا موجب ہوا ہے (۲) جب بھی کوئی نئی اصلاح دنیا کے لوگوں کے سامنے آتی ہے دنیا اسکی مخالفت کرتی ہے وہ ایسی عظیم الشان ہوتی ہے کہ شروع شروع میں نیکوکار بھی اسکی گہرائیوں اور تاثیروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسلام کے ظہور کے وقت میں ایسا ہی ہونا لازمی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا (۳) نیک لوگ بعد میں اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کی عظمت کے قائل ہو جاتے اور اس کی تائید میں لگ جاتے ہیں لیکن شریر مخالف مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی اسلام سے ہوا اور ہوگا چنانچہ تمام نیک فطرت لوگ ایک ایک کر کے اسلام میں داخل ہوئے اور اس کی تائید میں لگ گئے لیکن ابلیس مزاج نافرمانی پر اُتر آئے (۴) جب ظاہری مخالفت ناکام رہتی ہے تو الٰہی سلسلوں کے دشمن ان میں شامل ہو کر ان کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ آدم کے وقت میں شیطان نے کیا اور ایسا ہی معاملہ اسلام سے ▪وہ کرینگے اور کر رہے ہیں

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں آنحضرت صلعم کے دعویٰ کی طرف لطیف طور پر توجہ کا مبذول کرانا۔

لیکن جس طرح آدم کا شیطان ناکام رہا اور حقیقی نقصان آدم علیہ السلام کو نہ پہنچا سکا۔ یہ منافق بھی اسلام کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور باوجود ان کی مخالفت کے اسلام ترقی کرے گا اور اس کے دشمن ایک دائمی عذاب میں مبتلا ہونگے (۵) الٰہی ہدایت کا سلسلہ محدود نہیں ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہدایت بھجواتا رہے گا اگر ہدایت کا سلسلہ

یٰبَنِیۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ

اے بنی اسرائیل میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں تم پر کر چکا ہوں

عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ

اور (تم نے) میرے (ساتھ جو) عہد (کیا تھا اس) کو پورا کرو تب (میں نے) تمہارے (ساتھ جو) عہد (کیا تھا اس) کو میں پورا

فَارۡہَبُوۡنِ ○ وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ

کرونگا اور مجھ (ہی) سے ڈرو پھر (میں کہتا ہوں کر) مجھ ہی سے ڈرو ۵۴۱ اور اس کلام پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) اُتارا ہے

محدود ہوتا تو پھر اسے پہلے نبی کے ساتھ ہی بند ہو جانا چاہیئے تھا جیسا کہ مثلاً ہندوؤں کا خیال ہے لیکن وہ آدم اوّل کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ آدم اوّل کے مُنہ سے اللہ تعالیٰ نے آیندہ ہدایتوں کے آنے کی خبر دی۔ پس آیندہ کسی وقت میں اس کا بند ہو جانا خلافِ عقل و خلافِ وحیٔ الٰہی ہے (۶) جو لوگ آسمانی ہدایت پر ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی سابق خطاؤں کے بداثرات سے بچا لیتا ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام سے ہوا اور آیندہ کا ہر قدم ان کا ایسا مضبوط پڑتا ہے کہ مستقبل کے خطرات کم ہوتے ہوتے بالکل ہٹ جاتے ہیں پس خدا تعالیٰ کے اس وعدہ پر ایمان رکھتے ہوئے مومن دلیر بہادر اور جری ہوتا ہے وہ قربانیوں کے وقت عواقب اور انجام سے نہیں ڈرتا کیونکہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اس کے لئے ایسا عُروہ وُثقیٰ ہے کہ اسے پکڑنے کے بعد وہ ہر دُکھ سے محفوظ ہو گیا اگر وہ جیتا رہا تو دنیا کا رہنما ہو گا اگر مارا گیا تو خدا تعالےٰ کی محبت بھری گود میں۔ پس اسے کس امر کا خوف ہو سکتا ہے؟

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ

۵۴۱ حل لغات:۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جو بائیبل کے بیان کے مطابق ان کو ان کی بہادری کی وجہ سے خدا تعالےٰ کی طرف سے ملا۔ تورات میں آتا ہے "کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہو گا کیونکہ تُو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہُوا۔" (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۸) عبرانی کی لغت

ANALYTICAL HEBREW
AND CHALDEC

میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لقب کے علاوہ ان کی نسل پر (بھی) یہ لفظ بولا جاتا ہے یعنی کبھی بنی اسرائیل کو خالی اسرائیل بھی کہہ دیتے ہیں۔ عربی اسرائیل کا عبرانی تلفظ یَشْرَائِیْل ہے اور یہ مرکب ہے یسر اور ایل سے۔ یسر کے معنے ہیں جنگجو بہادر سپاہی۔ اور ایل کے معنے ہیں خدا۔ پس یسرائیل کے معنے ہوئے خدا کا بہادر سپاہی

WARRIOR OR
SOLDIER OF GOD

عربی زبان کے لحاظ سے یہ لفظ اِسْر اور اِیْل سے مرکب ہے گو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلیۃً عبرانی لفظ ہو اور عربی میں مستعار طور پر استعمال ہوتا ہو لیکن عربی زبان اور عبرانی زبان درحقیقت ایک ہی ہیں اور ہماری تحقیق میں عبرانی زبان عربی کی بگڑی ہوئی صورت ہے یورپین مصنفوں میں سے بھی بعض اس خیال کے ہیں گو اکثر مذہبی تعصب کی وجہ سے ان دونوں زبانوں کو ایک اور زبان کی شاخ ہی قرار دیتے ہیں بلکہ بعض تو عربی کو عبرانی کی شاخ تک قرار دے دیتے ہیں لیکن یہ موقعہ اس بحث کا نہیں اس موقعہ کے مناسب حال اس قدر کہنا کافی ہے کہ عربی اور عبرانی کا اشتراک ایک مسلّمہ حقیقت ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں عربی ہے اور عبرانی زبان میں سکی شکل بدل گئی ہے اور ہمزہ نے یار کی شکل اختیار کر لی ہے عربی

زبان میں اَسَرَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں قَبَضَ عَلَيْهِ وَ اَخَذَهٗ (اقرب) یعنی فلاں شخص اپنے مدِّمقابل پر غالب آگیا اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان معنوں کے اعتبار سے اِسْر کے معنے ہونگے وہ شخص جس کے اندر بہادری اور قوت ہو اور وہ اپنے مدِّمقابل پر غلبہ پاکر اسے اپنی گرفت میں لے لے۔ اگر عبرانی کے تلفظ اور رسم الخط کو دیکھا جائے تو یَسَر کے معنے ہیں اَللِّيْنُ وَ الْاِنْقِيَادُ (لسان) کسی کی بات کو آسانی سے قبول کر لینا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا۔

لفظ اِیل عربی زبان میں خدا تعالیٰ کے معنوں میں نہیں آتا۔ ہاں اگر غور کیا جائے تو اس کے حقیقی معنے اللہ تعالیٰ پر ہی صادق آتے ہیں کیونکہ یہ آلَ سے بنا ہے اور آلَ کا اسم فاعل آئِلٌ بنتا ہے اور اِیل اس سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے آلَ کے معنے ہیں سَاسَ یعنی اس نے نگہداشت کی۔ چنانچہ کہتے ہیں آلَ الرَّجُلُ اَهْلَهٗ اَیْ سَاسَهُمْ کہ فلاں شخص نے اپنے کُنبہ کی پُوری نگہداشت کی (اقرب) نیز کہتے ہیں آلَ الْمَلِكُ الرَّعِيَّةَ کہ بادشاہ نے اپنی رعیّت کی نگرانی رکھی اور رعیّت کے ساتھ تعلق رکھنے والے امور کی تدبیر کی۔ نیز کہتے ہیں آلَ عَلَى الْقَوْمِ وَلِيَ کہ وہ قوم پر بادشاہ ہوگیا۔ پس آئِلٌ کے معنے ہوئے مدبّر۔ حاکم۔ بادشاہ۔ اور اِیلٌ کے معنے ہونگے ایسی ہستی جس کی ذات میں تدبیرِ امور اور حکومت اور بادشاہت کی صفات پائداری کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور یہ صفات سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور ذات میں نہیں پائی جاتیں۔ کیونکہ وہی ایک ذات ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ آلَ کے ایک معنے لوٹنے کے ہیں ان معنوں کے لحاظ سے اِیل کے معنے ہونگے کہ وہ ذات جس کے اندر لوٹنے کی صفت پائیداری اور ہمیشگی کے ساتھ پائی جاتی ہے اور یہی معنے بلفظِ دیگر تَوَّابٌ کے ہیں یعنی بار بار رحمت کے ساتھ اپنے بندوں پر لوٹنے والا۔

الغرض پہلے مادہ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسرائیل کے معنے مندرجہ ذیل ہونگے (۱) ازلی ابدی بادشاہ (یعنی خدا تعالیٰ) کا سخت گرفت رکھنے والا بندہ (۲) ازلی ابدی مدبّر ہستی کا سخت گرفت رکھنے والا بندہ (۳) بار بار لوٹنے والے کا (یعنی توّاب خدا کا) بہادر بندہ۔

دوسرے مادہ یعنی یَسَر کے لحاظ سے اسرائیل کے معنے ہونگے اللہ تعالیٰ کا پورا مطیع و فرمانبردار اور اس کے اخلاق کو اپنے اندر لینے والا۔ عبرانی زبان چونکہ عربی سے نکلی ہے اس لئے اگرچہ اسرائیل کا تلفظ عبرانی میں بدل گیا اور اِسْر کو یَسَر اور اِیل کو ایل (نرم زبان سے یعنی زبر اور زیر کے درمیانی تلفظ سے) کر دیا گیا اور عربی زبان جو کہ اپنے اصل معنے کا انکشاف کرتی ہے عبرانی نے اسے محدود کر دیا۔ کیونکہ عبرانی میں اسرائیل کے معنے صرف خدا کے جنگجو بہادر سپاہی کے ہیں لیکن عربی زبان میں جہاں یہ معنے بھی بالوضاحت پائے جاتے ہیں وہاں ایک اور معنے کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ یَسَر سے بھی صفت مشبّہ کا صیغہ بن سکتا ہے اور یہ لفظ اس خاص حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انبیاء کی فطرت میں پائی جاتی ہے یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے لئے سرِ تسلیم خم رکھنا۔ گویا اسرائیل اس شخص کو کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کے احکام کے ماننے کے لئے ہر وقت اپنے تئیں تیار رکھے۔ ان معنوں کی تصدیق تاج العروس والے نے بھی کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ مَعْنَاهُ صَفْوَةُ اللهِ وَقِيْلَ عَبْدُ اللهِ کہ اسرائیل کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ کیا ہوا اور اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کے احکام کا فرمانبردار۔ بعض لوگوں نے اس کے معنے سَرِيُّ اللهِ کے کئے ہیں (تاج) سَرِيٌّ کے معنے عربی زبان میں صاحبِ شرف و مروّت اور فیاض کے یا معزز شریف سردار کے ہیں لیکن

HEBREW AND ENGLISH
LAXICON OF THE OLD
TESTAMENT

میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ یَسْرَئِیل کے حقیقی معنے

اُذْكُرُوْا
نِعْمَتِيَ

سَرِیٌّ کے نہیں ہاں اس سے ملتا جلتا مفہوم ہے (اصل بات یہ ہے کہ یَسَرٌ چونکہ جنگجو بہادر کو کہتے ہیں اور ایسا شخص ہی سردارِ لشکر ہو سکتا ہے جو بہادر اور جنگجو ہو اور عرب لوگ بھی ایسے شخص کو سردار مانتے تھے جو صاحبِ شرف اور مروّت اور فیاض ہو اور ایسا شخص ہی جنگوں میں پیشرو ہو سکتا تھا تو گویا ان معنوں کے لحاظ سے یَسَرٌ کے معنے سَرِیٌّ کے مشابہ ہو گئے)۔

اُذْكُرُوْا :- امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور ذَكَرَ الشَّيْءَ (يَذْكُرُ ذِكْرًا وَتَذْكَارًا) کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں یاد کر لیا اور جب ذَكَرَ الشَّيْءَ بِلِسَانِهٖ کہیں تو معنے ہونگے قَالَ فِيْهِ شَيْئًا کہ اس نے کسی بات کے متعلق اپنی زبان سے کچھ کہا۔ اور ذَكَرَ لِفُلَانٍ حَدِيْثًا کے معنے ہیں قَالَهٗ لَهٗ کوئی بات بیان کی جب ذَكَرَ مَا كَانَ قَدْ نَسِيَ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنے ہونگے فَطَنَ بِهٖ کسی بھولی ہوئی بات کی یاد تازہ ہو گئی (اقرب) امام راغب لکھتے ہیں اَلذِّكْرُ تَارَةً يُقَالُ وَيُرَادُ بِهٖ هَيْئَةٌ لِلنَّفْسِ بِهَا يُمْكِنُ لِلْاِنْسَانِ اَنْ يَّحْفَظَ مَا يَقْتَنِيْهِ مِنَ الْمَعْرِفَةِ کہ ذکر کا لفظ بول کر کبھی نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے جس کے ذریعہ سے انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ معلوم شدہ باتوں کو یاد رکھ سکے وَهُوَ كَالْحِفْظِ اِلَّا اَنَّ الْحِفْظَ يُقَالُ اعْتِبَارًا بِاِحْرَازِهٖ وَالذِّكْرُ يُقَالُ اعْتِبَارًا بِاِسْتِحْضَارِهٖ۔ اور ان مذکورہ بالا معنوں میں ذکر کا لفظ حفظ کے لفظ کے ہم معنی ہے ہاں حفظ اور ذکر ہر دو کے مفہوم میں تھوڑا سا امتیاز ہے حفظ کسی شخص کے یاد کرنے پر اس وقت بولیں گے جب وہ ذہن میں بعض باتوں کو جمع کرتا چلا جائے اور ذکر اس کے اس طور پر یاد رکھنے کو کہیں گے کہ اس کو وہ باتیں مستحضر رہیں اور جب چاہے انہیں استعمال کر لے وَتَارَةً يُقَالُ لِحُضُوْرِ الشَّيْءِ [illegible] اَوِ الْقَوْلِ اور کبھی دل میں کسی امر کا خیال ہے [illegible] سے لانے کا نام ذکر رکھا جاتا ہے وَلِذٰلِكَ قِيْلَ الذِّكْرُ ذِكْرَانِ ذِكْرٌ بِالْقَلْبِ وَذِكْرٌ بِاللِّسَانِ اسی لئے کہتے ہیں کہ ذکر دو طرح ہوتا ہے (۱) قلبی ذکر (۲) زبانی ذکر وَكُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا ضَرْبَانِ ذِكْرٌ عَنْ نِسْيَانٍ وَذِكْرٌ لَا عَنْ نِسْيَانٍ بَلْ عَنْ اِدَامَةِ الْحِفْظِ کہ خواہ قلبی ذکر ہو یا قولی ہر دو کی دو دو قسمیں ہیں (۱) بھول جانے کے بعد کسی بات کا یاد کرنا (۲) یا بغیر بھولنے کے یاد رکھنا (مفردات) پس اُذْكُرُوْا کے معنے ہونگے۔ تم یاد کرو۔

نِعْمَتِيَ :- اَلنِّعْمَةُ کے معنے ہیں اَلصَّنِيْعَةُ وَالْمِنَّةُ احسان۔ مَا اُنْعِمَ بِهٖ عَلَيْكَ مِنْ رِّزْقٍ وَّمَالٍ وَّغَيْرِهٖ۔ مال یا رزق یا اس کے علاوہ کوئی [illegible] چیز جو بطور انعام ملے۔ اَلْمَسَرَّةُ خوشی۔ اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ الصَّالِحَةُ ایسا احسان جس میں کوئی کدورت اور کمی نہ ہو۔ وَفِي الْكُلِّيَّاتِ اَلنِّعْمَةُ فِيْ اَصْلِ وَضْعِهَا "اَلْحَالَةُ الَّتِيْ يَسْتَلِذُّ بِهَا الْاِنْسَانُ" وَهٰذَا مَبْنِيٌّ عَلٰى مَا اشْتَهَرَ عِنْدَهُمْ مِنْ اَنَّ النِّعْمَةَ بِالْكَسْرِ لِلْحَالَةِ وَبِالْفَتْحِ لِلْمَرَّةِ۔ اور کلیات ابی البقاء میں یوں لکھا ہے کہ نعمت اصل وضع کے لحاظ سے اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان لذت اٹھاتا ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ حالت بیان کرنے کے لئے عربی زبان میں فِعْلَةٌ اور کسی کام کے ایک دفعہ ہونے کا اظہار کرنے کے لئے فَعْلَةٌ کا وزن لاتے ہیں اور نِعْمَةٌ ن کی زیر سے چونکہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے اس لئے اس میں نعمت والی حالت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ وَنِعْمَةُ اللّٰهِ۔ مَا اَعْطَاهُ اللّٰهُ لِلْعَبْدِ مِمَّا لَا يَتَمَنّٰى غَيْرَهٗ اَنْ يُّعْطِيَهٗ اِيَّاهُ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے بندے پر وہ احسان ہے جس کے بعد بندہ اس کے متعلق کسی اور سے خواہش نہیں رکھتا۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ اور نِعَمٌ آتی ہے اور جب فُلَانٌ وَاسِعُ النِّعْمَةِ کہیں تو اس کے معنے ہونگے وَاسِعُ الْمَالِ یعنے فلاں مالدار ہے (اقرب)

اَلْعَھْدُ :۔ کے مصدری معنے ہیں حِفْظُ الشَّیْءِ وَمُرَاعَاتُہٗ حَالًا بَعْدَ حَالٍ کسی چیز کی حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ وَسُمِّیَ الْمَوْثِقُ الَّذِیْ یَلْزَمُ مُرَاعَاتُہٗ عَھْدًا۔ اور اس عہد و پیمان کو جسکی ہر لحاظ سے حفاظت کی جائے عہد کے نام سے موسوم کرتے ہیں وَعَھْدُ اللّٰہِ تَارَۃً یَکُوْنُ بِمَا رَکَزَہٗ فِیْ عُقُوْلِنَا اور اللہ تعالیٰ کا بندوں سے عہد تین طور پر ہے (۱) یہ کہ بعض باتیں اس نے فطرت انسانی میں رکھ دی ہیں اور اس عہد کی حفاظت اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ خلاف فطرت کام نہ کیا جائے (۲) وَتَارَۃً یَکُوْنُ بِمَا اَمَرَنَا بِہٖ بِالْکِتَابِ وَبِسُنَّۃِ رُسُلِہٖ اور کبھی اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے عہد لینے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ باتیں جو اس نے اپنی نازل کردہ کتاب اور اپنے رسولوں کی سنّت کے ذریعہ ہمارے پاس بھیجی ہیں ہم ان کو بجا لائیں (۳) وَتَارَۃً بِمَا نَلْتَزِمُہٗ بعض اوقات اس بات کو بھی عہد کہہ دیتے ہیں جو برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے ذمہ لگا لیا جائے کہ میں خدا تعالیٰ کی خاطر فلاں جائز کام ضرور کروں گا (مفردات) تاج العروس میں ہے اَلْعَھْدُ اَلْوَصِیَّۃُ وَالْاَمْرُ کہ عہد کے معنے کسی تاکیدی حکم کے ہوتے ہیں نیز اس کے معنے ہیں اَلْمَوْثِقُ وَالْیَمِیْنُ پکا عہد و پیمان۔ قسم۔ اَلْحِفَاظُ وَرِعَایَۃُ الْحُرْمَۃِ کسی بات کی حفاظت اور اسکی حرمت کی نگہداشت کرنا۔ اَلْاَمَانُ امان۔ اَلذِّمَّۃُ ذمہ۔ اَلْاِلْتِقَاءُ ملاقات۔ اَلْمَعْرِفَۃُ کسی چیز کو جاننا اَلزَّمَانُ زمانہ۔ اَلْوَفَاءُ وفا۔ تَوْحِیْدُ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ اللہ تعالیٰ کو واحد گردانا اَلضَّمَانُ ضمانت۔ اَلَّذِیْ یُکْتَبُ لِلْوُلَاۃِ پروانہ شاہی جو کسی شخص کو کسی ملک کا حاکم مقرر کرتے وقت لکھ کر دیا جاتا ہے (تاج)

اِرْھَبُوْنِ :۔ اِرْھَبُوْا جمع مخاطب کا صیغہ امر ہے اور رَھِبَ الرَّجُلُ (یَرْھَبُ رَھْبَۃً) کے معنے ہیں خَافَ ڈر گیا (اقرب) اِرْھَبُوْنِ اصل میں اِرْھَبُوْنِیْ تھا۔ ی کو گرا دیا گیا اور نون وقایہ کے کسرہ پر اکتفا کیا گیا۔ اِرْھَبُوْنِ کے معنے ہیں مجھ سے ڈرو۔

اَلْعَھْد

ترتیب مضمون

تفسیر۔ ترتیب مضمون :۔ آدم علیہ السلام کی مثال دیکر یہ بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کوئی نیا دعویٰ نہیں بلکہ جب بشر کی عقل مکمل ہوئی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر الہام نازل کیا تھا اس کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب شروع میں الہام نازل کر دیا تو پھر اور کسی الہام کی کیا ضرورت ہے کیا وہ الہام کافی نہیں۔ یہ سوال عام ہے اور اکثر نبوت کے مخالف بلکہ پرانے مذہب کے مدعیان بھی یہ اعتراض کرتے چلے آتے ہیں۔ مخالفین نبوت کے اعتراض کی غرض تو صرف نبوت میں شک پیدا کرنا ہوتی ہے وہ اس اعتراض سے صرف یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ موجودہ مدعی غلطی پر ثابت ہوگا سابق کا کوئی دعویدار اور نائب موجود ہی نہیں کہ اسکی اطاعت کا سوال ہو لیکن جو مذاہب قدیم ہیں ان کی غرض اس سوال سے یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مذہب کی موجودگی میں اور کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ اس سوال کا دو طرح جواب دیا جا سکتا ہے ایک اس طرح کہ عقلاً نبوت کی ضرورت ثابت کی جائے دوسرے اس طرح کہ واقعات کی شہادت سے ثابت کر دیا جائے کہ نبوت آدم علیہ السلام کے بعد بھی جاری رہی۔ قرآن کریم نے نبوت کے اجراء کی ضرورت کو عقلی طور پر کئی دوسرے مقامات پر ثابت کیا ہے مگر اس جگہ دوسرے طریق جواب کو اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کے قریب زمانہ تک نبوۃ کے مدعی ہوتے رہے ہیں پس یہ کہنا کہ پہلی شریعت کے بعد اور کسی شریعت یا وحی نبوت کی ضرورت نہیں درست نہیں جن لوگوں کی صداقت شواہد اور دلائل سے ثابت ہو چکی ہو انکے دعویٰ کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے تھے تو پہلی وحی کے بعد دوسرے زمانوں کی وحیوں کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر پہلی وحی کے بعد بھی الہام ہوتا رہا بلکہ اسلام کے قریب زمانہ تک بھی خدا تعالیٰ

اِرْھَبُوْن

کے نبی آتے رہے تو پھر اسلام کی وحی پر اس بنا پر اعتراض کرنا کہ پہلی وحی کے بعد دوسری وحی کی ضرورت نہیں کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

آدم علیہ السلام کا ذکر بیان کرنے کے بعد بنو اسرائیل کو مخاطب کرنے کی وجہ۔

اس طریق جواب کو اختیار کرنے میں ایک مزید فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطبین میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہودی مذہب یا عیسوی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کے نبیوں کو قرآن کریم نے وحی کے جاری ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی جس کے بغیر ان پہلے نبیوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی بنو اسمٰعیل میں ایک نبی کا وجود بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ خبر دی گئی تھی کہ بنو اسمٰعیل میں بھی ایک نبی ہو گا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں نے اس نبی کی آمد کی مزید وضاحت کی تھی پس ان انبیاء کی وحی کو بطور شہادت پیدا کرنے میں دو فائدے تھے ایک تو وحی کے اجراء کا ثبوت دوسرے اس امر کا ثبوت کہ اس سلسلۂ نبوت کے بعد وحی الٰہی کا بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل ہونا لازمی اور ضروری تھا پس وحی نبوت کا اجراء ہی ثابت نہیں بلکہ اس کا آخری زمانہ کے مورد کا بنو اسمٰعیل اور عرب میں ہونا بھی ضروری تھا۔

لفظ اسرائیل کے معنی

چنانچہ اس دلیل کو بیان کرنے کے لئے اس رکوع سے بنو اسرائیل کو مخاطب کر لیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور اس امر کی سچی گواہی دو کہ خدا تعالیٰ کا الہام دنیا میں ہمیشہ نازل ہوتا رہا ہے اور تم بھی اس کے مہبط رہے ہو۔ بلکہ یہی کہ تمہاری کتب میں یہ بھی موجود ہے کہ ایک دن وحی الٰہی کا سلسلہ تم سے ہٹ کر تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

لفظ بنو اسرائیل کی وضاحت۔

اسرائیل

پیشتر اس کے کہ میں اس اجمال کی تفصیل بیان کروں۔ میں بنو اسرائیل کے لفظ کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے اسحاق علیہ السلام تھے۔ ان کے بیٹے کا نام یعقوب (علیہ السلام) تھا۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد تھے۔ حضرت یعقوبؑ یہود میں خاص حیثیت رکھتے ہیں اور انکی قوم کا نسلی امتیاز انہی کے نام سے قائم ہے۔ اسرائیل کا نام خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملا تھا جس کی وجہ سے ان کی اولاد بنی اسرائیل یعنی اسرائیل کی اولاد کہلائی۔ بائبل میں لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام سے ایک سفر کے دوران میں رات کے وقت ایک شخص نے کشتی لڑنی شروع کی اور ساری رات کشتی لڑتا رہا۔ بائبل کے بیان کے مطابق وہ کشتی لڑنے والا خدا تعالیٰ تھا (پیدائش باب ۳۲ آیت ۳۰) صبح کے وقت اس کشتی لڑنے والے نے حضرت یعقوبؑ سے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے یعقوب نام بتایا اسپر اس نے کہا کہ "تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کہ تُو نے خدا اور خلق پاس قوت پائی اور غالب ہُوا۔" (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۸) بائبل کے شارحین کشتی لڑنے والے کو فرشتہ کہتے ہیں گو اس کا کوئی ثبوت نہیں دیتے بہرحال وہ فرشتہ ہو یا خدا تعالیٰ کو عالم تمثیل میں انہوں نے دیکھا ہو۔ اس نے حضرت یعقوبؑ کو اسرائیل کا نام دیا۔ اور اس کے معنے بھی بتا دیئے کہ خدا تعالیٰ اور مخلوق کے نزدیک وہ قوی سمجھا گیا اور غالب ہُوا پس اسرائیل کے معنے بائبل کے بیان کے مطابق خدا کا قوی بندہ یا خدا کا غالب بندہ ہیں لغت کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ خدا کے جنگجو بہادر یا قوی سپاہی کے ہیں یا فرمانبردار کے ہیں بہرحال حضرت یعقوبؑ کو رؤیا یا کشف میں اسرائیل کا نام دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے ان کی اولاد بنو اسرائیل کہلائی۔

بنو اسرائیل اور یہودی

گو اس آیت میں یہودی کا لفظ استعمال نہیں ہُوا لیکن قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں یہودی یا اس کی جمع ھُود کا لفظ استعمال ہُوا ہے اور مناسب ہے کہ ان دونوں لفظوں کا فرق بھی بتا دیا جائے تا معلوم ہو سکے کہ بنو اسرائیل کا لفظ کس موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور یہودی

کا لفظ کس موقعہ پر استعمال ہوتا ہے۔

بنو اسرائیل کا لفظ قرآن کریم میں اڑتیس جگہ استعمال ہوا ہے اور یہودی کا لفظ نو جگہ اور ھود یہود کی جمع کے معنوں میں تین دفعہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی یا ھُود جہاں بھی استعمال ہوا ہے مذہب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے اور بنو اسرائیل کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے قوم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی جہاں حضرت یعقوب کی نسل کی طرف اشارہ مقصود ہے وہاں تو بنی اسرائیل کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو اپنے آپ کو موسیٰ کے پیرو کہتے تھے وہاں یہودی یا ھُود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ ھُود کا لفظ جن تین جگہ پر استعمال ہوا ہے اس کے ساتھ نصاریٰ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ گویا یہودی مذہب اور نصرانی مذہب کے متبعین کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح یہود کا لفظ جن نو مقامات میں استعمال کیا گیا ہے ان میں سے بھی آٹھ مقامات میں نصاریٰ کے مقابل پر استعمال کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ وہاں اسرائیلی قوم مراد نہیں بلکہ موسوی مذہب مراد ہے۔ باقی ایک مقام میں نصاریٰ کا لفظ ساتھ استعمال نہیں۔ یعنی مائدہ رکوع $\frac{9}{14}$ میں۔ اس کی بھی سب آئتیں واضح طور پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ اس جگہ یہودی مذہب کے پیروؤں کا ذکر ہے نہ کہ کسی نسل کے لوگوں کا کیونکہ اس میں عقائد پر بحث ہے۔ اس کے بالمقابل بنی اسرائیل کا لفظ جہاں بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے موسوی قوم پر دلالت کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کے کسی ایک مقام پر بھی اسے نصاریٰ کے مقابل پر استعمال نہیں کیا گیا۔

اس امتیاز کی وجہ سے جہاں تو بنی اسرائیل کا لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایسے لوگ بھی مخاطب ہو سکتے ہیں جو یہودی مذہب تو چھوڑ چکے ہوں لیکن ہوں حضرت یعقوبؑ کی نسل سے۔ مثلاً ان میں سے عیسائی یا مسلمان ہو جانے والے لوگ اسی طرح جہاں یہود یا ھود کا لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایسے لوگ بھی شامل سمجھے جا سکتے ہیں جو بنی اسرائیل سے تو نہ ہوں لیکن موسوی مذہب کو مانتے ہوں۔

لفظ بنو اسرائیل اور یہودی کے استعمال میں فرق۔

شائد کسی کو یہ شبہ گزرے کہ یہودی لوگ تو اپنے مذہب میں کسی کو داخل نہیں کرتے اس لئے جہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے بعض نصرانی یا مسلمان ہو گئے ہوں وہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ کوئی غیر اسرائیلی یہودی مذہب میں داخل ہو گیا ہو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بنی اسرائیل موسوی مذہب کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے تھے مگر اس میں بعض مستثنیات بھی تھے اور بعض قسم کے لوگوں کو یہودی مذہب میں شامل کرنے کی اجازت بھی ہوتی تھی مثال کے طور پر یہودیوں کے غلام یا ان کے ملک میں آ کر اور ان کے تابع ہو کر بسنے والے لوگوں کو یہودی مذہب قبول کرنے کی اجازت ہوتی تھی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب خروج میں لکھا ہے کہ "اور اگر کوئی بیگانہ تمہارے ساتھ مقیم ہو۔ اور خداوند کی فسح کیا چاہے (یعنی یہود کی تہواروں میں شامل ہونا چاہے) تو اس کے سب مرد اپنا ختنہ کروائیں۔ تب وہ نزدیک آئے اور فسح کرے۔ اور اب وہ گویا تمہاری زمین میں پیدا ہوا ہے کیونکہ نامختون انسان اسے نہ کھائے گا۔ وطنی اور بیگانے کی جو تمہارے بیچ میں ہے ایک شریعت ہوگی" (خروج باب ۱۲ آیت $\frac{48}{49}$)
ان آیات سے ظاہر ہے کہ موسوی شریعت گو اپنے آپ کو بنی اسرائیل سے مخصوص قرار دیتی ہے لیکن سوسائٹی میں یک جہتی قائم رکھنے کے لئے اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ جو لوگ بنی اسرائیل کے درمیان آ کر بس جائیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک حکومت کا جزو بننا چاہیں وہ موسوی شریعت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

لفظ بنی اسرائیل کا اطلاق ان لوگوں پر جو حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہوں۔ خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی یا مسلمان۔

اسی طرح استثنا باب ۲۳۔ آیت ۳ تا ۸ میں ان قوموں کی لسٹ بتائی ہے۔ جن کے افراد بعض قیود کے ماتحت یہودی نظام میں شامل ہو سکتے ہیں۔

یسعیاہ میں لکھا ہے "اور بیگانے کی اولاد بھی جنہوں نے اپنے آپ کو خداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اس کی بندگی کریں

اور خداوند کے نام کو عزیز رکھیں۔ اور اس کے بندے ہو ویں وے سب جو سبت کو حفظ کر کے اسے ناپاک نہ کریں۔ اور میرے عہد کو لئے رہیں۔ میں ان کو بھی اپنے مقدس پہاڑ پر لاؤنگا۔ اور اپنی عبادت گاہ میں انہیں شادمان کرونگا اور ان کی سوختنی قربانیاں اور ان کے ذبائح میرے مذبح پر مقبول ہونگے کیونکہ میرا گھر ساری قوموں کی عبادت گاہ کہلائیگا۔" (باب ۵۶ آیت ۶-۷) عہد کو قائم رکھیں سے اس جگہ مُراد ختنہ کرانا ہے کیونکہ عہد ابراہیمی کی علامت ختنہ کو قرار دیا گیا تھا اِس کی تائید استثناء باب۱۲ کے مذکورہ بالا حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔

مشہور یہودی عالم جوزیفس لکھتا ہے کہ مذہب بدل کر یہودی بننے والا شخص وہ ہے جو یہودی رسموں کو اختیار کرے اور جو یہودی قانون کی اتباع کرتے ہوئے اور خدا تعالیٰ کی اس رنگ میں عبادت کرتے ہوئے کہ جس رنگ میں کہ یہود عبادت کرتے ہیں (یہودی ہو جائے) (جُوِش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۰)

بنی اسرائیل کے علاوہ دوسرے لوگوں کو موسوی مذہب میں داخل ہونے کی اجازت

بائبل سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ عملاً بھی بعض لوگ موسوی مذہب کو قبول کر لیتے تھے چنانچہ بائبل کی ایک کتاب روت نامی ہے یہ روت جس کا اس میں ذکر ہے۔ موآبی لڑکی تھی جو ایک اسرائیلی سے بیاہی گئی اور اس نے موسوی مذہب کو قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح عزرا باب ۴ آیت ۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسوری لوگ جو فلسطین میں بس گئے تھے انہوں نے بھی یہودی طریقہ کو اختیار کر لیا تھا تاریخ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ رومی مورخین ٹیسیٹس (Tacitus) ڈیوکیسیس (Diocassious) اور ہوریس (Horece) وغیرہم نے اپنی کتب میں ان رومیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے یہودی مذہب کو قبول کر لیا تھا (جُوِش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۰) اسلامی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے عربوں میں سے بھی بعض لوگوں نے یہودی مذہب کو اختیار کیا ہوا تھا۔ چنانچہ کعب بن اشرف مشہور دشمن اسلام جس نے معاہدین میں شامل ہونے کے باوجود دشمنانِ اسلام کو مدینہ پر چڑھائی کے لئے اکسایا تھا اور مسلمانوں کے قتل کے منصوبے کئے تھے اور اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا تھا ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کا باپ بنو نبہان قبیلہ کا عرب تھا ایک شخص اسکے ہاتھ سے قتل ہو گیا اور وہ بھاگ کر مدینہ آ گیا وہاں اس نے یہودی قبیلہ بنو نضیر سے معاہدہ کر لیا اور اسی قبیلہ کی ایک لڑکی عقیلہ بنت ابی الحقیق سے شادی کر لی اور اس طرح یہودیوں میں شامل ہو گیا آگے اس کا بیٹا کعب بھی یہودی المذہب رہا (زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸ زیر عنوان قتل کعب ابن الاشرف)

اسی طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشرکین مدینہ نذر کے طور پر اپنی اولاد کو یہود میں داخل کرنے کا اقرار کر لیتے تھے اور وہ بڑے ہو کر یہودی مذہب کے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے "کَانَتِ الْمَرْأَةُ تَكُوْنُ مِقْلَاةً فَتَجْعَلُ عَلٰى نَفْسِهَا اِنْ عَاشَ لَهَا وَلَدٌ اَنْ تُهَوِّدَهٗ فَلَمَّا اُجْلِيَتْ بَنُو النَّضِيْرِ كَانَ فِيْهِمْ مِنْ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ فَقَالُوْا لَا نَدَعُ اَبْنَاءَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ کہ مدینہ کی عورتوں میں سے جب کسی عورت کے بچے بچپن میں ہی فوت ہو جاتے تو وہ نذر مان لیتی کہ اگر اس کا بچہ بچ جائے تو وہ اس کو یہودی مذہب میں داخل کر دیگی۔ چنانچہ جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا۔ تو ان میں انصار مدینہ کے ایسے بچے تھے جن کو یہودی بنایا گیا تھا۔ تو انصار نے ان کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کیا۔ اس وقت یہ آیت لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل ہوئی کہ مذہب کے بارے میں کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یُکرہ علی الاسلام)

موسوی مذہب کے بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہونے کے معنے۔

خلاصہ یہ کہ موسوی مذہب کے بنی اسرائیل کیلئے مخصوص ہونے کے یہ معنے نہیں کہ کوئی غیر اسرائیلی کبھی یہودی ہو ہی نہ سکتا تھا بلکہ خود حضرت موسیٰ کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق غلام یا تابع رہنے والے لوگ اگر موسوی دین پر عمل کریں اور ختنہ

کرالیں تو وہ موسوی مذہب میں داخل ہو سکتے تھے موسوی مذہب کے اسرائیلیوں تک مخصوص ہونے کے صرف یہ معنے ہیں کہ یہ مذہب تبلیغی نہیں اور انہیں حکم نہیں کہ دوسری قوموں میں جاکر تبلیغ کریں اور اس میں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص ترقیات کے وعدے ہیں وہ اسرائیلیوں کے لئے ہیں دوسری اقوام کو طفیلی اور تابع کے طور پر اگر کامل طور پر ان سے مل جائیں حصہ دیا جا سکتا ہے برخلاف اسلام کے کہ اس کے پیروؤں کو تبلیغ کرنے اور استثنائی طور پر نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ کے طور پر ساری دُنیا میں اسلام پھیلانے کا حکم ہے اور اس میں داخل ہونے والوں سے کوئی وعدہ نہیں جو صرف عربوں سے مخصوص ہو بلکہ ہر وعدہ اپنی انتہائی صورت میں اسی طرح غیر عربوں کے لئے ہے جس طرح کہ عربوں کے لئے۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ موسوی دین کے تابع لوگوں کو استثنائی صورتوں میں غیر اسرائیلیوں کو بھی اپنے دین میں شامل کرنے کی اجازت تھی اور محدود تعداد غیر قوموں کی ان میں شامل بھی ہوتی رہتی تھی اس لئے ضروری تھا کہ بنی اسرائیل کے سوا ان کا کوئی اور نام بھی ہوتا جس کے ذریعہ سے اس کے افراد کی قوم کی طرف نہیں بلکہ مذہب کی طرف نسبت ثابت کی جاتی۔ اس غرض کو پُورا کرنے کے لئے آہستہ آہستہ یہودی کے لفظ کو اختیار کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب زمانہ میں چونکہ ایسے لوگ بہت کم تھے جو باوجود غیر اسرائیلی ہونے کے یہودی مذہب قبول کریں انہیں اپنے اندر رہنے والے غیر یا بیگانہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا مگر جب حضرت داؤد علیہ السلام کے ذریعہ سے بنی اسرائیل میں حکومت آگئی اور ان کی حکومت کا حلقہ وسیع ہو گیا اور غیر قومیں اسرائیلیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور اسرائیلی حکومت تلے بسنے والوں میں سے ایک خاصے طبقے نے موسوی مذہب اختیار کر لیا تب یہ ضرورت بشدت محسوس ہوئی کہ اسرائیل کے سوا کوئی اور نام بھی ہو جو ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہو۔

اس نام کا انتخاب بعض سیاسی حالات نے خود ہی کر دیا اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا لڑکا ایک دُنیا دار آدمی تھا اس کی تخت نشینی پر بنی اسرائیل کے سردار اس کے پاس ملنے آئے اور اس سے قانون میں بعض نرمیاں کرنے کی درخواست کی اس پر اس نے اپنے نوجوان دوستوں کے مشورہ سے انہیں سخت جواب دیا اور دھتکار کر دربار سے رخصت کر دیا اس پر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے دس کے سرداروں نے دربار سے باہر نکلتے ہی بغاوت کا فیصلہ کر لیا اور رحبعام بن سلیمان سے باغی ہو گئے اور رحبعام کے ماتحت صرف یہود کا علاقہ (جسے اب فلسطین کہتے ہیں) اور یہودا اور بن یامین دو قبیلوں کے آدمی رہ گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت داؤد یہودا کے قبیلہ میں سے تھے اور بن یامین کے قبیلہ میں وہ پیدا ہوئے تھے اور انہیں کی مدد سے انہوں نے پہلے یہودا قبیلہ کے علاقہ کو اور پھر باقی اسرائیل کے علاقہ کو فتح کیا تھا (زیر لفظ داؤد جیوش انسائیکلوپیڈیا) پس ان دونوں قبیلوں میں آپس میں بہت جوڑ تھا اور اس بغاوت کے وقت میں وہ اکٹھے رہے۔

بنی اسرائیل کے علاوہ لفظ یہود کو اختیار کرنے کی وجہ۔

اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسرائیلیوں کی دو حکومتیں ہو گئیں ایک اس وجہ سے کہ حضرت داؤد یہودا قبیلہ میں سے تھے (۱۔تواریخ باب ۳ و ۹ تا ۱۵ نیز متی باب ۱ آیت ۲ و لوقا باب ۳ آیت ۳۳) اور یہودا کے علاقہ میں بستے تھے یہودیہ کہلائی اس میں یہودا اور بن یامین قبائل کے افراد شامل تھے (۲۔تواریخ باب ۱۱ آیت ۱) اور دوسری اس وجہ سے کہ اسرائیل کے اکثر قبائل اس میں شامل تھے اسرائیل کی حکومت کہلائی یہودیہ حکومت کا زور فلسطین میں تھا تو اسرائیل کی حکومت کا شمالی فلسطین اور مغربی شام کی طرف۔ اس اختلاف کے بعد اسرائیل کی حکومت متواتر بُت پرستی کی طرف راغب ہوتی گئی اور تورات کے علماء اسے چھوڑ کر یہودیہ کی طرف بھاگ آئے اور موسوی مذہب کا گڑھ یہودیہ کی حکومت بن گئی جو آہستہ آہستہ موسوی مذہب کی واحد علمبردار ہو گئی چنانچہ پہلے

تو اسرائیل کے حکومت کے باشندوں اور یہودیہ کی حکومت کے باشندوں میں فرق کرنے کے لئے یہودیہ کے باشندوں کو یہودی کہا جانے لگا لیکن جوں جوں مذہبی اختلاف کی خلیج بڑھتی گئی یہودی کا لفظ مقام رہائش کو بتانے کی بجائے مذہب کو بتانے کے لئے استعمال ہونے لگا اور عزیر اور نحمیاہ دو نبیوں کے ذریعہ سے جب یہودیہ دوبارہ بسایا گیا اور مذہب موسوی کی باگ ڈور کلی طور پر یہوداہ کے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تو یہودی کا لفظ نسلی امتیاز یا مقام رہائش کے معنوں سے بالکل الگ ہو کر مذہب (موسوی کے پیرو) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا کیونکہ اس زمانہ سے موسوی مذہب کا احیاء صرف یہوداہ کے لوگوں کے ذریعہ سے ہی ہوتا تھا اور جب یہ لفظ خالص مذہبی معنوں میں استعمال ہونے لگا تو اس کا اطلاق ان غیر اسرائیلی لوگوں پر بھی کیا جانے لگا جو نسلاً تو اسرائیلی نہ تھے لیکن مذہبًا موسوی مذہب کے پیرو تھے۔ پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں جبکہ اسرائیلیوں کا ایک حصہ حضرت مسیح پر ایمان لے آیا تو اسرائیلیوں کی بھی دو اقسام ہو گئیں ایک تو یہودی مذہب پر تھے اور دوسرے جو مسیحی تھے اسلام نے آکر اسرائیلیوں میں سے بعض کو مسلمان بنا لیا اور اس طرح ایسے اسرائیلی بھی ہو گئے جن کا مذہب اسلام تھا۔

قرآن کریم پر اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگانے والوں کا جواب۔

خلاصہ یہ کہ یہودیہ کے رہنے والوں میں چونکہ موسوی مذہب نے فروغ پایا اور تمام بڑے انبیاء وہیں پیدا ہوئے یا اسی سے تعلق رکھتے تھے جیسے یرمیاہ حزقیل دانئیل عزرا نحمیاہ وغیرہم۔ اور اسرائیلی حکومت میں بُت پرستی رائج ہو گئی۔ یہودیہ کی حکومت کے توابع یہود کے نام سے مشہور ہوئے اور چونکہ اس زمانہ میں بہت سے غیر اسرائیلی بھی موسوی مذہب میں داخل ہوئے۔ مذہب موسوی رکھنے والوں کا نام قوم سے ممتاز کرنے کے لئے یہودی ہو گیا۔ اور اسلام سے چند صدی پہلے یہودی کے معنے موسوی مذہب رکھنے والے کے ہو گئے۔ مگر چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وعدے جو دُنیاوی عزت اور اعلیٰ روحانی

لفظ یہود کے استعمال کی ابتداء اور اس کے معنے کی وسعت۔

مراتب سے متعلق تھے ان کی نسلوں سے خاص تھے بنی اسرائیل کا لفظ الگ طور پر قومی امتیاز کو بتانے کے لئے قائم رہا۔

مینے کسی قدر تفصیل سے یہ امر اس لئے بیان کیا ہے تا یہ بتاؤں کہ قرآن کریم جس پر یہودی مذہب اور اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگایا جاتا ہے اس امتیاز کو صحیح طور پر بیان کرتا ہے یعنی جہاں مذہب کا سوال ہوتا ہے یہودی کا لفظ استعمال کرتا ہے لیکن جہاں ان قومی وعدوں کا ذکر کرتا ہے جو آل ابراہیم یا آل موسیٰ یا آل داؤد سے خاص تھے یا موسوی انبیاء کے مخاطبین کا ذکر کرتا ہے وہاں یہودی کا لفظ استعمال نہیں فرماتا بلکہ بنی اسرائیل کا لفظ استعمال فرماتا ہے کیونکہ وہ وعدے موسوی دین اختیار کرنے والوں سے نہ تھے بلکہ ان بنی اسرائیل سے تھے جو خدا تعالیٰ کے عہد کو قائم رکھیں خواہ موسوی دین پر ہوں خواہ اس کے بعد آنے والے کسی اور الٰہی دین پر ہوں جیسے کہ مسلمان ہونیوالے بنی اسرائیل مگر لطیفہ یہ ہے کہ اس کے برخلاف ان معترضین کا جو قرآن کریم پر اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں یہ حال ہے کہ ان کی مذہبی کتب تک اس بارہ میں غلطی کر جاتی ہیں چنانچہ اناجیل نے بھی اس بارہ میں غلطی کی ہے مثلاً مسیح علیہ السلام کی نسبت لکھا ہے "یہودیوں کا بادشاہ" چنانچہ لکھا ہے کہ پیلاطوس نے مسیح علیہ السلام سے پوچھا "کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے یسوع نے اس سے کہا ہاں تو سچ کہتا ہے" (متی باب۲۷ آیت۱۱ مرقس باب۱۵ آیت۲ و لوقا باب۲۳ آیت۳) اس بادشاہت کے دعویٰ کی بُنیاد ذکریاہ نبی کی کتاب پر ہے اس میں لکھا ہے "اے صیحون کی بیٹی تو نہایت خوشی کر اے یروشلم کی بیٹی تو خوب للکار کر دیکھ تیرا بادشاہ تجھ پاس آتا ہے" (ذکریاہ باب۹ آیت۹) اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ذکریاہ نے ایک اسرائیلی بادشاہ کی خبر دی ہے جو یروشلم کو پھر اس کی سابق شوکت پر لائے گا پس اس سے مراد اسرائیلیوں کا بادشاہ ہے نہ یہود کا بادشاہ چنانچہ یوحنا باب۱ آیت۴۹ میں لکھا ہے "تو اسرائیل کا بادشاہ ہے" اور یہی درست ہے کیونکہ موسوی سلسلہ کے ترقی کے وعدے

بنی اسرائیل سے مخصوص تھے نہ کہ ہر یہودی مذہب کو قبول کرنے والے سے۔ اسی طرح حضرت مسیح کا خطاب صرف بنی اسرائیل سے تھا چنانچہ لکھا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب اپنے مریدوں کو تبلیغ کے لئے بھجوایا تو کہا کہ "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا" (متی باب۱ آیت۵) یاد رہے کہ سامری مخلوط نسل کے آدمی تھے اور اکثر ان میں سے یہودی باپوں کی نسل میں سے تھے اور تورات کو مانتے تھے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ جب سامریوں تک سے علیحدہ رہنے کا حکم مسیح نے دیا تو جو بالکل غیر قومیں ہیں ان کا کیا ذکر ہے۔

یہ غلطی مسیحیوں کو ایسی چمٹی ہے کہ آج تک وہ اس غلطی میں مبتلا ہیں چنانچہ آج جرمنی اور بعض دوسرے یورپین ممالک میں اسرائیلی نسل کے خلاف جو جوش پیدا ہے اس میں یہی کہا جاتا ہے کہ "یہودیوں" کو ملک سے نکال دو اور اس سے انکی مراد یہ نہیں ہوتی کہ جو موسوی مذہب کے تابع ہیں ان کو ملک سے نکال دو بلکہ یہ مخالفت ان لوگوں کے خلاف بھی ہے جو نصرانی مذہب اختیار کر چکے ہیں حالانکہ وہ بنی اسرائیل تو بیشک ہیں مگر یہودی کسی صورت میں بھی نہیں کیونکہ اپنا مذہب تبدیل کر چکے ہیں جرمنی میں تو یہ جوش اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ جن لوگوں کی رگوں میں کسی اسرائیلی عورت کا خون بھی ہے اسے بھی ملک کا دشمن قرار دیا جاتا ہے لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ یہ یہودی ہیں یا یہودی خون ان کے اندر ہے حالانکہ نہ وہ یہودی مذہب کے پابند ہیں اور نہ ان ماؤں کا مذہب یہودی تھا جنکی وہ اولاد ہیں بلکہ ان کی مائیں بھی مسیحی تھیں اور ان کی نسل بھی مسیحی ہے۔

غرض اس علمی زمانہ میں بھی کہ جسکی علمی ترقی پر یورپ کو اس قدر ناز ہے اسرائیلی اور یہودی کے فرق کو بالکل نہیں سمجھا جاتا لیکن قرآن کریم نے تیرہ سو سال پہلے اس فرق کو تسلیم کیا ہے اور جہاں جہاں نسلی ترقی کے وعدوں کا ذکر ہے یا نبیوں کے خطاب کا ذکر ہے ہاں بنی اسرائیل کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں صرف مذہب کا ذکر ہے وہاں یہودی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ آیات زیر تفسیر میں چونکہ ان وعدوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے یا ان وعدوں کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ابراہیمی نسل سے تھے اس لئے ان آیات میں اور ان کے بعد کی آیات میں ہر جگہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کہا گیا ہے ایک جگہ بھی یہودی کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ زائد کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف اپنی نعمت نہیں جتائی بلکہ اس سے زائد مضمون کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق جب حروف یا الفاظ میں زیادتی کی جائے تو وہ جدید یا زائد مضمون پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے پس اس آیت میں اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ وہ نعمت ہے جو تمہاری قوم کے لئے خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی نعمتیں

اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی نعمتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو عام ہیں مومن و کافر کو مل رہی ہیں جیسے ہوا پانی آگ خوراک وغیرہ لیکن ایک ایسی نعمتیں وہ ہیں جو خاص شرائط پورا کرنے والے مقربوں کو ملتی ہیں یا خاص وعدوں کے مطابق نازل ہوتی ہیں اگر تو عام نعمتوں کا ذکر ہوتا جو خاص وعدہ کے مطابق نہیں ملتیں بلکہ ہر کافر و مومن پر نازل ہوتی ہیں تو خالی اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ کہنا کافی تھا لیکن اس جگہ اول تو نِعْمَتِيَ کا لفظ مفرد رکھا گیا ہے جس سے خاص نعمت مراد ہے اور پھر اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ بڑھائے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ نعمت تم پر خاص تھی دوسرے لوگ دنیا کے اس میں شامل نہ تھے۔

بنی اسرائیل کو ملنے والی نعمت کیا تھی؟

یہ نعمت کیا ہے؟ اسے ہم قرآن کریم سے ہی دیکھتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ

اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(مائدہ ع۴) یعنے یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ
اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ اس نے تم
میں بہت سے انبیاء مبعوث فرمائے اور تم کو بادشاہ بنایا
اور تم کو وہ کچھ دیا جو اور کسی کو جہانوں میں سے نہ دیا تھا۔ یہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو انہوں نے اس وقت
بنی اسرائیل سے کہا تھا جب وہ ارضِ مقدسہ کے قریب پہنچ
گئی تھی اور اس میں داخل ہونے کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ ظاہر
ہے کہ اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کی قوم بادشاہ نہ بنی تھی بلکہ ابھی
تک جنگلوں میں سرگردان پھر رہی تھی اس سے پہلے بھی کسی زمانہ
میں وہ بادشاہ نہ بنی تھی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے
حضرت یوسفؑ تک ان میں سے کوئی بادشاہ نہ ہوا تھا اور
حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد تو وہ مصر میں غلام ہو کر رہی
تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسے اس غلامی سے
نکالا گیا لیکن بادشاہت اب تک اسے نصیب نہ ہوئی تھی صرف
اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ارضِ مقدسہ میں اسے بادشاہت دی
جائے گی اور جیسا کہ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے اس قول تک
وہ ارضِ مقدسہ میں داخل نہ ہوئی تھی پس جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا
سے یہ مراد نہیں کہ تم کو گزشتہ زمانہ میں بادشاہ بنایا گیا تھا بلکہ
صرف یہ مراد ہے کہ تم کو بادشاہ بنانے کا خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا
ہے اور چونکہ ساری آیت میں مضمون کا ایک ہی سلسلہ پیش
کیا گیا ہے اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ بھی خدا تعالیٰ
کے آیندہ وعدے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس میں
سابق انبیاء کا ذکر نہیں۔ اور مطلب اس قول کا یہ ہے کہ
خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کو یاد کرو جو اس نے تم سے کیا ہے
کہ وہ تم میں سے کثرت سے نبی بنائے گا اور تم کو بادشاہ بنائے گا
اور تم کو وہ کچھ دے گا جو اور کسی قوم کو نہیں دیا گیا گویا سابق
شوکت کا ذکر نہیں بلکہ آیندہ ملنے والی شوکت کا ذکر ہے اور
ماضی کے الفاظ حتمی وعدہ کے لحاظ سے استعمال کئے گئے ہیں
نہ اس لئے کہ ایسا گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے اس وعدہ کو یاد

بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کرنے سے مراد ان کو بادشاہ بنانا اور ان میں انبیاء کا مبعوث کرنا تھا۔

بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کا وعدہ حضرت ابراہیم کے زمانہ سے شروع ہوا۔

دلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو ارضِ مقدسہ میں داخل
ہونے کا حکم دیا اور بتایا کہ وہ وعدہ ارضِ مقدسہ میں داخل
ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے پس تم ارضِ مقدسہ کو فتح
کرنے میں دیر نہ کرو تا کہ اس وعدہ کا ظہور شروع ہو جائے۔

آیندہ زمانہ کے واقعات نے اس وعدہ کے پورا ہونے
کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا اور بنی اسرائیل میں کثرت سے نبی
آئے اور ان کو بادشاہ بنا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے
ایک لمبے سلسلہ کے ذریعہ سے ان پر پے در پے روحانی
علوم کھولے جس کی مثال اور کسی گزشتہ قوم میں نہیں ملتی۔

یہ وعدہ کب ہوا: بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس وعدہ کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع
ہوئی بائبل میں لکھا ہے "تب اس نے اسے (ابراہیم کو)
کہا کہ میں خداوند ہوں جو تجھے کسدیوں کے اُور سے نکال
لایا کہ تجھ کو یہ ملک میراث میں دوں" (پیدائش باب ۱۵ آیت ۷)
اس کے آگے اسی باب میں بتایا ہے کہ یہ وعدہ اس طرح پورا
ہوگا کہ پہلے ان کی قوم ایک اور ملک میں جا کر غلام بنے گی اور
چار پشت بعد ان کو وہاں سے نکالا جائے گا وہاں سے نکالا
جانے کے بعد وہ فلسطین کی بادشاہ بنے گی یہ وقفہ اس لئے
پڑے گا کہ اموری جو فلسطین میں بستے ہیں ابھی تک ان کے
گناہ اس حد کو نہیں پہنچے کہ ان کو سزا دے کر اس ملک سے نکالا
جائے۔ اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ پہلے وعدہ ابراہیم علیہ السلام
سے کیا گیا تھا اور اس کے پورا ہونے کا وقت وہ بتایا گیا
تھا جب بنی اسرائیل مصر میں غلام بن کر رہنے کے بعد وہاں
سے نکلیں گے اور یہ زمانہ جیسا کہ بائبل تاریخ اور قرآن کریم
سے ثابت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ پس ان آیات
میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو قول بتایا گیا ہے اس میں حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہا جا سکتا
ہے کہ اس وعدہ میں بادشاہت کا تو ذکر ہے مگر نبوت کا ذکر
نہیں مگر بائبل کے دوسرے مقامات کو ملا کر اس حصہ کا بھی پتہ
لگ جاتا ہے۔ چنانچہ سترھویں باب میں لکھا ہے "اور میں

اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ مَیں تجھے نہایت بڑھاؤ نگا تب ابراہیم مُنہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہوکر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا (جس کا عربی تلفظ ابراہیم ہے) کیونکہ مَیں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا اور میں تجھے بہت برومند کرتا ہوں اور قومیں تجھ سے پیدا ہونگی اور بادشاہ تجھ سے نکلینگے اور مَیں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہو کرتا ہوں کہ مَیں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہونگا۔ اور مَیں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے مِلک ہو اور مَیں ان کا خدا ہونگا۔“ (باب ۱۷ آیت ۲ تا ۸) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے دو وعدے کئے تھے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی قوم کو کنعان میں داخل کرے گا اور اس کے بعد (۱) انہیں وہاں کا بادشاہ کرے گا (۲) دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کا خدا ہوگا۔ خدا ہونے کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہاں روحانی ترقیات کا وعدہ ہے کیونکہ بادشاہت میں دنیاوی ترقیات کا وعدہ آچکا تھا۔

اوپر کے حوالہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بائبل کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد آئندہ زمانہ میں کنعان میں آئے گی اور ان کو بادشاہت اور اعلیٰ روحانی ترقیات عطا ہونگی۔ یہ وعدہ بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بھی دُہرایا گیا ہے لیکن ابتداءً اس کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے ہی کیا گیا تھا پس سورۃ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت میں جس نبوت اور بادشاہت کے دیئے جانے کا ذکر ہے وہی موعود بادشاہت اور نبوت ہے اور آیت زیر تفسیر میں نعمت سے مُراد وہی نعمت مراد ہے جس کا ذکر سورۃ مائدہ میں ہے اور جس کا ثبوت بائبل سے میں پیش کر چکا ہوں اس نعمت کو یاد دلا کر یہ اشارہ کیا ہے کہ انعام نبوۃ آدم پر ختم نہیں ہو چکا بلکہ بنی اسرائیل میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ ایک لمبا سلسلہ نبوت کا جاری رہا ہے۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کے مذکور وعدہ کا ذکر بائبل میں

قرآن کریم میں بھی اسی سورۃ میں اس موعود نعمت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں کیا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ ع ۱۵) یعنی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی بعض کلمات کے ذریعہ سے آزمائش کی تو ابراہیم نے ان احکام الٰہی کو پورا کر دیا اسپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں تجھے لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں تب ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام بنایا جائے اسپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام بنانے یعنی اولوالامر نبی کے درجہ پر فائز کرنے کا وعدہ فرمایا (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی نسبت بھی اس وعدہ کی توسیع کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے مشروط وعدہ فرمایا یعنے وعدہ کیا کہ تمہاری اولاد میں سے بعض اس عہد سے حصہ پائینگے مگر حصہ پانے والے وہی ہونگے جو قومی ظلم کے ذریعہ سے اپنے آپ کو محروم نہ کر چکے ہوں۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ اس جملہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گو آخری قوم جس میں الہام کا سلسلہ دیر تک جاری رہا بنی اسرائیل کی قوم تھی لیکن ان سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ مشروط تھا جب تک بنی اسرائیل اس وعدہ کے مستحق رہے اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرتا رہا مگر جب بنی اسرائیل کلی طور پر اس عہد کے انعامات کے ناقابل ہوگئے تو لازماً وہ عہد دوسری طرف

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْ میں اس طرف اشارہ کہ بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ مشروط تھا۔

منتقل ہو گیا۔ اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا ذکر آ چکا ہے وہ وعدہ یہ تھا کہ ان کی اولاد میں بھی نبی ہونگے مگر جب ان کی اولاد کا کوئی حصّہ ظالم ہو جائے گا تو پھر وہ اس عہد کا مستحق نہیں رہے گا اور عہد اولاد کے دوسرے حصّہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

خدا تعالیٰ کے تمام نعمت کا وعدہ مشروط ہونے کا ذکر بائبل میں۔

بائبل میں بھی اس عہد کے مشروط ہونے کا ذکر ہے پیدائش باب ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "پھر خدا نے ابرا ہام سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۹ تا ۱۱) "اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا" (آیت ۱۴)

حضرت ابراہیم کے واسطہ سے انکی اولاد سے خدا تعالےٰ کے دو وعدے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اولاد کی نسبت جو عہد کیا گیا تھا وہ مشروط تھا اور اس کی ظاہری علامت ختنہ تھا اور صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اولاد میں سے جو اس عہد کی پابندی نہ کریں گے خدا تعالیٰ کا عہد بھی ان سے کوئی نہ رہے گا اور ان کو وہ انعامات نہ ملیں گے جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے وعدہ کیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ اس وعدہ میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ یہ اس عہد کا "نشان" ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بندہ کی طرف سے عہد ختنہ کا نہیں بلکہ عہد اور ہے ہاں اس کا ظاہری نشان ختنہ ہے یہود نے اس کو نہ سمجھا اور صرف ختنہ پر خوش ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ صرف کسی ایک حکم پر عمل کر کے خوش نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ اس کے ذریعہ سے انہوں نے عہد کا اپنا حصّہ پورا کر دیا ہے۔ اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا یہ حکم پہنچاتے ہیں "پر اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو اور میری سنتوں کو حقیر جانو یا تمہارے دل میری عدالتوں کو ناپسند کریں ایسا کہ تم میرے حکموں پر عمل نہ کرو اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ویسا ہی کرونگا اور خوف اور سل اور تپ سوزاں کو تمہارے اوپر غالب کراؤنگا جس سے تمہاری آنکھیں پھوٹیں اور دل دُکھیں اور تم اپنے بیج بے فائدہ بوؤگے اس لئے کہ تمہارے دشمن اسے کھائیں گے **اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا**" (احبار باب ۲۶ آیت ۱۴ تا ۱۷) (آخری الفاظ کو عہد کے ان الفاظ کے ساتھ ملا کر دیکھنا چاہیئے کہ میں تیرا اور تیری نسل کا خدا ہونگا) اس حوالہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ختنہ صرف ایک ظاہری نشان تھا ورنہ اصل عہد جسکی پابندی کی حضرت ابراہیم کی اولاد سے توقع کی گئی تھی یہ تھا کہ وہ دل کے پاک ہوں خدا تعالےٰ کی سنتوں پر مطمئن ہوں اور اس کے سب احکام پر عمل کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے نبیوں نے بھی اس مضمون کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ یرمیاہ نبی بنی اسرائیل کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں "اسرائیل کے سارے گھرانے کے دل نامختون ہیں" (باب ۹ آیت ۲۶) اسی طرح فرماتے ہیں "دیکھ وے دن آتے ہیں خداوند کہتا ہے کہ میں ان سب کو جو مختون ہیں نامختون کے ساتھ سزا دُوں گا" (باب ۹ آیت ۲۵) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یرمیاہ نبی جسم کے مختون ہونے کو عہد کا پورا کرنا نہیں سمجھتے بلکہ دل کے مختون ہونے کو اصل ذریعہ عہد کے پورا کرنے کا قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطہ سے ایک معاہدہ اللہ تعالےٰ نے ان کی اولاد سے کیا تھا۔ اس معاہدہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے خدا رسیدہ لوگ پیدا کرے گا جو قرآن کریم کے بیان کے مطابق امام یعنی اولوالعزم نبی ہونگے اور دوسرے یہ کہ وہ انہیں کنعان کا ملک بطور میراث دے گا جس کے وہ بادشاہ

ہونگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وحی چونکہ اصل صورت میں محفوظ نہیں اس کا جس قدر حوالہ بائبل سے مل سکتا ہے بیشک اس میں ختنہ کی پوری تشریح نہیں مگر حضرت موسیٰ کی کتاب احبار اور یرمیاہ نبی کی وحی سے یقینی ثابت کر دیا ہے کہ ختنہ سے مراد صرف ظاہری ختنہ نہیں بلکہ اصل مراد دل کی صفائی اور کامل فرمانبرداری ہے جسمانی ختنہ اس کے لئے بطور علامت قرار دیا گیا ہے۔

اس تشریح کے مطابق آیت زیر تفسیر کے معنے یہ ہوئے کہ اے بنی اسرائیل یاد کرو کہ ہمارے تمہارے درمیان ایک عہد ہوا تھا اس عہد کا جو حصہ ہمارے متعلق تھا وہ ہم نے پورا کر دیا تم میں سے پے در پے نبی بھی بھجوائے اور بادشاہ بھی بنائے اور اس کے بالمقابل جو حصہ عہد کا تم سے تعلق رکھتا تھا وہ تم نے پورا نہ کیا اور تمہارے دل نامختون ہو گئے اور تم نے اپنے خدا کے حکموں کو بھلا دیا اور اسکے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں غیر اللہ کا خوف جاگزیں ہو گیا اگر تم اپنے حصہ عہد کو پورا کرو تو میں بھی پھر اپنے عہد کو تم سے پورا کرنے کو تیار ہوں لیکن تمہارا یہ امید کرنا کہ میں تو عہد کے اس حصہ کو پورا کرتا جاؤں جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے لیکن تم متواتر اس حصہ کو نظر انداز کرتے جاؤ جو تمہارے متعلق ہے درست نہیں۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہی عہد دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے پھر دُہرایا گیا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اسرائیلی قوم کی شریعت لانے والے تھے ان کے ذریعہ سے بھی یہ عہد دُہرایا گیا تھا۔ یہ عہد ایسا مشہور و معروف ہے کہ بائبل میں بیسیوں جگہ اس کا ذکر آتا ہے اور بار بار اسے عہد کے نام سے پکارا گیا ہے خروج باب ۲۰ میں وہ دس احکام جو حضرت موسیٰؑ کی معرفت دیئے گئے اور بنی اسرائیل کے ساتھ ایک نیا عہد باندھا گیا تفصیلاً درج ہیں۔ استثنا باب ۵۔ آیت ۲۔ اور باب ۱۸ آیت ۱۸ و ۱۹ کو ملا کر معلوم ہوتا ہے کہ سینا پہاڑ پر یا حورب پر جو نام کوہ سینا کا کتاب استثنا میں مستعمل ہے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بُلا کر دس حکم دیئے۔ اور بنی اسرائیل سے ایک نیا عہد باندھا (استثنا باب ۵۔ آیت ۲) اور کہا کہ اگر وہ ان احکام کے پابند ہیں تو میں انکی قوم کو زندہ رکھونگا اور ان کا بھلا ہوگا اور ارضِ مقدس پر ان کے قبضہ کی مہلت لمبی ہوتی چلی جائے گی (استثنا باب ۵ آیت ۳۳) جس وقت یہ احکام نازل ہو رہے تھے اور خدا تعالےٰ کا جلال کوہِ سینا یا حورب پر ظاہر ہو رہا تھا خطرناک بجلی چمک رہی تھی اور مہیب آوازیں آ رہی تھیں جسے دیکھ کر بنی اسرائیل جو خدا تعالیٰ سے عہد باندھنے کے لئے اپنے خیموں سے باہر نکل کر دامنِ کوہ میں کھڑے تھے ڈر گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم اس کلام کو نہیں سُنتے تو خدا سے سُنکر ہمیں سُنا دیا کر ہم ڈرتے ہیں کہ ہم اس کلام کو سُنکر کہیں مر نہ جائیں (خروج باب ۲۰ آیت ۱۹) اس پر خدا تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اچھا کہا ہے جب تک یہ ان احکام پر کاربند ہونگے برکت پائیں گے لیکن آیندہ جب کوئی نبی تیری مانند کھڑا کیا جائے گا (یعنی صاحبِ شریعت ہوگا) تو وہ ان کے بھائیوں میں سے ہوگا (یعنی ان میں سے نہ ہوگا) گو حضرت موسیٰ نے کہا ہے کہ تم میں سے تمہارے بھائیوں میں سے نبی کھڑا کیا جائے گا (استثنا باب ۱۸ آیت ۱۵) لیکن اوّل تو یہ خدا تعالیٰ کے اس کلام کے خلاف ہے جو اس نے موسیٰؑ سے کہا کیونکہ اس میں "تم میں سے" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ صرف یہی ہے کہ تیرے بھائیوں سے۔ دوم یہ فقرہ ہی بے معنی ہے کہ تم میں سے تمہارے بھائیوں میں سے جبکہ اس کلام کے سب بنی اسرائیل مخاطب تھے تو پھر تم میں سے کہکر تمہارے بھائیوں میں سے کہنا لغو تھا۔ جب بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا جائے گا کہ تمہارے بھائیوں سے نبی کھڑا کیا جائے گا۔ تو وہ بنی اسرائیل کے سوا کسی اور قوم میں ہوگا نہ ان میں سے اور اگر ان میں سے ہو تو پھر بھائیوں سے نہیں کہلا سکتا۔

نوعود عہد کی تجدید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت

بنی اسرائیل پر اتمام نعمت والا عہد دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے کئی بار دہرایا گیا۔

بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کے کلام کو سننے سے انکار

سوم بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نبی کھڑا کرنا تو سزا کے طور پر تھا۔ اگر انہیں میں سے نبی ہو۔ تو سزا نہیں رہتی۔ جیسا کہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۶ میں لکھا ہے "اس سب کی مانند جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں" پھر لکھا ہے "اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا۔ سو اچھا کہا۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا۔ اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالونگا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا" (آیت ۱۷ و ۱۸) اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل نے خدا کا کلام سننے سے انکار کر دیا جو کلام کہ شریعت کے متعلق تھا تو آیندہ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے شریعت کا دروازہ بند کر دیا اور کہا کہ جب کسی ایسے نئے نبی کی ضرورت ہوگی جو موسیٰ کی مانند ہو تو وہ ان کے بھائیوں میں سے کھڑا کیا جائے گا۔ اس عہد کے ماتحت بنی اسرائیل کو ہر قسم کی ترقی ملتی رہی اور ان کی رُوحانی زندگی کے لئے بادشاہ ہوتے رہے۔ اور ان کو سوائے ایک قلیل درمیانی مدت کے ارضِ مقدس پر حکومت میسر رہی گو مسیح کے نزول کے بعد ارض مقدس کا قبضہ اس گروہ کے ہاتھ آگیا جو مسیح کا ماننے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اسی عہد کی طرف اہل کتاب کو متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم سے تمہارا ایک عہد تھا۔ جس کے پورا کرنے کی صورت میں ہم نے تم سے برکت کی زندگی کا وعدہ کیا تھا۔ تم اگر اس عہد کو پورا کرو۔ تو میں اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے تیار ہوں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد کا ذکر قرآن کریم میں ہے جو اوپر گذر چکا ہے مذکورہ بالا موسوی عہد کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے فرماتا ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ

بنی اسرائیل کے عہد پر قائم نہ رہنے سے ان سے نعمت کا چھن کر بنو اسمٰعیل میں آنا۔

موسوی عہد کا ذکر قرآن مجید میں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف ع ۱۹) یعنی میری رحمت ہر ایک چیز پر وسیع ہے میں ضرور ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ کریں اور زکوٰۃ دیں اور ہماری آیات پر ایمان لائیں اسے لازم کر دونگا (خواہ وہ کسی قوم کے ہوں) ہاں ان لوگوں کے لئے جو اس رسول نبی اور اُمّی کی فرمانبرداری کرتے ہیں جسے وہ اپنی کتب تورات اور انجیل میں لکھا ہُوا پاتے ہیں وہ انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بُری باتوں سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے (برخلاف یہود کے جو بہت سی پاک چیزوں کو اپنی تنگ ظرفی کی وجہ سے حرام قرار دیتے ہیں) اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے (برخلاف نصاریٰ کے جو سؤر اور خون جیسی ممنوع اور بُری چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں) اور ان کے کمر توڑ دینے والے بوجھوں کو دُور کرتا ہے اسی طرح ان طوقوں کو بھی جو ان کے گلوں میں پڑے ہوئے ہیں پس وہ جو اس پر ایمان لاتے اور اپنی زبانوں اور تلواروں سے اسکی اعانت کرتے ہیں اور اسکی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ اُتارا گیا ہے (یعنی قرآن کریم) وہ ضرور کامیاب ہونگے یعنی باوجود غیر عرب ہونے کے ان برکات سے حصہ پائینگے جو عرب کے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت سے وابستہ ہیں کیونکہ وہ کسی ایک قوم کا نبی نہیں بلکہ سب دُنیا کا نبی ہے چنانچہ اگلی آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرماتا ہے قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا تو کہدے کہ اے لوگو

میں تم سب کی طرف خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں یعنی مجھ پر ایمان لانے والے سب کے سب ان انعامات کے وارث ہونگے جن کا مجھ سے وعدہ ہے اور صرف میری قوم ہی کے لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے۔

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں ایک نبی امی کا ذکر موجود ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم ہے اور اسکی اطاعت کے ساتھ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کے پورا ہونے کا تعلق ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کی قوم سے کیا گیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب وہ موعود نبی آئے گا تو اس وقت اس عہد کو جو موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے کیا گیا تھا اللہ تعالیٰ صرف انہی سے پورا کرے گا جو اس پر ایمان لائینگے چنانچہ لکھا ہے "میں ان کے لئے انکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا

اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لیکے کہے گا نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اُس سے لُوں گا" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸، ۱۹)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کے متعلق جو وعدہ کیا تھا اس کا زمانہ اس موعود نبی کی بعثت تک تھا اس کی بعثت کے بعد یہ شرط تھی کہ اگر بنی اسرائیل اس نبی کو مانینگے تو انعام پائینگے ورنہ سزا پائینگے اور اسی طرف اشارہ ہے اس آیت میں کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ تم اپنا عہد مجھ سے پورا کرو تو میں اپنا عہد تم سے پورا کرونگا۔

اس جگہ دو شبہات پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ ہر نبی کے منکروں کو ہی سزا ملتی ہے اور بنی اسرائیل میں موسیٰ کے بعد بہت سے نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذر چکے تھے جن کا انہوں نے انکار کیا پس عہد تو اس وقت ہی ٹوٹ چکا تھا پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پیشگوئی کا خاص تعلق کیونکر ہوا (۲) دوسرے یہ کہ اگر پیشگوئی محمد رسول اللہ صلعم کے متعلق تھی تو ان کی بعثت سے بنی اسرائیل کا زمانہ تو ختم ہوگیا پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ تم اپنا عہد پورا کرو تو میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ بنی اسرائیل کے توبہ کر لینے سے نبوت ان کی قوم میں واپس تو جا نہ سکتی تھی پھر یہ الفاظ کیوں کہے گئے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بہت سے نبیوں کا انکار کیا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ چونکہ ان کے قومی نبی تھے بعد میں ان کے حالات اور الہام ان کی مقدس کتب کے مجموعہ میں شامل ہوگئے پس وہ انکار عارضی تھا اس سے قومی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے قوم ان انبیاء کی معرفت آنے والے انعامات سے محروم نہ ہوتی تھی۔ انکی مثال ایسی ہی تھی جیسے کہ عرب نے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا لیکن آخر میں ان پر ایمان لے آئی ہاں آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار بنی اسرائیل نے شدت سے کیا اور بعد میں ان پر ایمان بھی نہ لائے لیکن بہر حال وہ بھی اسرائیلی نبی تھے اور بنی اسرائیل کا وہ حصہ جو ان پر ایمان لایا اس عہد کے تسلسل کو قائم رکھنے والا تھا اور اگر وہ اپنے عہد کو قائم رکھتا تو نبوت کا انعام پھر بھی ان کو ملتا لیکن انہوں نے بھی اس عہد کو قائم نہ رکھا اور نبوت دوسری طرف منتقل ہوگئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک موعود نبی کی پیشگوئی

یہود نے تو عہد کے روحانی پہلو کو بھلا کر یعنی دل کی پاکیزگی کو نظر انداز کر کے خدا تعالیٰ سے عہد کو توڑ دیا اور جو بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے انہوں نے ظاہری ختنہ کو چھوڑ کر عہد کے نشان کو مٹا دیا پس اس طرح بنی اسرائیل کا کوئی حصہ بھی عہد پر قائم نہ رہا اور خدا تعالیٰ نے عہد کو بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کر دیا۔

بنی اسرائیل کے عہد کے توڑنے کے متعلق بہشتی کا ارادہ

خلاصہ یہ کہ گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے
بھی بنی اسرائیل نے نبیوں کا انکار کیا لیکن وہ انکار عارضی
ہوتا تھا اور بعد میں ■ اس نبی کو قومی نبی کے طور پر تسلیم کر
لیتے تھے سوائے حضرت مسیح کے کہ جن کو بنی اسرائیل کی
باقی قوم نے قبول نہ کیا لیکن چونکہ وہ اسرائیلی نبی تھے اسرائیل
ہی کی طرف آئے تھے اور جیسا کہ اناجیل سے ثابت ہے
موسوی شریعت پر چلنے کا ہی حکم دیتے تھے اور ان کے
پہلے مومن اسرائیل میں سے ہی تھے اس لئے ان پر ایمان
لانے والے اسرائیلیوں کے ذریعہ سے وہ وعدہ قومی طور
پر پورا ہوتا رہا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار
اور رنگ کا تھا۔ آپ موسوی شریعت کے تابع نہ تھے بلکہ
موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق ایک نئی شریعت لائے تھے اور
اسرائیل کی طرف مبعوث نہ تھے بلکہ سب دنیا کی طرف مبعوث
تھے پس آپ کے ذریعہ سے جو دین قائم ہوا وہ موسوی دین
کا تسلسل نہ تھا اور اسرائیل اس پر قومی فخر نہ کر سکتے تھے
اور ان کی قومی برتری کا دَور اس سے ختم ہو جاتا تھا اس لئے
فرمایا گیا کہ چونکہ تم نے اپنا عہد توڑ دیا ہم نے بھی اپنا عہد
ختم کر دیا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ گو محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اسرائیلی نبیوں کا تسلسل
ٹوٹ گیا اور بنی اسرائیل کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم پر ایمان لانے سے وہ تسلسل پہلی شکل میں پھر قائم
ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ
کے ارشاد کے مطابق بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کی رحمتوں کا
سلسلہ جاری رہ سکتا تھا چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَلَوْ
اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ
النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝
(مائدہ ع ۹ و ع ۱۰) یعنی اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ
سے کام لیتے تو ہم ان کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتے اور ہم
انہیں نعمت والی جنتوں میں جگہ دیتے اور اگر وہ تورات کو
قائم کرتے اور انجیل کو اور اس کلام کو بھی جو ان پر (یعنے
موجودہ زمانہ کے اہل کتاب پر) ان کے رب کی طرف سے
نازل کیا گیا ہے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے یعنی روحانی
غذا کے دروازے ان کے لئے کھولے جاتے اور آسمانی
الہام ان پر نازل ہوتا وہ اپنے قدموں کے نیچے سے بھی
کھاتے یعنی مادی انعامات بھی ان پر نازل ہوتے۔ ان میں
سے ایک جماعت میانہ رو ہے (یعنی جو اسلام لے آئے
ہیں) اور اکثر ان میں سے بُرے عمل کرتے ہیں۔ اے رسول
جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے پوری طرح پہنچا اور اگر تُو
ایسا نہ کرے گا تو گویا تُو نے کوئی حصہ بھی کلام الٰہی کا نہیں
پہنچایا اور اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں کے حملوں سے بچائیگا
اللہ تعالیٰ کافروں کو کامیابی کا راستہ کبھی نہیں دکھاتا۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تورات اور انجیل کے
ماننے والے اگر ان کی تعلیم کو مانتے ہوئے اس کلام کو جو
آخری زمانہ میں ان کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے
مان لیں اور ایمان اور تقویٰ سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے
لئے الہام اور رزق طیب کا دروازہ کھول دے گا اور ان کی
سابق بدیوں کے عذاب سے وہ محفوظ ہو جائینگے گویا اس
رنگ میں اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو ان سے پُورا کرے گا اور
اُن کو آسمانی و دنیاوی انعامات سے متمتع کرے گا پھر فرمایا
ہے کہ اے رسول ان اقوام کو خوب تبلیغ کر تا ان پر حجت پوری
ہو جائے اور ان میں سے جو بچائے جا سکیں بچائے جائیں

پس گو نبوت حسب پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے نکالکر بنی اسمٰعیل میں آگئی لیکن پھر بھی اگر بنی اسرائیل اپنے عہد کو پورا کرنے میں لگ جائیں تو ان کے لئے خدا تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے۔ استثنا ر باب ۱۸ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی ہدایت کے بعد یہ آیت رکھی گئی ہے کہ اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے سارا کا سارا پہنچا دے اور یہی الفاظ استثنار کی پیشگوئی کے آخر میں ہیں کیونکہ وہاں لکھا ہے "اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہے گا" (باب آیت ۱۸)

آیت اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ سے یہ استدلال بھی ہوتا ہے کہ امتِ محمدیہ میں غیر تشریعی نبوت کا دروازہ بند نہیں اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے کہ اگر تم میرا عہد پورا کرو یعنی خدا کی باتوں کو مان لو اور وقت کے نبی محمد رسول اللہ پر ایمان لاؤ تو جو میں نے تم سے عہد کیا تھا وہ میں پھر تم سے پورا کروں گا اور اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ عہد یہ تھا کہ ان سے نبی پیدا ہوتے رہیں گے پس معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ میں نبوت کا دروازہ مسدود نہیں صرف شریعت ختم ہوتی ہے ورنہ بے شریعت والے اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع اور خادم نبی اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ممکن نہ تھا تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ اگر اب بھی تم اپنا عہد پورا کرو تو میں تم سے اپنا عہد پورا کروں گا یہ قول اسی وقت درست ہو سکتا ہے جبکہ اُمتِ محمدیہ میں نبوت کا دروازہ کھلا ہو اور بنی اسرائیل میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو اس کا وعدہ دیا جائے۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ بالا پیشگوئی کے مطابق بنی اسرائیل میں آیندہ شرعی نبوت کا دروازہ مسدود ہو چکا تھا اور صرف موسوی شریعت کے تابع نبوت کا دروازہ کھلا تھا کیونکہ استثنار باب آیت ۱۸ میں صاف لکھا تھا کہ شریعت والا نبی آیندہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنو اسمٰعیل میں سے آئے گا پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ان میں بغیر شریعت کے نبی آتے تھے اور نبوت محمدیہ پر ایمان لانے کے بعد بھی یہ دروازہ ان کے لئے بند نہ تھا پس فرمایا کہ اگر اب بھی اپنے عہد کو پورا کرنے لگو تو اس انعام سے حصہ پا سکتے ہو۔

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پس مجھ ہی سے ڈرو مگر یہ پورے معنے اس جملہ کے نہیں کیونکہ اِيَّايَ مفعول ہے اور اس کا فعل محذوف نکالنا ضروری ہے جو اگلے الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اِرْهَبُوْا ہے پس وَاِيَّايَ کے معنے ہوئے اور ڈرو مجھ سے اس کے بعد فا آیا ہے جو امر محذوف پر دلالت کرتا ہے اور وہ امر بھی عبارت کے مطابق ہی نکالنا ہوگا اور وہ اِرْهَبُوْا ہی ہو سکتا ہے پس محذوف کو ظاہر کرکے عبارت یہ ہوگی وَارْهَبُوْا اِيَّايَ اِرْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِ۔ اور ترجمہ یہ ہوگا کہ اور مجھ ہی سے ڈرو ڈر جاؤ پس مجھ ہی سے ڈرو گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے خوف کو تین دفعہ بیان کیا گیا ہے

اس جگہ بعض مغرب کے فلسفہ سے متأثر لوگوں کو شاید یہ وہم ہو کہ خدا تعالیٰ کے خوف پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے ایسے لوگوں کا ایک جواب تو یہ ہے کہ خوف بُری چیز نہیں خوف تقویٰ کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے انسان مختلف حالتوں کے ہوتے ہیں بعض محبت سے مانتے ہیں اور بعض خوف سے۔ پس جس ہستی کے مدنظر اصلاح ہوگی وہ خوف اور محبت دونوں سے کام لے گی۔ فلسفہ انسان کی اصلاح نہیں کر سکتا اصلاح تو مرض کے مطابق علاج کرنے سے ہوتا ہے پس جو لوگ گندے ہو چکے ہوں ان کو ان کے عیوب کے بدنتائج سے ڈرا کر ہی انکی اصلاح کی جا سکتی ہے جو اس طریق کو استعمال

---

۲ اِيَّايَ فَارْهَبُوْن

آیت اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے یہ استدلال کہ امت محمدیہ میں غیر تشریعی نبوت کا دروازہ بند نہیں۔

اس وہم کا ازالہ کہ خدا تعالیٰ کے خوف پر کیوں زور دیا جاتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

(اور) جو اس (کلام) کو جو تمہارے پاس ہے سچا کرنے والا ہے۔ اور تم اس کے (سب سے) پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے میں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ

تھوڑی قیمت مت لو۔ اور مجھ (ہی) سے (ڈرو) پھر (میں کہتا ہوں کہ) مجھ (ہی) سے ڈرو ۵۴۲ اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو

نہ کرے گا۔ اصلاح کے کام میں ناکام رہے گا۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ رَاھِبٌ کے معنے عام خوف کے نہیں بلکہ رَاھِبٌ کے معنوں میں کوشش اور جدو جہد کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں رُھِبَتِ النَّاقَةُ اور اس کے معنے ہوتے ہیں جَهَدَهَا السَّيْرُ یعنی اونٹنی خوب دوڑائی گئی اور تھک گئی۔ پس رَاھِبٌ اس خوف کو کہتے ہیں جو کام کی طرف رغبت پیدا کرے اسی وجہ سے عابد لوگوں کو راہب کہتے ہیں۔

اس سوال کا جواب کہ حضرت اسمٰعیل کی نسل کو ایک لمبے عرصہ تک انعام سے کیوں محروم رکھا گیا؟

ایک اور شبہ کا ازالہ بھی میں اس جگہ کر دینا چاہتا ہوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ تو بڑے بھائی تھے ان کی نسل کو ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ نے انعام سے کیوں محروم رکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بنو اسحاق گو بعد میں کیسے ہی بگڑے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینکڑوں سال تک انہوں نے دین کی شمع کو اٹھائے رکھا اس لئے وہ یقیناً خدا تعالیٰ کے خاص فضلوں کے وارث ہوئے۔ بنو اسمٰعیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک اس رتبہ کو نہیں پہنچے اس لئے بقدر ضرورت ہی انہیں انعام ملا۔ ہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے جوہر کامل بنو اسمٰعیل میں سے ہوئے کہ جنہوں نے سب کمی کو پورا کر دیا۔ اور چونکہ آپ خاتم النبیین ہونے والے تھے اس لئے ضروری تھا کہ سب دوسرے انبیاء کو جو براہِ راست نبوت کے مقام پر کھڑے ہونے والے تھے پہلے گذرنے دیا جاتا تا آخر میں آپ تشریف لاتے اور شریعت والی اور براہِ راست نبوت کا دروازہ مسدود کر دیا جاتا۔

اٰمِنُوْا — اَنْزَلْتُ — مُصَدِّقًا — كَافِرٍ — لَا تَشْتَرُوْا — بِاٰيٰتِيْ — اَلثَّمَنَ

۵۴۲ حل لغات:- اٰمِنُوْا: امر حاضر جمع کا صیغہ ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۶ه و ۱۴ه۔

اَنْزَلْتُ:- اَنْزَلَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اَنْزَلَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵ه

مُصَدِّقًا:- صَدَّقَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور صَدَّقَهٗ کے معنے ہیں ضِدُّ كَذَّبَهٗ اسے سچا قرار دیا اور اَلتَّصْدِيْقُ کے معنے ہیں نِسْبَةُ الصِّدْقِ بِالْقَلْبِ اَوِ اللِّسَانِ اِلَى الْقَائِلِ کسی بات کرنے والے کو اسکی بات میں دل سے سچا سمجھنا یا زبان سے سچا قرار دینا۔ وَقِيْلَ هُوَ اَنْ تَنْسِبَ بِاخْتِيَارِكَ الصِّدْقَ اِلَى الْمُخْبِرِ اور بعض نے تصدیق کے یہ معنے کئے ہیں کہ اپنے اختیار سے سوچ سمجھ کر مخبر کی طرف صدق کا منسوب کرنا تصدیق کہلاتا ہے۔ نیز لکھا ہے اَلْمُصَدِّقُ۔ اَلَّذِيْ يُصَدِّقُكَ فِيْ حَدِيْثِكَ کہ جو کسی کی باتوں کو سچا قرار دے اسے اس کا مصدق کہیں گے (اقرب)

كَافِرٍ:- كَفَرَ سے اسم فاعل ہے اور كَفَرَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۶ه و ۲۵ه

لَا تَشْتَرُوْا:- نہی مخاطب کا جمع کا صیغہ ہے اِشْتَرٰی کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۷ه

بِاٰيٰتِيْ:- اٰيٰتٌ اٰيَةٌ کی جمع ہے اٰيَةٌ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴۲ه

اَلثَّمَنَ:- مَا قَدَّرَهُ الْعَاقِدَانِ عِوَضًا

لِلْمَبِيْعِ کو خرید و فروخت کرنے والے جو کسی چیز کی قیمت ٹھہراتے ہیں وہ ثمن کہلاتی ہے (اقرب) مفردات میں ہے اَلثَّمَنُ اِسْمٌ لِمَا يَأْخُذُهُ الْبَائِعُ فِيْ مُقَابَلَةِ الْمَبِيْعِ عَيْنًا كَانَ اَوْ سِلْعَةً کہ ثمن اس چیز کو کہتے ہیں جس کو بیچنے والا بیچی ہوئی چیز کے بدلہ میں لیتا ہے خواہ نقدی کی صورت میں ہو یا سامان کی وَكُلُّ مَا يَحْصُلُ عِوَضًا عَنْ شَيْءٍ فَهُوَ ثَمَنُهٗ ہر وہ چیز جو کسی چیز کے عوض حاصل کی جائے اس پر بھی ثمن کا لفظ بول دیا جاتا ہے (مفردات) لسان میں لکھا ہے کہ اَلثَّمَنُ مَا تَسْتَحِقُّ بِهِ الشَّيْءَ ثمن ہر اس چیز پر بولینگے جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز کے لینے کا حق ہو جائے وَالثَّمَنُ ثَمَنُ الْبَيْعِ وَثَمَنُ كُلِّ شَيْءٍ قِيْمَتُهٗ کہ ثمن کا لفظ کسی چیز کی اس قیمت پر بھی بولا جاتا ہے جو اس کو لینے کے لئے ادا کی جائے اور اس پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی چیز کی اصل قیمت ہو (یعنی بعض اوقات ایک چیز کی اصلی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن بکتی کم قیمت پر ہے تو اصل قیمت پر اور اس قیمت پر جس پر وہ بک رہی ہوتی ہے ثمن کا لفظ بولا جاتا ہے) فراء کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ثَمَن پر نصب آئی ہے اور مبیع پر باء داخل کی گئی ہے وہاں ان دونوں میں سے کوئی بھی معین ثمن نہیں ہوتی۔ ہر دو اشیاء میں سے جس کو چاہیں ثمن بنا سکتے ہیں مثلاً جب یہ کہیں کہ اِشْتَرَيْتُ ثَوْبًا بِكِسَاءٍ کہ میں نے چادر دے کر کپڑا خریدا۔ تو اس میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ* کپڑا چادر کی قیمت ہے گویا ہر دو اشیاء ایک دوسرے کی قیمت بن سکتی ہیں اور جب یہ بتانا مقصود ہو کہ فلاں چیز اتنی رقم سے خریدی گئی ہے اور وہاں مال کا ذکر ہو تو اس وقت مال کو ثمن کہیں گے اور اس پر باء داخل ہوگی جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق آتا ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو چند درہموں پر خرید لیا تو یہاں درہم ثمن بن سکتے ہیں (لسان)

اِتَّقُوْنِ: اِتَّقُوْنِ

اِتَّقُوْنِ:۔ اِتَّقُوْا امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے نِ نی کا قائمقام ہے۔ اِتَّقُوْنِ کے معنے ہیں مجھ سے ڈرو اِتَّقٰی کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۳ع

تفسیر:۔ اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ کے معنے استثناء باب ۱۸ کے موعود نبی کو قبول کرنا ہے کیونکہ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ کے بعد اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ کہا گیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایفاء عہد اور خدا تعالیٰ کا خوف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانا یہ سب امور ان انعامات کی تکمیل کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے ہیں جو بنی اسرائیل کے لئے مقرر تھے۔

بِمَا اَنْزَلْتُ۔ اَنْزَلْتُ کے بعد ضمیر واحد غائب محذوف ہے کیونکہ مَا کی طرف ضمیر کا پھرنا ضروری ہے پس اصل جملہ یہ ہوگا بِمَا اَنْزَلْتُهٗ یعنی اس پر ایمان لاؤ جسے میں نے نازل کیا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یہ جملہ اَنْزَلْتُ کے بعد جو ضمیر محذوف ہے اس کا حال ہے اور مطلب یہ ہے کہ میرے اتارے ہوئے اس کلام پر ایمان لاؤ جو اس کا جو تمہارے پاس ہے مصدق ہے مطلب یہ ہے کہ اس کلام کے ذریعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ والی پیشگوئی پوری ہوئی ہے اسی طرح اور بنی اسرائیل کے نبیوں کی پیشگوئیاں پوری ہوئی ہیں پس اس کلام اور اس کے لانے والے پر ایمان لانا اپنے سابق الہامی کلام کی تصدیق کرنا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنا ہے اور اس کو نہ ماننا اس کلام کی تکذیب اور تردید ہے گویا بنی اسرائیل میں سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیش کردہ کلام الٰہی قرآن کریم پر ایمان لاتا ہے وہ حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں پر بھی ایمان لاتا ہے کیونکہ انہوں نے انکی خبر دی تھی اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر نازل شدہ کلام کو رد کرتا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کو بھی رد کرتا ہے

* کپڑے کی قیمت چادر ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ

حضرت ابراہیم اور ہاجرہ کو بنو اسمٰعیل کی ترقی کے متعلق پیشگوئیاں۔

کیونکہ وہ ان کی تصدیق کو ٹھکرا دیتا ہے۔ پس وہ ان انعامات کا مستحق نہیں رہتا جو ان کی تصدیق اور ان پر ایمان لانے سے وابستہ کئے گئے تھے۔

ایک غیر مسلم سوال کر سکتا ہے کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اور ان کے بعد میں آنے والے انبیاء نے واقعہ میں کسی ایسے نبی کی خبر دی تھی جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے پورا کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دُنیا کی ہر قوم میں ایک آخری زمانہ کے نبی کی خبر دی گئی تھی اور اس کی بعض علامات بھی بتائی گئی تھیں جو پورے طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پوری ہو گئیں خصوصاً اسرائیلی نبیوں کی پیشگوئیاں تو اس بارہ میں بکثرت ملتی ہیں اس کثرت سے کہ ان پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اس آیت میں سب انبیاء اور اقوام کی پیشگوئیوں کا ذکر نہیں اس لئے اس وقت میں ان کو بیان نہیں کرتا لیکن مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے مضمون کی مطابقت سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی پیشگوئیوں کا ذکر چونکہ ضروری ہے میں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر اس جگہ کرتا ہوں۔

قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تورات اور انجیل کی سات تصدیقات۔

تصدیق نمبر ۱ — پہلی تصدیق قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کرتا تھا جنہوں نے بنو اسمٰعیل کی ترقی کی پیشگوئی کی تھی اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے اور آپ پر وحی نازل نہ ہوتی تو حضرت ابراہیم جھوٹے قرار پاتے۔ حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ”اسمٰعیل کے حق میں یَمنے تیری سُنی دیکھ میں اسے برکت دُونگا اور اسے برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤنگا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا“ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰،۲۱) اس پیشگوئی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اسحاق کی اولاد سے وعدہ تھا کہ انہیں بہت بڑھاؤنگا اور اسے برکت دُونگا اور اس سے بڑی قوم بناؤنگا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق بھی وعدہ تھا گو باوجود اس کے بائبل میں لکھا ہے کہ یہ عہد اسحاق کی اولاد سے پورا ہوگا مگر یہ تو قلم درکفِ دشمن کی وجہ سے ہے ورنہ ساری باتیں جو حضرت اسحاق کی نسبت کہی گئی تھیں حضرت اسمٰعیل کی نسبت بھی کہی گئیں۔ تو پھر عہد کا حضرت اسحاق سے مخصوص ہونا بے معنی ہے بائبل کے قول کے مطابق خدا کا کلام حضرت ہاجرہ پر بھی نازل ہُوا تھا اور اس میں اسمٰعیلؑ کی نسبت یہ پیشگوئی تھی ”میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تُو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا وہ وحشی آدمی ہوگا اس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہونگے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔“ (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۲) گویہ الہام ہاجرہؓ پر نازل ہُوا ہے مگر موسیٰ کی وحی میں اسے شامل کر کے اسکے خُدائی الہام ہونے کی تصدیق کر دی گئی ہے پس یہ الہام بھی اسی طرح بنی اسرائیل پر حجت ہے جس طرح حضرت ابراہیم کا اپنا الہام۔ اس الہام میں یہ امور بیان ہیں کہ (۱) حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی حضرت اسحاق کی اولاد کی طرح بے انتہا ترقی کریگی حتّٰی کہ گِنی نہ جا سکے گی (۲) اسے ایسی عظمت ملے گی کہ سب دُنیا اس سے حسد کریگی (۳) باوجود اسکے کہ سب دُنیا اس کی مخالفت کرے گی وہ ان سے دبے گی نہیں بلکہ ان کے مقابل پر عزّت کی زندگی بسر کرے گی۔

قرآن کی پہلی تصدیق حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیوں کی

اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ بنو اسمٰعیل کے لئے عالمگیر عزّت شہرت اور عظمت مقدر کی گئی تھی اس قدر کہ اس کے نتیجہ میں دُنیا کی سب قومیں ان سے حسد کرنے لگینگی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق آکر یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایسی عظمت حاصل کرینگے کہ سب دُنیا ان پر حسد کرنے لگے گی خصوصاً بنو اسحاق۔ اور یہ کہ آپ کو سب دُنیا پر خدا تعالیٰ غلبہ دے گا۔ اس دعویٰ کے ساتھ گویا آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کے الہاموں کو پورا کرنے کا دعویٰ کیا اگر آپ ظاہر نہ ہوتے تو ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی وہ پیشگوئی پوری ہوتی جو انہوں نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے بارہ میں کی تھی اور نہ ہاجرہ پر نازل ہونے والا الہام۔ جو بائبل میں موجود ہے پورا ہوتا مگر رسول کریمؐ کی بعثت کے ساتھ یہ دونوں الہام پورے ہوگئے اور قرآن کریم بائبل کا مصدق ہوگیا یعنی اس کے الہام کو سچا کرنے والا۔

یہ جو بائبل میں ہے کہ حضرت اسحاق اس عہد کو پورا کرنے والے ہونگے جو حضرت ابراہیمؑ سے ہوا تھا اس کا ایک جواب تو میں پہلے دے آیا ہوں کہ بائبل انسانوں کی دست بُرد سے پاک نہیں بنو اسحاق کو بنو اسمٰعیل سے سخت عداوت تھی۔ پس جو کتاب زمانہ جہالت میں ایک لمبے عرصہ تک ان کے ہاتھوں میں رہی خدا ہی جانے کہ اس میں انہوں نے کیا کیا تحریف کی ہوگی۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ بائبل کے وہ نسخے جو عزرا نبی کے بعد تاریخی زمانہ میں لکھے گئے ہیں ان میں ہی کافی اختلاف ہے یہودیوں سامریوں اور مسیحیوں کی بائبل کے نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے گو اصولی طور پر وہ متفق ہیں لیکن پھر بھی کافی اختلاف موجود ہے جب یہ اختلاف تاریخی زمانہ کا ہے تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ عزرا نبی سے پہلے زمانہ میں کیا کیا دست بُرد یہودی کتب میں کر چکے ہونگے۔

اگر اس دست برد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی میں کہتا ہوں کہ ان پیشگوئیوں کو دیکھتے ہوئے جو حضرت اسمٰعیل کے حق میں بائبل میں اس وقت تک موجود ہیں ہم جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو بائبل میں لکھا ہے کہ "لیکن میں اسحاق سے جس کو سرہ دوسرے سال اسی وقت معین میں جنے گی اپنا عہد قائم کرونگا" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱) اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ یہ عہد ابتداءً اسحاق کی اولاد کے ذریعہ پورا ہونا شروع ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ پہلے یہ عہد ایک لمبے عرصہ تک بنو اسحاق کے ذریعہ سے پورا ہوتا رہا پھر خدا تعالیٰ نے اسے بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل کر دیا۔

اور اس امر کی وجہ کہ گو اسحاق چھوٹے تھے مگر خدا تعالیٰ کا عہد پہلے ان کی اولاد کے ذریعہ سے پورا ہونا شروع ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کو وہ نبوت ملنی تھی جو منسوخ نہ ہونے والی تھی اگر ان کے ذریعہ سے پہلے عہد پورا ہوتا تو بنو اسحاق نعمت سے بالکل محروم رہ جاتے پس اللہ تعالیٰ نے پہلے بنو اسحاق کو ایک لمبے عرصہ تک نبوت کے انعام سے حصہ دیا اس کے بعد بنو اسمٰعیل میں وہ نبی مبعوث فرما دیا جو خاتم النبیین تھا اور جس کی شریعت کو کسی اور شریعت نے منسوخ نہ کرنا تھا بلکہ اس نے قیامت تک دُنیا پر حکومت کرنی تھی۔

اس امر کا قطعی ثبوت کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے جو عہد تھا اس میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی شامل تھی اس سے ملتا ہے کہ جس طرح عہد کا ظاہری نشان بندوں کی طرف سے ختنہ قرار دیا گیا تھا اسی طرح عہد کا ظاہری نشان خدا تعالیٰ کی طرف سے کنعان کی حکومت قرار دیا گیا تھا۔ بائبل کا حوالہ میں اوپر نقل کر آیا ہوں لیکن اس جگہ مضمون کو واضح کرنے کے لئے پھر لکھ دیتا ہوں لکھا ہے " اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پُشت در پُشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہو کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہونگا اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے مِلک ہو اور میں ان کا خدا ہونگا۔ پھر خدا نے ابراہام سے کہا کہ تُو اور تیرے بعد تیری نسل پُشت در پُشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو۔ سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۷ تا ۱۱) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ عہد خداوندی کے مادی حصہ کی دو شقیں تھیں ایک شق اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی تھی اور وہ آل ابراہیمؑ کو کنعان کی بادشاہت دینے کا وعدہ تھا۔ اور دوسری شق آل ابراہیم سے تعلق رکھتی تھی اور وہ ختنہ کرانے کی رسم تھی خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ ہمیشہ آل ابراہیم

کے پاس کنعان رہے گا اور آل ابراہیم سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی ہمیشہ نرینہ اولاد کا ختنہ کرائیں۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ خدا تعالیٰ نے کنعان یہود سے لے کر مسیحیوں کو دے دیا بوجہ اس کے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی نبی تھے اس وقت بھی پیشگوئی قائم رہی اور کنعان آل ابراہیم کے قبضہ میں ہی رہا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد سے لے کر ۱۹۱۷ء تک اندازاً تیرہ سو سال تک یہ ملک مسلمانوں کے پاس رہا اگر تو بنو اسمٰعیل آل ابراہیم کے وعدہ میں شامل نہ تھے اور پھر بھی یہ ملک تیرہ سو سال ان کے اتباع کے قبضہ میں رہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی قطعاً باطل ٹھہرتی ہے لیکن چونکہ خدا کی بات جھوٹی نہیں ہو سکتی ثابت ہوا کہ بنو اسمٰعیل عہد ابراہیم میں بنو اسحاق سے برابر کے شریک تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں بنو اسمٰعیل کے متعلق آنحضرتؐ کے وجود میں پوری ہوئیں۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی اس فعلی شہادت سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ عہد ابراہیم میں بنو اسمٰعیل بھی شامل تھے اس وجہ سے ان کے قبضہ میں کنعان کا آنا عہد الٰہی کے پورا ہونے کے تسلسل میں تھا۔ تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عہد الٰہی کا روحانی حصہ یعنی خدا تعالےٰ کی طرف سے نبوت کا ملنا اور بندہ کی طرف سے دل کا ختنہ کرنا بھی بنو اسمٰعیل کے حق میں پورا ہونا ضروری تھا اور یہ ایفاء عہد خدا تعالیٰ اور بندہ کی طرف سے جہاں تک بنو اسمٰعیل کا تعلق ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پورا ہوا ورنہ بنو اسمٰعیل میں سے کوئی اور ایسا وجود پیش کیا جائے جس کی ذات سے یہ وعدہ پورا ہوا ہو۔

قرآن کریم اور آنحضرتؐ کا موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کرنا

تصدیق نمبر ۲ دوسری تصدیق قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی کی۔

(۱) کتاب استثناء میں لکھا تھا "میں ان کے لئے انکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں ■■ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنے گا تو مَیں اس کا حساب اس سے لُوں گا لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاوے" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۱)

اس پیشگوئی میں خبر دی گئی تھی کہ (الف) آیندہ بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنو اسمٰعیل میں سے ایک نبی کھڑا کیا جائے گا (باء) ■■ موسیٰ کی مانند ہوگا یعنی صاحب شریعت ہوگا اور اس کے واقعات حضرت موسیٰ کے واقعات سے ملتے جلتے ہونگے (ج) اس کی زبان پر خدا تعالیٰ کا کلام جاری ہوگا یعنی اس کا الہام کُل کا کُل لفظی ہوگا یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو اپنے الفاظ میں بیان کرے (د) وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو نڈر ہو کر لوگوں کے سامنے بیان کرے گا اور سارا کلام الٰہی لوگوں کو سنائے گا (ھ) اور جو الہام سُنائے گا خدا کا نام لے کر سُنائے گا اور شرک کی تردید کرنے والا ہوگا (و) اس کے منکر عذاب الٰہی میں مبتلا ہونگے (ز) اگر کوئی شخص اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق بننے کی کوشش کرے گا تو خدا تعالےٰ کا فیصلہ ہے کہ ■■ ہلاک ہو جائے (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں اس جگہ یہ الفاظ ہیں He shall die یعنی وہ ہلاک ہوگا نہ کہ وہ قتل کیا جائے جیسا کہ اردو میں ہے)

ان پیشگوئیوں کے مطابق (الف) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسمٰعیل میں سے یعنی بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے ظاہر ہوئے۔

(باء) آپ نے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؈ (مزمل غ ۱) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھجوایا ہے جو تم پر گواہ ہے اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھجوایا تھا یعنی موسیٰؑ۔ آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت نبی تھے اور آپ کے حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑی مشابہت

رکھتے ہیں یعنی ایک کامل شریعت آپؐ کو دی گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ سے وعدہ کیا گیا کہ آپؐ کی امت میں سے متواتر مجددین آتے رہیں گے اور یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری خلیفہ حضرت مسیح تھے اسی طرح قریباً اتنا ہی عرصہ آپؐ کے بعد ایک آپ کا خلیفہ ظاہر ہوگا جو مسیح کے نام سے موسوم کیا جا سکے گا چنانچہ اس پیشگوئی اور مشابہت کے مطابق حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنا ہی عرصہ بعد بانی سلسلہ احمدیہ مسیح موعود بن کر خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے (ج) آپ نے دعویٰ کیا کہ خدا تعالیٰ کا کلام آپ کی زبان پر جاری ہے یعنی اپنی وحی کے جو الفاظ آپ پیش کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہ الفاظ ہیں جو آپ کے دل پر نازل ہوئے تمام گذشتہ نبیوں کی کتب کو پڑھ کر دیکھ لو ان میں خدا کا کلام کم اور بندہ کا زیادہ ہوتا ہے انجیل میں تو شاید ایک دو فقرے ہی خدا کے ہیں باقی سب کچھ مسیح کا اپنا کلام یا انجیل کے داستان نویسوں کا نوشتہ ہے صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے کہ الف سے یاء تک خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔

غرض میں اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا سے یہی مراد تھا کہ پہلے انبیاء کا سارا کلام لفظی نہ ہوتا تھا بلکہ اکثر حصہ ان کے دل پر بطور مفہوم نازل ہوتا یا بطور نظارہ دکھایا جاتا اور بعد میں [illegible] اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتے۔ محمد رسول اللہ صلعم کی یہ خصوصیت اس پیشگوئی میں بتائی گئی کہ وہ خدا تعالیٰ کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان نہ کرینگے بلکہ خدا تعالیٰ کے مفہوم کو خدا تعالیٰ کے ہی الفاظ میں بیان کرینگے اور جو الفاظ وہ اپنے مُنہ سے خدا تعالیٰ کا منشاء بتانے کے لئے نکالیں گے وہ خود خدا تعالیٰ ہی کے الفاظ ہونگے پس فرمایا کہ میں اپنا کلام اسکے مُنہ میں ڈالوں گا یعنی باقی انبیاء کے تو دلوں پر کلام نازل ہوتا تھا اور مُنہ تک آتے ہوئے وہ نبیوں کے کلام کے لباس میں ملبوس ہو جاتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلعم کے دل پر بھی خدا تعالیٰ کا کلام اُتارا جائے گا اور مُنہ پر بھی وہی لفظ بعینہٖ جاری ہونگے جو خدا تعالیٰ نے کہے ہونگے اسی کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ع۱) محمد رسول اللہ اپنی مرضی سے خدا تعالیٰ کے منشاء کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتے بلکہ صرف وہی الفاظ وحی کے جو خدا تعالیٰ نے معین شکل میں ان کے دل پر نازل کئے ہیں دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں (د) آپؐ نے خدا تعالیٰ کے کلام کو نڈر ہو کر سنایا اور سارا کلام سُنایا چنانچہ قرآن کریم کا وجود اس پر شاہد ہے شدید مخالفت آپ کی کی گئی اور کفار نے ہزار لالچ آپ کو دی کہ کسی طرح بعض حصے جو انکے بتوں کے خلاف تھے حذف کر دیئے جائیں یا کمزور کر دیئے جائیں مگر آپؐ نے ذرا بھی پروا نہیں کی اور خدا تعالیٰ کا کلام پورا کا پورا اصلی شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا چنانچہ قرآن کریم میں اس کا ذکر یوں ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (ہود ع۲) یعنی تیرے مخالف اس امر کی طمع رکھتے ہیں کہ شائد ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر تو اس وحی میں سے جو تجھ پر نازل کی گئی ہے کچھ چھوڑ دے اور شائد کہ تیرا سینہ ان کے اس اعتراض سے ڈر کر کہ کیوں اس کے ساتھ خزانہ نہیں اُترا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آسمان سے تائید کے لئے نہیں آیا بعض حصہ وحی کا چھوڑ دے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ تو ایک ڈرانے والا ہے۔ ڈرانے والا ان لوگوں سے کس طرح ڈر سکتا ہے جن کے متعلق تباہی کی خبر دی گئی ہے اور اللہ تو ہر چیز پر نگران ہے پھر اس کے حکم سے کوئی باہر کیونکر نکل سکتا ہے (اس آیت کی پوری تفسیر کے لئے دیکھو نوٹ ۱۲ سورۃ ہود) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس امر پر شہادت دی اور لوگوں سے بھی دلوائی کہ آپؐ نے خدا تعالیٰ کا کلام سب کا سب دُنیا کو پہنچا دیا چنانچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپؐ کو یہ قرآنی وحی ہوئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ ع۱) آج میں نے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی آنحضرتؐ کے متعلق

سامنے دوبارہ مسلمانوں کو انکے فرائض کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اے لوگو خدا تعالےٰ کو گواہ رکھ کر بتاؤ کیا میں نے خدا تعالیٰ کا حکم پوری طرح دنیا کو پہنچا دیا ہے یا نہیں؟ اسپر سب صحابہ یک زبان ہو کر بولے اَللّٰھُمَّ نَعَمْ ہم اللہ تعالےٰ کو گواہ کرکے کہتے ہیں کہ آپنے خدا تعالیٰ کا پیغام اچھی طرح پہنچا دیا ہے اسپر آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اے خدا تو اسپر گواہ رہ کہ یہ سب لوگ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ تبلیغ کلام الٰہی کا کام میں نے پورا کر دیا۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد سوم)

اس پیشگوئی کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ موعود نبی خاتم النبیین ہونے والا تھا اسپر جو دینی وحی ہوگی دُنیا کو پہنچانے کے لئے ہوگی تاکہ دین کا کوئی حصہ نامکمل نہ رہ جائے۔ اس سے پہلے کے نبیوں کا یہ حال نہ تھا ان پر دین کے بعض اسرار کھولے جاتے تھے مگر انھیں ان کے بتانے کی اجازت نہ ہوتی تھی کیونکہ انکے زمانہ کے لوگ اسکے سمجھنے کے قابل نہ ہوتے تھے گو نبی کا ترقی یافتہ دماغ اسے سمجھنے کے قابل ہوتا تھا پس یہ کہنا کہ [illegible] نبی سب کچھ جو اسے کہا جائے گا لوگوں سے کہہ دے گا اس کے یہ معنے ہیں کہ اسکے زمانہ میں انسانی دماغ مکمل ہو چکا ہوگا اور آخری اور کامل شریعت جو تمام اسرار روحانی پر مشتمل ہوگی اسے دیدی جائیگی اور اسے حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنی امت کو سب باتیں سکھا دے کیونکہ وہ ان کے سُننے کے اہل ہیں ان معنوں کی طرف انجیل میں بھی اشارہ ہے حضرت مسیح فرماتے ہیں "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں۔ پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنے رُوح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتاوے گی"۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲ و ۱۳) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی سب وحی لوگوں کو نہ سُنائی کیونکہ وہ ان کے لئے خاص تھی انکی امت اسے سمجھنے کے قابل نہ تھی لیکن انہوں نے یہ خبر دے دی کہ انکے بعد ایک رُوح حق آئے گی وہ لوگوں کو سب باتیں سنا دیگی کیونکہ اس وقت لوگ سب باتوں کے سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے گویا وہ رُوح حق خاتم النبیین کے مقام پر فائز ہوگی۔

(ہ) پیشگوئی کا یہ حصہ کہ وہ آنے والا جو کچھ کہیگا خدا کا نام لے کر کہے گا اس طرح پورا ہوا ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی آیت رکھی گئی ہے جس کے معنے ہیں میں اللہ جو رحمٰن و رحیم ہے اس کا نام لے کر اس کلام کو پیش کرتا ہوں (و) پیشگوئی کا یہ حصہ کہ اس کے منکر ہلاک ہونگے جس شان سے محمد رسول اللہ صلعم کی نسبت پورا ہوا ہے اس کے دشمن بھی معترف ہیں گو وہ اسے دنیوی سامانوں کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ایک خلافِ عقل و خلاف واقعہ اعتراض ہے (ز) پیشگوئی کا یہ حصہ کہ جو شخص اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق بنے گا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے گا نہایت شان سے پورا ہوا باوجود اسکے کہ محمد رسول اللہ صلعم اکیلے تھے اور ان کے دشمنوں نے انہیں ہلاک کرنے کے لئے پورا زور لگایا وہ ہر میدان میں کامیاب ہوئے اور کوئی شخص انہیں نقصان نہ پہنچا سکا اور یہ امر اتفاقی طور پر نہیں ہوا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے پہلے سے کہدیا تھا اور دُنیا کو یہ حکم سُنا دیا گیا تھا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ع ۱۰)

آپ کا دشمنوں کے منصوبوں سے غیر معمولی طور پر محفوظ رہنا ایک ایسا نشان ہے کہ بہت سے سخت دشمنوں کی ہدایت کا موجب ہوا ہے چنانچہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ہند ابوسفیان کی بیوی فتح مکہ کے بعد جب دوسری عورتوں سے ملکر بیعت کرنے کے لئے آئی اور آپ نے عورتوں سے اقرار لیا کہ ہم شرک نہیں کرینگی اسپر ہند جوش سے بول پڑی کہ کیا ہم اب بھی شرک کر سکتی ہیں حالانکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ تو اکیلا تھا اور ہم لوگ ایک مضبوط جتھا تھے ہم نے اپنا سارا زور تجھے تباہ کرنے کے لئے خرچ کیا لیکن باوجود اسکے تجھے ہلاک نہ کر سکے اگر بتوں میں کوئی بھی طاقت ہوتی تو ہم تجھے تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر نتیجہ اُلٹا

نکلا ہم ہلاک ہوئے اور تو کامیاب (الروض الانف جلد دوم)

اب غور کرو کہ اگر بنو اسمٰعیل میں سے کوئی نبی شریعت کے ساتھ موسیٰ کے نقش قدم پر ظاہر نہ ہوتا اگر باوجود مخالفت کے وہ خدا کا کلام لوگوں کو نہ سُناتا اور سب کا سب کلام نہ سُناتا اور اس کے دشمن تباہ نہ ہوتے اور وہ باوجود دشمنوں کے زور اور ان کی مخالفت کے کامیاب نہ ہوتا اور خدا تعالیٰ اس کے مُنہ میں اپنا کلام نہ ڈالتا تو موسیٰ کی پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی اور اس کی سچائی کس طرح ثابت ہوتی پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹ کے الزام سے بچایا اور انکی تصدیق کا موجب ہوئی

تصدیق نمبر ۳

موسیٰ علیہ السلام نے ایک اور پیشگوئی کی تھی کہ "اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔" (استثناء باب ۳۳ آیت ۲) اس پیشگوئی میں تین آسمانی نشانوں کا ذکر ہے ایک سینا سے خدا تعالیٰ کے جلوہ گر ہونے کی جس سے حضرت موسیٰ کی ترقی کی طرف اشارہ ہے دوسرے شعیر سے خدا تعالیٰ کے طلوع کی اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی خبر تھی جو شعیر کے علاقہ میں ظاہر ہوئے۔

تیسرے الٰہی جلوہ کے ظہور کا مقام فاران بتایا گیا ہے اور اس جلوہ کی تفصیل پہلے دونوں جلووں سے زیادہ بیان کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی جلوہ کا ذکر اس جگہ اصل میں مقصود ہے۔ اس جلوہ کا مقام فاران بتایا گیا ہے اور اس جلوہ کے ظہور کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دس ہزار قدوسیوں کی معیت میں وہ ہوگا۔ اور اسکی مزید خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ جس شخص کے ذریعہ سے وہ جلوہ ظاہر ہوگا اسکے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ہوگی۔ یہ تینوں نشانیاں بتمام وکمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پائی جاتی ہیں آپ قرآن کریم کی واضح پیشگوئیوں کے مطابق جب مکہ پر غالب آکر مکہ میں داخل ہوئے تو فاران کی طرف سے ہی آپ کا داخلہ ہوا کیونکہ مدینہ اور مکہ کے درمیان میں فاران کی وادی واقع ہے اور جس وقت آپ مکہ پر حملہ آور ہوئے آپ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کا لشکر تھا اور آپ ایک آتشی شریعت دُنیا کے لئے لائے تھے یعنی جو اللہ کی محبت سے انسان کی بدیوں اور اس کے گناہوں کو جلا دینے والی ہے اور اس لحاظ سے بھی وہ آتشی شریعت ہے کہ اس میں نہ صرف ماننے والوں کے لئے انعامات کے وعدے ہیں بلکہ منکروں اور شریروں کے لئے سزاؤں کا بھی ذکر ہے۔

قرآن اور آنحضرت کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک اور پیشگوئی کی تصدیق کرنا۔

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر نہ ہوتے انہیں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہ کرنی پڑتی۔ اور پھر خدا تعالیٰ آپ کو دشمنوں پر غلبہ نہ دیتا آپ کے ہاتھ پر مکہ فتح نہ ہوتا آپ کے ساتھ اس وقت دس ہزار صحابہ نہ ہوتے آپ کے ہاتھ میں ایک کامل شریعت جو صرف مومنوں کے لئے ترقی کی خبر دینے والی نہ تھی بلکہ دشمنانِ حق کی سزاؤں کی خبروں پر بھی مشتمل تھی نہ ہوتی تو استثناء باب ۳۳ آیت ۲ کی پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی تصدیق کس طرح ہوتی۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اس پیشگوئی کو پورا کرنے اور اسے سچا ثابت کرنے کا موجب ہو کر مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ثابت ہوئی۔

تصدیق نمبر ۴

تصدیق نمبر ۴ حضرت سلیمان علیہ السلام کے الہام کی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام غزل الغزلات میں فرماتے ہیں "میرا محبوب سُرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے اور اس کا سر ایسا ہے جیسا چوکھا سونا اسکی زلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوّے کی سی کالی ہیں اسکی آنکھیں ان کبوتروں کی مانند ہیں جو لبِ دریا دودھ میں نہاکے تمکنت سے بیٹھے ہیں اس کے رخسار سے پھولوں کے چمن اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاری کی مانند ہیں اس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے اسکے

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کرنا۔

ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے جواہر جڑے گئے اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا سا کام ہے جسپر نیلم کے گل بنے ہوں۔ اس کے پیر ایسے جیسے سنگ مرمر کے ستون جو سونے کے پایوں پر کھڑے کئے جاویں اس کی قامت لبنان کی سی وہ خوبی میں رشک سرو ہے اس کا منہ شیریں ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے" (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰ تا ۱۶) اس پیشگوئی میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بتایا ہے جو تاریخ سے سُرخ و سفید ثابت ہے پھر فتح مکہ کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ آپ دس ہزار آدمیوں کے ساتھ فتح مندانہ اپنے ملک کو واپس آئینگے یہ دس ہزار آدمی ہی دس ہزار قدوسی ہیں جن کا ذکر استثناء باب ۳۳ کی پیشگوئی میں تصدیق نمبر ۳ میں گزر چکا ہے پھر آخر میں آپ کا نام بھی بتا دیا ہے یعنی 'محمدؐ' اس نام کو چھپانے کے لئے بائبل کے مترجموں نے اُردو میں 'عشق انگیز' کے الفاظ لکھ دیئے ہیں لیکن عبرانی زبان کے اصل الفاظ جو اس جگہ ہیں اُن کا اُردو ترجمہ یوں ہے " ہاں وہ محمدیم ہے۔ محمدیم میں ی اور م ادب کیلئے بڑھائے گئے ہیں جیسے الوہ جس کے معنے خدا کے ہیں اسے بائبل میں بہت جگہ الوھیم لکھا جاتا ہے پس ہاں وہ محمدیم کے معنے ہیں ہاں وہ بزرگ محمد ہے چنانچہ اس پیشگوئی کی وجہ سے یہ دیکھتے ہوئے کہ کئی نشانات ظہور محمد کے ظاہر ہو چکے ہیں لوگ اپنے بچوں کے نام محمد رکھنے لگ گئے تھے چنانچہ مدینہ میں بھی کئی ایک شخص کا نام انکے والدین نے محمد رکھے ہوئے تھے چنانچہ ان میں سے ایک محمد بن احیحہ بھی تھے جو صحابہ میں شمار ہوتے ہیں (اسد الغابہ جلد ۴) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے اس پیشگوئی کی بھی تصدیق کی۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا تعالیٰ کا کلام نہ اُترتا تو سلیمان علیہ السلام کی یہ پیشگوئی جھوٹی جاتی۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یسعیاہ نبی کے کلام کی تصدیق کرنا۔

تصدیق نمبر ۵

"وہ کس کو دانش سکھاوے گا کس کو وعظ کر کے سمجھاوے گا۔ ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جُدا کئے گئے۔ کیونکہ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون قانون پر قانون ہوتا جاتا۔ تھوڑا یہاں۔ تھوڑا وہاں۔ ہاں وہ وحشی کے سے ہونٹوں اور اجنبی زبان سے اس گروہ کے ساتھ باتیں کرے گا۔ کہ اس نے اُن سے کہا کہ یہ وہ آرامگاہ ہے تم ان کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیو اور یہ چین کی حالت ہے پر وے شنوا نہ ہوئے سو خدا کا کلام ان سے یہ ہوگا۔ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔ تاکہ وے چلے جاویں۔ اور پچھاڑی گریں اور شکست کھاویں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں (یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳) اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ایک زمانہ میں (۱) اسی قوم کے پاس آئے گا جو الہام کے دودھ سے محروم کر دی گئی اور جو اپنی والدہ سے جدا کئے گئے یعنی نبوت پانے کے بعد اس سے محروم کر دیئے گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت آئے جب نبوت پر ایک لمبا عرصہ گزر گیا تھا اور آپ نے بنی اسرائیل کو بھی مخاطب کیا جو الہام کے دودھ سے محروم کر دیئے گئے تھے اور نبوت کی چھاتیوں سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ قرآن کریم میں آتا ہے يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْجَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ع ۳) یعنی اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے رسولوں کے ناغہ کے بعد وہ تمہارے فائدے کی باتیں بیان کرتا ہے تا یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا نہ ڈرانے والا۔ پس خوب سُن لو کہ تمہارے پاس اب ایک خوشخبری دینے والا بھی اور ڈرانے والا بھی آگیا ہے۔ اور اللہ ہر امر پر خوب قادر ہے۔ غرض اسی آیت میں یسعیاہ نبی کے ان الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "وہ کس کو دانش سکھائے گا کس کو وعظ کر کے سمجھائیگا

ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے" (۲) دوسرے وہ کلام جو اس قوم کے لئے نازل ہوگا یکدم نازل نہ ہوگا نہ کسی ایک شہر میں نازل ہوگا بلکہ حکم پر حکم اور قانون پر قانون مختلف مقامات پر اُتریں گے۔ قرآن کریم اسی طرح اُترا کچھ مکہ میں کچھ مدینہ میں کچھ سفروں میں حتیٰ کہ دشمنوں نے اعتراض کیا کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (فرقان ع ۳) یعنی کیوں محمدؐ پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ نہ اُترا۔ اور باوجود یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مسیحی لوگ آج تک قرآن کریم پر یہ اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی قلموں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مصداق تھے (۳) تیسرے وہ کلام ایک عرب کی زبان سے سُنایا جائے گا اور غیر زبان یعنی عربی زبان میں سُنایا جائے گا کیونکہ وحشی کا لفظ عرب پر دلالت کرتا ہے اوپر پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس میں حضرت ہاجرہ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تھی اس میں لکھا تھا "وہ (یعنی اسماعیل) وحشی آدمی ہوگا۔ پس وحشی حضرت اسماعیلؑ کا نام ہے جو بائبل میں آتا ہے اور درحقیقت عرب کا ترجمہ ہے جو تعصب کی وجہ سے بنو اسرائیل نے وحشی کے لفظ سے کیا ہے ع ر ب کے معنے عربی زبان میں اظہار کے ہوتے ہیں اور عرب عربوں کا نام اسی لئے ہے کہ وہ خیموں میں رہتے تھے اور سب کے دلداد تھے اور نہایت فصیح بلیغ کلام کرنے تھے خیموں اور بادیہ میں رہنے کی وجہ سے ان کے مخالف بجائے خیموں میں رہنے والوں کے انہیں وحشی کہتے تھے بائبل نے بھی یہی طریق اختیار کیا اور جہاں حضرت اسماعیل کا ذکر آیا وہاں بھی انہیں وحشی کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اور جہاں ان کی اولاد میں سے آنے والے نبی کا ذکر آیا وہاں بھی بجائے یوں کہنے کے کہ وہ اسماعیل کی اولاد میں سے ہوگا یہ لکھ دیا کہ وہ وحشی کے ہونٹوں سے کلام کرے گا گو قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور ہر اک کو نظر آتا ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم فرماتا ہے وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (احقاف ع ۲) یعنی اس قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے یہ قرآن اسکی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہے چنانچہ انہی پیشگوئیوں کے مطابق یہ عربی زبان میں اُترا ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور محسنوں کو بشارت دے اس جگہ قرآن کریم کا عربی زبان میں ہونا موسوی کتب کی تصدیق کا موجب قرار دیا ہے اس سے اشارہ کتاب پیدائش کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جس میں حضرت اسماعیل کو وحشی یعنی عرب قرار دیا گیا ہے اور دوسرے استثنار باب ۱۸ آیت ۱۸ کی اس پیشگوئی کی طرف جس میں کہا گیا تھا کہ آئندہ شریعت والا کلام بنو اسحاق میں سے کسی فرد پر نہیں بلکہ ان کے بھائی بنو اسماعیل پر اُتارا جائے گا اور ضمناً حضرت یسعیاہ کی پیشگوئی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا جو حضرت موسیٰ کے تابع نبی تھے اور جنکی مذکورہ بالا پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بیان شدہ پیشگوئی کی مزید وضاحت تھی (۴) چوتھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ نبی یہود سے کہے گا کہ اس کا جائے رہائش آرامگاہ یعنی امن کا مقام ہے پس تم اُن کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیو۔ اس طرح تم چین سے رہوگے مگر یہود نبی کی اس بات کو نہ مانیں گے اور اس جگہ کو آرامگاہ نہ بنے دینگے اور تھکے ہوؤں کو تکلیف دیں گے یہ امر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ پر صادق آتا ہے آپؐ نے مدینہ منورہ کو جہاں یہود بھی رہتے تھے مکہ مکرمہ کی طرح امن کی جگہ قرار دیا اور یہود سے مدینہ منورہ کو باامن رکھنے کے لئے معاہدہ کیا (سیرت حلبیہ جلد ۲) لیکن انھوں نے تھکے ہوؤں کو یعنی مہاجرین کو جو دُور سے سفر کر کے آئے

تھے آرام سے نہ رہنے دیا اور مطابق پیشگوئی خود بھی چین نہ پایا (۵) پانچویں اس پیشگوئی میں تھا۔ حکم پر حکم نازل ہوگا" تاکہ وے چلے جاویں اور پچھاڑی گریں اور شکست کھاویں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں۔" یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری ہوئی۔ یہود نے جب تھکے ہوؤں کو آرام میں نہ رہنے دیا تو وہ "چلے بھی گئے" یعنی کچھ ان میں سے مدینہ سے جلاوطن کئے گئے "۔ "پچھاڑی بھی گرے" یعنی بعض قتل بھی کئے گئے انہوں نے شکست بھی کھائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور دام میں پھنسے اور گرفتار بھی ہوئے بعض ان میں سے غلام بھی بنائے گئے۔

قرآن مجید کا حضرت داؤد اور حضرت دانیال کے کلام کی تصدیق کرنا

یہ کیسی واضح پیشگوئی ہے۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پوری ہوئی اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ نازل نہ ہوتی اور یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کی اس طرح تصدیق نہ ہوتی تو یسعیاہ جھوٹے قرار پاتے لیکن قرآن کریم کے ذریعہ سے ان کی پیشگوئی پوری ہوکر ان کے کلام کی تصدیق ہوگئی۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یسعیاہ نبی کے ایک اور کلام کی تصدیق کرنا۔

تصدیق نمبر ۶

یہی یسعیاہ نبی فرماتے ہیں "باوجود اس کے خداوند یہووا یوں فرماتا ہے دیکھو میں صیحون میں بنیاد کے لئے ایک پتھر رکھونگا ایک آزمایا ہوا پتھر کونے کے سرے کا ایک مہنگ مولا ایک مضبوط نیو والا پتھر اسپر جو ایمان لاوے اتاولی نہ کرے گا" (یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۱۶) حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں " وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا ہے یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸۔ آیت ۲۲ و ۲۳) پھر فرماتے ہیں "مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے ہم خداوند کے گھر میں سے تم کو مبارک بادی دیتے ہیں" (آیت ۲۶) پھر اسی بارہ میں دانیال علیہ السلام پر الہام نازل ہوا اس کا قصہ یوں ہے کہ بنوکدنصر بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جسے وہ بھول گیا اس نے اپنے منجموں سے اس کا حال پوچھا مگر انہوں نے بھولی ہوئی خواب کی تعبیر بتلانے سے معذوری ظاہر کی اسپر بادشاہ نے ان کے قتل کا حکم دیا دانیال نبی جو یروشلم سے لائے ہوئے قیدیوں میں سے تھے انہوں نے یہ حال سُنا تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور اس نے ان کو خواب اور اسکی تعبیر بتادی اسپر انہوں نے بادشاہ سے خواب اور اسکی تعبیر بتلانے پر آمادگی ظاہر کی اور مندرجہ ذیل الفاظ میں خواب اور اسکی تعبیر بتائی " تُو نے اے بادشاہ نظر کی تھی اور دیکھ ایک بڑی مورت تھی وہ بڑی مورت جسکی رونق بے نہایت تھی تیرے سامنے کھڑی ہوئی اور اسکی صورت ہیبتناک تھی اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کا۔ اس کا شکم اور رانیں تانبے کی تھیں اس کی ٹانگیں لوہے کی۔ اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے اور تُو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے نکلا جو اس شکل کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کے مانند ہوئے اور ہَوا انہیں اُڑا لے گئی یہاں تک کہ ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حضور بیان کرتا ہوں تو اے بادشاہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس لئے کہ آسمان کے خدا نے تجھے ایک بادشاہت اور توانائی اور قوت اور شوکت بخشی ہے اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اس نے میدان کے چوپائے اور ہوا کے پرندے تیرے قابو میں کر دیئے اور تجھے ان سبھوں کا حاکم کیا۔ تو ہی وہ سونے کا سر ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی اور اس کے بعد

ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کریگی اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح کہ لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب ہوتا ہے ہاں لوہے کی طرح سے جو سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اسی طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی اور جو کہ تُو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی ماٹی کی، اور کچھ لوہے کی تھیں سو اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا گلاوے سے ملا ہوا تھا سو لوہے کی توانائی اس میں ہوگی اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ ماٹی کی تھیں۔ سو وہ سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہوگی اور جیسا کہ تُو نے دیکھا کہ لوہا گلاوے سے ملا ہُوا ہے وے اپنے آپکو انسان کی نسل سے ملا دینگے لیکن جیسا لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا تیساوے باہم میل نہ کھاوینگے اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہوویگی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی ان سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی تا ابد قائم رہے گی جیسا کہ تُو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا خدا تعالےٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے کو ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اسکی تعبیر یقینی" (دانیال باب ۲ آیت ۳۱ تا ۴۵) ان تین انبیاءؑ کی بتائی ہوئی خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک روحانی بادشاہ کا ظہور ہونے والا تھا جس نے کونے کے پتھر کی حیثیت پانی تھی یعنی وہ روحانی سلسلہ کا آخری وجود ہونے والا تھا۔ وہ پتھر بڑا قیمتی ہوگا مضبوط نیو والا۔ جو اس پر ایمان لائینگے صاحب وقار ہونگے اور جلد باز نہ ہوں گے وہ پتھر ایسا ہوگا جسے معماروں نے رد کیا ہوا ہوگا وہ زبردست بادشاہوں کو کچل ڈالے گا وہ ان گھڑ پتھر ہوگا اور کسی انسان کے ہاتھ نے اسے نہ گھڑا ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس پیشگوئی کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اس کی چاروں طرف روندھا اور اس کے بیچ میں کھود کے کولہو گاڑا اور برج بنایا اور باغبانوں کو سونپ کے آپ پردیس گیا اور جب میوہ کا موسم قریب آیا اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں پاس بھیجا کہ اس کا پھل لاویں پر ان باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کے ایک کو پیٹا اور ایک کو مار ڈالا اور ایک کو پتھراؤ کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو جو پہلوں سے بڑھ کر تھے بھیجا انہوں نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے لیکن جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا آپس میں کہنے لگے وارث یہی ہے آؤ اسے مار ڈالیں کہ اس کی میراث ہماری ہو جائے اور اسے پکڑ کے اور انگورستان کے باہر لے جاکر قتل کیا جب انگورستان کا مالک آوے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا وے اسے بولے ان بدوں کو بری طرح مار ڈالے گا اور انگورستان کو اَور باغبانوں کو سونپے گا جو اسے موسم پر میوہ پہنچاویں یسوع نے انہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہُوا یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائیگی۔"

قرآن مجید اور آنحضرتؐ کا حضرت مسیح کے کلام کی تصدیق کرنا۔

(متی باب ۲۱ آیت ۳۳ تا ۴۳) اس حوالہ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک تمثیل دی ہے اور بتایا ہے کہ بنی اسرائیل نے بہت سے نبیوں کا انکار کیا آخر خدا تعالےٰ نے ایک ایسے نبی کو بھیجا جو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا یعنی خود مسیح علیہ السلام لیکن بنی اسرائیل ان کا بھی انکار کریں گے اور انہیں قتل کریں گے یعنی قتل کرنے کی کوشش کرینگے جیسا کہ دوسرے

حوالوں سے جو اپنے وقت پر بیان ہونگے ثابت ہے) اسپر ایک ایسا نبی آئے گا جو خدا تعالیٰ کا ظہور کہلائے گا اور وہ کونے کا پتھر ہوگا اسکی آمد پر بنی اسرائیل کو مکمل سزا دی جائے گی اور خدا تعالےٰ کی بادشاہت ایک ایسی قوم کے سپُرد کی جائے گی جو خدا تعالےٰ کو وقت پر میوہ پہنچائیں گے یعنی خدا تعالیٰ کے احکام کو پوری طرح بجالائیں گے وہ پتھر اس شان کا ہوگا کہ جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا اور جو اس پر گرے گا وہ بھی چُور چُور ہو گا۔

آنحضرتؐ کا اپنے آپ کو کونے کا پتھر کہنا۔

یہ پیشگوئیاں جن کے بیان کرنے میں چار نبیوں نے حصہ لیا ہے یعنی داؤدؑ۔ یسعیاہؑ دانیالؑ اور حضرت مسیحؑ ایسی واضح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری ہوتی ہیں کہ سوائے تعصب سے اندھے شخص کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا آپ بنو اسماعیل میں سے تھے جن کو بنو اسحاق نے ہمیشہ رد کیا اور ابراہیمؑ کی برکتوں سے ہمیشہ محروم رکھنے کی کوششیں کیں آپ نے خود دعویٰ فرمایا کہ میں کونے کا پتھر ہوں چنانچہ آپ فرماتے ہیں مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَآءِ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بُنْیَانًا فَاَحْسَنَہٗ وَاَجْمَلَہٗ فَجَعَلَ النَّاسُ یُطِیْفُوْنَ بِہٖ یَقُوْلُوْنَ مَارَاَیْنَا بُنْیَانًا اَحْسَنَ مِنْ ھٰذَا اِلَّا ھٰذِہِ اللَّبِنَۃَ فَکُنْتُ اَنَا تِلْکَ اللَّبِنَۃَ (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل) یعنی میرا اور دوسرے انبیاء کا حال یُوں ہے کہ جیسے کسی نے ایک عمدہ اور خوبصورت محل تیار کیا پھر لوگ کثرت سے اسے دیکھنے کے لئے آنے لگے اور کہتے تھے کہ ہم نے اس سے عمدہ محل کوئی نہیں دیکھا ہاں یہ کونہ اس کا ننگا ہے پھر خدا تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا اور میں وہ کونے کا پتھر ہوں۔ آپؐ کا وجود نہایت قیمتی وجود تھا اور آپکی بنیاد مضبوط جیسا کہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ باوجود دنیا کی شدید مخالفت کے تیرہ سو سال سے آپؐ کے مقام کو کوئی نہیں ہلا سکا۔ آپؐ کے صحابہ مسیح کے حواریوں کی طرح جلد بازی کرنے والے نہ تھے بلکہ نہایت صاحبِ وقار تھے مسیح کے حواریوں کا تو یہ حال

کونے کا پتھر یعنی آنحضرتؐ کی شان

تھا کہ جب مسیحؑ کو رومی سلطنت نے پکڑا تو وہ ان کا انکار کر بیٹھے اور تتر بتر ہوگئے (متی باب ۲۶ آیت ۵۶-۷۰-۷۲-۷۴) مگر آپؐ کے صحابہ نے خطرناک مواقع پر کہا کہ یا رسول اللہ ہم آپکے دائیں بھی لڑینگے بائیں بھی اور آگے بھی لڑینگے پیچھے بھی اور دشمن آپؐ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہماری لاشوں کو روندتا ہُوا نہ گزرے قرآن کریم انکی شان میں فرماتا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان ع ۶) یعنی محمد رسول اللہ پر ایمان لانے والے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ زمین پر بڑے اطمینان سے چلتے ہیں اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور جب جاہل لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں تو وہ غصہ میں آکر گالیاں نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری سلامتی چاہتے ہیں پھر فرماتا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (فرقان ع ۶) یعنی جب وہ لہو و لعب کے امور کے مواقع کے پاس سے گزرتے ہیں تو دنیوی لذات سے متاثر ہو کر ان میں شامل نہیں ہو جاتے جیسے کہ مسیح کی اُمت ہے کہ ذکر الٰہی کو بھول کر ناچ گانے اور موسیقی میں مشغول ہوگئی ہے بلکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اُخروی زندگی کی طرف جس کے پھل دیر سے ملتے ہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پھر اس کونے کے پتھر کی شان یہ بتائی تھی کہ اس کا آنا خدا تعالیٰ کا آنا کہلائے گا اور خدا تعالیٰ کے نام پر آئے گا۔ مسیح علیہ السلام نے اسکی مزید تشریح یہ کر دی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے نام پر آنے والا خدا کا بیٹا کہلانے والے کے بعد آئے گا چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تشریف لائے اور آپ کا آنا خدا کا آنا کہلایا۔ چنانچہ آپؐ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (فتح ع ۱) یعنی وہ لوگ جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں تیرا ہاتھ

ان کے ہاتھوں پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

ان الفاظ میں کہ آپ کا آنا خدا کا آنا ہے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ مثیل موسیٰ ہونگے کیونکہ حضرت موسیٰ کی نسبت آتا ہے کہ وہ خدا کی مانند تھا۔ چنانچہ خروج باب ۷ آیت ۱ میں ہے کہ "پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ دیکھ مَیں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا" پس خدا کے مانند ہونے کے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ وہ مثیل موسیٰ ہوگا اور اس طرح گویا استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر اس پیشگوئی میں ہے کہ وہ پتھر جس پر گرے گا اسے پیس ڈالے گا اور جو اس پر گرے گا چُور چُور ہوگا سو ایسا ہی آپ سے ہُوا۔ باوجود انتہائی غربت اور کمزوری کے ساری قوموں سے آپ کی لڑائی ہوئی اور آپ کامیاب ہوئے حضرت مسیح علیہ السلام نے تو آپ کی جنگوں کا نقشہ ہی کھینچ دیا ہے یعنی فرماتے ہیں "جو اس پتھر پر گرے گا وہ چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا" یعنی اس کی جنگوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ پہلے دشمن اس پر حملہ کرے گا اور سخت نقصان اٹھاتا رہے گا بعد میں وہ دشمن پر حملہ کرے گا اور اسے تباہ کر دے گا اسی طرح آپ سے ہُوا کہ پہلے آپ کے دشمن آپ پر حملہ کرتے رہے اور چُور ہوتے رہے بعد میں آپ نے حملہ کیا اور ان کی شوکت کو بالکل توڑ دیا۔ دانیال نبی نے یہ خبر بھی دی تھی کہ اسکی جنگ اپنی ہی قوم سے نہ ہوگی بلکہ اس کے زمانہ کی زبردست حکومتوں سے بھی ہوگی اور وہ بھی اس کے ہاتھوں تباہ ہونگی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں آپ کی پیشگوئی کے مطابق قیصر کی حکومت تباہ ہوئی دانیال نبی نے اس حکومت کے مذہب کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے فرماتے ہیں "اور جیسا تُو نے دیکھا کہ لوہا گاوے سے ملا ہُوا ہے وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملاویں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا تیسا وے باہم میل نہ کھائیں گے" (دانیال باب ۲ آیت ۴۳)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہوگی جس میں داخل ہونے کا اسے حق نہ ہوگا کیونکہ یہ فرمایا کہ وہ قوم اپنے آپ کو انسان کی نسل سے ملاویگی۔ اس سے یہ مُراد تو نہیں ہوسکتی کہ وہ انسان نہ ہونگے کیونکہ انسان ہونا تو ان کا ظاہر ہے پس اس کے کوئی معنے کرنے پڑینگے اور وہ یہی ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ابن آدم سے ملانیکی کوشش کرینگے یعنی مسیح علیہ السلام سے لیکن ان کا یہ دعویٰ باطل ہوگا کیونکہ ابن آدم یعنی مسیح تو صرف بنی اسرائیل کے لئے آئے گا غیر قوموں کو اس کے مذہب میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ ہوگی جیسے کہ خود مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی پاس نہیں بھیجا گیا" (متی باب ۱۵ آیت ۲۴) اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے جب اپنے بعض حواریوں کو مبلّغ بنا کر بھجوایا تو انہیں مندرجہ ذیل الفاظ میں حکم دیا۔ "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا" (متی باب ۱۰ آیت ۵)

حضرت مسیح علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگوں کا نقشہ کھینچنا۔

پس رومی لوگ جو اپنے آپ کو مسیحی کہتے تھے ان کی مثال ایسے وجود کی تھی جو اپنے آپ کو ایسی نسل میں شامل کرتا ہے جس میں وہ شامل ہونے کا حق نہیں رکھتا اور یہ جو مَیں نے کہا ہے کہ انسان سے مراد مسیح ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا نام بار بار انجیل میں ابن آدم آتا ہے چنانچہ متی باب ۲۴ آیت ۲۷ میں لکھا ہے "جیسے بجلی پورب سے کوندھ کے پچھم تک چمکتی ویسا ہی ابن آدم کا آنا بھی ہوگا" پس انسان سے مراد اس جگہ ابن آدم کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کرنا ہے۔

ان گھڑ پتھر سے مراد آنحضرت کا امی ہونا

پھر لکھا تھا کہ وہ ان گھڑ پتھر ہوگا اس سے مراد یہ تھی کہ وہ پڑھا لکھا نہ ہوگا اور انسانوں نے اسے تعلیم نہ دی ہوگی چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اور قرآن کریم نے اس پیشگوئی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف ع ۱۹)

یعنی وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں اس رسول نبی اور اُمّی کی جس کا ذکر توراۃ اور انجیل میں موجود ہے اس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ توراۃ اور انجیل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تین ناموں سے کیا گیا ہے۔ رسول کے نام سے نبی کے نام سے۔ اور اُمّی یعنی اَن پڑھ کے نام سے اور جیسا کہ اوپر کے حوالجات میں بتایا گیا ہے عہد نامہ قدیم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان گھڑے پتھر کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انجیل نے اس پیشگوئی کی تصدیق کی ہے اور گویا عربی زبان کے محاورہ کے مطابق آپ کے اُمّی ہونے کی خبر دی ہے۔

اَن پڑھ ہونے کی پیشگوئی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ اس پیشگوئی کو نادانی سے مسیح ناصری پر چسپاں کرتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ مسیح ان پڑھ نہ تھا اس کے انسان اُستاد تھے چنانچہ لکھا ہے " تب یسوع جلیل سے یردن کے کنارے یوحنا کے پاس آیا تاکہ اس سے بپتسمہ پاوے" (متی باب ۳ آیت ۱۳) پھر لکھا ہے " اور یسوع بپتسمہ پا کے وہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا" (آیت ۱۶) پس مسیح نے نہ صرف مادی تعلیم پائی بلکہ روحانی تعلیم کے لئے بھی وہ یحییٰ کا شاگرد ہوا پس وہ اُمّی نہیں کہلا سکتا اور اس پیشگوئی کے مصداق کے لئے اُمّی ہونے کی شرط ہے نیز مسیح میں یہ بات بھی پائی نہیں جاتی کہ جو اس پر گرے چُور چُور ہو جائے اور جس پر وہ گرے اسے نیست کر دے لوگ مسیح پر گرے اور اسے ایذا دی اور اسے کسی پر گرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

اب اگر یہ پیشگوئیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری نہ ہوتیں تو داؤد۔ یسعیاہ۔ دانیالؑ۔ اور مسیح علیہ السلام سب کے سب نعوذ باللہ من ذالک جھوٹے قرار پاتے۔ پس ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے قرآن کریم نے ان انبیاءؑ کے کلام کی تصدیق کی ہے۔

قرآن مجید اور آنحضرتؐ کا مسیح کے حواریوں کے اقوال کی تصدیق کرنا۔

تصدیق نمبر ۷ کتاب اعمال میں لکھا ہے " پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا بلکہ سب نبیوں نے سموایل سے لے کے پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دنوں کی خبر دی ہے تم نبیوں کی اولاد اور اس عہد کے ہو جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے جب ابراہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پاویں گے تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی بدیوں سے پھیر کے برکت دے" (اعمال باب ۳ آیت ۱۹ تا ۲۶) یہ پیشگوئی اعمال میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ پیشگوئی بہر حال حضرت مسیح علیہ السلام سے کی ہوگی کیونکہ حواری انہی کے اقوال کو نقل کرتے ہیں اور مسیحیوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ حواری جو کچھ کہتے تھے مسیح کے روحانی اثر کے نیچے کہتے تھے اسی وجہ سے حواریوں کے اعمال و اقوال کو انہوں نے الہامی نوشتوں میں جگہ دی ہے اور بائبل کا حصہ قرار دیا ہے علاوہ ازیں جیسا کہ تصدیق نمبر ۶ میں بیان کیا جا چکا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے دوسرے لفظوں میں اس پیشگوئی کو بیان کیا ہے پس جو کچھ اعمال کے حوالہ میں کہا گیا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کہا ہوا ہے۔

اس حوالہ میں مندرجہ ذیل امور بیان ہوئے ہیں (۱) مسیح علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں نازل نہ ہونگے جب تک کہ وہ پیشگوئی موسیٰ کی پوری نہ ہولے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی موسیٰ کی مانند آئے گا (۲) موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ سموایل سے لے کر آخر تک سب نبیوں نے اس

آنے والے کی خبر دی ہے (۲) مسیح اوّل کی آمد اس نبی کے لئے بشارت دینے والے کی تھی کیونکہ لکھا ہے تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم کو اپنی بدیوں سے پھیر کے برکت دے۔

مَیں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ موسیٰ کی مانند نبی یا انجیل کے محاورہ کے مطابق وہ نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے پس اس پیشگوئی میں جو کہا گیا ہے کہ ضروری ہے کہ مسیح آسمان پر ہی رہے جب تک سب پیشگوئیاں خصوصاً مثیل موسیٰ کے آنے کی پیشگوئی پوری نہ ہو جائے۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی نیز یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حضرت مسیح کی پہلی آمد اس لئے تھی کہ تا وہ اس نبی کے لئے راستہ صاف کریں اور لوگوں کے دلوں کو گناہوں سے صاف کردیں تا وہ اس پر ایمان لائیں کیونکہ لکھا ہے خدا نے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا۔ یہ الفاظ صاف بتلاتے ہیں کہ مسیح کی آمد بطور ایک مبشر کے تھی اور غرض یہ تھی کہ کچھ لوگوں کے دل صاف ہو جائیں اور یہودیت کی سختی ان کے دلوں پر سے جاتی رہے اور ایسا ہی ہوا۔ قرآن کریم فرماتا ہے لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (المائدہ ع)
یعنے مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تو یہود کو پائے گا اسی طرح مشرک لوگوں کو۔ اور مسلمانوں سے محبت کرنے میں سب سے زیادہ قریب تو ان لوگوں کو پائے گا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ اس لئے ہے کہ ان میں پادریوں اور زاہدوں کا گروہ پایا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ ان میں فروتنی پائی جاتی ہے اور جب وہ اس کلام کو جو ہمارے اس رسول پر نازل ہوا ہے سنتے ہیں تو اس وجہ سے کہ انہوں نے سچ کو پہچان لیا ہے تجھے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں اے رب ہم ایمان لے آئے ہمارا نام بھی گواہوں میں لکھ لے۔

غرض قرآن کریم بھی مسیح کی اس پیشگوئی کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح نے پہلے آکر بہتوں کے دلوں کو گناہوں سے پھیر دیا اور انہیں برکت دی حتیٰ کہ ■ اس نبی کو جو موسیٰ کی مانند تھا ماننے کے قابل ہو گئے۔

اوپر کی پیشگوئی کو پورا کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح اور سموایل سے لے کر آخر تک کے سب نبیوں کی تصدیق کی۔ اگر آپ نہ آتے تو یہ سب کے سب جھوٹے ٹھہرتے۔

پیشگوئیاں تو بہت ہیں جن کو پورا کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انبیاء کے کلام کی تصدیق کی ہے مگر میں اس موقعہ پر اسی پر بس کرتا ہوں انہی مثالوں سے ہر غیر متعصب اس امر کو سمجھ سکے گا کہ قرآن کریم کا بنی اسرائیل سے یہ کہنا کہ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کیسا سچا دعویٰ ہے قرآن کریم بنی اسرائیل کی کتب کی خبروں کو پورا کرنے والا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کرتا وہ اپنی کتب کا انکار کرتا ہے جنہوں نے اس کے ظہور کی خبر دی تھی۔

قرآن کریم کے مصدق ہونے پر عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب۔

بعض مسیحی مصنف اس آیت کی نسبت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قرآن کریم نے اس آیت میں یہ اعلان کیا ہے کہ جو کچھ تمہاری موجودہ کتب میں لکھا ہے وہ سب سچ ہے اور یہ معنے کر کے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جبکہ قرآن کریم کے نزدیک موجودہ بائبل درست ہے تو پھر قرآن کریم جھوٹا ہوا کیونکہ ■ موجودہ بائبل کے خلاف مضامین بیان کرتا ہے میری سمجھ میں یہ ذہنیت کبھی بھی نہیں آتی کہ چونکہ الف باء

تصدیق کے دو معنے کسی کو سچا کہنے اور کسی کی بات کو پورا کرنے کے۔

کو سچا کہتا ہے اس لئے وہ جھوٹا ہے یہ تو گویا احسان کا بدلہ ظلم سے دیتا ہے مگر جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں۔ اس آیت کے معنے یہی ہی نہیں جو یہ پادری صاحب کرتے ہیں انہیں تصدیق کے لفظ سے دھوکا لگا ہے حالانکہ تصدیق کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے کسی کو سچا کہنے کے معنوں میں بھی اور اسکی بات کو پورا کرنے کے معنوں میں بھی۔ اور یہاں وہ دوسرے معنے ہیں قرآن کریم دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران ع ۹) یعنی جب اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ فرماتے ہوئے پختہ عہد لیا کہ میرے تم کو کتاب اور حکمت دینے کے بعد جو ایسا رسول آئے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اس کا مصدق ہو تو تم اسپر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا پھر فرمایا کہ کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس بارہ میں مجھ سے پختہ عہد باندھتے ہو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں اسپر فرمایا کہ اب تم بھی گواہ رہو اور میں بھی تمہارا گواہ رہونگا اور یہ بھی یاد رکھو کہ اب اس عہد کے بعد جو لوگ اس سے پھر جائینگے فاسقوں میں سے گنے جائینگے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک تمام انبیاء کو ایک ایسے نبی کے آنے کی خبر دی گئی تھی جو سب انبیاء کی کتب کی تصدیق کرے گا اور اسپر ایمان لانا سب قوموں کے لئے ضروری ہو گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نبیوں کے متعلق فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع ۳) کوئی قوم ایسی نہیں گزری کہ اس میں نبی نہ آیا ہو پھر اس کے بعد فرماتا ہے وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (فاطر ع ۴) یعنی جو کتاب اللہ تعالیٰ نے تجھ پر وحی نازل کی ہے ساری کی ساری حق ہے اور اس سے پہلے جس قدر وحیاں نازل ہو چکی ہیں سب کی مصدق ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے بندوں سے خبردار اور ان کے حال کا دیکھنے والا ہے ان آیات کو پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی سب دُنیا میں اور ہر قوم میں آئے ہیں اور یہ کہ اس آیت کا موعود نبی ہر نبی کی کتاب کا مصدق ہوگا اور ہر نبی کی اُمت کو اسپر ایمان لانا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس قسم کی تصدیق قرآن کریم بائبل کی کرتا ہے ویسی ہی تصدیق وہ دیدوں کی بھی کرتا ہے اور ویسی ہی تصدیق وہ ژندکی بھی کرتا ہے اور ویسی ہی ان تمام نبیوں کی کتب کی جو دُنیا کے کسی گوشہ میں گذرے ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کتب کی موجودہ شکلوں میں شدید اختلاف ہے اگر انہیں موجودہ شکل میں درست قرار دیا جائے تو چونکہ یہ ایک دوسرے کی مکذب ہیں مذہب کا کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ اور ہم انہیں موجودہ شکل میں خدا تعالیٰ کی کتاب کہہ کر گویا خود ان نبیوں کی تکذیب کرتے ہیں جنکی طرف وہ منسوب ہیں مثلاً کیا ہم موجودہ تورات کو کلی طور پر موسیٰؑ کا الہام کہہ سکتے ہیں اس میں تو یہ لکھا ہے "سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اسکی قبر کو نہیں جانتا" (استثناء باب ۳۴ آیت ۵ و ۶) پھر لکھا ہے "اور نون کا بیٹا یشوع دانائی کی روح سے معمور ہوا کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اسپر رکھے تھے اور بنی اسرائیل اس کے شنوا ہوئے اور جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا انہوں نے ویسا ہی کیا۔ اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا" (استثناء باب ۳۴ آیت ۹ و ۱۰) ان آیات سے ظاہر ہے کہ یہ موسیٰ کی وفات کے لمبے عرصہ بعد لکھی گئی ہیں بلکہ اس وقت جبکہ موسیٰ کی قبر کا نشان تک مٹ گیا تھا اور بہت سے نبی بنی اسرائیل میں آچکے تھے کیونکہ لکھا ہے اب تک

موسیٰ کی مانند نبی بنی اسرائیل میں کوئی نہیں آیا۔ کیا کوئی عقلمند مان سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی وفات کے سینکڑوں سال بعد دوبارہ دُنیا میں آئے تھے اور یہ الفاظ اپنی کتاب میں بڑھا گئے تھے اگر ایسا نہیں بلکہ کسی اور ہاتھ نے صدیوں بعد موسیٰ کی کتاب کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اور کیا کیا اس کتاب میں نہ بڑھا دیا ہوگا پھر قرآن کریم کی تصدیق ہم کس کس آیت پر چسپاں کریں اور کیونکر معلوم کریں کہ اس محرف کتاب میں کہ جسے آج بائبل کے اپنے علماء بھی بہت سے ہاتھوں اور بہت سے زمانوں کا لکھا ہُوا بتاتے ہیں کونسا کلام خدا کا ہے جسکی ہم تصدیق کریں۔ اور کونسا انسانوں کا ہے کہ جسے ہم رد کرنے کے مجاز ہوں۔

اسی طرح انجیل میں لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان میں سے جو یہاں کھڑے ہیں بعضے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اپنی بادشاہت میں آتے دیکھ نہ لیں موت کا مزہ نہ چکھیں گے" (متی باب ۱۶ آیت ۲۸) لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ سب لوگ مر گئے اور اس وقت تک انکی سو سو پشت مر چکی ہے مگر مسیحیوں کے نزدیک ابھی تک ابن آدم اپنی بادشاہت میں نہیں آیا اگر مسیح کی آمد سے اس کی قوم کی ترقی مراد لی جائے تب بھی یہ بات غلط ہوتی کیونکہ مسیحیوں کو ترقی تین سو سال واقعہ صلیب کے بعد ملی اور اس وقت تک ایک آدمی بھی مسیح کے زمانہ کا زندہ نہ تھا اب یہ پادری صاحبان جو تصدیق کے معنے اس کے سچا ہونیکا اقرار کرتے ہیں۔ ہمیں بتائیں کہ قرآن کریم اس قسم کی باتوں کی کس طرح تصدیق کر سکتا ہے۔

بڑی بات تو یہ ہے کہ مسیحی صاحبان کے نزدیک اناجیل میں مسیح کی خدائی اور اقنوم ثلاثہ کا ذکر ہے اور قرآن کریم فرماتا ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (مائدہ ع ۱۰) یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ تین اقنوم میں سے ایک اقنوم ہے (یعنی نصاریٰ) وُہ کافر ہیں اور حق یہی ہے کہ دُنیا کا معبود صرف ایک ہی ہے اور اگر یہ شرک کرنے والے لوگ اپنے شرک سے رُکیں گے نہیں تو جو ان میں سے کفر پر اصرار کریں گے انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ آیت اور ایسی ہی اور بہت سی آیات صاف بتاتی ہیں کہ قرآن کریم اس انجیل کا یقیناً مصدق نہیں جسے مسیحی لوگ پیش کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم انجیل کے اس مفہوم کا ہرگز مصدق نہیں جسے آجکل کے مسیحی لوگ پیش کرتے ہیں پھر ان معنوں سے مسیحی لوگ کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

قرآن مجید کا عام سلوک کے لحاظ سے تورات وانجیل کی تصدیق کرنا ان کے محرف ہونے کے دعوے کے مخالف نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تصدیق انسانوں کی دو طرح ہوتی ہے۔ اول یہ کہ کسی انسان کو راستباز کہا جائے دوم یہ کہ اُسکی کسی بات کو سچا ثابت کر دیا جائے خواہ زبان سے مثلاً کہا جائے کہ اس قول میں یہ سچا ہے یا فعل سے کہ عملاً اس کے قول کی تصدیق کی جائے مثلاً اس نے اس کے متعلق کسی کام کے کرنے کی خبر دی ہو اور یہ وہ کام کر دے لیکن کتب سماویہ کی تصدیق تین طرح ہوتی ہے اس طرح بھی کہ انہیں کلی طور پر سچا کہا جائے اس طرح بھی کہ ان کے بعض حصص کی تصدیق کی جائے اور اس طرح بھی کہ ان کی ابتدائی حالت کی تصدیق کی جائے مثلاً اس امر کا اقرار کہ وہ ابتداء میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور ان کے پیش کرنے والے راستباز تھے جھوٹے نہ تھے گو اب اس کتاب میں لوگوں نے خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔

کتب سماویہ کی تصدیق تین طرح ہوتی ہے

مَیں ثابت کر چکا ہوں کہ کلی تصدیق پہلی کتب کی نہ تو ممکن ہے اور نہ قرآن کریم ایسا کر سکتا ہے ممکن اس لئے نہیں کہ وہ سب کتب اس وقت دُنیا میں موجود ہی نہیں اور قرآن کریم کی شان کے لائق اس لئے نہیں کہ وہ خود ہی ان کتب کی غلطیاں بیان کرتا ہے پس جب وہ ان کتب کی غلطیاں بیان کرتا ہے تو ان کی تصدیق کیونکر کر سکتا ہے۔ اب صرف دو طریق تصدیق کے رہ گئے جزئی تصدیق یا ابتدائی حالت کی تصدیق یہ دونوں

قرآن مجید کی دو طرح سے کتب سماویہ کی تصدیق۔

کتب کی تصدیق قرآن کریم انہی دو طریق سے کرتا ہے جو کتب تو دنیا میں موجود ہیں ان کی تو دونوں قسم کی تصدیق کرتا ہے یعنی ان کے بعض مسائل کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی بعض پیشگوئیوں کو اپنی ذات میں پورا کر کے انہیں سچا ثابت کرتا ہے دوسری تصدیق وہ یہ بھی کرتا ہے کہ سب کتب سماویہ کے متعلق وہ یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت انہیں دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا وہ سچی تھیں۔ وہ حضرت آدمؑ کے الہام حضرت نوحؑ کے الہام حضرت ابراہیمؑ کے الہام حضرت موسیٰؑ کے الہام حضرت مسیحؑ کے الہام حضرت کرشنؑ کے الہام حضرت رامچندرؑ کے الہام حضرت زردشتؑ کے الہام۔ اور باقی ان تمام انبیاء کے الہاموں کی تصدیق کرتا ہے جو وقتاً فوقتاً اور مختلف مُلکوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے خواہ ان کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں چنانچہ فرماتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (مومن ع ۸) یعنی اے محمد رسول اللہ ہم تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیج چکے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے قرآن میں کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا اور یاد رکھو کہ کسی رسول کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی نشان لے آئے پس جب اللہ کا حکم آجائے تو سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور جو بھی جھوٹا ہو ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ صرف وہی نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آچکے ہیں پھر یہ سوال اُٹھایا ہے کہ جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہم کیونکر جانیں کہ وہ سچے تھے تو اسکی یہ علامت بتائی ہے کہ رسول نشان لے کر آتا ہے اور نشان خدا تعالیٰ کی امداد کے بغیر کوئی نہیں دکھا سکتا۔ پس جو نشان دکھاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے پھر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ بہت سے نشان یعنی شہادت اور واقعات کے تفصیلی علم کو چاہتے ہیں اور مختلف اقوام جن لوگوں کو بطور اپنے نبیوں کے پیش کرتی ہیں ان کے تفصیلی حالات کا ہمیں علم نہیں پھر انکی سچائی کو کس طرح معلوم کریں تو اس سوال کا جواب اس طرح دیا کہ ایک نشان ایسا ہے جو سب نبیوں میں مشترک ہے اور وہ اپنی شہادت ہر وقت ساتھ رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی نبی دنیا میں آتا ہے آخر کار (۱) اس کے مخالف ہلاک ہو جاتے ہیں اور (۲) اس کا نام دُنیا میں رہ جاتا ہے اور اس کے اتباع کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جس مدعیٔ الہام کی تائید میں یہ امر دیکھو سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کی تائید اس کے حق میں ہے اور وہ جھوٹا نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف انہی انبیاء کا مصدق نہیں جن کے نام اس نے لئے ہیں بلکہ اُن انبیاء کا بھی مصدق ہے جن کے نام اس نے نہیں لئے اور جب وہ ایسے انبیاء کا مصدق ہے تو ان کے کلام کا بھی مصدق ہے اور اس ناپید یا غیر مذکور کلام کی تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اجمالاً ایمان لایا جائے کہ وہ سچے ہیں پس تصدیق کے دوسرے معنے اجمالی ایمان کے ہیں یعنی ان کلاموں کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور ایسی ہی تصدیق قرآن کریم یہود و نصاریٰ کی کتب کی بھی کرتا ہے پس اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم انکی موجودہ صورت کو صحیح قرار دیتا ہے ظلم ہے اور دیگر آیاتِ قرآنیہ اور واقعات اور خود انکی کتب کی اندرونی شہادت کے خلاف ہے۔

تصدیق کو لِمَا مَعَكُمْ کے الفاظ کے ساتھ مقید کرنے کے لحاظ سے قرآن مجید کے تورات و انجیل کے مصدق ہونے کا مطلب۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں توراتؑ انجیل کی تصدیق کا ذکر نہیں بلکہ لِمَا مَعَكُمْ کی تصدیق کا ذکر ہے یعنے قرآن جو کچھ انکے پاس ہے اس کا مصدق ہے اب اگر ان الفاظ کے وسیع معنے لئے جائیں تو ان کے یہ معنے ہونگے کہ ان کے قصوں کہانیوں کی بھی وہ تصدیق کرتا ہے لیکن یہ معنے بالبداہت باطل ہیں اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان الفاظ کو بعض قیود سے مقید کرنا ہوگا اور وہ قیود معقول طور پر یہی ہو سکتی ہیں (۱) اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ جو مضمون اس قسم

کی آیات سے پہلے یا بعد میں بیان ہو رہا ہے یہ الفاظ ساری کتاب کی نہیں بلکہ صرف اسکی تصدیق کے بارہ میں ہیں اور یہ مطلب لیا جاوے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو تعلیم ہماری ہے وہی تمہاری کتب میں ہے پس تصدیق خاص ہو گی نہ کہ عام۔ انہی معنوں کے رو سے یعنے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ قرآن کریم تمہاری کتب میں بیان شدہ پیشگوئیوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی انہیں پورا کرتا ہے (۲) یا پھر لِمَا مَعَكُمْ کو اس حد بندی سے محدود کیا جائے گا کہ تمہارے پاس جو خدا کا کلام ہے اسکی تصدیق قرآن کریم کرتا ہے اور ان معنوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں اس میں کیا شک ہے کہ پہلی کتب میں جو خدا کا کلام ہے اس کی تصدیق ہر دوسرے آسمانی کلام کو کرنی چاہیئے مگر اس تصدیق کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ جو کچھ بھی ان کتب میں ہے وہ ضرور خدا کا کلام ہے۔

اس سوال کے متعلق ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ پہلی کتب کے لئے جس جس جگہ قرآن کریم میں تصدیق کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کا صلہ لام آیا ہے سوائے دو جگہوں کے جہاں کوئی صلہ استعمال نہیں ہوا لیکن جہاں قرآن کریم یا رسول کریم کی نسبت یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کا صلہ با آتا ہے اور لغت سے بھی ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تصدیق کے معنے اس کو سچا قرار دینے کے ہوں وہاں با صلہ آتا ہے پس اس اختلاف سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں جہاں پرانی کتب کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کے اور معنے ہیں اور وہ یہی ہو سکتے ہیں کہ پہلی کتب میں جو پیشگوئیاں تھیں قرآن کریم ان کا پورا کرنے والا ہے یہ نہیں کہ ان کے اندر جو کچھ غلط یا درست لکھا ہوا ہے اس کو سچا قرار دیتا ہے قرآن کریم کی بعض آیات بھی اس استدلال کی تصدیق کرتی ہیں سورۂ احقاف میں ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (احقاف ع ۲ و ع ۲) یعنے اے لوگو بتاؤ تو سہی کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اور تم نے اس کا انکار کر دیا تو کیا بنے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اپنے مثیل نبی آنے کی خبر دی ہے پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم نے تکبر سے کام لیا یاد رکھو کہ اللہ ظالموں کو کبھی کامیاب نہیں کرتا اور کافر مسلمانوں کے حق میں کہتے ہیں کہ اگر اس کلام میں کوئی بھلائی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے کس طرح ایمان لے آتے بات یہ ہے کہ چونکہ ان کو ہدایت نہیں ملی اب تو انہوں نے یہی کہنا ہوا کہ پہلے کلام بھی جھوٹے تھے یہ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے جو لوگوں کو ہدایت دیتی تھی اور رحمت کا موجب تھی اور اب یہ کتاب اس کی مصدق ہے اور عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور محسنوں کو بشارت دے۔

اُنْظُرْ تصدیق کے ساتھ دو مختلف صلے اکر دو مختلف باتوں کی طرف اشارہ۔

ان آیات سے پہلی آیات پڑھو تو معلوم ہوگا کہ اس جگہ یہود نہیں بلکہ کفار مکہ مخاطب ہیں ان سے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اپنے مثیل کی خبر دی تھی (جس میں یہ بھی خبر تھی کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا) اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ موسیٰ نے بنو اسحاق میں سے ہو کر اس پر ایمان کا اظہار کیا اور تم جن کو عزت ملی تھی اپنی قوم کے نبی کے ماننے میں تکبر سے کام لے رہے ہو اس پر کفار کا اعتراض بیان فرمایا ہے کہ ہم تو اس کے جھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ اس کو ماننے والے ادنیٰ لوگ ہیں بڑے لوگ تو

سب اس کے مخالف ہیں اگر یہ سچا ہوتا تو سب سے پہلے
ہمیں اس پر ایمان لانے کا موقعہ ملتا۔ اس کا جواب یہ فرمایا
کہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے جو اپنی ہدایت اور
فائدہ کے لحاظ سے اپنی سچائی کا ثبوت دے چکی ہے اس میں
اس کتاب کے بارہ میں پیشگوئیاں ہیں جن کو یہ کتاب پورا
کرتی ہے چنانچہ ان پیشگوئیوں کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس کتاب
کی زبان عربی ہوگی اور دوسری یہ کہ اس کی قوم کے لوگ
اس کے مخالف ہونگے اب ان صدیوں پہلے کی پیشگوئیوں
کو جب یہ کتاب پورا کرتی ہے تو تم اس کا انکار کیونکر کرسکتے ہو
آئندہ شریعت کے عربی زبان میں ہونے کی پیشگوئی
استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ سے نکلتی ہے جہاں بتایا ہے کہ
آنے والا موعود بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی
بنو اسمٰعیل میں سے ہوگا اور اس کی مخالفت کی خبر استثناء
باب ۳۳ آیت ۲ سے نکلتی ہے جہاں لکھا ہے کہ وہ دس ہزار
قدوسیوں کے ساتھ آئے گا اور اس کے داہنے ہاتھ میں
آتشی شریعت ہوگی یعنی وہ ضرورت کے موقعہ پر جنگ
کرے گا اور جنگ کی اجازت دے گا۔ ظاہر ہے کہ جنگ
کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب قوم مخالفت کرے
اور مخالف زبردست ہوں۔ پس مکہ والوں کا یہ کہنا کہ ہم جو
بڑے لوگ ہیں ایمان نہیں لاتے یہ ان کے سچا ہونے کی
دلیل نہیں بلکہ قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے سچا ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے موسیٰ
کی خبر کا ایک اور حصہ پورا ہوا اور ایک طرف اس سے
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوئی تو دوسری
طرف حضرت موسیٰ کی سچائی ظاہر ہوئی۔

اس آیت سے تصدیق کے معنے بالکل واضح ہو
جاتے ہیں کیونکہ یہ زبانی تصدیق کہ تورات سچی ہے کفارِ مکہ
پر کیا اثر کرسکتی تھی وہ قرآن اور تورات دونوں کو جھوٹا سمجھتے
تھے کفارِ مکہ پر وہی تصدیق حجت ہوسکتی تھی جس میں کسی پیشگوئی
کے پورا ہونے کا ذکر ہو کیونکہ پیشگوئی خواہ کسی نبی کی ہو چونکہ
علم غیب پر مشتمل ہوتی ہے ہر ایک شخص پر حجت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں
تصدیق کے معنے پیشگوئی پورا کرنے کے سوا اور کوئی ہو ہی
نہیں سکتے اور یہی معنی ہیں جو مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ والی
آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات میں استعمال ہوئے ہیں

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ کی تشریح

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ۔ اس جملہ کا پہلا حصہ جمع
ہے اور دوسرا مفرد یعنی لَا تَكُوْنُوْا کے معنے ہیں کہ اے
بنی اسرائیل تم نہ بنو اور اس کا جواب کہ کیا نہ بنو یہ دیا ہے کہ
اوّل کافر۔ بنو اور کافر مفرد ہے اُردو کے لحاظ سے تو اس پر
کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اردو میں ایسے موقعہ پر مفرد کا لفظ
ہی استعمال کرتے ہیں لیکن عربی کے محاورہ کے مطابق یہ قابلِ
اعتراض ہے کیونکہ عربی میں اس جگہ جمع کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
عربی کے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب افعل التفضیل
کا صیغہ استعمال ہو جیسا کہ اوّل کا لفظ ہے اور وہ کسی ایسے
نکرہ کی طرف مضاف ہو جو صفت کا صیغہ ہو جیسا کہ کافر کا لفظ
ہے تو اس وقت اس نکرہ کو جو صفت کا صیغہ ہو مفرد لانا بھی
جائز ہے اور جمع لانا بھی جائز ہے اور اس کی مثال کے طور پر
فرّاء نے ایک شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ ؎

وَاِذَا هُمُ طَعِمُوْا فَاَلْأَمُ طَاعِمٍ
وَاِذَا هُمُ جَاعُوْا فَشَرُّ جِيَاعٍ

یعنی جب وہ قوم کھاتی ہے تو کھانے والوں میں سے سب سے بُری
ہوتی ہے اور جب وہ بھوکی ہوتی ہے تو بھوکوں میں سے بدترین
ہوتی ہے۔ اس شعر میں پہلے مصرعہ میں طَاعِمٍ کافر کی طرح مفرد
آیا ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں جِيَاعٍ جمع کا صیغہ آیا ہے گویا
ایک ہی شعر میں دونوں طرح کا محاورہ استعمال ہو گیا ہے۔

جب صفت نکرہ افعل التفضیل کا مضاف الیہ ہو تو فرّاء
کے نزدیک مَنْ کے بعد فعل استعمال کرکے اس کے معنے کئے
جاتے ہیں مثلاً اس شعر میں طَاعِمٍ کے معنے مَنْ طَعِمَ کئے
جائیں گے اور آیت میں کافر کے معنے مَنْ كَفَرَ کئے جائیں گے
بعض دوسرے نحویوں نے کہا ہے کہ اس صورت میں یہ توجیہہ

ہوگی کہ اوّل فریق کافر بہ یعنی ابتدا ہی میں کفر کرنے والے گروہ میں شامل نہ ہو بعض دوسروں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ وَلَا یَکُنْ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ تم میں سے ہر ایک اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنے سیبویہ امام لغت کہتے ہیں کہ ایسے موقعہ پر مفرد نکرہ جمع کے معنے دیتا ہے اور اس جملہ کی ترکیب یُوں ہے لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرِیْنَ بِہٖ اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنو (بحر محیط زمخشری) اس کے یہ معنے نہیں کہ پہلے کافر نہ بنو ہاں دوسروں کے بعد بیشک کفر کرو۔ یہ عربی کا محاورہ ہے کہ ایک حصہ جملہ کا بیان کر دیتے ہیں اور دوسرا چھوڑ دیتے ہیں اسے وہ تحسین کلام میں سے سمجھتے ہیں اس کے رو سے جملہ یہ ہوگا کہ لَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اٰخِرَ کَافِرٍ بِہٖ یعنی نہ اس کے کفر میں جلدی کرو اور نہ بعد میں کفر کرو۔ اس کی مثال مفسرین اس شعر سے دیتے ہیں ؎

مِنْ اُنَاسٍ لَیْسَ فِیْ اَخْلَاقِہِمْ
عَاجِلُ الْفُحْشِ وَلَا سُوْءُ جَزَعٍ

وہ شخص ایسے لوگوں میں شامل ہے جن کے اخلاق میں نہ تو فحش میں جلدی کرنا شامل ہے اور نہ سخت گھبرانا۔ وہ کہتے ہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ فوراً فحش کو اختیار نہیں کرتا بلکہ دیر سے کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ فحش کو نہ جلدی اختیار کرتا ہے نہ دیر سے (بحر محیط)

میرے نزدیک اس کی ایک اور تشریح بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ جب یہ کتاب تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کی مصدق ہے تو تمہارا اس کتاب کا انکار کرنا اوّل درجہ کا کفر ہوگا کیونکہ جو لوگ جاہل ہیں ان کا انکار نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن تم کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ گویا یہ مُراد نہیں کہ چھوٹا کفر جائز ہے یا بعد میں انکار کرنا جائز ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کفر بہرحال ناجائز ہے مگر تمہارا کفر تو اوّل درجہ کا کفر ہے اور زیادہ خطرناک ہے یا یہ کہ تم کو کفار کی اوّل صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ محاورہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی استعمال ہُوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (قٓ ع۲) مَیں اپنے بندوں پر بہت بڑا ظلم کرنے والا نہیں ہوں اس کے یہ معنے نہیں کہ میں تھوڑا ظلم کر لیتا ہوں بلکہ یہ معنے ہیں کہ پہلا مضمون جو گذرا ہے اگر اسے تسلیم کیا جائے تو اللہ تعالیٰ بڑا ظالم ثابت ہوتا ہے مگر وہ ایسا نہیں ہے اُردو میں بھی یہ محاورہ مستعمل ہے کہتے ہیں اتنا قہر کیوں توڑتے ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چھوٹا قہر بیشک توڑو بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی پر ظلم کرنا تو ناجائز ہے پھر تم اس قدر بڑا ظلم کیوں کرتے ہو یا یہ کہ جھوٹ بولنا تو ناپسندیدہ ہے پھر تم اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولتے ہو۔

كَافِرٍ بِہٖ میں ہٖ کی ضمیر کا مرجع

کَافِرٍ بِہٖ میں ہٖ کی ضمیر بِمَآ اَنْزَلْتُ میں جو مَا ہے اس کی طرف بھی جا سکتی ہے اس صورت میں اس کے معنے ہونگے کہ خدا تعالیٰ کے نئے کلام یعنی قرآن کریم کے کافر نہ بنو اور لِمَا مَعَکُمْ کے مَا کی طرف بھی جا سکتی ہے اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ یہ قرآن تو تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کو پُورا کرنے والا ہے دوسرے لوگ ان پیشگوئیوں کے مُنکر ہوں تو ہوں تم کیوں دوسروں سے بھی جلدی کر کے خود اپنی کتب کی تکذیب کرتے ہو۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا میں ثمن سے مراد دنیا کا سامان ہے

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا میری آیات کو چھوڑ کر تھوڑی قیمت نہ لو۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کے معنوں کو بگاڑنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض مُلّا چار پانچ آنہ والا قرآن خرید کر دیہاتیوں کے ہاتھوں میں دو چار روپیہ کو فروخت کرتے ہیں اور کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ میری آیات کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو مُردوں پر جو ختم کئے جاتے ہیں ان میں بھی اسی بیہودہ خیال پر بناء رکھ کر قرآن بخشا جاتا ہے یہ سب بیہودہ خیالات ہیں اور اس آیت کے یہ معنی

بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَ

باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ ۵۴۳ اور

نہیں ہیں اگر اس آیت کے یہ معنے ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے وَلَا تَشْتَرُوْا اٰیٰتِیْ بِثَمَنٍ قَلِیْلٍ کیونکہ عربی محاورہ کے مطابق ب قیمت پر آیا کرتی ہے پس تھوڑی قیمت لینی مراد ہوتی تو ب ثمن پر آتی مگر ب ثمن پر نہیں بلکہ آیات پر آئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اشتراء کا لفظ خرید و فروخت کے معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوا بلکہ استبدال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (بحر محیط) نوٹ ۱۷ میں بتایا جا چکا ہے کہ لغت کے رو سے ایک معنے اشتراء کے یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کو چھوڑ دیا اور دوسری کو لے لیا لغت میں لکھا ہے وَكُلُّ مَنْ تَرَكَ شَيْئًا وَتَمَسَّكَ بِغَيْرِهٖ فَقَدِ اشْتَرَاهُ (اقرب) یعنی جو شخص ایک چیز کو ترک کر دے اور دوسری کو اختیار کرے اس کے لئے بھی اشتراء کا لفظ عربی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں یہی معنے ہیں اور یہ مطلب نہیں کہ میری آیات دے کر تھوڑا مال نہ لو بلکہ یہ معنے ہیں کہ میری آیات کو نہ چھوڑو اور تھوڑے مال کو اختیار نہ کرو تھوڑے مال سے مراد دنیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (نساء ع ۱۱) دنیا کا سب سامان تھوڑا ہے پس مراد یہ ہے کہ دین چھوڑ کر دنیا کو اختیار نہ کرو۔ اس میں بنی اسرائیل کو زجر کی ہے کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرنے سے انکار کرنا باوجود اس کے کہ تمہاری کتب میں ان کی پیشگوئیاں موجود ہیں محض اپنی لیڈری کے کھوئے جانے کے خوف سے ہے تم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا گراں گذرتا ہے اور ان کی مخالفت کر کے اپنی قوم کی سرداری قائم رکھنا زیادہ عزیز ہے گویا دنیا کی معمولی عزت اور تھوڑے سے پیسوں کے لئے تم ان پیشگوئیوں کو ترک کر رہے ہو جو تمہاری کتب میں موجود ہیں۔

یہود کا محض دنیا کی خاطر آنحضرت کا انکار کرنا۔

حدیثوں میں آتا ہے دو یہودی عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے واپس جاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ نبی وہی ہے جس کا ذکر ہماری کتب میں آتا ہے لیکن ماننا تو نہیں کیونکہ ہماری جماعت کے لوگ ہمیں قتل کر دیں گے یہی ذہنیت ہے جو اکثر لوگوں کو سچائی سے محروم کر دیتی ہے۔

(مسند احمد حنبل جلد رابع ص ۲۳۹)

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۔ اس فقرہ کی بناوٹ بھی وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کی طرح ہے (دیکھو نوٹ ۱۱۲ سورۃ ہذا) اور یہ پورا جملہ یوں ہوتا ہے وَاتَّقُوْا اِيَّايَ تَنَبَّهُوْا فَاتَّقُوْنِ مجھ سے ڈرو ہوشیار ہو جاؤ اور مجھ سے ڈرو اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دنیا کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ زندگی میں تکلیف سے ڈرتا ہے مگر یہ ڈر عبث ہے کیونکہ تکلیف اور آرام خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے پس دنیا کا آرام بھی خدا تعالیٰ کو خوش کر کے مل سکتا ہے اسے چھوڑ کر نہیں مل سکتا۔

۵۴۳ حل لغات:۔ لَا تَلْبِسُوْا۔ نہی جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور لَبَسَ عَلَيْهِ (يَلْبِسُ) الْاَمْرَ لَبْسًا کے معنے ہیں خَلَطَهٗ وَجَعَلَهٗ مُشْتَبِهًا بِغَيْرِهٖ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ کے ساتھ ملا کر مشتبہ کر دیا (اقرب) پس لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے معنے ہونگے کہ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔

لَا تَلْبِسُوْا

اَلْحَقُّ:۔ اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵۲۷

اَلْحَقُّ

اَلْبَاطِلُ:۔ اَلْبَاطِلُ نَقِيْضُ الْحَقِّ وَهُوَ مَا لَا ثَبَاتَ لَهٗ عِنْدَ الْفَحْصِ۔ یعنی باطل حق کے مقابل پر

اَلْبَاطِلُ

بولا جاتا ہے اور باطل اس چیز پر بولتے ہیں جس کی تحقیق کی جائے تو کوئی حقیقت نہ نکلے (مفردات)

تفسیر۔ تَلْبِسُوْا لَبَسَ سے بنا ہے۔ لَبَسَ ضَرَبَ یَضْرِبُ کے وزن پر بھی آتا ہے اور عَلِمَ یَعْلَمُ کے وزن پر بھی۔ جب یہ ضَرَبَ یَضْرِبُ کے وزن پر ہو تو اس کے معنے کسی چیز کو مخلوط کر کے مشتبہ کر دینے کے ہوتے ہیں اور جب عَلِمَ یَعْلَمُ کے وزن پر ہو تو اس کے معنے پہننے کے ہوتے ہیں۔ لباس اسی میں سے بنا ہے اس آیت میں چونکہ تَلْبِسُوْا ہے یعنی ب کے نیچے زیر ہے اس لئے اس کے معنے مخلوط کر کے مشتبہ بنا دینے کے ہیں اور آیت کا یہ ترجمہ ہے کہ حق میں باطل ملا کر اسے مشتبہ نہ بنا دو۔ انبیاء کے دشمن ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں یعنے کوئی سچی بات لی اور اس میں ایک جھوٹ ملا دیا اور شور مچا دیا کہ مدعی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہود سب علامتوں کو تسلیم کر کے کبھی کہہ دیتے کہ اصل علامت آنے والے کی یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہوگا کبھی کہہ دیتے کہ اصل علامت یہ ہے کہ وہ یروشلم میں ظاہر ہوگا اس طرح عوام کو سچ قبول کرنے سے محروم کر دیتے ہیں حالانکہ صداقت کے پہچاننے میں اصل چیز جسے مدنظر رکھا جاتا ہے یہ ہے کہ موعود اس غرض کو پورا کرتا ہو جس کے لئے اسکی خبر دی گئی تھی اس زمانہ میں ظاہر ہو جس میں اس کے ظہور کی سب سے زیادہ ضرورت ہو اور کچھ حصہ پیشگوئیوں کا ظاہر میں اس کے حق میں پورا ہو جائے ورنہ پیشگوئیوں میں چونکہ اخفاء کو مدنظر رکھا جاتا ہے کچھ حصہ ان کا تعبیر طلب ہوتا ہے بیشک بعض جگہ بنی اسرائیل میں سے اس نبی کے آنے کی خبر ہے مگر چونکہ دوسری جگہ بنو اسمٰعیل میں سے ہونے کی خبر ہے اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ اسکی قوم بنی اسرائیل کی برکات کی وارث ہوگی اور گویا آیندہ زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی قائم مقام ہوگی۔ اور صیحون میں اس کے ظاہر ہونے کے الفاظ بیشک آتے ہیں لیکن اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس جگہ وہ ظاہر ہوگا وہ بھی خدا تعالیٰ کے مقدس مقامات میں سے ہوگا یعنی مکہ۔ بہت سی دوسری علامات کے حرف بہ حرف پورا ہو جانے کے بعد اور سب سے زیادہ یہ کہ اس زمانہ میں ظاہر ہونے کے بعد جس میں کہ اس موعود کو ظاہر ہونا چاہیئے تھا اور وہ کام کرنے کے بعد جو اس کے لئے مقدر تھا پھر بنی اسرائیل کا یہ اعتراض کہ فلاں فلاں پیشگوئی ابھی پوری نہیں ہوئی یا لفظاً پوری نہیں ہوئی محض حق اور باطل کو ملانے والی بات تھی اور لوگوں کو حق کے قبول کرنے سے روکنے کی ایک ناواجب کوشش۔ مگر ایسی کوششیں نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئی تھیں نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہوئیں اور نہ آیندہ کبھی ہونگی۔

انبیاء کے مخالفین کا سچی باتوں کے ساتھ جھوٹی باتیں ملا کر انبیاء کے دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرنا۔

وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ۔ اس جملہ کا پہلے جملہ پر عطف ہے اس لئے وہی لَا۔ جو پہلے گذر چکا ہے دوبارہ دہرایا جائیگا اور جملہ یوں ہوگا وَلَا تَکْتُمُوا الْحَقَّ۔ اور تم حق کو نہ چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی دوسری شرارت بتائی وہ ان پیشگوئیوں کے چھپانے کی کوشش کرتے تھے جن سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہوتی تھی۔ گویا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح مقابلہ کرتے تھے۔ اوّل اس طرح کہ پیشگوئیوں کو مخلوط کر کے بیان کر دیتے تھے مثلاً لفظاً پورا ہونے والی پیشگوئیوں سے تعبیری پیشگوئیوں کو ملا دیتے تھے یا موعود آخر الزمان کی پیشگوئیوں کے ساتھ بعض سابق نبیوں کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں انہیں ملا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بھی آنے والے کی علامت ہے حالانکہ وہ کسی اور نبی کی علامت ہوتی تھی اور اس کے وجود میں پوری ہو چکی تھی (اسی طرح آجکل بعض علمائے اسلام کرتے ہیں اسلام نے بہت سے مہدیوں کی خبر دی ہے بعض آچکے اور اپنے متعلق پیشگوئیوں کو پورا کر چکے۔ مگر یہ علماء آنے والے مہدی کے بارہ میں ان پیشگوئیوں کو بتا کر ان پیشگوئیوں کو مشتبہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے بارہ میں ہیں اور پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں) دوسرا حربہ وہ یہ استعمال کرتے تھے کہ بعض پیشگوئیوں کو عوام کی نظر سے پوشیدہ رکھنے

تکتموا الحق کی تشریح۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○

نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کی خالص پرستش کرنے والوں کے ساتھ مل کر خدا ہی کی خالص پرستش کرو ۴۴؎

کی کوشش کرتے تھے اور ان کا ذکر اپنے وعظوں میں چھوڑ جاتے تھے اور اگر مسلمان انہیں بیان کرتے تو صاف انکار کر دیتے تھے اگر کوئی واقف آدمی ان کو مجبور کر دیتا تو بہانے تراشنے لگ جاتے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تشریح۔

وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ درانحالیکہ تم جانتے ہو یعنی یہ حق و باطل کو ملانا اور بعض حق کو چھپانا اتفاقی حادثہ نہیں اور نہ غلطی کی وجہ سے ہے بلکہ تم ایسا دیدہ و دانستہ کرتے ہو اور جو دیدہ و دانستہ ایسے گناہ کا مرتکب ہو ہرگز خدا تعالیٰ کے فضل کا وارث نہیں ہو سکتا۔

اَقِيْمُوْا

۴۴؎ حل لغات:۔ اَقِيْمُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اَقَامَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵؎

اَلصَّلٰوة

اَلصَّلٰوةُ۔ اَلصَّلٰوةُ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵؎

اَلزَّكٰوة

اَلزَّكٰوةُ:۔ زَكَا (يَزْكُوْا) تَزْكِيَةً کا اسم ہے اور زَكَى الشَّيْءُ کے معنے ہیں نَمَا کوئی چیز زیادہ اور بکثرت ہوگئی۔ کہتے ہیں زَكَا الرَّجُلُ۔ صَلَحَ وَتَنَعَّمَ وَكَانَ فِيْ خَصْبٍ کوئی شخص اچھی عمدہ حالت میں ہو گیا۔ خوشحالی میں ہو گیا (کیونکہ زَكَتِ الْاَرْضُ اس وقت بولتے ہیں جبکہ وہ سرسبز ہو جائے) اور جب زَكَّاهُ اللّٰهُ کہیں تو اس کے معنے ہونگے اَنْمَاهُ اللہ تعالیٰ نے اس کو پروان چڑھایا۔ طَهَّرَهٗ اسے پاکیزہ کیا۔ زَكّٰى فُلَانٌ مَالَهٗ کے معنے ہیں اَدّٰى عَنْهُ زَكٰوةً اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی اور جب زَكّٰى نَفْسَهٗ کہیں تو معنے ہونگے کہ مَدَحَهَا اپنے نفس کو اس نے تعریف کے قابل بنایا اور تَزَكّٰى کے معنے ہیں تَصَدَّقَ اس نے صدقہ دیا اور اَلزَّكٰوةُ کے معنے ہیں صَفْوَةُ الشَّيْءِ اعلیٰ درجہ کی چیز طَاعَةُ اللّٰهِ اللہ کی اطاعت۔ مَا اَخْرَجْتَهٗ مِنْ مَالِكَ لِتُطَهِّرَهٗ بِهٖ۔ مال کا وہ حصہ جو بطور زکوٰۃ نکالا جاتا ہے تاکہ باقی مال پاک ہو جائے۔ وَقِيْلَ سُمِّيَتِ الصَّدَقَةُ بِالزَّكٰوةِ لِاَنَّهَا تَزِيْدُ فِي الْمَالِ الَّذِيْ تُخْرَجُ مِنْهُ [illegible] تُوَفِّرُهٗ وَتَقِيْهِ مِنَ الْاٰفَاتِ۔ اور صدقہ کا نام اس لئے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کیونکہ جس مال سے زکوٰۃ نکالی جائے وہ اس مال میں برکت ڈالتی ہے اور اس کو بڑھاتی ہے اور اسے آفات سے بچاتی ہے (اقرب)

اِرْكَعُوْا

اِرْكَعُوْا:۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور رَكَعَ الْمُصَلِّيْ (رَكْعًا وَ رُكُوْعًا) کے معنے ہیں طَاْطَاَ رَاْسَهٗ۔ نمازی نے اپنا سر نیچے کیا اور جب رَكَعَ اِلَى اللّٰهِ کہیں تو معنے ہونگے اِطْمَاَنَّ اِلَيْهِ اس نے اللہ کی طرف تسلی پائی۔ نیز رَكَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِنْحَطَّتْ حَالَتُهٗ وَافْتَقَرَ اس کی مالی حالت کمزور ہو گئی اور وہ محتاج ہو گیا (یہ مجازی معنے ہیں) اور رَكَعَ الْمُصَلِّيْ فِي الصَّلٰوةِ رُكُوْعًا کے معنے ہیں خَفَضَ رَاْسَهٗ بَعْدَ قَوْمَةِ الْقِرَاءَةِ حَتّٰى تَنَالَ رَاحَتَاهُ رُكْبَتَيْهِ اَوْ حَتّٰى يَطْمَئِنَّ ظَهْرُهٗ۔ نمازی نے قراءت کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کمر کو جھکایا نیز لکھا ہے وَالرَّاكِعُ كُلُّ شَيْءٍ يَخْفِضُ رَاْسَهٗ اور ہر اس چیز پر جو سر نیچے جھکائے رکھتی ہے رَاكِع کا لفظ بولتے ہیں (اقرب) مفردات میں ہے اَلرُّكُوْعُ اَلْاِنْحِنَاءُ کہ رکوع کے معنے جھک جانے کے ہیں فَتَارَةً يُسْتَعْمَلُ فِي الْهَيْئَةِ الْمَخْصُوْصَةِ فِي الصَّلٰوةِ وَتَارَةً فِي التَّوَاضُعِ وَالتَّذَلُّلِ اِمَّا فِي الْعِبَادَةِ وَاِمَّا فِيْ غَيْرِهَا کبھی تو یہ لفظ اس مخصوص ہیئت پر استعمال کیا جاتا ہے جو نماز میں کی جاتی ہے۔ یعنی قرأت کے ختم کرنے کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جانا اور کبھی یہ لفظ عاجزی کرنے اور تذلل اختیار کرنے پر بولا

جاتا ہے خواہ یہ عاجزی نماز میں کی جائے یا اس کے علاوہ کسی اور حالت یا مقام میں (مفردات) تاج العروس میں ہے کُلُّ شَیْءٍ یَنْکَبُّ لِوَجْھِہٖ فَتَمَسُّ رُکْبَتَیْہِ الْاَرْضَ اَوْلَاتَمَسُّھَا بَعْدَ اَنْ یَّخْفِضَ رَأْسَہٗ فَھُوَ رَاکِعٌ کہ ہر اس چیز پر جو اوندھے منہ ہو کر چلتی ہے رَاکِعٌ کا لفظ بولتے ہیں (گویا اسکی ہیئت کذائی عاجزی پر دلالت کرتی ہے) وَقَالَ ثَعْلَبٌ اَلرُّکُوْعُ اَلْخُضُوْعُ لغت کے مشہور امام ثعلب کہتے ہیں کہ رکوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں وَکَانَتِ الْعَرَبُ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ تُسَمِّی الْحَنِیْفَ رَاکِعًا اِذَا لَمْ یَعْبُدِ الْاَوْثَانَ وَیَقُوْلُوْنَ رَکَعَ اِلَی اللّٰہِ اور عرب لوگ قبل اسلام مُوحّد کو راکع کہتے تھے کیونکہ وہ بتوں کی پوجا نہ کرتا تھا اور اس کے لئے راکع کا لفظ اس لئے استعمال کرتے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور اس کے سامنے عاجزی اختیار کی (تاج) الغرض رَکَعَ کے لفظ کے اندر عاجزی اور تذلل کے معنے پائے جاتے ہیں پس رَاکِعٌ کے معنے ہونگے (۱) عاجزی کرنے والا (۲) اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرنے والا۔ اور اِرْکَعُوْا کے معنے ہونگے تم عاجزی کرو۔ (۲) تم اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرو۔

تفسیر۔ پہلی آیات میں ایمان کی درستی کی بنی اسرائیل کو ہدایت کی تھی اب اعمال کی درستی کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرماتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اپنے ایمان کی تکمیل تمہارے لئے ضروری ہے اسی طرح آپ پر ایمان لاکر اپنے اعمال کی درستی تمہارے لئے ضروری ہے بیشک تم اپنے رنگ میں عبادت کرتے ہو مگر اب وہ عبادت تمہاری مقبول نہیں۔ اب تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کے مطابق نمازیں پڑھو گے تو عبادت قبول ہوگی۔ اسی طرح بیشک تم قومی چندے دیتے ہو مگر اب تو شریعت محمدیہ کے مطابق زکوٰۃ نہ دوگے تو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل نہ کرسکو گے اسی طرح بیشک تمہاری عبادات اور تمہارے اعمال شرک سے ایک حد تک پاک ہونگے مگر اب وہ معیار توحید کا جو پہلے تھا بدل گیا ہے اب تو اس وقت تک تم خدا تعالیٰ کے فضلوں کے وارث نہیں ہوسکتے جب تک اس معیار توحید کو قائم نہ کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے

اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کی تشریح۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں زکوٰۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ ایک مقررہ طریق اپنے اموال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ہے زکوٰۃ کے بارے میں آگے چلکر تفصیلی بحث ہوگی اسی سلسلہ میں نوٹ ۳۳ سورہ ہذا بھی دیکھ لینا چاہئے جس میں اسلامی ذمہ داریاں مال کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ میں لفظ رَکَعَ کے معنے موحد کے۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ میں جو لفظ رَکَعَ استعمال ہوا ہے اس کے بارہ میں حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنے علاوہ رکوع یعنی جھکنے کے موحدانہ زندگی بسر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ حقیقت الاساس میں لکھا ہے کَانَتِ الْعَرَبُ تُسَمِّی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَلَمْ یَعْبُدِ الْاَوْثَانَ رَاکِعًا۔ یعنی عرب لوگ اسے جو اللہ پر ایمان لاتا ہو اور بتوں کی پوجا نہ کرتا ہو رَاکِعٌ کہتے ہیں اسی طرح لسان العرب میں لکھا ہے کہ رَاکِعٌ توجہ کو خالص ایک طرف کردینے والے کو کہتے ہیں اور اسکی تائید میں نابغہ ذبیانی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

سَیَبْلُغُ عُذْرًا اَوْ نَجَاحًا مِنِ امْرِیٍٔ
اِلٰی رَبِّہٖ رَبِّ الْبَرِیَّۃِ رَاکِعُ

یعنی وہ شخص جو صرف اپنے رب کی طرف جو سب دنیا کا رب ہے خالص طور پر متوجہ ہو جاتا ہے ضرور یا نجات پا جائے گا یا معذور قرار پاجائے گا۔ پس وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے معنے اس جگہ نماز کے رکوع کے نہیں کیونکہ نماز میں صرف رکوع ہی نہیں ہوتا بلکہ رکوع کے سوا اور اجزا بھی ہوتے ہیں پس کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف رکوع کا ذکر کیا جاتا۔ دوسرے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں نہ صرف خالی نماز کا بلکہ باجماعت نماز کا ذکر ہو چکا ہے جس میں قیام رکوع سجدہ سب ہی شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں

بنی اسرائیل کو اعمال کی درستی کی توجہ دلائی گئی ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

کیا تم (دوسرے) لوگوں کو (تو) نیکی (کرنے) کے لئے کہتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ

حالانکہ تم (اپنی) کتاب پڑھتے ہو ۔ پھر (بھی) کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۴۵؎ اور

کہ ساری نماز کا جس میں رکوع بھی شامل ہے ذکر کر کے صرف رکوع کا الگ ذکر کیا جائے۔ پس ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رکوع کے معنے اور ہیں نماز والے رکوع کے نہیں اور ان معنے میں اوپر بیان کر چکا ہوں پہلے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے کی تلقین کی پھر مسلمانوں کی طرح زکوٰۃ دینے کی تلقین کی پھر یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کی طرح اپنے سب اعمال کو خدا تعالیٰ کے لئے کر دو اور کامل توحید کو اختیار کر لو شرک کی ملونی کو اپنے اعمال سے بالکل جدا کر دو تب جا کر تم ان فضلوں کے دوبارہ وارث ہو سکو گے جن کا وعدہ عہدِ ابراہیم میں بیان ہوا ہے۔

اس تشریح کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ تا کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ یہود کے لئے تورات کے احکام پر عمل کرنا اب بھی کافی ہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عمل صالح سے مراد وہی عمل ہوگا جو شریعت محمدیہ میں نازل ہوا ہے اور اسی صورت میں مقبول ہوگا کہ اسلامی طریق کے مطابق ادا کیا جائے۔

۴۵؎ حل لغات۔ اَلْبِرُّ۔ اَلصِّلَةُ۔ انعام احسان اور عطیہ۔ اَلطَّاعَةُ فرمانبرداری۔ اَلصِّدْقُ سچائی (اقرب) تاج العروس میں ہے اَصْلُ مَعْنَى الْبِرِّ اَلسَّعَةُ کہ بِرّ کے اصل معنے وسعت کے ہوتے ہیں ثُمَّ شَاعَ فِي الشَّفَقَةِ وَالْاِحْسَانِ وَالصِّلَةِ پھر یہ لفظ شفقت۔ احسان اور انعام عطیہ وغیرہ کے معنوں میں مشہور ہو گیا۔ ابو منصور جو لغت کے امام ہیں کہتے ہیں کہ اَلْبِرُّ۔ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ بِرّ کے لفظ کے اندر دُنیا و آخرت ہر دو کی بھلائیاں آجاتی ہیں۔ نیز اَلْبِرُّ کے معنے ہیں اَلصَّلَاحُ صلاحیت۔ اَلْخَيْرُ بھلائی۔ اَلْاِتِّسَاعُ فِي الْاِحْسَانِ اِلَى النَّاسِ۔ لوگوں کے ساتھ احسان کرنے میں وسعت (تاج العروس)

تَنْسَوْنَ:۔ نَسِيَ (يَنْسٰى) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور نَسِيَ الشَّيْءَ نَسْيًا کے معنے ہیں ضِدُّ حَفِظَهٗ کسی چیز کو بھول گیا۔ قَالَ الرَّاغِبُ "اَلنِّسْيَانُ تَرْكُ الْاِنْسَانِ ضَبْطَ مَا اسْتُوْدِعَ اِمَّا لِضَعْفِ قَلْبِهٖ وَاِمَّا عَنْ غَفْلَةٍ وَاِمَّا عَنْ قَصْدٍ حَتّٰى يَنْحَذِفَ عَنِ الْقَلْبِ ذِكْرُهٗ" امام راغب لکھتے ہیں کہ انسانی دماغ میں جو باتیں محفوظ ہوں ان کو اس کا ضائع کر دینا نسیان کہلاتا ہے خواہ یہ ضائع کرنا اس کی دماغی کمزوری کا نتیجہ ہو خواہ غفلت کی وجہ سے ہو یا ارادۃً ہو حتیٰ کہ ان باتوں کا نقش ذہن سے مٹ جاوے (اقرب) تاج العروس میں لفظ نسیان کی تشریح میں لکھا ہے اَكْثَرُ اَهْلِ اللُّغَةِ فَسَّرُوْهُ بِالتَّرْكِ۔ کہ اکثر اہل لغت نے نسیان کے معنے چھوڑنے کے کئے ہیں پھر امام ثعلب جو عربی لغت کے مشہور امام ہیں ان کا قول آیت نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ کی تشریح میں لکھا ہے کہ لَا يَنْسَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّمَا مَعْنَاهُ تَرَكُوا اللّٰهَ فَتَرَكَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ وہ کسی چیز کو بھول جائے۔ اس لئے آیت نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ میں نسیان کے معنی چھوڑنے کے ہیں یعنی لوگوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو چھوڑ دیا (تاج) پھر لکھا ہے وَاِذَا نُسِبَ ذٰلِكَ

تَنْسَوْنَ

اَلْبِرُّ

اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا

صبر اور دُعا کے ذریعہ سے (اللہ سے) مدد مانگو اور بے شک فروتنی اختیار

اِلَى اللّٰهِ فَهُوَ تَرْكُهٗ اِيَّاهُمْ اِسْتِهَانَةً وَمُجَازَاةً لِمَا تَرَكُوْهُ۔ جب لفظ نسیان اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے چھوڑنے کے ہوتے ہیں کیونکہ جب لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اُسکے احکام سے رُوگردانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایسے اعمال کے بدلہ میں ان کو چھوڑ دیتا ہے (تاج) اقرب میں لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں لَا تَقْصُدُوا التَّرْكَ وَالْاِهْمَالَ کہ اپنی فضیلت کو چھوڑنے کا قصد نہ کرو (اقرب) پس تَنْسَوْنَ کے معنے ہونگے تم بُھلاتے ہو۔ فراموش کرتے ہو۔ تم چھوڑتے ہو۔

اَنْفُسَكُمْ:۔ اَنْفُسٌ نَفْسٌ کی جمع ہے اور اَلنَّفْسُ کے معنے ہیں اَلرُّوْحُ۔ رُوح۔ اَلْجِسْمُ جسم وَيُرَادُ بِالنَّفْسِ الشَّخْصُ وَالْاِنْسَانُ بِجُمْلَتِهٖ بعض اوقات نفس کا لفظ بولکر رُوح اور جسم کا مجموعہ انسان اور اس کا خاص تشخص مراد لیا جاتا ہے۔ اَلْعَظَمَةُ عظمت اَلْعِزَّةُ عزت۔ اَلْهِمَّةُ ہمت۔ اَلْاِرَادَةُ۔ ارادہ اَلرَّأْيُ رائے (اقرب)

تَتْلُوْنَ:۔ تَلٰى (يَتْلُوْ) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تَلَا الْكَلَامَ تِلَاوَةً کے معنے ہیں قَرَأَهٗ کسی کلام کو پڑھا (اقرب) پس تَتْلُوْنَ کے معنے ہونگے تم پڑھتے ہو۔

تَعْقِلُوْنَ:۔ عَقَلَ (يَعْقِلُ) سے مضارع مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور عَقَلَ الدَّوَاءُ الْبَطْنَ کے معنے ہیں اَمْسَكَهٗ دوائی نے پیٹ کو روک دیا یعنی قبض کر دی اور جب عَقَلَ الْغُلَامُ کہیں تو معنے ہوں گے اَدْرَكَ لڑکا بالغ ہو گیا یعنی اچھی اور بُری باتوں کو سمجھنے لگ گیا اور عَقَلَ الشَّيْءَ عَقْلًا کے معنے ہیں فَهِمَهٗ وَ تَدَبَّرَهٗ کسی چیز کو سمجھا اور اس کے متعلق غور و فکر کیا عَقَلَ الْبَعِيْرَ:۔ ثَنٰى وَظِيْفَهٗ مَعَ ذِرَاعِهٖ فَشَدَّهُمَا مَعًا بِحَبْلٍ اُونٹ کی ٹانگ کو اسکی ران کے ساتھ باندھ دیا عَقَلَ الْوَعِلُ عَقْلًا کے معنے ہیں صَعِدَ وَامْتَنَعَ فِي الْجَبَلِ الْعَالِيْ پہاڑی بکرا پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہاں جا کر رُک کر محفوظ ہو گیا۔ نیز اَلْعَقْلُ کے معنے ہیں نُوْرٌ رُوْحَانِيٌّ بِهٖ تُدْرِكُ النَّفْسُ الْعُلُوْمَ الضَّرُوْرِيَّةَ وَالنَّظَرِيَّةَ کہ عقل اس روحانی روشنی کا نام ہے جس کے ذریعہ سے نفس بدیہی باتوں کو یا غور و فکر سے معلوم ہونے والی باتوں کو معلوم کرتا ہے (اقرب)

اَنْفُسَكُمْ

پس اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے معنے ہونگے (۱) کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے (۲) کیا تم اپنی ناواجب حرکات سے رکتے نہیں۔

تفسیر۔ بِرٌّ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں لکھا جا چکا ہے اعلیٰ درجہ کے احسان اور نیکی کے ہوتے ہیں اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ بنی اسرائیل اپنی کتب کے حکم کے مطابق لوگوں کو بہت احسان کرنے اور نیکی کرنے کا حکم دیتے تھے لیکن اپنا یہ حال تھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے آنے والے عظیم الشان نبی کو صرف دنیوی نقصان کے ڈر کے مارے قبول نہ کرتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو تو اپنی جانوں کو بھی تو نہ بھولو جن کا حق تو تم پر زیادہ ہے نسیان کے معنے چھوڑنے کے بھی ہیں اس کے رو سے یہ معنی ہونگے کہ لوگوں کو اعلیٰ نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو چھوڑ دیتے ہو انہیں ایسا حکم کیوں نہیں دیتے کہ تمہارا عمل تمہارے قول کے خلاف نہ ہو۔

تَتْلُوْنَ

تَعْقِلُوْنَ

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کے یہ معنے نہیں کہ تمہاری کتاب محرف مبدل نہیں جیسا کہ بعض ناواقف

عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا

کرنیوالوں کے سوا (دوسروں کے لئے) یہ (امر) مشکل ہے ۴۶؎ جو (اس بات پر) یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے

اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کے یہ معنے نہیں کہ تورات غیر محرف ہے۔

نتیجہ نکالتے ہیں بلکہ کتاب کا ذکر پہلے حکم کے سلسلہ میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم تو اپنی کتاب پڑھتے ہو اس میں تو یہ حکم نہیں کہ دوسروں کو تو نیکی کا حکم دو اور اپنے آپ کو بد راہ پر چلاؤ پس جب تم جس کتاب کو مانتے ہو وہ بھی اس طریق کو جائز نہیں قرار دیتی تو تم نے اس طریق کو کیوں اختیار کر رکھا ہے چاہیئے کہ جس طرح دوسروں کو قربانی کا حکم دیتے ہو خود بھی حق کے لئے قربانی کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے معنے رکنے کے

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ اور پھر کیا تم باز نہیں آتے یعنی اگر تمہاری کتب میں یہ تعلیم نہ ہوتی کہ اپنے نفس کو بھی نیکی کی راہ پر چلاؤ تو تم کو معذور سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس تعلیم کی موجودگی میں تمہارا نیکی کے راستہ سے بھٹکنا تو سخت افسوسناک ہے پس کسی دوسرے کی نہیں مانتے تو اپنی کتاب کے حکم ہی کو مانو اور نیکی اور تقوٰی کی راہ پر چلو۔

اِسْتَعِيْنُوْا

۴۶؎ حل لغات۔ اِسْتَعِيْنُوْا امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتِعَانَةٌ کے معنے مدد طلب کرنے یا مدد حاصل کرنے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں اِسْتَعَنْتُهٗ فَاَعَانَنِیْ یعنے اس سے مدد طلب کی تو اس نے مدد دے دی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ ۵؎

اَلصَّلٰوۃ

اَلْخٰشِعِيْنَ

اَلصَّبْر

اَلصَّبْرُ: صَبْرٌ کے معنی ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دکھ کا شکوٰی خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِیْ كَشْفِ الضُّرِّ لَا يُقْدَحُ فِیْ صَبْرِهٖ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے۔ کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ فِی الْمُصِيْبَةِ کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَیْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور

صبر جزع یعنی شکوٰی کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی جرأت دکھائی ہمت دکھائی اور صَبَرَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رُکا رہا۔ صَبَرَ الدَّابَّةَ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ اور جب صَبَرَ کا مفعول دَابَّة کا لفظ ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو چارہ نہ دیا نیز کہتے ہیں صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَلٰى كَذَا۔ حَبَسْتُهَا کہ میں فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی چنانچہ محاورہ ہے صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ یعنے جب صَبَرَ کا صلہ عَلٰی ہو تو اس کے معنے کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں اور جب اس کا صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنے کسی چیز سے رُکنے یا کسی کو اس سے روک دینے کے ہوتے ہیں (اقرب) پس صَبْرٌ کے معنے (۱) بدیوں سے رُکتے رہنا اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنا (۲) خدا تعالیٰ کے راستہ میں تکلیف پر جزع فزع نہ کرنا۔

اَلصَّلٰوةُ:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴؎

اَلْخٰشِعِيْنَ:۔ خٰشِعِيْنَ اور خٰشِعُوْنَ خَاشِعٌ کی جمع ہے جو خَشَعَ سے اسم فاعل ہے۔ خَشَعَ کے معنے ذَلَّ وَتَطَامَنَ تابعدار ہو گیا اور عاجزی کا اظہار کیا اور خَشَعَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہیں غَضَّهٗ آنکھ نیچے کر لی۔ نِهَايَة میں لکھا ہے کہ اَلْخُشُوْعُ فِی الصَّوْتِ وَالْبَصَرِ كَالْخُضُوْعِ فِی الْبَدَنِ جس طرح بدن کی عاجزی اور کمزوری ظاہر کرنے کے خضوع کا لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح آواز کے کمزور ہونے اور آنکھ کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے خشوع کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلْخُشُوْعُ اَلضَّرَاعَةُ

خشوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں وَاَکْثَرُ مَا یُسْتَعْمَلُ الْخُشُوْعُ فِیْمَا یُوْجَدُ عَلَی الْجَوَارِحِ وَالضَّرَاعَةُ اَکْثَرُ مَا تُسْتَعْمَلُ فِیْمَا یُوْجَدُ فِی الْقَلْبِ کہ خشوع کا استعمال اکثر اس عاجزی پر ہوتا ہے جو اعضاء سے ظاہر ہو رہی ہے اور تضرع اکثر دل میں عاجزی پیدا ہو جانے کے متعلق بولا جاتا ہے۔ (مفردات) پس خٰشِعِیْنَ کے معنے ہونگے عاجزی اختیار کرنے والے۔ فروتنی اختیار کرنے والے۔

تفسیر۔ صداقت کے قبول کرنے میں دو روکیں ہوتی ہیں (۱) حکومت قوم رشتہ داروں اور دوستوں کا دباؤ جو حق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا ضد تعصب یا خود غرضی کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی قبول نہیں کرنے دیتے (۲) سابق عادات یا گناہوں کا زنگ دل کو مردہ کر دیتا ہے اور ہمت کو سلب کر دیتا ہے۔

اس آیت میں ان دونوں روکوں کی طرف اشارہ کرکے بتایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اگر تم پر حق کھل گیا ہے تو اسے قبول کرنے میں دیر نہ کرو بیشک تم کو تمہارے ہم قوموں اور رشتہ داروں دوستوں کی طرف سے روکا جائے گا تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تکلیفیں دی جائینگی مگر ان باتوں کی پروا نہ کرو اور صبر کی پسندیدہ عادت سے اس روک کا مقابلہ کرو دوسرے اپنے دل کو صاف کرنے کے لئے خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرو تاکہ دل کے زنگ دُور ہوں اور تم میں صداقت کو قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہو۔

ایک اور نفسیاتی نکتہ بھی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کسی کام کی درستی کے لئے دو امور کی ضرورت ہوتی ہے **اوّل** بیرونی بداثرات سے حفاظت ہو **دوسرے** اندرونی طاقت کو بڑھایا جائے اس آیت میں صبر کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیرونی بداثرات کا مقابلہ کرو اور صلوٰۃ کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے دُعائیں کرکے اس کے فضلوں کو جذب کرو اس طرح کمزوری کے راستے بند ہونگے اور طاقت کے حصول کے دروازے کھل جائیں گے اور تم کامیاب ہو جاؤ گے حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ صبر کے معنے صرف جزع فزع سے بچنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ بُرے خیالات کا اثر قبول کرنے سے رُکنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اوپر کی تفسیر میں یہی معنے مُراد ہیں جب کوئی بداثرات کو رد کرے اور نیک اثرات کو قبول کرنے کی عادت ڈالے جو دعاؤں سے حاصل ہو سکتی ہے تو اس کے دل میں روحانیت پیدا ہو کر جو کام پہلے مشکل نظر آتا تھا آسان ہو جاتا ہے اور روحانی ترقی کی جنگ میں اسے فتح حاصل ہوتی ہے۔

صداقت کے ماننے میں دو روکیں اور ان کا حل۔

اگلے جملہ میں جو کَبِیْرَةٌ کا لفظ استعمال ہُوا ہے اس کے معنے بڑی کے ہیں اور اس آیت میں موقعہ کے لحاظ سے مشکل امر کے معنے ہوتے ہیں اور خَاشِع کے معنے ڈرنے والے کے ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ جس جگہ بھی استعمال ہُوا ہے اس ہستی سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے جس سے ڈرنا مناسب ہو چنانچہ خَاشِع کا لفظ سارے قرآن کریم میں یا تو خدا تعالےٰ سے ڈرنے یا اس کے عذاب سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ بندوں یا دوسری چیزوں سے ڈرنے کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہُوا۔

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَةٌ میں کبیرہ کے معنے مشکل امر کے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اس قسم کا علاج بتانا آسان ہے اس پر عمل کرنا مشکل ہے پس اس کا جواب وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس علاج پر عمل مشکل کام ہے لیکن جو خَاشِع ہو جائے اس کے لئے مشکل نہیں رہتا گویا گناہوں اور کمزوریوں سے بچنے کا حقیقی علاج خدا تعالیٰ پر ایمان ہے بغیر اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے انسان دوسری تدبیروں سے گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ دُنیا نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے لیکن افسوس کہ وہ بار بار اس نکتہ کو بھول جاتی ہے حقیقی نیکی اور کامل نیکی کبھی بھی خدا تعالےٰ پر کامل یقین کے بغیر نہیں پیدا ہوتی فلسفیانہ دلائل انسان کے اندر سچا تقویٰ نہیں پیدا کر

آیت ہذا میں ایک نفسیاتی نکتہ یعنی کسی کام کی درستی کے لئے دو امور کی ضرورت

ع ۵ ۸ ۵ رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

ہیں اور (اس بات پر بھی) کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ٥٧ اے بنی اسرائیل

سکتے۔ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان کے بعد جو خوف بدیوں سے پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طرح پیدا نہیں ہوتا اسی وجہ سے انبیاء کی جماعتوں نے جو نیکی اور قربانی کا نمونہ دکھایا ہے وہ اور کوئی جماعت دُنیا کی نہیں دکھا سکتی۔

يَظُنُّوْنَ

اس آیت میں جس محبت اور خیر خواہی سے بنی اسرائیل کو نصیحت کی گئی ہے وہ اس اعلیٰ روح کا جو اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے ایک بیّن ثبوت ہے لفظ لفظ سے انکی خیر خواہی ٹپکتی ہے اور ان الفاظ کا کہنے والا بنی اسرائیل کو غلطی سے بچانے کا پورا خواہشمند معلوم ہوتا ہے بعض نادان کہتے ہیں کہ یہ کلام محمد رسول اللہ کا ہے اور وہ اس طرح یہودیوں میں اپنے آپ کو مقبول بنانا چاہتے تھے مگر اس آیت کے الفاظ پر غور کرو کیا یہ الفاظ کسی شہرت کے طالب کے ہو سکتے ہیں پھر یہ بھی سوچو کہ بنی اسرائیل نے باوجود اس نصیحت کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت قوم کے نہیں مانا مگر اس سے کس کا نقصان ہوا کیا اسلام کو اس سے کوئی نقصان بھی پہنچا۔ جس وقت یہ نصیحت کی گئی تھی صرف چند سو آدمی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے لیکن اب چالیس کروڑ آدمی آپ کا کلمہ پڑھ رہا ہے ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی ہے اور اب پھر ان کی ترقی کے سامان اللہ تعالیٰ پیدا کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل اگر آپ پر ایمان لے آتے تو ان حالات میں اور کیا تبدیلی کر دیتے اگر کچھ فائدہ تھا تو انہی کا تھا۔ ان میں سے لاکھوں مسیحی ہوئے ہیں مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے ملکوں میں سے نکالا جانا۔ جائدادوں کا لوٹا جانا ان کا حصہ ہے اور نہ وہ اِدھر کے رہے ہیں نہ اُدھر کے۔ اگر اسلام لاتے تو آج کروڑوں مسلمانوں کے برابر کے شریک ہوتے اور کوئی ان کو غیر قرار دے کر دُکھ نہ دیتا

آیت ہذا میں بنی اسرائیل کے لئے حد درجہ کی خیر خواہی۔

آیت ماقبل میں لفظ خشوع کے معنے کامل ایمان رکھنے اور ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونے کے متعلق پورا یقین رکھنے کے۔

پس ان حالات کے باوجود مسیحی مصنفوں کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کو لالچ دیکر اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقع اعتراض ہے محض بنی اسرائیل کے فائدہ کی ایک بات کہی گئی تھی انہوں نے نہ مانا اور تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

٥٧ حل لغات۔ يَظُنُّوْنَ۔ ظَنَّ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ظَنَّ الشَّيْءَ کے معنے عَلِمَهٗ وَاسْتَيْقَنَهٗ کہ کسی چیز کو معلوم کیا اور اس کے متعلق یقین کر لیا اور اَلظَّنُّ کے معنے کے ماتحت لکھا ہے هُوَ الْاِعْتِقَادُ الرَّاجِحُ مَعَ اِحْتِمَالِ النَّقِيْضِ وَيُسْتَعْمَلُ فِي الْيَقِيْنِ وَالشَّكِّ یعنی ظن کے معنے زیادہ تر خیال غالب کے ہوتے ہیں اور بعض وقت وہ یقین کے معنے میں اور بعض وقت شک کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب) اس آیت میں ظن بمعنے یقین کے استعمال ہوا ہے اور يَظُنُّوْنَ کے معنے ہیں وہ یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر قرآن کریم کا یہ عام طریق ہے کہ جب کسی لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کرتا ہے تو اس اصطلاح کی ساتھ ہی تشریح بھی کر دیتا ہے اس آیت میں بھی قرآنی اصطلاح کے مطابق خَاشِعِيْنَ کے معنے بتائے گئے ہیں خَاشِعٌ چونکہ ڈرنے والے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس جگہ عام ڈرنیوالے کے معنوں میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور ایک دن اس کے سامنے حاضر ہونے پر انہیں پورا یقین ہے۔

پس خَاشِعِيْنَ کے معنے اوپر کی آیت میں صرف ڈرنے والے کے نہیں کئے جائیں گے بلکہ اس سے مراد وہ شخص لیا جائے گا جس کا خوف خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل

اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ

میرے اس احسان کو جو میں تم پر کر چکا ہوں یاد کرو اور (اس احسان کو بھی) کہ میں نے تمہیں

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ

تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی ۵۴۸ اور اس دن سے ڈرو کہ (جس دن) کوئی شخص

یقین سے پیدا ہوتا ہے اور اس خوف کی بناء نقصان کے ڈر پر نہیں بلکہ اس امر پر ہے کہ میں اعلیٰ ترقیات سے محروم نہ رہ جاؤں گویا یہ ڈر ایک بزدل کا ڈر نہیں بلکہ ایک عارف کی گھبراہٹ ہے جو دلیر سے دلیر آدمی میں بھی پائی جاتی ہے اور پائی جانی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کو دُنیاوی تکلیفوں سے ڈرنے سے روکتے ہوئے یہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس ڈر کا دُور کرنا ہے تو مشکل مگر خَاشِعِيْنَ کے لئے مشکل نہیں ڈر کے عام معنوں کے رو سے یہ فقرہ عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی ظاہری شکل یُوں بنتی ہے کہ لوگوں سے ڈرو نہیں بیشک ڈرنے سے بچنا مشکل ہے مگر ڈرنے والوں کے لئے مشکل نہیں۔ مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے۔ اَلْخُشُوْعُ کے معنے عام ڈر کے نہیں بلکہ ایک کامل ہستی پر ایمان رکھتے ہوئے قرب سے محروم رہنے کے خوف کے ہیں اور ان معنوں کی رو سے اس فقرہ میں کوئی امر قابلِ تعجب نہیں اور اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ دنیوی مشکلات سے نہ ڈرو یہ بیشک مشکل امر ہے لیکن جو لوگ اپنے لئے ایک اعلیٰ مقصد قرار دے لیں اور اس مقصد کو چھوڑنا ان پر سخت گراں گزرنے لگے ان کے لئے ایسے خطرات برداشت کرنے مشکل نہیں رہتے اس قسم کا ڈر درحقیقت بہادری اور احتیاط کی ایک قسم ہے نہ کہ بُزدلی کا مظاہرہ۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مابعد الموت زندگی پر اس کے مناسب حال زور دیتا ہے اسلام کے سوا کوئی اور مذہب تقویٰ کی بُنیاد کو بعد الموت زندگی پر نہیں رکھتا۔ اسلام اس دُنیا کی زندگی کو ایک لمبی زندگی کی ایک کڑی قرار دیتا ہے جس میں انسانی رُوح کی تکمیل ہوتی ہے وہ اس زندگی کے ختم ہونے کو رُوح کی کشمکش کا خاتمہ قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے بعد بھی اس کشمکش کو جاری بتاتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ اس زندگی میں انسان نسبتی طور پر اندھیرے میں کوشش کرتا ہے اور مرنے کے بعد نیک بد دونوں کو ایک بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس کی رہنمائی میں وہ آیندہ ترقی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ بدلوگ اپنے پیدا کردہ ماحول سے نجات پانے کے لئے اور نیک لوگ مزید ترقیات کے لئے۔ یہی وہ یقین ہے جس نے سچے مسلمانوں کو ہمیشہ موت سے نڈر بنائے رکھا ہے اور جب بھی اس ایمان کے ساتھ مسلمان اُٹھتے ہیں دُنیا پر غالب آتے ہیں۔ جو لوگ اس دُنیا کو اپنی ترقیات کا انجام سمجھتے ہیں کبھی نیکی کے لئے جدو جہد نہیں کر سکتے جو بعد الموت زندگی پر ایمان لانے والے کر سکتے ہیں اس دُنیا کو منتہا قرار دینے والے بار بار دنیاوی لذات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور جسمانی آرام کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

۵۴۸ حلِ لغات:۔ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے معنے کے لئے دیکھو حلِ لغات سورہ بقرہ ۵۴۱ **بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ**

اُذْكُرُوْا۔ اُذْكُرُوْا کے معنے کے لئے دیکھو حلِ لغات سورہ بقرہ ۵۴۱ **اُذْكُرُوْا**

نِعْمَتِىَ۔ نِعْمَةٌ کے معنے کے لئے دیکھو حلِ لغات **نِعْمَتِىَ**

نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ

کسی دوسرے شخص کا قائم مقام نہ بن سکے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش منظور کی جاوے گی اور

سورہ بقرہ ۳۱۴ھ

١ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ:۔ اَنْعَمْتُ اَنْعَمَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور انعام کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ع ۵

٢ فَضَّلْتُكُمْ

فَضَّلْتُكُمْ:۔ فَضَّلْتُ فَضَّلَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور فَضَّلَهٗ عَلٰى غَيْرِهٖ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ مَزِيَّةً عَلَيْهِ وَحَكَمَ لَهٗ بِالْفَضْلِ دوسرے کے مقابل پر اس کو خوبی کے اعتبار سے عمدہ قرار دیا۔ اور خوبیوں کی بنا پر اسے دوسروں سے افضل قرار دیا۔ نیز فَضَّلَهٗ کے معنے ہیں صَيَّرَهٗ اَفْضَلَ مِنْهُ اسے دوسروں کے مقابل ممتاز اور افضل قرار دیا (اقرب) پس فَضَّلْتُكُمْ کے معنے ہونگے یعنے تم کو فضیلت دی اور دوسروں سے ممتاز بنا دیا۔

٣ آیت اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ سے مراد سارے قومیں نہیں

٤ اَلْعٰلَمِیْنَ

اَلْعٰلَمِيْنَ:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ع ۳۔

٥ آیت ہذا میں بنی اسرائیل کو آخری کلام پر ایمان لانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے

تفسیر۔ اس آیت میں ایک اور ذریعہ سے بنی اسرائیل کو خدا تعالےٰ کے آخری کلام پر ایمان لانے کی طرف توجہ دلائی ہے پچھلے رکوع میں تو انہیں اس طرف متوجہ کیا تھا کہ خدا تعالیٰ سے تم نے ایک عہد کیا تھا خدا تعالےٰ نے اس عہد کے متعلق اپنی ذمہ داری پوری کر دی لیکن تم نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اس لئے خدا تعالیٰ کے فضل سے محروم ہو گئے۔ اب پھر ایک نیا کلام تمہاری کتب کی دی ہوئی خبروں کے مطابق نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو نئے سرے سے تم پر خدا تعالیٰ کے فضل نازل ہونے لگینگے اب اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ محسن کی محبت تو شریفوں کا خاصہ ہے خدا تعالیٰ کے تم پر بے حد احسان ہیں تمہاری قوم کو ادنیٰ حالت سے اُٹھا کر اس نے ایسی ترقی دی کہ دنیا کی بہترین قوموں میں سے بنا دیا پھر کیوں اس کے احسان کی قدر نہیں کرتے اور اس کے پیغام کو رد کرتے ہو۔ احسان کی قدر کرو اور اپنے محسن سے مُنہ نہ موڑو۔

اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ سے یہ مراد نہیں کہ اگلی پچھلی سب قوموں پر فضیلت دی۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی۔ قرآن شریف میں اُمتِ محمدیہ کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ تمام امتوں سے بڑھ کر ہے جیسا کہ فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ع ۱۲) اور فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (بقرہ ع ۱۷) یہ امر کہ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ سے مراد اسی زمانہ کے لوگ ہیں قرآن شریف کی اس آیت سے خوب کھل جاتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ع ۴) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عَالَمِيْنَ سے مراد اپنے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے جن انبیاء اور لوگوں کا ذکر ہے وہ مختلف زمانوں میں گزرے ہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے ہر ایک تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر آدمؑ تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت رکھتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ نوحؑ پر اور دوسرے بزرگوں پر بھی جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے ان کو فضیلت حاصل تھی اس صورت میں ان دوسرے بزرگوں کی نسبت کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کو تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت دی تھی پس بلاشبہ عَالَمِيْنَ سے مراد خاص زمانہ کے لوگ ہیں ان آیات کے علاوہ ایک اور آیت بھی عَالَم کے معنوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ سورۂ حجر ع ۵ میں حضرت لوطؑ کے ذکر میں آتا ہے کہ جب وہ چند مہمانوں کو اپنے گھر لے آئے تو شہر والوں نے اُن سے کہا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ کیا ہم نے

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ وَاِذْ

نہ اس سے (کسی قسم کا) معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جاوے گی ۵۴۹ اور (اس

تجھے غیر قوموں کے لوگوں کو شہر میں لانے سے منع نہیں کیا تھا اس جگہ عَالَمِیْن سے مراد اردگرد کے لوگ ہیں نہ کہ اگلی پچھلی نسلوں کے آدمی۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں جہاں عَالَمِیْن کا لفظ استعمال ہوا ہے ضروری نہیں کہ سیغہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہو بلکہ اس کے معنی اردگرد کے لوگ یا اسی زمانہ کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی دونوں معنے آیت زیر تفسیر میں مُراد ہیں۔

اس آیت میں فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ فرمایا ہے اَلنَّاس نہیں فرمایا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی فضیلت کئی رنگ میں تھی۔ عَالَم کے معنے جیسا کہ نوٹ ۵ سورہ فاتحہ میں بتایا جا چکا ہے اس گروہ یا قسم کے ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے بطور نشان ہوتا ہے پس عَالَمِیْن کا لفظ مختلف قسم کی خصوصیات رکھنے والے گروہوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے روحانی علوم میں تم کو ترقی ملی تھی۔ اگر اَلنَّاس ہوتا تو ایک قسم کی ترقی ہی اس سے سمجھی جا سکتی تھی۔ مگر عَالَمِیْن کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ روحانیت کے سب میدانوں میں انہیں فضیلت بخشی گئی۔ کیا بلحاظ شریعت کے کیا بلحاظ روحانیت کے کیا بلحاظ اخلاق فاضلہ کے۔ غرض ہر قسم کے صاحب کمال لوگ ان میں پیدا ہوئے۔ جو اس زمانہ کے یا دیگر دنیا کی قوموں کے دوسرے صاحب کمال لوگوں پر فضیلت رکھتے تھے۔

۵۴۹ حل لغات

اِتَّقُوْا۔ اِتَّقُوْا۔ امر مخاطب کا جمع کا صیغہ ہے اِتَّقٰی کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۳۵۔

يَوْمًا۔ یوم کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۵۔

لَا تَجْزِيْ۔ جَزٰى سے مضارع منفی واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اَلْجَزَاءُ (جو جَزٰى کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلْمُكَافَاۃُ عَلَى الشَّيْءِ کسی بات پر کسی کو کوئی بدلہ دینا اور جب کہیں کہ جَزَى الشَّيْءُ تو اس کے معنی ہونگے کَفٰى ایک چیز دوسری چیز کی ساری باتوں میں قائم مقام ہو گئی اور پہلی چیز سے استغناء حاصل ہو گیا (قاموس) نیز کہتے ہیں جَزَيْتُ فُلَانًا حَقَّهٗ اور مطلب یہ ہوتا ہے قَضَيْتُهٗ کہ میں نے اس کے حق کو پورا کر دیا (لسان) وَتَأْتِيْ جَزٰى بِمَعْنٰى اَغْنٰى اور جَزٰى کے معنے بعض اوقات اَغْنٰى کے ہوتے ہیں یعنی کوئی چیز دوسری چیز کے قائم مقام ہو گئی (لسان) پس لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ کے معنے ہونگے (۱) کوئی نفس قائم مقام نہیں بن سکے گا (۲) کوئی شخص حقوق کو پورا نہیں کر سکے گا۔

نَفْسٌ۔ نَفْسٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ نساء ۴۵۔

شَفَاعَةٌ۔ شَفَعَ کا مصدر ہے۔ شَفَعَ کا دوسرا مصدر اَلشَّفْعُ ہے اور اَلشَّفْعُ کے معنی ہیں ضَمُّ الشَّيْءِ اِلٰى مِثْلِهٖ ایک چیز کے ساتھ اس جیسی دوسری چیز ملا کر ان دونوں کو جمع کر دینا۔ اور اَلشَّفَاعَةُ کے معنے ہیں اَلْاِنْضِمَامُ اِلٰى اٰخَرَ نَاصِرًا لَّهٗ وَسَائِلًا عَنْهُ کسی شخص کا کسی شخص کے ساتھ اس کی مدد کرنے کی خاطر مل جانا اور اس سے حق کا مطالبہ کرنے والے سے التجا کرنا کہ قصوروار کے قصور کو معاف کر دے۔ وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي انْضِمَامِ مَنْ هُوَ اَعْلٰى حُرْمَةً وَّمَرْتَبَةً اِلٰى مَنْ هُوَ اَدْنٰى اور شفاعت کے لفظ کا اکثر استعمال ایسے دو اشخاص کے ملنے پر ہوتا ہے جن میں سے ایک عزت و رتبہ کے لحاظ سے اعلیٰ مقام رکھتا ہو اور دوسرا ادنے۔ اور عزت و رتبہ رکھنے والا شخص ادنی شخص سے اس کی مدد کی خاطر مل جائے (مفردات) اقرب الموارد میں ہے کہ جب شَفَعَ کا لفظ کسی عدد کے لئے یا نماز کے لئے استعمال کریں تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَيَّرَهٗ شَفْعًا اَيْ زَوْجًا اَيْ اَضَافَ اِلَى الْوَاحِدِ ثَانِيًا وَاِلَى الرَّكْعَةِ

۱ لم سے مراد اردگرد یا خاص زمانہ کے لوگ

۲ شَفَاعَةٌ

۱ بنی اسرائیل کو عالمین پر فضیلت بخشے جانے سے مراد روحانیات کے سب میدانوں میں فضیلت بخشے جانا ہے۔

اِتَّقُوْا

يَوْمًا

لَا تَجْزِيْ

أُخْرٰى ایک عدد کے ساتھ دوسرا عدد ملا دیا اور ایک کو دو کر دیا یا ایک رکعت کے ساتھ دوسری رکعت ملا کر ان کو دو رکعت بنا دیا۔ چنانچہ جب یہ کہیں کہ کَانَ وِتْرًا فَشَفَعَهٗ بِآخَرَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں قَرَنَهٗ بِهٖ وہ اکیلا تھا اس کے ساتھ ایک اور ساتھی ملا دیا اور اس کو جوڑا کر دیا اور جب شُفِعَ لِیَ الْاَشْخَاصُ بصیغہ مجہول کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَرٰی الشَّخْصَ شَخْصَیْنِ لِضُعْفِ بَصَرِیْ بینائی کی کمزوری کی وجہ سے مجھے ایک شخص کی جگہ دو اشخاص نظر آتے ہیں نیز جب شَفَعَ لَهٗ اَوْ فِیْهِ اِلٰی فُلَانٍ شَفَاعَةً کہیں تو اس کے معنی ہونگے طَلَبَ اَنْ یُعَاوِنَهٗ اس سے خواہش کی کہ وہ اس کی کسی معاملہ میں مدد کرے اور جب شَفَعَ لِفُلَانٍ فِی الْمَطْلَبِ کا فقرہ بولیں تو اس وقت یہ مراد ہوگی کہ سَعٰی اس نے کسی مقصد اور ارادہ کو پورا کرنے کے لئے کوشش کی اور جب شَفَعَ لِیْ بِالْعَدَاوَةِ کا فقرہ بولیں تو معنے ہونگے اَعَانَ عَلَیَّ اس نے میرے خلاف مدد دی (اقرب) اَلشَّفَاعَةُ کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اَلشَّفَاعَةُ: اَلسُّؤَالُ فِی التَّجَاوُزِ عَنِ الذُّنُوْبِ مِنَ الَّذِیْ وَقَعَتِ الْجِنَایَةُ فِیْ حَقِّهٖ کہ شفاعت کے معنے ہیں کہ جس کے حق میں کسی سے قصور اور غلطیاں سرزد ہوئی ہوں اس سے یہ خواہش اور سوال کرنا کہ وہ قصور وار سے اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر کرے وَ قِیْلَ لَا تُسْتَعْمَلُ اِلَّا بِضَمِّ النَّاجِیْ اِلٰی نَفْسِهٖ مَنْ خَافَ مِنْ سَطْوَةِ الْغَیْرِ کہ بعض کے نزدیک شفاعت کا لفظ اسی وقت بولا جاتا ہے جب کوئی ایسا شخص جو خود نجات یافتہ ہو کسی ایسے شخص کی تائید پر کھڑا ہو جائے جو دوسرے کی سزا سے خائف ہو (اقرب)

عَدْلٌ

عَدْلٌ: اَلْعَدْلُ ضِدُّ الْجَوْرِ۔ عدل کا لفظ جور یعنی ظلم کے بالمقابل بولا جاتا ہے یعنی اس کے معنے انصاف کے ہیں نیز اس کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ مثل اَلنَّظِیْرُ نظیر اَلْجَزَاءُ بدلہ معاوضہ۔ اَلْفِدَاءُ فدیہ۔ اَلنَّافِلَةُ عطیہ یا فرض سے زائد بات (اقرب)

آیت واتقوا... الخ میں بنی اسرائیل کے بعض غلط خیالات کا رد

تفسیر۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کے بعض ایسے خیالات کو رد کیا گیا ہے جو ان کو بدیوں پر دلیر کرتے تھے اور نیکیوں سے محروم کرتے تھے بنی اسرائیل کے مختلف گروہوں کے غلط خیال اس بارہ میں یہ تھے (۱) ان کے گناہوں کا بار کوئی دوسرا وجود اٹھالے گا (۲) ان کے بزرگ ان کی شفاعت کرکے انہیں بچالیں گے (۳) ان کو بعض نیکیاں حاصل ہیں جو ان کے گناہوں سے بہرحال زیادہ رہیں گی اور گناہوں کا بدلہ دے کر بھی وہ جنت کے مستحق رہیں گے۔ اس آیت میں ان خیالات کا رد کیا گیا ہے تا بنی اسرائیل کو نیکی کا اصل مفہوم معلوم ہو۔ اور وہ صداقتوں کا انکار کرکے تباہ نہ ہو جائیں۔

انسانی فطرت میں اعلیٰ روحانی مقام کے حاصل کرنیکا احساس اور اسکا قرآن کریم میں ذکر

اس آیت کا مضمون سمجھنے کے لئے اس امر کو سمجھنا ضروری ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ امر مرکوز ہے کہ وہ اعلیٰ رُوحانی مقام کو حاصل کرے متمدن اقوام ہوں کہ غیر متمدن قبائل سب میں یہ احساس کمال کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے افریقہ کے حبشی ہوں یا مکسیکو کے قدیم باشندے یا آسٹریلیا کے ابتدائی نسلوں کے آدمی سب اس خواہش سے متاثر نظر آتے ہیں بعض میں یہ احساس معین صورت میں پایا جاتا ہے اور بعض میں مبہم صورت میں مگر پایا سب میں جاتا ہے قرآن کریم نے اس احساس کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰی ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (اعراف ع ۲۲) اور یاد کر جبکہ تیرے رب نے تمام انسانوں کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو لیا اور انہیں اپنی جانوں پر گواہ

بنایا۔ اور فرمایا کہ کیا مَیں تمہارا رب نہیں سب نے کہا کہ ہاں تُو ہمارا رب ہے۔ اے لوگو یہ ہم نے اس لئے کیا تا تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس امر سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ ہمارے باپ دادوں نے شرک کیا تھا اور ہم اُن کے بعد آنے والی نسل تھے۔ اس لئے لازماً ہم ان کے خیالات سے متاثر ہوئے پھر کیا تُو ہم کو اُن جھوٹ بولنے والوں کے جُرم کے بدلہ میں سزا دے گا۔ اس آیت میں نہایت لطیف استعارہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر انسان اپنے آباء کی پیٹھوں سے ہی یعنی پیدائشی طور پر توحید کا اثر لے کر نکلتا ہے اور شرک کا رنگ بعد میں اس کے پیدا ہونے کے بعد اس کے ماں باپ اس پر چڑھاتے ہیں۔ اگر توحید کا اثر خدا تعالیٰ نے فطرت انسانی پر نہ ڈالا ہوتا تو انسان شرک کرنے میں معذور ہوتا لیکن اس نے توحید کا اقرار پیدائشی طور پر اس کے اندر رکھ کر ہر انسان پر حجت کر دی ہے اب نہ تو وہ ناواقفی کا عذر کر سکتا ہے اور نہ اپنے ماں باپ کے اثر کا عذر پیش کر سکتا ہے۔ اس فطری اثر کو ہم ہر قوم اور ہر قبیلہ میں محسوس کرتے ہیں ہمیشہ سے انسان اپنے پیدا کرنے والے خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا آیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ لگن فطرت میں پائی جاتی ہے اور کہیں باہر سے نہیں آئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ انسان سُستی غفلت یا سہل انگاری کی وجہ سے اس مقصد کو پہنچنے کے لئے سہل راستے تلاش کرتا رہتا ہے فلسفیانہ رنگ کے لوگ اس خواہش کو اس طرح پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو چونکہ اس دُنیا کے ماحول میں پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ ہم سے صرف اس قدر امید کرتا ہے کہ ہم اچھے شہری ہو کر رہیں۔ اگر ہم اس مقصد کو پورا کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس قدر ذمہ واریاں ہیں سب ادا ہو جاتی ہیں۔ جو فلسفی نہیں وہ مختلف قسم کی عارضی قربانیوں سے قَالُوْا بَلٰی کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں یہ قربانیاں بعض وقت ظاہر میں بڑی نظر آتی ہیں لیکن حقیقتاً اصل قربانی کا چھوٹا قائم مقام ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ بجائے مستقل نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے اور رات اور دن اپنے نفس کی اصلاح اور اپنی خواہشات کی قربانی کا کٹھن راستہ طے کرنے کے اپنے بعض اعضاء کاٹ دیتے ہیں اور اسے اس دائمی اور پوری قربانی کا قائم مقام سمجھ لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ذمہ حقیقی پاکیزگی کے حصول کے لئے مقرر کی ہے بعض لوگ شہوانی جذبات کو دبانے کی طاقت نہ پا کر اس عضو کو جو اس کا ذریعہ ہے کاٹ دیتے ہیں بعض لوگ غیبت جھوٹ اور بدکلامی سے رُکنے کی ہمت نہ دیکھ کر اپنی زبان کٹوا دیتے ہیں بعض دُنیا میں رہتے ہوئے خدا تعالیٰ کے ذکر کی طاقت نہ پا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کبھی ننگے رہ کر اپنے خیال میں آسائش کی قربانی کرتے ہیں اور کبھی سر کے بل لٹک کر اپنی ذمہ واری کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں (جیسا کہ ہندوؤں میں دیکھا جاتا ہے) لیکن یہ سب طریقے اپنے اصلی فرائض سے بھاگنے کے مترادف ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی تکمیل کو ان چیزوں پر منحصر رکھتا تو اسے ایک متمدن انسان پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تبتّل یعنی نکاح سے بچنا نیکی کا اصل ذریعہ ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ دُنیا کے کامل کرنے کا ذریعہ اسے فنا کرنا ہے جو کہ بالبداہت باطل ہے۔ اگر تبتّل ہی انسانی زندگی کا کمال ہے تو سب انسانوں کو کامل ہونا چاہیئے اور اگر سب انسان ہی تبتّل اختیار کر لیں تو ایک نسل میں ساری دنیا ختم ہو جاتی ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ تبتّل کمال کا ذریعہ نہیں بلکہ کامل لوگ تبتّل سے کام لیتے ہیں لیکن یہ خیال بھی بالبداہت باطل ہے کیونکہ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ کاملوں کی نسل اس دُنیا میں نہ چلے اور ناقصوں کی چلے۔ حالانکہ جانوروں میں اچھے گھوڑے اچھے بیل اور اچھے بھینسے اور اچھے اونٹ اور اچھے بکرے سے نسل لی جاتی ہے کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے اچھی نسل چلتی ہے۔ یہی طریق پھل دینے والے درختوں اور پھول لانے والے پودوں میں اختیار کیا جاتا ہے اور یہی طریق اناج اور سبزی ترکاری پیدا کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ اچھا اناج اچھے بیج سے اور اچھا پھل اچھے درخت کے پیوند سے اور اچھا جانور اچھے سانڈ سے پیدا ہو

ے
اس خیال کا بطلان کہ کامل لوگ تبتّل سے کام لیتے ہیں

ہر انسان توحید کا اثر فطرتاً لیکر پیدا ہوتا ہے شرک کا رنگ اس کے ماں باپ اس پر چڑھاتے ہیں۔

فلسفیوں کی طرف سے عارضی قربانیوں کے ذریعہ سے قالوا بلٰی کا جواب دینے کی کوشش

لیکن انسانوں میں سے اچھے لوگوں کو تو بے نسل رکھا جائے اور
ناقص انسانوں سے نسل لی جائے۔ یہ ایسا غلط خیال ہے کہ
کوئی معقول انسان اسے مان نہیں سکتا۔ بعض قوموں میں خدا تعالیٰ
کا قُرب حاصل کرنے اور اس کے غضب سے بچنے کے لئے
اولاد کی قربانی دی جاتی تھی قریباً دنیا کے ہر ملک میں اسکی
مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس رسم کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ
نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں اپنے بیٹے کی قربانی
پیش کرنے کا حکم دیا تاکہ ان کا ایمان دُنیا پر ظاہر ہو جائے اور
اس رسم کو بھی ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے بعض قوموں میں مردوں
یا اجنبیوں کو پکڑ کر قربانی میں پیش کیا جاتا تھا یہ سب غیر طبعی
غیر حقیقی اور غیر معقول خیالات تھے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کی
صفات اور دوسری طرف انسانی فطرت کی پاکیزگی کی حقیقت
نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے رہے۔ اگر یہ لوگ غور سے کام
لیتے تو سمجھ جاتے کہ یہ طریق تکمیل کا نہیں ہے تکمیل کا طریق
دائمی طور پر بُرے جذبات سے چوکس رہنا اور ان سے بچنے
کے لئے اپنے نفس سے برسرِ پیکار رہنا اور اس کے ساتھ
متواتر اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت رکھنا اور اسکی مدد حاصل
کرتے رہنا ہے۔

جہاں مذہب کے متعلق تفصیلی تعلیم نہ رکھنے والے
گروہوں میں اوپر کے غلط خیال پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں مذہب
سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنی ضمیر کو تسلی دینے کے لئے
اور تکمیل انسانی کی حقیقی جنگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے
لئے ان تین طریقوں کو ایجاد کر رکھا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیت
میں کیا گیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ جن قوموں میں کوئی مکمل
شریعت نہیں ان میں یہ خیالات نہیں پائے جاتے ان میں
بھی ان خیالات کے پردے میں اپنے نفس کے خواطر کو چھپایا
جاتا ہے مگر تفصیلی مذاہب کے پیرووؤں میں ان امور کو
زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور دوسرے امور کو کم۔ اس
آیت میں اصل مخاطب بنی اسرائیل ہیں اور وہ جیسا کہ بتایا
جا چکا ہے اس وقت دو حصوں میں تقسیم تھے (۱) یہود (۲)

یہودیوں اور نصاریٰ کے کفارہ کا غلط عقیدہ اور اس کا ردّ آیت لا تجزی نفس عن نفس سے

نصاریٰ۔ ان دونوں قوموں میں حقیقی نیکی کے مٹ جانے پر تنزل
کے زمانہ میں یہ خیالات زور پکڑ گئے تھے وہ ہر وقت چوکس رہ کر
اور رات دن اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار رہ کر اس کو پانے کی
بجائے یہ سمجھنے لگے تھے کہ اگر وہ شریعت اور آسمانی طریق کو نظر انداز
بھی کر دیں تو کوئی حرج نہیں۔ انھیں یا تو بزرگوں کے کفارہ کے
ذریعہ سے نجات حاصل ہو جائے گی یا بزرگوں کی شفاعت سے۔
یا پھر ان نسلی تعلقات سے جو انھیں حاصل ہیں اور یا ان مالی قربانیوں
کی وجہ سے جو وہ دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔

اب میں الگ الگ ان تینوں امور کے متعلق یہودی اور
نصرانی تعلیم کو بیان کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ کس طرح یہ اقوام
غلطی میں پڑ کر نجات کے حقیقی راستہ سے دُور جا پڑی ہیں۔

پہلا باطل خیال جو یہود و نصاریٰ میں پیدا ہو گیا تھا اور
اب تک موجود ہے اور جس کی تردید اس آیت میں قرآن کریم نے
کی ہے یہ ہے کہ کوئی اور وجود ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا
اور وہ اپنے گناہوں کی سزا سے بچ جائیں گے۔ یہود میں یہ خیال
ابتداءً قربانی سے پیدا ہوا یعنے جب تقویٰ کی حالت ان میں کمزور
پڑ گئی۔ تو انہوں نے ان قربانیوں سے جن کا ان کے مذہب میں
توبہ کی طرف توجہ دلانے کے لئے حکم تھا یہ تسلی حاصل کرنا شروع
کر دی کہ یہ قربانیاں ان کے گناہوں کا حقیقی کفارہ ہیں۔ حضرت
موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں "اور ہارون اپنے دونوں ہاتھ اس
جیتے حلوان کے سر پر رکھے۔ اور بنی اسرائیل کی ساری بدکاریوں
اور ان کے سارے گناہوں اور خطاؤں کا اقرار کر کے۔ ان کو اس
حلوان کے سر پر دھرے۔ اور اسے کسی شخص کے ہاتھ۔ جو اس کے
لئے معین ہو۔ بیابان کو بھجوا دے کہ وہ حلوان ان کی ساری بدکاریاں
اپنے اوپر اُٹھا کے ویرانے میں لے جائے گا اور وہ اس حلوان کو
بیابان میں چھوڑ دے" (احبار باب ۱۶ آیت ۲۱-۲۲) نیز فرماتے
ہیں "اور خطا کی قربانی کی بابت ایک بکرا۔ تاکہ اس سے تمہارے
لئے کفارہ دیا جاوے" (گنتی باب ۲۸ آیت ۲۲) یعنی جہاں اور
قربانیاں پیش کیا کرو وہاں اپنی خطاؤں کے کفارہ کے طور پر
ایک بکرا بھی قربانی کیا کرو تا وہ بکرا تمہارے لئے کفارہ ہو جائے

اور تمہارے گناہوں کو اپنی قربانی سے مٹا دے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے احکام کو دیکھتے ہوئے ان کے یہ معنے کرنے کہ بکرے یا بیل کی قربانی انسانی گناہوں کا حقیقی کفارہ ہے بالکل درست نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دوسری جگہ فرماتے ہیں "یہ وہ شریعتیں اور حقوق اور احکام ہیں جو خداوند تمہارے خدا نے مجھے فرمائے۔ کہ میں تمہیں سکھلاؤں تاکہ تم اس سرزمین میں جس کے وارث ہوتے جاتے ہو۔ ان پر عمل کرو۔ تاکہ تو خداوند اپنے خدا سے ڈرتا رہے اور اس کے سب حقوق اور اس کے سب حکموں کو جو میں تمہیں فرماتا ہوں حفظ کرے نہ فقط تو بلکہ تو اور تیرا بیٹا اور تیرا پوتا۔ زندگی بھر۔ تاکہ تیری عمر کے دن بڑھائے جاویں" (استثناء باب ۶ آیت ۱-۲)

پھر لکھا ہے "سن لے اے اسرائیل۔ خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ اور یہ باتیں جو آج کے دن میں تجھے فرماتا ہوں تیرے دل میں رہیں اور تو یہ باتیں کوشش سے اپنے لڑکوں کو سکھلا۔ اور تو اپنے گھر میں بیٹھتے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان کا چرچا کر اور تو ان کو نشانی کے لئے اپنے ہاتھ پر باندھ۔ اور وے تیری آنکھوں کے درمیان ٹیکوں کی مانند ہوں گے انہیں اپنے گھر کی چوکھٹوں اور پھاٹکوں پر لکھ" (باب ۶۔ آیت ۴ تا ۹)

پھر لکھا ہے "اور تم وہی کرو جو خداوند کی نظر میں راست اور درست ہے۔ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔" (باب ۶ آیت ۱۸) اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دل کی درستی اور نیکی اور توحید اور شریعت پر انتہا درجہ کا زور دیتے ہیں اور ان پر عمل کو ایسا ضروری قرار دیتے ہیں کہ انہیں تحریر و تقریر سے پھیلانے اور ایک دوسرے کی تلقین کرتے رہنے بلکہ در و دیوار پر لکھ رکھنے تک کی تاکید کرتے ہیں۔ اس تعلیم کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک قوم کی قوم کے گناہ ایک بکرے کی قربانی سے دُھل جائیں گے اگر گناہوں کا دُھلنا اتنا ہی آسان ہے تو پھر اس قدر زور شریعت پر دینے بلکہ حق یہ ہے کہ شریعت نازل کرنے ہی کی ضرورت کیا ہو سکتی تھی۔

قرآن کریم کا یہود کو کفارہ کا عقیدہ رکھنے پر انتباہ۔

قرآن کریم یہود کے اس غلط خیال کی تردید فرماتا ہے اور یہود کو ہوشیار کرتا ہے اور اس دن سے ڈراتا ہے جبکہ وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اور کوئی جان (قربانی کیا ہوا بکرا) کسی جان (یہودی) کی جگہ اس کے حضور میں قبول نہ کی جائیگی بلکہ اس دن اپنے نفس کی پاکیزگی ہی کام آ سکے گی۔

جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم جو خطا کی قربانی کے بارہ میں ہے۔ اس کے معنی صرف یہ تھے کہ بکرے کی قربانی سے نفس کی قربانی کی طرف توجہ دلائی جائے اور بکرے کی قربانی صرف ایک تصویری زبان میں نصیحت تھی۔ مگر یہود نے سہل انگاری سے کام لیکر اصل نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور تمثیل کو اصل قرار دیکر نفس کی پاکیزگی کو پیچھے ڈال دیا۔ اور بکرے کی قربانی کو اپنے لئے کافی سمجھا۔

بنی اسرائیل پر کفارہ کے عقیدہ کا اثر

اس قسم کے کفارہ کا اثر بنی اسرائیل کی طبیعت پر ایسا گہرا تھا کہ جب بخت نصر بادشاہِ بابل نے بیت المقدس کو مسمار کر دیا تو چونکہ قربانیاں اسی جگہ ہوتی تھیں ان کو یوں معلوم ہوا کہ گویا آئندہ گناہ بخشوانے کا کوئی ذریعہ ہی ان کے پاس نہیں رہا اور بہت سے آدمی اس صدمہ کی وجہ سے تارک الدنیا ہو گئے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۲۷۵ کالم اول بحوالہ توسفتا باب ۱۵۔ آیت ۲)۔ اور ایک بڑے عالم جوشا بن حنانیہ نے واویلا کرکے کہا "ہم پر افسوس اب ہمارے گناہوں کا کفارہ کس طرح ہوگا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد اول کالم اول بحوالہ ام اسدر ۱ باب ۵ آیت ۳۷)

میں بتا چکا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا کہ بکرے کی قربانی گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی بلکہ ان کا منشاء صرف یہ تھا کہ بکرے کی قربانی سے نفس کی قربانی کی طرف توجہ دلائی جائے چونکہ ان کے زمانہ میں لوگ رسوم اور تصویری زبان کے شیدا تھے اللہ تعالیٰ نے نفس کی قربانی کا مضمون ان کے سامنے رکھنے کے لئے بکرے کی قربانی کی ایک رسم ان میں رکھ دی تھا کہ سب قوم کی ایک مقررہ دن گناہوں کے ازالہ کی طرف توجہ ہو جائے

مگر انہوں نے تصویری زبان کو تو بھلا دیا۔ مگر تصویر کو قائم رکھا بیت المقدس کے گرائے جانے پر جو صدمہ یہود کو ہوا۔ اسکی وجہ سے انبیائے وقت نے ان کے اس غلط خیال کی تردید شروع کر دی کہ انسان کے گناہ کوئی بیل یا بکرا اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوسیع نبی فرماتے ہیں "تم کلام ساتھ لے کے خدا کی طرف پھرو۔ اور اسے کہو کہ ساری بدکاری کو دُور کر اور ہمیں عنایت سے قبول کر تب ہم ہونٹوں کے بچھڑے نذر گزرانیں گے (ہوسیع باب ۱۴ آیت ۲)

مختلف انبیاء کی طرف سے یہودیوں کے خیالی کفارہ کے باطل ہونے کا اعلان۔

اس آیت میں ہوسیع نبی یہود کو بتاتے ہیں کہ عام بچھڑا یا بکرا کفارہ نہیں بنتا۔ بلکہ توبہ اور تسبیح اور تحمید سے انسان گناہ کے اثر سے نجات پاتا ہے۔ گائے کے پیٹ سے نکلا ہُوا بچھڑا نہیں بلکہ تائب کی زبان سے نکلا ہُوا بچھڑا حقیقی کفارہ ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے عاموس نبی نے یہود کو ان قربانیوں پر بھروسہ کرنے سے اس طرح ہوشیار کیا۔ "اور تم ہر چند سوختنی قربانیوں اور ہدیوں کو میرے آگے گزرانو گے۔ تو بھی میں انہیں قبول نہ کرونگا اور تمہارے موٹے بیلوں کے شکرانے کے ہدیوں کی طرف متوجہ نہ ہوں گا" (باب ۵ آیت ۲۲) پھر لکھا ہے کہ اصل علاج توبہ کا یہ ہے کہ "تو ایسا کر کہ عدالت پانی کی طرح بہتی رہے اور راستی بڑی نہر کی مانند۔" (آیت ۲۴)

یہودیوں کی کفارہ کے متعلق ایک اور ایجاد۔

یسعیاہ نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں "اب آگے کو جھوٹے ہدیے مت لاؤ لبان سے مجھے نفرت ہے۔ نئے چاند اور سبت اور عیدی جماعت سے بھی کہ مَیں عید اور بدینی دونوں کی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ میرا جی تمہارے نئے چاندوں اور تمہاری عیدوں سے بیزار ہے وہ مجھ پر ایک بوجھ ہیں۔ مَیں ان کے اُٹھانے سے تھک گیا۔" (باب ۱ آیت ۱۳ و ۱۴) پھر لکھا ہے "اپنے تئیں دھوؤ آپ کو پاک کرو اور اپنے بُرے کاموں کو میری آنکھوں کے سامنے سے دُور کرو۔ بدفعلی سے باز آؤ نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو ہو۔ مظلوموں کی مدد کرو یتیموں کی فریاد رسی کرو عورتوں کے حامی ہو اب آؤ کہ ہم باہم حجت کریں۔ خداوند کہتا ہے اگرچہ تمہارے گناہ قرمزی ہوویں۔ پر برف کی مانند سفید ہو جائیں گے اور ہر چند وے ارغوانی ہوویں پر اُون کی مانند اُجلے ہونگے۔" (باب ۱ آیت ۱۶ تا ۱۸) اسی بارہ میں میکہ نبی فرماتے ہیں "مَیں کیا لے کے خداوند کے حضور میں آؤں اور خدا تعالیٰ کے آگے کیونکر سجدہ کروں کیا سوختنی قربانیوں اور یک سالہ بچھڑے کو لیکر اس کے آگے آؤں گا۔ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا۔ کیا میں اپنے پلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی جان کی خطا کے بدلے میں دے ڈالوں گا۔ اے انسان اس نے تجھے وہ دکھایا ہے جو کچھ کہ بھلا ہے اور خداوند تجھ سے اور کیا چاہتا ہے مگر یہ کہ تُو انصاف کرے اور رحم دلی کو پیدا کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے۔" (باب ۶ آیت ۶ تا ۸)

اُوپر کے حوالوں سے ثابت ہے کہ یہود کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر چکا تھا کہ قربانیاں ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں اور مختلف نبیوں نے انہیں اس عقیدہ سے ہٹانے کی کوشش کی اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ بکروں بیلوں بلکہ پلوٹھے لڑکوں کی قربانی تک سے خوش نہیں ہو سکتا۔ سابقہ گناہوں کے بداثر سے بچنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ انسان دل سے اور زبان سے توبہ کرے اور راستبازی اور نیکوکاری کو اپنے عمل سے پھر قائم کرے۔ تب اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ مگر نبیوں کی یہ تعلیم دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ بکروں اور بیلوں کی قربانی کی عظمت تو یہود کے دلوں سے کچھ کم ہوئی۔ مگر ایک اور قسم کا کفارہ انہوں نے ایجاد کر لیا اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگوں کی تکالیف ہماری قوم کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں اور اگر نیکوکار کسی زمانہ میں موجود نہ ہوں تو بے گناہ بچوں کو اللہ تعالیٰ مار کر قوم کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے چنانچہ یہود کی کتب میں لکھا ہے "جس نسل میں نیک لوگ نہ ہوں بے گناہ سکول کے بچوں کو خدا تعالیٰ لے جاتا ہے" (جوئش انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل صـ۲۷۸ کالم اوّل بحوالہ شبات طالمود) یہی خیال تھا جس نے بعد میں مسیحی کفارہ کے عقیدہ کے بننے میں مدد دی۔ قرآن کریم ان یہود کو مخاطب کر کے اس آیت میں فرماتا ہے کہ اے یہود بنی اسرائیل کوئی جان (خواہ بکرا ہو خواہ بزرگ خواہ بے گناہ

سکول کا بچہ) کسی اور جان (یہودی) کی قائم مقام نہیں ہو سکتی اور قرآن کریم کی اس تعلیم سے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے خود بنی اسرائیل کے نبیوں کو اتفاق ہے۔

بنی اسرائیل کا دوسرا حصہ وہ ہے جو مسیحی ہو چکا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح نے صلیب پر موت پاکر مسیحیوں کے گناہوں کو اٹھا لیا۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ قربانی جس کا حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا تھا مسیح کی آمد کی خبر تھی۔ اور اس سے اس خیال کو تازہ رکھا گیا تھا۔ کہ خدا کا ایک برہ یعنی مسیح دُنیا میں آکر قربان ہوگا۔ اور دُنیا کے گناہ اُٹھالے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک برّہ میں یہ طاقت نہیں کہ وہ سب دُنیا کے گناہ اُٹھالے لیکن خدا کے بیٹے میں یہ طاقت ہے کہ وہ دوسروں کے گناہ اُٹھالے۔ وہ یہود کے اس خیال کو کہ ہمارے بزرگوں نے تکالیف اُٹھا کر ہمارے گناہوں کا کفارہ کر دیا اس دلیل سے رد کرتے ہیں کہ وہ بزرگ بہرحال گنہگار تھے۔ اور گنہگار گنہگار کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا پس مسیح جو بےگناہ تھا اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ دوسروں کے گناہ اُٹھائے۔ مسیح بغیر کسی گناہ کے صلیب پر لٹکایا گیا۔ اور اسکی وجہ یہی تھی کہ وہ دوسروں کے گناہوں کی وجہ سے صلیب پر لٹکا اس طرح مسیح کے کفارہ کی نسبت وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ گناہ انسان کو آدم کے گناہ کے نتیجہ میں ورثہ میں ملا۔ مسیح چونکہ بلا باپ تھے اس لئے وہ آدم کے گناہ کے وارث نہ تھے پس وہی اس قابل تھے کہ بے گناہ ہوتے اور چونکہ وہ بے گناہ تھے اس لئے وہی انسانوں کے گناہ کا کفارہ ہو سکتے تھے بعض مسلمانوں نے ان کے اس خیال کی نادانی سے اس طرح تائید کر دی کہ وہ کہتے ہیں سوائے مسیح اور ان کی ماں کے کوئی مس شیطان سے پاک نہیں گویا وہ اس خیال کی وجہ سے مسیحیوں سے بھی ایک ہاتھ آگے چلے گئے۔ اور جبکہ مسیحی صرف مسیح کو کلی طور پر بے گناہ کہتے ہیں وہ انکی ماں کو بھی مس شیطان سے اس طرح پاک قرار دیتے ہیں جس طرح اور کوئی نبی مس شیطان سے پاک نہیں ہوا (نعوذ باللہ من ذالک)

مسیح کے بے گناہ ہونے اور صلیب پر چڑھ کر لوگوں کے گناہ اُٹھا لینے کے متعلق حضرت مسیح کا ایک قول بھی نقل نہیں کیا جاتا اور نہ نقل کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سراسر اس کے خلاف ہے (اگر ایسا حوالہ ہوتا بھی تو وہ قابل اعتبار نہ تھا کیونکہ موجودہ اناجیل سخت محرف مبدل ہیں) ہاں حواریوں کے بعض اقوال اس بارہ میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں "جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے مسیح ہمارے گناہوں کے واسطے مرا۔" (۱ قرنتھیوں باب ۱۵ آیت ۳) اس نے (یعنے مسیح نے) موت کی اذیت کے سبب جلال و عزت کا تاج پایا۔ تاکہ وہ خدا کے فضل سے سب آدمیوں کے لئے موت کا مزہ چکھے۔" (عبرانیوں باب ۲ آیت ۹ و ۱۰) "تاکہ وہ (یعنی مسیح) ان باتوں میں جو خدا سے نسبت رکھتیں لوگوں کے گناہوں کا کفارہ کرنے کے واسطے ایک رحیم اور دیانتدار سردار کاہن ٹھہرے۔" (عبرانیوں باب ۲ آیت ۱۷) "مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کہ وہ ہمارے بدلہ میں لعنت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے۔ (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) ان حوالوں اور بعض ایسے ہی اور حوالوں سے مسیحی نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسیح بے گناہ تھا۔ مگر وہ ایسی موت مرا جو لعنتیوں کی موت ہے کیونکہ وہ کاٹھ پر لٹکایا گیا جو تورات کی رُو سے لعنتیوں کی موت ہے پس معلوم ہوا کہ اسکی موت اس کے لئے نہ تھی بلکہ دوسرے گنہگاروں کے لئے تھی تاکہ وہ ان کے لئے کفارہ ہو جائے۔

مسیح کے بے گناہ اور مصلوب ہونے کے متعلق عیسائیوں کے پیش کردہ حوالہ جات کی حقیقت۔

کفارہ کے متعلق مسیحی عقیدہ۔

یہ خیال جیسا کہ اوپر یہود کے عقائد کے بارہ میں لکھا جا چکا ہے یہود کے اس خیال کا نتیجہ ہے جو ان میں آخری زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے کہ بزرگ لوگ جو تکلیف اُٹھاتے ہیں اس کا سبب قوم کو گناہوں کی سزا سے بچانا ہوتا ہے مگر یہ خیالات بائبل کی دوسری آیات کے بالکل خلاف ہیں مسیح علیہ السلام خود فرماتے ہیں "اور جو کوئی اپنی صلیب اُٹھا کے میرے پیچھے نہیں آتا میرے لائق نہیں۔" (متی باب ۱۰ آیت ۳۸) یہی بات بہ تغییرِ الفاظ دوسری اناجیل میں بھی ہے۔ اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنی صلیب سے لوگوں کی نجات وابستہ نہیں بتاتے بلکہ ہر ایک شخص کا خود صلیب

پر لٹکنا اس کی نجات کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بھی جو موسوی سلسلہ کے بانی تھے اور جن کی تعلیم کو قائم کرنے کا دعویٰ حضرت مسیح کرتے ہیں اس قسم کے کفارہ کی تردید پائی جاتی ہے تورات میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر چالیس راتوں کے لئے گئے اور ان کے پیچھے بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا لیا تو اللہ تعالےٰ کا غضب بنی اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کے تباہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لکھا ہے "پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کروں۔ اور میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۹ و ۱۰) اس کے بعد لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف آئے اور شرک پر ناراضگی ظاہر کی۔ اور پھر لکھا ہے "اور دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا اور اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں کہ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کروں چنانچہ موسیٰ خداوند کے پاس پھر گیا اور کہا کہ اے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا معبود بنایا اور اب کاش کہ تو ان کا گناہ معاف کرتا۔ مگر نہیں تو میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے دفتر سے جو تو نے لکھا ہے میٹ دے۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۳۰ تا ۳۲) ان آیات سے ظاہر ہے کہ اپنی قوم کو حضرت موسیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ دینے کا وعدہ کر کے پہاڑ پر گئے اور انہوں نے خدا تعالےٰ سے عرض کی کہ یا تو ان کا گناہ یوں ہی معاف کر دے نہیں تو مجھے تباہ کر کے ان کے گناہوں کا کفارہ کر دے۔ اس التجا کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا کہ تو تو گنہگار ہے گنہگار گنہگار کا کفارہ کس طرح ہو سکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ جواب دیا کہ "جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کو اپنے دفتر سے میٹ دوں گا۔" (آیت ۳۳) اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی گنہگار کے بدلہ میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا قانون یہی ہے کہ وہ گنہگار ہی کو سزا دیتا ہے۔ اس تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ مسیح اپنی قوم کے گناہوں کے لئے صلیب پر لٹکائے گئے۔ بائبل کی تعلیم کے خلاف ہے شاید کوئی کہے کہ یہ تعلیم حضرت مسیح کے وقت میں منسوخ ہو گئی مگر یہ تو ایک ازلی صداقت ہے اور ازلی صداقتیں منسوخ نہیں ہوا کرتیں۔ انسانوں کے متعلق احکام بدل سکتے ہیں خدا تعالیٰ کی سنتیں نہیں بدل سکتیں۔

جن دلائل پر مسیحیت کفارہ کی بنیاد رکھتی ہے وہ بھی عقلاً اور نقلاً غلط ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا ہے اس لئے وہ اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ گویا انسان کی فطرت ہی گنہگار ہے۔ قرآن کریم اس کو رد فرماتا ہے اور فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین عْ) ہم نے یقیناً انسان کو ہر قسم کی کجی سے پاک قوتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (بخاری جلد اول کتاب الجنائز) ہر بچہ کامل فرمانبرداری کی روح لے کر پیدا ہوتا ہے عجیب بات ہے کہ مسیحی ایک طرف تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ورثہ کے گناہ پر انسان غالب نہیں آ سکتا۔ اور اس لئے کفارہ کے لئے ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی کہ جو بلا باپ پیدا ہوا ہو لیکن دوسری طرف وہ اس امر کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دو ہی انسان جن کو ورثہ کا گناہ نہ ملا تھا یعنی آدم و حوا وہ دونوں گنہگار تھے۔ اگر وہ دونوں انسان جنہوں نے ورثہ میں گناہ نہ پایا تھا گنہگار تھے تو پھر یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جن کو ورثہ میں گناہ نہ ملے وہ پاک رہ سکتے ہیں۔ یہ امر تو تب ثابت ہوتا اگر کئی مثالیں ایسی بھی پائی جاتیں کہ ورثہ میں گناہ نہ پا کر لوگ بے گناہ رہ گئے ہوتے مگر مسیحیوں کے نزدیک تو دو ہی ایسے وجود تھے اور دونوں ہی گنہگار تھے۔ تیسرا وجود حضرت مسیح کا ان کے نزدیک ہے۔ لیکن حضرت مسیح کی نسبت یہ کہنا کہ بوجہ بے باپ ہونے کے ان کو ورثہ میں گناہ نہ ملا تھا محض ایک تحکم کا فیصلہ ہے کیونکہ بچہ صرف اپنے باپ کی قوتوں کو ورثہ میں نہیں لیتا بلکہ ماں کی قوتوں کو بھی ورثہ میں لیتا ہے نہ معلوم

انجیل اور تورات میں کفارہ کا رد

مسیحیوں کے کفارہ کے متعلق دلائل اور ان کا رد قرآن مجید میں

کس نادان نے اس مسئلہ کی ایجاد کرنے والے کے دل میں یہ شبہ ڈال دیا کہ بچہ صرف باپ کی خصلتیں لیتا ہے بچہ جس طرح باپ کی خصلتیں لیتا ہے اسی طرح ماں کی خصلتیں لیتا ہے بعض دفعہ بچہ باپ کی شکل پر ہوتا ہے بعض دفعہ ماں کی شکل پر بعض دفعہ باپ کی قوتوں کا حصہ اس میں زیادہ ہوتا ہے بعض دفعہ ماں کی قوتوں کا۔ اور بعض دفعہ برابر برابر۔ پس اگر مسیح کا باپ نہ تھا تو اس سے یہ کیونکر نتیجہ نکلا کہ ان میں ورثہ کا گناہ نہ آیا تھا۔ وہ حضرت مریمؑ کے پیٹ میں پلے اور ماں کی خصوصیات کے وارث ہوئے اور عورت مسیحیوں کے نزدیک اسی طرح گنہگار ہے جس طرح مرد۔ بلکہ بائبل کی رُو سے شیطان نے چونکہ حوا کے ذریعہ سے آدمؑ کو ورغلایا تھا۔ (پیدائش باب ۳ آیت ۱تا۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان عورت کو مرد کی نسبت گناہ کے زیادہ قریب سمجھتا تھا تبھی اس نے براہ راست آدم کو ورغلانے کی کوشش کی۔ پس جو بچہ بائبل کے بیان کے مطابق صرف حوا کی کمزوری لے کر پیدا ہوا وہ گناہ کے زیادہ قریب تھا بہ نسبت اُن بچوں کے جو آدم کی نسبتی طاقت سے حصہ لیتے ہیں خود مسیح علیہ السلام کی اپنی رائے اپنے بارے میں انجیل کے مطابق یہ ہے لکھا ہے کہ ایک شخص مسیح کے پاس آیا اور اُن سے کہا۔ "اے نیک اُستاد میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں اس نے اس سے کہا تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔" (متی باب ۱۹۔ آیت ۱۶ و ۱۷) ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو نیک نہیں قرار دیتے۔ پھر انہیں ایک ہی نیک قرار دے کر کفارہ کی بنیاد اس پر رکھنی کہاں تک درست فعل ہو سکتا ہے۔ اس جگہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام نے جب اس آیت کو پیش کرکے مسیحیوں کے کفارہ کے عقیدہ پر اعتراض کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو آیت اُنیس سو سال تک بقول مسیحیوں کے اناجیل کا حصہ تھی۔ تازہ اناجیل میں اُسے بدل دیا گیا ہے۔ کم سے کم اُردو کے تراجم میں سے تو

انجیل میں تحریف کا ایک نمونہ۔

بدل دیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ غلط ہوتا رہا ہے۔ مسیح علیہ السلام نے یہ نہیں کہا تھا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے بلکہ یہ کہا تھا کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اُنیس سو سال تک جو غلطی معلوم نہیں ہوئی وہ بانی سلسلہ احمدیہ کے اعتراض کے بعد کیونکر معلوم ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دلیرانہ تحریف ہے۔ جو اس زمانہ میں جبکہ پریس کو ایجاد ہوئے سینکڑوں سال گذر گئے ہیں اور کروڑوں اناجیل ہر زبان میں شائع ہو چکی ہیں کی گئی ہے۔ جو قوم اس قدر دلیرانہ تحریف پریس کی ایجاد کے بعد کر سکتی ہے اس سے پریس سے پہلے تحریف کی کیا کچھ امید نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ سب کچھ بائبل کے بیان کے مطابق ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اسلام کے نزدیک تو سب ہی بچے نیک فطرت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے انبیاء خواہ مسیح ہوں یا موسیٰ یا اور کوئی۔ سب کے سب کے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے مسیح علیہ السلام کو کوئی خصوصیت حاصل نہ تھی۔

ورثہ میں گناہ کے ملنے کی حقیقت۔

مسیح کے کفارہ کی دوسری بنیاد اور اس کا انہدام۔

اس بارہ میں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسیح کے کفارہ کی دوسری بنیاد اس پر ہے کہ وہ لوگوں کی خاطر اور ان کے گناہ اُٹھانے کے لئے صلیب پر لٹک کر مرے صلیب پر لٹک کر مرنے کی نسبت تو آگے چل کر متعلقہ آیات کے ماتحت لکھا جائیگا۔ اس جگہ کے مناسب حال میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ نہ تو مسیح کا اپنی مرضی سے صلیب پر لٹکنا انجیل سے ثابت ہے نہ اُن کا صلیب پر مرنا۔ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حضرت مسیح ساری رات اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ وہ اُن کو صلیب سے بچالے۔ چنانچہ لکھا ہے "پھر ذرا آگے بڑھ کے (مسیح علیہ السلام) مُنہ کے بل گرا۔ اور دعا مانگتے ہوئے کہا کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جائے۔ تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری ہی خواہش کے مطابق ہو" (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) کیا عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ جو شخص آسمان سے گنہگاروں کے گناہ اُٹھانے کے لئے اپنی مرضی سے آیا۔

وہ اس طرح زور و کر اور سجدہ میں گر کر اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح نے ساتھ یہ بھی تو کہا کہ خدا کی مرضی ہو بیشک ایسا ہی لکھا ہے مگر اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ مسیح کی اپنی مرضی لوگوں کے گناہ کا کفارہ بننے کی نہ تھی پھر وہ کفارہ ہو کس طرح گیا۔ کیا خدا تعالیٰ نے ظلماً ایک انکاری شخص کے کندھوں پر لوگوں کا بوجھ ڈال دیا۔ مسیح کی شدت مخالفت تو ہم اس حد تک دیکھتے ہیں کہ جب اُسے صلیب پر لٹکایا گیا تو بقول اناجیل اُس نے کہا "ایلی۔ ایلی۔ لما سبقتانی" (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اس حوالہ سے تو اس تشریح کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو مسیحی پہلے حوالہ کی کرتے ہیں یعنی مسیح علیہ السلام نے خدا کی مرضی کو مقدم کر لیا تھا کیونکہ انجیل کہتی ہے کہ جب خدا کی مرضی ظاہر ہو ہی گئی اور مسیح صلیب پر لٹک گئے۔ تو انہوں نے بجائے رضامندی ظاہر کرنے کے خدا تعالیٰ سے نعوذ باللہ شکوہ کرنا شروع کر دیا کہ تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح کسی صورت میں بھی صلیب پر لٹکایا جانا نہیں چاہتے تھے پس یہ کہنا کہ وہ انسانوں کے گناہ اُٹھانے کے لئے اس دُنیا میں آئے تھے۔ بالکل باطل ہے۔ اگر وہ اس غرض کے لئے دُنیا میں آئے ہوتے تو کبھی اس واحد ذریعہ سے جو مسیحیوں کے خیال میں لوگوں کو گناہ سے بچانے کا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہ کرتے۔

انجیل سے اس بات کا ثبوت کہ مسیح نہ صلیب پر اپنی مرضی سے لٹکے۔ اور نہ ہی صلیب پر انہوں نے وفات پائی

یہود پر انسانی قربانی کا اثر

اب رہا دوسرا سوال کہ کیا مسیح علیہ السلام واقعہ میں صلیب پر فوت ہوئے؟ سو اس بارہ میں اختصاراً خود حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادت یہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس فقیہوں اور فریسیوں کا ایک وفد آیا اور درخواست کی کہ انہیں ایک نشان دکھایا جائے۔ اس پر حضرت مسیح نے فرمایا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائے گا۔ کیونکہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔" (متی باب ۱۲ آیت ۳۹ و ۴۰) یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گئے تھے اُسکے پیٹ میں زندہ رہے تھے اور اس کے پیٹ سے زندہ ہی نکلے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ مسیح علیہ السلام بھی قبر میں زندہ ہی گئے اور زندہ ہی رہے اور یہ خیال کہ مسیح صلیب پر مر گئے تھے ایک باطل خیال ہے اور جب وہ مرے ہی نہیں تو اُن کا دوسروں کے گناہوں کی خاطر موت قبول کرنے کا مسئلہ بھی سراسر باطل ٹھہرا۔ اب ہم حضرت مسیح کو نعوذ باللہ جھوٹا کہیں یا اُن لوگوں کو جو انہیں صلیب پر مار کر قبر میں مُردہ ہی کی حیثیت میں داخل کرتے ہیں اور مردہ ہی کی حیثیت میں رکھتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باوجود اس کے کہ انسانی قربانی ان معنوں میں کہ لوگ خود کسی انسان کو پکڑ کر اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر قتل کر دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے موقوف ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہود اس کے اثر سے بالکل آزاد نہ تھے۔ چنانچہ کتاب قاضیوں باب ۱۱ میں لکھا ہے کہ اسرائیلی سردار افتاح جب بنو عمون سے لڑنے کو نکلا تو اُس نے نذر مانی کہ اگر خدا تعالیٰ اُسے فتح دے تو سب سے پہلی چیز جو اُسے اُس کے گھر سے نکلتی ملے گی وہ اُسے قربان کرے گا۔ اس کی واپسی پر اُس کی لڑکی جو اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُسے سب سے پہلے ملی۔ اور اس نے اُسے قربان کر دیا۔ اس قسم کی نذر بھی ایک قسم کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارے گناہ ہماری کامیابی کے راستہ میں روک بنتے ہیں تو اُن کے اثر کو دُور کرنے کے لئے ہم فلاں قربانی پیش کریں گے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ کوئی جان کسی جان کی قائم مقام کے طور پر خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش نہیں ہو سکتی نہایت سچا اور عقل کے مطابق دعویٰ ہے۔ اور خود یہود اور نصاریٰ کی کتب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال اس کے مؤید ہیں۔ اور اس کے برخلاف جو خیالات یہود اور نصاریٰ میں پائے جاتے ہیں صرف ایک باطل خواہش کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے

بزرگوں کو اپنے گناہوں کے بدلہ میں قربانی کے طور پر پیش کر کے ان بزرگوں کی سخت ہتک کی ہے اور گناہ کا دروازہ بہت وسیع کر دیا ہے۔

شفاعت

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ اُس دن کوئی شفاعت بھی کسی کی طرف سے قبول نہ کی جائے گی۔ یہ بھی یہود و نصاریٰ کے رائج الوقت خیالات کے رد میں ہے۔ یہود نسبی شفاعت کے قائل تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اُن کا اولادِ ابراہیم میں سے ہونا ان کے لئے شفاعت کا موجب ہوگا۔ اور اس تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں کوئی سزا نہیں دے گا۔ یا اگر سزا دیگا تو نہایت محدود۔ قرآن کریم میں آگے چل کر اسی صورت میں اُن کے اس دعویٰ کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر ہے وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ ع۹) یعنی یہود کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند گنتی کے دنوں سے زیادہ کسی صورت میں نہ چھوئے گی۔ یہود کے اس خیال کے متعلق ریورنڈ سیل رکوع ۹ کی مذکورہ بالا آیت کے نیچے اپنے ترجمۂ قرآن میں لکھتے ہیں کہ زمانہ حال کے یہود کا یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے کہ کوئی یہودی سوائے داتن اور ابیرام اور دہریوں کے دوزخ میں گیارہ مہینوں یا حد سے حد ایک سال سے زیادہ نہ رہے گا۔ پرانے لٹریچر میں مجھے اس بارہ میں کوئی حوالہ نہیں مل سکا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ کی کتب تو بہت کچھ مٹ چکی ہیں، اور زمانۂ حال کے مصنفین اس غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ یہود کلّی طور پر اور قومی طور پر بعث بعد الموت کے منکر ہیں۔ اور اس وجہ سے بعد الموت زندگی کی نسبت انہوں نے کاوش کر کے یہودی خیالات کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود بعد الموت زندگی کے قائل تھے چنانچہ اوپر کی آیت بھی اس پر شاہد ہے اور اور کئی آیات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اوپر کی آیات کے مفہوم کی تشریح کے سلسلہ میں بعض احادیث اسلامی کتب میں آتی ہیں جو اس امر کی مزید وضاحت کر دیتی ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ دُنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہر ہزار سال کے مقابل پر ہمیں ایک دن کا عذاب ملے گا۔ اس کے بعد ہمارا عذاب ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ بعض یہود کا خیال ہے کہ انہیں صرف چالیس دن تک دوزخ کا عذاب ملیگا کیونکہ انہوں نے چالیس دن تک بچھڑے کی پرستش کی تھی (سوائے داتن اور ابیرام کے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور وہ ہلاک کر دیئے گئے تھے اور سوائے دہریوں کے) حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں جو دنوں کے بارہ میں اختلاف ہے کسی روایت میں سات دن بیان ہوئے ہیں اور کسی میں چالیس دن۔ یہ اختلاف یہود کے مختلف قبائل کے مختلف خیالات کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے بہرحال ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانہ میں بعث بعد الموت کے قائل تھے مگر اُن کا خیال تھا کہ بوجہ اولاد ابراہیم ہونے کے وہ لمبی سزا نہیں پائیں گے۔ اور یہ خیال اُن کا کم سے کم کئی صدی پُرانا تھا کیونکہ عرب میں رہنے والے یہود چند صدی پہلے سے عرب میں آ کر بسے تھے۔ پس اُنکے وہ خیالات جو دوسرے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں (دیکھو حوالہ سیل) بہرحال چند صدی پہلے کے ہی تسلیم کرنے پڑیں گے۔

شفاعت کے متعلق یہودیوں کے خیالات[2]

عہد نامہ قدیم میں بعث بعد الموت کا ذکر

غور سے دیکھا جائے تو عہد نامۂ قدیم سے بھی بعد الموت زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی مذہب اس بارہ میں تعلیم دینے کے بغیر مکمل کہلا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ بعد الموت زندگی ہی انسانی پیدائش کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے اس ذریعہ کے علم سے محروم رکھنا گویا مذہب کی غرض سے محروم رکھنا ہے۔ پس جو مذہب اس تعلیم میں کوتاہی کرتا ہے اپنے خلاف خود گواہی دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی کتاب استثناء باب ۳۱ آیت ۱۶ میں لکھا ہے "تب خداوند نے موسیٰ کو فرمایا دیکھ تو اپنے باپ دادوں کے

ساتھ سو رہے گا۔" اس کے معنے صاف ہیں کہ مرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رُوح اپنے باپ دادوں کے ساتھ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جسمانی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی قبر وہاں نہیں بنی جہاں کہ اُن کے باپ دادوں کی تھی۔ کیونکہ وہ جنگل میں فوت ہوئے اور اُن کی قبر کا ظاہری نشان تک نہیں ملتا۔ تورات میں لکھا ہے " آجکے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا (استثناء باب ۳۴ آیت ۶) پس معلوم ہؤا کہ باپ دادوں کے ساتھ سونے سے مراد اُس جگہ رہنے کے ہی ہیں۔ جہاں ان کی رُوحیں موت کے بعد رہتی ہیں۔

اسی طرح تورات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا " اور اس پہاڑ پر جس پہ تو جاتا ہے مرجا اور اپنے لوگوں میں شامل ہو جیسے تیرا بھائی ہارون ہور کے پہاڑ پر مرگیا اور اپنے لوگوں میں جا ملا۔" (استثناء باب ۳۲ آیت ۵۰) اس حوالے سے بھی جسمانی موت کے بعد ایک اور زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ نیک ارواح کسی خاص جگہ پر اکٹھی رکھی جاتی ہیں۔ ورنہ مرنے کے بعد اپنے باپ دادوں سے جا ملنے کے معنے ہی کیا ہوئے۔

حضرت ایوبؑ فرماتے ہیں کاش میں اُن بچوں کی طرح ہوتا جنہوں نے اُجالا نہیں دیکھا یعنی بڑی عمر کو نہیں پہنچے۔ پھر ان کی حالت کی نسبت فرماتے ہیں " وہاں شریر ستانے سے باز آتے اور تھکے ماندے چین سے ہیں وہاں اسیر مل کے آرام کرتے ہیں اور ظالم کی آواز پھر نہیں سنتے۔ چھوٹے بڑے وہاں برابر ہیں۔ اور غلام اپنے آقا سے آزاد" (ایوب باب ۳ آیت ۱۷ تا ۱۹) ان آیات سے بھی ایک دوسری زندگی کا پتہ ملتا ہے۔

حضرت داؤدؑ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں " تُو میری جان کو قبر میں رہنے نہ دے گا اور تُو اپنے قدوس کو سڑنے نہ دے گا تُو مجھ کو زندگانی کی راہ دکھلائے گا۔" (زبور باب ۱۶ آیت ۱۰ و ۱۱)

یہودیوں کے شفاعت کا عقیدہ تراشنے کی وجہ۔

اسی طرح حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں " ان لوگوں سے اے خداوند جو تیرے ہاتھ ہیں دُنیا کے لوگوں سے جن کا بخرہ اسی زندگانی میں ہے اور جن کے پیٹ تو اپنی نہانی چیزوں سے بھرتا ہے انکی اولاد بھی سیر ہوتی اور وے اپنی باقی دولت اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ پر میں جو ہوں صداقت میں تیرا مونہہ دیکھوں گا۔ اور جب میں تیری صورت پر ہو کے جاگوں گا تو میں سیر ہوؤں گا۔" (زبور باب ۱۷۔ آیت ۱۴ و ۱۵)

ان آیات سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے نزدیک بعض لوگ اسی زندگی پر تکیہ کرتے ہیں لیکن مومن بعد از موت زندگی پر دھیان رکھتا ہے کیونکہ وہاں اُسے اللہ تعالیٰ کی کامل طور پر زیارت ہوگی اور اسکی رُوح اسی دُنیا میں خدا کی صورت پر ہوگی یعنی کامل الصفات ہوگی۔

پھر حضرت داؤد خدا تعالیٰ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں " اُس نے (یعنی داؤد نے) تجھ سے زندگی چاہی اور تو نے اس کو عمر کی درازی ابد تک بخشی" (زبور باب ۲۱ آیت ۴)

ان حوالجات ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں کی تعلیمات سے بعد از موت زندگی کا ثبوت یقینی طور پر ملتا ہے اور جب ہم قرآن کریم کی شہادت کو ملا کر دیکھیں جو دشمن کے نزدیک بھی کم سے کم زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک معتبر تاریخی شہادت کی حیثیت ضرور رکھتی ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس بارہ میں زمانہ حال کے محققین کا یہ خیال کہ حضرت مسیحؑ سے پہلے کے اسرائیلی نبیوں کی تعلیم میں بعد از موت زندگی کا ثبوت نہیں ملتا۔ ایک بودا۔ کمزور اور بے دلیل خیال ہے اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔

حق یہ ہے کہ بعد از موت زندگی کی تعلیم یہود میں پہلے سے موجود تھی۔ اور وہ اپنے اعمال سے ڈرتے ہوئے اس زندگی کے عذاب کا خوف دل سے مٹانے کے لئے کچھ حیلے تراشتے تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ بوجہ نبیوں کی اولاد ہونے کے ان کی شفاعت سے ہم عذاب اُخروی سے یا تو کلّی طور پر بچ جائیں گے یا بہت محدود عذاب ہمیں ملے گا۔ اللہ تعالےٰ

اس کی نفی فرماتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ شفاعت گناہ پر دلیر کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ایسی کوئی رعایت تم کو نہ دی جائے گی۔ پس اپنے اعمال کی اصلاح کرو اور خود ساختہ خیالات سے فریب کھا کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ یہود کو شفاعت کے بارہ میں غالباً اس امر سے بھی دھوکا لگا کہ اس دنیا میں پہلے بعض الٰہی عذابوں کا اُن کے متعلق فیصلہ ہوا، پھر نبیوں کی دُعا سے وہ ٹل گئے انہوں نے سمجھا کہ اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔ حالانکہ اس دنیا کو اگلے جہان سے کوئی نسبت نہیں۔ اس دنیا میں عذاب کے ٹلانے سے انسان کو پھر توبہ اور نیکی کا موقعہ مل سکتا ہے مگر دوسری زندگی تو آخری فیصلہ کا مقام ہے۔ وہاں اس قسم کی بخشش کے معنے تو یہ بنتے ہیں کہ دنیوی زندگی کو بالکل عبث قرار دیدیا جائے۔

عیسائیت اور شفاعت

شفاعت کا خیال مسیحیوں میں بھی پایا جاتا ہے انجیل میں لکھا ہے "اے میرے بچو میں یہ باتیں تمہیں لکھتا ہوں تاکہ تم گناہ نہ کرو۔ اور اگر کوئی گناہ کرے تو یسوع مسیح جو صادق ہے باپ کے پاس ہمارا شفیع ہے اور وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔ فقط ہمارے گناہوں کا نہیں بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا بھی"۔ (یوحنا کا پہلا خط باب ۲ آیت ۱)

کیا کفارہ اور شفاعت ایک ہی چیز ہے؟

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کفارہ اور شفاعت ایک چیز ہیں؟ اگر ایک چیز ہیں تو پھر ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے کے کیا معنے ہیں۔ جہاں تک میرا علم جاتا ہے اس بارہ میں مسیحی کتب خاموش ہیں۔ مگر کفارہ اور شفاعت کے الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ کفارہ سے یہ مراد ہے کہ کسی فعل کے ذریعہ سے کسی دوسرے فعل کے اثر کو مٹا دینا۔ لیکن شفاعت کسی فعل یا بدلہ پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے معنے سفارش کے ہیں خواہ سفارش کرنیوالا گنہگار کے فعل کا کوئی بدلہ نہ دے وہ جج یا فیصلہ کنندہ سے اپنے تعلق کو جتا کر ایک گنہگار کے لئے معافی لیتا ہے۔ میرے نزدیک مسیحیوں نے اس فرق کو نہ سمجھ کر دونوں مطالب کو خلط کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی بھی اور مسیحی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے اور اب بھی ہیں کہ اُن کے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ سے جو قرب حاصل ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یا تو اُن کو عذاب دیگا ہی نہیں، یا دیگا تو بہت ہی خفیف سا عذاب دیگا۔ اور اس خیال نے انہیں گناہوں پر دلیر کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے الٰہی صداقتوں پر غور کرنے کی طرف سے اُن کی توجہ ہٹ گئی ہے۔ قرآن کریم اُن کی اس غلطی کو اُن پر آشکار کر کے اُن کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتا ہے اور سچائیوں پر غور کرنے کی قابلیت کو پھر زندہ کرتا ہے۔

کیا قرآن کریم شفاعت کا منکر ہے؟

اس موقعہ پر ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے جو مسیحی مصنف اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق پھیلاتے رہتے ہیں۔ مسیحی مصنف اس آیت اور ایسی ہی اور آیات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک شفاعت کا مسئلہ مسلّم نہیں ہے اور یہ کہ شفیع ہونے کی مدعی صرف مسیحؑ کی ذات ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے رُو سے شفیع نہیں ہیں (وہیری جلد ۱ صفحہ ۳۱۳) اور مسلمان جو اُن کو شفیع کہتے ہیں یہ ان کا خودساختہ عقیدہ ہے۔ جو بقول اُن کے خلاف قرآن کمزور احادیث پر مبنی ہے۔ یہ خیال مسیحیوں کا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں شفاعت کا مضمون تو جو آیات اس کے متعلق ہیں، اُن کے نیچے انشاء اللہ بیان کروں گا یہاں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم شفاعت کا منکر نہیں۔ بلکہ اس قسم کی شفاعت کا منکر ہے جو یہودیوں اور مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق ہے ورنہ وہ شفاعت کا قائل ہے چنانچہ اسی سورۃ میں آگے چل کر یہ الفاظ موجود ہیں مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ ع ۳۴) یعنی کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے۔ اسی طرح فرماتا ہے لَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (زخرف ع ۷) یعنی جنکو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں شفاعت کا کوئی اختیار نہیں ہاں شفاعت کا حق ہمارے اس بندے کو حاصل ہے جو حق کی گواہی دے رہا ہے اور یہ اس حق کی گواہی دینے والے کو جانتے ہیں۔ پس قرآن کریم شفاعت کا قائل ہے وہ صرف اس غیر معقول شفاعت کا منکر ہے جو لوگوں کو گناہوں پر دلیر کرتی ہے اور سچائیوں پر غور کرنے سے باز رکھتی ہے۔

نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تمکو فرعون کی قوم سے اس حالت میں نجات دی کہ وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہی

الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ

تھی تمہارے لڑکوں کو (ایک ایک کرکے) ذبح کرتی تھی اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتی تھی

آیت زیر تفسیر کے الفاظ بھی اس بارہ میں ہماری ہدایت کے لئے کافی ہیں۔ اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ کوئی شفاعت نہ ہوگی بلکہ یہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کی طرف سے شفاعت قبول نہ کیجائیگی گویا مجرم کی طرف سے شفاعت کے پیش ہونے کو رد کیا گیا ہے۔ مجرد شفاعت کو رد نہیں کیا گیا۔

ولا یؤخذ منھا عدلٌ میں یہود کی ایک اور غلطی کا رد

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ۔ اس جملہ میں یہود و نصاریٰ کی تیسری غلطی کا جو ان کو گناہوں پر دلیر کرتی ہے رد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ گنہ گار اپنے گناہوں کا بدلہ دے کر گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ دونوں میں گناہوں کا بدلہ دینے کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ رومن کیتھولک مسیحیوں میں یہود سے بھی زیادہ یہ عقیدہ ہے۔ جب ان میں سے کسی سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ پادری کے پاس جاتا ہے اور وہ کچھ سزا اس کے لئے مقرر کر دیتا ہے جب وہ اس سزا کو بھگت لے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا گناہ معاف ہو گیا۔ یہود بھی قربانیوں وغیرہ کے ذریعہ سے گناہوں کا بدلہ دینے کے عادی تھے اور ہیں۔ اسلام گناہوں کا اس قسم کا بدلہ تسلیم نہیں کرتا وہ تو گناہ کی معافی گناہ سے نفرت اور آئندہ کے اجتناب سے متعلق قرار دیتا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ اس کے سوا گناہ کی معافی کی کوئی صورت نہیں کسی کو قتل کر کے کوئی شخص صدقہ دیدے تو اس سے اس کا یہ گناہ کس طرح معاف ہو جائے گا۔ یا گرجا میں بیٹھ کر کچھ روزے رکھ لے تو یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے بھی بعض غلطیوں کے لئے دوسرے اعمال کو بطور کفارہ قرار دیا ہے لیکن یہ وہ غلطیاں ہیں جو عبادت کی ظاہری شکل کے بارہ میں ہیں۔ بندوں کی حق تلفی یا خدا تعالیٰ کی حق تلفی کے بارہ میں ایسی کوئی تعلیم اسلام کی نہیں۔ مثلاً کسی شخص سے حج کا کوئی رُکن رہ گیا تو اس کے بدلہ میں کسی اور نیکی کا حکم دیدیا گیا ہے یا نادانستہ قتل ہو گیا ہے تو اُسے ایک اور عمل بتا دیا گیا ہے یہ اس لئے نہیں کہ اس دوسرے عمل نے گناہ کو دور کر دیا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ظاہری شکل کی غرض کسی اور طرح پوری ہو ہو جائے یا انسان ہوشیار ہو جائے اور آئندہ بے احتیاطی سے بھی کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔

ولا ھم ینصرون کی تشریح

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان تین طریق کے سوا کوئی اور غیر طبعی طریق بھی انسان کو بچا نہیں سکتا۔ اس کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی طریق ہے کہ انسان صداقت کو سمجھے اور اُسے قبول کرنے کے لئے پورا زور لگائے اور جہاں تک اس میں طاقت ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لائے۔ اور اس کی آواز پر لبیک کہتا رہے۔ پس یہود و نصاریٰ کو چاہیئے کہ خود ساختہ طریقوں پر انحصار نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نئی صداقت آئی ہے اُسے قبول کریں ورنہ کوئی اور حیلہ اُن کے کام نہ آئے گا۔

پہلی آیت اور آیت زیر تفسیر کا تعلق

پہلی آیت سے اس آیت کا یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ تم کو خدا تعالیٰ نے اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ اس میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس فضیلت کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تم خدا تعالیٰ کے شکر گزار اور فرمانبردار بندے بنتے۔ مگر تم اسکے برخلاف اس کی اطاعت کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے قسم قسم کے بہانے تلاش کرنے لگ گئے ہو اور خدا تعالیٰ کے فضل کو پیش کرکے

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۝ وَاِذْ فَرَقْنَا

اور تمہارے رب کی طرف سے اس (بات) میں (تمہارے لئے) ایک بڑی آزمائش تھی ۵۵؎ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے

اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور ناواقفوں کو دھوکا دینا چاہتے ہو

۵۵؎ حل لغات - اٰل :- اٰل کے معنے ہیں کنبہ قوم (اقرب) بعض کے نزدیک اٰل اَھْل سے مقلوب ہے (مفردات) اور اَھْلُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں عَشِيْرَتُهٗ وَذَوُوْ قُرْبَاهُ - آدمی کا کنبہ اور اس کے اقرباء وَاَھْلُ الرَّجُلِ: زَوْجَتُهٗ بعض اوقات اَھْلُ الرَّجُلِ بول کر یہ مراد ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی بیوی - اور جب کسی نبی کے لئے یہ لفظ بولیں اور کہیں اَھْلُ نَبِيٍّ تو اسکے معنے ہوں گے اُمَّتُهٗ نبی کی اُمت - اور اہل بیت کے معنے ہیں گھر میں رہنے والے - اور اَھْلُ الْاَمْرِ ان لوگوں کو کہیں گے جو کسی اہم امور پر متعین ہوں یعنی حکام (اقرب) لیکن اَھْل اور اٰل کے استعمال میں فرق کیا گیا ہے لفظ اٰل بڑے انسانوں کی طرف ہی مضاف ہوگا اور کسی نکرہ کی طرف یا کسی زمانے یا مکان کی طرف نہیں ہوگا (مثلاً یہ نہ کہیں گے کہ آلِ رَجُلٍ یا آلِ زمانہ یا آلِ بَیْت) لیکن اَھْل کا لفظ ہر ایک کی طرف مضاف ہو سکتا ہے - نیز آل کا لفظ کسی معزز اور شریف ذات کی طرف ہی منسوب ہوگا بمقابل اَھْل کے - کہ وہ معزز اور غیر معزز ہر دو کی طرف مضاف ہو جاتا ہے - یعنی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اٰلُ السُّلْطَانِ یعنی بادشاہ کی قوم اور رعیت - لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ آلُ الْخَيَّاطِ درزی کی آل - ہاں اَھْلُ الْخَيَّاطِ کہہ سکیں گے - مگر لفظ اَھْل ہر ایک کے ساتھ استعمال ہو سکے گا یعنی اَھْلُ السُّلْطَانِ بھی کہہ سکیں گے اور اَھْلُ الْخَيَّاطِ بھی (مفردات) پس آل فرعون کے معنے ہوئے فرعون کی قوم -

فِرْعَوْن :- لَقَبُ كُلِّ مَنْ مَلَكَ مِصْرَ یعنی لفظ فرعون مصر کے قدیمی بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا بعض کے نزدیک ہر سرکش اور متمرد و مغرور پر فرعون کا لفظ بولا جاتا ہے - اس کی جمع فَرَاعِنَةٌ ہے (اقرب) لفظ فرعون فَرْعَنَ سے بنا ہے اور فَرْعَنَ کے معنے ہیں كَانَ ذَا دَھَاءٍ وَنُكْرٍ کہ اس کے اندر ذہانت اور عقلمندی حد درجہ کی پائی جاتی ہے اور تَفَرْعَنَ فُلَانٌ کے معنے ہیں طَغٰی وَتَجَبَّرَ سرکش ہوا اور شان و شوکت کا اظہار کیا - اور تَفَرْعَنَ النَّبَاتُ کے معنے ہیں طَالَ وَقَوِيَ کہ کوئی پودا لمبا اور مضبوط ہو گیا (اقرب) فرعون مگرمچھ کو بھی کہتے ہیں (اقرب) گویا مصر کے قدیمی بادشاہوں کا لقب ان کی حد درجہ ذہانت اور بڑھی ہوئی طاقت کی وجہ سے فرعون ہو گیا -

یَسُوْمُوْنَكُمْ :- سَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے - اور سَامَ فُلَانًا الْاَمْرَ کے معنے ہیں كَلَّفَهٗ اِيَّاهُ کسی کو مشکل اور باِمشقت کام کرنے کا حکم دیا - وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي الشَّرِّ وَالْعَذَابِ اور اس فعل کا اکثر استعمال دکھ اور شر پہنچانے کے معنوں میں آتا ہے جب سَامَ الْبَائِعُ السِّلْعَةَ کہا جائے تو اس کے معنے ہوں گے عَرَضَهَا وَذَكَرَ ثَمَنَهَا - سامان کو خریدنے والے پر پیش کیا اور قیمت کا ذکر کیا - جب سَامَهٗ خَسْفًا کہیں تو معنے ہوں گے اَوْلَاهُ اِيَّاهُ وَاَرَادَهٗ عَلَيْهِ کہ اُسے ذلت پہنچائی یا اس پر ذلت پڑنے کی خواہش کی (اقرب) مفردات راغب میں ہے کہ اَلسَّوْمُ کے اصل معنے ہیں اَلذَّهَابُ فِي ابْتِغَاءِ الشَّيْءِ کہ کسی چیز کی تلاش میں جانا فَهُوَ لَفْظٌ لِمَعْنًى مُرَكَّبٍ مِنَ الذَّهَابِ وَالْاِبْتِغَاءِ گویا لفظ سَوْم درحقیقت مرکب معنے رکھتا ہے یعنی کسی جگہ جانا اور کسی چیز کو تلاش کرنا - لیکن بعض اوقات صرف جانے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں سَامَتِ الْاِبِلُ کہ اونٹ چرنے کے لئے گئے - اور کبھی صرف اِبْتِغَاء یعنی چاہنے کے معنے میں - جیسے یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کہ وہ

آل

یسومونکم

فرعون

تمہیں بدترین عذاب دینا چاہتے تھے۔ (مفردات) تاج العروس میں ہے کہ سَامَہٗ کے معنے ہیں اَلْزَمَہٗ وَجَشَّمَہٗ اس کے ذمہ کوئی کام لگایا اور اسے اس کام کے کرنے کی تکلیف دی (تاج)

العذاب — اَلْعَذَابُ:- کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۵ پس یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کے معنے ہوں گے (۱) وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہے تھے۔ (۲) وہ تمہیں بدترین عذاب دینا چاہتے تھے۔

یذبّحون — یُذَبِّحُوْنَ:- ذَبَّحَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ذَبَّحَ ذَبَحَ سے باب تفعیل ہے ذَبَحَ کے معنے ہیں شَقَّ پھاڑ دیا۔ نیز اس کے معنے ہیں فَتَقَ توڑ دیا۔ خَنَقَ گلا گھونٹ کر مار دیا نَحَرَ ذبح کیا (اقرب) لسان میں ہے اَلذَّبْحُ قَطْعُ الْحُلْقُوْمِ ذبح کے معنے ہیں گلا کاٹنا (لسان) تاج العروس میں ہے اَلذَّبْحُ اَلْھَلَاکُ کہ ذبح کے ایک معنی ہلاک کر دینے یا مار دینے کے ہیں (تاج) اس جگہ ذَبَحَ کے معنے مارنے یا گلا گھونٹ کر مارنے کے ہیں۔ پس یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ کے معنے ہوں گے (۱) وہ تمہارے لڑکوں کو مار دیتے تھے (۲) وہ تمہارے لڑکوں کو گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے۔

یستحیون — یَسْتَحْیُوْنَ:- اِسْتَحْیَا سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَحْیَاہُ کے معنے ہیں اَبْقَاہُ حَیًّا اُسے زندہ رہنے دیا۔ نیز لکھا ہے قَالَ اللِّحْیَانِیُّ اِسْتَحْیَاہُ اِسْتَبْقَاہُ وَلَمْ یَقْتُلْہُ کہ لحیانی کہتے ہیں اِسْتَحْیَاہُ کے معنے ہیں کہ اُسے زندہ رہنے دیا اور اُسے قتل نہ کیا (لسان) پس یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور قتل نہ کرتے تھے۔

بلاء — بَلَآءٌ:- بَلَوْتُ الرَّجُلَ (بَلَآءً وَّبَلْوًا) وَابْتَلَیْتُہٗ کے معنے ہیں اِخْتَبَرْتُہٗ میں نے اس کا امتحان لیا اور اِبْتَلَاہُ اللّٰہُ کے معنے ہیں اِمْتَحَنَہُ اللّٰہُ اللہ نے اس کا امتحان لیا۔ اور اس سے اِسم اَلْبَلْوٰی۔ اَلْبَلْوَۃُ۔ اَلْبَلِیَّۃُ اور اَلْبَلَآءُ آتا ہے یعنی امتحان۔ نیز لکھا ہے اَلْبَلَآءُ یَکُوْنُ فِی الْخَیْرِ وَالشَّرِّ کہ بلاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ بلائے خیر بھی اور بلائے شر بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اِبْتَلَیْتُہٗ بَلَآءً حَسَنًا وَّبَلَآءً سَیِّئًا کہ میں نے اس کا اچھا امتحان لیا اور بُرا امتحان لیا۔ پھر لکھا ہے وَاللّٰہُ تَعَالٰی یُبْلِی الْعَبْدَ بَلَآءً حَسَنًا وَّیُبْلِیْہِ بَلَآءً سَیِّئًا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا امتحان ہر دو طرح سے لیتا ہے بلاء انعام سے بھی اور بلاء تکلیف سے بھی۔ نیز اَلْبَلَآءُ کے معنے انعام کے بھی لکھے ہیں (لسان) اَلْبَلَآءُ کے اصل معنے امتحان کے ہوتے ہیں۔ لیکن امتحان چونکہ کبھی انعام کے ذریعہ سے اور کبھی سزا کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے اس لئے بلاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں انعام کا امتحان بھی اور تکلیف کا امتحان بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَبَلَوْنٰھُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ (اعراف ع۲۱)

عظیم — عَظِیْمٌ:- عَظِیْمٌ عَظُمَ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور عَظُمَ الشَّیْءُ عِظَمًا وَّعَظَامَۃً کے معنے ہیں کَبُرَ کوئی چیز بڑی ہو گئی۔ جب کہیں کہ عَظُمَ الْاَمْرُ عَلٰی فُلَانٍ تو اس کے معنے ہوتے ہیں شَقَّ وَصَعُبَ یعنی فلاں کام اس پر برداشت کرنا مشکل اور گراں ہو گیا (اقرب) پس عَظِیْمٌ کے معنے ہوں گے (۱) بڑا (۲) گراں۔ مشکل۔

تفسیر:- اس آیت سے ان احسانات کی تفصیلات گنوانی شروع کی ہے جو ایک لمبے عرصہ سے بنی اسرائیل پر ہوتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ پہلا احسان یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے فراعنہ کے ماتحت غلاموں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے تب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے موسیٰ کو بھیجکر اس عذاب سے اُن کو نجات دلوائی۔ بائبل میں بنی اسرائیل کی اس غلامانہ زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ "مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں۔ تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک

بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ

تمہارے لئے سمندر کو پھاڑا پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور تمہاری نظروں کے سامنے فرعون کی قوم کو

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ

غرق کر دیا ۵۱ اور (اسوقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس

نکل جاویں۔ اس لئے انہوں نے اُن پر خراج کے لئے محصّل بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستاویں... اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی۔ اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کرواکے اُن کی زندگی تلخ کی۔ انکی ساری خدمتیں جو وہ کراتے تھے مشقت کی تھیں۔" (خروج باب۱ آیت ۸ تا ۱۴)۔

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ۔ رعمسیس ثانی جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے بنی اسرائیل کا سخت دشمن تھا اور بنی اسرائیل کی ترقی دیکھ کر اس نے ان کے لڑکے قتل کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ مگر دائیوں کی نرم دلی کی وجہ سے اس ارادہ میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔ اور آخر اس نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے لڑکے دریا میں پھینک دیئے جایا کریں۔ اور لڑکیاں بچالی جائیں۔" (خروج باب۱ آیت ۲۲) طالمود میں بھی اسی مضمون کی روایات ہیں۔

اسی طرح اعمال باب۷ آیت ۱۹ میں لکھا ہے:۔

"یہانتک کہ اس نے (فرعون نے) ان کے لڑکوں کو پھینکوادیا تاکہ جیتے نہ رہیں۔"

بعض لوگوں نے اس آیت میں ذبح کے لفظ سے دھوکا کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بنی اسرائیل کے بچوں کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا۔ حالانکہ تاریخ کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ ان لوگوں کے دھوکا کھانے کی یہ وجہ ہے کہ ذبح کا لفظ گلا کاٹ دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے معنے ہلاک کر دینے کے بھی ہیں جن کے نظرانداز کر دینے کی وجہ سے ان معترضوں کو دھوکا لگا ہے۔ چنانچہ تاج العروس جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ پر لکھا ہے۔ وَالذَّبْحُ: اَلْهَلَاكُ۔ یعنی ذبح کے ایک معنی ہلاکت کے بھی ہیں۔ پس يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کے یہ معنے نہیں کہ وہ تمہارے لڑکوں کا گلا کاٹ دیتے تھے بلکہ یہ معنے ہیں کہ وہ تمہارے لڑکوں کو ہلاک کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ اعراف آیت ۱۴۲ میں يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کی بجائے يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کے الفاظ رکھ کر قرآن کریم نے يُذَبِّحُوْنَ کے معنے خود ہی کر دئے ہیں کہ اس سے مراد گلا کاٹنا ہی نہیں بلکہ مار دینا ہے خواہ کسی طرح سے ہو۔

بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کے متعدد احسانات اور انکی تفصیل۔

پہلا احسان بنی اسرائیل کو غلامانہ زندگی سے نجات دلوانا۔

یذبحون ابناءکم کے معنے لڑکوں کو ہلاک کرنے کے۔

بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔ ایسے عذاب سے نجات دینے میں تمہارے لئے بڑا انعام تھا۔ یہ نجات بہت سے انعامات کا موجب ہوئی۔

حل لغات

فَرَقْنَا: فَرَقَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے معنے ہیں فَلَقْنَاهُ ہم نے سمندر کو پھاڑا۔ (اقرب)

فرقنا۔

تَنْظُرُوْنَ: نَظَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور نَظَرَهٗ وَاِلَيْهِ کے معنے ہیں اَبْصَرَهٗ وَتَاَمَّلَهٗ بِعَيْنِهٖ کسی پر اچانک نظر پڑنے کے بعد غور سے اسے دیکھنے کے لئے ٹکٹکی لگائی۔ نیز نَظَرَهٗ کے معنے ہیں۔ مَدَّ طَرْفَهٗ اِلَيْهِ رَاٰهُ اَوْ لَمْ يَرَهٗ کسی کیطرف آنکھ اٹھائی۔ خواہ پھر اسے دیکھ سکا یا نہ دیکھ سکا۔ (دونوں حالتوں میں

تنظرون۔

نَظَرَ کا لفظ اس پر بول سکتے ہیں) نیز کہتے ہیں نَظَرَ فِی الْاَمْرِ نَظَرًا۔ اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ تَدَبَّرَہٗ وَ تَفَکَّرَ فِیْہِ یُقَدِّرُہٗ وَ یُقِیْسُہٗ نظر کے یہ بھی معنے ہیں کہ کسی امر پر غور کیا اور کسی معاملہ کو کسی اور معاملہ پر قیاس کر کے غور و فکر سے اپنی رائے قائم کی جب نَظَرَ بَیْنَ النَّاسِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَکَمَ وَ فَصَلَ دَعَاوِیْہِمْ لوگوں کے جھگڑوں کا سوچ بچار کر فیصلہ کیا، اور یہ بتایا کہ انہیں سے اپنے دعوے میں صادق کون تھا۔ اور جب نَظَرَ لِلْقَوْمِ بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے رَقَّ لَھُمْ وَ اَعَانَھُمْ کہ لوگوں کو مصائب و مشکلات میں پھنسا دیکھ کر دل میں رحم پیدا ہوا اور انکی مدد کی۔ نَظَرَ الشَّیْءَ کے ایک معنے اِنْتَظَرَہٗ کے بھی ہیں یعنی انتظار کیا۔ نیز اہل عرب کہتے ہیں دَارِیْ تَنْظُرُ اِلٰی دَارِ فُلَانٍ اَیْ تُقَابِلُھَا یعنی میرا گھر فلاں کے گھر کے بالمقابل ہے۔ (اقرب)

فرقنا بکم البحر کے معنے کرتے ہیں مفسرین کا غلطی کھانا اور اس کے صحیح معنے۔

پس تَنْظُرُوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تم آلِ فرعون کا غرق ہونا دیکھ رہے تھے۔ (۲) تم آل فرعون کے غرق ہونے کو دیکھ کر ان کے دعاوی کے جھوٹا ہونے اور اپنے دعاوی کے سچا ہونے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ (۳) تم آل فرعون کے غرق ہونے پر رحم کھا رہے تھے کہ کاش وہ بدیاں نہ کرتے۔ اور ہلاکت تک نوبت پہنچتی۔ (۴) تم انکی ہلاکت کے منتظر تھے۔ (۵) ہم نے آل فرعون کو اسوقت غرق کر کے ہلاک کر دیا جب کہ تم بالکل ان کے بالمقابل تھے۔

فرقنا بکم البحر میں بنی اسرائیل کے سمندر سے ہو کر بچ نکلنے کے معجزہ کیطرف اشارہ

تفسیر۔ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے لفظی معنے ہیں۔ جبکہ ہم نے تمہارے ذریعہ سے سمندر کو پھاڑا اور ان معنوں سے دھوکا کھا کر اکثر مفسرین نے آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ بنی اسرئیل دریا پھاڑنے کا ذریعہ تھے۔ انکو دریا میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ تو جوں جوں وہ آگے بڑھتے تھے دریا کا پانی سمٹتا جاتا تھا۔ لیکن یہ معنے خود قرآن کریم کے الفاظ سے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (الشعراء ع) یعنی ہم نے موسیٰؑ سے وحی کی کہ تو سمندر پر سونٹا مار۔ جب اس نے سونٹا مارا تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہر ٹکڑا ایک اونچے ٹیلے کیطرح نظر آتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے پھٹنے کا ذریعہ ظاہر میں سونٹا تھا نہ کہ بنی اسرائیل۔ پس یہ معنے کہ بنی اسرائیل کے ذریعہ سے سمندر کو پھاڑا باطل ہوئے۔ اب یہ سوال ہے کہ اس کے معنے کیا ہیں؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ باء عربی زبان میں تعلیل اور سببیت کے لئے بھی آتی ہے۔ اور آیت کے معنے یہ ہیں۔ کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو پھاڑا۔ یعنی تمہیں نجات دینے کے لئے ہم نے ایسا کیا۔ دوسرے الفاظ میں فَرَقْنَا لَكُمُ الْبَحْرَ کے معنوں میں فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ آیا ہے۔ (دیکھو بحر محیط کشاف شرح مائۃ عامل)۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ۔ اس آیت میں اس معجزہ کیطرف اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت موسےؑ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُسوقت دکھایا جبکہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کیطرف لیجا رہے تھے۔ اور ان کو واپس لیجانے کے لئے فرعون اپنے لشکروں سمیت ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ خروج باب ۱۴، آیت ۲۱ تا ۳۱ میں لکھا ہے:۔

"پھر موسےٰ نے دریا پر ہاتھ بڑھایا۔ اور خداوند نے بہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سُکھا دیا اور پانی کو دو حصے کیا۔ اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کے گذر گئے۔ اور پانی کی ان کے دہنے اور بائیں

دیوار تھی۔ اور مصریوں نے پیچھا کیا۔ اور ان کا پیچھا کئے ہوئے ڈے اور فرعون کے سب گھوڑے اور اسکی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے۔ اور یوں ہوا کہ خداوند نے پچھلے پہر آگ اور بدلی کے ستون میں سے مصریوں کے لشکر پر نظر کی۔ اور مصریوں کی فوج کو گھبرا دیا۔ اور ان کی گاڑیوں کے پہیوں کو نکال ڈالا۔ ایسا کہ مشکل سے چلتی تھیں۔ چنانچہ مصریوں نے کہا۔ کہ آؤ اسرائیلیوں کے منہ پر سے بھاگ جاویں کیونکہ خداوند ان کے لئے مصریوں سے جنگ کرتا ہے۔ اور خداوند نے موسے سے کہا کہ اپنا ہاتھ دریا پر بڑھا تا کہ پانی مصریوں پر اور انکی گاڑیوں اور ان کے سواروں پر پھر آوے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھایا۔ اور دریا صبح ہوتے اپنی قوت اصلی پر لوٹا۔ اور مصری اس کے آگے بھاگے۔ اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا۔ اور پانی پھرا۔ اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا کے بیچ آئے تھے چھپا لیا۔ اور ایک بھی انمیں سے باقی نہ چھوٹا۔ پر بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے۔ اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔ اور اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارے پر دیکھیں۔ اور اسرائیلیوں نے بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی۔ اور لوگ خداوند سے ڈرے۔ تب خداوند پر اور اس کے بندے موسے پر ایمان لائے۔"

قرآن کریم میں یہ واقعہ علاوہ اس آیت کے سورہ شعراء ع۴ اور سورہ طٰہٰ ع۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں آتا ہے۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ (الشعراء ع۴) یعنی ہم نے موسیٰ سے وحی کی کہ تو سمندر پر سونٹا مار۔ جب اسنے سونٹا مارا تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہر ٹکڑا ایک اونچے ٹیلے کی طرح نظر آتا تھا۔" پھر سورہ طٰہٰ میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝ (طٰہٰ ع۴) یعنی ہم نے موسیٰ سے وحی کی کہ ہمارے بندوں یعنی بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال لیجاؤ۔ اور سمندر میں سونٹا مار کر ان کے لئے خشک رستہ بنا دو۔ تم اس طرح اس کو پار کر لوگے اور تعاقب سے اور ڈوبنے سے نہ ڈروگے۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ لیکن سمندر کا ریلا کچھ ایسا آیا کہ وہ غرق ہو گئے اور فرعون نے یوں اپنی قوم کو تباہی میں ڈالا اور بچ نہ سکا۔

بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنیکا ذکر بائبل میں

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں اس واقعہ کا ذکر

ان آیات کو ملا کر قرآن کریم کے بیان کے مطابق واقعہ کی کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ بنی اسرائیل ارض مقدس کے ارادہ سے چلے جا رہے تھے کہ پیچھے سے فرعون کا لشکر آپہنچا۔ اسے دیکھ کر بنی اسرائیل گھبرائے اور سمجھے کہ اب ہم پکڑے جائیں گے لیکن خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی معرفت انکو تسلی دلائی۔ اور حضرت موسیٰ سے کہا کہ اپنا عصا سمندر پر ماریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر میں ایک راستہ ہو گیا۔ اور وہ اسمیں سے آگے روانہ ہوئے۔ ان کے دونوں طرف پانی تھا جو ریت کے ٹیلوں کی مانند یعنی اونچا نظر آتا تھا۔ لشکر فرعون نے ان کا پیچھا کیا۔ مگر بنی اسرائیل کے صحیح سلامت پار ہونے پر پانی پھر لوٹا۔ اور مصری غرق ہو گئے۔

قرآن کریم کی آیات کے مطابق واقعہ کی کیفیت

اس واقعہ کے سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تمام معجزات اللہ تعالے کی طرف سے ہوتے ہیں اور کسی انسان کا انمیں دخل

تصرف نہیں ہوتا۔ پس حضرت موسیٰؑ کا عصا اٹھانا اور سمندر پر مارنا صرف ایک نشانی کے لئے تھا۔ نہ اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا کا سمندر کے ہٹ جانے میں کوئی دخل تھا۔ اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن کریم کے الفاظ سے ہرگز ثابت نہیں کہ سمندر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور انہیں سے حضرت موسیٰؑ نکل گئے تھے۔ بلکہ قرآن کریم میں اِس واقعہ کے متعلق دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک فَرَقَ اور ایک اِنْفَلَقَ کا۔ جن کے معنے جدا ہو جانے کے ہیں۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق اِس واقعہ کی یہی تفصیل ثابت ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کے وقت سمندر جدا ہو گیا تھا۔ یعنی کنارے سے ہٹ گیا تھا اور جو خشکی نکل آئی تھی اس میں سے بنی اسرائیل گزر گئے تھے۔

آیت واذ فرقنا بکم البحر۔ الخ کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات۔

اور سمندر کے کناروں پر ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ نپولین کی لائف میں لکھا ہے کہ جب وہ مصر پر حملہ آور ہوا۔ تو وہ بھی اپنی فوج کے ایک حصہ سمیت بحیرۂ احمر کے کنارہ کے پاس جزر کے وقت گذرا تھا۔ اور اس کے گذرتے گذرتے مد کا وقت آگیا۔ اور وہ مشکل سے بچا۔ اس واقعہ میں معجزہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر کے سامنے پہونچایا جبکہ جزر کا وقت تھا۔ اور حضرت موسےٰؑ کے ہاتھ اٹھاتے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت پانی گھٹنا شروع ہو گیا۔ لیکن فرعون کا لشکر جب سمندر میں داخل ہوا تو ایسی غیر معمولی روکیں اس کے راستہ میں پیدا ہو گئیں کہ اسکی فوج بہت سست رفتار سے بنی اسرائیل کے پیچھے چلی۔ اور ابھی سمندر ہی میں تھی کہ مد آگئی اور دشمن غرق ہو گیا۔ چنانچہ اس خیال کی تائید قرآن کریم کے الفاظ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (سورہ شعراء آیت ۶۴) بھی کرتے ہیں۔ جن کے یہ معنی ہیں کہ جب سمندر ہٹا۔ تو ہر ایک ٹکڑا ایک اونچے ریتلے ٹیلہ کی طرح ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کریم کا یہ منشاء ہوتا کہ سمندر دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا تو کُلّ کا لفظ جو نکرہ مفرد پر آیا ہے کبھی استعمال نہ ہوتا۔ پس کُلّ کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس موقعہ پر سمندر پھٹا

بنی اسرائیل کیساتھ پیش آمدہ واقعہ کی مثال نپولین کی لائف میں۔

۱۰۲ سمندر دو ٹکڑوں میں پھٹا نہ تھا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا

نہ تھا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ اور جیسا کہ اُن سمندروں میں ہوتا ہے جن کے کناروں پر چھوٹے گڑھے پانیوں کے ہوتے ہیں۔ سمندر کے ہٹنے پر وہ پانی کے ہواتھے پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ ایسا ہی اُسوقت ہوا۔ بنی اسرائیل کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف وہ چھوٹی چھوٹی جھیلیں جو سمندر کے کنارے پر واقع تھیں۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے درمیان میں گزرنے والوں کو [illegible] اونچی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ بحیرہ احمر کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کنارہ پر بہت سی جھیلیں ہیں جو پرانے زمانہ میں اور بھی زیادہ تھیں۔ جیسا کہ پرانے نقشہ جات سے ثابت ہے۔

جو معنے اِس آیت کے میرے نزدیک ہیں انہیں لکھنے کے بعد میں سابق مفسرین کے خیالات بھی لکھدینے مناسب سمجھتا ہوں۔ سابق مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت موسےٰؑ نے نیل کا دریا پار کیا تھا۔ اور اس معجزہ کے بارہ میں انکا مزید خیال یہ ہے کہ دریا بارہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ یہ استدلال وہ سورہ شعراء کی آیت فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ سے کرتے ہیں۔ ان بارہ ٹکڑوں سے اُن کے نزدیک یہ فائدہ تھا۔ کہ بارہ قبائل الگ الگ گذر جائیں۔ اِس بارہ میں انہوں نے اسقدر زور دیا ہے کہ [illegible] کہتے ہیں کہ جب وہ دریا میں سے گذرنے لگے تو چونکہ ہر دو فریق کے درمیان پانی کی دیوار حائل تھی۔ بنی اسرائیل نے دریا میں سے گذرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جبتک دوسرے گروہ ہم کو نظر نہ آئیں گے ہم دریا میں سے نہ گذریں گے۔ آخر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور خدا تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ پانی کی دیوار میں سونٹا داخل کرو۔ انہوں نے اسی طرح کیا۔ اور دیوار میں سوراخ ہو گیا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کی آوازیں سننے لگے اور صورتیں دیکھنے لگے۔ (کشاف) گویا پانی اس طرح بستہ ہو گیا تھا کہ اسمیں قائم رہنے والا سوراخ ہو سکتا تھا۔ اور پھر موسیٰ کا سونٹا اسقدر

لمبا ہوگیا کہ وہ بارہ سڑکیں جس پر یہود کے بارہ قبیلے گذر رہے تھے۔ اُن سب کو ایک ہی وار میں، وہ سونٹا چیر گیا۔ اور سب میں ایک ہی وقت میں سوراخ کر گیا۔ اس سوال پر کسی مفسر نے روشنی نہیں ڈالی، کہ جن بنی اسرائیل میں اسقدر محبت تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہ پاتے تھے اور ایک دوسرے کے متعلق تسلی پائے بغیر موسٰی جیسے نبی کے ساتھ بھی دریا پار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اُن کے لئے بارہ راستے الگ الگ کیوں بنائے گئے تھے؟ وہ ایک ہی راستہ پر سے سب کے سب کیوں نہ گذر سکتے تھے؟ اصل بات یہ ہے کہ مفسر ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہوئے ہیں کہ وہ اس پانی کو جس میں سے موسٰی علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر گذرے تھے نیل کا پانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعات سے درست ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ اور آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے وقت میں جیسا کہ آجکل بھی ہے۔ صدر مقام کی آبادی نیل کے مشرق کی طرف تھی۔ نہ کہ مغرب کی طرف۔ ایک مختصر نقشہ اسوقت کی آبادی کا نیچے دیا جاتا ہے:-

جس پانی سے حضرت موسٰی اپنی قوم کو لیکر گذرے وہ نیل کا پانی نہیں تھا۔

اس نقشہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ کنعان جس کی طرف حضرت موسٰی علیہ السلام اور انکی قوم گئی تھی نیل کے شمال مشرق کیطرف ہے۔ اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ فراعنہ کے وقت میں اُن کا صدر مقام گوشن کے علاقہ میں تھا جسے وادی ٹمیلات بھی کہتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۲ صفحہ ۲۰۱۲ زیر لفظ جیسیس)۔ اور یہ وادی دریائے نیل کے مشرق میں ہے اور اس جگہ سے جو شخص کنعان کو جائے اسے دریائے نیل سے گذرنا ہی نہیں پڑتا نیل اس کے مغرب میں رہ جاتا ہے۔ پس اس آیت میں دریائے نیل کے گذرنے کا ذکر نہیں بلکہ کسی دوسرے پانی سے گذرنے کا سوال ہے۔

اور چونکہ اس مقام سے لیکر قادس تک جہاں حضرت موسٰی علیہ السلام گئے تھے کوئی دریا واقع نہیں (جیسا کہ نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے) اس لئے وہ جگہ جہاں سے حضرت موسٰی علیہ السلام اور انکی قوم گذری تھی بہرحال سمندر یا اسکا کوئی بڑھا ہوا حصہ تھا۔

جہاں سے حضرت موسٰی بمعہ ساتھیوں کے گذرے تھے وہ سمندر یا اسکا کوئی بڑھا ہوا حصہ تھا۔

پس یہ معنی کہ ایک بہتا ہوا دریا عصائے موسیٰ کی ضرب سے رک گیا تھا اور اس کے ایک طرف کا پانی ایک طرف منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور دوسری طرف کا پانی دوسری طرف منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اس میں سونٹا مار کر سوراخ کر دیا گیا تھا۔ یہ سب لغو قصے ہیں۔ قرآن کریم انکی تصدیق نہیں کرتا۔ قرآن کریم بَحر اور یَمّ کا لفظ بولتا ہے جو گو دریا کے لئے بھی بول لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال سمندر یا نمکین پانی کی جھیل کے لئے زیادہ تر ہوتا ہے۔ اور بنی اسرائیل کے رہنے کے مقام اور کنعان کے درمیان سمندر یا اس کے ٹکڑے ہی آتے ہیں۔ بیچ میں دریا کوئی نہیں آتا۔ پس جس جگہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام گذرے تھے وہ سمندر یا اس کا کوئی بڑھا ہوا ٹکڑا تھا۔

ؔ اس سوال کا جواب کہ فرعون نے بنی اسرائیل کا تعاقب خشکی کے راستے سے ہو کر کیوں نہ کیا؟

میں اوپر بتا آیا ہوں کہ سمندر میں مد و جزر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک وقت میں پانی کنارے پر سے بہت دور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور دوسرے وقتوں میں وہ خشکی پر اور آگے آجاتا ہے۔ سمندر پھاڑنے کے واقعہ کا اسی مد و جزر کی کیفیت سے تعلق ہے۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام ایسے وقت میں سمندر سے گذرے جبکہ جزر کا وقت تھا اور سمندر پیچھے ہٹا ہوا تھا۔ اس کے بعد فرعون پہنچا۔ وہ بوجہ اس کے کہ کم سے کم ایک دن بعد حضرت موسیٰؑ کے چلا تھا وہ مارا مار کرتا ہوا جس وقت سمندر پر پہنچا ہے اُسوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اس خشک ٹکڑے کا جس سے وہ گذر رہے تھے۔ اکثر حصہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے انکو پار ہوتے دیکھ کر جلدی سے اس میں اپنی رتھیں ڈالدیں مگر سمندر کی ریت جو گیلی تھی اس کی رتھوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اور انکی رتھیں اسمیں پھنسنے لگیں۔ اور اسقدر دیر ہوگئی کہ مد کا وقت آگیا اور پانی بڑھنے لگا۔ اب اس کے لئے دونو باتیں مشکل تھیں۔ نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر نے اسے درمیان میں آلیا۔ اور [illegible] اور اس کے بہت سے ساتھی سمندر میں غرق ہوگئے۔ اور چونکہ مد کا وقت تھا سمندر کا پانی جو کنارے کیطرف بڑھ رہا تھا اس نے ان کی لاشوں کو خشکی کی طرف لا پھینکا۔

ؔ حضرت موسیٰ ایسے وقت میں سمندر سے گذرے جبکہ جزر کا وقت تھا۔

ؔ فرعون کی غرقابی کے وقت سمندر کی مد کیحالت تھی۔

اِس امر کا جواب کہ اگر صرف مد و جزر سے فائدہ اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گذرے تھے تو اس میں معجزہ کیا ہوا اوپر گذر چکا ہے۔

اِسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں فرعون اوپر کیطرف سے ہو کر خشکی کے راستہ نہ گیا اور کیوں اس نے سمندر کی خشک جگہ میں سے ہو کر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ سمندر کے اس مقام کے پاس جو غالباً سویز شہر کے پاس تھا (یہاں سمندر کی چوڑائی صرف ۱/۲ میل ہے۔ دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا صفحہ ۱۴۳۷)۔ بہت سی جھیلیں ہیں اور دلدلیں بھی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جیساکہ بائبل سے ثابت ہے۔ پہلے اوپر کی طرف گئے تھے مگر آگے جھیلوں کو راستہ میں دیکھ کر اور راستہ بند پاکر واپس سمندر کی طرف لوٹے۔ بائبل میں لکھا ہے "خدا نے انہیں یہ رہبری نہ کی کہ وہ فلسطیوں کی راہ سے جاویں۔ اگرچہ وہ نزدیک کی راہ تھی۔ کیونکہ خدا نے کہا۔ ایسا نہو کہ وہ لڑائی دیکھ کے پچھتاویں اور مصر کو پھر جاویں۔ بلکہ خدا نے ان لوگوں کو دریائے قلزم کے بیابان کی طرف پھیرا۔" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ و ۱۸) اگر فرعون اوپر جاتا تو اسے اور بھی چکر کاٹ کر جھیلوں کے اوپر سے ہو کر جانا پڑتا۔ اور یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسوقت تک بہت دور نکل چکے ہوتے۔ اور اسکی مملکت سے باہر چلے گئے ہوتے۔ اس لئے اس نے انکے پکڑنے کی ایک ہی صورت ممکن دیکھی کہ وہ سمندر کے خشک شدہ حصہ میں سے ان کا تعاقب کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسکی رتھوں کے بیلوں کو ڈرایا اور رتھوں کے راستہ میں مشکلات پیدا کر دیں جس کی وجہ سے اس کے سفر میں دیر ہوتی گئی۔ اور مد کا وقت آگیا۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کے

لئے دیکھو خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ سے آخر تک اور پھر باب ۱۴ [اس بیان میں بہت سی غلطیاں اور مبالغہ ہے مگر اجمالی طور پر اس سفر کا نقشہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے]۔

جدید مؤرخین میں یہ بحث ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کا واقعہ صحیح ہے تو اس کا مقام کون سا ہے؟ بائبل میں چونکہ ایک دریا کا بھی ذکر آتا ہے بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام جھیل تمساح کے پاس سے گذرے ہیں جس کا پانی ان کے نزدیک گذشتہ زمانہ میں ایک نالہ کے ذریعہ سے سمندر سے ملتا تھا۔ (ڈوبائے آمی سیٹیکل اور کنوبل کی بھی یہی رائے ہے (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا اکسوڈس (خروج) کالم ۱۴۲۸ و ۱۴۲۹۔ اس مقام کے لئے دیکھو اوپر کا نقشہ)۔

بعض کے نزدیک وہ بحیرہ قلزم کے پاس سے نہیں گذرے بلکہ زوآن کے پاس سے ہوتے ہوئے (دیکھو اوپر کا نقشہ) بحیرہ روم کے پاس سے گذرے ہیں۔ (بقول شلائیڈن اور برگش انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کالم ۱۴۳۸) بعض کے نزدیک وہ ان علاقوں میں سے کسی علاقہ میں سے بھی نہیں گذرے۔ بلکہ شمالی افریقی مصر میں رہتے ہی نہ تھے بلکہ وہ اُس مصر میں رہتے تھے جو شمالی عرب میں واقع تھا اور ان کے نزدیک مُصر سے غلطی کھا کر بنی اسرائیل نے بائبل میں مصر لکھ دیا۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کالم ۱۴۳۶۔ جلد ۲) اس تھیوری کے مطابق اگر سمندر کے عبور کرنے کا واقعہ صحیح تسلیم کیا جائے تو بنی اسرائیل مغرب سے مشرق کو نہیں بلکہ مشرق سے مغرب کی طرف گئے تھے۔ اور خلیج سویز نہیں بلکہ خلیج عقبہ کو، سویز کے پاس سے نہیں بلکہ عقبہ کے پاس سے انہوں نے عبور کیا تھا۔ اگر عربی مصر کا جائے وقوع اس مقام کو اختیار کیا جائے تو پھر سمندر عبور کرنے کا واقعہ ان لوگوں کے نزدیک سراسر فرضی قرار پائے گا۔

آثار قدیمہ کی تحقیق اور پرانی تاریخوں سے یہ امر پوری طرح ثابت ہو چکا ہے کہ مصر نامی علاقہ بہ تغیر اشکال شمالی افریقہ۔ شمالی شام اور شمالی عرب میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ ان تین علاقوں کے علاوہ اور مقامات بھی مصر یا مصران یا مصرام یا مصرائیم یا مُصری کہلاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے بائبل کی بیان کردہ تفصیلات میں سے بعض کو شمالی افریقہ کے ملک مصر پر چسپاں نہ دیکھتے ہوئے بائبل کے علوم کے جدید محققین میں سے بعض نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ افریقوی مصر نہیں بلکہ اگر یہ واقعات گذرے ہیں تو عربی مصر میں گذرے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے مدائن جانے کو وہ اس کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ مدائن شمالی عرب کے مصر کے ساتھ ملتا تھا۔

جدید مؤرخین میں بنی اسرائیل کے گذرنے کے مقام میں اختلاف

یہ امر کہ کئی علاقے مصر کہلاتے تھے مغربی مصنفوں کے لئے حیرت انگیز ہے لیکن عربی دانوں کے لئے نہیں۔ مصر کے معنے عربی زبان میں شہر کے ہیں۔ جن لوگوں کو کسی بڑے شہر کے پاس رہنے کا یا وہاں جانے کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ بڑے شہروں کے اردگرد کے علاقے بعض دفعہ بیسیوں میل تک اپنے علاقہ کے شہر کا نام لیکر نہیں بلاتے بلکہ صرف شہر کہتے ہیں۔ لاہور کے اردگرد کے دیہات میں جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص شہر گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ لاہور گیا ہے۔ انگریزی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں بھی سیٹی یعنی شہر کے لفظ سے انگلینڈ کے باشندے لنڈن مراد لیتے ہیں پس عرب لوگ اور عربی سے ملتی جلتی زبانیں بولنے والے اُس زمانہ میں کہ جب بڑے شہروں کا رواج کم تھا۔ اگر کسی بڑے بڑے قصبات پر مشتمل علاقہ کو مصر کہتے تھے۔ خواہ وہ شام میں خواہ عرب میں خواہ افریقہ میں۔ تو اسمیں تعجب کی کونسی بات ہے۔ مُصری یا مصرام یا مصران یا مصرائیم سے انکی مراد صرف یہ ہوتی کہ وہ شہروں والا علاقہ ہے۔ عرب جیسی صحرا نورد قوم کے لئے شہروں میں بسنا ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ اور جس علاقہ میں کثرت سے بڑے بڑے شہر اور قصبات ہوں وہ ان کے لئے ایسا حیرت انگیز امر تھا کہ اس علاقہ کا نام

آثار قدیمہ سے مصر نامی علاقہ کا شمالی افریقہ شمالی شام اور شمالی عرب میں پائے جانیکا ثبوت اور مغربی مصنفوں کے لئے تعیین مقام میں مشکل کا ازالہ۔

بنی اسرائیل کے مصر کیطرف نہ جانے کے دلائل کا رد۔

شہری ملک رکھدینا ان کے لئے ایک طبعی امر تھا۔ پس صرف مصر کے لفظ سے بنی اسرائیل کے جلاوطنی کے واقعات کو افریقی مصر کے علاقہ سے بدلا نہیں جاسکتا۔ راستہ کی جزئیات میں مشکلات کیوجہ سے اس اصولی سوال کو نظرانداز کردینا کہ بائیل اور قرآن کریم دونوں کے نزدیک اس مصر کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔ اور قرآن کریم کے اس بیان کی روشنی میں کہ اس مصر میں مُردوں کی لاشوں کو دیر تک قائم رکھنے کا رواج تھا۔ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی شخص کی شناخت کو اس لئے مشتبہ کردیا جائے کہ گو اس کا حُلیہ اسکا نام اور اس کے باپ کا نام تو نذکورہ علامات کے مطابق ہے لیکن اس کے رومال کا رنگ وہ نہیں جو بتایا گیا تھا۔ پرانے زمانہ کے حالات اسطرح محفوظ نہیں کہ ہم اُس زمانہ کے حالات کو سو فیصدی درست معلوم کرسکیں پس ہمیں ستر فیصدی اتفاق کو مشعلِ راہ سمجھتے ہوئے تیس فیصدی اختلاف کو نظرانداز کردینا چاہیئے۔ اور تیس فیصدی اختلاف پر ستر فیصدی اتفاق کو قربان کردینے کی حماقت سے بچنا چاہیئے۔

بنی اسرائیل کے متعلق بعض لوگوں کا خیال کہ وہ مصر کیطرف نہیں گئے اور انکے تین دلائل۔

بعض لوگ تاریخ کی منفی یا مثبت شہادت سے اس امر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسرائیل مصر کی طرف نہیں گئے۔ ان کے استدلال کی وجوہ یہ ہیں :-

(۱) مصری آثار قدیمہ میں بنی اسرائیل کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ (اسرائیل مصنفہ اڈولف لاڈز صفحہ ۱۶۹)۔

(۲) منفتاح جس کے زمانہ میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے۔ اس کے زمانہ کے ایک پرانے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کے پانچویں سال میں بنی اسرائیل کے کچھ قبائل کنعان میں بس رہے تھے۔ اور بائیل بتا رہی ہے۔ کہ بنی اسرائیل اس کے زمانہ میں وہاں سے نکلے اور کوئی ۴۰ سال میں جاکر کنعان میں داخل ہوئے۔ (۳) بیشک مصر میں بعض ایشیائی قبائل کے ورود کا پتہ ملتا ہے۔ لیکن ان واقعات کو اگر بنی اسرائیل پر چسپاں کیا جائے تو کبھی واقعات ملتے جلتے ہیں مگر تاریخیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور کبھی تاریخیں ٹھیک بیٹھتی ہیں تو واقعات مطابقت نہیں کھاتے پس معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بناوٹی کہانی ہے۔

چونکہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے مصر میں جانے اور وہاں سے آنے کا ذکر کرتا ہے۔ ہم اس اعتراض کیطرف توجہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ (۱) یہ ضروری نہیں کہ ہر امر کا آثار قدیمہ سے حال معلوم ہو جائے۔ کیا اگر آج تہذیب کی ترقی کے زمانہ میں کسی متمدن ملک کی تاریخ کو مٹا دیا جائے تو کیا اسکی پوری تاریخ اس کے آثار سے معلوم ہوسکیگی۔ کیا مثلاً انگلستان یا یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ یا جرمنی یا فرانس کی مکمل تاریخ تمام قوموں کے اعداد و شمار۔ مذاہب اور ان کے فرقوں کا حال اور ان کے علوم و فنون کا پورا پتہ کسی ایک یا دو شہروں کے نشانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر موجودہ زمانہ کے صحیح حالات مکمل طور پر موجودہ زمانہ کے آثار سے بھی معلوم نہیں ہوسکتے تو اس سے زیادہ غیر معقول خیال کیا ہوگا کہ گذشتہ زمانہ کے تفصیلی حالات چند ہزار سال پہلے کے دو یا چار قصبات کے کھودنے سے معلوم ہوسکیں گے۔ یہ تو ایسی خلاف عقل بات ہے کہ اس پر کسی علم کی بنیاد رکھنی علم سے تمسخر کرنا ہے۔ مثبت شہادت تو خیر کچھ قیمت بھی رکھتی ہے۔ گو اسمیں بھی بہت سی غلطیوں کا امکان ہے۔ مگر یہ کہنا کہ چونکہ فلاں قوم کا ذکر نہیں ملا اس لئے وہ وہاں نہ تھی ایسا خلاف عقل خیال ہے کہ اسے علمی کتب میں پیش کرنے سے مصنفین کو خود ہی رکنا چاہیئے تھا۔ آخر بنی اسرائیل کی مصر میں حیثیت کیا تھی۔ غلاموں کی طرح وہ رہتے تھے۔ کوئی ایسے بڑے کام ان کے سپرد نہ تھے کہ ان کا ذکر تاریخی آثار میں آتا۔ انکی اہمیت کا باعث غالباً صرف یہ تھا کہ وہ ایک منفرد مذہب رکھتے تھے۔

اور یا یہ کہ غالباً ان کے زمانہ کے مصری بادشاہ خالص مصری قوم سے نہ تھے اور وہ بنی اسرائیل سے ڈرتے تھے کہ یہ کسی دوسری قوم سے مل کر ہماری حکومت کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ان حالات میں آثار قدیمہ میں ان کے نام آنے کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ اور اگر نام آتا بھی تو آثار قدیمہ سے صرف تاریخی ٹکڑے معلوم ہو سکتے ہیں پوری تاریخ معلوم نہیں ہو سکتی کہ ان کی خاموشی کوئی دلیل سمجھی جائے۔

دوسری دلیل کہ کسی فرعونی اثر سے معلوم ہوتا ہے جو غالباً منفتاح فرعونِ مصر کا اثر ہے یا اس سے پہلے کے کسی بادشاہ کا کہ اس زمانہ میں بنی اسرائیل کنعان میں بستے تھے کوئی قابل توجہ جرح نہیں۔ کیونکہ اگر یہ اثر جس کی تاریخ معین نہیں حضرت یوسفؑ کے بعد کے زمانہ کا ہے اور خروج موسیٰؑ سے پہلے کا ہے۔ تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا کچھ حصہ خروج موسیٰؑ سے پہلے بھی کنعان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اور اگر یہ اثر یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے پہلے کا ہو یا ہجرت موسوی کے بعد کا۔ تو اس سے کوئی خلاف نتیجہ نکلتا ہی نہیں۔

تیسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ بیشک بعض ایشیائی اقوام کا مصر میں ورود تاریخوں سے ملتا ہے۔ مگر انہیں بنی اسرائیل سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایک خالص منفی دلیل ہے۔ اور منفی دلیل ناقص آثار کی بناء پر کوئی بھی دلیل نہیں۔ ایک کتاب جس کے آدھے ورق پھٹے ہوئے ہوں۔ انکی بناء پر کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ فلاں مضمون اس کتاب میں نہیں کیونکہ وہ ان ورقوں میں نہیں جو میرے پاس ہیں۔

ان تینوں قسم کی دلائل کو رد کرنے کے بعد میں بعض قیاسی دلائل اس امر کی تائید میں دیتا ہوں جو بنی اسرائیل کے مصر میں ورود کے ثبوت میں ہیں:-

بنی اسرائیل کے مصر میں ورود کے چار قیاسی دلائل

(۱) یہی لوگ جو بنی اسرائیل کے مصر سے آنے کے خلاف ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ کہ موسیٰ کا نام خود مصری زبان کا ہے۔ ان کے نزدیک مُوسیٰ مَوسے تھا۔ جس کے معنے 'بیٹا' کے ہیں۔ (موزز اینڈ مانو تھی ازم۔ مصنفہ سگمنڈ فرائیڈ صفحہ ۱۳) اگر ان کا یہ دعویٰ درست ہے تو پھر یہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ اسرائیلی افریقی مصر میں تھے۔ اور وہاں انکی رہائش اسقدر لمبی تھی۔ کہ انہوں نے مصری زبان کے نام بھی رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ لوگ اس امر کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے بعض دوسرے ساتھیوں کے نام حور وغیرہ بھی جو بائبل میں آتے ہیں مصری ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو بنی اسرائیل کے مصر میں رہنے اور وہاں سے نکلنے کا یہ مزید ثبوت ہے۔

(۲) بائبل مصر میں اپنے باپ دادوں کو بادشاہ اور حاکم قرار نہیں دیتی۔ کہ سمجھا جائے انہوں نے اپنی شان بڑھانے کے لئے یہ قصہ گھڑ لیا۔ بائبل تو ان کو وہاں غلاموں کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ اور اس قسم کے قصہ بنانے کا کوئی محرک نظر نہیں آتا۔ پس اسے بناوٹی قرار دینے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

(۳) بائبل میں جو تفصیلات ہیں وہ سب افریقوی مصر پر صادق آتی ہیں۔ فراعنہ کا ذکر ان کے بعض بادشاہوں کے نام جو تاریخ سے ثابت ہو گئے ہیں۔ افریقوی مصر کے بعض شہروں کا نام جو گو مٹ چکے تھے مگر اب پرانی جگہوں کی کھدائیوں سے انکی تصدیق ہو گئی ہے۔ فرعونیوں کے قوانین اور آداب کے متعلق جو بائبل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب تفصیلات آثار قدیمہ سے سچی ثابت ہو رہی ہیں۔ اسی طرح مثلاً یہ کہ انہوں نے غلہ کیلئے خاص گودام مقرر کر چھوڑے تھے۔ پرانے آثار سے ایسے کئی گوداموں کا پتہ چلا ہے۔ (ضمناً یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے مصریوں کے مذہب کے متعلق

بھی روشنی ڈالی ہے کہ وہ بادشاہ ہیں خدا کی صفات تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ امر بھی آثارِ قدیمہ سے ثابت ہو گیا ہے) اسی طرح مصر کے جغرافیہ کے متعلق بائبل کی معلومات بہت حد تک درست ہیں۔ پس یہ سب غالب طور پر درست تفصیلات جو بعض ایسے امور کے متعلق ہیں جو استدادِ زمانہ کی وجہ سے مخفی ہو گئے تھے۔ اور اب آثارِ قدیمہ سے ان کا پتہ چلا ہے بتاتی ہیں کہ بنی اسرائیل کا گہرا تعلق اس زمانہ کے مصر کے ساتھ تھا اور جو شبہات اب پیدا کئے جا رہے ہیں محض اس وجہ سے ہیں کہ کیوں سو فیصدی تطابق انہیں ان اتفاقات سے نہیں جو نامکمل آثارِ قدیمہ سے یا نامکمل تاریخوں سے ان معترضین کو معلوم ہوئے ہیں۔ اور یہ مطالبہ خلافِ عقل ہے۔

بنی اسرائیل کے سمندر سے گزرنے کے مقام کی تفصیل۔

(۴) قدیم یونانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے لوگ بھی اس امر کو تسلیم کرتے تھے کہ اسرائیلی وہاں سے نکل کر گئے ہیں گو وہ روایات بے سر و پا ہیں۔ مثلاً ان میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی مصر کے کوڑھیوں کی اولاد ہیں۔ اور چونکہ انکو دوسروں سے الگ رکھا گیا۔ اور چونکہ وہ مصری خداؤں کا انکار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے بغاوت کی اور اس لئے انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ یہ روایات علاوہ اور مصنفوں کے آبدیرا کے ہیکاتیئس نے جو سکندر رومی کا ہم عصر تھا۔ اور منیتھو نے جو باشندہ ہلیو پول کا تھا لکھی ہیں۔ (دیکھو اسرائیل معنفہ اڈولف لاڈز ص۱۶۹) اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ روایات بائبل کی روایات کے کلی طور پر خلاف ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل مصر میں نہ گئے تھے اور نہ وہاں سے نکلے تھے تو پھر یہ روایات مصر والوں نے بنائیں کیوں؟ روایات میں جو اختلاف ہے اسکی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ مصری اسرائیلیوں کے دشمن تھے۔ ان کا بادشاہ موسیٰؑ کے مقابلہ میں ذلیل ہو کر مرا۔ اس لئے انہوں نے یہ روایات گھڑ لیں کہ یہ کوڑھی تھے اور ہم نے انکو مار کر نکال دیا۔

جہاں سے بنی اسرائیل سمندر پار ہوئے وہاں کا فاصلہ صرف ۳/۴ میل تھا۔

لیکن اس کی غرض کیا ہو سکتی تھی کہ نہ اسرائیلی ان کے ملک میں آئے نہ وہاں سے نکلے مگر مصری خود بخود قصے بنانے لگ گئے۔ کہ اسرائیلی ہمارے ملک میں آئے تھے اور ہم نے انکو نکال دیا۔ اور ادھر خود اسرائیلیوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ہم وہاں گئے تھے اور انہوں نے ہمیں نکال دیا۔ یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے اور بائبل اور قرآن کریم کا بیان کہ بنی اسرائیل مصر گئے تھے اور وہاں سے خدا تعالیٰ کی مدد سے نکلے بالکل درست ہے۔

اس امر کے واضح ہو جانے کے بعد کہ مصر سے مراد افریقی مصر ہی تھا یہ تو یقین ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل افریقی مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شمال کی طرف سے گئے یا وسط سے یا جنوب سے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر جہاں تک علومِ تحقیق کا تعلق ہے اور بائبل اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی مد و جزر کی کیفیات سے نتیجہ نکلتا ہے یہی بات قرینِ قیاس ہے کہ بنو اسرائیل تل ابی سلیمان کے مقام سے (دیکھو نقشہ اس جگہ فرعونِ موسیٰ کا پایہ تخت ہوتا تھا) پہلے وسط یعنی جمیل تمساح کی طرف گئے جہاں سے کنعان نزدیک پڑتا ہے (دیکھو نقشہ) پھر وہاں سے جھیلوں کی روک دیکھ کر جنوب کی طرف مُڑے۔ اور سویز کے مقام کے پاس سمندر میں سے جزر کے وقت پار ہوئے اور وہاں سے قادس کی طرف روانہ ہو گئے۔

وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ سے بنی اسرائیل نے سمندر کو پار کیا تھا وہ بہت چھوٹا علاقہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ لمبا علاقہ ہوتا تو ایک طرف کھڑے ہوئے درمیان میں ہونے والے واقعہ کو دیکھ نہ سکتے تھے اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ خلیج سویز کے انتہائی شمالی حصہ کا پھیلاؤ کل ۳/۴ میل ہے۔ اگر اس کے نصف میں فرعون کی غرقابی کا مقام تصور کیا جائے تو صرف چھ سات سو گز پر

لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ

راتوں کا وعدہ کیا پھر تم نے اس کے (پیچھے جانیکے) بعد ظلم سے کام لیتے ہوئے بچھڑے کو (معبود)

ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

بنا لیا۔ ۵۱ پھر ہم نے اس کے بعد تمہیں معاف کیا

بنی اسرائیل کھڑے تھے اور انکی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے معلوم ہوتا ہے فرعون اور اس کے کچھ ساتھی تیرنا نہ جانتے تھے۔ یا یہ کہ شام کا وقت تھا جلد ہی اندھیرا ہوگیا اور ۔ راستہ بھول کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگ گئے اور اسمیں غرق ہو گئے۔ نپولین کے محولہ بالا واقعہ میں بھی اسی طرح ہوا تھا۔ شام کا وقت قریب تھا۔ جب وہ اور اس کے ساتھی سمندر کے خشک شدہ حصہ میں داخل ہوئے۔ ابھی پھر ہی رہے تھے کہ مد کا وقت آگیا۔ اور چونکہ خشکی کی طرف جھیلیں تھیں۔ سمندر کا پانی جھیلوں کے پانی سے مل گیا اور جہت کا اچھی طرح معلوم کرنا مشکل ہوگیا اور اس امر کا خوف پیدا ہوگیا کہ بجائے کنارے کی طرف جانے کے نپولین اور اس کے ہمراہی گہرے سمندر میں جا کر غرق ہوجائیں۔ اس پر نپولین نے اپنے ہمراہیوں کو ایسی شکل پر چلنے کا حکم دیا جس طرف کے آدمی پانی گہرا پاتے وہ اس طرف سمٹ آتے تھے جدہر کے لوگ پانی تھوڑا پاتے تھے۔ اور پھر نئی جگہ پر پہلی شکل بنا لیتے تھے۔ اسی طرح کرتے کرتے آخر انہیں کنارہ مل گیا۔ نپولین ریت پر آکر لیٹ گیا۔ اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا کہ اگر آج میں غرق ہوجاتا تو ساری عیسائی دنیا شور مچا دیتی کہ یہ بھی ایک فرعون تھا جو سمندر میں غرق ہوگیا۔

حل لغات ۲۵۱ ظٰلِمُوْنَ: ظَلَمَ سے اسم فاعل ظَالِمٌ آتا ہے۔ ظٰلِمُوْنَ اسکی جمع ہے۔ ظَلَمَ کی تشریح کے لیے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا نمبر ۳۶۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پرستش کا واقعہ

تفسیر اس آیت میں ایک اور احسان کا ذکر ہے جس کی بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ناقدری کی۔ اور احسان کو عذاب میں بدلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ واقعہ اس طرح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک پہاڑ پر جو اُن کے سفر کے راستہ میں تھا۔ کچھ دن الگ عبادت کریں اور خدا تعالیٰ کے خاص ارشادات سنیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے ماتحت پہاڑ پر گئے۔ بنی اسرائیل نے کچھ دنوں کے بعد محسوس کیا کہ انہیں دیر ہوگئی ہے اور سمجھے کہ موسیٰ یا فوت ہو گئے ہیں یا کوئی اور ناگوار واقعہ ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے ان زیورات سے جو انکے پاس تھے۔ ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور کہا یہ بچھڑا ان کا معبود ہے۔ اور اس کی پرستش میں لگ گئے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دی اور واپس جانے کا حکم دیا۔ بائبل میں اس واقعہ کا یوں ذکر آتا ہے:۔

"اور اس نے موسیٰ سے کہا کہ خداوند پاس چڑھ آ۔ تو اور ہارون اور ندب اور ابیہو اور بنی اسرائیل کے بزرگوں سے ستر شخص تم دور سے سجدہ کرو۔ اور موسیٰ اکیلا خداوند کے نزدیک آوے پر وے نزدیک آویں اور لوگ اس کے ساتھ نہ چڑھیں۔" (خروج باب ۲۴ آیت ۱ و ۲)۔ پھر لکھا ہے۔ اس پر عمل کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بزرگوں سے کہا "تم ہمارے لئے یہاں جبتک کہ ہم تم پاس پھر آویں ٹھیرو۔ اور دیکھو کہ ہارون اور حور تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر کسی کو کچھ کام

ظَالِمُوْن

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کا واقعہ بائبل میں

ہوتے تو وہ ان کے پاس جائے۔" (باب ۲۴ آیت ۱۴) پھر لکھا ہے۔ "اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا۔" (باب ۲۴ آیت ۱۸) پھر لکھا ہے۔ "جب لوگوں نے دیکھا موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وے ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہارے بیٹوں کے اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کر مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو اُن کے کانوں میں تھے توڑ توڑ کر ہارون کے پاس لائے۔ اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے ہتھیار سے درست کی۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہکے منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ اور وے صبح کو اُٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں۔ اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اُٹھے" (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶)۔

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کا ذکر قرآن مجید میں

بچھڑے کے بنانے کے متعلق بائبل اور قرآن مجید کے بیان کا فرق۔

اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر کچھ دن بسر کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو اپنے بعد ہارون اور حور کی اطاعت کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بنی اسرائیل نے خیال کیا کہ شاید موسیٰ مر گئے ہیں کہ واپس نہیں لوٹے۔ اور ہارون نے کہا کہ ہمارے لئے کچھ بُت بناؤ۔ انہوں نے فوراً اس پر آمادگی ظاہر کی اور انہیں اپنے زیورات لانے کو کہا جو وہ لے آئے۔ اور ان زیورات سے ہارون نے ان کے لئے ایک بچھڑا بنایا۔ جس کے آگے ہارون کی مدد اور اعانت سے ان لوگوں نے قربانیاں گذرانیں۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور پھر ان تیس راتوں کو دس راتیں اور بڑھا کر مکمل کر دیا اس طرح اس کے رب کا وعدہ چالیس راتوں کی صورت میں مکمل ہو گیا۔" (اعراف ع ۱۷۔ آیت ۱۴۳)

"اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا جو محض بیجان وجود تھا اور صرف اس میں کچھ آواز پیدا ہوتی تھی بنا لیا۔ اور اتنا بھی غور نہیں کیا کہ وہ بولتا نہیں اور نہ انہیں کوئی ہدایت کی بات بتاتا ہے مگر بہر حال انہوں نے اسے اختیار کر لیا اور مشرک ہو گئے"۔ (اعراف ع ۱۸۔ آیت ۱۴۹)۔

"اور اس سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے) پہلے ہارون نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس بچھڑے کے ذریعہ سے تمہارے ایمان کی آزمائش کی گئی ہے۔ اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ (یعنی کلام ہدایت نازل کرتا ہے حالانکہ یہ بچھڑا تو تم کو کوئی ہدایت نہیں دیتا) پس میری فرمانبرداری کرو اور جو میں تم کو کہتا ہوں اس پر عمل کرو (شرک نہ کرو) اس پر انہوں نے کہا کہ ہم تو جب تک موسیٰ واپس نہ آجائیں اس بچھڑے کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔" (طٰہٰ ع ۵۔ آیت ۹۱-۹۲)

بائبل اور قرآن کریم کے اس بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اول تو قرآن کریم بنی اسرائیل کی گھبراہٹ کی وجہ بھی بتاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ابتداءً پہاڑ پر تیس رات رہنے کا حکم دیا گیا تھا (لازماً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اسکا ذکر کر دیا ہوگا) پھر خدا تعالیٰ نے اپنے احسان کو مکمل کرنے کے لئے اس وعدہ کو چالیس رات تک بڑھا دیا (چالیس کا عدد روحانی دنیا میں تکمیل کا عدد ہے) اس تدبیر کے

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

تاکہ تم شکر گذار بنو ۵۵۳ اور (اسوقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی توراۃ)

فرق کیوجہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دس دن کے واپس نہ آنے پر گھبراہٹ پیدا ہونے لگ گئی ہوگی۔ کوئی خیال کرنے لگا ہوگا کہ وہ فوت ہوگئے ہیں کوئی سمجھنے لگا ہوگا کہ شاید راستہ کی مشکلات کو دیکھ کر موسیٰؑ دھوکا دیکر ہمیں درمیان ہی میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ تب انہوں نے بوجہ ایمان میں حدیث العہد ہونے کے اپنے لئے ارد گرد کی مشرک قوموں کیطرح بُت بنانے کی طرف توجہ کی۔ بائبل کے بیان سے اس گھبراہٹ کی وجہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

دوسرے قرآن کریم وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ شرک دوسرے اسرائیلیوں نے کیا۔ ہارون علیہ السلام اس الزام سے کلی طور پر پاک تھے بلکہ انہوں نے اسرائیلیوں کو شرک سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ بائبل اسکے برخلاف ہارونؑ کو جو ایک نبی تھے شرک میں نہ صرف شریک بتاتی ہے بلکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیل کے کہنے پر بلا تردد انہوں نے بُت بنانے پر رضا مندی ظاہر کردی اور نہ صرف بچھڑا بنایا بلکہ ساری قوم کو اسکی عبادت کی دعوت دی۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

بائبل کا یہ بیان ایسا خلاف عقل ہے کہ کوئی عقلمند ایک مشرک کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا ایک نبی جو خدا تعالیٰ کا کلام سننے کا عادی تھا وہ ایک بے جان بے اثر بے فائدہ مورت بنا کر اسے خدا قرار دیتا ہے اور خود بھی اسکی عبادت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی اسکی عبادت کرواتا ہے۔ سوائے پادریوں اور یہودی ربیوں کے جو بائبل کی رطب و یابس تحریرات کو ماننے کیلئے عقل کے کانوں میں روئی ڈالے بیٹھے ہیں کون اس غیر معقول بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟

بعض لوگ اس واقعہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دس دن کے وقفہ کے اندر بچھڑا کیونکر بن گیا؟ ان کے اس اعتراض سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے وہ بچھڑا دیکھا ہے اور اس کی صنعت انہیں ایسی اعلیٰ معلوم ہوئی ہے کہ اُسکے بنانے کیلئے بڑے بڑے کارخانوں اور کامل الصناعت انجنیروں کی ضرورت تھی۔ سونے کو پگھلا کر کسی کے ایک سانچے میں ڈال کر اس سے ایک بھدا سا بُت بنا دینا کونسا بڑا کام ہے جس شخص نے وہ بُت بنایا تھا وہ دل سے مشرک تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح بنی اسرائیل میں پھر شرک جاری ہو جائے۔ پس اسنے گھنٹوں محنت کرکے ایک بھدا سا بُت بنا دیا تو اس میں کیا تعجب ہے؟ ایسے بُت کا بنانا سادہ کڑوں کے بنانے سے زیادہ مشکل نہیں جو چند گھنٹوں میں سُنار تیار کر لیتے ہیں۔

دس دن کے اندر بچھڑا کس طرح بن گیا؟

باقی رہا یہ سوال کہ ہارونؑ کو یہ فن کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا جواب یہودی یا عیسائی دیں ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام اس مشرکانہ فعل سے بری تھے۔ اس کا بنانے والا ایک اور شخص سامری نام تھا ممکن ہے وہ خود سُنار ہو۔ یا ممکن ہے اس نے اپنے ہمخیال سُناروں کی مدد سے بچھڑا بنایا ہو۔

بائبل کے بیان کے خلاف قرآن مجید کا حضرت ہارونؑ کو شرک سے پاک قرار دینا۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کرنا پھر چالیس راتیں کر دینا کیا وعدہ خلافی نہیں؟ یہ ایسا ہی اعتراض ہے جیسے کسی کو تیس روپے دینے کا وعدہ کرکے چالیس دیئے جائیں تو اسے وعدہ خلافی کہا جائے۔ خدا کا کلام ایک نعمت ہے۔ تیس رات کلام کی جگہ چالیس رات کلام کرکے نعمت کو مکمل کیا گیا ہے۔ اور نعمت کی تکمیل وعدہ خلافی نہیں کہلاتی بلکہ انعام و احسان کہلاتی ہے۔

تیس راتوں کی بجائے چالیس راتوں کا وعدہ احسان تھا کہ وعدہ خلافی۔

حل لغات ۵۵۳ ثُمَّ حرف عطف ہے۔ اردو زبان میں اسکا مفہوم ادا کرنے کے لئے "پھر" "تب" "بعد ازاں" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مزید تشریح کیلئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۵۲۹

ثُمَّ

عَفَوْنَا: عَفَىٰ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور عَفَىٰ عَنْهُ وَلَهُ ذَنْبَهُ وَعَنْ ذَنْبِهٖ (یَعْفُوْ) کے معنے ہیں صَفَحَ عَنْهُ وَتَرَكَ عُقُوْبَتَهُ وَهُوَ يَسْتَحِقُّهَا وَاَعْرَضَ عَنْ سُوْٓءِ فَعْلَتِهٖ کہ اس کے قصور سے درگذر کیا اور اس کی سزا کو معاف کیا اور اس کی غلطی پر مؤاخذہ نہ کیا درآنحالیکہ وہ سزا کا مستحق تھا۔ جب عَفَى اللّٰهُ عَنْ فُلَانٍ کا فقرہ کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مَحٰى ذُنُوْبَهُ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کو مٹا دیا۔ اور عَفَىٰ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ وَتَنَزَّهَ عَنْ طَلَبِهٖ کسی چیز سے رُکا رہا اور اسکی طلب سے اپنے آپکو علیحدہ رکھا۔ (اقرب) پس عَفَوْنَا کے معنے ہوں گے کہ باوجود اس کے کہ تمہارا گناہ اس قابل تھا کہ ضرور سزا دیجاتی۔ لیکن پھر بھی ہم نے مواخذہ نہ کیا اور معاف کر دیا۔ (۲) ہم تم کو سزا دینے سے رُکے رہے۔

(عَفَوْنَا عَنْكُمْ سے مراد قومی سزا کی معافی ہے نہ کہ تمام قوم کی۔)

لَعَلَّ: لَعَلَّ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ؏۳

تَشْكُرُوْنَ: شَكَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور شَكَرَ کبھی بغیر صلہ اور کبھی ل کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شَكَرَهُ اور شَكَرَ لَهُ ہر دو طرح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر شَكَرَ کا صلہ لام آئے تو یہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ شَكَرَهُ وَشَكَرَ لَهُ کے معنے ہیں اَثْنٰى عَلَيْهِ بِمَا اَوْلَاهُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ کسی کے احسان کے باعث اس کی تعریف کی۔ گویا محسن کی تعریف کے ساتھ اقرارِ احسان شکر کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ خروج باب ۳۲ آیت ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے بچھڑا بنایا تو اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر بھڑک اٹھا اور اس نے موسےٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ ایک گردن کش قوم ہے اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کر دوں"۔ پھر آیت ۱۴ میں ہے۔ "اس پر حضرت موسےٰ نے ان کے لئے دعا کی اور مطابق توریت تب خداوند نے اس بدی سے، جو چاہا تھا، کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا"۔ یعنی انہیں سزا نہ دی بلکہ درگذر فرمایا۔

اِسجگہ عَفَوْنَا عَنْكُمْ سے مراد قومی سزا کی معافی ہے نہ کہ تمام قوم کی معافی۔ قومی جرائم کی دو شقیں ہوتی ہیں۔ ایک شق اس کی تمام قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق رکھتی ہے۔ اور ایک شق اس کے افراد سے تعلق رکھتی ہے۔ قومی جرائم میں کچھ اشخاص شرارت میں زیادہ حصہ لینے والے ہوتے ہیں۔ کچھ کم حصہ لینے والے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ حصہ تو نہیں لیتے مگر دل میں ساتھ ہوتے ہیں اور زبان سے بھی ساتھ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ زبان سے تو ساتھ نہیں دیتے مگر دل سے ساتھ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں بھی شامل ہو جاتے ہیں مگر دل میں مخالف ہوتے ہیں۔ صرف بزدلی کی وجہ سے اشتراک کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں شریک نہیں ہوتے صرف زبان سے تائید کر دیتے ہیں مگر دل سے اُس بدی کے مخالف ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ عمل سے شامل ہوتے ہیں نہ زبان کی شامل ہوتے ہیں نہ دل سے شامل ہوتے ہیں لیکن وہ مقابلہ بھی نہیں کرتے خاموش ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بدی کے خلاف اظہار ناراضگی بھی کر دیتے ہیں لیکن پوری کوشش اس کو روکنے کیلئے نہیں کرتے۔ قومی سزا میں یہ سارے کے سارے شریک ہو جاتے ہیں لیکن جو سزا شخصی ہوتی ہے۔ اس میں ہر ایک کے سلوک میں فرق کیا جاتا ہے۔ اِسجگہ عَفَوْنَا عَنْكُمْ سے مراد قومی سزا ہی ہے۔ یعنی اس جرم کی بنی اسرائیل کو بحیثیت قوم جو سزا ملتی تھی۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ روک دی گئی۔ افراد کے شخصی جرم جن کا اس میں ذکر نہیں۔ جیسا کہ ایک آیت چھوڑ کر بعد کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی طور پر جو لوگ بڑے مجرم تھے انکو سزا دیگئی تھی۔

وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى

اور فرقان دیئے تاکہ تم ہدایت پاؤ ۵۴؎ اور (اُسوقت کو بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ یعنی یہ فضل ہم نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم ہماری رحمت کے قدردان بنجاؤ اور تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کیسا رحیم ہے ۔ اور اس کی رحمت کی وسعت کو دیکھکر تم بار بار اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو ÷

حل لغات ۵۴؎

اَلْفُرْقَانَ : فُرْقَان دراصل فَرَقَ کا مصدر ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں فَرَقَ بَيْنَهُمَا فُرْقَانًا اَيْ فَصَلَ اَبْعَاضَهُمَا یعنی دو چیزوں کے حصوں کو جدا جدا کر دیا اور جب فَرَقَ لِفُلَانٍ اَمْرٌ اَوْ رَاْيٌ کہیں تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے ۔ کہ بَيَّنَ وَاتَّضَحَ فلاں کے لئے اس کی رائے اور معاملہ کی حقیقت واضح اور اچھی طرح ظاہر ہو گئی ۔ نیز کہتے ہیں فَرَقَ لَهٗ عَنِ الشَّيْءِ اور مراد یہ ہوتی ہے ۔ کہ بَيَّنَهٗ اس کے سامنے کسی بات کو اچھی طرح بیان کر دیا ۔ علاوہ ازیں اَلْفُرْقَانُ کے معنے ہیں اَلْقُرْاٰنُ قرآن مجید ۔ كُلُّ مَا فُرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ ہر وہ بات جس سے حق اور باطل کے درمیان تمیز ہو جائے ۔ اَلنَّصْرُ مدد ۔ اَلْبُرْهَانُ ۔ دلیل ۔ اَلصُّبْحُ اَوِ السَّحَرُ صبح یا سحری کا وقت ۔ اِنْفِرَاقُ الْبَحْرِ سمندر کا دو ٹکڑے ہونا ۔ اَلتَّوْرٰىةُ تورات کو بھی فرقان کہتے ہیں ۔ نیز بدر کی جنگ کو بھی يَوْمُ الْفُرْقَانِ کے نام سے موسوم کرتے ہیں (اقرب) فُرْقَان کے اصل معنے تو كُلُّ مَا فُرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ کے ہیں ۔ لیکن لغت والوں نے اس لفظ کے ذیل میں قرآن مجید ۔ تورات اور سمندر کے دو ٹکڑے ہونے کے بھی معنے کئے ہیں ۔ یہ استنباطی معنے ہیں نہ کہ لغوی ۔ کیونکہ مذکورہ اشیاء کے ذریعہ سے مختلف مذاہب والوں کے نزدیک حق و باطل میں تمیز ہو گئی ۔ اس لئے انکو فرقان کہا گیا ۔

(لعلکم تشکرون کی تشریح ۔)

(تہتدون ۔) تَهْتَدُوْنَ : اِهْتَدٰى سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے ۔ اور اِهْتَدٰى هَدٰى سے باب افتعال ہے ۔ هَدٰى کے لئے دیکھو سورہ فاتحہ ۶؎ نیز سورہ بقرہ ۳؎ ۔ اِهْتَدٰى کے ایک معنے سب سے آگے ہو جانے کے بھی ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں اِهْتَدَى الْفَرَسُ الْخَيْلَ صَارَ فِيْ اَوَائِلِهَا کہ فلاں گھوڑا باقی قافلہ کے گھوڑوں کے آگے آگے چلا (اقرب) پس تَهْتَدُوْنَ کے معنے ہدایت پانے کے علاوہ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تا تم سب لوگوں سے آگے نکل جاؤ ۔ ان کے پیش رو ہو جاؤ ۔

(الفرقان)

تفسیر ۔ اس آیت میں ضمنی طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کو ان چالیس راتوں میں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ۔ کیا کچھ دیا گیا تھا اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم تو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اتنا کام کر رہے تھے اور ان کی ترقی کے سامان پیدا کر رہے تھے ۔ اور یہ لوگ ایک زندہ خدا اور محسن خدا کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی پرستش میں مشغول تھے ۔ یہ تقابل اللہ تعالیٰ کے فعل کا اور بنی اسرائیل کے فعل کا بنی اسرائیل کے جرم کو ایسا واضح کر دیتا ہے کہ کوئی عقلمند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم تمہاری ہدایت کے سامان کر رہے تھے اور تم اپنی گمراہی کے سامان کر رہے تھے ۔ کتاب اور فرقان اُس پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے ۔ انکی غرض تو یہ تھی کہ وہ اجمالی ایمان جو بنی اسرائیل کو حاصل تھا اسے تفصیلی ایمان سے بدل دیا جائے ۔

(آیت واذ اٰتینا الخ میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور بنی اسرائیل کے فعل کے تقابل کی طرف اشارہ ۔)

مگر بنی اسرائیل نے ان ایام میں اس اجمالی ایمان کو بھی کھو دیا۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس جگہ بعض امور بیان کر دینے ضروری ہیں۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے سلسلۂ نبوت کی پہلی کڑی تھے جس کی آخری کڑی کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوئے۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرعون کے ساتھیوں نے کہا اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ (ع ۱۵) اے فرعون! کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ ملک میں فساد کریں۔ اسی طرح ایک درجن سے بھی زیادہ مواقع پر قرآن کریم میں بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم قرار دیا گیا ہے۔ گو اس کی یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ قوم سے ان کے ماننے والے لوگ مراد لئے جائیں لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ پس آپ کو ماننے والے بھی سوائے شاذ و نادر کے بنی اسرائیل ہی ہوں گے۔ پس قوم سے مراد اس صورت میں بھی بنی اسرائیل ہی بنتے ہیں۔ بلکہ ایک آیت قرآن کریم میں ایسی ہے جو قوم کے لفظ کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (یونس ع ۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر انکی قوم میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے تھے۔ اسجگہ قوم سے مراد بہرحال بنی اسرائیل ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جب فرمایا کہ انکی قوم کے تھوڑے آدمی انپر ایمان لائے تھے۔ تو قوم سے مراد مومن نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قوم سے مراد نسلی قوم ہی لیجا سکتی ہے۔

حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل میں سے ہونیکا ثبوت قرآن کریم سے۔

نئے محققین کی اس بات کو ثابت کرنیکی جد و جہد کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے۔

آجکل کے نئے محقق اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے۔ بلکہ وہ کسی مصری قوم میں سے تھے۔ اور اس کے مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں:-

اوّل موسیٰ کا نام مصری زبان میں ہے۔ چنانچہ مصری زبان میں "موسے" بچے کو کہتے ہیں۔ بریسٹڈ اپنی کتاب "ڈان آف کانشنس" میں لکھتا ہے کہ مصریوں میں "آمن موسے" اور "پتا موسے" قسم کے نام پائے جاتے ہیں جن کے معنے ہیں۔ امون (ایک مصری دیوتا) کا بچہ۔ پتا (ایک مصری دیوتا) کا بچہ۔

پروفیسر سگمنڈ فرائیڈ اپنی کتاب "موزز اینڈ مانوتھی ازم" Moses and Monotheism - میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے علاوہ مصری بادشاہوں کے نام بھی اس رنگ کے پائے جاتے ہیں۔ جیسے "آہ موسے" "تھٹ موسے" "را موسے" مثلاً۔ یہ "را موسے" وہی ہے جس کے نام کو بائبل میں "رعمسیس" لکھا گیا ہے۔ "را" سورج کا دیوتا تھا۔ پس "را موسے" کے معنے ہوئے۔ سورج دیوتا کا دیا ہوا بیٹا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "موسے" کے ساتھ جو نام تھا وہ گر گیا اور "موسیٰ" خالی "موسیٰ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

دوسری دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ توحید کنعانی قبائل میں نہیں پائی جاتی۔ توحید کا عقیدہ ایک مصر کے بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس بادشاہ کا نام "امون ہوتپ چہارم" بتایا جاتا ہے۔ اس بادشاہ نے ایک خدا کی جس کا نام "اتون" بتاتا تھا پرستش کی اور لوگوں سے کروائی۔ اتون کا لفظ پرانی کتب میں سورج دیوتا کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہلیو پولس کے مقام پر سورج دیوتا کا ایک بڑا مندر تھا جس میں سورج کی پوجا کیجاتی تھی۔ اس مندر کے ساتھ تعلق رکھنے والے بہت سے پجاری

فلسفیانہ خیالات کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ سورج دیوتا کو ایک بڑی دیوتا سے اخلاقی دیوتا کی شکل میں بدلنا شروع کردیا۔ اسی تصور کو "عمون ہوتپ" نے واحد خدا کے تصور کا جامہ پہنایا اور مصر میں اس کو رائج کیا۔ اس کا ایک فقرہ نقل کیا جاتا ہے جیسے بریسٹڈ نے اپنی تاریخ مصر (HISTORY OF EGYPT) میں درج کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "وہ تنہا خدا تیرے سوا اور کوئی نہیں" اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ توحید کے خیال کا بانی وہی تھا اور اس نے ملک میں جبراً اس خیال کی اشاعت کی۔ اس بادشاہ نے بُت خانے بھی تڑوائے۔ چونکہ "عمون ہوتپ" مشرکانہ نام تھا اس لئے اس بادشاہ نے اپنا نام بھی "اختاتون" رکھا گویا اپنے آپ کو "اتون" یعنی واحد خدا کی طرف منسوب کیا۔

تیسری دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں ختنہ رائج کیا اور ختنہ کا دستور مصری ہے۔ پس معلوم ہوا کہ موسیٰ مصری تھے۔

چوتھی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس اختاتون بادشاہ یا عمون ہوتپ بادشاہ کی تعلیم میں کہیں بعث بعد الموت کا ذکر نہیں کیا گیا ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں کہیں بعث بعد الموت کا ذکر نہیں۔

پانچویں دلیل یہ دی گئی ہے کہ مصری سؤر سے نفرت کرتے تھے ایسا ہی موسوی تعلیم میں سؤر سے نفرت دلائی گئی ہے۔

چھٹی دلیل یہ دی گئی ہے کہ موسیٰ کی نسبت آتا ہے کہ وہ اچھی طرح اپنے خیالات ظاہر نہ کرسکتے تھے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصری تھے اور عبرانی زبان اچھی طرح نہ بول سکتے تھے۔

پس معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے اور ان لوگوں کے خیال میں وہ عمون ہوتپ المعروف بہ اختاتون بادشاہ کے متبعین میں سے تھے۔ اختاتون کے بعد پھر دوبارہ مصری مذہب قائم ہوگیا اور شرک نے پھر سر نکالا جب اس میں اختاتون کی موحدانہ تعلیم کے پھیلنے کا کوئی امکان نہ رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک غیر قوم یعنے بنی اسرائیل کی طرف توجہ کی جو مصریوں کے ظلم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اور عام مصری خیالات کو اپنے منافرت کی وجہ سے چھوڑنے پر آمادہ کی جاسکتی تھی۔ اسرائیلیوں نے اس وجہ سے کہ وہ موسیٰ مصری کے خیالات کو مانکر مصری قوم کے خیالات کی تردید کرنے والے ہوجاتے تھے جو ان کی دشمن تھی جلدی سے اس دین کو قبول کرلیا اور جب اس دین کو قبول کرنے کی وجہ سے مصر میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انہوں نے اس ملک سے ہجرت کی اور کنعان کی طرف آگئے۔

اب میں ان چھ دلیلوں کا جو پیش کی جاتی ہیں مختصراً جواب دیتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی مصری قوم میں سے ثابت کرنے کے دلائل کا رد

پہلی دلیل یہ دی گئی ہے کہ موسیٰ کا نام مصری ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری ہیں۔ یہ دلیل نہایت ہی مضحکہ خیز ہے بنی اسرائیل مصر میں بستے تھے اور ادنیٰ حیثیت میں بستے تھے اس لئے لازمی طور پر انہیں مصری تہذیب اور مصری اقوام کے اثر سے متأثر ہونا چاہیئے تھا۔ ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ تھوڑے سے انگریز ہیں۔ ہزار میں سے ایک بھی انگریز آبادی کے لحاظ سے نہیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں ہزاروں آدمی جیمز (JAMES) جونز (JONES) اور ٹامس (THAMAS) وغیرہ ناموں سے اپنے خیال میں اپنی عزت افزائی کررہے ہیں اُن کے رنگ کوئلوں کی طرح کالے ہیں نسلاً وہ چوہڑوں چماروں میں سے ہیں۔ زبان انگریزی جاننا تو الگ رہا بعض اُن میں سے ایسے ہیں کہ لفظ عیسائی یا انگریز بھی نہیں بول سکتے۔ عیسائی کو "ہسائی" کہتے اور انگریز کو "گرنج" کہتے ہیں مگر پھر بھی ٹامس جونز اور اس قسم کے اور نام انہوں نے رکھے ہوئے ہوتے ہیں کیا ان ناموں کو دیکھ کر کوئی مورخ یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب سمجھا جائے گا کہ یہ انگریزی نسل کے آدمی ہیں۔ آخر انسانی استدلال کی کوئی نہ کوئی قیمت چاہیئے۔ ایک مورخ کو رائے قائم کرنے سے پہلے ہر قسم کے حالات کو سوچ کر رائے قائم کرنی چاہیئے میں حیران ہوتا ہوں یہ یورپین مورخ آخر کس بناء پر ایسی جلدی نتائج نکالنے کی طرف مائل ہوگئے ہیں وہ موسیٰ اور اُن کے چند ساتھیوں

کے ناموں پر حیران ہیں وہ ہندوستان میں آئیں ہم ان کو ہزاروں
کالے کلوٹے نسلاً چوہڑے اور چمار زبان انگریزی سے نابلد
ٹامس (THAMAS) جیمز اور جونز دکھا دیتے
ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا حال ہے سینکڑوں عورتیں ایسی ہیں
جو عیسائی تو نہیں لیکن کسی کان ونٹ (CONVENT)
میں پڑھنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے نام یا اپنے بچوں کے نام
انگریزی طرز پر رکھ لئے ہیں اور بعض جگہ پر ایک ایک انگریزی
نام ہے اور ایک ایک اسلامی یا ہندوانہ نام اور وہ اپنے
دوستوں اور عزیزوں میں اسی انگریزی نام سے مشہور ہوتی ہیں
کوئی ثریا ہے اور اپنی ہمجولیوں میں ڈالی (DOLLY)
کہلاتی ہے کوئی رام کول ہے اور وہ اپنی سہیلیوں میں جین
(JANE) کہلاتی ہے کیا اس سے ہم یہ نتیجہ
نکال لیں کہ وہ انگریز ہیں پھر ان سینکڑوں اور ہزاروں مثالوں
کو دیکھ کر کیوں نہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اگر موسیٰ ایک مصری نام ہی
ہے تو موسیٰ علیہ السلام کے والدین نے یا جس نے بھی یہ نام رکھا
اس نے مصری اثر کے نیچے اس بچے کو ایک مصری نام دے دیا
اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بائبل اور قرآن کریم کے رو سے حضرت
موسیٰ علیہ السلام کو ان کی پیدائش پر فرعون کی سختی سے بچانے
کے لئے ان کی والدہ نے خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک ٹوکرے
میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا تھا اور ان کو مصری شاہی خاندان
کی ایک عورت نے وہاں سے اٹھایا اور پالا تو اس میں کونسے تعجب
کی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا نام مصری تھا۔ آخر جو بچہ دریا
کے کنارے پڑا ہوا پایا گیا تھا اس کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا
اگر اسے اٹھانے والوں نے اس کا نام اپنی زبان میں رکھا تو
اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ پس فرض کرو یہ مصری نام ہے
تو بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
مصری تھے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے واقعات
میں ایک ایسی کڑی موجود ہے جو ان کے نام کے مصری ہونے
کے امکان کو ثابت کرتی ہے تو پھر اس نام سے انکی مصری قومیت
کا نتیجہ نکالنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ غرض مصری نام کی وجہ سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام مصری زبان میں ہونا ان کے مصری قوم میں سے ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری ہونے کا استدلال نہایت ہی کمزور
ہے اور اس استدلال سے زیادہ بودا اور کمزور استدلال کم ہی
ہو سکتا ہے بائبل کا بیان اس واقعہ کے متعلق مندرجہ ذیل ہے۔
"لاوی میں سے ایک مرد نے اپنے قبیلہ کی عورت سے
شادی کی" وہ عورت حاملہ ہوئی اور بیٹا جنی اور اس نے اسے
خوبصورت دیکھ کر تین مہینے تک چھپا رکھا اور جب آگے کو چھپا
نہ سکی تو اس نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اس پر لاسا اور
رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس نے اسے دریا کے
کنارے جھاؤ میں رکھ دیا اور اسکی بہن دور سے کھڑی دیکھتی
تھی کہ کیا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ تب فرعون کی بیٹی غسل کرنے
کو دریا پر اتری اور اسکی سہیلیاں دریا کے کنارے پر پھرنے
لگیں اس نے جھاؤ میں ٹوکرا دیکھ کر اپنی سہیلی کو بھیجا کہ اسے
اٹھا لے۔ جب اس نے اسے کھولا تو لڑکے کو دیکھا۔ اور دیکھو
وہ روتا ہے اسے اس پر رحم آیا اور بولی یہ کسی عبرانی کا لڑکا ہے
تب اس (یعنی موسیٰ) کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہئے تو میں
جا کے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس لے آؤں تا کہ وہ
تیرے لئے اس لڑکے کو دودھ پلائے۔ فرعون کی بیٹی نے اسے
کہا کہ جا وہ چھوکری گئی اور لڑکے کی ماں کو بلایا۔ فرعون کی بیٹی نے
اسے کہا کہ اس لڑکے کو لے اور میرے لئے دودھ پلا۔ میں تجھے
درماہہ دونگی۔ اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا۔ جب
لڑکا بڑھا وہ اسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا۔
اس نے اس کا نام موسیٰ رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اسے
پانی سے نکالا۔" (خروج باب ۲ آیت ۲ تا ۱۰)

قرآن کریم میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے۔ وَ
اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ
عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا
رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَالْتَقَطَهٗٓ
اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۗ اِنَّ فِرْعَوْنَ
وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝ وَقَالَتِ
امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ

عَسٰٓی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۝ (قصص ع ۱) یعنی موسیٰ کی پیدائش پر ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی کی کہ اس کو [illegible] پلا۔ پھر جب تجھے ڈر ہو کہ بچے کی پیدائش کا راز فاش ہو جائے گا تو تو اس کو دریا میں ڈال دیجئو اور ڈریو نہیں اور نہ ہی غم کیجئو (سورۃ طٰہٰ ع ۲ میں دریا میں ڈالنے کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ کہا گیا تھا کہ انہیں ایک صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا جائے) ہم اس کو تیری طرف واپس لائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ پھر اس کو آلِ فرعون نے دریا کے پاس سے اٹھا لیا تاکہ وہ ان کا دشمن ہو اور غم کا موجب ہو۔ فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر یقیناً خطا کار تھے اور فرعون کے خاندان کی ایک عورت نے فرعون سے کہا یہ میرے لئے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا اس کو مارو نہیں ممکن ہے یہ ہمیں نفع دے (اچھا غلام ثابت ہو) یا (اگر بہت ذہین نکلے) تو ہم اسے بیٹا بنا لیں اور وہ حقیقت کو جانتے نہیں تھے۔ ان حوالوں سے ثابت ہے کہ قرآن کریم اور بائبل کے رو سے فرعون کے گھر کی ایک عورت نے جو بائبل کے بیان کے مطابق فرعون کی بیٹی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا اور پالا۔ اور بائبل صاف کہتی ہے کہ اس فرعون کی بیٹی نے ہی موسیٰ علیہ السلام کا نام رکھا تھا۔ وہ اگر ایسا ہوا ہو تو فرعون کی بیٹی نے آخر اپنا مصری نام ہی رکھا ہوگا۔ پس مصری نام کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری قرار دینا بالکل خلاف عقل ہے پنجاب میں اس قسم کی کم از کم دو مثالیں پائی جاتی ہیں دو مشہور انگریزوں نے دو ہندوستانی لڑکے پالے اور ان کے انگریزی نام رکھے اور وہ لڑکے اپنی انگریزی ناموں سے اب تک مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک وار برٹن خاندان کی طرف منسوب ہے اور دوسرا ہندوستانی نوجوان ڈاکٹر مارٹن کے خاندان کی طرف منسوب تھا جس خاندان کا ایک فرد ابی سینیا میں وزیر کے عہدہ پر بھی متمکن رہا ہے۔ وہ افراد جن کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں خالص ہندوستانی الاصل ہیں مگر چونکہ انگریزوں نے ان کو پالا تھا اور انگریزوں نے ہی ان کا اپنی طرز پر نام رکھا اس لئے وہ انگریزی ناموں سے ہی مشہور ہیں۔

علاوہ ازیں میرے نزدیک اس امر کا بھی کوئی کافی ثبوت پیش نہیں کیا گیا کہ موسیٰ دراصل میں مصری نام ہے اور نہ اس امر کا کوئی کافی ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ موسیٰ عبرانی نام نہیں ہے جو لوگ موسیٰ کو مصری نام قرار دیتے ہیں وہ بعض مصری ناموں سے استدلال کرتے ہیں کہ ان کا ایک حصہ موسیٰ کے نام پر مشتمل ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محققینِ زبان کا اس میں اختلاف ہے بلکہ ایک بھی محقق ایسا نہیں جو اس لفظ کا تلفظ جیسے موسیٰ قرار دیا گیا ہے موسیٰ بتاتا ہو بلکہ کوئی اسے "موسیٰ" پڑھتا ہے اور کوئی اسے "میس" اور کوئی "میسو" بتاتا ہے جس کے معنے بچے کے ہیں اور یہ نام کبھی اکیلا ہوتا ہے اور کبھی کسی اور نام کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ مصری شاہی خاندان کے مندرجہ ذیل ناموں کا یہ حصہ ہے۔

تحات میس (THOTMS)

آہ میس (AHEMS)

را میسو (RAMESSU)

اب یہ ظاہر ہے کہ موسیٰ کے تلفظ اور اس تلفظ میں بہت بڑا فرق ہے۔ اوّل موسیٰ میں حروفِ علت میں سے واؤ استعمال ہوئی ہے اور "میسو" یا "میس" میں یا استعمال ہوئی ہے دوسرے موسیٰ میں حرفِ علت کی آواز لمبی ہے لیکن "میس" یا "میسو" میں وہ اتنی چھوٹی ہے کہ حرفِ علت کی بجائے اسے خالی حرکت کہنا زیادہ درست ہوگا۔ پھر موسیٰ کے آخر میں الف آتا ہے اور "میسو" کے آخر میں واؤ آتی ہے اور "میس" کے آخر میں کچھ بھی نہیں آتا۔ چوتھے یہ کہ بائبل میں لکھا ہے فرعون کی بیٹی نے موسیٰ نام سے بچے کو پکارتے ہوئے کہا کیونکہ ہم نے اسے پانی سے بچایا ہے لیکن مصری زبان میں پانی سے نکالنے کے معنوں میں موسیٰ یا اس کے مشابہ کوئی لفظ نہیں پایا جاتا۔ ہاں عبرانی زبان میں اس سے ملتے جلتے معنے ہو سکتے ہیں چنانچہ عبرانی زبان میں موسیٰ کا نام "مَوشے" آتا ہے اور اگر موشے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ایک حصہ "مو" بنے گا جس کے

معنے پانی کے ہونگے اور دوسرا حصہ "شے" بنے گا۔ جس کے معنے چیز کے ہونگے عربی اور عبرانی زبانیں آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ عربی میں پانی کے لئے مَاءٌ کا لفظ ہے اور چیز کے لئے شَیْءٌ کا۔ اگر عربی میں یہ نام رکھا جائے تو یہ مَاءٌ شَیْءٌ بنے گا۔ بگڑی ہوئی عربی میں بھی پانی کے لئے "مُوْ" کا لفظ بولتے ہیں چنانچہ جو لوگ حج کے لئے گئے ہیں انہوں نے یہ الفاظ سُنے ہونگے کہ ایک شخص دوسرے سے سوال کرتا ہے مَوْشَے فِیْہٖ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کیا اس میں کچھ پانی ہے صحیح عربی میں یہ فقرہ یُوں بنتا ہے هَلْ شَیْءٌ مِنَ الْمَاءِ فِیْهِ لیکن جاہل لوگ مختصر کر کے اسے "مَوْ شَے فِیْہٖ" کہہ دیتے ہیں مَاءٌ کی جگہ مَوْ کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں اور شَیْءٌ کی جگہ "شے" کا۔ عبرانی زبان بھی درحقیقت عربی کی ایک بگڑی ہوئی قسم ہے پس اس زبان کے لحاظ سے "مَوْ شے" کے معنے ہوئے پانی کی چیز۔ اور مطلب یہ ہوا کہ پانی میں سے نکالا ہوا بچہ عربی میں آکر اسے موسیٰ بنا دیا گیا جیسے یشوع کا عربی تلفظ عیسیٰ ہے اور جیسے "یشمعیل" کا عربی تلفظ اسماعیل ہے۔ پس نہایت قوی قرینہ اس بات کا موجود ہے کہ موسیٰ کا نام عبرانی ہی ہے اور بائبل کا بیان اس بارہ میں کمزور ہے۔ یہ خیال کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں کہ کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پاس رہے اور ان کا کوئی نام ہی نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے خاندان سے آپکی والدہ دودھ پلانے کے لئے لائیں تو انہوں نے اس خیال سے کہ یہ پانی سے بچا ہے اس کا نام "مَوْشے" رکھا کہ پانی کی چیز۔ جس نام کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا وہ معجزہ ہمیشہ ان کے سامنے تازہ رہتا تھا معلوم ہوتا ہے جب وہ اس بچے کو واپس لے کر فرعون کے گھر گئی ہیں تو وہاں انہوں نے یہ نام لیا ہے اور اسکی وجہ بتائی۔ تو وہ نام فرعون کے گھر والوں کو بھی پسند آگیا اور انہوں نے کہا ہم اس نام سے اسے بُلایا کرینگے یہ حقیقت کے قریب ترین تشریح ہے۔ کیونکہ اوّل تو مصری زبان میں "موشے" کی طرز کا کوئی مصری لفظ نہیں جس کے معنی پانی سے بچانے کے ہوں۔

دوسرے یہ خیال کرنا بعید از قیاس ہے کہ سالہا سال ایک بچے کا کوئی نام ہی نہ رکھا گیا ہو۔ اگر ہم عربی زبان پر غور کریں تو اس رستہ سے بھی موسیٰ کے نام کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ عربی زبان کے رو سے موسیٰ کے معنے کٹے ہوئے کے ہونگے اور اس نام کے یہ معنے ہوسکتے ہیں کہ گویا وہ اپنے خاندان سے کٹ کر فرعون میں پالا گیا۔ اگر عبرانی تلفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو "موشے" ہے دیکھا جائے تو "موشی" کے معنے عربی زبان میں نکالے ہوئے کے ہیں چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اَوْشَی الشَّیْءَ اِسْتَخْرَجَهٗ۔ اَوْشٰی کا اسم فاعل بنے گا۔ مُوْشِی (نکالنے والا) اور اسم مفعول بنے گا مُوْشٰی (یعنی نکالا ہوا) پس مُوشٰی کے معنے بنیں گے نکالا ہوا اور یہ معنے بائبل کے اس فقرہ سے بالکل ملتے ہیں جو کہا گیا کہ "اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا" پس میرے نزدیک درحقیقت موسیٰ مُوشٰی تھا جس کا عبرانی تلفظ "موشے" ہے اور اس کے لفظی معنے صرف نکالے ہوئے کے ہیں۔

سب سے آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف تو یہ جدید محقق اس بات کو ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ نہ بنی اسرائیل مصر میں گئے اور نہ مصر سے واپس آئے۔ اور دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل مصر میں گئے اور ان کے سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام خود مصری تھے۔ اور انکا مذہب بھی مصری تھا۔ اس تضاد سے ہی انسان سمجھ سکتا ہے کہ ان محققین کی باتوں کی بنیاد کتنی کمزور ہے۔ حق یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض اچھی تحقیقاتیں کی ہیں لیکن اس شوق نے ان کو خراب کر دیا ہے کہ ہر تحقیق کے نتیجہ کو اس مسئلہ تک محدود رکھنے کی بجائے اس کو سب مسائل پر حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح وہ ٹھوکر کھا گئے ہیں انکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص آبخورا بنائے اور ساری دُنیا کی پیدائش کا دعوٰے کرنے لگ جائے۔ آبخورا بنانا تو ایک اچھا کام ہے مگر آبخورے کے بنانے سے کوئی شخص دنیا کا خالق نہیں بن سکتا۔ اگر یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً اُن کے کام کی دنیا میں بہت زیادہ قدر کی جاتی۔

دوسری دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ توحید کا خیال مصری ہے چونکہ یہ خیال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں میں پھیلایا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصری تھے۔ اس کے مندرجہ ذیل جواب ہیں۔

اوّل یہ خیال کر لینا کہ کوئی عقلی خیال محض کسی ایک قوم میں نشوونما پاتا ہے عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ہم اس خیال کو درست تسلیم کر لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تمام علمی ترقی صرف چار یا پانچ اشخاص کے دماغوں میں ہوئی ہے اور باقی دنیا نے اس کی نقل کی ہے اور یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں مختلف افراد اپنے گردوپیش کے حالات پر غور کر کے کچھ نتائج نکالتے رہے ہیں اور مختلف ممالک کے سینکڑوں آدمیوں کے خیالات میں توارد ہوتا رہا ہے اصولی خیال ایک رہا ہے۔ ماحول کے ماتحت کچھ کچھ تبدیلیاں مختلف ملکوں میں ہوتی رہی ہیں۔ توحید کا سوال تو ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ملک کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا ہم تو دیکھتے ہیں سائنس کے جزوی مسائل کے بارہ میں بھی ایک ایک وقت میں کئی ممالک کے سائنسدانوں نے آزادانہ طور پر تحقیقات کر کے ایک قسم کے نتائج معلوم کئے ہیں اور کسی نے نہیں کہا کہ انہوں نے ایک دوسرے کی چوری کی ہے بلکہ دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ یہ توارد ہوا ہے بے تار برقی کے متعلق ہی ایک وقت میں مارکونی کے علاوہ اور سائنسدان بھی تو یہ کر رہے تھے اور وہ اپنے طور پر اس بارہ میں کئی حقائق کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے پس یہ خیال کرنا بالکل درست نہیں کہ چونکہ مصریوں میں توحید کا خیال پایا جاتا تھا اس لئے یہ خیال کسی اور قوم میں نہیں ہو سکتا تھا اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری توحید کو پھیلاتے تھے اس لئے وہ مصری تھے۔

ایک لحظہ کے لئے فرض کر لو کہ یہ اصول بھی درست ہے تو پھر بھی اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکلا کہ موسیٰ مصری تھے کیا قانونِ قدرت کا یہ بھی کوئی قاعدہ ہے کہ مصری خیال کو مصری ہی پھیلا سکتا ہے کوئی اسرائیلی نہ اس خیال کو تسلیم کر سکتا ہے اور نہ اس کو پھیلا سکتا ہے اگر یہ درست بھی ہے کہ توحید صرف مصر میں ہی پائی جاتی تھی تو کیا اس بات کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اسرائیلی نسل کے ایک شخص موسیٰ کو یہ خیال بھایا اور اس نے یہ خیال اپنی قوم میں پھیلا دیا۔

میرے یہ جوابات اس مسئلہ پر صرف علمی تنقید کا رنگ رکھتے ہیں ورنہ حق یہ ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے توحید کا خیال ایجاد کیا اور نہ اسلام یہ کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خیال کو ایجاد کیا تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء اپنے خیالات نہیں پھیلاتے بلکہ خدا تعالیٰ کی وحی کو پھیلاتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ توحید کا خیال ابتدائے عالم سے دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام کیا گیا ہے۔ اگر خدا ایک ہے اور اگر وہ شروع سے الہام کرتا چلا آیا ہے تو یہ سیدھی سادی بات ہے کہ وہ اپنے نبی کو یہی کہے گا کہ میں ایک ہوں یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خدا پہلے نبیوں سے تو یہ کہتا رہے کہ میں دو ہوں یا تین ہوں یا چار ہوں لیکن "آمون ہوتپ" کو آ کر یہ کہے کہ میں ایک ہوں۔ یہ سارا دھوکا الہام اور اس کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مذہب کی تو بنیاد ہی الہام پر ہے۔ اگر الہام نہیں تو مذہب صرف ایک ڈھکوسلا رہ جاتا ہے پھر موسیٰ اسرائیلی ہوں مصری ہوں یا کچھ ہوں ان کی ذات بالکل بے حقیقت رہ جاتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت اور شان تو خدائی الہام کی وجہ سے ہے اور اگر خدائی الہام کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ توحید تمام انبیاء کی تعلیم کا جزو اعظم رہا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے وجود کو ظاہر کرنے کے لئے "آمون ہوتپ" کے پیدا ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم مکہ کے رہنے والوں کے سامنے متواتر یہ بات پیش کرتا ہے کہ تمہارا دادا ابراہیمؑ موحد تھا اور حضرت ابراہیمؑ یقیناً حضرت موسیٰ سے پہلے کے آدمی ہیں مکہ کے لوگ خود مشرک تھے لیکن ان کو اس بات کی تردید کی جرأت کبھی نہ ہوئی اور ایک قول بھی کسی تاریخ میں ایسا نہیں ملتا کہ مکہ کے لوگوں نے آگے سے جھوٹے طور پر بھی کہا ہو کہ ابراہیمؑ مشرک تھا پس یہ ایک تاریخی شہادت اس بات کی ہے کہ قریش تو اسرائیلیوں سے دور بستے تھے اور اپنے آپ کو

ان دلیل کا رد کہ توحید کا خیال مصری ہے۔ اور حضرت موسیٰ کا توحید کے خیالات پھیلانا ان کے مصری ہونے کی دلیل ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے قرار دیتے تھے وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خدا کے ماننے والا قرار دیتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اگر توحید "عمون ہوتپ" سے سیکھی تھی تو کرکے ان آنحضرت لوگوں نے توحید کا علم کس سے حاصل کیا۔ کیا یہ بھی مصر سے سیکھ کر آئے تھے۔ وہ تو خود مشرک تھے ان کا تو فائدہ اس میں تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک قرار دیتے مگر باوجود اسکے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے موحد ہونے کا کبھی انکار نہیں کیا۔ پس یہ کہنا کہ "عمون ہوتپ" سے توحید شروع ہوئی ہے بالکل درست نہیں۔ دُنیا کی مختلف تاریخیں ایک خدا کا خیال قدیم زمانہ سے پیش کرتی چلی آئی ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے الہام نے دُنیا کے ہر گوشہ میں توحید کے خیال کو زندہ اور قائم رکھا ہے۔ شرک سے توحید پیدا نہیں ہوئی بلکہ توحید کے بعد کمزوری اور ضعف کے دنوں میں شرک کے خیالات پیدا ہوئے ہیں۔

تیسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ ختنہ مصریوں میں رائج تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسکی تعلیم دی۔ پس معلوم ہوا کہ وہ مصری تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ختنہ کی رسم جاری کرنا ان کو مصری ثابت نہیں کرتا۔

اوّل تو یہ استدلال غلط ہے کہ ختنہ کی رسم کے جاری کرنے کی وجہ سے موسیٰ مصری ثابت ہوتے ہیں کیونکہ فرض کرو ختنہ مصر ہی میں رائج تھا تو کیوں یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے مصر کی رہائش کے دنوں میں مصریوں کے اثر کے ماتحت ختنہ کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ ختنہ مصریوں میں ہی رائج تھا۔ بائبل کہتی ہے کہ ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئی سو سال پہلے خدا تعالیٰ کے حکم سے کروایا اور اپنی اولاد کے لئے ختنہ کرانا ضروری قرار دیا اور نہ صرف خود اپنا ختنہ کرایا بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق کا بھی ختنہ کرایا اس بات کا ثبوت کہ بائبل کا یہ بیان درست ہے یہ ہے کہ عرب جن کے سوشل تعلقات اسرائیلیوں سے اچھے نہیں تھے اور جو کبھی مصر نہیں گئے اُن میں بھی ختنہ کی رسم پائی جاتی ہے اور اُنکی روایات کے مطابق بھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ذریعہ سے یہ رسم اُن میں قائم ہوئی۔ بائبل کے متعلق تو یہ جدید محقق کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ نے اُن کو ختنہ کی تعلیم دی کیونکہ وہ مصری تھے اور جب ختنہ کی تعلیم ان میں آگئی تب بنی اسرائیل نے اس تعلیم کو اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ مگر یہ لوگ عرب کے متعلق کیا کہیں گے۔ عربوں کو تو نہ اسرائیلیوں کی تاریخ سے کوئی دلچسپی تھی نہ موسیٰ علیہ السلام سے انکو کوئی ہمدردی تھی بلکہ وہ تو اسماعیل علیہ السلام کے سوتیلے بھائی اسحاق علیہ السلام کی وجہ سے اسرائیلیوں سے عناد رکھتے تھے اور اسرائیلی اُن سے خار کھاتے تھے۔ اُن میں بھی اس رسم کا ہونا اور اُن کا بھی اس رسم کا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ ختنہ کی رسم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت چلی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری قرار دینے والے محقق درحقیقت ایک خطرناک غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں عربوں میں ختنہ کا رواج مدت سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت "فلاس ٹارگی اُسں" بھی دیتا ہے جو مسیح سے ۲۴۳ سال پہلے گذرا ہے (دیکھو جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۹۷) مگر سب سے بڑی شہادت خود عربوں کی قومی شہادت ہے خواہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم۔ علاوہ ازیں جیوئش انسائیکلوپیڈیا والا لکھتا ہے کہ ختنے کی رسم علاوہ یہودیوں اور مسلمانوں کے اور قوموں میں بھی پائی جاتی تھی اور پائی جاتی ہے چنانچہ ایبے سینین عیسائی بھی ختنہ کراتے ہیں۔ افریقہ کے وحشی قبائل میں تو یہ رسم اتنی وسیع ہے کہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا کے بیان کے مطابق اُن قبائل کا نام لینا آسان ہے جو ختنہ نہیں کراتے بہ نسبت اُن قبائل کے جو ختنہ کراتے ہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا کے پُرانے قبائل بھی ختنہ کراتے تھے جن کا کوئی تعلق مصر سے ثابت نہیں ہو سکتا (دیکھو ٹرائیبز آف سنٹرل آسٹریلیا مصنفہ سپنسر اینڈ گلن ۳۲۴)

امریکہ میں بھی کیا شمالی اور کیا جنوبی اور کیا وسطی یہ رسم پائی جاتی تھی (جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۹۷) ان

حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف مصریوں میں اس رسم کا پایا جانا غلط خیال ہے اگر باوجود مصر سے تعلق نہ رکھنے کے افریقہ کے اکثر قبائل، آسٹریلیا کے قبائل میں، شمالی جنوبی اور وسطی امریکہ کے قبائل میں اور عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا تو اس بات کے ماننے میں کیا مشکل ہے کہ اسرائیلی بھی ختنہ کرایا کرتے تھے۔

حق یہ ہے کہ مصر میں ختنے کا پُرانے سے پُرانا ثبوت ایک مصری بادشاہ کی ممی سے جس کا نام ایمن این ہب AMEN-EN-HEB تھا ملتا ہے اس بادشاہ کا زمانہ ۱۴۱۱ قبل مسیح سے ۱۵۰۰ قبل مسیح تک تھا (دیکھو جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۹۲ بحوالہ آرچوفورانتھر ARCHIVFUR ANTHER صفحہ ۱۲۳) اور یہ زمانہ حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے خاندان کی مصر میں ہجرت کے بعد کا ہے غرض مذکورہ حوالے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں ختنے کا قدیمی ثبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صرف دو سو سال قبل ملتا ہے ہم آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے بادشاہوں کا خاص قُرب حاصل ہو گیا تھا ان کی تعلیم کے ماتحت مصر کے بادشاہوں اور ان کے گرد و پیش کے اُمراء میں ختنہ کا رواج شروع ہو گیا تھا چنانچہ مصری علوم کے محققین کی عام رائے بھی یہی ہے کہ مصر میں ختنے کا رواج زیادہ تر بادشاہوں اور پادریوں میں تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری ہونے کے حق میں چوتھی دلیل یہ دی گئی ہے کہ عمون ہوتپ کے مذہب میں بعث بعد الموت کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں بھی بعث بعد الموت کا کوئی ذکر نہیں۔

اس دلیل میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اوّل خامی تو یہ ہے کہ عمون ہوتپ کا سارا مذہب معلوم نہیں۔ اس نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ اگر چھوڑی ہے تو وہ موجود نہیں اور نہ اُس نے کوئی جماعت چھوڑی ہے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ عمون ہوتپ کے مذہب میں اس تعلیم کا ذکر نہیں۔ جب عمون ہوتپ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی تو کیونکر معلوم ہوا کہ اس کی تعلیم میں بعث بعد الموت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کتاب نہ چھوڑی ہوتی جماعت ہی چھوڑی ہوتی تو ہم اس جماعت کے اقوال سے اس کا اندازہ لگا سکتے مگر ایسی کوئی جماعت بھی عمون ہوتپ نے نہیں چھوڑی پس یہ کہنا کہ اس کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی ایک غیر معقول بات ہے۔

دوسرے ان لوگوں نے یہ بھی ثابت نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بعث بعد الموت کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں یہ ذکر پایا جاتا ہے اسی طرح اُن کے تابع نبیوں کی تعلیم میں بھی یہ ذکر پایا جاتا ہے چنانچہ ذیل میں دو حوالے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درج کئے جاتے ہیں۔

تورات میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اور اس پہاڑ پر جس پر تُو جاتا ہے مر جا اور اپنے لوگوں میں شامل ہو جیسے تیرا بھائی ہارون ہور کے پہاڑ پر مر گیا اور اپنے لوگوں میں جا ملا" (استثناء باب ۳۲ - آیت ۵۰) اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اُن لوگوں سے اے خداوند جو تیرے ہاتھ ہیں دُنیا کے لوگوں سے جن کا بخرہ اسی زندگانی میں ہے اور جن کے پیٹ تُو اپنی نہانی چیزوں سے بھرتا ہے ان کی اولاد بھی سیر ہوتی اور وے اپنی باقی دولت اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں پر میں جو ہوں صداقت میں تیرا منہ دیکھوں گا اور جب میں تیری صورت پر ہو کے جاگوں گا تو میں سیر ہوں گا" (زبور باب ۱۷ آیت ۱۴، ۱۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری ثابت کرنے کی چوتھی دلیل کا رد کہ آپ کے مذہب میں بعث بعد الموت کا ذکر نہیں۔ اس لئے آپ مصری ہیں۔

ان حوالوں سے صاف ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعث بعد الموت کے قائل تھے اور تورات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بھی اس کے قائل تھے اور زبور میں اس کا ذکر موجود ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عہد نامہ قدیم میں بعث بعد الموت پر اس قدر زور نہیں دیا گیا جیسا کہ زرتشتی مذہب یا اسلام میں دیا گیا ہے یا ہندو مذہب میں دیا گیا ہے لیکن اسکی وجہ یہ ہے

کہ یہودی لوگ بہت ہی دُنیادار تھے۔ جب تورات حوادثِ زمانہ سے مٹی اور یہودیوں نے پھر دوبارہ اُس کو جمع کیا تو انہوں نے تہدیک کے اُن پیشگوئیوں کو تو جمع کر لیا جو دُنیوی ترقی کے متعلق تھیں لیکن اُن امور کی چنداں پرواہ نہ کی جن سے اُن کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس طرح کئی حصے رہ گئے جن میں سے ایک بعث بعد الموت کا بھی حصہ تھا مگر باوجود اسکے جیسا کہ پہلے بتایا ہے اب بھی بعث بعد الموت کا ذکر تورات اور دوسرے انبیاء کے صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔

پانچویں دلیل یہ دی گئی ہے کہ سؤر بنی اسرائیل میں حرام ہے اور یہی بات مصری تعلیم میں پائی جاتی ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ استدلال ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ خیال کہ مصری لوگوں میں سؤر حرام تھا درست نہیں۔ جو کچھ مصری تعلیم کے متعلق ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مصری لوگ سؤر کے گوشت کو زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے لیکن اسکی حرمت کا ثبوت نہیں ملتا۔ (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴ کالم ۴۸۲۵ بحوالہ کتاب ایجپٹ (EGYPT) صفحہ ۱۴۴ مصنفہ ارمن (ERMAN) بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ بات ہے کہ مصر میں بعض جگہ پر سؤر پالے جاتے تھے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کے اسی صفحہ پر رینی (RENNI) کے متعلق لکھا ہے کہ اُس کے مال میں تین سو سؤر بھی تھے اور یہ رینی الکاب (EL-KAB) کے مندر کے دیوتا کا کاہن تھا اور ہیروڈوٹس (HERODOTUS) لکھتا ہے کہ سیلین (SALENE) اور ڈایونیسس (DIONYSUS) یعنی اوسیرس ([illegible]) کے ناموں پر سوروں کی قربانی کی جاتی تھی اسی طرح پاہیری (PAHERI) جو شاہانِ مصری کے اٹھارویں حاکم خاندان کا بادشاہ تھا اس کی قبر پر سؤروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں (یہ تمام حوالے انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کالم ۴۸۲۵ و ۴۸۲۶ پر دیکھیں)

کیا موسیٰ علیہ السلام کا سور کو حرام قرار دینا مصری تعلیم کے زیر اثر تھا؟

اسی طرح پروفیسر اڈولف لاڈز (Adolphelods) جو پیرس کی سار بان (Sorbonne) یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اپنی کتاب اسرائیل میں لکھتے ہیں کہ مصر میں عام طور پر تو سؤر کے گوشت سے پرہیز کیا جاتا تھا لیکن خاص خاص چاندوں کی چودھویں تاریخوں پر "سی لین" اور "ڈایونیسس" کے مندروں پر اُن کی قربانی کی جاتی تھی اور اُن کے پجاری اُسے کھاتے تھے (کتاب اسرائیل صفحہ ۴۸) پس یہ کہنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ سؤر کے کھانے سے روکا اس لئے وہ مصری تھے درست نہ ہوا کیونکہ خود مصریوں میں سؤر کی پوری ممانعت نہیں اور جن قبائل میں ممانعت ہے ان میں بھی اس کو گندہ قرار دے کر ممانعت نہیں بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیکر ممانعت ہے یعنی کو خاص خاص تہواروں پر مندروں میں اسکی قربانی کی جاتی تھی اور پجاری لوگ اس کو کھاتے تھے۔

سؤر کو پاکیزہ جانور قرار دینا صرف مصر تک ہی نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے کہ ایشیائے کوچک۔ یونان اور اٹلی میں سؤر کو خاص عزت حاصل تھی اسی طرح پروفیسر لاڈز (LORDS) لکھتے ہیں کہ سؤر بنی اسرائیل کے بہت سے ہمسایوں کے نزدیک ایک مقدس جانور تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس پر خدا تعالیٰ کی تقدیس نازل ہوئی ہے بابل کے ملکوں میں ننیب (NINIB) کی وجہ سے اور شامی لوگوں میں تموز (TAMMUZ) کی وجہ سے یہ مقدس سمجھا جاتا تھا چنانچہ شامیوں میں تموز کے نام جو مہینہ مقرر کیا گیا تھا اس کا نام خنزیرہ یعنی خنزیر (سؤر) تھا (دیکھو کتاب اسرائیل صفحہ ۴۸ بحوالہ ڈی کا لکن شر علتی اُنڈ ڈاس آلتے ٹسٹامینٹ مصنفہ ہائین رچ زمرن اور ربوگو نکلر)۔

ان حوالوں سے مزید تقویت اس خیال کو پہنچتی ہے کہ مصری لوگوں میں خنزیر کے ذبیحہ سے اجتناب اُسکی تقدیس کی وجہ سے تھا نہ کہ اُسے بُرا سمجھنے کی وجہ سے۔ لیکن جیسا کہ بائبل سے ظاہر ہے یہودیوں میں اُسے بُرا اور گندا قرار دیا گیا ہے پس سؤر کی حرمت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے کسی صورت

میں بھی درست نہیں ہوسکتا۔

چھٹی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری النسل ہونے کی تائید میں یہ دی جاتی ہے کہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح کلام نہیں کرسکتے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ غیر نسل سے تھے اور یہودیوں کی زبان میں اُن سے کلام نہیں کرسکتے تھے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام صفائی کے ساتھ کلام نہیں کرسکتے تھے وہ تو ایک حد تک درست ہے بائبل میں بھی یہ ذکر ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے خروج باب ۳ میں لکھا ہے۔

"پس اب تو جا میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔ موسےٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں (آیت ۱۰ و ۱۱)

اس کے بعد ان مختلف ہدایتوں کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملیں پھر اس سلسلۂ کلام کے آخر یوں کہا گیا ہے کہ۔

"تب موسےٰ نے خداوند سے کہا اے میرے خداوند میں فصاحت نہیں رکھتا نہ تو آگے سے اور نہ جب سے کہ تو نے اپنے بندے سے کلام کیا اور میری زبان اور باتوں میں لکنت ہے تب خداوند نے اُسے کہا۔ کہ آدمی کو زبان کس نے دی اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے کیا میں نہیں کرتا جو خداوند ہوں۔ پس اب تو جا اور میں تیری بات کے ساتھ ہوں گا اور تجھ کو سکھاؤں گا جو کچھ تو کہیگا" (خروج باب ۴ آیت ۱۰ تا ۱۲)

قرآن کریم میں آتا ہے وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۔ وَيَضِيْقُ صَدْرِىْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ (الشعراء ع ۲) یعنی یاد کرو جبکہ تیرے رب نے موسےٰ سے کہا کہ ظالموں کی قوم یعنی فرعون کی قوم کے پاس جا اور انہیں کہہ کہ کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کرینگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ اے میرے رب میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کرینگے اور اُن کی تکذیب کے خیال سے میرا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ اور میری زبان چلتی نہیں پس نبوت کو ہارون کی طرف بھیجئے۔

اس دلیل کا رد کہ چونکہ حضرت موسیٰ اچھی طرح کلام نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے آپ مصری تھے

بائبل اور قرآن کے ان حوالوں سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کوئی نقص تھا اور انہوں نے خدا تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ میری زبان نہیں چلتی اس لئے میری جگہ کسی اور کو بھیجئے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی بائبل اور قرآن دونوں کے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان نہ چلنے کا عذر اس وقت کیا ہے جب انہیں فرعون کے پاس جاکر تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عذر کے یہ معنے کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی یا اعصابی طور پر کچھ ایسی کمزوری تھی کہ جب انہیں جوش آجاتا تھا تو صفائی سے اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کرسکتے تھے اور الفاظ یا حروف کو حذف کر دیتے تھے اور یا ہم یہ معنے کریں کہ جس قوم کو مخاطب کرنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا اسکی زبان میں وہ اچھی طرح کلام نہیں کرسکتے تھے۔ اگر اوّل الذکر معنے لئے جائیں تو پھر یہ استدلال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے بالبداہت باطل ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ زبان میں لکنت کا ہونا یا کسی شخص میں ایسی اعصابی کمزوری کا پایا جانا کہ جوش والی تقریر میں عبارت اسکے قابو میں نہ رہے۔ یہ مصریوں کا خاصہ نہیں۔ بنی اسرائیل میں بھی یہ مرض ایسی ہی پائی جاسکتی ہے جیسا کہ مصریوں یا کسی اور قوم میں۔ اور اگر دوسرے معنے کئے جائیں یعنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عذر سے مراد زبان کا نہ جاننا ہے تو پھر تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری نہ تھے کیونکہ بائبل بھی یہی بیان کرتی ہے۔ قرآن کریم بھی یہی بیان کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر اُس وقت پیش کیا ہے جب انہیں

فرعون کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا کوئی عقلمند یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مصری موسےٰ مصری فرعون کو تبلیغ کرنے کا حکم سن کر یہ عذر کرے گا کہ مجھے مصری زبان نہیں آتی۔ اگر وہ مصری تھے تو اُن کو تو وہ زبان آتی تھی جو فرعون بولتا تھا۔ بیں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عذر کی یہ تشریح کی جائے کہ وہ اُس زبان کے نہ جاننے کا عذر کرتے ہیں جس سے اُن کا مخاطب واقف ہے تو پھر اس سے یقینی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اسرائیلی تھے چونکہ فرعون کو تبلیغ کرنے کا اُنہیں حکم دیا گیا اور وہ فرعون کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے انہوں نے خدا تعالیٰ سے یہ عذر کیا کہ جس شخص کو تبلیغ کرنے کا آپ نے مجھے حکم دیا ہے میں اُسکی زبان اچھی طرح نہیں جانتا یعنی میں عبرانی زبان کا ماہر ہوں اور وہ مصری زبان بولنے والا ہے۔ پس یہ استدلال نہایت ہی بودہ۔ نہایت ہی کمزور اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کہ خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم اور بائبل کا دعویٰ کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے صحیح ہے اور محققین جدید کا یہ دعویٰ کہ وہ مصری تھے نہایت غلط اور خلافِ عقل ہے۔ حق یہ ہے کہ کوئی ثبوت اِس بات کی تائید میں نہیں ملتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی نہ تھے لیکن بیسیوں ثبوت اس بات کی تائید میں ہیں اور پیش کئے جا سکتے ہیں اور بعض اوپر پیش کئے گئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی تھے۔

قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دیئے جانے پر ریورنڈ ویری کا اعتراض اور اس کا جواب

اَلْکِتَاب فرماتا ہے ہم نے اِس جگہ پر موسےٰ کو کچھ احکام دیئے۔ کتاب کے معنی جیسا کہ حلّ لغات (سورہ بقرہ ۲) میں بتایا گیا ہے مفروضات کے ہوتے ہیں یعنی فرض کی گئی باتیں۔ پس اَلْکِتَاب سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہاں بعض نہایت ہی تاکیدی احکام عطا فرمائے ریورنڈ ویری نے اپنی تفسیر میں اس آیت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں ہمیں محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہودی تاریخ سے ناواقفیت کی ایک مثال ملتی ہے جیسا کہ اَور بھی کئی مثالیں اِس سورۃ میں ہمیں ملتی ہیں اور وہ مثال یہ ہے کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی الْکِتَابَ کی تشریح

اس پہاڑ پر دی گئی تھی۔ حالانکہ وہاں ان کو صرف الواح ملی تھیں پس قرآن کریم کا بیان ایک اسرائیلی تاریخ سے ناواقف انسان کا بیان ہے۔

میرے نزدیک پادری صاحب کو (اوّل) بائبل پر حد سے زیادہ حسن ظنی معلوم ہوتی ہے جسکی وہ مستحق نہیں (دوم) قرآن کریم سے اُن کو اتنی دشمنی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے وہ اپنی نجات کے لئے اُسپر اعتراض کرنا ہی کافی سمجھتے ہیں اُن کا بغیر کسی بیرونی شہادت کے بائبل کے بیان کو صحیح قرار دینا نہایت خلافِ عقل بات ہے بائبل کے تو باب باب کی خود عیسائی مصنفین نے ایسی دھجیاں اڑائی ہیں کہ اسکی کسی بات کی تصدیق بیرونی شہادت کے بغیر ناممکن ہے۔ پادری صاحب کہتے ہیں بائبل سے ثابت ہے کہ طور پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح ملی تھیں چونکہ قرآن اس کے خلاف کہتا ہے اس لئے قرآن جھوٹا ہے اور وہ (نعوذ باللہ) ایک جاہل انسان کی تصنیف ہے مگر پادری ویری صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ خود اُن کے ہم مذہب جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں اوّل تو موسیٰ علیہ السلام کے ہی منکر ہیں۔ پھر اگر موسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں تو وہ اسے ایک مصری نژاد انسان بتاتے ہیں اور بعض اُن میں سے بنی اسرائیل کے مصر جانے کے ہی قائل نہیں کجا یہ کہ وہاں سے خروج کے قائل ہوں۔ پھر جس طور کے متعلق پادری ویری صاحب کا خیال ہے کہ وہاں دو الواح ملی تھیں محققین جدید اوّل تو اِس طور کے ہی منکر ہیں اور اگر اسے مانتے ہیں تو مصر اور عرب اور شام کے درمیانی علاقہ میں مختلف مقامات پر اسکی تعیین کرنا چاہتے ہیں۔ بائبل کے جو بیانات تاریخ کے رو سے اتنے مجروح ہیں اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناواقفیت ہے کہ انہوں نے بائبل کے خلاف بات لکھ دی صرف اتنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ پادری ویری صاحب کو نہ بائبل کا علم ہے اور نہ اُن تاریخوں کا جو بائبل کے متعلق نئے انکشاف کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔

قرآن کریم کے متعلق اُن کو جو تعصب ہے اُس کا ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ قرآن کریم میں طُور پر ساری بائبل کے نازل ہونے کا کہیں ذکر نہیں بلکہ بائبل کے بیان کے موافق جسے ویری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے بعض احکام اور الواح کے اُترنے کا ہی ذکر ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ۔ (الاعراف ع ۱۷) یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے الواح میں ہر ایک ضروری امر کے متعلق نصیحت لکھ دی اور ہر ایک ضروری امر کی تفصیل بیان کر دی اور اُسے کہا کہ اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور اپنی قوم سے کہو کہ وہ اس کے احکام کی اچھی طرح نگہداشت رکھیں۔ میں تم کو بدکاروں کا انجام دکھاؤں گا۔ اِن آیات سے ثابت ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے طُور پر الواح دی تھیں لیکن نہ قرآن اِس کو تسلیم کرتا ہے اور نہ بائبل یہ دعوےٰ کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سوائے الواح کے اور کچھ نہیں ملا۔ پس ایک پادری کے قلم سے یہ لکھا جانا کہ "بائبل صرف اتنا بتاتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہاں دو الواح ملی تھیں جن میں دس احکام تھے" ایک نہایت ہی تعجب انگیز امر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ اس موقعہ پر دیا گیا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے گوسالۂ سامری کی پُوجا شروع کر دی تھی اس کا خروج باب ۲۰ سے شروع کر کے خروج باب اکتیس تک ذکر کیا گیا ہے۔ اتنے بابوں کو یہاں درج تو نہیں کیا جا سکتا صرف خلاصہ اس جگہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ باب ۲۰ میں اُن دس احکام کا ذکر کیا گیا ہے جو اس پہاڑ پر دیئے گئے تھے۔ باب ۲۱ میں غلاموں کے متعلق۔ اُس کے متعلق جس کا کان چھیدا گیا ہو۔ لونڈیوں کے متعلق۔ قتل کے متعلق۔ بردہ فروشوں کے متعلق۔ ماں باپ کو کوسنے والوں کے متعلق۔ مار پیٹ کرنے والوں کے متعلق۔ اتفاقی چوٹ کے متعلق۔ سینگ مارنے والے بیل کے متعلق۔ اور اُس شخص کے متعلق جس سے لوگوں کو اتفاقی نقصان پہنچ جائے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ باب ۲۲ میں چوری۔ نقصان دہی۔ امانت۔ قرض۔ زنا کاری۔ جادو۔ حیوانات سے بدصحبت کرنے والوں۔ بُت پرستی۔ پردیسیوں۔ بیواؤں۔ لاوارثوں۔ سُود خوری۔ رہن۔ حاکم کی تعظیم اور پہلے پھلوں کی بابت احکام دیئے گئے ہیں باب ۲۳ میں تہمت۔ جھوٹی گواہی۔ انصاف۔ خیر خواہی صدقہ کے طور پر کھیت چھوڑنے۔ سبت۔ بُت پرستی۔ تین عیدوں۔ قربانی کے لہو اور چربی اور فرشتہ کے بھیجے کے متعلق احکام اور وعدے بیان کئے گئے ہیں۔ باب ۲۴ میں پھر دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہاڑ پر جانے کا ذکر ہے اور باب ۲۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عبادت گاہ کے بناتے وقت بنی اسرائیل کیا کیا نذریں گذرانیں صندوق کا ڈول کس طرح بنایا جائے۔ کفارے کا سرپوش معہ کروبیوں کے کس طرح بنایا جائے۔ میز اور اُسکے ظروف کس طرح بنائے جائیں۔ شمعدان اور اُس کے آلات کس طرح بنائے جائیں۔ باب ۲۶ میں خیمے کے دس پردوں۔ بکری کے بال سے گیارہ پردوں۔ اور بکروں کی کھال سے بالاپوش بنانے خیمہ کے تختوں کُولوں اور بینڈوں۔ نیز صندوق پردوں اور دروازوں کے پردوں کے بنائے جانے کے متعلق تعلیم ہے باب ۲۷ میں سوختنی قربانی کا مذبح اور اس کے اسباب مسکن کے صحن۔ اس کے پردوں اور ستونوں اور چراغ کے تیل کی بابت احکام دیئے گئے ہیں۔ باب ۲۸ میں ہارون علیہ السلام اور اُس کے بیٹوں کو کہانت کے لئے مخصوص کئے جانے پاک لباس بنانے کا حکم دیئے جانے۔ افود۔ عدل کی چپراس۔ اور اُوریم و تمیم کے متعلق احکام اور پگڑیوں اور منقش کُرتوں اور ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کے لباس کے متعلق احکام دیئے گئے ہیں۔ باب ۲۹ میں کاہن کے مقدس کرنے کے متعلق قربانی کی رسوم۔ دائم سوختنی قربانی کی رسوم۔ اور خدا کا بنی اسرائیل کے درمیان رہنے کا وعدہ بیان کیا گیا ہے۔ باب ۳۰ میں بخور

۱۳ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ طور پر ملا۔ وہ صرف دس احکام تھے۔

کے مذبح خانوں کے فدیہ۔ برنجی حوض۔ مساحت کے متعلق تیل اور بخور کے بنانے کی ترکیبیں بیان کی گئی ہیں اور باب ۲۱ میں کچھ اور ہدایتیں دینے کے بعد ان کے ساتھ دو لوحیں سپرد کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اتنے بابوں کی تعلیم کو پادری ویری صاحب کس طرح بھول گئے۔ بارہ بابوں میں ان احکام کا ذکر ہے جو طُور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے اور انہی میں سے صرف نصف میں (دس احکام) اور لوحوں کا ذکر ہے۔ مگر باوجود اس کے پادری صاحب کہتے ہیں کہ وہاں لوحوں کے سوا کچھ نہیں ملا اور قرآن کریم کا یہ کہنا کہ وہاں لوحوں کے سوا کچھ اور بھی ملا تھا قرآن کریم کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

لفظ فرقان کے متعلق ریورنڈ ویری کا اعتراض کہ یہ لفظ شامی ہے۔

باقی رہا پادری صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن کریم کے نزدیک ساری تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر دی گئی تھی یہ دعویٰ بلا دلیل ہے الکتاب کے معنی ساری کتاب کے نہیں بلکہ الکتاب کے معنے کچھ حصہ کتاب کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں ایک معمولی خط کا نام بھی کتاب رکھا گیا ہے۔

الکتاب کے معنے

سورۂ نمل میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سبا کی ملکہ کو ایک خط لکھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے پیغامبر کو ایک خط لکھ کر دیا اور کہا اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ (نمل ع ۲) یعنی تُو یہ میری کتاب لے جا اور سبا کے لوگوں کے سامنے اسے پیش کر دے۔ پھر تُو پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو جائیو اور دیکھیو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں جب پیغامبر نے اس کے مطابق عمل کیا اور وہ خط سبا والوں کے سامنے پیش کر دیا تو سبا کی ملکہ نے کہا اے میرے سردارو میرے سامنے ایک معزز کتاب پیش کی گئی ہے وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ اور فرمانبردار بن کر میرے پاس آ جاؤ۔

یہاں کتاب صرف ڈیڑھ یا دو سطر کے ایک خط کا نام رکھا گیا ہے۔ پس محض کتاب کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے مراد ساری تورات ہے صرف اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ کسی طرح قرآن کریم پر اعتراض کیا جائے خواہ سچائی کو فائدہ پہنچتا ہو یا نقصان۔

لفظ فرقان | فرقان کے متعلق ریورنڈ ویری نے اپنی تفسیر میں رومن اردو قرآن کے حوالہ سے جو ایک عیسائی کی مختصر تفسیر ہے لکھا ہے کہ یہ لفظ شامی زبان سے مستعار لیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) افرائیم شامی کی تفسیر بائبل سے واقف تھے جس میں متواتر بائبل کو فرقان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پادری ویری صاحب اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لفظ شامی زبان سے لیا گیا ہے لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی شامی یا عبرانی عیسائی کتاب کی واقفیت تھی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات تاریخ کلیسیہ کے واقعات سے نہایت ہی مختلف ہیں پس وہ صرف سُنی سُنائی حکایات پر مبنی کہے جا سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی شامی کتاب سے واقف ہونا یا نہ ہونا تو ایک ایسا سوال ہے جس کا اس موقع سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کوئی معقول آدمی اس کو تسلیم کر سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف چند ہفتوں کے لئے شام میں ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ گئے تھے۔ اس عرصہ میں آپ کا شامی زبان سیکھ جانا اور اس کے لٹریچر کا مطالعہ کر لینا یہ صرف ایک فاتر العقل انسان کا ہی خیال ہو سکتا ہے کوئی معقول آدمی اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ انگریز چالیس چالیس سال تک ہندوستان میں رہتے ہیں مگر پھر بھی ہزاروں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے جو اردو زبان کو پڑھ سکتا ہو۔ وہ نہ تحریری زبان تو الگ رہی بولنے والی زبان سے بھی وہ بالکل کورے ہوتے ہیں پھر اس تجربہ کے ہوتے ہوئے کسی مصنف کا یہ کہنا کہ صرف چند

ہفتوں کے اندر اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے تجارتی کاموں کے علاوہ شامی زبان بھی سیکھ لی تھی اور نہ صرف شامی زبان سیکھ لی تھی بلکہ شامی زبان کے لٹریچر سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی صرف اُس تعصب کو ظاہر کرتا ہے جو مسیحی اقوام کے دلوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق پیدا ہو چکا ہے۔

باقی رہا فرقان کا شامی لفظ ہونا یہ بھی عربی زبان سے ناواقفیت کی علامت ہے تعجب ہے کہ وہ لوگ جو عربی زبان سے کوئی مس نہیں رکھتے وہ قرآن کریم کی تفسیریں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں جو عربی زبان کا بہترین نمونہ اور اُس کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔

فُرْقَان کا لفظ درحقیقت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے بہت سے صیغے مختلف شکلوں میں عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس آیت سے پہلے ہی وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ آ چکا ہے اسی طرح عربی زبان میں فَرَقَ فَرَّقَ فَارَقَ اَفْرَقَ تَفَرَّقَ تَفَارَقَ اِنْفَرَقَ اِفْتَرَقَ فَارُوْقٌ فَرَاقٌ فَرْقٌ فُرُوْقٌ فُرْقَانٌ فُرْقٌ فِرْقٌ فَرَقٌ فَرِيْقٌ فُرَقَاءُ فِرْقَةٌ فُرُوْقٌ فَرِيْقَةٌ اَفْرَقُ تَفَارِيْقُ مَفْرَقٌ مَفْرِقٌ مَفْرِقٌ مُنْفَرَقٌ مُفَرِّقٌ وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو سب کے سب فرقان کے مادے سے ہیں۔ اگر یہ لفظ شامی زبان سے مستعار لیا گیا ہے تو تمام کے تمام الفاظ عربی زبان میں کہاں سے آ گئے اور اگر یہ الفاظ عربی زبان کے ہیں تو اس مادے کا جو مصدر ہے وہ شامی کس طرح ہو گیا ہاں ایک صورت ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ فرقان کا وزن عربی زبان کے اوزان میں سے نہ ہوتا اس صورت میں بےشک کہا جا سکتا تھا کہ گو یہ مادہ عربی زبان کا ہے مگر چونکہ فرقان کا وزن عربی میں مستعمل نہیں اس لئے یہ لفظ شامی زبان سے لیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں فرقان کا وزن عربی زبان میں بکثرت استعمال ہوا ہے چنانچہ سُبْحَان خدا تعالیٰ کا نام ہے قُرْاٰن قرآن کریم کا دوسرا نام ہے۔ نُعْمَان فقہ کے مشہور امام حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نام کا جزو ہے کُفْرَان کفر کو کہتے ہیں۔ فُقْدَان کے معنے غائب ہو جانے کے ہیں پس یہ وزن بکثرت عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس وزن کے سینکڑوں الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ پس جبکہ فرقان کا مادہ بھی عربی زبان میں مختلف شکلوں میں کثرت سے استعمال میں آتا ہے اور فرقان کا وزن بھی عربی زبان کا وزن ہے اور اس قسم کے سینکڑوں الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں اسے شامی کہنا ناواقفیت اور جہالت کی علامت نہیں تو اور کیا ہے مگر میں اس سے بڑھ کر ایک اور ثبوت اس بات کا دیتا ہوں کہ یہ لفظ عربی کا ہے بلکہ اس مادے کو پورے طور پر صرف عربی نے ہی استعمال کیا ہے اور شامی اور عبرانی زبانیں جو عربی کی فرعیں ہیں اگر اُن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے تب بھی وہ اس پوری حکمت اور شان کا حامل نہیں جس حکمت اور شان کا حامل یہ عربی لفظ ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں صرف لفظ کے معنے نہیں ہوتے بلکہ لفظ جن حروف سے مرکب ہوتا ہے اس کے اصل معنوں پر وہ دلالت کرتے ہیں چنانچہ حروف کے مقام اور مختلف حروف کے مشابہ حروف کے اندر بھی معنوں کا ایک تسلسل پایا جاتا ہے مثلاً ایک لفظ ف ر ق سے بنتا ہے جیسے فُرْقَان تو ایک تو اس لفظ کے مخصوص معنے عربی زبان میں ہونگے اور ایک معنوں کی فلسفیانہ حکمت ہوگی جو نہ صرف اس لفظ میں پائی جائے گی بلکہ تمام ان الفاظ میں بھی پائی جائیگی جو ف ر ق سے بنے ہوں اور ان میں بھی اصولی طور پر وہی معنے یا اس کے مخالف معنے پائے جائیں گے۔ مخالف معنے بھی ایک مشارکت رکھتے ہیں یعنی ان کی وجہ سے ذہن میں دوسرے معنے آ جاتے ہیں چنانچہ عربی زبان میں بہت سے ایسے لفظ پائے جاتے ہیں جو مخالف معنے دیتے ہیں مثلاً ظَنٌّ ہے کہ اس کے معنی شک کے بھی ہیں اور یقین کے بھی۔ اسی طرح رِجَاءٌ کا لفظ ہے اس کے معنی امید کے بھی ہیں اور خوف کے بھی ہیں ایسے الفاظ کے لئے اصطلاحاً اضداد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنے اس لفظ

[1] اس بات کا رد کہ فرقان شامی لفظ ہے

[2] اس بات کا ثبوت کہ فرقان عربی لفظ ہے

میں ایک دوسرے کے ضد معنے پائے جاتے ہیں۔ بعض عربی زبان کے ماہروں نے عربی زبان کے اضداد پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں ان کو یکجائی طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً اسی لفظ فرقان کو لے لو یہ ف ر ق سے بنا ہے اگر عربی زبان میں ان تین حرفوں کو آگے پیچھے کر کے اور الفاظ بنے ہوں تو فرق کے اندر جو اصولی معنے پائے جاتے ہیں وہی ان میں بھی پائے جائینگے مثلاً اگر ف پہلے آجائے اور ق ر پیچھے چلے جائیں یعنی فقر بن جائے یا ر پہلے آجائے اور ف ق پیچھے جائیں یعنی رفق بن جائے یا ر پہلے آجائے اور ق ف پیچھے چلے جائیں اور رقف بنجائے یا ق پہلے آجائے اور ف ر پیچھے چلے جائیں یعنی قفر بن جائے یا ق پہلے آجائے اور ر ف پیچھے چلے جائیں یعنی قرف بن جائے تو ان سب الفاظ کے گو ظاہری معنے مختلف ہونگے مگر اس سب میں مشارکت خواہ موافقت کے لحاظ سے ہو خواہ مخالفت کے لحاظ سے۔ ضرور پائی جائے گی۔ پس جب کوئی لفظ عربی زبان کا ایسا ہو کہ جس کے ساتھ اس کے مشابہ الفاظ کے معنوں میں بھی مشارکت پائی جائے تو وہ یقیناً عربی کا ہی ہو سکتا ہے مستعار نہیں کہلا سکتا کیونکہ مستعار لفظ تو ایک لیا جاتا ہے مگر جس لفظ کی جڑیں تک عربی زبان میں نظر آرہی ہوں اسے مستعار کس طرح کہا جا سکتا ہے اسی مشارکت کو اصطلاحی طور پر اشتقاقِ کبیر کہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فُرْقَان کے لفظ کے عربی ہونے پر اشتقاقِ کبیر شہادت دے رہا ہے مثلاً فَرَقَ کے معنے عربی زبان میں جُدائی اور ڈر کے ہیں چنانچہ فَرَقَ کے معنے ہیں دو چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کر دیا اور فَرِقَ کے معنے ہیں ڈر گیا (اور ڈرنا بھی جدائی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ڈر کر انسان دُور بھاگتا ہے) اور فُرْقَان فَرَقَ کا مصدر ہے چنانچہ اقرب الموارد جو ایک عیسائی کی لکھی ہوئی لغت ہے اُس میں لکھا ہے فَرَقَ یَفْرُقُ فَرْقًا وَفُرْقَانًا یعنی عربی کے لفظ فَرَقَ کا مصدر فُرْقَانٌ بھی آتا ہے اور فُرْقَانٌ بھی آتا ہے اب ہم اشتقاقِ کبیر کے ماتحت ف ر ق کے

اشتقاق سے اس بات کا ثبوت کہ فرقان عربی لفظ ہے۔

دوسرے مجموعوں کو دیکھتے ہیں۔ پہلا مادہ اس کے مشارک حروف کا فَقْرٌ ہے۔ فَقْرٌ کے معنے غربت کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ غریب آدمی امیروں سے جُدا ہو جاتا ہے پس یہاں بھی جُدائی کے معنے پائے جاتے ہیں۔ جُدائی کا ضد اتصال ہے یہ معنے بھی ف ق ر کے اجتماع میں پائے جاتے ہیں چنانچہ فقر کے معنے آپس میں ملا دینے کے بھی ہیں چنانچہ ہار میں تاگا پرونے کو بھی فَقْرٌ کہتے ہیں اسی طرح ریڑھ کی ہڈی بھی فقرات ظہر کہلاتی ہے کیونکہ وہ بھی ہار کی شکل کی بنی ہوتی ہے یعنی الگ الگ ٹکڑوں کے اندر ایک سفید تاگا گذرتا ہے پھر دوسرا اجتماع ف ر ق کا قَرَفَ اور قَفَرَ کی شکل میں ہو سکتا ہے ان میں بھی وہی دونوں معنے پائے جاتے ہیں یعنی جدائی اور اتصال کے معنے چنانچہ قَرْفٌ کے معنے چھلکے اُتارنے کے ہوتے ہیں جس میں جُدائی کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح قَرْفٌ کے معنے زخم کو چھیلنے کے ہوتے ہیں۔ قَرْفٌ کے معنے عیب لگانے کے ہوتے ہیں اور عیب گیری بھی تفرقہ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اور بھی چند معنے اس کے ہوتے ہیں۔ مثلاً رشتہ داروں کے لئے مال کمانا اور چیزوں کو آپس میں ملا دینا اور قَارَفَ کے معنے قریب ہو جانے کے ہوتے ہیں گویا ان معنوں میں بھی افتراق اور اتصال دونوں معنے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح قَفَرَ کے معنے کسی کے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں تَقَفَّرَ کے معنے جمع کرنے اور اَقْفَرَ کے معنے خالی ہو جانے کے ہوتے ہیں اور قَفْرٌ کے معنے جنگل کے ہوتے ہیں۔ جو آبادیوں میں فاصلہ پیدا کر دیتا ہے اور قَفَارٌ اُس روٹی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سالن نہ ہو۔ اب رہی ف ر ق کے اجتماع کی تیسری شکل۔ سو وہ رِفْقٌ اور رقف ہے یعنے ر پہلے ہے اور ف ق یا ق ف بعد میں آتے ہیں رِفْقٌ کے معنے نرمی کے ہیں جو اجتماع کا ذریعہ ہوتا ہے رَفَقَ کے معنے باندھ لینے کے بھی ہوتے ہیں اور رَفِیْقٌ کے معنے ساتھی کے ہوتے ہیں اور رَافَقَت کے معنے دوستی کے ہوتے ہیں اسی طرح مِرْفَقٌ کہنی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دو ہڈیوں کو ملاتی ہے

رقّت کانپنے کو کہتے ہیں جو ڈر کا نتیجہ ہوتا ہے اور فَرَق کے ایک معنے بھی ڈر کے بتائے جاچکے ہیں پس ف ر ق سے جتنے الفاظ عربی زبان میں بنتے ہیں ان سب میں انفصال یا افتراق کے معنے پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ فرقان کا لفظ غیر زبان سے آیا ہے عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ بھی ثابت کرسکتا ہوں کہ اشتقاقِ اکبر کے لحاظ سے بھی فرقان کا لفظ عربی ہی ثابت ہوتا ہے یعنی ف ر ق کے مجموعہ میں ہی معنوں کا اشتراک نہیں پایا جاتا بلکہ اُن کے قریب المخارج الفاظ کے معنوں میں بھی فُرْقَان کے ساتھ اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً ف کی جگہ واو رکھ دیں ر کی جگہ ل رکھ دیں ق کی جگہ ث رکھ دیں تب بھی بہت سے الفاظ میں معنوں کا اشتراک پایا جائے گا مگر چونکہ یہ تفسیر کی کتاب ہے ادبی کتاب نہیں اس لئے میں اس تفصیل میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جاچکا ہے فُرْقَان کے اصل معنے تو فرق کردینے یا دو چیزوں میں امتیاز کردینے کے ہیں اب رہا یہ سوال کہ اس جگہ پر اسلامی اصطلاح میں فُرْقَان کے کیا معنے ہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مختلف مفسرین نے اس کے مختلف معنے کئے ہیں۔ تفسیر جریر جلد اوّل میں ابو العالیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا فُرْقَان کے معنے ہیں فُرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ یعنی ایسی چیز جس کے ذریعہ حق اور باطل میں فرق کردیا گیا ہو۔ مجاہد کا قول ابن جریر نے یہ لکھا ہے کہ فُرْقَان سے مُراد کتاب ہی ہے اور اس کے معنے حق اور باطل میں فرق کرنے والے کے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس کا یہ قول لکھا ہے کہ فُرْقَان مجموعی نام ہے تورات زبور انجیل اور قرآن کا۔ ابن زید سے ابن جریر نے یہ روایت کی ہے کہ فُرْقَان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی ملا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ملا۔ بدر کے موقع پر خدا تعالیٰ نے مشرکوں اور مسلمانوں میں امتیاز کرکے دکھایا اور واقعۂ سمندر کے رو سے خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے دشمنوں میں فرق کرکے دکھا دیا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں بعض لوگوں نے اس آیت کے معنے یہ کئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرقان دیا۔ اختصار کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام بیان نہیں کیا لیکن یہ معنے بالبداہت غلط ہیں اسی طرح وہ لکھتے ہیں جن لوگوں نے فُرْقَان کے معنے کتاب کے کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کتاب کے بعد فرقان کا لفظ تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے چنانچہ زجاج کا یہی قول ہے اور یہی فرّاء نے بھی بیان کیا ہے۔ بعضوں نے فُرْقَان کے معنے مصیبت سے نجات کے کئے ہیں۔ اور اس سے مراد مصر سے نکلنے کو لیا ہے اور ابن بحر نے کہا ہے کہ حجت اور بیان اس کے معنے ہیں بعض نے کہا ہے واو زائد ہے۔ اور فُرْقَان کتاب کی صفت ہے (تفسیر القرطبی جلد اوّل)

خلاصہ ان حوالوں کا یہ ہے کہ فُرْقَان کے [illegible] حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں آگے اس بات کی تعیین کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کس چیز کو خدا تعالیٰ نے حق و باطل میں تمیز کرنے والی قرار دیا ہے اس کے متعلق بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو ہی فرقان قرار دیا گیا ہے بعض نے غرقِ فرعون کو اور بعض نے مصر سے اُن کے بچ کر نکل آنے کو اس لفظ کا مستحق بتایا ہے لیکن میرے نزدیک کتاب اور فرقان کو ایک قرار دینا قرآن کریم کے دوسرے مقامات کو مدِّنظر رکھ کر کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (انبیاء ع ۴) یعنے ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور متقیوں کے لئے نصیحت عطا فرمائی تھی۔ اس آیت میں فُرْقَان کے [illegible] دینے میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ پس فرقان کے معنے تورات کے نہیں لئے جاسکتے۔

فرقان کے معنے

کتاب اور فرقان دونوں ایک نہیں ہوسکتے۔

قرآن کریم میں فُرْقَان کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۱) فُرْقَان کا لفظ قرآن کریم کی نسبت بھی استعمال

قرآن کریم میں فرقان کے لفظ کا استعمال مختلف معنوں میں

ہوا ہے جیسے سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ (ع۱) برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فُرْقَان اُتارا تاکہ وہ ساری دنیا کے لئے نذیر بنے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فُرقان قرآن کریم کا نام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعلق سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (ع ۲۳) یعنی رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں اللہ نے قرآن کریم اُتارا ہے جس قرآن میں ایک تو لوگوں کے لئے ہدایت ہے دوسرے اس میں دلائل ہیں ہدایت کے اور دلائل ہیں فُرْقَان والے یعنی ایسے دلائل جو حق اور باطل میں تمیز کر دیتے ہیں۔ اس آیت کے ذریعہ قرآن کریم کو فُرْقَان پر مشتمل بتایا گیا ہے قرآن کریم میں فرقان کے ایک معنی مصیبت اور مشکل سے نجات کے بھی آتے ہیں چنانچہ سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ہر نبی کو فرقان دیا جاتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (ع ۴) اے مومنو اگر تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہر مصیبت اور مشکل سے بچنے کا راستہ نکالتا رہے گا۔ ان آیات پر غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ درحقیقت فُرْقَان کے معنے حق و باطل میں تمیز کرنے والی چیز کے ہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فُرْقَان کا وعدہ کیا ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ مشکلات کے وقت ان کو ایسی تمیز بخش دیگا کہ وہ صحیح راستہ معلوم کرنے کے قابل ہو جائینگے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فُرْقَان ملا تھا تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ انہیں کوئی ایسی چیز ملی تھی جس سے وہ اپنے دوست اور دشمن اور حق اور باطل میں تمیز کر سکتے تھے اور اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی چیز ایسی ملی تھی جس کو ہم فُرْقَان کہہ سکتے ہیں تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ آپ کو ایسی چیز ملی تھی جس سے آپ اور آپ کے اتباع حق اور باطل میں تمیز کر لیتے تھے اور آپ کے مخالف اگر چاہتے تو اسکی مدد سے حق کو سمجھ سکتے تھے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ فُرْقَان کے معنے محدود کئے جائیں اور اسے بدر کی جنگ یا سمندر سے بچ نکلنے کے معجزوں تک محدود کیا جائے۔ بیشک بدر کی جنگ کو بھی فرقان کہا گیا ہے اور بیشک سمندر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بچ نکلنا ایک فرقان تھا مگر صرف یہی دو چیزیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ملیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور ہزاروں معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملے تھے پس جہاں کسی خاص معجزے کا نام قرآن کریم نے فُرْقَان رکھا ہے (جیسے بدر کے معجزہ کا) وہاں تو ہم اُس کے وہ خاص معنے کرینگے لیکن جہاں کسی خاص معجزے کا ذکر نہیں کیا وہاں ہم فُرْقَان کے معنوں کو محدود نہیں کر سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی شریعت دی جاتی ہے خواہ وہ نئی ہو یا پُرانی (یعنے سابق نبی کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے) اسی طرح فُرْقَان دیا جاتا ہے یعنی ایسے نشانات دیئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز ہو سکے اور یہ فرقان ہی ان کی سچائی کو پہچاننے کا حقیقی ذریعہ ہوتا ہے ہر زمانہ میں لوگوں نے اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سچے نبیوں کو ماننے سے انکار کیا ہے یا جھوٹے نبیوں کے فریب میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی صداقت کسی ایک چیز پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ انہیں بیسیوں قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی انکی سچائی یا ان کے درجہ کی بلندی پر گواہ ہوتے ہیں بعض لوگ صرف چند خواب یا الہام دیکھ کر اپنے آپ کو مامور قرار دینے لگ جاتے ہیں حالانکہ خوابیں اور الہام خیالی بھی ہو سکتے ہیں بیماریوں کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں طبعی بھی ہو سکتے ہیں شیطانی بھی ہو سکتے ہیں اور رحمانی بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف کسی خواب یا الہام کا سچا ہو جانا بھی اس کے رحمانی ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ طبعی اور خیالی باتیں بھی کئی دفعہ پوری ہو جاتی ہیں

انبیاء کے الہام تو اپنے اندر ایک خاص شان رکھتے ہیں ان کے اندر وسعت ہوتی ہے زمانہ کے مفاسد کا علاج ہوتا ہے اور زمانہ کے حالات پر ■ حاوی ہوتے ہیں۔ پس خالی الہام بعض کمزور طبائع کے لئے امتیاز کا موجب نہیں ہوتے مگر الہام کے علاوہ انبیاء کو اپنے دعویٰ سے پہلے ایک پاکیزہ اور ممتاز زندگی ملا کرتی ہے۔ قرآن کریم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع ۲) الہام میں غلطی دماغی کمزوری کا نتیجہ کہلا سکتی ہے لیکن اِس شان کے انسان کی طرف دماغی کمزوری کا منسوب کرنا مشکل ہو جاتا ہے پس گو الہام کی سچائی بھی ایک دلیل ہے۔ گو دعوے سے پہلے کی زندگی کی پاکیزگی بھی ایک دلیل ہے مگر یہ دونوں دلیلیں ملکر ایک تیسری دلیل سچائی کی پیدا کر دیتی ہیں جو اپنی ذات میں بہت بڑی شان رکھتی ہے اور یہ فُرْقَان ہے۔ پھر قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو تو دیکھو جو اس پر ایمان لائے ہیں وہ خود اپنی ذات میں ایک بھاری ثبوت ہیں۔ آخر انسان مختلف درجات اور طبقوں کے ہوتے ہیں۔ کوئی بد اخلاق اور طامع لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی جاہل اور جلدی فریب میں آجانے والے ہوتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگوں میں سے بعض تو وہ تھے جنہوں نے خود اپنے ملک میں اپنے فن اور اپنی عقل اور اپنے علم کی وجہ سے خاص مرتبہ حاصل کیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا آپ پر ایمان لانا خود اپنی ذات میں آپ کی صداقت کی ایک بڑی بھاری دلیل تھی وہ آدمی جو نہ جذباتی تھے نہ جاہل تھے نہ بدعمل تھے۔ دلیل اور عقل کے پیچھے چلنے والے علم رکھنے والے۔ قربانیاں کرنے والے۔ غرباء کی امداد کرنے والے اور مختلف فنون کے ماہر تھے آخر انہیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی قوم میں اپنے آپ کو ذلیل کر کے ایک ایسے شخص کے پیچھے چلتے جو اپنے اندر سچائی کی علامتیں نہ رکھتا تھا اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی دلیل خدا تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اُن کے دشمن تباہ ہو رہے ہیں۔ یہ بھی اپنی ذات میں ایک زبردست دلیل ہے مگر جس وقت یہ پچھلی تین دلیلوں سے مل جائے تو یہ اَور زیادہ شان پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی ایک یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مفاسد پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہ دُور کرتا ہے۔ لوگوں کی علمی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی ذات میں ایک بڑی بھاری دلیل ہے لیکن جس وقت یہ اُن دوسری دلیلوں کے ساتھ مل جاتی ہے تو یہ اَور بھی زیادہ شان پیدا کر دیتی ہے ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ بعض الہام طبعی بھی ہوتے ہیں اور خیالی بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی ہم مان لیتے ہیں کہ طبعی اور خیالی الہام بعض دفعہ سچے بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماننا ہمارے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ خیالی اور طبعی الہام جو دماغی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور شیطانی الہام جو روحانی اور اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس شخص کو اپنے لئے منتخب کیا جسکی زندگی کی پاکیزگی کا سارا ملک شاہد تھا چلو ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ایسے طبعی یا خیالی یا شیطانی الہام ایک ایسے شخص کو ہو گئے جسکی پاکیزہ زندگی کا سارا ملک شاہد تھا لیکن ہمارے لئے یہ ماننا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک راستباز تھا اس کا دماغ بگڑ گیا لیکن باوجود اس کے ملک کے نہایت سمجھدار طبقہ کا ایک حصہ جنہوں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور جنکی اپنی عقل کا ملک گواہ تھا اس کی سچائی پر گواہی دینے لگا پھر چلو ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ غلطی بھی ہو گئی مگر یہ بات ہمارے لئے ماننی کتنی ناممکن ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ کے غلط خیالات خواہ عقیدہ کے لحاظ سے ہوں یا علمی لحاظ سے ہوں یا عمل کے لحاظ سے ہوں انکی اصلاح بھی اس شخص سے ہوئی معترض مانتا ہے کہ شرک بُرا ہے اور معترض مانتا ہے کہ اس شرک کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی دُور کیا۔ پھر وہ یہ بھی مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الہام کے مدعی تھے اور اُس کے نزدیک

اُن میں سے بعض اتفاقی طور پر پورے بھی ہو جاتے تھے وہ مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی دعوے سے پہلے بڑی پاکیزہ تھی وہ مانتا ہے کہ ان کے ماننے والے ایسے لوگ تھے جنہوں نے انکی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا تھا اور وہ خود بھی اپنی عقل اور اپنے علم اور اپنے نیک اعمال کی وجہ سے مُلک میں مشہور تھے وہ مانتا تھا کہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانا وہ اتفاقی طور پر جیت گئے اور ان کے دشمن اتفاقی طور پر ہار گئے اور پھر وہ یہ بھی مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرک کے دُور کرنے کی بھی توفیق ملی جسکی غلطی کو وہ خود بھی تسلیم کرنے والا ہے اسی طرح اور بیسیوں عقائد کی اصلاح کی توفیق آپ کو ملی جن میں سے بعض اصلاحات کے صحیح ہونے کو دشمنوں میں سے ایک فریق اور بعض کے صحیح ہونے کو دوسرا فریق مانتا ہے اب اس سارے مجموعہ کو دیکھتے ہوئے کون شخص کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ فاترالعقل تھے یا دماغ کی کمزوری کے مریض تھے یا نعوذ باللہ شیطان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ایک دلیل میں الگ الگ تو شبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایک دلیل کو الگ الگ تو اتفاقی قرار دیا جا سکتا ہے مگر ان سب امور اور ایسے ہی اور سینکڑوں امور کے ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جانے کو تو کسی صورت میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اس اجتماع کے ہوتے ہوئے بھی شبہ باقی رہ سکتا ہے تو پھر دنیا کی کسی بات کو بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی مجموعے کا نام میرے نزدیک فُرْقَان ہے۔ یہی مجموعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا یہی مجموعہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ملا۔ یہی مجموعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملا۔ یہی مجموعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملا۔ اور یہی مجموعہ آج بانئ سلسلہ احمدیہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملا ہے۔ دشمن ہمیشہ ایک ایک چیز کو لے کر اعتراض کرنے لگ جاتا ہے حالانکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اعتراض تو ہر چیز پر ہو سکتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ بیسیوں قسم کے دلائل کا مجموعہ اس میں کس طرح جمع ہو گیا ہے۔ اگر ایسا مجموعہ کسی میں جمع ہو تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے فُرْقَان ملا ہے اور یقیناً وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگا یہ فُرْقَان کبھی کسی جھوٹے آدمی کو نصیب نہیں ہو سکتا ہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسرے نبیوں سے ایک امتیاز حاصل ہے اور وہ یہ کہ دوسرے نبیوں کو کتاب اور اس کے علاوہ فُرْقَان ملا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرقان الگ بھی ملا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی اسے بھی فُرْقَان بنایا گیا۔ تورات اپنی سچائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزات کی تائید کی محتاج تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہامات دوسرے معجزات کی تصدیق کے محتاج تھے۔ وید اور ژند کا بھی یہی حال ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب اپنی ذات میں بھی فُرْقَان ہے یعنی وہ ایک زندہ کتاب ہے اور اگر دوسرے معجزات لوگوں کو بھول بھی جائیں تب بھی وہ اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر شامل رکھتی ہے اسی وجہ سے اس کا نام فُرْقَان رکھا گیا ہے اور کسی سابق الہامی کتاب کا نام فُرْقَان نہیں رکھا گیا کیونکہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی محتاج ہیں مگر قرآن کریم اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کو ماننے والوں کی نسبت يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال ع ۴) فرمایا گیا ہے یعنی یہ کتاب چونکہ خود فُرْقَان ہے اس لئے اس پر ایمان لانے والوں کو بھی اگر وہ درجۂ کمال تک ایمان لائیں فُرْقَان ملتا ہے۔ یہ دلیل انبیاء علیہم السلام کی صداقت پہچاننے کی ایک ایسی زبردست اور جامع دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص اس دلیل کو لے کر انبیاء کی شناخت کی کوشش کرے تو اس کے لئے اپنے زمانہ کے مامور کو پہچاننا کوئی مشکل کام

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ فرماتا ہے:

کتاب اور فرقان ہم نے موسیٰ کو اس لئے دیئے تھے تاکہ بنی اسرائیل ہدایت پائیں مگر افسوس انہوں نے نہ کتاب

[۲] قرآن کریم کو فرقان کہنے کی وجہ

[۲] انبیاء کو فرقان کا ملنا ان کے صادق ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

[۱] انبیاء میں کثرت سے ایسے دلائل کا جمع ہو جانا جو ان کی صداقت کو پوری طرح واضح کر دیں فرقان کہلاتا ہے

لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم (کے لوگو) تم نے بچھڑے کو (معبود) بنا کر یقیناً اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اس لئے تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف جھکو اس طرح سے کہ اپنے (آدمیوں) کو (آپ) قتل کرو

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ

یہ بات تمہارے پیدا کرنیوالے کے نزدیک تمہارے حق میں بہت اچھی ہے تب اس نے تمہاری طرف فضل کے ساتھ پھر توجہ کی

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى

وہ یقیناً (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۵۵ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا

سے فائدہ اُٹھایا اور نہ فرقان سے فائدہ اُٹھایا۔ لَعَلَّ کے لفظ سے اِس جگہ شک کا مفہوم نہیں سمجھنا چاہیئے یہ شاہانہ کلام ہے اور گو لغوی لحاظ سے اس لفظ میں قطعیت نہ پائی جاتی ہو لیکن شاہی کلام میں جب اس قسم کے الفاظ آئیں تو ان میں قطعیت کا مفہوم ہی پایا جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے فرامین میں ہمیشہ لکھتے ہیں کہ ہم فلاں قوم سے یہ امید کرتے ہیں حالانکہ اس سے مراد حکم ہوتا ہے۔ یہاں بھی لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کے یہی معنے ہیں کہ ہم نے یہ چیزیں دیں اور ہم بنی اسرائیل سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ہدایت پائیں یعنی ہمارا احسان کا تقاضا تھا کہ وہ ہدایت پائیں اور اس کا طبعی نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے تھا کہ وہ ہدایت پا جاتے لیکن انہوں نے ہمارے احسان کی قدر نہ کی اور اپنی فطرت کو بھی ایسا مسخ کر دیا کہ طبعی نتیجہ یعنی ہدایت سے محروم ہو گئے۔

۵۵ حل لغات۔ ظَلَمْتُمْ۔ ظَلَمَ سے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور ظَلَمَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۶ھ

اَنْفُسَكُمْ۔ اَنْفُسٌ نَفْسٌ کی جمع ہے اور نَفْسٌ کے معنی کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴۵ھ

تُوْبُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ تَابَ يَتُوْبُ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۸ھ

لعلکم تھتدون کی تشریح

بَارِئِكُمْ: اَلْبَارِئُ بَرَأَ سے اسم فاعل ہے اور بَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنے ہیں خَلَقَهُمْ اللّٰہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اَلْبَارِئُ کے معنے ہیں اَلْخَالِقُ پیدا کرنے والا (اقرب)

اقتلوا

اُقْتُلُوْا۔ اُقْتُلُوْا امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور قَتَلَهٗ کے معنے ہیں اَمَاتَهٗ بِضَرْبٍ اَوْ حَجَرٍ اَوْ سَمٍّ اَوْ عِلَّةٍ۔ کسی قسم کی ضرب یا پتھر کے مارنے یا زہر دینے یا اور کسی وجہ سے اسکی رُوح کو اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا اور جب قَتَلَ الْجُوْعَ وَالْبَرْدَ کہیں تو معنے ہونگے كَسَرَ شِدَّتَهٗ کہ اس نے بھوک کی تیزی اور سردی کی شدت کو دُور کر دیا۔ اور قَتَلَ اللّٰهُ الْاِنْسَانَ وَقَاتَلَهٗ کے معنے ہیں لَعَنَهٗ کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص پر لعنت نازل کی اور اپنے سے دُور کر دیا (اقرب) مفردات راغب میں اُقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ کے ماتحت لکھا ہے لِيَقْتُلْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا یعنی اس کے معنے یہ ہیں کہ تم میں سے غیر مشرک مشرک کو خود قتل کر دیں۔ وَقِيْلَ عَنٰى بِقَتْلِ النَّفْسِ اِمَاطَةَ الشَّهَوَاتِ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قتل نفس سے مراد خواہشات نفسانیہ کو دُور کرنا ہے چنانچہ

اسی معنے میں یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالْمَاءِ اَیْ اِذَا مَزَجْتَهٗ یعنی شراب کو پانی کے ساتھ ملا کر قتل کر دیا یعنی اسکی شدت کو ہلکا کر دیا نیز کہتے ہیں قَتَلْتُ فُلَانًا وَقَتَّلْتُهٗ اِذَا ذَلَّلْتَهٗ یعنی جب کسی کو عاجز اور ذلیل کر دیا جائے تو اس وقت بھی قتل کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ میں نے فلاں کو قتل کر دیا۔ لسان العرب میں قَتَلَ کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال پر جب خلافت کا انتخاب ہونے لگا تو بعض لوگوں نے اس وقت اختلاف کیا اور ان میں سے ایک سعد بھی تھے تو ان کے متعلق کہا گیا قَتَلَ اللّٰهُ سَعْدًا فَاِنَّهٗ صَاحِبُ فِتْنَةٍ وَشَرٍّ کہ اللہ تعالیٰ سعد کو قتل کرے کیونکہ وہی فتنہ و فساد کی جڑ ہیں اور مطلب یہ تھا کہ دَفَعَ اللّٰهُ شَرَّهٗ یعنی اللہ تعالیٰ سعد کے شر کو دفع کرے اور اس کے ارادوں کو پورا نہ کرے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اُقْتُلُوْا سَعْدًا قَتَلَهُ اللّٰهُ کہ سعد کو قتل کر دو اللہ تعالیٰ اسے قتل کرے اور مطلب یہ تھا کہ اِجْعَلُوْهُ كَمَنْ قُتِلَ وَاحْسِبُوْهُ فِیْ عِدَادِ مَنْ مَاتَ وَهَلَكَ وَلَا تَعْتَدُّوْا بِمَشْهَدِهٖ وَلَا تُعَرِّجُوْا عَلٰی قَوْلِهٖ یعنی اے لوگو تم سعد کی طرف التفات نہ کرو بلکہ اپنی توجہ کو اس سے ہٹا کر اسے ایسا کر دو کہ گویا وہ مقتول ہے اور اس کو ان لوگوں میں شمار کرو جو مر چکے ہوں اور اس کو کسی گنتی میں نہ لاؤ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ بھی اس سے ایسا ہی سلوک کرے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ مَنْ دَعَا اِلٰی اِمَارَةِ نَفْسِهٖ اَوْ غَيْرِهٖ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَاقْتُلُوْهُ اَیْ اِجْعَلُوْهُ كَمَنْ قُتِلَ وَمَاتَ بِاَنْ لَا تَقْبَلُوْا لَهٗ قَوْلَهٗ وَلَا تُقِيْمُوْا لَهٗ دَعْوَةً یعنی جو شخص اپنی خلافت یا اور کسی کی خلافت کا پروپیگنڈا کرے اور لوگوں کو کہے کہ اسے یا فلاں شخص کو خلیفہ بناؤ۔ اس کو قتل کر دو یعنی اسکی بات کو قبول نہ کرو اور مکمل طور پر اس سے قطع تعلق کر لو اور اسے اس ذریعہ سے ایسا کر دو کہ گویا وہ مقتول ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے اِذَا بُوْيِعَ بِخَلِيْفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا اَیْ اَبْطِلُوْا دَعْوَتَهٗ وَاجْعَلُوْهُ كَمَنْ مَاتَ کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جاوے تو آخری کو قتل کر دو یعنی اس کی دعوت کی طرف کان نہ رکھو بلکہ اس سے قطع تعلق کر کے اسے قتل کئے جانے کے حکم میں کر دو (لسان) پس قَتَلَ کے عام مشہور معنوں کے علاوہ اس کے معنے ذلیل کرنے اور قطع تعلق کرنے کے بھی ہیں۔

تو بہ والی بارگاہ میں لفظ بارئ استعمال کرنے کی حکمت اور اس کے معنے

اَنْفُسَكُمْ۔ اَنْفُسَكُمْ کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ع۵

تَابَ۔ تَابَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ع۵

اَلتَّوَّابُ۔ اَلتَّوَّابُ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ع۵

اَلرَّحِيْمُ۔ اَلرَّحِيْمُ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ فاتحہ ع۱

تفسیر۔ یہ بتانے کے بعد کہ بنی اسرائیل نے اس موقعہ پر بھی جبکہ عظیم ترین احسان ان پر ہو رہا تھا خدا تعالیٰ کی شدید ترین نافرمانی کی۔ فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اکثر کو اس موقعہ کے لحاظ سے سزا دینی ضروری تھی کیونکہ ایسے عظیم الشان موقعہ پر شرک کا جُرم کلی طور پر معاف کر دینا گناہوں پر دلیر کرنے کا موجب ہو سکتا تھا۔ پس فرمایا کہ اے بنی اسرائیل تم نے اپنی جان پر شرک کر کے بڑا ظلم کیا ہے اس لئے اپنے بَارِیْ کے حضور بیت توبہ کرو۔ بَارِیْ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے گئے ہیں پیدا کرنے والے کے ہیں۔ لیکن خَالِقْ کے لفظ سے اس کے معنوں میں کچھ فرق ہے بَرَءَ کا لفظ عیب اور نقص سے پاک ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے اس لئے ائمہ زبان نے اس کے معنے نقائص سے پاک خلق کے کئے ہیں چنانچہ زمخشری اپنی کتاب کشاف میں لکھتے ہیں اَلْبَارِیُٔ

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بَرِیْئًا مِّنَ التَّفَاوُتِ، یعنے بَارِئٌ کے معنے ہیں وہ جس نے مخلوق کو اختلاف و نقصان سے پاک پیدا کیا۔ جو علامہ ابوحیان نے بھی ان کے ان معنوں کی تعریف کی ہے اور علامہ ابوحیان نحو اور لغت کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں اور انکی تفسیر بحرالمحیط چوٹی کی تفسیروں میں سے ہے وہ زمخشری کے اس استدلال کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ یہ استدلال کلام حسن ہے یعنے بہت لطیف استدلال ہے۔ یہ استدلال علامہ زمخشری کا اس لفظ کے دوسرے الفاظ سے ہے بَرْءٌ کے معنے عربی زبان میں عیب و نقص سے پاک ہونے کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں بھی لکھا ہے کہ خَلْقٌ اور بَرْءٌ میں یہ فرق ہے کہ خلق سب قسم کی مخلوق کے لئے آتا ہے لیکن بَرْءٌ کا لفظ عموماً ذوی الارواح کی نسبت بولا جاتا ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں بَرَءَ اللّٰہُ النَّسَمَةَ وَخَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنے ارواح کی پیدائش کے لئے بَرَءَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش کے لئے خَلَقَ کا۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ نسبتاً کامل مخلوق کی پیدائش کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں مصائب کی پیدائش کی نسبت بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے (حدید آیت ۲۳ ع ۳) مگر وہاں بھی چونکہ ذوی الارواح کا ہی ذکر ہے یہ استعمال مشارکت کی وجہ سے ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بَارِئٌ کا عام استعمال غیر ذوی الارواح کے لئے جائز ہے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ (حشر ع ۳) یعنے اللہ بارئ اور خالق ہے۔ ایک جگہ دونوں لفظوں کا استعمال بتاتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک دونوں لفظ ہم معنی نہیں ہیں بلکہ دونوں الگ الگ خصوصیت کے حامل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے بَارِئٌ نام کے یہ معنی ہیں کہ نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ وہ خاص قسم کے اخلاق اور ترقی کرنے والی قوتیں بھی عطا فرماتا ہے پس اس جگہ پر بَارِئٌ کا لفظ استعمال فرما کر ایک لطیف اشارہ شرک کی تردید کے متعلق کیا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل نے بھی گھڑ گھڑا کر ایک بت تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خالق مخلوق سے اچھا ہوتا ہے اور گھڑنے والا گھڑی ہوئی چیز سے بہتر ہوتا ہے۔ ایک تصویر بڑی اچھی چیز ہے مگر اس کا مصور اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کیونکہ وہ ویسی ہی بلکہ اس سے بڑھ کر تصویریں بنانے کی قابلیت رکھتا ہے تُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ کہہ کر فرمایا کہ اے نادانو تم اپنے ہاتھ کی ادنیٰ اور بے جان گھڑی ہوئی چیزوں کے آگے سجدہ کرنے لگ گئے لیکن جس نے تم کو کامل طور پر جاندار بنا کر پیدا کیا تھا اس کو بھول گئے۔ اگر صنعت کوئی قابلِ قدر چیز ہے تو صناع اس سے بھی بڑھ کر قابلِ قدر ہے کیونکہ وہ صنعتوں کا منبع ہے پس اگر کوئی اچھی صنعت تمہاری توجہ کو کھینچ لیتی ہے تو تمہیں صنعت سے صانع کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تھی اور شرک کی بجائے توحید کو اختیار کرنا چاہیئے تھا غرض تُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ کہہ کر توبہ کے مضمون کے علاوہ صرف اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے کی ضرورت اور حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ تین لفظوں میں ہزاروں الفاظ کا مضمون بیان کر دیا گیا ہے۔

۱ لفظ بَرْءٌ اور خلق میں فرق

فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ قتل کے معنی جیسا کہ مل تا سے ظاہر ہے قتل کے بھی ہوتے ہیں اور قطع تعلق کے بھی ہوتے ہیں بعض مفسرین نے اس جگہ پر قتل سے مراد اپنے نفس کو قتل کرنے یعنی اپنی خواہشات کو مارنے کے لیے ہیں لیکن بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الواقع بعض آدمیوں کو قتل کی سزا دی گئی تھی اور اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ پہلے عفو کا اعلان کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس موقع کی شناخت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت بعض افراد کو قتل کی سزا بھی دی گئی تھی۔ بائبل میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے۔

۲ اقتلوا انفسکم میں قتل کے معنے حقیقۃً قتل کرنے کے

"اور اس (موسیٰ) نے انہیں (بنو لاوی کو) کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکرگاہ میں گذرتے پھر و اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو۔ ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک

بائیبل میں بچھڑے کی پرستش کرنے والوں کے قتل کئے جانے کا ذکر

آدمی اپنے قریب کو قتل کرے اور بنو لاوی نے موسیٰ کے کہے کے موافق کیا چنانچہ اُس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار مرد مارے پڑے۔" (خروج باب ۳۲- آیت ۲۷-۲۸) پھر آگے لکھا ہے اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاکر رحم کی درخواست کی اور کہا۔ "کاش کہ تُو اُن کا گناہ معاف کرتا اگر نہیں تو میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے اُس دفتر سے جو تُو نے لکھا ہے میٹ دے۔" (خروج آیت ۳۲)

اس پر خدا تعالیٰ نے بحیثیت قوم تو گناہ معاف کر دیا لیکن مِن حیث الافراد معاف نہ کیا اور کہا کہ قیامت کو پرسش ہوگی۔ (آیت ۳۴)

بائیبل کے ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ پہلے انکو قتل کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر رحم کیا گیا اور قومی طور پر سزا اُٹھا دی گئی لیکن قیامت کے دن کی پرسش کو قائم رکھا گیا۔ قرآن کریم اور بائیبل کے اس بیان میں کچھ اختلاف ہے قرآن کریم کے بیان کے رو سے قومی معافی پہلے ہوئی اور فردی سزا بعد میں دی گئی لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق فردی سزا پہلے دی گئی اور پھر قوم کو معافی ملی۔ جہاں تک الہامی شہادت کا سوال ہے لازماً یہودیوں اور عیسائیوں کو بائیبل کے بیان پر اعتبار ہوگا اور ایک مسلمان کو قرآن کریم کے بیان پر۔ اور جہاں تک تاریخ کا سوال ہے سوائے بائیبل اور قرآن کریم کے بیان کے اور کوئی شہادت اس بارہ میں ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جن دوسرے مقامات پر بائیبل اور قرآن کریم میں اختلاف ہوا ہے اور جنکی نسبت آزاد تاریخی شہادت بھی موجود ہے ایسے مواقع پر نتیجہ ہمیشہ یہی نکلا ہے کہ قرآن کریم کی بات سچی اور بائیبل کی بات غلط ثابت ہوئی ہے پس تاریخی لحاظ سے بھی قرآن کریم کے بیان کو بائیبل کے بیان پر مقدم کرنا پڑے گا لیکن یہ واقعہ ایک حد تک نفسیاتی اصول سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم جُرم کرے تو سارے ہی جُرم کرنے والوں کے خلاف یک دم قدم اُٹھایا جاتا ہے پھر اگر معاف کرنا ہو تو عام

٢١١
بنی اسرائیل کو بچھڑا بنانے کے بعد قومی معافی اور فردی سزا دیے جانے میں بائیبل اور قرآن مجید کا اختلاف اور اصل حقیقت

قوم کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جو زیادہ مجرم ہوں ان کو سزا دے دی جاتی ہے پس اس نفسیاتی اصول کے لحاظ سے بھی قرآن کریم کی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اور قوم میں ندامت پیدا ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے حضور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تسلی کے لئے ان پر ظاہر کر دیا کہ اُن کی قوم من حیث القوم تباہ نہیں کی جائیگی اس اعلان کے بعد جو آئمۃ الکفر تھے اُن کے لئے سزا تجویز کر دی گئی لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ نے سب کے قتل کا حکم دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فریاد پر جو پہلے دن مارے گئے تھے اُن کے سوا باقیوں کو چھوڑ دیا۔ یہ ترتیب نہ صرف غیر طبعی ہے بلکہ ظالمانہ بھی ہے کیونکہ قرآنی بیان کے مطابق تو عام طور پر قوم کو معاف کر دیا گیا تھا اور آئمۃ الکفر کو سزا دی گئی تھی۔ لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق پہلے دن ایک دوسرے کو بنی اسرائیل نے مارا۔ اتفاقاً جو پہلے دن مر گئے وہ مر گئے اور جو بعد میں بچ گئے چاہے وہ آئمۃ الکفر تھے یا عوام۔ اُن کو معاف کر دیا گویا سزا میں جُرم کی اہمیت کو بالکل مدنظر نہیں رکھا گیا صرف وقت کو مدنظر رکھا گیا کہ جو پہلے مارے گئے سو مارے گئے اور جو بعد میں بچ گئے سو بچ گئے۔ حالانکہ جو سزا شرعی قانون کے مطابق دی جاتی ہے اس میں اہمیتِ جُرم کو ضرور مدنظر رکھا جاتا ہے ہاں قانون طبعیت کے اصول اور ہیں۔ پس قرآن کریم کا بیان ہی انصاف اور عدل کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے نادانی اور رُعب کے ماتحت کام کیا تھا انکو تو معاف کر دیا اور جو بڑے بڑے مجرم تھے ان کو سزائیں دے دیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے مراد یہ نہیں کہ اپنے آپ کو مار دو بلکہ مُراد قوم کے مخصوص افراد یا سردار ہیں۔ قرآن کریم میں اسی سورۃ کی آیت ۸۵ میں آتا ہے وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (البقرۃ ع)

اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو حالانکہ مراد اپنی قوم کے لوگ ہیں کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے گھر سے نکالا نہیں کرتا۔ اسی طرح سورۂ توبہ آیت ۳۶ میں آتا ہے فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ (ع ۵) یعنی حرمت والے مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ اور مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو اسی طرح سورۂ نور میں آتا ہے فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً (ع ۹) جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنی جانوں کو سلام کہو اور مراد یہ ہے کہ تمہارے وہ بھائی جو ان مکانوں میں رہتے ہیں ان کو سلام کہو۔ پس فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کے معنے یہ ہیں کہ اپنے اعزاء و اقرباء کو قتل کرو جیسا کہ بائبل میں بھی مذکور ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شرک کے سردار ثابت ہوئے تھے اُن کے متعلق یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان کے بھائی یا دوست ہی اُن کو قتل کریں اس میں دو فائدے مدنظر تھے ایک تو یہ کہ جو قتل ہوا اس کو تو قتل کی سزا مل گئی اور جس نے قتل کیا اس کو بھی ایک رنگ میں سزا مل گئی کہ اسے اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی یا دوست کو مارنا پڑا اور اسکی موت کا نظارہ دیکھنا پڑا۔ دوسرا فائدہ اس میں یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی بُنیاد قبائل پر تھی اور جن قوموں کی بُنیاد قبائلی زندگی پر ہوتی ہے اُن میں رقابت بہت شدید ہوتی ہے اگر قتل کرنے والے غیر ہوتے تو بنی اسرائیل کے قبائل میں شدید دشمنی پیدا ہو جاتی اور وہ مقتول کی شرارت کو بھول جاتے اور یہی بات اُن کے دل پر غالب رہتی کہ ان کے ایک بھائی یا دوست کو فلاں غیر شخص نے قتل کر دیا تھا اور اُس کا کینہ اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے پس اللہ تعالیٰ نے مزید فتنہ سے بچانے کے لئے اُن کو یہ حکم دیا کہ قریبی اپنے قریبی کو اور دوست اپنے دوست کو خود مارے تاکہ ایک طرف تو اُس کے دل کو دُکھ پہنچ کر اسکی رُوحانی اصلاح ہو اور دوسری طرف اُس کا دل اپنے بھائیوں کے کینہ سے محفوظ رہے۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے اس حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا اور شائد انہوں نے کرنا ہی اس پر عمل کیا ہوگا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے طوعاً اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی صحبت میں رہنے والے لوگ اخلاق کے نہایت ہی اعلیٰ معیار پر پہنچ چکے تھے جنگ بنو المصطلق کے موقع پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے تو ایک جگہ پر ایک ہی کنُواں تھا اور پانی نکالنے والے زیادہ تھے جلدی کی وجہ سے بعض لوگوں میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اتفاق کی بات ہے یہ اختلاف ایک طرف انصار میں اور دوسری طرف مہاجرین میں ہؤا اور بغیر کسی ارادے کے دو پارٹیاں سی بن گئیں ایک طرف مہاجرین کا گروہ نظر آنے لگا اور ایک طرف انصار کا۔ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی ابن سلول نے جب یہ حالت دیکھی تو اس سے فائدہ اُٹھانے کا ارادہ کیا اور انصار کو مخاطب کر کے بڑے زور سے کہا تم نے خود ہی ان لوگوں کو سر پر چڑھا لیا ہے ورنہ ان کی حیثیت کیا تھی کہ ہمیں ذلیل کرتے۔ اب ذرا مدینے واپس پہنچ لینے دو لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون ع ۱) مدینے کا سب سے بڑا معزز آدمی یعنی عبداللہ بن ابی ابن سلول مدینہ کے سب سے ذلیل آدمی یعنی نعوذ باللہ من ذالک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وہاں سے نکال دیگا یہی وہ معنے تھے جو صحابہؓ نے لئے۔ ہو سکتا ہے کہ اسکی مراد یہ ہو کہ معزز قوم یعنی انصار ذلیل قوم یعنی مہاجرین کو نکال دیگی۔ مگر بات پھر بھی وہی آجاتی ہے۔ صحابہؓ میں گو اس وقت اختلاف اور جوش پیدا ہوا تھا مگر عبداللہ بن ابی ابن سلول کے مونہہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ اُن کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ انصار نے فوراً سمجھ لیا کہ ہمارے ایمان کی آزمائش کا وقت ہے انہوں نے جھگڑا وہیں ختم کر دیا اور مہاجرین کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ مہاجرین نے تو اس وجہ سے کوئی جوش نہ دکھایا کہ خود اُن کے ساتھ جھگڑا تھا مگر انصار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ اس فقرہ کے کہنے کے بعد عبداللہ بن ابی ابن سلول زندہ

اقتلوا انفسکم میں انفسکم سے مراد بنی اسرائیل کے مخصوص افراد یا سردار ہیں۔

بچھڑے کی پرستش کی تحریک کے لیڈروں کو ان کے رشتہ داروں سے قتل کرانے کی حکمت

رہنے کے قابل نہیں۔ عبد اللہ بن ابی ابن سلول کے بیٹے کو جب اس کا علم ہُوا تو اس نے بھی اپنے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ میرا باپ اب زندہ رہنے کے قابل نہیں اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ کو ■■ بات پہنچی ہے جو میرے باپ نے کہا ہے آپؐ نے فرمایا ہاں پہنچی ہے اس کے بعد اُس نے کہا یا رسول اللہ میرے باپ کے اس جرم کی سزا سوائے قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے مگر میں ایک عرض کرتا ہوں کہ جب آپؐ میرے باپ کے قتل کا حکم دیں تو میرے ہاتھ سے اُس کو قتل کروائیں کیونکہ یا رسول اللہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی اور شخص کے ہاتھ سے وہ قتل ہو اور میرا نفس کسی وقت مجھے یہ جوش دلائے کہ وہ سامنے میرے باپ کا قاتل جاتا ہے اُس سے بدلہ لے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا باپ میرے ہی ہاتھ سے قتل ہو جائے تا کسی مسلمان کا بغض میرے دل میں پیدا نہ ہو (سیرت ابن ہشام جلد ۲) دیکھو صحابہؓ کی نظر کیسی باریک بین تھی عبد اللہ بن ابی ابن سلول کا بیٹا اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے اس لئے قتل نہیں کرنا چاہتا کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک کی ہے وہ جانتا ہے کہ جرم خواہ کتنا ہی بڑا ہو بہر حال وہ اس کا باپ ہے۔ پس وہ اس جوش کی وجہ سے اسے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کرنا چاہتا کہ اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیوں ہتک کی۔ ■■ اُسے اس وجہ سے اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتا ہے تا کسی اور مسلمان بھائی کا بغض اس کے دل میں پیدا نہ ہو گویا بنی اسرائیل کو جس حکمت کی طرف وحی جلی سے خدا تعالیٰ کو توجہ دلانی پڑی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ آپ ہی آپ اپنے نورِ ایمان کی وجہ سے وحی جلی کے بغیر وحی خفی کی مدد سے اس نکتہ تک جا پہنچے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ اس میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں یعنی ائمۃ الکفر کو سزا دلانا تمہاری قوم کے لئے بہتر ہے کیونکہ تمہاری قوم کی قلبی حالت ایسی ہے کہ عفو اسکی اصلاح نہیں کر سکتا کسی قدر سزا اس کے ساتھ شامل ہونی چاہیئے اور دوسرے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بھائیوں سے بھائیوں اور دوستوں سے دوستوں کو مروانے میں تمہارے لئے بہتری ہے ورنہ تمہاری قوم اتنی مغلوب الغضب ہے کہ اگر غیروں کے ہاتھ سے انہیں قتل کروایا گیا تو تمہارے اندر انتقام کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔ پھر خدا تعالیٰ نے تمہارے اوپر فضل نازل کیا اور رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہُوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس جرم کو ان سزاؤں کے بعد بھلا دیا اور اگر تم مزید جرائم نہ کرتے تو خدا تعالیٰ تمہارے اس جرم کو کبھی یاد نہ دلاتا۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ وہ یقیناً بہت ہی فضل اور رحمت نازل کرنے والا ہے اور توبہ قبول کرنے والا ہے اور بار بار رحم کرنے والا ہے یعنی بعد کے واقعات خود تمہارے پیدا کردہ ہیں ورنہ اتنے عظیم الشان احسان کے موقع پر بنی اسرائیل کا اتنا خطرناک جرم اُس نے پُوری طرح معاف کر دیا تھا لیکن افسوس کہ انہوں نے جیسا کہ آئندہ واقعات ظاہر کرینگے خدا تعالیٰ کی اس عظیم الشان بخشش کی قدر نہ کی۔

جیسا کہ اوپر نوٹ میں خروج کے حوالہ سے بتایا جا چکا ہے بائبل کے بیان کے مطابق تین ہزار آدمی تھے جو اُس دن مارے گئے مگر یہ بات عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اگر صرف ائمۃ الکفر ہی اُن میں تین ہزار تھے تو قوم تو لاکھوں کی چاہیئے تھی لیکن اُس وقت کے بنی اسرائیل کا لاکھوں کی تعداد میں ہونا نہ تو تاریخ سے ثابت ہوتا ہے اور نہ واقعات اسکی اجازت دیتے ہیں آج اتنے سامانوں کی موجودگی میں دشت سینا میں سے لاکھوں کی قوم آسانی سے نہیں گذر سکتی تو اُس زمانہ میں جبکہ کوئی سامان موجود نہیں تھے یہ لاکھوں کی جمعیت جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے کس طرح گذر سکی تھی جہاں تک

فتاب علیکم [1]

انہ ھو التواب الرحیم کی تشریح [2]

آنحضرت صلعم کے صحابہ اور حضرت موسیٰ کے متبعین میں فرق [1]

بائیبل کا بچھڑے کی پرستش کے نتیجہ میں مقتولین کی تعداد کو تین ہزار قرار دینا مبالغہ ہے [2]

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

ہم تیری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہم اللہ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اس پر تمہیں ایک ہلاک کرنے والے عذاب نے

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ

پکڑ لیا اور تم (اپنی آنکھوں سے اپنے فعل کا انجام) دیکھ رہے تھے ۵۵ پھر ہم نے تمہاری ہلاکت کے

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور جہاں تک عقل شہادت دیتی ہے یہ ہجرت کرنے والے بنی اسرائیل صرف چند ہزار افراد تھے ممکن ہے تین قبائل میں سے چند آدمی مارے گئے ہوں اور بائبل کے مبالغہ نویسوں نے اُن کو تین ہزار بنا دیا ہو۔

۵۵ حل لغات۔ جَهْرَةً :۔ اَلْجَهْرَةُ کے معنے ہیں مَا ظَهَرَ جو چیز سامنے نظر آ رہی ہو اور آیت لَنْ نُّؤْمِنَ الخ میں جَهْرَةً کے معنی ہیں عَيَانًا غَيْرَ مُسْتَتِرٍ یعنی کھلم کھلا۔ ظاہر۔ (اقرب)

اَلصَّاعِقَةُ :۔ اَلصَّاعِقَةُ کے معنی کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۰۔

تفسیر۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بعض ضدی لوگ جب دلائل اور براہین کا جواب نہیں دے سکتے تو ایسی شرائط لگانے لگتے ہیں جو بے فائدہ ہوں اور جن سے سوائے بات ٹالنے کے اور کچھ مقصود نہ ہو اس زمانہ میں بھی بہت سے لوگ ہیں کہ جب ہستی باری تعالیٰ کو دلائل سے ثابت شدہ دیکھتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو تب تک نہ مانیں گے جب تک خدا کو نہ دیکھ لیں۔ بنی اسرائیل میں سے بھی معلوم ہوتا ہے ایک جماعت نے حضرت موسیٰ سے ایسا مطالبہ کیا گو بائبل میں اس کا ذکر نہیں لیکن یہ ایک ایسا عام سوال ہے جو قریباً ہر زمانہ میں صداقت کے مقابلہ میں ہوتا آ رہا ہے اور اس بات کی صداقت میں مخالف قرآن کریم بھی شک نہیں کر سکتے چونکہ قرآن کریم خود الٰہی کلام ہونے کا مدعی ہے اس لئے ضروری نہیں کہ بائبل کے بیان کردہ امور سے زائد کسی واقعہ کا ذکر نہ کرے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں خدا تعالیٰ دکھا دو عذاب نازل ہوا مگر حضرت موسیٰ نے بھی تو رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ کہا تھا (اعراف آیت ۱۴۴ ع ۱۷) یعنے اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا تا میں بھی تجھے دیکھوں لیکن اُن پر غضب نازل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے تو محبت کے تقاضے سے سوال کیا اور ان لوگوں نے یہ شرط لگا دی کہ ہم تو اُس وقت ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو دیکھ نہ لیں اور یہ گستاخی اور شرارت ہے اس لئے خفگی کا الہام ہوا۔ اگر حق کو قبول کر کے رؤیت کا سوال کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان پر بھی ناراضگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

صَاعِقَه کے معنے عربی زبان میں عذاب کے ہیں لسان العرب جلد ۱۲ میں لکھا ہے قِیْلَ اَلصَّاعِقَةُ :۔ اَلْعَذَابُ یعنی اہل لغت کہتے ہیں کہ صاعقہ عذاب کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کی باریک تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق خصوصاً ایسے عذابوں پر ہوتا ہے جن کے ساتھ سخت آواز ہو جیسے زلزلہ یا بجلی یا بادو تند کا عذاب۔ کبھی صاعقہ کے معنے موت یا غشی کے بھی ہوتے ہیں لیکن اصل معنے وہی ہیں جو اوپر لکھے گئے اور موت اور غشی کے معنے صرف اس [illegible] رواج پا گئے کہ اکثر خطرناک عذابوں کا نتیجہ موت یا غشی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں صاعقہ کا لفظ زیادہ تر عذاب کے ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرمایا ہے فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (سورۃ حٰم سجدہ ع آیت) یعنے اگر یہ لوگ تیری باتوں سے اعراض کریں تو تو اُن کو کہدے

اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے متعلق لیکھری قسم کے دو سوال اور ان میں فرق

جهرة

اخذتکم الصاعقۃ میں صاعقہ سے مراد

بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ

بعد تمہیں اس لئے اُٹھایا کہ تم شکر گذار بنو ۵۶ اور ہم نے تم پر

کہ میں تمہیں ایسے صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عاد وثمود کے صاعقہ کی طرح ہوگا اور آگے چل کر عاد کے صاعقہ کی یہ تشریح کی ہے کہ انہیں ایک بادِ تند کے عذاب کے ساتھ سزا دی گئی تھی۔ اسی طرح ثمود کے صاعقہ کی تشریح سورۂ اعراف غ آیت ۷۹ میں یُوں بیان فرمائی ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ کہ ثمود کی قوم ایک سخت زلزلے سے تباہ کی گئی تھی پس معلوم ہُوا کہ قرآن کریم میں صاعقہ بمعنے عذاب استعمال ہوتا ہے اور آیت زیر تفسیر میں بھی اس سے عذاب ہی مراد ہے۔

۵۶ حل لغات۔

بَعَثْنَا بَعَثَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور بَعَثَهٗ (يَبْعَثُ) بَعْثًا کے معنے ہیں اَرْسَلَهٗ اس کو بھیجا نیز کہتے ہیں بَعَثَهٗ بَعْثًا اور مطلب یہ ہوتا ہے اَثَارَهٗ وَهَيَّجَهٗ اس کو برانگیختہ کیا اور جوش دلایا اور جب بَعَثَهٗ عَلَى الشَّيْءِ کہیں تو اس کے معنی ہونگے حَمَلَهٗ عَلٰى فِعْلِهٖ اس کو کسی کام کے کرنے پر آمادہ کیا جب بَعَثَ کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اور کہیں کہ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى تو اس کے معنے ہونگے اَحْيَاهُمْ اللہ تعالیٰ نے مُردوں کو زندہ کیا اور اَلْبَعْثُ کے معنے ہیں اَلنَّشْرُ، اُٹھانا (اقرب) پس بَعَثْنَاكُمْ کے معنے ہونگے ہم نے تم کو اُٹھایا۔

بَعَثْنَا

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ سے مراد جہالت کے بعد علم نو تلخ زندگی کے بعد آرام دہیا کرنا۔

مَوْتِكُمْ۔ اَلْمَوْتُ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۹

تَشْكُرُوْنَ۔ شَكَرَ (يَشْكُرُ) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور شُکر کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵۳

تفسیر۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ۔ آیت ماقبل کے ساتھ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے ذلت و تکلیف کے بعد تمہاری حالت کو ترقی دی اور تمہیں معزز بنایا۔ پہلی آیت کے الفاظ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ درانحالیکہ تم دیکھتے تھے۔ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مُردے نہیں تھے۔ قبل ازیں نوٹ ۲۹ و ۲۹ میں موت کے مندرجہ ذیل چھ معنے لغت سے بتائے جا چکے ہیں (۱) قوتِ نشوونما کا زائل ہوجانا (۲) قوت حس کا مرجانا (۳) قوت ادراک کا نہ ہونا یعنی جہالت (۴) تکالیف اور دکھوں والی زندگی۔ تلخ زندگی (۵) نیند (۶) رُوح جسم عنصری سے جُدا ہونا۔ ان مذکورہ معنوں میں سے یہاں صرف ۳-۴ چسپاں ہوتے ہیں یعنی قوتِ ادراک کا نہ ہونا اور زندگی کا تلخ ہوجانا۔ اور آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ حقیقی طور پر مرجانے کے بعد زندہ کئے گئے تھے بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر کیا گیا تھا ہم نے اسے دُور کرکے پھر تم پر فضل کرنا شروع کردیا اور پہلے عذاب کی وجہ سے جو موت کی سی حالت تم پر طاری ہوگئی تھی اس کو ایک نئی روحانی اور دنیوی زندگی سے بدل دیا۔

بعض مسلمان مفسرین نے اس کے معنے رُوح کے جسم سے خارج کرنے کے لئے ہیں لیکن حقیقی موت انہوں نے بھی مُراد نہیں لی چنانچہ اس آیت کے متعلق قتادہ جو مشہور مفسر قرآن ہیں ان کا یہ قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ مَاتُوْا وَذَهَبَتْ اَرْوَاحُهُمْ ثُمَّ رُدُّوْا لِاسْتِيْفَاءِ اٰجَالِهِمْ (قرطبی جزو اول ص۴۰۴) یعنی حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ مر گئے اور انکی رُوحیں نکل گئیں پھر انکی رُوحیں واپس لائی گئیں تاکہ وہ اپنی مقدر زندگی کے باقی دن اس دُنیا میں پُورے کریں۔ ابن کثیر نے ربیع ابن انس سے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے (ابن کثیر جلد اول) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت قتادہ کے نزدیک وہ حقیقی موت نہیں تھی کیونکہ حقیقی موت تو زندگی کے دن پورا کرلینے کے بعد آتی ہے۔ زندگی کے دن پورے ہونے سے پہلے جو رُوح نکلے گی وہ تو عارضی طور پر ہی نکلے گی۔ بعض نے کہا ہے کہ موت سے مُراد حرکت کا بند ہونا ہے چنانچہ لکھا ہے وَ

قِيْلَ مَا تُوْا مَوْتَ هُمُوْدٍ يَعْتَبِرُ بِهِ الْغَيْرُ ثُمَّ اُرْسِلُوْا (قرطبی جز اول ۴۰۳) یعنی وہ اس طرح مرگئے کہ حرکت وغیرہ بند ہوگئی اور ایسی حالت اُن کی ہوگئی کہ اس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔ پھر ان کو کھڑا کر دیا گیا اور بعضوں نے کہا ہے کہ عَلَّمْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ جَهْلِكُمْ (قرطبی جلد اول ۴۰۳) اس سے مُراد یہ ہے کہ ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں علم دیا۔ یعنی تم نے یہ جو جاہلانہ سوال کیا تھا کہ خدا ہم کو سامنے نظر آجائے اس سے تمہاری روحانیت مرگئی تھی اور تم پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی نازل ہوئی تھی۔ ہم نے پھر اس ناراضگی کو دُور کر دیا اور تم کو صحیح رُوحانی علم عطا فرمایا جس کی وجہ سے تم کو ایک نئی روحانی زندگی مل گئی یہ معنی بھاسے کئے ہوئے معنوں کے بہت قریب ہیں۔

بعض مفسّرین نے اس عذاب کا تعلق پہلے بچھڑے کی پُوجا سے قائم کیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ یہاں واضح الفاظ میں بنی اسرائیل کا ایک اور جُرم مذکور ہے یعنی ان کا یہ قول کہ ہم کبھی بھی موسیٰ کی بات نہیں مانیں گے جب تک خدا ہم کو سامنے نہ نظر آجائے۔ دوسرے یہاں جو سزا مذکور ہوئی ہے وہ بچھڑے والی سزا سے مختلف ہے پس معلوم ہُوا کہ وہ واقعہ اور ہے اور یہ واقعہ اور ہے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کا ذکر ہے نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا۔ اور مراد یہ ہے کہ جب تک خدا ہمیں نظر نہ آجائے ہم تیری فرمانبرداری نہیں کریں گے۔ پس وہ اس موقعہ پر موسیٰ کی نبوت میں شک نہیں کرتے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت سے اس وقت تک انکار کرتے ہیں جب تک کہ ان کو وہی درجہ نہ دے دیا جائے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ سے بالمشافہ گفتگو کرنے سے حاصل تھا۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ موت سے مُراد درحقیقت حقیقی موت نہیں اور حق یہ ہے کہ اگر حقیقی موت مراد لی جائے تو اوّل تو قرآن کریم کی دوسری آیات کی تردید ہوتی ہے جن میں اِس دُنیا میں مُردوں کے واپس آنے سے انکار کیا گیا ہے مثلاً سورۃ مؤمنوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (ع ۶) یعنی جب اُن میں سے کسی پر موت کا وقت آتا ہے تو کہتا ہے اے میرے رب مجھے لوٹا دے تاکہ مَیں دُنیا میں واپس جاکر اپنے اموال و جائداد کے ذریعہ سے اچھے عمل کروں۔ فرماتا ہے ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں ایسا کبھی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا یہ صرف ایک بات ہے جو وہ مُنہ سے نکال رہا ہے یہ کبھی پُوری نہیں ہوسکتی۔ ان مرنے والوں کے پیچھے تو ایک برزخ ہے جو قیامت کے دن تک چلی جائیگی اس آیت سے ظاہر ہے کہ مرنے والا اس دُنیا میں واپس نہیں آسکتا جو حیات انسان کو ملے گی اسکی تکمیل اس دن ہوگی جبکہ اگلے جہان کی زندگی کا نیا دَور شروع ہوگا۔ اس کے علاوہ عقلی اعتراضات بھی اس دوبارہ زندگی پر پڑتے ہیں مثلاً ایک اعتراض یہی ہے کہ اگر کوئی شخص مرکر دوبارہ زندہ ہوگا تو اس کا ایمان طوعی نہیں ہوگا بلکہ اضطراری ہو جائے گا۔ اس دُنیا میں ایمان کے لئے ایک حد تک اخفاء کا ہونا ضروری ہے اسکی وجہ سے انبیاء کے معجزات میں ایک حد تک اخفاء کا پہلو قائم رکھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے لوگ انبیاء کے نہایت ہی کھلے اور ظاہر معجزات پر بھی اعتراضات کرتے چلے جاتے ہیں مگر دُنیا کی چیزوں کے مشاہدہ کی طرح ایمان کے معاملات بھی سائنٹفک تجربات کے اصول پر آجائیں تو ان پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ رہے اور کافر و مومن ان کو ماننے پر مجبور ہو جائیں اور ایمان سے جو فائدہ مطلوب ہے وہ جاتا رہے۔ پس مُردے کا واپس دُنیا میں آنا ایمان کی غرض کو باطل کرتا ہے اور کم سے کم اُنہیں زندہ ہونے والے کے لئے تو ایمان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی یہ شبہ پہلے مفسرین کے دلوں میں بھی پیدا ہُوا ہے چنانچہ علامہ ماوردی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایسے مُردے جو واپس آئیں آیا وہ اعمال

۲۱ بچھڑے کی پرستش کرنے والوں پر جو عذاب نازل ہُوا اس سے وہ حقیقی موت نہ مرے۔

الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ

بادلوں کا سایہ کیا اور تمہارے لئے مَن اور سلویٰ اتارے۔ (اور کہا کہ) ان

طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ۔ اور انہوں نے (نافرمانی کر کے) ہمارا نقصان نہیں کیا بلکہ

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ

وہ اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔ ۵۸؎ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل

کے مکلّف ہونگے یا نہیں کیونکہ وہ تو مر چکے اور حقیقت کا انکشاف ان پر ہو چکا چنانچہ وہ لکھتے ہیں وَ اخْتُلِفَ فِیْ بَقَاءِ تَكْلِيْفِ مَنْ اُعِيْدَ بَعْدَ مَوْتِهٖ وَمُعَايَنَتِهِ الْاَحْوَالَ الْمُضْطَرَّةَ اِلَى الْمَعْرِفَةِ عَلٰى قَوْلَيْنِ اَحَدُهُمَا بَقَاءُ تَكْلِيْفِهِمْ لِئَلَّا يَخْلُوَ عَاقِلٌ مِنْ تَعَبُّدٍ۔ اَلثَّانِیْ۔ سُقُوْطُ تَكْلِيْفِهِمْ مُعْتَبَرًا بِالْاِسْتِدْلَالِ دُوْنَ الْاِضْطِرَارِ (قرطبی جلد اول صفحہ ۴۰۴) ماوردی کہتے ہیں کہ جو لوگ موت کے بعد زندہ ہوں اور ان حالات کو آنکھوں سے دیکھ لیں جو انسان کو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں تو ان کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا عبادت اُن پر واجب رہتی ہے یا نہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اُن پر واجب رہتی ہے تا کوئی عاقل بھی عبادت سے باہر نہ رہے یعنی جہاں تک اُن کے نفس کا تعلق ہے بیشک عبادات اُن کو فائدہ نہیں دیتیں لیکن اس لئے کہ دوسرے لوگوں کو ٹھوکر نہ لگے اُن کے لئے بھی عبادت کرتے رہنا ضروری ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اُن پر سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں کیونکہ اعمال کے لئے مکلّف کیا جانا اسی وقت تک مفید ہو سکتا ہے جبکہ اعمال کی بنیاد استدلال پر ہو۔ نہ کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو کہ مضطر اور مجبور کر کے ان پر عمل کروائے۔

اس شبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پُرانے مفسرین اور علماء کے دلوں میں بھی یہ شبہ موجود تھا کہ مُردوں کا اس دنیا میں واپس آنا شریعت کے بعض اور مسائل کو باطل کر دیتا ہے گو انہوں نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے کوشش کی ہے مگر جیسا کہ ظاہر ہے وہ کوشش ناکام رہی ہے اور تسلی بخش نہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ حقیقی مُردے اِس دُنیا میں زندہ ہو کر واپس نہیں آتے اور اس آیت میں یا اور جس آیت میں بھی مُردوں کے زندہ ہونے کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس کے معنے حقیقی احیاءِ موتیٰ کے نہیں ہو سکتے بلکہ یا روحانی مردے کا زندہ ہونا۔ یا مردے جیسی حالت کو پُہنچے ہوئے مریض کا اچھا ہونا۔ یا گری ہوئی قوم کا دوبارہ ترقی پانا یا کفر کی حالت کا ایمان کی حالت سے بدل جانا یا اور اسی قسم کے کسی تغیر کا پایا جانا ہی مراد ہے۔

۵۸؎ حلّ لغات:۔ ظَلَّلْنَا۔ ظَلَّلَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور ظَلَّلَهٗ تَظْلِيْلًا کے معنے ہیں غَشِيَهٗ وَاَلْقٰى عَلَيْهِ ظِلَّهٗ اس کو ڈھانپ لیا اور اس پر اپنا سایہ ڈال دیا اور جب ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ کہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ سَخَّرْنَاهُ لِيُظِلَّهُمْ ہم نے بادل کو ان پر سایہ کرنے کی خدمت پر لگا دیا۔ (اقرب)

ظَلَّلْنَا [1]

اَلْغَمَامُ:۔ اَلْغَمَامُ کے معنی اَلسَّحَابُ بادل وَقِيْلَ الْاَبْيَضُ اور بعض نے کہا ہے کہ غمام سفید بادلوں کو ہی کہیں گے اور بادل کو غمام کہنے کی یہ وجہ ہے کہ غَمٌّ کے معنی ڈھانپنے کے ہیں اور بادل بھی آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے اس کی جمع غَمَائِمُ آتی ہے۔ (اقرب)

اَلْغَمَام [2]

اَلْمَنُّ:۔ مَنَّ يَمُنُّ کا مصدر ہے چنانچہ کہتے

ہیں مَنَّ عَلَيْهِ بِالْعِتْقِ وَغَيْرِهٖ يَمُنُّ) مَنًّا اَیْ اَنْعَمَ عَلَيْهِ بِهٖ مِنْ غَيْرِ تَعَبٍ وَّلَا نَصَبٍ وَاصْطَنَعَ عِنْدَهٗ صَنِيْعَةً وَاِحْسَانًا کسی پر اس کی محنت و مشقت کے بغیر انعام کیا اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا احسان کیا نیز اَلْمَنُّ کے معنے ہیں كُلُّ مَا يَمُنُّ اللّٰهُ بِهٖ مِمَّا لَا تَعَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کسی شخص کو محنت اور مشقت کے بغیر عطا فرماوے وہ مَنّ کہلاتی ہے كُلُّ طَلٍّ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ عَلٰى شَجَرٍ اَوْ حَجَرٍ وَيَحْلُوْ وَيَنْعَقِدُ عَسَلًا وَيَجِفُّ جَفَافَ الصَّمْغِ كَالشِّيْرَخُشْتِ وَالتُّرُنْجَبِيْنِ۔ ہر وہ شبنم جو آسمان سے درختوں اور پتھروں پر اُترتی ہے اور وہ میٹھی ہوتی ہے اور پھر شہد کی طرح گاڑھی ہو جاتی ہے اور گوند کی طرح سوکھ کر ایسی ہو جاتی ہے مثلاً شیرخشت اور ترنجبین (اقرب)

اَلسَّلْوٰی:۔ اَلسَّلْوٰی کے معنی ہیں اَلْعَسَلُ شہد كُلُّ مَا سَلَاكَ ہر وہ چیز جو تسلی کا موجب ہو۔ طَائِرٌ اَبْيَضُ مِثْلُ السُّمَانٰی بیٹر کی مانند سفید پرندے (مفرد سَلْوَاةٌ آتا ہے) وَقِيْلَ اَلسَّلْوٰی:۔ اَللَّحْمُ اور بعض نے کہا ہے کہ سَلْوٰی گوشت کو کہتے ہیں اور اسکی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے لِاَنَّهٗ يُسَلِّی الْاِنْسَانَ عَنْ سَائِرِ الْاِدَامِ کہ جب گوشت دسترخوان پر آئے تو یہ باقی سالنوں کی جگہ کافی ہو جاتا ہے اور دوسرے سالنوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلسَّلْوٰی اَصْلُهَا مَا يُسَلِّی الْاِنْسَانَ۔ سَلْوٰی کے اصل معنے تو اس چیز کے ہیں جو انسان کو تسلی دے۔ يُقَالُ سَلَيْتُ عَنْ كَذَا اِذَا زَالَ عَنْكَ مَحَبَّتُهٗ چنانچہ سَلَيْتُ عَنْ كَذَا کے معنی ہیں کہ میں فلاں مرغوب چیز کو بھول گیا اور دل میں اسکی خواہش نہ رہی (مفردات) پس اقرب والے نے جو گوشت کو سَلْوٰی کہا ہے وہ اس لئے ہے کہ گوشت کے ملنے کی وجہ سے دوسرے سالنوں کی طرف رغبت نہیں رہتی۔

طَيِّبَاتٌ:۔ طَيِّبَاتٌ طَيِّبَةٌ کی جمع ہے اور طَيِّبَةٌ طَيِّبٌ سے مؤنث کا صیغہ ہے جو طَابَ سے بنا ہے اور طَابَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں لَذَّ وَزَكَا وَحَسُنَ وَحَلَا وَجَلَّ وَجَادَ کہ کوئی چیز مرغوب پاکیزہ عمدہ خوبصورت دلربا اور دل بھانے والی ہو گئی (اقرب) طَيِّبٌ کے معنے ہیں ذُو الطِّيْبَةِ جس کے اندر لفظ طَابَ کے معنی کے ضمن میں بیان شدہ تمام صفات ہوں۔ خِلَافُ الْخَبِيْثِ جو گندہ ردی اور فاسد نہ ہو۔ اَلْحَلَالُ حلال (اقرب) مفردات میں ہے اَصْلُ الطَّيِّبِ مَا تَسْتَلِذُّهُ الْحَوَاسُّ وَمَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ کہ طیب کے اصل معنے تو یہ ہیں کہ جس سے حواس انسانی اور نفس انسانی لذت اٹھائے وَالطَّعَامُ الطَّيِّبُ فِی الشَّرْعِ مَا كَانَ مُتَنَاوَلًا مِنْ حَيْثُ مَا يَجُوْزُ وَبِقَدْرِ مَا يَجُوْزُ وَمِنَ الْمَكَانِ الَّذِیْ يَجُوْزُ اور شریعت کی رو سے طیب اس چیز کو کہیں گے جو جائز طریقہ اور مناسب و جائز اندازے کے مطابق اور جائز جگہ سے حاصل کی جائے (مفردات)

رَزَقْنٰكُمْ:۔ رَزَقْنَا رَزَقَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے رَزَقَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا۔

ظَلَمُوْنَا:۔ ظَلَمُوْا ظَلَمَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ظَلَمَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۔

تفسیر۔ گنتی باب ۹ آیت ۱۷ تا ۲۲ میں لکھا ہے "اور جب مسکن پر سے بدلی اٹھائی جاتی تھی تو بنی اسرائیل کوچ کرتے تھے۔ اور جہاں بدلی آ کے ٹھہرتی تھی وہاں بنی اسرائیل خیمے کھڑے کرتے تھے۔ خداوند کے حکم سے بنی اسرائیل کوچ کرتے تھے اور خداوند کے حکم سے مقام کرتے تھے۔ اور جب تک کہ بدلی مسکن پر ٹھہرتی تھی خیموں میں رہتے تھے اور جب بدلی مسکن پر بہت دنوں تک ٹھہری رہی تو بنی اسرائیل خداوند کے حکم پر لحاظ کرتے رہے اور کوچ نہ کیا اور ایسے ہی جب بدلی تھوڑے دنوں تک مسکن پر رہی وے خداوند کے حکم سے اپنے خیموں میں رہے اور خداوند کے حکم سے انہوں نے کوچ کیا۔ اور جب شام سے صبح تک بدلی ٹھہری رہی اور صبح ہوتے ہی جب بلند ہوئی۔ تو وہیں انہوں نے کوچ کیا۔ جب بدلی بلند

ل اَلْمَنّ

ل طیبات

ے السلوٰی

ے بائیبل میں بنی اسرائیل یا بیابان میں دن کے سایہ کرنیکا ذکر

ہوتی خواہ دن ہوتا خواہ رات وے کوچ کرتے تھے۔ اور جب بدلی مسکن پر ٹھہری رہتی خواہ دو دن خواہ ایک مہینہ۔ خواہ ایک برس۔ بنی اسرائیل اپنے خیموں میں مقیم رہتے اور کوچ نہ کرتے پر جب وہ بلند ہوتی تب وہ کوچ کرتے۔ نیز دیکھو گنتی باب ۹ آیت ۱۵ تا ۲۳ و خروج باب ۴۰ آیت ۳۴ تا ۳۸)

[2] مَنّ کی تشریح

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ بنی اسرائیل خیمہ زن ہوتے تھے وہاں بادل پھیل کر سایہ کر لیتے تھے۔ جب اُن کے سفر پر روانہ ہونے کا دن آتا تو پھر بادل اوپر چڑھ جاتے لیکن قرآن شریف کے الفاظ اور سیاق سے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں کے گھر آنے سے بارش ہونا مُراد ہے کیونکہ عام طور پر برسنے والے بادل گھنے اور تاریک ہوتے ہیں۔ پس یا تو قرآن کریم اس جگہ بائبل کے بیان کی تردید کرتا ہے یا دوسرے واقعہ کا بیان کرتا ہے جس کا ذکر بائبل میں نہیں۔ میرے نزدیک اس جگہ تردید ہی ہے کیونکہ بائبل نے جس طرح بادلوں کا ذکر کیا ہے وہ غیر معقول اور ساتھ ہی غیر ضروری بھی ہے بنی اسرائیل کو کسی جگہ ٹھہرانے کے لئے انہیں چاروں طرف سے بادلوں سے گھیر لینے کی کیا ضرورت تھی موسیٰ علیہ السلام کو الہام ہو جانا کافی تھا۔

[1] بادلوں سے سایہ کرنے سے مراد بنی اسرائیل کو بارش کے ذریعہ پانی مہیا کرنا

بادلوں کے ساتھ قرآن شریف دو اور کھانے والی چیزوں مَنّ و سَلوٰی کا بھی ذکر فرماتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ویرانے جنگل میں پانی کی طرح کھانے کی بھی قلت تھی اللہ تو گھنے بادل بھیجکر اوں کی پیاس بجھاتا تھا اور مَنّ و سلوٰی سے اُنکی بھوک دُور فرماتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تکالیف دور کرنے اور ان کی آسایش و آرام بڑھانے کے لئے خاص انعامات ظاہر فرماتا ہے یہ اُس کی عادت زمانۂ گذشتہ ہی کے لئے نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں بھی وہ اپنے مقبول بندوں کے لئے انعام و برکات اسی طرح نازل فرماتا ہے اِس کے یہ معنے کرنے کہ ہر وقت ان پر بادلوں کا سایہ رہتا تھا درست نہیں کیونکہ ہر وقت ابر کا رہنا تو بجائے نعمت کے مصیبت ہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ جنگل میں رہتے تھے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ ان پر بادل برساتا تھا جس سے وہ پیاس بجھاتے تھے اور دوسری ضرورتیں پوری کرتے تھے۔

[2] مَنّ ملنے کا ذکر بائبل میں

مَنّ کے لغوی معنے اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ ترنجبین یا ہر وہ چیز جو بغیر محنت کے ملے اُسے مَنّ کہتے ہیں۔ یہ اپنے مخصوص معنوں میں گوند کی قسم کی ایک چیز ہے جو بعض درختوں پر جم جاتی ہے اور مزے میں شیریں ہوتی ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ترنجبین ہے۔ ترنجبین کے نام پر جو دوا ہندوستان میں ملتی ہے اُس میں سے اکثر مصنوعی ہوتی ہے اصل مَنّ دشتِ سیناء، شام اور عراق کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ایک دوست عراق سے میرے لئے مَنّ تحفۃً لائے تھے مصنوعی بھی اور اصلی بھی۔ مصنوعی تو ویسی ہی تھی جیسے ہندوستان میں ترنجبین ہوتی ہے لیکن اصلی مَنّ کائی کے پتوں کا ایک ڈلا سا معلوم ہوتا تھا مجھے اس دوست نے بتایا کہ یہ رطوبت ان چھوٹے چھوٹے پتوں سے جو درختوں کی جڑوں پر اُگ آتے ہیں ملی ہوئی ہوتی ہے اور لوگ ان پتوں سمیت اسے اکٹھا کر لیتے ہیں پھر گرم کر کے چھان لیتے ہیں اور پتوں کو پھینک دیتے ہیں۔ جو شیرینی ان میں سے نکلتی ہے اس میں بادام اور پستہ وغیرہ ڈال کر اسکی مٹھائی بنانے کا عربوں میں رواج ہے میں نے بھی اسے صاف کروایا تو اس میں سے شہد کی طرز کی ایک چیز نکلی۔ رنگ اس کا بھورا سا تھا۔ مَنّ کا ذکر بائبل میں خروج باب ۱۶ آیت ۱۳ تا ۱۵ میں آتا ہے وہاں لکھا ہے۔

"اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے پالا کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کے آپس میں کہا کہ مَنّ ہے کیونکہ انہوں نہ جانا کہ وہ کیا ہے تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے۔"

اس حوالہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز زمین پر گری تھی لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے عرب اور شام کے لوگ جہاں یہ مَنّ پیدا ہوتی ہے اُنکی یہ گواہی ہے کہ یہ درختوں پر گرتا ہوئی

یا درختوں سے نکلی ہوئی ایک رطوبت ہے جو شیرین ہوتی ہے ممکن ہے دشتِ سینا میں جن درختوں کی جڑوں میں سے یہ مَنّ نکلتی ہو یا جنگی جڑوں پر گرتی ہو اُن پر کائی تہ ہوتی ہو اور مصفیٰ ڈلیاں الگ الگ جم جاتی ہوں بہر حال جو مَیں نے دیکھی ہے اور جو عراق میں پائی جاتی ہے وہ تو کائی کے ساتھ مِلی ہوئی ہوتی ہے اور اسے گرم کر کے الگ کیا جاتا ہے۔

مَنّ کے معنے جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں بلا محنت و مشقت ملنے والی چیز کے بھی ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے اِس لفظ کا تمام ایسی چیزوں پر اطلاق ہو سکتا ہے جو بغیر محنت کے مِل جاتی ہیں چنانچہ حدیث میں آتا ہے اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی مُوْسٰی (مسلم جلد سوم کتاب الاشربہ باب فضل الکمأۃ) یعنی کھمبی بھی مَنّ کی اُن اقسام میں سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ اس حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ مَنّ کسی خاص چیز کا نام نہیں بلکہ کئی ایسی چیزیں جو کھانے کے کام آتی ہیں اور جنگلوں میں خودرَو یا بغیر کوشش کے پڑی ہوئی مِل جاتی ہیں اُن سب کو مَنّ کہتے ہیں پس کھمبی بھی مَنّ کی قسموں میں سے ہے ترنجبین بھی مَنّ کی قسموں میں سے ہے اسی طرح بیر یا پیلو وغیرہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو کھانے کے کام میں آسکتی ہیں پیٹ بھرتی ہیں۔ غذائیت کا کام دیتی ہیں جہاں جہاں پائی جاتی ہیں کثرت سے مِل جاتی ہیں اور جنگلوں میں چلنے والے قافلے بعض دفعہ ہفتوں ان پر گذارہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ہجرت کے سالوں میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سے یہ اشیاء جنگل میں پیدا کر دی تھیں جن کو بنی اسرائیل کھاتے تھے اور پیٹ بھر لیتے تھے۔ اسی طرح آٹا اور چاول وغیرہ جو خرید کرنے والی اشیاء ہیں ان کی اُنہیں بہت کم ضرورت پیش آتی تھی۔

سَلْوٰی۔ سلوٰی کے معنے بھی مَنّ کی طرح ایک عام ہیں اور ایک خاص۔ اس کے عام معنے تو ہر اُس چیز کے ہیں جو تسلّی دینے والی ہو اور خاص معنوں کے لحاظ سے وہ ایک پرندے کا بھی نام ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے اور شہد کو بھی سلوٰی کہتے ہیں۔ بائبل میں اس کا ذکر گنتی باب ۱۱ آیت ۳۱ تا ۳۴ میں آتا ہے وہاں لکھا ہے۔

"تب خداوند کی طرف سے ایک ہوا اُٹھی اور دریا سے بٹیر اُڑا لائی اور انہیں خیمہ گاہ پر اور خیمہ گاہ کے گرداگرد اِدھر اُدھر ایک دن کی راہ تک پھیلایا۔ ایسا کہ وہ زمین پر دو ہاتھ بلند ہوا تب لوگ اُس سارے دن اور اُس ساری رات اور اس کے دوسرے دن بھی کھڑے رہے اور بٹیر جمع کیا کئے اور جس نے کم سے کم جمع کئے دس خومر (نصف من) تھے اور انہوں نے اپنے لئے خیمہ گاہ کے آس پاس اُنہیں پھیلا دیا اور ہنوز اُن کے دانتوں تلے گوشت تھا پہلے اس سے کہ وے اُسے چابیں خداوند کا غصہ ان لوگوں پر بھڑکا اور خداوند نے ان لوگوں کو بڑی مری سے مارا اور اُس نے اس مقام کا نام قبرات التہاوہ (حرص کی قبریں) رکھا کیونکہ انہوں نے اُن لوگوں کو جنہوں نے حرص کی تھی وہیں گاڑا۔"

[1] بنی اسرائیل کو مَنّ ملنے سے مراد

چونکہ بنی اسرائیل مدتوں تک فراعنۂ مصر کی غلامی میں رہے تھے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انہیں جنگل میں آزاد رکھ کر اُن میں جرأت اور بہادری کے اخلاق پیدا کرے اس لئے بجائے جلد سے جلد کنعان پہنچانے کے اُن کو ایک عرصہ تک دشتِ سینا اور اس کے اِرد گرد کے علاقہ میں رکھا اور اُن کے لئے ایسی غذائیں جو بلا تعب اور بغیر محنت کے ملتی تھیں مہیا فرما دیں کچھ شیریں کچھ نمکیں۔ کچھ ٹھوس۔ کچھ ہلکی۔ کچھ پکانے والی کچھ کچی کھانے والی تاکہ ذوق کو بھی ان سے تسلّی حاصل ہو اور معدہ بھی بھرے اور صحت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی پوری طرح میسر آجائیں جیسا کہ مَیں بیان کر چکا ہوں مَنّ میں پھل، کھمبیاں اور ترنجبین وغیرہ شامل ہیں اور سَلْوٰی میں پرندے۔ شہد اور وہ تمام ایسی غذائیں جو کہ قلب کو تسکین دیتی ہیں شامل ہیں۔ پس بادل نازل کر کے پانی مہیا فرما دیا گیا۔ مَنّ نازل کر کے پھل اور سبزی ترکاری کی قسم کی غذائیں مہیا کر دی گئیں اور سَلْوٰی نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے گوشت کی ضرورت کو مہیا کر دیا۔

[2] بنی اسرائیل کو سلوٰی ملنے سے مراد

یہاں اَنْزَلْنَا کا لفظ بھی غور کے قابل ہے نُزُوْل

کا لفظ اعزاز و احترام کے لئے یا غیر معمولی حالات کے مطابق کسی چیز کے مہیا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے مَنّ اور سَلْوٰی آسمان سے نہیں اُترتے تھے۔ زمین کی ہی چیزیں تھیں اور زمین پر ہی پیدا ہوتی رہتی تھیں ان کے لئے نزول کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ غیر معمولی حالات میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ چیزیں مہیا کر دی تھیں۔ جو لوگ آنے والے مسیح کے متعلق نزول کے الفاظ پڑھ کر قسم قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں اُنہیں قرآن کریم کے یہ محاورات بھی مدّنظر رکھنے چاہئیں۔ اگر زمین میں پیدا ہو کر مَنّ وسلوٰی کے لئے نزول کا لفظ آسکتا ہے تو زمین میں ہی پیدا ہو کر مسیح کے لئے نزول کا لفظ کیوں نہیں آسکتا جس طرح مَنّ وسلوٰی کا غیر معمولی حالات میں مہیا کر دینا قرآنی اصطلاح میں نزول کہلایا ہے اسی طرح فسق و فجور کے زمانہ میں ایک پاکیزہ نفس مصلح کا پیدا ہو جانا خدائی اصطلاح میں نزول کہلاتا ہے اور مسیح موعودؑ کے لئے بھی انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہُوا ہے۔

ا — من وسلوٰی کے لئے ملنے کے ساتھ لفظ نزول کا استعمال اور ایک مشکل کا حل

اس کے بعد فرماتا ہے کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ جو کچھ ہم نے تمہیں طیّبات میں سے دیا ہے اسے کھاؤ یعنی اس زمانہ میں یہ غذائیں تمہارے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں ان کے استعمال سے وہ تمام ضرورتیں جو تمہیں لاحق ہیں پوری ہو جائیں گی۔

ا — کلوا من طیبٰت الخ میں طیّب کے معنے

طَیِّب کے معنے لذیذ۔ پاکیزہ۔ خوبصورت۔ میٹھے اور شاندار کے ہوتے ہیں پس کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ کے معنے یہ ہوئے کہ یہ چیزیں اس وقت تمہاری لذّت کے سامان بھی مہیا کرتی ہیں۔ تمہارے اخلاق کی درستی کا موجب بھی ہیں۔ ظاہری شکلوں میں بھی وہ اچھے کھانے ہیں شیریں ولطیف بھی ہیں اور اپنے فوائد کی عظمت کے لحاظ سے بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں پس تم ان کو کھاؤ اور اخلاق حسنہ پیدا کر کے اُس عظیم الشان کام کے لئے تیار ہو جاؤ جو تمہارے لئے مقدّر ہے۔

ا — من وسلوٰی کے بطور انعام ملنے کے متعلق بائیبل اور قرآن مجید کا اختلاف

اس آیت سے یہ مُراد نہیں کہ مَنّ اور سَلْوٰی جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور انکی قوم کو ملے تھے پس وہی طیّبات ہیں بلکہ مدحیہ الفاظ ہوں یا ذم کے الفاظ سب کے سب نسبتی ہوتے ہیں۔ ایک ہی چیز ایک وقت میں اچھی ہوتی ہے یا ایک شخص کے لئے اچھی ہوتی ہے لیکن وہی چیز دوسرے وقت میں بُری ہو جاتی یا دوسرے شخص کے لئے بُری ہو جاتی ہے اسی طرح ایک ہی چیز ایک وقت میں بُری ہوتی یا ایک شخص کے لئے بُری ہوتی ہے لیکن وہی چیز دوسرے وقت میں اچھی ہو جاتی یا دوسرے شخص کے لئے اچھی ہو جاتی ہے جن چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے گو وہ عام طور پر بھی اچھی ہیں لیکن بنی اسرائیل کے حالات کے مطابق ▪ اس وقت ان کے لئے خاص طور پر طیّب تھیں ان غذاؤں کو چھوڑ کر دوسری غذاؤں کے پیچھے پڑنے سے وہ غرض فوت ہوتی تھی جس کے لئے بنی اسرائیل کو جنگل میں رکھا گیا تھا۔

بائبل میں ہے اور گنتی باب آیت ۳۱ تا ۳۴ کا جو حوالہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بٹیروں کا آنا بطور عذاب کے تھا کیونکہ ان کے کھانے سے بنی اسرائیل پر عذاب نازل ہُوا مگر قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ قرآن کریم اسے احسان بناتا اور اپنا انعام قرار دیتا ہے اور قرآن کریم کا بیان ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جنگل میں غذا مہیا کر دینا اور پھر اس کے کھانے پر عذاب نازل کرنا یہ تو ایک ظلم ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے پہلے سے فرما دیا ہوتا کہ بٹیرے آئینگے تم اُنہیں نہ کھانا تب بھی کچھ بات تھی اور اگر بنی اسرائیل میں بٹیرہ حرام ہوتا تب بھی کچھ بات تھی مگر وہاں تو سرے سے بٹیروں کی حُرمت کا کوئی حکم ہی موجود نہیں۔ پھر ایک حلال چیز اگر بنی اسرائیل کو مل گئی اور انہوں نے اسے کھانے کا ارادہ کیا (بائبل میں لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہی ان پر عذاب آگیا) تو اس پر ناراضگی کیسی اور ناراضگی بھی ایسی کہ جنگل کا جنگل قبروں سے بھر گیا یہ تو ایک ظلم ہے اور خدا تعالیٰ ظالم نہیں۔ خود بائبل کے بعض حصّے بھی اس خیال کو ردّ کرتے ہیں چنانچہ خروج باب ۱۶ میں لکھا ہے:-

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا میں نے بنی اسرائیل کا جھنجھانا سنا انہیں کہہ کہ تم درمیان زوال اور غروب کے گوشت کھاؤگے اور صبح کو روٹی سے سیر ہوگے اور تم جانوگے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں اور یوں ہوا کہ شام کو بٹیریں اوپر آئیں اور پڑاؤ کو چھپا لیا اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے۔"

(آیت ۱۱ تا ۱۴)

اِس حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ بٹیرے خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے مطابق آئے اور خدا تعالیٰ نے قبل از وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم ان بٹیروں کو کھانا اور انہیں انعام قرار دیا اور فرمایا کہ ان کے کھانے سے "تم جانوگے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔" اور بٹیروں کے انعام کو مَنّ کے انعام کے ساتھ اکٹھا بیان کیا اور مَنّ کے انعام کو ساری بائبل میں انعام ہی قرار دیا گیا ہے کہیں اسے عذاب قرار نہیں دیا گیا۔ پس گنتی باب۱۱ میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ بعد کے کسی ناواقف مفسر تورات کی جہالت کا نمونہ ہے جس نے اپنے غلط خیالات کو تورات میں شامل کر دیا ورنہ بات وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی یعنے مَنّ بھی بطور انعام کے تھا اور سَلْویٰ بھی بطور انعام کے تھا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے اِس میں یہ جتایا ہے کہ ان احسانات کی بھی انہوں نے ناقدری کی اور اس طرح ہمارے انعاموں کو ناشکری کے ذریعہ سے عذاب کا موجب بنا لیا۔ فرماتا ہے بنی اسرائیل ہمارے انعاموں کی ناشکری کرکے یہ سمجھا کرتے تھے کہ گویا انہوں نے خدا تعالےٰ کو کوئی نقصان پہنچا دیا ہے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی نے کیا نقصان پہنچانا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑتا ہے وہ تو اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے اور جو اس کی نعمتوں کی ناقدری کرتا ہے وہ خود اپنے لئے نعمتوں کے دروازے بند کرتا ہے۔

یہ مصیبت دین کو سمجھ کر نہ ماننے والوں میں ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں پر بھی یہی مصیبت آئی ہوئی ہے نماز روزہ حج زکوٰۃ قربانی جتنے احکام ہیں وہ انہیں چٹی سمجھتے ہیں اگر ان احکام کو پورا کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ پر احسان کر دیا اور اگر ان احکام کو پورا نہیں کرتے تو سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو خوب دھوکا دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو کسی چیز کا محتاج نہیں۔ کسی کی نماز کسی کے روزے کسی کا حج کسی کی زکوٰۃ اور کسی کی قربانی سے اسے کیا فائدہ۔ یہ ساری باتیں تو ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہیں۔ نماز ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ روزہ ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ حج ہمارے فائدہ کے لئے ہے زکوٰۃ ہمارے فائدہ کے لئے ہے کسی چیز میں ہمارے قلب کی اصلاح ہے کسی چیز میں ہمارے فکر کی اصلاح ہے کسی چیز میں ہمارے جسم کی اصلاح ہے کسی چیز میں ہمارے تمدن کی اصلاح ہے کسی چیز میں ہماری قوم کی سیاست یا اقتصادیات کی اصلاح ہے پس ان احکام کو ماننے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کا شکر پیدا ہونا چاہیئے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا اور کامیابی کی ترکیبیں بتائیں ہم مرتے اور تباہ ہوتے تو اُس کا کیا بگڑ جاتا۔ ہم بچ جائیں تو اس کا کیا سنور جاتا ہے مگر جہالت کا بُرا ہو وہ انسان کو ایسے رستوں پر چلاتی ہے جو عقل کے اور دانائی کے مخالف ہوتے ہیں مگر پھر بھی انسان ہیں کہ اُسپر چلے جاتے ہیں۔

اس حصہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے مَنّ و سَلْویٰ کے متعلق بھی کچھ نافرمانیاں کی تھیں سلویٰ کا مضمون تو جیسا کہ میں نے بتا دیا ہے بائبل میں بالکل خبط ہو گیا ہے مگر مَنّ کے متعلق انکی نافرمانی کا پتہ لگتا ہے چنانچہ خروج باب۱۶ آیت ۱۹-۲۰ میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم تھا کہ مَنّ کو جمع نہ کیا جائے لیکن وہ لوگ حرص کی وجہ سے اس کو جمع کرتے تھے۔ اسی طرح ان کو حکم تھا کہ وہ سبت کے دن مَنّ لینے کے لئے نہ نکلیں لیکن وہ پھر بھی گئے اور انہوں نے کوئی نہ پایا (خروج باب۱۶ آیت ۲۷ تا ۲۹) ایسی ہی کوئی بے احتیاطی

خدا تعالےٰ کے احکام کو چٹی سمجھنے کا نتیجہ

وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون کی تشریح

حصہ آیت وما ظلمونا میں بنی اسرائیل کی مَنّ و سلویٰ کے متعلق نافرمانیاں کرنے کا ذکر اور اس کی تائید بائبل سے

الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ

ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ اور

ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

(اس کے) دروازے میں پوری فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہونا اور کہنا (کہ ہم) بوجھ ہلکا کرنے کی التجا کرتے ہیں (تب) ہم

خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

تمہاری خطاؤں کو بالکل معاف کر دینگے اور ہم محسنوں کو ضرور بڑھائیں گے ۵۶ پھر (انکی شرارت کو دیکھو کہ) ان

معلوم ہوتا ہے انہوں نے سَلْوٰی کے متعلق بھی کی ہوگی شاید اس کا جمع کرنا بھی منع ہو اور انہوں نے اسے جمع کر لیا ہو۔ بہرحال ان الفاظ سے کہ وہ ہم پر ظلم نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر نافرمانی انہوں نے ضرور کی یا کم سے کم انہوں نے اس بارہ میں ناشکری سے کام لیا چنانچہ قرآن کریم میں آگے چل کر اس بارہ میں انکی ایک ناشکری کا ذکر آتا بھی ہے۔

۵۸ حل لغات۔ اَلْقَرْيَةُ:۔ اَلْقَرْيَةُ کے معنے ہیں اَلضَّيْعَةُ جاگیر جائداد۔ اَلْمِصْرُ الْجَامِعُ بڑا شہر وَقِيْلَ كُلُّ مَكَانٍ اِتَّصَلَتْ بِهِ الْاَبْنِيَةُ وَاتُّخِذَ قَرَارًا۔ اور بعض کے نزدیک قَرْيَة ہر اس جگہ پر بولیں گے جہاں چند گھر پاس پاس بنے ہوئے ہوں اور وہاں لوگوں کی رہائش بھی ہو۔ جَمْعُ النَّاسِ لوگوں کا گروہ (قَرْيٌ کے معنے جمع کرنے کے بھی ہیں چنانچہ کہتے ہیں قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ کہ میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر اس جگہ پر جہاں لوگوں کا مجمع ہو اسپر قَرْيَةٌ کا لفظ بولا جائے گا نیز ان معنوں کو مدنظر رکھ کر خواہ کوئی شہر ہو یا بستی ہر ایک پر قَرْيَة کا لفظ بول سکیں گے لیکن بعض نے قَرْيَةٌ اور مَدِيْنَةٌ میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ قَرْيَةٌ اس بستی کو کہیں گے جس کے اردگرد فصیل نہ ہو اور مَدِيْنَةٌ اس کو کہیں گے جس کے اردگرد فصیل ہو) (اقرب)

رَغَدًا:۔ رَغَدًا کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۶

اَلْبَابُ:۔ اَلْمَدْخَلُ۔ اَلْبَابُ کے معنے ہیں کسی جگہ داخل ہونے کا رستہ نیز جس کے ذریعہ سے وہ رستہ بند کیا جائے اسے بھی باب کہتے ہیں۔ (اقرب)

سُجَّدًا:۔ سُجَّدًا سَاجِدٌ کی جمع ہے جو سَجَدَ سے اسم فاعل ہے۔ سَجَدَ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۵

حِطَّةٌ:۔ اَلْحِطَّةُ اِسْتَحَطَّ کا اسم ہے اور اِسْتَحَطَّ فُلَانًا وِزْرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں سَاَلَهٗ اَنْ يَّحُطَّهٗ عَنْهُ کہ اس سے یہ خواہش کی کہ اس سے اس کے بوجھ کو اتار دے حِطَّةٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے جسکی تقدیر یوں ہوگی۔ اَمْرُكَ اَوْ مَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ کہ ہماری دعا یہ ہے یا یہ کہ آپکی شان کے شایان یہ بات ہے کہ آپ ہمارا بوجھ ہلکا کردیں (اقرب) مفردات میں ہے کہ حِطَّةٌ کے معنے ہیں حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا کہ ہمارے گناہوں اور قصوروں کو معاف کرکے ہمارے بوجھوں کو ہم سے اتار دیجئے (مفردات)

نَغْفِرْ:۔ غَفَرَ سے مضارع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور غَفَرَ الشَّيْءَ غَفْرًا کے معنے ہیں سَتَرَهٗ کسی چیز کو ڈھانپ دیا اور غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ ذَنْبَهٗ کے معنے ہیں غَطّٰى عَلَيْهِ وَعَفَا عَنْهُ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں پر پردہ پوشی

رَغَدًا ۳۶ — الْبَاب ۳۶ — سُجَّدًا ۳۶ — الْقَرْيَة ۱ — حِطَّة ۲ — نَغْفِر ۳

کی اور اس کے گناہوں سے تجاوز کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا اور جب غَفَرَ اللّٰہُ الْاَمْرَ بِغُفْرَتِہٖ کہیں گے تو معنے ہونگے اَصْلَحَہٗ بِمَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُصْلَحَ بِہٖ کسی امر کی ان چیزوں سے اصلاح کی جن کے ذریعہ سے اسکی اصلاح ہو سکتی تھی (اقرب)

خَطَایَا:۔ اَلْخَطِیْئَۃُ کی جمع ہے اور اَلْخَطِیْئَۃُ کے معنے ہیں اَلذَّنْبُ جُرم قصور۔ وَقِیْلَ الْمُتَعَمَّدُ مِنْہُ بعض کے نزدیک خطیئۃ اس قصور کو کہیں گے جو جان بوجھ کر کیا جائے۔ خَطِیْئَۃ کا لفظ اثم سے عام ہے کیونکہ اثم عمداً ہی ہوتا ہے اور خَطِیْئَۃ عمداً اور غیر عمداً ہر دو طرح ہو سکتی ہے (اقرب)

نَزِیْدُ:۔ زَادَ سے مضارع متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور زَادَ لازم اور متعدی ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے چنانچہ زَادَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں نَمَا کوئی چیز بڑھ گئی اور زَادَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بڑھایا۔ نیز زَادَ فُلَانٌ کے معنے ہیں اَعْطَی الزِّیَادَۃَ اس نے کسی کو حق سے زیادہ دیا (اقرب) پس نَزِیْدُ کے معنے ہونگے (۱) ہم بڑھائیں گے (۲) ہم زیادہ دیں گے۔

اَلْمُحْسِنِیْنَ:۔ اَحْسَنَ سے اسم فاعل مُحْسِنٌ آتا ہے مُحْسِنُوْنَ اور مُحْسِنِیْنَ اسکی جمع ہے۔ اَحْسَنَ اِلَیْہِ وَبِہٖ کے معنے ہیں عَمِلَ حَسَنًا وَاَعْطَاہُ الْحَسَنَۃَ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا نیز اس کے معنے ہیں اَتٰی بِالْحَسَنِ نیک کام کیا اور جب اَحْسَنَ الشَّیْءَ کہیں تو اسکے معنے ہونگے جَعَلَہٗ حَسَنًا کسی چیز کو خوبصورت بنایا۔ اَحْسَنَ کے ایک معنے عَلِمَہٗ کے ہیں یعنی کسی چیز کو عمدگی سے جانا۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ یُحْسِنُ الْقِرَاءَۃَ کہ فلاں شخص اچھی طرح قرأت جانتا ہے (اقرب)

تفسیر۔ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا یعنی فرمانبرداری کی حالت میں شہر میں داخل ہو۔ اور ایسے اخلاق دکھاؤ جو ایک نبی کی امت کے مناسب حال ہوں تا ان لوگوں پر بُرا اثر نہ پڑے۔

قُوْلُوْا حِطَّۃٌ سے یہ مراد ہے کہ اپنی کمزوریوں کی معافی کے لئے دُعائیں کرتے جاؤ تاکہ تمدنی زندگی کے بُرے اثرات تمہارے دلوں پر نہ پڑیں حِطَّۃٌ اِسْتَحَطَّ کا اسم ہے اور اِسْتَحَطَّ کے معنے بوجھ کے گرائے جانے کی درخواست کرنے کے ہیں اور حِطَّۃٌ اس جگہ خبر ہے ایک مبتدا کی جو محذوف ہے اور وہ مبتدا نحویوں کے نزدیک مَسْئَلَتُنَا ہے یعنی ہماری درخواست حِطَّۃٌ کی ہے یا ہمارا سوال حِطَّۃٌ کا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اے خدا ہماری تجھ سے درخواست ہے کہ ہمارے گناہوں کے بوجھوں کو ہم سے گرا دے اور ہمارے ساتھ بخشش کا معاملہ کر۔

خطایا

نزید

بنی اسرائیل جس وقت دشتِ سینا میں سے گذر کر کنعان کی طرف جا رہے تھے تو رستے میں بعض جگہ ایسے قبائل کے پاس سے گذرے تھے جنہوں نے جنگل میں بعض قصبات اور شہر بنائے ہوئے تھے (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۲ کالم ۲۰۳۶ و ۲۰۲۷) بنی اسرائیل کی افسردگی دُور کرنے کے لئے ان شہروں میں تھوڑا سا وقت گذارنے کی ان کو اجازت بھی ملجاتی تھی ایسے ہی شہروں میں سے کسی ایک قصبہ یا شہر کا یہاں ذکر ہے قرآن کریم نے اس قصبہ یا شہر کا نام نہیں لیا اور نہ اسکی ضرورت تھی کیونکہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے خروج کی تاریخ بیان نہیں کرتا وہ تو حوالے کے طور پر صرف ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو اُس کے بیان کردہ مضامین کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتے ہیں پس اُسے تو اُس عبرت سے غرض ہے جو اس واقعہ سے نکلتی ہے نہ کہ ناموں اور تاریخوں سے۔ غرض فرماتا ہے ایک گاؤں تھا یا قصبہ یا شہر تھا جس میں داخل ہونے کی ہم نے تمہیں اجازت دی اور یہ کہدیا کہ اس شہر میں داخل ہو کر بافراغت کھاؤ یعنی کچھ دن تمدنی زندگی کے بھی لطف اُٹھا لو ہاں ایک خیال رکھنا کہ شہر میں مومنانہ طور پر داخل ہونا وَقُوْلُوْا حِطَّۃٌ اور دُعائیں اور استغفار کرتے جانا تاکہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے شہر کے باشندوں کے بد اخلاق سے متاثر نہ ہو جاؤ اگر ایسا کروگے تو ہم تمہارے گناہوں کو چھپا دینگے یعنے تمہارے دل کا میلان جو گناہوں کی طرف ہے اسے دبا دینگے اور نیکی کی

المحسنین

قولوا حطۃ سے مراد

قوت عطا کر دینگے۔

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔ کہہ کر بتا دیا کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ادنیٰ انعام ہے ورنہ اگر تم ہمارے حکم پر پوری طرح عمل کرو گے تو ہم تمہیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر انعام دینگے یعنی صرف تمہارے دل میں گناہ کے مقابلہ کی ہی طاقت نہیں پیدا ہو جائیگی بلکہ اعلیٰ درجہ کی نیکیوں کی قدرت بھی تم کو حاصل ہو جائے گی۔

نزید المحسنین کے دو معنے

نَزِيْدُ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے گئے ہیں زیادہ ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور اس کے معنے نسلی ترقی کے بھی ہو سکتے ہیں اور انعامات کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم نے اچھی طرح ہمارے احکام پر عمل کیا تو ہم تمہاری نسل کو اتنی ترقی دینگے کہ تم سے بھی بڑے بڑے ملک بس جائینگے اور تم بھی شہروں کے بانی ہو جاؤ گے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم شہر کے لوگوں کے اموال اور اُنکی اشیاء کو اپنے سے نہ دیکھنا اگر تم نے فرمانبرداری اور استغفار سے کام لیا تو ہم ان قوموں سے بھی زیادہ اموال اور اشیاء تم کو عطا کریں گے۔

خود بائیبل کا موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے واقعات کو منتشر بیان کرنا

ریورنڈ وہیری کا یہ اعتراض کہ سفرِ بنی اسرائیل کے واقعات قرآن مجید نے حقیقی ترتیب سے بیان نہیں کئے۔ اور اس کا جواب

ریورنڈ وہیری اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں کہ واقعات کا اس طرح ملا دینا جن میں سے بعض تو دشت میں واقع ہوئے تھے اور بعض ارضِ مقدسہ میں واقع ہوئے اور بعض کہیں بھی واقع نہیں ہوئے اور پھر مزید برآں واقعات کو ایک ایسی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا جو حقیقی ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب کا نبی (نعوذ باللہ من ذالک) بائبل کے واقعات سے بالکل ناواقف تھا۔

مجھے ریورنڈ وہیری پر ہمیشہ رحم آتا ہے۔ اس بندۂ خدا نے اپنی زندگی بالکل ہی برباد کر دی۔ ایک پادری ہونیکی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ بائبل کا مطالعہ سب سے زیادہ کرتے مگر اس کتاب کا مطالعہ انہوں نے بہت کم کیا ہے اگر وہ بائبل کا مطالعہ غور سے کرتے تو ایک منٹ کے لئے بھی وہ یہ تصور نہ کر سکتے کہ بائبل کوئی مستند تاریخی کتاب ہے اور واقعات کو صحیح پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔ بائبل کے بیانات تو آپس میں اتنے مختلف ہیں کہ کوئی شخص ان بیانات کی موجودگی میں خروج کی کوئی تاریخ لکھ ہی نہیں سکتا اور خود عیسائی مصنفین خروج کی بیان کردہ تاریخ کو ناقابلِ اعتبار اور ترتیب کے لحاظ سے غلط قرار دیتے ہیں چنانچہ پروفیسر جے۔ ایف سٹیننگ (Stanning) ایم اے آکسفورڈ یونیورسٹی لیکچرار انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھتے ہیں کہ خروج میں بعض ایسے واقعات جو موسیٰؑ کے سفر کے آخری حصہ کے ہیں شروع میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں مارہ کے پانیوں کو میٹھا کرنے کا واقعہ اور مَنّ اور سلویٰ کے آنے کا واقعہ بھی اپنی اصل جگہ پر بیان نہیں کیا گیا مَنّ کا واقعہ سینا سے جانے کے بعد ہوا ہے اور بٹیروں کے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح گنتی میں بٹیروں کے واقعہ کو سفر کے آخر میں بیان کیا گیا ہے لیکن خروج میں شروع میں بیان کر دیا گیا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۸ صفحہ ۹۷ کالم اول نوٹ ۵) جیسا کہ میں اوپر نوٹوں میں ایک مثال دے چکا ہوں خروج باب ۱۶ آیت ۱۱ و ۱۲ میں تو یہ لکھا ہے کہ خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ تم شام سے پہلے پہلے بٹیروں کا گوشت کھاؤ گے اور اسے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام قرار دیا ہے لیکن گنتی باب ۱۱ آیت ۳۳ میں یہ لکھا ہے کہ بٹیروں کے آنے پر اُن کا گوشت چبانے سے پہلے ہی اسرائیل مر گئے اور تباہ ہو گئے۔ گویا کتاب خروج تو خدا تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی کرتی ہے کہ وہ لوگ بٹیروں کا گوشت کھائینگے اور بٹیروں کا گوشت ملنے کو ایک انعام قرار دیتی ہے لیکن گنتی کی کتاب کہ وہ بھی موسیٰ کی ہی وحی کہلاتی ہے یہ بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے گوشت نہیں کھایا بلکہ گوشت کھانے کا ارادہ کرنے پر ہی اُن پر عذاب آ گیا۔

اب ان بیانات میں کون تطبیق دے سکتا ہے اگر قرآن کریم خروج کے بیان کی تصدیق کرے تو پادری صاحبان کہیں گے کہ قرآن کریم نے چونکہ گنتی کے خلاف کہا ہے اس لئے قرآن کو تاریخ کا پتہ نہیں اور اگر وہ گنتی کے بیان کی تصدیق کرے تو پادری صاحبان کہیں گے کہ چونکہ قرآن نے خروج کے خلاف لکھا ہے اس لئے

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى
ظالموں نے اس بات کے خلاف جو انہیں کہی گئی تھی ایک اور بات بدل کر کہنی شروع کر دی

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
جس پر ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ان کے نافرمان ہونے کے سبب سے آسمان سے ایک عذاب

يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا
نازل کیا ۵۹ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو جب) موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے (اسے) کہا

قرآن کو بائبل کی تاریخ کا پتہ نہیں۔ اور اگر وہ دونوں کے ہی مطابق بات کہے تو پھر اس کے معنے یہ ہونگے کہ جیسی غیر معقول تاریخ بائبل کی ہے ویسی ہی غیر معقول تاریخ (نعوذ باللہ) قرآن کریم کی ہو جائے گی پس قرآن کریم نے گنتی اور خروج کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو واقعات تھے وہ اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیئے۔ اگر بائبل کے بتائے ہوئے واقعات صحیح ہیں تو اس نے بائبل کی تصدیق کر دی۔ اگر بائبل کے بتائے ہوئے واقعات غلط ہیں تو اس نے انکی تردید کر دی اور اگر کوئی واقعہ عبرت کے لئے بیان کرنا ضروری تھا اور بائبل میں بیان نہیں ہوا تو اس نے بیان کر دیا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو بائبل کے مصنفین کے تتبع کی ضرورت نہیں۔

۵۹ حل لغات:۔ ظَلَمُوْا۔ ظَلَمَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ظَلَمَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۶؎

رِجْزًا:۔ اَلرِّجْزُ کے معنے ہیں اَلْقَذَرُ گند۔ عِبَادَةُ الْاَوْثَانِ بتوں کی عبادت اَلْعَذَابُ۔ عذاب اَلشِّرْكُ شرک (اقرب) رِجْزٌ کے اصل لغوی معنے اضطراب اور پے در پے حرکت کرنے کے ہیں چنانچہ اسی بناء پر رِجْزٌ کے معنے زلزلہ کی قسم کے عذاب کے بھی کئے جاتے ہیں اور شرک اور بتوں کی عبادت کے معنے رِجْزٌ کے اس اعتبار سے ہیں کہ جو ایسا فعل کرتا ہے اس کے اعتقاد میں ایک قسم کا اضطراب

ہوتا ہے۔

اَلسَّمَآءُ:۔ اَلسَّمَآءُ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۰؎

يَفْسُقُوْنَ:۔ فَسَقَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور فَسَقَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۷؎

تفسیر۔ فرماتا ہے دیکھو تم نے ہمارے اس انعام کی بھی ناقدری کی۔ ہم نے تو یہ چاہا تھا کہ تم کچھ دن اپنی تھکان دور کر لو اور تمدنی زندگی کا لطف اٹھا لو لیکن تم نے اس احسان کے ساتھ بھی تمسخر کرنا شروع کر دیا اور ایک ایسی بات کہنی شروع کر دی جو تمہیں نہیں کہی گئی تھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حِطَّةٌ کہنے کی بجائے جس کے معنے تھے کہ ہمارے گناہ بخش دیئے جائیں حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ کہنا شروع کر دیا یعنی ہمیں گندم مل جائے گندم مل جائے (یہ مراد نہیں کہ حِنْطَةٌ کا لفظ استعمال کیا بلکہ جو عبرانی لفظ بھی گندم کے لئے ہے خواہ حِنْطَةٌ ہو یا کوئی اور ہو وہ استعمال کیا) شہر کے اندر داخل ہونے کے خیال نے ان کے اندر گندم کے گرم گرم نانوں کی حرص پیدا کر دی اور گناہوں کی معافی کا خیال جاتا رہا اور مذاقاً انہوں نے حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ کہنا شروع کر دیا کہ خدایا ہمیں گندم دلادے۔ فرماتا ہے یہی وجہ ہے اُن پر عذاب نازل ہوا کیونکہ انہوں نے تمسخر سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ سے احکام کی نافرمانی کی۔

دیکھو کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر خدا تعالیٰ کے غضب کا

بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کے حکم کے ساتھ تمسخر کرنا اور اس کا نتیجہ

رجز کا

موجب ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی میں انسان صرف سنجیدگی کی وجہ سے ترقی کرسکتا ہے انسان کتنی ہی عبادتیں کرے کتنی ہی قومی خدمت بجالائے لیکن اس کے اندر سنجیدگی نہ ہو تو وہ کبھی بھی روحانی ترقی نہیں کرسکتا اور نہ قوم کے لئے صحیح طور پر مفید ہوسکتا ہے بلکہ ایسے غیر سنجیدہ لوگ بعض دفعہ قوم کو خطرناک تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں بظاہر حِطَّةٌ کو حِنْطَةٌ کہہ دینا ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کرو تو نہایت اہم بات ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ تمسخر کیا گیا ہے اس قسم کا تمسخر وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں سنجیدگی نہ ہو اور جس کے دل میں سنجیدگی نہیں نہ وہ دین کے لئے مفید ہوسکتا ہے اور نہ دنیا کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے اشتعال کے مواقع چھوٹی چھوٹی حرص کے مواقع ایسے آدمیوں کو ملت اور ملک سے غداری کرنے پر آمادہ کردیتے ہیں۔ آج مسلمانوں کی بھی یہی کیفیت ہے جو بے دین ہیں وہ تو بے دین ہیں ہی۔ مگر جو دیندار کہلاتے ہیں علماء ہیں یا صوفیاء ہیں وہ بھی دین کی باتوں سے تمسخر کرلیتے ہیں کہیں بے موقع قرآن کی آیت پڑھ دیں گے کہیں ہنسی کے موقع پر حدیث نبویؐ پڑھ دینگے حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کا مقام بہت بالا ہے اُن کی باتوں کو ہنسی اور تمسخر کے موقع پر بیان کرنا نہایت خطرناک بات ہے یہ چیز دل کو سیاہ کردیتی۔ روحانیت کو ماردیتی اور تقویٰ کو کچل دیتی ہے۔ اس گناہ پر غالب آنے کے لئے کسی بڑی محنت کی بھی ضرورت نہیں کسی لالچ کو دبانے کا یہاں سوال نہیں۔ ایک معمولی سی توجہ کی ضرورت ہے جن لوگوں میں یہ مرض پائی جاتی ہے وہ ایک ذرا سی توجہ سے اِس نقص کو دُور کرسکتے ہیں اور تھوڑی سی محنت کے ساتھ دل کی ایک ایسی اصلاح کرسکتے ہیں جو ان کو بڑے بڑے کاموں کے لئے تیار کردے۔

(حاشیہ ۱: قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث کو ہنسی اور تمسخر کے موقعہ پر استعمال کرنے کے متعلق نصیحت)

پس خدا کی باتوں اور اس کے رسول کی باتوں میں ہنسی اور مذاق کو بالکل چھوڑ دو یہ گناہ بے لذت ہے اور انسانی دل کو بالکل مردہ کردیتا ہے خدا اور اس کے رسول کا ذکر جب بھی آئے اس کے ساتھ دل میں خشیت پیدا ہونی چاہیئے جس سے محبت ہوتی ہے اُس کا ذکر کبھی بھی توجہ کھینچے بغیر نہیں رہتا اپنے ماں باپ سے کوئی شخص تمسخر نہیں کرتا۔ اپنے ماں باپ کی باتوں سے کوئی شخص تمسخر نہیں کرتا پھر کیوں خدا اور رسول کی باتوں کو ہنسی کے مواقع پر استعمال کیا جائے کیوں خدا اور رسول کے نام کو تمسخر کے طور پر استعمال کیا جائے اور ایک سیکنڈ کے مذاق کے لئے عمر بھر کی عبادت کو ضائع کردیا جائے اَلْحَذَرْ ثُمَّ الْحَذَرْ۔

(حاشیہ ۲: رجزمن السماء میں رجز سے مراد طاعون یا اولے)

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ عذاب تو جو پیدا ہوا زمین سے ہی پیدا ہوا مگر کہا یہ گیا ہے کہ آسمان سے نازل کیا۔ یہ الفاظ اُن الفاظ سے بہت زیادہ زبردست ہیں جو مسیحؑ کے نزول کے متعلق احادیث میں آئے ہیں کیونکہ مسیح موعود کے متعلق کسی بھی صحیح حدیث میں یہ نہیں آتا کہ وہ آسمان سے نازل ہوگا بلکہ صرف نازل ہونے کے الفاظ ہیں مگر یہاں تو اس عذاب کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ آسمان سے نازل ہوا اور رجز سے صحابہؓ اور دیگر آئمہ نے عام عذاب یا طاعون یا اولوں کا عذاب مُراد لیا ہے چنانچہ شعبی کا قول ہے اَلرِّجْزُ اِمَّا الطَّاعُوْنُ وَاِمَّا الْبَرَدُ۔ رجز یا طاعون کو کہتے ہیں یا اولوں کے عذاب کو کہتے ہیں اور سعید بن جبیر جو مشہور مفسر قرآن ہیں کہتے ہیں هُوَ الطَّاعُوْنُ اس سے مراد طاعون ہے اور ابن ابی حاتم نے سعد بن مالکؓ۔ اسامہ بن زیدؓ اور خزیمہ بن ثابتؓ تین صحابہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ طاعون ہی رجز ہے اور ابن جریرؓ نے بھی اسامہ بن زید سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اِنَّ هٰذَا الْوَجَعَ وَالسُّقْمَ رِجْزٌ عُذِّبَ بِهٖ بَعْضُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ (ابن کثیر جلد اوّل) یعنی یہ درد اور بیماری (طاعون) رجز ہے جس کے ذریعہ سے تم سے پہلے بعض قوموں کو عذاب دیا گیا۔

(حاشیہ ۳: عذاب کے ساتھ لفظ نزول استعمال کرنے کی وجہ حالانکہ عذاب تو مادی بیماری سے تھا۔)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ طاعون تو ایک مادی بیماری ہے گلٹی جسم میں نکلتی ہے بخار جسم کو چڑھتا ہے اور اسکے سامان اسی طرح اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جس طرح اور بیماریوں

اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

کہ اپنا سونٹا فلاں پتھر پر مار۔ اسپر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے

عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ

(اور) ہر ایک گروہ نے اپنی گھاٹ کو پہچان لیا (تب اُنہیں کہا

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي

گیا کہ) اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور پیو اور مفسد بن کر

الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ

زمین میں خرابی نہ پیدا کرو ۵۶۔ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے

اور سب چیزوں کے اسباب اس دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے آسمان سے ان کے لئے رجز اُتارا۔

اگر کہا جائے کہ چونکہ طاعون کا حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس لئے طاعون کی نسبت یہ کہا گیا کہ وہ آسمان سے اُتاری گئی تو میں کہتا ہوں کہ یہی مسیح کا حال سمجھنا چاہیئے۔ کیا طاعون کا حکم آسمان سے اُترتا ہے لیکن جس شخص کو مامور کیا جاتا ہے اس کا حکم آسمان سے نہیں اُترتا۔ پس اگر طاعون آسمان سے اُتری ہوئی کہلا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے مامور آسمان سے اُترے ہوئے نہیں کہلا سکتے باوجود اس کے کہ وہ زمین پر پیدا ہوں۔

۵۶ حل لغات۔ اِسْتَسْقٰی:۔ سَقٰی (يَسْقِیْ) سے باب استفعال کا ماضی کا صیغہ ہے اور اِسْتَسْقَی الرَّجُلُ مِنْ فُلَانٍ اِسْتِسْقَاءً کے معنی ہیں طَلَبَ السَّقْیَ وَاِعْطَاءَ مَا يَشْرَبُهٗ یعنے کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے یہ خواہش کی کہ وہ اسے پینے کے لئے کچھ دے (اقرب)

قَوْمٌ:۔ اَلْقَوْمُ: اَلْجَمَاعَةُ مِنَ الرِّجَالِ خَاصَّةً وَقِيْلَ تَدْخُلُهُ النِّسَاءُ عَلٰی تَبْعِيَّةٍ یعنے لفظ قوم مردوں کی جماعت کے لئے ہی بولتے ہیں لیکن بعض اہل زبان کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ یہ لفظ مردوں کی جماعت پر ہی بولا جاتا ہے لیکن تاہم عورتیں بھی اسمیں ضمناً آجاتی ہیں کیونکہ وہ بھی مختلف انسانی جماعتوں کا ایک حصہ ہوتی ہیں (لسان میں لکھا ہے کہ لفظ قوم میں مرد اور عورت ہر دو آجاتے ہیں لیکن جن لوگوں نے لفظ قوم کو مردوں کی جماعت کے لئے مخصوص کیا ہے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں آتا ہے لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسٰی أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ اگر قوم میں عورتیں بھی داخل ہوتیں تو لفظ قوم کے ذکر کے بعد عورتوں کا ذکر نہ ہوتا جن لوگوں نے لفظ قوم کو مردوں اور عورتوں ہر دو کی مشترکہ جماعت کے لئے بولے جانے کے حق میں کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کے ماننے والوں یا جن کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے اس کو قوم کہا گیا ہے اور اس میں مرد و عورت ہر دو شامل ہوتے ہیں۔ نیز جب یہ کہا جائے قَوْمُ كُلِّ رَجُلٍ تو اس کے معنے ہوتے ہیں شِيْعَتُهٗ وَعَشِيْرَتُهٗ کنبہ اور کنبے میں مرد و عورت ہر دو شامل ہوتے ہیں) اقرب الموارد کا مصنف کہتا ہے کہ مردوں کی جماعت کو قوم اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے وجود سے بڑے بڑے کام قیام پذیر ہوتے ہیں پھر لکھا ہے کہ لفظ قوم

اِسْتَسْقٰی

قَوْمٌ

ہر دو طرح استعمال ہو جاتا ہے۔ مذکر بھی اور مؤنث بھی۔ چنانچہ کہہ دیتے ہیں قَامَتِ الْقَوْمُ وَ قَامَ الْقَوْمُ۔ قَوْم کی جمع اَقْوَامٌ۔ اَقَاوِم۔ اَقَاوِيْم۔ اور اَقَايِم۔ آتی ہے (اقرب)

قُلْنَا

قُلْنَا :۔ قَالَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے کہا۔ ہم نے وحی کی۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۱۳۵

فَانْفَجَرَتْ

فَانْفَجَرَتْ :۔ اِنْفَجَرَتْ اِنْفَجَرَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِنْفَجَرَ فَجَرَ سے باب انفعال ہے۔ فَجَرَ الْمَاءَ (يَفْجُرُ) کے معنے ہیں بَجَسَهٗ وَفَتَحَ لَهٗ طَرِيْقًا فَجَرٰى پانی کو جاری کیا۔ پانی کو بہایا۔ پانی کے لئے راستہ کھول دیا۔ اور وہ بہہ پڑا۔ اور فَجَرَ الْقَنَاةَ کے معنے ہیں شَقَّهَا وَقِيْلَ شَقًّا وَاسِعًا پانی کی نالی کو وسیع طور پر پھاڑ کر بنایا۔ اور جب اِنْفَجَرَ الْمَاءُ کہیں تو معنے ہوں گے سَالَ وَجَرٰى۔ پانی بہہ پڑا (اقرب) پس اِلْاِنْفِجَارُ کے معنی ہونگے اَلْاِنْشِقَاقُ۔ اَلتَّفَتُّحُ۔ پھوٹ پڑنا۔ بہہ پڑنا اور اِنْفَجَرَتْ کے معنے ہونگے۔ پھوٹ پڑے۔ بہہ پڑے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى الخ میں بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر

اُنَاسٌ

اُنَاسٌ :۔ اَلْاُنَاسُ۔ اَلْاِنْسُ کی جمع ہے۔ اور اَلْاِنْسُ کے معنے ہیں اَلْبَشَرُ آدمی اَوْ غَيْرُ الْجِنِّ وَالْمَلَائِكِ۔ جنوں اور فرشتوں کے سوا آدمزاد (اقرب) اُناس بعض دفعہ قبیلہ اور گروہ کے معنے میں بھی آجاتا ہے (ملخ)

مَشْرَبَهُمْ

مَشْرَبَهُمْ :۔ اَلْمَشْرَبُ کے معنے ہیں اَلْمَاءُ۔ پانی اَلْوَجْهُ الَّذِيْ يُشْرَبُ مِنْهُ پانی پینے کی جگہ۔ شَرِيْعَةُ النَّهْرِ۔ دریا کا گھاٹ۔ مَشْرَبٌ کی جمع مَشَارِبُ آتی ہے (اقرب)

لَا تَعْثَوْا

لَا تَعْثَوْا :۔ عَثِيَ يَعْثٰى سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور عَثِيَ کے معنے ہیں اَفْسَدَ اس نے فساد کیا بَالَغَ فِي الْفَسَادِ اَوِ الْكِبْرِ اَوِ الْكُفْرِ یعنی اس نے حد سے بڑھ فساد یا تکبر یا کفر کیا (اقرب) لسان میں لکھا ہے کہ عَثِيَ کے معنے ہیں اَفْسَدَ اَشَدَّ الْفَسَادِ سخت ترین فساد کیا اور اَلْعُثُوُّ کے معنی ہیں اَشَدُّ الْفَسَادِ۔ سخت ترین فساد (لسان)

پادری صاحبان کا آیت اذا استسقٰی پر اعتراض کہ ایسا واقعہ بائیبل میں مذکور نہیں۔

امام راغب کہتے ہیں اَلْعَيْثُ اَكْثَرُ مَا يُقَالُ فِي الْفَسَادِ الَّذِيْ يُدْرَكُ حِسًّا وَالْعَثِيُّ فِيْمَا يُدْرَكُ حُكْمًا کہ عَثِيَ کا لفظ عموماً ایسے فساد کے لئے استعمال ہوتا ہے جو غیر محسوس ہو اور عَيْثٌ کا لفظ محسوس فساد کے لئے بولا جاتا ہے (مفردات) پس لَا تَعْثَوْا کے معنے ہونگے (۱) سخت ترین فساد نہ کرو (۲) تم انتہائی طور پر فساد تکبر اور کفر نہ کرو۔

مُفْسِدِيْنَ :۔ اَفْسَدَ سے اسم فاعل مُفْسِدٌ آتا ہے اور مُفْسِدُوْنَ اور مُفْسِدِيْنَ اس کی جمع ہیں اَفْسَدَ کے معنے ہیں ضِدُّ اَصْلَحَهٗ کسی چیز میں خرابی ڈالدی۔ اس میں فساد پیدا کر دیا اور جب اَفْسَدَ بَيْنَ الْقَوْمِ کہیں تو معنے ہونگے لوگوں میں پھوٹ ڈالدی۔ اور اَلْفَسَادُ کے معنے ہیں جھگڑا۔ نقصان۔ خرابی۔ اَخْذُ الْمَالِ ظُلْمًا ظلم سے کسی کا مال لینا۔ نیز فساد کے ایک معنی قحط کے بھی کئے گئے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہاں ایک اور ناشکری بنی اسرائیل کی بیان کی گئی ہے۔ کہیں پانی کی دقت ہوئی (معلوم ہوتا ہے یہ ایسا علاقہ تھا جہاں خدا تعالیٰ کی طرف سے بادل نازل نہیں کئے جاتے تھے بادلوں کے علاقہ کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے) موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پانی کے لئے دُعا کی اور انہیں حکم ہوا کہ فلاں پتھر کو اپنے سونٹے سے مارو انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر ایک جماعت نے اپنے لئے ایک گھاٹ تجویز کر لی۔

پادری صاحبان اس آیت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ بائبل میں مذکور نہیں مگر جیسا کہ میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں بائبل میں کسی واقعہ کا بیان ہونا یا نہ ہونا یہ کوئی اہم بات نہیں۔ بیشک ایک مؤرخ مجبور ہے کہ وہ انہی واقعات کو بیان کرے جو بائبل میں یا دوسری تاریخوں میں بنی اسرائیل کے متعلق مذکور ہیں لیکن جو کلام اس بات کا مدعی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے وہ اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ بائبل یا تاریخ کے حوالوں کو بیان کرے۔ جو باتیں بائبل اور

تاریخ میں بیان ہوئی ہیں کہ ان کے سوا دُنیا میں اور کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اور کیا پھر ایسے واقعات کو بیان کرنا خدا تعالیٰ کے لئے ممنوع ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے اور خدا تعالیٰ کے علم کو تاریخ دانوں کا علم نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن کا منکر ہم سے اس بات کا مطالبہ تو کر سکتا ہے کہ ثابت کرو قرآن خدا کی کتاب ہے لیکن جب ہم ثابت کر دیں کہ قرآن خدا کی کتاب ہے تو اس کے بعد قرآن کی گواہی ہر مورخ کی گواہی سے اور ہر مسوخ یا مسوخ کتاب کی گواہی سے یقیناً زیادہ معتبر سمجھی جائے گی مگر اس کے یہ بھی معنے نہیں کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معنے کریں جو قرآن کریم کے رو سے ناجائز ہوں یا خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ عقل کے خلاف ہوں یا لغت کے خلاف ہوں۔

اس آیت پر جہاں پادریوں نے یہ غلط اعتراض کیا ہے کہ چونکہ یہ واقعہ بائبل میں بیان نہیں اس لئے اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں ہمارے بعض مفسروں نے بھی ایک غلطی کی ہے چنانچہ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک چھوٹا سا پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اُٹھائے پھرتے تے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہ اس پتھر کو مار کر اس میں سے بارہ چشمے پھوڑ لیا کرتے تے یہ معجزہ نہیں یہ تو ایک تمسخر ہے جب خدا تعالیٰ ایک علاقہ میں بادل لایا تھا اور دوسرے علاقہ میں اُس نے ایک پتھر پر سونٹا مارنے کا حکم دیا تو یہ معجزہ بھی خدا تعالیٰ کے طبعی قانون کے مطابق ہی ہونا چاہیئے اس آیت کے صرف اتنے معنے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر سونٹا مارنے کا حکم دیا گیا اس سونٹے کے مارنے سے وہ پتھر ٹوٹ گیا اور اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے جن لوگوں کو پہاڑوں پر جانے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض جگہ پر پہاڑوں کی چوٹیوں کا برفوں کا پانی جو کہ زمین کی سطح کے نیچے بہہ رہا ہوتا ہے بعض دفعہ سطح زمین کے اتنے قریب آجاتا ہے کہ معمولی سوٹی مارنے سے ہی وہاں سے پانی نکل آتا ہے اور ایسے چشمے صرف پہاڑوں پر ہی نہیں پائے جاتے بعض دفعہ بیابانوں میں بھی خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ بعض طبعی قانونوں کے ماتحت سطح زمین کے قریب پانی آئے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ عرب کے ریگستانوں میں بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے نخلستان اور چشمے پائے جاتے ہیں۔ ان پانی کی جگہوں کو جغرافیہ والوں کی اصطلاح میں اویسس (Oases) کہتے ہیں۔ اسی طرح کے کسی مقام کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے الہام سے خبر دے دی جہاں پانی سب سے زیادہ سطح زمین کے قریب تھا اس کے اوپر ایک پتھر پڑا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس پتھر کو توڑ دو اس کے نیچے سے پانی نکل آئے گا چنانچہ اُنہوں نے پتھر توڑ دیا اور پانی نکل آیا۔ معجزہ نہ اس میں ہے کہ پتھر میں سے پانی نکلا۔ نہ اس میں ہے کہ نئے سرے سے پانی پیدا کیا گیا معجزہ اس امر میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کے ساتھ خبر دی کہ فلاں پتھر کے نیچے پانی موجود ہے پس نہ تو اس واقعہ کے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے اور نہ قانونِ قدرت کے خلاف شکل دینے کی کوئی وجہ ہے۔ پانی اُس جگہ پر قانونِ قدرت کے مطابق موجود تھا مگر انسان نہیں جانتے تھے کہ اس جگہ پر پانی موجود ہے صرف خدا کو معلوم تھا کہ یہاں پانی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے موسیٰ کو اس بات کا علم دیا اور موسیٰ کے پتھر توڑ دینے سے چشمے کا پانی جو پتھر کی وجہ سے بند تھا باہر کی طرف بہہ پڑا اور اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ وہ پتھر جو معلوم ہوتا ہے بہت ہی چھوٹی گہرائی کا تھا سونٹے کی ضرب سے بارہ جگہ سے ٹوٹا اور بارہ ہی اس میں سے چشمے پھوٹ پڑے۔

بعض مفسرین کا اذا استسقیٰ موسیٰ کی تفسیر میں غلطی کرنا

پہاڑوں پر جانے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک ایک جگہ سے بعض دفعہ متعدد چشمے پھوٹتے ہیں کشمیر میں ایک جگہ ککرناگ ہے جو جہلم کے منبع سے کوئی پندرہ سولہ میل کے فاصلہ پر ہے اور اسلام آباد کے شہر کے اوپر آٹھ دس میل پر ہے اس جگہ پر میں نے خود ایک چند گز کی جگہ کے اندر سے بہت سے چشمے پھوٹتے ہوئے دیکھے جنکی تعداد غالباً دس سے زیادہ تھی۔

بنی اسرائیل علیہ السلام کے پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشموں کے پھوٹنے کی وجہ

بارہ چشمے پھوڑنے کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے کئی قبائل تھے اور وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے ہر ایک کے

لئے الگ الگ پانی میسر آ گیا یا ہو سکتا ہے کہ بارہ چشموں کا پھوٹنا ایک اتفاقی امر ہو اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کو مدِّنظر رکھ کر ایسا نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا ذکر محض اس لئے کر دیا کہ وافر پانی مل گیا اور بنی اسرائیل نے بغیر تکلیف کے پی لیا۔

اس جگہ اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کو سیل اپنے ترجمۂ قرآن کے نوٹوں میں لکھتا ہے کہ پندرھویں صدی کے ایک سیاح نے شہادت دی ہے کہ حُورب کی ایک چٹان میں سے اُس وقت بارہ چشموں کا نشان ملتا تھا گو وہ سارے چلتے نہ تھے۔ (القرآن مصنفہ سیل صفحہ ۸

Al-Quran by Sale Page 8

ایک سیاح کی شہادت کہ حورب کی چٹان پر بارہ چشموں کا نشان ملتا تھا

اس شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں بعض چٹانوں پر سے بارہ چشمے کسی زمانہ میں پھوٹا کرتے تھے۔ خروج باب ۱۷ میں حورب کی چٹان پر پانی کے لئے سونٹا مارنے کا حکم ثابت ہوتا ہے لیکن بارہ چشموں کا ذکر نہیں ملتا (آیت ۶) ہاں ایلیم ایک جگہ ہے جہاں بارہ چشموں کا ذکر ہے مگر وہاں سونٹا مارنے کا ذکر نہیں (خروج باب ۱۵ آیت ۲۷) لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اِس بارہ میں بائبل کی شہادت کو زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال پندرھویں صدی کے ایک عیسائی سیاح کی شہادت کہ حورب کی چٹان پر بھی بارہ چشمے پائے جاتے تھے کم سے کم عیسائی معترضین کا مونہہ بند کر دینے کے لئے کافی ہے۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الگ الگ پانی الگ الگ قوم کے لئے مقرر کیا گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم نے اپنے لئے الگ جگہ مقرر کر لی یعنی پانی اتنی کثرت سے تھا اور اتنی متفرق جگہوں سے پھوٹا تھا کہ بنی اسرائیل کو پانی ملنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی اور آپس میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہُوا بلکہ ہر قوم آسانی سے اپنے لئے الگ گھاٹ تجویز کر کے اس سے پانی پینے لگ گئی۔

قد علم کل اناس مشربھم سے مراد

كُلُّ أُنَاسٍ کے معنے ہر ایک قوم یا ہر ایک گروہ کے ہیں ہر انسان اس کے معنے نہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ سے یہ بتایا ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہر جگہ کھانے اور پینے کی چیزیں مہیا کر رہا ہے تم اس کے احسان کی قدر کرو اس پر توکل کرو اور اپنی نظر اسباب پر نہ رکھو جتنے فساد دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کسی زمین یا کسی مکان یا کسی جانور یا کسی دھات کے متعلق انسان یہ سمجھتا ہے کہ اگر مجھے نہ ملی تو میرا نقصان ہوگا اور وہ اپنے بھائی سے لڑتا ہے اور فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے اس وقت کے بنی اسرائیل سے کہا کہ دیکھو ہم نے تمہیں ان سب جھگڑوں سے آزاد کر دیا۔ نہ تمہیں کھانے کے لئے تلاش اور محنت کرنی پڑتی ہے نہ تمہیں پانی کے لئے تلاش اور محنت کی ضرورت پیش آتی ہے پس جب ہم تمہاری سب ضروریات خود پورا کر رہے ہیں تو فساد کی کوئی وجہ نہیں۔ اب بھائی کو بھائی سے کیوں بغض ہو اور ہمسایہ ہمسایہ سے کیوں لڑے پس کم سے کم اِن ایّام میں تو تمہیں کوئی فساد نہیں کرنا چاہیئے اور پھر ان ایّام کی نعمتوں کو یاد رکھتے ہوئے تمہیں آئندہ بھی فساد نہیں کرنا چاہیئے۔

عثی کے معنے

عَثٰی کے معنے جیسا کہ لغت میں بتائے جا چکے ہیں شدید فساد کے ہوتے ہیں لَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ کے معنے ہوئے زمین میں فساد کرتے ہوئے سخت فساد مت کرو یہ عربی کا محاورہ ہے اور اس محاورہ کے رُو سے اس کے معنے یہ ہیں کہ جانتے بوجھتے ہوئے فساد مت کرو بعض دفعہ انسان سے کوئی ایسی حرکت ہو جاتی ہے جو موجب فساد ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے فساد کی نیت نہیں ہوتی مومن کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی بچے لیکن کم سے کم اُسے ایسے کاموں سے تو ضرور بچنا چاہیئے جن کے متعلق اسے معلوم ہو کہ اس کا نتیجہ فساد ہوگا اور یہی مفہوم اس آیت کا ہے۔

چونکہ اردو زبان میں اس کا لفظی ترجمہ یُوں بنتا ہے

عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا

پر صبر نہیں کر سکیں گے اس لئے تو ہمارے لئے اپنے رب سے دُعا کر کہ وہ ہمارے لئے بعض ایسی

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا

چیزیں جنہیں زمین اُگاتی ہے پیدا کرے یعنی اسکی سبزیاں ککڑیاں گیہوں

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ

مسور اور پیاز — (اسپر اللہ نے) کہا کہ کیا تم اس چیز کی بجائے جو

هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ

اعلیٰ ہے۔ اس چیز کو لینا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے — کسی شہر میں چلے جاؤ (وہاں)

لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ

جو کچھ تم نے مانگا ہے تمہیں ضرور مل جائے گا (تب) انہیں ہمیشہ کے لئے ذلیل اور

الْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ

بے بس کردیا (گیا) اور وہ اللہ کے غضب کا مورد بن گئے۔ یہ

بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ

اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور

النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا

نبیوں کو ناحق قتل کرنا چاہتے تھے (اور) یہ (گناہ) ان کے نافرمانی کرنے اور حد سے بڑھے ہوئے

یَعْتَدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَ ع

ہونیکے سبب سے (ان میں پیدا ہوگیا) تھا[۱۲۶] جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ اور جو یہودی ہیں۔

"فساد کرتے ہوئے زمین میں سخت فساد نہ کرو" اور یہ اُردو ترجمہ بے معنی سا ہو جاتا ہے اس لئے ہم نے عربی محاورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے "اور مفسد بنکر زمین میں خرابی نہ پیدا کرو"۔

۱۲۶ حل لغات۔ لَنْ نَّصْبِرَ۔ صَبَرَ (یَصْبِرُ) سے مضارع منفی متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں حَبَسْتُهَا کہ

یعنے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی (اقرب) تاج العروس میں ہے کہ "بصائر" کے مصنف کہتے ہیں۔ صَبْرٌ کے لغوی معنے رُک جانے اور رُکنے کے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں نے صبر کیا تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَنِ الْجَزَعِ وَحَبْسُ اللِّسَانِ عَنِ الشَّكْوٰى وَحَبْسُ الْجَوَارِحِ عَنِ التَّشْوِيْشِ نفس پر گھبراہٹ پیدا ہونے کے وقت قابو پائے رکھنا۔ زبان کو شکوہ کرنے سے روکے رکھنا اور دیگر اعضاء سے تشویش کا اظہار نہ ہونے دینا (تاج) مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۱۵۴ پس لَنْ نَّصْبِرَ کے معنے ہونگے ہم ثابت قدمی نہیں دکھا سکیں گے۔

طَعَامٍ: اِسْمٌ لِمَا يُؤْكَلُ كَالشَّرَابِ لِمَا يُشْرَبُ عربی زبان میں ہر اس چیز کو جو خوراک کا کام دے طعام کہتے ہیں جیسے ہر پینے کی چیز کو شَرَاب کہتے ہیں وَقَدْ غَلَبَ الطَّعَامُ عَلَى الْبُرِّ اور زیادہ تر طعام کا لفظ گندم پر بولا جاتا ہے۔ وَرُبَّمَا اُطْلِقَ عَلَى الْحُبُوْبِ كُلِّهَا اور کئی دفعہ جملہ اقسام کے غلوں پر طعام کا لفظ بول دیتے ہیں۔ طَعَامٌ کی جمع اَطْعِمَةٌ آتی ہے اور جمع الجمع اَطْعِمَات آتی ہے (اقرب)

بَقْلٌ: اَلْبَقْلُ: مَا يَنْبُتُ فِي بِزْرِهٖ لَا فِي اَرُوْمَةٍ ثَابِتَةٍ۔ بقل ان سبزیوں کو کہتے ہیں جو اپنے بیجوں میں نشوونما پاتی ہیں اور خوراک حاصل کرنے کے لئے انکی لمبی چوڑی جڑھیں نہیں ہوتیں وَقَالَ ابْنُ فَارِسٍ كُلُّ مَا اخْضَرَّتْ بِهِ الْاَرْضُ ابن فارس کہتے ہیں کہ ایسا سبزہ جس سے زمین ہری بھری نظر آتی ہے بقل کہلاتا ہے وَالْفَرْقُ مَا بَيْنَ الْبَقْلِ وَدِقِّ الشَّجَرِ اَنَّ الْبَقْلَ اِذَا رُعِيَ لَمْ يَبْقَ لَهٗ سَاقٌ وَالشَّجَرُ تَبْقٰى لَهٗ سُوْقٌ وَاِنْ دَقَّتْ۔ اور بقل اور چھوٹے چھوٹے پودوں میں یہ فرق ہے کہ بقل کو جب جانور چر جائیں تو اسکی ٹہنی باقی نہیں رہتی لیکن پودوں کی ٹہنیاں کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتی ہیں (تاج) لسان میں ہے اَلْبَقْلُ مِنَ النَّبَاتِ مَا لَيْسَ بِشَجَرٍ دِقٍّ وَلَا جِلٍّ کہ چھوٹے یا بڑے درختوں کے علاوہ جو نباتات اور سبزی ہوتی ہے اس کو بقل کہتے ہیں (لسان العرب)

قِثَّائِهَا: اَلْقِثَّاءُ نَوْعٌ مِنَ الْفَاكِهَةِ يُشْبِهُ الْخِيَارَ تُسَمِّيْهِ عَوَامُّنَا الْمَقْتَي یعنی قِثَّاء ایک پھل کا نام ہے جو کھیرے کی طرح ہوتا ہے عوام الناس اسے ککڑی کہتے ہیں (اقرب)

فُوْمِهَا: اَلْفُوْمُ لُغَةٌ فِي الثُّوْمِ۔ ثوم جسے اردو میں لہسن کہتے ہیں اس کے مترادف لفظ عربی میں فوم ہے اس کا مفرد فُوْمَةٌ آتا ہے۔ نیز اَلْفُوْمُ کے معنی ہیں اَلْحِنْطَةُ گندم۔ اَلْحِمَّصُ چنے اَلْخُبْزُ روٹی وَسَائِرُ الْحُبُوْبِ الَّتِيْ تُخْبَزُ تمام غلے جن سے روٹی بناتے ہیں اَلسُّنْبُلَةُ غلہ کی بالی (اقرب)

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ: تَسْتَبْدِلُوْنَ اِسْتَبْدَلَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اِسْتَبْدَلَهٗ وَاسْتَبْدَلَ بِهٖ کے معنے ہیں ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لے لی لیکن جس لفظ پر بِ آئے وہ دی جاتی ہے اور جس پر بِ نہ آئے وہ لی جاتی ہے (اقرب) پس اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ کے معنے ہونگے کیا تم اچھی چیز دیکر ادنی چیز لیتے ہو۔

اَدْنٰى: اَدْنٰى اسم تفضیل کا صیغہ ہے بعض اسے دُنُوٌّ سے بناتے ہیں اور بعض دَنَاءَةٌ سے جو دَنَاءَة سے بناتے ہیں وہ اس کے معنے اَخَسُّ کے کرتے ہیں یعنی رذیل چیز اور جو اَدْنٰى کو دُنُوٌّ سے بناتے ہیں وہ اس کے معنے اَقْرَبُ کے کرتے ہیں یعنی زیادہ قریب لیکن پھر اس کے معنے یہ کرتے ہیں اَقَلُّ قِيْمَةً کم قیمت (لسان) مفردات راغب میں ہے يُعَبَّرُ بِالْاَدْنٰى تَارَةً عَنِ الْاَصْغَرِ فَيُقَابَلُ بِالْاَكْبَرِ کہ کبھی اَدْنٰى سے مراد سب سے چھوٹی چیز ہوتی ہے اس وقت اس کے مقابل پر اَكْبَرُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْاَرْذَلِ فَيُقَابَلُ بِالْخَيْرِ اور کبھی اَدْنٰى سے مراد کسی ارذل (ردی) چیز کے ہوتے ہیں۔

اس وقت اس کے مقابل خَیْر (یعنی بہتر چیز) کا لفظ بولا جاتا ہے وَتَارَۃً عَنِ الْاَوَّلِ فَیُقَابَلُ بِالْاٰخِرِ اور کبھی ادنیٰ سے مراد ابتدائی ہوتا ہے اور اس وقت اس کے مقابل آخر (بعد کی) کا لفظ بولا جاتا ہے وَتَارَۃً عَنِ الْاَقْرَبِ فَیُقَابَلُ بِالْاَقْصٰی اور کبھی اَدْنٰی ۔ اقرب یعنی قریب ترین کے معنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت ادنیٰ کے مقابل اقصیٰ یعنی دُور کی چیز کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (مفردات)

اِهْبِطُوْا :۔ (هَبَطَ یَهْبِطُ تَهْبُطُ) امر جمع کا صیغہ ہے۔ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ اٰخَرَ کے معنی ہیں اِنْتَقَلَ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۳۷

مِصْرًا :۔ اَلْمِصْرُ: اَلْحَاجِزُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ دو چیزوں کے درمیان کی روک اَلْحَدُّ بَیْنَ الْاَرْضَیْنِ خَاصَّۃً وَقِیْلَ الْحَدُّ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ دو ملکوں کے درمیان کی حد اور بعض ہر ایک چیز کی حد کو مصر کہہ دیتے ہیں اَلْکُوْرَۃُ اَیِ الْمَدِیْنَۃُ وَالصُّقْعُ اَوْ کُلُّ کُوْرَۃٍ یُقْسَمُ فِیْهَا الْفَیْءُ وَالصَّدَقَاتُ وہ جگہ جہاں کثرت سے مکانات اور محل ہوں۔ یا وہ آبادی جہاں صدقات تقسیم کئے جائیں یعنی بڑا شہر۔ مصر۔ شہر مصر کو بھی کہا جاتا ہے جسے آجکل قاہرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ نیز کبھی مصر کے معنوں میں وسعت دے لی جاتی ہے اور ہر شہر پر یہ لفظ اطلاق پاتا ہے (اقرب)

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّۃُ :۔ ضَرَبَهٗ بِیَدِهٖ وَبِالْعَصَا کے معنے ہیں اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا اس کو سونٹے کے ذریعہ سے یا ہاتھ سے مارا (اقرب) اور جب ضَرَبَ عَلٰی یَدَیْهِ کہیں تو معنے ہونگے۔ اَمْسَکَ اس کو خرچ کرنے سے روک دیا۔ اور ضَرَبَ الْقَاضِیْ عَلٰی یَدِ فُلَانٍ کے معنے ہیں حَجَرَ عَلَیْهِ وَمَنَعَهُ التَّصَرُّفَ کہ قاضی نے کسی کو معاملات اور مال میں تصرف کرنے سے روک دیا۔ ضَرَبَ عَلَیْهِمُ الْجِزْیَۃَ کے معنے ہیں وَضَعَهَا اَوْجَبَهَا عَلَیْهِمْ وَاَلْزَمَهُمْ بِهَا۔ ان پر ٹیکس لگا دیا جزیہ کا ادا کرنا لازم واجب کر دیا (اقرب) ذَلَّ کے معنے ہیں ھَانَ ذلیل و حقیر ہو گیا (اقرب) اور ذِلَّۃٌ کے معنے خواری والی حالت۔ اور جب ضَرَبَ عَلَیْهِ الذِّلَّۃَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَذَلَّهٗ اس کو ذلیل کر دیا (اقرب) امام راغب لکھتے ہیں کہ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّۃُ کے معنے ہیں اِلْتَحَفَتْهُمُ الذِّلَّۃُ یعنی ذلت نے انہیں چاروں طرف سے لپیٹ لیا (مفردات)

اَلْمَسْکَنَۃُ :۔ اَلْفَقْرُ مفلسی اَلذُّلُّ ذلت و خواری۔ اَلضَّعْفُ کمزوری (اقرب)

بَاءُوْ بِغَضَبٍ :۔ بَاءُوْ۔ بَاءَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَآءَ کے معنے ہیں رَجَعَ۔ لوٹا (اقرب) اور بَاءَ بِهٖ کے معنے ہیں اَرْجَعَهٗ یعنی اس کو لوٹا لیا (اقرب)

اَلْغَضَبُ :۔ کے اصل معنے ثَوَرَانُ دَمِ الْقَلْبِ اِرَادَۃَ الْاِنْتِقَامِ کے ہیں یعنی غضب جرم کی سزا دینے کے ارادہ پر دل میں خون کے جوش مارنے کو کہتے ہیں لیکن جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے صرف جرم کی سزا دینے کے ہوتے ہیں۔ دوسری باتیں اس وقت مد نظر نہیں ہوتیں (مفردات) لفظ غَضَب کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۷ لسان میں ہے بَاءَ بِذَنْبِهٖ کے معنے ہیں اِحْتَمَلَهٗ وَصَارَ الْمُذْنِبُ مَاْوَی الذَّنْبِ اس نے گناہ کا بوجھ اُٹھایا اور گناہ گار گناہ کا مقام بن گیا یعنے گناہ اس سے چمٹ گیا۔ پھر لکھا ہے کہ نیز بَاءَ بِذَنْبِهٖ کے معنے ہیں کَانَ عَلَیْهِ عُقُوْبَۃُ ذَنْبِهٖ کہ اس پر اس کے قصور اور جرم کی سزا وارد ہوئی۔ (لسان) امام راغب بَاءُوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ کے معنے کرتے ہوئے لکھتے ہیں اَیْ حَلَّ مَبْوَأً وَمَعَهٗ غَضَبُ اللّٰهِ اَیْ عُقُوْبَتُهٗ کہ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنے ہیں وہ اپنی جائے رہائش پر اس طرح ٹھہرا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا۔ وَبِغَضَبٍ فِیْ مَوْضِعِ حَالٍ اَیْ رَجَعَ وَجَاءَ وَحَالُهٗ اَنَّهٗ مَغْضُوْبٌ یعنی بِغَضَبٍ جو بَآ کے بعد آتا ہے وہ حالت کے اظہار کے لئے آتی ہے یعنی بَاءَ بِغَضَبٍ کہیں گے تو اس کے معنے ہونگے ...

اَلْمَسْکَنَۃُ
اِهْبِطُوْا
بَاءُوْ بِغَضَبٍ
مِصْرًا
اَلْغَضَبُ

لوٹا درانحالیکہ وہ غضب کا مورد ہو رہا تھا۔ پھر لکھا ہے وَ اِشْتِغَالُ بَا تَنْبِیْھاً عَلٰی اَنَّ مَکَانَہُ الْمُوَافِقَ یَلْزَمُہٗ فِیْہِ غَضَبُ اللّٰہِ فَکَیْفَ غَیْرُہٗ مِنَ الْاَمْکِنَۃِ اور بَاءَ فعل کے بعد لفظ بَا کا صلہ لانا ان معنوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا یہ حال ہے کہ ان کے اپنے گھر میں ان پر غضب نازل ہو رہا ہے۔ اگر وہ اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ ہوں تو نہ معلوم ان کا کیا حال ہو۔ (مفردات) پس بَاءُوْ بِغَضَبٍ کے ایک معنے ہونگے۔ وہ غضب کا مورد بن گئے یا ان کے گھروں میں غضب نے اپنا گھر بنا لیا۔

یَکْفُرُوْنَ

یَکْفُرُوْنَ :۔ کَفَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ کے معنے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۵

عَصَوْا

اٰیٰتٌ

اٰیٰتٌ :۔ اٰیٰتٌ اٰیَۃٌ کی جمع ہے اٰیَۃٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۴۰

یَقْتُلُوْنَ

یَقْتُلُوْنَ :۔ قَتَلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور قَتَلَ کے معنے حل لغات سورۃ ہذا ۵۵ میں مندرجہ ذیل لکھے جاچکے ہیں (۱) کسی کو قتل کر دیا (۲) کسی سے قطع تعلق کر لیا (۳) کسی کو ذلیل کر دیا (۴) کسی کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں کہتے ہیں ھُوَ قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ اَیْ یُطْعِمُ فِیْمَا یُدْفِئُ یعنی جب کسی کے متعلق قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ کا فقرہ کہیں تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ غرباء کو سردیوں میں کپڑے اور کھانا کھلا کر سردی کے اثر سے بچاتا ہے (لسان) نیز کہتے ہیں قَتَلَہٗ اور مطلب ہوتا ہے اَصَابَ مَقَاتِلَہٗ کہ اس کے جسم کو چھوا یعنی مارا (مفردات) پس یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ کے معنی ہونگے (۱) انہوں نے نبیوں کو مارا (۲) ان سے بے تعلقی کا برتاؤ کیا (۳) ان کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کی (۴) نبیوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

یَعْتَدُوْنَ

اَلْحَقُّ

اَلْحَقُّ :۔ حَقَّہٗ (یَحُقُّ) حَقًّا کے معنی ہیں غَلَبَہٗ عَلَی الْحَقِّ اس پر حق میں غالب آیا۔ راستی میں غالب آیا۔ اور حَقَّ الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَثْبَتَہٗ وَاَوْجَبَہٗ کسی امر کو ثابت کیا اور اس کو لازم کیا وَکَانَ عَلٰی یَقِیْنٍ مِنْہُ کسی معاملہ کے متعلق یقینی خبر معلوم کر لی اور جب حَقَّ الْخَبَرَ کہیں تو اس وقت معنے ہونگے وَقَفَ عَلٰی حَقِیْقَتِہٖ خبر کی حقیقت کو معلوم کر لیا اور حَقَّ الْاَمْرُ کے معنے ہیں وَجَبَ وَثَبَتَ کوئی امر ثابت ہوگیا اور واجب ہوگیا (اقرب) امام راغب کہتے ہیں کہ اَلْحَقُّ کا مفہوم کئی طرح ادا کیا جاتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے یُقَالُ فِی الْفِعْلِ وَالْقَوْلِ الْوَاقِعِ بِحَسْبِ مَا یَجِبُ وَفِی الْوَقْتِ الَّذِیْ یَجِبُ کہ کسی فعل یا بات کا برمحل۔ مناسب حال اور باموقعہ کرنے کا نام اَلْحَقُّ ہے (مفردات) اَلْحَقُّ کی مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۴۳

عَصَوْا :۔ عَصٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور عَصَاہُ (یَعْصِیْہِ) کے معنے ہیں خَرَجَ عَنْ طَاعَتِہٖ وَخَالَفَ اَمْرَہٗ وَعَانَدَہٗ اس کی اطاعت سے نکل گیا اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اور اس کی دشمنی کی ٹھان لی (اقرب) پس عَصَوْا کے معنے ہونگے انہوں نے نافرمانی کی۔ اطاعت سے نکل گئے۔

یَعْتَدُوْنَ :۔ اِعْتَدٰی سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِعْتَدٰی عَلَیْہِ کے معنے ہیں ظَلَمَہٗ اس پر ظلم کیا۔ (اقرب) اَلْاِعْتِدَاءُ :۔ مُجَاوَزَۃُ الْحَقِّ یعنے اپنے حق سے تجاوز کرنے کا نام اِعْتِدَاء ہے (مفردات) لسان میں ہے۔ اَلْاِعْتِدَاءُ اور اَلتَّعَدِّیْ اور اَلْعُدْوَانُ کے معنے ہیں اَلظُّلْمُ ظلم اور جب اِعْتَدٰی فُلَانٌ عَنِ الْحَقِّ یا اِعْتَدٰی فَوْقَ الْحَقِّ کہیں تو اس کے معنے ہونگے جَاوَزَ عَنِ الْحَقِّ اِلَی الظُّلْمِ کہ حق سے تجاوز کرتے ہوئے ظلم کو اختیار کر لیا (لسان) پس یَعْتَدُوْنَ کے معنے ہونگے (۱) وہ حق سے تجاوز کرتے تھے (۲) وہ ظلم کرتے تھے۔

تفسیر۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی پھر ایک اور ناشکری کا ذکر کیا گیا ہے جو مَنّ و سَلْوٰی کے انعام کے

متعلق معلوم ہوتی ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک بنی اسرائیل کو منّ و سَلوٰی ملتا رہا۔ کبھی کبھی درمیان میں شہروں میں جانے اور وہاں رہائش اختیار کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے ایک ہی قسم کی غذا اور دیر تک کھانے کی برداشت نہ کر سکے گو حق یہ ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی نہ تھی اس میں بھی تنوّع موجود تھا مگر بنی اسرائیل مصر میں رہ کر شہری زندگی کے عادی ہو چکے تھے وہ بھنی ہوئی اور تلی ہوئی اور دم پخت چیزوں کے شوقین تھے پس وہ جنگلی غذاؤں پر مطمئن نہ تھے اور ان جنگلی غذاؤں کے پیچھے جو حکمت تھی اسکی قدر نہ کرتے تھے آخر ایک دن تنگ آکر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اے موسیٰ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے ہماری برداشت سے یہ بات بڑھ گئی ہے بیشک تجھ میں طاقت ہوگی کہ ایک قسم کے کھانے پر صبر کرے اور تجھے اس کے بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہوگی مگر تو ہماری خاطر (یہ مفہوم اُدْعُ لَنَا کے الفاظ سے نکلتا ہے جس کے معنے ہیں خدا تعالیٰ سے ہماری خاطر دُعا کر) اللہ سے دُعا کر کہ وہ ہمارے لئے زمین کی ہر قسم کی ترکاریاں نکالے یعنی ہمیں کسی ایسی جگہ پر ٹِک کر رہنے کی اجازت دی جائے جہاں کھیتی باڑی ہو سکتی ہو اور ہر قسم کے غلّے اور دالیں اور ترکاریاں اور سبزیاں ہم کو میسر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ان سے فرمایا کہ کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلہ میں ایک ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو۔ عربی کا محاورہ ہے کہتے ہیں اِسْتَبْدَلَهٗ بِهٖ۔ اَخَذَهٗ مَكَانَهٗ یعنی جس پر حرف ب آتا ہے وہ چیز چھوڑی جاتی ہے اور جو بغیر ب کے مفعول ہوتا ہے وہ لیا جاتا ہے پس اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ کے معنے ہونگے کہ خَیْر کو چھوڑ کر اَدْنٰی لینا چاہتے ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ خیر کیا ہے اور اَدْنٰی کیا ہے بعضوں نے کہا ہے کہ خیر سے مراد گوشت ہے اور ادنیٰ سے مراد ترکاریاں ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ ترکاریاں بھی خیر ہیں اور گوشت بھی خیر ہے اور نہ شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اچھا کھانا ملتا ہو تو دوسرا نہ کھاؤ بسا اوقات انسان کا دل پلاؤ کو نہیں کرتا دال کو کرتا ہے اور یہ بات خدا تعالیٰ کے عذاب یا اُسکی ناراضگی کا موجب نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ اُن غذاؤں کا جو جنگل میں بغیر محنت کے ملتی ہیں اُن غذاؤں سے مقابلہ کیا گیا ہے جو شہروں میں محنت و مشقت کے بعد ملتی ہیں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان جنگلوں میں اس لئے رکھا تھا تا غلامی کا اثر دُور ہو جائے اور مصریوں کی صحبت میں جن گناہوں کی عادت انہیں پڑ گئی تھی ان کا ازالہ ہو جائے اسی طرح غیر قوموں سے مل کر اُن کے مشرکانہ جذبات بار بار نہ بھڑکتے رہیں بلکہ موسیٰؑ کی صحبت میں مستقل طور پر رہ کر توحید کو وہ اپنے اندر جذب کر لیں۔ جنگل میں آخر وہی غذائیں مل سکتی ہیں جو جنگل کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے مہیا کر دیں۔ سبزیاں۔ ترکاریاں اور تمدنی طور پر پکائے ہوئے کھانے تو آبادیوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور وہیں میسر آ سکتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے مطالبے سے بھی یہ مُراد نہ تھی کہ اُن کو ککڑیاں اور ترکاریاں ملیں بلکہ اُن کا بھی یہ مطلب تھا کہ ہم کو آبادیوں میں رہنے کی اجازت دی جائے ہم اس بدوی زندگی سے تنگ آ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا کہ کیا تم اچھی چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو لینا چاہتے ہو تو اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ ترنجبین یا شہد یا کھمبیوں یا بٹیروں کو چھوڑ کر تم گندم اور ترکاریوں کو کیوں لینا چاہتے ہو بلکہ اس سے بھی یہ مراد ہے کہ کیوں تم اس اچھی زندگی کو چھوڑ کر جو تمہیں حکومت اور آیندہ فاتحانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنا رہی ہے اس زندگی کو قبول کرنا چاہتے ہو جو تمہاری حیثیت کو معمولی زمینداروں کی حیثیت میں تبدیل کر دے گی۔ تمہارا ایسا مطالبہ یا تو اِس وجہ سے ہے کہ تم بالکل کم عقل ہو اور اس زندگی کی قدر کو نہیں سمجھتے جو خدا تمہیں دینے والا ہے اور یا پھر تم کو خدا تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان نہیں۔ تم سمجھتے ہو موسیٰؑ یونہی جھوٹ بول رہا ہے بادشاہت ہمیں کہاں ملتی ہے کیوں زمیندارے کی زندگی سے بھی محروم رہیں اور یہ دونوں باتیں چونکہ بے ایمانی اور دناءت پر دلالت کرتی تھیں

۲/۱
وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ میں بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر

اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈانٹا اور ان پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

بنی اسرائیل کے ایک کھانے پر تسلی نہ پانے کا ذکر بائبل میں

بنی اسرائیل کا ایک کھانے پر تسلی نہ پانے کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے چنانچہ گنتی باب ۱۱ آیت ۵ میں لکھا ہے۔

"ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔"

اِهْبِطُوْا مِصْرًا۔ بعض مفسرین نے ناواقفی سے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ مصر جو ملک مصر کا دارالخلافہ ہے اُس میں ان کو جانے کا حکم دیا گیا تھا اور عیسائی مصنفین نے ان معنوں کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس پر خوب بغلیں بجائی ہیں اور قرآن کریم کی ناواقفیت پر ہنسی اُڑائی ہے حالانکہ ناواقف مفسرین کا یہ بیان بھی غلط ہے اور معترضین کا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ ملک مصر کا دارالخلافہ مصر تو غیر منصرف ہے یعنی اس پر تنوین نہیں آسکتی چنانچہ قرآن کریم میں دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ (یوسف ع ۱۱) اسی طرح فرماتا ہے اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ (زخرف ع ۵) لیکن اس آیت میں تو مِصْرًا فرمایا ہے نہ کہ مِصْرَ۔ اور جب منون مصر آئے تو اس کے معنے محض شہر کے ہوتے ہیں نہ کہ ملک مصر کے دارالخلافہ کے۔ اور ملک مصر کا دارالخلافہ مصر اس سے مراد نہیں ہوتا۔ پس یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت کا ثبوت ہے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ پر صرف یہ اجازت دی ہے کہ کسی شہر میں چلے جاؤ تمہیں وہاں یہ چیزیں مل جائیں گی۔

باءو بغضب کا مطلب

اهبطوا مصرا سے مراد ملک مصر کا دارالخلافہ نہیں

وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اس میں یہ بتایا ہے کہ چونکہ انہوں نے زمینداروں کو ترجیح دی اور بادشاہت کے رستوں کو اپنے لئے بند کرنا چاہا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر ذلت اور مسکنت نازل فرمادی۔ خدا کی قدرت ہے کہ پیشگوئیوں کے ماتحت اس کے بعد بنی اسرائیل کو حکومت تو ملی لیکن ان کا خدا تعالیٰ کے وعدوں سے بار بار مونہہ پھیرنا ان کے لئے کچھ ایسا وبالِ جان بن گیا کہ اب دو

بنی اسرائیل کے نبیوں کو قتل کرنے کا مطلب

ہزار سال سے وہ بادشاہت سے محروم ہیں اور تجارت اور زمیندارہ کے سوا اُن کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ بَآءَ کے معنے اوپر بتائے جاچکے ہیں یعنے اُٹھالینا اور ایسی طرح اُٹھانا کہ وہ اُس چیز کا مستقل محل بن جائے پس بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنے یہ ہونگے کہ وہ خدا کے غضب کو لے کر اپنے شہروں میں اُترے۔ گویا اپنا وطن اور اپنا ٹھکانا جو سب سے زیادہ امن کی جگہ ہوتی ہے وہی ان کے لئے عذاب اور تکلیف کی جگہ بن گئی۔ یوں بھی آیندہ زمانہ کے واقعات نے بتا دیا کہ بنی اسرائیل کا وطن کنعان ہمیشہ مصائب کی آماجگاہ بنا رہا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ کی باتوں پر ایمان کی کمی نتیجہ تھا نبیوں کے مقابلہ کا۔ جب انہوں نے نبیوں کا ادب نہ کیا تو رفتہ رفتہ اُس کلام کا ادب اور اس پر ایمان بھی جاتا رہا جو وہ لائے تھے اور نبیوں کا مقابلہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ بدکار اور گنہگار تھے۔ نبیوں نے اُن کو ہدایت کی تعلیم دی جو اُنہیں ناپسند معلوم ہوئی اور انہوں نے ان کا مقابلہ شروع کر دیا۔ علت و معلول کے اصل پر غور کرنے والے لوگ اس بات سے لطف اُٹھا سکتے ہیں کہ کس طرح قرآن کریم ہر ایک بدی یا نیکی کی جڑ اور پھر اُسکی جڑ بتاتا ہے تاکہ انسان کسی بدی سے بچنے کے لئے پہلے اسکی جڑ کو کاٹے تا ایسا نہ ہو کہ کچھ مدت کے بعد وہ بدی پھر عود کر آئے۔

یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ بنی اسرائیل نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے۔ قتل کے معنے اس جگہ قتل کے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اس وقت تک کسی نبی کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا تھا۔

قَتَلَ کے معنے لغت میں علاوہ قتل کرنیکے یہ بھی ہیں اوّل لعنت کہتے ہیں قَتَلَهُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی۔ (لسان)

دوم۔ قَتَلُوْا فُلَانًا۔ اس سے اعراض کرو (لسان)

وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ

نیز نصاریٰ اور صابی (ان میں سے) جو (فریق) بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر (کامل) ایمان

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ

لایا ہے۔ اور اس نے نیک عمل کئے ہیں یقیناً ان کے لئے ان کے

سوم۔ فُلَانٌ قَتَلَہٗ۔ مِنَ الْقِتَالِ۔ قِتَالٌ سے نکلا ہے جس کے معنے اَلْجِسْمُ کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ صاحب قتالہٗ اس کے جسم کو چھوا لیتے مارا (اقرب)

چہارم۔ کہتے ہیں فُلَانٌ قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ (لسان) فلاں شخص سردیوں کا قتل کرنے والا ہے یعنی غریبوں کو کپڑے دیکر سردی کا اثر دور کرتا ہے۔

پانچویں کہتے ہیں قَتَلَہُ الْعِشْقُ۔ عشق نے اس کو مار ڈالا یعنی اس کی زندگی خراب کر دی اور اس کو دُکھ میں ڈال دیا (لسان) پس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نبیوں کو تلوار سے قتل کرتے تھے کیونکہ موسیٰؑ کے زمانہ تک کسی نبی کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا تھا۔ پس اس جگہ پر قتل کرنے سے مُراد یہ ہوگی کہ وہ نبیوں کو پیٹتے تھے یا ان سے بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے یا یہ کہ ان کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن شریف میں بھی قتل کا لفظ مارنے پیٹنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (آل عمران ع ۲) چونکہ یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق ہے اس لئے اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملے کرتے تھے یا قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے یا آپ کے کام میں روک ڈالتے تھے کیونکہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو انہوں نے قتل کیا اور نہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔

ایک اور جگہ قرآن کریم میں آتا ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّکُمْ (المومن ع ۴) یعنی آل فرعون میں سے ایک ایسا شخص جو موسیٰؑ پر ایمان لایا تھا لیکن اپنا ایمان چھپا کر رکھتا تھا اُس نے فرعون اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔ کیا تم ایک ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے بڑے بڑے نشانات لایا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرعون یا اس کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔

قتل قتل کا ہم سے مارنے کے معنے اور کئی حملہ کرنے کے معنے آیا ہے۔

پس یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ کے معنے قتل کا ارادہ کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل چونکہ اللہ تعالےٰ کے نشانوں کا انکار کرتے تھے اور اللہ کے نبیوں موسیٰؑ اور ہارونؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے یا اُن سے قطع تعلق کرتے یا اُن سے لڑتے جھگڑتے یا اُن کی تعلیم کے پھیلنے میں روک بنتے تھے اس وجہ سے وہ نیکی سے محروم ہوتے جاتے تھے اور گناہوں میں ترقی کرتے جاتے تھے اور یہ انبیاء کے مقابلہ کرنے کا گناہ اس سے اس لئے صادر ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعتوں میں اعتدال کا مادہ جاتا رہا تھا جوشیلی طبیعتیں تھیں اور ہر بات میں حد سے نکل جانے کے عادی تھے جس کی طبیعت میں غصہ اور جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ بڑی سے بڑی نیکیوں سے محروم ہو جاتا اور بڑے سے بڑے گناہوں پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ کے معنے

رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

رب کے پاس ان کا (مناسب) اجر ہے اور انہیں نہ (تو مستقبل کے متعلق) کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ (ماضی پر) وہ غمگین ہونگے۔

۲۵ حل لغات ۔ اٰمَنُوْا ۔ اٰمَنَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اٰمَنَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ع۱

هَادُوْا ۔ هَادَ (یَهُوْدُ هَوْدًا) سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور هَادَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں تَابَ وَرَجَعَ اِلَى الْحَقِّ اس نے توبہ کی اور حق کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ جب کوئی شخص غلطی کرکے اس سے توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس وقت کہتے ہیں هَادَ الْمُذْنِبُ اِلَى اللّٰهِ کہ قصوروار نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ نیز کہتے ہیں هَادَ الرَّجُلُ اور مطلب یہ ہوتا ہے دَخَلَ فِي الْيَهُوْدِيَّةِ کہ فلاں شخص نے یہودی مذہب اختیار کرلیا جب هَادَ فِي الْمَنْطِقِ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنے ہونگے اَدَاهُ بِسُكُوْنٍ وَرِفْقٍ کہ اس نے نرمی سے کلام کیا۔ هَادَ سے اسم فاعل هَائِدٌ بنے گا۔ اور هَائِدٌ کی جمع هُوْدٌ ہوگی (اقرب) پس اَلَّذِيْنَ هَادُوْا کے معنے ہونگے وہ لوگ جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کیا۔

اَلنَّصَارٰى ۔ تُبَّعُ الْمَسِيْحِ یعنی مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ نَصَارٰى جمع ہے بعض نے اس کا مفرد نَصْرَانِيٌّ لکھا ہے یعنی ناصرہ بستی کی طرف منسوب ہونے والا بعض کا خیال ہے کہ نَصَارٰى نَصْرَانٌ کی جمع ہے (یعنی نَصْرَان بستی کی طرف منسوب ہونے والا) اور بعض نے اس کو نَصْرِيٌّ کی جمع بتایا ہے یعنی نصرہ بستی کی طرف منسوب ہونے والا (اقرب) امام راغب کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کے پیروؤں کا نام اس واسطے نصاریٰ رکھا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو کہا کہ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ کہ اللہ کے کام میں میرا کون مددگار ہوگا تو انہوں نے جواباً کہا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ یعنے ہم مددکرنے کے لئے تیار ہیں۔ چونکہ وہ مدد کے لئے تیار ہوگئے اس لئے اُن کو نَصَارٰى کہا گیا (مفردات) لیکن یہ معنے درست نہیں حق یہی ہے کہ نصرانی کا لفظ ناصرہ سے نکلا ہے دیکھو تفسیری نوٹ۔

اَلصَّابِئِيْنَ :۔ اَلصَّابِئُوْنَ و اَلصَّابِئِيْنَ صَابِئٌ کی جمع ہے جو صَبَأَ کا اسم فاعل ہے۔ کہتے ہیں صَبَأَ الرَّجُلُ صَبْأً اور مراد یہ ہوتی ہے خَرَجَ مِنْ دِيْنٍ اِلٰى دِيْنٍ اٰخَرَ کہ اس نے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیا (اقرب) نیز لکھا ہے اَلصَّابِئُوْنَ قَوْمٌ يَعْبُدُوْنَ النُّجُوْمَ وَقِيْلَ قَوْمٌ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى دِيْنِ نُوْحٍ قِبْلَتُهُمْ مَهَبُّ الشَّمَالِ عِنْدَ مُنْتَصَفِ النَّهَارِ کہ صَابِئُوْنَ ایک قوم ہے جو ستاروں کی پرستش کرتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صَابِئُوْنَ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مذہب پر چلتے ہیں اور ان کا قبلہ بادشمال کے چلنے کے رُخ پر ہے۔ (اقرب)

عَمِلَ صَالِحًا :۔ صالح کے معنے وہ عمل جو فساد سے پاک ہو اور با مصلحت اور مناسب حال ہو عمل صالح کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات ۲۲ سورۃ ہذا۔

اَجْرُهُمْ :۔ اَلْاَجْرُ :۔ اَلثَّوَابُ بُدٌ (اقرب) اَلْاَجْرُ وَالْاُجْرَةُ مَا يَعُوْدُ مِنْ ثَوَابِ الْعَمَلِ دُنْيَوِيًّا كَانَ اَوْ اُخْرَوِيًّا جو کسی کام کا بدلہ ملتا ہے خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی اُسے اجر کہتے ہیں۔ (مفردات)

رَبِّهِمْ :۔ لفظ رَبّ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ع۱

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ :۔ خَوْف اور حُزْن کے معنے مفصل طور پر حل لغات سورۃ بقرہ ع۳ میں بتلائے جا چکے ہیں خَوْف اور حُزْن میں یہ فرق ہے کہ خوف آیندہ زمانے کے متعلق ہوتا ہے اور

اٰمَنُوْا
هَادُوْا
اَلصَّابِئِيْنَ
عَمِلَ صَالِحًا
اَلنَّصَارٰى
اَجْرُهُمْ
رَبِّهِمْ
لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

محزون کسی واقعہ گزشتہ کی بناء پر ہوتا ہے اسی لئے ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ انہیں نہ تو (مستقبل کے متعلق) کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ (ماضی پر) وہ غمگین ہونگے۔

تفسیر۔ ھَادُوْا۔ ھَادَ جیسا کہ لغت میں بتایا جا چکا ہے یہودی ہونے کو کہتے ہیں گو حلِ لغات میں ھَادَ کے اور معنے بھی بتائے جا چکے ہیں لیکن یہ توارد ہے کہ عبرانی کا ایک لفظ عربی کے ایک لفظ کے مشابہ ہو گیا ہے ان معنوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال نہیں کر لینا چاہیئے کہ یہودی کو اس لئے یہودی کہتے ہیں کہ اس میں ھُدْنَا والے معنے پائے جاتے ہیں بلکہ عربی ھَادَ اور ہے اور یہ ھَادَ یَھُوْدُ جو یہودی قوم کے نام کو بتانے کے لئے ہے اور ہے یہ لفظ درحقیقت اس نام کا معرّب ہے جو بنی اسرائیل کے لئے ہجرت بابل کے بعد خود یہودیوں اور ارد گرد کے لوگوں میں رائج ہو گیا تھا چنانچہ عبرانی میں اسے 'یَہُوْدِیْ' کہتے ہیں اور آرمی زبان میں 'یہودائی' کہتے ہیں اور پرانی بابلی زبان میں اسے 'یاؤدائی' کہتے ہیں اور یہ لفظ 'یہودا' سے بنا ہے جو اس علاقہ کا نام ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل اور قبیلہ کے لوگ حکومت کرتے رہے ہیں اور جس کا دارالخلافہ یروشلم تھا (انسائیکلوپیڈیا بائبلیکا کالم ۲۳۵۰ و جیوش جلد ۷) درحقیقت اس علاقہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہوداہ کی نسل کا زور رہا تھا جس کا عبرانی تلفظ یہوداہ ہے اس لئے اس علاقہ کا نام ہی 'یہودا' ہو گیا اور پھر اس علاقہ میں رہنے والوں کو یہودی نام مل گیا۔ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بغاوت ہو گئی تھی اس لئے بنو یہودا اور بنو بنیامین حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو بیٹوں کی اولاد تو اس علاقہ میں رہ گئی ہے۔ باقی دس قبائل نے شمال میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی اور ان لوگوں کے مذہب میں کچھ خرابیاں واقع ہو گئیں نبیوں کی بعثت بھی زیادہ تر اسی علاقہ میں ہوتی رہی جس میں بنو یہودا رہتے تھے پس آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کے دو فرقوں میں امتیاز کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ یروشلم کے علاقہ کے باشندوں کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط یہودی کا لفظ ایک نئی اصطلاح بن گیا اور اس کے یہ معنے کئے جانے لگے کہ وہ جو موسوی شریعت کا سچا پابند ہے۔ اس یہودی کے لفظ کو عربوں نے اپنی زبان میں استعمال کیا اور چونکہ یہود کا لفظ عربی کے مضارع کے صیغہ سے مشابہ تھا انہوں نے اس سے ماضی کا صیغہ ھَادَ بنا لیا۔ مگر ایک مستقل لفظ ھَادَ بھی عربی میں ہے وہ لفظ یہودیوں یا ان کے قبیلوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اس کے معنے بالکل اور ہیں جیسا کہ حلِ لغات میں بتائے جا چکے ہیں۔

یہود کو یہود کہے جانے کی وجہ

پس ان معنوں کے رو سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ ھَادَ کا جو لفظ ہے یہ عربی ہے بلکہ ھَادَ کا لفظ یہودی لفظ سے ماضی کا صیغہ بنایا گیا ہے اور یہودی کا لفظ یہودا سے بنا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "یہودا" کے علاقہ میں رہنے والا۔ اور اس کے اصطلاحی معنے ہیں موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا متبع۔ تعجب ہے کہ قرآن کریم جہاں کہیں مذہب کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں یہودی لفظ استعمال کرتا ہے اور جہاں قوم کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں بنو اسرائیل کا لفظ استعمال کرتا ہے اور قرآن کریم پر عیسائی مصنف یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی تاریخ سے واقف نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے اسرائیل اور یہود کے لفظ کا بالکل صحیح استعمال کیا ہے جبکہ خود انجیل میں اس لفظ کا غلط استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے اسرائیلی نسل کے آدمیوں کے لئے گئے ہیں اور آج بھی یورپ کے لوگ اس لفظ کو غلط استعمال کرتے رہتے ہیں (اس کے لئے دیکھو نوٹ ۱۱۵ سورۂ بقرہ زیر آیت یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ (الخ)

قرآن مجید کا بنو اسرائیل اور یہود ہر دو الفاظ کو مختلف مفہوموں میں استعمال کرنا

نَصَارٰی۔ نَصْرَانِیٌّ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں نَاصِرَہ سے تعلق رکھنے والے یہود اور ممالک عربیہ کے لوگ اس نام سے مسیحیوں کو یاد کرتے تھے۔

مسیحیوں کو نصاریٰ کہے جانے کی وجہ

ناصرہ جس سے یہ لفظ نکلا ہے جلیل کا ایک گاؤں تھا اور پرانے زمانہ میں 'مسیح کے اپنے ملک' کے نام سے مشہور رہا کیونکہ یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بپتسمہ لینے سے پہلے حضرت مسیح اپنے

خاندان سمیت وہیں رہا کرتے تھے (دیکھو متی باب ۲ آیت ۲۳ مرقس باب ۱ آیت ۹ لوقا باب ۲ آیت ۳۹ یوحنا باب ۱ آیت ۴۶ اعمال باب ۲ آیت ۲۲) اسی گاؤں کے نام کی وجہ سے ابتدائی یہودی مذہبی کتب میں حضرت مسیح کے ماننے والوں کو نصرانی لکھا جاتا تھا ان سے عربوں نے اس کو اخذ کیا اور آج تک ان میں یہی نام مشہور ہے (خدا کی قدرت ہے کہ اس زمانہ میں امتِ محمدیہ کے مسیح موعود کے اتباع کو بھی ان کے مخالف قادیانی کہتے ہیں یعنے امام کی جائے قیام کی طرف انہیں منسوب کرتے ہیں یہ مشابہت بھی نہایت عجیب ہے) رومی لوگ بھی ابتدائی زمانہ سے مسیحی لوگوں کو نصرانی کہتے تھے (دیکھو اعمال باب ۲۴ آیت ۵) لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات ہے کہ ناصرہ جس کے نام پر مسیح علیہ السلام کے اتباع نے نام پایا ایک لمبے عرصہ تک اس میں یہودی ہی بستے تھے مسیحی صدیوں سال بعد جا کر اس میں بسے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۳ کالم ۳۳۵۹-۳۳۶۰) متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح کے مجازی والد یوسف نجار اس جگہ ایک خواب کی بناء پر جا کر رہتے تھے لکھا ہے "اور خواب میں آگاہی پا کر گلیل کی اطراف میں روانہ ہوا اور ایک شہر میں جس کا نام ناصرت تھا جا کے رہا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا (متی باب ۲ آیت ۲۲ و ۲۳) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بائبل میں کہیں بھی اس پیشگوئی کا ذکر نہیں سو یا تو یہ الہام کسی قریب کے زمانہ کے کسی ولی کا ہوگا یا کسی اعتراض سے بچنے کے لئے انجیل نویسوں نے اس قسم کی تعبیر نصرانی کے لفظ کی کر لی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تبعین محمدؐ کے اتباع کی مسیح ناصری کے تبع سے ایک مشابہت۔

اَلصَّابِئِیْنَ ۔ صابی قوم اس وقت مفقود ہے گو بعض قومیں عراق میں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے متعلق شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ صابی الاصل ہیں گزشتہ زمانہ میں عیسائیوں کا ایک فرقہ جو علاقہ بابل میں رہتا تھا صابی کہلاتا تھا اور ان کو الکسائٹس (Elkesaitas) بھی کہتے تھے وہ مذہباً یوحنا بپتسمہ دینے والے کے متبعین کے ساتھ زیادہ ملتے تھے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا) اسی طرح صابی بعض ستارہ پرست اقوام کو بھی کہتے ہیں جو عراق عرب وغیرہ میں کسی وقت پائی جاتی تھیں اور حران ان کا مرکز تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) درحقیقت یہ لوگ ستارہ پرست تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کا نام صابی بجائے ستارہ پرستوں کے استعمال ہونے لگ گیا۔ یہ لوگ ستارہ پرست تھے اور ایک الہامی کتاب کے ماننے والے تھے۔ تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا یہ لوگ اپنے آپ کو صابی کہتے تھے یا لوگوں نے ان کا نام صابی رکھ دیا تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ مامون کے وقت میں بھی اس قبیلہ کے کچھ لوگ بھی موجود تھے کیونکہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مامون نے رومی حکومت پر حملہ کرتے وقت اپنے رستہ میں ان لوگوں کو دیکھا ان کے لمبے لمبے بالوں اور عجیب قسم کے لباس اور غیر معروف مذہبی رسوم کو دیکھ کر اس نے حکم دیا کہ یا تو تم اپنے آپ کو کسی اہل کتاب مذہب سے وابستہ کر لو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ انہوں نے مسلمان فقہاء سے مشورہ کیا اور ان کے مشورہ کے مطابق اپنا نام صابی رکھ لیا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲۰ صفحہ ۴۹۰) میرے نزدیک یہ بات کہ انہوں نے بعد میں اپنا نام صابی رکھا غلط ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ان کا چھوٹا سا قبیلہ الگ پڑا ہوا ہو اور وہ اپنا نام بھی بھول گئے ہوں پھر انہوں نے مسلمان علماء کے مشورہ سے اپنا نام صابی بتایا ہو کیونکہ اسلامی تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ حران کے لوگوں کا تعلق مامون کے زمانہ سے بہت پہلے اسلامی حکومت سے قائم ہو چکا تھا۔

صابی قوم کون تھی؟

یہ کہ قرآن شریف میں صابئین کے لفظ سے کون صابی مراد ہیں تعیین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میرے نزدیک چونکہ صابی کا نام کئی اہل کتاب قوموں کی طرف منسوب کرتی تھیں عربی زبان میں صابی کے معنے اہل کتاب کے ہو گئے۔ یہود اور نصاریٰ کو تو وہ جانتے تھے اس لئے انہیں تو وہ خاص نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کے سوا باقی تمام قومیں جن کی نسبت عرب سمجھتے تھے کہ یہ الہامی کتاب کے قائل ہیں انہیں وہ صابی کے نام سے یاد کر لیتے تھے پس گو صابی کا نام کسی وجہ سے کسی ایک نے یا دوسری وجہ سے بعض اور قبائل نے اپنے لئے استعمال کیا تھا لیکن عربوں کے نزدیک اس کے معنے ہر ایسی قوم کے تھے جو اہل کتاب ہو اور

صابی کے معنے اہل کتاب کے۔

یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ ہو چنانچہ جب اسلام نیا نیا نکلا تو جب تک عرب کے لوگ اسلام کے نام اور اسلام کے مذہب سے مانوس نہیں ہوئے مسلمانوں کو بھی وہ صابی کہا کرتے تھے جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو کہتے صَبَأَ فُلَانٌ فلاں شخص صابی ہو گیا۔ میرے نزدیک کوئی حرج نہیں کہ ہم قرآن شریف میں بھی اس لفظ کے یہی معنی کریں یعنی قرآن شریف نے بھی عربی محاورہ کے مطابق صابی سے مراد اہل کتاب کے سوا لئے ہوں اور اس آیت سے مراد یہ ہو کہ یہودی ہو یا نصرانی ہو یا اور کسی الہامی کتاب کی طرف منسوب ہونے والا ہو ہر ایک قوم کے متعلق اللہ کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر سچا ایمان لائیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے تو وہ کبھی تباہ نہیں ہونگے۔

جیساکہ اوپر کی آیات کی تفسیر سے ظاہر ہے چوتھے رکوع سے یہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت نئی نہیں بلکہ نبوت کا سلسلہ قدیم سے چلا آیا ہے چنانچہ پہلا انسان کامل بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا۔ اور پھر پانچویں رکوع سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سلسلہ آدم پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین زمانہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آتے رہے ہیں چنانچہ عرب کے جوار میں رہنے والی اسرائیلی قوم میں ایک انبیاء کا سلسلہ انبیاء کا چلا جس کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پڑی۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے یہ خبر دی گئی تھی کہ ان کے دونوں لڑکوں اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے ذریعہ سے روحانیت کے عظیم الشان سلسلے چلیں گے۔ پس جبکہ نبوت کا سلسلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے شروع کیا گیا اور جاری رکھا گیا اور سابق انبیاء کی پیشگوئیوں نے نئے زمانہ میں آنے والے ایک عظیم الشان نبی کی خبر دے بھی رکھی ہے تو پھر ایک مدعی نبوت کے دعوے پر استعجاب کیوں ہو۔

دوسرا مضمون چوتھے رکوع سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی مخالفت کی گئی۔ آدم علیہ السلام پر بھی معترض ہوئے چنانچہ شیطان اور اس کی ذریت نے خوب بڑھ بڑھ کر اعتراض کئے۔ فرشتوں نے گو اعتراض نہیں کیا مگر انکی پیدائش پر تعجب اور حیرت کا اظہار ضرور کیا۔ پھر اس کے بعد نبی پر نبی آیا اور یہ سبق دُہرایا گیا مگر اسلام کے قریب ترین روحانی سلسلہ کے نبیوں پر پھر اسی طرح اعتراضات ہوئے جیسے پہلے نبیوں پر اعتراضات ہوئے تھے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان اعتراضوں سے نہ بچے۔ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار محض اس وجہ سے کہ ان کی بعض باتوں پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

تیسرا سلسلہ مضمون ان رکوعوں میں یہ جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو چنتا ہے تو اپنے فضل کو کمال تک پہنچا دیتا ہے لیکن جب وہ قوم ناشکری میں بڑھ جاتی ہے تو وہ فضل کسی دوسری قوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ آدمؑ کی وسیع اولاد میں سے منتقل ہوتے ہوتے فضل الٰہی بنی اسرائیل میں آیا۔ اب بنی اسرائیل کی متواتر اور ایک لمبے عرصہ تک کی مسلسل ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے وہ فضل ایک دوسرے خاندان کی طرف منتقل ہوا ہے بنی اسرائیل کو اب غصہ کیوں آتا ہے اور مکہ کے لوگ ناراض کیوں ہیں نہ بنی اسرائیل کی خفگی کی کوئی وجہ ہے کہ انہوں نے خود دھکے دے دے کر خدا تعالیٰ کے فضل کو اپنے گھر سے نکالا اور نہ مکہ والوں کے لئے شور مچانے کی کوئی وجہ ہے کہ ان کے تاریک گھروں میں خدا تعالیٰ کے نور کا دیا جلایا جا رہا ہے ان کے افسردہ دلوں پر خدا تعالیٰ کی رحمت کی بارش نازل کی جا رہی ہے۔ ان کے لئے تو خوش ہونے کا مقام ہے نہ کہ رنجیدہ ہونے کا۔

آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا کا گزشتہ آیات سے تعلق۔

یہ تین سلسلہ مضامین چوتھے رکوع سے شروع ہو کر اس جگہ تک آ رہے ہیں اور کچھ دُور تک آگے بھی جائیں گے چنانچہ اس آیت سے اگلی آیت میں پھر وہی مضمون جاری ہو جائیگا لیکن اس سلسلہ مضمون میں یہ آیت جس پر نوٹ لکھا جا رہا ہے بظاہر بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔ کہاں یہودیوں کا ذکر اور وہ بھی پرانے زمانے کے یہودیوں کا۔ پھر اس آیت کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ہی ذکر ہے درمیان میں یہ آیت

کیسی آگئی کہ جس میں مسلمانوں یا عام مومنوں کا بھی اور نصاریٰ کا بھی اور صابئین کا بھی ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں یہود کے اوپر مستقل طور پر غضب الٰہی نازل ہونے کا ذکر تھا اور پھر یہ بتایا گیا تھا کہ وہ انبیاء کا مقابلہ کرتے رہے ہیں یہ ایک ایسا دل دہلا دینے والا مضمون ہے کہ انسانی فطرت اس جگہ اپنی مشکلات کا حل کر دئے بغیر آگے جانے دینا پسند نہیں کرتی۔ جس وقت انسان اس مضمون کو پڑھتا ہے کہ ایک قوم پر خدا تعالیٰ کا فضل نازل ہوا اور فضل پر فضل نازل ہوا مگر اس نے ناقدری پر نافرمانی کی اور نبیوں کا مقابلہ کیا تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا ذریعہ ہے جسکی مدد سے اس خطرناک حالت سے بچ سکتا ہوں اس فطری سوال کا جو ضمنی طور پر اس دل دہلا دینے والے مضمون کے موقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس آیت میں جواب دے دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے یقیناً وہ لوگ جو ایمان کے مدعی ہیں خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی ہیں یا صابی ہیں جو بھی اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لائیں اور مناسب حال عمل کریں ان کو ان کے رب کی طرف سے اجر ملتا ہے یعنی جو چیز انسان کے امن کو دوام بخشتی ہے وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان اور عمل صالح ہے یہ مت سمجھو کہ باوجود ایمان کے انسان ٹھوکریں کھاتا ہے جب حقیقی ایمان نصیب ہو تو اس وقت انسان ٹھوکریں نہیں کھاتا۔ بنی اسرائیل نے اگر ٹھوکریں کھائیں تو اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ ایمان کے ہوتے ہوئے وہ ٹھوکریں کھاتے تھے بلکہ اسکی وجہ یہ تھی کہ ان کے ایمان میں کمزوری تھی ورنہ جو شخص خدا تعالیٰ پر سچا ایمان لاتا ہے اور بعث بعد الموت پر یقین رکھتا ہے اور اسکے مناسب حال عمل کرتا ہے وہ کبھی خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق نہیں ہوتا پس اگر یہودیوں کو ٹھوکر لگی۔ اگر ان کے بعد نصاریٰ کو ٹھوکر لگی اور اگر انکی ہمسایہ قوم صابئین کو ٹھوکر لگی تو اسکی بڑی وجہ یہی تھی کہ یا تو ان کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں تھا یا یوم آخر پر ایمان نہیں تھا یا مناسب حال عمل ان کے نہیں تھے چنانچہ دیکھ لو یہود کو اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں تھا تبھی تو انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا تھا۔ اسی طرح یوم آخر پر ایمان نہیں تھا تبھی تو انہوں نے

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں تمام اقوام عالم سے خطاب

اپنی کتابوں میں سے چن چن کر یوم آخر کے متعلق حوالے نکال پھینکے یہی حال نصاریٰ کا ہے۔ نصاریٰ کو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں تھا اگر ایمان ہوتا تو وہ خدا تعالیٰ کے ایک بندے کو اس کا بیٹا کیوں بنا دیتے اور عمل صالح کا تو کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ کفارہ نے عمل کی ضرورت کو باطل کر دیا ہے پس فرماتا ہے۔ یہودیوں کی اس متزلزل حالت کو دیکھ کر اور ان کے بارہ میں خدا تعالیٰ کے غضب کی پیشگوئیوں کو پڑھ کر گھبراؤ نہیں اور یہ نہ سمجھو کہ جب یہود جیسی قوم جس میں اس قدر اللہ تعالیٰ کے نبی آئے اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی تو اور کسی شخص کو اپنے روحانی انجام پر کس طرح اطمینان ہو سکتا ہے کیونکہ روحانی انجام کی درستی یقیناً ہو سکتی ہے۔ تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان درست کرو اور عمل صالح کرو۔ پھر کوئی چیز تم کو جادۂ اعتدال سے پھرا نہیں سکتی۔ پھر کوئی چیز تم کو خدا تعالیٰ کے فضل سے محروم نہیں کر سکتی۔ نہ ایسے شخصوں کے لئے سابق کا کوئی غم رہتا ہے اور نہ آیندہ کے لئے کوئی ڈر رہتا ہے۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں تمام اقوام عالم کا ذکر ہے اور وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ میں زور دینے کے لئے خصوصیت سے یہودیوں۔ نصرانیوں اور صابیوں کا الگ ذکر کر دیا گیا ہے گویا تفصیلی طور پر اس آیت کے معنے یوں ہو سکتے ہیں کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ خاص طور پر ہم اس جگہ نام لے کر ذکر کر دیتے ہیں یہودیوں نصرانیوں اور صابیوں کا کہ خواہ یہ ہوں یا کوئی اور قوم ہو۔ جو لوگ بھی اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لائیں اور مناسب حال عمل کریں انہیں ان کے رب کی طرف سے اجر ملے گا اور نہ انہیں آیندہ کا کوئی خوف ہوگا اور نہ گزشتہ باتوں پر کوئی غم ہوگا۔

ان معنوں کی رو سے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے صرف مسلمان نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ دنیا کی ہر قوم کے لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں چاہے وہ ہندو ہوں زرتشتی ہوں۔ یونانی ہوں کنفیوشس مذہب والے ہوں۔ یہودی ہوں۔ نصرانی ہوں۔ صابی ہوں۔ ساری ہی وہ قومیں جن کو دعویٰ ایمان ہے اس میں شامل ہیں۔ اور اٰمَنُوْا کے اجمالی معنوں کی تشریح کرنے کے لئے اَلَّذِیْنَ هَادُوْا

وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٔيْنَ کہہ کر بعض ایسی مثالیں دے دی گئی ہیں جو عرب کے ارد گرد رہنے والے مذاہب کی ہیں اور اس آیت سے اُس مایوسی کو دُور کیا گیا ہے جو گذشتہ آیات میں یہودیوں کے حالات کو پڑھ کر ایک مومن کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی اور بتایا ہے کہ ایمان کا رستہ ایسا مخدوش نہیں جیسا کہ یہودیوں کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے خود ہی حالت مخدوش بنائی ورنہ روحانی رستہ تو بالکل کھلا اور صاف ہے۔ اللہ پر انسان ایمان لے آئے، یوم آخر پر ایمان لے آئے اور اس کے مطابق عمل کرے ساری مشکلیں آپ ہی دُور ہو جاتی ہیں۔ سارے مسائل آپ ہی حل ہو جاتے ہیں نہ عقیدوں کے سمجھنے میں کوئی دقت رہتی ہے نہ مذہبی مسائل روحانیہ کی سچائی کے سمجھنے میں کوئی مشکل رہ جاتی ہے نہ اخلاقی مسائل کی اُلجھنیں باقی رہتی ہیں۔ نہ عبادات کے ادا کرنے میں کوئی تکان پیدا ہوتی ہے اور نہ حقوق العباد کے ادا کرنے میں کوئی بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا یہ ایک کمال ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی ایسا مضمون ہو جس سے مایوسی پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو وہ دوسرا پہلو امید کا بھی ساتھ ہی پیش کر دیتا ہے اور جہاں کہیں امید اور خوشی کا مضمون ایسا زوردار ہو کہ اس سے غفلت اور سستی پیدا ہونے کا احتمال ہو جائے تو وہ خوفِ خدا اور خشیت کا مضمون بھی مناسب طریق سے اس جگہ پر بیان کر دیتا ہے تاکہ ایمان کی حالت وسطی رہے اور مسلم کا دل کسی ایک کیفیت کی طرف منتقل ہو کر جادۂ اعتدال سے ہٹ نہ جائے۔ دوسری کتابوں کا یہ حال نہیں وہاں محبت کا ذکر ہے تو محبت کا ذکر ہی ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ دل میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے عذابِ الٰہی کا ذکر ہو تو عذابِ الٰہی پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ مایوسی پیدا ہو جاتی ہے انجیل اور تورات اور دوسری تمام مذہبی کتابوں میں اس توازن کو مدنظر نہیں رکھا گیا صرف اور صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اس توازن کو مدنظر رکھتی اور ایسی حالت پیدا ہونے نہیں دیتی جو نامناسب امیدوں یا خطرناک مایوسی کی طرف انسان کو لے جائے۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے ایک اور رنگ میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ گذشتہ آیات میں بار بار بنی اسرائیل کو ان کی نافرمانیاں یاد دلائی گئی تھیں شریف الطبع اور خدا تعالیٰ کا خوف رکھنے والے بنی اسرائیل ان واقعات کو یکجائی طور پر دیکھ کر یقیناً متاثر ہو سکتے تھے اور ڈر ہو سکتا تھا کہ وہ مایوس ہو جائیں اور سمجھیں کہ ہماری قوم کے لئے تو اب بخشش کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے اس آیت میں اس مایوسی کی حالت کو دُور کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آج اسلام کے ذریعہ سے خدا نے پھر رحمت کے دروازے کھول دیئے ہیں خواہ مسلمان کہلانے والے لوگ ہوں۔ خواہ یہودی عیسائی یا اَور کسی کتاب کو ماننے والے ہوں اگر وہ آج بھی اسلامی تعلیم کے مطابق اپنے ایمان کو درست کریں اور مناسبِ حال اعمال بجا لائیں تو انکی روحانی ترقیات کے سامان پھر پیدا ہو سکتے ہیں وہ پھر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں وہ پھر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے وارث ہو سکتے ہیں ان کی قوم کی گذشتہ بداعمالیاں ان کے رستہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ روک نہیں بنیں گی۔

اس جگہ ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر بنی اسرائیل کی ایمانی حالت اس درجہ تک گری ہوئی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص فضیلت کیوں دی اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم کی حالت کا اندازہ صرف اس کے عوام کی حالت سے نہیں لگایا جاتا بعض دفعہ اسکی قیمت کا اندازہ اس کے خاص افراد کی حالت سے بھی لگایا جاتا ہے اور کبھی اسکی فطری قابلیت سے لگایا جاتا ہے۔ بنو اسرائیل کو دیکھو باوجود نبوت سے اس قدر دُور ہو جانے اور ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہونے کے اپنی ذہانت اور عقل سے اب بھی وہ دُنیا پر اقتصادی طور پر حکومت کر رہے ہیں اور ہر قسم کے علمی انکشافات میں پیش پیش ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم قابلیت میں دوسری بہت سی اقوام سے ممتاز ہے یہ تو انکی فطری قابلیت کی دلیل ہے ان کے خاص افراد کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ جس قدر انبیاء اس قوم میں آئے ہیں اور کسی قوم میں نہیں آئے اس قدر افراد کا جوہر خالص رکھنا اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا بھی یقیناً اس قوم

کی فضیلت کا ثبوت ہے پس اس قوم کا خاص فضلوں کے لئے چُنا جانا غلط نہ تھا نہ تحکمانہ فعل تھا یہ قوم واقعہ میں ان فضلوں کی مستحق تھی مگر اس میں جہاں خاص لوگوں کی بیماقت اور فطری نیک کی حدت کی خوبی تھی وہاں یہ نقص تھا کہ یہ اپنے فطری جوہر سے دنیوی ترقی کے حصول کے لئے مدد لیتے تھے نہ دینی ترقی کے لئے اور بوجہ عام طور پر ذہن رسا حاصل ہونے کے اپنے انبیاء سے حسد کرتے تھے اور ان کو خاص مدد دینے پر تیار نہ ہوتے تھے ان دونوں نقائص نے آخر ان کو روحانی میدان سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور یہ لوگ نبوت کا انعام کھو بیٹھے خلاصہ یہ کہ یہود کا ایک ہی وقت میں خاص فضلوں کا وارث ہونا اور پھر خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو بار بار اپنے پر نازل کرنا دو متضاد امور نہیں ہیں ایک ہی وقت میں یہ دونوں امور جمع ہو سکتے ہیں اور بنی اسرائیل کے وجود میں جمع بھی ہوئے۔

> آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ میں اسلام کی ترقی کی طرف اشارہ

یہ معنے تو قرآن کریم کی آیات کی ترتیب کے لحاظ سے ہیں لیکن اگر اس آیت کے مضمون پر منفردانہ نگاہ ڈالی جائے تو پھر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے معنے مخصوص طور پر مسلمانوں کے بھی کئے جا سکتے ہیں اس صورت میں یہ آیت ایک عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف مذاہب کے فیصلہ کی ایک آسان راہ بتائی گئی ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے پیاروں کو تباہ و برباد نہیں ہونے دیتا نہ ان کو دکھ میں دیکھ سکتا ہے پھر خدا کب اپنے پیارے بندوں کو ذلیل اور رسوا کرے گا۔ پس مختلف مذاہب کے فیصلہ کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے کہ جس مذہب کو الٰہی نصرت اور مدد ملے وہ الٰہی مذہب ہوگا اور جو خدا تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہو وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس طریق کے مطابق اس وقت کے بعض مذاہب کا نام لیکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کو متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ جو مومن ہیں یعنی اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہی سچے مومن ہیں اور وہ جو یہودی ہیں اور نصاریٰ اور صابئین۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ جو اعمال انکی قوم کرتی ہے وہی سچے اور

> آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا کے معنی بحیثیت پیشگوئی

خدا تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں۔ اب انکی اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ ان میں سے کون واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا پیارا اور سچا مومن ہے۔ ہم یہ طریق بتاتے ہیں کہ ان میں سے جو شخص واقعہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور یوم آخر پر یقین رکھتا ہے اور وہ اعمال کرتا ہے جو واقعی اچھے ہیں وہ ضرور خوف و حزن کی حالت سے نکل جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح آرام اسے حاصل ہو جائے گا۔

یہ معیار جس حالت میں پیش کیا گیا ہے اس کا علم اس بات کے جاننے سے ہو سکتا ہے کہ سورۃ بقرہ ہجرت کے ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی ہے اور ان دنوں میں اسلام نہایت کمزور حالت میں تھا خود اہل عرب مخالف تھے اور جان کے دشمن تھے اہل مدینہ میں سے ایک زبردست جماعت صرف منافقانہ طور پر اسلام لے آئی تھی اور در پردہ اسلام کی تباہی کے لئے کوشاں تھی۔ یہود کے تین قبیلے مدینہ میں رہتے تھے اور تینوں اسلام کے سخت دشمن اور اسلام کے مٹانے کے درپے تھے مسیحیوں کے مختلف قبائل مدینہ کے قرب و جوار میں بستے تھے اور شام کی سرحد مدینہ سے چند منزل پر ہی تھی اور وہاں کے باشندوں کے سینے اسلام کی عداوت سے لبریز تھے مسلمانوں کی تعداد مع عورتوں اور بچوں ملا کر تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی ایسے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مونہہ سے اللہ تعالیٰ یہ کلمات نکلواتا ہے اور کل مخالفین کو جو نہ صرف تعداد میں ہی ہزاروں گنا زیادہ تھے بلکہ مال و دنیاوی رعب و داب اور حکومت اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی آپ پر لاکھوں درجہ فضیلت رکھتے تھے یہ پیغام دلواتا ہے کہ تم سب اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے اور خدا تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کرتے ہیں پس اس کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو لوگ واقعہ میں ایسے ہیں ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ انکی مدد کرے پس باوجود اس کے کہ تم زیادہ ہو اور ہر طرح امن و امان میں ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ جس کو خدا تعالیٰ دکھوں اور تکلیفوں سے نجات دے دے وہ سچا اور واقعہ میں خدا تعالیٰ کا پیارا ہے اور جو خوف و حزن سے محفوظ ہوتے ہوئے اس میں پڑ جائے وہ ضرور

غلطی پر ہے۔

اس معیار پر کس مذہب کی صداقت ثابت ہوئی۔ اس کے جواب کے لئے ہمیں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے مخالف مؤرخین کی لکھی ہوئی تاریخیں اس بات پر کافی روشنی ڈال رہی ہیں کہ ہجرت کے پہلے ایک دو سال کے اندر کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا ہے اسلام کی کیا حالت تھی اور اس کے بعد چند سال میں ہی وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور وہ مسلمان جو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے سطح زمین پر ٹڈی دل کی طرح پھیل گئے اور ان کا خوف و حزن امید اور خوشی سے بدل گیا اور ان کے دشمن جو پہلے سکھ کی نیند سوتے تھے اور ملکوں کے مالک تھے خوف و حزن میں مبتلا ہو گئے اور اس طرح خدا تعالیٰ کے فعل نے اس بات کی شہادت دے دی کہ مسلمانوں کی جماعت ہی وہ جماعت تھی جو واقعہ میں اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی تھی اور اعمالِ صالحہ بجا لاتی تھی ورنہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا ایمان ایک رسمی ایمان تھا اور اُن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نہ تھے۔

اس معیار پر یہ اعتراض کرنا درست نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسیحی حکومتیں مسلمانوں پر غالب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مذہبی مقابلہ کے وقت اُس قوم کے خوف و حزن سے نکلنے کا وعدہ کیا ہے جو واقعہ میں مومن اور اعمالِ صالحہ کو بجا لانے والی ہو اور اس زمانہ کے مسلمان بموجب حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسلام سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور انہوں نے قرآن کریم پر عمل چھوڑ دیا ہے اور ان کی اس وقت وہی حالت ہو رہی ہے جو بنی اسرائیل کی مسیح ناصری کے وقت میں تھی۔ پس ان کا خوف و حزن میں مبتلا ہونا بطور سزا ہے اور پیشگوئی کے مطابق ہے۔ ہاں یہ بھی وعدہ ہے کہ جب یہ لوگ مسیح موعود کو قبول کرکے پھر اس آیت کا مصداق بن جائیں گے تو ہر قسم کے خوف و حزن سے بچ جائیں گے اور اُن کے دشمن انکے مقابلہ میں ذلیل ہونگے لیکن یہ غلبہ جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی اسباب سے حاصل ہوگا اور تلوار کی بجائے دلائل و براہین سے اسلام کو غالب کیا جائیگا چنانچہ وہ مسیح موعود پیدا ہو چکا ہے [illegible] رہے اور اس کے پیروؤں کو اللہ تعالیٰ خارق عادت نشانات سے خوف و حزن سے بچا رہا

اس کے دشمنوں کو ان کے مقابلہ میں شرمسار کرتا ہے۔

اس استدلال کا رد کہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بیوم آخرت نجات ہو سکتی ہے۔

اس آیت کے معنے کرنے میں بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ چونکہ اس جگہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بیوم آخر کے ساتھ خوف و حزن سے نجات کو وابستہ کیا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس قوم کو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والی ہو۔ نجات یافتہ قرار دیتا ہے مگر یہ درست نہیں۔ ایمان باللہ و یوم آخر میں اسلام کے سب اصول شامل ہیں چنانچہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (سورہ نساء ع ۲۱) یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی اور راستہ بنا لیں۔ یہ لوگ ہی پکے کافر ہیں۔

مسیحی حکومتوں کا غلبہ ان کے مذہب کے سچے ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے اندر ہی رسولوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے اور رسولوں پر ایمان لانے میں اگر وہ کوئی کتاب لایا ہو تو اس پر ایمان لانا بھی داخل ہوگا۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝ (انعام ع ۱۱) یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس پر (یعنی قرآن کریم پر) بھی ایمان رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ یوم آخر پر ایمان میں قرآن کریم پر ایمان لانا اور عبادات کا بجا لانا بھی شامل ہے پس اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانا صرف ہستی باری اور یوم آخر کا اقرار کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر تمام وہ فروع بھی شامل ہیں جو ان سے متفرع ہوتے ہیں۔

عَمِلَ صَالِحًا۔ عملِ صالح کے معنے ہیں وہ عمل جو

مناسب حال ہو۔ صَلَحَ کے معنے عربی زبان میں مناسب کے ہوتے ہیں یعنی جس میں کوئی نقص نہ ہو کہتے ہیں صَالَحَہٗ وَافَقَہٗ اُس کے موافق ہو گیا۔ اور کہتے ہیں ھٰذَا یَصْلُحُ لَکَ یہ کام تیرے مناسب حال ہے اور کہتے ہیں اَصْلَحَ بَیْنَ الْقَوْمِ اُس نے قوم کی آپس میں موافقت کرا دی۔ پس عملِ صالح کے معنے اُس کام کے ہیں جو ضرورت اور وقت کے مطابق ہو اور ایسا ہی کام فساد اور خرابی کو دُور کر سکتا ہے جو کام ضرورت اور وقت کے مطابق نہ ہو اس سے فساد اور خرابی پیدا ہوتی ہے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ نظر آتا ہو۔ جہاد کے وقت میں اگر کوئی نماز شروع کر دے یا نماز کے وقت میں صدقہ و خیرات بانٹنے لگ جائے۔ یا رمضان کے ایام میں ایسے کاموں میں مشغول ہو جائے جو روزے کو باطل کر دیتے ہیں مثلاً اِردگرد کے علاقوں میں تبلیغ کے لئے جانا شروع کر دے اور سفر کے عذر سے روزہ نہ رکھے تو ایسے شخص کے اعمال گو وہ تمام کے تمام اچھے ہی ہوں عملِ صالح نہیں کہلائیں گے اور اُن کا نیک نتیجہ پیدا نہیں ہو گا۔

اعمالِ صالحہ سے مراد مناسبِ حال اعمال

قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی کامل انسان کا ذکر ہے وہاں عمل صالح کی ہی شرط رکھی گئی ہے اور کسی جگہ بھی عملِ خیر کی شرط نہیں رکھی۔ کیونکہ کوئی عملِ خیر بغیر عملِ صالح ہونے کے نفع نہیں دیتا۔ ہاں بعض بظاہر بُرے نظر آنے والے عمل عملِ صالح ہونے کی وجہ سے نفع دے جاتے ہیں مثلاً کسی شخص کے سر پر بچھو نظر آجائے یا پگڑی میں کہیں سانپ بیٹھا ہوا دکھائی دے تو گو مارنا اور پیٹنا عملِ شر ہی ہے لیکن ایسے وقت میں اگر کوئی زور سے ہاتھ مارے یا زور سے جوتی ہی مار دے اس خیال سے کہ اگر آہستہ سے اس چیز کے قریب گئے یا اس شخص کو بتایا جس کے سر پر وہ چیز بیٹھی ہے تو وہ زہریلا کیڑا اُسے ڈس لے گا۔ تو یہ عمل گو بظاہر بُرا ہو گا مگر عملِ صالح ہو گا اور اس لئے کرنے والے کو ثواب کا مستحق بنا دے گا کوئی شخص کسی گڑھے کے پاس کھڑا ہو اور دوسرے شخص کو معلوم ہو جائے کہ اُسپر کوئی شخص فائر کرنے لگا ہے اور وُہ ایسے دھکا دیکر گڑھے میں پھینک دے، تو اگر گڑھے میں گرنا بندوق کا نشانہ بننے سے کم ضرر رکھتا ہو تو یہ گڑھے میں گرا دینا ایک عملِ صالح کہلائے گا گو عام حالات میں یہ نیک کاموں میں سے نہیں۔

پس حقیقت یہی ہے کہ جو چیز انسان کو ثواب کا مستحق بناتی ہے وہ عملِ صالح ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکثر اوقات عملِ خیر ہی عمل صالح ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ انسان عملِ خیر کو عملِ غیر صالح بنا دیتا ہے۔ اس وقت وہ عملِ خیر ثواب کا موجب نہیں رہتا۔ اسی طرح بعض دفعہ ضرورت کے ماتحت عملِ شر عمل صالح بن جاتا ہے بشرطیکہ خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اس وقت اسی پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ جہاد کے لئے تشریف لے گئے بعض صحابہؓ نے روزے رکھے ہوئے تھے وہ منزل مقصود پر پہنچ کر چور ہو کر گر گئے۔ مگر جو بے روزہ تھے۔ انہوں نے خیمے لگانے شروع کئے کھائیاں کھودنی شروع کیں۔ لکڑیاں جمع کرنی شروع کیں اور وضو کے لئے پانی لائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ آج بے روزہ روزہ داروں سے بڑھ گئے۔ اس واقعہ سے یہی سبق ملتا ہے کہ گو روزہ ایک اچھا عمل ہے مگر ایسے وقت میں کہ اسلام کو انسان کی طاقت کی ضرورت ہو اُس وقت یہی روزہ ناجائز ہو جائے گا یا ادنیٰ عمل بن جائے گا (یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ روزے نفلی تھے فرضی نہ تھے فرضی روزہ سفر میں منع ہے)

آجکل بدقسمتی سے مسلمانوں میں یہی خرابی پیدا ہو رہی ہے کہ بظاہر عمل خیر کرنے والے تو ان میں بہت نظر آتے ہیں مگر عمل صالح کرنے والے بہت کم دکھائی دیتے ہیں اسلام مصیبت میں ہے چاروں طرف سے اُسپر حملے ہو رہے ہیں۔ اِس گرے ہوئے زمانہ میں بھی لاکھوں مسلمان نماز اور اذکارِ الٰہی کے پابند ہیں لیکن وہ اپنا سارا وقت ذکر اور نماز میں ہی خرچ کر دیتے ہیں اُن کے مصلّے تو بیشک آباد ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے اُجڑنے کی اُن کو کوئی فکر نہیں

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کیا تھا (اور کہا تھا کہ)

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ

جو (کچھ) ہم نے تمہیں دیا ہے۔ اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد رکھو

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

تا کہ تم متقی بن جاؤ ۵۶۳ پھر اس (واضح ہدایت) کے (مل جانے کے) بعد بھی تم نے پیٹھ پھیر لی

یقیناً یہ نمازیں اور یہ ذکر اُن کے مُنہ پر مارے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اسلام کے گھر کی آبادی کا فکر نہیں کرتے۔ خدا اُن کے دلوں کو بھی اپنے جلوے سے آباد نہیں فرماتا۔

پھر لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو بظاہر مسلمانوں کی تعلیم اور مسلمانوں کی اقتصادی یا سیاسی حالت کی درستی میں لگے ہوئے ہیں لیکن نماز اور روزے سے غافل ہیں اس لئے اُن کے یہ کام محض سیاسی ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ دین کی چاشنی ملی ہوئی نہیں اور جسم کی ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے اور رُوح کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے پس یہ کام بھی عملِ صالح نہیں ہے مناسب حال کام وہی ہوتا ہے جس میں چاروں کونوں کا خیال رکھ لیا جاتا ہے وہ مکان جس کی تین دیواریں ہوں اور ایک نہ ہو حفاظت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا گویا یہ کہ ایک دیوار ہو اور تین نہ ہوں ضرورت تھی کہ ایک طرف اپنے عمل اور اپنے فعل سے اسلامی تعلیم کی خوبی کو دنیا پر ظاہر کیا جاتا تو دوسری طرف دلائل اور براہین کی تلواروں سے اسلام کی حفاظت کی جاتی۔ اگر یہ دونوں پہلو مدِنظر رکھ لئے جاتے تو اسلام کبھی کمزور نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ مسلمان باغی بنتے نہ بزدل اور جھگڑے ہوتے بلکہ اعلیٰ اخلاق والے۔ اعلیٰ قربانیاں کرنے والے شریف متواضع۔ دلیر اور بہادر بیک وقت سب اخلاق کے مالک ہوتے اور دُنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ کر سکتی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صَالِحٌ کا لفظ عربی زبان میں کبھی بُرے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا پس جھوٹ چوری ڈاکہ وغیرہ قسم کے افعال پر وہ خواہ کسی مصلحت کے لئے بھی کیوں نہ ہوں اور کسی کے فائدہ ہی کے لئے کیوں نہ کئے جائیں عملِ صالح نہیں کہلا سکتے۔

۵۶۳ حل لغات۔ مِيْثَاقٌ۔ اَلْمِيْثَاقُ۔ عَقْدٌ مُؤَكَّدٌ بِيَمِيْنٍ وَعَهْدٍ۔ مِيْثَاقٌ کے معنے ہیں ایسا عہد کرنا جو قسم سے مؤکد ہو (مفردات) — مِیْثَاق

رَفَعْنَا۔ رَفَعَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ رَفَعَهٗ رَفْعًا کے معنے ہیں ضِدُّ وَضَعَهٗ۔ اس کو اوپر اُٹھایا بلند کیا۔ نیز کہتے ہیں رَفَعَ لَهُ الشَّيْءُ اور مُراد یہ ہوتی ہے اَبْصَرَهٗ عَنْ بُعْدٍ اس نے فلاں چیز کو دُور سے دیکھا (اقرب) — رَفَعْنَا

اَلطُّوْرُ۔ اَلْجَبَلُ طُور کے معنے پہاڑ کے ہیں جَبَلٌ قُرْبَ اَيْلَةَ يُضَافُ اِلٰى سِيْنَا۔ نیز ایک مخصوص پہاڑ کا نام بھی طور ہے جو طورِ سینا کے نام سے مشہور ہے (اقرب) — اَلطُّوْرَ

اُذْكُرُوْا۔ امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور ذَكَرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں یاد کر لیا (اقرب) مکمل تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۱۵۳ بعض نے اُذْكُرُوْا مَا فِيْهِ کے معنے اُدْرُسُوْا مَا فِيْهِ کے بھی کئے ہیں یعنی جو کچھ اس میں ہے اسکو پڑھو (لسان) — اُذْكُرُوْا

لَعَلَّ۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۲۲ — لَعَلَّ

تَتَّقُوْنَ :۔ اِتَّقٰی یَتَّقِیْ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اِتَّقٰی کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ بقرہ ع۳

اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ کی تفسیر

تفسیر۔ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ سے وہ دس احکام اور ان کے ساتھ اُترنے والی دوسری تعلیم مُراد ہے جو سینا پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی۔ اس آیت میں اُن احکام کی طرف بنی اسرائیل کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ان احکام کو یاد کرو جو تمہیں اس وقت دیئے گئے تھے جبکہ تم سینا کے نیچے کھڑے ہوئے تھے اور جن کے سُننے پر تم پیٹھ پھیر کر چلے گئے تھے اور تم نے خدا تعالیٰ کا کلام سُننے سے انکار کر دیا تھا کہ ایسا نہ ہو ہم مر جائیں۔

مِیْثَاقَکُمْ میں میثاق کی اضافت ضمیر مخاطب کی طرف کرنے کی وجہ۔

مِیْثَاقَکُمْ میں جو میثاق کی اضافت ضمیر جمع مخاطب کی طرف کی گئی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ میثاق بنی اسرائیل میں ایک خاص شہرت رکھتا ہے اور اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میثاق کے وقت بنی اسرائیل کے اُن تعلقات کی بُنیاد رکھی گئی جو اُن میں اور اللہ تعالیٰ میں قائم رہنے والے تھے اور اسی میثاق کے وقت اُنکی نافرمانیوں کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آیندہ شریعت لانے والا نبی بنو اسحاق میں سے نہیں بلکہ بنو اسماعیل میں سے ہوگا۔ پس یہ میثاق چونکہ ایک خصوصیت رکھتا تھا اس لئے اس کا نام ہی بنی اسرائیل کا میثاق رکھ دیا گیا اور اس وجہ سے ضمیر مخاطب کی طرف میثاق کی اضافت کی گئی گویا یہ اضافت اُس عہد کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہے اور ایسا محاورہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے بعض دفعہ ایک ماں باپ کے کئی بچے ہوتے ہیں کوئی بچہ ماں کا لاڈلا ہوتا ہے اُسے شرارت کرتے وقت اگر باپ کبھی دیکھ لے تو وہ اسے ماں کے پاس لے آتا ہے اور کہتا ہے لو تمہارا بچہ ایسا کر رہا ہے اسکے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ باپ کا بچہ نہیں یا دوسرے بیٹے ماں کے بیٹے نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس بچے سے ماں خاص تعلق رکھتی ہے اسی محاورہ کے مطابق مِیْثَاقَکُمْ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اسکے یہ معنی نہیں کہ اور کوئی عہد بنی اسرائیل سے کیا ہی نہ گیا تھا۔

رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ میں لفظ طُور کے معنے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ۔ طُور کے معنے عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہوتے ہیں خواہ کوئی پہاڑ ہو (HEBREW AND ENGLISH LANICON OF THE OLD TESTAMENT عہد قدیم کی عبرانی انگریزی لغت) اور عربی زبان میں بھی طُور کے ایک معنے پہاڑ کے ہیں لیکن باوجود اسکے کہ عربی زبان میں بھی طُور کے معنے پہاڑ کے ہیں جب یہودیوں سے عربوں نے یہ سُنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے طُور پر کلام کیا تھا تو انہوں نے سمجھا کہ شائد عبرانی زبان میں طُور اُس خاص پہاڑ کا نام تھا اس پہاڑ کو جبل الطور کہنے لگ گئے یعنی طور پہاڑ۔ حالانکہ عبرانی زبان میں بھی طور کے معنے پہاڑ کے تھے اور عربی زبان میں بھی طُور کے معنے پہاڑ کے تھے اور جب عبرانی لوگ کہتے تھے طُور پر خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں تو اس کے معنے محض اتنے ہوتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے ایک پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔

قرآن کریم نے بھی گو طُور کا لفظ اسی رنگ میں استعمال کیا ہے جس رنگ میں عربی میں استعمال ہوتا تھا اور ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن اس میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ طُور پہاڑ کو کہتے ہیں نہ یہ کہ کسی خاص پہاڑ کا نام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ (المومنون ع) یا فرماتا ہے۔ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (التین) ان دونوں حوالوں میں طُور لفظ کی سینا۔ کی طرف اضافت کر کے بتایا گیا ہے کہ طُوْر کا لفظ وضع لغت کے لحاظ سے کسی خاص پہاڑ کا نام نہیں بلکہ اس کے معنی ہی پہاڑ کے ہیں اور موسیٰ کے طور سے مُراد محض دشتِ سینا۔ کا ایک پہاڑ ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے دھوکا کھایا ہے اور اسکا یہ مطلب یہ سمجھا ہے کہ پہاڑ کو بلند کر کے بنی اسرائیل کے سر پر اوپر کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس غلط مطلب کو لے کر راڈول صاحب نے بھی اسلام پر ایک اعتراض کر دیا ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ غلطی خروج باب ۱۹ آیت ۱۷ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یہود کو لگی ہے اور ان سے سُنکر قرآن کریم میں نقل کر دی گئی ہے (خروج باب ۱۹ آیت ۱۷ کے الفاظ یہ ہیں "اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملاوے اور وے پہاڑ کے

نیچے آکھڑے ہوئے " عربی کی بائبل میں یہ الفاظ ہیں وَاَخْرَجَ مُوْسٰی الشَّعْبَ مِنَ الْمَحَلَّةِ لِمُلَاقَاتِ اللّٰهِ فَوَقَفُوْا فِیْ اَسْفَلِ الْجَبَلِ) لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس طرح بعض راویوں یہود نے خروج باب ۱۹ کی آیت ۱۷ کے معنے غلط سمجھے ہیں اسی طرح یہود کے قصوں پر یقین کر کے بعض لوگوں نے اس آیت کے وہ معنے کر دئیے ہیں جو یہود میں طُور کے اُٹھائے جانے کے متعلق مشہور تھے۔ حالانکہ اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ یہ عہد ایسے وقت میں ہوا جب تم دامن کوہ میں تھے اور یہ معنے عربی زبان کے محاورہ کے عین مطابق ہیں۔ جن دو لفظوں سے اس آیت کے معنے کرنے میں دھوکا لگا ہے وہ رفع اور فوق ہیں رفع کے معنے اُٹھانے اور فوق کے معنے اوپر کے ہیں لیکن محاورۂ زبان میں یہ الفاظ صرف بلندی کے معنے میں بھی آتے ہیں جیسا کہ بخاری کی کتاب المناقب میں براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ مدینہ کی طرف آتے ہوئے جب گرمی سے سخت تکلیف ہوئی اور دوپہر کا وقت آگیا تو رُفِعَتْ لَنَا صَخْرَةٌ طَوِيْلَةٌ لَهَا ظِلٌّ لَمْ تَأْتِ عَلَيْهِ الشَّمْسُ (بخاری کتاب المناقب) جس کے لفظی معنے یہ ہیں کہ ایک لمبا پتھر ہمارے لئے اُٹھایا گیا لیکن مُراد یہ ہے کہ پاس ہی ایک اونچا پتھر نظر آیا۔ اسی طرح فوق کا محاورہ قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ سورۂ احزاب میں آتا ہے۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (احزاب ع ۲) اس کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ دشمن تمہارے اوپر کی طرف سے آگیا لیکن اصل مطلب یہ ہے کہ اونچی جانب کی طرف سے آگیا۔ غرض اس آیت سے یہی مراد ہے کہ یہود کو طُور کے نیچے کھڑا کیا گیا اور بعض احکامات دئیے گئے جن پر پابند رہنے کا ان سے عہد لیا گیا جیسا کہ خروج باب ۱۹ آیت ۱۶ تا ۲۵ سے ثابت ہے۔ وہاں لکھا ہے " اور یوں ہُوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا اندھی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی چنانچہ سارے لوگ ڈیروں میں کانپ گئے۔ اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملا دے اور وے پہاڑ کے نیچے آکھڑے ہوئے اور سب کوہ سینا پہ نیرو بالا دُھواں تھا کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کے اُس پر اُترا اور تنور کا سا دُھواں اس پر سے اُٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا اور جب قرنائی کی صدا بہت بڑھائی گئی اور بلند سے بلند ہوتی جاتی تھی موسیٰ نے کلام کیا اور خدا نے اسے ایک آواز سے جواب دیا۔ اور خداوند کوہ سینا پہاڑ کی چوٹی پر نازل ہُوا اور خداوند نے پہاڑ کی چوٹی پر موسیٰ کو بُلایا اور موسیٰ چڑھ گیا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُتر جا اور لوگوں کو تقید کر تا نہ ہووے کہ حدوں کو توڑ کے خداوند کے پاس دیکھنے کو آویں اور بہتیرے اُن میں ہلاک ہو جاویں اور کاہنوں کو بھی جو خداوند کے نزدیک آتے ہیں کہہ۔ اپنے کو پاک کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ خداوند اُن میں رخنہ ڈال دے تب موسیٰ نے خداوند سے کہا کہ لوگ کوہ سینا پر آ نہیں سکتے کیونکہ تُو نے تو ہمیں تاکید کر کے کہا ہے کہ پہاڑ کے لئے حدیں مقرر کر رکھو اور اس کو پاک کرو۔ خداوند نے اسے کہا کہ چل نیچے جا اور تجھ کو پھر اُوپر آنا ہوگا۔ تو اور ہارونؑ تیرے ساتھ۔ پر کاہن اور لوگ حدیں توڑ کے خداوند پاس اوپر نہ آویں۔ نہ ہووے کہ اُن میں رخنہ ڈال دے چنانچہ موسیٰ لوگوں پاس تلے اُترا اور اُن سے کلام کیا۔"

رفعنا فوقکم الطور سے مراد پہاڑ کو جڑھ سے اکھاڑ کے سروں کے اوپر کھڑا کرنا نہیں۔

اس آیت میں طُور کے اُٹھانے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ پہاڑ کے نیچے رہنے کا تاکیدی حکم اُن کو اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا چنانچہ خروج باب ۱۹ آیت ۱۲ میں لکھا ہے " اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُتر جا اور لوگوں کو تقید کر تا نہ ہووے کہ حدوں کو توڑ کے خداوند کے پاس دیکھنے کو آویں اور بہتیرے ان میں ہلاک ہو جاویں۔"

اس جگہ پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رفع اور فوق کے دو الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں ان میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ طُور کا عہد ہمیشہ ہمیش کے لئے ساتھ رہے گا۔ گویا صرف اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ طُور کے نیچے

ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ

تو تم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ۵۶۲ اور تم اُن لوگوں (کے انجام)

عہد لیا گیا تھا بلکہ تمثیلی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ طور جیسے تمہارے سروں پر منڈلا تا ہے گویا یہ عہد ایک دو دن کا عہد نہیں بلکہ اس عہد کا بنی اسرائیل کی قومی زندگی کے ساتھ دائمی تعلق ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا مضمون بائبل میں

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت موسویہ کی پہلی بنیاد دشتِ سینا کے ایک پہاڑ پر جس کا نام ہی اب طُور پڑ گیا ہے اور ہم بھی اب اس کو طور کے نام سے ہی یاد کریں گے رکھی خروج باب ۱۹ اور باب ۲۰ میں یہ سب واقعہ اور زلزلہ کے آنے کا ذکر ہے اور استثنا باب ۵ آیت ۲ سے جس کے یہ الفاظ ہیں کہ "خداوند ہمارے خدا نے حورب میں ہم سے ایک عہد کیا" معلوم ہوتا ہے کہ دس احکام حورب کی چٹان پر سے بیان کئے گئے تھے اور اُس وقت بنی اسرائیل سے ان احکام پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا اسی طرح ان دس احکام کے علاوہ اور احکام بھی دیئے گئے تھے جیسا کہ اَلْكِتَاب کے ماتحت خروج باب ۲۰ سے خروج باب ۳۱ تک کے حوالوں سے ثابت کیا جا چکا ہے (دیکھو نوٹ ۵۳ سورۂ بقرہ زیر آیت وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ) یہ ایک عظیم الشان احسان کی بنیاد تھی لیکن جیسا کہ اگلی آیت سے ثابت ہے یہودیوں نے اس موقع پر بھی ناشکر گزاری سے کام لیا۔

تَوَلَّيْتُمْ

اس آیت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ عہد جو اس وقت لیا گیا ہے انہیں چاہیے کہ اس کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھیں اور مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں اور اس پر عمل کرتے رہیں تا کہ ہر قسم کے مصائب سے بچے رہیں۔ اس تاکید کا ذکر استثنا باب ۵ میں بھی آتا ہے وہاں لکھا ہے:۔

فَضْلٌ

"پھر موسیٰ نے سارے اسرائیل کو بلایا۔ اور انہیں کہا اے اسرائیل یہ شرعیں اور احکام سنو جنہیں میں آج تمہارے کانوں تک پہنچاتا ہوں تاکہ تم انہیں سیکھو اور حفظ کرو اور ان پر عمل کرو" آیت ۱

اسی طرح لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا مضمون بھی بائبل میں پایا جاتا ہے خروج باب ۲۰ میں آتا ہے اگر تم اپنے اس عہد پر قائم رہے اور ان احکام پر عمل کیا جو تمہیں دیئے گئے ہیں تو تم خدا تعالیٰ کے عذاب اور مصائب سے بچائے جاؤ گے چنانچہ لکھا ہے "موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم مت ڈرو اس لئے کہ خدا آیا ہے کہ تمہیں امتحان کرے اور تاکہ اس کا خوف تمہارے سامنے ظاہر ہو کہ تم گناہ نہ کرو" (آیت ۲۰)

۵۶۲ حل لغات۔

تَوَلَّيْتُمْ: تَوَلّٰى سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تَوَلّٰى کے معنے ہیں۔ اَدْبَرَ پیٹھ پھیری تَوَلّٰى عَنْهُ: اَعْرَضَ وَتَرَكَهٗ یعنی اس سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا (اقرب) پس تَوَلَّيْتُمْ کے معنے ہونگے تم پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔ (۲) تم نے اعراض کیا۔ تم نے اس کو چھوڑ دیا۔

فَضْلٌ: اَلْاِحْسَانُ۔ فضل کے معنے احسان کے ہیں وَالْاِبْتِدَاءُ بِهٖ بِلَا عِلَّةٍ کسی پر اس کے کام کے بغیر ابتداءً احسان کرنا فضل کہلاتا ہے۔ (اقرب)

اَلْخٰسِرِيْنَ: اَلْخَاسِرِيْنَ اور اَلْخَاسِرُوْنَ اَلْخَاسِرُ کی جمع ہے جس کے معنے نقصان اٹھانے والے اور گھاٹا پانے والے کے ہیں مفصل تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ بقرہ ۳۱۵

تفسیر۔

خروج باب ۲۰ میں لکھا ہے:۔

"اور سب لوگوں نے دیکھا کہ بادل گرجتے۔ بجلیاں چمکتیں۔ قرنائی کی آواز آتی۔ پہاڑ سے دھواں اٹھتا۔ اور سب لوگوں نے جب یہ دیکھا تو ہٹے اور دور جا کھڑے رہے تب انہوں نے موسیٰ سے کہا تو ہی ہم سے بول اور ہم سنیں لیکن خدا ہم سے نہ بولے کہیں ہم مر جاویں" (آیت ۱۸ و ۱۹)

الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا

کو جنہوں نے تم (اہل کتاب) میں سے (ہوتے ہوئے) سبت کے معاملہ میں زیادتی کی تھی یقیناً جان چکے ہو۔ پھر ہم نے ان سے کہا

لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا

کہ (جاؤ) ذلیل بندر ہو جاؤ پس ہم نے اس (واقعہ) کو

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً

ان (لوگوں) کے لئے بھی جو (واقعہ کے وقت) موجود تھے اور اس (واقعہ) کے بعد آنے والے لوگوں کیلئے (موجب) عبرت

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ

اور متقیوں کے لئے (موجب) نصیحت بنا دیا ۶۵؎ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو کہ) جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ

اسی طرح استثناء باب ۵ میں لکھا ہے:۔

"خداوند نے تمہارے ساتھ روبرو پہاڑ کے اوپر آگ میں سے کلام کیا۔ اس وقت میں تمہارے اور خداوند کے درمیان کھڑا ہوا کہ خداوند کا کلام تم پر ظاہر کروں کیونکہ تم آگ کے سبب ڈر گئے تھے اور پہاڑ پر نہ چڑھے" (آیت ۴ و ۵)

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے کلام سے بلاواسطہ مشرف کرنے کے لئے بلایا تو وہ زلزلہ کو دیکھ کر ڈر کے پیچھے ہٹ گئے۔ پس تَوَلَّيْتُمْ کے معنے اس جگہ پر ظاہر پھر بیٹھنے کے ہیں۔ وہ لوگ بھاگ کر پیچھے چلے گئے اور خدا تعالیٰ کا کلام سننے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اسکی رحمت تم پر نہ ہوتی تو اس وقت تمہارا نام نبیوں کی امت میں سے کاٹ دیا جاتا اور تم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے اس وقت تم کو کوئی سزا نہ دی لیکن جیسا کہ استثناء باب [illegible] آیت [illegible] سے ثابت ہے اس کے کلام کے سننے سے انکار کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ کی مانند جو آئندہ نبی ہوگا وہ ان میں سے نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ ان کے بھائیوں یعنی بنو اسماعیل میں سے ہوگا۔

۶۵؎ حل لغات:۔ اِعْتَدَوْا۔ اِعْتَدٰى سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِعْتَدٰى کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۶۱؎

السَّبْتُ

اَلسَّبْتُ۔ سَبَتَ الرَّجُلُ (يَسْبُتُ وَ يَسْبِتُ) سَبْتًا کے معنے ہیں۔ اِسْتَرَاحَ آرام کیا اور سَبَتَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں قَطَعَهٗ کسی چیز کو کاٹا۔ سَبَتَ الرَّأْسَ۔ حَلَقَهٗ سر کو مونڈا۔ نیز سَبَتَ کے ایک معنی قَامَ بِاَمْرِ السَّبْتِ کے بھی ہیں یعنی سبت کا دن منایا (اقرب) نیز اَلسَّبْتُ کے معنی ہیں اَلدَّهْرُ زمانہ۔ يَوْمٌ مِّنْ اَيَّامِ الْاُسْبُوْعِ بَيْنَ الْجُمُعَةِ وَالْاَحَدِ ہفتہ کا دن (اقرب) سَبْتٌ کو سَبْتٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اہل کتاب کام وغیرہ چھوڑ دیتے تھے۔

خٰسِئِيْنَ

خٰسِئِيْنَ:۔ خَاسِئٌ کی جمع ہے جو خَسَأَ سے بنا ہے۔ کہتے ہیں خَسَأْتُ الْكَلْبَ خَسْئًا اَيْ زَجَرْتُهٗ مُسْتَهِيْنًا بِهٖ فَانْزَجَرَ کتے کو اس کے ذلیل ہونے کی وجہ سے دھتکارا۔ اور وہ دور ہو گیا (تاج) خَسَأَ الرَّجُلُ الْكَلْبَ اَيْ طَرَدَهٗ کتے کو دھتکارا۔ اَلْخَاسِئُ مِنَ الْكِلَابِ اَلْمُبْعَدُ الْمَطْرُوْدُ لَا يُتْرَكُ اَنْ يَّدْنُوَ مِنَ النَّاسِ یعنی جب خَاسِئٌ کا لفظ کسی کتے کے متعلق استعمال کریں تو اس

سے مُراد ہوتی ہے کہ دُور کیا ہُوا دھتکارا ہُوا جس کو لوگوں کے نزدیک نہ آنے دیا جائے۔ (اقرب)

نَكَالًا

نَکَالًا۔ نَکَّلَ بِفُلَانٍ کے معنی ہیں صَنَعَ بِهٖ صَنِيْعًا يَحْذَرُ غَيْرَهٗ إِذَا رَآهُ کہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا کہ دوسرا اس کو دیکھ کر ہوشیار ہو جائے۔ وَالنَّكَالُ اِسْمُ مَا يُجْعَلُ عِبْرَةً لِلْغَيْرِ ہر اس چیز کا نام نکال رکھتے ہیں جو کسی کے لئے عبرت کا موجب بن جائے۔ (اقرب)

مَوْعِظَةً

مَوْعِظَةٌ :۔ اَلْمَوْعِظَةُ (نصیحت) وَعَظَ کا اسم مصدر ہے۔ کہتے ہیں وَعَظَهٗ۔ نَصَحَهٗ وَذَكَّرَهٗ مَا يُلَيِّنُ الْقَلْبَ مِنَ الثَّوَابِ وَالْعِقَابِ یعنی اس کو ایسی نصیحت کی جو دل کو نرم کر دے کہیں سزا کی باتیں بتا بتا کر اور کہیں کامیابی کے راستے بتا بتا کر۔ وَفِي الْمِصْبَاحِ مَا يَسُوْقُهٗ إِلَى التَّوْبَةِ إِلَى اللّٰهِ وَإِصْلَاحِ السِّيْرَةِ وَأَمْرِهٖ بِالطَّاعَةِ اور مصباح کے مصنف نے وَعَظَ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ ایسی باتیں کسی کو سُنانا جو اس کو اللہ کی طرف رجوع کروانے اور عادات و اطوار کو درست بنانے اور خدا کے احکام کی فرمانبرداری کروانے کا موجب ہوں (اقرب) خلیل نحوی ادیب نے وعظ کے معنی هُوَ التَّذْكِيْرُ بِالْخَيْرِ فِيْمَا يَرِقُّ لَهُ الْقَلْبُ کے کئے ہیں یعنی وعظ ایسی باتوں کے یاد دلانے کو کہتے ہیں جن کے سُننے سے دل میں نرمی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے (مفردات) اَلْمَوْعِظَةُ :۔ كَلَامُ الْوَاعِظِ مِنَ النُّصْحِ وَالْحَثِّ وَالْإِنْذَارِ یعنی اَلْمَوْعِظَةُ اس کلام کو کہتے ہیں جو نہایت اخلاص پر مبنی ہو اور نیک باتوں کی طرف ترغیب دے اور بُری باتوں سے ڈرائے (اقرب)

سبت منانے کا حکم بائبل میں۔

اَلْمُتَّقِيْنَ

اَلْمُتَّقِيْنَ :۔ اَلْمُتَّقِيْنَ اور اَلْمُتَّقُوْنَ يَتَّقِيْ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اِتَّقٰى يَتَّقِيْ کے معنوں کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ بقرہ ع۳

سبت کے معنے

تفسیر: سبت کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ زمانہ راحت۔ کاٹنا۔ مونڈنے۔ سبت کا دن منانے اور ہفتہ کے دن کے ہوتے ہیں۔ یہ سارے معنی ہی اس آیت پر چسپاں ہو سکتے ہیں اگر تو اس آیت کو گذشتہ آیات سے ملا کر نہ پڑھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جب ہم نے تم کو مال و دولت اور آرام و آسائش دی تو تم نے شرارتیں شروع کر دیں اس لئے ہم نے تم کو ذلیل کر دیا۔ اور اگر سابق آیات سے ملا کر پڑھا جائے تو پھر اس کے معنے یہ ہوں گے کہ طُور کے موقع پر جو احکام تمہیں دیئے گئے تھے اُن میں سے ایک حکم سبت منانے کا بھی تھا۔ تم نے اُس حکم کی بھی نافرمانی کی۔ سبت کا ذکر استثناء باب ۵ آیت ۱۲ تا ۱۵ میں آتا ہے لکھا ہے:۔

”سبت کے دن کو یاد کرتا کہ تُو اُسے مقدس جانے جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے۔ چھ دن تک تُو محنت کر اور اپنے سب کام کیا کر۔ پر ساتواں روز خداوند تیرے خدا کے سبت کا ہے تُو اُس دن کوئی کام نہ کر نہ تُو۔ نہ تیرا بیٹا۔ نہ تیری بیٹی۔ نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا بیل۔ نہ تیرا گدھا۔ نہ تیری کوئی مواشی۔ اور نہ مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو۔ تا کہ تیرا غلام اور تیری لونڈی تیری طرح سے آرام کریں۔ یہ بھی یاد کر کہ تُو مصر کی زمین میں غلام تھا۔ اور وہاں سے خداوند تیرا خدا اپنے زور آور ہاتھ اور بڑھائے ہوئے بازو سے تجھے نکال لایا۔ اس لئے خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا کہ تُو سبت کے دن کی محافظت کر“۔ اسی قسم کا مضمون خروج باب ۲۰ آیت ۸ تا ۱۱ میں بھی ہے۔ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا واقعی اُن ٹکڑوں میں سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی میں سے اب تک محفوظ چلے آتے ہیں۔ انسانی اعمال کی حکمت اور غرباء کی خبرگیری کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم اس میں موجود ہے۔

سبت جس کا عبرانی لہجہ شبات ہے اس کے معنے عربی کی طرح (دیکھو حل لغات) عبرانی میں بھی آرام کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی عبرانی زبان میں ختم کرنے اور ترک کرنے کے بھی ہیں (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ SABBATH)

HEBREW AND ENGLISH
LEXICON OF THE OLD
TESTAMENT

عربی زبان میں بھی یہ معنے پائے جاتے ہیں کہتے ہیں سَبَتَ الشَّيْءَ قَطَعَهٗ اس چیز کو کاٹ۔ سَبَتَ رَأْسَهٗ حَلَقَهٗ اس کا سر مُونڈا عبرانی زبان کے واقفوں کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ ہفتہ کے دن

کا نام سبت آرام کی وجہ سے نہیں رکھا گیا بلکہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اُس ہفتہ کے کام کو ختم کرتا ہے۔

پُرانی بابلی زبان میں سَبَتُّو دعائے توبہ کو کہتے تھے اس لئے بعض (جیبس) کے نزدیک یہ اسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ توبہ اور دُعا کا دن ہے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴ کالم ۴۱۷۴)

جیسا کہ بائبل کے حوالہ سے ظاہر ہے سبت کا دن غلاموں ملازموں اور قبیلہ کے لوگوں کو آرام دلانے اور عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ دونوں حکمتیں نہایت اہم ہیں اور یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کو مدنظر رکھا جائے یہودیوں میں سبت ہفتہ کو منایا جاتا تھا اور بائبل سے ہفتہ کا دن ہی اس بات کے لئے ثابت ہے (اس لئے سبت کے معنے ہی ہفتہ کے دن کے ہو گئے ورنہ اصل معنے سبت کے یہی ہیں کہ جس دن روزمرہ کے کام چھوڑ دیئے جائیں اور اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ بنو اسرائیل کا سبت ہفتہ کو ہوتا ہے اور مسلمانوں کا جمعہ کو) کیونکہ لکھا ہے جمعہ کے دن خدا تعالیٰ نے دُنیا کو پیدا کرنے کا کام ختم کیا اور ہفتہ کے دن آرام کیا اور اسی کی یاد میں یہودیوں کو سبت منانے کا حکم دیا چنانچہ آتا ہے "خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین۔ دریا اور سب کچھ جو اُن میں ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا" (خروج باب ۲۰ آیت ۱۱ نیز دیکھو خروج باب ۲ آیت ۲ تا ۵) عیسائیوں نے بھی سبت کی اہمیت کو تو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے لئے اتوار کا دن قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض یورپین اقوام اور بادشاہوں نے جب عیسائیت کی طرف رغبت ظاہر کی تو انہوں نے اپنے عیسائی ہونے کی ایک شرط یہ رکھی کہ چھٹی کا دن اتوار قرار دیا جائے اور ان لوگوں کو عیسائی بنانے کے لالچ میں پادریوں نے اُن کی اس دعوت کو قبول کر لیا اور اس طرح سبت کی بے حرمتی میں وہ یہود سے بھی بڑھ گئے کیونکہ یہود تو سبت کے دن کبھی کبھی کوئی فائدے کا کام کر لیا کرتے تھے لیکن عیسائیوں نے ہفتہ کو ہمیشہ کے لئے کام کا دن قرار دے دیا اور آرام کے دن کے لئے اتوار کو چن لیا۔ اگر خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایسا ہوتا تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی مگر یہ جو کچھ ہوا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت نہیں ہوا۔ اپنی مرضی سے اور حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد ہوا۔ حضرت مسیح ناصریؑ خود سبت کا احترام کیا کرتے تھے۔ گو یہودیوں میں جو غلو سبت کے متعلق پیدا ہو گیا تھا اس کے وہ مخالف بھی تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "سبت کا دن انسان کے واسطے ہوا نہ انسان سبت کے دن کے واسطے" (مرقس باب ۲ آیت ۲۷) اس کے یہی معنے ہیں کہ اگر حقیقی ضرورتیں پیش آ جائیں تو اُس میں سبت کے تفصیلی احکام کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا اور نہ دین کے کاموں کو سبت روک سکتا ہے یہودیوں میں یہ بیہودہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ سبت کے دن تبلیغ کرنی بھی کرنا اور دوسرے نیکی کے کام کرنے بھی ناجائز ہیں حالانکہ سبت کے دن تو صرف دنیوی کاموں سے روکا گیا تھا۔

> انجیل میں سبت منانے کا حکم اور عیسائیوں کا اسکی خلاف ورزی کرنا۔

ابتدائی ایام میں عیسائی اقوام برابر سبت کا دن مناتی چلی آئی ہیں (دیکھو انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴۔ اور جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۶۰۵) ہاں حواریوں کے زمانہ سے ہی غیر یہودی قوموں میں اتوار کا احترام بھی جو کہ آرین نسلوں کا مقدس دن ہے ساتھ ساتھ جاری تھا چنانچہ پولوس نے قرنتیوں کے نام جو پہلا خط لکھا ہے اُس میں تحریر ہے کہ

"ہر ہفتہ کے پہلے دن (یعنی اتوار کو) تم میں سے ہر کوئی اپنی آمدنی کے موافق جہاں تک فائدہ اُٹھایا کچھ جمع کر کے اپنے پاس رکھے تاکہ جب میں آؤں تو چندہ کرنا نہ پڑے" (باب ۱۶ آیت ۲) اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کے دن وہ لوگ چھٹی کیا کرتے تھے اسی طرح اعمال باب ۲۰ میں پولوس کے ذکر میں لکھا ہے "اور ہفتہ کے پہلے دن (اتوار کو) جب شاگرد روٹی توڑنے کو اکٹھے آئے پولس نے کہ دوسرے دن جانے کو تھا ان کے ساتھ کلام کیا اور اپنا کلام آدھی رات تک بڑھایا" (آیت ۷) اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر یہودی قوموں کے اجتماع عام طور پر اتوار کے دن ہوا کرتے تھے شاید اس لئے کہ وہ اُن کی قومی چھٹی کا دن تھا آجکل بھی جہاں جہاں مسلمان انگریزی حکومت کے ماتحت ہیں انہیں اپنے جلسے اتوار کے دن کرنے پڑتے ہیں کیونکہ یہی چھٹی کا دن ہے۔

> عیسائیوں کا ہفتہ کے دن کی بجائے اتوار کو چھٹی کا دن منانے کی وجہ۔

بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ اتوار کے دن عیسائیوں نے سبت کا منانا اس لئے شروع کیا تاکہ غیر یہودی قوموں میں اُن کی مخالفت نہ پیدا ہو۔ برنباس کے خط میں لکھا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مسیح اس دن مُردوں میں سے جی اُٹھے تھے (جیوش انسائکلوپیڈیا جلد ۱) بہرحال کوئی وجہ بھی ہو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف تھا اسلام نے بھی سبت کا ایک دن مقرر فرمایا ہے اور وہ جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کا دن کسی قیاس کے مطابق مسلمانوں نے مقرر نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مقرر کیا ہے اس لئے ان پر وہ اعتراض نہیں پڑتا جو عیسائیوں پر پڑتا ہے۔

سبت کے دن یہودیوں کی نافرمانیاں کرنے کا ذکر قرآن مجید میں۔

اسلام نے جمعہ کے دن کے لئے یہ خصوصیتیں مقرر فرمائی ہیں۔ اُس دن چھٹی رکھی جائے۔ عبادت زیادہ کی جائے اُسے قومی اجتماع کا دن بنایا جائے۔ نہایا دھویا جائے۔ صفائی کی جائے مریضوں کی عیادت کی جائے اسی طرح اور قومی اور تمدنی کام کئے جائیں ہاں جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد اجازت دی گئی ہے کہ لوگ اپنے مشاغل میں لگ جائیں مگر زیادہ مناسب اسی کو قرار دیا ہے کہ بعد میں بھی وہ ذکر الٰہی میں مشغول رہیں۔

سبت کی بے حرمتی کی سزا میں مسلمانوں کے لئے عبرت۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی سبت کی قدر نہیں جانی اور جمعہ کی نماز سوائے بڑے شہروں کے ایک عرصہ تک ہندوستان سے بالکل مٹ ہی گئی۔ اب پھر کچھ اس طرف توجہ ہے مگر اب بھی سو میں سے ایک مسلمان صرف جمعہ کی نماز بھی ادا کرنے کے لئے تیار نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ گورنمنٹ نے بعد مشکل بانی سلسلہ احمدیہ کے میموریل اور جماعت احمدیہ کی کوششوں کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے ایک گھنٹہ کی چھٹی منظور کی ہے مگر افسوس کہ مسلمان اب بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور بعض جگہ پر تو دوسرے مسلمان صاف طور پر گورنمنٹ کے افسروں سے کہہ دیتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے لئے چھٹی کی درخواست محض احمدیوں کی شرارت ہے ہم لوگ اس میں شامل نہیں۔

عیسائیوں میں اب پھر یہ تحریک شروع ہے کہ اتوار کی جگہ ہفتہ کو سبت منایا جائے۔ یہ لوگ سونتھ ڈے ایڈونٹس (Seventh day Advents) کہلاتے اور اتوار کی بجائے ہفتہ کو سبت مناتے ہیں۔

اس آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے سبت کے دن زیادتیاں کیں وہ زیادتیاں کیا تھیں۔ اس کا جواب خود قرآن کریم میں ہی مذکور ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (اعراف ع ۲۱) یعنی ان سے پوچھ اُس بستی کی نسبت جو سمندر کے کنارے پر تھی جبکہ وہ زیادتی کیا کرتے تھے سبت کے متعلق۔ اُس وقت کہ اُنکی مچھلیاں اُن کے سبت کے دن سامنے آجاتی تھیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تھا سامنے نہ آتی تھیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی لوگ تجارتی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہفتہ کو مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے اس آیت میں یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں زیادہ آتی تھیں یہ کسی غیر معمولی معجزے کا ذکر نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ بعض مخیر لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقدس ایام میں اپنے جانوروں وغیرہ کو بھی کچھ کھانا ڈال دیتے ہیں اور جانور بھی ان اوقات کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں معلوم ہوتا ہے سبت کے دن نیک لوگ کنارے پر آٹا وغیرہ ڈال دیتے ہونگے تاکہ یہ اُنکی طرف سے صدقہ ہو۔ مچھلیاں اس دن خصوصیت کے ساتھ وہاں جمع ہو جاتی ہونگی جب شریروں نے یہ نظارہ دیکھا تو انہوں نے سبت کے دن مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں ہندو لوگ بھی اپنے مقدس گھاٹوں پر آٹا اور دانے وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ ان گھاٹوں پر جاکر دیکھو کہ ان اوقات میں جبکہ آٹا یا دانے ڈالے جاتے ہیں مچھلیاں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ تعجب آتا ہے اور اُس جگہ سے ہٹ کر یا دوسرے اوقات میں دیکھو تو مچھلیاں نظر ہی نہیں آتیں۔

بائبل میں بھی سبت کے متعلق یہود کی بعض نافرمانیوں کا ذکر آتا ہے نحمیاہ باب ۱۳ میں لکھا ہے۔

"انہی دنوں میں نے کتنوں کو دیکھا جو سبت کے دن

انگوروں کو کولھوؤں میں کچلتے ہیں اور پولے باندھتے اور گدھے لادتے ہیں اسی طرح مے اور انگور اور انجیر اور سارے بوجھ دیکھے جنہیں وے سبت کے دن یروشلم میں لائے اور جس دن وے سیدھا بیچنے لگے انکی بدی اُن پر جتائی۔ اور وہاں صور کے لوگ بھی بستے تھے جو مچھلی اور ہر طرح کی چیزیں لا کے سبت کے دن یہوداہ اور یروشلم کے لوگوں کے ہاتھ بیچتے تھے" (آیت ۱۵ و ۱۶) سبت کی بے حرمتی کا ذکر یرمیاہ باب ۱۷: آیت ۱۹ تا ۲۷۔ اور حزقی ایل باب ۲۲۔ آیت ۸ میں بھی آتا ہے

کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ۔ اس آیت کے معنے کرنے میں بعض مفسرین نے دھوکا کھایا ہے اور قِرَدَۃً کے لفظ سے جس کے معنی بندر کے ہیں یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں سبت کے حکم کی نافرمانی کرنے والی قوم کے بندر بن جانے کی خبر دی گئی ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں کیونکہ قرآن کریم میں یہ واقعہ اس جگہ کے علاوہ دو اور جگہ پر بھی بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں مقامات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ درحقیقت بندر نہیں تھے بلکہ بندر کا لفظ تشبیہ و تمثیل کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۶۱ و ۶۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۚ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ○ وَإِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ○ (المائدہ ع ۹) یعنی ان لوگوں سے کہہ دے کہ کیا میں تم کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس جماعت سے زیادہ بُری جزا پانے والی جماعت کی خبر دوں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اُن پر غضب کیا اور اُن میں سے ایک جماعت کو بندر اور سؤر بنا دیا اور جو لوگ کہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں یہ لوگ زیادہ بُرے ہیں اپنے رتبہ کی وجہ سے لحاظ سے اور زیادہ گمراہ ہیں سیدھے راستہ سے۔ اور جب یہ لوگ آتے ہیں تمہارے پاس کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ یہ لوگ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ واپس چلے گئے اور اللہ اس چیز کو جسے یہ چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ جماعت جس پر خدا تعالیٰ نے لعنت کی ہوئی تھی اور اسے بندر اور سؤر بنا دیا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا جایا کرتی تھی اور آپ کے پاس آکر نفاق سے یہ بھی کہہ دیا کرتی تھی کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ اُس کے دل میں کفر بھرا ہوتا تھا۔ اور یہ بات قرآن کریم سے اور احادیث اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ جماعت آدمیوں کی ہی تھی نہ کہ بندروں اور سؤروں کی پس معلوم ہوا کہ بندر بنا دینے سے مُراد یہ نہیں کہ وہ شکلاً اور ماہیتاً بندر بن گئے تھے بلکہ اِس سے مُراد اُن کا بندروں کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کر لینا تھا۔

دوسرا موقع جہاں بنی اسرائیل کے بندر بنائے جانے کا ذکر ہے سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۵ تا ۱۶۸ ہیں جن میں سبت کے متعلق بنی اسرائیل کی سرکشی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚ وَإِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (الاعراف ع ۲۱) یعنی جب ان لوگوں نے اُس چیز میں کہ جس سے روکے گئے تھے سرکشی کی ہم نے انہیں کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل۔ اور جب تیرے رب نے حکم دیا کہ وہ ضرور قیامت کے دن تک اُن پر ایک جماعت کو مقرر کرے گا جو اُن کو بہت بُرا عذاب دیگی۔ تیرا رب بڑا جلدی عذاب دینے والا ہے اور وہ ضرور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اور ہم نے اُن کو زمین میں جماعتیں بنا کر پھیلا دیا۔ ان میں سے نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ اور ہم نے اُن کو نفعوں اور نقصانوں دونوں کے ذریعہ آزمایا تاکہ وہ لوٹ آئیں۔

ان آیات پر غور کر کے ہر ایک شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے

بائبل میں سبت کے متعلق یہود کی بعض نافرمانیوں کا ذکر

کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ کی تفسیر قرآن مجید کی دوسری آیات کے پیش نظر

کہ یہ بندر حقیقی بندر نہیں بلکہ اس نافرمان قوم کو بندروں سے بہت مشابہت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ وہ جماعت قیامت تک باقی بھی رہیگی اور اس میں نیکوکار اور بدکار بھی ہوتے رہیں گے اور قسم قسم کے امتحانات کے ذریعہ سے اُن کو نیکی کی طرف واپس لانے کی تدابیر بھی کی جائینگی۔ غرض قرآن کریم نے چونکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ کے بندر بنائے جانے کا مطلب خود ہی بتا دیا ہے اس لئے اس کے مخالف کسی اور روایت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہود حقیقی بندر نہیں بنے تھے بلکہ ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔

بعض لوگ اس تشریح کو سن کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کیا تعجب ہے کہ یہود مسخ ہو کر بندر بننے والے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آتے ہوں۔ اول تو جو تشریحات قرآن کریم کی بیان ہوئی اوپر بتائی گئی ہیں وہ اس توجیہ کی اجازت ہی نہیں دیتیں دوسرے جو لوگ ائمہ سابق میں سے اس قسم کے مسخ کے قائل ہیں وہ خود بھی اسے تسلیم نہیں کرتے کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک زندہ رہے تھے ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فَجُعِلُوْا قِرَدَةً فُوَاقًا ثُمَّ هَلَكُوْا مَا كَانَ لِلْمَسْخِ نَسْلٌ یعنے یہود ذرہ سی دیر کے لئے بندر بنائے گئے تھے پھر ہلاک ہو گئے تھے اور مسخ شدہ کی نسل نہیں چلا کرتی۔ اسی طرح ضحاک نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فَمَسَخَهُمُ اللّٰهُ قِرَدَةً بِمَعْصِيَتِهِمْ يَقُوْلُ اِذًا لَا يَحْيَوْنَ فِي الْاَرْضِ اِلَّا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ قَالَ وَلَمْ يَعِشْ مَسْخٌ قَطُّ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَلَمْ يَاْكُلْ وَلَمْ يَشْرَبْ وَلَمْ يَنْسِلْ (ابن کثیر جلد اول ص۱۴۹) یعنی ضحاک حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب سے مسخ کر دیا پھر فرماتے تھے ایسے لوگ دُنیا کے پردہ پر تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہتے تھے پھر ضحاک نے کہا کہ کبھی کوئی مسخ شدہ مخلوق تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی اور مسخ ہونے کے بعد نہ وہ کھانا کھاتی ہے اور نہ وہ پانی پیتی ہے اور نہ اسکی نسل چلتی ہے۔ اسی حوالے سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مسخ کے قائل ہیں انکے نزدیک مسخ کے بعد تین دن سے زیادہ کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا جب یہ مسئلہ ہے تو جن مسخ شدہ لوگوں کے بارہ میں قرآن کریم فرماتا ہے کہ قیامت تک ان پر لوگ مسلط رہیں گے اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھی آیا کرتے تھے اور باتیں کیا کرتے تھے وہ جسمانی طور پر مسخ شدہ کس طرح ہو سکتے ہیں بفرض محال اگر جسمانی مسخ کو مان لو تو بھی قرآن کریم میں جن لوگوں کے مسخ ہونے کا ذکر ہے انکی نسبت تو اوپر کے حوالوں کی روشنی میں ماننا پڑے گا کہ وہ تو روحانی طور پر مسخ ہوئے تھے جسمانی طور پر بندر یا سؤر ہرگز نہ بنے تھے۔

قرآن کریم کی مذکورہ بالا تشریح کے علاوہ ایک اور بھی ثبوت ہے جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جگہ بندر سے حقیقی بندر مراد نہیں ہیں اور وہ قواعدِ زبان کی شہادت ہے۔ عربی گرامر کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ وْن اور ی ن کو صرف ان جمع کے صیغوں کے آخر میں لگایا جاتا ہے جو ذوی العقول کے متعلق ہوں یا جو انکی صفات ہوں اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قِرَدَةً کی صفت خَاسِئِيْنَ بیان فرمائی ہے جس کے آخر میں ی ن ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قِرَدَةً سے وہ بندر مراد نہیں جو حیوانات کی قسم سے ہیں کیونکہ اگر وہ مراد ہوتے تو قِرَدَةً کی صفت بجائے خَاسِئِيْنَ کے خَاسِئَةً آتی لیکن چونکہ قِرَدَةً کی صفت خَاسِئِيْنَ آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندر حقیقی بندر نہ تھے۔

علماء سلف کا اس بات کو ماننا کہ یہود حقیقی بندر نہ بنے تھے۔

جو معنے ہم نے اوپر کئے ہیں وہ علماء سلف سے بھی مروی ہیں چنانچہ مجاہد جو مفسرین کے سردار مانے جاتے ہیں اور تابعین میں سے ہیں وہ کہتے ہیں مُسِخَتْ قُلُوْبُهُمْ وَلَمْ يُمْسَخُوْا قِرَدَةً وَاِنَّمَا هُوَ مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللّٰهُ لَهُمْ (ابن کثیر جلد اول ص۱۴۸ نیز درمنثور) یعنی ان کے دل مسخ کر دیئے گئے تھے وہ خود مسخ نہیں کئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات صرف ایک مثال کے طور پر بیان فرمائی ہے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں کہ قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ کے معنے اَذِلَّةً صَاغِرِيْنَ کے ہیں یعنی ذلیل رسوا۔ قتادہ اور ربیع اور ابو مالک کا بھی یہی قول ہے (لغت میں بھی کہتے قَرِدَ فُلَانٌ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں ذلیل ہو گیا) (ایضاً) اسی طرح دوسرے علماء نے بھی کہا ہے جُعِلَتْ اَخْلَاقُهُمْ كَاَخْلَاقِهَا (مفردات) کہ انکے اخلاق بندروں جیسے ہو گئے تھے۔

يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا

تمہیں ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے انہوں نے کہا کیا تو ہمیں

هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ

تمسخر کا نشانہ بناتا ہے (موسیٰ نے) کہا میں (اس بات سے) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ (ایسا فعل کرکے) میں

الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا

جاہلوں میں شامل ہو جاؤں ۵۶۶ انہوں نے کہا ہماری خاطر اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتا دے

بندر بنا دینے سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی قرآن کریم سے ہی ظاہر ہے۔ اول تو وہ ذلیل ہو گئے جس طرح بندروں کو لوگ پکڑ کر نچاتے پھرتے ہیں اور جس طرح قلندر ان سے کرتب کرانا پڑتا ہے اسی طرح ان پر بھی ایسی حکومتیں مسلط ہوئیں اور ہوتی رہینگی جو جس طرح چاہینگی ان سے معاملہ کرینگی ان کی حکومت میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

دوم بندر کا کام نقل کرنا ہوتا ہے بندر کی عادت ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے ویسا ہی کرنے لگتا ہے اور بنی اسرائیل میں سے بھی ایک جماعت کے دل ایسے مسخ ہو گئے تھے کہ خشیت اللہ کا نام نہ رہا تھا۔ ان کے تمام کام نقل کے طور پر تھے حقیقت کچھ نہ تھی چھلکے کو پکڑے بیٹھے تھے اور مغز سے بالکل بے خبر تھے حتیٰ کہ ایسا بھی کر لیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے پاس آکر مسلمان بن جاتے اور ہم مذہبوں کے پاس جا کر یہودی بن جاتے۔

تیسرے بندروں میں شہوت زیادہ پائی جاتی ہے عربی کا محاورہ ہے فُلَانٌ اَزْنٰی مِنْ قِرْدٍ (لسان و تاج) فلاں شخص بندر سے بھی زیادہ زناکار ہے یہود میں بھی بدکاری حد سے بڑھی ہوئی ہے حتیٰ کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں یہی ناچ باناری پائی جاتی ہیں۔

۵۶۶ حل لغات۔ هُزُوًا :- هَزَأَ بِهٖ وَهَزَأَ مِنْهُ کے معنے ہیں سَخِرَ مِنْهُ اس سے تمسخر کیا (اقرب) هُزُوًا اس کا مصدر ہے یعنی مسخری کرنا۔ مصدر بمعنے اسم مفعول استعمال ہوا ہے اور اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کے معنے یہ ہیں کہ کیا تو ہمیں تمسخر کا نشانہ بناتا ہے۔

اَلْجٰهِلِيْن

اَلْجَاهِلِيْنَ :- اَلْجَاهِلُوْنَ اور اَلْجَاهِلِيْنَ جَهِلَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اَلْجَهْلُ کے ایک معنی ہیں فِعْلُ الشَّيْءِ بِخِلَافِ مَا حَقُّهٗ اَنْ يُّفْعَلَ کسی امر کو کما حقہ ادا کرنے کے خلاف ادا کرنا۔ (مفردات)

یہودیوں میں بندر کی سی خاصیات کا پیدا ہو جانا۔

تفسیر:- بنی اسرائیل چونکہ مصر میں رہتے تھے اور وہاں کے لوگ گائے کی بہت عزت کرتے تھے اس سبب سے اُن کے دل میں بھی گائے کی عظمت آگئی تھی چنانچہ اس سورۃ کی آیت ۵۲ اور خروج باب ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اپنے لئے ایک معبود بنایا تو وہ بچھڑے کی شکل پر ہی تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں گائے کی عظمت الوہیت کی عظمت تک پہنچی ہوئی تھی اور چونکہ انبیاء کی اصل غرض دنیا سے شرک کا مٹانا اور اس واحد خدا کے جلال کا دنیا پر ظاہر کرنا ہوتا ہے جو سب مخلوق کا خالق اور مالک ہے اس لئے ضرور تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کوئی ایسا سامان بھی کرتی جس سے بنی اسرائیل کے دل سے گائے کی وہ عظمت مٹ جائے جس کی وجہ سے وہ اسکی عبادت تک کے لئے تیار ہو جاتے تھے اور اگر ایسا بندوبست کوئی نہ کیا جاتا تو ضرور تھا کہ کچھ مدت کے بعد بنی اسرائیل پھر گائے کی پرستش کی طرف متوجہ ہو جاتے پس اس غرض کو پورا کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں گائے کی قربانی کا کئی جگہ حکم دیا گیا ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ

هُزُوًا

جب ایک قوم ایک جانور کو ذبح کرتی رہے گی تو وہ کبھی اُسے اُلوہیت کی صفات سے متصف نہیں قرار دے سکتی۔

مذکورہ بالا آیات میں بھی اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گائے کی قربانی کا حکم دیا لیکن انہوں نے بہانہ بنا کر ٹالنا چاہا مگر آخر کار بادلِ ناخواستہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

بنی اسرائیل کا مصریوں کے ماتحت ہونے کو تسلیم کرنا اور حضرت موسیٰ کا اس عقیدت کو مٹانے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم دینا۔

اس جگہ پر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر کرتا ہے۔ گو سامری کے بچھڑے کے پوجنے کے بعد اور سخت سزاؤں کے برداشت کرنے کے بعد اور بڑی توبہ اور ندامت کے اظہار کے بعد یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ انکی وہی نسل پھر شرک کے قریب چلی جائیگی مگر انہوں نے اس واقعہ سے بھی عبرت حاصل نہ کی اور پھر شرک کی طرف راغب ہوگئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکی بدقسمتی سے کوئی ایسا بیل اُن کے گلّے میں پیدا ہوگیا جو نہایت خوشنما اور خوش رنگ تھا۔ چونکہ فرعون کی قوم میں بیل کی پوجا کا عام رواج تھا۔ بلکہ سب سے بڑا مندر مصر کا وہی تھا جس میں ایک بے عیب بیل بطور دیوتا کے رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اُس اثر کے ماتحت جو مصر میں رہنے کی وجہ سے ان کے عقائد پر پڑا تھا اُس بیل کو خاص عزت کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان میں گائے کی قربانی کا رواج پیدا کیا جائے تاکہ اس قسم کے خیالات کا قلع قمع ہو بنی اسرائیل کے دل میں چونکہ چور تھا انہوں نے فوراً شبہ کیا کہ اس خاص بیل کے متعلق جو ہماری قوم میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کس طرح اُن کا پتہ لگ گیا ہے اور انہوں نے اُس بیل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں بیل کی قربانی کا حکم دیا ہے۔ اُس وقت یہود کی مثال بالکل "چور کی داڑھی میں تنکا" والی ہوگئی اور انہوں نے بجائے اس کے کہ خاموشی سے ایک بیل ذبح کر دیتے اور اس طرح اُن کے عیب پر بھی پردہ پڑا رہتا اور منشائے الٰہی بھی پورا ہو جاتا کہ آہستہ آہستہ اُنکے دلوں سے گائے اور بیل کی عظمت بالکل نکل جائے اُلٹا یہ کیا کہ

مصری لوگوں میں بیل کو پوجنے کا رواج

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سوالوں کی بھرمار شروع کر دی کہ فوراً آپکو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی خاص بیل کے ذبح کرنے کا حکم جو ملا ہے اسکی تمام نشانیاں بتائی جائیں۔ اس جرح قدح کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر اللہ نے وہ تمام علامتیں جو اس مخصوص بیل میں پائی جاتی تھیں جس کا ادب اور احترام بنی اسرائیل میں پیدا ہو رہا تھا انہیں بتا دیں اور وہ خاص بیل انہیں ذبح کرنا پڑا اور شرمندگی الگ اٹھانی پڑی۔

مصری لوگوں میں بیل کی عبادت اور اسکی عظمت کے متعلق تاریخ میں کثرت سے حوالے ملتے ہیں نیو سٹینڈرڈ ڈکشنری میں ایپس (APIS) کے لفظ کے نیچے لکھا ہے۔ یہ ایک مقدس بیل ہوتا تھا جسکی مصری لوگ قدیم زمانہ میں پوجا کرتے تھے اور اپنے بتوں اور تصویروں میں بھی اسکی شکلیں دکھاتے تھے۔ یہ مصر کے مقدس جانوروں میں سے سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا اسکی پیدائش کے دن کو ایک عام چھٹی کے طور پر ملک میں منایا جاتا تھا اور اسکی موت پر تمام ملک میں ماتم کیا جاتا تھا اور یہ ماتم اس وقت تک جاری رکھا جاتا تھا جب تک ایک نیا ایپس اُن علامتوں کے مطابق جن سے اس کے خدا کے مظہر ہونے کا ثبوت حاصل ہو نہ مل جائے میمفس (MEMPHIS) مقام پر اس کا بہت بڑا مندر تھا اور ہر ایسے بیل کے مرنے کے بعد اسکی لاش میں مصالحے بھر دیئے جاتے تھے اور اُسے ایک چٹان سے کھودے ہوئے مقبرہ میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS) صفحہ ۵۰۷ پر لکھا ہے کہ

مصریوں میں جانور کی پوجا کرنے کا جو رواج تھا اس میں سب سے اہم مقام بیل کو حاصل تھا۔ اور اس پوجا کا نشان بہت پرانے زمانہ تک ملتا ہے۔ جب کوئی پرانا ایپس یعنی بیل مر جاتا تھا تو ایک نئے بیل کی تلاش کی جاتی تھی اور جس گلّے میں سے یہ بیل ملتا تھا اس کے مالک کو بڑی عزت دی جاتی تھی اور جو شخص اس کو تلاش کرتا تھا اس کو بھی بہت بڑا انعام دیا جاتا تھا اور بیل کی مادہ کو بھی لاکر میمفس مندر کے ایک اور کمرہ میں رکھا جاتا تھا۔ سال میں صرف ایک دفعہ اُسے گائے سے ملنے کا موقع دیا جاتا تھا اور پھر

اُس گائے کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اُسکی پیدائش کا دن ہر سال منایا جاتا تھا۔ اس دن اُسے پبلک کے سامنے لایا جاتا تھا۔ اور لوگ اُسکی زیارت کے لئے جمع ہوتے تھے مصری لوگ اس بیل کے حوان سے آیندہ کی خبریں معلوم کرتے تھے اور بیل کے مندر کے پجاریوں کی خوابوں سے (جو عموماً خود) نائندہ اُٹھواتے تھے جبکہ اس مندر کے سامنے کھیلتے ہوئے بچے جو باتیں کرتے تھے اُن سے (بھی) وہ پیشگوئیوں کا مفہوم نکالتے تھے۔ جب وہ مر جاتا تھا تو اُس کی ممی بنا کر ایک چٹان کی قبر میں محفوظ کر دیتے تھے ایپس بیل کی پوجا کسی خاص قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ سارا ملک اسکی عبادت کرتا تھا۔

اس بیل کی پوجا کی بنیاد کہا جاتا ہے کہ مصر کے دوسرے بادشاہ "ککاؤ" نامی نے شروع کی تھی اور ممفس پر اس کا مندر بنایا تھا اور اس بیل کا نام سورج دیوتا کے باپ فتاح PHTAH دیوتا کے نام پر ایپس رکھا تھا۔ اسی طرح ہیلیو پولس مقام پر اس نے ایک دوسرے بیل مینوس MNEVIS نامی کی سورج دیوتا کی ایک زندہ یادگار کے طور پر پرستش کروانی شروع کی نیز ہرمانتھس (HLRMONTHiS) مقام پر ایک بیل "باکھا" نامی کی پرستش شروع کرائی گئی جسے پہلے منتو MENTUI دیوتا کا اور بعد میں سورج دیوتا کا مظہر قرار دیا گیا۔

مصریوں میں بیل کی طرح گائے کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ بیل کے سوا اور جانوروں کی پوجا بھی مصر میں ہوتی تھی اور جس قسم کے جانور کا نمائندہ کسی مندر میں رکھا جاتا تھا۔ اُس قسم کے سارے جانوروں کو ہی مقدس سمجھا جاتا تھا گو اُنکی پرستش نہیں کی جاتی تھی۔ اس قسم کے جانوروں کو کھانا جائز نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی شخص کسی دیوتا کے ہم قسم جانور کو مار دیتا تھا تو جان بوجھ کر مارنے کی صورت میں اُس کو قتل کی سزا ملتی تھی اور نادانستہ مارنے کی صورت میں جرمانہ ہوتا تھا۔ ممفس کے دیوتا بیلوں کا سلسلہ مصریوں کے آخری بادشاہوں تک چلنا ثابت ہے چنانچہ رعمیس ثانی کے زمانہ سے لے کر جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا

ہوئے اُس کے ٹولومک زمانہ PTOLEMAIC PERIOD تک کم سے کم چوبیس بیل یکے بعد دیگرے ممفس کے مقام پر فتاح کے مندر میں پوجا کے لئے رکھے گئے تھے (دی نائل اینڈ ایجپشن سیویلائزیشن

THE NILE AND EGYPTIAN CIVILIZATION BY MORET PAGE 363

مصنفہ اے مارٹ پروفیسر فرانس یونیورسٹی)

ان حوالجات سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں بیل کی پوجا خاص طور پر کی جاتی تھی اور خاص علامتوں والے بیل اس غرض کے لئے چنے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے بھی مصر میں رہنے کی وجہ سے مصریوں کے اس خیال کے اثر کو قبول کر لیا تھا۔ جب اتفاقاً اُن کی قوم کے کسی گلہ میں ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت بیل پیدا ہو گیا تو انہوں نے اپنے دل میں یہ خیال کر لیا کہ سورج دیوتا نے ان پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان کی قوم کے ایک بیل میں جنم لیا ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس شرک کو دور کرنے کے لئے بیل اور گائے کی قربانی کا حکم دیا (قرآن کریم میں بقرہ کا لفظ ہے جو بیل اور گائے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے عام طور پر بقرہ کو مؤنث سمجھ کر گائے کا ترجمہ کر لیا جاتا ہے مگر یہ لفظ صرف مؤنث پر دلالت نہیں کرتا بلکہ خواہ نر ہو یا مادہ دونوں کو بقرہ کہتے ہیں) بائبل میں اس تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہیں آتا جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اور میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ بائبل میں کسی تاریخی واقعہ کا ہونا یا نہ ہونا ایک محفوظ الہامی کتاب کے بیان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا مگر پھر بھی بائبل میں ایک ہی قسم کے بیل کی قربانی کا حکم جسکی علامات قرآن کریم نے بتائی ہیں ضرور پایا جاتا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے "بنی اسرائیل کو کہہ کہ ایک لال گائے جس پہ داغ اور بے عیب ہو اور جس پہ کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو تجھ پاس لاویں تم اسے الیعزر کاہن کو دو کہ اُسے خیمہ گاہ سے باہر لے جاوے اور وہ اُس کے حضور ذبح کی جاوے اور الیعزر کاہن اپنی انگلی پر اُس کا لہو لیوے اور جماعت کے خیمے کے آگے کی طرف اُسکے لہو کو سات مرتبہ چھڑکے پھر اُسکی

مشرک لوگوں کا اپنے عبادت گاہ میں خاص قسم کے بیل کو تلاش کر کے رکھنا۔

نوٹ: بقرہ میں بیل اور گائے ہر دو مراد لئے جا سکتے ہیں۔

مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ

کہ وہ (گائے) کیسی ہے۔ اس نے (یعنی موسیٰ نے) کہا کہ وہ فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہے کہ نہ تو بڑھیا ہے

وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا

اور نہ بچھیا (بلکہ) پوری جوان ہے ـــــ اس (بیان کردہ حد بندی) کے درمیان کی ہے اس لئے جو حکم تمہیں دیا

تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا

جاتا ہے اسے بجا لاؤ ۶۹ انہوں نے کہا ہماری خاطر اپنے رب سے (پھر) دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے

آنکھوں کے سامنے وہ گائے جلائی جاوے۔ اس کا چمڑا۔ اس کا گوشت۔ اس کا خون۔ اس کے گوبر سمیت سب جلایا جاوے پھر کاہن وہاں دیودار کی لکڑی اور زوفا اور قرمز لے کے اس جلتی ہوئی گائے پر ڈال دے۔ تب کاہن اپنے کپڑے دھووے اور اپنا بدن پانی سے دھووے بعد اس کے خیمہ گاہ میں داخل ہو اور کاہن شام تک ناپاک رہے گا اور وہ جو اُسے جلاتا ہے اپنے کپڑے پانی سے دھووے اور اپنا بدن پانی سے دھووے اور شام تک ناپاک رہے گا اور کوئی پاک شخص اس گائے کی راکھ کو جمع کرے اور خیمہ گاہ کے باہر صاف جگہ دھر دے۔ یہ بنی اسرائیل کی جماعت کے لئے محفوظ رہے گی تاکہ جدائی کے پانی میں ملائی جاوے یہ گناہ سے پاک کرنے کے لئے ہے" (گنتی باب ۱۹ آیت ۲ تا ۹) گو اس حوالہ میں ان سوالات و جوابات کا ذکر نہیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں پھر بھی ایک ادنیٰ نظر سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ گو بائبل نے اسے ایک عام واقعہ کے طور پر بیان کیا ہے لیکن اصل حکمت اس قسم کی گائے کے ذبح کرنے میں یہی تھی کہ بنی اسرائیل کے دل سے شرک کو مٹایا جائے اور اُن کو غیر قوموں کے اثر سے محفوظ کیا جائے اور شائد اسی حکمت کی وجہ سے اس پانی کا نام جس میں گائے کی راکھ کو ملانے کا حکم تھا جدائی کا پانی رکھا گیا۔

یہ جو بائبل میں آتا ہے کہ "یہ گناہ سے پاک کرنے کیلئے ہے" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر تم اس قسم کے بیل یا گائے جن کی مصر میں پوجا کی جاتی تھی بار بار قربان کروگے تو تبھی تمہارے دل شرک سے پاک ہونگے۔ بائبل کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے یہودی احادیث کی کتابوں میں اس سے بڑھ کر اس گائے کی تفاصیل دی گئی ہیں چنانچہ مشنا (یہودی حدیثوں کی کتاب) میں اس گائے کے متعلق نہایت تفصیلی بحثیں کی گئی ہیں اور ایک باب کا باب اس کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ ربی قنیس کی روایت اس کے متعلق یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بعد پھر ان شرطوں والی گائے کوئی نہیں ملی (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۱ کالم ۱۶۲۶) یہودی کتب احادیث کا یہ بیان قرآن کریم کی اس بات کی کامل تصدیق کر دیتا ہے کہ درحقیقت ایک خاص گائے کو اُس وقت ذبح کرانا مقصود تھا جس میں بعض غیر معمولی قسم کی خوبصورتی کے نشانات پائے جاتے تھے اور اس قسم کی گائے عام طور پر ہر زمانہ میں نہیں ملتی۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ دینی امور میں ہنسی اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہوتا ہے۔ افسوس بہت سے لوگ اس امر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور دینی امور میں ہنسی اور مذاق کرکے یا عدم سنجیدگی کا اظہار کرکے دلوں کو سخت کر لیتے ہیں۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ۔ بعد اس طرف اشارہ کہ دینی امور میں تمسخر نہیں کرنا چاہیئے۔

۷۶۵ حل لغات۔ فَارِضٌ۔ فَرَضَ سے بنا ہے اور فَرُضَتِ الْبَقَرَةُ کے معنے ہیں كَبُرَتْ وَطَعَنَتْ فِي السِّنِّ کہ گائے بوڑھی ہو گئی اور لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ کے معنے ہیں لَا مُسِنَّةٌ وَّلَا فَتِيَّةٌ نہ بڑھیا اور عمر رسیدہ ہے اور نہ بچھیا اور

فَارِضٌ

مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ

کہ اس کا رنگ کیا ہے (موسیٰ نے) کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد رنگ کی گائے ہے

فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ۝ قَالُوا ادۡعُ لَنَا

اس کا رنگ بہت شوخ ہے (اور) وہ دیکھنے والوں کو بہت پسند آتی ہے ۱۲۵ انہوں نے کہا کہ ہماری خاطر اپنے رب سے

بِكۡرٌ:- اَلْبَقَرَةُ الْفَتِيَّةُ- نوعمر گائے (اقرب)

بِكۡرٌ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ هِیَ الَّتِیْ لَمْ تَلِدْ یعنی لفظ بِكۡرٌ جو آیت لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ میں گائے کی صفت میں استعمال ہوا ہے اس کے معنے ہیں ایسی گائے جس نے ابھی کوئی بچہ نہ دیا ہو۔ (مفردات)

عَوَانٌ:- اَلنَّصَفُ درمیانی عمر کی۔ پوری جوان (اقرب)

تفسیر۔ تفصیل کے لئے دیکھو اوپر کی آیت کا نوٹ ۱۔

پہلی آیت میں صرف ایک بیل یا گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر چونکہ یہودیوں کے دل میں چور تھا انہوں نے علامتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ تو وہ گائے یا بیل فَارِضٌ یعنی بوڑھا ہو اور نہ بِكۡرٌ یعنی بچہ ہو بلکہ عَوَانٌ یعنی جوان ہو۔ بَيۡنَ ذٰلِكَ کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ اس کے درمیان۔ اور درمیان کا لفظ ایک چیز پر نہیں بولا جاتا بلکہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ "اس کے درمیان" سے کیا مراد ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں ذٰلِكَ سے مراد فَارِضٌ اور بِكۡرٌ کا مجموعہ ہے یعنی مراد یہ ہے کہ اس تفصیل کے درمیان درمیان۔ یا یہ کہ ایک ذٰلِكَ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ بَيۡنَ ذٰلِكَ وَذٰلِكَ۔

فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ کہہ کر حکم دیا کہ اب زیادہ لیت و لعل نہ کرو جس طرح کہا جاتا ہے کرو شرطیں نہ پوچھو لیکن یہود پھر بھی باز نہ آئے اور جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے انہوں نے پھر اور سوال کر دیا۔

بِكۡرٌ عَوَانٌ

۱۲۶ حل لغات۔ صَفۡرَآءُ فَاقِعٌ:- فَقَعَ لَوْنُهٗ کے معنے ہیں اِشْتَدَّتْ صُفْرَتُهٗ۔ اس کا رنگ بہت زرد تھا اَلْفَاقِعُ اَلْخَالِصُ الصُّفْرَةِ خالص زردی والا رنگ۔ اَلْخَالِصُ الصَّافِیْ مِنَ الْاَلْوَانِ اَیَّ لَوْنٍ کَانَ خالص اور صاف رنگ خواہ کوئی ہو۔ وَالْمَشْهُوْرُ اَنَّهٗ صِفَةٌ لِلْاَصْفَرِ اور لفظ فاقع زرد رنگ کے لئے بطور صفت کے آتا ہے یعنی جب اَصْفَرُ کے لئے لفظ فاقع استعمال کریں گے تو معنے ہوں گے شوخ زرد رنگ (اقرب)

صَفۡرَآءُ فَاقِعٌ

تفسیر۔ انہوں نے پہلے سوالوں پر بس نہ کی بلکہ باوجود الٰہی اشارہ کے کہ ہم تو تمہاری پردہ پوشی کر رہے ہیں تم زیادہ سوال نہ کرو۔ پھر یہ سوال کر دیا کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ پس اس کا جواب دیا کہ اس کا رنگ زرد فاقع ہو۔ عربی زبان میں ہر رنگ کے لئے الگ الگ خصوصیت آتی ہے۔ سود اور سیاہ کو کہتے ہیں لیکن اگر بہت سیاہ مراد ہو تو اس کے لئے حَالِكٌ کی صفت استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح صَفۡرَآءُ کا لفظ زرد رنگ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اگر نہایت خوبصورت اور گہرا زرد مراد ہو تو اس کے لئے فَاقِعٌ کی صفت استعمال کرتے ہیں۔

عَوَانٌ بَيۡنَ ذٰلِكَ کی تشریح۔

بائبل میں اس کے لئے سرخ گائے کا لفظ آیا ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے لئے صَفۡرَآءُ کا لفظ استعمال کیا ہے بعض لوگ اس میں بھی اختلاف قرار دیتے ہیں گو جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قرآن کریم جیسی محفوظ الہامی کتاب کو اگر بائبل سے اختلاف ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں وہ غیر محفوظ ہے اور یہ محفوظ ہے لیکن یہ اختلاف میرے نزدیک کوئی اختلاف نہیں کیونکہ بعض رنگ باہم مشابہ ہوتے ہیں اور مختلف نقطۂ نگاہ سے ان پر

قربانی کی جانے والی گائے کا رنگ بیان کرنے میں بائبل اور قرآن مجید کا اختلاف اور اصل حقیقت۔

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ

(پھر) دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتلائے کہ وہ (گائے) کیسی ہے ہمیں تو اس قسم کی (سب) گائیں ایک ہی جیسی

عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ○

نظر آتی ہیں اور (یقین رکھئے کہ) اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت کو قبول کریں گے ۵۶۹

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ

(موسیٰ نے) کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے نہ تو جوئے کے نیچے لائی گئی ہے کہ

الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا

ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے — بالکل تندرست ہے اس میں

مختلف الفاظ بول لئے جاتے ہیں. گہرا زرد رنگ بھی ایسے ہی لحاظ سے ہے کوئی دیکھنے والا اسے زرد قرار دے دیتا ہے اور کوئی سرخ جیسے زعفران ہے. زعفران اگر مختلف لوگوں کے سامنے رکھا جائے تو بعض لوگ اس کا رنگ سرخ بتائیں گے اور بعض اس کا زرد رنگ قرار دیں گے جس رنگ کی وہ گائے تھی معلوم ہوتا ہے یہودی لوگ اس کو سرخ کہا کرتے تھے اور عرب کے لوگ اسے زرد کہتے تھے قرآن آخر عربی میں اترا ہے اور اس نے عربی کے محاورہ کو ہی استعمال کرنا [illegible] پس یہ حقیقی اختلاف نہیں بلکہ ایک ہی بات کو مختلف طریق سے بیان کرنے کی ایک مثال ہے۔

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔ تَسُرُّ کا صیغہ مؤنث آیا ہے حالانکہ تَسُرُّ کی ضمیر لَوْنٌ کی طرف جاتی ہے جو مذکر ہے لون کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں يَسُرُّ چاہیئے تھا نہ کہ تَسُرُّ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ بھی ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کی طرف مضاف ہو تو خواہ وہ مذکر ہو یا مؤنث. مضاف الیہ کے مطابق اسکی طرف ضمیر پھیرنی بھی جائز ہوتی ہے فرض کرو مضاف مذکر ہے اور مضاف الیہ مؤنث ہے تو یہ جائز ہوگا کہ باوجود مضاف کے مذکر ہونے کے اسکی طرف مؤنث کی ضمیر پھیر دی جائے۔ چونکہ لَوْن۔ ھَا کی طرف جو مؤنث کی ضمیر ہے مضاف ہوا تھا اس لئے باوجود اس کے مذکر ہونے کے ھَا کو مدنظر رکھتے ہوئے تَسُرُّ میں مؤنث کی ضمیر استعمال کی گئی۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ کبھی کبھی عربی زبان میں ضمیر بالمعنیٰ بھی پھیر دی جاتی ہے چونکہ لَوْن سے مراد صُفْرَة تھی (یعنے زرد رنگ) جو مؤنث ہے اس لئے مؤنث کی ضمیر پھیر دی گئی۔

تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ہو سکتا ہے تَسُرُّ کی ضمیر لَوْن کی طرف نہیں بلکہ بَقَرَہ کی طرف جاتی ہے تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ بقرہ کی دوسری صفت ہو. مطلب یہ کہ وہ نہ صرف زرد بھی ہے اور ایسا خوبصورت بھی ہے کہ دیکھنے والوں کو پسند آتا ہے۔

تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ میں لفظ تَسُرُّ کی ضمیر کا مرجع۔

۵۶۹ حل لغات۔ تَشَابَهَ۔ اَلرَّجُلَانِ کے معنے ہیں اَشْبَهَ كُلٌّ مِّنْهُمَا الْاٰخَرَ حَتّٰى الْتَبَسَا کہ دو شخص اس طور پر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا (اقرب)

تَشَابَهَ

تفسیر۔ پھر بھی وہ لوگ سوال سے باز نہ آئے اور کہا ہمیں کچھ اور شرطیں بتاؤ مگر دل میں چونکہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس جگہ پر بیل کی قربانی سے مراد اس خاص بیل کی قربانی ہے جو ہماری قوم

شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ

کوئی غیر رنگ نہیں (پایا جاتا) انہوں نے کہا (ہاں) اب تو نے (ہم پر) حقیقت کھول دی ہے

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِذْ

ع ۸ ۱۰

چنانچہ انہوں نے اس (گائے) کو ذبح کر دیا۔ گو وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ تھے ۷۵ اور (اس وقت

میں معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر یہی حکم ہوا تو ہم اسے ذبح کر ہی دینگے پس ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ۔ کہ خدا نے چاہا تو جو بیل بھی آپ کہیں گے ہم اسے قربان کر دیں گے۔

۷۵ حل لغات۔ مُسَلَّمَةٌ :۔ سَلَّمَ سے اسم مفعول مُسَلَّمٌ آتا ہے۔ مُسَلَّمَةٌ مُسَلَّمٌ کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ سَلَّمَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاٰفَةِ کے معنے ہیں وَقَاهُ اِيَّاهَا کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو بیماریوں تکالیف اور خرابیوں وغیرہ کی آفات سے محفوظ رکھا (اقرب) پس مُسَلَّمَةٌ کے معنے ہونگے تندرست۔ جو بیماریوں اور خرابیوں سے محفوظ اور بچی ہوئی۔

شِيَةٌ :۔ وَشَيْتُ الشَّيْءَ وَشْيًا کے معنے ہیں جَعَلْتُ فِيْهِ اَثَرًا يُخَالِفُ مُعْظَمَ لَوْنِهٖ۔ یعنے کسی چیز میں ایسا نشان کر دیا جو اس کے اصل رنگ کے مخالف تھا (مفردات) شِيَةٌ :۔ كُلُّ لَوْنٍ يُخَالِفُ مُعْظَمَ لَوْنِ الْفَرَسِ وَغَيْرِهٖ یعنی گھوڑے یا کسی اور جانور کے بدن کے اکثر رنگ کے خلاف جو اس کے بدن میں تھوڑا سا رنگ ہو۔ اس کو شِيَةٌ کہتے ہیں (مثلاً کسی جانور کے بدن کا سارا رنگ سفید ہے اس میں قدرے کہیں سیاہی آجائے یا سارا رنگ سیاہ ہے اور کہیں سفیدی آجائے) شِيَةٌ کی جمع شِيَاتٌ آتی ہے (اقرب) پس لَا شِيَةَ فِيْهَا کے معنے ہونگے۔ اس کا رنگ ایک جیسا ہے اور کوئی غیر رنگ اس میں نہیں پایا جاتا۔

تفسیر۔ آخر اللہ تعالیٰ نے وہ ساری علامتیں بیان کر دیں جس سے اس مخصوص بیل کی تعیین ہو گئی۔ فرمایا نہ تو وہ زمین میں جوتا ہوا ہو۔ نہ اس سے پانی لیا جاتا ہو مطلب یہ کہ سانڈ کے طور پر چھوڑا ہوا ہے تم اس کے اعزاز کی وجہ سے اس سے کسی قسم کا کام نہیں لیتے اور وہ ایک بے عیب بیل ہے کہ نہ کوئی اس کو مارتا ہے نہ پیٹتا ہے اور اس وجہ سے کہ اس کے جسم پر کوئی داغ نہیں پڑتے۔ گویا جو ان بیلوں کا حال ہوتا ہے جن کا لوگ مذہبی طور پر اعزاز کرتے ہیں وہی اس کا حال ہے اس طرح تمام علامتیں خدا تعالیٰ نے بتا دیں اور یہود نے بھی آخر کہہ دیا کہ آپ نے ہمیں سچ سچ بات آخر بتا ہی دی یعنے ہم پہلے سے سمجھتے تھے کہ فلاں بیل کی قربانی کا ہمیں حکم دیا جاتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی بات تو پہلے بھی سچی ہی تھی۔ اللہ کا منشا یہ تھا کہ وہ شرمندہ نہ ہوں اور گائے کی قربانی ان میں شروع ہو جائے آہستہ آہستہ اس قسم کا شرک بھی دل سے نکل جائے گا انہوں نے خود اصرار کر کے اس بیل کی تعیین کرائی اور پھر یہ لاف زنی کرنے لگ گئے کہ اب آپ نے سچ بات بیان کی ہے پھر آگے فرمایا آخر انہوں نے اس گائے یا بیل کو ذبح کر ہی دیا مگر کچھ خوش دلی سے نہ کیا۔

یہود کا یہ فقرہ کہ اب آپ نے اصل بات بتائی ہے کتنا واضح ثبوت اس امر کا ہے کہ ان کے اندر کسی خاص بیل کی نسبت مشرکانہ خیال پیدا ہو چکے تھے ورنہ ان کا گائے کی قربانی کا حکم ملنے پر سوال پر سوال کرنا اور آخر بعض تفصیلی علامات کے بتائے جانے پر کہنا کہ اب آپ نے اصلی بات بتا دی ہے کس طرح ممکن تھا عید الاضحیہ پر قربانی کے لئے بیل لانے کے لئے ہمیشہ امراء اپنے ملازموں کو حکم دیتے ہیں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں کہ ہم سمجھے نہیں کیسی گائے۔ اور نہ سوال پر سوال کر کے خاص قسم کی گائے کو مخصوص کرلتے ہیں اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ گائے سے مراد گائے سمجھتے ہیں نہ خاص قسم کی گائے لیکن یہودیوں کے دل میں چونکہ ایک خاص بیل کی نسبت مشرکانہ عقیدہ

مُسَلَّمَةٌ

شِيَةٌ

گھر کر چکا تھا انہوں نے شروع سے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہو نہ ہو اس عام حکم کے نیچے اس خاص بیل کی قربانی کا حکم مخفی ہے پس وہ جرح کرتے گئے کرتے گئے یہاں تک کہ خاص اسی بیل کا حُلیہ انہیں بتا دیا گیا جسے وہ خدا تعالےٰ کا مظہر سمجھ رہے تھے۔

موسیٰؑ علیہ السلام کی غیبت میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پوجا کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہود کا عقیدہ گائے کے متعلق مشرکانہ تھا۔

موسیٰؑ کی غیبت میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پوجا کرنا اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ یہود کا عقیدہ گائے کی نسبت مشرکانہ تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ مصریوں میں زندہ بیل کی بھی اور اُس کے بُت کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ پس ایک دفعہ انہوں نے بُت کی اور دوسری دفعہ زندہ بیل کی پوجا کی کوشش کی۔ بیل کا جو رنگ بتایا گیا ہے وہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کیونکہ بچھڑے کا بُت بھی انہوں نے سونے کا بنایا تھا جو زرد ہوتا ہے اور وہ بیل جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس کا رنگ بھی زرد بتایا گیا ہے چنانچہ عربی زبان میں صَفْرَاءُ کے لفظ کے معنے جو لفظ کہ بیل کے رنگ کے بتانے کے لئے قرآن کریم نے استعمال کیا ہے ذَھَبٌ یعنی سونے کے بھی ہیں (اقرب) پس بُت سونے سے تیار کرنا اور قربانی کے رنگ کا صَفْرَآءُ بتایا جانا بتاتا ہے کہ جس قسم کے بیل کو یہود خدائی صفات سے متصف سمجھتے تھے وہ سنہری رنگ کا ہوتا تھا۔ اس امر کا ایک اور زبردست قیاسی ثبوت بھی ہے کہ یہ بیل جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا درحقیقت یہود کا مرکز عبادت بن رہا تھا یا بننے والا تھا اور یہ کہ اس کا رنگ زرد بتایا گیا ہے اور جیسا کہ مَیں اوپر مصری تاریخوں کے حوالوں سے ثابت کر آیا ہوں بیل جس جس مندر میں اُلوہیت کے مقام پر کھڑا کیا گیا تھا سورج دیوتا کا مظہر قرار دے کر اسے پُوجا گیا تھا ممفس میں اس کی پُوجا فتاح کے نام پر کی جاتی تھی جو "رَا" یعنے سُورج دیوتا کا باپ کہا جاتا تھا اور ہیلیوپولس اور ہرمنتھس دونوں مندروں میں اسے سُورج دیوتا کا مظہر بتایا جاتا ہے چونکہ سورج کا رنگ بھی سنہری ہوتا ہے اس لئے یہ امر کہ وہ بیل گہرے زرد رنگ کا تھا اس بات پر زبردست دلالت کرتا ہے کہ یہود نے

بیل کو سورج دیوتا کا مظہر قرار دیکر اسکی عبادت کرنیکا رواج۔

اسے سُورج دیوتا کا مظہر سمجھا تھا۔

اس قیاس کی درستی کو اگر تسلیم کیا جائے تو بیل کے رنگ کے متعلق جو دو مختلف الفاظ بائبل اور قرآن کریم میں استعمال کئے گئے ہیں ان کے بارہ میں بھی یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے جو اس کی نسبت زرد کا لفظ استعمال کیا ہے وہ واقعات کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہے بہ نسبت سُرخ کے لفظ کے۔ جسے بائبل نے استعمال کیا ہے۔

وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ قریب تھا کہ وہ ایسا نہ کرتے یعنی اس بیل کا ذبح کرنا اُن کے دل پر بہت گراں گذرا کیونکہ مصری اثر کے ماتحت وہ سمجھتے تھے کہ اس بیل میں کچھ نہ کچھ خدائی ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کیسے پُر حکمت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں بھی گائے کی قربانی کو رائج کر کے اس شرک کو ملیا میٹ کر دیا ہے جو دُنیا میں آج بھی گائے کے متعلق پایا جاتا ہے گو افسوس کہ بغیر کسی دینی فائدہ کے مسلمان اس حق کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں اور یا پھر خواہ مخواہ قربانی کی گایوں اور بیلوں کا مظاہرہ کر کے اپنی ہمسایہ قوموں کے دلوں کو دکھاتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ناجائز ہیں۔ مومن کا کام اپنی اصلاح ہے ہمسایہ کو دُکھ دینا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا منصفانہ طریق اپنی ہمسایہ قوموں کے لئے پیش کیا وہ اپنی کتاب "پیغام صلح" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کے بزرگوں حضرت کرشن اور حضرت رامچندر جی کو قرآنی تعلیم کے مطابق خدا تعالےٰ کا نبی مانتے ہیں اگر ہندو لوگ بھی ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی طرح عزت کرنے لگ جائیں تو ہم ان کی اس قربانی کے بدلہ میں اس بات کے لئے تیار ہیں کہ اس ملک میں گائے کی قربانی کو بند کر دیں مگر افسوس کہ ہندو قوم نے اس نہایت ہی منصفانہ پیشکش کو قبول نہ کیا۔

قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ

کو بھی یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا پھر تم میں سے ہر ایک نے اپنے سر سے الزام کو دور کرنے کی کوشش کی حالانکہ جو (کچھ)

مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا

تم چھپاتے تھے اللہ اُسے ظاہر کرنے والا تھا ۱۱۶ اس پر ہم نے کہا کہ اس کو (یعنی قاتل کو) اس (ضائع شدہ جان)

۱۱۶ حل لغات - قَتَلْتُمْ۔ قَتَلَ۔ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ تشریح کے لئے دیکھو حل لغات ۲۵ نیز ۵۱۔

نَفْسًا۔ نَفْسٌ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات ۲۵۔

فَادّٰرَءْتُمْ۔ اِدّٰرَءْتُمْ اصل میں تَدَارَءْتُمْ تھا۔ تا اور دال چونکہ قریب المخارج ہیں اکٹھے آگئے پس تا دال ہو کر دال میں مدغم کر دی گئی۔ ادغام کی وجہ سے ابتدائی حرف ساکن ہو گیا اور اس وجہ سے اس کا پڑھا جانا مشکل تھا اس لئے اس کے قبل ہمزہ وصل لگایا گیا تاکہ ابتدائی حرف پڑھا جا سکے تَدَارَءْتُمْ دَرَءَ سے باب تفاعل کا ماضی جمع مخاطب کا صیغہ ہے دَرَءَهٗ (يَدْرَءُهٗ) کے معنی ہیں دَفَعَهٗ وَقِيْلَ دَفَعَهٗ (دَفْعًا) شَدِيْدًا یعنی کسی کو اپنی طرف سے ہٹایا یا سختی سے دور کر کے اپنا بچاؤ کیا۔ اور تَدَارَءَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں تَدَافَعُوْا فِي الْخُصُوْمَةِ وَاخْتَلَفُوْا یعنی لوگوں نے آپس میں سختی سے جھگڑا کیا اور ہر ایک نے دوسرے کو ملزم کر کے اپنا بچاؤ کرنا چاہا اور اس طرح ان کے درمیان اختلاف برپا ہو گیا۔ اَلدَّرْءُ (جو دَرَءَ کا اسم مصدر ہے) کے اصل معنے اَلْمَيْلُ وَالْعِوَجُ فِي الْقَنَاةِ کے ہیں یعنی نیزہ میں ٹیڑھا پن اور کجی کا ہونا۔ عرب کہتے ہیں اَقَمْتُ دَرْءَ فُلَانٍ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کی کجی اور غلط روی کو دور کیا نیز اس کے معنے ہیں اَلْخِلَافُ جھگڑا۔ اختلاف (اقرب) زجاج کہتے ہیں معنی اِدّٰرَءْتُمْ تَدَارَءْتُمْ اَيْ تَدَافَعْتُمْ اَيْ اَلْقٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ کہ اِدّٰرَءْتُمْ کے معنے ہیں تم نے آپس میں کسی امر کے متعلق اس طور پر اختلاف کیا کہ ہر ایک نے اپنے سر سے الزام کو دور کرنے اور دوسرے کے ذمہ لگانے کی کوشش کی (لسان)

مُخْرِجٌ مُخْرِجٌ:۔ اَخْرَجَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَخْرَجَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَبْرَزَهٗ کسی چیز کو ظاہر کیا۔ (اقرب) پس مُخْرِجٌ کے معنے ہونگے ظاہر کرنے والا۔

تَكْتُمُوْنَ تَكْتُمُوْنَ:۔ كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کے معنے ہیں تم چھپاتے تھے اس کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات ۳۴۔

اِدّٰرَءْتُمْ کی تشریح۔ **تفسیر**۔ اِدّٰرَءْتُمْ کے معنے اختلاف کرنے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہوتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ یاد کرو جب تم نے ایک نفس کو قتل کیا اور پھر اس میں اختلاف سے کام لیا کسی نے کہا فلاں شخص نے اس کو مارا ہے کسی نے کہا فلاں شخص نے مارا ہے یا یہ کہا کہ ہم نے نہیں مارا کسی اور نے مارا ہوگا یا یہ کہ اس کے قتل کے بارہ میں کسی اور قسم کا کوئی اختلاف کیا یہ سب معنے اس آیت پر چسپاں ہو سکتے ہیں کیونکہ اِدّٰرَءَ کے لفظ میں یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں۔

قَتَلْتُمْ نَفْسًا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے والی یہودی قوم تھی یا یہودی قوم قاتل کی پشت پر تھی تبھی فرمایا گیا کہ تم یہودیوں نے قتل کیا۔ اگر یہ کوئی انفرادی واقعہ ہوتا تو پھر قوم کی طرف قتل کا فعل منسوب نہ کیا جاتا۔ قتل کے معنے اس جگہ ارادہ قتل کے بھی ہو سکتے ہیں (دیکھو نوٹ ۱۱۶ سورۃ ہذا)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں نفس کو نکرہ استعمال کرنیکی وجہ۔ نَفْسًا پر جو تنوین آئی ہے اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی غیر معروف آدمی کو۔ اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک عظیم الشان انسان کو قتل کیا کیونکہ تنوین عربی زبان میں تنکیر کے لئے بھی آتی ہے اور تعظیم کے لئے بھی آتی ہے یعنی اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ

کے (جرم قتل کے) ایک حصہ کے سبب سے مارو۔ اللہ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرتا اور تم کو اپنے نشان دکھاتا

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ

ہے تاکہ تم عقل کرو ۵۷؎ اس کے بعد پھر تمہارے دل سخت ہو گئے

کہ کوئی شخص یا چیز ایسی غیر معروف ہے کہ اس کا نام ہمیں معلوم نہیں یا ایسی بے حقیقت ہے کہ اس کا نام لینے کی ہمیں ضرورت نہیں اور یا پھر اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ شخص یا وہ چیز جس پر تنوین آئی ہے نہایت ہی اہم اور عظیم الشان ہے اور جس بارہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسا اہم امر ہے کہ ہر شخص کا ذہن اُدھر جا سکتا ہے اس لئے معرفہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اوپر کی تشریحات کے مطابق اس آیت کے معنے یہ ہوئے

قَتَلْتُمْ نَفْسًا کے معنے۔

کہ اے یہودی قوم یاد کرو جبکہ تم نے بحیثیت جماعت (۱) ایک عظیم الشان انسان کو قتل کیا تھا یا قتل کرنا چاہا تھا (۲) یا کسی شخص کی پشت پناہ بن کر یا اُسے انگیخت کر کے اور اُکسا کر کسی عظیم الشان شخص کو قتل کرنا چاہا تھا یا قتل کیا تھا (۳) یا یہ کہ اے بنی اسرائیل جبکہ تم نے ایک غیر معروف شخص کو جس کا نام لینے کی ضرورت نہیں قتل کیا تھا یا قتل کرنا چاہا تھا اور پھر اس بارہ میں تم نے اختلاف کیا یعنی یا تو یہ کہا کہ ہم نے قتل نہیں کیا یا یہ کہا تھا کہ ہم نے قتل نہیں کروایا۔ یا یہ کہا تھا کہ ہم نے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی اور یا یہ کہا تھا کہ ہم نے قتل کروانے کی کوشش نہیں کی اور یا یہ کہ ہمیں معلوم نہیں ایسا شخص قتل ہو گیا ہے یا نہیں ہوا۔

ان معنوں میں سے یہ معنے کہ ایک غیر معروف شخص کو تم نے قتل کرنا چاہا تھا یا قتل کیا تھا سب سے کمزور معنے ہیں کیونکہ ایک غیر معروف شخص کے قتل کا نہ تو یہودی قوم ارادہ کر سکتی تھی کیونکہ اس میں قوم کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور نہ ایسے شخص کے قتل کے متعلق قوم میں کوئی اختلاف پیدا ہونے کا امکان تھا پس جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نَفْسًا سے اس جگہ ایسا شخص ہی مُراد ہے جس کا نام تو نہیں لیا گیا لیکن اس کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا ہے گویا وہ ایسا شخص ہے کہ بغیر نام لینے کے بھی اسکی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اسے نکالنے والا ہے جو تم چھپاتے تھے یعنی کسی نہ کسی ذریعہ سے اللہ تعالیٰ قاتل کا یا قتل کرنے کی انگیخت کرنے والے کا یا قتل کرنے یا کروانے کی کوشش کرنے والے کا بھانڈا پھوڑ دیگا اور اسکے چہرے پر سے نقاب اٹھا دیگا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس عظیم الشان انسان کو قتل کرنے والا یا قتل کروانے والا یا قتل کرنے یا کروانے کی کوشش کرنے والا کون شخص ہے۔ اسی طرح اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بغض اور کینہ کو ظاہر کر دیگا جو اس قتل یا ارادہ قتل کا موجب ہوا۔

چونکہ اس آیت کے مضمون کی تکمیل اگلی آیت میں ہوتی ہے اس لئے اس آیت کی پوری تشریح اگلی آیت کے ماتحت کی جائیگی۔

اِضْرِبُوْهُ

۵۷؎ حل لغات۔ اِضْرِبُوْهُ

اِضْرِبُوْهُ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ وَبِالْعَصَا کے معنے ہیں اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا یعنی اس کو ہاتھ سے یا سوٹے سے یا کسی اور چیز سے مارا۔ نیز کہتے ہیں ضَرَبَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ اور معنے یہ ہوتے ہیں خَلَطَهٗ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا۔ نیز کہتے ہیں ضَرَبَ لَهٗ مَثَلًا اور مراد یہ ہوتی ہے وَصَفَهٗ وَقَالَهٗ وَبَيَّنَهٗ کسی مثال کو بیان کیا (اقرب) ضَرَبَهٗ بِالسَّيْفِ اَوْقَعَهٗ بِهٖ یعنی اس پر تلوار سے حملہ کیا (اقرب) پس اِضْرِبُوْهُ کے یہاں کئی معنے ہو سکتے ہیں۔

بِبَعْضِهَا

بِبَعْضِهَا۔ بَعْضُ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہیں طَائِفَةٌ مِّنْهُ ساری چیز کا ایک معتد بہ حصہ وَقِيْلَ جُزْءٌ مِّنْهُ اور

بعض محققین کے نزدیک کسی چیز کے ایک تھوڑے سے حصہ پر بھی بعض کا لفظ بولا جاتا ہے وَيَجُوْزُ كَوْنُهُ اَعْظَمَ مِنْ بَقِيَّتِهٖ كَالثَّمَانِيَةِ مِنَ الْعَشَرَةِ اور بعض کا لفظ کسی چیز کے بڑے حصہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے جیسے دس میں سے آٹھ کو بعض کہیں گے حالانکہ آٹھ بقیہ دو سے بہت زیادہ ہیں (اقرب)

يُحْيِي:۔ اَحْيٰى سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور يُحْيِي کے معنے ہیں وہ حیات بخشتا ہے یا وہ حیات بخشے گا۔ حَيٰوةٌ کے چھ معنوں کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۲۹ و ۲۰

اَلْمَوْتٰى:۔ اَلْمَيِّتُ کی جمع ہے اور اَلْمَيِّتُ کے معنے ہیں اَلَّذِيْ فَارَقَ الْحَيٰوةَ جس کے اندر حیات نہ رہے (اقرب) (موت۔ حیات کے مقابل کا لفظ ہے تو جتنی حیات کے ہوں اس کے اُلٹ معنی موت کے ہوتے ہیں۔ حیات کے معنوں کے لئے دیکھیں حل لغات ۲۹ و ۲۰

اٰيٰتِهٖ:۔ اٰيَاتٌ۔ اٰيَةٌ کی جمع ہے اس کے لئے دیکھیں حل لغات ۲۲

تَعْقِلُوْنَ:۔ تَعْقِلُوْنَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات ۲۵۔

تفسیر:۔ پس ہم نے ان سے کہا کہ اس کو یعنی قاتل کو اس کے یعنی مقتول کے بعض کے ساتھ یا بعض کے سبب سے مارو۔ (ب) کے معنے عربی زبان میں کئی ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

اوّل۔ اِلصاق یعنی اس کے ساتھ ملا دینا جیسے کہا جاتا ہے اَمْسَكْتُ بِخَالِدٍ میں نے خالد کو پکڑ لیا یعنی میرا جسم اور اس کا جسم مل گیا۔ کبھی ان معنوں میں یہ لفظ مجازاً بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں مَرَرْتُ بِزَيْدٍ میں زید کے پاس سے گزرا یعنی گو جسم جسم سے چھوا نہیں مگر ایک رنگ میں قرب حاصل ہو گیا۔

دوسرے معنے اس کے فعل لازم کو متعدی بنانے کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ میں زید کو لے گیا اور کبھی اس کے معنے امداد طلب کرنے کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں نَجَوْتُ بِالْفِرَارِ بھاگ کر میں نے نجات حاصل کی یعنی بھاگنے سے مدد حاصل کی۔ کبھی اس کے معنے سببیت کے ہوتے ہیں یعنی وہ چیز اس کا سبب بن گئی جیسے کہتے ہیں لَقِيْتُ بِزَيْدٍ الْاَسَدَ زید کے سبب سے میں نے شیر کو دیکھا یعنی زید اپنی قوت اور شوکت میں ایک شیر کی طرح ہے جس میں سے میں گویا شیر کا وجود دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اور کبھی اس کے معنے ساتھ ہونے کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں اِهْبِطْ بِسَلٰمٍ سلامتی کے ساتھ اترو یعنی تم بھی اترو اور تمہارے ساتھ سلامتی بھی اترے کبھی اس کے معنے تبعیض یعنی کچھ حصے کے ہوتے ہیں کہتے ہیں شَرِبَ بِمَاءِ الْبَحْرِ اس نے سمندر کے پانی کو پیا یعنی سمندر کے پانی کا کچھ حصہ پیا۔ اسی طرح ب کے معنے قسم کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں بِاللّٰهِ کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اور کبھی یہ تاکید کے لئے بھی آتا ہے (اقرب) ان کے علاوہ عربی زبان میں اس کے اور بھی کئی معنے ہیں۔

اس آیت میں صرف دو معنے چسپاں ہو سکتے ہیں ایک الصاق کے دوسرے سببیت یا تعلیل کے۔ الصاق کے لحاظ سے اس آیت کے معنے یوں ہونگے کہ اس کے بعض کے ساتھ اسے مارو یعنی اس کا بعض حصہ اس پر زور سے پھینکو اور سببیت یا تعلیل کے لحاظ سے اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس کے بعض (گناہ) کے سبب سے اسے مارو۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے دو معنی ہیں اوّل یہ کہ اس طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرتا ہے یعنی حقیقی مُردوں کو زندہ کر کے اس دُنیا میں واپس لاتا ہے۔ یہ معنے اس جگہ پر نہیں لئے جا سکتے کیونکہ قرآن شریف کی دوسری آیات ان معنوں کے خلاف ہیں اور اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی مُردے اس دُنیا میں واپس نہیں آ سکتے (دیکھو نوٹ ۲۹ سورۃ ہذا)

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طرح ایسے لوگوں کو جو مُردوں کے مشابہ ہوتے ہیں زندہ کرتا ہے

يُحْيِي

اَلْمَوْتٰى

اٰيٰتِهٖ

تَعْقِلُوْنَ

اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا میں با کے معنے سببیت یا الصاق کے

یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مُردوں کی عزت کو بچا لیتا ہے یا آئندہ دُنیا کو ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى میں احیاء موتیٰ سے مراد

آخری دونوں معنوں کی تصدیق قرآن کریم سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ ع ۲۲) یعنی اے عقلمندو قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اگر مناسب موقع پر قاتل کو سزا دی جائے تو آئندہ قتل کے جُرم کم ہو جائیں گے اور اس طرح کئی لوگوں کی جانیں بچ جائینگی۔ اس محاورہ کے رُو سے مُردے کو زندہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ جو مر چکا ہو اُسے زندہ کرنا۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ جس کے قتل ہونے کا خطرہ تھا اُس کو اِس خطرہ سے بچا لینا۔ اور اس رنگ میں بھی قصاص حیات ہے کہ جو مارا جاتا ہے اسکی عزت قائم ہو جاتی ہے اور رشتہ داروں کے دلوں سے بُغض اور کینہ نکل جاتا ہے۔ اگر قاتل کو سزا نہ ملے تو رشتہ داروں کے دلوں میں بُغض اور کینہ باقی رہ جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے آدمی کو قتل کر کے اُسکی ذلت کی گئی ہے۔ عربوں کی بول چال میں بھی یہ محاورہ پایا جاتا ہے چنانچہ ایک شاعر حارث بن حلزہ کہتا ہے ؎

اِنْ نَبَشْتُمْ مَا بَيْنَ مَلْحَةَ فَالصَّا
قِبِ فِيْهَا الْاَمْوَاتُ وَالْاَحْيَاءُ

(سبعہ معلقہ قصیدہ ۷)

یعنی اے ہماری دشمن قوم اگر تم ملحہ اور صاقب دونوں مقاموں کے درمیان قبروں کو کھود کر دیکھو تو ان قبروں میں تم کو مُردے بھی ملینگے اور زندہ بھی ملینگے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ہماری قوم بہادر اور غیور ہے جب کبھی ہمارے کسی آدمی کو تمہاری قوم کے کسی آدمی نے مارا ہے تو ہم نے اُس کا بدلہ ضرور لے لیا ہے اور اس طرح ہمارا مُردہ زندہ ہو گیا لیکن جب ہمارے کسی آدمی نے تمہاری قوم کے کسی آدمی کو مارا ہے تو تم اس کا بدلہ نہیں لے سکے پس تمہارے مُردے قبروں میں ذلیل ہیں کیونکہ اُن کا بدلہ کسی نے نہیں لیا۔

یہ شعر عرب کے زمانۂ جاہلیت کے ایک چوٹی کے شاعر کا ہے اور اِس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں مُردہ زندہ کرنے کے معنے یہ بھی ہیں کہ کسی مقتول کا بدلہ لے لیا جائے پس اس مفہوم کی رو سے كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے معنے یہ ہونگے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جو اُسکی راہ میں قتل ہوئے ہوں یا اسکی وجہ سے قتل ہوئے ہوں اُن کا بدلہ لے کر زندہ کر دیتا ہے۔

جیسا کہ مَیں اوپر بتا چکا ہوں ایک معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مُردوں کی طرح ہوں اُن کو زندہ کر دینا۔ یہ معنے عام محاورہ کے مطابق ہیں بعض دفعہ ایک چیز دوسری چیز کے ساتھ ایسی مشابہ ہو جاتی ہے کہ اُس کا نام اسے مل جاتا ہے چنانچہ عام بول چال میں جب کسی شخص کو کوئی سخت چوٹ لگے تو وہ اپنے درد اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے "ہائے میں مر گیا" مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں مُردوں کی طرح ہو گیا۔ پس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مُردوں کی طرح ہوں اللہ تعالیٰ اُن کو زندہ کر دیتا ہے یعنی جن کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ اور دنیوی علوم انکی ہلاکت کا فتویٰ دے دیتے ہیں خدا تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے بچا لیتا ہے۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اور تم کو اپنے نشان دکھاتا ہے تاکہ تم غلطیوں اور گناہوں سے رُکو۔ عقل کے معنے حل لغات ۵۲۵ سورۃ ہذا میں بتائے جا چکے ہیں کہ باندھنے اور روکنے اور رُکنے کے ہوتے ہیں۔ عقل کی قوت کو عقل اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے آپ کو گناہوں اور غلطیوں سے روک لیتا ہے۔

آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جس امر کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک نشان ہے جس سے سمجھدار لوگ فائدہ اُٹھا کر گناہ اور بدی سے بچ سکتے ہیں یا کفر اور طغیان سے نجات پا سکتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق پُرانے مفسرین کا خیال یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک مقتول سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ اسکی تفصیل یُوں بیان کرتے ہیں کہ عامیل نامی ایک شخص کو (بقول کرمانی) یا نکار کو (بقول ماوردی) اس کے بھتیجے نے اور بعض کے نزدیک اس کے بھائی نے قتل

کر دیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ گائے ذبح کریں جس کا ذکر ان لوگوں کے نزدیک اوپر کی آیات میں آچکا ہے اور پھر حکم فرمایا کہ اس گائے کے بعض ٹکڑوں کو اس مقتول کے ساتھ مارو۔ وہ ٹکڑا جس کے مارنے کا حکم دیا گیا تھا اس کے بارہ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ اسکی زبان کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ اسکی دائیں ران کے مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ جس ہڈی سے کان لگے ہیں۔ اُس ہڈی کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ نے اس گائے کے ٹکڑے کے مارنے سے مُردے کو زندہ کر دیا۔ (فتح البیان)

اختلاف کے بارہ میں کہتے ہیں کہ قاتل نے لاش ایک ایسی جگہ پھینک دی تھی جو کئی قبائل کے درمیان واقع تھا اس وجہ سے آپس میں اختلاف ہوا۔ ہر قبیلہ نے کہا کہ دوسروں نے ملا ہے ہم نے نہیں مارا۔ مفسرین اس بات کی وجہ تلاش کرنے میں بھی لگ گئے ہیں کہ قاتل نے کیوں مارا۔ بعض کہتے ہیں کہ مقتول کی لڑکی خوبصورت تھی اُس سے شادی کرنے کے لئے اُس نے چچا کو مارا۔ بعض کہتے ہیں کہ قاتل غریب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے چچا یا بھائی کو مار کر اس کا وارث بن جائے۔ علامہ قرطبی نے تو اس واقعہ سے بعض مسائل اسلامیہ کا استخراج بھی کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ تفسیریں جو کی گئی ہیں ان کا کوئی حصہ بھی قرآن کریم یا حدیث سے ثابت نہیں۔ اسی وجہ سے علامہ ابن کثیرؒ نے ان روایات کو درج کرکے آخر میں لکھا ہے وَظَاهِرٌ اَنَّهَا مَاْخُوْذَةٌ مِنْ کُتُبِ بَنِیْۤ اِسْرَائِیْلَ وَهِیَ مِمَّا یَجُوْزُ نَقْلُهَا وَلٰکِنْ لَا تُصَدَّقُ وَلَا تُکَذَّبُ فَلِهٰذَا لَا یُعْتَمَدُ عَلَیْهَا اِلَّا مَا وَافَقَ الْحَقَّ عِنْدَنَا (ابن کثیر جلد اوّل زیر آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً الخ) یعنی یہ ظاہر بات ہے کہ یہ سب قصے بنی اسرائیل کی کتابوں سے لئے گئے ہیں اور ان قصوں کا نقل کرنا تو جائز ہے لیکن ان کی تصدیق یا تکذیب کرنا جائز نہیں

پس ایسے قصوں پر کسی صورت میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہاں صرف اس صورت میں ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جبکہ ▪ ان تعلیم کے مطابق ہوں جو قرآن یا حدیث سے ثابت ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں بیان شدہ واقعہ کے متعلق پہلے مفسرین کا خیال۔

تفسیر فتح البیان میں بھی گائے کے ٹکڑوں کا ذکر کرتے ہوئے باوجود اس کے کہ ان میں سے ایک روایت حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے لکھا ہے وَلَا حَاجَةَ اِلٰی ذٰلِكَ مَعَ مَا فِیْهِ مِنَ الْقَوْلِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَیَکْفِیْنَا اَنْ نَقُوْلَ اَمَرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْ یَضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا یعنی ہمیں اس قسم کی روایتوں کی طرف توجہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں خصوصاً جبکہ اُن میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کی تصدیق علم سے نہیں ہو سکتی ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو گائے کے بعض سے مارنے کا حکم دیا تھا۔

صاحب فتح البیان کا یہ بیان بھی اس امر پر شاہد ہے کہ اس بارہ میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں باوجود اس کے کہ انکو صحابہؓ تک کھینچا گیا ہے وہ اسلامی روایات کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ صرف یہودی کتابوں کی نقل ہیں پس ان پر اعتماد کرنا اسلام کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرنا ہے جو بالکل ممکن ہے کہ اسلام کی تعلیم کے صریح مخالف ہوں اور قرآن کریم کی تکذیب کرنے والی ہوں حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ اور اسکی ترتیب ان روایات کی برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ اوّل تو جو واقعہ تفسیروں میں بیان کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قتل کے واقعہ پر قاتل کو دریافت کرنے کے لئے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا لیکن قرآن کریم میں گائے کے ذبح کرنے کا حکم پہلے آتا ہے اور قتل کا واقعہ بعد میں آتا ہے۔ قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اور فصاحت و بلاغت کے تمام انسانی معیاروں سے بالا ہے۔ ایک ادنیٰ عقل کا انسان بھی اس واقعہ کو اس ترتیب سے بیان نہیں کر سکتا۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے اگر اس واقعہ کو بیان کرے تو وہ اس طرح بیان کرے ▪ کہ یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا اور اس کے قتل کے بارہ میں اختلاف کیا تب ہم نے حکم دیا کہ تم ایک گائے کو ذبح کرو

وَاِذْ قَتَلْتُمْ میں بیان شدہ واقعہ کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات کے متعلق ابن کثیر کی رائے۔

اور اس کے کچھ حصے کو مقتول کے کچھ حصے پر مارو جب تم نے ایسا کیا تو مردہ زندہ ہوگیا لیکن قرآن کریم یوں بیان نہیں کرتا قرآن کریم گائے کے واقعہ کو الگ بیان کرتا ہے اور قتل کے واقعہ کو الگ بیان کرتا ہے اور گائے کے واقعہ کو قتل کے واقعہ سے پہلے بیان کرتا ہے۔ پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ گائے قاتل کو دریافت کرنے کے لئے ذبح کی گئی تھی قرآن کریم کی اس فصاحت و بلاغت کا خیال بھی رکھا جائے جو اس کے اندر پائی جاتی ہے بلکہ ایک معمولی لیکن معقول کتاب اُسے قرار دیا جائے تب بھی یہ ترتیب بیان اس کی طرف منسوب کرنی جائز نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض میرے ہی ذہن میں نہیں بلکہ پہلے لوگوں کے ذہن میں بھی یہ اعتراض پیدا ہوا ہے چنانچہ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر مفاتیح الغیب میں اس سوال کو اُٹھایا ہے لیکن اس کا نہایت بودا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ واقعہ کے تقدّم اور تاخّر کو اسی ترتیب سے بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا کیونکہ کبھی سبب کو حکم سے پہلے بیان کر دیتے ہیں اور کبھی حکم کو سبب سے پہلے بیان کر دیتے ہیں اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ کبھی کبھی ترتیب میں فرق ہو جاتا ہے اور بیان کی ترتیب واقعہ کی ترتیب سے مختلف ہو جاتی ہے مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ بعد میں ہونے والا واقعہ زیادہ اہم ہو۔ پس توجہ پھرانے کے لئے اسے پہلے بیان کر دیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص کسی مقتول کی لاش پر پہنچتا ہے تو جب وہ اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سناتا ہے تو پہلے یکدم سنا دیتا ہے کہ فلاں شخص مر گیا۔ اور پھر تفصیل بتاتا ہے کہ میں اس اس طرح جا رہا تھا کہ فلاں شخص کی لاش نظر آگئی لیکن اس جگہ پر تو نہ صرف یہ کہ پہلی بات کو پیچھے بیان کیا گیا ہے اور پچھلی بات کو پہلے بیان کیا گیا ہے بلکہ اہمیت کے لحاظ سے جو بات ادنیٰ تھی اسے پہلے بیان کیا گیا ہے اور اہمیت کے لحاظ سے جو بات زیادہ تھی اسے بعد میں بیان کیا گیا ہے۔ اور پچھلی بات کو پہلے بیان کرنے کی جو حکمت ہوا کرتی ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ پس خالی یہ کہہ دینا کہ کبھی بعد کی بات کو پہلے بیان کر دیا کرتے ہیں کافی نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ جن وجوہ کے پائے جانے پر بعد کی بات کو پہلے بیان کیا کرتے ہیں وہ اس جگہ پر پائی جاتی ہیں ورنہ قرآن کریم کا یہ حصہ حکمت سے خالی سمجھا جائیگا مگر میں بتا چکا ہوں کہ وہ وجوہ جو کسی بعد کی بات کو پہلے بیان کرنے کا سبب ہوا کرتی ہیں وہ یہاں نہیں پائی جاتیں بلکہ اسکے برخلاف یہ وجہ موجود ہے کہ جو پہلے کا واقعہ ہے اسے پہلے بیان کیا جاتا اور جو بعد کا واقعہ ہے اسے بعد میں بیان کیا جاتا کیونکہ پیچھے کا واقعہ یعنے قتل بعد کے واقعہ یعنے گائے کے ذبح کرنے کے حکم سے زیادہ اہم ہے پس اصل ترتیب کو قائم رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔

قرآن مجید کی آیات کو ترتیب سمجھنے کے خیالات کی تردید ہیں۔

دوسرے یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گائے کے واقعہ کو بھی اِذْ کے لفظ سے شروع کیا ہے اور قتل کے واقعہ کو بھی اِذْ کے لفظ سے شروع کیا ہے اور ان آیات سے پہلے جتنی آیات گذر چکی ہیں ان میں جہاں جہاں اِذْ کا لفظ آیا ہے وہ الگ واقعات کے متعلق آیا ہے پس اس جگہ بھی جبکہ دونوں آیتوں سے پہلے اِذْ کا لفظ آیا ہے ہمیں ماننا پڑیگا کہ یہ واقعات اپنی ذات میں الگ الگ ہیں۔

تیسری دلیل میرے خیال کی تائید میں یہ ہے کہ گائے کے ٹکڑے کو قاتل پر مار کر اُسے زندہ کرنے کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں اگر معجزانہ طور پر مُردے کو زندہ کرنا تھا تو اُس کے لئے گائے کے ذبح کرنے اور اُس کا ٹکڑا اس پر مارنے کی ضرورت کیا تھی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے زندہ کیا جا سکتا تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے عام مسلمانوں کے نزدیک مُردے زندہ ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ گائے کے گوشت میں کوئی طبعی اثر ایسا ہوتا ہے کہ مُردہ زندہ ہو جاتا ہے تو اسپر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ وہ طبعی اثر اب کیوں ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کہا جائے کہ صرف اس قسم کی گائے کے گوشت میں وہ طبعی اثر ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں کیا گیا ہے تو اسپر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اگر اِن صفات والی گائے میں یہ اثر ہے تو پہلے اللہ نے عام گائے کے ذبح کرنے کا کیوں حکم دیا۔ نیز اِس قسم کی گائے کا مہیا کرنا کوئی مشکل نہیں اب بھی تلاش سے ایسی گائے مِل سکتی ہے اس عقیدہ کے قائل اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ غرض کوئی معقول وجہ اِن دونوں آیتوں کو آپس میں ملانے کی نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ یہودیوں کی روایات کی بناء پر ان دونوں آیتوں کو ایک ہی واقعہ کی تفصیلات قرار دیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ یہود کی معتبر روایات بھی اس کے خلاف ہیں۔ بائبل میں کسی ایسے واقعہ

کا ذکر نہیں جہاں گائے کو ذبح کر کے کسی مُردے پر مارا ہو اور وہ زندہ ہوگیا ہو۔ بیشک تورات استثناء باب ۲۱ آیت ۱ تا ۹ میں یوں آتا ہے "اگر اس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے۔ تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرد اگرد کے شہروں کے فاصلہ کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو۔ اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو۔ اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیونکہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں۔ اور اُس کے نام سے برکت دیا کریں۔ اور انہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے سب سے نزدیک بسنے والے ہوں اس بچھیا کے اوپر جسکی گردن اس وادی میں توڑی گئی۔ اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا۔ اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے"۔ اس حوالے سے ظاہر ہے کہ گائے کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس کے کسی حصّہ کو مقتول پر مارا جائے نہ اس کا کوئی ذکر ہے کہ ایسا کیا گیا اور اس سے مُردہ زندہ ہوگیا اور اُس نے قاتل کی نشان دہی کی بلکہ گائے کے ذبح کرنے میں صرف یہ حکمت ہے کہ ایک طرف تو بنی اسرائیل کے دلوں سے گائے کا شرک دُور ہو دوسرے چونکہ وہ اسے مقدس سمجھتے تھے اسپر ہاتھ دھو کر گواہی دینے کا مطالبہ کر کے ان سے سچ بلوانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جب واقعات یہ ہیں تو پھر وجہ کیا ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب جن معنوں کو رد کرتی ہے۔ بائبل میں جن معنوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اُن کو زبردستی قرآن کریم کی آیات پر ٹھونسا جائے اور ایسے معنے کئے جائیں جو عقل اور نقل کے خلاف ہیں اور دشمن کو قرآن کریم پر ہنسی کرنے کا موقع دیتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کا مضمون واضح ہے اس زمانہ کے بنی اسرائیل میں بچھڑے کی پوجا اور گائے کی پوجا کے امکانات صریح طور پر پائے جاتے تھے۔ گائے کی قربانی کا حکم بھی بائبل میں موجود ہے اور اس میں جو اسکی غرض بتائی گئی ہے وہ بھی قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق معلوم ہوتی ہے یعنی یہودیوں کے دلوں سے گائے کے شرک کو دور کرنا۔ ان سب امور کی موجودگی کے باوجود اس آیت کے مضحکہ خیز معنے کرنا اور قرآن شریف کی آیات کی لطیف ترتیب کو بگاڑ کر ایک غیر معقول ترتیب اس کی طرف منسوب کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے اور جب ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ قصص حق کی بناء پر ان آیات کے وہ معنے مفسرین نے کئے ہیں درست نہیں۔ بائبل سے وہ ثابت نہیں۔ قرآن کریم اُن کی تصدیق نہیں کرتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے متعلق کچھ بیان نہیں فرمایا تو اب ہمارے لئے یہ رستہ بالکل کھلا ہے اور یہی رستہ طبعی ہے کہ ہم گائے کے ذبح کرنے کے واقعہ کو بالکل الگ سمجھیں اور قتل کے واقعہ کو بالکل الگ سمجھیں اور اِذْ قَتَلْتُمْ کے الفاظ والی آیت کو اُن یہودی قصوں کہانیوں سے جن کی تردید خود بائبل سے بھی ہوتی ہے آزاد رکھ کر معنی کریں۔

قَاِذْ قَتَلْتُمْ کی تفسیر میں بعض مفسرین کے خیالات کو تردید بائبل سے

ہاں اگر مفسرین کے خیالات کو تسلیم کر کے بطور تنزّل اس آیت کے معنے کرنے ہی پڑیں تو پھر بھی یاد رہے کہ اس آیت کے معنے یہ نہیں کئے جا سکتے کہ کوئی مُردہ گائے کے گوشت کے مارنے سے زندہ ہوگیا کیونکہ یہ معنی قرآن کریم سے صریح خلاف ہیں بلکہ صرف یہی معنی کئے جا سکیں گے کہ گائے کا ٹکڑا مارنے سے کوئی ایسی بات پیدا ہوئی جس سے قاتل پکڑا گیا اور خدا تعالیٰ نے یہ ترکیب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے بتلائی تاکہ قاتل پکڑا جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے اپنی کتاب ازالۂ اوہام میں یہ تشریح کی ہے لیکن جیسا کہ موقعہ اور محل سے ثابت ہے یہ تشریح مخالف کو قریب ترین رستہ سے پکڑنے کے لئے ہے اس جگہ پر آپ نے اس آیت کی خود تفسیر بیان نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کے اس استدلال کو رد کیا ہے کہ وہ اس آیت سے مُردہ زندہ ہونے کا استدلال کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حقیقی مردہ کے زندہ ہونے کا ذکر نہیں صرف یہ مراد لی

سابق مفسرین کے خیالات کے مطابق وَ اِذْ قَتَلْتُمْ کے امکانی معنے۔

جاسکتی ہے کہ گائے کا ٹکڑا مارنے سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جس سے قاتل پکڑا گیا۔ غرض چونکہ اعتراض کے جواب میں آپ نے یہ معنے بیان فرمائے ہیں اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ مخالف کی باتوں کو مان بھی لیا جائے تو اس سے وہ استدلال نہیں ہو سکتا جو وہ کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ چور کے پکڑنے کے لئے کسی چیز کو سیاہی لگا دیتے ہیں اور ان جاہل لوگوں کو جن پر چوری کا شبہ ہوتا ہے کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ کمرہ میں جا کر اس چیز کو ہاتھ لگاؤ جو چور ہوگا اُس کا ہاتھ اس چیز سے چپک جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا کی تشریح احمدی علما کے نزدیک اور بعض اشکال۔

کہ جو چور نہیں ہوتے وہ تو ہاتھ لگا آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کو سیاہی لگ جاتی ہے مگر چور پکڑے جانے کے ڈر سے ہاتھ نہیں لگاتا اور اس کے ہاتھ کو سیاہی نہیں لگتی اور اس طرح پکڑا جاتا ہے ہم ان قصص کو تسلیم کرتے ہوئے ایک سہل راستہ مخالف کو خاموش کرانے کا اختیار کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسی ہی ترکیب جس میں اس امر کو مد نظر رکھ لیا گیا ہو کہ سچائی کو نقصان نہ پہنچے اور دھوکا نہ ہو اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دی ہو تو اس سے مُردہ زندہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا یا مثلاً ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر نشان کے طور پر کوئی بات ایسی ظاہر کر دی جس سے گائے کے ٹکڑے مارنے والوں میں سے جو قاتل تھا اس کا پتہ لگ گیا۔ مثلاً یہی کہ اُس پر ڈر کے مارے لرزہ طاری ہو گیا یا قاتل کے ٹکڑہ مارتے وقت مقتول کے جسم میں کسی اور سبب سے حرکت پیدا ہوئی اور قاتل یہ سمجھ کر کہ شاید وہ زندہ ہونے لگا ہے بیہوش ہو گیا یا ڈر کے مارے اُس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ بہر حال اس آیت سے کسی مُردے کا زندہ ہونا اور مجرم کا پکڑوانا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ مگر یہ معنے بطور فرض کے اختیار کئے گئے ہیں اور مفسرین کے معنوں کو رد نہ کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیت کو اس اعتراض سے بچانے کے لئے ہیں کہ اس میں تضاد پایا جاتا ہے کسی جگہ کہا ہے مُردے زندہ نہیں ہو سکتے اور کسی جگہ مُردے زندہ ہونے کی خبر دی ہے ورنہ میرے نزدیک اس آیت میں ایک مستقل مضمون بیان کیا گیا ہے اور اُن یہودی روایات سے جو خود ان کی اپنی کتابوں کے خلاف ہیں ہمیں استدلال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پیشتر اس کے کہ میں وہ مفہوم بیان کروں جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ میں ایک اور معنی بیان کرتا ہوں جو جماعت احمدیہ کے بعض علماء کرتے ہیں اور جن معنوں میں اسی اصل کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ اِذْ قَتَلْتُمْ والے واقعہ کا ذبح بقرہ والے واقعہ سے کوئی واقعاتی جوڑ نہیں۔ ان علماء کے نزدیک نَفْسًا سے مُراد حضرت مسیح ناصری علیہ السلام ہیں اور قَتَلْتُمْ سے مُراد کوشش قتل ہے یا مشابہ بالقتل کے معنے ہیں۔ انکی تفسیر کے مطابق اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ اے بنی اسرائیل یاد کرو جب تم نے ایک عظیم الشان جان یعنی حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا یا ان سے ایسا سلوک کیا کہ وہ مقتولوں کے مشابہ ہوگئے یعنی ان کو صلیب پر لٹکا کر مارنا چاہا۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا۔ اس میں ھَا کی ضمیر نفس کی طرف بھی جا سکتی ہے اور واقعہ قتل کی طرف بھی معنوی طور پر جا سکتی ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اس واقعہ صلیب کے بعد تم نے اُس نفس کے متعلق اختلاف کیا یا یہ کہ اس واقعہ کے متعلق اختلاف کیا۔ اگر واقعہ کے متعلق اختلاف لیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ بعض نے یہ سمجھا کہ مسیح صلیب پر مر گیا ہے اور بعض نے یہ سمجھا کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ اور اگر نفس کی طرف ضمیر پھیری جائے تو اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تم نے مسیح کے بارہ میں اختلاف کیا یعنی بعض نے یہ سمجھا کہ مسیح کی لاش چرا لی گئی ہے حالانکہ وہ مر گیا تھا اور بعض نے یہ قرار دیا کہ مسیح علیہ السلام زندہ صلیب پر سے اُتار لئے گئے تھے اور قبر میں سے بھاگ گئے۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ میں اُنکے نزدیک اس طرف اشارہ ہے کہ ایک دن ان اختلافات کی حقیقت کو کھول دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ نے قرآن کریم۔ اناجیل اور تاریخ سے یہ امر ثابت کر دیا کہ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام صلیب پر چڑھائے ضرور گئے تھے مگر مرے نہیں تھے اور وہ زندہ اُتار لئے

گئے تھے چنانچہ تین دن قبر میں رہ کر وہ پھر اپنے حواریوں میں چلے آئے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کے معنی و خلاصہ یہ ہیں کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ مسیح کی قاتل قوم کو اس جرم کے بدلہ میں جو اُس نے مسیح کے حق میں کیا ہے مارو یعنی سزا اور عذاب دو گویا ہُ کی ضمیر قوم یہود کی طرف جاتی ہے جو قاتل تھی اور ہا کی ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے جس سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام ہیں اور جرم کے بعض حصے سے مراد یہ ہے کہ کچھ حصہ کی سزا فرشتے ان کو دنیا میں دیں اور کچھ حصہ کی سزا مرنے کے بعد انہیں ملے گی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب کے واقعہ کے متعلق سورۃ نساء رکوع ۲۲ آیت ایک سو اٹھاون میں بحث آئے گی اس جگہ اوپر کے معنوں کو سمجھنے کے لئے اختصاراً اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ حضرت مسیح ناصریؑ کے واقعہ صلیب کے متعلق مختلف اقوام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح کو انہوں نے صلیب پر لٹکا دیا اور صلیب پر ہی وہ مر گئے پھر اُن کی لاش کو ایک قبر میں رکھ دیا گیا جہاں سے اُن کے مرید اُن کی لاش کو اُٹھا کر لے گئے اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ حضرت مسیح زندہ ہو گئے ہیں تاکہ وہ یہودیوں کے اس اعتراض سے بچ جائیں کہ جو شخص صلیب پر لٹکا کے مار دیا جائے وہ لعنتی ہوتا ہے (جس کی موت صلیب پر لٹک کر ہو اس کے متعلق لعنتی ہونے کا فتویٰ بائبل میں موجود ہے چنانچہ لکھا ہے۔ "وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے" استثناء باب ۲۱ آیت ۲۳۔ "جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے" گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) مسیحیوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر ضرور لٹکایا گیا تھا اور وہ صلیب پر مر بھی گئے لیکن چونکہ ان کا صلیب پر لٹکایا جانا بغیر کسی گناہ کے تھا اس لئے مسیحیوں کے نزدیک گو حضرت مسیح لعنتی ہوئے مگر وہ دوسروں کی خاطر لعنتی ہوئے اور دوبارہ زندہ ہو کر انہوں نے اس لعنت سے نجات پا لی جو بنی نوع انسان کو گناہ کی سزا سے بچانے کے لئے انہوں نے اپنے آپ پر خوشی سے وارد کی تھی۔

آجکل کے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر نہیں لٹکائے گئے بلکہ ان کی جگہ کسی اور شخص کو صلیب پر لٹکا دیا گیا اور اُن کو خدا تعالیٰ آسمان پر زندہ اُٹھا کر لے گیا۔ اس عقیدہ کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں ملتا۔ جو تفصیلات اس واقعہ کی بیان کی جاتی ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی جاتیں گذشتہ زمانہ کی تفصیلات یا تو نبی کو الہام سے معلوم ہو سکتی ہیں یا صحیح تاریخ سے معلوم ہو سکتی ہیں چونکہ وہ تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان نہیں فرمائیں لازماً اُن کا ثبوت تاریخ سے دینا پڑے گا لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں نہ یہودی تاریخ میں اور نہ ہی عیسائی تاریخ میں ان باتوں کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ پس سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بعض شریر یہودیوں یا عیسائیوں نے اپنی تاریخوں کے خلاف روایتیں وضع کر کے مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کیا۔

بانی سلسلہ احمدیہ نے ان تینوں اقوال سے اختلاف کیا ہے اور قرآن کریم۔ اناجیل اور تاریخ سے اس امر کو ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر تو لٹکائے گئے تھے مگر خود حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشگوئیوں کے مطابق جو انجیل میں بیان ہیں اور آج تک محفوظ ہیں صلیب پر سے زندہ اُتار لئے گئے اور زخموں کی شدت سے دو تین دن بیہوشی اور ضعف کی حالت میں ایک کمرہ میں پڑے رہے۔ تیسرے دن طاقت آنے پر وہاں سے نکلے اور حواریوں کی مدد سے اور انجیل کی اس پیشگوئی کے مطابق کہ مسیح بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے (لکھا ہے کہ "میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں مجھے ان کو بھی لانا ضرور ہے" یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۶) ان دس قبائل میں تبلیغ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے جن کی نسبت بائبل اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر انہیں قید کر کے عراق فارس کی طرف لے گیا اور وہاں سے اُس نے انہیں سلطنت کے مشرقی ممالک یعنی افغانستان اور کشمیر کی طرف بھیج دیا تھا۔ ان علماء کا خیال ہے کہ اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بنی اسرائیل کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری شرارتیں صرف موسیٰ کے زمانہ پر ختم نہیں ہو گئیں بلکہ ان کا سلسلہ ممتد ہوتا گیا یہاں تک کہ تم نے مسیح ناصریؑ کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی اور اسے لعنتی قرار دیا لیکن

اللہ تعالیٰ ایک دن تمہارے اس راز کو کھول کر رکھ دے گا۔

جہاں تک معانی کا سوال ہے یہ تفسیر بہت حد تک اس آیت پر چسپاں ہوتی ہے مگر میرے نزدیک اس میں بعض اشکال ہیں مثلاً یہ کہ اس کے بعد کی آیت کو ثُمَّ کے لفظ سے شروع کیا گیا ہے اور ثُمَّ کے عام معنے یہ ہوتے ہیں کہ پہلے واقعہ کے بعد یہ دوسرا واقعہ ہوا۔ مگر وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اور اس کے بعد کی آیت کے معنے یہ کئے جائیں کہ مسیح موعود کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ اِس راز کو ظاہر کرے گا تو ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ والی آیت جو اس کے آگے ہے اس کے معنے یہ کرنے پڑیں گے کہ واقعۂ قتل کے بعد نہیں بلکہ اس ظہار کے بعد جو آخری زمانہ میں ہونے والا ہے یہودیوں کے دل سخت ہوگئے حالانکہ یہ درست نہیں یہود کے دل جہاں تک مسیح علیہ السلام پر ظلم کرنے کا تعلق ہے حضرت مسیح کو صلیب پر لٹکاتے ہوئے ہی سخت ہوگئے تھے۔

اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا کے مرجح معنے۔

اب میں ان معنوں کی طرف آتا ہوں جنہیں میں ترجیح دیتا ہوں لیکن ان معنوں کے سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ گذشتہ مفسرین کو غلطی اس وجہ سے لگی ہے کہ انہوں نے اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا والے واقعہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا نہیں وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ تک وہ واقعات ختم ہوگئے ہیں جن میں بنی اسرائیل کی وہ نافرمانیاں اور ناشکریاں بیان کی گئی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان سے ہوئیں اور وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا کی آیت سے میرے نزدیک اُن کی اُن نافرمانیوں اور ناشکریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں اُن سے صادر ہوئیں

اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں مخالفین اسلام کے کعب بن اشرف کے قتل کے متعلق اعتراض کا جواب۔

اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ قتل والے واقعہ کے بعد فرماتا ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ پھر اس واقعہ کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہوگئے یعنی تم نے اس سے عبرت حاصل نہ کی۔ اور اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو جس سے معلوم ہوا کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ والے گروہ ہی نے ایک جان کو مارا یا مارنے کی کوشش کی تھی اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کا تھا تبھی تو فرمایا کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں اسی طرح اِس آیت کے بعد بھی اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ والی آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے لوگ تھے پس حقیقت یہ ہے کہ آٹھویں رکوع تک تو یہودیوں کی ان ناشکریوں کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اُن سے صادر ہوئیں اور نویں رکوع سے اُن کی ان ناشکریوں کا ذکر شروع ہوتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں اُن سے سرزد ہوئیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کا ایک واقعہ ہمیشہ مخالفینِ اسلام کے لئے اعتراض کا موجب بنتا چلا آیا ہے اور وہ واقعہ کعب بن اشرف اور ابورافع سلام بن ابی الحقیق دو یہودی سرداروں کے قتل کا ہے ان دونوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے ساتھ قتل کیا گیا تھا۔ مخالفین اسلام اعتراض کرتے ہیں کہ لڑائی میں قتل یا لڑائی کے نتیجہ میں قتل تو غیر جائز کہلا سکتا ہے مگر ان دو شخصوں نے تو نہ لڑائی کی تھی نہ یہ کسی لڑائی کے جرم میں پکڑے گئے تھے پھر انہیں کیوں قتل کیا گیا میرے نزدیک اس آیت میں اسی واقعہ کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ قتل قومی جرائم کے نتیجہ میں تھے اور یہودی قوم اُن کی ذمہ وار تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کوئی اعتراض نہیں آتا کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور جائز قصاص کی صورت میں کیا۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ جنگ بدر میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عظیم الشان فتح دی تو یہود جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ میں آمد کے موقع پر مسلمانوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا ان کے دل حسد سے جل گئے اور منافقین کے دلوں میں بھی اُس وقت سے بغض کی آگ سلگنے لگی۔ درحقیقت بدر کی جنگ نے ایک طرف تو کفارِ مکہ کی شوکت کو توڑ دیا اور دوسری طرف یہود اور منافقین کے دلوں میں بھی بے چینی پیدا کر دی کیونکہ اس سے پہلے وہ مسلمانوں کی آمد کو ایک وقتی اور معمولی تغیر سمجھتے تھے مگر اس جنگ کے بعد وہ اس کی اہمیت کو محسوس کرنے لگ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو منافقوں نے اندرونی طور پر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ دوسری طرف یہودی سردار کعب بن اشرف

نے مسلمانوں کے خلاف یہودی قوم کو مختلف ذرائع سے بھڑکانا شروع کر دیا اور مکہ والوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف جوش دلانا شروع کر دیا بعد ابو رافع ابن ابی الحقیق نے اسکی پیٹھ ٹھونکی۔ چنانچہ جنگ بدر ۲ھ ہجری کے رمضان کی سترھویں یا انیسویں تاریخ کو ہوئی اور اس جنگ کے معاً بعد کعب بن اشرف مکہ گیا اور اس نے مکہ والوں میں مسلمانوں سے بدر کے واقعہ کا بدلہ لینے کے لئے اشتعال پیدا کیا اور بڑے جوش سے کفار مقتولین کے مرثیے پڑھے اور قریش کو غیرت دلائی اور یہاں تک شرارت میں بڑھ گیا کہ مسلمان عورتوں کی نسبت تشبیب شروع کر دی یعنی ایسے شعر کہنے شروع کر دیئے جن میں مسلمان مستورات کی نسبت محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ شعر لوگ پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف اُن کے دلوں میں جوش بھی پیدا ہوتا تھا اور ان کا رُعب بھی مٹتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اِس ناپاک انسان نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی بیوی کے متعلق بھی تشبیب کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک طرف تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہونا شروع ہُوا۔ دوسری طرف یہودیوں نے علی الاعلان مسلمانوں کے خلاف اور رسول کریم صلعم کے خلاف باتیں کرنی شروع کر دیں اور مسلمان عورتوں سے تمسخر کرنا شروع کر دیا چنانچہ ایک مسلمان عورت ایک دن بازار میں کسی کام کے لئے گئی۔ بعد میں بنو قینقاع جو ایک یہودی قبیلہ کے لوگ تھے اور سُنار کا کام کرتے تھے اُن میں سے کسی سُنار کے پاس بیٹھ گئی (بعض دوسری روایات میں آتا ہے کہ اس نے اپنا کوئی زیور بننے کے لئے دیا ہُوا تھا جب دیر ہوگئی تو وہ اپنے زیور کی تیاری کا حال پوچھنے کے لئے اس یہودی کے پاس آئی) اُس عورت کے چہرے پر کپڑا جھکا ہُوا تھا یہودی نے اُسے کہا کہ اپنا مُنہ کھول دے (اس وقت تک پردے کا حکم نازل نہیں ہُوا تھا مگر معلوم ہوتا ہے مسلمان عورتوں نے حیا کے اثر کے ماتحت خود بخود اپنے سروں اور چہروں کو ایک حد تک ڈھانکنا شروع کر دیا تھا) عورت نے انکار کیا۔ اس پر اس شخص نے اُسکی اوڑھنی کو اُس کے تہ بند کے ساتھ ٹانکے کے ذریعے پرو دیا جب وہ کھڑی ہوئی تو جھٹکا لگ کر اس کا کپڑا اُتر گیا اور وہ ننگی ہوگئی اس پر سب یہودی ہنس پڑے۔ اس عورت نے شور مچایا۔ ایک مسلمان جو وہاں سے گزر رہا تھا اُس نے اُس یہودی کا جس نے یہ شرارت کی تھی مقابلہ کیا اور وہ یہودی اس کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس پر دوسرے یہودیوں نے اُس مسلمان پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات اور بھی بگڑ گئے۔

یہ ایک انفرادی واقعہ نہیں تھا بلکہ جنگ بدر کے بعد کعب بن اشرف کی شرارتوں کی وجہ سے یہودی قبائل میں اسلام کے خلاف جو جوش پیدا ہو گیا تھا اسکی وجہ سے وہ لوگ چاہتے تھے کہ کوئی فساد ایسا کریں جس کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے میں کامیاب ہو سکیں چنانچہ ابن سعد لکھتا ہے فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ بَدْرٍ أَظْهَرُوا الْبَغْيَ وَالْحَسَدَ وَنَبَذُوا الْعَهْدَ (طبقات کبیر جلد اوّل جزثانی لمحمد بن سعد) یعنی جب بدر کا واقعہ ہُوا تو اس کے بعد یہودیوں نے فساد اور بغاوت کرنی شروع کر دی اور عہد کو توڑ دیا۔ یہ شرارت اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ صحابہؓ ہر وقت اس خطرہ میں رہتے تھے کہ کوئی شخص دھوکا سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک صحابی طلحہ بن براءؓ شدید بیمار ہوئے موت کی حالت قریب آگئی تو وہ رات کا وقت تھا اس پر انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو نصیحت کی کہ انکی وفات کی اطلاع رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ کی جائے اور ان کے رشتہ دار خود ہی انہیں دفن کر دیں تاکہ آپ اُن کے اقربا کی دلجوئی اور اُن کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کے لئے ان کے گھر پر تشریف نہ لے آئیں مبادا اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر یہودی لوگ آپ پر حملہ کر دیں۔ اصل الفاظ ان کے یہ ہیں فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْهِ الْيَهُودَ وَأَنْ يُصَابَ فِي سَبَبِي یعنی میں ڈرتا ہوں کہ یہود آپ پر حملہ نہ کر دیں اور میری وجہ سے آپ کو نقصان نہ پہنچے (اصابہ جلد ۲ ص ۲۰۰) اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے اُس وقت شرارت اتنی بڑھ چکی تھی کہ مسلمان ہر وقت اِس بات کا خطرہ محسوس کرتے تھے کہ کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودی قاتلانہ حملہ نہ کر دیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حالات

کے ماتحت بنو قینقاع کے ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی کرنے اور ایک مسلمان جو اس کا بدلہ لینے کے لئے گیا تھا اس کے مار دینے کے واقعہ کو ایک انفرادی واقعہ قرار نہیں دیا اور ہر عقلمند انسان اوپر کے واقعات سے یہی استدلال کرے گا کہ یہ انفرادی واقعہ نہیں تھا سوائے ان متعصب عیسائی مؤرخین کے جو اس کو انفرادی واقعہ قرار دے کر بیان کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر چونکہ دونوں طرف سے قتل ہو گیا تھا سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ یہ واقعہ ختم ہو گیا ہے (لائف آف محمد مصنفہ میور صفحہ ۲۴۱) باقی ہر منصف مزاج ان تمام حالات کو دیکھ کر کہ ایک طرف مکہ والوں کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا جانے لگا۔ دوسری طرف مسلمان مستورات کے خلاف گندے شعر بنا بنا کر علی الاعلان پڑھے جانے لگے تیسری طرف مسلمان عورتوں کی حرمت پر علی الاعلان حملہ ہونے لگا چوتھی طرف خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں سمجھ سکتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ نہیں ہو سکتا۔

آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو قینقاع کو جلا وطنی کی سزا دی اور جو ان جھگڑوں کے اصل بانی تھے یعنی کعب بن اشرف جو اس ساری شرارت کا اٹھانے والا تھا اور ابو رافع جو اس کا محسن اور اس کا حامی اور بنو نضیر قبیلہ کا سردار تھا ان دونوں کے قتل کرنے کا حکم دے دیا کیونکہ مسلمانوں کے اصل قاتل اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر اکسانے کے اصل ذمہ وار یہی دو شخص تھے کعب بن اشرف اپنی شرارتوں کی وجہ سے اور ابو رافع اس کی امداد کرنے کی وجہ سے۔

اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں قتل کے معنے ارادہ قتل اور نفسًا سے مراد آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات۔

عیسائی مؤرخ آج تک شور مچا رہے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کو بلاوجہ قتل کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شرارت کے مقابلہ میں جو انہوں نے اٹھا رکھی تھی ان کا قتل بالکل بے حقیقت تھا۔

میرے نزدیک آیت زیر تفسیر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو کچھ تم نے کیا تھا وہ تو کیا ہی تھا۔ اب اس زمانہ میں کہ تم کو دوبارہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا تم نے پھر شرارت پر کمر باندھ لی ہے اور ایک عظیم الشان نفس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس کے متعلق منصوبے کرتے ہو اور کئی قسم کی تدبیریں سوچتے ہو اور پھر ان شرارتوں کی ذمہ داری سے کلیۃً انکار کر بیٹھتے ہو لیکن یاد رکھو یہ تمہاری چال بازیاں کام نہ دیں گی۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی شرارتوں پر کون اکسانے والا ہے اور وہ اس پردہ راز کو کھول کر رکھ دے گا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ درحقیقت اس شرارت کا بانی مبانی کعب بن اشرف ہے پس اس کی سزا کے لئے وہ سامان پیدا کرے گا۔

یہاں قَتَلْتُمْ نَفْسًا کے الفاظ ہیں جس کے معنے ہیں "تم نے ایک جان کو قتل کیا" لیکن جو واقعات بتائے ہیں ان سے یہ نکلتا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا تھا اس اختلاف کا حل یہ ہے کہ قتل کا لفظ قتل کی کوشش یا ارادہ کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر آتا ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المومن ع) یعنی آل فرعون میں سے ایک ایسا شخص جو موسیٰ پر ایمان لایا تھا لیکن اپنا ایمان چھپا کر رکھتا تھا اس نے فرعون اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔ کیا تم ایک ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے بڑے بڑے نشان لایا ہے ظاہر ہے کہ یہاں ارادہ قتل کے معنوں میں قتل کا لفظ استعمال ہوا ہے پس آیت زیر تفسیر میں بھی قَتَلْتُمْ نَفْسًا سے مراد یہ معنی کرنے جائز ہیں کہ تم نے ایک عظیم الشان انسان کے قتل کا ارادہ کیا اور ایسا پختہ ارادہ کیا اور عملی طور پر اس کے لئے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ یوں کہنا چاہیئے گویا تم نے اپنی طرف سے اسے قتل کر ہی دیا مگر اس کے علاوہ ایک مسلمان کی جان بھی ان یہودیوں نے لی تھی گو وہ مسلمان ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا مگر چونکہ اس ساری شرارت کی غرض اصل میں یہ تھی کہ کسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا موقع نکالا جائے اس لئے اس کا قتل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قتل کہلوائے گا۔ پس قَتَلْتُمْ نَفْسًا سے اس شخص کا

قتل بھی مراد لیا جا سکتا ہے جسے بنو قینقاع نے قتل کیا اور اسکی عظمت اس بنا پر سمجھی جائے گی کہ اس کا قتل درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں تھا۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ یہودی لوگ تو تھوڑے تھے ان کے دلوں میں اتنا جوش کہاں پیدا ہو سکتا تھا کیونکہ گو یہودی تعداد میں تھوڑے تھے لیکن انہیں مدینہ کے لوگوں کی امداد کا عموماً اور منافقین کا خصوصاً بھروسہ تھا کیونکہ وہ ان کے سامان سے تبلیغ چلے آ رہے تھے بلکہ مکہ کے لوگ بھی ان کو اکسا رہے تھے علاوہ ازیں وہ اپنے آپ کو زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ منظم سمجھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ جنگِ بدر کے بعد بنو قینقاع نے مجلسوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ تَرٰی اَنَّ قَوْمَكَ لَا یَغُرَّنَّكَ اَنَّكَ لَقِیْتَ قَوْمًا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِالْحَرْبِ فَاَصَبْتَ مِنْهُمْ فُرْصَةً اِنَّا وَاللّٰهِ لَئِنْ حَارَبْنَاكَ لَتَعْلَمَنَّ اِنَّا نَحْنُ النَّاسُ" اے محمدؐ تم شاید چند قریش کو قتل کر کے مغرور ہو گئے ہو وہ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے اور تم نے موقعہ پا کر ان پر فتح حاصل کر لی۔ اگر ہمارے ساتھ مقابلہ پڑے تو تمہیں پتہ لگ جائے کہ مرد کیسے ہوتے ہیں (سیرت ابن ہشام جلد دوم)

اس تمہید کے بعد اب میں ان آیات کی ترتیب تفصیلاً بیان کرتا ہوں۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودی مخاطب ہیں اور قتل سے مراد ارادۂ قتل اور قتل بھی ہو سکتا ہے اور نَفْسًا سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور وہ فرد یا افراد ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا راستہ کھولنے کے لئے یہودیوں نے قتل کیا۔ فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا سے مراد یہ ہے کہ رسول کریم صلعم کے قتل کے منصوبہ سے بظاہر انکار کرتے رہے یا یہ کہ بعد میں یہودیوں نے اس مسلمان کے قتل کے بارہ میں اختلاف کیا جسے انہوں نے مل کر قتل کر دیا تھا چونکہ حملہ اکٹھا کیا گیا تھا اس لئے ہر شخص ان میں سے کہتا تھا کہ میں نے نہیں مارا اور سمجھتا تھا کہ ایک پہلو سے میں سچ کہہ رہا ہوں حالانکہ اس قسم کی بات سچ نہیں کہلاتی بلکہ جھوٹ ہی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس فعل پر دلیری یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کے منصوبوں پر دلیری جو شخص تم کو دلا رہا ہے اور جو تمہاری ان تمام شرارتوں کا محرک ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور وہ اس کو ظاہر کر کے چھوڑیگا یا مراد یہ ہے کہ گو بظاہر تم مسلمان عورتوں کے خلاف گندے اشعار کہتے یا عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہو یا دوسرے مسلمانوں کی جانوں پر حملہ کرتے ہو لیکن تمہارا اصل مقصد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنا ہے اور تمہارے اس گند کو اللہ تعالیٰ ایک دن ضرور ظاہر کر دیگا چنانچہ بعد کے واقعات نے یہودیوں کے ان ارادوں کو ظاہر کر دیا بنو نضیر جو یہودیوں کا دوسرا قبیلہ تھا انہوں نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعض دینی معاملات پر بحث کرنے کے لئے دعوت دی اور ساتھ ہی یہ منصوبہ کیا کہ موقعہ پا کر آنحضرت صلعم کو قتل کر دیا جائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان کے بد ارادے سے بچا لیا (ابو داؤد کتاب الخراج باب خبر النضیر) اسی طرح خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لقمہ منہ پر رکھا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہاماً خبر دے دی لیکن ایک دوسرا مسلمان جس نے ایک لقمہ کھا لیا تھا وہ شہید ہو گیا (ابن ہشام جلد ۲) پس وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کے معنے یہ ہیں کہ گو اس وقت تم اپنے دلوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ رکھتے ہو مگر جب ان قرائن کی وجہ سے جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں تم پر گرفت آتی ہے تو تم الزام سے انکار کر دیتے ہو لیکن یاد رکھو خدا تعالیٰ ایسے سامان ضرور کرے گا کہ جن سے تمہارے یہ تو رہے رہو ایک دن پوری طرح ننگے ہو جائینگے۔ ان دوسرے معنوں کی رو سے وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کا جملہ یہودیوں کے اندرونہ کی وقتی پردہ دری پر دلالت کرنے کے علاوہ ایک ضمنی جملہ کے طور پر آیندہ کے لئے ایک پیشگوئی بھی قرار دیا جائے گا اگر کہا جائے کہ پہلے معنوں پر تو یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ چونکہ ان کا

اِذْ قَتَلْتُمْ الخ میں آنحضرتؐ کے زمانہ کے یہودیوں کو خطاب۔

ظہور بعد کے زمانہ سے تعلق ہے اس لئے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ سے اس کا جوڑ نہیں رہتا لیکن یہاں بھی وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کو ایک پیشگوئی قرار دیا گیا ہے جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے معنوں میں فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ والی آیت کا تعلق بھی مستقبل بعید سے بتایا جاتا ہے لیکن اس جگہ صرف وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کو ضمنی جملہ اور پیشگوئی بتایا گیا ہے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ کو حال ہی سے متعلق بتایا گیا ہے پس ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ کا تعلق فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ سے قائم ہے اور کوئی اختلاف معنوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فرماتا ہے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرنے پر یا ایک مسلمان کو اس غرض کے پورا کرنے کے لئے قتل کر دینے پر ہم نے کہا اِضْرِبُوْهُ قاتل کو مارو بِبَعْضِهَا اس کے بعض کے سبب سے۔ اس جملہ کے بعض حصے تشریح طلب ہیں۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ میں ضرب کے معنے تلوار سے مارنے کے

اوّل ضَرَبَ کے عام معنے پیٹنے کے ہوتے ہیں لیکن اس جگہ پیٹنے قتل کے معنے لئے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ وَبِالْعَصَا وَنَحْوِهَا: اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا یعنی اپنے ہاتھ سے یا سونٹے سے یا ایسی ہی کسی اور چیز سے اُسے چھوا یا زور سے ٹکرایا یعنی مارا لیکن جس طرح ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ یا ضَرَبَهٗ بِالْعَصَا کہنے سے مارا کے معنے نکلتے ہیں اسی طرح لغت میں لکھا ہے کہ جب ضَرَبَهٗ بِالسَّيْفِ کے الفاظ استعمال ہوں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَوْقَعَ بِهٖ (اقرب) تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ پس گو عام استعمال کے مطابق ضَرَبَ کے معنے مارنے کے ہی ہوتے ہیں لیکن جیسا کہ یہ لغت سے اوپر بتایا ہے جب ضَرَبَ بِالسَّيْفِ مراد ہو تو اس کے معنے قاتلانہ حملہ یا قتل کرنے کے ہوتے ہیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعب بن اشرف کے مارنے پر جو اس فتنہ کا بانی مبانی تھا ایک صحابی کو مقرر کیا تھا اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو شخص مارنے کے لئے جائے وہ قتل پر قابو بھی پالے وہ زیادہ سے زیادہ کوشش کر سکتا ہے اس لئے موقع کی مناسبت سے اِضْرِبُوْهُ کے الفاظ استعمال کئے (جن کا متعلق

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا میں بِبَعْضِهَا سے مراد

بالسیف محذوف ہے) اور مراد یہ ہے کہ اس پر تلوار سے حملہ کرو۔

قتل کا حکم درحقیقت ایسے شخص کو ہی دیا جا سکتا ہے جو قتل پر قادر ہو جیسے حکومت کے کسی نمائندہ کو حکومت کے کسی فرد کے قتل کرنے کا حکم دیا جائے مگر کعب بن اشرف اسلامی نظام حکومت کے اس طرح تابع نہیں تھا پس اس وجہ سے اِضْرِبُوْهُ کے الفاظ استعمال کئے گئے اور مراد یہ ہے کہ اِضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ اُس پر تلوار سے حملہ کرو۔ بِبَعْضِهَا میں باء تعلیل کے معنے دیتی ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کے بعض کے سبب سے یا بعض کی وجہ سے۔ اور بعض کے بعد اِثْمٌ یعنے گناہ یا ایسا ہی کوئی اور لفظ محذوف ہے جو عربی قاعدہ کے رُو سے اکثر محذوف ہو جایا کرتا ہے پس سارے جملہ کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے کہا قاتل پر اس کے گناہ کے بعض حصہ کی وجہ سے تلوار کے ساتھ حملہ کرو۔ بعض حصہ اس لئے کہا گیا ہے کہ کعب بن اشرف کا گناہ صرف اس دُنیا کی سزا کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تھا اور اس کے گناہ کی سزا کو اُس کا قتل کیا جانا ڈھانپ نہیں سکتا تھا بلکہ وہ اس بات کا مستحق تھا کہ اگلے جہان میں بھی اُسکو خاص خدائی عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ قاتلوں کے متعلق فرماتا ہے وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (النساء ع ۱۴) جو شخص کسی مومن کو جان بوجھکر مار دے اسکی سزا جہنم ہے جس میں وہ دیر تک بستا چلا جائے گا۔ لیکن قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ ایسے شخص کی یہ بھی سزا ہے کہ اُسے قتل کیا جائے پس معلوم ہوا کہ قاتل کو دو سزائیں ملتی ہیں۔ ایک اس دُنیا میں قتل کے ذریعہ سے اور ایک اگلے جہان میں جہنم میں ڈالکر۔ پس بِبَعْضِ اِثْمِهَا سے مراد یہ ہوئی کہ تم اپنے حصہ کی سزا اسے قتل کے ذریعہ سے دے لو۔ دوسرے حصہ کی سزا ہم خود اسے اُسکی موت کے بعد دیں گے۔

یہ جو معنے بتایا ہے کہ بِبَعْضِهَا میں باء حرف تعلیل کے طور پر استعمال ہوئی ہے ان معنوں میں باء کے استعمال کی مثالیں قرآن کریم میں بھی ملتی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ (المائدہ ع ۳) ہم نے ان کے عہد توڑ دینے کے سبب سے اُن پر لعنت کی اور یہ جو معنے لکھا ہے کہ

ھا کا مضاف یعنی اِثْمُ کا لفظ حذف کیا گیا ہے اس کا استعمال بھی قرآن کریم میں موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ ع ۱) تم پر مُردہ حرام کیا گیا ہے حالانکہ مُردہ حرام نہیں ہوتا مُردہ کا کھانا حرام ہوتا ہے پس اصل الفاظ یہ ہیں حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أَكْلُ الْمَيْتَةِ تم پر مُردے کا کھانا حرام کیا گیا ہے اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا (یوسف ع ۱۰) تم اس بستی سے پوچھو جس میں ہم تھے اور عیر سے پوچھو جن کے ساتھ واپس آئے ہیں حالانکہ بستی مکانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ عیر کے معنے گدھوں کے ہیں۔ نہ کوئی مکانوں سے پوچھا کرتا ہے اور نہ گدھوں سے پوچھا جاتا ہے پس بستی سے بستی والے اور گدھوں سے گدھوں والے مراد ہیں۔ اھل کا لفظ یا صاحب کا لفظ جو قریہ اور عیر کی طرف مضاف تھا اسے حذف کر دیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ اسْأَلْ أَهْلَ الْقَرْيَةِ وَأَصْحَابَ الْعِيرِ۔

اس کے بعد فرماتا ہے كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے یعنی انبیاء کی جماعتوں کو لوگ تباہ کرنا چاہتے ہیں اور نبیوں کو قتل کر کے ان کو مٹانا چاہتے ہیں مگر جس قسم کے انبیاء کو قتل سے محفوظ رکھنا خدا تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہے وہ ان نبیوں کو دشمنوں کے حملوں سے ضرور بچا لیتا ہے اور جب دشمن اُنہیں اپنی طرف سے مار چکا ہوتا ہے تو وہ اپنی حفاظت کے ذریعہ سے گویا اُن کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ سلسلۂ روحانیہ کے پہلے اور آخری نبی کے قتل پر اُن کے دشمن کبھی تسلط نہیں پاتے کیونکہ قومی احیاء کا حقیقی نمونہ ان ہی دو نبیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسے کہ موسوی سلسلہ میں پہلے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور آخری حضرت مسیح علیہ السلام تھے جو احیاء بنی اسرائیل کا ان دو نبیوں کے ذریعہ سے ہوا اور درمیانی انبیاء کا کام ان کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا ان انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے ہر حالت میں دشمنوں کے حملوں سے بچایا ہے اسی طرف كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ میں اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ جن کو خدا تعالیٰ موت سے بچانا چاہے اُنہیں کوئی مارنے پر قادر نہیں ہو سکتا دوسرے اس احیاء کی طرف بھی اشارہ ہے جو ان انبیاء کے ذریعہ سے دنیا میں ہوتا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو لوگ کسی سلسلہ کے اوّل اور آخری نبی کو مٹانا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ضرور ہلاک کرتا ہے کیونکہ اگر وہ ہلاک نہ کئے جائیں تو دُنیا زندہ نہیں ہو سکتی پس انکی ہلاکت پر اعتراض کرنا حماقت ہے۔ اعتراض تو اس صورت میں ہوتا کہ ان انبیاء کے ایسے دشمن جو انہیں ہلاک کرنا چاہیں خود ہلاک نہ ہو جائیں۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ سے یہ بتایا کہ اس قسم کے نشانوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو انکی شرارتوں سے روکا جائے اور نیکی کی طرف لایا جائے۔ یہود کو سزائیں ملیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انکی جماعت کو خدا نے ہر قسم کے ظاہر اور مخفی حملوں سے محفوظ رکھا۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں ایک بڑا نشان تھا چنانچہ کچھ یہودی مسلمان بھی ہو گئے مگر قوم کے بیشتر حصہ نے ان نشانوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

غرض ان دونوں آیتوں میں جو اوپر گذریں اس عظیم الشان اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو عیسائی اور یہودی آج تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرتے چلے آئے ہیں کہ آپ نے کیوں کعب بن اشرف اور ابو رافع سلام بن ابی الحقیق کو قتل کرایا اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کی شرارتوں کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بعض مسلمان مارے گئے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کرنے کی سازشیں بھی ہوئیں اور کسی جماعت کے امام یا کسی ملک کے بادشاہ کے قتل کا ارادہ درحقیقت اس ساری قوم کے قتل کے برابر ہوتا ہے یورپ کے لوگوں نے بھی ایسے جرم کو ایک خاص نام ہائی ٹریزن "HIGH TREASON" کا دیا ہے اور "ہائی ٹریزن" کے جرم میں جن لوگوں کو موت کی سزا دی جاتی ہے ضروری نہیں ہوتا کہ اُن کا جُرم قتل کے جرم پر ہی مشتمل ہو۔ آجکل بھی جب کہ دوسری جنگِ عالم جاری ہے معمولی جاسوسوں کے جرم میں لوگوں کو پھانسیاں ملتی ہیں عیسائی اور یہودی یہ تو اعتراض کرتے ہیں کہ کعب بن اشرف اور ابو رافع بن ابی الحقیق کو کیوں مروا دیا گیا مگر یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ اشخاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کرنے کے فکر میں تھے اور اس کے لئے لوگوں کو اکساتے تھے

مِّنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ

چنانچہ وہ پتھروں کی طرح بلکہ (ان سے بھی)

قَسۡوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ

زیادہ سخت ہیں اور پتھروں میں سے تو یقیناً بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں سے

الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ

دریا بہتے ہیں اور بعض ان میں سے ایسے (بھی) ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے

الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ

پانی نکلنے لگتا ہے اور ان (یعنی دلوں) میں سے (بھی) بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے ڈر سے (معافی مانگتے ہوئے)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۞ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ

گر جاتے ہیں اور جو (کچھ) تم کر رہے ہو اللہ اس سے ہرگز بے خبر نہیں ہے ۷۳؎ (اے مسلمانو) کیا تم امید رکھتے ہو

کیا دُنیا کی کوئی بھی حکومت ہے جو ایسے آدمی کو قتل نہ کریگی جو اُن کی حکومت کے افسر یا رئیس کو قتل کروانے کے لئے باقاعدہ سازشیں کر رہا ہو۔ اس صورت میں وہی حکومت اس بات سے اغماض کر سکتی ہے جو خود بھی اپنے سردار کی قیمت کو نہ سمجھتی ہو اور اُس کے مارے جانے میں مُلک کا کوئی زیادہ حرج نہ پاتی ہو مگر صحابہؓ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عاشق تھے اُنکی محبت کا اندازہ اسی مذکورہ بالا واقعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے جس میں ذکر ہے کہ جب ایک صحابی رات کے وقت فوت ہونے لگا تو اس نے وصیت کی کہ میرے مرنے کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر نہ دی جائے تا ایسا نہ ہو کہ آپ ہمدردی کی وجہ سے رات کے وقت میرے مکان پر آنا چاہیں اور یہودی آپ کو قتل کر دیں۔

صحابہؓ کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنازہ پڑھانے کی جو قیمت تھی اُس کا پورا اندازہ عیسائی اور یہودی نہیں لگا سکتے لیکن پھر بھی اگر وہ تعصب سے خالی ہو کر اُس صحابی کی اس قربانی پر غور کریں تو وہ سمجھ سکینگے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کو یہودیوں سے اُس وقت بہت ہی بڑا خطرہ تھا اتنا بڑا خطرہ کہ جس کے لئے اس صحابی نے اس نعمت کو قربان کر دیا۔ جو نعمت یقیناً اس کو اپنی جائیداد اور اپنے بال بچوں کی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ اگر خطرہ حقیقی نہ ہوتا اور بہت سخت نہ ہوتا تو کبھی بھی وہ صحابی اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم نہ کرتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا جنازہ پڑھائیں۔

۷۳؎ حل لغات۔ قَسَتۡ ۔ قَسَا سے مؤنث کا صیغہ ہے اور قَسَا قَلۡبُهٗ (يَقۡسُوۡ قَسۡوًا وَّقَسَاوَةً) کے معنی ہیں صَلُبَ وَغَلُظَ اس کا دل سخت ہو گیا اور جب قَسَا درہم کے متعلق استعمال کریں اور کہیں قَسَا الدِّرۡهَمُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں تراقت کر سکہ خالص دھات کا نہیں ہے اس کے اندر ملاوٹ کر دی گئی ہے (اقرب) اَلۡقَسۡوَةُ. اَلصَّلَابَةُ فِيۡ كُلِّ شَيۡءٍ یعنی ہر چیز کی سختی کو قسوۃ سے تعبیر کرتے ہیں اور جب قَسۡوَةً کا لفظ قلب کیلئے استعمال کریں تو اس کے معنے ہونگے۔ ذِهَابُ اللِّيۡنِ وَالرَّحۡمَةِ

قَسَتۡ

(لسان) وَالْخُشُوْعُ دل سے نرمی، شفقت اور خشوع کا نکل جانا۔ پس قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ کے معنے ہونگے کہ تمہارے دل سخت ہوگئے۔ (۲) تمہارے دل نرمی، شفقت اور خشوع سے خالی ہوگئے۔

اَلْحِجَارَةُ :- اَلْحِجَارَةُ کے لئے دیکھو حل لغات ۲۵ھ

يَتَفَجَّرُ :- يَتَفَجَّرُ تَفَجَّرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَفَجَّرَ الْمَاءُ کے معنی ہیں سَالَ الْمَاءُ وَجَرٰى پانی بہہ پڑا (اقرب) پس يَتَفَجَّرُ کے معنے ہوں گے بہہ پڑتے ہیں۔

اَلْاَنْهَارُ :- اَنْهَارٌ کے لئے دیکھو حل لغات ۲۶ھ

يَشَّقَّقُ :- اصل میں يَتَشَقَّقُ (باب تفعل سے مضارع واحد غائب کا صیغہ) تھا۔ ت کو شین میں ادغام کیا گیا اس کی ثلاثی شَقَّ (يَشُقُّ) ہے شَقَّ الشَّيْءَ (متعدی) کے معنے ہوتے ہیں صَدَعَهٗ وَفَرَّقَهٗ کہ کسی چیز کو پھاڑ دیا اس کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ تَشَقَّقَ (باب تفعل میں) اَلْحَطَبُ کے معنے ہیں کہ (کسی نے) لکڑی (کو پھاڑا اور وہ) پھٹ گئی۔ آیت ہذا میں يَشَّقَّقُ کے معنے ہونگے (بعض دل) پھٹ جاتے ہیں۔

يَهْبِطُ :- هَبَطَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور هَبَطَ مِنَ الْخَشْيَةِ کے معنی ہیں تَضَاءَلَ وَخَشَعَ یعنی ڈر کی وجہ سے کمزور اور چھوٹا ہوگیا اور اس نے عاجزی اختیار کی (اقرب) اَلْهُبُوْطُ، اَلْاِنْحِدَارُ اوپر سے نیچے کی طرف گرنا (مفردات) هَبَطَ کی مزید تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات ۷۳ھ پس يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کے معنے ہونگے کہ ان دلوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ (معافی مانگتے ہوئے) اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں (۲) اللہ کے ڈر کی وجہ سے عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

خَشْيَةٌ :- خَشِيَهٗ (يَخْشَاهُ خَشْيَةً) کے معنے ہیں خَافَهٗ وَاتَّقَاهُ کسی چیز سے ڈرا اور اس سے خوف محسوس کیا اَلْخَشْيَةُ کے معنے ہیں اَلْخَوْفُ خوف (اقرب) کلیات ابی البقاء میں ہے اَلْخَشْيَةُ اَشَدُّ مِنَ الْخَوْفِ وَالْخَشْيَةُ تَكُوْنُ مِنْ عَظَمَةِ الْمَخْشِيِّ وَالْخَوْفُ يَكُوْنُ مِنْ ضُعْفِ الْخَائِفِ (بحوالہ اقرب) یعنی لفظ خشیت میں ڈر کا مفہوم لفظ خوف کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے نیز خشیت اور خوف میں ایک یہ بھی فرق ہے کہ خشیت میں اس ڈر کے معنے پائے جاتے ہیں جو مخشی (یعنے جس ذات سے ڈرا جائے) کی عظمت کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے اور خوف میں اس ڈر کا مفہوم پایا جاتا ہے جو ڈرنے والے کی اپنی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں اَلْخَشْيَةُ خَوْفٌ يَشُوْبُهٗ تَعْظِيْمٌ یعنی خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جس میں اس شخص کی بزرگی اور تعظیم کا خیال بھی شامل ہو جس سے خشیت کی جائے۔ پھر لکھتے ہیں وَاَكْثَرُ مَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ عَنْ عِلْمٍ بِمَا يُخْشٰى مِنْهُ اور لفظ خشیت کا اکثر استعمال اس جگہ ہوتا ہے جہاں خوف کی وجہ کا بھی علم ہو وَلِذٰلِكَ خُصَّ الْعُلَمَاءُ بِهَا فِيْ قَوْلِهٖ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا کی خشیت اس کے عالم بندوں کے دل میں ہوتی ہے ورنہ خوف تو عام لوگوں کے دلوں میں بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ (مفردات)

بِغَافِلٍ :- غَافِلٌ غَفَلَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ غَفَلَ عَنْهُ غَفْلَةً کے معنے ہیں تَرَكَهٗ وَسَهَا عَنْهُ کسی چیز (کی رعایت) کو چھوڑ دیا اور اس کو بھول گیا۔ نیز کہتے ہیں غَفَلَ الشَّيْءَ اور معنے یہ ہوتے ہیں سَتَرَهٗ یعنی فلاں چیز پر پردہ ڈال کر اس کو ڈھانپ دیا (اقرب) اَلْغَفْلَةُ سَهْوٌ يَعْتَرِي الْاِنْسَانَ مِنْ قِلَّةِ التَّحَفُّظِ وَالتَّيَقُّظِ یعنے قوت حافظہ اور دماغی بیداری کے کم ہونے کی وجہ سے کسی چیز کو بھلا دینا غفلت کہلاتا ہے (لسان) اہل عرب کہتے ہیں اَنْتَ غَافِلٌ اور مطلب یہ ہوتا ہے لَا تَعْنِيْ بِشَيْءٍ کہ تو تو کسی شے کی طرف توجہ نہیں دیتا (لسان) ابوالبقاء کہتے ہیں اَلْغَفْلَةُ هُوَ الذُّهُوْلُ عَنِ الشَّيْءِ کہ کسی چیز کو بھلا دینا غفلت کہلاتا ہے (تاج) غَافِلٌ کی جمع غَافِلُوْنَ غُفُوْلٌ اور غُفَّلٌ آتی ہے (اقرب)

اَلْحِجَارَةُ يَشَّقَّقُ يَهْبِطُ غَافِلٌ خَشْيَةٌ

پس مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کے معنے ہونگے کہ اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہو جائے (۲) تمہارے اعمال پر پردہ ہی ڈالتا چلا جائے (۳) تمہارے اعمال کو بھول کر اُن کا کوئی نتیجہ نہ نکالے (۴) تمہارے اعمال کی طرف سے اپنی توجہ کو ہٹا لے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ کی تفسیر

تفسیر۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس آیت میں ثُمَّ کا لفظ بتاتا ہے کہ اس کا مضمون پہلی آیتوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور مراد یہ ہے کہ پہلے نشانات کی وجہ سے چاہیئے تو یہ تھا کہ تمہارے دلوں میں نرمی پیدا ہوتی مگر تمہارے دل اور بھی زیادہ سخت ہو گئے چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کعب بن اشرف اور ابو رافع بن ابی الحقیق کے قتل کئے جانے کے باوجود اور بنو قینقاع کے مدینہ سے نکالے جانے کے باوجود یہود کے دوسرے دو قبیلوں یعنی بنو نضیر اور بنو قریظہ شرارتوں میں اور بھی بڑھ گئے۔

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً۔ فرماتا ہے وہ دل پتھروں کی طرح ہو گئے بلکہ سختی میں اُن سے بھی زیادہ۔ پتھر کے ساتھ دل کی سختی کی مشابہت قریباً ہر زبان میں دی جاتی ہے یہاں بھی وہی مشابہت مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ خدائی باتوں کو قبول کرنے کے لئے اُن کے دل تیار نہیں ہوتے حتّٰی کہ پتھر میں بھی کوئی نرمی ہوتی ہے مگر ان کے دلوں میں کوئی نرمی نہیں۔

اَوْ کا لفظ اس جگہ پر شک کے لئے نہیں آیا بلکہ مراد یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے دل پتھروں کی طرح سخت ہیں اور کچھ لوگوں کے دل اُن سے بھی سخت ہیں۔

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ پھر فرماتا ہے ہم نے جو کہا کہ یہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ پتھروں میں سے بھی بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ پانی کے دباؤ سے پھٹ جاتے ہیں اور ان کے نیچ میں سے نہریں بہنے لگ جاتی ہیں چنانچہ یہ نظارے کثرت سے پہاڑوں میں نظر آتے ہیں کہ اونچی برفوں سے بہنے والے زمین دوز پانیوں کے دباؤ سے کئی جگہ پر پتھریلی زمینیں شق ہو جاتی ہیں اور اُن میں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ مگر یہودی لوگ کچھ ایسے سخت دل ہو گئے کہ خدا کے کلام کی نہر جاری ہوئی مگر اُن کے دلوں نے اس کو کوئی راستہ نہ دیا اور خدا تعالیٰ کی آیات کا ظاہراً و باطناً انکار ہی کرتے چلے گئے

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ۔ اور ان میں سے (یعنی پتھروں میں سے) بعض ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو اُن میں سے پانی نکلتا ہے یعنی کوئی بڑا چشمہ تو اُن میں سے نہیں نکلتا مگر تھوڑا تھوڑا پانی اُن میں سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے گویا اس جگہ پر اس بات کی مثال دی ہے کہ بعض لوگوں سے کم نیکی کا ظہور ہوتا ہے اور بعض لوگوں سے زیادہ نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو اُن پتھروں کے مشابہ ہوتے ہیں جن کے نیچے سے بڑے بڑے چشمے بہتے ہیں یعنی شروع میں تو وہ صداقت کا مقابلہ کرتے ہیں مگر آخر صداقت کے اثر کو قبول کر لیتے اور راستہ دے دیتے ہیں اور اس حد تک اُس سے اثر پذیر ہوتے ہیں کہ صداقت بڑے زور سے اُن میں سے نکلنی شروع ہو جاتی ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ شروع میں تو صداقت کا مقابلہ کرتے ہیں مگر آخر اُسے رستہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن اُن کا تاثر زیادہ شدید نہیں ہوتا صداقت اُن سے نکلتی ہے مگر کم مقدار میں۔ لیکن فرماتا ہے یہود میں سے اکثر لوگ اس درجہ کے بھی نہیں ہیں وہ پتھروں سے بھی زیادہ سنگ دل ہیں وہ کسی صورت میں بھی خدائی صداقتوں کو نکلنے کے لئے رستہ نہیں دیتے۔ نہ چھوٹا رستہ نہ بڑا۔

پھر فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ اس فقرہ کے دو طرح معنے کئے جا سکتے ہیں ایک تو اس طرح کہ ھَا کی ضمیر پتھروں کی طرف پھیری جائے اور معنے یہ کئے جائیں کہ پتھروں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خشیت اللہ سے گر جاتے ہیں اس سے یہ مراد نہیں کہ پتھروں میں عقل اور امتیاز کا مادہ پایا جاتا ہے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے خوف کو اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح کہ انسان محسوس کرتا ہے بلکہ اس جگہ پر خشیت کا مضاف محذوف ہے (تفسیر جلد دوم) اور مراد یہ ہے کہ خشیت اللہ پیدا کرنے کے اسباب سے گر جاتے ہیں جیسے آندھیاں ہیں زلزلے ہیں۔ سیلاب ہیں۔ گرنے والی بجلیاں ہیں۔ یہ سب چیزیں یہ خشیت اللہ

پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور ان چیزوں سے پتھر بھی گرتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ سیلاب آتے ہیں تو پتھر بھی ان سے متاثر ہو جاتے ہیں آندھیاں آتی ہیں تو پتھر بھی ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ زلزلے آتے اور بجلیاں گرتی ہیں تو بھی پتھر ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن زمینی اور آسمانی انقلابات متواتر اور شدت کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں مگر ان سنگ دل اور متعصب یہودیوں کے دلوں میں کچھ بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا اور ان کے دل خدا تعالیٰ کے سامنے جھکتے ہی نہیں۔

دوسرے معنی اس کے اس طرح پر کئے جا سکتے ہیں کہ گو خشیت کے معنے ڈرنے کے ہیں لیکن کبھی ثلاثی مصدر رباعی کے قائم مقام کے طور پر بھی استعمال ہو جاتا ہے (بحر محیط) اسی طرح خشیت اس جگہ اِخْشَاءٌ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرانے والی چیزوں کے سبب سے (جیسے آندھیاں۔ سیلاب۔ بجلیاں اور زلزلے میں) بعض پتھر گر جاتے ہیں۔

اس تشریح کے لحاظ سے بھی معنے وہی رہیں گے جو پہلے بیان ہوئے ہیں صرف نحوی ترکیب میں فرق پڑ جائیگا یعنی پہلے معنی اس بنیاد پر کئے گئے تھے کہ یہاں مضاف حذف ہو گیا ہے اور دوسری تشریح کے رو سے وہی معنے اس لحاظ سے کئے گئے ہیں کہ خشیت کا لفظ اِخْشَاءٌ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان دوسرے معنوں کے کرتے وقت یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس جگہ مصدر بمعنے اسم فاعل استعمال ہوا ہے جیسے کہتے ہیں زَیْدٌ عَدْلٌ اور مراد یہ ہوتا ہے کہ زَیْدٌ عَادِلٌ۔ اور یہ سمجھا جائے گا کہ خشیت بمعنے اِخْشَاءٌ استعمال ہوا ہے اور اِخْشَاءٌ مُخْشِیْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (مصدر بمعنی اسم فاعل و مفعول استعمال ہونے کیلئے دیکھو رضی بحث مصدر)

تیسرے معنی اس آیت کے یوں کئے جا سکتے ہیں کہ ھا کی ضمیر قلوب کی طرف پھیری جائے اور یوں معنی کئے جائیں کہ دلوں میں سے یقیناً بعض ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے گر جاتے ہیں۔ قلوب کا لفظ پہلے آ چکا ہے اور اسکی طرف ضمیر عربی قاعدہ کے رو سے جا سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ قُلُوْبٌ کا لفظ پہلے ہے اور حِجَارَۃ کا لفظ بعد میں۔ اور اس سے پہلی جو ضمیریں ہیں وہ حِجَارَۃ کی طرف پھیری جا چکی ہیں۔ پس حِجَارَۃ کا لفظ جو بعد میں استعمال ہوا ہے اسکی طرف ضمائر کے پھیرے جانے کے بعد ایک ضمیر کا قلوب کی طرف جو حِجَارَۃ سے پہلے بیان ہوا ہے۔ پھیرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن یہ اعتراض درست نہ ہوگا کیونکہ عربی زبان میں ضمائر کو اس طرح پھیرنا جائز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ وَتُسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (الفتح ع۱) تا کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (یعنے رسول) کی مدد کرو اور اسکی عزت کرو اور صبح شام اس (یعنے اللہ) کی تسبیح کرو۔

اس آیت میں پہلے اللّٰہ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور پھر رسول کا۔ لیکن اس کے بعد پہلے دو ضمیریں رسول کی طرف پھیری گئی ہیں اور پھر تیسری ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف پھیری گئی ہے یہ مثال بالکل اس آیت کے مضمون کے مطابق ہے آیت زیر تفسیر میں بھی پہلے قلوب کا لفظ ہے پھر حِجَارَۃ کا ہے اور یہاں بھی پہلے دو ضمیریں حِجَارَۃ کی طرف جو بعد میں ہے پھیری گئی ہیں اور پھر ایک ضمیر قلوب کی طرف جو اس سے پہلے ہے پھیری گئی ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ع۲۹) اس آیت میں تَاْخُذُوْا کی ضمیر اور طرف گئی ہے اور خِفْتُمْ کی ضمیر اور طرف۔ حالانکہ جملہ ایک ہی ہے یعنی تَاْخُذُوْا سے مراد خاوند ہیں اور خِفْتُمْ سے مراد دوسرے لوگ ہیں۔ پس ایک جگہ پر بیان کردہ ضمائر کو مختلف مرجعوں کی طرف پھیرنا عربی کے لحاظ سے بالکل درست ہے اور اسے اصطلاح میں انتشار ضمائر کہتے ہیں اور اسے نحوی جائز قرار دیتے ہیں (جواہر الحسان للثعالبی)

وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو۔ اس جملہ سے صاف ظاہر ہے کہ ان آیات میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ

أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں

يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ

جو اللہ کے کلام کو سنتے ہیں پھر اسے سمجھ لینے کے بعد اس (کے مطلب) کو بگاڑ

مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ

دیتے ہیں اور وہ (اس عمل کے بد نتائج کو خوب) جانتے ہیں ۔ اور جب یہ لوگ مومنوں سے ملتے ہیں

کے تھے۔ فرماتا ہے تمہارے یہ اعمال اور شرارتیں جو تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف کرتے ہو خدا تعالیٰ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے بدلہ میں تمہیں ضرور سزا ملے گی۔

حل لغات۔ تَطْمَعُونَ۔ طَمِعَ سے مضارع جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے اور طَمِعَ فِيهِ (يَطْمَعُ) کے معنے ہیں حَرِصَ عَلَيْهِ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے دل میں خواہش نے جوش مارا (اقرب) مفردات میں ہے اَلطَّمَعُ نُزُوعُ النَّفْسِ إِلَى الشَّيْءِ شَهْوَةً لَهُ کہ کسی شے کے حصول کے لئے طبیعت کا انتہائی اشتیاق طمع کہلاتا ہے نیز طَمِعَ فِيهِ وَبِهٖ کے معنے ہیں حَرِصَ عَلَيْهِ وَرَجَاهُ کسی چیز کے حصول کی خواہش کی اور اس کو حاصل کرنے کی امید رکھی (تاج) اَلطَّمَعُ ضِدُّ الْيَأْسِ کہ طمع کے ایک معنے امید کے بھی ہیں (لسان) پس أَفَتَطْمَعُونَ کے معنے ہونگے (۱) کیا تم امید رکھتے ہو (۲) کیا تم خواہش رکھتے ہو۔

أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ۔ يُؤْمِنُوا اصل میں يُؤْمِنُونَ ہے أَنْ پہلے آنے کی وجہ سے ن گر گیا باقی يُؤْمِنُوا رہ گیا۔ یہ اٰمَنَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اٰمَنَ لَهٗ کے معنے ہیں خَضَعَ وَانْقَادَ کسی کے سامنے عاجزی کا اظہار کیا اور اس کی بات کو مان لیا اور اٰمَنَ بِهٖ کے معنے ہیں صَدَّقَهٗ اس کو سچا قرار دیا۔ اور جب اٰمَنَهٗ کہیں تو اس کے معنے ہونگے اس کو امن بخشا (اقرب) پس أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ کے معنے ہونگے کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے۔

فَرِيقٌ: اَلْفَرِيقُ، اَلطَّائِفَةُ مِنَ النَّاسِ لوگوں کا گروہ۔ أَكْثَرُ مِنَ الْفِرْقَةِ۔ فِرْقَہ کے معنے بھی اَلطَّائِفَةُ مِنَ النَّاسِ کے ہیں لیکن فریق کا لفظ فرقہ سے بڑے گروہ پر بھی جو کسی بڑی جماعت کا حصہ ہو استعمال ہوتا ہے وَرُبَّمَا أُطْلِقَ الْفَرِيقُ عَلَى الْجَمَاعَةِ قَلَّتْ أَوْ كَثُرَتْ بعض اوقات لفظ فریق سے کسی بڑی جماعت کا حصہ کی بجائے خود ایک مستقل جماعت بھی مراد لی جاتی ہے خواہ اس کے افراد تھوڑے ہوں یا زیادہ (اقرب)

يُحَرِّفُونَهٗ: يُحَرِّفُونَهٗ حَرَّفَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حَرَّفَهٗ کے معنی ہیں غَيَّرَهٗ کسی چیز کو اسکی اصلی حالت سے تبدیل کر دیا اور حَرَّفَ الْكَلَامَ کے معنی ہیں غَيَّرَهٗ عَنْ مَوَاضِعِهٖ کسی کلام کے الفاظ کو انکی جگہوں سے تبدیل کر دیا (اقرب) امام راغب لکھتے ہیں تَحْرِيفُ الْكَلَامِ أَنْ تَجْعَلَهٗ عَلَى حَرْفٍ مِنَ الْاِحْتِمَالِ يُمْكِنُ حَمْلُهٗ عَلَى الْوَجْهَيْنِ یعنی کسی کلام میں تحریف کرنے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ کلام میں جس رنگ اور جس موقعہ کی وجہ سے خاص معنے پیدا ہو جاتے ہیں انکی بجائے کلام کو ایسے رنگ میں ڈھال دینا کہ اس کے مخصوص معنوں کی بجائے اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں جسکی وجہ سے پڑھنے والے پر اصل معنی ظاہر نہ ہوں (مفردات)

تفسیر۔ اٰمَنَ لَہٗ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں لکھا گیا ہے اطاعت اور فرمانبرداری یا جزوی تصدیق کے ہوتے ہیں۔ گو اس کے معنے کلّی تصدیق کے بھی ہیں لیکن کلّی تصدیق کے لئے زیادہ تر اٰمَنَ کا صلہ باء آتا ہے جیسے سورۃ بقرہ کے پہلے رکوع میں آتا ہے وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرہ ع) قرآن کریم میں اٰمَنَ یا اٰمَنُوْا کے الفاظ کے ساتھ جہاں صلہ مذکور ہوا ہے وہاں دو ہی صلے آتے ہیں باء کا صلہ اور لام کا صلہ۔ ان میں سے باء کا صلہ ترپّن دفعہ آیا ہے اور لام کا صلہ آیت زیر تفسیر کے علاوہ تین جگہوں میں آیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی لام کا صلہ آیا ہے وہاں اطاعت اور فرمانبرداری کے معنے ہی زیادہ مرجح ہیں۔ چنانچہ سورۃ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ (یونس ع) یعنی گو دل میں تو بنی اسرائیل کا بہت سا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا مگر ظاہر ہو کر حضرت موسیٰؑ کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق صرف کچھ ہی لوگوں کو ملی تھی۔ کیونکہ باقی لوگ فرعون اور اُس کے معاونوں کی ایذاء سے ڈرتے تھے۔ اِسی طرح سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے فرعون نے ساحروں سے کہا اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (طٰہٰ ع) یہاں بھی یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ تم نے موسیٰ کی فرمانبرداری اختیار کر لی اور میری بغاوت کی۔ کیونکہ فرعون کو قلبی ایمان کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس کو تو موسیٰ علیہ السلام کی سیاسی فرمانبرداری اور اطاعت کی ہی فکر تھی یہی آیت سورۃ شعراء ع میں بھی آئی ہے۔ پس قرآن کریم کے محاورہ کے لحاظ سے جہاں ایمان کا ذکر ہو وہاں اٰمَنَ بِهٖ کے الفاظ آتے ہیں اور جہاں اطاعت کا ذکر ہو وہاں اٰمَنَ لَهٗ کے الفاظ آتے ہیں۔

ایمان سے مضارع مخاطب کا صیغہ بارہ جگہ قرآن کریم میں باء کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور ایک جگہ سورۃ دخان میں لام کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جہاں آتا ہے وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (الدخان ع) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول فرعونیوں کے متعلق ہے۔ اِس جگہ بھی اطاعت کے معنے ہی زیادہ مناسب ہیں کیونکہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول درج ہے کہ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۔ اللہ کے بندے میرے سپرد کر دو۔ پس اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ کے معنے یہ ہیں کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے یعنی خوشی سے بنی اسرائیل کو میرے سپرد نہیں کرتے تو فَاعْتَزِلُوْنِ کم سے کم میرے راستہ میں روکیں تو پیدا نہ کرو۔

۲۸۱
اٰمَنَ بِهٖ اور اٰمَنَ لَهٗ کے معنوں میں فرق

اٰمَنَ کے اسم فاعل کے صیغہ میں مومنین کے ساتھ دو جگہ پر باء کا صلہ استعمال ہوا ہے اور وہاں ایمان کے ہی معنے ہیں۔ صرف ایک جگہ پر لام کا صلہ استعمال ہوا ہے جہاں اُس کے معنے بات مان لینے کے ہیں۔ یہ لام کے صلہ کا استعمال سورۃ یوسف میں ہے جہاں آتا ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (یوسف ع) آپ ہماری بات نہیں مانیں گے اگرچہ ہم سچ ہی کیوں نہ کہہ رہے ہوں۔ یہاں بھی اُس ایمان کا ذکر نہیں جس کا خدا یا خدا تعالیٰ کے رسول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے بلکہ جزوی تصدیق کا ذکر ہے۔

ایمان سے جمع متکلم کا صیغہ چار جگہ باء کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور آٹھ جگہ لام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جگہ سورۃ شعراء میں ہے جہاں کفار کا یہ قول درج ہے کہ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ (ع) انہوں نے کہا کیا ہم تیرے فرمانبردار ہو جائیں حالانکہ تیرے فرمانبردار رذیل لوگ ہیں۔ یہاں بھی ایمان کا لفظ فرمانبرداری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (۲) پھر سورۃ مومنون میں فرعونیوں کا یہ قول لکھا ہے کہ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (المومنون ع) یہاں بھی فرمانبرداری کے ہی معنے ہیں۔ فرعون کی قوم کہتی ہے کہ کیا ہم ایسے دو آدمیوں کی

اطاعت اختیار کریں جن کی قوم ہماری غلام ہے گویا ہم غلاموں کے غلام ہو جائیں (۳) تیسرا مقام سورۂ آل عمران ۱۹ ع پر ہے وہاں یہ الفاظ ہیں اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تاکید کردی تھی کہ ہم کسی رسول کی بات نہ مانیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس وہ قربانی نہ لائے جس کو آگ کھاتی ہو یہاں دونوں معنے ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ دوسرے مقامات میں جہاں لام استعمال ہوا ہے یا تو فرمانبرداری کے معنے لئے گئے ہیں یا کسی خاص بات کو تسلیم کرنے کے معنے لئے گئے ہیں کلی ایمان کے معنے نہیں لئے گئے اور چونکہ یہ معنے بھی اس جگہ پر چسپاں ہو سکتے ہیں اس لئے دوسری آیات کے تابع یہاں بھی یہی معنے سمجھے جائیں گے کہ اس جگہ کلی ایمان مراد نہیں بلکہ فرمانبرداری مراد ہے (۴) چوتھی جگہ سورۂ توبہ میں ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (التوبہ ع ۱۲) منافق تمہارے پاس عذر کرتے ہوئے آتے ہیں جبکہ تم جنگ سے ان کی طرف واپس آتے ہو۔ اے رسول تم انہیں کہہ دو کہ عذر مت کرو۔ ہم تمہاری بات اس بارہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اللہ نے ہمیں تمہاری خبر دے دی ہے۔ یہاں بھی ایک خاص بات کے ماننے کا ذکر ہے کلی ایمان کا ذکر نہیں۔ کیونکہ نبی اپنی جماعت کے افراد پر ایمان نہیں لایا کرتا (۵) پانچواں مقام سورۂ بنی اسرائیل ہے۔ یہاں دو جگہ نُؤْمِنَ کے ساتھ لام کا صلہ استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا۔ (بنی اسرائیل ع ۱۰) اس جگہ بھی اطاعت اور فرمانبرداری ہی مراد ہے کیونکہ یہاں دنیوی سامانوں اور بادشاہت کا ذکر ہے۔ دوسرے مقام پر اسی رکوع میں یوں آتا ہے وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ ہم تیرے چڑھنے پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں بھی ایک خاص بات ماننے کا ذکر ہے کلی ایمان کا ذکر نہیں (۶) اسی طرح سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (البقرہ ع ۶) یہاں قطعی طور پر فرمانبرداری کے ہی معنے ہیں اس لئے کہ وہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کلی ایمان کا اظہار تو ملک مصر سے نکلتے ہوئے بھی کر چکی تھی۔ پس یہاں فرمانبرداری کے ہی معنے ہیں یا یہ مراد ہے کہ ہم تیری اس خاص بات کو نہیں مانیں گے (۷) ساتویں جگہ سورۂ اعراف میں دو جگہ لام کا صلہ استعمال ہوا ہے ایک جگہ آتا ہے وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ (الاعراف ع ۱۶) یہ آیت بنی اسرائیل کے مصر سے نکل جانے کے مطالبہ کے بعد آئی ہے پس اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ ہم تیری بات نہیں مانیں گے اور بنی اسرائیل کو نہیں بھیجیں گے۔ چنانچہ اگلی ایک آیت کے بعد ہی دوسری دفعہ لام کا صلہ نُؤْمِنَ کے بعد استعمال ہوا ہے اور وہاں قطعی طور پر بات ماننے کے معنے ہیں کیونکہ وہاں یہ الفاظ ہیں لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ اگر کلی ایمان مراد ہوتا تو وہ یوں کہتے کہ بنی اسرائیل کو بھیجنا تو الگ رہا ہم تجھ پر ایمان لا کر خود بھی تیرے ساتھ روانہ ہو جائیں گے۔

اٰمَنَ سے غائب کے صیغہ کا استعمال مفرد اور جمع دونوں ملا کر قرآن کریم میں ۸۰ دفعہ ہوا ہے۔ ان میں سے ۷۷ جگہ باء کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور دو جگہ لام کا صلہ استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اسی آیت زیر بحث میں اور دوسرے سورۂ توبہ میں۔ سورۂ توبہ ع ۸ میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یہاں صاف طور پر بات ماننے کا ذکر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے لئے باء کا صلہ استعمال ہوا ہے جس پر ایمان کلی ہوتا ہے اور مومنوں کے لئے لام کا صلہ استعمال ہوا ہے جس نے معنے

بات ماننے کے ہیں اور اس جگہ ذکر بھی یہی ہے کہ منافق کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے خلاف دوسروں کی باتیں قبول کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہمارا رسول ٹھیک کرتا ہے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ پر کلّی ایمان لاتا ہے اور مومنوں پر اعتبار کرتا ہے۔

غرض قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی لام کا صلہ استعمال ہوتا ہے اُس کے معنے یا تو فرمانبرداری کے اور یا کسی خاص بات کے تسلیم کرنے کے ہوتے ہیں۔ کلّی ایمان جو خدا اور اُس کے رسولوں پر لایا جاتا ہے اِن معنوں میں لام کا صلہ استعمال نہیں ہوتا۔ پس اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ کے معنے یہ ہیں کہ کیا تم امید کرتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لینگے کُمۡ کی ضمیر بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ کلّی ایمان تو خدا اور رسول پر ہوتا ہے مومنوں پر نہیں ہوتا۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ یہودیوں پر حُسن ظنی رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ صلح اور محبت اور پیار سے رہیں گے تو وہ سچ کہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اگر تم ایسی امید رکھتے ہو تو سخت غلطی کرتے ہو۔ معاہدوں کو پورا کرنا شرافتِ نفس یا خشیۃ اللہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ جو آدمی جھوٹ، فریب اور دغا سے کام لیتا ہے اُس سے یہ امید کرنا کہ وہ معاہدہ کو پورا کرے گا بالکل خلافِ عقل ہے۔ غرض اللہ تعالےٰ اس آیت میں مومنوں کو توجہ دلاتا ہے کہ تم اِن یہودیوں کے حالات کو دیکھو کہ کس طرح جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے ہیں اُن کا جھوٹ اور فریب سے کام لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ فرماتا ہے وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ ان میں سے ایک گروہ بظاہر یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ پر عامل ہے یعنی اللہ تعالےٰ کا کلام سنتا ہے مگر ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ پھر وہ اُس کو اپنے مقام سے پھیر دیتا ہے مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ بعد اس کے کہ وہ اُس کو خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوتا ہے وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔ اور اس حالت میں تحریف کا مرتکب ہوتا ہے کہ اُسے اپنے اس گناہ کا پورا علم ہوتا ہے۔ یعنی تحریف گو بُری بات ہے لیکن اس صورت میں کہ انسان سے اُس کلام کے متعلق تحریف ہو جائے جس کو وہ سمجھا نہیں یا سمجھ تو گیا ہو مگر بات بیان کرتے ہوئے غلطی سے کچھ اور مُنہ سے نکل جائے تحریف، تحریف کرنے والے کی شرارت پر دلالت نہیں کرتی بلکہ اُس کی ناسمجھی یا غلطی پر دلالت کرتی ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان یہودیوں کے حق میں یہ دونوں عذر موجود نہیں۔ وہ اللہ تعالےٰ کے کلام کے اصل مفہوم کو سمجھ کر پھر اُس کے خلاف بیان کرتے ہیں اور پھر یہ خلاف اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ نادانستہ اُن کے مُنہ سے کوئی بات غلط نکل جاتی ہے بلکہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اُس کا اُنہیں علم ہوتا ہے۔ پس جو لوگ اتنا بڑا افتراء کر سکتے ہیں اور اتنا بڑا ظلم کسی دوسری قوم کے مذہب اور دیانت کے متعلق کر سکتے ہیں یا خود اپنے مذہب یا اپنی قوم کے متعلق کر سکتے ہیں اُن کے متعلق یہ کب اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ شرافت اور دیانت کے ساتھ اپنے معاہدوں کو نباہیں گے۔

اگر تو کلام اللہ سے اِس جگہ پر یہودیوں کی کتابیں مراد لی جائیں جیسا کہ بالعموم پُرانے مفسروں نے مراد لی ہے تو پھر بھی یہ بات عقل کے خلاف ہے کیونکہ جو شخص اپنے مذہب سے غداری کرتا ہے وہ دوسری قوم سے کس طرح دیانت داری کا معاملہ کرے گا۔ اور اگر کلام اللہ سے قرآن کریم مراد لیا جائے جیسا کہ بعض سابق مفسروں نے بھی یہ معنے کئے ہیں اور میرے نزدیک یہی معنے سیاق و سباق سے نکلتے ہیں تو پھر بھی وہ یہودی جن کا اس جگہ ذکر ہے قابلِ اعتبار نہیں رہتے کیونکہ کلامِ الٰہی کسی قوم کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے اور اس کے متعلق اُس کے جذبات سب سے زیادہ نازک ہوتے ہیں اگر یہودی قرآن کریم کو بگاڑ کر اور اسکے غلط معنے کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے عادی تھے اور مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کا اس بارہ میں کوئی خیال نہیں رکھتے تھے تو

اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور جب ایک دوسرے سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو (ایک دوسرے کو الزام دیتے ہوئے)

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

کہتے ہیں کیا تم انہیں وہ بات جو اللہ نے تم پر کھولی ہے اس لئے بتاتے ہو

لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمہارے رب کے حضور میں تم سے بحث کریں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۵۵

اُن سے یہ کیونکر امید کی جاسکتی تھی کہ وہ اُن سے کئے ہوئے دنیوی معاہدات کو پورا کریں گے۔ جو شخص کسی کے نازک ترین جذبات کو مجروح کر دیتا ہے اُس سے یہ کب امید کیجاسکتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرے گا۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کی یہ عادت تھی کہ قرآن کریم کی آیتوں کو اُن کے سیاق وسباق سے جدا کرکے اور غلط معنے کرکے لوگوں میں اسلام کے خلاف جوش پھیلایا کرتے تھے اور یہ عادت ہمیشہ سے انبیاء کے دشمنوں میں چلی آئی ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کے خلاف یہ حربہ دشمن نے نہیں چلایا۔ بلکہ کوئی سچائی دنیا میں ایسی نہیں ہوئی جس کے خلاف اُس کے دشمنوں نے یہ حربہ نہ چلایا ہو سچائی کی دشمنی جھوٹ پر انسان کو مجبور کر دیتی ہے آخر سچی بات کی مخالفت کوئی شخص کر ہی کس طرح سکتا ہے اور اُس کے خلاف لوگوں کو بھڑکا ہی کس طرح سکتا ہے۔ اِسی صورت میں سچائی کی مخالفت انسان کرسکتا ہے جبکہ سچ کو جھوٹ کا رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ آج اِس زمانہ میں بھی سب سے بڑا گناہ دنیا میں یہی ہو رہا ہے اور یہی چیز صداقت کے قبول کرنے سے لوگوں کو محروم کر رہی ہے۔ اگر اِس زمانہ کے لوگ اِس بات کا تہیہ کرلیں کہ اپنے مخالف کے مذہب کو غلط رنگ نہیں دیں گے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اُس کو اصل شکل میں اپنے اور اپنی قوم کے سامنے پیش کریں گے تو سچائی کا دریافت کرنا ہرگز مشکل نہ رہے اور تفرقہ اور شقاق اور نفاق بہت جلد دنیا سے دُور ہو جائے۔

۵۵ تفسیر - پہلی آیت میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ یہودی لوگ مسلمانوں کے ساتھ سلوک کرنے میں ایسا تعصب برتتے ہیں کہ قرآن کریم کے مطالب کو دیدہ و دانستہ بگاڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب آیت زیر تفسیر میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ جو اُن کا تمسخر کا طریق ہے اِس کے علاوہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی اُن کا سلوک غیر مخلصانہ ہے۔ وہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو اُن کے سامنے یُوں اظہار کرتے ہیں کہ گویا وہ دل سے اسلام کی سچائی کے قائل ہیں بلکہ اُن کے سامنے وہ ایسے دلائل بھی بیان کرتے ہیں جنہوں نے اُنکو اسلام کی سچائی کا قائل کر دیا اور اپنی کتابوں کی ایسی پیشگوئیاں بیان کرتے ہیں جو اُنکے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر چسپاں ہوتی اور آپ کی سچائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب وہ اپنے دوستوں کے پاس جاتے ہیں تو ایک دوسرے پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم کیوں ایسی باتیں مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے ہو جن سے انہیں تمہارے مذہب کے خلاف حجت قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کی اِس کارروائی سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہودیوں کی مخالفت

محض مذہبی مخالفت ہی نہیں بلکہ سیاسی اور تمدنی طور پر بھی وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں کیونکہ وہ صرف مذہب پر ہی اعتراض نہیں کرتے بلکہ اُن کی مسلمانوں کے ساتھ دوستیاں بھی سنجیدہ نہیں اور اُن میں بھی فریب اور پُرکاری کے جذبات کارفرما ہیں۔

یہودیوں کے اخلاق کا جو پہلو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی نہایت ہی خطرناک ہے یہودی لوگ مسلمانوں سے ملتے تو اُن سے دوستیوں کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ہم بھی دل سے اسلام کی صداقت کے قائل ہیں لیکن جب اُن سے علیحدہ ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے کو زجر کرتے کہ تم نے کیوں اُن باتوں کو جو اللہ تعالٰے نے تم پر کھولی ہیں مسلمانوں پر ظاہر کیا۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ وہ اِن باتوں کو تمہارے خلاف استعمال کرینگے۔ گویا وہ یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ کہ جن باتوں کا انہوں نے مسلمانوں سے ذکر کیا ہے وہ خدا تعالٰے کی بتائی ہوئی ہیں اور اس امر کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہ باتیں اسلام کی تائید میں ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن باتوں کا مسلمانوں کو علم ہو تا ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں یہودیت کے خلاف استعمال کریں۔ گویا اُن کے نزدیک خدا تعالٰے کی بات بے شک جھوٹی نکلے، خدا تعالٰے کا منشاء بے شک پورا نہ ہو لیکن پبلک کی نظر میں یہودیوں کی عزت قائم رہے جس قوم کے اخلاق کی یہ حالت ہو جائے وہ دینی طور پر کس صرف کی ہو سکتی ہے؟ یقیناً اُس سے دین اور اخلاق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جہاں تک مذہب اور اخلاق کا تعلق ہے اِس قوم کی تباہی میں ہی دین اور دنیا کی بہتری ہے۔ پس یہ اخلاقی حالت جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے بعد یہودیوں نے پیش کی اِس بات کا ایک زبردست ثبوت تھا کہ اب یہ قوم خدا تعالٰے کی نعمتوں کی مستحق نہ رہی تھی اور خدا تعالٰے کا نبی اب اِس قوم سے باہر ہی آنا چاہیئے تھا۔

اِس آیت کے آخر میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ یعنی کیا یہ اِن باتوں سے رُکتے نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان [illegible] بات کیا کرتا ہے جو اُس کے لئے یا اُس کی قوم کے لئے عزت کا موجب ہو۔ مگر یہ بات جو اُوپر بیان کی گئی ہے اِس کا کہنے والا تو صاف لفظوں میں اِس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا تعالٰے کا غدار ہے۔ وہ خدا تعالٰے کے منشاء کو سمجھتا ہے، اُس کی پیشگوئیوں کو سمجھتا ہے۔ مگر صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ میں خدا تعالٰی کی پیشگوئیوں کی سچائی ظاہر نہیں ہونے دوں گا اور خدا تعالٰے کے منشاء میں روک بنوں گا۔ جو شخص اتنا خطرناک دعوٰی اپنے دوستوں کے سامنے کرتا ہے اُس کے بے عقل ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اُس کی مثال تو وہی ہے کہ ؎

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ۔ اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا نے جو تم پر کھول دیا یعنی عقلی طور پر یا معجزوں کے ذریعے سے اسلام کی سچائی کو ظاہر کر دیا۔ اور مطلب یہ ہے کہ خواہ تم پر اسلام کی سچائی واضح ہو گئی ہو پھر بھی تم کو یہ بات مسلمانوں کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہیئے۔

دوسرے معنے فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ پیشگوئیاں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بائبل میں بیان ہو چکی ہیں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں پوری ہو کر آپ کی صداقت کو ثابت کر رہی ہیں اُن کو کیوں مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے ہو۔ یہ دونوں معنے ایک ہی وقت میں اِس آیت میں پائے جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگ یہودیوں میں تھے کچھ وہ جو بائبل کے پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن وہ عقلی دلائل سے اور اُن معجزات کے ذریعہ سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے دل میں قائل ہو چکے تھے۔ اور کچھ وہ لوگ جو بائبل کے ماہر تھے اُن پر اُن پیشگوئیوں کی وجہ سے جو بائبل میں پائی جاتی تھیں

اور آپ کی ذات میں پوری ہوئیں آپ کی صداقت کھل گئی تھی وہ مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کے موقع پر اُن پیشگوئیوں کا ذکر کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری کتب کی فلاں فلاں پیشگوئیوں کے مطابق بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے ثابت ہوتے ہیں۔

عِنْدَ رَبِّكُمْ کے الفاظ جو اس آیت میں پائے جاتے ہیں اُن کے متعلق کچھ اشکال پیدا ہوتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔

عام معنے اس جملہ کے یہ بنتے ہیں کہ بعض یہودی اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے پاس وہ پیشگوئیاں بیان کرتے ہو جو تمہاری کتابوں میں بیان ہوئی ہیں یا یہ کہ اُن کے سامنے اقرار کرتے ہو کہ عقلی طور پر تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی ثابت ہوتی ہے مگر کیوں اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ اس کی وجہ سے وہ تمہارے رب کے سامنے تم سے بحث کریں گے اور تم کو مجرم قرار دیں گے۔

ان معنوں پر اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے مسلمانوں کے نزدیک بھی اور یہودیوں کے نزدیک بھی۔ پھر یہ کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہودی اپنے ساتھیوں پر اس لئے ناراض ہوتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے اپنے دلی یقین یا بائبل کی پیشگوئیوں کا اظہار کیوں کر دیتے ہیں اس کی وجہ سے مسلمان قیامت کے دن اُنکے خلاف حجت قائم کر سکیں گے۔

یہ اعتراض اسی صورت میں پڑ سکتا ہے جبکہ یہ تسلیم کیا جائے کہ تمام کے تمام انسانوں کا ایمان خدا تعالےٰ پر ایک قسم کا ہے مگر یہ بات درست نہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خدا تعالےٰ کے سوا بندوں کو بھی عالم الغیب قرار دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خدا تعالےٰ کو بھی پوری طرح عالم الغیب قرار نہیں دیتے۔ چنانچہ قرآن کریم میں کفار کی اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے جو قیامت کے دن اُن میں اور خدا تعالیٰ میں ہوگی فرماتا ہے ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (انعام آیت ۲۴ ع ۳)

یعنی جب کفار پر پوری طرح حجت تمام ہو جائے گی تو اُس وقت وہ ایک ہی جواب کی رٹ لگاتے جائیں گے اور دھیٹھ بنکر یہی کہتے چلے جائیں گے کہ ہمیں قسم ہے اللہ اپنے رب کی کہ ہم مشرک نہیں تھے۔ عالم الغیب ہستی کے سامنے اِس قسم کا جواب جاہلانہ ہے۔ مگر دنیا میں یہ جاہلانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایسے فلسفی موجود ہیں جو خدا تعالےٰ کو مانتے ہیں مگر اُس کے علم کو حاوی نہیں سمجھتے۔ اُس کی طرف کلی علم کو تو منسوب کرتے ہیں مگر اس بات کے منکر ہیں کہ اُسے تمام جزئیات کا بھی علم ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ امر بعید نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہتے ہوں کہ کیوں تم نے اپنے دلی خیالات کو مسلمانوں پر ظاہر کیا۔ یہ قیامت کے دن اِس گواہی کو تمہارے خلاف پیش کریں گے۔ اِس قسم کی جہالت یہودی اَور باتوں میں بھی کرتے رہے ہیں۔ مثلاً اِسی سورۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ یہودی لوگ کہتے تھے ابراہیمؑ یہودی تھا حالانکہ یہودیت موسیٰؑ سے چلی بلکہ موسیٰؑ سے بھی نہیں۔ یہودیت کا نام داؤد علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو حاصل ہوا مگر باوجود اس کے وہ کہہ دیتے تھے کہ ابراہیمؑ یہودی تھا۔ جب قوموں میں تنزّل پیدا ہوتا ہے تو لوگ اِس قسم کی متضاد اور مخالف باتیں کہنے لگ جاتے ہیں کیونکہ درحقیقت اُن کے ایمان کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں ہوتی بلکہ سُنی سُنائی باتوں پر ہوتی ہے اور سُنی سُنائی باتیں اوّل تو متضاد خیالات کے لوگوں سے پہنچی ہوئی ہوتی ہیں اِس لئے خود اُن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ دوسرے جب کوئی شخص عقل کے خلاف بات پر عقیدہ رکھے گا تو اُسے سچا ثابت کرنے کے لئے اُسے عقل کے خلاف باتیں کرنی پڑیں گی۔ سچے دین کو جو آخر میں کامیابی ہوتی ہے اُس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُس کے اندر تضاد نہیں ہوتا۔ جب کبھی کسی انسان پر

تعصب سے خالی ہونے کی گھڑی آتی ہے وہ سچائی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح الٰہی جماعت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ عِنْدَ کے معنے عربی زبان میں کئی ہیں۔ جن میں سے ایک معنے "پاس" کے ہیں اور دوسرے معنے "مطابق حکم" کے۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں ھٰذَا عِنْدَ فُلَانٍ حَرَامٌ۔ یعنی یہ چیز فلاں شخص کے حکم کے مطابق حرام ہے۔ اور قرآن کریم میں بھی محاورہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ اگر کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے تو چار گواہ ساتھ لائے۔ فرماتا ہے فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَاۤءِ فَاُولٰۤىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (سورۂ نور آیت ۱۴ ع ۲) یعنی الزام لگانے والے اگر چار گواہ نہ لاسکیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جھوٹے ہیں۔ یہاں عِنْدَ کے معنے پاس نہیں ہو سکتے کیونکہ بالکل ممکن ہے ایک شخص کسی پر الزام لگائے اور وہ الزام لگانے میں سچا بھی ہو لیکن وہ چار گواہ نہ لاسکے پس گو وہ خدا تعالیٰ کے علم میں سچا ہوگا مگر خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق جھوٹا قرار دیا جائے گا اور اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا تاکہ جھوٹے لوگوں کو یہ جرأت پیدا نہ ہو کہ وہ کسی شخص پر بلا ثبوت دشمنی کی وجہ سے جھوٹا الزام لگا دیں۔ لیکن باوجود اس کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص خدا تعالیٰ کے علم میں بھی جھوٹا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بغیر شہادت کے بھی جانتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ پس اس جگہ پر عِنْدَ اللّٰهِ کے معنے "مطابق حکم" کے سوا اور کوئی نہیں کئے جا سکتے۔

بعض علماء نے عِنْدَ کے معنے "فِیْ" کے بھی کئے ہیں اور مراد یہ لی ہے کہ تمہارے رب کے متعلق جب بحث ہو کیونکہ فِیْ کے معنے "بارہ میں" بھی ہوتے ہیں (دیکھو بحر محیط زیر آیت محولہ بالا) بعض لوگوں نے اس جگہ پر مضاف حذف تصور کیا ہے جو عربی قواعد کے لحاظ سے جائز ہے وہ کہتے ہیں عِنْدَ رَبِّكُمْ سے مراد ہے عِنْدَ ذِكْرِ رَبِّكُمْ۔ اور جملے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو تم سے جب کبھی تمہارے رب کے متعلق گفتگو ہو تو وہ تمہاری بتائی ہوئی باتوں کے ذریعہ سے تم سے بحث کریں یعنی جب یہ سوال پیدا ہو کہ آیا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی پر خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی کوئی دلیل ہے تو مسلمان لوگ بائبل کی ان پیشگوئیوں کو نہ پیش کر دیں جو انہوں نے تم سے سنی ہوں گی۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام نفاق کو اور اخلاص کے بغیر کسی مذہب کے قبول کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہود کے اس فعل کو کہ وہ پورا ایمان حاصل کئے بغیر مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرتے تھے بُرا قرار دیتا ہے۔ اگر اسلام کے نزدیک صرف زبانی اقرار ایمان کے لئے کافی ہوتا تو چاہیئے تھا کہ یہود کی ان حرکات کی تعریف کی جاتی اور اُن کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچائے جاتے کہ وہ مسلمانوں سے اور بھی زیادہ ملیں اور اُن کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کریں۔

اس آیت میں اُن لوگوں کا بھی جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں سے سُن سُنا کر بائبل کے واقعات قرآن کریم میں لکھ دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کام کرنے والا شخص اس ذریعے کو جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے بڑھانے کی کوشش کیا کرتا ہے نہ کہ کم کرنے کی۔ اگر نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں سے سُن کر قرآن کریم میں واقعات لکھ لیا کرتے تھے تو آپ یہود کے اس فعل کا بھانڈا کیوں پھوڑتے تب تو چاہیئے تھا کہ آپ اُن کا بھانڈا پھوڑنے کی بجائے اُن کے لئے ملاقاتوں کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

کیا (اس بات کو) نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں

يُعْلِنُونَ ۝ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ

اللہ اُسے جانتا ہے ۵۷۶ اور اُن میں سے بعض اَن پڑھ ہیں جو چند جھوٹی باتوں کے سوا

۵۷۶ تفسیر: اس آیت میں بھی اِس اعتراض کا جواب موجود ہے جو عیسائی مصنفین کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں سے سُنکر بائبل کے واقعات قرآن کریم میں نقل کر دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس آیت میں اِس قسم کے خیالات کی تردید کی گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ ہر ضروری خبر اپنے رسول کو خود بتا دیتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ کیا یہودی یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ اُسے بھی جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور اُسے بھی جانتا ہے جو وہ ظاہر کرتے ہیں یعنی قرآن کریم میں ایسی اخبار بھی موجود ہیں جو اِن یہودیوں نے بیان نہیں کیں اور وہ بھی ہیں جو انہوں نے بیان کیں۔ اِس سے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو انہوں نے بیان کی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تب بھی اِس سے قرآن کریم کے مضامین میں کمی نہیں آسکتی تھی۔

مخالفینِ صداقت ہمیشہ سے ماموروں پر یہ اعتراض کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ زمانہ کی رَو کی پیداوار ہیں۔ اُس زمانہ میں جو خیالات زور پر ہوتے ہیں اُن سے متاثر ہو کر وہ اپنے لئے ایک مقام تجویز کر لیتے ہیں اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب کبھی خدا تعالےٰ کسی مامور کو مبعوث کرنے لگتا ہے اُس کے آنے سے پہلے لوگوں کی توجہ ایک آنے والے مامور کی طرف پھیر دی جاتی ہے۔ بعض سابق پیشگوئیوں کے متعلق لوگ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ اِس زمانہ میں پوری ہوں گی۔ اور بعض علامات سے وہ یہ استدلال کرنے لگ جاتے ہیں کہ اِسی زمانہ میں وہ موعود مامور آئے گا اور ایسا ہونا ہی چاہیئے کیونکہ بعثتِ مامور کے وقت اُس کے ماننے کے لئے دنیا میں سامان پیدا کرنا ایک ضروری امر ہے جسے خدا تعالےٰ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پس جب وہ مامور آتا ہے تو وہ اُن پیشگوئیوں سے بھی فائدہ اُٹھاتا ہے جن کی طرف اُس کی آمد سے پہلے علماء زمانہ کی نگاہیں اُٹھ چکی ہوتی ہیں۔ اِس سے یہ استدلال کر لینا کہ مامورین زمانہ کی پیداوار ہیں ایک نہایت ہی بودا اعتراض ہے۔ کیا اِن معترضین کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ کو نبی پہلے بھیجنا چاہیئے اور اُس کی شناخت کے سامان بعد میں پیدا کرنے چاہئیں؟ اگر خدا تعالےٰ ایسا کرے تو اِس کے معنے تو یہ ہوں گے کہ وہ خود دنیا کو ہدایت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ یا پھر کیا ان لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ نبیوں کی شناخت کے سامان تو پہلے سے مہیا کر دیئے جائیں اور پہلے نبیوں کی بعض پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے آثار بھی ظاہر کر دیئے جائیں لیکن وہ نبی اُن پیشگوئیوں سے فائدہ نہ اُٹھائے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ دوسروں کے خیالات سے متاثر ہے۔ ادنیٰ غور سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ یہ خیال بھی بالکل باطل ہے۔ جس چیز کو خدا تعالےٰ نے سچائی کے ظاہر کرنے کے لئے بطور دلیل مہیا کیا ہے اِس سے فائدہ نہ اُٹھانا تو خدا اور اُس کے دین سے غداری ہے اور نبی غدار نہیں ہوتا پس اِس قسم کے اعتراضات خواہ وہ پہلے نبیوں پر ہوتے ہوں یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوتے ہوں یا آپ کے بعد کسی کے متعلق ہوں بالکل لغو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ فَوَيْلٌ

اپنی کتاب کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے اور وہ صرف تُک بندیاں کرتے رہتے ہیں پس

لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ

جو لوگ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں (اور) پھر اُس کے ذریعہ سے (کچھ) تھوڑی (سی)

هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

قیمت حاصل کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ (کتاب) اللہ کی طرف سے ہے اُن کیلئے (ایک سخت) عذاب

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ

(مقدر) ہے۔ پھر (ہم کہتے ہیں کہ) اُن کے لئے اُن کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کے سبب سے (ایک سخت) عذاب (مقدر) ہے

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ

اور اس کے سبب سے (بھی) عذاب (مقدر) ہے جو وہ کماتے ہیں ٣٥ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں چند گنتی کے دنوں کے سوا

آیت زیرِ تفسیر میں نہایت عمدگی سے اِس کو رد کر دیا ہے اور فرماتا ہے کہ وہ باتیں بھی ہماری کتاب میں موجود ہیں جن کو تم بیان کرتے ہو اور وہ باتیں بھی موجود ہیں جن کو تم بیان نہیں کرتے یا بیان نہیں کر سکتے۔ خدا تو ساری ہی باتوں کا واقف ہے اُس کی طرف سے آنے والی کتاب کسی کے بتلائے ہوئے علم کی محتاج نہیں۔ مگر وہ یہ بھی تو نہیں کر سکتی کہ چونکہ کسی اور نے ایک علم کا اظہار کر دیا ہے اِس لئے خدائی کتاب میں سے اِس علم کو خارج کر دینا چاہیئے۔ اِس سے تو سچائی کا خون ہو گا اور خدا کی کتاب ایسی حرکات سے بالا ہوتی ہے۔

٣٥ تفسیر۔ اَمَانِیَّ اُمْنِیَّۃٌ کی جمع ہے اور اِس کے معنے ہیں (۱) جس چیز کی تمنا کی جائے (۲) جھوٹ (۳) جو چیز پڑھی جائے (۴) مقصود۔ پس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ یہود میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں صُحُفِ بنی اسرائیل کا صرف اتنا علم حاصل ہے کہ وہ اُنہیں پڑھ سکتے ہیں۔ مراد یہ کہ وہ اچھی طرح اُن کے سمجھنے پر قادر نہیں۔ گویا اُمّی کے معنے اِس جگہ پر محدود کر لئے گئے ہیں اور ایسے اَن پڑھ کے معنے نہیں لئے گئے جو کہ کتاب کو لفظاً بھی نہ پڑھ سکتا ہو بلکہ اِس لفظ سے ایسے اَن پڑھ مراد لئے گئے ہیں جو لُغت کی باریکیوں سے واقف نہیں اور صرف موٹے موٹے معنے جانتے ہیں۔ اِن معنوں کے رُو سے یہود پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اپنی کتب کے گہرے مطالعہ کی کوشش نہیں کرتے۔ ذو معانی الفاظ جو اُن میں استعمال کئے گئے ہیں اُن میں سے ایسے معنوں کو تو لے لیتے ہیں جو خدا کی سُنّت اور اُس کے منشاء کے خلاف ہوتے ہیں اور اُن کو چھوڑ دیتے ہیں جو خدا کی سُنّت اور اُس کے منشاء کے مطابق ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے یہ مضمون بہت ہی عبرت کا موجب ہے۔ آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔ اکثر مسلمان تو قرآن کریم کے معنے جانتے ہی نہیں اور جو جانتے ہیں وہ

صرف محدود علم رکھتے ہیں۔ قرآنی الفاظ کے اندر جو متعدد مضامین پائے جاتے ہیں اُن کی طرف نہ توجہ کرتے ہیں نہ توجہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ جو توجہ کرے اُسے متأوّل اور کافر قرار دیتے ہیں جس کی وجہ سے قرآن کے خزانے بند ہو گئے۔ اُس کا چلتا ہوا پانی اِن لوگوں کے لئے کھڑا ہو کر بدبودار ہو گیا۔ مسلمانوں نے اتنا نہ سوچا کہ جس بات کو قرآن کریم نے یہودیوں کے لئے عیب کے طور پر پیش کیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے حُسن کیونکر ہو گیا۔

ایک معنے اُمْنِیَّہ کے تمنّا کے کئے گئے ہیں اِن معنوں کے رُو سے اُمّی کے وہی عام معنے لئے جائیں گے جو عام عربی زبان میں رائج ہیں یعنی بالکل اَن پڑھ جو نہ لکھ سکے اور نہ پڑھ سکے۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ یہودیوں میں سے بعض اَن پڑھ ہیں جو اپنی کتاب پڑھ بھی نہیں سکتے یا لفظاً تو تلاوت کر سکتے ہیں لیکن اُس کے معنے نہیں جانتے۔ اُن کا علم کتاب کے متعلق صرف چند آرزوؤں تک محدود ہے یعنی وہ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہم نے صُحفِ بنی اسرائیل کو اگر بغیر معنے جاننے کے ہی پڑھ لیا یا لوگوں سے سُن لیا تو بس یہ ہماری نجات کے لئے کافی ہے۔ گویا خدا کی کتاب اُن کے دل میں صرف ایک تمنا پیدا کرتی ہے کوئی علم اور نُور نہیں بخشتی۔ یہ حالت بھی آج مسلمانوں میں پیدا ہے اور وہ اس سے ہوشیار نہیں ہوتے۔ ہوشیار ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ کروڑوں مسلمان ہیں جو قرآن کریم کی لفظی تلاوت بھی نہیں کر سکتے اور کروڑوں ہیں جو اُس کے لفظ تو پڑھ سکتے ہیں مگر اُن کے معنے نہیں جانتے اور اِن دونوں گروہوں کے دلوں میں قرآن کریم کے پڑھنے اور اُس کے معانی کے جاننے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی بغیر معنے جاننے کے جب وہ قرآن کریم پڑھ لیتے ہیں یا یہ بھی نہیں کر سکتے اور کبھی کبھار کسی سے قرآن کریم کی کچھ سُن لیتے ہیں تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کو نجات حاصل ہو گئی۔ کیونکہ اُنہوں نے قرآن کریم سُن لیا ہے یا پڑھ لیا ہے حالانکہ نہ اُنہوں نے قرآن پڑھا نہ سُنا بلکہ آوازوں کے بعض اُتار چڑھاؤ سنے یا سیاہی کی بعض لکیروں کو دیکھا قرآن کریم تو اُس مضمون کا نام ہے جس پر اُس کے حروف و الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے اس مضمون کو نہ پڑھا اور یہ جانتے ہوئے نہ پڑھا کہ قرآن کریم کے اِن الفاظ کا یہی مفہوم ہے اُس نے قرآن کریم ہرگز نہیں پڑھا۔ اور جس نے اُس کتاب کو ہی نہ جانا جو خدا تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھجوائی تھی وہ کیونکر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ سچے مذہب پر ایمان لایا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جس کو قرآن کے معنے نہ آئیں اُس کو قرآن کریم پڑھنا بھی نہیں چاہیئے ایسی تلاوت کم سے کم اُسے اُس کے مدّعا کی یاد تو دلاتی رہتی ہے لیکن اُس کے دل میں معنوں کے جاننے کی خواہش تو ہونی چاہیئے اور اُن کے سیکھنے کے لئے اُسے کچھ کوشش تو کرنی چاہیئے اگر یہ خواہش موجود ہو اگر اس قسم کی کوشش جاری ہو تو بے شک خدا اور اُس کے رسول کے سامنے ایسا آدمی بری قرار دیا جائے گا۔ لیکن جب کوشش مفقود ہو اور خواہش کا وجود ہی نہ ہو تو ایسا آدمی صرف اپنی تمناؤں سے خدا تعالیٰ کو کس طرح خوش کر سکتا ہے۔

ایک معنے اُمْنِیَّہ کے جو اَمَانِیّ کا مفرد ہے جھوٹ کے ہیں اور اِن معنوں کے رُو سے آیت کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہود میں سے کچھ لوگ اَن پڑھ ہیں جو کتاب کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتے سوائے کچھ جھوٹوں کے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ قوم کے کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو کلامِ الٰہی کے معنے تو نہیں جانتے لیکن اُنہیں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ دنیا یہ سمجھے کہ اُنہیں کلامِ الٰہی کے معنے آتے ہیں۔ گویا علم نہ رکھتے ہوئے عالم کہلانے کا شوق اُن میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس قسم کے یہود بھلا کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں یا اِس بات کے کب حقدار ہو سکتے ہیں کہ

خدا کا فضل اُن پر نازل ہوتا رہے۔ وہ تو دین کے دشمن ہیں کہ اپنی جہالت کو خدا تعالیٰ کے سر منڈھ کر اُس کی ہتک کرتے ہیں اور پھر اس جہالت کو لوگوں میں پھیلا کر بھولے بھالے سادہ انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ افسوس آج مسلمانوں میں بھی اِس قسم کی جماعت کثرت سے موجود ہے۔ ایسے لوگ ان میں بھی موجود ہیں جو قرآن کریم کو لفظاً بھی نہیں پڑھ سکتے مگر وہ ادھر اُدھر سے سُنے ہوئے قصوں کو خدا اور اُس کے رسول کی طرف منسوب کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں اور پھر اصرار کرتے ہیں کہ اُن قصوں پر یقین کیا جائے اور اُن پر ایمان لایا جائے اور اُن کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اور ایسے بھی ہیں جو عربی زبان کا معمولی سا علم رکھتے ہیں لیکن اُن میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ عربی زبان کی باریکیوں کو سمجھ سکیں اور وہ قرآن کریم کے متعلق اپنے ناقص علم کے ذریعہ آپ بھی گمراہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو قرآن کریم کی لفظی تلاوت کر سکتے ہیں مگر اُن لوگوں پر جو لفظی تلاوت بھی نہیں کر سکتے یہ رُعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے علوم کے ماہر ہیں۔ یہی لوگ اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اگر قرآن کریم کے پڑھنے اور جاننے کی کوشش کی جاتی اور اُس کے مطالب پر صحیح غور کیا جاتا اور جھوٹوں اور آرزوؤں کی پیروی نہ کی جاتی تو اسلام کو وہ دن دیکھنا نہ پڑتا جو آج ہر مخلص مسلمان کے دل کو غمگین کر رہا ہے۔

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ۔ یعنی وہ تمام اقسام کے آدمی جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے صرف ظن سے کام لیتے ہیں علم اُن کے ساتھ نہیں۔ وہ بھی جن کو زبان کا پورا علم نہیں صرف گمان سے کام لیتے ہیں اور وہ بھی جو کہ زبان کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے مگر لوگوں کی سُنی سُنائی باتوں کو خدا کا کلام قرار دے کر اپنے دماغ کو بھی اُن سے بھر لیتے ہیں اور لوگوں کے دماغوں میں بھی اُن کو بھرنے کی کوشش کرتے ہیں صرف گمان سے کام لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس نے اُن کو بات بتائی ہے وہ ضرور سچا ہوگا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ

اِس آیت میں ایک عجیب اختصار سے کام لیا گیا ہے یعنی بظاہر عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی آیت کا تتمہ ہے اور اس میں اُنہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ذکر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک دوسرے گروہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر عبارت ایسے رنگ میں رکھی گئی ہے کہ پہلی آیت کا تتمہ معلوم ہوتی ہے پہلی آیت میں تو اُن لوگوں کا ذکر تھا جو عبرانی زبان سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور بائبل کے باریک مضامین کے جانے بغیر اپنے آپ کو دھوکا دیتے تھے اور لوگوں کو گمراہ کرتے تھے یا اُن کا ذکر تھا جو صرف اس خواہش اور آرزو میں مگن ہو رہے تھے کہ ہم نے صُحفِ بنی اسرائیل کے الفاظ پڑھ یا سُن لئے ہیں بس ہماری نجات کے لئے یہ امر کافی ہے۔ یا اُن لوگوں کا ذکر تھا جو صُحفِ بنی اسرائیل کو پڑھتے تھے یا کچھ حصہ اس کا انہوں نے یاد کر لیا تھا۔ مگر معنے نہ جانتے تھے۔ ہاں اُنہوں نے کچھ تفسیریں علماء کی یاد کر چھوڑی تھیں اور موقع بے موقع لوگوں کو وہ تفسیریں سُنا سُنا کر دعویٰ کرتے تھے کہ وہ صُحفِ بنی اسرائیل کے سچے مضامین بیان کر رہے ہیں۔ گویا صرف جہّال کا ذکر اس آیت میں تھا مگر آیتِ زیرِ تفسیر میں جہّال کا ذکر نہیں بلکہ علماء کا ذکر ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اُن یہودیوں پر جو اپنے ہاتھوں سے کتابیں لکھتے ہیں اور پھر لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے عذاب نازل ہوگا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں علماء کا ذکر ہے نہ کہ جہّال کا۔ اِس پر سوال ہوتا ہے کہ پھر اِس آیت کو فا سے کیوں شروع کیا گیا جس کے معنے "پس" کے ہیں اور پس کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ پہلے مضمون کے نتیجہ میں یہ دوسرا مضمون پیدا ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم پر چونکہ لاتعداد مضامین بیان کرنے

ذمہ واری ہے اِس لئے ایسی عبارت میں نازل کیا گیا ہے جو اختصار کا کمال اپنے اندر رکھتی ہے۔ پہلی آیت میں جہّال کا ذکر تھا جو علماء کی غلط سلط تفسیروں پر اعتماد کرکے خود بھی گمراہ ہو رہے تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور دوسری آیت میں اُن لوگوں کا ذکر کیا جانا مقصود تھا جو عالم ہوتے ہوئے سچی دینداری سے عاری تھے اور لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ اگر مستقل طور پر اُن لوگوں کا ذکر کیا جاتا تو عبارت لمبی ہو جاتی۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں جہّال کا ذکر کیا اور دوسری آیت میں اُس کے تابع علماء کا ذکر کر دیا اور یُوں فرما دیا کہ وہ جہّال جن کا پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ہے علماء کی غیر ذمہ وارانہ حرکات کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اوّل علماء نے اُنہیں کتاب سے واقف نہیں کیا۔ دوسرے غلط سلط باتیں کتاب کی طرف منسوب کرکے اِن جہّال کو یاد کرا دیں اور کہہ دیا کہ یہی تمہاری کتاب کا مفہوم ہے پس اُن جہّال کی تباہی اور بربادی کی ذمہ واری اُن علماء پر ہے اور ان کی گمراہی کا موجب اُن کی یہ بے ایمانی ہے کہ اپنے خیالات کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے اُسے خدا تعالیٰ کی کتاب اُنہوں نے قرار دے دیا۔ پس مذکورہ بالا جہّال کو جو سزا ملے گی وہ تو ملے گی ہی مگر ساتھ ہی یہ علماء بھی اُن کی گمراہی کے ذمہ وار قرار دئے جاکر اپنے گناہوں کے علاوہ اُن جہلاء کے گناہوں کی سزا میں بھی حصہ دار ہوں گے اِسی وجہ سے جہّال کا ذکر کرنے کے بعد فرما دیا۔ "پس عذاب نازل ہوگا اُن لوگوں پر جو کہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے" اور اِس طرح مختصر الفاظ میں ایک تو یہ بتا دیا گیا کہ یہود میں عالم بھی موجود ہیں مگر وہ اپنے علم سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دوسرے یہ بتا دیا گیا کہ جہّال کی گمراہی کی ذمہ واری اِن علماء پر ہے۔ اور تیسرے یہ بتا دیا گیا کہ جہّال کو اُن کے عمل کی جو سزا ملے گی اِس میں علماء بھی اُن کو گمراہ کرنیکی وجہ سے شریک کئے جائیں گے کیونکہ گمراہی کے ذمہ وار وہی ہیں۔ اتنے وسیع مضمون کو علماء کا ذکر پیچھے رکھ کر اور اُن کے ذکر سے پہلے صرف فاء کا حرف بڑھا کر ادا کر دیا گیا ہے۔

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ اِس میں یہ بتایا ہے کہ یہ علماء دنیوی اغراض کے ماتحت دین کو بگاڑتے ہیں اور اُن کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ دین چاہے برباد ہو جائے ان کو دنیا مل جائے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ لکھا تو ہاتھ سے ہی جاتا ہے پھر بِاَيْدِيْهِمْ کا لفظ کیوں بڑھایا گیا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اَيْدِيْ کا لفظ تاکید کیلئے بڑھایا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب کا لفظ کبھی لکھوانے کے معنوں میں بھی آجاتا ہے جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اُكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا (بخاری جلد ۳ کتاب المغازی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہٖ) میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں تمہیں ایک عبارت لکھ دوں تاکہ میرے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو۔

قرآن کریم سے بھی اور تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لکھنا نہیں جانتے تھے پس اُكْتُبُ کا لفظ جو اس حدیث میں استعمال ہوا ہے اس کے معنے لکھوانے کے ہیں۔ پس اِس جگہ پر اَيْدِيْهِمْ کے الفاظ بڑھا کر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اِس آیت میں علماء کا ذکر ہے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے تاکہ کوئی شخص یہ دھوکا نہ کھائے کہ شاید اس آیت میں بھی پہلے گروہوں کا ہی ذکر ہے اور لکھنے سے مراد لکھوانا ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔ اس میں بتایا ہے کہ یہ علماء تہرے عذاب کے مستحق ہیں۔ ایک وجہ تو اُن کے عذاب کی پہلے بتائی جا چکی ہے کہ جہّال کو گمراہ کرتے ہیں

دوسری وجہ اُن کے عذاب کی یہ ہوگی کہ انہوں نے خدائی کلام کی طرف غلط باتیں منسوب کیں اور تیسری وجہ عذاب کی یہ ہوگی کہ اِس حرکت کا محرک بھی نیک نہیں تھا بلکہ اُن کا مقصد اِس تحریف سے صرف دنیا کمانا تھا پس ایک عذاب تو اُن کو فعلِ بد کی وجہ سے ملے گا اور ایک عذاب محرکِ بد کی وجہ سے ہوگا۔

اِس آیت میں سزا و جزاء کا ایک اہم فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ فعلِ بد دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) فعلِ بد جو نادانی سے کیا جائے (۲) فعلِ بد جو دیدہ دانستہ کیا جائے۔ پھر یہ فعل آگے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) وہ فعلِ بد جس کا محرک نیکی کا خیال ہو خواہ غلط خیال ہو (۲) وہ فعلِ بد جس کا محرک خود ایک ذلیل اور گندہ جذبہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص قتل کرتا ہے اور وہ قتل اس سے ناواقفی میں ہو جاتا ہے تو یہ فعلِ بد تو ہے لیکن یا تو اس کا مرتکب کلّی طور پر بری قرار دیا جائے گا یا جب اُس نے پوری احتیاط سے کام نہ لیا ہو تو جزوی طور پر بری قرار دیا جائے گا۔ لیکن ایک دوسرا شخص ایسا ہو سکتا ہے جس نے دیدہ و دانستہ قتل کیا مگر فرض کرو اس وہم کے ماتحت قتل کیا کہ یہ شخص میرے بچوں کو قتل کرنے والا ہے یا ہماری قوم کے فلاں بزرگ کو قتل کرنے والا ہے یا اُسے نقصان پہنچانے والا ہے۔ یہ فعل بھی ہوگا تو بُرا مگر اس کا محرک نیک ہوگا۔ ایک اور تیسرا شخص ایسا ہو سکتا ہے جو کسی شخص کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اُس کا روپیہ چھین کر عیاشی کرے۔ اِس شخص کا فعل بھی بُرا اور اُس کا محرک بھی بُرا۔ پس یہ دو گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے قتل کا بھی اور حرص و ہوا کا بھی۔ اور اس لئے دوہرے عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس کے اُلٹ نیکیوں کا بھی یہی حال ہے اور اس کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ پس قرآن کریم کے اس جملہ میں کہ اُن پر عذاب ہوگا اس تحریر کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور اُن پر عذاب ہوگا اُس دنیوی مال کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا۔ اخلاق کے اِس لطیف نکتہ کو بیان کیا گیا ہے اور جو شخص تقوےٰ حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے علم کا ایک دروازہ کھول دیا گیا ہے۔

مسیحی اِس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک بائبل اپنی اصلی شکل میں موجود تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو محرف مبدّل بائبل کے بدلنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہم نے اِس آیت کے معنے بائبل کے بدلنے کے نہیں کئے اس لئے یہ نتیجہ ہمارے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں نکالا جا سکتا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے نزدیک بائبل قرآن کریم کے وقت میں محرف مبدّل نہ ہوئی تھی کیونکہ ہمارے علم اور تحقیق میں یقیناً اُس وقت تک بائبل محرف مبدّل ہو چکی تھی۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اِس آیت کے معنے میں نے یہ نہیں کئے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ بائبل حضرت مسیحؑ کے زمانہ سے بھی پہلے محرف مبدّل ہو چکی تھی) لیکن اگر آیت کے یہ معنے کئے جائیں کہ یہودی لوگ بائبل کو بدلا کرتے تھے تو بھی اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بائبل قرآن کریم کے زمانہ تک محرف مبدّل نہیں تھی کیونکہ اس صورت میں اس آیت کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ یہودی بائبل کو بدلتے ہیں اور جب اِس آیت کے یہ معنے کئے جائیں کہ یہودی بائبل کو بدلا کرتے ہیں تو اِس فقرہ سے کونسا عقلمند یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہودی بائبل کو بدلا نہیں کرتے تھے اور بائبل اُس وقت تک محرف مبدّل نہیں ہوئی تھی۔ بے شک یہ اعتراض اُن کی طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر بائبل کی تعلیم محرف مبدّل تھی تو اس کے بدلنے میں حرج کیا تھا اور اس پر ڈانٹا کیوں گیا؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ گو یہودی قرآن کریم کے نزول سے پہلے بائبل میں تحریف و تبدیل کرنے لگ گئے تھے تو بھی اُن کا اس کام کو جاری رکھنا بُرا تھا۔ بائبل کی

نسبت تو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک محرف مبدل کتابِ آسمانی ہے۔ اگر کسی سَو فیصدی انسانی بنائی ہوئی کتاب کو کوئی شخص غلطی سے خدائی کتاب سمجھتا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے پھر اُس میں کوئی تبدیلی کرتا ہو تو وہ شخص بھی مجرم سمجھا جائیگا اِس لئے نہیں کہ وہ ایک آسمانی کتاب کو بدلتا ہے بلکہ اِس لئے کہ جس کتاب کو وہ آسمانی سمجھتا ہے اُسے کیوں بدلتا ہے قرآن کریم میں صاف آتا ہے کہ منافق لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور کہتے تھے نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (سورۃ منافقون ع۱) یعنی منافق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو آکر کہتے تھے کہ ہم خدا کی قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے بے شک تو اللہ کا رسول ہے مگر منافق اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔ اِن آیات میں منافقوں کو ایک ایسی بات کہنے پر جھوٹا کہا گیا ہے جو سچی ہے اور جس کے سچا ہونے پر خدا تعالےٰ خود بھی گواہی دیتا ہے۔ اُنہیں جھوٹا اِس لئے کہا گیا ہے کہ وہ دل سے اِس بات کو نہیں مانتے تھے جس طرح دل سے نہ مانتے ہوئے ایک سچی بات پر ظاہر میں ایمان کا اظہار کرنا منافقت اور بے ایمانی ہے اِسی طرح غلط کتاب کو آسمانی سمجھتے ہوئے اُس میں بگاڑ پیدا کرنا بے ایمانی اور کفر کی علامت ہے اور یقیناً یہ جرم اِس بات کا مستحق ہے کہ اس پر خدائی کتاب میں تنبیہ کی جائے۔ ایک عورت ہوش میں اپنے بچے کو قتل نہیں کرتی۔ اگر ایک عورت ایک ایسے بچے کو جسے وہ اپنا بچہ سمجھتی ہے گو درحقیقت وہ اُس کا بچہ نہیں قتل کرتی ہے تب بھی ہم یہی یقین کریں گے کہ اُس عورت کا دماغ خراب ہے کیونکہ گو وہ اُس کا بچہ نہیں مگر وہ تو یہی سمجھتی ہے کہ وہ اُس کا بچہ ہے۔ اِسی طرح گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بائبل محفوظ نہیں تھی اور محرف ومبدل تھی مگر یہودی تو اُس کو غیر محفوظ اور محرف مبدل نہیں سمجھتے تھے۔ جب وہ اس کو شروع سے لے کر آخر تک خدا تعالےٰ کی کتاب سمجھتے تھے تو اُن کا اس کے مضامین پر پردہ ڈالنا یا اُن میں کوئی خرابی پیدا کرنا اُن کی بے ایمانی اور بد اعمالی کی واضح دلیل تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ بائبل میں اُس کی موجودہ شکل میں بھی ہزاروں صداقتیں پائی جاتی ہیں پس اُن کے بدلنے سے اب بھی حق کو نقصان پہنچتا ہے۔

اِس آیت کا ایک اَور مفہوم بھی ہے اور وہ یہ کہ بائبل کے متعلق یہود کا یہ یقین ہے کہ بخت نصر کے زمانہ میں وہ ضائع ہو گئی تھی پھر عزرا نبی نے اُس کو دوبارہ لکھا گویا یہودی تاریخ کے مطابق بھی اصلی بائبل موجود نہیں رہی تھی بعض انسانوں نے خواہ وہ نبی ہی ہوں اُس کو دوبارہ درست کر کے لکھا پس اُس کی حیثیت محض ایسی رہ گئی جیسا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی حدیثوں کی۔ اور جس طرح احادیث نبویہ کو کتاب اللہ نہیں کہا جا سکتا اُس کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُس میں غلطی کے امکان پیدا ہو گئے خصوصاً جبکہ بائبل کو حفظ کرنے کا رواج کبھی بھی بنی اسرائیل میں نہیں ہوا اور خصوصاً جبکہ خود بائبل کی اندرونی شہادتیں اِس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ بائبل اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں بلکہ اُس میں بہت سے حواشی اور تفسیریں اور غلط روائتیں شامل ہو گئے ہیں۔ پس اس آیت کے یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی تاریخوں کے مطابق خود جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دست بُرد سے پاک نہیں لیکن باوجود اِس کے اصرار کرتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے بے شک ابتداء میں یہ خدائی کتاب تھی مگر اب جبکہ اس میں انسانی دستبرد سے کچھ زیادتیاں یا کمیاں پیدا ہو گئی ہیں اِسے خالص خدا کا کلام کہنا اور الہامی کتاب کے مقابلہ میں پیش کرنا زیادتی اور ظلم ہے۔

عیسائی تو یہودیوں سے بھی ایک قدم آگے ہیں سب کی سب انجیل خدا کی کتاب کہلاتی ہے۔ لیکن جب اُسے

اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
(دوزخ کی) آگ ہرگز نہ چھوئے گی تو (ان سے) کہہ کیا تم نے اللہ کی بارگاہ سے کوئی

عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
عہد لیا (ہُوا) ہے (اگر ایسا ہے) تب تو اللہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں کریگا یا تم اللہ کے متعلق ایسی

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝
بات کہتے ہو جس کا تمہیں (کوئی) علم نہیں ہے ۸۲ ۞

کھول کر پڑھنا شروع کرو تو لکھا ہوتا ہے متی کی انجیل مرقس کی انجیل۔ لوقا کی انجیل۔ یوحنا کی انجیل۔ پطرس کے خط پولوس کے خط۔ زید کے خط اور بکر کے خط۔ یہ انسانوں کی اناجیل اور زید اور بکر کے خطوط خدا کا کلام کس طرح ہوگئے بے شک انجیل میں خدا کا کلام بھی موجود ہے مگر وہ خدا کی کتاب نہیں کہلا سکتی کیونکہ انسانوں نے اپنے الفاظ میں بعض باتیں لکھی ہیں جو انہوں نے خدا سے نہیں بلکہ خدا کے نبی سے سُنیں یا خدا کے نبی سے بھی نہیں سُنیں خدا کے نبی کی باتیں سُنکر اُن سے ایک نتیجہ نکالا۔ اور یہ حصہ بھی باقی کتاب کا دو تین فی صدی ہے۔ باقی باتیں اپنے خیالات یا غیر محقق روایات پر مبنی ہیں۔ ایسی کتابوں کو خدا کی کتابیں کہنا اور پھر اُن پر مذاہب کی بنیاد رکھنا اور الہامی کتابوں کے مقابلہ میں اُن کو پیش کرنا ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

اِس آیت سے اُن کتب کی طرف بھی اشارہ سمجھا جا سکتا ہے جو درجنوں کی تعداد میں یہود و نصاریٰ میں پائی جاتی ہیں اور الہامی کتب کہلاتی ہیں یا الہامی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن خود مسیحی اور یہودی بھی اُن کی صداقت میں شک کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے "ایپو کریفا" کے نام سے ایسی کتابوں کا مجموعہ شائع کیا ہوا ہے۔ یہ سب کی سب کتابیں وہ ہیں جن کو اُن کے لکھنے والوں نے یا عیسائیوں کی بعض جماعتوں نے خدائی کتابیں قرار دیا ہے لیکن عیسائی بحیثیتِ مجموعی اُن کو خدائی کتابیں تسلیم نہیں کرتے اور سچی انجیلیں قرار نہیں دیتے۔ جس قوم کے اپنے عقیدہ کے مطابق بھی ایسی اناجیل موجود ہیں جن کو خدائی کتابیں کہا جاتا ہے لیکن اُس قوم کے عقیدہ کے مطابق وہ خدا کی کتابیں نہیں ہیں کیا اُس کے افراد قابلِ ملامت نہیں اور کیا قرآن کریم کا یہ کام نہ تھا کہ اُن کو زجر کرتا اور اُن کے اس عیب کو دنیا کے سامنے لاتا اور اُن مجرموں کی اصلاح کی کوشش کرتا۔

۸۲ حل لغات ۔ يُخْلِفُ۔ اَخْلَفَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَخْلَفَ وَعْدَهٗ کے معنے ہوتے ہیں لَمْ يُتَمِّمْهُ عہد کو پورا نہ کیا (اقرب) پس فَلَنْ يُّخْلِفَ عَهْدَهٗ کے معنے ہوں گے۔ وہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اُن یہودیوں کا ذکر ہے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ یہود خواہ کچھ بھی کریں چونکہ وہ خدا تعالیٰ کے پیاروں کی اولاد ہیں وہ دائمی عذاب میں مبتلا نہیں کئے جا سکتے۔ حق تو یہ ہے کہ یہود نے بائبل میں سے حیوٰة بعد الممات کے عقیدہ کو ہی غائب کر دیا ہے۔ عذاب و ثواب کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ سارا عہد نامہ قدیم پڑھ جاؤ بڑی مشکل سے استنباطی طور پر حیات بعد الممات کا

ثبوت نہ ملا۔ جس طرح قرآن کریم میں وضاحت سے حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا ذکر ہے بائبل میں ایسا ہرگز نہیں۔ پس یہود کی اکثریت تو سارے انعام اسی دنیا میں مانگتی تھی اور سزا بھی اسی دنیا میں طلب کرتی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پوری طرح جزا و سزا اور حشر و نشر کے عقیدہ سے آزاد نہیں ہو سکے تھے وہ لوگ بھی اپنے متعلق یہی خیال کرتے تھے کہ ہم کو کچھ زیادہ سزا نہیں ملے گی کیونکہ ہم خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں اور اگر کوئی سزا ملی بھی تو وہ صرف چند دن کی ہوگی۔ ان لوگوں میں سے بعض کا خیال تھا کہ اس چند روزہ سزا کے بعد یہودیوں کو خاک کر دیا جائیگا اور اُن کی خاک نیکوں کے قدموں میں لاکر ڈال دی جائے گی۔ اور بعض کا خیال تھا کہ یوں نہیں بلکہ یہود کو معاف کر دیا جائے گا۔ اِس عقیدہ کے بارہ میں یہود کے مختلف خیالات ذیل میں درج ہیں۔

سیل اپنے ترجمۂ قرآن میں لکھتا ہے کہ یہود کے نزدیک یہ مسلّم مسئلہ ہے کہ کوئی یہودی خواہ کتنا ہی شریر ہو اور کسی فرقے کا ہو گیارہ ماہ اور حد سے حد ایک سال سے زیادہ تک دوزخ میں نہیں رہے گا سوائے داتھن اور ابیی رام کے یاد ہریوں کے جو ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ داتھن اور ابیی رام وہ شخص ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کی تھی اور ایک جماعت بنا کر کوشش کی تھی کہ حضرت موسیٰؑ کی حکومت کو مٹا دیا جائے (دیکھو گنتی باب ۱۶) اِن کو خدا تعالیٰ نے ایک خاص عذاب کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا تھا۔

بابلی طالمود کے مطابق سوائے کافروں اور جیروبوم باقی سب یہودی بارہ مہینے تک دوزخ میں رہیں گے پھر جلا کر راکھ کر دیتے جائیں گے اور اُنکی خاک اُڑا کر نیکوں کے قدموں میں ڈال دی جائے گی۔

بابا میزیہ (BABA MEIZYA) کی طالمود میں لکھا ہے کہ تمام یہود جو دوزخ میں جائیں گے پھر نکل آئیں گے سوائے تین قسم کے آدمیوں کے۔ اوّل بدکار۔ دوسرے ہمسایہ کی عصمت دری کرنے والا۔ تیسرے ہمسایہ کو بدنام کرنے والا۔

ایرو بین طالمود میں لکھا ہے کہ دوزخ کی آگ یہودی گنہگاروں کو نہیں چھوئے گی کیونکہ وہ دوزخ کے دروازہ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور خدا کی طرف واپس لوٹ آئیں گے۔

برکوت طالمود (BARAKOT) میں لکھا ہے مرتد اور رومی اور ایرانی دوزخ میں جائیں گے یعنی یہودی گنہگار دوزخ میں جائیں گے ہی نہیں۔ اِس طالمود میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسرائیلیوں کو دوزخ سے بہت کم خطرہ ہے ہاں مرتد یہودی کو دوزخ میں جانے کا خطرہ ہے۔ اسی طرح غیر یہودیوں کے لئے خطرہ ہے۔

(جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۵۸۳)

اِن حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہودیوں کو بہت محدود سزا ملے گی اور اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً کے بھی یہی معنے ہیں گنتی کے دنوں سے مراد مقررہ دن نہیں بلکہ تھوڑے دن مراد ہیں۔ یہ محاورہ اُردو میں بھی ہے کہتے ہیں میرے پاس تو کچھ گنتی کی چیزیں ہیں مطلب یہ کہ بہت تھوڑا مال ہے۔ بحر محیط نے اِس آیت کے نیچے لکھا ہے کہ یہود کا خیال تھا کہ بچھڑے کی پوجا چونکہ چالیس دن کی گئی تھی اِس لئے اسی قدر عذاب ہمیں ملے گا۔ بعض نے چالیس دن کے عذاب کو بھی زیادہ قرار دے کر کہا ہے کہ صرف سات دن یہود کو عذاب ملے گا۔ اِس سے پتہ لگتا ہے کہ یہود میں اس قسم کے خیالات اسلامی زمانہ تک بھی قائم رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ہمارے رسولؐ ! تُو

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ

کیوں نہیں ؟ جو لوگ بھی کسی قسم کی بدی کمائیں گے اور اُن کا گناہ انہیں (چاروں طرف سے) گھیر لے گا

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ دوزخ (میں پڑنے) والے ہیں وہ اُس میں (پڑے) رہیں گے ۵۹

اُن سے پوچھ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے اِس بارہ میں کوئی عہد لیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا اور عذاب دینا یا نہ دینا تو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے یہ تمہارے کاہنوں اور رُہبانوں سے تعلق نہیں رکھتا کہ وہ جو چاہیں فیصلہ کر دیں اگر خدا نے یہود کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ کیا ہے تو وہ بائبل میں موجود ہونا چاہیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا دوسرے نبیوں کی معرفت اُس کا اعلان ہونا چاہیئے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے نبی تو خاموش ہیں اور طالمود کے علماء اپنی قیاس آرائیوں سے اِس بارہ میں فیصلہ کرتے ہیں کیا یہ خدا اور اُس کے دین کی ہتک نہیں؟ پھر فرماتا ہے اگر یہ عہد والی بات نہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارے علماء اپنے ذہن اور اپنے خیال سے یہ باتیں بناتے ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ اپنے ذہن اور اپنے خیال سے خدا تعالیٰ کے متعلق باتیں بنا لینا بہت گناہ ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو مختلف ادیان میں بگاڑ اسی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لوگوں نے مختلف امور میں اپنی طرف سے قیاس آرائیاں کر کے مختلف ادیان کی طرف منسوب کرنی شروع کر دیں۔ آج مسلمان بھی ہر مسئلہ میں جس میں اُنہیں دوسروں سے اختلاف ہوتا ہے اپنی باتوں کو سچ ثابت کرنے کے لئے اسلام کی آڑ لے لیتے ہیں۔ قرآن ساکت ہوتا ہے۔ حدیث خاموش ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ تو وہ مخالف ہوتے ہیں لیکن یہ رٹ برابر لگی چلی جاتی ہے کہ اسلام یُوں کہتا ہے اسلام کی تعلیم یُوں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اِس بات کے سمجھنے کی توفیق دے کہ وہ قرآن کو پارہ پارہ نہ کریں اور خدا تعالیٰ کے فرض کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔

۵۹ حل لغات۔ كَسَبَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں جَمَعَهٗ کسی چیز کو جمع کر لیا اور كَسَبَ الْاِثْمَ کے معنے ہوتے ہیں تَحَمَّلَهٗ۔ گناہ کمایا (اقرب) پس كَسَبَ سَيِّئَةً کے معنے ہوں گے۔ گناہ کیا یا گناہوں کو اکٹھا کر لیا۔

تفسیر۔ بَلٰى کے معنے ایجابی ہوتے ہیں خواہ اس سے پہلی عبارت میں نفی کا پہلو ہو یا اثبات کا یُوں اِس کے معنے "ہاں" کے ہوتے ہیں مگر عام طور پر تو ہاں کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ پہلی بات ٹھیک ہے۔ لیکن جب بَلٰى کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ بَلٰى کے بعد جو بات بیان کی گئی ہے وہ ٹھیک ہے۔ پہلی بات ہو سکتا ہے کہ غلط ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط نہ ہو۔ پس بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ کے معنے یہ ہوتے کہ اِس حقیقت میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جو شخص جان بوجھ کر بدی کرتا ہے اور پھر اُس کی بدی اُس کا احاطہ کر لیتی ہے یعنی اتنی غالب آ جاتی ہے کہ نیکیوں کا اثر کمزور پڑ جاتا اور ضائع ہو جاتا ہے تو ایسے لوگ دوزخ کے ساکن ہو جاتے ہیں اور اُن کی حالت اِس بات کی مستحق ہوتی ہے کہ وہ ایک لمبے عرصہ تک اُس میں رہیں۔

دو شرطیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں یعنی بدی کمائے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جنت (میں جانے) والے ہیں وہ اس میں (ہمیشہ) بسیں گے ۵۰

اور غلطی اُس کو گھیر لے۔ اِن سے اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر بدی انسان کو دوزخ کا مستحق نہیں بناتی بلکہ (۱) علم ہو (۲) ارادہ ہو (۳) نیکی پر بدیاں غالب آجائیں تب انسان دوزخ کا مستحق ہوتا ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو انسان کیلئے تسلی کا موجب ہو سکتی ہے ورنہ نصاریٰ کا کفارہ جس میں صرف مسیحؑ کی صلیبی موت پر ایمان لانے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا یہود کا دعوائے فضیلت جو ہر صورت میں اُنکو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے یا ہندوؤں کی حد و دنجات جو بار بار انسان کو تناسخ کے چکر میں ڈالتی ہے یا زرتشتیوں کا نسلی فضیلت کا دعویٰ یہ سارے کے سارے قابلِ اعتراض ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ مذہب ایک ذریعہ نجات کا ہے کسی مذہب کے قبول کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اُس مذہب کے قبول کر لینے سے خاص حقوق قائم ہو گئے ہیں۔ قانونِ نجات کی بنیاد بہرحال اس امر پر ہے کہ نیک علم، نیک ارادہ اور نیک کوشش کے ساتھ کام کرو تو تمہیں نجات ملے گی۔ تمہارا عقیدہ نجات میں ممد ہوگا وہ نجات کی گارنٹی نہیں بن سکتا بلکہ بعض دفعہ تو وہ تمہیں سزا دلانے کا مستحق بنا دیگا۔ جو شخص جانتے ہوئے غلطی کرتا ہے وہ زیادہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ جس کے پاس ہدایت ہو اور پھر وہ گمراہی کو قبول کرے وہ یقیناً بڑا مجرم ہے۔ پس کسی عقیدہ کو ماننے کی وجہ سے یہ خیال نہ کرو کہ اب تم عذاب سے بچ گئے اُس عقیدہ کا ماننا تم کو نجات نہیں دلوا دیتا بلکہ اُس عقیدہ کو ماننا تمہارے لئے ایسے اعمال اور خیالات میں ممد ہوتا ہے جن کی وجہ سے نجات مل جائے۔ اگر اُس عقیدہ کے باوجود تمہارے اعمال اور تمہارے افکار میں اصلاح نہیں ہوئی تو یہ زیادہ خطرناک بات ہے تسلی کی بات نہیں۔ یہ کتنا فطرت کے مطابق مسئلہ ہے اور کس طرح ہر قسم کے اعتراض سے پاک ہے۔

۵۰ تفسیر۔ اَصْحٰبُ النَّارِ کے مقابلہ میں اب اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ کا حال بیان فرماتا ہے جس طرح اَصْحٰبُ النَّارِ بننے کے لئے یہ شرط تھی کہ باوجود علم کے یا بالارادہ بدی کرے اور بدی نیکی سے بڑھ جائے تو یہ چیز انسان کو ایک لمبی سزا کا مستحق بنا دیتی ہے اِسی طرح اُس کے بالمقابل جس کے اندر ایمان ہو اور پھر وہ ایسے اعمال کرے جو موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب ہوں تو ایسا انسان جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

مَیں نے اُوپر بتایا تھا کہ کسی مذہب میں شامل ہونا یا کسی عقیدہ کو ماننا نجات کی گارنٹی نہیں بلکہ وہ صرف نجات کے لئے ممد ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائیں اور صالح عمل کریں وہ جنتی ہیں۔ خیال ہو سکتا ہے کہ کیا اِس کا یہ مفہوم ہے کہ عملِ صالح بغیر ایمان کے کام نہیں دیتا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ عملِ صالح بغیر ایمان کے کام نہیں دیتا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عملِ صالح بغیر ایمان کے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو عمل صرف اِس بات کا نام نہیں کہ ہم ہاتھ سے یا پیر سے کام لیں۔ ہمارا دماغ بھی کام کرتا ہے وہ بھی عمل ہے کسی کے متعلق بد ارادہ کرنا یا کسی کے متعلق نیک ارادہ کرنا خواہ اِن ارادوں پر عمل کرنے کی توفیق نہ ملے یہ اپنی ذات میں کام ہیں۔ ایک شخص جس کا دل دنیا بھر کی بدخواہی کے خیالات سے بھرا ہُوا ہے رات اور دن لوگوں پر حسد کرتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ بدعمل نہیں۔ کسی نہ کسی

وجہ سے اُسے بدعمل اپنے ہاتھوں یا پیروں سے کرنے کی توفیق نہیں ملی ورنہ بدعمل تو وہ ضرور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک عمل صالح کی صحیح تشریح خدا اور اُس کے رسول کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس عملِ صالح کا پتہ بغیر ایمان کے لگ ہی نہیں سکتا۔ یہ مطلب نہیں کہ عملِ صالح کی کوئی جزو بھی ایسی نہیں جو بغیر ایمان کے حاصل نہ ہو سکے۔ سینکڑوں اجزاءِ عملِ صالح کے ایسے ہوں گے جن کو بغیر ایمان کے حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ بغیر ایمان کے اُن کو حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر سوال تو مکمل تشریح کا ہے مکمل تشریح بغیر ایمان کے حاصل نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم عملِ صالح کے دو نتائج بیان فرماتا ہے۔ ایک نتیجہ تو یہ بیان فرماتا ہے کہ اچھے کام کے اچھے نتائج اِس دنیا میں ملتے ہیں اور بُرے کام کے بُرے نتائج اِس دنیا میں ملتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والا بدنام ہو جاتا ہے۔ سچ بولنے والا نیک نام ہو جاتا ہے۔ لوگ جھوٹے پر اعتبار نہیں کرتے سچے پر اعتبار کرتے ہیں۔ بد دیانت کو لوگ قرض نہیں دیتے دیانتدار کو صرف قرض ہی نہیں دیتے بلکہ اُس کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے ہیں جن سے وہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ محنتی آدمی کو زیادہ آسانی سے نوکریاں مل جاتی ہیں، کام مل جاتے ہیں، اچھی تنخواہیں مل جاتی ہیں۔ غرض بہت سے نیک اعمال کے بدلے اسی دنیا میں مل رہے ہیں۔ مگر اس آیت میں اِس دنیا کے بدلوں کا ذکر نہیں اِس آیت میں تو جنت ملنے کا ذکر ہے جو کام انسان نے اپنی مرضی سے کئے اور اُن سے فائدہ اُٹھایا۔ اُن کے بدلہ میں جنت کیوں ملے۔ لازمی بات ہے کہ جنت ملنے کے لئے کوئی ایسا فعل بھی ساتھ شامل ہونا چاہیئے جس فعل سے اُس نے خدا کی بات مانی ہے اور وہ ایمان ہے۔ اِسی وجہ سے جب کبھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جنت کا ذکر فرماتے تھے یہ ضرور فرماتے کہ جو شخص نیک عمل کرے ایمانًا واحتسابًا ایمان اور خدا سے نیک بدلہ کی اُمید کرتے ہوئے، تو اُس کو جنت مل جائے گی۔ اِس کے یہی معنے ہیں کہ عمل کا دنیوی نتیجہ تو یہیں انسان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اگلے جہان میں بدلہ ملنے کے لئے کوئی زائد عمل ہونا چاہیئے اور وہ عمل ایمان ہے۔ ایک شخص سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی وجہ سے سوسائٹی میں اُس کی قدر ہوتی ہے کئی ایسے کاموں کے حاصل کرنے میں اُسے سہولت حاصل ہوتی ہے جن میں سچ کو قیمت دی جاتی ہے یہ شخص اپنے کام کا پھل کھا لیتا ہے اور نتیجہ پا لیتا ہے لیکن اگر ایسا شخص سچ بولتے وقت یہ بھی مدنظر رکھ لیتا ہے کہ میرے خدا نے مجھے کہا ہے کہ سچ بول۔ میں اپنے خدا کی خاطر سچ بولتا ہوں تو ایسا شخص ایک تو وہ نیک کام کر رہا ہے دوسرے خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نیک کام کرنے کا نتیجہ تو اُس کو اِس دنیا میں مل گیا لیکن خدا تعالےٰ کی خاطر نیک کام کرنے کا نتیجہ اُس کو اِس دنیا میں نہیں علاوہ ازیں مرنے کے بعد جنت کی صورت میں ملے گا۔

اگر کسی شخص نے خدا تعالےٰ کی خاطر نیک کام کیا ہے تو جہاں تک نیک کام کا تعلق ہے وہ بنی نوع انسان کے فائدہ کی چیز ہے۔ بنی نوع انسان اپنے محدود ذرائع سے اُس کو محدود انعام اسی دنیا میں دے دیتے ہیں لیکن جہانتک خدا تعالیٰ کی خاطر نیک کام کرنے کا تعلق ہے وہ دنیوی انعام اُس کا بدلہ نہیں کہلا سکتا اُس کا بدلہ خدا تعالےٰ پر لازم و واجب ہے اور چونکہ خدا تعالےٰ کے ذرائع غیر محدود ہیں وہ اُس کے بدلہ میں اُس نیک شخص کو غیر محدود جنت دیتا ہے پس اٰمَنُوْا کی شرط لگا کر عملِ صالح کی قیمت نہیں گھٹائی بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ عملِ صالح کے ساتھ جب ایمان لگ جائے تو اُس کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسی دنیا میں نہیں بلکہ اگلے جہان میں بھی اُس کا انعام ملتا ہے پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام عمل صالح کی قیمت گراتا ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ عملِ صالح تو انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور انسان اس کی قیمت ادا کرتے ہی رہتے ہیں۔ قرآن کریم کا اصل تعلق تو اُس عمل صالح سے

ہے جو خدا کی خاطر کیا جائے وہ یہ نہیں کہتا کہ عملِ صالح کا جب تک ایمان اُس کے ساتھ نہ ہو کوئی بدلہ نہیں ملنا چاہیئے تو اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانوں کے لئے جو نیک کام کئے جائیں انسانوں کو اُن کا بدلہ دینا چاہیئے اور قانونِ قدرت بھی اُن کے مناسب بدلہ کا انتظام کر دیتا ہے لیکن آیت زیرِ تفسیر اور اسی قسم کی دوسری آیتوں میں وہ یہ زائد مضمون بیان کرتا ہے کہ جب کوئی شخص نیک عمل کرتے وقت یہ نیت کر لیتا ہے کہ میں یہ کام خدا کی خاطر کر رہا ہوں اور جس کے سامنے خدا تعالےٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے خدا تعالےٰ کے کلام اور اُس کے رسولؐ کی ہدایت کے مطابق نیک عمل کی ایک کامل صورت آجاتی ہے تو ایسے شخص کی جزاء یقیناً اُس پہلے شخص کی جزاء سے زیادہ ہونی چاہیئے. ور صرف اسی دنیا میں اُسے جزاء نہیں ملنی چاہیئے بلکہ اگلے جہان میں بھی ملنی چاہیئے کیونکہ ایمان کے ساتھ عمل کو وابستہ کر دینے کی وجہ سے اور خدا تعالےٰ کی خاطر کام کرنے کی وجہ سے جزا کی کمیت اور اُس کے زمانہ کی وسعت لازماً ممتد ہو جاتی ہے

عَمِلَ صٰلِحًا۔ قرآن کریم جہاں بھی کہتا ہے عملِ صالح کہتا ہے۔ عملِ صالح کے معنے ہیں مناسبِ حال عمل یعنی نماز کے موقع پر نماز۔ روزہ کے موقع پر روزہ۔ زکوٰۃ کے موقع پر زکوٰۃ اور جہاد کے موقع پر جہاد۔ صرف نیک عمل انسان کے لئے نفع بخش نہیں ہو سکتا بلکہ مناسبِ حال عمل نفع بخش ہوتا ہے۔ دوسرے عَمِلَ صٰلِحًا نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اچھا فعل بھی بعض جگہ بُرا ہو جاتا ہے۔ رحم کی جگہ انتقام اور انتقام کی جگہ رحم بھی مضر ہے پس رحم گو اچھا ہے مگر انتقام کے موقع پر رحم عملِ صالح نہیں ہوگا اور اس لئے ناپسندیدہ فعل ہوگا۔ جہاد کے موقع پر کوئی شخص نماز پڑھنے بیٹھ جائے تو نماز گو اچھی چیز ہے مگر اُس وقت عملِ صالح نہیں ہوگا اور اس لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا۔

اَصْحٰبُ النَّارِ اور اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عارضی عذاب پانے والے اور ایک لمبا عذاب پانے والے۔ ایک مستقل جنّت والے اور ایک عارضی جنت والے۔ اصحاب کا لفظ ایسے ہی موقع پر استعمال ہوتا ہے جب نسبت مستقل ہو۔ پس قرآنی اعتبار سے اَصْحٰبُ النَّارِ وہ ہیں جن کا لمبا تعلق دوزخ سے ہو اور اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ وہ ہیں جن کا لمبا تعلق جنت سے ہو۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کا دوزخ سے بھی اُس قدر لمبا تعلق نہیں ہوگا جس قدر پہلے لوگوں کا۔ یا جنت سے بھی اُس قسم کا لمبا تعلق نہیں ہوگا جس قسم کا پہلے لوگوں کا۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عارضی عذاب والے یا عارضی جنّت والے پہلے کچھ عذاب پالیں گے اور پھر اپنے اپنے وقت پر معافی حاصل کر کے جنّت میں داخل کر لئے جائیں گے جو مستقل ہوگی۔ پس اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ کے معنے ہیں جو پہلے دن سے ہی جنّت میں جائیں ورنہ یوں تو ہر شخص ہی آخر میں جنّت میں چلا جائے گا۔ آریہ قوم کی تعلیم اس کے خلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ پہلے خدا عذاب دے گا اور پیشتر اس کے کہ عذاب مکمل ہو انسان کو انعام دینا شروع کر دے گا کچھ مدت انعام دے کر پھر جو گناہ بچا کر رکھ لئے جائیں گے اُن کی سزا میں دوبارہ اُس کو کسی جون میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ تعلیم کینہ پر اور بغض پر دلالت کرتی ہے اور خدا تعالےٰ کینہ اور بغض سے پاک ہے ؏

اِشاریہ کلیدِ مضامین

کلیدِ مضامین

(مُرتبہ: سیّد عبدالحیٔ ایم۔اے)

آ

❁

آسمان

آگ

آنکھ

آیات

الف

اسلامی اصول کی فلاسفی

اسم / اسماء

اشراق

اعتدال

اقامتِ صلوٰۃ

القاء

اللہ جلّ جلالہٗ

امام

امّتِ محمدیّہ

امنِ عالم

اُمّی

امیر الجیش

انجیل

انسان

انصار

انعام

ایمان بالغیب

ب

بارش

بائیبل نیز دیکھئے تورات و انجیل

ت

❊

صدیق ۔ صدیقیت

صراطِ مستقیم

صفاتِ الٰہیہ (نیز دیکھئے اللہ تعالےٰ)

صلیب

صورت

ض

ضالّ ۔ ضالّین

ضیافت

ط

طاعون

طالب علم

غ

غذا

غزواتِ نبویؐ

غزوۂ بدر

مُصدّق

قرآنی تعلیم اور اس کی جامعیت

ہدایت

پڑھنے کی تاکید اور مقصد

قرآن کی مثل لانے کا چیلنج

قرآن کریم کے محاورات

قرآن کریم اور بائبل

متفرق

قربانی

قرض حسنہ

یقین

اسماء

آ

حضرت آدم علیہ السلام

ا

مقامات

حَلُّ اللُّغَات

(الف)

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر کبیر للرازی ۱۷
تفسیر ابن کثیر ۱۲ ، ۲۱۴
تفسیر الکشاف للزمخشری ۱۹۱
تفسیر ابن جریر ۲
تفسیر بحر محیط ۱۲ ، ۲۲۵
مفاتیح الغیب للرازی ۵۱۴
تفسیر معالم التنزیل ۳۴۸
تفسیر ثعلبی ۷
تفسیر فتح البیان ۳ ، ۱۳ ، ۴۵
الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱
ترجمہ قرآن (ریورنڈ وہیری) ۱۶

حدیث

جامع صحیح بخاری ۳ ، ۹
صحیح مسلم ۷۰۰
جامع ترمذی ۲
سنن نسائی ۲
سنن ابو داؤد ۲
سنن ابن ماجہ ۸
مسند احمد بن حنبل ۲ ، ۴۵ / ۳۹۰
مسند دارمی ۳
دار قطنی ۹
بیہقی ۳
صحیح ابن حبان ۸
صحیح ابن خزیمہ ۸
المستدرک للحاکم ۱۲
الدر المنثور ۱۴
اربعین حافظ عبد القادر ۱۴
فتح الباری شرح بخاری ۵۲

تصانیف حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ازالہ اوہام ۵۱۵
پیغام صلح ۵۰۸
اسلامی اصول کی فلاسفی ۲۵۵

تاریخ

طبقات ابن سعد ۵۱۹
اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ۵۴ ، ۲۷۶

سیرتِ حلبیہ ۳۷۷

الروض الانف ۳۷۵

سیرت ابن ہشام ۱۷۱

TRIBES OF CENTRAL AUSTRALIA (SPENCER & GILLIN)

MOSES & MONOTHIEISM BY SGD/FRUID

THE NILE & EGYPTIAN CIVILIZATION BY MORET

LIFE OF MOHAMMAD BY SIR W MUIR

HISTORY OF EGYPT BY BRESTED

ISRAEL BY ADOLPHELODS

JEWISH LIFE OF CHRIST

لغت

اَقربُ الموارد ۱۹

تاج العروس ۳۵۱/۱۸۴

فقہ اللغۃ للامام ابومنصور ثعالبی ۲۸۰

مفردات لغریب القرآن ۱۸

مجمع البحار للشیخ محمد طاہر (لغت حدیث)

ANALYTICAL DICTIONARY OF HEBREW & CHALDEC

NEW STANDARD DICTIONARY

HEBREW AND ENGLISH LAXICON OF THE OLD TESTAMENT

ENCYCLOPAEDIA BRITANICA

ENCYCLOPAEDIA BIBLICA

JEWISH ENCYCLOPAEDIA

ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS & ETHICS.

کتب یہود ونصاریٰ

بائبل (عہد نامہ قدیم وعہد نامہ جدید)

طالمود، بابلی

طالمود، بابامیزیہ — TALMUD BABA MEIZYA

طالمود، برکوت — TALMUD BARAKOT

طالمود، ایروبین ۵۸، ۴۱۷، ۵۴۴

مِشنا (یہودی حدیثوں کا مجموعہ) ۵۰۴

تفسیر بائبل از میتھیو پول MATHEW POOL ۸۴

عہد نامہ جدید مکاشفات ۳

ہندو لٹریچر

ستیارتھ پرکاش مصنفہ دیانند ۸۴

رگ وید ۲۸۸

منوسمرتی ۲۸۹

کورم پوران پورو آردھ ۸۸

گیتا ۲۱۷

راماین ۸۲

شو پران ۲۸۹

شریمد بھگوت پران ۸۲

برہم دی ورت پران ۸۲

پرشن اپنشد ۲۸۹

آئیتری اپنشد ۲۸۹

برہدارنیک اپنشد (تفسیر وید) ۲۸۸

متفرق

فتوحات مکیہ از حضرت محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ ۳۰۱